ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجئے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا / گی۔

نام ____________

مقام و پتہ ____________

____________

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجئے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا / گی۔

نام ____________

مقام و پتہ ____________

____________

ٹوکن دوش

دوشیزہ اد

لی ہیں اور مجھے ہ

ہے۔ منسلکہ ح

کے ہر فیصلے کا پا

نام ____________

مقام و پتہ ____________

____________

جلد ۵
شمارہ ۲

گیا۔ اسی روز میرے بتائے ہوئے پتے پر گھر آگیا۔ مجھے گمان نہیں تھا
کہ وہ آج ہی آ پہنچے گا۔ لیکن سچ یہ ہے کہ مجھے اس کے آنے کی دلی
خوشی ہوئی۔ اس روز ہماری دوستی کی جو بنیاد پڑی وہ دن بہ دن گہری
ہوتی گئی۔ میں شادی شدہ آدمی تھا اور عمر میں اس سے چار چھ سال بڑا
ہی ہوں گا۔ اس کے باوجود ہم بچپن کے معصوم دوستوں کی طرح ایک
دوسرے کو چاہتے تھے۔ حیات کے والد کا اس کے لڑکپن میں ہی انتقال
ہو گیا تھا۔ ماموں کے یہاں پرورش ہوئی تھی۔ فطری بات ہے کہ اسے
وہ خصوصی مراعات نصیب نہیں تھیں جو ماموں کے بچوں کو حاصل تھیں۔
وہ دل ہی دل میں اپنے ماموں اور رشتہ داروں سے نفرت پالتا رہا۔ بڑے
ہونے پر ماموں نے اپنے احسانات کے بدلے اس کا رشتہ اپنی بیٹی
سے کرنا چاہا۔ پہلی دفعہ اسے موقع ملا تھا کہ اپنی نفرت کا برملا اظہار
کر سکے۔ اپنی ماں سے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے یہ رشتہ کسی صورت
میں نہیں کرنا۔ ساری عمر ان کی غلامی میں بسر ہو گئی۔ رشتہ کرنے کے بعد
جتنی باقی ہے وہ بھی جی حضوری کی نذر ہو جائے گی۔ آپ میری طرف
سے کہہ دیں کہ وہ فی الحال شادی میں دلچسپی نہیں رکھتا۔

یہ جواب سن کر ماں کا ماتھا ٹھنکا کہ لڑکا ہاتھوں سے نکلا جا رہا
ہے۔ وہ اپنے بھائیوں کو دل سے چاہتی تھی۔ اُن کی آن میں بیس تیس
برس پڑی کہ اگر ان کا کہا نہیں مانتا تو آج ہی یہ گھر چھوڑ دے۔ حیات
نے ماں کی ڈانٹ ڈپٹ پر اسی شام ہمیشہ کے لئے اپنے ماموں کا گھر
چھوڑ دیا اور کراچی چلا آیا۔ یہاں حالات درست ہوتے ہی ماں کو
منانے کا خط لکھا مگر وہ ضدی عورت اور اکڑ گئی۔ لکھ بھیجا کہ میرا تیری کمائی
سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں تیری طرح احسان فراموش نہیں ہوں کہ وقت
نکل جانے کے بعد آنکھیں پھیر لوں۔ میں ساری عمر بھائیوں کے ساتھ رہوں
گی۔ اگر تو فرض سمجھے تو میرے مرنے پر آ جانا۔ حیات نے اس صدمے کو
ذہنی جانا اور اپنی زندگی کی گہما گہمی میں مگن ہو گیا۔ اکیلا آدمی تھا۔ ہوٹل میں
رہائش اختیار کر لی۔ بیمار پڑتا تو میں اپنا ملازم اس کی دیکھ بھال کیلئے
بھیج دیتا۔ اس دفعہ بیمار پڑا تو میرا ملازم چھٹی پر تھا۔ صبح شام میں
دیکھ بھال کے لئے چلا جاتا۔ ایک روز آفس سے چھٹی جلدی ہو گئی۔
میں سیدھا حیات کی طرف چلا آیا۔ اندر سے عورتوں کی باتوں کی
آواز آ رہی تھی۔ میں اس خیال سے خوش ہو گیا کہ شاید اس کے گھر
والے آ گئے ہیں۔ دروازے پر دستک دی۔ اندر کھلبلی سی مچ گئی۔ میں نے
بلند آواز سے کہا کہ حیات کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔ حیات نے خوشی
کا نعرہ مارا۔ یار تجھ سے کسی کا پردہ نہیں اندر آ جا۔ اور جب میں قدرے
جھجکتا اندر پہنچا تو ——— حیرت زدہ ہو گیا۔ اندر جو دو عورتیں بیٹھی تھیں

وہ اپنے انداز اور لباس سے قطعی دیہاتی نہیں لگتی تھیں بلکہ صاف [illegible]
میں کیوں نہ کہوں کہ وہ اپنی وضع قطع کے اعتبار سے اس بازار کی
عورتیں لگ رہی تھیں۔ حیات نے اپنے قریب بیٹھی ہوئی عورت سے
سر ڈھانپنے کو کہا۔ اس نے جیسے تیسے پلو سے سر پر آنچل ڈال لیا۔
حیات بولا۔ سلیمان یہ الماس جان ہے اور یہ دوسری اس کی بہن بازار
بن ستارا جان۔ میری ماں کو بیماری کا سن کر ملنے آئیں اور یہ بدنام
علاقے کی عورتیں اتنی سمجھ تو رکھتی ہیں کہ مجھے دیکھنے چلی آئیں۔

اس روز یہ بھید کھلا کہ حیات کی ان سے پرانی شناسائی ہے
اور یہ حضرت اس بازار میں ——— بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔
ان دونوں کے چلے جانے پر میں نے اسے ڈانٹا کہ یہ کیا بات ہوئی
اسکو مجھ سے بھی چھپاتے رہتے ہو۔ ہنسنے لگا۔ بولا یار تو بال بچے دار آدمی ہے
تجھے ان چکروں سے دور رکھنا بہتر ہے۔ میں چھڑا آدمی ہوں [illegible]
کروں کسی کی زندگی پر چھایا یا اثر نہیں پڑتا۔ اس کی بات معقول
تھی۔ میری آمدنی ان عیاشیوں کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی لیکن اتنا ضرور
ہوا کہ کبھی مہینے میں ایک آدھ دفعہ حیات کے دوست کی حیثیت سے
میں الماس جان سے ملنے جانے لگا۔ ستارا جان لاہور چلی گئی تھی اور
میں نے یہ بات بھی نوٹ کی کہ الماس کی ماں حیات کے گھر جانے
پر کڑی نظر رکھتی ہے۔ غالباً وہ بیٹی کی بڑھتی ہوئی دلچسپی سے کھٹک
گئی تھی۔ بات ٹھیک ہی تھی۔ اس نے الماس پر نمائشی پابندیاں لگا دیں
مگر حیات کا جادو اس پر چل چکا تھا۔ وہ ہر تیسرے چوتھے روز ماں سے چھپ
چھپ کر ملنے آتی رہی۔ حیات نے اس کی وفاداری اور محبت
قبول کر لیا۔ پہلے دل لگی کے لئے اس سے ملتا تھا لیکن اب [illegible]
دل سے اسے چاہنے لگا تھا۔ میں نے [illegible] دوست [illegible]
چاہا کہ بازاری عورت بے وفا ہوتی ہے۔ اس کا اعتبار کیا [illegible]
بیوی بن سکے گی۔ اس پر حیات سنجیدہ ہو گیا۔ کہنے [illegible]
مہینوں سے جانتا ہے۔ مگر میری الماس سے اس وقت سے
دوستی ہے جب میں پہلے دن کراچی کے اسٹیشن پر اترا تھا۔ الماس
لاہور سے آ رہی تھی۔ اس نے اسٹیشن پر مجھے [illegible]
تنہا پریشان کھڑا دیکھ کر اس نے [illegible]
دعوت دی۔ اس وقت مجھے معلوم [illegible] بازاری عورت ہے۔ اس
وقت میں نے اخلاقی طور پر شکریہ ادا کیا تب اس نے بتایا [illegible]
رہتی ہے۔ بیگانے ہونے کے باوجود [illegible]
مناسب [illegible]
عورت کو بھانپ لیا تھا۔ بعد میں اس سے ملاقات [illegible]

کھڑے ہو کر الماس کو گھیرے میں لے لیا۔ حیات جھپٹ کے آگے بڑھا۔ بولا: "آپ کو شریف گھرانے کی بہو بیٹیوں کو حراست میں لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔" انسپکٹر نے طنزاً پوچھا "کیا ناچنے والی عورت آپ میں سے کسی کی بہو بیٹی ہو سکتی ہے؟" اس پر حیات نے فلمی ہیرو کی طرح سینہ تان لیا۔ گرج کر بولا "انسپکٹر صاحب ہوش کی دوا کیجیے یہ خاتون میری بیوی ہے اور یہ دوسری خاتون میری ساس ہیں میری بیوی کی سگی ماں۔ آپ کو کسی کی ازدواجی زندگی کے معاملات میں دخل دینے کا حق کس نے دیا ہے۔ میری بیوی کو رقص و سرود کا شوق ہے اور یہ شوق ہم گھر میں پورا کر رہے ہیں بازار میں تو نہیں ناچ رہے۔" انسپکٹر کا لہجہ نرم پڑ گیا وہ شائستگی سے بولا "اگر یہ محترم خاتون آپ کی واقعی ہیں تو ہم سب آپ سے ابھی معافی مانگ کر رخصت ہو جائیں گے لیکن اگر یہ بات غلط ہوئی تو یہ محترمہ اور ان کی والدہ صاحبہ کو آپ سمیت حوالات میں بند ہونا پڑے گا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ہم پولیس والے حوالات میں آپ تینوں سے کیسا سلوک کریں گے۔ بہرحال آپ ہمیں نکاح نامہ دکھا دیجیے۔" فیصلہ ابھی ہو جائے گا۔ حیات دلیری سے بولا "نکاح نامہ میرے بڑے بھائی صاحب کے گھر رکھا ہوا ہے آپ آدھ گھنٹے کی مہلت دیں تو ابھی حاضر کیے دیتا ہوں۔" انسپکٹر نے مسکرا کر مہلت دے دی اور خود سپاہیوں سمیت وہیں براجمان ہو گیا۔

بڑی بی اس وقت تھر تھر کانپ رہی تھیں انہیں اٹھا کر ساتھ والے کمرے میں لے آیا۔ میں بھی ساتھ آ گیا۔ وہ بولا "اماں حالات بہت بری طرح بگڑ گئے ہیں اب اگر خود کو بچانا ہے تو بیٹی کی قربانی دینی پڑے گی میں ابھی قاضی کا انتظام کیے دیتا ہوں وہ پچھلی تاریخ میں نکاح نامہ بناتا ہے۔ اگر اس وقت تم نے اکڑ دکھائی تو ہم سب حوالات میں بند کر دیئے جائیں گے۔" بڑی بی بری پھنسی تھیں۔ نا کرتی تو ہتھکڑی لگ کر اسی وقت حوالات میں بند کر دی جاتیں اور ہاں کرتیں تو عمر بھر کی کمائی ہاتھوں سے جا رہی تھی مگر اپنی جان کسے پیاری نہیں ہوتی۔ یوں ہی جھوٹ موٹ کے دو چار آنسو بہا کر اجازت دے دی۔ میں اور حیات الماس کو لے کر قرتر روڈ آئے یہاں نکاح کی پوری پوری تیاری پہلے سے کر رکھی تھی پھر بھی ڈیڑھ گھنٹہ لگ ہی گیا۔ اس کارروائی سے فارغ ہو کر واپس ناظم آباد آئے۔ انسپکٹر صاحب نے قدرے ناراضگی دکھائی کہ اتنی دیر کیوں ہوئی لیکن نکاح نامہ دیکھ کر انہوں نے الماس اور اس کی ماں سے معافی مانگی حیات سے بھی بار بار اپنی ندامت کا اظہار کیا اور چائے پی کر وہ لوگ رخصت ہو گئے۔ انسپکٹر حمید کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کر کے حیات نے نہایت چالاکی سے بڑی بی کی رضامندی حاصل کر کے الماس کو سب کے سامنے بیوی بنا لیا۔ بعد میں بڑی بی نے بڑی بھاگ دوڑ کی۔ حمید صاحب سے بھی کام لیا اور طلاق دلوانے کے لئے بڑی بڑی رقموں کا لالچ دیا مگر اب حیات کو کس کا ڈر تھا۔ الماس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اماں میں اب مر کر ہی اس گھر سے نکلوں گی تو مجھے جیتے جی یہاں سے نہیں لے جا سکو گی۔ بڑی بی بہت دنوں تک کھولتی رہیں لیکن بالآخر ہار کر انہیں باور کرنا پڑا کہ لڑکی واپس نہیں آئے گی۔ وہ اپنی چھوٹی بہن کے پاس لاہور چلی گئیں ۔۔۔ اور یہ دولہا میاں یعنی آج کل ڈیفنس سوسائٹی میں رہتے ہیں۔ حیات کا اپنا کاروبار ہے تین بچے بھی ہیں۔ آج بھی میری ان لوگوں سے کافی گہری چھنتی ہے، خاص طور پر الماس بھابی میری بڑی عزت کرتی ہیں۔ کہتی ہیں "بھیا تم نے مجھے اس گندگی سے نکالنے کے لئے جو اخلاقی سہارا دیا ہے وہ میں مر کر بھی نہیں بھلا سکوں گی۔" اور سچ ہے کہ یہی وہ جو شمع انجمن بن کر بزم میں جلتی رہی اب چراغ خانہ بن کر اپنے مقدس گھر کی چار دیواری میں اپنے پیار اور اپنی ممتا کی کرنیں بکھیر رہی ہے۔

غلام عثمانی - کراچی

**********************

مجھے خود بھی حیرت ہوتی ہے کہ میں نے ایسا کیسے کر [illegible] کیا اور پھر یہ فیصلہ کرتے وقت میرے قدم [illegible] نہ ڈگمگائے [illegible] کرتی اور عورت ہوتی تو شاید اتنا حوصلہ نہ کر پاتی اور وہ بھی [illegible] کے اس معاشرے میں جہاں عورت کو گھر اور پیار کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کہہ رہے ہوں گے کہ کیا پہیلیاں بجھا رہی ہو صاف بات کیوں نہیں کہتی۔ تو کہانی سنانے سے پہلے [illegible] کہ اب مجھے بتائیں میری جگہ آپ ہوتیں تو کیا کرتیں۔

[illegible]
ہوں۔ والدین غریب ضرور تھے لیکن ہمارے ساتھ [illegible] رہے۔ پانچ بہنوں میں سب سے بڑی میں ہوں اس لئے مجھے گھر کے مالی اتار چڑھاؤ کا بھی اچھی طرح پتہ ہے۔ [illegible] کاروبار کرتے تھے میری چھوٹی بہن کی پیدائش پر ابا جی بیمار پڑ گئے۔ بس یہیں سے ابا کا مالی بحران شروع ہوا۔ [illegible] پھر زیادہ توجہ نہ دے سکے اور رفتہ رفتہ ہم [illegible]

بیچاری پہلے ہی بیمار رہتی تھیں اور ان حالات میں ابا کی وفات ہو گئی۔ سلمیٰ کی پڑھائی چھوٹ گئی۔ امی بیمار رہنے لگیں۔ میکے کے یہ حالات تھے اور میرے اپنے گھر کے تیور بھی بدلے ہوئے تھے۔ سلیم مجھ سے بیزار رہنے لگے تھے۔ وہ اب شدت سے بچوں کی کمی محسوس کرنے لگے۔ اپنی پریشانیوں میں گھرے گھرے مجھے اچانک ایک خیال آیا کہ اماں کو تو سلمیٰ کے رشتے کی فکر نے گھلا دیا اور میں شاید کچھ دنوں بعد شوہر کی رفاقت سے محروم کر دی جاؤں کیونکہ سلیم نے دبے دبے لفظوں میں دوسری شادی کی خواہش کا اظہار کر دیا تھا، ظاہر ہے اتنا سارا بینک بیلنس کس کے کام آتا ۔۔۔ انسان اپنے لئے جیتے جیتے بھی اکتا جاتا ہے۔ ہم دونوں اپنی ذات سے اکتا چکے تھے انہیں یہ حق تھا کہ نئی زندگی اپنا لیں۔ یہ گھر جو میں نے سالوں کی محنت سے بنوایا تھا جس کا ایک ایک تنکا میں اپنے ہاتھ سے سنبھال کر رکھتی تھی غیر عورت آنے سے میرے ہاتھ سے چھن جائے گا۔ یہ خیال مجھے پاگل کئے دے رہا تھا۔ دوسری عورت کے آنے سے میں یہاں سے دودھ کی مکھی کی طرح سے نکال دی جاؤں گی۔ اگر رحم کھا کر رکھ بھی لی گئی تو زندگی سوکن کے جلاپے اور آئے دن کے جھگڑوں سے جہنم سے بدتر ہو جائے گی۔ میں ایسا قدم کیوں نہ اٹھاؤں جس سے میرا حق بھی نہ چھنے اور میرے شوہر کا سونا گھر بھی آباد ہو جائے ۔۔۔ تو آپ سمجھے میں نے کیا فیصلہ کیا ۔۔۔؟ میں نے سلمیٰ اپنی چھوٹی بہن کو اپنے شوہر کی بیوی بنانے کا فیصلہ کیا ۔۔۔ آپ نادان مت بولیں یہ غیر شرعی فعل ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی قبول کر لیا تھا کہ سلیم مجھے طلاق دے دیں۔ میری بہن مجھے اپنے ساتھ رکھنے کا تو حق رکھتی ہے۔ وہ میری ماں جائی ہے۔ سب سے زیادہ مجھے چاہتی ہے۔ وہ کبھی مجھے گھر سے نہیں نکالے گی ۔۔۔ جب میں نے اس فیصلے پر ہر طرح سے غور کر لیا تو سلیم سے بات کی۔ وہ پہلے تو حیران ہوئے کہ یہ تمہیں کیا سوجھی۔ لیکن میں نے انہیں سمجھایا کہ جب آپ کو دوسری بیوی لانا ہی ہے تو وہ میری بہن کیوں نہ ہو۔ اگر غیر عورت لاؤ گے تب شاید وہ میرا یہاں رہنا گوارا نہ کرے اور میں آپ سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ کر دی جاؤں۔ سلمیٰ کے آنے سے کم از کم میری زندگی برباد ہونے سے تو بچ جائے گی۔ آپ سے صرف جسمانی تعلق ٹوٹے گا مگر آپ میری نظروں کے سامنے تو رہیں گے۔

وہ میری بات مان گئے۔ اب امی کو سمجھانا تھا۔ وہ بیمار عورت تھیں۔ میرا فیصلہ سن کر رونے لگیں کہ اس عمر میں طلاق لے کر رُل جائے گی۔ تجھے کیا خبر سلمیٰ تیرے شوہر کی بیوی بن کر تیرے ساتھ کیسا سلوک کرے۔ میں نے اماں کو یقین دلایا کہ سارے حالات میں سنبھال لوں گی۔ آپ [illegible] سلمیٰ [illegible]۔ سلیم جیسا شوہر ملنا مشکل ہے۔ اماں رو دھو کر چپ ہو گئیں اور میں نے سلمیٰ کو گلے سے لگایا کہ میری بہن میں تجھے اپنے شوہر کی ہونے والی بیوی کی شکل میں لے جا رہی ہوں [illegible] سوکن کا [illegible] تو مجھے اپنی ماں سمجھ کر میری اطاعت کرنا۔ میں اپنا [illegible] محبت کرنے والا شوہر تیرے حوالے کر رہی ہوں تو اس کے بدلے مجھے [illegible] سے روٹی دیتی رہنا۔ سلمیٰ مجھ سے لپٹ کر رونے لگی کہ آپا تم تو میری ماں جائی ہو۔ خود پر کیوں ظلم کر رہی ہو۔

مگر یہ میرا اٹل فیصلہ تھا ۔۔۔ چند دن بعد سلیم نے مجھے طلاق دے دی اور سلمیٰ سے نکاح کر لیا ۔۔۔ عدت کی مدت میں نے اماں کے ساتھ ساہیوال میں گزاری۔ سلمیٰ سلیم کے ساتھ لاہور چلی گئی۔ وہاں سے سلیم اسے لندن لے گئے۔ میری عدت پوری ہو گئی تب وہ لوگ لندن گھوم آئے۔ پھر سلمیٰ مجھے اور اماں کو لینے ساہیوال آئی۔ اس کا رنگ روپ دو ہی دنوں میں نکھر آیا تھا۔ سلیم کی دی ہوئی محبت اور آسائشوں نے اسے گلاب کی طرح تر و تازہ کر دیا تھا۔ اماں اور میں اس کے ساتھ [illegible] میں آ گئے۔ اماں کا چھ ماہ بعد انتقال ہو گیا مگر وہ اس احساس سے [illegible] تھیں کہ میرا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ بظاہر سلمیٰ گھر کی مالک ہے مگر سلیم [illegible] اختیارات مجھے پہلے کی طرح دیئے ہوئے ہیں۔ گھر کے اخراجات میرے ہاتھ میں ہیں۔ سلمیٰ ہر کام مجھ سے پوچھ کر کرتی ہے۔ سلیم پہلے کی طرح [illegible] ہر معاملے میں مشورہ پوچھتے ہیں۔ میرا گھر میں ویسا ہی احترام ہے [illegible] تھی ۔۔۔ اور پھر سلمیٰ نے ہمارا برسوں کا خواب پورا کر دیا ۔۔۔ وہ سال بعد بیٹے کی ماں بن گئی اور پہلے ہی دن وہ بچہ اس نے میری جھولی میں ڈال دیا کہ آپا میری ہر خوشی آپ کی ذات سے ہے۔ اسے [illegible] نہیں اپنا بیٹا سمجھئے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ [illegible] کے اعتبار سے وہ مجھے اپنے ہی گوشت پوست سے [illegible] ہے۔ وہ ڈھائی برس کا ہے۔ سلمیٰ کو [illegible] اور مجھے امی کہتا ہے۔ سلیم اب [illegible] میرا فیصلہ ہر اعتبار سے مناسب تھا۔ [illegible] جسمانی [illegible] چکا ۔۔۔ اور خدا گواہ ہے کہ انہوں نے [illegible] کبھی نہیں دیکھا۔ وہ اب بھی مجھ سے [illegible] ان کے انداز گفتگو میں کبھی [illegible] لائیں گے مجھے اس میں برابر کا شریک کرتے ہیں۔ [illegible] میں ہے جیسا جی چاہے خرچ کروں [illegible] ہے۔ میری بدولت [illegible] نے اس [illegible] بھر دیا۔ اور میری اپنی زندگی بھی برباد ہونے سے بچ گئی۔

صفیہ صدیقی۔ لاہور

ثروت چوہدری

اک روز میں نے اس سے کہا تھا۔
تمہارے سینے سے لگ کر میں اپنے سارے غم بھول جاتی ہوں۔
مجھے اپنے سینے میں چھپا لو
وہ اٹھ کر میرے قریب آیا۔ اور قریب ---- اور قریب ---
میں مدہوش ہو گئی ---------
جب میں ہوش میں آئی تو ----------
میرا بیش قیمت لاکٹ غائب تھا۔
جس میں قیمتی نگینہ جڑا ہوا تھا۔
میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے میرا لاکٹ واپس نہیں کر سکتا
اور میں --------
چاہنے کے باوجود دنیا کی کسی بھی عدالت میں
دعوا دائر نہیں کر سکتی
کیونکہ ؟
میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

الیاس سیتاپوری کا

ایک ایسے مجاہد کی ایمان پرور داستان
جس نے تن تنہا اس حکومت کا مقابلہ کیا
جس کا سورج کبھی غروب نہیں ہوتا تھا

گنگادین بالکل مختلف مزاج اور طبیعت کا لڑکا تھا۔ طبیعت میں
ایک ایسی سنجیدگی پائی جاتی تھی جو جوانی میں بُردباری کہلاتی ہے۔ اس کی کالی
رنگت میں [illegible] کچھ زیادہ جاذبِ نظر نہیں تھے۔ وہ تعلیم حاصل کر رہا تھا
اور وہ اپنے کلاس ہی میں نہیں پورے اسکول کے لڑکوں میں ہر دل عزیز تھا
اس میں معلوم نہیں کیا بات تھی جو ہر دیکھنے والے کو اس کی طرف مائل کر دیتی۔
اس کے استاد بھی اس سے مرعوب سے ہو جاتے۔

گنگادین کا ماضی ایسا نہیں تھا جس سے وہ خود لاعلم ہوتا۔ اسے اپنے
بارے میں بے ترتیبی کے ساتھ بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا
کہ اسے گنگا کے سینے پر ایک کشتی میں سے لایا گیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ
اس کے ماں باپ جو کوئی بھی رہے ہوں لیکن یہ یقینی بات تھی کہ انھیں انگریزوں
نے ظلم و تشدد سے ہلاک کر دیا تھا۔ اسے اس کے نام کی وجہ سے اجنبی ہندو
سمجھتے لیکن اسے نہ تو ہندو کہلانے میں خوشی محسوس ہوتی نہ مسلمان سمجھے جانے
سے خوش ہوتا، وہ جو کچھ بھی تھا اس سے مطمئن تھا۔

اسے کھیل کود سے دلچسپی نہیں تھی، لیکن جنگ اس کا خاص مشغلہ تھا
وہ اپنے ساتھیوں کو دو ٹولیوں میں تقسیم کر دیتا۔ ایک ٹولی کا جرنیل خود بنتا اور دوسری
کا کسی اور لڑکے کو بنا دیتا اور مقابلہ شروع ہو جاتا۔ یہاں تک کہ ہر مقابلے
میں اپنی مخالف ٹولی کو شکست دے دیتا۔

اس کے ساتھ ہی اس میں ایک خاص بات بہت نمایاں طور پر
محسوس کی جا سکتی تھی۔ اسے جہاں کہیں انگریز نظر آتا اس کے چہرے پر نفرت
سے کھنچاؤ پیدا ہو جاتا۔

پورا اسکول پک نک منانے ایک پہاڑی علاقے میں پہنچا ہوا تھا
پہاڑی کی دامن میں پہنچ کر استادوں نے لڑکوں کو ان کی مرضی پر چھوڑ دیا۔
گنگادین کی بے چین اور انقلابی طبیعت نے فوراً ایک منصوبہ تیار کر لیا۔ اس
نے لڑکوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ اس موقع پر چند لڑکوں نے اس کے
زیرِ کمان کام کرنے سے انکار کر دیا۔ گنگادین نے نہایت نرمی سے انھیں
اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ شوق سے دوسری ٹولی میں شامل ہو
سکتے ہیں۔

جب دونوں ٹولیاں ایک دوسرے سے جنگ کرنے کے لیے تیار
ہو چکیں تو جنگ سے پہلے گنگادین نے ان دونوں کے سامنے ایک انقلابی
اعلان کر دیا۔ اس کا اعلان نہایت مختصر لیکن نہایت دور رس تھا۔ اس
نے کہا۔

"دوستو! یہ جنگ حریت پسندوں اور سامراجیوں کے درمیان ہوگی
میری جماعت کا حریت پسندوں سے تعلق ہے اور میرا مخالف گروہ سامراجیوں
یعنی انگریزوں کا ٹولہ ہے۔ ہم دونوں کو اپنی پوری صلاحیتوں اور چالاکیوں سے
ایک دوسرے کا مقابلہ کرنا ہے، کوئی کسی کے ساتھ رعایت نہیں کرے گا۔"

بظاہر تو یہ اتنا اہم اعلان نہیں تھا لیکن اس پر گنگادین نے عمل
جس طرح کیا وہ بہت خوفناک تھا۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے [illegible]
بے دردی اور سختی سے اپنے تمام زمانہ انگریز دشمنوں کا مقابلہ کیا اور اس کے
مخالفوں کے لیے یہ [illegible] تنگ اور پریشان کن ثابت ہوا۔ گنگادین نے
اپنی جماعت کو پہاڑی ٹیلوں میں کچھ اس طرح پھیلا دیا کہ سامراجی ان کے گھیرے
میں آ گئے اور انھوں نے گوریلوں کی طرح اپنے دشمنوں پر تاخت و تاراج
شروع کر دی۔ گنگادین کے ساتھی کبھی داہنی طرف سے کبھی بائیں جانب سے
کبھی پیچھے سے اور کبھی آگے سے اچانک حملہ آور ہو جاتے۔ ان کے غیر متوقع
اور تابڑ توڑ حملوں سے دشمن بدحواس ہو گیا۔ پورا علاقہ برف سے ڈھکا ہوا
تھا۔ گنگادین اور اس کے ساتھیوں نے برف کے گولوں سے دشمن کے ہوش و
حواس اڑا دیے اور وہ حملوں کی تاب نہ لا کر راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو
گیا۔ گنگادین نے اپنے آدمیوں کے ساتھ ان بھگوڑوں کا پیچھا کیا اور ایک
تنگ درّے میں دشمنوں کے کمانڈر کو گرفتار کر لیا۔ نفسیاتی طور پر اس کمانڈر کا
ڈر کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ اس کی نفسی کیفیات یہ بتا رہی تھیں کہ گویا وہ
واقعی شکست خوردہ انگریز کمانڈر تھا اور گنگادین حریت پسندوں کا لیڈر جس
نے فاتح کی حیثیت سے اسے گرفتار کر لیا تھا۔ وہ گڑگڑاتا ہوا گنگادین کے
قدموں میں گر گیا۔ "رحم [illegible] گنگادین رحم کرو [illegible]"

گنگادین کو اس گڑگڑاتے ہوئے لڑکے میں کسی انگریز کا چہرہ [illegible]
اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور اعصاب میں کھنچاؤ پیدا ہو گیا۔ گنگادین کی آنکھیں جوش
غضب سے ابل پڑیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی۔ اس نے لکڑی
فضا میں بلند کی اور پوری قوت سے اپنے دشمن کمانڈر کی پٹائی شروع کر دی۔
لڑکے کی چیخ نکل گئی۔ گنگادین کے ساتھی لڑکے کی ہر چیخ پر [illegible] رہے تھے
لیکن جب اس نے یہ محسوس کیا کہ گنگادین اپنے دشمن کمانڈر کو [illegible]
کر دینے کے درپے ہے تو اس نے بروقت [illegible] روک دیا۔ وہ گنگادین
کے [illegible] سے [illegible] بہت
سے دوسرے لڑکے بھی پہنچ گئے۔ استاد بھی آ گئے اور جب انھیں اصل
واقعے کا علم ہوا تو انھوں نے زخمی لڑکے کو فوراً [illegible] کر دیا اور [illegible]
بعد پکنک منائے بغیر ہی سب لڑکے واپس ہو گئے۔

●●

اس واقعے کا بڑا چرچا ہوا۔ زخمی لڑکے کے باپ اور [illegible]
نے بڑا شور و غل کیا مگر اسکول کے ماسٹروں نے بڑی [illegible] سے
معاملے کو چھپانے کی [illegible] لیکن [illegible]
کس طرح گنگادین کے انگریز دشمن جذبے کی [illegible]
آیا اور اس نے نہایت [illegible] اسکول [illegible]
کی اس میں [illegible] اور گنگادین [illegible]

پیچ بھینچ کر رہ جاتا مگر اُف نہ نکالتا۔

■■

بنگلے کے صدر دروازے سے بگھی اندر داخل ہوئی پہرے پر موجود سپاہی مستعد ہو کر کھڑے ہو گئے۔ بگھی سے جوزیفائن کا اڑتالیس پچاس سالہ انگریز باپ اور تیس چالیس سالہ ہندوستانی ماں یکے بعد دیگرے نیچے اترے۔ جوزیفائن نے دوڑ کر ان کا استقبال کیا۔

جوزیفائن کا باپ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ بولا "بیٹی! آج بڑا غضب ہو گیا!"

جوزیفائن نے حیرت سے پوچھا "یعنی؟ کیا ہوا کیا؟"

جوزیفائن کے باپ نے کہا "اندر چلو، وہاں بتاؤں گا۔"

اس کے بعد یہ تینوں اندر چلے گئے۔ گنگادین سے ملحقہ کمرے میں۔ یہ لوگ گنگادین سے اتنے قریب تھے کہ ان کی ساری باتیں گنگادین بآسانی سن سکتا تھا۔

جوزیفائن کے باپ نے کہا "بیٹی! ایک خطرناک باغی پولیس کو مطلوب ہے۔ پولیس نے اسے زخمی کر دیا ہے لیکن وہ چالاک شخص بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ پولیس خون کے قطرات کی مدد سے تلاش کر رہی ہے۔ پولیس کہتی ہے کہ خون کے قطرات ہمارے بنگلے کی پچھلی چہار دیواری تک ملتے ہیں اس کے بعد نہیں ملتے۔ پولیس بنگلے کے پچھلے حصے میں داخل ہو کر باغی کی جستجو کر رہی ہے۔"

جوزیفائن گھبرا گئی۔ اُس کی اِس گھبراہٹ کو باپ نے بھی محسوس کر لیا۔ پوچھا "تم کیوں گھبرا رہی ہو؟"

جوزیفائن نے بات بنائی "باغی ہمارے بنگلے کی پچھلی دیوار تک آیا تھا! اُف میرے خدا!"

باپ نے تسلی دی، بولا "تم مت گھبراؤ۔ تم نے یہاں کسی کے چلنے کی آواز تو نہیں سنی؟"

"نہیں!" جوزیفائن نے کہا "تعجب ہے کہ میں نے کوئی آواز نہیں سنی۔"

پیچھے پولیس پارٹی خون کے قطرات تلاش کرتی پھر رہی تھی۔ اس نے جوزیفائن کے باپ کو مطلع کیا کہ "باغی بنگلے کے پچھلے حصے میں داخل ہوا ہے!"

جوزیفائن کے باپ نے کڑک کر حکم دیا "تب پھر اسے تلاش کرو!"

لیکن پولیس اس گھنی جگہ میں گنگادین کو کہاں تلاش کرتی، اس نے ایک ایک درخت کے اوپر ٹارچ مار کے خوب اچھی طرح دیکھ لیا لیکن انھیں گنگادین نہیں ملا۔

جوزیفائن کے باپ نے پولیس پارٹی کو حکم دیا "تم سب رات بھر یہیں موجود اور مستعد رہو گے!" پھر بیٹی سے کہا "اور جوزیفائن تم بھی اپنی خواب گاہ کے دروازے خوب اچھی طرح بند کر کے سونا کیونکہ باغی کا کوئی بھروسا نہیں کہ کب اور کہاں سے نمودار ہو جائے؟"

***

جوزیفائن کے لیے وہ رات بڑی قیامت کی ثابت ہوئی۔ وہ گنگادین سے ذرا بھی الگ نہ رہنا چاہتی تھی اور والدین سے اپنی خواب گاہ میں نہ سونے کا کوئی معقول بہانہ بھی نہ کر سکتی تھی۔ آخر جب وہ اپنی خواب گاہ میں جانا پڑا۔ اس نے خواب گاہ کے دروازے خوب اچھی طرح بند کیے اور ہندوستانی مسہری پر چڑھ کر بیٹھ گئی، کچھ دیر خاموش رہ کر ادھر ادھر کی آہٹیں سنتی رہی پھر ایک طرف جھک کر چادر اوپر اٹھائی اور سرگوشی میں کہا "اب آ جاؤ!"

گنگادین اتنی احتیاط اور ہوشیاری سے مسہری سے نکلا کہ ذرا سی بھی آہٹ نہ سنائی دی۔ جوزیفائن تھوڑی دیر چپ چاپ اس کی شکل دیکھتی رہی پھر اس کے زخمی ہاتھ کو دیکھ کر کچھ بے چین ہو گئی سرگوشی میں بولی "افسوس کہ میں اس وقت تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی؟"

گنگادین نے بھی اسی طرح سرگوشی میں رک رک کر کہا "میری تمہاری یہ مدد کیا کم ہے کہ تم نے مجھے اپنی خواب گاہ میں چھپا لیا!"

اچانک انھیں باہر کسی قسم کی آہٹ محسوس ہوئی دونوں نے سکوت اختیار کر لیا۔

جوزیفائن نے کہا "تم ایک بار پھر مسہری کے نیچے چلے جاؤ میں ذرا باہر کا جائزہ لے کر آتی ہوں۔"

وہ پھر مسہری کے نیچے [illegible] اس کا باپ سپاہیوں کے ساتھ گنگادین کی تلاش [illegible] نے اپنی خواب گاہ کے دروازے بند [illegible] خواب گاہ میں دوبارہ داخل ہوئی اور اندر سے بند کر کے گنگادین کو مسہری کے نیچے سے دوبارہ باہر نکال لیا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مسہری پر بیٹھ جانے کا حکم دیا اور خود بھی بیٹھ گئی۔

جوزیفائن نے [illegible] پوچھا "کیا تمہیں یہ معلوم ہے کہ [illegible] سپاہیوں سے تمہاری تلاش ہو رہی ہے؟"

گنگادین نے جواب دیا "ہاں معلوم ہے [illegible] گفتگو بھی سن لی ہے۔" [illegible] "تمہارے باپ کا عہدہ کیا ہے؟"

"میرے باپ کا عہدہ؟" جوزیفائن نے سوال دہرایا "کمشنر ہے!"

گنگادین کو ایسا محسوس ہوا جیسے [illegible]

جنھیں انگریزوں سے چھین لینے والے اسلحہ جات کا ذخیرہ کیا جا رہا تھا، سامان جنگ اور معروفیات میں بھی اسے جوزیفائن کا خیال آتا رہا لیکن جب وہ یہ سوچتا کہ وہ ایک انگریز کی بیٹی ہے تو اس کے چہرے کی رنگت بدل جاتی۔

ایک دن صبح آٹھ نو بجے ایک گھوڑا گاڑی ایک پرچون کی دکان پر آ کر رک گئی۔ اس پر جوزیفائن بیٹھی تھی۔ اس نے کوچوان سے کہا: "دکان دار سے معلوم کرو، یہاں امام دین کہاں رہتا ہے؟"

کوچوان کے پوچھنے پر، لڑکی سے مرعوب دکان دار اپنی گدی سے اٹھا اور گھوڑے کے آگے آگے چل کر امام دین کے گھر تک پہنچا دیا۔ جوزیفائن گاڑی سے اتر کر اندر چلی گئی۔ یہ ایک بد ترین اجڑا ہوا مکان تھا، گھر میں کسی عورت کے نہ ہونے سے بڑی بے ترتیبی پائی جاتی تھی۔ امام دین ایک جھلنگے پر پڑا کھانس رہا تھا۔ اس نے اپنے سامنے ایک نوجوان اجنبی لڑکی کو دیکھا تو چکرا گیا، گھبرا کے اٹھ بیٹھا اور بے بسی سے مسکرا کر، سہمے ہوئے انداز میں پوچھا: "بیٹی! تمہیں کس سے ملنا ہے؟"

جوزیفائن نے پوچھا: "گنگا دین تمہارا ہی بیٹا ہے؟"

امام دین کے چہرے پر اداسی دوڑ گئی۔ وہ اپنے جھلنگے پر دوبارہ دراز ہو گیا۔ حسرت اور نفرت کے ملے جلے لہجے میں بولا: "گنگا دین میرا بیٹا نہیں ہے، ہاں میں نے اسے پالا ضرور ہے!"

جوزیفائن نے نرمی سے کہا: "بڑے میاں! تم گھبراؤ نہیں، ڈرو مت، خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

امام دین نے چڑچڑے انداز میں کہا: "میں ڈروں کیوں نہیں، صبح شام پولیس تنگ کرتی رہتی ہے۔ میری بس اتنی سی غلطی تھی کہ میں نے اسے لاوارث سمجھ کے پال لیا تھا۔ میں سمجھا تھا وہ بڑا ہو کر میرا سہارا بنے گا لیکن وہ تو میرے لیے مصیبت بن گیا۔ اب وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے اس کا میری ذات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی میں نے پولیس سے کہہ دیا ہے اور یہی تم سے بھی کہہ رہا ہوں۔"

جوزیفائن نے پوچھا: "کیا وہ یہاں آتا جاتا ہے؟"

"نہیں، کبھی نہیں۔" بڈھے میاں نے گھبرا کے جلدی جلدی کہا: "وہ یہاں کبھی بھی نہیں آتا اور اگر اب وہ کبھی غلطی سے یہاں آ بھی جائے گا تو میں اسے پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

اس کے بعد امام دین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، بولا: "میں نے اسے دو سال کی عمر سے پال پوس کر جوان کیا ہے اور میں اسے اپنے بیٹے کی طرح چاہتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ وہ حکومت کے خلاف ہنگامے کرتا پھرے۔"

جوزیفائن نے کہا: "بڑے میاں! میں یہاں اس لیے آئی تھی کہ گنگا دین کو یہ پیغام پہنچا دوں کہ وہ اب بھی تخریبی کاموں سے باز آ جائے اور توبہ کر کے خود کو سرکار کے حوالے کر دے تو میں اس کی ساری اگلی پچھلی غلطیاں سرکار سے معاف کرا دوں، اگر وہ آ جائے تو تم اسے اپنی طرف سے سمجھاؤ کہ انگریز دشمنی سے اسے کچھ بھی نہ ملے گا اور ایک نہ ایک دن گرفتار ہو کر وہ گولی سے اڑا دیا جائے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہارا بیٹا اور ایک بہادر نوجوان اپنے اس انجام کو پہنچے۔"

بڑے میاں نے اپنی چندھی ہوئی کمزور آنکھوں سے جوزیفائن کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی، بولے: "بیٹی تم ہو کون؟ تمہارا نام؟"

"جوزیفائن۔" اس نے کہا: "تم گنگا دین سے کہہ دینا، جوزیفائن آئی تھی اور یہ پیغام دے گئی ہے۔"

امام دین ایک بار پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جھلنگے سے اتر کر ایک ٹوٹا پھوٹا مونڈھا اٹھا لایا، بولا: "بیٹی! اس پر بیٹھو، کچھ کھاؤ پیو گی؟ میں لاؤں؟ پھر شرمندہ ہو کر بولا: "گھر والی ہوتی تو تمہاری خاطر تواضع کرتا، بیٹی! عورت کے بغیر گھر گھر نہیں رہتا، جہنم بن جاتا ہے۔"

جوزیفائن واپس جاتی ہوئی بولی: "میں بیٹھوں گی نہیں پھر کبھی آؤں گی۔ اس دوران میں اگر گنگا دین آ جائے تو اس سے میری باتوں کا جواب ضرور رکھنا، میں کسی دن آ کے معلوم کر لوں گی۔"

امام دین حیرت اور بے بسی سے جوزیفائن کو دیکھتا رہا، وہ باہر نکل گئی۔

یہ بالکل اتفاق کی بات تھی کہ جوزیفائن جیسے ہی باہر نکلی، اسی وقت ایک لمبی چوٹی والا ہندو پنڈت امام دین کے دروازے پر پہنچا۔ اس نے صرف ایک دھوتی پہن رکھی تھی اور دھوتی کا اوپری حصہ سر پر ڈال رکھا تھا۔ ایک کان میں جنیو پھنسا ہوا تھا۔ اس نے جوزیفائن کو غور سے دیکھا، جوزیفائن بھی ٹھٹکی اور پنڈت جی کو گہری نظروں سے گھورا۔ پنڈت جی پیچھے ہٹ کر اندر چلے گئے۔ وہ امام دین کے قریب جا کھڑے ہوئے اور دریافت کیا: "بابا! گنگا دین کہاں ملے گا؟"

بابا کو غصہ آ گیا، جھنجلا کر بولے: "گنگا دین گنگا دین، جسے دیکھو گنگا دین ہی کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔ گنگا دین نہ ہوا مصیبت ہو گیا۔ میں کیا جانتا گنگا دین کہاں ملے گا؟"

پنڈت جی نے ہنس کر کہا: "بابا! میں نے گنگا دین کا پتہ پوچھا تھا، تمہیں گالی تو نہیں دی تھی۔ تم بلا وجہ مجھ پر ناراض ہونے لگے۔"

امام دین نے جواب دیتے ہوئے کہا: "ابھی ابھی ایک لڑکی آئی تھی۔" وہ سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بولا: "کچھ پہلے سا ہی پتہ پوچھ رہی تھی، شاید جلدی میں یاد نہیں رہا کیا بتایا تھا۔"

چلا۔ آخر وہ گھوڑے سے اُتر پڑا۔ سامنے ہی ایک چھوٹا سا چشمہ بہہ رہا تھا۔ یہ
چشمے پر پہنچا اور وضو کرنے لگا۔ وضو کر چکنے کے بعد اسے پیاس سی محسوس
ہوئی۔ اس نے دونوں ہتھیلیوں اور انگلیوں کو چلو بنا کے اس میں پانی لیا
اور حلق کے نیچے اتار گیا۔ پھر وہ وہاں سے ہٹ کر سبزے
پر قبلہ رو کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگا۔ جب نماز سے فارغ ہوا تو اسے اپنے
چاروں طرف رات کی سیاہی کی چادر پھیلتی نظر آئی۔ اس نے ایک بار
پھر اپنے آس پاس متجسس نگاہوں سے کچھ دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی لیکن
کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے چیخ کر کہا: "گنگا دین! تم کہاں ہو؟ میں تمہاری
تلاش میں شمال مغربی صوبے سے چلا آ رہا ہوں!"

لیکن اسے اپنے اس سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔ آخر اس نے
ایک بار پھر چیخ کر کہا۔ "کیا میں غلط جگہ تو نہیں آ گیا؟ گنگا دین! مجھے تمہاری
مدد کی ضرورت ہے۔ میں بھی ایک محبِ وطن ہوں اگر تم میری آواز سن
رہے ہو تو بے دھڑک میرے سامنے آ جاؤ!"

اسی وقت اس اجنبی کو اپنی پشت میں کوئی چیز چبھتی ہوئی محسوس
ہوئی۔ اس نے گھبرا کر گھوم کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک ایسا شخص
دیکھا جس کے ہاتھ میں رائفل تھی اور اس نے رائفل کی نال اس اجنبی کی
پشت میں چبھو رکھی تھی۔ یہ سرفراز تھا۔ اس نے پوچھا: "تم گنگا دین سے
کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

"یہ باتیں میں تمہارے سامنے نہیں کروں گا۔ مجھے گنگا دین کے پاس
لے چلو!"

سرفراز نے کہا: "میں اپنا اطمینان کیے بغیر تمہیں گنگا دین کے پاس
نہیں لے جا سکتا!"

"تم کس طرح اطمینان چاہتے ہو؟"

"کیا تم اپنی ساری باتیں مجھے بتانا پسند کرو گے؟"

"کیوں نہیں۔ بے شک۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

اس درمیان گنگا دین بھی اپنی کمین گاہ سے باہر نکل آیا اور ایک
دم اس اجنبی کے سر پر جا پہنچا، بولا: "میں گنگا دین ہوں، کہو، تم میرے
پاس کیا لینے آئے تھے؟" پھر سرفراز سے کہا: "تم اپنی رائفل کی نال ہٹا لو!"

سرفراز نے حکم کی تعمیل کر دی لیکن ساتھ ہی اس نے اجنبی کا
پستول اپنے قبضے میں کر لیا۔

اجنبی نے پوچھا: "کیا تم واقعی گنگا دین ہو؟"

سرفراز نے ترشی سے کہا: "تمہیں یقین کیوں نہیں آتا؟"

اجنبی ہنس دیا، بولا: "میں ایک طویل سفر طے کر کے آ رہا ہوں اور
یہ طویل سفر میں نے گنگا دین سے ملنے کی خاطر کیا ہے۔"

گنگا دین نے قمیص کے نیچے کمر کے گرد لپٹا ہوا کالا کپڑا کھول کر
سرفراز کی طرف پھینکا۔ سرفراز نے اپنی رائفل گنگا دین کے حوالے کر دی اور
پھرتی سے کالا کپڑا پٹی کے طور پر اجنبی کی آنکھوں پر باندھ دیا۔ اجنبی نے
بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ پھر یہ دونوں اسے خوب گھما پھرا کر ایک کھوہ
میں لے گئے۔ اس کھوہ میں داخلے کا راستہ نہایت مختصر تھا لیکن اندر
کافی دور چلنے کے بعد کھوہ وسیع ہو گئی تھی۔ جگہ جگہ دونوں طرف چھوٹی چھوٹی
شمعیں روشن تھیں جن کی مدھم روشنی میں یہ گمان ہوتا تھا گویا چلنے والے
پاتال میں اترتے چلے جا رہے ہیں۔ پھر یہ لوگ اس پاتال سے گزر کر ایک
دوسری ایسی کھوہ میں داخل ہو گئے جو بہت سارے درختوں میں گھری ہوئی
تھی۔ اس کھوہ میں دھیمی دھیمی شمعیں روشن تھیں اور اس مدھم روشنی میں
گنگا دین کے ساتھی آسیبی سایوں کی طرح چل پھر رہے تھے۔ یہاں پہنچ کر
گنگا دین اور سرفراز خود بھی بیٹھے اور اس اجنبی کو بھی بٹھا لیا، اس کی پٹی
کھول دی گئی۔ گنگا دین نے تحکمانہ انداز میں کہا: "ہاں اب بتاؤ
کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو اور مجھ سے کیا کام ہے؟"

اس شخص نے اپنے آس پاس کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔
سرفراز نے کہا۔ "ادھر اُدھر دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں، کام کی باتیں کرو
اور رات گزار کے چلتے پھرتے نظر آؤ۔"

گنگا دین نے کہا: "اجنبی! اگر تم انگریزوں کے جاسوس ہو اور
یہاں ہماری خفیہ پناہ گاہوں کی ٹوہ میں آئے ہو تو یہ بڑی شرم کی بات
ہے کیونکہ تم ہندوستانی ہو اور تمہیں اپنے وطن اور محبِ وطن ساتھیوں
کے ساتھ غداری نہیں کرنا چاہیے۔"

اجنبی نے جواب دیا: "گنگا دین! میں غدار نہیں ہوں، میں بھی
تمہاری ہی طرح محبِ وطن ہوں۔ ہمارا صوبہ انگریز دشمنی کی آگ میں جل رہا
ہے۔ ہمارے صوبے کے فوجی بھی ہمارے ساتھ ہو گئے ہیں۔ اب تحریک
آزادی کو کچلنے کے لیے شمالی ہند کی فوج استعمال کی جائے گی۔ ہم تم سے
بس اتنی سی مدد چاہتے ہیں کہ اس راستے سے جو بھی انگریزی مدد گزرے،
اسے تباہ و برباد کر دیا جائے اور یہ سب کچھ اس طرح ہو کہ انگریز اسی غلط
فہمی کا شکار ہو جائے کہ شمالی ہند میں بھی بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی ہے اور
یہاں کی فوج کو ہمارے صوبے میں بھیجنا زبردست فوجی اور سیاسی غلطی ہو
گی۔ اگر ہم انگریز کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر سکے تو یقین کرو ہم اپنے صوبے
میں سے انگریز کو بہت جلد نکال باہر کریں گے اور مستقبل انگریز کے وجود
سے پاک ہو جائے گا۔"

گنگا دین نے فکر مند لہجے میں کہا: "ہمارے پاس آدمیوں کی کمی
ہے اور کام بڑا اہم ہے لیکن ہم پھر بھی جو کر سکتے ہیں ضرور کریں گے۔"

اس شخص نے کہا "ضرور کریں گے نہیں بلکہ قسمیں یہ کام جس طرح
میں نے بتایا، اسی طرح انجام دینا ہے اور میں یہ حتمی وعدہ لیے بغیر یہاں
سے واپس نہیں جاؤں گا۔"
گنگا دین آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگا۔
اس رات وہ سب دیر تک باتیں کرتے رہے اور دوسرے دن
صبح جب وہ واپس ہوا تو گنگا دین سے یقینی وعدہ لے چکا تھا۔

--

فوج کے ذمہ دار ہندوستانی افسروں کو الگ الگ ایک مراسلہ
موصول ہوا۔ اس مراسلے میں گنگا دین نے ان سے وطن اور مذہب کے نام
پر یہ اپیل کی تھی کہ وہ انگریزوں کا ساتھ چھوڑ دیں اور جنگ آزادی میں
اگر اس کا ساتھ نہیں دے سکتے تو اس کے مقابلے پر بھی نہ آئیں۔ ان مراسلوں
میں گنگا دین نے اپنا نام دلیری سے استعمال کیا تھا۔ انگریزوں کو جب اس
کا علم ہوا تو انہوں نے گنگا دین کے اس اقدام کو بدترین بغاوت کا نام
دیا، فوج میں انتشار پھیلانے اور بغاوت پھیلانے کا مجرم حکومت نے
گنگا دین اور اس کے اس اقدام کو ملک کا غدار اور باغی قرار دے دیا۔ گنگا
دین کی زندہ یا مردہ گرفتاری پر پچاس ہزار کی رقم کا اعلان کر دیا۔ اخباروں
اور پوسٹروں میں گنگا دین کی تصویریں چھاپی گئیں۔ اعلان میں ہر اس
شخص کو بھی باغی اور مجرم قرار دیا گیا جو گنگا دین یا اس کے کسی ساتھی کو
پناہ دینے یا کسی قسم کی اعانت پہنچانے کا مرتکب ہوگا۔
اب باقاعدہ جنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ جھڑپیں شروع ہو گئیں
اور انگریزوں پر مختلف سمتوں سے حملے ہونے لگے۔ گنگا دین نے اپنے
ساتھیوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ ایک حصہ انفرادی تباہ کاریوں
میں مشغول ہو گیا اور دوسرے نے اجتماعی جنگ شروع کر دی۔ انفرادی جنگ
دھماکوں سے لڑی جانے لگی اور اجتماعی جنگ گوریلا وار کے طریقے پر۔ چترال
شمالی ہند سے کئی رجمنٹیں شمال مغربی صوبے کو روانہ کی جا رہی تھیں۔ ان
کا راستہ کوہستانی سلسلوں کے دامن سے گزرتا تھا۔ یہ فوجی بڑی بڑی
گاڑیوں اور جیپوں میں سفر کر رہے تھے۔ ان کے درمیان میں اسلحہ جات کا
ذخیرہ ساتھ چل رہا تھا جس کی بڑی حفاظت کی جا رہی تھی۔ فوجیوں کے
بالکل پیچھے ان کا دوسرا سامان تھا جو گھوڑا گاڑیوں اور خچروں وغیرہ پر بار تھا۔
ایسا لگتا تھا جیسے فوجی کسی ملک کو تسخیر کرنے جا رہے ہوں۔ جب رات سر پر
آئی تو سفر رک گیا اور ان لوگوں نے کھلے میدان میں پڑاؤ کیا۔ پڑاؤ کے
چاروں طرف آگ روشن کر دی گئی تاکہ اس کی روشنی میں دور دور سے
خطرات کو دیکھا جا سکے۔ علاقہ چونکہ جنرل نیفالن کے باپ کی حدود میں تھا
اس لیے وہ بھی پولیس کی بھاری جمعیت لیے قرب و جوار کی نگرانی اور
چوکسی میں مشغول تھا۔ رات کے پچھلے پہر فوجیوں کے درمیان مختلف حصوں
میں یکے بعد دیگرے چار دھماکے ہوئے۔ جس شان دھماکوں نے قیامت برپا کر دی۔
بدحواس فوجی ادھر ادھر بھاگنے لگے جیپوں کے پہیے اڑ گئے۔ چار دھماکوں
کے بعد ایک دھماکا بارودی اسلحہ میں ہوا اور اس دھماکے نے تباہی مچا
دی۔ بہت سے فوجی جان بچانے کی کوشش میں پڑاؤ کے چاروں طرف
دہکتی ہوئی آگ میں پھاند گئے۔ کمشنر پولیس نے فوج کے سب سے پچھلے
اور محفوظ حصے کو گھیرے میں لے لیا۔ یہ وہی حصہ تھا جو قلیوں اور باربردار
چیزوں پر مشتمل تھا۔ جو بدحواس اور افراتفری کے شکار فوجی کسی نہ کسی طرح
نکلنے میں کامیاب ہو گئے انہیں کوہستانی سلسلوں میں چھپے ہوئے
گنگا دین کے آدمیوں نے اپنی باڑھ پر رکھ لیا۔ کمشنر پولیس کیونکہ جنگل
اور ناہموار مقاموں میں چھپے ہوئے ان حریفوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا
اس لیے اس نے باعزت پسپائی اختیار کی۔ اس نے قلیوں اور مزدوروں
پر مشتمل فوجی حصے کو اپنی حراست میں لے کر راہ فرار اختیار کی۔ چند گھنٹوں
میں اس جگہ کی یہ حالت ہو گئی کہ قبرستان کا گمان ہونے لگا۔ زخمیوں
اور مرنے والوں کی چیخیں زور شور سے بلند ہوتیں اور آہستہ آہستہ رات
کے گہرے سکوت میں ڈوبتی چلی گئیں۔
دوسرے دن صبح جب فوج اور پولیس کی بھاری جمعیتیں اس
حصے کے سامنے پہنچیں تو وہاں کا دردناک سماں ان سے دیکھا نہ گیا۔
ہر طرف جلی، ادھ جلی، برباد گاڑیاں تھیں، ادھر ادھر بکھری لاشوں کا ڈھیر لگا
تھا۔ دھماکوں میں اڑنے والوں کی لاشیں اور ان کے اعضا اس طرح
بکھرے پڑے تھے گویا ان کی آسمان سے بارش ہوئی تھی۔
پولیس کمشنر ایک فوجی کرنل کے ساتھ فوجی دستے کو لیے ہوئے
ان کوہستانی سلسلوں میں داخل ہو گیا۔ اس نے جگہ جگہ انسانی قدموں
کے نشان دیکھے جن سے اسے یہ یقین ہو گیا کہ رات گنگا دین کے گوریلے
وہاں موجود تھے۔ اس نے پہاڑی غاروں میں گشت پسند نہیں کیا کیونکہ
اسے یقین کی حد تک یہ شبہ تھا کہ کہیں ان کے داخلے کے بعد اس غار کو
بھی دھماکے سے نہ اڑا دیا جائے لیکن وہاں یہ فیصلہ ضرور کر لیا گیا کہ ان
چٹانوں اور غاروں کو اس جرم کی سزا بھگتنا ضرور پڑے گی۔ اس نے اس
غار کے دہانے پر جس میں گنگا دین اور اس کے ساتھیوں کی موجودگی
مشتبہ تھی، ایک ضرب کا نشان بنا دیا جس کا مطلب تھا اسے فاتح
نے تباہ و برباد کر دیا۔
گنگا دین اور اس کے ساتھیوں کی یہ ضرب اتنی دہشت ناک اور
لرزہ خیز ثابت ہوئی کہ انگریزوں اور ان کے وفاداروں میں تہلکہ مچ گیا۔
اس غار کے دہانے کے سامنے میدان میں لاؤڈ اسپیکر [illegible]

پھر ریڈیو پر یہ فرمان سنایا گیا کہ "او غدارو! تم نے جو کچھ کیا ہے اس کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اگر اس سزا سے بچنا چاہتے ہو تو خود کو خاموشی سے حکومت کے حوالے کر دو، حکومت تمھیں معاف کر دے گی۔"

گنگا دین کے ساتھیوں کو بطور خاص ترغیب دی گئی۔ علان میں کہا گیا "ہم کو اگر گنگا دین سرکش ہے باغی ہے اس کے ورغلانے میں مت آؤ، چپ چاپ پہاڑیوں سے نکل کر نیچے آجاؤ، تمھیں معاف کر دیا جائے گا۔"

پھر کئی دن اسی میدان میں جگہ جگہ پھانسیاں گاڑی گئیں، یہیں ایک فوجی عدالت بیٹھی اور اس عدالت میں تباہ حال فوج کے گرفتار قلیوں اور مزدوروں کو پیش کیا گیا۔ انھیں بری طرح مارا پیٹا گیا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی کہ اس سازش میں ان میں کا کون کون شریک تھا۔ انھیں جلتی سلاخوں سے داغا گیا، ان کی انگلیوں کے ناخن نکلوا دیئے گئے، ان کی انگلیوں کے جوڑ الگ کر دیئے گئے۔ کئی نے جسمانی اذیتوں سے بچنے کی خاطر جھوٹ موٹ اقبال جرم کر لیا اور انھوں نے اقرار کیا کہ فوج میں جو دھماکے ہوئے، اس میں ان کا ہاتھ تھا لیکن ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے ہر سزا جھیل کر بھی اقرار نہیں کیا۔ عدالت نے سرسری کارروائی کے بعد ان سب کے لیے سزائے موت تجویز کر دی اور نہ صرف سزائے موت تجویز کر دی بلکہ سزائے موت کے طریقے تک مقرر کر دیئے۔

ان میں سے چند کو پھانسیوں پر لٹکا دیا گیا۔

کچھ کو گولیوں سے اڑا دیا گیا اور بعض کو توپوں کے دہانوں سے باندھ کر فضا میں بکھیر دیا گیا۔ ان سزاؤں کی تعمیل کے دوران لاؤڈ اسپیکر پر چیخ چیخ کر یہ اعلان بھی کیا جاتا رہا کہ "غدارو! ان کے انجام سے عبرت پکڑو اور اپنی تخریبی سرگرمیوں سے باز آجاؤ ورنہ تمھیں ان سے بھی برا دن دیکھنا پڑے گا۔"

اس کے ساتھ ہی گنگا دین کے ساتھیوں میں یوں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی گئی کہ بار بار یہ اعلان کیا گیا کہ جو شخص بھی گنگا دین کا ساتھ چھوڑ کے سرکار کی امان میں آجائے گا۔ سرکار اسے معاف بھی کر دے گی اور اس کی جان کی حفاظت بھی کرے گی، اسے اعلیٰ درجے کی ملازمت عطا کی جائے گی اور پانچ ہزار فی کس انعام بھی دیا جائے گا۔"

یہ اعلان بار بار ہوا۔ گنگا دین، سرفراز اور جاوید بھی یہ اعلان سنتے رہے۔ سرفراز نے تشویش سے کہا۔ "بھائی گنگا دین! کیا اس اعلان سے ہماری صفوں میں بے چینی اور نفاق نہیں پیدا ہو جائے گا؟"

جاوید نے کہا۔ "یہ بڑی کٹھن گھڑی آ پڑی ہے ہمیں اپنے ہر آدمی سے ہوشیار اور چوکنا رہنا پڑے گا۔"

گنگا دین نے نفرت سے کہا۔ "مجھے کسی کی بھی پروا نہیں۔ ہم ایک نصب العین کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اگر ہم میں کچھ ایسے لوگ واقعی موجود ہیں جو حریص اور ابن الوقت اور وہ ہمارا ساتھ چھوڑ دیں گے تو انھیں واقعی ہمارا ساتھ چھوڑ دینا چاہیے۔ ہم ان کی علیحدگی کو بخوشی گوارا کر لیں گے کیونکہ ہم ان کمزور ساتھیوں کو اپنی صف میں نہیں دیکھنا چاہتے۔"

پھر انھی اعلانوں میں سرفراز کے باپ کی آواز بھی سنی گئی، وہ اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔ "بیٹے سرفراز! کیا تم اپنے بوڑھے باپ کی آواز سن رہے ہو؟ بیٹے! تم گنگا دین کی رفاقت سے کنارہ کشی اختیار کر لو، یہ شخص جس کے ماں باپ کا بھی کسی کو کوئی علم نہیں، تمھیں تباہ و برباد کر رہا ہے، ہم نے سرکار سے تمھارے لیے امان حاصل کر لی ہے۔ ہمارے پاس سیدھے گھر آجاؤ ورنہ تمھاری بوڑھی ماں تمھارا دودھ نہ بخشے گی۔"

باپ کی آواز اور اس کی باتوں نے سرفراز کو گنگا دین کے روبرو شرمندہ کر دیا۔ اس نے گردن جھکالی اور شرمسار لہجے میں کہا۔ "بھائی گنگا دین! میں اپنے باپ کی باتوں پر نادم ہوں اور تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں مرتے دم تک تمھارا ساتھ نہ چھوڑوں گا!"

گنگا دین بہت اداس تھا۔ سوگوار لہجے میں بولا۔ "مجھے تم پر یقین ہے لیکن پھر بھی اگر تم اپنے باپ کی آواز پر لبیک کہنا چاہو تو بشوق کر سکتے ہو۔"

اسی اعلان میں جاوید کی ماں کی آواز بھی سنائی دی۔ "بیٹے جاوید! اگر تمھارا باپ زندہ ہوتا تو کیا تم اس وقت بھی اس راہ پر چلتے؟ ہرگز نہیں! تم شریف ماں باپ کے بیٹے ہو اس لیے تمھیں شریفانہ زندگی اختیار کرنی چاہیے۔ سرکار کے خلاف کام مت کرو، اگر تم نے گنگا دین کا ساتھ نہ چھوڑا تو میں قیامت میں تمھاری شکل تک نہ دیکھوں گی اور تمھارا دودھ نہ بخشوں گی۔"

جاوید ماں کی آواز سن کر تلملا گیا، اس نے کنکھیوں سے اپنے دونوں ساتھیوں کی کیفیت کا اندازہ لگانا چاہا، وہ دونوں بھی جاوید سے نظریں چرا رہے تھے، جاوید نے آہستہ سے گویا ماں کو جواب دیا۔ "ماں! اس وقت میں تمھارا کہنا نہیں مانوں گا کیونکہ میں ایک تم سے بھی بڑی ماں کی خدمت کر رہا ہوں اور اس ماں کا نام ہے وطن۔"

گنگا دین نے کہا۔ "جاوید! میں تم سے شرمندہ ہوں لیکن اپنے مقصد اور نصب العین سے ہرگز شرمندہ نہیں۔"

جاوید نے کہا۔ "بھائی گنگا دین! میری جان تمھارے اختیار میں ہے جس طرح چاہو کام میں لاؤ۔"

گنگا دین نے کہا۔ "ہو سکتا ہے ہم اپنے مقصد میں ناکام ہو جائیں اور اپنی جانیں دے کر چلے جائیں لیکن ہمیں اس پر یقین ہے کہ تحریک آزادی کی جو شاہراہ ہمارے خون سے جنم لے گی وہ بالکل اس کہکشاں کی مانند درخشاں و تابندہ ہوگی جس پر چل کر مستقبل کی نسل آزادی اور انگریزوں

ہو سکتی ہے جس میں عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش شریک نہ ہوں۔"
سرفراز نے پوچھا "عورتیں ہماری تحریک میں کیا کام کر سکتی ہیں؟"
لڑکی نے جواب دیا "اس قیامت کی ہولناک فضا میں کمل کر باتیں
نہیں کی جا سکتیں اگر تم لوگ ہم عورتوں کا بھی تعاون حاصل کرنا چاہتے
ہو تو کسی دن اور کبھی بھی ہم سے ملو۔ میں بھی ایک پڑھی لکھی محب وطن
ہندوستانی لڑکی ہوں اور تمہارے ہی جیسے جذبوں سے سرشار ہوں۔"
سرفراز نے سحر زدہ انسان کی طرح سوال کیا "تم کہاں مل سکتی ہو؟"
لڑکی نے ڈبے کے اندر سر کر لیا اور کاغذ نہ ہونے کی وجہ سے جلدی
جلدی اپنے سفید رومال پر پنسل سے پتہ لکھ کر سرفراز کے حوالے کر دیا۔
اسی لمحے فضا میں یکے بعد دیگرے تین فائر ہوئے۔ جو اس بات
کا اعلان تھے کہ کام کامیابی سے تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور اب گنگا دین کے
ساتھیوں کو یہاں سے فرار ہو جانا ہے۔ سرفراز نے عجلت میں رومال جیب
میں رکھ لیا اور لڑکی کو الوداعی سلام کرتے ہوئے کہا "میں تم سے بہت
جلد ملنے کی کوشش کروں گا۔ یہ ملاقات اچانک ہوگی۔"
لڑکی اندھیرے میں سرفراز کو جاتے ہوئے دور تک دیکھتی رہی یہاں
تک کہ سرفراز اپنے ساتھیوں کے ساتھ رات کے اندھیرے میں نظروں سے
اوجھل ہو گیا۔
گنگا دین کے چلے جانے کے بعد ٹرین اور اس کے آس پاس
سوگواری طاری ہو گئی۔ زخمی اور مرے ہوئے محافظ سپاہی خرمن زدہ والے
ڈبے کے اندر اور آس پاس بکھرے پڑے تھے، زخمی کرب سے چیخ رہے
تھے یا کراہ رہے تھے۔ گارڈ، ٹی ٹی ای اور ڈرائیور کو باندھ کر ٹرین کے پہیوں
کے پاس ڈال دیا گیا تھا۔ انہیں ڈرے سہمے مسافروں نے کافی دیر بعد کھولا

●●●

خزانے کی لوٹ کا واقعہ اتنا دہشت ناک اور ہنگامہ خیز ثابت
ہوا کہ انگریز بوکھلا گئے، ان کی بڑی بڑی فوجی جمعیتوں نے ان کوہستانی
سلسلوں پر یلغار کر دی جو گنگا دین کا مسکن تھا لیکن گنگا دین اتنا بیوقوف
نہیں تھا کہ وہ یہاں موجود رہتا وہ وقتی طور پر اس جگہ کو خالی کر گیا تھا وہ
کہاں تھا کسی کو کچھ پتہ نہ تھا۔ انگریز اسے شکاری کتوں کی طرح تلاش کرتے
پھر رہے تھے اس دوران میں اس نے بھی خاموشی اختیار کر لی تھی؛ وہ کیوں
خاموش تھا اور کہاں کیا کر رہا تھا کسی کو کچھ پتہ نہ تھا، انگریزوں کو اس کی
خاموشی پر تشویش تھی۔
گنگا دین کچھ عرصے کے لیے اپنی تحریک کی قیادت سرفراز اور
جاوید کو سونپ گیا، وہ کس کام میں مشغول تھا اس کے ساتھی تک نہ جانتے
تھے۔ بظاہر سرفراز اور جاوید کے جوش و خروش میں کوئی فرق نہ آیا تھا

لیکن آدمی کی ذات میں اُتر جانے والی نظریں سرفراز کو دیکھ کر یہ محسوس کر
سکتی تھیں کہ اس میں کچھ تبدیلی ضرور آ گئی ہے۔ سرفراز کو ٹرین والی لڑکی
نے پریشان کر دیا تھا اس کی پُر اثر باتیں اور مترنم آواز اکثر و بیشتر اس کے
خیالوں میں رس گھولتی رہتی۔ اس نے تخلیے میں رومال پر لکھا ہوا پتہ
پڑھا اور بھیس بدل بدل کر کئی بار اسے تلاش بھی کیا لیکن صحیح طور پر
تلاش نہ کر سکا۔
پھر اچانک گنگا دین کہیں سے آ گیا اور اس نے اپنے ساتھیوں
کی کارگزاریاں سنیں جو کچھ خاص نہیں تھیں جاوید نے گنگا دین کو تخلیے میں
بتایا کہ "سرفراز کچھ سرد پڑتا جا رہا ہے۔"
گنگا دین نے اس شکایت پر کوئی خاص توجہ نہیں دی، اس کا
خیال تھا جاوید کی شکایت میں پرانی پرخاش کام کر رہی ہے اور اگر اس
کی عدم موجودگی میں سرفراز میں کوئی کمی آئی بھی ہوگی تو اس کی وجہ خود
گنگا دین کی کمی ہوگی۔ گنگا دین نے دونوں کو مل جل کر کام کرنے کی تلقین
کی اور کچھ دنوں کے لیے پھر غائب ہو گیا۔ اس کی عدم موجودگی میں کئی جگہ
انگریزوں کو تنگ کیا گیا اور بھاری نقصان پہنچا کے اپنی کمین گاہوں میں
چھپ گئے۔
اس دوران لڑکی کے حسین تصور نے سرفراز کے اندر توڑ پھوڑ
جاری رکھی تھی، وہ اندر ہی اندر ٹوٹ رہا تھا اس کی سمجھ میں اب یہ بات
نہیں آ رہی تھی کہ اس جدوجہد کا انجام کیا ہوگا؟ اس کے دل میں بار بار
یہ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ کیا وہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال سکے
گا؟ اس سوال کا اس کے پاس کوئی یقینی جواب نہیں تھا اور احساس
اسے کچھ زیادہ ہی ناامید کر رہا تھا کہ انگریز اس کے ملک پر ملک کے لوگوں
ہی کی مدد سے حکومت کر رہا تھا اور وہ جو جنگ لڑ رہا تھا اس میں دونوں
طرف اس کے ہم وطن ہی کام آ رہے تھے۔ ان الجھنوں اور فکروں میں اسے
ایک ایسے مشیر اور ہمدرد کی ضرورت تھی جس کے سامنے وہ اپنا کرب اپنی
اذیت بیان کر سکتا اس سے مشورہ کر سکتا یا اگر مشورہ نہ کر سکتا تو اس کے
سامنے سب کچھ اگل کر اپنے دل کا بوجھ اتار سکتا۔ ان تاریکیوں میں اسے
ایک بار پھر وہ ٹرین والی لڑکی یاد آئی۔ اس نے لڑکی کا پتہ لکھا ہوا رومال
جیب میں رکھا اور ایک سادہ لوح دیہاتی کا روپ دھار کر بیل گاڑی میں
بیٹھا اور لڑکی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جس بستی کا اس میں نام تھا وہاں
عیسائی رہتے تھے سرفراز کو عیسائیوں پر اعتماد نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ ہمت
کر کے اس بستی میں پہنچ گیا۔ بیل گاڑی میں گھی کے دو کنستر رکھے تھے جب
وہ مطلوبہ مکان پر پہنچا تو اتفاق سے اس وقت گھر میں کوئی مرد نہیں موجود
تھا، گھر میں ایک بڑی بی موجود تھیں سرفراز نے ان سے پوچھا "یہاں کوئی

زیفائن نامی کوئی لڑکی بھی رہتی ہے؟"
"جوزیفائن؟" بڑی بی نے تعجب سے یہ الفاظ دہراتے ہوئے
ا پھر کچھ یاد کرتی ہوئی بولیں۔ "جوزیفائن املی واقعی یہیں رہتی ہے۔ اس
سے تمھیں کیا کام ہے؟"
سرفراز نے کہا: "انھوں نے مجھ سے دو کنستر گھی منگایا تھا۔ خدا ان
وا دیجیے؟"
بڑی بی نے حیرت سے کہا: "گھی منگایا تھا کیسا گھی؟"
سرفراز نے جواب دیا: "کھلا گھی!"
بڑی بی نے سرفراز کو سر سے پیر تک دیکھا اور آہستہ سے پوچھا: "کیا تمھارے
پاس اس کے ہاتھ کی کوئی تحریر ہے کوئی رومال وغیرہ؟"
سرفراز کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے آہستہ سے کہا: "میرے پاس
اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ براہ کرم آپ مجھے جوزیفائن سے ملوا دیجیے۔"
بڑی بی نے کہا: "جوزیفائن اس وقت تو یہاں موجود نہیں ہے۔ تھوڑی
دیر انتظار کرنا پڑے گا۔"
سرفراز نے پوچھا: "کتنی دیر؟"
بڑی بی نے جواب دیا: "یہی کوئی آدھ پون گھنٹہ۔"
سرفراز کو جوزیفائن بڑی مشکل سے ملی تھی بولا: "بلا دیجیے۔ میں
انتظار کر لوں گا۔"
بڑی بی اسے بٹھا کر باہر نکل گئیں۔
تقریباً بیس منٹ بعد ایک سیاہ شیورلیٹ دروازے پر آ کر رکی
اس میں سے ایک لڑکی نکل کر اندر داخل ہو گئی اور اندر ایک اجنبی کو
دیکھ کر ٹھٹھک گئی، پوچھا۔ "مجھ سے کون ملنا چاہتا ہے؟"
لڑکی کی مترنم آواز سے سرفراز نے اسے پہچان لیا اور اٹھ کر کھڑا
ہو گیا: "آپ سے میں ملنا چاہتا ہوں۔" اس کے بعد اس نے کمرے میں موجود
بڑی بی کی طرف دیکھا۔ سرفراز کی آواز سے جوزیفائن نے بھی اسے پہچان
لیا تھا۔ جوزیفائن یہ محسوس کر کے کہ سرفراز بڑی بی کی موجودگی سے جھجک رہا
ہے اس نے بڑی بی کو کمرے سے باہر بھیج دیا۔
سرفراز نے جوزیفائن کا دایاں ہاتھ لے کر تعارف کو یقینی کر دیا
جوزیفائن نے کہا: "میں تمھارا انتظار کرتے کرتے مایوس ہو گئی تھی۔"
سرفراز نے جواب دیا: "میں نے اس پتے پر پہنچنے کی بارہا کوشش
کی لیکن جرأت نہ ہو سکی۔ آج میں نے آپ کو تلاش کر لیا۔"
جوزیفائن نے پوچھا: "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمھیں گرفتار کرا
دوں گی؟"
"نہیں" سرفراز بولا: "مجھے آپ پر شبہ نہیں تھا لیکن مجھے یہ خیال تھا

---

گرجا میں ایک پادری نے کہا۔ "میرا آج کا وعظ جھوٹ بولنے والوں کے بارے میں ہوگا۔ کیا آپ میں سے ہر ایک نے انجیل متی کا چھبیسواں باب پڑھ رکھا ہے؟" جواب میں تقریباً سبھی حاضرین نے اپنے ہاتھ اٹھا دیے۔ پادری مسکرا کر بولا: "بالکل آپ جیسے لوگوں سے ہی میں آج بات کرنا چاہتا ہوں۔ متی میں ایسا کوئی باب نہیں۔"

---

کہ احتیاط کرنی ہی چاہیے۔"
جوزیفائن کسی سوچ میں پڑ گئی۔ اس نے سر جھکا لیا تھا۔ کچھ دیر بعد
سر اٹھا کر بولی: "تم لوگوں نے سرکار کو بہت تنگ کر رکھا ہے۔ کیا تم نے کبھی
اس پر بھی غور کیا کہ تمھارا اصل نصب العین کیا ہے اور اس کی حصول یابی
اور کامیابی پر تمھیں کس حد تک یقین ہے؟"
سرفراز نے کہا: "میں سر دست اس بحث میں نہیں پڑوں گا۔
اس وقت میں آپ سے اس لیے ملا ہوں کہ آپ اپنے وعدے کے مطابق
یہ بتائیں کہ آپ ہماری کس حد تک مدد کر سکتی ہیں۔ آپ ہندوستانی
ہیں اور آپ نے محب وطن ہونے کا اقرار بھی کیا تھا۔"
جوزیفائن نے کہا: "میں چاہوں تو عورتوں میں یہ تحریک چلا
سکتی ہوں کہ وہ اپنے مردوں کو انگریزوں کے خلاف عدم تعاون اور
ترک موالات پر آمادہ کریں لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب تم مجھے اپنے
نصب العین کی عظمت اور برتری کا یقین دلا دو۔"
سرفراز نے پرجوش لہجے میں کہا: "مجھے انگریزوں سے نفرت ہے۔"
جوزیفائن بولی: "انگریزوں سے نفرت کوئی نصب العین نہیں۔"
سرفراز نے اسی جوش و خروش سے کہا: "میں انھیں اپنے ملک
سے نکال دینا چاہتا ہوں۔"
جوزیفائن کا انداز تخاطب اچھا نہیں تھا۔ بولی: "تم انگریزوں کو اس
ملک سے کیوں نکالنا چاہتے ہو؟"
"وہ اس لیے کہ ملک ہمارا ہے۔ انگریز سات سمندر پار سے آ کر زبردستی
اس ملک کے مالک و مختار بن بیٹھے ہیں۔"
"غلط" جوزیفائن نے کہا۔ "انگریزوں کے اقتدار میں تم ہندوستانی

لگائے گئے تھے اور اب سارا ہم کرنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ جاوید کی عدم موجودگی میں سرفراز سے ملے اور کہا "سرفراز بھائی! ہم سب آپ سے متفق ہیں۔ آپ نے ہمت کر کے وہ باتیں کہہ دیں جو ہم سب کئی دن پہلے کہنے والے تھے۔"

سرفراز نے کہا "تم لوگ مت گھبراؤ۔ اگر تم لوگوں نے میرا ساتھ دیا تو میں بہت جلد تم سب کو ایک ایسی زندگی سے ہمکنار کر دوں گا جس میں خوشیاں ہوں گی، ہم ولے ہوں گے، امنگیں ہوں گی۔ آزادی ہوگی، ترقیاں ہوں گی۔"

ایک شخص نے کہا "ہماری کوئی زندگی نہیں۔ اپنے عزیز رشتہ داروں سے ہم نہیں مل سکتے۔ سرکار ہماری تلاش میں ہے۔ تلوار ہمارے سروں پر لٹک رہی ہے لاحول ولا قوۃ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔"

سرفراز نے کہا "اگر تم لوگ مجھ پر اعتماد کرو تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں معافیاں بھی دلا سکتا ہوں اور تمہیں اعلیٰ سرکاری ملازمتوں پر بھی فائز کرا سکتا ہوں۔"

سب نے متفق ہو کر کہا "ہم سب تم پر اعتماد کرتے ہیں۔ ہمیں تم پر اعتبار ہے۔"

"تب پھر تم بھی یقین کر لو کہ تمہارے سروں پر لٹکی ہوئی موت کی تلواریں بہت جلد اتار لی جائیں گی۔"

●●●

سرفراز جوزلیفائن کے قدموں میں بیٹھا ہوا اسے یقین دلا رہا تھا "جوزلیفائن! میں نے اپنا کام پورا کر دیا ہے۔ گنگا دین کے دو تہائی ساتھی اس سے علیحدگی کا وعدہ کر چکے ہیں۔ اب تمہیں اپنے وعدے پورے کرنے ہوں گے۔"

جوزلیفائن نے کہا "ان آدمیوں کو وہاں سے ہٹوا دو اور بہتر یہ ہے کہ انھیں کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جائے جہاں وہ لوگ گنگا دین کی انتقامی کارروائیوں کا نشانہ نہ بن سکیں۔"

سرفراز نے کہا "اس جگہ کا انتخاب بھی تمہیں کو کرنا ہوگا۔"

جوزلیفائن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "بہتر ہے۔"

سرفراز نے سوچا۔ اس وقت وہ اپنی اس محبت کا اظہار بھی کر دے جو پہلی ملاقات کے بعد سے اس کے دل میں کروٹیں لے رہی ہے وہ یہ کہہ دینا چاہتا تھا کہ جوزلیفائن یہ تمہاری محبت ہی تو تھی جس نے اس سے یہ سب کچھ کرا دیا لیکن جوزلیفائن کے رعب نے یہ کہنے نہ دیا۔ بمشکل تمام اس نے کہا "جوزلیفائن! ابھی تو میں گنگا دین کے پاس آتا جاتا رہوں گا لیکن جب میں مستقلاً اس سے علیحدگی اختیار کر لوں گا تو تم اپنے وعدے پورے کرنے کی پابند ہوگی۔"

جوزلیفائن نے جواب دیا "بالکل۔ تم کو میری ہر بات پر یقین کرنا چاہیے۔"

سرفراز نے کہا "وہ انگریز مجھے معاف کر دیں گے؟"

"میں جو کہتی ہوں۔"

"مجھے کوئی اعلیٰ منصب بھی بخشا جائے گا؟"

"ضرور، یہ میرا وعدہ ہے۔"

"میں اپنی پسند کی لڑکی سے شادی بھی کر سکوں گا؟" یہ کہتے ہوئے اس نے جوزلیفائن کو نہایت حرص اور شوق کی نظروں سے دیکھا۔ معلوم نہیں جوزلیفائن اس کی بات سمجھی یا نہیں۔ اس نے جواب دیا "ہاں یہ بھی ہو جائے گا لیکن ایسا دونوں کی منظوری اور پسند کے بغیر نہیں ہوگا۔"

سرفراز نے چونک کر جوزلیفائن کی طرف دیکھا وہ نظریں جھکائے مسکرا رہی تھی۔

*** ***

ایک ایک دو دو، اور دو دو چار کر کے گنگا دین کے ساتھی اس سے جدا ہونے لگے۔ یہ سب کچھ نہایت پراسرار طریقے سے ہو رہا تھا۔ آدمی کم ہو رہے تھے لیکن کسی کو معلوم نہ تھا کہ یہ کہاں اور کیوں چلے گئے۔ جب گنگا دین واپس آیا تو اس کے دو تہائی ساتھی غائب ہو چکے تھے۔ اس نے اس کمی کے بارے میں سرفراز سے بھی پوچھا اور جاوید سے بھی لیکن دونوں نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ جاوید گنگا دین کو وہاں سے کہیں دور لے چلا گیا اور کہا "لیڈر! میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ اب تم سرفراز پر اعتبار بھی نہ کرنا۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ سرفراز انگریزوں سے مل گیا ہے۔"

گنگا دین نے ترش لہجے میں کہا "جاوید! تم اس قسم کی باتیں کرنا چھوڑ دو۔ تم سرفراز کی طرف سے ہمیشہ ہی بدگمان رہے ہو۔ آخر ایسا کیوں ہے؟"

جاوید نے کہا "میں بدگمان نہیں ہوں لیڈر! مجھے خوب اچھی طرح یہ معلوم ہو چکا ہے کہ سرفراز جوزلیفائن نامی کسی کرسچین لڑکی سے عشق کرنے لگا ہے اور اسی کے عشق میں غداری کرنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔"

گنگا دین اس نام پر خاموش ہو گیا۔ ملی ہوئی جھنجھلاہٹ سی بگڑی حالت گرفتگی سے پوچھا "اس کا کوئی ثبوت؟ یہ لڑکی آخر ہے کون؟"

جاوید نے اپنی جیب سے ایک سفید رومال نکال کر گنگا دین کے حوالے کر دیا۔ بولا "یہ رہا ثبوت۔ اس پر خود اسی لڑکی کے ہاتھ کا پتہ بھی لکھا ہوا ہے۔ میں نے یہ رومال بمشکل چوری کر کے حاصل کیا ہے جو ہر وقت اس کی جیب میں پڑا رہتا تھا۔"

گنگا دین نے اس رومال کو جلدی سے لے لیا اور اس کا پتہ خود پڑھنے لگا۔ یہ پتہ اس کی جوزلیفائن کے پتے سے مختلف تھا اس لیے اس کا بے چین دل قابو میں آ گیا۔ بولا "مگر یہ سب سچ نکلا تو میں سرفراز کو خود

اپنے ہاتھ سے قتل کر دوں گا۔"

جادیہ نے جواب دیا "لیڈر! یہ کام تمھارا ہے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

جب یہ دونوں دوبارہ اپنی جگہ واپس پہنچے تو وہاں سرفراز موجود نہ تھا۔ وہ فرار ہو چکا تھا۔ گنگادین نے اس کی تلاش میں کئی آدمی دوڑائے لیکن وہ ہاتھ نہیں آیا۔

٭٭

اب یہ طے شدہ امر تھا کہ سرفراز اس جگہ گنگادین کی موجودگی کی اطلاع حکومت کو ضرور کر دے گا۔ یہ سوچ کر گنگادین نے ایک خوفناک معرکے کا منصوبہ بنا لیا۔ حسب توقع دوسرے ہی دن انگریزی سپاہ نے کوہستانی سلسلوں کے آس پاس گھیرا ڈال دیا۔ انگریزوں نے ان سلسلوں میں جگہ جگہ بندوقچی تک بٹھا دیے۔ یہ سب مسلح تھے اور ان کے سر یا جھلکیاں کوہستانی سلسلوں میں کچھ ڈھکی چھپی اور کچھ نمایاں نظر آ رہی تھیں۔

انگریزی سپاہ کا کمانڈر آگے بڑھا اور لاؤڈ اسپیکر پر باغیوں کو حکم دیا: "اب بھی وقت ہے اگر تم لوگ ہتھیار ڈال کر خود کو حکومت کے حوالے کر دو تو تمھیں معاف کر دیا جائے گا ورنہ مقابلے کی صورت میں تمھیں تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔"

دوسری طرف سے لاؤڈ اسپیکر ہی سے جواب ملا: "ہم تمھارا بھرپور مقابلہ کریں گے اس مقابلے میں یا تو خود تباہ ہو جائیں گے یا تمھیں تباہ و برباد کر دیں گے۔"

کمانڈر پیچھے ہٹا اور چند منٹوں کے لیے سکوت اختیار کیا پھر حملے کا حکم دے دیا۔ بندوقیں چلنے لگیں، گولہ باری ہونے لگی، اس کا جواب دوسری طرف سے بھی دیا گیا۔ آتشیں ہتھیاروں کی گرج چمک سے پہاڑیاں گونج اٹھیں، پتھروں کے ریزے اڑنے لگے۔ کئی گھنٹوں کی جنگ کے بعد انگریزوں نے یہ محسوس کیا کہ اس کا حریف یا تو کمزور پڑ گیا ہے یا پھر نئے حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ گنگادین کے آدمی بندوقوں اور رائفلوں سمیت پہاڑیوں میں جگہ جگہ نشستیں لگائے نظر آ رہے تھے لیکن وہ حملے نہیں کر رہے تھے۔ ان کی تعداد کی نسبت سے جوابی حملوں کی رفتار کم تھی۔ انگریز اسے بھی گنگادین کی کوئی جنگی چال سمجھ کر پہاڑیوں کی طرف بڑھتے ہوئے گھبرا رہے تھے۔ پھر انگریزوں نے جرأت سے کام لیا اور وہ آہستہ آہستہ نہایت احتیاط سے پہاڑیوں کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ خود بھی ایک ایسی جگہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جو گنگادین کی پہاڑیوں کے مقابل پہاڑیاں تھیں اور ان کی آڑ سے گروہ گنگادین پر زبردست یلغار کر سکتے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی انگریزوں نے ایک بار پھر شدت سے حملہ شروع کر دیا۔ انھیں اس کا جواب بھی ملا لیکن اس جواب میں جوش و خروش نہیں تھا۔ پہلی جیسی سرگرمی نہیں تھی۔ انگریزوں کو بہت جلد ہی یقین ہو گیا کہ گنگادین کی طرف جواب دینے والی جنگی طاقت اب مقابلہ کرنے کے لائق نہیں رہ گئی لیکن انھیں حیرت اس بات پر تھی کہ پہاڑیوں میں اس کے آدمی اب بھی کھڑے تھے اور وہ انگریزوں کے حملوں سے بظاہر بے خوف ہو رہے تھے۔ انگریزوں نے ان پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی اور چند گھنٹوں میں ان پر گولے بارود کا اتنا ذخیرہ ضائع کر دیا کہ مزید کی ضرورت پیش آ گئی لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ گنگادین کے آدمیوں کی استقامت میں کوئی فرق نہ آیا۔

بڑے غور و فکر کے بعد انگریزی سپاہ نہایت احتیاط سے پیدل پہاڑیوں کی آڑ لے کر گنگادین کے مسکن کی طرف بڑھی۔ جب وہ گنگادین کی کمین گاہوں کے بالکل قریب پہنچ گئے تو ان پر اچانک پیچھے سے ایک بھرپور حملہ ہو گیا۔ جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو دوسری طرف سے بھی فائر کھل گیا۔ اب انگریزی سپاہ اس شخص کی طرح پھنس گئی تھی جس کے ایک طرف بھیانک خندق ہو اور دوسری طرف گہرا کھڈ۔ وہ کسی طرف بھی نہ بھاگ سکتی ہو۔ چند گھنٹوں میں انگریزوں کا صفایا کر دیا گیا۔ ان میں چند انگریز خوش قسمتی سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنی تباہ کاری کی داستان جب ہیڈ کوارٹر کو سنائی تو انگریزوں کے حلقوں میں زلزلہ پیدا ہو گیا۔ اس بار انھوں نے بہت بڑی فوج سے ان پہاڑیوں کو گھیرے میں لے لیا اور گنگادین کی کمین گاہوں میں داخل ہو جانے میں کامیاب ہو گئے اور انھیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ اب تک جنھیں گنگادین کی مستقل مزاج فوج سمجھ رہے تھے وہ لکڑی کے پتلے تھے جنھیں کپڑے پہنا کر اور ان کے ہاتھوں میں لکڑی کی مصنوعی بندوقیں دے کر انھیں کھڑا کر کے انگریزوں کو مغالطے میں ڈال دیا گیا۔ اسی مغالطے نے گنگادین اور اس کے ساتھیوں کو پیچھے سے حملہ آور ہونے کا موقع دیا تھا اور اسی مغالطے میں انگریزوں کا بہت سا گولہ بارود بے کار ضائع گیا تھا۔ یہاں گنگادین کے چند آدمی مارے بھی گئے تھے ان میں کچھ مر چکے تھے اور کچھ سسک رہے تھے۔ انگریزوں نے ان نیم مردہ آدمیوں کو اسپتال میں داخل کرا دیا اور اس کوہستانی سلسلوں میں فتح تسلیم کر دی۔ انھوں نے کئی دن تک ان پُراسرار سلسلوں میں گنگادین کو تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملا۔

گنگادین کی تلاش نہایت سرگرمی سے شروع کر دی گئی۔

جو زخمی اسپتال میں داخل تھے ان میں جادیہ بھی شامل تھا۔ اس کی سرفراز نے شناخت کی۔ جب حکومت کو یہ معلوم ہوا کہ جادیہ گنگادین کا اہم ترین ساتھی ہے تو اس پر زبردست پہرہ بٹھا دیا گیا۔

ایک رات گنگادین اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر چند جانثاروں کے ساتھ

وہ لوگ پتے پر پہنچ گئے اور بڑی بی سے جوزیفائن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ بڑی بی نے گنگا دین سے بھی وہی بات کہی جو سرفراز سے کہی تھی، بولیں "آدھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑے گا لیکن تم ہو کون؟ اس کو تمہاری آمد کی اطلاع کس طرح دوں؟"

گنگا دین نے جواب دیا "اس سے کہہ دو، سرفراز کا بھائی تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

بڑی بی نے کہا "اچھا تم ٹھہرو، میں اسے بلواتی ہوں!"

گنگا دین نے کہا "آپ اسے بلائیے، میں تیس چالیس منٹ بعد دوبارہ حاضر ہو جاؤں گا۔"

بڑی بی کسی طرف چلی گئیں اور گنگا دین جوزیفائن کی گزرگاہ کی تاریکی میں کھڑے ہو کر اس بات کا اندازہ لگانے لگا کہ جوزیفائن اس سے ملنے تنہا آتی ہے یا اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوتا ہے۔ تقریباً بیس پچیس منٹ بعد کالی پشواز میں جوزیفائن وہاں پہنچ گئی اس کی بجلی کی روشنی میں جوزیفائن کو گاڑی چلاتے دیکھا تو اچانک اس کے پاس پہنچ گیا۔ جوزیفائن گاڑی میں تنہا تھی۔ اس نے گاڑی میں منہ ڈال کر کہا "جوزیفائن! میں تم سے چند باتیں کرنے آیا ہوں اس کے بعد تم مجھے پولیس کے حوالے کر دینا۔"

جوزیفائن نے اس آواز کو پہچان لیا۔ خوشی سے بولی "یہ تم ہو! میں تو تمہاری تلاش میں تھی۔"

گنگا دین نے بے دلی سے کہا "میری تلاش میں ایک تم کیا، سارا زمانہ ہے، پہلے یہ بتاؤ تم مجھ سے کہاں باتیں کرنا پسند کرو گی؟"

جوزیفائن نے کہا "تھوڑی دیر تو یہیں بیٹھ کر باتیں کروں گی اس کے بعد کہیں اور چلے چلیں گے۔"

گنگا دین نے پوچھا "کیا تم مجھ سے خوف نہیں کھاتیں؟ کیا تم یہ نہیں سوچتیں کہ میں تمہیں دھوکے سے قتل بھی کر سکتا ہوں؟"

جوزیفائن نے جواب دیا "میں تمہیں ایک اصولی اور بہادر نوجوان سمجھتی ہوں اس لیے میں یہ یقین رکھتی ہوں کہ تم دھوکے باز نہیں ہو سکتے اور ایک لڑکی کو دھوکے سے ہلاک کرنا بہادری کے خلاف سمجھو گے۔"

گنگا دین نے کہا "اچھا چلو کہیں بیٹھ کر چند باتیں ہو جائیں۔"

جوزیفائن اسے بڑی بی کے کمرے میں لے گئی۔ وہاں اس نے جوزیفائن سے شکایت کی کہ اس نے سرفراز کو اپنا ہم خیال بنا کر اور اس کے ذریعے آپس میں پھوٹ ڈلوا کر اس نے اچھا نہیں کیا۔

جوزیفائن نے کہا "میرا باپ پولیس کمشنر ہے اور میری ماں ایک ہندوستانی عورت ہے میری رگوں میں دونوں ہی کا خون دوڑ رہا ہے میں بیک وقت دونوں ہی کی وفادار رہنا چاہتی تھی۔ چنانچہ تمہیں پناہ دے کر تمہیں چلا جانے دیا تو اس فعل میں میری ماں کا خون کارفرما تھا اور جب میں نے سرفراز اور اس کے ذریعے تمہاری جمعیت میں پھوٹ ڈلوا دی تو یہ کام میں نے اپنے باپ کی وفاداری میں کیا تھا۔" پھر پوچھا "کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم بغاوت ترک کر دو میں تمہیں معافی دلوا کر کوئی اچھا سا منصب دلوا دوں گی۔"

گنگا دین نے آہستہ سے جواب دیا "ہاں کہا تو تھا لیکن بدقسمتی سے میری بھی رگوں میں صرف ہندوستانی ماں باپ کا خون گردش کر رہا تھا اور مجھے اس خون کی وفاداری میں انگریز سے جنگ کرنی ہی تھی۔ اس کے سوا میں اور کیا کر سکتا تھا؟"

اسی وقت باہر سے پاپا کی آواز سنائی دی۔ جوزیفائن نے گھبرا کر گنگا دین کو الماری میں چھپا دیا۔ بولی "میرے والد آ گئے ہیں، تم سانس روکے الماری میں کھڑے رہو۔ جیسے ہی چلے جائیں گے میں تمہیں باہر بلا لوں گی۔"

گنگا دین نے کہا "بہتر ہے۔" اور ایک الماری میں اسے چھپا لیا۔ کچھ دیر بعد جوزیفائن نے محسوس کیا کہ اس کا باپ کسی کو تلاش کر رہا ہے۔

کمشنر نے بیٹی سے پوچھا "تم سے ملنے کون آیا تھا؟"

جوزیفائن نے جواب دیا "سرفراز کا ایک رشتے کا بھائی۔"

"وہ کہاں گیا؟"

"وہ اپنے گھر چلا گیا۔"

"کہتا کیا تھا؟"

جوزیفائن نے جواب دیا "وہ کہتا تھا میرے بھائی پر آنچ نہ آنے دی جائے۔"

کمشنر نے کہا "یہ کس طرح ممکن ہے کہ غداروں کو معاف کر دیا جائے؟"

جوزیفائن نے چونک کر باپ سے پوچھا "لیکن میں نے تو ان لوگوں سے یہ وعدہ کر لیا ہے کہ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اس وعدے کے بعد بھی اگر ان پر غداری کا مقدمہ چلا تو یہ نہایت بری بات ہوگی۔"

کمشنر نے جواب دیا "تم فکر نہ کرو، ہم تمہیں یہ خوب اچھی طرح یقین دلا دیں گے کہ تم سے حکومت یا پولیس نے کوئی بھی وعدہ کیا تھا۔ ایک غیر ذمہ دار لڑکی حکومت کے دشمنوں سے وعدہ کس طرح کر سکتی ہے اور اس سلسلے میں حکومت پر کوئی ذمہ داری کہاں اور کس طرح عائد ہوتی ہے؟"

جوزیفائن نے کہا "میں نے جن لوگوں سے وعدہ کیا ہے انہیں اپنا ہم خیال بنایا ہے کہ وہ کم از کم خود تو ان کے خلاف جانے سے رہے۔"

"جوزیفائن!" کمشنر نے فکرمندی سے کہا "کیا گنگا دین کا پتہ چل سکتا ہے کس طرح؟"

جوزیفائن نے جواب دیا: "میں خود اس کی تلاش میں ہوں۔"

کمشنر نے کہا: "جوزیفائن! میرے دل پر ایک بوجھ سا پڑا ہے، میں اسے اتارنا چاہتا ہوں۔"

جوزیفائن نے پوچھا: "وہ کس طرح؟"

کمشنر نے معافی پر زور دیتے ہوئے کہا: "جوزیفائن! جیسا کہ تم اور بعض دوسرے لوگ جانتے ہیں کہ میں اپنی جوانی میں فوج میں ملازم تھا۔ وہاں میں نے ہندوستانیوں پر بے پناہ ظلم کیے۔ شراب اور اقتدار کے نشے نے ہم سب کا دماغ خراب کر رکھا تھا۔"

اس کے بعد اس کے تصورات میں تمام پرانی باتیں، لالہ بی بی کی تلاش، گنگا دین کی ماں سے چھیڑ چھاڑ، ہنگامہ اور اس دن اور اس دن کے بعد جو کچھ بھی پیش آیا، سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ اس نے جوزیفائن کو سب کچھ بتا دیا اور بولا: "جوزیفائن! مجھے شبہ ہوتا ہے کہ اس رات میں نے جس عورت کو چھیڑا تھا اس کی گود میں دو سالہ بچہ بھی تھا اور مجھے یہ بھی یاد آ رہا ہے کہ میں نے جس کشتی کے مسافروں کو گولیوں کی بوچھاڑ پر رکھ لیا تھا وہ دو سالہ بچہ اور اس کا باپ اس کشتی میں سفر کر رہا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ اس بچے کو ایک مسلمان نے پال لیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ گنگا دین وہی بچہ ہے اور اس کی انگریز دشمنی میں یہی واقعات کار فرما ہیں۔"

جوزیفائن نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اندر گنگا دین کا بہت برا حال تھا۔ اس وقت وہ اپنے قابو میں نہیں تھا۔ بار بار یہی جی چاہتا تھا کہ الماری سے نکل کر کمشنر کا کام تمام کر دے لیکن وہ ضبط و تحمل سے اندر ہی دبکا رہا، باہر نہیں نکلا۔ کمشنر نے کہا: "جوزیفائن! میں کسی بھی طرح گنگا دین سے ملنا چاہتا ہوں۔"

جوزیفائن نے اداس ہو کر پوچھا: "آپ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟"

"اپنی پریشانی دور کرنے کے لیے، اپنے دل کا بوجھ اتارنے کے لیے۔"

جوزیفائن نے پوچھا: "اگر گنگا دین آپ کو مل جائے تو کیا آپ اسے معافی دلوا دیں گے؟"

کمشنر نے بے دردی سے جواب دیا: "ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، وہ غدار ہے، باغی ہے۔ ایک باغی یا غدار کو کس طرح معاف کیا جا سکتا ہے؟"

جوزیفائن نے سر جھکا لیا اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کچھ دیر بعد پوچھا: "ڈیڈی! اس میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

کمشنر نے جواب دیا: "گنگا دین کے معاملے میں تمہاری محبت کی آگ روشن ہے، تم چاہو تو وہ گرفتار کیا جا سکتا ہے۔"

جوزیفائن نے کہا: "میں کوشش کروں گی۔"

کمشنر وہاں سے چلا گیا۔ جوزیفائن باپ کے پیچھے پیچھے باہر تک چلی گئی اور جب باپ کی کار اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ واپس آئی اور گنگا دین کو الماری سے باہر نکال کر نظریں جھکائے مجرموں کی طرح اس کے سامنے کھڑی ہو گئی، بولی: "گنگا دین! میں تمہاری مجرم ہوں، جو سزا چاہو دے لو۔"

گنگا دین کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آج وہ ہر دن سے زیادہ غمگین تھا۔ بولا: "جوزیفائن! ایسی باتیں مت کرو۔ اگر تم پسند کرو تو میری ایک اور آخری خواہش پوری کر دو۔"

جوزیفائن خوف زدہ ہو گئی۔ لرزتی کپکپاتی آواز میں پوچھا: "کون سی خواہش؟"

گنگا دین نے کہا: "مجھے کسی طرح میرے سنگی ساتھی جاوید سے ملوا دو۔"

جوزیفائن نے جواب دیا: "میں کوشش کروں گی۔"

کئی دن بعد جوزیفائن نے گنگا دین کو جاوید سے ملوا دیا۔ جاوید سے مل چکنے کے بعد گنگا دین بہت زیادہ اداس ہو گیا۔ اس نے جوزیفائن سے کہا: "جوزیفائن! جاوید نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ اب میں صحیح معنوں میں تنہا ہوں۔"

جوزیفائن نے اسے تسلی دی، بولی: "گنگا دین! تم زیادہ فکر نہ کرو، تم چند دن اور روپوش رہو، میں کوشش کروں گی کہ تمہیں حکومت معاف کر دے۔"

گنگا دین نے جواب دیا: "میں معافی نہیں چاہتا جوزیفائن! میں ناکام اور نامراد انسان معافی پا کر کروں گا کیا؟"

"میری خاطر، میرے لیے گنگا دین! تم تنہا نہیں ہو۔"
گنگا دین کے چہرے پر تازگی اور شگفتگی کی لہر دوڑ گئی۔

***

کئی دن بعد مسٹر فریزر نے جوزیفائن کو یہ خوش خبری سنا دی کہ جاوید اب ان کا ہم خیال ہو چکا ہے اور اس نے وعدہ کر لیا ہے کہ اگر اسے معاف کر دیا جائے تو وہ گنگا دین کو گرفتار کرا سکتا ہے۔

جوزیفائن پریشان ہو گئی، بولی: "جاوید کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔"

مسٹر فریزر نے تعجب سے پوچھا: "کیوں؟"

جوزیفائن نے جواب دیا: "اب اس بدنصیب اور تنہا انسان کو یوں ہی رہنے دو۔"

مسٹر فریزر کو جوزیفائن کی باتوں میں محبت کی بو محسوس ہوئی، بولا: "جوزیفائن! تمہیں اس باغی سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟"

جوزلیفائن نے جل کر جواب دیا "میں اس کی عزت کرتی ہوں مسٹر سرفراز۔"

سرفراز نے بھی بھی آواز میں کہا "مس جوزلیفائن! شاید آپ کو پتہ نہیں معلوم کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں اور یہ آپ کی محبت ہی تو تھی جس نے مجھے غداری پر آمادہ کر دیا۔"

جوزلیفائن نے جواب دیا "لیکن میں تم سے محبت نہیں کرتی اور نہ کر سکتی ہوں۔"

سرفراز کے دل میں ایک سوال کھٹک رہا تھا، پوچھا "کیا تم گنگا دین سے کبھی مل چکی ہو؟"

"ہاں کئی بار۔" جوزلیفائن نے جواب دیا۔

اب سرفراز کی سمجھ میں سب کچھ آچکا تھا۔ رقابت اور حسد کی آگ پورے جوش کے ساتھ اس کے دل میں روشن ہو گئی۔ جوزلیفائن کو جلانے کے لیے بولا "کل صبح تک گنگا دین کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ اب میں اس کی گرفتاری کے بعد ہی تم سے ملوں گا۔ اس کی گرفتاری کی خوشخبری کے ساتھ۔"

جوزلیفائن دل مسوس کر رہ گئی۔

جاوید نے سرفراز اور پولیس کمشنر کو بتا دیا تھا کہ کل صبح گنگا دین، امام دین سے ملنے جائے گا۔ جاوید نے کمشنر کو مشورہ دیا کہ گنگا دین کو دھوکے سے گرفتار کیا جائے۔ جاوید نے کہا "تینوں آدمی دوپہر کو چپ چاپ کشتی کے ذریعے اس پار پہنچیں۔ امام دین کے مکان پر پہنچ کر سرفراز اور کمشنر باہر کھڑے رہیں اور جاوید اندر چلا جائے، پھر وہ گنگا دین کو باتیں کرتے ہوئے دھوکے سے باہر لے آئے، وہ دونوں جیسے ہی باہر آئیں کمشنر اور سرفراز اپنے اپنے پستولوں کی مدد سے دونوں کو بے بس کر لیں، پولیس وہاں پہلے ہی سے کہیں چھپی رہے۔"

سرفراز اور کمشنر کو جاوید کی یہ تجویز بہت پسند آئی۔

علی الصباح طلوع آفتاب سے قبل سرفراز اور جاوید کمشنر کے ساتھ گنگا کے کنارے پہنچ گئے۔ کمشنر معمولی کپڑوں میں تھا۔ دریا کے کنارے ایک کشتی ان کی منتظر تھی، یہ وہی ساحل تھا جہاں ایک عرصے پہلے ایک بڑا ہنگامہ گرم ہو چکا تھا۔ ساحل سے پہلے گھنیرے درختوں کے جھنڈ چپ چاپ کھڑے معلوم نہیں کتنے تماشے دیکھ چکے تھے۔ ملاح اور اس کے ساتھی نے ان تینوں کا مسکراتے ہوئے استقبال کیا۔ رات کی سیاہی میں صبح کا اجالا یوں گھل مل گیا تھا جیسے باورچی خانے کی دھواں آلود دیواروں پر سفیدی پھیر دی گئی ہو۔

جب یہ تینوں کشتی میں بیٹھ گئے تو کمشنر نے ملاح کو حکم دیا "کشتی کو تیزی سے لے چلو۔"

ملاح اور اس کے ساتھی نے اپنے اپنے چپو پانی میں ڈال دیئے اور کشتی پانی میں آگے بڑھنے لگی۔ ابھی یہ کشتی بمشکل پچاس ساٹھ گز ہی آگے بڑھی ہو گی کہ ملاح اور اس کے ساتھی نے چپوؤں کو پانی میں پھینک کر چھلانگ لگا دی اور باآواز بلند کہا "میرے دوستو، خدا حافظ!"

کمشنر اور سرفراز حیرت اور پریشانی سے ملاح اور اس کے ساتھی کو پانی میں جھانکنے لگے، سرفراز نے پوچھا "کیا بات ہے تم نے یہ حرکت کیوں کی؟"

کمشنر نے خطرے کی بو محسوس کر لی تھی، اس نے پستول نکال لیا۔

جاوید نے ہنستے ہوئے کمشنر سے کہا "اب اسے اپنی جیب ہی میں رہنے دیں، اب یہ دونوں واپس نہیں آئیں گے۔"

سرفراز نے گھبرا کر پوچھا "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

کمشنر نے غصے میں پستول کا رخ جاوید کی طرف کر دیا۔ دانت پیستا ہوا بولا "میں تمہیں گولی مار دوں گا ورنہ بتاؤ کہ اصل معاملہ کیا ہے؟"

جاوید نے نہایت مطمئن لہجے میں کہا "مجھے تم خود گولی مار دو یا حکومت پھانسی پر چڑھا دے، میرا انجام دونوں ہی صورتوں میں یکساں ہے۔"

کشتی دریا کے بہاؤ پر بہنے لگی۔

کمشنر نے ایک بار پھر ملاح اور اس کے ساتھی کو پانی میں دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ دونوں نظر نہیں آئے۔ کہیں دور پر پانی میں ان دونوں کے ہاتھ پاؤں مارنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کمشنر نے اندازے سے اس سمت گولی چلا دی، لیکن اسی وقت ساحل سے گولیوں کی باڑھ چلی اور یہ تینوں اپنے ہی خون میں نہا کر کشتی میں ڈھیر ہو گئے۔

جاوید سسکتا گھسٹتا سرفراز کے پاس پہنچا، کراہ کر بمشکل بولا "غداری کی سزا مل گئی، اگر تم زندہ بچ جاتے تو میں مرنے کے بعد بھی بے چین رہتا۔"

لیکن سرفراز نے اس کی باتیں نہیں سنیں کیونکہ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اس کے بعد جاوید کمشنر کے پاس پہنچا۔ کمشنر نے جاوید کو گولی مار دینی چاہی لیکن کمزوری نے ساتھ نہ دیا۔ نیم مدہوشی میں اس نے جاوید کو اپنے قریب دیکھا۔ جاوید کے دھواں دھواں چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ کمشنر نے سنا، جاوید کہہ رہا تھا "کمشنر! گنگا دین نے اپنا انتقام لے لیا۔ بہت عرصے پہلے تم نے بھی گنگا دین کی ماں کو اس ساحل پر اور باپ کو کشتی میں اسی طرح ہلاک کیا تھا، یاد ہے نا؟"

جاوید کی طاقت بھی جواب دیتی جا رہی تھی۔ بے ملاح کی کشتی تیزی سے دریا کے بہاؤ پر بہی چلی جا رہی تھی۔

اس صبح، ابھی پالمر کے قتل کی خبر کسی کو بھی نہ ملی تھی، گنگا دین جوزیفائن کے پاس پہنچ گیا۔ جوزیفائن اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی، بولی "تمہاری گرفتاری کے لیے ڈیڈی، سرفراز اور عبادیہ کے ساتھ امام دین کے پاس گئے ہوئے ہیں، خدا کے لیے تم بھاگ جاؤ، ویسے میں اس وقت تمہیں یہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہوں۔"

گنگا دین نے اس کی بات کا جواب دیئے بغیر سوال کیا "جوزیفائن! کیا تم میرا ساتھ دینے پر آمادہ ہو؟"

"کس قسم کا ساتھ؟ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔"

گنگا دین نے پھر سوال کیا "جوزیفائن کیا یہ سچ ہے کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟"

جوزیفائن نے مسکرا کر گنگا دین کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلا کر گردن جھکا لی۔

"تب پھر تم میرے ساتھ چلو" گنگا دین نے کہا "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں ہندوستان چھوڑ رہا ہوں۔"

جوزیفائن نے پوچھا "لیکن تم یہیں کیوں نہیں رہتے، اسی ملک میں۔ میں نے تم سے وعدہ کیا ہے کہ ڈیڈی کے ذریعے میں تمہیں معافی دلانے کی کوشش کروں گی۔"

گنگا دین نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں اور رقت آمیز لہجے میں بولا "جوزیفائن! میں نے انگریزوں کے خلاف خوفناک جنگ کی۔ میں انگریزوں سے کیوں نفرت کرتا تھا تمہیں معلوم ہے؟ جب میں اپنے غدار ساتھیوں ہی کے ہاتھوں اپنے منصوبوں میں ناکام ہو گیا تو میں اکثر سوچا کرتا تھا، لیکن میں کبھی کبھی یہ بھی سوچتا تھا کہ آخر میں انگریزوں کو کس حد تک نقصان پہنچا سکتا ہوں، میرے دل میں تمہاری یہ بات بھی ناگزیر تھی کہ انگریز ہمارے ہی بھائی بندوں کے ذریعے ہم پر حکومت کر رہے ہیں، پھر ہم انگریزوں سے کس طرح لڑیں؟ انھیں کس طرح تباہ کریں؟" یہ کہتے کہتے وہ چپ ہو گیا، پھر کچھ دم لے کر وہ آہستہ آہستہ بولا "ان دنوں میں بہت مایوس اور شکستہ سا رہنے لگا تھا، مجھے اپنی ناکامی کا احساس اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹے جا رہا تھا۔ پھر ایک رات جب مجھ پر اچانک یہ انکشاف ہوا کہ میں کون ہوں اور میرے ماں باپ کون تھے؟ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان کی موتیں تمہارے انگریز باپ کے ذریعے کس طرح واقع ہوئی تھیں تو میرے مایوس اور شکستہ دل میں پھر سے توانائی پیدا ہو گئی اور میں نے فوراً ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ میں تمہارے باپ کو اسی طرح ہلاک کر کے اپنے انتقام کی آگ بجھاؤں گا۔"

جوزیفائن کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی، خوفزدہ سے لہجے میں بولی "لیکن گنگا دین! تم میرے ڈیڈی کو میری خاطر معاف کر دو، خدا کے لیے، بھگوان کے لیے اور اس کے لیے جسے تم مانتے ہو، میرے ڈیڈی کو معاف کر دو۔"

گنگا دین عجیب نگاہوں سے، کھوئی کھوئی نظروں سے کچھ دیر جوزیفائن کو دیکھتا رہا، بولا "میں تمہارے ذریعے عبادیہ سے ملا اور اس سے مل کر اپنا منصوبہ تیار کر لیا اور ابھی ابھی اسی وقت اس منصوبے پر عمل کر کے تمہارے پاس آ گیا ہوں۔"

جوزیفائن تڑپ گئی، تلملا کر بولی "گنگا دین! تم صاف صاف بات کیوں نہیں کرتے، میرے ڈیڈی کہاں ہیں؟"

گنگا دین زہرخند کرتا ہوا بولا "گنگا کے دھاروں پر بہتی ہوئی کی کشتی میں خون میں لت پت۔" پھر ذرا زور سے طنزیہ ہنسا "پتہ نہیں گنگا کے دھارے اس کشتی کو کہاں تک بہا کر لے جائیں گے۔"

جوزیفائن چیخ مار کر رو دی، بولی "تم نے یہ اچھا نہیں کیا گنگا دین! میں تم سے نفرت کرتی ہوں، تم یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں تمہیں گرفتار کرا دوں گی، تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

گنگا دین نے آہستہ سے کہا "جوزیفائن! میں نے تمہارے باپ کے ساتھ وہی سلوک کیا ہے جو تمہارے باپ نے میرے باپ کے ساتھ کیا تھا" پھر بولا "اگر تم مجھ سے واقعی نفرت کرتی ہو تو میں تنہا چلا جاتا ہوں۔"

اس کے بعد وہ روتی ہوئی جوزیفائن کو چھوڑ کر باہر نکلا، درخت کی جڑ سے بندھے ہوئے گھوڑے کو کھول کر اس کی پشت پر بیٹھ گیا اور گھوڑے کو دوڑاتا ہوا گنگا کے ان پُراسرار کوہستانی سلسلوں میں کہیں گم ہو گیا جو ایک مدت تک اس کی پناہ گاہ رہ چکے تھے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔

بعد میں جوزیفائن کو اپنے جملے "میں تم سے نفرت کرتی ہوں" پر زندگی بھر افسوس رہا، اسے معلوم نہیں کس طرح یہ معلوم ہو گیا تھا کہ گنگا دین ان پُراسرار کوہستانی سلسلوں میں کہیں چھپ گیا ہے۔ اس نے گنگا دین کی واپسی کی امید میں وہیں کے ایک اسکول میں ملازمت کر لی اور جب بھی موقع ملتا، ان پہاڑی سلسلوں میں گھومنے پھرنے پہنچ جاتی کہ ممکن ہے وہ کبھی یہاں کہیں سے نمودار ہو کر جوزیفائن کے دل کی خشک کھیتی کو تر و تازہ کر دے۔ اسی امید و بیم میں اس کے سیاہ راتوں جیسے بالوں پر برف گرنے لگی۔

نکہت مرزا

بیٹی جب لاڈ بھرے انداز سے باپ کو پکارتی
تو اس کی ماں پر دورہ کیوں پڑ جاتا تھا ۔ ؟

⬠

**آمنہ** ایک بار پھر بیمار پڑ گئی۔

"اے ہے نگوڑ ماری یہ بھی یہ کیا زندگی ہوئی، سال میں بارہ مہینے جس کے کراہتے گزریں۔"

بی اماں ٹانکا بھرتے ہوئے بیزار آواز میں بولیں۔ ایک دو دن کی بیماری ہو تو پروا بھی ہوتی ہے پر جہاں بیمار پڑنے کا چکر ہی پڑ جانے والی کیسے چنتی پڑی ہے جوان کی تیمارداری میں اپنی جان کھپاتا پھرے۔ آمنہ نے جھوٹ نہ بلائے تو پچاسویں بار تو ضرور ہی بیمار ہوئی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ اب بی اماں گنتی ہی بھول چکی تھیں۔ "موئی بیماری اور ی ۔۔۔ اس سے تو بہتر تھا میں ۔۔۔" دادی نے برآمدے میں سے گزرتے بی اماں کی بڑبڑاہٹ سنی اور گول گول آنکھیں گھماتی اندر چلی آئیں۔

"میں نے کہا بہو ۔۔۔ کس کے پیچھے پڑ رہی ہو؟"

وہ دھپ سے تخت پر پسکڑا مار کر بیٹھ گئیں۔ "کیا بتاؤں اماں! زندگی اجیرن ہو کے رہ گئی ہے۔" بی اماں گھر گھر آواز میں بولیں۔

"اے تو یہ کبھی زندگی سے خوش بھی ہوا کرو بہو اتی۔" دادی نے پیار سے بی اماں کا کندھا تھپتھپایا۔ تب دفعتاً سوال کیا۔ "بہو، بچی کو ڈر پلا دی کیا؟" بی اماں کا چلتا ہاتھ رک گیا۔ بھنویں اٹھا کر تیکھے لہجے میں بولیں "اسی کی بات تو کر رہی تھی اماں، یہ بھی کیا زندگی ہوئی آئے دن بیمار اس سے تو اچھا تھا میں ۔۔۔"

"دیکھ بہو!" دادی بات کاٹ کر چلا اٹھیں۔ "آگے مت کچھ کہنا ۔۔۔ غضب خدا کا یہ آج کل کی مائیں ۔۔۔" بی اماں نے سوئی اٹھا کر پھر سے ٹانکا بھرنا شروع کر دیا۔ اب ان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات میں اضافہ ہو گیا تھا۔ کچھ دیر وہ غصے میں آپ ہی آپ کھولتی رہیں پھر اچانک بند ٹوٹ گیا۔ "ہم نصیبوں جلی نے کیا سکھ پایا ۔۔۔ اس گھر نے جو بھی سکھ کا سانس لینے دیا ہو؟"

"میں پوچھتی ہوں کیا کمی ہے تجھے اس گھر میں؟" دادی نے نفرت سے ناک چڑھا کر پوچھا۔ "اچھا کھاتی ہے، اچھا پہنتی ہے اور کیا چاہیے تجھے؟"

"اچھا کھانا پینا تو جانوروں کو بھی مل جاتا ہے اماں!" بی اماں نے اپنی دانست میں فلسفہ بگھارا۔

"اوہ وہ جو تیرے ناز نخرے اٹھانے کو ہر وقت تیار رہتا ہے؟" دادی نے ان سنی کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"ہے کسر ناز نخرے ۔۔۔" بی اماں بڑبڑائیں ۔۔۔ "قسم لے لو کبھی اس نے ایک پائی بھی مجھ پر صرف کی ہو ۔۔۔" ان کی آواز میں بلا کی حسرت تھی۔

"اے تو وہ کون سے تلاؤں میں رقم گنوا آتا ہے، آخر کو گھر کی ہی ساری رقم خرچ ہوتی ہے۔" دادی کو اپنے بیٹے کا ساتھ منظور تھا۔

بی اماں نے سوئی اٹھا پھر سے ٹانکا بھرنا شروع کر دیا۔ دادی نے دفعتاً ٹھنڈی سانس بھری ۔۔۔ "اے بہو بچارے کو کیسا شوق ہوا کرتا تھا لڑکے کا۔ شادی سے پہلے گھر بھر سے کہا کرتا تھا، اماں میں اپنے پہلے

امی جلدی سے فارغ ہو کر آئیے مُنّی دودھ کے لیے رو رہی ہے

---

کوئی نیا ڈاکٹر آیا ہے۔ دوائی کچھ نہیں دیتا۔ بس کچھ ——"
"وہ —— چودھری اکرم ——" دادی نے اس کی بات کاٹ کر نفرت سے ناک سکوڑی: "یہی نام لیا تھا ناں تم نے کہ آ بنے" (سکینہ اثبات میں سر پر پھوڑ چال سے آئی) "ہنہ اسے بھی دیکھ لیا۔ وہ تو مجھے کوئی مسخرہ لگا۔ ارے کوئی ایسے بھی علاج کرتا ہے ——"
سکینہ اشتیاق سے آگے کو جھک آئی۔
"کیا کہا اس نے آپا ——"
"کہنا کیا تھا —— ایسی ایسی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا رہا ——
ہنہ ——"
سکینہ آنکھوں میں اشتیاق بھرے منہ کھولے چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔
"لو اور سنو —— پوچھنے لگا کتنے بہن بھائی ہو، باپ کیا کام کرتا ہے، تعلیم کہاں تک ہے —— اور ——" دادی نے گہرا سانس بھرا۔ "کہنے لگا گھر کا ماحول کیسا ہے ماں باپ میں لڑائی جھگڑا تو نہیں ہوتا"
(اور روتی ہوئی زہرہ سے سہیلیوں اور رو پنچھیوں نے پوچھا ——
"کاہے کو روتی ہے زہرہ؟" اور زہرہ نے کہا "میں اپنے گھر کی تلاش میں روتی ہوں۔ میرا کوئی گھر نہیں، میرا کوئی گھر نہیں ——" اور سہیلیوں اور پنچھیوں نے حیرت سے سوال کیا —— "کیا یہ تیرا گھر نہیں ——؟ کیا یہ تیرا گھر نہیں ——؟" اور زہرہ نے کہا "نہیں یہ میرا گھر نہیں —— یہ ایک باپ اور بیٹی کا گھر ہے۔ میں اپنے مرد کی تلاش میں روتی ہوں۔ —— میرا کوئی مرد نہیں ——")
دادی نے کرتے کی جیب سے زردے کی ڈبیا نکالی اور ایک چٹکی گالوں میں بھری۔ "اے سکینہ تو سوچ نہیں سکتی اس نے کیسی باتیں کیں۔ پوچھنے لگا ابھی تک اس کی شادی کیوں نہ کی ہو نے تھے بیجا وہ سوالی رہتی ہے شادی کیا تم سے کر دوں —— لو میرا اتنا بتانا تھا کہ ہوشیار ہو بیٹھا۔ کہنے لگا جب گھر میں اس کی شادی کی بات چیت ہوتی ہے تو اس کی بیماری پلٹ آتی ہے ناں ——"
اسے میں کہیں اس کی باتوں میں آ گئی، بس پھر کیا تھا کہنے لگا۔
"بی بی میں نے تمہاری پوتی کی بیماری کی جڑ تلاش کر لی ہے۔ وہ اپنے باپ سے بہت محبت کرتی ہے —— لو اور سنو۔" دادی نے قہقہہ لگایا۔

"کون بیٹی اپنے باپ سے محبت نہیں کرتی۔" کہنے لگا "نہیں بی بی یہ اور قسم کی محبت ہے تم اسے نہیں سمجھ سکو گی —— بڑا آیا مجھے سمجھانے والا۔" دادی کو غصہ آ گیا۔ "نواز نے سدا آمنہ سے پیار کیا ہے کوئی باپ اپنی بیٹی سے کرے گا۔" "اے وہ تو نفس پڑا اٹھو ہے بکا۔ بولا یہی تو بات ہے تبھی تو وہ شادی کا نام سن کر بیمار پڑ جاتی ہے۔ وہ اپنے باپ کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتی ——" ہے تو وہ کوئی مسخرہ لگا؟ تو بھلا اگر وہ دس برس کی عمر تک نواز کے ساتھ سوتی رہی تو کیا ہوا، آخر کو وہ اس کا اپنا خون ہے۔
"پچھلے زمانے میں تو دس برس کی چھوکریوں کی شادی ہو جایا کرتی تھی نا آپا ——" سکینہ غیر شعوری طور پر بلا سوچے کہہ بیٹھی۔ دادی نے اسے چونک کر دیکھا (یہ کیا محل تھا ایسی بات کہنے کا!)
"پھر کوئی علاج بھی بتایا آپا یا باتوں ہی میں ٹال دیا؟"
"علاج —— ہنہ، ایسے مسخرے بھی کبھی علاج بتاتے ہیں لو اور سنو"
آنگن میں سائیکل کھڑا کرنے کی آواز آئی۔ نواز دفتر سے لوٹ آیا تھا —— "ابا —— اب آ گئے امی ——" ساتھ کے کمرے سے آمنہ کی لاڈ بھری آواز گونجی —— (باورچی خانے میں زہرہ نے بھینچے دانتوں سرگوشی کی —— "تجھے زہر کھلاؤں سوکن میری ——" اور پتیل کی دیگچی پوری طاقت سے سامنے کی دیوار پر دے ماری ——)
دادی نے سکینہ کے خوفزدہ چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے اطمینان سے کہا۔
"اے بہو پر ایسے دورے اکثر پڑتے ہیں۔"

کیا رخصتِ یار کی گھڑی تھی
ہنستی ہوئی رات رو پڑی تھی

ہم خود ہی ہوئے تباہ ورنہ
دنیا کو ہماری کیا پڑی تھی

یہ زخم ہیں اُن دنوں کی یادیں
جب آپ سے دوستی بڑی تھی

جاتے تو کدھر کو تیرے وحشی
زنجیرِ جنوں کڑی پڑی تھی

دریوزہ گرِ حیات بن کر
دنیا تری راہ میں کھڑی تھی

غم تھے کہ فراز آندھیاں تھیں
دل تھا کہ فراز پنکھڑی تھی

## م،ن،ارشد،بہاولنگر

وہ غالباً مارچ ۱۹۷۵ء کا شمارہ تھا جو میں نے پہلی دفعہ پڑھا تھا۔ پہلے بھی کئی دفعہ "دوشیزہ" کو بک اسٹالوں پہ دیکھا مگر اسے خالص زنانہ رسالہ سمجھ کر ہاتھ نہیں لگایا، مبادا دوست دیکھ لیں اور سمجھ لیں کہ مجھ میں زنانہ عنصر تو شامل نہیں ہو گیا۔ مگر ایک دفعہ پڑھا تو پتہ چلا کہ یہ "دوشیزہ" تو مردانہ خصوصیات بھی رکھتی ہے۔ مسلسل ناول "فرار" خوب ہے لیکن نئے پڑھنے والوں کے لیے گزشتہ اقساط کا خلاصہ ضرور دیجئے۔ "تیر نیم کش" شروع کریں مگر ذرا تبدیلی کے ساتھ۔ ہر ماہ مخصوص عنوان کے تحت ہی شعر شائع کئے جائیں۔ اس طرح کچھ دلچسپی پیدا ہو گی اور قارئین کو ہر موضوع پر منتخب اشعار بھی مل جائیں گے۔ "آئیڈیل کی تلاش" خوب ہے لیکن ایک طرف تو آپ یہ دعوا کرتی ہیں کہ "دوشیزہ" میں جہیز جیسی برائیوں کے خلاف جہاد کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف ایسی دوشیزاؤں کے آئیڈیل چھاپتے ہیں جو محض فوجی افسر، انجنیئر یا ڈاکٹروں کے خواب دیکھتی ہیں۔ کیا دنیا میں عام آدمی نہیں بستے۔ اگر لڑکیاں صرف بڑے عہدوں کو پسند کریں گی تو مرد بیچارے جہیز کا لالچ کیوں ترک کریں۔

اکیسویں صدی کی ڈائری اچھی لگی۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو ریحانہ فاروقی صاحبہ باقی تین دنوں کا کچا چٹھا بھی کھول ہی ڈالتیں تا کہ وہ مشرق زادیاں اپنی آئندہ صورت دیکھ لیتیں جو مغرب کی تقلید میں اپنی تہذیب بھلا بیٹھی ہیں۔ ریحانہ فاروقی، ابیاسس

سیتاپوری اور فضیلہ تسنیم بلگرامی کی شمولیت ایک انقلابی قدم ہے ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

## محمد شفیق آرزو، راولپنڈی

مئی کا "دوشیزہ" پڑھا۔ افسانوں میں طلعت عزیزی صاحبہ کا "دلِ ناداں" بہت ہی پسند آیا۔ سالگرہ نمبر کی مبارک باد پہنچا دیجئے۔ "آئینہ" اور "میں" بھی عمدہ تھا لیکن "اکیسویں صدی کی ڈائری" نے تو ہلا کر رکھ دیا۔ "فرار" دلچسپ جا رہا ہے۔ غزلیں میری کمزوری ہیں۔ اس دفعہ آپ نے بہت کم پیش کی ہیں۔ تینوں آخری تین کہانیاں "حسب روایت" بہت خوب تھیں۔ ایک غزل بھیج رہا ہوں۔ اس کے علاوہ ایک افسانہ بھی لکھا ہے۔ جلد بھیج دونگا۔ عورتوں اور مردوں کی نفسیات پر ایک فیچر بھی لکھا ہے کیا آپ کو بھیج دوں۔ یہ بھی بتایئے کیا اچھے اچھے لطائف اور اقتباسات بھی روانہ کر دوں۔ شائع کریں گی؟؟

ج:- آپ کی غزل کسی قریبی شمارے میں شائع ہو جائے گی۔ افسانہ کے متعلق اپنی رائے ہم پڑھنے کے بعد ہی مطلع کر سکیں گے۔ مردوں کے فیچر اور لطائف بھیجئے کی بات تو ہم آپ کی صوابدید پر چھوڑتے ہیں کہ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ ضرور بھیجئے اچھے ہوں گے تو شائع ہو جائیں گے

## شبنم، گلگت

کچھ دن پہلے میں اپنی ایک سہیلی کے گھر گئی تھی۔ وہاں میں نے "دوشیزہ" کا ایک شمارہ پڑھا مجھے بہت پسند آیا۔ پچھلے شماروں کی طرح ہے آپ مدد کریں تو نوازش ہو گی۔ کہانیاں سبھی اچھی لگیں۔ مسلسل ناولوں پہ اس وقت سے سکون ملے گا جب پچھلے شمارے مل جائیں گے۔

ج:- شمارے بھیج دیئے گئے ہیں۔ مطالعہ وصول کرنے کے بعد مطلع کیجئے۔ ہماری محنت کو سراہنے کا شکریہ

## محمد اسلم جاوید، کراچی

محترمہ ریحانہ فاروقی کا مضمون "اکیسویں صدی کی ڈائری" نظر سے گزرا۔ پہلی ہی نظر میں دل کی دھڑکن تیز ہو گئی کہ نہ جانے اس وقت یہ نقشہ دہر کیسا ہو جائے گا۔ مبارکباد قبول کرنا ہو گی کہ یہ ایک حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا

میں نے سوچا چلو اپنا چھوٹا پلیٹ سے کر دوشیزہ کی محفل میں پہنچ جاؤں۔ کچھ نہ کچھ تو کہیں بھی مل ہی جائے گا

ج :۔ آپ کی ڈھیروں ڈھیر مبارکباد کے بوجھ تلے ہم بُری طرح دب گئے ہیں۔ اب ذرا تھوڑی سی تنقید کر کے اس بوجھ کو کم کیجئے۔ محفل میں آنے پر آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں مگر پلیز صرف پلیٹ ہی لائیے چمچہ ساتھ نے کر مت آئیے۔ پہلے ہی ان کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے ہیں۔

## خالد قریشی، کراچی

میرے خیال میں "دوشیزہ" کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا راز یہ ہے کہ وہ اصلاحی معلوماتی اور صاف ستھری چیزیں چھاپتا ہے جو ہر طبقے کے لوگوں کی پسند کے عین مطابق ہیں۔ پہلے میں ہفت روزہ اخبار جہاں "تین عورتیں تین کہانیاں" کے لیے لیا کرتا تھا۔ صد شکر کہ یہ پرچہ یہ کمی پوری کر دیتا ہے۔ اس کالم کو شروع کرنے کی مبارکباد لیجئے۔

## جی، ایم، ربینا

میری درخواست ہے کہ ایسے مسئلے جن کو پڑھ کر مدد کو جی چاہے ان لوگوں کے ایڈریس سمیت شائع کیا کریں تاکہ درد مند لوگ ان سے براہ راست رابطہ کر کے جو امداد ممکن ہو کر دیا کریں۔ مجھے بھی اپریل کے شمارے میں شائع ہونے والے خط "حق پرستی کا عذاب" کے لکھنے والے ظفر الاسلام صاحب کا ایڈریس چاہیے کیا وہ مل سکتا ہے۔

ج :۔ اگر ظفر الاسلام صاحب آپ کا خط پڑھ کر ہمیں اپنا پورا ایڈریس بھیج دیں تو ہم ضرور آپ تک پہنچا دیں گے۔ مگر اپنا مکمل ایڈریس تو آپ نے بھی نہیں لکھا۔

## حسیب اختر، ابوظہبی

کیا آئیڈیل کی تلاش میں آپ بہن بھائیوں کے کالم مفت چھاپتے ہیں یا اس کا معاوضہ لیا جاتا ہے۔ مجھے دراصل ایک آئیڈیل بہن کی تلاش ہے۔ میں شادی شدہ انسان ہوں میری کوئی بہن نہیں ہے۔ چاہتا ہوں کہ کوئی آئیڈیل بہن بن جائے جو میری اس محرومی کو پورا کر دے۔ مجھے اس مقصد کو پانے کے لیے آپ کے کالم میں کیا لکھ کر بھیجنا ہوگا؟

ج : کالم "آئیڈیل کی تلاش" میں ہم ان مرد حضرات کو ترجیح دیتے ہیں جو سالانہ ۸ لاکھ یا اتنا چاہتے ہیں نہ سالانہ ۲ لاکھ سے ۴ لاکھ روپے۔ لیکن آپ کا مسئلہ اس "آئیڈیل کی تلاش" سے قطعی مختلف ہے۔ آپ کو ایک بہن کی تلاش ہے مگر اس سلسلے میں کسی بہن نے آپ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہمیں خط لکھا تو وہ شائع کر دیا جائے گا جس کی کوئی فیس نہیں۔

## محمد سرور، کراچی

"دوشیزہ" میں ایک کمی محسوس کرتے ہوئے خط لکھ رہا ہوں کہ اس میں اسلامی طرز زندگی پر بھی کچھ نہ کچھ لکھا جانا چاہیے جو آج کل کی خواتین کے لیے بہت ضروری ہے۔

ج :۔ ہم ہر ماہ دوشیزہ میں اولیائے کرام میں سے کسی ایک کی زندگی کے حالات شامل کرتے ہیں جو عورت اور مرد دونوں کے لیے سبق آموز اور قابل تقلید ہوتے ہیں۔

## ساجدہ افضل، کراچی

شمیم نقوی کا ناول "سپنا" ہمیں بہت پسند ہے۔ جی چاہتا ہے ایک ہی بار سارا ناول پڑھ لوں۔ ہر ماہ بے چینی سے انتظار کرنا پڑتا ہے۔

## احمد حسن شاہد، شاہ نکڈر (سرگودھا)

کسی بھی ماہنامے کی کامیابی کا راز اس کے مضامین کے معیار پر ہے۔ مناسب ترتیب، اچھی کتابت اور ٹائٹل کی خوبصورتی بھی پرچے کی مانگ میں اضافہ کرتے ہیں۔ "دوشیزہ" اس لحاظ سے ایک ابھرتا ہوا معیاری پرچہ ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ آپ کی محنت ثمر آور ہو۔

## ناہید بٹ، جہلم

ماشاء اللہ ہماری "دوشیزہ" روز بروز نکھرتی ہی جا رہی ہے

— اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ
ایک چھوٹی سی ذاتی شکایت ہے کہ آپ نے پچھلی بار میرے خط
میں جہلم کی بجائے جھنگ کر دیا اور خط بھی مختصر کر دیا۔ ایسا کیوں
ہوا۔ بیلی خانم کی آپ بیتی تو ہمارے ہی معاشرے کی بھٹکی ہوئی
نا سمجھ دوشیزہ کی آپ بیتی لگتی ہے۔ آپ کی کہانیوں کا سلسلہ
ہے۔ جو لوگ پہلے اخبار صرف تین تین کہانیاں لے
کے پڑھتے تھے یقیناً اس اقدام سے خوش ہوں گے۔ فروری
میں میں نے اپنے بھائی ارشد بھٹی کی ایک غزل بھیجی تھی وہ اب
تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کی کچھ اور غزلیں آپ کہیں تو بھیجوں۔
ارشد آجکل لندن میں زیرِ تعلیم ہے۔

ج: آپ کے شہر کا نام سہواً غلط شائع ہوا، معذرت
خواہ ہیں۔ خطوط کو مختصر کر کے نہ چھاپا جائے تو
ان صفحات میں صرف چند ایک خطوط شائع ہو
سکیں گے۔ جبکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔
کہانیوں کو پسند کرنے کا شکریہ۔ ارشد کی غزل
ہمیں نہیں ملی ہے۔ آپ ہمیں ان کی دوسری
غزلیں ضرور بھیجئے۔ اچھی ہوئیں تو کیوں نہیں
چھاپ سکیں گے۔

## رزم حسان، واہ کینٹ

آجکل کے لڑکے اور لڑکیاں بڑی تعداد میں غیر شادی شدہ
ہی بوڑھے ہو رہے ہیں۔ ایسے وقت میں "آئیڈیل کی تلاش"
کا کالم بڑی راہنمائی کر سکتا ہے بشرطیکہ لڑکے سنجیدگی سے کام لیں
اور لڑکیاں اتنا اونچا نہ اڑیں کہ متوسط طبقے کے لڑکے حسرت سے
منہ تکتے رہ جائیں۔

## شہناز پروین ناز، کراچی

الیاس ستا پوری اور رضیہ تسنیم بگرامی کی دوشیزہ میں آمد
کی خبر سن کر جی خوش ہو گیا۔ آپ کی کہانیوں کی خوشی کیا کم تھی
اس پر یہ بھی شامل ہو گئی۔ اب ہمیں کسی دوسرے رسالے کی
ضرورت نہیں رہی۔ بس ذرا آئیڈیل کی تلاش میں لڑکیوں کا نام
چھاپ کر مت بٹھایئے کہ ان کی باتیں سن کر شرم سے آنکھیں
جھک جائیں۔ "دوشیزہ کی ڈائری" کے نام سے ایک سلسلہ شروع
کر دیجئے تاکہ ہم لوگ اس کے لیے چھوٹی چھوٹی لطیف باتیں بھیج
سکیں۔ مئی کے افسانے سبھی اچھے تھے۔ خصوصاً "بے شرم" اور "عزیز"
بہت ہی اچھے لگے۔ ریحانہ فاروقی کی ڈائری نے بھی خاصا متاثر کیا۔

## رضوانہ آسی، ساہیوال

• "آئیڈیل کی تلاش" میں فاکہہ صاحبہ جو عنوانات دیتی ہیں
ان میں مختصر کیوں ہوتا ہے۔ اس دفعہ غزلیں بہت اچھی تھیں،
افسانے بھی اچھے تھے۔ خطوط کا جواب بھی دیا کریں تاکہ لکھنے اور
پڑھنے والوں کو مزید دلچسپی ہو۔ میں لڑکوں کے آئیڈیل شائع کرنے
کی حامی ہوں۔

ج: ہماری محنت سراہنے کا شکریہ۔ آئیڈیل کی تلاش
میں دیئے گئے عنوانات لوگوں کی توجہ کو نئے اور دلچسپ
بڑھانے کے لیے دیئے جاتے ہیں اور قارئین کی کثرت
نے انہیں بے حد پسند کیا ہے۔ پھر بھی آپ کی رائے
متعلقہ شعبے تک پہنچا دی گئی ہے۔

## شہر بانو سحر، پشاور

• "بیلی" اور "بہینا" دونوں کہانیاں بہت دلچسپ ہیں
لیکن مجھے مئی کے افسانے کچھ پھیکے لگے۔ مردوں کے افسانے ختم
مت کیا کریں۔ مجھے ہلکے پھلکے رومانی افسانے اچھے لگتے ہیں۔
اشعار کی محفل پھر سے شروع کر دیں۔

## خورشید انور، کراچی

• "دوشیزہ" ایک رسالہ نامہ ہی نہیں خواتین کے لیے ایک
بہت بڑا راہنما بھی ہے۔ مرد حضرات بھی اس کے ذریعے ان
مسائل سے آگاہ ہو رہے ہیں جنہیں معاشرے کے ارتقاء کے لیے
جاننا بہت ضروری ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ "آئیڈیل کی تلاش"
والا کالم علیحدہ سے مت چھاپیں۔ اسے رسالے کے ساتھ ہی رکھیں۔

## ایم ایس سلیم، لائلپور

مئی کے شمارے میں افسانہ "پانا" بہت عمدہ تھا۔ آپ
سے ایک گزارش ہے کہ اشعار کا کالم شروع کریں۔ آجکل امتحانات
سے فارغ ہوں۔ آپ کے رسالے نے فراغت اور بوریت کے
احساس سے بچا لیا۔ ورنہ روز شام تک بڑی بوریت رہتی۔

اس کا ذکر کرنا چاہیے۔

ثریا کی واپسی دو بجے کے بعد ہی ہوئی۔ وہ بہت تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے تھکے تھکے سے اور گہری سانس لیتے ہوئے مسکرا کر بولی "تم نے کوئی عمدہ چیز پکائی ہے۔ میں یہیں سے محسوس کر رہی ہوں" میں مسکرا کر رہ گئی۔

ثریا واش بیسن پر کھڑی ہو کر منہ ہاتھ دھونے لگی اور میں میز پر کھانا چننے لگی "تمہیں تھوڑی دیر کے لئے کھانا نکالنا ہے" ثریا منہ دھوتے ہوئے بولی "پرویز مجھے دروازے پر چھوڑ کر گیا ہے۔ وہ پھل لے کر واپس آئے گا اور کھانا ہمارے ساتھ کھائے گا" میں نے سوچا یہی موقع ہے جو اسے بشیرن کے بارے میں بتا دوں۔ میں نے دیکھا وہ ابھی تک جھکی ہوئی منہ دھو رہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں بولی "ثریا خانم! آج ایک شخص تم سے ملنے آیا تھا۔ اس نے خود کو بشیرن کہہ کر متعارف کرایا تھا اور کہا تھا کہ تم اسے فوراً ٹیلی فون کر دو۔"

منہ دھوتے دھوتے ثریا ایک پھرکی کی مانند میری جانب گھومی۔ میں نے دیکھا کہ پل بھر میں اس کا چہرہ ہلدی کی مانند زرد پڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شدید اضطراب اور خوف جھانکنے لگا تھا۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں سے دبا لیا۔ چند لمحوں تک ساکت و جامد کھڑی رہی۔ پس منظر میں صرف واش بیسن کی ٹونٹی سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر ثریا سنبھلی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی "میں تمہاری شکر گزار ہوں لیلی جان اور ساتھ ہی یہ درخواست ہے کہ پرویز کے سامنے کبھی بھول کر بھی بشیرن کا تذکرہ نہ کرنا۔ اب یہ بات تم اپنے سینے میں دفن کر لو۔ اس سلسلے میں اگر تم نے اپنا منہ بند رکھا تو تم زندگی میں مجھ سے بہتر دوست نہ پاؤ گی۔ یہ تم نے اچھا کیا کہ تم نے مجھے تنہائی میں بشیرن کے بارے میں بتایا۔ تم نے میری نظروں میں اپنی وقعت بڑھا لی ہے اور میں تمہاری حیثیت متعین کر چکی ہوں" ثریا خاموش ہو گئی۔ وہ ہاتھ منہ دھونا بھول چکی تھی۔ خاموشی سے اس نے ٹونٹی بند کی اور میری طرف گھومتے ہوئے دوبارہ بولی۔

"تم یہ نہ سمجھنا کہ میں کوئی بری عورت ہوں اور پرویز سے خیانت کر رہی ہوں۔ دراصل میرے کچھ مسائل ہیں اور میں باوجود کوشش کے انہیں حل نہیں کر پا رہی ہوں" پھر وہ خوشامدانہ لہجے میں بولی۔

"تم نے مجھے جیت لیا ہے لیلی جان، تم نے مجھے اپنا غلام بنا لیا ہے۔ اب تم دیکھو گی کہ ثریا تمہاری کتنی بہترین دوست ہوتی ہے"

ان سب باتوں کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ سوچ میں پڑ گئی کہ یہ بشیرن کون ہے اور اس کا ثریا کی زندگی میں کیا عمل دخل ہے۔ بشیرن کے ذکر سے ثریا اس قدر ہراساں اور وحشت زدہ کیوں ہو گئی تھی۔ اگر کوئی خاص بات نہیں تھی تو وہ پرویز سے بشیرن کی شخصیت کو چھپانا کیوں چاہتی تھی۔ اس کی گفتگو سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے منسوب ہیں اور عنقریب شادی کرنے والے ہیں۔ پھر درمیان میں یہ بشیرن کہاں سے آ ٹپکا۔ ضرور کوئی خاص بات ہے مگر مجھے اس سے کیا۔ میرے خود اپنے کون سے کم مسائل ہیں۔ جو کچھ ہے اور جو کچھ ہوتا ہے کل معلوم ہو جائے گا۔ اس قدر عجلت اور بے صبری بھی کیا۔

ایک صبح جبکہ ہم ناشتے کی میز پر بیٹھے ہوئے تھے ثریا نے مجھ سے پوچھا "لیلی! تمہارے پاس کتنی رقم ہے؟"

میں چونک پڑی۔ بڑا بے موقع اور بے محل سوال تھا۔ فریدہ نے بھی مجھ سے یہی سوال کیا تھا۔ کیا یہ ثریا بھی مجھ سے قرض کے طور پر کچھ رقم طلب کرے گی اور پھر شاید فریدہ کی مانند اس کی واپسی بھی نہ ہو سکے۔ بہرحال میں جھوٹ نہ بول سکی "شاید تین چار سو تومان" میں لہجے کو پرسکون بناتے ہوئے بولی۔

"یہ ناکافی ہے" ثریا نے کہا۔

"میں تمہیں پانچ سو قرض دے رہی ہوں۔ جب تمہارے حالات بہتر ہو جائیں تو واپس کر دینا۔ دراصل [illegible] ہم شاپنگ کے لئے باہر جائیں گے۔ تم اپنے لئے کپڑے خرید لینا۔ جو خریدو گی اس کی قیمت خود ادا کرو گی۔ پھر تمہیں قرض دینے کی ایک وجہ اور بھی ہے وہ یہ کہ میں نہیں چاہتی کہ پرویز کو معلوم ہو کہ میرے پاس اس قدر زیادہ رقم ہے" ثریا نے جبراً میری مرضی کے خلاف مجھے قرض دیا اس لئے کہ اس میں میرا نہیں اس کا فائدہ تھا۔ میں نے نوٹ سنبھال کر رکھ لئے۔

وہ دن میری زندگی کا ایک یادگار دن تھا۔ یہ کس قدر عجیب اور حیرت انگیز بات تھی کہ میں گاڑی میں بیٹھی چوروں کی مانند چھپ کر تم سے تہران آئی تھی۔ اس گاڑی میں انتہائی شاہانہ انداز میں بیٹھ کر تہران کی شاہراہوں اور شاپنگ سینٹرز کی سیر کر رہی تھی۔ میں نے ہر چند خود کو پرسکون اور ضبط میں رکھنے کی کوشش کی مگر میرا ہیجان اور ولولہ چھپا نہ رہ سکا۔ میری ہیجانی کیفیت کچھ عجیب سی ہو رہی تھی۔ میں اس وقت اس آٹھ سالہ بچی سے بالکل مشابہ تھی جو گھر سے پہلی بار قریبی میلہ دیکھنے نکلی ہو اور گردن اچکا اچکا کر ہر چیز کو حیرت اور تجسس سے دیکھتی ہو۔ ثریا اور پرویز میری اس کیفیت سے بہت محظوظ ہو رہے تھے اور بار بار مسکرا کر ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگتے تھے۔ انہیں میرے جذبات اور احساسات کا کیا اندازہ۔ وہ میرے دل میں جھانک کر دیکھتے۔ یہی تو وہ تہران تھا جس کی خاطر میں نے اس قدر صعوبتیں اور تکلیفیں جھیلی تھیں۔ میں اپنی پہلی ٹرپ کے تہران میں گھوم رہی تھی اور پا پیادہ نہیں تھی۔ میرے جسم پر بوسیدہ، گرد میں اٹا ہوا اور پسینے سے تر لباس نہیں تھا بلکہ میں شاندار گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھی اور میرے جسم پر بہترین لباس تھا [illegible] رہا تھا کہ اس کی زیبائش [illegible]

اس دن ہم نے بہت شاندار خریداری کی۔ میں نے [illegible]

جن کا عام حالات میں صرف تصور ہی کر سکتی تھی۔ شام کو ہم تہران سے باہر نکل جاتے
میں سیر کرنے گئے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سب خواب و خیال کی باتیں ہیں۔
اور میں بزدل سی اپنے پرانے بستر پر لیٹی ہوئی تہران کے خواب دیکھ رہی ہوں۔ میں
نے اپنے جسم میں چٹکیاں لیں، نہیں یہ خواب نہیں تھا۔ تہران میں ہی تھی۔ یہ خواب
نہیں حقیقت تھی۔ میں ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ آرام یہ
عیش اور یہ سکون ایک بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہیں۔ آنے والے دن میرے لئے
بڑی ہولناکیاں لے کر آ رہے ہیں۔ اور یہ موجودہ عیش ایک دم ہی ختم ہو جائے گا۔

ایک صبح کام پر جاتے وقت ثریا نے مجھ سے کہا۔

"لیلیٰ جان! میری ایک بات غور سے سنو۔ میری غیر موجودگی میں اگر تمہیں
باہر جانے کی ضرورت پیش آئے تو مثلاً خریداری وغیرہ کے سلسلے میں تو زیادہ دیر تک
باہر مت ٹھہرنا۔ شاید میری غیر موجودگی میں وہ آ جائے۔"

"کون! البشیر!!" میں نے ایک اندازہ لگایا۔

"ہاں جانم!" ثریا مجھ سے پیار سے بولی۔ "اگر وہ آئے تو اس سے تپاک
سے ملو۔ اندر لے آؤ۔ چائے پانی سے تواضع کرنا اور اس وقت تک روکے رکھنا جب
تک کہ میں نہ آ جاؤں۔" پھر وہ رکی اور معنی خیز لہجے میں بولی۔

"اور تم کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کرو گی۔ معاہدہ یاد ہے نا؟" اس نے لفظ
معاہدے پر زور دیا۔

"ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے تم مطمئن رہو۔" میں نے اطمینان دلایا۔

وہ چلی گئی مگر مجھے خیالات کے ہجوم میں چھوڑ گئی۔ کچھ دیر بعد میں اٹھی اور
کام کاج میں لگ گئی۔ دس بجے تھے کہ باہر گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ میرا دل دھک
دھک کرنے لگا۔ خدایا یہ بے موقع اور بے وقت کون آیا ہے۔ ثریا البشیر کے لئے
پیش بندی کر گئی تھی ممکن ہے وہی ہو۔ میں مرے ہوئے قدموں سے دروازے
کی طرف روانہ ہو گئی۔ دروازہ کھولا تو میرے سامنے ثریا کھڑی ہوئی تھی۔ اس
نے بڑی عجلت کے عالم میں مجھے بوسہ دیا اور خوابگاہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں بھی
اس کے پیچھے چل پڑی۔ راستے میں وہ ایک ایک کر کے لباس اتارتی جا رہی تھی
اور میں انہیں سمیٹتی جا رہی تھی۔ جب وہ خوابگاہ میں داخل ہوئی تو بالکل ننگی تھی کیا
ثریا اس قدر ننگی عورت تھی اسے مجھ سے کوئی شرم نہ آ رہی تھی۔ میں لڑکی اور
اس کی ہم جنس تھی تو کیا کپڑے پہننے اور اتارنے کے بھی کچھ اصول ہیں اور یہاں پہننے
کے بھی اصول ہیں۔ مگر ثریا عجیب بے پرواہ اور بے حجاب عورت تھی۔ وہ برہنہ
تھی تو میں اس سے نگاہیں نہیں ملا پا رہی تھی یہ میرے لئے بہت زیادہ تھا۔
میں تو غسل خانے میں مشکل سے کپڑے اتارتی تھی۔ میں نگاہیں پھیرتے ہوئے بولی۔

"تم نے نیچے بھی کچھ نہیں پہنا؟"

"ضروری تو نہیں جانم!" وہ بے باکی سے ہنستے ہوئے بولی۔ پھر اس
نے اپنے لئے ایک انتہائی مختصر لباس منتخب کیا۔ میں اس سے کچھ پوچھنا چاہ رہی

بزدل کے بچے ذرا باہر تو نکل کے آ ذرا!

تھی مگر اس نے بڑی خوبصورتی سے مجھے ٹال دیا۔ پھر میں نے خود ہی سوچا کہ
مجھے خاموشی اختیار کر لینی چاہئے اور ان کے معاملات میں مداخلت سے گریز کرنا
چاہئے۔

ثریا نے اپنے لئے جو لباس منتخب کیا تھا وہ مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ
انتہائی باریک اور شفاف تھا۔ اس لباس میں اس کے جسم کے تمام خطوط و نشیب و
فراز واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے۔ اور اس لباس کا مقصد بھی یہی تھا۔ اس
نے خود کو عریاں رکھنے کے لئے بڑا شاندار اہتمام کیا تھا۔ اس وقت اس کی حرکات و
سکنات میں بھی بہت بے حجابی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ مجھ سے باتیں کرنے لگی۔
اور گفتگو کے دوران اپنی موجودہ حیثیت اور حالت کا دفاع کرنے لگی۔ وہ ایسا
ظاہر کر رہی تھی جیسے وہ یہ سب کچھ کرنے پر مجبور ہو۔ ورنہ دل سے پسند نہیں
کرتی۔ وہ اس وقت جس رنگ روپ میں دکھائی دے رہی تھی۔ خود کو اس کا
قصوروار نہیں سمجھتی تھی۔ پھر اس نے مجھ سے کچھ وعدے کئے۔ کچھ یقین دہانیاں
کرائیں۔ اس نے شکل و صورت سے مکاری و عیاری نہ ٹپکنا چاہا۔ میں خاموش تماشائی بنی
اسے تکتی رہی۔ ثریا نے ایک فیشن ایبل شانی اور سینہ گردن اور جسم کے دوسرے حصوں
پر خوشبو چھڑکنے لگی۔ دل ہی دل میں ایک دیہاتی اور شہری لڑکی کی زندگی کا مقابلہ
کرنے لگی۔ کیا تہران میں نوجوان لڑکیوں کی یہی روش اور طرز زندگی ہے۔
کتنی آسانی سے خود کو مرد کے حوالے کر دیتی ہیں جیسے کوئی خاص بات نہ ہو جیسے
کچھ ہوئے چلی گئی ہوں۔ جیسے ایک گلاس پانی پی لیا ہو کیا تمام لڑکیوں کا یہی
حال ہے۔ اسی وقت باہر گھنٹی بجی اور ثریا بے اختیار اچھل پڑی۔ اس نے خوشبو
کی شیشی رکھ دی اور میرے دونوں بازو پکڑتے ہوئے جلدی جلدی بولی۔

"لیلیٰ جان! تم اسے دوسرے کمرے میں لے جا کر بٹھاؤ۔ سنو! اصل
میں نہیں چاہتی کہ اسے تمہاری موجودگی کا علم ہو۔ اگر میں گھر پر نہ ہوتی تو دوسری
بات تھی تم اس کی پذیرائی کر سکتی تھیں مگر اب میری موجودگی میں تمہارا رہنا مناسب نہیں

کہتی کہ تم اس کے سامنے آ جاؤ۔ اسے احساس ہو کہ میں گھر پر تنہا نہیں ہوں"
"مطمئن رہو۔ اسے میری موجودگی کا علم ہرگز نہیں ہو سکے گا" میں نے
ملامت کے انداز میں کہا۔ وہ خوش ہو گئی اور کسی ہرنی کی مانند قلانچیں بھرتے
ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ میں ان دونوں کو
دیکھ نہیں رہی تھی مگر ان کی آوازیں میرے کان میں پہنچ رہی تھیں۔ میرا خیال درست
ثابت ہوا وہ بشیرن ہی تھا۔ ان کی گفتگو کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ مدت سے
ان کے درمیان راہ و رسم ہے۔

"کوئی اور گھر میں نہیں ہے" بشیرن نے پوچھا۔

"اور کون ہو سکتا ہے"

"وہ لڑکی جو چند دن پہلے مجھے یہاں دکھائی دی تھی۔ تم نے بتایا نہیں کہ وہ کون تھی"

"وہ میری دوست تھی کبھی کبھی آ جاتی ہے" ثریا کی آواز سنائی دی۔

"چیز بری نہیں تھی" بشیرن ہنستا ہوا بولا۔

"اچھا اب نظر سیدھی ہی رکھنا۔ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے" ثریا بھی ہنستے ہوئے بولی۔

وہ دونوں کمرے میں داخل ہو گئے اور ان کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ پھر دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی میرا تجسس بیدار ہونے لگا۔ میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ میں ان کے کمرے کے سامنے سے گزری۔ وہ اب بھی گفتگو کر رہے تھے مگر آواز اس قدر ہلکی تھی کہ میں کوشش کے باوجود کچھ نہ سن سکی۔ یہ محسوس کر کے کہ میں ان کی گفتگو نہ سن سکوں گی مجھے غصہ سا آنے لگا۔ ثریا اور بشیرن نے گویا اس وقت مجھے مشتعل کر دیا تھا۔ میں کئی منٹ تک گو مگو کے عالم میں کھڑی رہی۔ وہ اندر کچھ بھی کر رہے ہوں مجھے اس سے کیا غرض۔ میں نے خود کو سمجھایا، قائل کیا مگر دل تھا کہ سرکشی پر آمادہ تھا۔ دماغ تھا کہ سُن ہوا جا رہا تھا اور رگوں میں خون کا یہ عالم تھا کہ جیسے ابھی رگیں پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ میرا دماغ گھومنے لگا اور حلق ایک دم خشک ہو گیا۔ میں خود کو سنبھالنے کے لئے باورچی خانے میں چلی گئی مگر وہاں بھی مجھ سے رکا نہ گیا۔ دیکھا تو پھر گھوم پھر کر ثریا کے بند کمرے کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ کچھ خوف، کچھ اشتیاق نے مجھے ایک عجیب ہیجانی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ دل و دماغ ایک ہی تقاضا کر رہے تھے۔ سنو، سنو وہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ دیکھو دیکھو وہ کیا کر رہے ہیں۔ میں ہیجانی کیفیت میں دروازے سے بالکل چپک کر کھڑی ہو گئی۔ میرا ایک ہاتھ سینے پر تھا۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے بالوں کو پیچھے کیا اور کی ہول سے آنکھیں لگا دیں۔ میری آنکھیں کمرے کا طواف کرتی ہوئی مسہری پر اٹک کر رک گئیں۔ جو کچھ میں دیکھ رہی تھی باور کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ مگر سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ کان جھٹلاتے ہیں مگر آنکھیں نہیں جھٹلاتیں۔ ثریا

کی منگنی ہو چکی تھی اور وہ عنقریب چیف سے شادی کرنے والی تھی۔ اور شادی کی اجازت لینے ہی وہ اصفہان چیف کی ماں کے پاس گئے تھے۔۔۔ پھر پھر وہ بشیرن کے ساتھ یہ اختلاط کیوں تھا۔ آخر یہ کیسی عورت تھی۔ میرا بھی عجیب [illegible] کا کردار ہو سکتا ہے۔ وہ کپڑوں سے بے نیاز حیوانوں کی مانند ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھے۔ اس سے زیادہ مجھے دیکھنے کا یارا نہ تھا۔ یہ سب کچھ دیکھنے کا مجھے شوق اور جستجو تھی مگر اب سوچ رہی تھی کہ نہ ہی دیکھتی تو اچھا تھا۔ انسانوں کے بھی کتنے روپ ہوتے ہیں کہیں وہ حیوان ہے کہیں فرشتہ۔ میں ثریا کو کوئی خاص مقام دینے سے قاصر تھی۔ میں دروازے سے ہٹی اور شکست خوردگی کے ساتھ کمرے تک آ کر اپنے بستر پر گر گئی۔ میں سوچ اور اندیشوں کی دنیا میں کھو گئی۔ میرا ذہن ایک بار پھر اپنی ماں، فاروق، بیوی، والد، بھائی اور آغا کی طرف چلا گیا۔ وہ سب ہی کچھ لوگ تھے۔ کچھ اچھے کچھ برے۔ میرا خیال ہے زندگی اچھائیوں اور برائیوں سے ہی عبارت ہے۔ صرف نیکی ہی نیکی کی تلاش کرنا حماقت ہے۔ پھر بھی آدم اور غلام یاد آئے۔ ان کی کتنی اچھی صفتیں تھیں کیا ان جیسے لوگوں کا دنیا میں قحط ہے۔ کیا دنیا میں [illegible]، فریدہ، ممی، اصغر، ثریا اور بشیرن جیسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے۔ نیکی کو عام کرنے میں قدرت نے بہت بخل سے کام لیا ہے۔ میری سوچ کی رو پھر ثریا کی طرف منتقل ہو گئی۔ یہ عورت پیاز کی مانند تھی جو تہہ در تہہ کھلتی جا رہی تھی مگر اندر کچھ نہیں تھا۔ شادی وہ چیف سے کرنا چاہتی تھی جبکہ [illegible] بشیرن سے ہوتی تھی۔ ثریا کوئی الہڑ، معصوم اور نو دیدہ دوشیزہ نہیں تھی۔ ایک خاصی عمر رسیدہ اور مکمل عورت تھی۔ میرا خیال ہے چیف بھی یہ بات جانتا ہو گا کیونکہ وہ خود بھی ثریا کے جسم سے فیضیاب ہو چکا ہے۔ افسوس تو مجھے چیف کی ماں پر ہو رہا تھا۔ وہ بے چاری نیک خو اور نیک دل خاتون سوچ رہی تھی کہ اس کا بیٹا ایک نجیب الطرفین اور خاندانی لڑکی سے شادی کرنے جا رہا ہے۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ اس کی ہونے والی بہو شادی سے پہلے ہی نہ صرف اس کے بیٹے بلکہ دوسرے مردوں کا بھی پہلو گرم کرتی رہی ہے۔ خدایا یہ تہران کیسا شہر ہے۔ یہاں کے لوگ کیسے ہیں۔ انہیں سمجھنا آسان نہیں۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد مجھے ثریا کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ باورچی خانے کی طرف گئی تھی۔ پھر جلد ہی اس کی واپسی ہوئی تھی۔ اس نے شاید کچھ فریج سے نکالا تھا۔ ان کے کمرے کا دروازہ دوبارہ بند ہو گیا۔ تنہائی نے ایک بار پھر مجھے آ لیا۔ ثریا نے مجھے بشیرن کے سامنے آنے سے روکا تھا۔ شاید یہی میرے لئے بہتر تھا۔ ثریا اپنے دوستوں کو بہتر طور پر پہچانتی ہے۔ پھر مجھے ان کی زور سے باتیں کرنے اور ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ کچھ دیر بعد بشیرن واپس چلا گیا تھا۔ اس عرصے میں، میں اٹھی اور کمرے تک پہنچی جو ثریا کے لباس کو الماری میں رکھ دیا۔ اس کے جوتے اور موزے مخصوص جگہ رکھے اور کمرے کو صاف کرنے لگی۔

**مہندر ناتھ**

"میں اپنی بیوی کے ساتھ شادی کروں
اور وہ بھی بارہ برس کے بعد"

**انوکھے میاں بیوی کی انوکھی داستان**

**کامنی** میری بیوی ہے۔ اس کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے تقریباً بارہ سال ہوگئے ہیں اور یہ پڑھ کر آپ واقعی حیران ہوں گے کہ ان بارہ برسوں میں میری اور کامنی کی آپس میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی گو یہ عرصہ اتنا لمبا ہے کہ لڑائی تو ہونی چاہیئے تھی سا گر اس عرصے میں طلاق کی نوبت آجاتی تو بھی اچنبے کی بات نہ تھی۔ لیکن میری بیوی کی بات اور ہے اس قسم کی بیویاں ذرا مشکل سے ملتی ہیں۔ کامنی سے میری ملاقات آج سے بارہ برس پہلے ایک خوبصورت دوپہر کو ہوئی تھی۔ ایک ایسی دوپہر جب سورج ٹھیک سر پر تھا ـــــ اور اس نے ہم دونوں کو اتنا قریب کر دیا کہ آخر تک ہم دونوں کو ہمیشہ کے لئے ایک ہونا پڑا۔

اگر آپ میری بیوی کو دیکھیں گے تو آپ اسے قبول صورت ضرور کہیں گے۔ جب میں نے اسے دیکھا تو وہ مجھے بے حد خوبصورت اور حسین نظر آئی تھی۔ میں نے سوچا کہ ایسی لڑکی دنیا کے کسی کونے میں نظر نہیں آئے گی۔ اس کی نیلی نیلی آنکھیں، جو اب پیلی پیلی ہوگئی ہیں۔ لیکن اب بھی مجھے نیلی ہی نظر آتی ہیں، اس وقت بڑی پرکشش اور دل آویز دکھائی دیں۔ اور جب میں نے اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے سر سے لے کر پاؤں تک قیامت دکھا دی۔ میرے سارے بدن میں کپکپی دوڑ گئی تھی، ایسا سندر اور سڈول جسم میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ میرے ان لفظوں کو ناپسند کریں۔ جو میں نے اپنی بیوی کے بارے میں استعمال کئے ہیں۔ اور جو اپنی بیوی کے بارے میں استعمال نہیں کرنے چاہئیں لیکن میں آپ سے یہ عرض کر دوں کہ میری محبوبہ بھی ہے اور محبوبہ کے بارے میں اس قسم کے جملے لکھنا کوئی بے ادبی نہیں۔

جہاں تک میری بیوی کی سیرت کا تعلق ہے وہ بے مثال ہے صورت اور سیرت کی وجہ سے میں اس کے اتنا قریب آگیا کہ پھر پیچھے نہ ہٹ سکا۔

جب ہم دونوں پہلی بار اس چلچلاتی دھوپ میں ملے تو نہ

ضیاء تسنیم بلگرامی

میں تثلیث کا چرچا تھا اور دروازے پر صلیب کا نشان بنا ہوا تھا۔ ماں کے گلے میں جو قیمتی ہار پڑا تھا اس میں بھی چاندی کی صلیب لٹکی ہوئی تھی۔ باپ کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی افتاد پڑتی فوراً سینے پر انگلیوں سے صلیب کا نشان بنا لیا۔ اکثر جب زوروں کی بارش ہو رہی ہوتی اور بجلی کا کڑکا لوگوں کو دہلا دیتا، اس کے والدین اپنے اپنے سینوں پر صلیب کا نشان بنانے لگتے۔ معصوم بچہ اپنے والدین کی یہ حرکت نہایت غور سے دیکھتا رہتا۔ پھر اسے گرجے میں لے جایا جاتا۔ وہاں اس نے ایک جگہ حضرت مسیح کی فرضی تصویر دیکھی جنہیں صلیب پر لٹکا دیا گیا تھا۔ اور ہاتھوں پیروں سے خون کے بڑے بڑے قطرات ٹپک رہے تھے۔ مسیح کے آس پاس ان دو چوروں کے مصلوب جسم تھے، جنہیں اس دن حضرت عیسیٰ کے ساتھ صلیب پر چڑھا دیا گیا تھا۔ بچہ ان مشاہدات اور واردات کا کیا اثر لیتا رہا۔ اس کا کسی کو بھی علم نہ تھا۔ لیکن بچہ اپنے فرصت کے اوقات میں ان بزرگوں کی صحبت میں پہنچ جاتا جو مسلمان تھے۔ اور ان کا معاشرے میں ایک خاص مقام تھا۔ ان کی روحانیت کا دُور دُور تک شہرہ تھا۔ ان کی دنیا عام لوگوں کی دنیا سے بالکل مختلف تھی اور جن کا ایک خاص طرزِ فکر تھا۔ جن کے گرد ہمیشہ ہزاروں ارادت مندوں اور مریدوں کا ہجوم رہتا تھا اور جن کے اثرات کا یہ حال تھا کہ بڑے بڑے صاحبانِ منصب ان سے خوفزدہ رہتے تھے۔ اور فرماں روائے وقت جن کے در کی حاضری اور ناصیہ فرسائی کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔ یہی بچہ ان کی محفلوں میں جاتا اور وہاں کی حرکات و سکنات اور اعمال و اشغال کا بڑی دلچسپی اور انہماک سے مشاہدہ کرتا۔ باپ بھی اپنے بچے کی حرکات اور اعمال کا گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے ہم قوم حضرات نے بھی باپ کو اس تشویش سے آگاہ کیا کہ اگر بچے کی نگرانی نہ کی گئی اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا تو وہ ان کے ہاتھ سے نکل کر بے دین ہو جائے گا۔ اور مسیحیت کو چھوڑ کر اسلام کا دامن پکڑ لے گا۔

اس دن بھی جب وہ مسلمان بزرگوں کی صحبت سے اٹھ کر گھر پہنچا

اِس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

شیخ فریدالدین عطار — مفتی غلام سرور لاہوری — رئیس احمد جعفری — دارا شکوہ — شیخ عبدالحق محدث دہلوی

اس کے والدین اس کا نہایت بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے بچے کو دیکھتے ہی سوال کیا: "بیٹے تم کہاں گئے تھے؟"
بیٹے نے جواب دیا: "روحانی صیقل گروں میں۔"
باپ نے حیرت سے پوچھا: "یہ کون لوگ ہیں؟"
جواب ملا: "یہ وہ لوگ ہیں جو زنگ آلود روحوں کو مجلا کر دیتے ہیں۔"
باپ نے مزید سوال کیا: "یہ مسیحی ہیں یا مسلمان؟"
بیٹے نے جواب دیا: "مسلمان، کیونکہ مسیحی روحانیوں کی روحیں خود ہی زنگ آلود ہو چکی ہیں۔"
اس کم عمری میں ایسا شاعرانہ جواب! والدین حیران رہ گئے۔ دونوں نے آپس میں سرگوشی کی۔ باپ نے بیوی سے کہا: "لڑکا بے دین ہوتا جا رہا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟"
بیوی نے مخلصانہ مشورہ دیا: "اسے فوراً مسیحی مکتب میں داخل کر دیا جائے۔ مدرسین خود ہی اصلاح کر لیں گے۔"
باپ نے اس مشورے پر دوسرے ہی دن عمل کر دیا اور بچے کو ایک مسیحی مدرسے میں داخل کر دیا۔ باپ کا یہ عمل بیٹے کو پسند تو نہ آیا لیکن اس نے باپ کی نافرمانی بھی نہیں کی۔ باپ نے معلم کو سمجھایا: "جناب! یہ بچہ مسلمانوں کی صحبت میں خاصا بگڑ چکا ہے۔ اب یہ آپ کی ذہانت اور تجربے کا امتحان ہے کہ آپ اس کے دل و دماغ سے اسلام اور اس کے اثرات کو کس طرح دھو ڈالتے ہیں۔"
معلم نے ان دونوں کو غور سے دیکھا تو ایسا محسوس ہوا کہ باپ کے چہرے پر جتنی زیادہ الجھن اور پریشانی ہے، بیٹے کے چہرے پر اتنی ہی زیادہ طمانیت اور سکون ہے۔ معلم نے سر کے اشارے سے باپ سے چلے جانے کو کہا اور بیٹے کو اپنے قریب بٹھا لیا۔ کچھ دیر بعد معلم نے اپنے ایک شاگرد سے کہا: "ذرا باہر نکل کر دیکھنا تو اس کا باپ چلا گیا یا ابھی باہر موجود ہے؟"
شاگرد نے باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھا اور اندر جا کر استاد کو مطلع کیا: "وہ گھر جا چکا ہے۔"
اب معلم نے [illegible] اختیار کی اور چہرے پر خشگی طاری کر لی۔ بچے کو حکم دیا: "تیرا باپ کس مذہب پر ہے؟"
بچے نے جواب دیا: "میرا باپ مسیحی ہے، کیا آپ یہ بات نہیں جانتے؟"
"جانتا ہوں۔" استاد نے درشت لہجے میں کہا۔ "اور تو کس دین پر ہے؟"
بچے نے جواب دیا: "بظاہر تو میں اپنے آبائی دین پر ہوں لیکن میری روح میں اسلام کی شمع روشن ہو چکی ہے اور اس کی ہلکی ہلکی گرمی میں شرک اور تثلیث منجمدات کی طرح اڑتے جا رہے ہیں۔"
استاد نے حکم دیا: "کہو ثالث ثلاثہ (خدا تین ہیں)۔"

بچے نے تن کر جواب دیا: "ہو اللہ احد (خدا تو ایک ہے)۔"
استاد نے غصے میں ایک زور کا طمانچہ رسید کر دیا اور حکماً کہا: "کہو ثالث ثلاثہ۔"
بچے نے اسی استقلال و استقامت سے جواب دیا: "ہو اللہ احد۔"
استاد نے نہایت بے دردی سے پٹائی شروع کر دی اور خدا کے تین ہونے پر اصرار کرتا رہا۔ لیکن تندی اور مستقل مزاج بچہ خدا کے ایک ہونے کا اقرار کرتا رہا۔ آخر جب یہ مار پیٹ اپنے عروج کو پہنچی تو شاگردوں نے مخل ہو کر اس ہنگامے کو ختم کر دیا۔ بچے نے استاد اور مدرسے کی طرف سے مایوس ہو کر راہ فرار اختیار کی اور گھر کی بجائے حضرت علی بن موسیٰ رضا کے گھر کا رخ کیا۔
علی بن موسیٰ رضا نے ایک بچے کو اپنے در پر کھڑا ہوا دیکھا تو سوال کیا: "بیٹے! تم کس کے پاس آئے ہو؟"
زخمی بچے نے بھرائی آواز میں جواب دیا: "آپ کے پاس۔"
ابن موسیٰ رضا نے بچے کے زخمی رخساروں کی طرف دیکھ کر کہا: "کیا تمہیں کسی نے مارا ہے؟"
"ہاں!" بچے نے نہایت صبر و سکون سے جواب دیا۔ "میں کہتا تھا خدا ایک ہے اور میرا مسیحی معلم اس پر مصر تھا کہ میں تین خداؤں کا اقرار کروں۔ اس تکرار میں میری مرمت کر دی گئی۔"
ابن موسیٰ رضا نے بچے کے دونوں زخمی گالوں کو سہلانا شروع کر دیا اور نہایت شفقت سے مکان کے اندر لے گئے۔ فرمایا: "بیٹے! تو کتنا خوش قسمت ہے کہ نصرانیوں میں پیدا ہوا اور ایک خدا کی تصدیق کی۔ لوگوں کا آبائی مسلمان ہونا بھی نہایت دشوار امر ہے۔"
بچے نے کہا: "حضرت! میں مسلمان ہونے آیا ہوں۔ مجھے اسلام کی دولت سے سرفراز فرما دیں۔"
ابن موسیٰ رضا نے بچے کو اسی وقت مسلمان کر لیا اور انھی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ بچے کا نام معروف رکھ دیا گیا۔ آپ نے معروف کو اپنے گھر میں رکھ لیا اور دینی اور روحانی تعلیم و تربیت دینے لگے۔
دوسری طرف والدین اپنے بیٹے کی گمشدگی سے بہت پریشان تھے۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ استاد نے ان کے بیٹے کی تین خداؤں کے منکر ہونے پر مرمت کی تھی تو انھیں بڑا قلق ہوا اور افسوس کرنے لگے کہ اے کاش وہ اپنے بیٹے کو مسیحی مکتب میں نہ لے جاتے۔ پڑوسیوں نے الگ تنگ کر رکھا تھا، جسے دیکھیے یہی پوچھنے چلا آ رہا ہے: "تمہارا بیٹا کہاں چلا گیا؟"
باپ جواب دیتا: "پتہ نہیں، اسے اس کے استاد نے بے حد زدوکوب کیا تھا، میرا بیٹا ناراض ہو کر کہیں چلا گیا۔"
کوئی اللہ کا بندہ کہتا: "تمہارا بیٹا تو بے دین ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں وہ تین خدا

اس سکتے کے منہ میں ڈالتا ہوں“

خالو نے پوچھا: ”لیکن اس شرم سے تجھے حاصل کیا ہوا؟“

آپ نے جواب دیا: ”آپ تو محض کوتوال ہیں اور میں نے اس عمل سے وہ حکومت حاصل کر لی ہے کہ لوگ اس کی تمنا میں اپنی جانیں دے دیتے ہیں اور محروم رہتے ہیں“

خالو نے کہا: ”یعنی؟ میں تیرا مطلب نہیں سمجھا“

آپ نے مسکرا کر کہا: ”اس کا مطلب سمجھنا چاہتے ہو؟ لو، یہ بھی سمجھائے دیتا ہوں“

اس کے بعد آپ نے آسمان کی طرف دیکھا۔ اوپر ایک پرندہ اڑتا چلا جا رہا تھا۔ اس پر آپ کی جیسے ہی نظر پڑی وہ نیچے اتر آیا، پرندے نے اپنی آنکھیں اور چہرہ اپنے پنجوں اور پروں سے ڈھانپ رکھا تھا۔ آپ نے اپنے خالو سے فرمایا: ”جو خدا سے شرم کرتا ہے اسے ہر شے سے حیا آتی ہے“

ایک بار آپ نے عالمِ اضطرار میں ایک ستون کو پکڑ لیا اور اسے زور سے بھینچا، ستون لرزنے لگا۔ لوگوں نے واویلا کیا: ”حضرت! یہ آپ کیا ستم فرما رہے ہیں ستون ٹکڑے ہو کر گر جائے گا“

آپ نے ستون چھوڑ دیا، اس کی لرزش موقوف ہو گئی۔

عید کے دن ایک زمانہ خوشیاں منا رہا تھا، لوگ آپس میں گلے مل رہے تھے۔ آپ اس دن بھی کھجوریں چننے میں مشغول تھے، ادھر سے آپ کے مرید خاص حضرت سری سقطیؒ گزرے۔ انہوں نے اپنے پیر و مرشد کو کھجوریں چنتے دیکھا تو ادب سے پوچھا: ”آج عید کے دن بھی آپ کھجوریں چننے میں مشغول ہیں، خیریت تو ہے؟“

آپ نے ذرا فاصلے پر بیٹھے ہوئے ایک معصوم بچے کی طرف اشارہ کیا، فرمایا: ”یہ یتیم ہے اور اسے عید کے دن بھی کپڑے نصیب نہیں ہیں، میں نے سوچا ہے کہ ان کھجوروں کو بازار میں فروخت کر کے اس کے لئے نئے کپڑے خرید لاؤں“

سری سقطیؒ نے کہا: ”آپ ناحق زحمت اٹھاتے ہیں، اس کے نئے لباس کی ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں“

سری سقطیؒ نے بچے کا ہاتھ پکڑا اور اسے نئے کپڑے دلا دیئے۔

آپ کے گھر ایک مہمان آیا، نماز کے وقت اس نے غلط سمت منہ کر کے نیت باندھ لی، نماز سے فارغ ہو کر وہ بیٹھا ہی تھا کہ آپ نے صحیح سمت میں منہ کر کے نماز پڑھنی شروع کر دی۔ مہمان نے یہ بات شدت سے محسوس کی۔ جب آپ نے سلام پھیرا تو مہمان نے شکایتاً کہا: ”حضرت! یہ کیا بات ہوئی کہ آپ نے مجھے غلط سمت منہ کر کے نماز پڑھتے دیکھا اور خاموش رہے۔ آپ کو مجھے اس غلطی سے آگاہ کر دینا تھا“

آپ نے جواب دیا: ”جناب! فقرا کو دوسروں کے معاملات میں دخل دینے کی اس وقت حاجت ہوتی ہے جب انہیں اپنے امور سے مہلت مل جاتی ہے“

آپ کوئی معمولی غذا تناول فرما رہے تھے اور خوشی کا یہ عالم تھا گویا کوئی بہت لذیذ چیز کھا رہے ہیں۔ کسی مرید نے پوچھا: ”حضرت! اس معمولی چیز کے تناول فرمانے میں خوشی کا کیا مقام ہے؟“

آپ نے جواب دیا: ”خوشی کھانے کی نہیں ہے بلکہ اس بات کی ہے کہ میں خدا کی دعوت کھا رہا ہوں، میں اس وقت اپنے اللہ کا مہمان ہوں۔“

مرید نے حیرت سے پوچھا: ”اللہ کا مہمان ہوں، کا کیا مطلب ہوا؟“

آپ نے جواب دیا: ”اس طرح کہ یہ جو کچھ مجھے کھانے کو ملا ہے خدا کی طرف سے عطا کردہ ہے، اس طرح میں خدا کا مہمان ٹھہرتا ہوں“

اس کے بعد آپ نے اپنے نفس کو مخاطب کیا: ”اے نفس مجھے چھوڑ دے تاکہ تجھے بھی چھٹکارا مل جائے“

مرید نے کہا: ”حضرت! آپ کی بعض باتیں بڑی پُراسرار ہوتی ہیں“

آپ نے ارشاد فرمایا: ”یہ تیری سمجھ کی کوتاہی ہے، یاد رکھ جو شخص اللہ پر توکل کرتا ہے، مخلوق کے شر سے محفوظ رہتا ہے“

مرید نے کہا: ”جب ایسا ہے تو ہمیں توکل اختیار کر کے کسی چیز سے ڈرنا ہی نہیں چاہئے“

آپ نے جواب دیا: ”ہاں، مگر اس چیز سے بھی ڈرتے رہو کہ خدا کی نظریں تم پر ہیں“

آپ نے اپنے مریدوں سے فرمایا: ”جواں مردوں میں تین علامتیں ملیں گی“

سوال کیا گیا: ”کون کون سی؟“

جواب دیا: ”وفاداری، جس میں بے وفائی کا شائبہ تک نہ ہو، دوسرے ستائش جس میں جود و سخا کا تصور تک نہ ہو، تیسرے بے طلب داد و دہش“

٭٭

اس دن آپ روزے سے تھے، مریدوں نے آپ کو اپنے حلقے میں لے رکھا تھا۔ آپ تصوف کے رموز و اسرار بیان فرما رہے تھے، راستے میں چلنے سے ایک سقا گزرا، اس نے معروف کو غور سے دیکھا اور آواز لگائی: ”رحمۃ اللہ من یشرب من ہذا الماء“ اللہ اس پر رحمت کرے جو اس پانی کو پیئے“

آپ نے سقے کو پاس بلایا اور پیالے میں پانی بھر کے پی لیا، مرید یہ تماشا فکر و تشویش سے دیکھتے رہے۔ ایک مرید نے پوچھا: ”کیا اس وقت آپ روزے سے نہیں تھے؟“

آپ نے جواب دیا: ”کیوں نہیں، میں روزے سے تھا“

مرید نے کہا: "جب آپ روزے سے تھے تو یہ پانی کیوں پی لیا؟"
آپ نے جواب دیا: "میں جذبۂ رحمت سن کر پانی پی گیا۔"
اس واقعے کو ایک عرصہ گزر گیا لیکن لوگوں نے اسے یاد رکھا۔

آپ اپنا مصلےٰ اور قرآن پاک لئے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے۔ ان دونوں کو مسجد میں رکھ دیا اور پاکیزگی کے لئے دجلہ کی طرف چل دیئے۔ وہاں خوب اچھی طرح جسم کو پاک کیا اور وضو کر کے مسجد کی طرف واپس پہنچے۔ راستے میں ایک بوڑھی عورت کو دیکھا جو تیز تیز قدم اٹھاتی ایک طرف چلی جا رہی تھی۔ آپ نے یہ بھی دیکھا کہ اس کی بغل میں آپ کا مصلیٰ دبا ہوا ہے اور آپ ہی کا قرآن پاک ہاتھ میں ہے۔

آپ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک لیا اور دریافت فرمایا: "بڑی بی! اس عمر میں آپ کا کوئی بچہ قرآن پڑھتا ہے؟"
بڑھیا نے نفی میں گردن ہلا دی کہ "نہیں تو۔ میرے گھر میں کوئی بچہ ہی نہیں ہے۔"

آپ نے قرآن پاک کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اگر یہ بات ہے تو میرا قرآن پاک میرے حوالے کر دو، مصلےٰ کے لئے میں کوئی اصرار نہ کروں گا۔"
بڑھیا نے آپ کو نہایت شفقت اور محبت کی نظروں سے دیکھا اور کہنے لگی: "تم آدمی نہایت نیک اور سلیم الطبع نظر آتے ہو، جب یہ دونوں ہی چیزیں تمہاری ہیں تو تم انہیں مجھ سے زبردستی حاصل کر سکتے تھے لیکن تم نے جس صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا ہے اس سے میں بہت متاثر ہوئی ہوں۔"
اس کے بعد اس نے وہ دونوں چیزیں انہیں واپس کر دیں۔

آپ کے گرد و پیش لوگوں کا ہجوم رہنے لگا تھا۔ آپ ان سے بچنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ آپ سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہتے تھے۔
ایک نے سوال کیا: "حضرت! ہمیں یہ کس طرح معلوم ہو کہ خدا نے ہم پر گرفت کر رکھی ہے؟"
آپ نے جواب دیا: "جب تم یہ محسوس کرلے ______ کہ اگر تم اتباع نفس پر مائل رہتے ہو تو سمجھ لو کہ خدا نے تم پر گرفت کر لی ہے۔"
کسی اور نے پوچھا: "جنت کی طلب، شفاعت کی امید اور رحمت کی تمنا کے لئے کون سی باتیں ضروری ہیں؟"
آپ نے جواب دیا: "اعمال صالحہ کے بغیر جنت کی طلب، اتباع سنت کے بغیر شفاعت کی امید اور نافرمانی کے باوجود رحمت کی تمنا حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

آپ نے یہ بھی فرمایا: "حقائق کو معتبر تصور کرنے، صدق و تقویٰ جیسا عمل کرنا اور مخلوق سے امید وابستہ نہ کرنا خالص تصوف ہے۔"
کسی نے پوچھا: "اللہ والے مال و دولت کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟"
آپ نے جواب دیا: "جنہیں عرفان مل جاتا ہے انہیں دولت کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ عارفین خود سراپا دولت ہوتے ہیں، انہیں کسی اور دولت کی حاجت نہیں رہتی۔"

✽ ✽

آپ کو حضرت امام رضا سے ملاقات کرنے کا بڑا شوق رہا۔ جب امام کے در پر پہنچے تو دربانوں نے روک دیا۔ آپ نے دربانوں سے کہا: "تم مجھے امام کے پاس جانے سے کیوں منع کر رہے ہو؟ جب خدا کے گھر میں پہرے دار اور دربان نہیں ہوتے تو امام کے دربان کا یہ ہجوم کیا ہے؟"
دربانوں نے کہا: "زیادہ بحث و مباحثہ کی ضرورت نہیں ہے۔ بس ایک بار منع کر دیا کہ اس وقت امام سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔"
آپ نے اندر جانے پر اصرار کیا۔ بولے: "مجھے تم لوگ اندر جانے سے نہیں روک سکتے!"
دربان نے کہا: "تم آگے بڑھ کر تو دیکھو۔"
آپ نے نرمی سے کہا: "کیا تم لوگ مجھے نہیں جانتے؟"
ایک شوریدہ پشت دربان آپ کے سامنے آگیا اور سینہ تان کر بولا: "ہم یہاں آنے والوں میں کس کس کو پہچانیں گے۔ ہم صرف اپنے امام کو پہچانتے ہیں اور کسی کو بھی نہیں۔"
آپ نے اندر جانے کے لئے قدم بڑھایا: "مجھے مت روکو، مجھے اندر جانے دو۔"
ایک دربان نے آپ کا گریبان پکڑ لیا: "تم یہاں سے نہیں جاؤ گے۔"
دوسرے دربان نے آپ کو دھکا دے کر زمین پر گرا دیا اور کئی دربانوں نے مل جل کر آپ کو زد و کوب کرنا شروع کر دیا اور اتنی شدید پٹائی کی کہ کئی پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ کچھ لوگوں نے آپ کو بچا لیا ورنہ دربان مار کے ہی دم لیتے۔ آپ کو وہاں سے اٹھا کر گھر لایا گیا۔ مریدوں اور عقیدت مندوں میں صف ماتم بچھ گئی کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے پیر و مرشد کی جان بری کا امکان بہت کم پایا جاتا ہے۔

آپ کے پاس حضرت سری سقطی بیٹھے چپکے چپکے رو رہے تھے۔ آپ آنکھیں بند کئے لیٹے ہوئے تھے۔ سری سقطی کے آنسو ٹپک ٹپک کر آپ کے چہرے پر گر رہے تھے۔ آپ نے آنکھیں کھول دیں۔ پوچھا: "کیا تم رو رہے ہو؟"
سری سقطی نے جواب دیا: "ہاں، میں رو رہا ہوں کیونکہ آپ رونے کے سوا باقی رہا ہی کیا ہے؟"
آپ نے کہا: "یہ رونے کا کونسا مقام ہے؟"
سری سقطی نے جواب دیا: "آپ ہم سے بچھڑ جائیں گے۔"
آپ نے کہا: "بچھڑ کر اپنے معبود حقیقی سے جا ملوں گا اور اس سے اچھا اور کون سا ہو سکتا ہے کہ آدمی علائق دنیا سے چھوٹ کر اپنے رب سے جا ملے۔"
سری سقطی نے غم سے سوگوار اور زیادہ رونے کی وجہ سے سرخ جا نکلا

ذکیہ سمیع:

# آئیڈیل کی تلاش

بعض خواتین اپنا ایڈریس بھیجنے سے احتراز کرتی ہیں۔ یہ مناسب نہیں۔ آپ یقین رکھیں، ہمارے ادارے سے کسی کو آپ کا پتہ کبھی معلوم نہ ہو سکے گا کیونکہ ہماری طرف سے رازداری کی شرط اوّل ہے۔ آئندہ مکمل کوائف بھیجنے والی خواتین کو ترجیح دی جائے گی۔ اس طرح ان معزز ممبرز کو قابلِ ترجیح سمجھا جائے گا جو سالانہ خریدار ہیں یا آئندہ بننا چاہتے ہیں۔ سالانہ رجسٹری ڈاک سے ۲۰/- روپے ہے۔ اپنے خطوط میں خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔

قارئین کی سہولت کے لیے ہم نے ہر ماہ آئیڈیل کی تلاش کے صفحات الگ چھاپنے کا بھی بندوبست کیا ہے جو ایک روپیہ فی کاپی کے حساب سے دستیاب ہیں۔ جو بہن بھائی چاہیں ایک روپے کے ڈاک ٹکٹ اور جوابی لفافہ بھیج کر طلب کر سکتے ہیں۔

## پیار کی پھوار

میرا بھی ایک آئیڈیل ہے — عمر یہی کوئی ۲۰/۲۵ سال، تعلیم میٹرک، دراز قد، گوری رنگت اور پرکشش آنکھیں، شکی مزاج ہرگز نہ ہو، سرکاری ملازم، تنخواہ ۱۰۰۰/- روپے ماہوار تاکہ زندگی پرسکون طریقے سے گزر سکے۔

میں ایک معزز کشمیری گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۱۶ سال، تعلیم واجبی، گوری رنگت اور سراپا بے حد دلکش۔

کاش مجھے میرا آئیڈیل مل جائے تو اپنی ساری چاہتیں اس کے قدموں پر نچھاور کر دوں۔

• عشرت ناز، کراچی

## پلکوں کے سائے

میرا آئیڈیل — عمر ۲۴ سال، دراز قد، کشادہ سینہ، بڑی بڑی آنکھیں، شرارت سے لبریز، مردانہ وجاہت کا جیتا جاگتا مجسمہ۔ ذاتی کاروبار یا اعلیٰ ملازمت۔

میری عمر ۲۱ سال، تعلیم میٹرک، سرو قد، گوری رنگت، سراپا جیسے چاندی میں ڈھلا ہوا، گھنیری پلکیں، نشیلی آنکھیں، نماز روزے کی پابند اور خانہ داری میں ماہر ہوں۔

بس کاش! میرا آئیڈیل مل جائے تاکہ میری گھنیری پلکوں کے سائے میں ایک ہنستی کھیلتی مطمئن زندگی بسر کر سکے۔

• فرحانہ تبسم، ڈگری

## تم آئے بہار آئی

میرا آئیڈیل کوئی غیر معمولی انسان نہیں ایک تعلیم یافتہ، مہذب انسان جو خوش شکل اور خوش سیرت ہو۔ مجھے دولت سے ہرگز کوئی دلچسپی نہیں، آمدنی صرف اتنی ہو کہ زندگی پرسکون انداز میں بسر ہو سکے۔

میں ایک معزز سید گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۱۶ سال، میٹرک کی طالبہ، گوری رنگت، سراپا بے حد دلکش، میرا حسن نقاشِ جہاں کا خاص عطیہ ہے۔

دفتری اور انتظامی اخراجات کے لیے صرف ۱۰ فیصد رقم وضع کی جائے گی!

# 2,60,000

دو لاکھ ساٹھ ہزار روپے کے انعامات

پہلا انعام، بالکل درست حل پر ۲ لاکھ روپے

## دوسرا انعام، ایک غلطی والے حل پر چالیس ہزار روپے

## تیسرا انعام، دو غلطی والے حل پر بیس ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل ایک روپیہ۔ ایک نام اور ایک کوپن کے ساتھ دو روپے پچاس پیسے میں تین خانے بھیجے جا سکتے ہیں۔ اس حساب سے جتنے چاہے حل بھیج سکتے ہیں۔ دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۸ کے اپنے تمام خانوں کے ساتھ ایک کوپن دوشیزہ ادبی معمے نمبر ۸ ضرور بھیجئے جو ماہنامہ دوشیزہ سے کاٹا گیا ہو۔ مفصل شرائط اور ہدایات کی پابندی لازمی ہے جو دوشیزہ کراچی میں شائع ہوئی ہیں۔ ایک شخص الگ الگ کوپنوں پر الگ الگ انعام حاصل کر سکتا ہے۔ انعامی رقم میں مزید کمی و بیشی ہو سکتی ہے۔

دفتر ماہنامہ دوشیزہ ۹، ۱۸ اسی سنٹرل کمرشل ایریا علامہ اقبال روڈ پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ میں دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۸ جنوری آٹھ بجے رات تک اور بذریعہ ڈاک ۸ جنوری تک

## دوشیزہ ادبی معمے نمبر ۸

| نمبر | اشارے | ممکن الفاظ | | | حل نمبر... | حل نمبر... | حل نمبر... |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | ـــــ کی گاڑی تو کبھی دیر میں نہیں آتی۔ | کارپوریشن | ایمبولینس | ڈاک | | | |
| ۲ | ـــــ کا گوشت من و سلویٰ کے برابر تھا۔ | کبوتر | بطخ | ہرن | | | |
| ۳ | حکومت نے ـــــ کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ | فقیروں | مزدوروں | کسانوں | | | |
| ۴ | مدد کرنے کا بھی ایک ـــــ ہے۔ | علم | طریقہ | ڈھنگ | | | |
| ۵ | آدمی محبت میں اپنے ـــــ کو بھی بدل جاتا ہے کیا؟ | رشتوں | دوستوں | راستوں | | | |
| ۶ | وہ آپ کے ـــــ سے نکل گئی ہے۔ | علاقے | گھر | پہنچ | | | |
| ۷ | جب درس ختم ہوتا تو ـــــ لگائے جاتے۔ | قہقہے | پہرے | نعرے | | | |
| ۸ | دراصل انسان عیش کا ـــــ ہے۔ | پھندہ | بندہ | پتلا | | | |
| ۹ | اس کی ـــــ میں بدلتی دنیا کا الم بھی شامل تھا۔ | فریادوں | تقریروں | تحریروں | | | |
| ۱۰ | اب بھی اس کے دل میں جذبات کی ـــــ باقی ہے۔ | شدت | حرارت | گرمی | | | |

نام اور مکمل پتہ ـــــــــــــــــــــــــــ

ـــــــــــــ دستخط ـــــــــــــ

ڈاک سے اپنے حل اور فیس اس پتے پر بھیجئے: **دوشیزہ ادبی معمہ ۸**، ماہنامہ دوشیزہ پوسٹ بکس ۸۰۹۵، کراچی ۲۹

دوشیزہ ادبی معمہ ۸ کا صحیح حل ۸ جنوری ۷۶ کو ایک بجے دن دفتر دوشیزہ پر مہر بند لفافے کے مکمل حوالوں کے ساتھ آویزاں کر دیا جائے گا۔ اور ۹ جنوری ۷۶ کو صحیح حل امن، مشرق (کراچی، لاہور، پشاور اور کوئٹہ) میں شائع ہوگا۔ انعام یافتگان کی مکمل فہرست فروری ۷۶ کے دوشیزہ میں ملاحظہ کیجئے۔

## سادگی ـــــ اور شوخی بھی

میرا آئیڈیل ـــــ ایک اسمارٹ نوجوان جو ڈاکٹر، آرمی آفیسر، انجینئر یا کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو مگر خدا ترس، شگفتہ مزاج اور لالچی نہ ہو یعنی جس کو جہیز کی ہوس نہ ہو۔

میں ایک معزز سید گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۲۲ سال، تعلیم بی اے بی ایڈ، کھلتا ہوا گندمی رنگ، متناسب جسم، طبیعت میں سادگی ہے اور بلا کی شوخی بھی۔ بڑی حساس طبیعت ہوں۔

کاش میری آواز میرے آئیڈیل تک پہنچ جائے۔

"ش۔ ن" کراچی

## میرا ہمراز

میرا آئیڈیل کوئی خوب صورت انسان نہیں بلکہ ایک ۲۵/۳۰ سال کا عام سا نوجوان ـــــ صحت مند، پرکشش، مزاج اور رحم دل۔ وہ امیر ہو نہ غریب، آمدنی بس اتنی ہو کہ خوشگوار زندگی بسر ہو سکے۔ وہ مجھے اپنا ہمراز سمجھے مگر شکی مزاج ہرگز نہ ہو۔

میں ایک کھاتے پیتے معزز گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۱۹ سال، تعلیم میٹرک، کھلتا ہوا گندمی رنگ، اسمارٹ جسم اور سراپا بے حد دلکش۔ میں ایک مشالی بیوی کی طرح اپنے آئیڈیل کو اس طرح سنواروں گی کہ دیکھنے والے رشک کریں۔ جہیز کے لالچی پرے ہی رہیں تو بہتر ہے۔

میں دل و جان سے اپنے آئیڈیل کی منتظر ہوں۔

"روحی بانو" لاہور

## ٹوٹا ٹوٹا، بکھرا بکھرا

میرا آئیڈیل ایک گہرا سانولا معاشرے کا ٹھکرایا ہوا، ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرا ہوا انسان ہے جسے ایک ایسے ساتھی کی شدت سے ضرورت ہو جو اس کے وجود کو یکجا کر کے اسے نئی زندگی سے روشناس کرا سکے۔ اس کا انتقام کر لے جو دھوپ کی دودھ جیسی چاندنی کی سیر کرا سکے۔ اپنی مزدوری کے بل پر وہ ایک خودسر، مغرور اور ضدی طبیعت کا مالک ہو، بات بات پر ڈانٹنے اور اپنی من مانی کرنے والا مگر مجھے اس کی رفاقت سے تحفظ کا احساس پیدا ہو۔ اس کی عمر ۳۰/۳۵ سال ہو۔ اگر سابقہ فوجی کیپٹن ہو تو بہت خوب!

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی نازک سی لڑکی ہوں۔ عمر ۲۱ سال، انٹر کی اسٹوڈنٹ، شخصیت پرکشش، سراپا دلکش۔

کاش میری یہ آرزو پوری ہو جائے۔

"منیبہ ضرمالی" حیدرآباد

## تنہا تنہا

میرا آئیڈیل ـــــ دراز قد نوجوان، بڑی بڑی شرارت بھری آنکھوں والا، اسمارٹ اور ذہین۔ دراصل میں ایک ایسے انسان کو ساتھی بنانا چاہتی ہوں جس کا اس بھری دنیا میں کوئی نہ ہو۔

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ بڑی سگھڑ ہوں مگر بلا کی شوخ اور سائنس میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ ہوں۔

مجھے بے تابی سے اپنے آئیڈیل کا انتظار رہے گا۔

"ت۔ ح" لاہور

## وارے نیارے

میرا بھی ایک آئیڈیل ہے۔ ایک سانولا سلونا تعلیم یافتہ، مہذب انسان، عمر یہی کوئی ۳۰/۲۶ سال۔ ذاتی کاروبار یا کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو اور حقیقی معنوں میں پرخلوص، ہمدرد اور ساتھ نبھانے والا ہو۔

میرا تعلق ارائیں گھرانے سے ہے۔ عمر ۲۴ سال، تعلیم بی ایس سی بی ایڈ، شکل و صورت درمیانی۔ مجھے سیاحت کا بڑا شوق ہے۔ اگر مجھے میرا آئیڈیل اسلام آباد اور راولپنڈی میں مل جائے تو وارے نیارے ہو جائیں۔

"نسرین" اسلام آباد

## نرگس بیمار

مجھے بھی اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے۔ ڈاکٹر، انجینئر یا بینک آفیسر مگر فوجی آفیسر ہو تو کیا کہنے۔ دراز قد، خوبصورت آنکھیں، خوش گفتار، خوش لباس، عمر یہی کوئی تیس سال ہو۔

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۱۹ سال، تعلیم ایف اے، براؤن بال اور براؤن آنکھیں جنہیں کوئی نظر بھر کے دیکھ کر تاب نہیں لا سکتا۔ بے حد سگھڑ اور ملنسار ہوں۔

"خالدہ پروین" سیالکوٹ

## ہونٹ گلابی چہرہ گلاب

میرا آئیڈیل ـــــ تعلیم یافتہ، قبول صورت اور نیک سیرت نوجوان جو صرف ضروریاتِ زندگی کا ضامن بن سکے۔

میں معزز گھرانے کی لڑکی ہوں۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، گلابی ہونٹ، پھول سا چہرہ، خوبصورت آنکھیں اور سیاہ بال۔ تعلیم یافتہ ہوں اور اسمارٹ بھی۔

کاش میں کسی کا آئیڈیل بن جاؤں۔

"گ۔ ذ" کراچی

## خوشبو کا مجنوں

میرا آئیڈیل ـــــ پاکستان نیول آفیسر یا انجینئر یا فوجی آفیسر، دراز

کاش میرے دل کی بیتاب دھڑکنوں کی آواز میرے آئیڈیل تک پہنچ جائے۔
 "بشریٰ خان" پشاور

## افسانہ لکھ رہی ہوں.....

میرا بھی ایک آئیڈیل ہے۔ مجھے خوبصورت کی نہیں خوب سیرت کی تلاش ہے سادہ اسلوبی، پرکشش چہرہ، سیر و تفریح کا شوقین مگر نماز روزے کا پابند ضرور ہو۔ تنگی مزاج ہرگز نہ ہو۔ اسے لازمی طور پر ڈاکٹر ہونا چاہیئے۔
میری عمر تقریباً بیس برس ہے۔ ایف اے پاس ہوں۔ افسانہ نگاری اور شعر و شاعری سے بے حد لگاؤ ہے۔ نماز روزے کی پابند ہوں
 "مینا رضا" لاہور

## چاہت کا جال

میرا آئیڈیل ایک مہذب اور تعلیم یافتہ انسان ہے جو اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہو سالانہ آمدنی اچھی ہو، مجھے دراصل ایک ایسے شخص کی تلاش ہے جو زندگی میں خلوص اور چاہت سے محروم رہا ہو اور ہم دونوں مل کر باہمی چاہت کا ایک ایسا نازک سا جال بُن سکیں جس میں عمر بھر ایک دوسرے کے سہارے اُلجھے رہیں۔
میرا تعلق ایک کھاتے پیتے پنجابی گھرانے سے ہے۔ عمر ۲۶ سال، تعلیم بی ایس سی، بی ایڈ، معقول تنخواہ پر سروس کرتی ہوں۔ نیک سیرت، کم گو اور نفاست پسند ہوں۔ سیر و تفریح کی بھی شوقین ہوں۔ میرا آئیڈیل راولپنڈی یا اسلام آباد میں مل جائے تو زہے نصیب!
 "منور مین چوھدری" اسلام آباد

## زیب تمانی

میرا آئیڈیل ایک کھلتے ہوئے رنگ کا دراز قد نوجوان ہے۔ خد و خال پرکشش، خوش لباس اور خوش کلام ہو، سیر و تفریح کا شوقین ہو۔ اس کی شخصیت بھتماد اور وقار سے عبارت ہو۔ تنگی مزاج ہرگز نہ ہو۔ آمدنی اتنی ہو کہ خوشگوار زندگی بسر ہو سکے۔
میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی ہوں، عمر ۲۲ سال تعلیم بی اے گلابی رنگت، نقش دیدہ زیب، آنکھوں میں ستاروں کی چمک، زیبا سے جید مشابہ ہوں میری مسکراہٹ کا انداز بڑا دلفریب اور منفرد ہے۔ ہر ماحول کو اپنانے کی صلاحیت رکھتی ہوں۔ "م، ص" کراچی

## مرغ دست آموز

میرا آئیڈیل کوئی آسانی فرشتہ یا خوابوں کا شہزادہ نہیں۔ بس ایک عام سا قبول صورت انسان جو زندگی کی بنیادی ضرورتیں پوری کر سکے۔ میں گھر کا سارا کام کاج خود اپنے ہاتھوں کروں گی۔ وہ صبح کام پر جائے اور ٹھیک پانچ بجے سیدھا گھر آ جائے۔ اپنی شام میری حسین آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گزار دے اور اندھیری راتیں سیاہ زلفوں کے سائے میں بسر کرے۔
میں بی اے کی طالبہ ہوں۔ حسین تو نہیں مگر میری سیاہ زلفیں اور خوبصورت آنکھیں بڑی پرکشش ہیں۔
 "فارینہ نسرین"

## چشم آہو

مجھے بھی اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے ——— بنک آفیسر، ایئر فورس پائلٹ یا انجینئر، وہ اگر کسی اور محکمے میں اعلیٰ پوسٹ پر فائز ہو تو بھی ٹھیک ہے۔ اس کی عمر یہی کوئی ۳۰/۲۸ سال، تعلیم یافتہ، آہو چشم اور مردانہ وجاہت کا پیکر جو پیار سے گھر کا مالک ہو، سادات گھرانے سے ہو یا غیور پٹھان۔
میری عمر ۲۵ سال، تعلیم میٹرک، ایک قدامت پسند، فرسودہ روایات کے پجاری خاندان سے تعلق رکھتی ہوں اس لیے آج تک جتنے بھی رشتے آئے میرے قبل یا دوسرے ٹھکرا دیئے۔ اگر میرا آئیڈیل مل گیا تو میں ان خود ساختہ بندھنوں کو یکبارگی توڑ دوں گی۔
 "ایس، جے" لاہور

## نقش دیوار

میرا آئیڈیل ——— ڈاکٹر، انجینئر، اعلیٰ فوجی یا سیول آفیسر، عمر یہی کوئی ۳۰/۲۵ سال، مردانہ وجاہت کا پیکر جو دلِ درد آشنا رکھتا ہو۔
میں ایک نہایت معزز پنجابی پٹھان فیملی سے تعلق رکھتی ہوں، عمر ۲۷ سال، تعلیم انٹر، خوبصورت اور اسمارٹ، سراپا نہایت پرکشش۔ مجھے یقین ہے ضرور کوئی باشعور انسان میری زندگی کے خاکے میں میرے مزاج کے مطابق رنگ بھرے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں انتظار کی گھڑیاں گنتے گنتے نقش دیوار بن جاؤں۔
 "مس شیبا خان" ساہیوال

## میرا ——— صرف میرا

مجھے ایک ایسے انسان کی تلاش ہے جو دراز قد، تعلیم یافتہ اور صحت مند ہو۔ عمر یہی کوئی ۴۰/۳۰ سال، سوسائٹی میں اعلیٰ پوزیشن رکھتا ہو اور میرا، صرف میرا ہو۔
میں سفید پوش طبقے سے تعلق رکھتی ہوں۔ سانولی رنگت اور جسم ذرا فربہ، میں اپنے باپ کے پاس اکیلی رہتی ہوں کیونکہ امی کا انتقال ہو چکا ہے اور دو بڑی بہنیں بیاہی جا چکی ہیں۔
خدا کرے مجھے میرا آئیڈیل جلد ہی مل جائے۔ "نادرہ" کراچی

## میرا بھی تیرا بھی

میرا آئیڈیل —— ایک تعلیم یافتہ، سیدھا سادا اور صحت مند نوجوان ہو جو کنجوس ہو نہ شکی مزاج۔ ایک ضروری شرط یہ بھی کہ وہ ٹوٹ کر پیار کرے اور اپنے ماں باپ کا حقیقی معنوں میں فرمانبردار ہو۔ تنخواہ اتنی کہ ضروریات زندگی آسانی سے مہیا ہو سکیں۔

میرا تعلق متوسط طبقہ سے ہے۔ سیکنڈ ایئر کی طالبہ ہوں۔ گوری رنگت شوخ مگر بڑی حسّاس، ہنس مکھ اور سگھڑ۔ مجھے امید ہے میرا آئیڈیل ملنا کچھ مشکل نہیں۔

"م، س" کراچی

## دولت کا کھیل

میرا بھی ایک آئیڈیل ہے —— بزنس مین، ڈاکٹر، انجینئر یا کسی اچھے عہدے پر فائز نوجوان، وہ ہینڈسم، ہنس مکھ اور دل میں بات رکھنے والا نہ ہو۔ مجھے شکی مزاج لوگوں سے سخت نفرت ہے۔ اس کی آمدنی کم از کم ڈیڑھ دو ہزار روپے ماہانہ ہو اور کار اور بنگلہ تو ضروری ہی ہو۔

میں کھاتے پیتے معزز گھرانے کی لڑکی ہوں۔ تعلیم بی اے۔ بڑی اسمارٹ اور صحت مند ہوں۔

کاش میرا آئیڈیل کا خواب سچا ہو جائے۔ "تہمینہ کنول"

## خوب سیرتی —— واہ واہ

میری ایک بہت گہری سہیلی ہے۔ اس کا آئیڈیل ایک تعلیم یافتہ، روشن خیال اور خوش مزاج انسان ہے جو زندگی کی ضروریات بڑی خوش اسلوبی سے پوری کر سکے۔ وہ خوبصورتی سے زیادہ خوب سیرتی کا قائل ہو چاہے مشرق وسطیٰ میں رہائش پذیر ہو۔

میری سہیلی کی عمر ۲۴ سال ہے۔ سرو قد، سانولا رنگ اور بڑی سلجھی ہوئی، خوش ذوق اور خوش لباس ہے اور امور خانہ داری میں بڑی ماہر۔

خدا کرے میری سہیلی کی مراد بر آئے۔

"ق، س" لاہور

## زندگی —— ایک حقیقت

میرا آئیڈیل، ایک تعلیم یافتہ نوجوان جو مردانہ وجاہت کا جیتا جاگتا پیکر ہو، سنجیدہ سا بزنس مین، میرے دکھ درد کا ساتھی اور میرا ہمراز۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی چاہتوں میں گم ہو جائیں۔ وہ مجھے ڈانٹے مگر اس کی ڈانٹ میں بھی پیار کا عنصر ہو۔ میری زندگی میں پیار کا لفظ شرمندۂ معنی نہ ہو سکا۔ ماں باپ کا پیار ملا نہ کسی بہن بھائی کا۔

میں ایم اے کی اسٹوڈنٹ ہوں اور اپنے جیون ساتھی سے اسی تعلیمی معیار کی توقع رکھتی ہوں تاکہ وہ زندگی کی حقیقتوں سے قریب تر ہو سکے اور اسے محض کسی نئے دن دہرائے جانے والے افسانے کا پلاٹ نہ سمجھے۔

"جویریہ" لاہور

## صاحب شجرہ —— مبارک

میری ایک کزن کو اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے —— ایک شریف خاندان کا لاڈلا، تعلیم یافتہ نوجوان جو خوبصورت، نیک سیرت اور پرخلوص ہو۔ صاحب جائیداد یا کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو۔ حسب نسب اعلیٰ خاندان سے ہو، صوم و صلوٰۃ کا پابند اور مذہب سے گہری وابستگی رکھتا ہو۔ صاحب شجرہ ہونا بھی انتہائی ضروری ہے۔ عمر یہی کوئی ۲۵/۲۸ سال۔ صوبہ پنجاب سے تعلق رکھتا ہو تو بہت خوب!

میری کزن کی عمر ۲۳ سال ہے۔ تعلیم میٹرک۔ خاندان قادری سے تعلق رکھتی ہے۔ خوش شکل، سیدھی سادی، نیک سیرت اور بلند کردار۔ نماز روزے کی سختی سے پابند ہے اور بڑی سگھڑ ہے۔

خدا کرے میری کزن کو اپنا آئیڈیل مل جائے۔

"سیدہ جبیں قادری" پشاور

## یتیم کی پکار

میری ایک سہیلی "ن ف" کو اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے۔ ائیر فورس یا آرمی آفیسر یا کسی اعلیٰ عہدے پر فائز نوجوان جو دراز قد، مردانہ وجاہت کا پیکر اور روشن خیال ہو۔ عمر یہی کوئی ۳۰/۳۲ سال، جہیز کا لالچی نہ ہو۔

میری سہیلی یتیم ہے اور متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ عمر ۱۸/۱۹ برس، تعلیم بی اے، گوری رنگت، متناسب جسم اور حساس طبیعت ہے۔ آئیڈیل کا سید شیعہ ہونا ضروری ہے۔

"ایچ، امین" حیدرآباد

## خبر لیجیے ذہن بگڑا

میرا آئیڈیل نہ تو افق پار سے آیا ہوا شہزادہ ہے اور نہ علم شمار کی طرح ایک قبول صورت مرد، باہمت اور جری جس کی آنکھوں میں ذہانت کی ہو۔ اعلیٰ عہدے دار یا پولیس آفیسر ہو۔ باوقار اور خوشگوار زندگی کا ضامن ہو سکے۔ عمر یہی کوئی ۳۰/۳۵ سال۔ ایک ایسا انسان جو مجھے میری خامیوں اور خوبیوں سمیت قبول کر سکے۔

میں ایک کھاتے پیتے تعلیم یافتہ گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۲۲/۲۳ میرے کھلتے ہوئے گندمی رنگ میں اس قیامت کی کشش ہے کہ بقول دوسروں کے گوری چٹی لڑکیاں بھی ماند پڑ جاتی ہیں۔ ویسے میں بہت بااخلاق ہوں

غصے کے عالم میں بول بول لیتی بھی ہوں جو میرے گھر والوں کو سخت ناگوار گزرتا ہے۔ یہ میرے آئیڈیل کا فرض ہوگا وہ میری اصلاح کرکے اپنے جیسا بنا سکے مجھ جیسی سرکش اور ضدی لڑکی کو کوئی معمولی آدمی ہرگز نہیں اپنا سکتا۔

• ع۔ فاطمہ " کراچی

## بانکپن

میرا آئیڈیل سجیلا اور صحت مند نوجوان ہو جو مردانہ دلکشی کا جیتا جاگتا نمونہ ہو، دراز قد، گہری سانولی رنگت، منفرد شخصیت اور انداز گفتگو میں بانکپن ہو، تنخواہ چھ سات سو سے زائد، تاکہ زندگی باعزت طریقے سے بسر ہو سکے وہ جہیز کی تمنا نہ کرے۔

میری عمر ۲۰ سال، کھلی ہوئی شخصیت اور روشن خیال ہوں۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، تیکھے نقوش اور دلکش سراپا سینے میں دل درد آشنا رکھتی ہوں اور ایک خوشگوار ازدواجی زندگی کی خواہشمند ہوں۔

• ایس۔ اے " لاہور

## موجِ تبسم

میرا آئیڈیل ــــ بینک منیجر، ڈاکٹر، بزنس مین یا کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو۔ دراز قد، اسمارٹ اور خوش شکل۔ وہ قول کا سچا ہو۔

میں ایک معزز زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ عمر ۲۲ سال، تعلیم بی اے بی ایڈ، سیکنڈ مسٹریس ہوں۔ سرو قد، اسمارٹ اور خوش خلق، رنگت صندلی، دلکش، بائیں رخسار پر پیدائشی تل ہے اور لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔

• سروش افتخار " شیخوپور

## چاہت کے اجالے

مجھے ایک ایسے نیک اور باوفا ساتھی کی ضرورت ہے جو زندگی میں خلوص و محبت جیسی نعمت سے محروم رہا ہو یا گردشِ زمانہ کے سبب والدین کی شفقت اور چاہت نصیب نہ ہو سکی ہو۔ ایک ایسا انسان جس نے اپنا مستقبل اپنی کوشش اور بلند حوصلگی سے تعمیر کیا ہو۔ میں اس کی پیاسی اور سنسان زندگی کو اپنے پیار اور خلوص کے جگمگاتے ستاروں سے روشن کر دوں گی تاکہ احساسِ محرومی کے اندھیرے میری چاہت کے اجالوں میں جذب ہو کے رہ جائیں۔

میں ایک معزز گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۲۰ سال، تعلیم بی اے ہے، ایلوپیتھک اور ہومیوپیتھک ڈاکٹر بھی ہوں۔ میرا سراپا دلکش اور شخصیت بڑی پرکشش ہے۔

میرا ایمان ہے کہ مجھے میرا آئیڈیل ضرور ملے گا۔

• رفعت جبیں " کراچی

## پیار کی پرچھائیں

میرے سپنوں کے شہزادے، میرے آئیڈیل کی پرچھائیں الفاظ کا روپ دھار کر میری نوکِ زبان پر آگئی ــــ ایک تعلیم یافتہ، سلجھا ہوا انسان، دراز قد، سانولی رنگت اور گہری کالی خوبصورت آنکھیں۔ تنخواہ اتنی ہو کہ باعزت زندگی بسر ہو سکے۔

میری عمر ۱۹ سال، تعلیم میٹرک، سنہری رنگت، بادامی آنکھیں، سراپا پھول کی طرح نیک اور سلجھا ہوا ذہن ہے۔ سگھڑ ہوں اور ادبی ذوق کی مالک بھی۔ مجھ جیسی غریب لڑکی صرف نقدِ جان اور بے پناہ خلوص ہی نچھاور کر سکتی ہے

• مس جی۔ اے " لاہور

## نگہہ بصیرت

میرا آئیڈیل ایک تعلیم یافتہ، خوش شکل، سنجیدہ مزاج نوجوان ہے۔ جو وسیع القلب، حرص و ہوس سے پاک اور سچائی کا پرستار ہو۔ نگہہ بصیرت رکھتا ہو۔ کسی باعزت پیشے سے وابستہ ہو اور اتنی آمدنی ہو کہ زندگی ہنستے کھیلتے بسر ہو سکے۔ اس کا شیعہ اور سید ہونا لازمی شرط ہے۔

میں ایک باعزت گھرانے کی لڑکی ہوں۔ تعلیم بی اے، ہنرمند اور سلیقہ شعار ہوں، بڑی حساس، سنجیدہ مزاج اور سادگی پسند ہوں اور چاہتی ہوں کہ میرا آئیڈیل بھی مندرجہ بالا خوبیوں کا لاجواب پیکر ہو۔

آواز دے کے دیکھ لو شاید وہ مل ہی جائے
ورنہ یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے

• ن۔ ب " کراچی

## زہے نصیب!

مجھے بھی اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے ــــ دراز قد، اسمارٹ، نوجوان، کھلتا ہوا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، گریجویٹ، سرکاری ملازمت، ماہانہ آمدنی خوشگوار زندگی کی ضامن ہو، عمر یہی کوئی ۲۲ سال، شریف یا باعزت گھرانے سے تعلق رکھتا ہو۔

میں ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ عمر ۲۲ سال، تعلیم میٹرک، قد ۵ فٹ، بڑی صاف گو اور سیدھی سادی لڑکی ہوں۔ اپنے آئیڈیل کو ٹوٹ کر چاہوں گی۔ اگر وہ مجھے مل جائے تو زہے نصیب!

• مس سلیمہ رشید "

## میٹھے سپنے

میرا آئیڈیل ایک دراز قد، خوبصورت اور متناسب جسم کا نوجوان

چاہتی ہیں۔ ہے کوئی اس ساٹ کروڑ کی آبادی میں ایسا شخص جو زندگی کے صحرا میں گلستان پیدا کرنے کی خواہش رکھتا ہو۔

"عالیہ" کراچی

**شائستہ تبسم کے نام:**

میں آپ کے خیالات سے بہت متاثر ہوں۔ عمر ۲۵ سال، تعلیم ایم اے، تنخواہ ۹۰۰/- روپے ماہانہ۔

ارشد معرفت شفیع اللہ خاں
گیس پاکستان لمیٹڈ، پشاور روڈ، راولپنڈی

---

میں آپ کے معیار پر پورا اترتا ہوں۔ عمر ۲۵ سال، تنخواہ ۷۰۰/- روپے ماہانہ، منقول جائیداد کا بھی مالک ہوں

قاضی غلام رسول
پوسٹ بکس ۱۸۳، پشاور کینٹ

---

آپ کے خیالات کی بہت قدر کرتا ہوں۔ عمر ۲۸ سال، تنخواہ ۵۰۰/- روپے ماہانہ۔

ایم اقبال معرفت ایم جمیل اختر
ای/۲۹ گلبرگ ۳، لاہور

**نعیمہ گجرات کے نام:**

آپ کے پاکیزہ خیالات پڑھ کر مسرت ہوئی۔ ذاتی بزنس ہے۔ آمدنی تقریباً ۲۰۰۰/- روپے ماہانہ۔

ناصر معرفت جی آر قریشی
۲۰۵/۲ اورنگ آباد، ناظم آباد ۵، کراچی ۱۸

---

میں خود کو آپ کا آئیڈیل سمجھتا ہوں۔ عمر ۲۴ سال، تعلیم بی اے
سٹیٹ لائف میں ۸۰۰/- روپے ماہانہ پر ملازم ہوں۔

محمد امین
اکاؤنٹس سیکشن۔ پی او بکس ۴۵۹۹۔ کراچی

---

میں آپ کے معیار پر پورا اترتا ہوں۔ عمر ۳۱ سال۔ تنخواہ ۱۴۰۰/- روپے ماہانہ۔

ایم متین آزاد
معرفت ڈیکی پلاسٹر۔ ریلوے روڈ۔ رحیم یار خاں

**شاہینہ پشاور کے نام:**

آپ کی تحریر سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ عمر ۲۵ سال تعلیم بی اے
تنخواہ ۱۶۰۰/- روپے ماہانہ۔

ایف رحمٰن۔ پی او بکس ۱۸۳۔ پشاور کینٹ

آپ کے جذبات اور خیالات کی بہت قدر کرتا ہوں۔ عمر ۳۲ سال، الیکٹریکل انجینئر، تنخواہ ۱۴۰۰/- روپے ماہانہ۔

آئی اے ڈوگر
کنسٹرکشن انجینئر، نیشنل پاور کنسٹرکشن کارپوریشن لمیٹڈ
معرفت پوسٹ ماسٹر نوشہرو فیروز، ضلع نواب شاہ۔

---

میں آپ کے سلجھے ہوئے خیالات کی بہت قدر کرتا ہوں۔ یقیناً میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں۔

محمد داؤد خان، ایم اے۔ ایل ایل بی
پوسٹ بکس نمبر ۲۷۱ - پشاور

**سونیا رضا کے نام!**

معزز خاندان کا گریجوایٹ اور پاک فضائیہ کا باعزت رکن ہوں۔ اپنی کارکردگی کی وجہ سے کافی شہرت یافتہ ہوں۔

خالد چوہدری معرفت حنیف چوہدری
معرفت ایل ایم — ۱۰
پی آئی اے کالونی - ایئرپورٹ۔ کراچی

---

محمد علی کے جیسی رنگت رکھتا ہوں۔ تعلیم ایم اے۔ ایم ایڈ۔ تنخواہ ۷۰۰ روپے ماہانہ۔

ع م ب۔ معرفت عطاءاللہ قریشی
مجید بلڈنگ، فلیٹ آر۔۳، لیاقت کالونی۔ حیدرآباد

---

آپ کے منفرد خیالات نے بہت متاثر کیا۔ قد ۶ فٹ، گورا سانولا رنگ، انجینئر، تنخواہ ۷۰۰/- روپے ماہانہ ہے۔

سید جاوید اقبال معرفت محمد ذاکر خان
پوسٹ بکس نمبر ۳۹۸، ABUDHABI (U.A.E)

**نگہت صدیقی کے نام!**

آپ ہی میرے خوابوں کی تعبیر ہیں۔ آجکل گورنمنٹ کی طرف سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔

ایم فاروقی
اولڈ ہوسٹل نمبر ۲ بی ایم سی۔ کراچی ۳۵

---

آپ کے خیالات میری شخصیت سے مماثلت رکھتے ہیں۔ عمر ۲۸ سال، انجینئر، تنخواہ ۹۰۰/- روپے ماہانہ۔

ایس ایم حنیف معرفت محمد منیر
P.O.BOX 76 - ABUDHABI (U.A.E)

**کوثر سرگودھا کے نام!**

آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ عمر ۳۰ سال، تعلیم بی اے

کیپٹن نذر محمد
معرفت دی ماڈرن گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی خوشاب
ضلع سرگودھا

---

میں آپ کے آئیڈیل پر پورا اترتا ہوں۔ عمر ۲۹ سال تعلیم بی ایس سی انجینئرنگ۔ تنخواہ ۱۲۰۰/- روپے ماہانہ۔
تسلیم الدین۔ مائننگ انجینئر
معدنیاتی ترقیاتی کارپوریشن، سالٹ مائن
کالاباغ۔ میانوالی

زبیدہ گل کے نام!
میں آپ کے خیالات سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ ۲۲ سالہ تعلیم یافتہ فوجی نوجوان ہوں۔ دو سال سے قطر میں مقیم ہوں۔ تنخواہ ۳۰۰۰/- روپے ماہانہ
بیگ۔ پوسٹ بکس ۱۲۸۹
دوحہ قطر۔ عربین گلف

---

میں آپ کی خوبیوں کا قائل ہوں اور جہیز کو لعنت سمجھتا ہوں۔ ایک اچھے عہدے پر فائز ہوں۔ ماہانہ تنخواہ ۱۸۰۰/- روپے۔ خدا کا دیا بہت کچھ ہے۔
محمد مسعود خان
پوسٹ بکس نمبر ۷۶۲۔ پشاور

---

آپ کے خیال سے بہت متاثر ہوں، تعلیم ایم ایس سی، تنخواہ ۱۵۰۰ روپے ماہانہ۔
انور نقوی
پوسٹ بکس نمبر ۴۔ راولپنڈی

کلثوم بلوچ کے نام!
میں معزز بلوچ گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں، گریجویٹ ہوں اور یہاں ایک ٹریول ایجنسی میں اسسٹنٹ منیجر ہوں۔ تنخواہ ۶۰۰۰/- روپے ماہانہ
محمد علی اشرف زئی بلوچ
P.O. BOX 470 MANAMA BAHARIAN
ARABIAN GULF

---

میں معزز بلوچ خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ سلطنت عمان میں قیام پذیر ہوں اچھے روزگار پر ہوں۔ امید ہے آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔
اکبر بلوچ۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۵
مسقط، سلطنت عمان

شہزادی خرم رافی کے نام!
ہمارے خیالات میں کافی مطابقت ہے اور ہم ایک دوسرے کا آئیڈیل

بن سکتے ہیں۔
ڈاکٹر اے۔ میمن
جے پی ایم ایس۔ کراچی ۳۵

---

میرا تعلق ملتان کے زمیندار گھرانے سے ہے۔ عمر ۲۵ سال گریجویٹ تنخواہ ۱۵۰۰ روپے ماہانہ۔
چوہدری نوازش علی
اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن "سی" بیریونٹ
پوسٹ بکس نمبر ۸۴۔ شاہراہ پہلوی۔ پشاور صدر

مس ساجدہ حبیبی کویت کے نام!
آپ کے خیالات کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ عمر ۳۲ سال۔ ایک انگلش فرم میں پانچ سال سے جنرل فورمین کا کام کر رہا ہوں۔ تنخواہ نہایت معقول۔ پاکستان میں کافی جائیداد ہے۔
ایم اے۔ جنرل فورمین
پوسٹ بکس نمبر ۲۵۲۶ کاسٹن کمپنی۔ دوبئی۔ (ریاست ہائے)

حمیرا گل کے نام!
میں آپ کے آئیڈیل کے بہت قریب ہوں۔ تعلیم یافتہ اور حافظ قرآن ہوں۔ ایک مل میں ملازم ہوں۔ تنخواہ ۸۰۰/- روپے ماہانہ
حافظ سرور

منیجر شیگفتا کلینڈرز ، ماری پور روڈ
نزد لکی ہوٹل ، شیر شاہ کالونی ، کراچی ۲۸

**زاہدہ جہلم کے نام!**

آپ کے خیالات سے بہت متاثر ہوں - میں بھی جہلم کا رہنے والا ہوں اور ہمارے خیالات بھی ایک دوسرے سے بہت ملتے ہیں۔ آپ ہی میرا حقیقی آئیڈیل ہیں۔

ملک سیف علی

P.O.BOX 892.  SHARJA - (U.AE)

---

آپ کے اندازِ تحریر اور خیالات کی بڑی قدر کرتا ہوں - یقیناً ہم دونوں ایک دوسرے کا آئیڈیل ہیں۔

ڈاکٹر محمود محمود - اے/۲۹ اوشا ہاسٹل
سینٹ ایم اے - کراچی ۳۵

**عابدہ خان کے نام:**

آپ کے خیالات میرے دل پر بہت اثر انداز ہوئے - عمر ۲۸ سال ، مشین آپریٹر ، آمدنی -/۱۵۰۰ روپے ماہانہ۔

محمد اسلم نمبر ۸۸۹
مشین آپریٹر ، کار پینٹر ورکشاپ ، ہائی گیسٹ ہاؤس
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۵۶ - مطرح ، مسقط - عمان

---

میں معزز گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں - عمر ۲۵ سال ، تعلیم بی اے ، سرکاری ملازم ، تنخواہ -/۳۰۰۰ روپے ماہانہ ، سرکاری کوارٹر ، ذاتی مکان اور جیپ بھی ہے۔

رشید احمد خان

اسلام آباد  83 - G/05, 6 - 6/1-4

**ن لاہور کے نام:**

میں آپ کے خیالات سے بہت متاثر ہوں - عمر ۲۶ سال ، تعلیم میٹرک ، پیشہ تجارت ، آمدنی -/۱۵۰۰ روپے ماہانہ ، ذاتی کوٹھی بھی ہے۔

عبدالرشید ولد چوہدری نذیر احمد
کوٹھی نمبر ۱۱ نزد حبیبیہ کالج
یتیم خانہ حمایتِ اسلام ، لاہور

---

میں آپ کا آئیڈیل بن سکتا ہوں ، تعلیم ایم اے ، تنخواہ -/۲۰۰۰ روپے ماہانہ۔

نیازی
معرفت پوسٹ بکس نمبر ۲ - راولپنڈی

**ش ، ع ، کے نام:**

آپ کے اور میرے خیالات میں بہت مطابقت ہے۔ آپ کے معیار پر ضرور پورا اتروں گا۔ عمر ۲۳ سال - فوجی ہوں۔

سوہال علی راوی

1st REMT  Q/A B.BTY. H.Q. ROSTA
SIA : SECTION  SULTANATE OF OMAN

**شائستہ کراچی کے**

آپ میری صورت کا آئیڈیل ہیں - وہ فلاں ہے اور ایک اچھے عہدے پر فائز ہے۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے۔

A.A. RASHID

B.B.M.E .P.O.BOX 35

MUSCAT, SULTANATE OF OMAN

**جمیلہ راولپنڈی کے نام:**

دوشیزہ میں آپ کے خیالات سے بہت متاثر ہوا ہوں - میں ۲۵ سال کا ایک خوبرو اور اسمارٹ نوجوان ہوں - ماں باپ کی شفقت سے محروم ہوں۔ اپنے عزیز باندے سائیکالوجی پی ایچ ڈی کیلئے - میو ہسپتال میں ملازم ہوں۔

ڈاکٹر طارق محمود - ایم بی بی ایس
مکان نمبر ۵ - گرو نانک اسٹریٹ نمبر ۲۱
ریلوے روڈ ، نزد گوالمنڈی - لاہور

**س ، م کے نام:**

میں آپ کے جذبات کی دل سے قدر کرتا ہوں - ایک مہذب خاندان سے تعلق رکھتا ہوں - عمر ۳۲ سال ، تعلیم بی اے - باعزت عہدے پر ملازم ہوں۔ تنخواہ -/۵۰۰۰ روپے ماہانہ۔

"خ"

پوسٹ بکس نمبر ۲۲۸۲ - جدہ - سعودی عرب

**سیدہ بی کے نام:**

آپ کے احساسات اور جذبات نے بہت متاثر کیا ہے - امیر خاندان سے تعلق رکھتا ہوں ، تعلیم بی اے ، مشغلہ زمینداری - ۲۵ مربع اراضی کا مالک ہوں۔ ڈائس کار ، کوٹھی اور ٹریکٹر بھی ہے۔

احمد حسین شاہد
معرفت منیجر پاکستان ٹیک لمیٹڈ - شاہ مکند ، ضلع سرگودھا

**مس عظمیٰ شفیق کے نام:**

آپ کے نظریات سے بہت متاثر ہوں - سرکاری ملازمت ، تنخواہ تقریباً -/۱۰۰۰ روپے ماہانہ ، خوشگوار زندگی کا خواہشمند ہوں۔

اظہر معرفت محبوب عالم بھٹی
بھٹی بلڈنگ ، جناح پارک ، شیخوپورہ

**رانی مردان کے نام:**

"دوشیزہ" میں آپ کے خیالات کا پرتو دکھائی دیا۔ میں ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں جس کا صوبہ سرحد کے معزز ترین خاندانوں میں شمار ہوتا ہے - ایم اے فائنل کا طالب علم ہوں۔

رُخسانہ سہام مرزا

# تیسری دنیا

**تیسری دنیا** میں تیل پیدا کرنے والے ممالک کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

تیل برآمد کرنے والے ممالک بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ ان ملکوں کے معاشی مسائل کیا ہیں۔ لیکن تیل خریدنے کی ایک معقول قیمت ادا کرنے کے بعد بھی کسی ملک نے تیسری دنیا کی معاشی ضروریات پر توجہ نہ دی اور ایک طویل مدت تک تیسری دنیا کے تیل پیدا کرنے والے ممالک مغربی ممالک کے دستِ نگر رہے۔ لیکن تیل کی تجارت کی بدولت پھیلنے والے عوامی شعور نے اپنی حکومتوں پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ تیل کی دولت کوڑیوں اور نے پونے بھاؤ لٹنے نہ دیں۔ اسی دولت کی طاقت سے دوسرے معاشی مسائل کا حل دریافت کیا جائے۔ اور یہ حل اسی صورت میں ممکن تھا کہ تیسری دنیا کے تیل پیدا کرنے والے ممالک بدیسی تیل کمپنیوں سے تیل کی قیمتوں میں اضافے کا مطالبہ کریں۔ لیکن ان مطالبات کی راہیں بہت مسدود تھیں۔ بات دراصل یہ تھی کہ مشرقِ وسطیٰ کے تیل برآمد کرنے والے اسلامی ممالک نے تیل کمپنیوں سے باہمی معاہدات کر رکھے تھے اور انھی معاہدوں کی بدولت وہ کوئی ایسا سخت اقدام نہیں کر سکتے تھے جس سے تیل کی قیمتوں میں اضافہ ہو یا تیل کی رسد میں کمی ہو۔ ان معاہدات کی تجدید بھی ہوتی رہتی تھی۔ تجدیدِ معاہدات کا باعث کبھی ماضی کے بعض تحریری معاہدے ہوتے تھے۔ ان غریب اور لا محدود وسائل رکھنے والے ملکوں کے عوام نے اس پر احتجاج شروع کیا کیونکہ ان کا معاشی شعور جاگ چکا تھا۔ ان لوگوں کو احساس ہو گیا تھا کہ ان کو دورِ جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اپنے ملکوں میں صنعتی انقلاب برپا کرنا ہے۔ زرعی ترقیاتی کارنامے انجام دینے ہیں۔ اس لیے ان کا احتجاج بڑھا۔ لیکن یورپی تیل کمپنیوں کے طرزِ عمل نے ان کو مؤثر اور سخت اقدامات اٹھانے پر مجبور کر دیا اور مجموعی طور پر تیل کی قیمتوں میں اضافے کی آواز بلند ہو گئی۔ جن اسلامی ملکوں نے تیل کی قیمتوں میں اضافے کی پہلی آواز اٹھائی وہ سعودی عرب تھا۔ یاد رہے کہ تیسری دنیا کے اسلامی ممالک جو تیل پیدا کرتے ہیں ان میں سعودی عرب، عراق، کویت، لیبیا، شارجہ، بحرین، دبئی، قطر، ایران وغیرہ شامل ہیں بلکہ ان مسلم ممالک کو تیل کی بہت بڑی منڈی سمجھا جاتا ہے۔ انھی ممالک میں بڑی بڑی تیل کمپنیاں کام کرتی ہیں۔ ان تیل کمپنیوں نے اس امر کی تو پروا بھی نہ کی کہ وہ تیل پیدا کرنے والے ممالک کو خاطر میں نہ لاتی تھیں۔ ان ممالک پر دباؤ ڈالا جاتا تھا کہ وہ قیمت اور مقدار رسد کے بارے میں بدیسی تیل کمپنیوں کی شرائط اور فیصلے قبول کریں۔ انھی وجوہ کی بنا پر تیل کی قیمتوں میں مسلسل کمی کے ہی مطالبے کیے جاتے تھے۔ جبکہ دوسری طرف یورپی ممالک میں ہر قسم کی مصنوعات اور اشیائے صرف کی قیمتیں تیزی سے بڑھ رہی تھیں۔ ان سب حالات کو دیکھتے ہوئے تیسری دنیا کے پانچ مسلم ممالک نے ایک ایسی تنظیم بنانے کا اعلان کیا جو تیل برآمد کرنے والے ممالک کے مفادات کا تحفظ کرے گی۔ جب اس تنظیم کا قیام عمل میں آیا تو یورپی ممالک اور امریکہ کسی بھی ملک کو احساس نہ ہو سکا کہ یہ تنظیم غیر معمولی کردار ادا کرے گی۔ ایک ایسا فعال اور مضبوط کردار جو دنیا کی معیشت کو یکسر ہلا کر رکھ دے گی۔ اس تنظیم کا قیام ۱۹۶۰ء کے آخر میں عمل میں آیا تھا۔ اور اس کا نام اوپیک تھا۔ یہ تنظیم بن تو گئی تھی لیکن تیل برآمد کرنے والے ممالک کی سیاسی سطح اس قدر مستحکم نہ تھی کہ یہ تنظیم فوری طور پر مؤثر ثابت ہو سکی۔ سات بڑی یورپی تیل کمپنیوں نے وقت کے اس تقاضے کو اچھی طرح سے نہ سمجھا اور ۱۹۶۹ء

میں تیل کی قیمتوں میں کمی کر دی۔ یہ یک طرفہ اقدام تیل پیدا کرنے والے ممالک کے لیے ایک چیلنج ثابت ہوا۔ تیسری دنیا پہلے ہی محسوس کر رہی تھی کہ بیرونی دنیا تیل کی تجارت کے معاملے میں اپنی بالادستی سے غریب ممالک کو اپنے وسائل بروئے کار لا کر ترقی کی راہوں پر گامزن نہیں ہونے دے گی۔ لہٰذا جب اسلامی ممالک سعودی عرب، عراق، کویت، وینزویلا نے ان تیل کمپنیوں کے خلاف لائحہ عمل مرتب کیا کہ تیل کی قیمتوں میں اضافے کے لیے اس تنظیم کو فعال بنایا جائے، ایک ایسا مشترکہ لائحہ عمل تیار کیا جائے جو بیرونی تیل کمپنیوں کو یک طرفہ طور پر تیل کی قیمتوں میں اضافے کی طرف مائل کر دے۔ جب اس تنظیم کا قیام ہوا تو پانچ ممالک سامنے آئے تھے مگر جب تیسری دنیا کے عوام نے آواز بلند کی تو اس کے اراکین کی تعداد تیرہ ہو گئی تھی۔

تیسری دنیا کے ملک میں تیل پیدا کرنے والے ممالک نے تیل کی سیاست کی اہمیت کو یوں تو ہر دور میں بخوبی سمجھا لیکن ماضی کے آئینے سے جھانک کر سیاسی نشیب و فراز کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تیل میں قیمتوں کے اضافے کی آواز مشرق وسطیٰ میں مسئلہ [illegible] کے بعد زیادہ بڑھی۔ اور عربوں نے مکمل اتحاد کا مظاہرہ کر کے تیل کی قیمت میں اضافہ اور اس کی رسد میں تخفیف کا اعلان کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسا اقدام تھا کہ مغربی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ ان کے اخبارات نے لکھا: "تیل کی قیمتوں میں اضافے کا مطالبہ کر کے تیسری دنیا نے اپنے مفادات سے روگردانی کی ہے۔ پٹرولیم ایندھن کی قیمتوں میں اضافے سے یورپی ممالک متاثر ہوئے ہیں۔ اس لیے تیسری دنیا کے پسماندہ ممالک کی ترقیاتی امداد میں کمی ہو جائے گی۔" مگر اس شر انگیز پروپیگنڈے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور اوپیک تیسری دنیا کے معاشی مسائل کے حل میں اہم کردار ادا کرتی رہی اور ترقی پذیر دنیا کا ہر فرد محسوس کرنے لگا کہ ان کے مسائل خاطر خواہ طور پر حل کیے جا سکتے ہیں۔ تیل کمپنیوں کا اثر و رسوخ کم ہو گیا ہے۔ یورپی ممالک کی بالادستی مجروح ہوئی ہے۔ تیل کی سیاست شرائط اور قیود کی حد سے نکل گئی ہے۔ تیل پیدا کرنے والے ممالک آزادی سے تجارتی منڈی کا قیام کر سکتے ہیں اور جن ممالک کو جس قدر چاہیں تیل کی سپلائی دے سکتے ہیں۔

آپ کو یاد ہو گا کہ جب تیسری دنیا کے تیل پیدا کرنے والے ممالک نے قیمتوں میں اضافے کے لیے چند ممالک کو تیل کی سپلائی روک دی تھی۔ تو پوری مغرب اور ترقی پذیر دنیا بحران کا شکار ہو گئی تھی۔ وہاں کی بلند بالا چمنیوں سے دھواں نکلنا بند ہو گیا تھا۔ سڑکوں کی جگمگاتی روشنیاں ماند پڑ گئی تھیں۔ شاہراہوں پر ہر وقت دوڑنے والی گاڑیاں، موٹریں ناکارہ ہو کر رہ گئی تھیں۔ مختصر یہ کہ یورپی ممالک کی عام سماجی زندگی میں بھی ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔ اس وقت ان کے ہر گھر میں ہر فرد کی زبان پر سعودی عرب، ایران اور عرب امارات کا ہی نام تھا۔ اس تیل کی سیاست ہی کی بدولت تیسری دنیا کے تین اہم لیڈر بین الاقوامی حلقوں میں مقبول ہو گئے تھے جن میں سرِ فہرست شاہ فیصل شہید تھے جنہوں نے امریکہ جیسی بڑی طاقت کو بھی دھمکی دے دی تھی کہ تیل ہمارا ہتھیار ہے۔ اس سے عرب کاری ضرب لگائیں گے۔ دوسرے لیڈر الجزائر کے صدر بومدین اور تیسرے مصر کے انور السادات۔ آج بھی سعودی عرب نے تیل کی سپلائی کی بحالی پر مکمل رضامندی نہیں کی ہے اور اسی وجہ سے مشرق وسطیٰ کی سیاست میں عالمی سیاست کا جھنڈا اونچا ہوتا پھر رہا ہے۔ تیل کی سیاست کی بدولت ہی آج تیسری دنیا کے سامنے بڑی طاقت جھکنے لگی ہے۔ اس کا اجمالی خاکہ اگلی قسط میں دوشیزہ نواز بہنوں کی خدمت میں پیش کروں گی۔

(جاری ہے)

## شرقِ اوسط کا دورہ

دوشیزہ کے بیشمار قارئین نے ہمیں شرق اوسط کے دورے کی دعوت دی ہے، ہم ان کی اس پُرخلوص دعوت کے بیحد شکر گزار ہیں۔ فوری جو وعدہ کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ انشاءاللہ اکتوبر کے مہینے میں ہم اپنی چیف ایڈیٹر رخسانہ سہام مرزا اور مس حجاب کی معیت میں مشرق وسطیٰ کے تفصیلی دورے پر آؤں گی۔ جو احباب مجھے برادر ممالک کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تحریری، تصویری یا زبانی معلومات فراہم کریں گے ان سے تبادلہ خیال کر کے مجھے بے انتہا خوشی ہو گی۔

"رعنا فاروقی"

"سچ ———"

"ہو گیا"۔ "اپنے کالج کی چیمپئن ہوں۔ کیا سمجھتی ہیں آپ مجھ کو؟"

"ارے واہ تم تو بڑے کام کے آدمی ہو بھئی ——— میں بھی اپنے کالج کی چیمپئن تھی۔"

"سچ مچ ———" راجو چلایا

بینا ہنس پڑی۔

چائے ختم کر کے وہ لان میں آ گئے۔ دیر تک کھیلتے رہے۔ راجو واقعی بہت اچھا کھیلتا تھا۔ بینا کو لطف آ رہا تھا۔ کہنے لگی:

"تمہارے اس کمال کا آج ہی پتہ چلا راجو، پہلے کیوں نہ بتایا کہ تم اتنا اچھا کھیلتے ہو۔"

"آپ تو شیخ کے ساتھ کھیلنے چلی جایا کرتی تھیں، بہت غصہ آتا تھا مجھے۔"

وہ ہنس پڑی۔

"کیوں بھلا؟"

"میرے ساتھ جو نہ کھیلتی تھیں۔"

"تم اتنے چھوٹے ہو مجھ سے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ اتنا اچھا کھیلتے ہو۔"

"اب تو پتہ چل گیا نا ———"

بینا مسکرا دی اور مسکراتے ہوئے ریکٹ اسے تھما دیا۔

"اب میں چلی کلاس لینے۔"

کلاس لے کر واپس آئی تو اندھیرا بڑھ چکا تھا۔ گیٹ کی لائٹ جل رہی تھی۔ شرجیل کی موٹر لان کے قریب ہی کھڑی تھی۔ غالباً وہ کلب جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ بینا نے ایک لمحے کو کچھ سوچا پھر سر جھٹک کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر تک بیٹھی تنگ کرتی رہی پھر پیانو ریاض کرنے بیٹھ گئی۔ ہلکی سی چاپ پر سر گھما کر دیکھا۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ شرجیل اس کے کمرے میں بغیر اجازت آیا تھا۔ بینا نے ایک ثانیے کو اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر اپنی دھن میں محو ہو گئی۔ وہ اپنی جگہ کھڑا اسے پیانو بجاتے ہوئے سنتا رہا۔ وہ بڑی خوبصورت دھن تھی۔ بہت سحر انگیز ——— بینا اس کے وجود سے بے نیاز اپنی سرمستی میں کھوئی رہی۔ اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ خود ہی پاس پڑے صوفے پر بیٹھ گیا ——— بڑی محویت سے بینا کو دیکھتا رہا۔ دھن پیاری تھی۔ بیٹھا دلچسپی سے سنتا رہا۔ دھن ختم کر کے بینا نے سر موڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"بڑی خوبصورت دھن تھی۔ اچھا خاصا سیکھ گئی ہو۔" وہ مسکراتا ہوا بولا۔

بینا کچھ نہ بولی۔ اٹھ کر شیلف میں سے کچھ ڈھونڈنے لگی۔ چند لمحے وہ دیکھتا رہا۔ کچھ سوچتا رہا پھر بولا:

"تم تو کہتی تھیں کہ وہ آنے والا ہے۔"

"پھر ———"

"آیا کیوں نہیں ———"

"ممکن ہے دیر سے آئے۔" بینا اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ شرجیل معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔ وہ ابھی تک شیلف میں کچھ تلاش کر رہی تھی، لمبے بالوں کی ایک چوٹی سینے پر پڑی تھی اور سنجیدہ چہرے کے ساتھ سفید لباس میں وہ بہت مقدس سی لگ رہی تھی۔ بیلے کی چند کلیاں بالوں میں اٹکی تھیں۔ اس کے روکھے پھیکے رویے پر وہ کچھ دکھی سا ہو گیا۔ بینا کا یہ انداز اس کی توقع کے خلاف تھا۔ وہ شیلف سے ایک کتاب لے کر سیدھی ہو گئی۔ ایک جھٹکے سے چوٹی پیچھے ڈالی اور ذرا ہٹ کر دوسری کرسی پر بیٹھ کر کتاب کھول لی:

"کیا پڑھ رہی ہو ———؟"

"کتاب ہے ———" اس نے کتاب پر نظریں جمائے جمائے مختصر سا جواب دیا ——— لاپروا سے انداز میں ———

"پھر پڑھ لینا۔"

بینا نے نظریں اٹھائیں۔

"باتیں کرو، پڑھنے کے لیے تو ساری رات پڑی ہے۔"

بینا نے کتاب ایک طرف ڈال دی۔ سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔

"کوئی کام ہے؟"

"نہ"

"پھر آنے کا مقصد؟"

"یونہی تم سے باتیں کرنے چلا آیا۔"

"نوازش ———" وہ ہنسی

"کتنی بات ہے ———"

"بہت مصروف ہو کیا؟"

"کچھ ایسی بیکار بھی نہیں۔"

"چلو گی ———؟"

"کہاں ———؟"

"ڈنر پر ——— پھر تھوڑی سی سیر بھی کر لیں گے۔"

"معاف کیجیے ——— میرا موڈ ........"

کشف و کرامات اولیائے کرام کا خاصہ ہے۔ جو کبھی کبھی بزرگان دین کے مبارک توسط سے اللہ کے نیک بندوں کو اس کے لطف و کرم کے صدقے میں عطا ہو جاتا ہے۔

## بابا سید شان احمد صاحب

کا شمار بھی انہی برگزیدہ ہستیوں میں ہے جنہیں روحانی انعام و اکرام سے نوازا گیا اور اس کا منہ بولتا ثبوت حقیقت حال سے متعلق وہ اہم پیش گوئیاں ہیں جو بذریعہ کشف تمثیل کی صورت میں ان پر ظاہر ہوتی رہیں۔ بابا جی شادی بیاہ، مقدمات، محبت میں کامیابی یا ناکامی، مالی مشکلات اور اولاد وغیرہ سے متعلق آپ کے سوالات کے جوابات بذریعہ کشف دینے پر رضامند ہو گئے ہیں اور وہ پلک جھپکتے میں آپ کے حال اور مستقبل کے تانے بانے میں جھانک کر فوراً خدا لگتی کہہ دیں گے۔ صرف ضرورت ہے اس نام کی جس سے آپ زیادہ پکارے اور پہچانے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ آپ کی والدہ کا نام، عمر اور مقام پیدائش۔ آپ ایک وقت میں صرف دو سوال کر سکتے ہیں۔ جوابات کے لیے جوابی لفافہ بھیجنا ضروری ہے۔ بابا جی کے جوابات کا کوئی نذرانہ نہیں ہے۔ صرف انہی سوالات کے جوابات دیئے جائیں گے جن کے ساتھ "روحانی ڈاک" کا کوپن ہوگا۔

نام ———— والدہ کا نام ————

مقام پیدائش ———— عمر ————

پورا پتہ ————

————————

خط لکھنے کا پتہ

روحانی ڈاک

ماہنامہ "دوشیزہ" پوسٹ بکس [illegible]

کراچی [illegible]

کھیل شروع ہوا تو شرجیل بھی آ گیا۔ پارٹنر کا انتخاب پھر سے ہوا اور بازی جم گئی۔ شہلا اور صبیحہ ایک طرف دوسری طرف ساجد اور شرجیل۔ ایک دوسرے پر خوب چوٹیں کر رہے تھے۔ بڑا اودھم مچا ہوا تھا۔ اچانک کھیلتے کھیلتے شرجیل پیچھے مڑا۔ کچھ دور بیٹھی بینا کو پکار لیا۔

"بینا ——"

اس نے سوالیہ نظروں سے ادھر دیکھا۔

"تم نہ کھیلو گی ——؟"

"موڈ نہیں ہے۔"

"ایک دو بازی سہی۔"

"ایک دو بازیوں کا کیا مزہ —— آپ لوگ کھیلیں میں یوں بھی تھکی ہوئی سی ہوں۔"

شرجیل نے اور کچھ نہ کہا۔ بے دلی سے کھیل میں لگ گیا۔ بینا آتشدان کے قریب بیٹھی دیوار سے ٹیک لگائے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ آتشدان میں جلتے کوئلوں کا عکس اس کے گلابی چہرے پر پھیل کر اس کے حسن میں اضافہ کر رہا تھا۔ گلابی رنگ میں اتنی مٹھاس تھی کہ بے اختیار شرجیل کی نگاہیں بار بار اس پر جم جاتیں۔

"کیا بات ہے بھیا کھیل میں دل نہیں لگ رہا۔" صبیحہ نے ٹوکا۔

"تم لوگ ہو ہی بور کرنے والے۔"

"واہ ایسا دلچسپ کھیل اور آپ کو بوریت ہو رہی ہے۔"

"وہ ہار جو رہے ہیں۔" شہلا ہنسی۔

"لو ہار مان لیتا ہوں۔" شرجیل نے تاش قالین پر بکھیر دیے۔

"بس بھئی ——"

"ہارے تو بھاگ لیے۔" صبیحہ اور شہلا ایک ساتھ چلائیں۔

شرجیل کچھ نہ بولا۔ آہستہ قدموں چلتا ہوا بینا کے قریب جا بیٹھا وہ تھوڑا سا پرے کو کھسک گئی۔ شرجیل مسکرا دیا۔

"اتنی نفرت ——؟"

"نفرت کیسی ——" اس نے نظریں اٹھائیں

"پھر محبت ——"

"نہ نفرت —— نہ محبت ——"

"دونوں کے بیچ کچھ کچھ ——" وہ مسکرایا۔

"خواہ مخواہ کی الجھن ——" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ شرجیل نے اس کا پلو تھام لیا۔

"ارے —— یہ کیا ——" وہ پلٹی۔

"بیٹھو ——"

"کیوں —— ؟"

"سوال جواب کی بات نہیں —— بیٹھ جاؤ ——"

وہ خاموشی سے تھوڑی دیر کچھ سوچتی رہی پھر بیٹھ رہی۔ شرجیل نے جیب سے پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگایا۔ ماچس کی جلتی تیلی بینا پر اچھال دی۔ وہ لاپرواہ سے انداز میں بیٹھی رہی۔ شرجیل کچھ دیر لمبے لمبے کش لیتا رہا پھر اس کی طرف مڑا۔

"بینا ——"

"کیا —— ؟"

"تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

"کیسی باتیں ؟"

"یونہی کچھ۔"

"ارشاد ——"

"میرے کمرے میں چلو۔"

"ایسی کیا ضرورت پیش آگئی۔"

"چلو تو بتاؤں۔"

"میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔"

"مگر میں سنانا چاہتا ہوں۔"

"کسی اور کو سنائیں۔"

"وہ بات تم سے متعلق ہے۔"

"میں نہیں سمجھ سکی کہ اچانک کیا بات پیش آگئی۔"

"کمرے میں چلو تو بتاؤں۔"

"نہ ——" وہ اکھڑے پن سے بولی۔

"چلو نا ——" وہ سختی سے بولا۔ لہجے میں تحکم تھا، رعونت تھی۔ بینا نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور عجیب انداز میں مسکرا پڑی۔ بولی کچھ نہ۔

"آؤ چلتے ہیں۔" شرجیل نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"چھوڑ دیں میرا ہاتھ۔" وہ تلخ لہجے میں بولی۔ آواز دوسروں کے کانوں تک بھی گئی۔ انھوں نے ادھر دیکھا۔

"کیا بات ہے بینا۔" خانم اس کی طرف مڑیں۔

"سمجھائیں شرجیل کو۔"

"کیوں ستا رہا ہے۔" خانم نے ڈانٹا۔

"یہ میری بات کیوں نہیں سنتی۔"

بیگم ہر تو ہنس پڑیں۔ "کیا بچوں کی طرح لڑ رہے ہو تم دونوں۔"

"آپ اسے نہیں جانتیں آنٹی ——— جانے کس جنگل سے آئی ہے۔"

"فضول باتیں نہ کریں شرجیل۔" وہ بھڑک اٹھی۔ "اگر میں بھی کچھ کہہ دوں گی تو بُرا لگے گا۔"

"کہہ دو جو کہنا چاہتی ہو۔ میں سب کچھ سننے کے لیے تیار ہوں اس وقت۔"

بینا دانت پیس کر رہ گئی۔ ایک جھٹکے سے اٹھی اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئی۔ شرجیل نے اسے جاتے دیکھا۔ چہرے پہ ابر سا چھا گیا۔ اپنی جگہ چپ چاپ کھڑا رہا پھر سگریٹ آتشدان میں اچھال کر اپنے کمرے کو چل دیا۔

بینا بالکونی کی دیوار پہ بیٹھی سوچوں میں گم تھی۔ قدموں کی آہٹ پر پلٹ کر دیکھا ——— شرجیل جسم تنائے بت بنا کھڑا تھا۔

"ہونہہ ———" سر جھٹک کر اس نے رخ موڑ لیا۔

"کیا سمجھتی ہو تم خود کو۔" شرجیل بھڑک اٹھا۔ یہ بے نیازی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ بینا کا یہ انداز اسے کھل گیا۔

"شرجیل بلاوجہ مجھے تنگ نہ کریں ——— پلیز۔" وہ جھنجھلا گئی۔

"ایک بات پوچھوں ———" وہ ذرا قریب آگیا۔

بینا خاموش بیٹھی رہی۔

شرجیل چند لمحے اس کے خوبصورت چہرے کو دیکھتا رہا کچھ سوچتا رہا جیسے کسی الجھن میں گرفتار ہو، کچھ کہنا چاہ رہا ہو مگر کہہ نہ پا رہا ہو۔

"ڈھنگ سے جواب دو گی؟"

"اگر ڈھنگ کی بات ہوئی تو۔"

"بینا ——— میں ——— میں جاننا چاہتا ہوں کہ رضا کو تم کس حد تک پسند کرتی ہو۔"

"رضا کو ———" وہ بڑے اطمینان سے مسکرائی۔ شرجیل کی طرف دیکھا اور ہنس پڑی۔

"مجھے جواب دو بینا۔"

"کیوں جاننا چاہتے ہیں آپ؟"

"بس جاننا چاہتا ہوں ——— اور اگر تم بتانا نہیں چاہتیں تو مجبور بھی نہ کروں گا۔"

بینا چند لمحے بیٹھی کلائی میں پڑی چوڑیوں سے کھیلتی رہی، پھر نظریں اٹھاتی ہوئی بولی:

"رضا میرا دوست ہے۔"

"اور کچھ؟"

"فی الحال نہیں۔"

"ہو سکتا ہے؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی ——— یوں آدمی برے نہیں ہیں۔"

نامعلوم احساس سے مغلوب ہو کر شرجیل دیر تک اسے دیکھتا رہا ——— کچھ بول نہ سکا ——— چند لمحے ٹھہر کر بولا:

"اگر میں کہوں کہ رضا سے دور رہو تو ——— ؟"

"تو میرے نزدیک یہ کوئی اہم بات نہ ہوگی ——— ممکن ہے آپ کی بات مان بھی جاؤں اور بہت ممکن ہے میرے اس سے گہرے تعلقات ہو جائیں۔" وہ بڑی صفائی سے بولی بنا کسی جھجک کے۔

"بینا ایسا نہ ہونا چاہیے۔" اس کے ذہن میں برتری کا احساس جاگ اٹھا۔

"کیوں؟" بینا نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ شرجیل نے اس کے ہونٹوں کی وہ زہر سی مسکراہٹ دیکھی اور دھیمے سے ہنس پڑا۔

"پتہ نہیں ——— میں نہیں چاہتا کہ ایسا ہو۔"

"آپ کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔" اس کا قہقہہ اتنا ہی سرد اور بے مہر تھا۔ شرجیل نے اسے شانوں سے تھام لیا۔ آہستہ سے اس پر جھک آیا۔ سرگوشی کے سے انداز میں بولا:

"بینا تم بینا چھوڑ دو۔"

وہ ان لفظوں سے گھبرا سی گئی۔ چہرہ جیسے چٹخ گیا ہو۔ خود کو چھڑانے کی کوشش میں پیچھے ہٹتے گرتے بچی۔ شرجیل نے مضبوطی سے اسے تھام لیا ورنہ وہ کئی فٹ نیچے زمین پر گر گئی ہوتی۔

"جانے آپ کیا چاہتے ہیں۔" اس نے خود کو سنبھالا، چھڑایا اور گردن جھٹکتی ہوئی ایک بے خودی کے انداز میں اپنے کمرے کو مڑ گئی۔

---

ابھی پو بھی نہ پھٹی تھی کہ بینا کی آنکھ کھل گئی۔ انگڑائی لے کر بستر سے اٹھی۔ دریچے کا پردہ اٹھا کر جھانکا۔ باہر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ہوا میں خوشگوار سی خنکی تھی اور مہکتی ہوئی ہوا بہت بھلی لگ رہی تھی۔ دیر تک وہ دریچے پر آنکھیں بند کیے کھڑی رہی۔ چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ دریچے سے ہٹ کر نیم خوابیدہ سی کیفیت میں چلتی ہوئی باہر آ گئی۔ غیر ارادی طور پر نظر شرجیل کے کمرے پر پڑی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور وہ شکاری لباس میں ملبوس اپنا سامان درست کر رہا تھا۔ بینا نے لگو

اٹھا کر اندر چلی گئی ——— خانم بھی وہیں تھیں۔ بینا کو دیکھ کر شرجیل کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ بینا نے دیکھا وہ بہت کمزور سا لگ رہا تھا۔ چہرہ بالکل زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ اسے اس حال میں دیکھ کر وہ حیران سی رہ گئی۔ خانم اسے پیچھے سے سوپ پلا رہی تھیں۔ بینا دو قدم آگے آگئی ——— پوچھا:

"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

"دیکھ لیں —"

"زیادہ چوٹ آئی ہے کیا؟"

"کچھ اتنی زیادہ بھی نہیں، برداشت کے قابل ہے بہر حال۔"

"گولی کیسے لگ گئی؟"

وہ ہنس دیا:

"کوئی آپ جیسا ہی بہادر تھا، اسی کی بہادری کا نتیجہ ہے۔"

"میرا تو دل ہول گیا تھا اسے دیکھ کر،" خانم بولیں۔ "خدا نے بڑا کرم کیا، اگر کہیں دل کو گولی لگ جاتی تو ——"

"تو کیا ہوتا خانم ——" وہ مسکرایا، "اچھا ہے آپ کی مصیبت ختم ہو جاتی۔ آپ کو میں بہت تنگ کرتا ہوں نا۔"

"شرجیل کیسی باتیں کرتے ہو بیٹے ——— تمہیں یوں لیٹا دیکھ کر تو مجھے وحشت ہو رہی ہے اور اوپر سے تمہاری یہ باتیں۔"

"ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں خانم ——— آپ مجھ سے بہت تنگ ہیں نا؟"

"کوئی تنگ نہیں ہوں ——— اور اب تو میں تم سے خوش رہنے لگی ہوں۔" وہ مسکرا دیں۔

شرجیل حیران ہو کر ان کی طرف مڑا۔

"کیوں خانم خوشی کیسی ——— کس بات کی؟"

"تمہاری شرارتیں جو کم ہو گئی ہیں۔"

وہ ہنس پڑا۔

"اس عرصے میں ڈر ہے کہ نہ جانے پھر کب ویسا ہی ہو جاؤں یا اس سے بھی بدتر ——— یہ تو وقت پر منحصر ہے۔"

اسی وقت خانم کی کال آگئی۔ وہ سوپ کا پیالہ بینا کو تھما کر جلدی سے اٹھ گئیں۔

"تم اسے سوپ پلا دو بینا، میں دیکھتی ہوں کس کی کال ہے۔"

خانم چلی گئیں۔ بینا اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔ شرجیل اسے ہی تک رہا تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ کچھ دیر چپ رہ کر وہ کہنے لگا۔

"بس بینا ——"

"جی ——"

"تم کل سے کیوں نہ آئیں ——— دل چاہا مجھے دیکھنے کو۔"

"خیریت پتہ چل جاتی تھی۔"

"آ جاتیں تو کوئی حرج تھا؟"

"کوئی نہیں۔"

"پھر ——"

"فرصت نہ مل سکی تھی اور میرا آنا کچھ ایسا ضروری تھا کیا؟"

"اگر میں کہوں ضروری تھا تو ——"

"تو مجھے تعجب ہوگا۔"

"اس وقت کسی کے کہنے سے آئی ہو ——؟"

"فرض کیجئے ایسا ہی ہو تو ——"

"تو کچھ نہیں۔" اس نے گہری سانس لی۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم آئیں تو سہی ——— اچھا سوپ پلاؤ، بڑی بھوک لگی ہے۔"

"خانم کو آنے دیں۔"

"خانم تو تم سے کہہ گئی ہیں نا؟"

"میں انہیں جواب دے دوں گی۔"

"تمہارے پلانے میں کیا حرج ہے؟"

بینا کچھ نہ بولی۔ آہستگی سے سوپ کا پیالہ اٹھا کر اس کے پاس ہی بستر پر بیٹھ رہی۔

"سہارا دے کر ذرا مجھے اٹھاؤ تو۔"

"لیٹے رہیں ——— آپ کو اٹھنا یقیناً منع ہوگا۔"

"تم ڈاکٹر نہیں ہو۔"

"تھوڑی سی شد بد رکھتی ہوں ——— میں سمجھتی ہوں زیادہ باتیں بھی نہ کریں۔"

وہ آہستہ آہستہ اسے اپنے ہاتھ سے سوپ پلاتی رہی اور وہ پیتا رہا۔ خالی پیالہ میز پر رکھ کر وہ پاس پڑی کرسی پر بیٹھ رہی۔ شرجیل نے سگریٹ سلگا لیا۔ وہ ایک کش لے کر کہنے لگا۔

"تمہارے آنے کی خوشی ہوئی۔"

"میرے آنے کی خوشی ہوئی؟" وہ عجیب انداز سے مسکرائی، "دلچسپ بات ہے۔"

"ابھی تو نہ جانے کتنی نئی باتیں سنو گی۔" وہ مسکرایا۔ ایسا کہتے وقت اس کی آنکھوں میں بجلی سی چمک آگئی تھی۔ بینا نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ آہستہ سے بولی کچھ نہیں، اس بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی اور کچھ نہ سمجھ کر سر جھکا دیا۔

——— (باقی آئندہ) ———

پروین شاکر

وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا
مسئلہ پھول کا ہے پھول کدھر جائے گا

ہم تو سمجھے تھے کہ اک زخم ہے بھر جائے گا
کیا خبر تھی کہ رگِ جاں میں اُتر جائے گا

وہ ہواؤں کی طرح خانہ بجاں پھرتا ہے
ایک جھونکا ہے جو آئے گا گزر جائے گا

وہ جب آئے گا تو پھر اُس کی رفاقت کے لیے
موسمِ گُل مرے آنگن میں ٹھہر جائے گا

آخرش وہ بھی کہیں ریت پہ بیٹھی ہو گی
تیرا یہ پیار بھی دریا ہے، اُتر جائے گا

مجھ کو تہذیب کے برزخ کا بنایا وارث
جُرم یہ بھی مرے اجداد کے سر جائے گا

جہاں تک میں سمجھتا ہوں یہ سارا سلسلہ آپ کے بچپن سے گہرے طور پر وابستہ ہے۔ یقیناً ایسا ہوا ہوگا کہ بچپن میں کوئی شخصیت ذہن پر گہرا اثر چھوڑ گئی ہے۔ یہاں تک کہ وہ شخصیت جنسی جذبات کو تحریک دینے کا باعث بن جاتی ہے۔ یہ شخصیت لاشعور کے کسی گوشے میں وہیں بیٹھی رہتی ہے اور جب اس شخصیت سے ملتی جلتی کوئی شبیہ سامنے آجائے تو لاشعور میں شدید تحریک پیدا ہوتی ہے۔ آپ کا ان کے سامنے بے بس ہو جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ لاشعور اپنی آسودگی کی خاطر آپ کے شعور کو بے بس کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ لمحات گزر جاتے ہیں تو شعور کو ہوش آتا ہے۔ باشعور ہوتے ہی آپ اپنے لاشعور کی اس غیر اخلاقی حرکت پر نادم ہوتی ہیں۔ غصہ آتا ہے۔ جنسی آسودگی کوئی مشینی عمل نہیں کہ ایک مخصوص طریقے کے ذریعے یہ آسودگی میسر آجائے۔ جنسی عمل دراصل ایک شدید جذباتی اور ہیجانی کیفیت کا نام ہے۔ آپ کو یقیناً اس بات کا تجربہ ہوا ہوگا کہ کبھی آپ شوہر سے شدید طور پر ہیجان محسوس کرتی ہوں اور کبھی وہی عمل آپ کے لیے بے معنی ہو جاتا ہے۔ گویا ایک ہی عمل سے مختلف اوقات میں مختلف نتائج برآمد ہوتے ہیں اور ان نتائج کا تعلق اس دن اس لمحے اپنے اندرونی جذبات سے وابستہ ہوتا ہے۔

یہ تو تھی ایک مختصر سی تفصیل ان جذبات کی جن سے آپ دوچار ہیں۔

اب رہا علاج یعنی اس شخص کی آپ پر ذہنی گرفت سے چھٹکارا پانے کا طریقہ تو محترمہ آپ شعوری طور پر قسم کھا کر اپنے لاشعور سے لڑ تو سکتی ہیں مگر اس غیر فطری ناچاقی سے ان جذبات کو دبا دینا کوئی علاج نہیں کیونکہ آپ مستقل طور پر ایک بوجھ ایک خوف اور ندامت میں مبتلا رہیں گی۔

دوسرا فقرہ جو آپ کے لاشعور کی کیفیت کو بیان کرتا ہے وہ ڈراکولا کی طرح خوفزدہ ہوتے ہوئے لہو پینے کی آرزو۔ ڈراکولا "اذیت پرستی" کی علامت ہے۔ ایک ہیبت ناک شکل والا آدمی جو جنس مخالف کی گردن میں دانت گاڑ کر لہو پیتا ہے۔ دراصل کہانی نویس نے اذیت پرستی کا براہ راست مظاہرہ کرنے کی بجائے اسے وحشتناک صورت دے کر اپنے کردار کو جنسی سنسر شپ سے بچانا چاہتا تھا ورنہ اس کہانی کا مرکزی کردار اور اس کے شکار سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ اذیت حاصل کر کے لذت کشید ہوتے ہیں اور بلا اس کی اس آسودگی کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ انھیں اپنی جان تک کی بھی پرواہ نہیں ہوتی۔ ذرا اپنے اندر جھانکیے اور سوچئے کہ کہیں آپ دراصل ان صاحب سے کسی ایسے اقدام سے آسودہ تو نہیں ہوتیں جس میں اذیت کا پہلو نکلتا ہے۔ شکل و صورت سے نفرت، آنکھوں میں سانپ کی پھنکار اور پھر ان کے اقدام پر خود کو بے دست و پا محسوس کرنا اور بالکل ایسے ہی منتظر رہنا جس طرح ڈراکولا کے شکار منتظر رہا کرتے تھے ـــــ اس مخصوص تکلیف دہ اور اذیت کے منتظر ـــــ!

ہو سکتا ہے آپ کے لاشعور کا وہ گوشہ جو اذیت پسند ہے، شوہر کے نرم و نازک پیار سے نا آسودہ رہتا ہے۔ گھبرائیے نہیں تقریباً ہر فرد میں اذیت پرستی اور اذیت پسندی کے جراثیم پائے جاتے ہیں کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ یہ نفسیاتی الجھن صرف اسی وقت بنتی ہے جب ایک فرد صرف اور صرف اذیت ہی سے آسودگی محسوس کرتا ہو اور عام حالات سے اسے کوئی آسودگی محسوس نہ ہو۔ آپ میں ایسی کوئی علامت نہیں۔ اس لیے آپ خود کو اذیت پسندی کی مریضہ بھی نہ سمجھ بیٹھیں۔ یہ تو صرف یہ نشان دہی اس لیے کر رہا ہوں کہ آپ کی اس بیزاری کی چھان پھٹک کر سکوں تاکہ آپ خود کو پہچان کر از خود صحت مند محسوس کرنے لگیں اور اس شخص سے با آسانی چھٹکارا پالیں۔ جبر سے نہیں بلکہ از خود بلا کسی قسم کے الجھاؤ اور پریشانی کے۔ اگر میری مندرجہ بالا تشریح سے آپ کے ذہن کا کوئی گوشہ چونک کر خود کو جان لے تو پھر آپ کو قطعی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں اور اگر اس کے باوجود آپ سنبھل نہ سکیں تو پھر جبر کیجئے یا کسی مقامی ماہر سے مل لیجئے لیکن اس وقت تک جب تک کہ آپ اپنے اندر اس شخص سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں پاتیں اس سے کسی بھی صورت میں نہ ملیں۔

میں نے آپ کے خط سے جو علامتیں (SYMBAL) حاصل کیں یہ تو تجزیہ نفسی کی بنیاد ہے لیکن قطعی اور صحیح تجزیہ کرنا غلط ہوگا۔ اس لیے کہ محض خطوط کی بنا پر یہ ناممکن ہے۔ البتہ اگر آپ اپنے تین خواب جو مسلسل تین راتوں کو دیکھے ہوں وہ لکھ کر بھیج دیں تو ہو سکتا ہے مجھے کچھ قطعی نشانیاں مل جائیں مگر خواب بغیر ترمیم شدہ اور بغیر کسی قطع برید کے ہونے چاہئیں جیسے بھی اُلٹے سیدھے نظر آئیں بالکل ویسے ہی لکھ ڈالئے۔ اگر کوئی بات یاد نہ رہی ہو تو اپنی جانب سے ہرگز کوئی بات شامل نہ کریں۔ اللہ آپ کے اخلاقی اقدار کی حفاظت کرے۔ آمین!

## ھلنے میں کیا کروں ؟

عزیز بھیا ناز صاحب!

آداب: بہت عرصہ گزرا میں نے سوچا کسی سے اپنی پریشانی کا اظہار کروں۔ آج پہلی بار جرأت سے یہ قدم اٹھا رہی ہوں۔

بھیا! بچپن سے ہر منزل پر میں اپنی بہن سے شکست کھائی ہے یعنی میٹرک سکول کی پڑھائی کے دوران وہ ہمیشہ اچھی پوزیشن لے گئی حالانکہ میں بھی اتنا ہی پڑھتی تھی۔ حتیٰ کہ کالج کا زمانہ آگیا اور یہاں بھی یہی حال رہا۔ میں اس سے زیادہ پڑھنے کے باوجود اس سے آگے نہ بڑھ سکی۔ بی اے کا نتیجہ آیا۔ اس میں بھی یہی ہوا۔ حالانکہ اس سے زیادہ میں نے محنت کی تھی۔ اور اس وجہ سے میرے ذہن میں شکست کا سوال کچھ اس شدت سے پیدا ہو گیا کہ غصہ لگا تو دو کنارہ مسکراتی بھی نہیں۔ ابا جان ٹی بی کے مریض ہیں۔ میں اکیلی ہوتی ہوں ایک طرف تو سب طنز کرتے ہیں اور دوسری طرف ابا جان کو ذہنی دیا دکھائی

ہو جائے تو میرے سر الزام لگاتے ہیں کہ تمہاری وجہ سے ہوا۔ اب یہ حال ہے
کہ ایک وقت کا کھانا بھی بہت مجبور کرنے پر کھاتی ہوں صرف والدین کی وجہ سے
زندگی کی ذرہ برابر بھی ضرورت نہیں۔ بات یہیں ختم ہو جاتی تو مطمئن رہتی لیکن
خدا سے گلہ ہے یعنی۔ اس نے بھی مجھے ایسی بیماری میں مبتلا کر دیا جو کہ نسوانیت کے
لیے لعنت ہے۔ بہتیرے علاج کرائے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ بلکہ

؎ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

والدین بھی میری طرف سے فکرمند رہتے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے کہ
کیا بیماری ہے اور یہی کہ جو آجکل کی سینکڑوں پاکستانی بہنوں کا مسئلہ ہے یعنی
چہرہ پر بال۔ یہ دوسری شکست ہے جو مجھے اپنی بہن کی طرف سے ملی ہے۔
بجیا! پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہوں قرآن مجید کی تلاوت کرتی ہوں
کیونکہ مذہبی گھرانہ ہے۔ مسئلے کے حل کی دعائیں مانگتی ہوں۔ کبھی خودکشی
کرنے کو دل چاہتا ہے۔ حالانکہ معلوم ہے یہ اسلام کی رو سے ناجائز ہے۔
یہی کچھ سوچ سوچ کر اگلی زندگی میں کیا ہوگا والدین کے ہاں تو بری بھلی گزر
ہی رہی ہے۔ نہ علم کا شوق نہ اچھا کھانے پہننے کا۔ شکل صورت ایسی کہ بدصورت
نہیں کہا جا سکتا لیکن منزل کوئی نہیں۔ دل لگتا ہی نہیں نہ پڑھائی میں نہ
دوسرے کسی کام میں NDVP میں سروس کی لیکن تنخواہ جیسی ملی [illegible]
اچھی نہیں اس لیے مزید کوشش بیکار۔ ایک ایسا پتھر جو اپنی جگہ سے سرکتا
نظر نہیں آتا۔ والدین کسی جگہ بات چیت کر رہے ہیں لیکن مجھے ہر وقت
یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ وہاں بھی بے عزتی نہ ہو جائے۔ شاید اس شکست
کے بعد تو سر اٹھانے کے قابل بھی نہ رہوں۔ سمجھ نہیں آتا کیا کروں کیا نہ کروں
خدا کے لیے جلد جواب دیجئے خواہ مختصر الفاظ میں۔ آج تک کوئی دعا کوئی آرزو
پوری نہیں ہوئی خدا کرے میری زندگی میرے والد کو مل جائے۔
ہر وقت سوچتے رہنے سے سر سفید ہو چلا ہے اور رونے سے نظر خراب ہو
رہی ہے۔ اس سے اچھا ہے کوئی بڑی بیماری ہو کر زندگی سے چھٹکارا ملے
زندہ رہنے کی کوئی خواہش نہیں۔ اگر کہیں شادی ہو جاتی تو چھوٹی بہن سے
شکست کا خوف نہ ہوتا۔ شاید تعلیم ہی آگے جہاں میں جانا ہے۔ دعا کریں
کہ حرام موت نہ مروں۔ ابا جان ہی صرف کمانے والے ہیں وہ بیمار رہتے ہیں
ایک ہی بھائی ہے وہ ابھی چھوٹا ہے زیر تعلیم ہے۔ مہنگائی کا دور دورہ ہے
چھوٹی سی دکان ہے۔ بجیا! آپ مجھے نصیحت نہ کریں کہ اپنے سے کمتر
کی طرف دیکھو کیونکہ بجیا یہ باتیں تو میرے والدین بھی سمجھاتے رہتے ہیں میں
کیوں نہ اپنے سے بہتر کی طرف دیکھوں۔ خاص طور پر اپنے خاندان میں تو بھی
گھر کے ماحول پر ہی نظر کروں۔ جیسے بجیا قسمت کا لکھا ہوتی ہے۔ جب
قسمت ہی بہتر نہیں تو کیا کیا جائے۔ کیا بجیا واقعی کسی ایسے چہرے پر جس پر خفیف
ریش کے آثار پیدا ہو سکتے ہیں۔ کہیں مجھے بھی زندگی میں خوشی نصیب ہوگی۔

**آپ بیتی** میں جو مزہ ہے وہ جگ بیتی
(تاریخ) میں کہاں؟ مؤرخ بڑا بے شک ہو اور
تحقیق و تلاش میں سرگرم، آپ بیتی لکھنے والے
کو نہیں پہنچ سکتا۔ بعض اوقات اس کے ایک
بے ساختہ جملے سے وہ اسرار حل ہو جاتے ہیں جو
مدتوں تاریخ کی ورق گردانی کے بعد بھی حل نہیں
ہوتے۔ اگر ہر شخص جس نے دنیا دیکھی بھالی ہے
اور کچھ کیا بھی ہے، اپنی آپ بیتی لکھ جایا کرے
تو ادب کے خزانے میں یہ جواہرات انمول ہوں۔

○ "بابائے اردو"

بجیا آپ کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے یہ جانتے ہوئے بھی میں جیسی ایک
فضول سی ہستی نے آپ کا اتنا وقت ضائع کیا۔ ہو سکے تو ایک نالائق بہن سمجھ کر
معاف کر دینا۔ شکر گزار رہوں گی۔

آپ کی اپنی بہن "ص، س" راولپنڈی

عزیزی ص س

آپ زندگی کے بہت اہم پہلو کو نظرانداز کر گئیں۔ انسان کے ارتقا اور
عروج کے لیے لازم ہے کہ اس کے اندر مقابلے کا احساس اور آگے بڑھنے کی
صلاحیت ہو۔ جس دن آدمی یہ دونوں چیزیں کھو دیتا ہے اس دن وہ ناکارہ
ہو جاتا ہے۔ مقابلے کا احساس بھی اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی مد مقابل ہو
یعنی کوئی اپنے سے بہتر اپنے سے آگے ہو۔ اسے دیکھ کر ہی انسان آگے بڑھنے
کی آرزو کو جنم دیتا ہے۔ اگر ایک آدمی کو ہر چیز مل جائے اور وہ ہاتھ پر ہاتھ
دھر کر بیٹھ جائے تو پھر اس کا ذہنی اور جسمانی ارتقا رک جاتا ہے اور وہ اپنی
موت آپ مر جائے گا۔ ارتقا کا راز اسی میں ہے کہ آدمی آگے بڑھنے کی آرزو
کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو بیدار کرتا ہے۔ انسان کی صرف ایک منزل ہوتی
ہے ــــ آگے اور آگے کچھ اور آگے ـــــــ دوسروں سے بہتر
اور زیادہ حاصل کرنے کی لگن اور احساس کمتری انسانی زندگی کے ارتقا کے
لیے فطرت کی جانب سے ایک عطیہ ہے۔ اگر انسان میں یہ احساس نہ ہو تو پھر وہ آگے
بڑھنے اور دوسروں سے بڑھنے کی آرزو ہی سے محروم ہو جاتا ہے اور بالکل
ایک ایسا ٹھہرا ہوا منجمد تالاب بن جائے جس کا پانی بتدریج گدلا ہوتے ہوتے
متعفن ہو جاتا ہے۔ انسان اس دن مر جاتا ہے جس دن وہ ٹھہر جاتا ہے اور رک
جاتا ہے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ ظاہر ہے آدمی ہر چیز حاصل نہیں کر سکتا۔

راجیہ گپتا

# غزل

بڑھا کچھ وقت سے احساس غم کا
چڑھا سورج تو سایہ اور چمکا

جسے کہتی ہے دُنیا شادمانی
وہ اِک بدلا ہوا نقشہ ہے غم کا

تغافل بھی ہے اِک طرزِ توجہ
سِتم بھی ایک پردہ ہے کرم کا

ترے دامن کو بھر دوں موتیوں سے
تقاضہ ہے یہ میری چشمِ نم کا

بقدرِ شوق دِل ہے دولتِ درد
یہاں جھگڑا نہیں کچھ بیش و کم کا

سُنا ہے شاعری ہے دوسرا نام
مرے جذباتِ دِل کے زیر و بم کا

جفا کا نام تک باقی نہیں ہے
کرم دیکھو زمانے کے ستم کا

پابندی کریں۔ چہرہ صابن سے دھویا کریں اور جلد کی مناسبت کا خاص خیال رکھا کریں۔

بالوں کے لیے آپ فروری کا شمارہ ملاحظہ فرمائیں تفصیل سے جواب ملے گا۔

## سمرا اعوان، کراچی

س: باجی میں نے آپ کے مشورے کے مطابق الزبتھ آرڈن موکیس استعمال کرنا چاہی۔ تمام جگہ تلاش کی مگر کہیں بھی نہیں مل سکی۔ اب آپ ہی بتائیں کہ یہ کہاں سے ملے گی۔

## ذکریہ نور محمد، کراچی

س: پچھلے شمارے میں الزبتھ آرڈن موکیس کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ ہمیں کہیں بھی نہیں مل رہی۔ اگر آپ ہمیں بذریعہ وی پی بھیج دیں تو بڑی مہربانی ہوگی نیز یہ بھی بتا دیجئے کہ اس کا استعمال کب اور کیسے کیا جاتا ہے۔

ج: سمرا بہن اور ذکریہ بہن! الزبتھ آرڈن موکیس ہم آپ کو بذریعہ وی پی بھیج دیں گے ساتھ تمام تفصیل بھی لکھ کر بھیج دیں گے، فکر مند نہ ہوں۔ اپنا مکمل پتہ لکھ کر بھیج دیں۔

## محمد اسلم جاوید، کراچی نمبر ۲

ج: دانتوں کے لیے جس منجن کی آپ کو ضرورت ہے وہ ہم آپ کو بھیج دیں گے۔ اس کے لیے آپ پانچ روپے دفتر کے پتے پر روانہ کر دیجئے۔

## جی، ایم، کراچی

ج: آپ کے کہنے کے مطابق ہم آپ کا خط شائع نہیں کر رہے۔ آپ نے تو ذرا سی بات کو اتنا بڑا مسئلہ بنا رکھا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں خوب کھانا پینا شروع کر دیں۔ روزانہ ڈمبل ورزش کیا کریں آپ کے پٹھے مضبوط ہو جائیں گے۔ چند روز بعد ہی صحیح کام بھی کر کے دیکھیں۔ زیتون کے تیل کے ساتھ روزانہ بازوؤں کی مالش بھی کیا کریں۔ ضرور فرق پڑے گا۔

## ساجدہ افضل، حضرو

س: میں چہرے کے روؤں کو ختم کرنے کے لیے ڈاکٹر ڈائیز کی کریم لیتی استعمال کرتی ہوں لیکن اس کریم کے ساتھ بال ختم نہیں ہوتے بلکہ اس سے بال اور کالے نہیں ہوتے۔ نیز ایسا علاج بھی بتائیے جس سے چہرے پر مسلے بھی ختم ہو جائیں؟ جواب ضرور دیجئے گا۔

ج: آدھا چائے کا چمچ L'OREAL HAIR BLEACH لے کر اس میں ایک ٹکنے کا چمچ کریم پاؤڈر اینڈ CREAM - PER OXIDE - ملائیں اور پیسٹ سا بنا کر چہرے پر کسی نرم چیز کے ذریعہ لگائیں اور ۲۰ سے ۲۵ منٹ تک لگا رہنے دیں پھر اتار کر منہ دھو لیں۔ لیکن چہرہ صاف کرنے کے بعد CETAMIDE CREAM ضرور لگائیں۔ دانوں کے لیے شاہد ناز کو جو مشورہ دیا ہے اس پر عمل کریں۔

## روحی، راولپنڈی

س: میری آنکھیں کمزور ہو گئی ہیں۔ عنقریب میں چشمہ لگوا رہی ہوں باجی کیا آپ بتائیں گی کہ میرے چہرے پر کس قسم کا فریم سوٹ کرے گا۔ میرا چہرہ گول ہے اور عمر ۱۴ سال اور آنکھوں کا رنگ براؤن ہے۔ یہ بھی بتائیے بال کس طرح کٹواؤں۔

ج: گول چہرے پر بالائی ڈنڈا سیدھا کبھی بھی سوٹ نہیں کرتے۔ اس بات کا خیال رکھئے TWO TONED FRAMES وہ فریم لگائیں جن میں دو شیڈ استعمال ہوئے ہوں جیسے گہرا براؤن اور ہلکا براؤن۔ بال چھوٹے کٹوائیں۔

## شمیمہ، نواب شاہ

س: میرے چہرے کا رنگ بالکل صاف ہے لیکن گردن کی رنگت کچھ سیاہی مائل سی ہے۔ بتائیے میں اسے کس طرح صاف کروں۔

ج: آپ بلیچ کریم روزانہ سونے سے قبل اپنی گردن پر لگایا کریں جلد ہی فائدہ ہوگا۔

## عاصمہ رشید، شیخوپورہ

س: میرے چہرے پر براؤن رنگ کے تل ہیں کیا یہ ختم ہو سکتے ہیں؟

ج: آپ اسکن ٹون فریکل کریم استعمال کریں۔ کھانے میں سبزیوں اور پھلوں کا استعمال بڑھا دیں اور آگ کے نزدیک یا دھوپ میں زیادہ دیر نہ رہا کریں۔

رات کے آخری حصے میں بیوی نے

شوہر سے ایک سوال پوچھا...؟

کی وہ اندھیری راتیں تھیں، یاد ہیں نا؟"
میں دھیرے سے بولا۔

اس نے میرا سوال سن لیا اور ایک لمبی سی سانس لے کر اپنا منہ تکیے میں چھپا لیا۔ جاڑے کی وہ برفیلی راتیں، گھر کی بڑی سی انگنائی کا اندھیرا اور انگنائی کے اس پار اس کا کمرہ اور اس کمرے کی کھڑکی، وحشی اور میرے خیالات ـــــ وہ سوئی ہوتی ہے۔ صندل کی طرح مہکتا ہوا، جھومتی شاخ سا جوان جسم گرم گرم لحاف میں لپٹا ہوا۔ کاش میں اس کھڑکی سے اس کے جسم کے لمس کو محسوس کر سکتا!

"ارے شاں! میں تو کبھی ان راتوں کو نہیں بھول سکتا۔" میں نے پھر کہا۔

وہ چپ رہی اور میرے ساتھ سمٹی پڑی جوتی چاور میرے اوپر ڈال دی۔ کچھ دیر تک ہم دونوں چپ رہے لیکن اس کا دماغ کام کر رہا تھا۔ گزرے دنوں میں بھٹک رہا تھا۔ آخر کو وہ بولی۔

"تم کو کیا ہو جاتا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"تم کو ڈر نہیں لگتا تھا۔" وہ بولی اور پھر آپ ہی آپ سوچ کر اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے لگی۔ "جب تم اس سوئی ہوئی رات کے سناٹے میں، اس سردی میں ننگے پاؤں ساری انگنائی پار کر کے میرے کمرے کے دروازے سے لگ کر مجھے دیکھتے رہتے تو مجھے ایسا لگتا کہ جیسے میرے سینے میں کوئی دھان کوٹ رہا ہو۔"

"تم کو تو بس ایک ہی سبق یاد تھا۔" میں جل کر بولا۔

"کیا چاہتے ہو؟" وہ ہنسی۔

"کوئی دیکھ نہ لے۔"

"اور کیا۔" وہ شرارت سے بولی۔ "تمہیں کوئی کچھ نہ کہتا۔ سب میرا ہی نام رکھتے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے اپنی انگلیاں میرے بالوں میں الجھا دیں۔ میری آنکھوں کے سامنے ماضی کا پھیلا ہوا آسمان تھا جس پر یادوں کے کچھ ٹکڑے تھے جو چمک رہے تھے۔ ایسے ٹکڑے جو میری تپتی اور جلتی ہوئی زندگی پر دھیرے دھیرے برستے تھے اور جنہوں نے میری زندگی کے آنگن میں جل تھل کر دیا تھا۔ انہی بھٹکتے ہوئے خیالات میں میں نے اپنے ہونٹ اس کی گردن پر رکھ دیئے۔ میں جانتا تھا کہ میری اس حرکت پر وہ لاکھ ضبط کے باوجود اپنی ہنسی نہ روک پائے گی۔ وہ ہنسی اور بے تحاشہ ہنسی اور بڑی مشکل سے اپنی سانسوں پر قابو پا کر کہہ سکی۔

"میری جان کی قسم، یہ نہ کیجئے۔ مجھ سے گدگدی برداشت نہیں ہوتی۔"

ماضی کے آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا آیا اور گزر گیا۔ اس کی گردن نہ معلوم کیوں اس معاملے میں بڑی پھوہڑ تھی۔ وہ کبھی میرے ہونٹوں کے لمس کو برداشت نہیں کر پائی اور میرے ہونٹ تھے کہ اس نازک سی گردن کی شفاف سی جلد پر سینہ اور گردن کے ٹھیک

جو شاید بکھرے ہوئے کانٹے سے تل کر دیکھنے کو کیا ملنگ نکلا ادا تھے۔

میں نے گرفت ڈھیلی کر دی اور سفید چادر کو چہرے سے کر سر تک اوڑھ لیا اپنی دونوں ہتھیلیاں سینے پر رکھ لیں اور دونوں پیر ملا کر بالکل سیدھے تان لئے ٹھیک اس طرح جیسے پلنگ پر مردہ پڑا ہو۔ وہ کچھ دیر دیکھتی رہی پھر اس نے یکبارگی چادر کو میرے اوپر سے نوچ کر پھینک دیا اور جھنجھلا کر بولی۔

"پچاس بار منع کر چکی ہوں، ایسے چادر مت اوڑھا کیجئے۔"

"کیوں بھئی۔" میں جان کر انجان بن کر بولا۔

"مجھے وہم آتا ہے۔" وہ کھسیانی سی ہو گئی۔

"ہوں نہیں!" میں تھیٹر کے انداز میں بولا "ہاں آ فرض ہے ایسے مرتے پر جس کی لاش پر تم جیسا خوبصورت رونے والا موجود ہو" اور میں نے دیکھا سچ مچ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے اس کی گود میں اپنا سر رکھ دیا۔ میں جانتا تھا کہ اسے دکھ ہوگا اب میرے سامنے ایک ہی ذریعہ تھا، میرے ہونٹ اور اس کی گردن —— اور بہرحال کامیابی مجھے ہی ہوئی۔ میرے ہونٹ دیکھے نہیں کہ اسے ہنسی آ گئی۔

میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"درخشاں! آرزو تو میری یہی تھی کہ میں تمہارے سامنے مروں"

اس نے جلدی سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی "خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کرو......"

ہم دونوں تھوڑی دیر کے لئے پھر خاموش ہو گئے کہ بھولے ماضی کا ایک ٹکڑا میرے سامنے آ گیا ——

میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہیں وہ چاندرات یاد ہے؟"

"یاد ہے" وہ بڑے گداز لہجے میں بولی

میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا اور میں ہنس کر بولا

"تم تو ہائے اللہ کر کے اُچھل پڑی تھیں جیسے پیروں کے نیچے سانپ آ گیا ہو"

"شریر کہیں کے" اس نے دھیرے سے مسکرا کر میری ناک کو چٹکی سے دبا دیا۔ وہ میرے نتھنوں کو اپنی چٹکی میں دبائے تھی۔ میں نے بھی منہ کھول کر سانس نہیں لی اور دم سادھے پڑا رہا اسے اس کا احساس ہو گیا۔ وہ دلچسپی سے میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ دھیرے دھیرے میرا دم گھٹنے لگا۔ چہرہ لال ہو گیا اور آنکھوں میں پانی سا آ گیا۔ اس نے گھبرا کر میری ناک چھوڑ دی۔ میں ہنس دیا تو وہ بھی ہنس کر بولی۔

"ابھی تک شرارتیں نہیں گئیں"

ہم دونوں پھر خاموش ہو گئے رات بھیگتی جا رہی تھی۔

"فرض کرو" میں نے پھر کہنا شروع کیا "جو ہم نے سوچا تھا اگر اس کا الٹ ہو جاتا تو سوچو آج کیا ہوتا؟"

"میں پاگل ہو جاتی"

"جھوٹ"

"سچ میں ایک سیکنڈ بھی تمہارے بغیر زندہ رہ سکتی تھی؟"

"اور میں؟"

"تم تو رہ سکتے تھے" وہ مسکرائی مسکراتے ہونٹوں کے کونوں سے صاف شرارت جھانک رہی تھی۔

"سچ کہہ رہی ہو؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"نہیں" اس نے بڑھ کر مجھے اپنی باہوں میں لے لیا اور میرے بالوں کو سلجھاتے ہوئے بولی۔

"تم نے کیا دکھ لیا تھا آخر؟"

"خدا جانے" میں سنجیدہ ہو گیا۔

"لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ میں نے تمہاری جدائی کا ایک ایک لمحہ ایسی اذیت کے ساتھ کاٹا ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی سوچتا تھا تم کو کھو کر کیا رہ جائے گا مجھ میں"

"ہوں" وہ شرارت سے بولی۔

"ہوں" میں نے بھی اسی طرح جواب دیا۔

اور پھر مجھے یاد آ گیا کہ میں تھکا ہوا ہوں، رات کا وقت ہے۔ درخشاں میرے بستر پر میرے پہلو میں لیٹی ہے۔ میں نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا اور پھر باتیں بہت دور چلی گئیں۔ ہر طرف خاموشی تھی خاموشی جو وہ سب کچھ کہنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے جسے الفاظ ادا نہیں کر سکتے —— اور پھر ہم سو چکے تھے۔

یکبارگی مجھے ایسا لگا جیسے میرے کان کے اندر تیز قسم کی نفیری بج رہی ہو۔ میری آنکھ کھل گئی۔ پپو نے گیتے پر پیشاب کر دیا تھا اس کے پیشاب میں بدبو کے پیشاب کی سی بُو آ رہی تھی۔ درخشاں مجھ سے کئی بار ڈاکٹر سے ملنے کے لئے کہہ چکی تھی۔ پپو گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہا تھا میں نے انتہائی کڑواہٹ کے ساتھ چاروں طرف نظریں گھما کر دیکھا دیوار پر دھوپ اتر آئی تھی۔ اچھا خاصا دن نکل آیا تھا۔ میں نے پپو کی طرف دیکھا وہ ہوا میں پیر اچھال اچھال کر چیخ رہا تھا۔

"ارے بھئی کہاں چلی گئیں۔ کیا سنائی نہیں دے رہا ہے" میں

پھر بھاگتے اور کچھ سوتے ہوئے بولا۔
"آتی ہوں"، ریشاں کی باورچی خانے سے آواز آئی۔ میں نے تکیے پر سر رکھ کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ہتھوڑی کی چوٹوں کی آوازیں میرے دماغ کے اندر تک اترتی چلی جا رہی تھیں۔
"یہ تو اتنی سی جان مگر حلق کس طرح پھاڑتا ہے"، میں نے پلیٹ گلاس کو خاموش کرانے کے ارادے سے سیدھے جس سے گلاس کی رفتار تیز ہو گئی۔
"ارے سنتی کیوں نہیں ہو تم؟" میں نے پھر جھنجھلا کر ریشاں کو آواز دی۔ وہ اپنا کام ادھورا چھوڑ کر چلی آئی۔
"بس، نیند بھر سونے کو بھی نہیں ملتا۔ بڑی مشکل ہے"، میں نے غصے سے تیوریاں چڑھا کر کہا اور کروٹ لے کر آنکھیں بند کر لیں لیکن پھر میں سو نہ سکا۔ پندرہ بیس منٹ بعد ریشاں کی آواز باورچی خانے سے آئی۔
"اب اٹھیے، ہاتھ منہ دھو لیجئے نا، چائے ٹھنڈی ہو جائے گی"،
—— لیکن جب چائے کا گھونٹ لیا تو اس کا کسیلا پن مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔
"چائے بڑی نازک چیز ہے تم اس کو بھی توجہ دے کر نہیں بنا سکتی"۔
"کیا ہوا"، وہ قدرے ڈرتے ہوئے بولی۔
"ہوتا کیا —— ایسا لگتا ہے جیسے گرم پانی میں دھواں گھول کر لے آئی ہو"۔
"اکیلی جان ہوں، کیا کیا دیکھوں"، وہ بولی
"پپو کو سنبھالنے آئی تو لکڑیاں بجھ گئیں"۔
"وجہ تو ہر بات کی کوئی نہ کوئی ہوتی ہی ہے"، میں بگڑ کر بولا
"آپ تو بیکار کی باتیں کرتے ہیں۔ دوسری بنا دیتی ہوں"۔ وہ بھی بگڑ گئی۔
"مجھے نہیں پینا ہے"، میں تلخی سے بولا۔
"اونہہ..."، وہ جھڑک کر آگے بڑھی کہ اتنے میں باورچی خانے میں شیشے کی بوتل گرنے کی آواز آئی۔ روزی گھٹنوں گھٹنوں چل کر باورچی خانے میں گھس گیا تھا۔ ریشاں تیزی سے ادھر جھپٹی پھر اس کے بعد میں نے سنا شہناز پر بری طرح سے دو ہتھڑ پڑ رہے تھے اور گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہی تھی۔ ریشاں بک رہی تھی۔
"بے عقل کی بچی کھڑی تکتی رہی اور لڑکے نے سارا تیل پھینک دیا"۔

**طلاق** شادی کے وقت ہی سے شروع ہو جاتی ہے، بلکہ میرا خیال ہے کہ طلاق کی عمر شادی سے چند ہفتے زائد ہی ہوتی ہے۔
—— والٹیئر ——

ریشاں جب اسے اچھی طرح دھنک چکی تو اسے باورچی خانے کے باہر دھکیل دیا۔ وہ روتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے پہلو سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ میں کرسی پر بیٹھا دفتر کی فائل دیکھ رہا تھا۔ میرا جی شہناز کی طرف دیکھنے کو نہیں چاہ رہا تھا لیکن میں نے فائل سے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ میری نظر اس کے فراک پر پڑی جو میلی تھی اور کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ اس کے پیر ننگے تھے۔
"تیری چپلیں کہاں ہیں؟" میں نے اس سے سوال کیا۔ وہ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں ملتی رہی پھر دھیرے سے سسکیاں لیتے ہوئے بولی۔
"چپلیں نہیں ہیں"۔
میں ذرا تیز آواز میں ریشاں سے مخاطب ہوا۔
"میں کہتا ہوں آخر تم کرتی کیا ہو۔ بچوں کا منہ ہاتھ تک نہیں دھلتا۔ سارا دن کچن میں لت پت رہتی ہے یہ۔ صورت دیکھو چڑیلوں کی سی حالت ہو رہی ہے"۔
"دن میں کئی بار ہاتھ منہ دھلاتی ہوں اب کیسے دیکھوں؟" ریشاں منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ میں نے دیکھا ریشاں کا پائجامہ میل سے چیکٹ ہو رہا تھا۔ میری جان جل کر رہ گئی۔ میں تنک کر بولا۔
"ذرا اپنی حالت تو دیکھو۔ تم بھی کسی فقیرنی سے کم تھوڑی ہو"۔
"ایک جوڑے سے دوسرا نصیب نہیں"، وہ تڑپ کر بولی۔
"بڑی شرم آتی ہے تو بنوا دو"، پھر وہ تیوریاں چڑھا کر باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔
"ابھی بازار کا ہوش نہیں ہے۔ دفتر کا وقت آ جائے گا تو مجھے مت چھیڑنا"۔
"بڑا اچھا ناشتہ کرایا ہے کھانا بھی ایسا ہی کھلا دینا"، میں نے جل کر کہا۔

"مجبوری ہے" وہ بے رخی سے بولی۔

"مجبوری ہے تو کھانا بھی نہیں کھاؤں گا"

"نہ سہی ۔ ۔ ۔"

"تم خوشامد کیوں کرنے لگیں۔ میں ہاتھ جوڑوں گا، تمہارا غلام جو ٹھہرا"

وہ کچھ نہیں بولی۔ مجھے شدید غصہ آگیا تھا۔ میں نے پیٹی کھولی اور میلی جھوٹی قمیص نکال کر اس کے بٹن دیکھنے لگا۔ ایک بٹن ٹوٹا ہوا تھا۔ میں نے طاق پر سے سوئی دھاگا اٹھایا اور بٹن تلاش کر کے ٹانکنے بیٹھ گیا۔ ریشماں یہ دیکھ کر آگے بڑھی اور بولی۔

"لائیے میں ٹانک دوں"

"جاؤ مجھے پریشان مت کرو" میں نے اسے ڈانٹ دیا۔

وہ الٹے پیروں چلی گئی اور پھر اپنے آپ کو چولہے میں جھونک دیا یعنی کہ چولہا پھر سے دیا۔ ریشماں سہمی ہاتھ میں لئے چولہے پر جھکی گیلی لکڑیوں پر اپنی دھونکنی آزما رہی تھی کہ بچے کی آواز سن کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بچے کو لے کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک بڑا سا منہ بنا کر اپنے جمپر کا کونا اوپر کو اٹھایا۔ بچے نے لپک کر سینے پر منہ ملا اور خاموش ہو گیا۔ میں نے سرسری نگاہ سے ریشماں کی طرف دیکھا۔ اس کے ماتھے پر شاید کوئلے کی کالک لگی ہوئی تھی۔ میں بٹن ٹانک کر اٹھا اور جوتے کے لئے پالش کی ڈبیہ کھول کر دیکھی تو اس میں خاک اڑ رہی تھی مجھے اور غصہ آگیا۔ میں نہانے چلا گیا اور ریشماں پھر باورچی خانے میں گھس گئی۔ ساڑھے نو بجے جب میں دفتر کے لئے تیار ہونے لگا تو ریشماں نے کھانے کی سینی لا کر رکھ دی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں اور کپڑے پہننے لگا۔

"پہلے کھانا کھا لیجئے" ریشماں بولی۔

میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔

"آئیے نا" وہ کھانے کے قریب ہی شہباز کو لے کر بیٹھتے ہوئی بولی۔

"میں نہیں کھاؤں گا" میں نے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

"آپ کو میری قسم میرا مرا منہ دیکھئے جو نہ کھائیے"

"مردہ ہی دیکھنے کو مل جائے تو پھر یہ سارے جھگڑے ہی کیوں ہوں" میں نے انتہائی تلخی سے کہا اور بڑی تیزی کے ساتھ گھر سے نکل گیا۔

دفتر نے مجھے اپنی آغوش میں کچھ اس طرح لیا کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ یہ کہ ریشماں نے کھانا نہیں کھایا ہوگا۔ اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ ایسی حالت میں اس نے بچے کو دودھ بھی پلایا ہوگا۔ یہ خیال مجھے اس وقت بھی نہیں آیا جب میں کینٹین سے چائے اور کھن سکٹ منگوا کر کھا رہا تھا یا جب میں نے اپنے ساتھی کلرک کے ناشتے دان کے پراٹھوں میں حصہ لیا تھا۔

دفتر سے سیدھا گھر نہیں گیا کیونکہ جب میں گھر پہنچا تو نو بج چکے تھے۔ ریشماں کھانا لئے میرا انتظار کر رہی تھی۔ اجلا اجلا سا چہرہ بالوں میں تیل پڑا ہوا، ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک لگی ہوئی، دھلے ہوئے صاف ستھرے کپڑے۔ فوراً ہی خیال آیا کہ میرے طبقے کی عورت بھی بازار کی عورت کی طرح چراغ جلنے یعنی روشنی ہونے کے بعد ہی اپنے کو سنوارتی ہے۔

میں چپ چاپ کپڑے اتار کر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ ریشماں اپنے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ میں نے اس کی طرف اپنی پیٹھ کر رکھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میرے کانوں نے سنا وہ چپکے چپکے رو رہی تھی۔ میں خاموش لیٹا رہا۔ رات بھی چپ تھی پھر میں نے محسوس کیا کہ میرے پلنگ کے نیچے ایک بوجھ سا لٹک گیا اور رونے کی آواز اور زیادہ قریب ہو گئی۔ کچھ وقت اور گزر گیا۔ پھر ریشماں نے روتے روتے اچانک اپنا سر میرے بازوؤں پر رکھ دیا۔ میں نے بڑی آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے سر کی طرف بڑھایا اور اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔

"اچھا اب رو تو نہیں" یہ جملہ میرا تھا۔ وہ چپ رہی لیکن دھیرے دھیرے سسکتی رہی۔

"کھانا کھایا تم نے؟" یہ سوال بھی میں نے کیا۔

"ہاں" وہ زیر لب گنگنائی۔

"جھوٹ" میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔

"کھاؤ میری جان کی قسم"

وہ جواب میں چپ رہی۔ میں نے اس کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔

"اگر تم اس وقت نہیں کھاؤ گی تو میں بھوکا سو رہوں گا" شاید میں بھوکا نہیں تھا لیکن میں نے صفائی سے جھوٹ بول دیا پھر بھی وہ روتی رہی۔

"تم کو میری قسم ہے جو کھانا نہ کھاؤ" یہ کہہ کر میں اٹھا۔ چولہے پر سب کچھ ابھی آنچ پر رکھا تھا۔ میں نے گرم گرم کھانا نکالا اور دسترخوان بچھا

لا اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔ وہ اپنی نازک
لی لونگ کو جو رشتے رشتے سرخ ہو گئی تھی، دوپٹے سے پونچھتی ہوئی اٹھی تو
بڑی مشکل سے دو چار لڑکھڑا کر پلنگ پر پڑ رہی۔

رات خاموش تھی۔ دن بھر کی تھکن اور کوفت نے میرے جسم کی
ساری نسوں کو تان سا دیا تھا اور اب انہیں سکون کی ضرورت تھی۔ ریشماں
کے برابر میرا پلنگ تھا لیکن میں اپنے پلنگ پر نہیں لیٹا۔ وہ اپنے پلنگ
کی پٹی کی طرف منہ کئے لیٹی تھی۔ پلنگ کی پٹی اور اس کی پیٹھ کے درمیان
کسی جسم کی گنجائش نہ تھی کیونکہ اس کے ساتھ اس کے تینوں بچے لیٹے
ہوئے تھے مگر میں نے اپنے کو اس جگہ میں ٹھونس دیا اور اس کے گلے
میں بانہیں ڈال کر لیٹ گیا وہ خاموش لیٹی تھی میں بھی خاموش تھا۔

ابھی تھوڑے دنوں کی بات ہے۔ شاید صرف سات سال ہوئے
ریشماں ایک البیلی سی اور شگفتہ سی لڑکی تھی جو میرے گھر پہلی بار برسات کی
ایک سہانی صبح میں صرف چند دنوں کیلئے مہمان آئی تھی اور جسے میں نے
اپنے کمرے کے دروازے کی دراڑ سے چوروں کی طرح دیکھا تھا۔ وہ
گھر کی بڑی سی گیلی انگنائی میں اپنے دودھ جیسے غرارے کے دونوں پائنچوں
کو اپنی نازک نازک چٹکیوں سے گھٹنوں تک اٹھا کر چل رہی تھی۔ اس
کے گورے گورے پیروں میں نازک سی چپل تھی۔ کاندھوں پر گھنیرے
بالوں کے لچھے، بادلوں کی طرح مست اور خوابوں کی طرح بکھرے ہوئے
سے۔ دو سال تک میں اس کے پیار میں دیوانہ رہا تھا۔ اس موہنی سی لڑکی
نے میرے دامن میں وصل کا نشاط بھی ڈالا اور ہجر کا درد بھی مگر لڑکپن کی
وہ ہمیں صرف ایک جھلک دیکھ لینے کی وہ بے قراری کہ اس سے دو گھڑی کے
پہ خود واروں سے کہ وہ بجھونے ڈھکوسلے اور بھرکن ارمانوں سے میں سلے
بیاہ کر لایا تھا —

یکبارگی میرے خیالات منتشر ہو گئے۔ میرے کانوں میں سسکیوں
کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نے دیکھا ریشماں تکیے میں منہ دیئے
رو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"ریشماں، مجھے اتنی سخت سزا نہ دو"، میں نے چپکے سے کہا اور
چپ ہو گیا۔ میرا دماغ پھر پچھلے دنوں میں ڈوب گیا۔ ریشماں اسی طرح
میری طرف پیٹھ کئے لیٹی تھی اور شاید اس کا ہیجان کچھ کم ہو گیا تھا میں نے
اس کے کان میں کہا۔

"ریشماں! تم کو میں اس رات کا واسطہ دے کر کہتا ہوں جب
پہلی بار میرے ہونٹوں نے تمہارے ہونٹوں کے ساتھ گستاخی کی تھی،
اب مجھے معاف کر دو۔"

ریشماں کچھ نہیں بولی۔

"تم کو یاد ہے ریشماں جب پہلی بار میرے ہونٹوں نے تمہیں چوما
تھا۔" میں نے پھر سوال کیا لیکن وہ خاموش رہی۔

"بالکل پہلی بار تمہاری نظریں جھک گئی تھیں اور تمہارا سارا جسم پیپل
کے پتّوں کی مانند کپکپا رہا تھا، میں کہہ رہا تھا۔

"اور ریشماں میں ڈر گیا تھا تب ہی تو تم نے نئے نئے سے
تمہاری نظروں کے سامنے اپنے نچلے ہونٹ پر ہلکا سا نشان بنا دیا تھا۔
اور تم سے کہا تھا — دیکھو ریشماں! اس گستاخ کو اپنے کئے کی سزا مل گئی
اب تو مجھے معاف کر دو اور تم سے کچھ بن نہیں پڑا تھا۔ تم نے میرے ہونٹ
سے رستے ہوئے خون کو دیکھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا
میں جانتا تھا میری اس حرکت پر تم تڑپ کر رہ گئی تھیں۔ بولو — یاد ہے نا
وہ دن —؟"

لیکن ریشماں خاموش رہی۔ میں نے اس کے بالوں سے کھیلتے
ہوئے پھر کہنا شروع کیا۔

"اور وہ خط — وہ خط تمہیں یاد ہے نا — جو تم نے ایک
چھوٹے بچے کے ہاتھ مجھ کو بھیجا تھا۔ تم نے لکھا تھا آپ مجھے سب سے زیادہ
چاہتے ہیں اس کی قسم آج کالج نہ جائیے گا۔" ریشماں کچھ نہ بولی۔ اس کی
آنکھیں بند تھیں۔ میں نے پھر کہا۔

"اور ریشماں وہ صبح جب تم نے کہا تھا میرے ساتھ ایک
لڑکی پڑھتی ہے وہ بڑی پیاری ہے، آپ اسی سے شادی کیجئے گا۔
تو میں نے کہا تھا —

"میں تو ایک لڑکی کو پسند کر چکا ہوں"

"کون ہے وہ، مجھے بھی دکھائیے" تم اتاؤلی ہو گئی تھیں۔

"یہ ہے وہ —" میں نے تمہارے چہرے کے سامنے
آئینہ کر کے کہا تھا۔

"دھت —" یہ کہہ کر تم نے منہ چڑایا تھا اور میرے کمرے
سے بھاگ گئی تھیں، یاد ہے نا؟"

ریشماں پھر بھی کچھ نہ بولی تو میں نے جھانک کر اس کے چہرے
کی طرف دیکھا۔ شاید وہ بہت دیر پہلے سو چکی تھی۔ تھکا تھکا سا چہرہ جو
کبھی کھلے ہوئے کنول کی طرح اجلا اجلا سا تھا، مرجھائے ہوئے
پھول کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ میں پلنگ سے اٹھنے ہی والا تھا کہ ریشماں
نے دفعتاً کروٹ لی اور آہستہ سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ایک بات پوچھوں؟" وہ آنکھیں کھول کر بولی۔

"ارے ـــــ" میں نے حیرت ظاہر کی۔

"تم ابھی تک سو گئیں؟"

"نہیں" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"میں سب سن رہی تھی" پھر اس نے اپنا سر میرے بازوؤں میں چھپا لیا اور رک رک کر عجیب سے انداز میں بولی۔

"میں تم سے صرف ایک سوال کرنا چاہتی ہوں۔ بس اتنا بتاؤ کہ ساری باتیں، محبت کے زمانے کی پیارے قصے تمہیں صرف رات ہی کو یاد آتے ہیں صرف رات کو جب تم دفتر سے تھکے ہارے آتے ہو اور جب تم میرے پہلو میں آکر لیٹتے ہو؟"

"ایسا نہیں ہے ریشماں۔۔۔"

"نہیں" اس نے میری بات کاٹ دی۔

"دن کی روشنی میں تمہیں اس میں سے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔ اس میں سے کسی بات کا ذکر تم نہیں کرتے" اور یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں خاموش تھا۔ رات بھی خاموش تھی۔ میرے تینوں بچے آہستہ سے پلنگ پر پڑے تھے۔ ریشماں پھر بولی۔

"صرف پانچ سال گئے ہماری شادی کو، لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے ان پانچ سالوں کی ساری ہی باتیں مجھے ملی ہیں۔ اور ان کے حصے میں نہیں آئے کیونکہ دن کی روشنی میں تم مجھے بھوکا چھوڑ کر دفتر چلے جاتے ہو۔"

یہ کہہ کر وہ سسکیاں لینے لگی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہوں۔ اس کی پھر آواز آئی۔

"ان پانچ برسوں نے تو مجھ سے میرے دن چھین لئے ہیں لیکن اگلے پانچ برسوں میں جانتے ہو کیا ہو گا؟"

"کچھ نہیں ہو گا" میں نے اسے اپنی طرف کھینچا لیکن وہ مجھے جھٹک کر بولی۔

"اگلے برسوں میں یہ راتیں بھی مجھ سے چھن جائیں گی محبت کے زمانے کی یہ ساری یادیں کیا اگلے برسوں میں بھی تمہیں یاد رہیں گی؟"

وہ بڑی بے دردی سے رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

"سوچو تو کہ تم کو مجھ سے کیا مل سکتا ہے۔ یہی تین بچے تا اور یادوں کے کچھ پھول جو صرف رات کو تھوڑی دیر کے لئے کھلتے ہیں اور دن کو شاخ سے ٹوٹ کر گر جاتے ہیں" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور میں اسی طرح گم سم بیٹھا رہا۔ خدا جانے کتنا وقت یونہی گزر گیا ریشماں کا سر میرے زانوؤں پر تھا اور آنسو بہاتے بہاتے نہ جانے کس وقت اسے نیند آ گئی تھی۔ آخرکار میں نے آہستہ سے اس کا سر اٹھا کر اس کے تکئے پر رکھا اور نڈھال ہو کر اپنے بستر پر آکر لیٹ رہا۔

رات کے آخری حصے میں نہ جانے کیا بجا ہو گا کہ مجھے اپنے چہرے پر گرم گرم سانسیں سی بکھرتی محسوس ہوئیں۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا ریشماں میرے پہلو میں لیٹی میرے چہرے پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے نیند اور بیداری کی ملی جلی کیفیت میں اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ میرے کانوں میں رس گھولتے ہوئے بولی۔

"بڑے ظالم ہو، چپکے سے آکر لیٹ گئے۔ مجھے بھی اپنی گود میں لے آتے۔"

"تم نے مجھے معاف کر دیا نا؟" میں نے کہا

"اب اسے بھول جاؤ" وہ چپکے سے بولی "تم اب کوئی اور بات کرو۔"

میں چپ ہو گیا۔ سوچتا رہا کیا بات کروں، کوئی ایسی بات جو ہمارے درمیان مشترک ہو، لیکن ایسی کونسی بات تھی۔

"کرو نا کوئی بات" وہ پھر بولی

اور ایک بار پھر میں نے اپنے دماغ پر زور دیا لیکن مجھے کچھ نہیں ملا ـــــ

"ہاں یاد آیا" میں چونک کر بولا

"چھوٹو کے پیشاب میں بڑی کھراند ہے"

"یہ بات نہیں، کوئی اور بات" وہ مسکرائی اور پھر ہم دونوں خاموش ہو گئے ـــــ اور رات گزر گئی۔

میں اس رات بھی ریشماں کو کچھ نہ دے سکا لیکن میرا خیال ہے شاید وہ وہی رات تھی جب ریشماں کے شکم میں میرے چوتھے بچے کی داغ بیل پڑی تھی۔

دوبارہ جب میری آنکھ کھلی تو چھوٹو نے گدے پر پیشاب کر دیا تھا اور صبح کی پہلی کرن نے ہمارے ایک اور دن کی مہورت کر دی تھی۔

(۴۳) سمیع الدین کراچی (۴۴) محمد سلیم ملتان (۴۵) احمد خان ونیپور (۴۶) ثریا بیگم کولٹ (۴۷) جاوید اسلم نشتر کراچی (۴۸) اسلام الدین راولپنڈی (۴۹) تنویر شہوار ساہیوال (۵۰) طاہر الدین راولپنڈی (۵۱) مرزا رشید بیگ لاہور (۵۲) صلاح الدین کراچی (۵۳) الیاس کراچی (۵۴) مستی بیگم کراچی (۵۵) یاقوت کراچی (۵۶) شمشیر خان کلاچی (۵۷) حسین اشرف کراچی (۵۸) صادق شاہ جہلم (۵۹) مریم خاتون کراچی (۶۰) سید بی نیر سلطانہ کراچی (۶۱) قریشہ خاتون کراچی (۶۲) نسیمہ فردوس حیدرآباد (۶۳) امیر علی چنیوٹ (۶۴) عطاء اللہ گجرات (۶۵) برجیس اختر کراچی (۶۶) جہاں آراء حیدرآباد (۶۷) عمران اشرف ساہیوال (۶۸) سعادت علی بہاولنگر (۶۹) محمد مسعود راولپنڈی (۷۰) بیگم اصغر خان پشاور (۷۱) اشرف دین چشتیاں (۷۲) جمیلہ کراچی (۷۳) شفیق تلہ پور (۷۴) مجاہد علی سرگودھا (۷۵) امتیاز علی سرگودھا (۷۶) شہناز فاطمہ جہلم (۷۷) زبیر محمد لاہور (۷۸) سید مقبول احمد کراچی (۷۹) حسین علی عثمانی حیدرآباد (۸۰) خلیل اللہ سرگودھا (۸۱) سید فراست علی کوئٹہ (۸۲) اندرینہ کراچی (۸۳) شیخ مطلب دین کراچی (۸۴) خوشی لاہور (۸۵) صفیہ بیگم بہاولپور (۸۶) چوہدری رحیم خان کراچی (۸۷) محمود حسین قزلباش لاہور (۸۸) عبدالمعنی حیدرآباد (۸۹) تبسم سعید حیدرآباد (۹۰) امیر ناظم حسین کراچی (۹۱) نور احمد اسلام آباد (۹۲) ملک محمد شفیع لاہور (۹۳) مقبول شوکت لاہور (۹۴) سیف الرحمن کراچی (۹۵) عبدالعزیز رحیم یار خان (۹۶) گلزار فاطمہ اسلام آباد (۹۷) خالد شفیع خانیوال (۹۸) کرم الٰہی کراچی (۹۹) عبدالعزیز بھٹی جھنگ (۱۰۰) خواجہ میر الدین راولپنڈی (۱۰۱) عبدالرزاق اوکاڑہ (۱۰۲) اختری بیگم کراچی (۱۰۳) غلام نبی باشی لاہور (۱۰۴) عبدالقدوس چوہدری لاہور

## دو غلطی والے ۴۹۴ حل موصول ہوئے جن پر تیسرا انعام دس ہزار روپے بحساب مبلغ ۲۲ روپے ۲۸ پیسے فی حل دیا گیا

جگہ کی عدم گنجائش کی بنا پر ناموں کی طویل فہرست شائع نہیں کی جا رہی ہے۔

ایک اور دو غلطیوں والے انعامات کلیم کا انتظار کیے بغیر بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دیے گئے ہیں جو اس شمارے کی اشاعت سے پہلے آپ کو مل جائیں گے۔ اگر آپ کو انعامی رقم نہ ملے اور آپ سمجھتے ہیں کہ آپ انعام کے حقدار تھے تو ایک روپیہ کلیم فیس کے ساتھ اپنے بھیجے ہوئے حل کی تفصیلات سے مطلع فرمائیں یعنی کس تاریخ کو کتنے حل بھیجے تھے انہیں کس طرح روانہ کیا تھا یعنی منی آرڈر رسید نمبر، پوسٹل آرڈر نمبر یا نقد نامہ نمبر کا حوالہ دیجئے۔ اگر حل رجسٹری ڈاک سے بھیجے گئے تھے تو رجسٹری نمبر اور ڈاکخانہ کا نام ——— آپ کا حل کس انعام کا مستحق ہونا چاہیے تھا۔ ایسے تمام کلیم ہمیں زیادہ سے زیادہ دس جون تک مل جانے چاہئیں۔ اس تاریخ کے بعد کوئی کلیم قابلِ غور نہ ہوگا۔ اگر آپ کا کلیم درست ثابت ہوا تو انعامی رقم کے ساتھ آپ کی کلیم فیس بھی واپس کر دی جائے گی۔

ہم نے بڑی احتیاط کے ساتھ حلوں کی بار بار جانچ کی ہے۔ اس لیے ہمارا یہ خیال ہے کہ کوئی کلیم درست ثابت نہیں ہوگا۔ اسی بنا پر ایک اور دو غلطیوں کے انعامات روانہ کر دیے گئے ہیں۔ ایک اور دو غلطیوں کے جتنے بھی کلیم درست نکلیں گے ان کو ادارہ اپنی طرف سے انعامی رقم پیش کرے گا اور روانہ کردہ انعامی رقم میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ درست حل کے کلیم اگر صحیح ثابت ہوں گے تو اعلان کردہ رقم میں تبدیلی ناگزیر ہوگی۔ کلیم کی مدت (۱۰ جون ۸۰ء) کے گزرنے کے بعد ۱۲ جون کو درست حلوں کے انعامات ادا کر دیے جائیں گے۔

●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●

## ڈاک سے ملنے والے حلوں پر تین ہزار روپے کا خصوصی انعام

- بالکل درست حلوں میں سے : چار سو روپے :۔ ماسٹر عبدالحمید لاہور، ثریا بیگم کراچی، اختر نظام حیدرآباد، تسنیم کراچی،
- ایک غلطی والے حلوں میں سے : ڈھائی سو روپے :۔ رشید بٹ راولپنڈی، نظام الدین کراچی، اُزیر احمد ساہیوال، لالہ حمید گجرات،
- دو غلطی والے حلوں میں سے : ایک سو روپے :۔ روشن دین نوابشاہ، ملک شیر جھنگ، ارشد ملک لاہور، خدا بخش سرگودھا،

دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲ کیلئے یونائیٹڈ بنک نرسری میں ایک لاکھ دو ہزار روپے (۱۰۲،۰۰۰) نقد جمع کرا دیئے گئے ہیں

اِسی اکاؤنٹ سے انعامات کے چیک جاری کئے جائیں گے ۔

# 52,000.00

# باون ہزار روپے کے انعامات

پہلا انعام ہر بالکل درست حل پر چھبیس ہزار روپے

دوسرا انعام: ایک غلطی والے حل پر، بارہ ہزار پانچ سو روپے ۔ تیسرا انعام: دو غلطی والے حل پر، دس ہزار پانچ سو روپے

خصوصی انعام: تین ہزار روپے، پہلا دوسرا اور تیسرا انعام پانے والے حلوں میں سب سے پہلے ڈاک سے آنے والے چار چار حلوں پر مزید تقسیم کیا جائیگا۔ فیس داخلہ فی حل ایک روپیہ، ایک نام اور ایک کوپن کے ساتھ دو روپے پچاس پیسے میں تین خاکے بھیجے جا سکتے ہیں۔ اس حساب سے جتنے چاہے حل بھیج سکتے ہیں۔ دوشیزہ ادبی معمہ ۲ کے اپنے تمام خاکوں کے ساتھ ایک کوپن دوشیزہ ادبی معمہ ۲ ضرور بھیجئے جو ماہنامہ دوشیزہ کراچی سے کاٹا گیا ہو۔ مفصل شرائط اور ہدایات کی پابندی لازمی ہے جو ماہنامہ دوشیزہ کراچی میں شائع ہوئی ہیں۔ ایک شخص الگ کوپنوں پر الگ الگ انعام حاصل کر سکتا ہے

دفتر ماہنامہ دوشیزہ کراچی میں ڈاک سے اور دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۵ رجون ۷۵ء دس بجے رات تک

## دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲

| سلسلہ نمبر | اشارے | ممکن الفاظ | | | حل ب | حل الف |
|---|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | سماج میں عورتوں کا ۔۔۔۔ بلند ہو گیا ہے لیکن وہ بدستور پستی میں | مرتبہ | درجہ | وقار | | |
| ۲ | دنیا کی بڑی سے بڑی ۔۔۔۔ بھی دنیا سے نیکی اور احسن عمل کے آثار نہیں مٹا سکتی | طاقت | تباہی | | | |
| ۳ | تم تنہا ۔۔۔۔ کی تلاش میں نکل جاؤ | زندگی | محبت | روشنی | | |
| ۴ | انسانوں کے رشتے کو ۔۔۔۔ سے جوڑ جائے | خدا | انسانوں | | | |
| ۵ | میں نے شہر والوں کو ۔۔۔۔ کرنے کے لئے فوج کو حکم دیا کہ محاصرہ کا دائرہ تنگ کر دے | مرعوب | ہلاک | خوفزدہ | | |
| ۶ | اتنے لوگ موت کے گھاٹ اترے کہ دور تک ہر جگہ انسانی ۔۔۔۔ سے پٹی رہی | پنجروں | جسموں | ڈھانچوں | | |
| ۷ | تقدیر سے لڑا اس نے [illegible] ۔۔۔۔ [illegible] | پختہ ور | قربان | وقت | | |
| ۸ | انسان کی ۔۔۔۔ پر جگر خون ہو جاتا ہے | بے حیائی | بے اتفاقی | بے وفائی | | |
| ۹ | اُس کے ۔۔۔۔ آنسوؤں کی لکیر سے تر تھے | رخسار | گال | | | |

نام ــــــــــــ مکمل پتہ ــــــــــــ

ــــــــ ڈاک سے اپنے حل اور فیس اس پتے پر بھیجئے ــــــــ

دوشیزہ ادبی معمہ ۲ : ماہنامہ دوشیزہ، ۹۸۹ سی سنٹرل کمرشیل ایریا، علامہ اقبال روڈ، پی ای سی ایچ ایس، کراچی ۲۹

دوشیزہ ادبی معمہ ۲ کا صحیح حل ۔۔۔ جون ۷۵ء کو ایک بند لفافہ ۔۔۔ دوشیزہ کے ۔۔۔ کتابوں کے مکمل حوالوں کے ساتھ آویزاں کر دیا جائے گا۔

[illegible]

## ترپن ہزار روپے کے انعامات 53000.00

### پہلا انعام مکمل طور پر درست حل پر تیس ہزار روپے

**دوسرا انعام: ایک غلطی والے حل پر، بارہ ہزار پانچ سو روپے۔ تیسرا انعام: دو غلطی والے حل پر، دس ہزار پانچ سو روپے**

فیس داخلہ فی حل ایک روپیہ۔ ایک نام اور ایک کوپن کے ساتھ دو روپے پچاس پیسے میں تین خانے بھیجے جاسکتے ہیں۔ اس حساب سے جتنے چاہے حل بھیج سکتے ہیں۔ دوشیزہ ادبی معمہ ۳ کے اپنے تمام خانوں کے ساتھ ایک کوپن دوشیزہ ادبی معمے کا ضرور بھیجئے جو ماہنامہ دوشیزہ کراچی سے کاٹا گیا ہو۔ مفصل شرائط اور ہدایات کی پابندی لازمی ہے جو ماہنامہ دوشیزہ کراچی میں شائع ہوئی ہیں۔ ایک شخص الگ الگ کوپنوں پر الگ الگ انعام حاصل کر سکتا ہے۔

دفتر ماہنامہ دوشیزہ ۹۸ سی سنٹرل کمرشل ایریا، علامہ اقبال روڈ، پی ای سی ایچ ایس، کراچی ۲۹ میں دستی حل وصول کرنے کی آخری تاریخ ۸ جولائی ۱۹۸۸ء دس بجے رات تک

## دوشیزہ ادبی معمے نمبر ۳

| نمبر | اشارے | ممکن الفاظ | | | حل نمبر..... | حل نمبر..... | حل نمبر..... |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | جس ـــــ کو چاہیں فتح کرلیں | ملک | عورت | | | | |
| ۲ | بعض اوقات کلام کی سنجیدگی ـــــ کا خون کردیتی ہے | مطالب | توقعات | موضوع | | | |
| ۳ | ـــــ تو پوری سوسائٹی میں ہے | خرابی | افراتفری | انتشار | | | |
| ۴ | جہاں نشیب آیا، پانی ـــــ گیا | رہ | ڈھل | بہہ | | | |
| ۵ | پہلے ـــــ روتے روتے اندھے ہوجایا کرتے تھے | عوام | عشاق | بادشاہ | | | |
| ۶ | اور ـــــ پھیلا پھیلا کر فریاد کرتے تھے | ہاتھ | چادر | دامن | | | |
| ۷ | کوئے ـــــ سے اُسے زور کا پھندا لگا | گھونٹ | کش | دھوئیں | | | |
| ۸ | وہ ـــــ نظر پڑا جس نے اس کی رنگین محبت کی بنیاد رکھ دی تھی | ظالم | پتھر | شخص | | | |
| ۹ | ہماری دوستی زمان و مکان کی ـــــ سے آزاد ہے | حدود | قید | پابندیوں | | | |

نام اور مکمل پتہ ـــــــــــــــــــــــــــ

دستخط ـــــــــــــــــــــــ

ڈاک سے اپنے حل اور فیس اس پتہ پر بھیجئے:۔ دوشیزہ ادبی معمہ ۳، ماہنامہ دوشیزہ پوسٹ بکس ۱۰۰۹۸ کراچی ۲۹

دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۳ کا صحیح حل ۱۰ جولائی ۱۹۸۸ء کو ایک بجے دن دفتر دوشیزہ میں مہربند لفافے سے نکال کر مکمل حوالوں کے ساتھ آویزاں کردیا جائے گا۔

[illegible]

# دوستی حل

## کہاں کہاں جمع کرائے جاسکتے ہیں؟

دوشیزہ ادبی معموں کے شائقین کی سہولت کی خاطر عروس البلاد کراچی میں حسب ذیل سینٹر بنائے گئے ہیں، جہاں ادارہ کی طرف سے فراہم کئے گئے سربمہر سیل شدہ بکسوں میں جن پر دوشیزہ ادبی معمے ”لکھا ہوا ہے“ دوستی حل ڈالے جاسکتے ہیں۔ مقررہ تاریخ اور وقت گزرنے کے بعد ان بکسوں میں حل ڈالنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ان مراکز سے نقد نامے اور خلاصے بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

۱۔ سٹار نیوز ایجنسی، پیر الٰہی بخش کالونی
۲۔ ایم ایس نیوز ایجنسی، ریگل بس اسٹاپ صدر
۳۔ عابد اینڈ عابد نیوز ایجنسی، پہلی چورنگی ناظم آباد
۴۔ عزیز بک ڈپو، لیاقت آباد
۵۔ نایاب بک اسٹال، محمدی ہاؤس۔ آئی آئی چندریگر روڈ
۶۔ کوہ نور بک اسٹال، لی مارکیٹ
۷۔ ایم ڈبلیو ٹاور نیوز پیپر بک اسٹال، میری ویدر ٹاور
۸۔ ہلال بک اسٹال اینڈ نیوز پیپر ایجنسی، بس اسٹاپ، ٹنکی ملیر کالونی
۹۔ گل نیوز پیپر ایجنسی۔ کورنگی ۱/۶
۱۰۔ ریاض بک سنٹر نور مارکیٹ، برکات حیدری
۱۱۔ مومن اسٹور، سندھی ہوٹل،

## صرف نقد ناموں کے لیے

۱۔ عوامی کتب خانہ، بولٹن مارکیٹ
۲۔ لائٹ آف پاکستان، برنس روڈ
۳۔ میگزین بک اسٹال۔ لیاقت آباد ۱۰
۴۔ حق بک اسٹال۔ جمیلہ اسٹریٹ، سعید منزل

●●●●●●●●●●●●●●●●●●●

### ڈاک سے آنے والے درست حلوں پر خصوصی انعام کی تقسیم کیسے ہوگی؟

ڈاک سے آنے والے حلوں پر دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۲ ..... (۲) کے خصوصی انعام کی تقسیم اس طرح ہوگی، پہلا دوسرا اور تیسرا انعام پانے والے جو حل ہیں ڈاک سے ملے ہوں گے ان میں سے سب سے پہلے کھلنے والے چار حلوں پر دوشیزہ ادبی معمہ سے ملیں بالترتیب چار سو روپے، ڈھائی سو روپے اور ایک سو روپے خصوصی انعام میں سے دیئے جائیں گے۔

اگر ڈاک سے آئے ہوئے حلوں میں سے پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے مستحق حل نہ ہوسکیں تو خصوصی انعام میں سے آتا حصہ ایڈیٹر معمہ کے فیصلے پر ڈاک سے آئے ہوئے دوسرے انعامی یا غیر انعامی حلوں پر دیا جائے گا۔ ایک نام سے آنے والے تمام حلوں میں سے ایک لفافے میں سے برآمد ہونے والے تمام حلوں میں سے صرف ایک ہی حل خصوصی انعام میں حصہ پانے کا مستحق ہوگا۔

ہر ڈاک سے آئیں حلوں کے جتنے لفافے ملیں گے ان پر ہم سلسلہ وار نمبر لگاتے رہیں گے تاکہ چیکنگ کے بعد متعلقہ انعام پانے والے حلوں میں سے آنے والے چار حلوں کا تعین کر سکیں۔ خصوصی انعام میں صرف ان حلوں کو حصہ دیا جائے گا جن کے لفافے اسی مقام سے پوسٹ کئے گئے ہوں جہاں کا پتہ ان کے اندر ملے حلوں پر درج ہے۔ خصوصی انعام کے سلسلے میں بھی چیف ایڈیٹر دوشیزہ کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا اور سب حل بھیجنے والوں کو قبول کرنا ہوگا۔

### پچھلے پرچوں کی زبردست مانگ

پچھلے چند دنوں سے ماہنامہ دوشیزہ کے سابقہ شماروں کی زبردست مانگ ہوگئی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دوشیزہ ادبی معمے ملنے کے تین اشارے دوشیزہ کے ایک ہی شمارے سے مل جاتے تھے۔ ہم نے دوشیزہ کی جتنی بھی مکمل جلدیں بنوائی تھیں وہ فروخت ہوچکی ہیں۔

اگر آپ پچھلے ۱۹ شمارے منگوانا چاہیں تو آج ہی پچاس روپے (۵۰-۰۰) کا منی آرڈر اور مکمل پتہ ارسال کیجئے

منیجر: ماہنامہ دوشیزہ، پوسٹ بکس ۸۰۹۵، کراچی ۲۱

### دوشیزہ ادبی معموں پر بحث کیلئے

• انتخاب“ ہفت روزہ مجور منڈی، گوجرانوالہ
ہفت روزہ ”چمنستان“ رابسن روڈ، کراچی
ہفت روزہ ”تازیانہ“ رابسن روڈ، کراچی

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۳،۲،۲

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شاملِ مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ________

مقام و پتہ ________

________

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۳،۲،۲

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شاملِ مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ________

مقام و پتہ ________

________

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۳،۲،۲

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شاملِ مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ________

مقام و پتہ ________

________

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۳،۱،۲

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شاملِ مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ________

مقام و پتہ ________

________

# دوشیزہ ادبی کلب

## کے ممبر ایک سو روپیہ دے کر دو سو روپے کے نقد نامے حاصل کر سکتے ہیں ۔۔۔!

دوشیزہ ادبی کلب کی ممبری فیس پانچ روپے فی کس ہے۔ ممبروں کے لیے یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ "آئیڈیل کی تلاش" میں عام قارئین کے خطوط کے مقابلہ میں انھیں ترجیح دی جائے گی اور ان کے خط پہلے شائع کیے جائیں گے۔ خط و کتابت میں اپنے ممبری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

## سنہری موقع :

یکم مئی سے ۳۱ مئی ۷۵ء کے دوران دوشیزہ ادبی کلب کے بننے والے ممبران کے لیے، سنہری موقع فراہم کیا جا رہا ہے کہ انہی تاریخوں کے دوران "دوشیزہ ادبی کلب" سے سو روپے کے نقد نامے خریدنے والے ممبروں کو تاریخ خریداری سے ٹھیک ایک ماہ بعد سو روپے کے مزید نقد نامے مفت اس صورت میں دیئے جائیں گے کہ خریدے ہوئے تمام نقد نامے دوشیزہ ادبی معمے نمبر ۱ اور ۲ کے مقابلہ میں استعمال کر لئے جائیں اور مزید ایک ماہ بعد پچاس روپے کے نقد نامے مفت دیئے جائیں گے جو تاریخ اجراء سے چار ماہ تک کارآمد رہیں گے۔

مفت ملنے والے نقد نامے کسی کو تحفے میں بھی دیئے جا سکتے ہیں یا حسبِ خواہش فروخت بھی کیے جا سکتے ہیں۔

## آپ کو کیا کرنا ہے :

دوشیزہ ادبی کلب کی پانچ روپے ممبری فیس کے ساتھ سو روپے سیکرٹری دوشیزہ ادبی کلب ماہنامہ دوشیزہ علامہ اقبال روڈ، پی ای سی ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹ کے نام اپنے مکمل پتے کے ساتھ بھیج دیجئے۔ ڈرافٹ سے یہ رقم بھیجنی ہو تو کسی بنک سے کراچی کے لیے دوشیزہ میگزین کے نام ڈرافٹ بنوا کر اسے کراس کر دیجئے۔ دفتر دوشیزہ میں ذاتی طور سے بھی پانچ روپے ممبری فیس کے ساتھ سو روپے جمع کرا کے دوشیزہ ادبی معموں کے نقد نامے خریدے جا سکتے ہیں۔

آپ کی ممبری فیس اور سو روپے جمع ہوتے ہی ہم آپ کو دوشیزہ ادبی کلب کا ممبر بنا کر ممبری کی رسید اور سو روپے کے نقد نامے بھیج دیں گے اور جس تاریخ کو سو روپے کے نقد نامے خریدے جائیں گے اس کے ٹھیک ایک ماہ بعد مذکورہ شرائط کے مطابق پچاس روپے یا سو روپے کے نقد نامے بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ روانہ کر دیئے جائیں گے۔ دوشیزہ ادبی کلب کے ممبروں کو فی کس سو روپے سے زیادہ نقد نامے نہیں دیئے جائیں گے۔

# دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط

صحیح حل کے اعلان میں مالکان "دوشیزہ" کی مرضی کا قطعی دخل نہیں ہوگا بلکہ صحیح حل ماہنامہ دوشیزہ کی طرف سے کتابوں اور رسالوں کے باقاعدہ حوالوں سے شائع کیا جائے گا۔ دوشیزہ ادبی معمے کے تمام اشارے اردو کی مطبوعہ کتابوں اور رسالوں سے لئے گئے ہیں :

************************

۱ ۔ فیس داخلہ ایک روپیہ فی خانہ ہے۔ ایک ہی نام سے ایک ہی کوپن کے ساتھ دو روپے پچاس پیسے فی حل کے حساب سے بھیجے جا سکتے ہیں۔ اس حساب سے جتنے چاہیں حل بھیج سکتے ہیں۔ تمام حل چھپے ہوئے یا سادہ کاغذ پر ہاتھ سے بنائے گئے خانوں کی صورت میں ہی ضروری ہیں۔ حل کو روشنائی یا بال پین سے پُر کرنا ضروری ہے۔ ہر خانے کے نیچے اس کاغذ پر بھیجنے والے کا نام اور مکمل پتہ روشنائی یا بال پین سے لکھا ہونا چاہیے۔ پنسل سے لکھے ہوئے یا کٹے پھٹے، تبدیل شدہ، مشکوک یا نامکمل حل غیر مستحق قرار دیے جائیں گے۔ ایک بار حل بھیجنے کے بعد ان میں ترمیم کرنا ممکن نہیں ہے۔

۲ ۔ ایک شخص کے ایک ساتھ بھیجے گئے تمام حل کے ہمراہ ماہنامہ دوشیزہ کراچی سے کاٹا ہوا متعلقہ دوشیزہ ادبی معمہ کا کوپن، فیس کے طور پر بھیجے گئے منی آرڈر کی رسید یا پاکستانی پوسٹل آرڈر یا نقد نامے جاری کردہ ماہنامہ دوشیزہ کراچی منسلک کئے جائیں جو نہ اسی لفافے میں موصول ہونے لازمی ہیں۔ پوسٹل آرڈر کراس کر کے اس پر نقد نامے، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی پشت پر دوشیزہ ادبی معمہ کا نمبر، حل بھیجنے والے کا نام اور مکمل پتہ اور اس کے دستخط ہونے لازمی ہیں۔ ایک بار معمہ کا نمبر، نام، پتہ اور دستخط تحریر کئے جانے کے بعد ان میں سے کسی میں تبدیلی قابل قبول نہ ہوگی۔ ادارہ دوشیزہ کو حق ہوگا کہ انعامات کی ادائیگی سے پہلے تصدیق کرے کہ انعام پانے والا وہی ہے جس کے دستخط حلوں کے ساتھ نقد نامہ، پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی رسید پر موصول ہوئے تھے۔ بند لفافے کھلنے پر دفتر دوشیزہ میں مختلف ایجنٹوں کے پاس رکھے گئے دستی حلوں کے بکس کھلنے پر جو حل یا اس کے متعلق کاغذات نکلیں ان کی تعداد یا نوعیت کے متعلق نیز کسی لفافے میں سے کوئی بھی حل نہ نکلنے یا اس سے متعلق ضروری کاغذات، کوپن یا رسید منی آرڈر وغیرہ برآمد نہ ہونے کے متعلق مالکان دوشیزہ یا ان کی طرف سے اس کام کے لئے مقرر کردہ کسی بھی افسر کی تصدیق صحیح اور درست تسلیم کی جائے گی۔

۳ ۔ تمام حل متعلقہ دوشیزہ ادبی معمہ کے کوپن پر درج کی گئی، ماہنامہ دوشیزہ کراچی میں شائع کی جانے والی تاریخ کو مقررہ اوقات تک یہاں سربمہر دفتر دوشیزہ ۹۰ منی سنٹر کمرشل ایریا، علامہ اقبال روڈ، پی ای سی ایچ ایس کراچی پر موصول ہونے چاہئیں۔ مالکان دوشیزہ اپنے خصوصی اختیارات کو کام میں لاتے ہوئے مقررہ تاریخ یا مقررہ وقت کے بعد مگر صحیح حل ظاہر کئے جانے سے پہلے جو حل پائیں وصول کر کے شامل مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مقررہ تاریخ یا وقت کے [illegible] حل بھی [illegible] جب [illegible] شامل مقابلہ کئے جانے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ [illegible] دوشیزہ ادبی معمہ نمبر [illegible] منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر [illegible] دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ....... لکھئے۔ ایک منی آرڈر، پوسٹل آرڈر یا نقد نامے صرف ایک ہی شخص کی طرف سے ایک کوپن کے ساتھ بھیجے گئے حلوں کی فیس بھیجئے اور کسی دوسرے شخص کی کوئی رقم اس میں شامل نہ کیجئے۔ ڈاک سے حل بھیجتے وقت لفافہ پر اپنا پتہ اور متعلقہ دوشیزہ ادبی معمہ کا نمبر واضح طور پر لکھئے۔ ڈاک سے بھیجنے کے علاوہ دفتر دوشیزہ میں اور مختلف ایجنٹوں کے پاس رکھے گئے دستی حلوں کے بکس میں بھی ڈالے جا سکتے ہیں۔ حلوں کے وصول نہ ہونے، دیر سے وصول ہونے، ضائع ہو جانے یا گم ہو جانے کی صورت میں مالکان دوشیزہ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کسی بھی دوشیزہ ادبی معمہ کا صحیح حل ظاہر کرنے کی تاریخ اور حل وصول ہونے کی آخری تاریخ اور وقت سے پہلے حلوں کی وصولیابی کی آخری تاریخوں میں اضافہ کیا جا سکتا ہے یا بالکل ہی منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ منسوخی کی صورت میں اس معمے سے متعلق آئی ہوئی فیس داخلہ واپس کر دی جائے گی۔ کوئی اشارہ غلط شائع ہو جانے کی صورت میں اس میں ترمیم کا اعلان کیا جا سکتا ہے یا اسے قطعاً منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ اشارہ منسوخ ہو جانے کی صورت میں اس اشارہ کا جو بھی جواب کسی نے لکھا ہوگا اس کی غلطی شمار نہیں کی جائے گی۔

۴ ۔ جو لفظ آپ موزوں سمجھتے ہوں ان پر کسی قسم کا نشان نہ لگائیے۔ ان الفاظ پر کراس (x) لگا دیجئے جو آپ کی دانست میں غیر موزوں ہوں۔ اس کے علاوہ ہر خانے کے ہر اشارے کے آگے دو دو سادہ خانے دیے گئے ہیں۔ جو دو مزید حلوں کے لئے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اس طرح ہر چھپا ہوا خانہ تین حلوں کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر چھپا ہوا خانہ ایک حل کے لئے استعمال کرنا ہو تو صرف غیر موزوں الفاظ کو کاٹ دینا کافی ہوگا۔ ہر غیر موزوں لفظ پر اس طرح کا نشان x لگا دیجئے۔ ایک بات یاد رکھئے سادہ کاغذ پر بھیجے جانے والے حل کی ترتیب میں اکثر غلطی ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اشارہ نمبر ۱ کی جگہ اشارہ نمبر ۲ کا اور اشارہ نمبر ۲ کی جگہ اشارہ نمبر ۱ کا جواب لکھ دیا گیا تو دو غلطیاں شمار کی جائیں گی۔ اس صورت سے بچنے کے لئے چھپے ہوئے خانے استعمال کیجئے جو پاکستان بھر میں ہر بک اسٹال سے مل سکتے ہیں۔ وہ براہ راست دفتر دوشیزہ سے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ اور [illegible] پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر منگوائے جا سکتے ہیں۔ صحیح حل ڈاک سے منگوانے کے لئے جوابی لفافہ اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کیجئے۔

۵ ۔ دوشیزہ ادبی معموں میں استعمال کئے گئے تمام اشارے اردو کی صرف ان کتابوں اور رسالوں سے اخذ کئے جاتے ہیں گے جو پاکستان اور قیام پاکستان سے قبل موجودہ پاکستانی علاقوں سے شائع ہوتے ہوں۔ اگر ایک کتاب یا رسالے کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہوں یا ایک اشارہ کئی کتابوں میں شامل ہو تو ان میں سے کسی کتاب یا کتاب کے کسی بھی ایڈیشن میں سے اشارہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ہر ایڈیشن کو بجائے خود ایک علیحدہ کتاب سمجھا جائے گا۔

۶ ۔ ہر دوشیزہ ادبی معمہ کا صرف ایک ہی حل ہے جسے کوئی بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔ تمام حل وصول ہونے کی آخری تاریخ گزر جانے کے بعد دوشیزہ ادبی معمہ کا حل ظاہر کر دیا جائے گا۔ صحیح حل

# پاکستان تعمیری مرحلے سے گزر رہا ہے!

ہمیں صرف اپنی ذاتی کوششوں سے ترقی یافتہ قوموں کے شانہ بشانہ آگے قدم بڑھانا چاہیے، اسی طرح ہمارا پاکستان کو مثالی مملکت بنانے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے

## الاعظم لمیٹڈ

اپنی قومی ذمہ داریوں سے پوری طرح واقف ہیں اور ہر طبقہ کی آمدنی کے مطابق، کم سے کم قیمت کے اچھے مکانات عظیم الشان سکونتی منصوبے مزید برآں اپارٹمنٹس اور فلیٹس تعمیر کر کے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ الاعظم کی تعمیر کردہ عمارات اعلیٰ فنی مہارت اور پیشہ ورانہ ذکاوت کی آئینہ دار ہیں۔ آپ بھی ان کے ساتھ شریک ہو کر آسان شرائط پر نہ صرف اپنے ذاتی فلیٹ یا مکان حاصل کر سکتے ہیں بلکہ نئے پاکستان کی تعمیر میں حصہ لے کر اپنا قومی فریضہ بھی ادا کر سکتے ہیں

## الاعظم لمیٹڈ

۳۳ بمبینو چیمبرز ۔ گارڈن روڈ ۔ کراچی
فون نمبر : ۷۳۳۶۹ ۔ ۷۳۳۲۶

KSK AA-9.

# دوشیزہ

مدیرۂ اعلیٰ — رخسانہ سہام مرزا
مدیرہ — رعنا فاروقی
معاون — حسن عباس
آرٹ — راجہ

قیمت فی پرچہ — ۳ روپے
زرِ سالانہ — ۳۳ روپے
رجسٹری ڈاک — ۳۰ روپے

ناشر
گولڈن بلاک ورکس لمیٹڈ

پرنٹر
پاکستان ہیرالڈ پریس کراچی

اداریہ

رخسانہ سہام مرزا

# منزلِ مراد

یوں تو اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں اس کی بنیادی اہمیت کے پیشِ نظر ایک واضح نصب العین کا تعین ضروری ہے لیکن آزادیٔ نسواں کے حامی پرچوں میں "دوشیزہ" ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ذمہ داری بڑی شدت سے عائد ہوتی ہے کہ وہ صاف صاف لفظوں میں اپنی اپنی منزل کی نشاندہی کریں۔ کوئی باشعور خاتون اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی کہ "دوشیزہ" محض سوجھ بوجھ رکھنے والی خواتین کا ایک صاف ستھرا اور دل پسند مجلہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسی ثمر آور تحریک ہے جو علم و دانش کی کلیاں جھولیاں بھر بھر کر لٹائے جاتی ہے۔ اس نکتے کو سمجھنے کے لیے آپ کو ذہن پر زور ڈالنے کی چنداں ضرورت نہیں صرف زیرِ نظر شمارے پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال لینا ہی کافی ہے خاص کر مستقل عنوانات پر ———

پہلا عنوان — "تین عورتیں تین کہانیاں" — جو خواتین کے سینوں پر بکھرے ہوئے سرخ داغوں کی بہار ہی نہیں بلکہ ان المناک ان کہی داستانوں کا سسکتا ہوا پرتو بھی ہے جس کا ایک ایک نقطہ معاشرے کے بخشے ہوئے زخموں سے چور چور ہے۔ دلِ درد آشنا رکھنے والی مشہور خاتون صحافی رخسانہ فاروقی کا منجھا ہوا قلم آپ کے ہونٹوں سے نکلی ہوئی کہانیوں کی نوک پلک سنوار کر انہیں "دوشیزہ" کے صفحات پر سچے موتیوں کی طرح بکھیر دیتا ہے تاکہ آپ ان کی حقیقی قدر پہچان سکیں۔ دوسرا مستقل عنوان "الجھنیں" ہے جسے آپ کے جانے پہچانے ماہرِ نفسیات ڈاکٹر جی ایم ناز سلجھاتے ہیں اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ان کے اس خدمتِ خلق کے جذبے نے کئی بجھتے ہوئے چراغوں کو روشنی بخشی اور اس طرح گھور اندھیروں میں ڈوبتے ہوئے گھرانوں میں چار سو اجالا کر دیا۔ ڈاکٹر ناز صاحب بعارضۂ قلب صاحبِ فراش ہیں۔ اگلے ہفتے ان کے دل کا آپریشن ہونے والا ہے تا آپ بھی مزید اس فرشتہ صفت انسان کی صحت یابی کیلئے دعائے خیر کریں۔

اب رہی بات "آئیڈیل کی تلاش" کی، آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ "قدرِ زر زرگر داند قدرِ جوہر جوہری" — اس کالم میں جو جوہر چھپے ہیں وہ آپ کی جوہر شناس نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس مقبولِ عام کالم کا مقصد صرف "شادی خانہ آبادی" ہے مگر ایک پُرخلوص اور باوقار طریقے پر جس کی بنیاد سوجھ بوجھ اور باہمی مفاہمت پر ہو۔ یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ آجکل لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ بڑی نازک صورت اختیار کر گیا ہے۔ مائیں اپنی جوان سال بچیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی آرزو میں مری جا رہی ہیں مگر مناسب بر کی تلاش اب جوئے شیر لانے والی بات بن گئی ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے اس مبارک کالم کے توسط سے کئی خواتین کی مرادوں کے پھول کھلے اور انشاءاللہ ہماری بے لوث کوششوں کے نتیجے میں یہ پھول سدا یونہی کھلتے رہیں گے۔

"دوشیزہ" میں چھپنے والے افسانوں کے پسِ پردہ بھی ایک مقصد ہوتا ہے۔ یعنی ایک ایسی فضا کی تخلیق جو خواتین کی ذہنی نشوونما کے لیے سودمند اور سازگار ہو۔ یہی حال "آپ بیتی"، "فراز" اور مسلسل ناول "بینا" کا بھی ہے جس کا مجموعی تاثر دلوں میں چٹکیاں لے کر سوئی ہوئی سوچوں کو بیدار کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تصوف کی ابدی جگمگاہٹ بھی ہے جس کی نورانی کرنوں سے ہمارے سینے جگمگا اٹھتے ہیں۔

وہ دن دور نہیں جب ہماری خواتین ذہنی ترقی کے کٹھن اور نازک ترین ارتقائی دور سے گزرتی ہوئی اپنا مناسب مقام پالیں گی اور یہی وہ منزل ہوگی جہاں ان کی انتھک کوششوں کی بدولت باہمی مفاہمت اور اجتماعی شعور کے سوتے پھوٹیں گے اور ہمارے اکثر معاشرے کا بگڑتا ہوا مزاج پوری طرح سنور جائے گا ——— انشاءاللہ

شاد باد منزلِ مراد

# تین عورتیں تین کہانیاں

رعنا فاروقی

**شمیمہ** کا شمار اُن لڑکیوں میں ہوتا تھا جنہیں قدرت غیر معمولی حسن اور ذہانت سے نواز کر زمین پر بھیجتی ہے۔ بہت بڑے خاندان میں پیدا ہوئی تھی۔ اس سے بڑے آٹھ بہن بھائی تھے اور اس سے چھوٹا ایک ہی بھائی تھا جب اس کے باپ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اس وقت یہ ڈھائی تین برس کی تھی۔ باپ کی محبت کی کمی ماں نے محسوس نہیں ہونے دی۔ دولت ویسے بھی بیوہ کے آنسو جلد خشک کر دیتی ہے مگر یہ تو تھی بھی بڑی سمجھدار عورت۔ اس نے اپنے شوہر کی رُخ کو ہمیشہ اپنے قریب سمجھا اور بچوں کی پرورش بڑے باوقار انداز سے کی۔ دوسرے بچے اوسط ذہن کے تھے۔ ماں نے جیسا چلایا چلتے رہے لیکن شمیمہ کی تربیت اس کے لئے وبال ہو گئی۔ حسین صورت اور بلا کا نکھرا ذہن۔ ذہن ایسا تیز کہ ذرا سی ڈانٹ ڈپٹ کرو تو دلائل دینے لگتی کہ ماں تم غلطی پر ہو۔ ڈیڈی ہوتے تو وہ ایسا ہرگز نہیں کرتے۔ ماں نادم ہو کر بالشت بھر چھوکری سے معافی مانگنے لگتی۔ ایسی حکمرانی کسی [illegible] کی قسمت میں نہیں آتی تھی کہ جو مانگتی پا لیتی۔ جو چاہتی پورا ہوتا۔ اسکول بھیجا تو وہاں بھی اس کی ہر دلعزیزی کا یہی عالم رہا کہ استانیاں تک مرعوب تھیں۔ ایک تو کمبخت کا چاندنی جیسا روپ سب سے منفرد کئے ہوئے تھا دوسرے بعض اوقات تو اس کے تیز ذہن سے نکلے سوالات سے استانیاں گڑبڑا جاتیں۔ باتیں کرنا بھی ایک فن ہے جس سے اکثر باتونی لوگ قطعی ناواقف ہوتے ہیں۔ دوسروں کی دلچسپی جان لینے کے بعد اس معیار کی گفتگو کرنا بہت کم لوگوں کو آتا ہے۔ شمیمہ اس فن سے واقف تھی جس موضوع پر چاہو اس سے بات کر لو۔ ایسے چٹخے دار جواب دیتی کہ سننے والے کا ذہن تازگی اور شگفتگی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکے۔ لڑکیاں اسے دیکھ دیکھ کر جلا کرتیں۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی صلاحیتیں اس کی ساتھی لڑکیوں کے لئے حسد کا سامان بن گئی ہیں۔ بظاہر وہ سب اس سے خوش اخلاقی سے ملتی تھیں اور شمیمہ ان کے دلوں کا حال جانتے ہوئے بھی اس سے مسکرا کر بات کرتی لیکن یہ گروہ اس کے پیچھے نفرت کا زہر اگلنے بیٹھ جاتا کہ خود کو کسی ملک کی شہزادی سمجھتی ہے۔ اسکول کے بعد کالج میں بھی یہی حال رہا۔ اس کے حسن کی دھوم مچ گئی۔ اس کی ذہانت کا ڈنکا بجنے لگا اور اسی طرح نفرت اور حسد کرنے کے باوجود لڑکیاں اس کے گرد منڈلاتی رہتیں۔ اگر شمیمہ چار سال کالج میں گزار دیتی تو یقیناً خون خرابہ ہو جاتا۔ برابر میں لڑکوں کا کالج تھا۔ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے لڑکے اپنا ہیر پریس کر کے گھنٹوں کھڑے رہتے۔ رقابتوں نے بھی جنم لیا۔ اور مار کٹائی بھی ہوئی مگر ان تمام ہنگاموں سے یہ حسن بے پرواہ لاتعلق رہا۔ اور اچھا ہی ہوا جو یہ فتنہ اس وقت نہ جاگا۔ ایک سال اور کالج میں گزار دیتی تو وہ ان معاملات میں شاید دلچسپی لینے لگتی لیکن جہاں دیدہ ماں نے ایف اے کے دوسرے سال اس کی شادی

ملا کر کے اسے پڑھنے سے اٹھا لیا۔ شیمہ پر اب تک پڑھائی کی دھن سوار تھی وہ اس فیصلے پر خاصی بگڑی کہ کم از کم مجھے بی اے تو کرنے دیں لیکن حال اس بار اس کے دلائل سے متاثر نہیں ہوئی۔ شادی کے وقت اس کی عمر سولہ برس کی تھی۔ شیمہ کے شوہر نے اس کے بے پناہ حسن کو دیکھا اور مبہوت رہ گیا۔ اسے باتیں کرنا نہیں آتی تھیں اس لئے جو کہنا چاہتا نظروں کی زبان استعمال کرتا جبکہ شیمہ چاہتی تھی کہ اس کا شوہر دوسرے لوگوں کی طرح اس کے حسن کو لفظوں میں بیان کرے۔

شادی کے بعد وہ ایک نئی لذت سے آشنا ہوئی تھی اور وہ تھی مرد کی قربت۔ اسے اب اس خیال سے ہنسی آتی تھی کہ وہ پہلے شادی سے گھبراتی تھی۔ مردوں سے بات کرنے اور ان کی چاہت سمیٹنے کی بھی اسے پوری پوری آزادی مل گئی تھی سال کی کڑی پابندیاں اٹھ جانے کے بعد اس نے اپنے گرد چاہنے والوں کا ایک ہجوم اکٹھا کر لیا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ اس کا شوہر حیدر اسے جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ اس پر مکمل اعتماد کرتا تھا اور وہ جو چاہتی تھی منوا لیتی تھی۔ حیدر کے خاندان میں ایک سے ایک تیز لڑکا تھا۔ انہوں نے شیمہ کے گرد لفظ بھابی کی مقدس آڑ میں تعریفوں کے جال بن دیئے۔ حیدر اس فن میں قطعی اناڑی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رشتے دار مردوں کے علاوہ اس کے شوہر کے جگری دوست بھی بھابی کے گرویدہ ہو گئے۔ گھر میں آتے، ہاتھ ملانا ہوتا بھابی سے آنکھ مچولی کھیل جاری ہے بھابی کے ہاتھ کے پکوڑے کھا کر عقیدت سے ان کے ہاتھ چومے جا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ حیدر کے سامنے ہوتا۔ وہ بیوی سے احتجاج کرتا تو وہ بگڑ جاتی کہ آپ کو سوسائٹی کے آداب نہیں آتے، آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔ حیدر نے رفتہ رفتہ ان تمام تلخیوں کو قبول کر لیا جو اس کے دوستوں اور رشتے داروں کی صورت میں اس کی بیوی کو اس سے چھین رہی تھیں بیوی سے علیحدگی کا وہ تصور نہیں کر سکتا تھا۔ بہتر تھا وہ خاموش تماشائی بن جائے۔ تبادلہ کرا لیا تو وہاں بھی نئے دوست بن گئے۔ چار بچے بھی ہو گئے لیکن شیمہ کا حسن اور بھی نکھر آیا۔ اس کی عادتیں سنورنے کی بجائے بگڑتی ہی گئیں۔ بیگم کے کام کاج سے کوسوں دور بھاگتی تھی شوہر کی مجال نہیں تھی کہ اسے سوتے سے اٹھا کر اپنے کسی کام کو کہے بچوں کو ملازم پالتے تھے۔ کھانا ناشتہ خانساماں کے سپرد تھے۔ وہ خود بے تاج کی ملکہ عالم تھی جس کے ایک اشارے پر شوہر سجدہ تک کرنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ حیدر کی یہی کمزوری شیمہ کو اس سے بہت دور لے گئی۔ اس نے جی بھر کے لوگوں سے دوستی بڑھائی۔ زندگی کے ہر پہلو کو اچھی طرح کھنگالا اور آخر تھک ہار کر سوچنے لگی کہ اب کیا کروں۔

انہی دنوں ایک فقیر نے شہر سے دور اپنا ڈیرہ جمایا۔ شیمہ کی ایک سہیلی نے اطلاع دی کہ ایک جلالی پیر جنگل میں دھونی رمائے بیٹھے ہیں شیمہ کی مہم جو طبیعت نے اکسایا۔ ہلکے جوگیا رنگ کے کپڑے پہن سہیلی کے ساتھ فقیر بابا کے آستانے پر جا پہنچی۔ نوے سالہ فقیر بابا نے ایک شان بے نیازی سے اس حسینہ کو دیکھا اور اس کے حسن سے کسی بھی قسم کا تاثر لئے بغیر وظیفہ پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ شیمہ کے لئے یہ تغافل چیلنج ہو گیا۔ عاشق مزاج لوگوں کو اپنی زلف گرہ گیر کا اسیر کر لینا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ جس شخص نے اپنی ساری عمر زہد و تقویٰ میں گزاری، جو عورت جیسی شے سے قطعی رغبت نہ رکھتا ہو اسے اپنے قدموں پر جھکانا بہت کٹھن کام تھا جو شیمہ جیسی سرپھری عورت نے اپنے لئے چیلنج سمجھ لیا۔ اپنے گورے گورے ہاتھوں سے انگوٹھیاں اتاریں اور فقیر بابا کے چرنوں میں ڈال دیں۔ بابا نے انگوٹھیاں اپنے سامنے بیٹھے لوگوں کی طرف اچھال دیں گویا ان کا دل دنیوی لالچ سے پاک ہے۔ شیمہ ناگن کی طرح پھنکار اٹھی۔ اس وقت تو خاموشی سے اٹھ کر چلی آئی۔ مگر ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ شوہر کو قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ دوسرے دن خاندان والوں کو دعوت میں مدعو کیا اور سب کے سامنے اعلان کیا کہ وہ ایک پہنچے ہوئے فقیر کی مرید بننا چاہتی ہے۔ جن لوگوں کو ان کا مرید بننا ہو وہ میرے ساتھ چلیں فقیر بابا کے معجزے سنا کر خاندان کے لوگوں کو اتنا مرعوب کر لیا کہ اس کے شوہر نے بھی مرید بننے کی خواہش ظاہر کر دی۔ بیوی کے چہرے پر تقدس کا نور بکھرا دیکھ کر اس نے سوچا کہ شاید اب یہ راہ راست پر آ گئی ہے اگر یہ رجحان طبیعت پر غالب آ گیا تو کلب میں رقص و شراب اور دیگر ہنگامے بازیوں سے نجات مل جائے گی۔

ادھر شیمہ اس نئے جنون میں گرفتار ہو کر گھر بار شوہر بچوں سے قطعی غافل ہو گئی۔ پیر بابا کے آستانے پر ہاتھ جوڑے بیٹھی رہتی۔ دو چار اپنے جیسی مالدار ہمی تاپ بیگمات کو اپنے ساتھ چپکا لیا تھا۔ فقیر بابا بھی آخر انسان تھے۔ ان کی زندگی بھر کی کٹھن ریاضت میں ایسی ذہین اور حسین خاتون مرید نہیں ہوئی تھی۔ اپنا جھوٹا دودھ اور شربت پلانے کی رسم ادا کر کے انہیں اپنا قریبی مرید بنا لیا۔ اب شیمہ نے ان کے لیکچر ٹیپ کرنے شروع کر دیئے۔ بیسیوں ٹیپ بھر کر لندن اپنے بھائی کو بھجوائے کہ وہ اس فقیر بابا کی تبلیغ کا کام شروع کر دیں۔ خاندان کے بیشتر لوگ فقیر بابا کے غلام ہو گئے۔ پیر بابا کو خوشامدیں کر کے ان کے آستانے سے اٹھوا لیا گیا اور اپنی کوٹھی میں منتقل کر لیا۔ مریدوں کی تعداد دن بدن بڑھنے لگی تو شیمہ ان کی نائب بن کر مریدوں کے نام پیغام جاری کرنے لگی۔ مٹھائیوں کے نذرانے آنے

در رہنے والوں میں بانٹے جاتے۔ پیر بابا کی یہ خلیفہ اوّل اتنی ذہین تھی کہ اب بابا کو اپنے نظریات کے متعلق کم ہی بولنا پڑتا۔ شمیمہ اتنے مدلل انداز سے بحث کرتی کہ بڑے بڑے لوگ سر جھکا کر رہ جاتے۔ وہ جب بولتی تو ساری محفل پر موت کا سا سکوت چھا جاتا۔ اور اس ہم پسند ذہین عورت کے لئے یہ بڑا انوکھا اور دلچسپ تجربہ تھا۔ جس میں اس کی توجہ دن بہ دن زیادہ بڑھتی گئی۔ اس کا شوہر اب دل میں پچھتانے لگا کہ مذہب پرستی کا یہ جنون اس کے لئے وبالِ جان ہو گیا۔ کوٹھی ہر وقت بھانت بھانت کے لوگوں سے بھری رہتی محفل سماع میں رات رات بھر جاگنا ہوتا۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ گھر پہ داخل ہوتا تو یہاں کا نقشہ ہی کچھ اور ملتا۔ کبھی لندن والے دوست کی بیوی مرید ہونے کی تقریب میں ہنگامہ برپا کئے ہوتے ہیں۔ کبھی جرمنی سے ان کے مرید ملنے تشریف لا رہے ہیں۔ ہو حق کے نعروں سے سونا جاگنا حرام ہو گیا۔ ایک ہنگامہ سا چوبیس گھنٹے برپا رہتا۔ پیر بابا ہر وقت اپنے حجرے میں بیٹھے رہتے اور بحالت مجبوری اٹھ کر ایک آدھ گھنٹے کے لئے مریدوں کے ساتھ باہر نکلا کرتے۔ گاڑی خدمت کے لئے موجود تھی۔ شمیمہ ہر وقت ان کے سر پر مالش کرتی یا پاؤں دباتی نظر آتی تھی۔ ننگا ہوں ننگا ہوں وہ روحانیت کا درس دیا کرتے۔ آس پاس لوگ کھڑے حسرت اور رشک سے دیکھا کرتے کہ کاش یہ نظرِ کرم ہم پر بھی ہو جائے۔ جنون اس حد تک بڑھا کہ شمیمہ نے گھر بار چھوڑ دینے کا ارادہ کر کے جنگل میں دھونی رمانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ہاتھ جوڑ کر فقیر بابا کے سامنے بیٹھ جاتی کہ بابا مجھے ان دنیوی جھگڑوں سے نجات دلاؤ میں آپ کے ساتھ جنگل جنگل پھرنا چاہتی ہوں۔ اب شمیمہ کے شوہر کی آنکھیں کھلیں۔ بیوی کی خوشی کی خاطر وہ پیر بابا کی مریدی تو قبول کر چکا تھا لیکن اب بیوی ہاتھ سے جاتی دیکھی تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ اس نے پیر بابا کے پاؤں تھام لئے کہ آپ دنیا ترک نہ کریں، یہاں میرا سب کچھ آپ کا ہے۔ پیر بابا جو حالات کا بڑے غور سے جائزہ لے رہے تھے اور پھیل گئے۔ اب تو یہ ہونے لگا کہ رات بھر بیوی پیر بابا کے چرنوں میں لیٹی رہتی شوہر اُف نہ کرتا۔ پیر بابا اتنی قربت سے کب تک اپنا نفس سنبھالے رکھتے۔ عشق مجازی کے پھندے میں گرفتار ہو کر عیش و طرب میں پڑ گئے اور اس طرح اس حسینہ نے پیر بابا کا سر پُر غرور اپنے قدموں پر جھکا کر دم لیا۔

حیدر کے ایک قریبی رشتے دار رضا علی اس سے ملنے آئے انھیں ان ہنگامے بازیوں کی خبر تو مل چکی تھی مگر اب تک انھوں نے اپنی آنکھوں سے کچھ نہ دیکھا تھا۔ رضا کا زیادہ وقت یورپ میں گزرا تھا وہاں اس قسم کے مناظر وہ دیکھتے رہتے تھے۔ حیدر کے گھر آئے تو انہیں اس غریب پر بڑا ترس آیا۔ حیدر کو کریدا تب اس نے شروع سے آخر تک سارے حالات بتائے کہ یار میں کیا کروں اس عورت کی ذہانت اور حسن نے مجھے تو کیا سارے گھر کے سکون کو غارت کیا ہوا ہے۔ اگر کسی طرح اس دفعہ یہ پیر بابا کے حلقے سے نکل جائے تو میں اسے لے کر باہر نکل جاؤں۔ بصورت دیگر میرا رہا سہا سکون اور دولت دونوں ہاتھ سے چلے جائیں گے۔ رضا کو اس کی حالت پر بڑا افسوس ہوا۔ اسے تسلی دی کہنے لگا تم اگر مجھے اجازت دو تو بھابی کو راہِ راست پہ لے آؤں مگر ایک شرط ہے کہ مجھے ابھی بھابی سے مت ملوانا اور نہ ہی ان کے سامنے کبھی یہ ظاہر کرنا کہ میں انھیں یا تمہیں جانتا ہوں میں خود کو پیر بابا کے مرید کی حیثیت سے یہاں متعارف کراؤں گا۔ حیدر ہر قیمت پر اپنی بیوی کو پیر بابا سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ اس نے حامی بھر لی۔ دوسرے روز رضا نے مصنوعی داڑھی لگائی۔ ڈھیلا چولا پہنا اور ہو حق کا نعرہ لگاتا کوٹھی کے پھاٹک پہ آ کھڑا ہوا۔ ملازم نے بھاگ کر اندر اطلاع دی کہ ایک اللہ والا گیٹ پر "حق اللہ" کا نعرہ لگا رہا ہے۔ شمیمہ جو ان دنوں روحانیت کے درس لے رہی تھی اس نئے پیر کی آمد پہ ننگے پاؤں دوڑی دوڑی گیٹ پر گئی۔ جاتے ہی جھک کر اس کے قدم چھو لئے۔ جوان پیر نے رعب دار آواز میں پوچھا کہ بابا رحمٰن کا آپ کے یہاں قیام ہے؟ میں بڑی دور سے ان کی زیارت

کے لئے آیا ہوں۔ شیمہ عقیدت سے ہاتھ جوڑتی اسے اپنے ساتھ لے کر آئی۔ جوان فقیر نے بابا رحمٰن کا مرید بننے کی درخواست کی جو شیمہ کی سفارش پر فوراً منظور ہو گئی اور اسی رات قوالی کی محفل ہوئی۔ نئے فقیر نے اپنا نام شامی بتایا تھا اور اس محفل میں اس نے وہ رنگ جمایا کہ جوان مرید عورتوں کے دل دھڑک دھڑک اٹھے۔ شامی نے اپنا چولا اتار پھینکا۔ اس کا جوان صحت مند جسم قوالوں کی تالوں پر اس بے قراری سے جھومتا تھا کہ دیکھنے والی بیسیوں آنکھوں کی نیندیں اڑ گئیں۔ شیمہ نے جو مدت سے پیر بابا سے روحانیت کے درس لے رہی تھی یکبارگی آنکھیں کھول کر انتہائی دلچسپی سے اس نئے خوبرو مرید کو دیکھا۔ اور اس کا ذہن و دل حسبِ روایت بدل گئے۔ اب وہ پیر بابا سے نظریں بچا بچا کر شامی کو دیکھ رہی تھی جو ماحول سے بے نیاز مستانہ وار ناچ رہا تھا۔

اس رات کے بعد شیمہ آہستہ آہستہ شامی کی طرف راغب ہوتی گئی۔ وہ اب بوڑھے بابا سے درس لیتے لیتے اکتا چکی تھی۔ شامی نے اپنی چرب زبانی سے مریدوں میں اپنا نمایاں مقام بنا لیا۔ وہ پیر بابا کے دیئے ہوئے درس پر اس ذہانت سے گفتگو کرتا کہ سننے والے کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ مخالفت کر رہا ہے۔

شامی یورپ کا تعلیم یافتہ تھا اسے ہر مضمون پر مکمل عبور تھا۔ پیر بابا کا علم اتنا کہاں تھا کہ وہ اس کا مقابلہ کرتا۔ شیمہ نے شروع شروع میں پیر بابا کا ساتھ دیا لیکن دل ہی دل میں شامی کی جسمانی اور ذہنی حسن سے مرعوب ہو چکی تھی اور ایک وقت یہ آ گیا کہ پیر بابا کی قربت اسے جنجال لگنے لگی۔ رضا جو شامی کے نام سے اپنی زندگی کا ایک انوکھا کردار ادا کر رہا تھا اس عورت کے سحر میں سچ مچ گرفتار ہو گیا وہ آیا تو تھا اسے راہِ راست پر لانے کے لئے۔ مگر یہاں معاملہ ہی اُلٹ گیا۔ لو آپ اپنے جال میں صیاد آ گیا والی بات ہو گئی۔

شیمہ کی ایک قریبی سہیلی فوزی جو نئی نئی پیر بابا کی مرید ہوئی تھی۔ شامی کو دیکھ کر دل ہار بیٹھی۔ رقابت اور محبت کا کچھ ایسا ڈرامہ شروع ہو گیا جس میں شامی کو اپنا آپ بچانا مشکل ہو گیا۔ شیمہ نے شامی کے سامنے پیر بابا کی روحانیت کا بھانڈہ پھوڑ دیا کہ یہ بڈھا بہروپیا ہے۔ عورتوں کا قرب حاصل کرنے کے لئے فقیری کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ میں اس سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتی ہوں ورنہ کسی دن یہ میرے ہاتھ سے پٹ جائے گا۔ شامی کا مشن پورا ہو چکا تھا۔ اس نے شیمہ کی یہ گفتگو ٹیپ کر لی۔ اور تنہائی میں پیر بابا کو سنا کر مشورہ دیا کہ بڑے میاں یہاں سے بستر بوریا گول کر لو ورنہ یہ سارا ٹیپ میں اس کے شوہر کو سنا دوں گا۔ اس عورت کا بھی کوئی بھروسہ نہیں کسی دن مار پیٹ کر کے گھر سے نکال دے گی۔ مفت میں ذلت اٹھاؤ گے۔ پیر بابا نے راتوں رات بستر بوریا اٹھایا اور کوٹھی سے ایسے چمپت ہوئے کہ ان کے مرید انہیں بعد میں ڈھونڈتے ہی رہ گئے۔

شیمہ کے شوہر حیدر نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس بلا سے نجات ملی۔ شیمہ نے بظاہر بڑی تشویش دکھائی مگر اندر سے خوش تھی کہ اسے شامی کی صورت میں ایسا پیر مل گیا ہے جو اس کے روحانی اور جسمانی تقاضوں کو پورا کرے گا لیکن شامی نے اپنے دل پر جبر کر کے اپنے دوست کی امانت کو اس کے حوالے کر کے خاموشی سے یورپ کی راہ لی، اور ہاں یہ بتاتی چلوں کہ شیمہ کی سہیلی فوزی نے شامی کی گمشدگی کے سوگ میں ساری عمر شادی نہیں کی۔ شامی کی یاد میں شیمہ مدتوں چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔ وہ اپنا پتہ دیئے بغیر غائب ہوا تھا۔ اس لئے سوائے حیدر کے ان میں سے کسی کو اس بات کا علم نہ ہو سکا کہ وہ کون تھا اور کہاں گیا۔ ڈیفنس سوسائٹی میں رہنے والی اس امیر گھرانے کی یہ عجیب و غریب کہانی مجھے اس لئے معلوم ہے کہ میں بھی اس پیر بابا کے ہاتھ سے جھوٹا شربت پی کر مریدوں میں شامل ہوئی تھی۔ میں نے وہ محفلیں بھی اٹینڈ کی ہیں جو رات رات بھر قوالی کی صورت میں اودھم بازیاں کرنے کے لئے منعقد کی جاتی تھیں۔

اس کہانی کا ڈراپ سین ہوئے مدت ہو چکی ہے۔ حیدر صاحب نے میرے شوہر کو یہ ساری بات بتائی کہ پیر بابا کو بھگانے کے لئے انہیں اپنے ایک دوست کا سہارا لینا پڑا تھا۔ کہانی کی باقی کڑیاں میں جانتی ہوں کیونکہ شیمہ میری دوست ہے۔ اس کا شامی کی یاد میں رات دن رونا اور سسکیاں لے لے کر اس کی باتوں کو دہرانا میں نے دیکھا ہے۔ بہرحال اب وہ نارمل ہو چکی ہے اور سنجیدگی سے اپنے شوہر اور بچوں کی خدمت میں لگی ہوئی ہے اور وہ سارا ہپی ٹائپ گروپ جو پیری مریدی کے ہنگاموں میں گرفتار تھا اب اس جنون سے نکل کر راہِ راست پر آ چکا ہے۔ کبھی مل بیٹھتے ہیں تو ایک دوسرے کی ہنسی اڑاتے ہیں۔

یہ کہانی میں نے آپ کو محض اس لئے سنائی ہے کہ یہ اس پڑھے لکھے طبقے کا ایک رخ ہے جہاں دولت کی برسات میں شوہر اور عورتوں کو اپنا وقت گزارنے کے لئے نت نئے ہنگامے کرنا پڑتے ہیں اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ بھیگی بلی بن کر گوشہ عافیت کی تلاش میں ماری ماری پھرتی ہیں۔

**شفقت بانو۔ کراچی**

خالہ زاد بہن رفعت بیاہ کر سسرال گئی تو اسے وہاں پڑوس میں ایک اچھی سی لڑکی ممتاز مل گئی جس نے رفعت کو اتنا خلوص دیا کہ اس ماحول میں خود کو اجنبی محسوس نہ کر سکی۔ ممتاز تیکھے ناک نقشے کی گوری اور نازک اندام لڑکی تھی لمبے لمبے بالوں کی دو چوٹیاں گوندھ کر جب وہ انہیں گھماتی گھر میں داخل ہوتی تو اس کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر رفعت اور اس کے سسرال والے سبھی خوش ہو جاتے۔ ہر ایک کو ہنسانا اور گدگدانا اس کا مشغلہ تھا۔ بچپن سے شوخ چنچل رہی تھی۔ پڑھائی میں اس کا دل نہیں لگتا تھا اس لئے زیادہ نہیں پڑھ سکی۔ ہاں گھر گرہستی میں ماہر تھی۔ خود بھی اچھا سی کر پہنتی تھی اور محلے میں ملنے جلنے والوں کے بھی کپڑے سی دیتی تھی۔ سبھی اس کے دلدادہ تھے۔ رفعت کے بری کے بیشتر جوڑے اس نے سی کر دیئے تھے۔ بعد میں بھی رفعت کو ایک سے ایک نئے ڈیزائن کے کرتے قمیص سی کر پہناتے۔ محلے کے علاوہ رشتے داروں میں بھی یہ خوبصورت لڑکی بہت مقبول تھی۔ بہت سے گھرانوں نے اسے بہو بنانے کی خواہش کی۔ اس کے والدین چاہتے تھے انہیں کوئی ایسا لڑکا مل جائے جو ان کی چہیتی لڑکی کو پھولوں میں رکھے۔ وہ رشتوں کی چھان پھٹک میں مصروف تھے کہ ممتاز نے چپکے سے ایک بلوچی لڑکے کو اپنے دل میں بٹھا لیا۔ اس کی کسی سہیلی کے یہاں آتے جاتے یہ لڑکا اسے راستے میں ملنے لگا دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا۔ لڑکا خوبرو تھا۔ برسر روزگار تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ممتاز سے فلرٹ نہیں کر رہا تھا۔ وہ اسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد پیام لے کر والدین کے پاس آ گیا۔ اپنے قد و قامت سے وہ متاثر کن شخصیت رکھتا تھا۔ سبھی اس سے مرعوب ہو گئے۔ ہم لوگوں نے بھی چھپ کر اسے دیکھا اور پسند کیا لیکن ممتاز کے والد نظریات پسند آدمی تھے۔ انہیں یہ کسی صورت گوارا نہیں ہوا کہ ان کی لڑکی اپنا شریک حیات خود چنے۔ اس کے علاوہ وہ ذات پات کی الجھنوں میں بھی گرفتار تھے۔ وہ اس کے جاتے ہی بیٹی پر بگڑ گئے کہنے لگے "اگر ممتاز اپنے دکھ سکھ کی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہے تو میں آج ہی نکاح کرائے دیتا ہوں لیکن اگر وہ یہ چاہتی ہے کہ ساری زندگی میں اس کے لئے ڈھال بنا رہوں تو وہ اس رشتے سے انکار کر دے میں اس کی شادی اپنی پسند سے اچھی جگہ کر دوں گا۔"

ممتاز جذباتی لڑکی تھی جوانی میں یوں بھی عشق و محبت کا طوفان کچھ زیادہ ہی شوریدہ سری دکھاتا ہے۔ ماں نے باپ کا حکم اسے سنایا تو چیخ چیخ کر رونے لگی بولی۔

"امی مجھے جمیل کے سوا اور کسی سے شادی منظور نہیں۔ ابو سے کہہ دیں اگر انہوں نے اس کا رشتہ قبول نہیں کیا تو میں ساری عمر کنواری مر جاؤں گی۔ میرے دکھ سکھ کا ساتھی کون ہے یہ میں ابو سے زیادہ جانتی ہوں۔" بیٹی کے جواب سے ماں کا دل ٹوٹ گیا۔ اس نے شوہر کو جا کر سمجھایا کہ لڑکی گستاخی پر اتر آئی ہے کیوں اپنے لیے پریشانیاں مول لیتے ہو، جو وہ چاہتی ہے کرنے دو۔ ماں باپ نے جتنے خواب دیکھے تھے وہ بکھر گئے۔ ٹوٹے دل سے رشتہ منظور کر لیا۔ جمیل کے والدین بچپن میں مر چکے تھے۔ دور نزدیک کے رشتے داروں کے سلوک سے وہ بدظن ہو چکا تھا۔ شادی کا سارا انتظام ممتاز کے والد کے سر پڑا۔ دونوں طرف کی تیاریاں انہیں خود کرنا پڑیں۔ مہینے بھر میں شادی ہو گئی۔ باپ کے دل میں بیٹی کی سرکشی سے کانٹا سا چبھ گیا تھا۔ رخصتی کے وقت سرد لہجے میں بولا "ممتاز بیٹی تم یاد رکھنا کہ اپنے دکھ سکھ کا ساتھی تم نے خود چنا ہے۔" ممتاز باپ کا اشارہ سمجھ گئی تھی مگر اسے اپنے محبوب شوہر پر اعتماد تھا۔ سر جھکا کر چپکے سے مسکرا دی۔ جمیل اسے اپنے گھر لے آیا۔ کرائے کا مکان لیا تھا۔ ارد گرد والوں سے جان پہچان نہیں تھی۔ ممتاز زیادہ وقت گھر پر رہتی۔ میکے جانے کی کبھی ضد کرتی تو جمیل ٹال دیتا کہ بار بار جانے سے تمہاری قدر کم ہو جائے گی۔ کچھ ماہ ناز نخرے اٹھانے میں گزرے لیکن اس قلیل عرصے میں ممتاز نے محسوس کر لیا تھا کہ شادی سے پہلے نظروں نظروں میں محبت کے جام لنڈھانے اور یوں رات دن ایک ساتھ رہ کر پیار محبت کا نشہ قائم رکھنے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ جمیل ایک حاسد اور شکی مزاج آدمی تھا۔ وہ ممتاز کو کسی اور کے ساتھ ہنستا بولتا دیکھ کر سیخ پا ہو جاتا۔ ممتاز صاف دل کی خوش مزاج لڑکی تھی جس کی گھٹی میں شوخیاں شرارتیں پڑی ہوں وہ ایک دم سنجیدگی کیسے اپنا سکتی ہے۔ جمیل شروع کے دنوں میں اپنا غصہ ضبط کرتا رہا۔ جذبات نارمل ہوتے ہی وہ اسے بات بات پر ٹوکنے لگا۔

"تم کل اپنے خالہ زاد بھائی کے سامنے کھلے بالوں سے کیوں گئیں؟" "مجھے تمہارا فلاں کزن قطعی پسند نہیں اس سے بات مت کیا کرو۔" یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑھتے بڑھتے اس ہنستی کھیلتی لڑکی کی جان کا

روگ بن گئیں۔ ممتاز ایسی لڑکی تھی جسے سب ایک نظر میں ہی پسند کر لیتے تھے۔ ہر محفل میں اس کی شخصیت کو جانِ محفل سمجھ لیا جاتا تھا۔ جمیل کو بیوی کی مقبولیت احساسِ کمتری میں مبتلا کر گئی ــــ اس نے اس کے آنے جانے پر پابندیاں لگا دیں۔ اس کے رشتے داروں کو منع کر دیا کہ مجھے زیادہ میل جول رکھنے کی عادت نہیں ہے۔ اگر اس کے باوجود کوئی بھولا بھٹکا آن ٹپکتا تو جمیل ایک منٹ کے لئے ادھر سے ادھر نہ ہوتا۔ سارا وقت کڑوی نظروں سے ممتاز کو دیکھتا رہتا۔ جب وہ مہمان رخصت ہوتا تو پھٹ پڑتا کہ یہ لوگ منع کرنے کے باوجود کیوں آتے ہیں۔ ضرور میرے پیچھے تم انہیں بلا کر حوصلہ افزائی کرتی ہو۔ ممتاز نازک دل کی لڑکی تھی اپنے شوہر کے یہ الزامات زیادہ دن تک نہ سن سکی۔ جس شخص کو باپ کی مخالفت کے باوجود اپنایا تھا۔ اس کی شکایت کس سے کرتی۔ اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ لڑنے جھگڑنے کی عادت نہیں تھی۔ چپکے چپکے اندر ہی اندر سلگتے رہنے سے بیمار ہو گئی جمیل نے اب یہ طعنے دینے شروع کر دئیے کہ تم مجھ سے شادی کر کے پچھتا رہی ہو۔ ضرور تمہارے رشتے دار لڑکوں میں سے کوئی ایک تمہارا پہلا محبوب تھا۔ جبھی ان کے نہ آنے سے تمہیں چپ کا روگ لگ گیا ہے۔

ممتاز نے لبوں پر مہر لگالی تھی۔ بیماری کے عالم میں ایک لڑکے کو جنم دیا۔ بچے کی پیدائش سے حالات وقتی طور پر بہتر ہو گئے لیکن خدا کسی شکی مزاج مرد سے عورت کا واسطہ نہ ڈالے۔ ایک روز معمولی سی بات پر بگڑ کر بولا "مجھے یہ کیسے یقین دلاؤ گی کہ یہ بچہ میرا ہے جبکہ تمہارے رشتے دار یہاں اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔"

ممتاز کے لئے یہ ایک ایسی گالی تھی جسے سننے سے زیادہ وہ مر جانا پسند کرتی تھی۔ یہ فقرہ سنتے ہی اس کے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ ذہن میں دھماکے سے گونجے۔ اس نے اپنا دل پکڑنا چاہا مگر وہ تو جیسے ساکت ہو گیا تھا۔ تیورا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ جمیل نے اتنا کرم کیا کہ اس کی والدہ کو خبر دے آیا۔ وہ بھاگی بھاگی آئیں۔ بیٹی کو بے ہوش دیکھ کر ان کی ممتا تڑپ اٹھی۔ ڈاکٹر بلایا۔ گھنٹہ بھر بعد ہوش آیا۔ ڈاکٹر نے بتا دیا کہ اسے صدمہ پہنچا ہے۔ ماں نے سینے سے لگا کر پوچھا کہ آخر مجھے تو بتا دے تجھے اس نے کیا کہا ہے۔ ممتاز کب سے اپنی ذات میں تنہا تھی۔ سمجھ رہی تھی باپ کے ساتھ ماں بھی پرائی ہو گئی ہے۔ وہ بھی میرا ساتھ نہیں دے سکی۔ لیکن جب اس سے پیار کا بھرپور اظہار ملا تو بکھر گئی۔ رو رو کر ساری باتیں بتائیں۔ وہ آگ بگولہ ہو گئیں۔ داماد کو جی بھر کے برا بھلا کہا۔ جمیل برابر والے کمرے میں بیٹھا تھا ساس کی باتیں سن کر غصے میں بھرا ہوا اندر آیا۔ بولا

"بڑی بی فوراً اسی لمحے یہاں سے رخصت ہو جاؤ اور پھر عمر بھر یہاں نہ آنا میں اس کا شوہر ہوں جو جی چاہے کروں۔ جیسا جی چاہے سلوک کروں۔ تم کون ہوتی ہو مجھے ٹوکنے والی"۔ شریف خاندان کی عورت نے ایسی باتیں اپنے شوہر سے کبھی نہ سنی تھیں۔ اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ یہاں سے رخصت ہو جائے۔ ممتاز رو رو کر روکتی رہ گئی۔ مگر سنگدل جمیل نے آگے بڑھ کر ممتاز یا اس کی ماں سے صلح کا ایک لفظ نہ کہا اور وہ چلی گئیں۔ اس کے بعد وہ کبھی بیٹی کے در پہ نہیں آئیں۔ ممتاز رو دھو کر صبر کر کے بیٹھ گئی۔ جمیل نے اپنا تبادلہ لاہور کروا لیا۔ ممتاز کو چھوڑ کر اکیلا لاہور چلا گیا۔ کہنے لگا گھر کا بندوبست کر لوں پھر بلوا لوں گا۔ ممتاز کو حیرت تھی کہ جو شخص ایک لمحے اسے اکیلا چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا وہ آج تنہا چھوڑ کر لاہور کیسے جا رہا ہے مگر جمیل کی شخصیت میں تضاد تھا وہ بیوی کو چھوڑ کر چلا گیا اکیلے گھر میں ممتاز اکیلی کیسے رہ سکتی تھی۔ بچے کو ساتھ لے کر ماں کے در پہ آ گئی۔ باپ نے منہ پھیر لیا مگر ماں نے برسوں بعد بیٹی کو گھر میں دیکھا تھا بڑھ کر گلے سے لگا لیا۔ کئی ماہ گزر گئے مگر جمیل نے اپنی خیر خبر نہ بھیجی۔ ممتاز شوہر کی دیوانی تھی۔ دوری نے تڑپ اور بڑھا دی اسے یاد کر کر کے آنسو بہاتی۔ ایک سال بعد اس کی دعائیں رنگ لائیں۔ جمیل اچانک بغیر اطلاع دئیے آ گیا اور دوسرے روز ہی ممتاز اور بچے کو لے کر لاہور چلا گیا۔ ساس سسر سے دعا سلام تک نہیں کی۔ نئے گھر میں کچھ

دن سکون سے گزرے۔ ممتاز سمجھی کہ شاید دوری نے اسے بیوی کی محبت کا احساس دلا دیا ہے۔ مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ پھر اسے ٹوکنے لگا۔

ممتاز کی میں کیوں کھڑی تھی؟ یہ سبزی والے سے ہنس ہنس کر کیا باتیں ہو رہی تھیں؟ یوں ممتاز کے لئے گھر پھر قید خانہ بن گیا۔ رات دن اس پر طعنوں، تشنوں کے کوڑے برسنے لگے۔

بیمار پڑ گئی تو اسے کراچی اس کے والدین کے گھر چھوڑ آیا کہ مجھ سے آپ کی نازک بیٹی نہیں سنبھالی جاتی۔ یہاں اس کے بیٹی پیدا ہوئی۔ جمیل بیٹی کی خبر سن کر بھی واپس نہیں آیا۔ دو سال بعد طلاق نامہ بھجوا دیا۔ ممتاز کو ذہنی طور پہ تو اس عرصے میں بار بار طلاق مل رہی تھی پھر بھی وہ اپنی محبت کے انجام پر تڑپ تڑپ کر روتی رہی۔ پڑھی لکھی ہوتی تو کہیں ملازمت کر کے اپنا وقت گزارتی۔ باپ سے شرمندہ تھی کہ جس بڑھاپے میں اپنا جیون ساتھی چن لینے کا عزم دکھایا تھا وہ خاک میں مل چکا تھا۔ گھر میں اس طرح وقت گزار رہی تھی جیسے کوئی مجرم ہو۔ باپ سے اپنی کسی ضرورت کا ذکر نہیں کرتی تھی مبادا وہ چڑ کر پرانی بات دہرا دیں۔ اس کے دونوں بچے ماں باپ کی زندگی میں ہی یتیموں جیسی بے بسی سے جی رہے تھے۔ جو مل گیا کھا لیا، جو بنا دیا پہن لیا۔ نہ ضد نہ فرمائش۔ ممتاز ان کی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی۔ پہلے محلے بھر کے غریبوں میں مفت کپڑے سیا کرتی تھی اب چاہتی تھی کہ دہی کام پیسے لے کر شروع کر دے تاکہ بچوں کے چہروں پہ زندگی کے کچھ آثار تو نظر آنے لگیں۔ ایک دو جگہ سے کپڑے لے کر جب دینے گئی تو پیسے مانگنے کی ہمت نہ پڑی۔ گھبرا کر خود ہی واپس آ گئی۔

اتفاق سے انہی دنوں اس بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں نئے لوگ آ کر رہے۔ ایک بڑی بی تھیں اور ان کا ایک بیٹا تھا۔ بیٹا تو زیادہ تر باہر ہی رہتا تھا۔ اس کا دوبئی میں کاروبار تھا۔ بڑی بی سال میں دو چار مہینے وہاں رہتی تھیں۔ بقول ان کے وہاں کی آب و ہوا انہیں راس نہیں آتی تھی۔ ملنسار بڑھیا نے جلد ہی فلیٹ والوں سے دوستی کر لی۔ ممتاز کے گھر بھی آنا جانا ہوا۔ انہیں اس لڑکی کی داستان نے بڑا متاثر کیا۔ اکثر اس کی دلجوئی کرنے لگیں۔ ممتاز اپنے حالات سے شکستہ دل تھی۔ بڑی بی کی غیر معمولی محبت اور توجہ نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ گھر میں وہ دبی دبی رہتی تھی۔ اب بڑی بی کے گھر جا کر خود کو محفوظ سمجھتی تھی۔ کچھ تو بڑی بی کی اپنائیت اور کچھ اس کا ممتاز کے بچوں کو ٹوٹ کر چاہنا وہ تو بڑی بی کی دیوانی ہو گئی۔ بڑی بی نے اس سے اپنے بہت سارے کپڑے سلوائے، ان کی اجرت دی۔ ان کے کہنے سے فلیٹ کے دوسرے لوگ بھی ممتاز کو سلائی کے پیسے دینے لگے۔ دو تین ماہ بعد

موسیقی کے فن سے اورنگ زیب بھی بے خبر نہ تھا لیکن آگے چل کر اس کی طبیعت کی اُفتاد نے دوسری راہ اختیار کر لی۔ اس لیے اس کے اشتغال و ذوق سے کنارہ کش ہو گیا اور سلطنت مغلیہ پر قبضہ پانے کے بعد تو سرے سے اس نے یہ کارخانہ ہی بند کر دیا۔ گویوں نے موسیقی کا جنازہ نکالا تو اس نے کہا کہ:

"اسے اس طرح دفن کرنا کہ پھر قبر سے نہ اُٹھ سکے۔"

ابوالکلام آزاد

بڑی بی نے ممتاز کو مشورہ دیا کہ یہاں تو اپنوں میں رہ کر بھی بیگانوں جیسی زندگی گزار رہی ہے بہتر یہ ہے کہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو کر پیسے کما، خود کھا، دو پیسے، بچوں کی اچھی پرورش کر۔ ممتاز نے بتایا کہ وہ تو صرف چھ جماعتیں پڑھی ہوئی ہے اسے بھلا کہاں ملازمت مل سکتی ہے اس پہ بڑی بی بولیں۔

"یہاں نوکری نہیں ملتی تو نہ سہی۔ دوبئی میں تجھ جیسی ہنرمند لڑکی کو ایک قمیص سینے کے سو سو روپے ملیں گے۔ میں تیری مدد کروں گی۔ چند مہینوں میں اپنی دکان کھولنے کے قابل ہو جاؤ گی۔ کاریگر رکھ کر دکان چلانا اور ہزاروں کمانا۔ وہاں ہنر کی بڑی مانگ ہے۔"

ممتاز کی سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ اس نے والدین سے چوری چوری بڑی بی کے ذریعے اپنے باہر جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بڑی بی ایک دو مہینے میں جانے والی تھیں۔ انہوں نے ممتاز کی پوری پوری مدد کی اور جب سب مراحل طے ہو چکے تو ممتاز نے اپنے فیصلے سے ماں کو مطلع کر دیا۔ ظاہر ہے وہ اب کنواری لڑکی تو تھی نہیں جو وہ اپنے فیصلے اس پر مسلط کرتے۔ کنواری تھی جب اس نے کب کسی کی مانی تھی۔ اسے بہت سمجھایا مگر وہ بولی کہ اب صرف میرا نہیں میرے بچوں کا معاملہ ہے میں ان کی پرورش یتیموں کی طرح نہیں کرنا چاہتی۔ میں انہیں اچھے اسکولوں میں پڑھانا چاہتی ہوں۔ ابو سے کہہ دیجئے میں ان پر مزید بوجھ نہیں بننا چاہتی۔

ماں آنسو بہاتی رہ گئی، باپ دل ہی دل میں کھولتا رہ گیا۔ ممتاز بڑی بی کے ساتھ نئی زندگی کی تلاش میں دوبئی چلی آئی۔ بچوں کو ماں

کے پاس چھوڑ گئیں کہ چند ماہ بعد یہ چلانے کے بعد بلوالوں گی۔ بڑی بی کا صاحبزادہ پہلے ہی وہاں پہنچ چکا تھا۔ ممتاز نے پہلی بار اسے دیکھا خاصی عمر کا آدمی تھا۔ کسی بھی زاویے سے ان کا بیٹا نہیں لگتا تھا۔ تب بڑی بی نے بتایا کہ یہ ان کا سوتیلا بیٹا ہے۔ مگر بڑا ہی فرمانبردار ہے۔ گھر بھی اتنا شاندار تھا کہ ممتاز کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ان دونوں کے علاوہ ایک اور فرد وہاں نظر آیا۔ بڑی بی نے بتایا کہ ان لوگوں کی غیر موجودگی میں گھر اور کاروبار کی دیکھ بھال رزاق کرتا ہے اور یہ خالہ بی کے دور کے غریب رشتے داروں کا لڑکا ہے۔

شام کے وقت رزاق بڑی بی سے اجازت لے کر چلا گیا تو انھوں نے ایک نیا انکشاف کیا کہ ان کے ساتھ تین لڑکیاں اور رہتی ہیں۔ یہ تینوں یہاں ملازمت کرتی ہیں۔ رہائش کا بندوبست ان کے ساتھ ہی ہے۔ اپنے کھانے پینے کے اخراجات وہ ادا کرتی ہیں۔ بڑی بی نے ممتاز کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا کہ اللہ نے چاہا تو تمہارا کاروبار بھی جلد چل جائے گا پھر تم بھی ان تینوں کی طرح اپنے اخراجات ادا کرنے کے قابل ہو جاؤ گی۔ اس وقت تک تم بلا تکلف مجھے اپنی ماں اور اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔ رات کو رزاق کے ساتھ وہ تینوں لڑکیاں بھی آگئیں۔ ممتاز سے ان لوگوں نے بہت کم بات کی وہ خاصی مغرور لڑکیاں نکلیں۔ ممتاز نے سوچا کہ وہ خود بھی انہیں زیادہ منہ نہیں لگائے گی۔

دو تین ہفتے گزر گئے۔ بڑی بی نے اسے بتایا کہ تمہارے بارے میں ایک ٹیلر ماسٹر سے بات کر رہی ہوں اسے کاریگروں کی ضرورت ہے۔ معاوضہ کم دے رہا ہے۔ میں دو چار دن میں اسے راضی کر لوں گی۔" ممتاز چپ ہو گئی۔ چار روز بعد بڑی بی نے اسے کپڑوں کا ڈھیر لا کر دیا۔ "یہ لیڈیز بچوں کی فراکیں سینی ہیں۔ مہینے بھر کی مہلت لی ہے۔ تم آرام سے کام شروع کرنا۔" ممتاز ان کے خلوص سے پگھلی جا رہی تھی مگر وہ یہ دیکھ رہی تھی کہ رزاق اس سے گھلنا ملنا چاہتا ہے وہ جتنا اس سے کھنچتی رزاق بہانہ کر کے اس کے پاس آجاتا۔ وہ لڑکا برا نہیں تھا۔ بات چیت سنبھل کر کرتا تھا لیکن پھر بھی ممتاز نے لفٹ دے کر اپنی پریشانیوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کام آگیا تو وہ مصروف ہو گئی۔ وہ تینوں لڑکیاں اب رات گئے لوٹتی تھیں۔ بڑی بی نے ممتاز سے کہہ دیا تھا کہ ان سے زیادہ واسطہ مت رکھو۔ یہ تمہیں جاہل سمجھ کر بات نہیں کرتیں تو تم کیوں انہیں منہ لگاؤ۔ ایک مہینہ اسی طرح گزر گیا۔ ممتاز کو کپڑوں کی سلائی کا معاوضہ بھی مل گیا اس نے گھر پیسے بھجوائے۔ اپنے لئے بھی شاپنگ کی۔ ممتاز نے زور دیا کہ وہ خود ٹیلر ماسٹر سے بات کرنا چاہتی ہے تاکہ اپنا معاملہ خود طے کر سکے بڑی بی اس پر راضی نہیں ہوئیں اور پہلی دفعہ ان دونوں میں تلخی ہو گئی۔ ممتاز ان کے احسانات سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی جبکہ بڑی بی کا شکنجہ اب اس پر کچھ زیادہ ہی مضبوط ہونے لگا تھا۔ وہ اب اسے ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگی تھیں۔ باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کسی سے میل جول بڑھانے کی شدید مخالف تھیں ایک دن رزاق کے ساتھ دھاگہ خریدنے چلی گئی تو گھر سر پر اٹھا لیا۔ رزاق کو کچھ نہ کہا۔ صرف اسے ڈانٹا کہ مجھ سے اجازت کیوں نہیں لی تھی۔

اس رات وہ بہت روئی۔ رزاق اسے دیکھ کر بجھا بجھا سا رہتا اور آخر ایک دن جب بڑی بی نہیں تھیں اس نے ہمت کر کے ممتاز سے بات کی کہ آپ یہاں کن حالات میں آئی ہیں۔ ممتاز نے اسے اپنے سارے حالات سچ سچ بتا دیئے۔ تب رزاق نے اسے بتایا کہ یہ عورت لڑکیوں کا کاروبار کرتی ہے۔ تمہیں جھانسے دے کر لائی ہے۔ کہتی تو یہی ہے کہ اس سے دھندہ نہیں کراؤں گی۔ مگر یہ بڑی مکار عورت ہے۔ تم سے جھگڑا پیدا کر کے وہ کچھ ایسا جال بچھائے گی کہ تم اس کے پھندے سے نکل ہی نہ سکو۔ میں یتیم لڑکا ہوں اس کے پاس نوکری کی مجبوری سے رہ رہا ہوں۔ اور یہ تینوں لڑکیاں بھی ان لوگوں کے کارندوں میں سے ہیں۔"

ممتاز کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ گھر کا ماحول اسے پراسرار ضرور لگا تھا لیکن وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ بڑی بی اس حد تک فراڈ نکلیں گی۔ وہ گھبرا کر رونے لگی۔ رزاق بولا۔

"تم مجھ پر بھی بھروسہ مت کرنا کیونکہ میں ان لوگوں کے بُرے کاموں میں شریک رہا ہوں لیکن پھر بھی خدا کی قسم میں یہ نہیں چاہتا کہ تم بُرے دھندے میں پھنسو۔ میرے دل کی یہ بات بڑھیا جانتی ہے تبھی میرا تمہارا زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتی۔ ویسے پھر بھی اگر تمہارا دل مانے تو میں تمہیں واپس بھجوا سکتا ہوں۔"

ممتاز نے اس کے پاؤں پکڑ لئے کہ رزاق تمہیں شریف عورت کی عزت کا اگر ذرا بھی احساس ہے تو مجھے یہاں سے نکال دو۔ میں اب یہاں ایک منٹ رہنا نہیں چاہتی۔ رزاق پر اسے تھوڑا بہت بھروسہ کرنا پڑا۔ گو وہ ڈر رہی تھی کہ آسمان سے گر کر کھجور میں نہ اٹک جائے لیکن رزاق کے دل میں اس مظلوم اور شریف لڑکی کے لئے بھائی کا جذبہ جاگ گیا تھا۔ اس نے بڑی خاموشی سے فرار کی تیاریاں کیں اور اسے لے کر پاکستان آگیا۔ راستے میں اس نے اپنے سارے حالات سنائے کہ کس طرح وہ بچپن سے یتیم ہونے کے بعد بڑی بی کے گھر ملازم بن کر

آیا۔ یہاں وہ اس بدکار عورت کا کس طرح کھلونا بنا۔ وہ شرافت کی زندگی بسر کرنا چاہتا تھا مگر اس طوائف نے اسے اپنے رنگ میں رنگ لیا اور تقریباً چودہ پندرہ سال تک اس کے ساتھ رہا لیکن وہ اب صدق دل سے شریف شہری کی حیثیت سے زندگی گزارنا چاہتا تھا ممتاز خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ سوچتی رہی کہ اللہ جانے گھر جانا نصیب ہوگا بھی یا نہیں اگر وہاں جاتے جاتے کسی اور کے پھندے میں پھنس گئی تو کیا ہوگا۔ رزاق اپنے قول میں سچا نکلا۔ اس نے ممتاز کو خیریت سے اس کے والدین کے گھر پہنچا دیا۔ ممتاز کی درخواست پر وہاں کے حالات کے متعلق اس کے والدین کو کچھ نہیں بتایا۔ ممتاز نے بہانہ کر دیا کہ وہاں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ کچھ عرصے بعد رزاق کو ایک پرائیویٹ ملازمت مل گئی وہ بدستور ممتاز کے والدین سے ملتا رہا اور ایک دن ممتاز سے شادی کی درخواست بھی کر دی۔ ممتاز نے حامی بھر لی۔ اس کے والدین بھی تھک چکے تھے چاہتے تھے کہ یہ پھر سے گھر بسا لے۔ ان کی نظروں میں رزاق اچھا لڑکا تھا۔ کیونکہ وہ تمام حالات سے باخبر ہوتے ہوئے بھی دو بچوں کی ماں کو بچوں سمیت قبول کر رہا تھا۔ شادی ہو گئی۔ اور یہ جوڑا کامیاب رہا۔ رزاق نے ممتاز کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دی۔ اس کے بچوں کو بھی باپ کا پیار دیا وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا مگر بہت محنتی اور کاروباری سوجھ بوجھ خوب رکھتا تھا۔ اپنی دوکان کھول جو کامیابی سے چل رہی ہے شادی کے بعد ممتاز نے درستی کے حالات اپنی ماں کو بتائے۔ وہ بھی دل سے داماد کی عزت کرتی ہیں۔ آج کل یہ جوڑا بڑی پُر مسرت زندگی بسر کر رہا ہے میری دعا ہے کہ خدا ان کے دل اسی طرح پیار، محبت اور اعتماد سے معمور رکھے تاکہ ان کی زندگی سے وابستہ دونوں کونپلیں ہری بھری رہ سکیں۔

نرگس سعید قریشی - کراچی

شاید یہ کہانی ساری عمر اپنے سینے میں ہی دفن رکھتا اگر کچھ عرصے پہلے میرا سامنا اس کہانی کے ایک کردار سے نہ ہوتا اور اب میں اس وقت سے عجیب و غریب کیفیت میں گھر گیا ہوں۔ کبھی میرے ہاتھوں کی انگلیاں اپنے حلقے میں کسی گردن کو دبوچنے کے تصور سے اینٹھنے لگتی ہیں اور کبھی سر عام کسی کو رسوا کرنے کے نت نئے منصوبوں کی آنچ سے دماغ کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ شاید میں کسی بھی لمحے ان احساسات سے مغلوب ہو کر کچھ کر بیٹھوں۔

میں متوسط گھرانے کا لڑکا تھا۔ والدین جیسے تیسے مجھے پڑھا رہے تھے ان کی خواہش تھی کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں جبکہ میں اپنے والدین پر بوجھ بننا نہیں چاہتا تھا۔ میری طبیعت بچپن سے حساس تھی۔ امی کی طرح میں کم گو تھا اور زندگی برتنے کے بیشتر اصول ان کی تربیت سے حاصل کئے تھے۔ وہ شرافت سادگی اور خودداری کو پوجتی تھیں اور یہی مجھے سکھایا تھا۔ یہی وجہ کہ بی اے کا رزلٹ نکلتے ہی میں نے امی سے کہہ دیا کہ میں ملازمت کروں گا۔ امی چاہتی تھیں کہ میں آگے پڑھوں اور یہی والد صاحب کی خواہش تھی لیکن وہ بھولے لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان دو سالوں کی تعلیم مجھے کلرکی کرنے کے سوا اور کچھ نہ دے سکے گی۔ میں نے امی کو سمجھایا کہ "اگر آپ مجھے آگے پڑھانے پر مصر ہیں تو آپ سے وعدہ کرتا ہوں میں ملازمت کے دوران ایم اے کر لوں گا لیکن اب میں والد صاحب پر بوجھ بننا نہیں چاہتا۔" ماں تو پھر ماں ہی ہوتی ہے۔ وہ میری بات مان گئیں کہنے لگیں "میں تمہارے ابو سے یہ بات منوا لیتی ہوں لیکن اگر تم نے پڑھائی چھوڑ دی تو مجھے بہت صدمہ ہوگا۔" میں نے ان سے پکا وعدہ کر لیا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ امی نے ابو سے اجازت دلا دی اور میں نے اپنے ایک عزیز دوست نعیم کے ہمراہ نئی زندگی کی تلاش میں اپنا آبائی شہر گوجرانوالہ چھوڑ دیا۔ ہم دونوں کی پہلی منزل کراچی تھی۔ یہاں نعیم کے رشتے دار رہتے تھے۔ طے یہ تھا کہ اگر خدانخواستہ یہاں ملازمت نہ مل سکی تو واپس چلے جائیں گے۔ مجھے اپنی ذات پر بڑا اعتماد تھا اور جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ مجھ جیسا آدمی بے روزگاری کا شکار نہیں ہو سکتا۔ میری یہ خود اعتمادی رنگ لائی ایک ہفتے کی تگ و دو کے بعد مجھے ایک پرائیویٹ فرم میں معقول تنخواہ پر ملازمت مل گئی۔ دفتر میں کل سات ملازم تھے فرم کا سیٹھ بڑا شریف النفس اور سادہ مزاج آدمی تھا۔ اس کا اپنے ملازموں سے بہت اچھا برتاؤ تھا۔ غرور و تکبر اسے چھو کر نہیں گیا تھا۔ باصلاحیت، ذہین اور ایماندار لوگوں کو بہت پسند کرتا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے تربیت بھی بچپن سے انہی اصولوں کی بنیاد پر ملی تھی۔ سیٹھ نے میرے اندر یہ جوہر بھانپ لئے تھے اسی لئے وہ سب سے زیادہ مجھے چاہتا تھا اس نے اپنی محبت اور خلوص سے مجھے بہت قریب کر لیا۔ مجھے ہر طرح سے آزمایا۔ جب اسے مکمل اعتماد ہو گیا تو اپنے پرائیویٹ کاموں کے لئے اپنا معاون بنا لیا۔ اس کے گرد خوشامد پسند لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ سچا اور ایماندار ساتھی کوئی نہیں تھا۔ سیٹھ صاحب نے پید تمہ

مجھے دے دیا۔ آپ میری خوشی کا اندازہ لگائیں کہ پہلا واسطہ ایک ایسے شخص سے
پڑا تھا جو سچائی پسند تھا۔ ورنہ اس معاشرے میں کتنے راست گو اور دیانتدار
لوگ غلط محکموں پر ملازمتیں مل جانے پر دفتری سیاست کا نشانہ بنتے
ہیں۔ عموماً ان کی ایمانداری دوسروں کے لئے چیلنج بن جاتی ہے۔ جبکہ
میرے ساتھ خدا نے یہ فضل کیا تھا کہ یہی چیز مجھے آگے بڑھانے کا سبب
بن گئی۔ میں نے بھی پورے خلوص اور محنت سے سیٹھ کے کام سنبھال لیے۔
سیٹھ جس وقت چاہتا مجھے بلا لیتا۔ دن ہو یا رات مجھے بھی سیٹھ کے حکم
کی تعمیل میں کوئی عذر نہیں ہوتا۔ اچھی تنخواہ مل رہی تھی مہربان شخص سیٹھ کا
منظورِ نظر ہونے کی وجہ سے مجھے سر آنکھوں پر بٹھاتا تھا۔ سکون ہی سکون تھا
گھر پیسے باقاعدگی سے بھجوا رہا تھا اور امی ہر خط میں دعا کے بعد یہ لکھنا
نہیں بھولتی تھیں کہ بیٹا پڑھائی جاری رکھنا۔ امی سے کیا ہوا یہ وعدہ میں
بھولا نہیں تھا۔ اس موقع کی تلاش میں تھا کہ داخلے شروع ہوں تو سیٹھ
سے اجازت لے کر ایم اے کر ڈالوں لیکن انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا
کچھ اور ہے۔ ایک دن سیٹھ نے مجھے اپنے گھر سے سیف کی چابیاں لانے
کے لئے بھیجا۔ سیٹھ کے گھر میں اکثر آتا جاتا رہتا تھا لیکن باہر سے ہی
رخصت ہو جاتا تھا کبھی اندر جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس روز سیٹھ
نے فون پر اپنی بیوی کو بتایا کہ شوکت کو بھیج رہا ہوں اس کے ہاتھ چابیاں
بھجوا دینا۔ سیٹھ کا بنگلہ نرسری کے قریب تھا میں پندرہ بیس منٹ میں
وہاں پہنچ گیا۔ آفس کے دوستوں کی زبانی سنا ہوا تھا کہ چھ سات ماہ پہلے سیٹھ
نے ایک بیس سالہ لڑکی سے شادی رچائی تھی۔ سیٹھ کی اپنی عمر پچاس
سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ یہ بات مجھے کچھ اچھی نہیں لگی تھی لیکن کسی کے
پرائیویٹ معاملات سے مجھے کیا واسطہ۔ گیٹ پر پہنچ کر میں نے اطلاعی
گھنٹی بجائی۔ ایک ادھیڑ عمر عورت نے دروازہ کھولا۔ مجھے ڈرائنگ روم
میں بٹھا دیا۔ بیس پچیس منٹ انتظار کی کوفت میں مبتلا رہا۔ خدا جانے
چابیاں کھو گئی تھیں یا بیگم صاحبہ جان بوجھ کر دیر کر رہی تھیں۔ بہرحال
بیگم صاحبہ چابیاں لے کر بنفسِ نفیس خود تشریف لائیں۔ وہ واقعی بیس
بائیس سال کی حسین و جمیل خاتون تھی۔ پُرکشش لباس نے اسے
اور بھی قیامت بنا ڈالا تھا۔ میں رعبِ حسن سے گڑبڑا گیا۔ عجلت
میں سلام کیا وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ چابیاں لیتے وقت میں خاصا نروس
ہو رہا تھا۔ جلدی سے سلام کر کے وہاں سے رخصت ہوا۔ راستے بھر سوچتا
آیا کہ بھلا مجھے نروس ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن سچ بات یہ ہے کہ کبھی
حسین عورت سے اس طرح مل بیٹھنے کا موقع بھی نہ ملا تھا۔ اس کے باوجود
میں بڑے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اس عورت کے متعلق کسی برے خیال نے
میرے دل میں جگہ نہیں لی تھی جبکہ دفتر کے نوجوان ساتھی چٹخارے لے لے
کر سیٹھ کی نوجوان بیوی کی باتیں کرتے تھے۔ میرے نزدیک وہ میرے
شفیق محسن اور مہربان باس کی بیوی تھی اور اس شخص نے مجھ پر ہر قدم
پر اعتماد کیا تھا۔

اس روز کے بعد سیٹھ مجھے اکثر اپنے نجی کام سے گھر بھیجنے لگے۔ میں
اس کی نظر میں شریف لڑکا ثابت ہوا تھا اسی حساب میں بلا دھڑک
ان کے بنگلے میں چلا جاتا تھا۔ مجھے اپنی ذات پر اعتماد تھا کہ سیٹھ کو کبھی
شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔ بیگم صاحبہ کا یہ حال تھا کہ مجھے دیکھتے ہی
مسکرا اٹھتیں۔ بالکل پہلے دن کی طرح شگفتہ انداز سے بات کرتیں کبھی
کبھی تو ان کی بے تکلف مسکراہٹ مجھے بڑی معنی خیز لگتی کبھی سوچتا کہ
ہو سکتا ہے یہ تبسم و تکلم اس عورت کی عادت ہو۔ ایک دفعہ بیگم صاحبہ
کے کچھ مہمان حج کے سلسلے میں کراچی آ رہے تھے۔ سیٹھ صاحب نے ان
کے قیام و طعام کی ذمہ داری مجھے سونپ دی۔ انہیں اسٹیشن پہ لینے بھی
مجھے ہی بھیجا۔ بیگم صاحبہ میرے ہمراہ تھیں۔ گاڑی میں بیگم صاحبہ نے مجھے اپنے
ساتھ پیچھے بٹھایا جبکہ میں ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھ چکا تھا۔ ان کے حکم
پر ساتھ بیٹھنا پڑا۔ اور یہاں میں سچائی سے کام لوں کہ اس عورت کی قربت
نے میرے جذبات میں نہ معلوم سی ہلچل مچا دی۔ میں سمٹ کر بیٹھنا چاہتا
تھا مگر وہ اسی مخصوص ادا سے مسکراتی میرے انتہائی قریب ہو کر بیٹھنے کے
موڈ میں تھی اس کے بدن کی میٹھی خوشبو نے مجھے سرشاری میں دھکیل دیا۔
اس کے بالوں کی بھینی بھینی مہک مجھے اپنے سانسوں میں گھلتی محسوس ہو
رہی تھی جی چاہتا تھا اس گل بدن کو اپنے اندر جذب کر لوں۔ یہ کیفیت
دو چار منٹ تک شدید رہی مگر میں نے اپنے اندر کے سرکش مرد کو کسی نہ
کسی طرح قابو کر لیا۔ جبکہ مجھے یقین ہے اس وقت کوئی اور مرد ہوتا تو
اس عورت کی اتنی قربت میں ضرور پگھل جاتا اور پھر اس پر اس کا بار
بار مسکرا کر دیکھنا۔ اپنی ساڑی کا پلو کاندھے سے جان بوجھ کر گرانا اور وہ
بھی اس انداز سے کہ اس کے بدن کی دھوپ سے آنکھیں اور عقل دونوں
چندھیانے لگیں۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ لاحول پڑھ
کر خود پر لعنت بھیجی کہ یہ تیرے محسن کی شریکِ حیات ہے تو یہاں اگر اتنا
بے غیرت ہو گیا ہے کہ رشتوں کا احترام بھی بھلا بیٹھا۔ خدا خدا کر کے
اسٹیشن آیا۔ گاڑی آنے میں دیر تھی ہم دونوں پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگے
سب لوگ گردن موڑ موڑ کر ہمیں رشک بھری نظروں سے دیکھ رہے
تھے۔ وہ جانے مجھے کیا سمجھ رہے ہوں گے۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی
تھی۔ تب اس نے بڑی ادا سے اپنے بالوں کو سمیٹا اور جھک کر مجھ سے
سرگوشی کی۔ "شوکت جانتے ہو یہ لوگ کیا سمجھ رہے ہیں۔ یہ دل ہی دل
میں کہہ رہے ہیں کتنا اچھا جوڑا ہے "

اور عین اسی وقت گاڑی پلیٹ فارم میں داخل ہوگئی۔ اس کی گڑگڑاہٹ میں بات ادھوری رہ گئی اور میں نے خدا کا شکر کیا۔ مہمانوں کو لے کر بنگلے پر آئے۔ وہاں سے میں سودا سلف لینے ایمپریس مارکیٹ گیا۔ خانساماں کو سامان خرید کر دیا۔ ان کاموں سے فراغت پاکر میں نے جانے کی اجازت مانگی۔ مگر بیگم صاحبہ نے حکم دیا کہ جب تک سیٹھ صاحب دفتر سے نہ آجائیں تم نہیں جا سکتے۔ سیٹھ صاحب آئے تو میرا حسن انتظام دیکھ کر خوش ہوئے۔ انہوں نے شام کو کھانے پر اصرار کرکے روک لیا۔ رات کے گھر لوٹا تو تھکن سے چور تھا۔ مگر اس کے باوجود نیند نہیں آئی۔ عجیب کشمکش و پیچ میں گرفتار ہوگیا تھا۔ بیگم صاحبہ کا بار بار قریب آنا۔ ہونٹوں کے کونے دبا کر مسکرا دینا اور جھک کر سرگوشی کرنا۔ آخر یہ سب کچھ کیا تھا۔ اسے عادت نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو سراسر دعوت تھی۔ اس خوبصورت عورت کی بڑھتی ہوئی شوخیوں نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ میں کسی بھی صورت میں اس کی دعوت کو قبول کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں پارسا تھا یا بالکل ہی بے حس۔ اتنی توبہ شکن اداؤں کو فرشتے بھی بہک جاتے۔ بات صرف یہ تھی کہ میرے اپنے کچھ اصول ہیں۔ میں رشتوں کا احترام اور تقدس کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں۔ اس عورت کا درجہ میرے نزدیک ایک شفیق محسن کی بیوی کا تھا جس کا احترام مجھے ہر حال میں کرنا تھا۔ عادت پھر اپنے نفس کو سمجھاتا رہا کہ تجھے ثابت قدم رہنا ہے۔ ایک شخص نے تجھ پر اعتماد کیا ہے۔ وہ ٹوٹ گیا تو شاید پھر کبھی وہ کسی پر بھروسہ نہیں کر سکے گا۔ صبح دیر سے اٹھا۔ دفتر بھی دیر سے گیا۔

دو دن سیٹھ کے بنگلے پر مہمانوں کی بھاگ دوڑ میں گزرے۔ بیگم صاحبہ کے حجاب کا پردہ کچھ اور سرک گیا۔ کبھی کبھی تو مجھے یقین ہو جاتا کہ اب میرا یہاں سے کھسک جانا میرے لئے زیادہ بہتر رہے گا۔ وہ اتنی اپنائیت اور شوخی سے بات کرتی کہ اگر سیٹھ دیکھ لیتا تو ضرور بدگمان ہو جاتا۔ چار دن بعد مہمان حج پر چلے گئے۔ میں نے شکر ادا کیا کہ اب بنگلے پر جانا کم ہوگا اور بیگم صاحبہ بھی اپنی روش بدل لیں گی لیکن یہ خیال خام نکلا۔ دو دن گزرنے کے بعد بیگم صاحبہ نے سیٹھ کو دفتر فون کیا کہ مجھے ملیر جانا ہے شوکت کو بھیج دیں۔ سیٹھ کو مجھ پر اندھا اعتماد ہو گیا تھا اور وہ اپنی بیوی کو بھی مضبوط کردار کی عورت سمجھتا تھا اس لئے مجھے گھر جانے کا حکم دیا۔ میں اپنے خوف کو سیٹھ سے چھپا کر بنگلے پہ آ تو گیا لیکن اندر سے دل کہتا تھا کہ بیٹا آج تیرا امتحان ہے۔ بیگم صاحبہ کے تیور ٹھیک نظر نہیں آتے میرے خدشات بالکل درست نکلے۔ وہ گیٹ پر میری منتظر تھیں۔ مجھے اپنی مسکراہٹوں کے جال میں لپیٹتی اندر لے آئیں۔ مجھے یہ احساس ہوا کہ ملازمہ گھر میں نہیں ہے۔ بہانے سے پوچھا تو ہنسنے لگیں۔ ظاہر ہے اسے چھٹی دے دی ہوگی۔ کہنے لگیں آج میں تمہیں اپنے ملبوسات دکھاؤں تاکہ تم میرے ذوق کا اندازہ کرکے میرے لئے اچھی شاپنگ کر سکو۔ میں نے خود کو تسلی دی کہ آخر مرد بچہ ہوں مجھے کھا تو نہیں جائے گی۔ اندر آیا بیگم صاحبہ نے مجھے ملبوسات کی الماری دکھائی اور پھر ایک لباس منتخب کرکے پردے کے پیچھے غائب ہوگئیں۔ چند ہی منٹوں میں واپس آئیں تو کچھ کی کچھ ہوگئی تھیں۔ نیم عریاں باریک لباس جو عموماً شب خوابی میں پہنا جاتا ہے زیب تن کیا ہوا تھا۔ اس وقت دن کے دو بجے تھے۔ میں نے یہ سوچا کہ شاید محترمہ نے بازار جانے کا ارادہ ملتوی کرکے سونے کا پروگرام بنا لیا ہے لہٰذا مجھے اب رخصت لینی چاہئے۔ مگر وہ بے دھڑک میرے برابر آبیٹھیں۔ میں گھبرا کر کھڑا ہوگیا کہ اس عورت کے بدن اور زلفوں کی خوشبو نے پھر سے میری عقل کے دریچے بند کرنے شروع کر دیئے تھے۔ وہ بھی یک دم کھڑی ہوگئی اور اس بے تابی سے مجھ سے لپٹ گئی کہ ایک لمحے کے لئے میرے جسم میں سینکڑوں کرنٹ دوڑتے چلے گئے۔ میں ان لمحات سے فائدہ اٹھانا جانتا ہوں مگر میں نے بتلایا نا کہ مجھے سیٹھ کی عزت اور اس کا اعتماد جان سے زیادہ عزیز تھا۔ مجھے اپنے نفس سے شدید جنگ کرنا پڑی تھی مگر میں اپنی ذات سے قطعی شرمندہ نہیں ہوں کیونکہ میں نے اس عورت کو ٹھکرا دیا۔ بڑی نرمی سے اس کے ہاتھ ہٹائے اور تلخی سے بولا: "تم حسین ہو، جوان ہو مگر ضروری نہیں کہ اس کے عوض تم ہر شخص کا کردار خریدنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ میں سیٹھ کی عزت کرتا ہوں اور اسی رشتے سے تمہاری عزت بھی کرنا چاہتا ہوں۔"

اس رومانٹک تنہائی میں وہ عورت یہ طمانچہ برداشت نہ کر سکی بپھر کر بولی۔

"بے وقوف مت بنو، انسانی جذبات کی قدر کرنا سیکھو۔ پہلے خدا کی اس نعمت کا احترام تم پر لازم ہے۔ میں چاہوں تو سیٹھ سے تمہارا رشتہ منٹوں میں ختم کرا سکتی ہوں۔ پھر تم کس رشتے سے سیٹھ کا احترام کروگے۔!"

میں سمجھ گیا کہ بحث و تکرار سے یہ عورت اور زیادہ خطرناک ہو جائے گی۔ اور جس انداز سے وہ بات کر رہی تھی صاف ظاہر تھا کہ اپنی شکست پر وہ برا بھلا کام کرنے سے دریغ نہیں کرے گی۔ لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ اب مجھے اس سے اور اس کے حسن سے سخت نفرت ہوگئی تھی۔ اس کے باطن نے اس کے ظاہری حسن اور اداؤں کو بھیانک کر دیا تھا۔ اور اب میں صرف یہ چاہتا تھا کہ اس عورت کو اپنے ارادے میں شکست ہو۔ وہ میرے سامنے کھل کر ایسی باتیں بنا رہی تھی کہ ہم دونوں ایک ہو جائیں گے۔ سیٹھ کی ساری دولت میرے پاس ہے جو میں تمہارے قدموں پر نچھاور کر دوں گی۔ میں نے اس

کی سب باتیں سنیں اور وہ یہ سمجھتی رہی کہ میں مستقبل کے حسین خواب میں کھو کر اسے قبول کر لوں گا۔ مگر درحقیقت اس وقت میں یہاں سے نکل بھاگنے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا۔ جب وہ خوب بک بک کر چکی تب میں نے دھیمی سرگوشی میں کہا۔

"مجھے ایک منٹ باتھ روم جانا ہے ابھی آیا" بیڈ روم کے ساتھ باتھ روم تھا اور اس کا ایک دروازہ باہر کھلتا تھا جو کئی بار آتے جاتے میری نظروں سے گزر چکا تھا۔ وہ اس وقت میرے کام آیا۔ کمرے سے نکلتے وقت بھی اسے خبر نہیں ہوتی ہوگی کہ میں بھاگ چکا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے کب تک میرا انتظار کر کے باتھ روم کھولا ہو۔

میں اس کے سحر سے آزاد ہو کر عارضی طور پہ بے حد مطمئن تھا کہ جذبات کا چڑھاؤ اترنے پر وہ پشیماں ضرور ہو گی۔ پھر یقیناً اس کی نظروں میں میرا جو مقام ہوگا اس کے سہارے میں سیٹھ کے ساتھ مل کر اپنا کام سکون سے کرتا رہوں گا۔ لیکن دوسرے روز جب میں دفتر پہنچا تو چپڑاسی نے سیٹھ کے بلاوے کا بتایا کہ صاحب صبح سے دو بار میرے بارے میں پوچھ چکا ہے۔ میں سیٹھ کے کمرے میں آیا ساتھ انہوں نے دروازہ بند کرنے کے بعد مجھے جو کچھ بتایا وہ مجھے حیرت زدہ کر گیا، کہنے لگے۔

"میں نے تم پہ اعتماد کر کے بہت بڑی غلطی کی تھی۔ تم نے کل میری عزت پر ڈاکہ ڈالا ہے۔ میں چاہتا تو پولیس کے حوالے کر دیتا مگر اس میں میری بیوی کی بھی رسوائی ہے میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ یہاں سے اسی وقت رخصت ہو جاؤ اور آئندہ کبھی یہاں اپنی صورت مت دکھانا" میں نے اپنی صفائی میں بولنا چاہا مگر سیٹھ نے نفرت سے منہ پھیر کر جواب دیا کہ دفع ہو جاؤ میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ اپنا حساب صاف کر کے یہاں سے فوراً چلے جاؤ"

کچھ کہنا سننا فضول تھا سیٹھ جوان بیوی کے بتائے ہوئے جھوٹے ڈرامے پر یقین کر چکا تھا۔ میں اپنی صفائی میں کیا کہتا وہ تو کچھ سننے کے لئے تیار ہی نہ تھا۔ خاموشی سے سینے پر صدمے کی سل لئے باہر آگیا اور احتجاجاً اپنا حساب بھی نہیں لیا۔ میرے ساتھی مجھے حیرت زدہ سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان سے بھی کچھ نہیں بولا گھر آ کر نعیم سے ساری باتیں کہہ دیں۔ اس نے تسلی دی بولا۔

"شکر کرو شوکت اس دلدل میں پھنسے نہیں۔ نوکری تو اور بھی مل جائے گی لیکن خدانخواستہ اس کے چنگل میں پھنس جاتے تو وہ تمہیں ذلیل و رسوا کر کے چھوڑ دیتی" اس کی حوصلہ افزائی نے بڑا حوصلہ دیا۔ کچھ دن کی بھاگ دوڑ کے بعد مجھے ایک ریکروٹنگ ایجنسی میں جگہ مل گئی نعیم سے مشورہ کر کے میں نے اپنا نام ایجنسی کے باہر جانے والے افراد کی فہرست میں لکھوا لیا۔ ایجنسی نے چھ مہینے میں مجھے کویت بھیج دیا اور والدین سے ملے بغیر میں یہاں آگیا۔ یہ سب میں نے اس لئے کیا کہ میں تعلیم جاری رکھنے کا وعدہ پورا نہ کر سکا تھا۔ اور اسی لئے میں انہیں اپنا منہ نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ کویت میں مجھے پہلی تنخواہ چار ہزار روپے ملی۔ تھوڑے عرصے بعد نعیم کو بھی میں نے یہاں بلوا لیا اور پھر دو سال بعد پاکستان لوٹا تو ابی سے جا کر معافی مانگ لی۔ امی نے اس شرط پر معاف کیا میں اب شادی کے بعد کویت جاؤں۔

اور آج کل جب میں کویت میں اپنی نیک سیرت اور وفا شعار بیوی اور دو بچوں کے ساتھ پرسکون زندگی بسر کر رہا ہوں۔ اچانک ہی مضطرب ہو گیا ہوں۔ اس کی وجہ بھی سن لیں۔

ڈیڑھ ماہ پہلے میں نعیم کے ساتھ ایک شاپنگ سینٹر میں گیا۔ کچھ چیزیں خرید کر نکل رہا تھا کہ اچانک مجھے وہی صورت نظر آگئی۔ اس واقعہ کو گیارہ سال بیت چکے ہیں مگر میں اسے پہلی نظر میں پہچان گیا۔ وہ ابھی تک اسی طرح جوان اور تر و تازہ تھی۔ اس کے ساتھ ایک چالیس پینتالیس سال کا شخص تھا جس کا سہارا لئے وہ خراماں خراماں شاپنگ سینٹر میں داخل ہو رہی تھی۔ میں فوراً ایک پردے کی آڑ میں ہو گیا۔ اس لمحے انتقام کی آگ نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا جس شخص کے ساتھ وہ تھی یقیناً اس کا دوسرا شوہر یا نیا عاشق ہوگا۔ اور اب وقت آگیا تھا کہ میں اس سے بدلہ لے سکوں۔ میں نے نعیم کو بتایا کہ یہی وہ ناگن ہے جس نے میرے محسن کو مجھ سے بدگمان کیا تھا۔ نعیم اور میں نے اس کا تعاقب کیا۔ اس کا ٹھکانہ معلوم کرنے کے بعد میں نے کراچی اپنے دوست کو خط لکھا کہ وہ قمر ہاؤس میں سیٹھ کی فرم کے متعلق معلومات کرے۔ وہاں سے جواب آیا کہ اس نام کا سیٹھ اور فرم دونوں ہی قمر ہاؤس میں نہیں ہیں۔ گویا فرم بند ہو چکی ہے ظاہر ہے یا تو سیٹھ مر چکا ہے یا اس عورت نے دوسرا شکار پھانس کر اسے چھوڑ دیا۔ بہرحال اب میں رات دن اس احساس کی آگ میں جل رہا ہوں کہ اس سے بدلہ لوں۔ اس نے مجھ پہ جو الزام لگایا تھا اس کا مزہ اسے چکھاؤں اگر سیٹھ زندہ ہے تو اسے بتاؤں کہ تیری بیوی نے مجھ پر یہ تہمت کیوں لگائی تھی نعیم سمجھاتا ہے کہ یار چھوڑ کیا اس فاحشہ عورت سے بدلہ لینا مگر میں نے اس عورت کے نئے شوہر سے دوستی کے تعلقات پیدا کر لئے ہیں۔ میری حیثیت اب کسی طور بھی کسی سے کم نہیں۔ وہ مجھ سے مرعوب ہو کر ملتا ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ میرے اندر کون سا جذبہ سلگ رہا ہے۔ آپ مجھے مشورہ دیجئے کہ میں کس طرح اس سے بدلہ لوں تاکہ میری گیارہ سال سے سلگتی انتقام کی آگ ٹھنڈی ہو جائے۔

شوکت محمود، کویت ***

# خزاں رسیدہ پتہ اور میں

میں چلچلاتی دھوپ سے بچنے کے لیے اپنے آنگن میں لگے بوڑھے برگد کے نیچے بیٹھی نجانے کیا سوچ رہی تھی کہ ایک زرد پتہ میری گود میں آگرا۔ میں نے اِسے ڈنڈی سے پکڑ کر گھماتے ہوئے سوچا ــــــــ

اُس پر بھی کبھی بہار آئی ہوگی۔ یہ بھی مست ہواؤں میں خوشبوں سے بدمست ہوکر شاخوں پر ہلکورے لیتا ہوگا۔ اس وقت اسے اس پل کی خبر نہ ہوگی جب وہ خشک اور بے جان ہوکر شاخوں سے الگ ہوجائے گا ــــــــ

میں اِس کی اِس بےبَسی کی بے کسی پر افسوس ہی کر رہی تھی کہ وہ افسردگی سے مسکرایا اور بولا۔

"اپنے انجام کی تو سب کو خبر ہوتی ہے دوست! لیکن انجام کی کون پروا کرتا ہے۔ جب بہار ایک ہی مرتبہ آتی ہے تو کیوں نہ بہار کے مزے لوٹے جائیں۔ اگر بہار کے دنوں میں خزاں کا سوچ سوچ کر اپنی بہار کو بھی خزاں میں بدل لیا تو اس سے کیا حاصل۔"

اُس کی بات میرے دل کو لگی۔

میں نے پتے کو گھما کر زمین پر پھینکا اور گنگناتے ہوئے اُٹھی۔ اِسے اور اس جیسے دوسرے پتوں کو اپنے پیروں تلے روندتے ہوئے اپنی بہار کا مزہ لوٹنے کے لیے تیار ہونے چلی ــــــــ

چلتے چلتے میرے کانوں میں آواز آئی ــــــــ

"یہ لڑکی تو بہت جلد باز نکلی"

آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ اس کی حدت سے گھروں کی دیواروں، پہاڑیوں اور چٹیل میدانوں سے آگ کی لپٹیں نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایسے وقت میں بہت کم لوگ باہر نکلنے کی جرأت کر سکتے تھے، اسی لیے ہر طرف سناٹا تھا مگر اس تپتی ہوئی دھوپ اور جھلسا دینے والی گرمی میں عباد بنو کافر بنو کنانہ کے تاجروں کے ہمراہ مصروف سفر تھا۔ کافی دور تک ان تاجروں کے ساتھ سفر کرنے کے بعد اب اس کا راستہ جدا ہو گیا تھا۔ وہ ریت کے ٹیلوں، سنگلاخ چٹانوں اور تنگ تنگ وادیوں سے گزرتے ہوئے جلد اپنی منزل پر پہنچنا چاہتا تھا۔ بارہا اس نے ان راستوں پر سفر کیا تھا مگر ہر مرتبہ بدوؤں کے اچانک حملے یا کسی اپنے ہی مخالف قبیلے سے ٹکراؤ دشواری پیدا کر دیتا تھا۔ لیکن یہ سفر ہمیشہ سے زیادہ خوشگوار تھا۔

گرمی کے باوجود اب عرب کی حدود میں سفر کرتے ہوئے وہ خود کو بڑا مسرور محسوس کر رہا تھا۔ ابھی تک اس کا سفر کسی ناخوشگوار واقعے سے دوچار ہوئے بغیر گزرا تھا۔ دوسرے یہ اس کی زندگی کا کامیاب ترین سفر تھا۔ وہ مسکرا دیا۔ اس نے کپڑا فروخت کر کے توقع سے زیادہ دولت کمائی تھی اور دمشق کی خوبصورت تلواریں اور ڈھالیں خریدی تھیں جو ایک عرب کا سرمایہ حیات ہوتی ہیں۔ پچھلی مرتبہ وہ چند گھوڑے لایا تھا مگر اتنا مطمئن نہ تھا جتنا اس مرتبہ کی تجارت نے اسے مسرور کیا تھا۔ اس پیسے سے وہ یہودی سردار کا قرض بھی اتار سکتا تھا اور اپنے قبیلے اوس کے نوجوانوں کو یہ تلواریں دکھا کر داد و تحسین بھی حاصل کر سکتا تھا۔ تلواروں کا تصور ہی اسے مسرور کیے دے رہا تھا جبکہ گھٹنے اپنے قبیلے میں سر اٹھا کر چلنے کا خیال ہی اسے بے خود کیے دے رہا تھا۔

پچھلے چند برسوں سے اس کی زندگی بڑی صعوبت سے گزر رہی تھی۔ یہودی سردار اشرف کا قرض اور سود اور اس کے لڑکے کعب بن اشرف کے تذلیل آمیز تقاضوں نے اس کی راتوں کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ مستزاد یہ کہ بنو خزرج کے ہاتھوں اس کے باپ اور چچا کی موت نے اسے دیوانہ کر دیا تھا۔ مگر اب وہ انتقام لینے کا پورا پورا فیصلہ کر چکا تھا۔ پچھلے سال اس کے باپ کا گھوڑا بنو خزرج کے ایک معزز تاجر عتبہ کی چراگاہ میں چلا گیا تھا تو موقع پاتے ہی عتبہ نے اس کے باپ کو زدوکوب کیا تھا۔ ان زخموں کی تاب نہ لا کر بوڑھا چل بسا تھا۔ اس کا انتقام لینے کے لیے اس کے بھائی نے عتبہ کے گھر میں آگ لگا دی تھی جس سے اس کی بیوی جل کر خاک ہو گئی۔ عتبہ نے موقع پاتے ہی اس کے بھائی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر اسی انتقام کی بھینٹ اس کا چچا چڑھ گیا۔ جب سے اب تک قبیلے والے اسے کئی بار غیرت دلا چکے تھے کہ وہ اپنے بزرگوں کا انتقام لے۔ اسی لیے وہ نئی تلواریں خرید کر لایا تھا۔ وہ خیالات میں گم تھا مگر گھوڑے نے ایک سم پر زور لگائی تو وہ چونک پڑا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ہمیشہ دمشق سے واپسی پر وہ چند گھنٹے آرام کیا

کرتا تھا۔ اس جگہ کو پہچان کر ہی گھوڑے نے ہٹ کی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔
"ہاں دوست اب ہم آرام کریں گے۔" اس نے گھوڑے کی گردن پر پیار سے ہاتھ پھیرا، پھر گردن موڑ کر اپنے ادھیڑ عمر غلام سالم کو دیکھا جو اونٹ پر سوار مال سے لدے ہوئے دوسرے اونٹ کو ساتھ لا رہا تھا۔

"سالم!" عباد بولا۔ "میرا دوست بہت تھک گیا ہے اور آرام چاہتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" سالم نے اطاعت آمیز انداز میں کہا۔ "آپ توقف فرمائیں میں اس چٹان کے دوسری طرف دیکھتا ہوں۔ کوئی موزوں جگہ دیکھ کر قیام کریں گے۔ گرمی بھی تو بہت ہے۔"

"نہیں تم مال کے پاس ٹھہرو۔" عباد بولا۔ "جگہ کا انتخاب میں خود کروں گا۔" یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور باگ موڑ کر سامنے والے ریتیلے ٹیلے پر جا پہنچا۔ اس کے دوسری جانب ایک کشادہ محفوظ جگہ تھی۔ یہ جگہ ببول کی جھاڑیوں اور اونچی نیچی پہاڑیوں سے گھری تھی اور اس گرمی کے وقت میں اس جگہ پر سایہ آنکھوں کو بھلا لگتا تھا۔ عباد نے گردن موڑ کر فاصلے پر ٹھہرے ہوئے سالم کو اشارہ کر کے بلایا اور خود گھوڑے سے کود پڑا۔ پھر اس نے ببول کی ایک جھاڑی سے اسے باندھا۔ چھاگل کے پانی سے چوتھرے اور چنے کے توبڑے میں رکھ کر اس کے آگے رکھ دیئے۔ اس عنایت سے گھوڑا ہنہنایا۔ اس نے محبت سے مالک کو دیکھا اور توبڑے میں منہ ڈال دیا۔ عباد نے پیار سے اسے تھپکی دی، جسم پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ جو اس کا بہترین دوست اور ساتھی تھا۔ اس وقت تک سالم بھی یہاں پہنچ گیا تھا مگر اسے اونٹوں سے سامان اتارتا ہوا دیکھ کر عباد بولا۔

"سامان مت اتارو سالم: بس دونوں اونٹوں کو باندھ دو ہمیں جلد ہی یہاں سے روانہ ہونا ہے۔" سالم نے حکم کی تعمیل کی تو عباد نے پھر کہا۔ "اب تم کھانے کا سامان اور پانی کا مشکیزہ اٹھا لو، تھوڑا پانی گھوڑے کو پلاؤ۔ باقی کھانے کے ساتھ خرچ ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ چند گھنٹے آرام کے بعد ہم روانہ ہو جائیں۔ یہ رات تمام ہونے سے قبل ہمیں گھر پہنچنا ہے۔"

"بہتر ہے۔" سالم نے کہا اور ستو، کھجوریں اور پنیر نکال کر عباد کے سامنے کھانا چنا۔ ان دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا اور پانی پی کر ریت پر لیٹ گئے یہاں گرمی کی شدت کچھ کم تھی اس لیے وہ بڑا آرام محسوس کر رہے تھے۔ سالم بولا: "مالک آپ سو جائیں۔ گزشتہ شب میں نے کافی آرام کیا تھا۔ لہٰذا ابھی تھکن محسوس نہیں ہو رہی، اس لیے میں بآسانی پہرہ دے سکتا ہوں۔"

"آرام تو میں نے بھی رات خاصا کیا تھا۔" عباد بولا۔ "اور سچ پوچھو تو اس وقت اگر میرا گھوڑا ہٹ نہ کرتا تو میں کبھی آرام کے لیے نہ ٹھہرتا۔ میں صرف جانوروں کے خیال سے یہاں اترا ہوں، ورنہ تم جانتے ہو کہ میں اس مرتبہ گھر پہنچنے کے لیے کتنا بے چین ہوں۔"

"ہاں!" سالم مسکرایا۔ "ہمارا یہ سفر کامیاب بھی تو بہت رہا ہے۔"

"میرے قبیلے والے سمجھتے ہیں کہ میں اپنے باپ اور چچا کا انتقام لینے سے کتراتا ہوں۔ مجھ پر کسی نے جادو کر دیا ہے۔ مگر اب میں انہیں بتاؤں گا کہ میرے بازوؤں میں کتنا دم ہے۔" عباد نے قدرے اشتعال سے کہا۔

"پچھلے دنوں اشرف کے گھر پر بنو اوس اور بنو خزرج کے کچھ لوگ جمع تھے وہ آپ پر ہنس رہے تھے کہ آپ جادو کے اثر سے قوت سے محروم ہو گئے ہیں۔" سالم نے کہا۔

"تم سے کس نے کہا۔" عباد نے کہا۔

"وہ عدی کا غلام ہبیرہ ہے نا! اس نے مجھے بتایا تھا۔" سالم نے کہا "ویسے عدی آپ کے لیے فکر مند ہے کہ ایک سال ہونے کو آیا مگر آپ نے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ یہ ضرور جادو کا اثر ہے۔ اس کا خیال ہے کہ بنو خزرج نے آپ پر جادو کیا ہے۔"

"اونہہ!" عباد نے غصے سے کہا۔ "اب میں کھلے میدان میں بنو خزرج کا مقابلہ کروں گا۔"

وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ اونٹ ببول کی ٹہنیاں نوچ نوچ کر چبا رہے تھے اور گھوڑا ابھی تک توبڑے میں منہ ڈالے چنے کھانے میں مصروف تھا۔ سوچتے سوچتے عباد کا خیال اپنے گھر کی طرف گیا۔ پرسکون گھر، جوان بیوی عفیرہ اور دس سالہ بچی کا تصور بڑا سکون بخش تھا۔ وہ خیالات میں گم ہو گیا۔ یہ بچی اسے بڑی عزیز تھی۔ اگرچہ اس سے پہلی دو لڑکیاں وہ دفن کر چکا تھا مگر تیسری مرتبہ اس نے عفیرہ سے پہلے ہی وعدہ لیا تھا کہ وہ بیٹا دے گی۔ ورنہ وہ تیسری لڑکی کو بھی دفن کر دے گا۔ عفیرہ گھبرا کے رونے لگی تھی مگر اسے پروا نہ تھی وہ ایک غیرت مند عرب تھا۔ بزرگوں کا انتقام لینا اس کا مقصد تھا، اسی لیے وہ بیٹا چاہتا تھا۔ بیٹا جو عربوں کے خیال میں طاقت کی علامت تھا جو باپ دادا کی موت کے بعد قبیلوں کی جنگوں کو جاری رکھ سکتا تھا۔ جو اپنے اسلاف کے قتل کا بدلہ لے سکتا تھا جس کی پیدائش پر عرب سینہ تان کر چلتے تھے۔ مگر لڑکی ایک گالی تھی اور عباد یہ گالی کھانے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس نے شادی کی رات ہی عفیرہ سے عہد کیا تھا کہ وہ لڑکے پیدا کرے گی مگر عفیرہ اس عہد پر پوری نہ اتری تھی۔ تیسری بیٹی کی پیدائش پر وہ غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ اس نے عفیرہ کو زدوکوب کیا اور بچی کو چھین کر چلا تو عفیرہ رونے لگی اور اس نے کہا کہ صرف ایک رات وہ اس بچی کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے۔ اگلی صبح وہ کچھ نہ کہے گی۔ عباد نے دوسری صبح اسے دفن کر دینے کے خیال سے بچی واپس کر دی مگر یہ شب اس کے خیالات میں انقلاب لے آئی۔ اس نے خواب دیکھا کہ وہ ساحل سمندر کے قریب کھڑا ہے۔ بچی اس کے ہاتھوں میں ہے اس نے کہی

بادل زمین کھود کر اسے دفن کرنا چاہا مگر زمین برابر ہو گئی۔ وہ حیران و پریشان کھڑا ہے۔ پھر وہ کچھ سوچ کر قدید کی طرف بڑھا ہے۔ جہاں پر ان کی دیوی مناۃ نصب تھی۔ اس نے مناۃ سے دعا کی اور کہا۔ "اے مناۃ یہ لڑکی واپس لے لے" مگر مناۃ نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ پھر وہ سواع، ود، لات، یغوث، نسر، سعد، اساف، نائلہ، عزیٰ اور مدان کے پاس گیا۔ مگر ہر دیوی اور ہر دیوتا نے مناۃ کی طرح اس بچی کو لینے سے انکار کر دیا۔ تب وہ معبود اعظم ہبل کے پاس پہنچا۔ مگر اس پر مقدس گھر کا دروازہ بند تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ حیران و پریشان اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ مگر بہر سوچ کے بعد ایک ہی جواب سامنے آتا کہ بچی دیوتاؤں کی دین ہے جسے واپس کرنا ان کے غضب کو للکارنا ہے پھر اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔ وہ بچی کو دفن کرنے نہیں لے گیا جب سے اب تک اسے یہ بچی بےحد عزیز تھی۔ اس کے بعد اس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اگرچہ یہ چیز پریشانی کا باعث تھی وہ بیٹے سے محروم تھا اور اس طرح اس کے بعد دشمنوں سے بدلہ لینے والا کوئی نہ تھا۔ عربوں کی موت دوسروں کے ہاتھوں آتی تھی جس کا انتقام بیٹے پوتے لیتے تھے مگر اس کی موت کا بدلہ لینے والا کوئی نہ تھا۔ یہ خیال اسے اور عفیرہ کو آزردہ کرتا، مگر سعاد کی محبت میں کمی نہ کر سکتا تھا۔ اس طرح وہ دس سال کی ہو گئی تھی۔ عباد اسے بےحد چاہتا تھا۔ وہ اس وقت بھی اس کو پیار کرتا جب اسے اپنے خاندان کے مقتولوں کی روحیں انتقام کے لیے سرگرداں اور بھٹکتی نظر آتیں۔ اس کے ذہن میں یہ خیال جم چکا تھا کہ سعاد دیوتاؤں کی دین ہے۔

وہ خیالات میں گم تھا۔ تصورات اُمنڈے چلے آ رہے تھے، مگر گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز اسے مادی دنیا میں لے آئی۔ شاید وہ اور جو طلب کر رہا تھا مگر اب نہ گھاس تھی نہ جو، لہٰذا عباد نے اس آواز کو نظرانداز کر دیا۔ جانور اور انسانوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا اس نے سوچا، جتنا دو اتنی ہی طلب بڑھتی ہے۔ اس معاملے میں دونوں ہی حریص ہیں۔ بس فرق اتنا ہے کہ جانور طلب کرتا ہے اور انسان چھین لیتا ہے۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا، سالم آنکھیں بند کئے پڑا تھا مگر اس کا انداز بیداری کی غمازی کر رہا تھا۔ اس نے خیالات سے بچنے کے لیے اس سے بات کرنی چاہی، مگر کچھ بولنے سے قبل ہی اسے آہٹ محسوس ہوئی۔ شاید کوئی مسافر گزر رہا ہو۔ اس نے سوچا مگر یہ آواز کئی انسانوں کے آہستہ آہستہ چلنے کی تھی۔ جو لمحہ بہ لمحہ واضح ہو رہی تھیں۔ عباد نے تلوار کے دستے پر ہاتھ جمایا اور اس کے ساتھ ہی دو برس قبل کا واقعہ یاد آ گیا۔ جب وہ اوس کے چند نوجوانوں کے ساتھ تجارتی مال لے کر دمشق سے واپس آ رہا تھا تو بنو خزرج کے کچھ شرپسند جوانوں نے حملہ کر دیا تھا اور اس حملے کا جواب عباد اور اس کے ساتھیوں نے اس شدت سے دیا تھا کہ بنو خزرج اپنی تلواریں چھوڑ کر منتشر ہو گئے تھے۔ عباد کے ہاتھ ان میں سے ایک کی تلوار بھی آئی اور بنو اوس میں داد و تحسین بھی ملی تھی۔ بنو خزرج کی طرف سے آنے والے اس ٹولے کا سربراہ عتبہ تھا جس کے باپ دادا سے عباد کے باپ دادا کی پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ یہ لوگ ایک دوسرے کو پست کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ عباد کے لیے اسے پسپا کر دینا بڑی عزت کی بات تھی۔ اوس کے نوجوانوں نے اس فتح پر اسے کندھوں پر اُٹھا لیا تھا۔ اور بنو خزرج میں عتبہ کو نامردی کا طعنہ سننا پڑا تھا۔ جب سے اب تک ان میں ایسی جھڑپیں ہو رہی تھیں۔ اب آوازیں اتنی واضح ہو گئی تھیں کہ سالم نے بھی آنکھیں کھول کر ادھر اُدھر دیکھا اور دوسرے لمحے وہ دونوں تلواروں کے قبضوں پر ہاتھ جمائے چوکنے کھڑے تھے۔ اس مرتبہ حملہ آور تین اطراف سے وارد ہوئے تھے۔ عباد کو پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہ لگی کہ یہ عتبہ، اس کے پانچ ساتھی اور ایک بارہ تیرہ برس کا لڑکا ہاتھ میں تیر و ترکش لیے ہوئے تھا۔ نجانے عتبہ سابقہ شکست کا بدلہ لینے آیا تھا یا تجارت کا مال لوٹنے۔ بہرحال بات ایک ہی تھی، عباد مقابلے پر ڈٹ گیا۔ وہ چار کے نرغے میں اور سالم تین کے مقابلے پر تھا۔ مگر ان میں کسی قسم کی گھبراہٹ نہ تھی۔ کمال پھرتی سے چند منٹ تک عباد ان کے مقابلے پر تلوار چلاتا رہا۔ اوس و خزرج کے بہادر مقابل تھے۔ وہ اپنا بچاؤ کر کے دوسروں کو زیر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر کوئی ہارتا نظر نہ آتا تھا لیکن اسی وقت عقب سے اس تیرہ سالہ لڑکے نے سالم پر تیر زنی کی اور دوسرا تیر عباد کے پہلو میں لگا۔ سالم تو اسی وقت گر گیا مگر عباد نے گرتے گرتے بھی عتبہ کے ساتھی پر وار کیا جس نے اسے ڈھیر کر دیا۔ جوابی وار عتبہ نے کیا مگر عباد کا حملہ

دو جینئس

"ورڈز ورتھ اور رسل کو ایک پہاڑی پر آثارِ قدیمہ دکھانے لے گئے۔ دونوں خاصے موٹے تھے اور عمر رسیدہ بھی اور گرمی بھی زیادہ تھی۔ رسل نے پہاڑی پر چڑھنا شروع کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ دونوں میزبان بھی پیچھے پیچھے آ رہے ہوں گے مگر جب مڑ کر دیکھا تو دونوں نیچے کھڑے تھے۔ رسل پہاڑی کی چوٹی سے گھوم پھر کر آیا تو ان سے اوپر نہ آنے کی وجہ پوچھی۔ وہ کہنے لگے۔ "پہاڑی پر چڑھنے کے لیے ہم نے بحث شروع کر دی۔ بڑی بڑی دلیلیں پیش ہوئیں۔ بالآخر ایک دلیل ایسی سامنے آ گئی کہ ہم اوپر چڑھنے سے باز آ گئے۔ میرے ساتھی کا کہنا تھا کہ اگر ہم دو موٹے شخص اس قدر گرمی میں پہاڑی پر چڑھے تو شاید یہ پہاڑی ہمارا بوجھ اٹھانے کی متحمل نہ ہو سکے۔"

شکست ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہر طرف سے تلوار کے واروں نے اسے ہوش نہ لینے دیا۔ اس لڑائی میں خزرج کے تین آدمی عباد کے ہاتھوں مارے گئے تھے مگر عقبہ کو پرواہ نہ تھی۔ عباد کی موت اس کے زخموں کا علاج تھی۔ آج اس نے اس خاندان کو ختم کر دیا تھا۔ دوسرے لمحے وہ تیرہ سالہ لڑکے کو سینے سے لگائے کہہ رہا تھا:

"شاباش: تو نے میری سابقہ توہین کا بدلہ لے لیا۔"

دوسرے دن شام تک اوس و خزرج میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ عباد اور عقبہ کی باہمی جنگ میں عباد زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ یہ خبر پھیلانے والا سالم تھا جو تیر کھا کر گرا تھا مگر اس کے وجود کو فراموش کر کے یا نظر انداز کر کے بنو خزرج مالِ غنیمت لوٹنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔

اسی شب عباد کا جنازہ لے کر بنو اوس قبرستان گئے۔ ان کی عورتیں ماتم کر رہی تھیں۔ عفیرہ نے اپنے بال کھول کر منہ پر خاک ڈالی تھی اور سعاد نے اس کی نقل کی تھی۔ زخمی سالم اپنے آقا کی قبر پر اونٹ لایا تھا جسے قبر پر باندھا گیا تھا تاکہ قیامت کے دن تھکے ہوئے عباد کو خدا تک پہنچنے کے لیے چلنا نہ پڑے اور وہ اس اونٹ پر سوار ہو سکے۔ عربوں کا دستور تھا کہ مرنے والوں کی قبر پر گھیرا ڈال کر کھڑے ہوتے اور قاتلوں سے انتقام کی قسم کھاتے تھے۔ قسم کھانے والوں میں بیٹے بھتیجے، بھائی یا دیگر عزیز ہوتے تھے مگر عباد ان سب رشتوں سے محروم ہو چکا تھا۔ عفیرہ اپنا سنہ نوچ نوچ کر رونے لگی۔ "تمھارا بدلہ لینے والا کوئی نہیں۔"

"ایسا نہ کہو مالکہ۔" سالم نے کہا مگر وہ بات مکمل نہ کر سکا۔ بنو اوس کے دیگر جوان بھی اسے تسلی دینے لگے مگر عفیرہ روئے جا رہی تھی۔

"تمھاری قبر ہمیشہ تاریک رہے گی!" اس کی باتیں سب کو رُلا رہی تھیں۔ عربوں کا خیال تھا کہ جب تک باپ کے قاتلوں سے انتقام نہ لے اس کی قبر تاریک رہتی ہے یہ سن کر دس سالہ سعاد روتے روتے چپ ہو گئی اور اس نے آگے بڑھ کر اپنے باپ کی گیلی قبر سے مٹی اٹھائی اور بولی:

"ماں یوں نہ کہو، میں مناۃ کی قسم کھاتی ہوں کہ اپنے باپ کے قاتل کو قتل کروں گی۔ میرے باپ کی قبر تاریک نہ رہے گی۔ میں خود انتقام لوں گی۔"

سب نے حیرت سے دیکھا۔ اب تک عرب عورتیں صرف مُردوں کی لاشیں مسخ کیا کرتی تھیں مگر اس لڑکی نے انتقام کا دعویٰ کیا تھا۔ اسی شب یہودی سردار اشرف نے اپنے نوعمر بیٹے کعب بن اشرف کو عباد کے گھر بھیجا اور دلاسہ دینے کے بعد وعدہ کیا کہ بنو اوس اگر بنو خزرج سے اس لڑائی کا انتقام لیں گے تو وہ پوری طرح ان کی مدد کرے گا۔ پھر یہی وعدہ اس نے بنو خزرج سے کیا۔ اس طرح اس نے دوستی کا اظہار کر کے دونوں قبیلوں کی کمر ٹھونکی تھی اور چند دن بعد اس نے اپنے قلعہ نما گھر میں ایک مجلس منعقد کی جس میں اوس اور خزرج کے معززین شریک تھے۔ اس کا بظاہر مقصد دونوں قبیلوں میں مصالحت کرانا تھی۔ مگر درحقیقت وہ انتقامی آگ کو بھڑکانا چاہتا تھا اس لیے اس نے صرف ان ہی لوگوں کو بلایا تھا جن کے اقربا ایک دوسرے کے ہاتھوں ختم ہو گئے تھے۔ قبیلہ اوس سے نعمان جس کا جوان بیٹا بنو خزرج کے ہاتھوں قتل ہوا تھا، ضعیف العمر عوف جس کے گھر کو کسی نے آگ لگا دی تھی اور اس کے خیال میں یہ کام صرف بنو خزرج کا تھا۔ قتیبہ جس کے بوڑھے باپ کو بنو خزرج کے جوانوں نے صرف اس لیے پیٹا تھا کہ ان کی اونٹنی ان کی چراگاہ میں پائی گئی تھی۔ اور عباد کا غلام سالم جس کے زخم ابھی مندمل نہ ہوئے تھے۔ بنو خزرج کی طرف سے ہلبل جس کی گھوڑی کی ٹانگیں بنو اوس کے لڑکوں نے توڑی تھیں۔ شمعون جس کے اصطبل کے دو گھوڑے کسی نے مار ڈالے تھے مگر اس کا دعویٰ تھا کہ یہ کام بنو اوس کا ہے۔ حرب جس کے باپ اور چچا کو بنو اوس نے لڑائی کے دوران قتل کیا تھا اور اس کے خیال میں ان کی قبریں جب تک تاریک رہتیں جب تک وہ اپنے ہاتھ سے ان کے قاتلوں کو موت کے گھاٹ نہ اتار دیتا۔ اور عقبہ کو بلانے کے لیے یہودی سردار نے اپنے بیٹے کعب بن اشرف کو بھیجا تھا جو ابھی تک واپس نہ آیا تھا۔ ایسے کام کے لیے وہ غلاموں پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ کافی دیر بعد کعب بن اشرف آیا اور یہودی سردار سے بولا:

"بابا جان: عقبہ یہ قبیلہ چھوڑ کر جا چکا ہے۔"

سب نے حیرانی سے دیکھا۔ بنو خزرج کو بھی یہ علم نہ تھا کہ عقبہ اچانک کہاں چلا گیا۔

بنو اوس نے بڑی نفرت سے بنو خزرج کو دیکھا جن کا آدمی قتل کر کے بھاگ گیا۔ جبکہ جرم کر کے بھاگنا ان کا شیوہ نہ تھا۔ یہودی سردار نے بنو خزرج کے مردوں کو دیکھا:

"کیا آپ لوگ جانتے ہیں کہ عقبہ کہاں گیا ہے؟"

"ہم اس کی روانگی سے قطعی لاعلم ہیں۔" شمعون نے کہا۔

"ایک بار وہ کہہ رہا تھا کہ میں یثرب چلا جاؤں گا۔" ہلبل نے کہا۔

"کیوں؟" اشرف نے پوچھا۔

"اگر وہ یثرب گیا ہے تو چند دن تک لوٹ آئے گا۔" حرب نے کہا۔

"نہیں وہ کبھی نہیں آئے گا۔" نعمان نے طنز کیا۔ "وہ گھر بیچ کر بھاگا ہے۔"

بنو خزرج کے لوگ خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ مگر اسی وقت یہودی سردار بولا:

"تمھیں کس نے کہا کہ وہ قبیلہ چھوڑ کر گیا ہے۔"

"مجھے کئی تاجروں نے کہا ہے کہ وہ واقعی مکان بیچ چکا ہے

اور اب وہ خود بھی جا چکا ہے۔"

تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔ بنو اوس کے مردوں کے لبوں پر طنزیہ تبسم تھا اور بنو خزرج خفیف ہو رہے تھے۔ پھر کعب بن اشرف بولا:
"ہمیں اپنا کام کرنا چاہیے۔ ایک آدمی کے نہ آنے سے یہ محفل برخاست تو نہیں ہونی۔"

"ہاں!" بوڑھے یہودی نے گلا صاف کیا: "عتبہ کے علاوہ سب موجود ہیں۔ اب میں اصل مطلب کی طرف آتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ سب تدبر سے کام لیں گے۔"

سب گوش برآواز تھے۔ وہ بولا:
"سب سے پہلے میں جاننا چاہوں گا کہ امن کے زمانے میں یہ جھگڑا کیوں ہوا؟"

چند لمحے خاموشی رہی، پھر عباد کا غلام سالم بولا:
"جناب اس حادثہ میں میرے مالک کا کوئی قصور نہ تھا۔ بلکہ عتبہ نے اچانک ہم پر حملہ کیا تھا۔"

"یہ غلط ہے۔" لعل جس کا رشتہ دار عتبہ کے ساتھ حملہ آور ہوئے تھے بولا۔ "عتبہ نے بلاوجہ حملہ نہیں کیا بلکہ دمشق جانے سے قبل عباد نے عتبہ کو دھمکی دی تھی کہ واپس آ کر اس کے دانت کھٹے کر دے گا۔ اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اب کی مرتبہ کھلے میدان میں جنگ ہو گی۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ عباد نے دھمکی دی تھی۔" نعمان نے کہا: "مگر اسے سرِ راہ گھیر کر قتل کرنے کی ذمے داری صرف عتبہ پر عائد ہوتی ہے۔"

"یہاں آپ لوگ جھگڑنے کے لیے جمع نہیں ہوئے۔" بوڑھے سردار نے کہا۔ "بلکہ میں چاہتا ہوں کہ آپ سب باہمی تصفیہ کر لیں۔ اوس اور خزرج لڑ لڑ کر تھک چکے ہیں ....."

"اس تصفیے کے یہ معنی تو نہیں کہ ہم مقتولوں کے انتقام سے دستبردار ہو جائیں۔" نعمان نے کہا۔

بنو اوس کے سب افراد نے اسے ستائش بھرے انداز میں دیکھا اور یہودی سردار نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے معنی خیز انداز میں اپنے بیٹے کعب کو دیکھا۔ اسی وقت عوف بولا:
"یہ صرف ایک گھرانے کا معاملہ تو نہیں کہ تصفیہ کر دیا جائے۔ بلکہ بنو اوس کا ہر گھر بنو خزرج کے ہاتھوں چوٹ کھائے ہوئے ہے۔ یہ لوگ شرپسند ہیں۔ رات کی تاریکی میں انھوں نے میرے گھر کو آگ لگا دی۔"

"شرپسند تو آپ لوگ ہیں۔" شمعون نے غصے سے کہا: "جو انسانوں سے لڑتے لڑتے جانوروں پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگے۔ پچھلے دنوں میرے اصطبل کے دو گھوڑے مردہ پائے گئے۔"

"ہم دیوتا کی قسم کھاتے ہیں کہ ہم نے یہ قبیح حرکت نہیں کی۔" عتبہ بولا۔ "گھوڑے کو قتل کرنا انسانیت سے گرنا ہے۔"

"پھر یہ ذلیل حرکت کس نے کی؟" شمعون غصے سے بولا۔ مگر کسی کے بولنے سے قبل اشرف بولا:

"آپ سب معاملے کی بات سے ہٹ رہے ہیں۔ میں نے تصفیہ کی تجویز صرف اس لیے پیش کی ہے کہ بیشمار گھر تباہ ہو گئے ہیں۔ آپ سب کی کیا رائے ہے؟"

"میں اپنے رشتہ داروں کا انتقام لیے بغیر نہیں رہوں گا۔" لعل نے کہا۔ "عباد اور عتبہ کی لڑائی میں میرے خاندان کے تین آدمی مارے گئے۔"

"تصفیہ کے لیے ہم بھی تیار نہیں ہیں۔" عوف نے کہا: "ان حالات میں جبکہ بنو خزرج کے ہاتھوں ہم بار بار ان کی شرارت کا شکار ہو رہے ہیں، صلح کرنا ہماری توہین ہے۔"

بوڑھا یہودی دھیرے سے مسکرایا اور بولا:
"میں نے سنا ہے کہ عباد کی بیٹی نے مناۃ کی قسم کھائی ہے کہ وہ اپنے باپ کا بدلہ لے گی؟"

بنو خزرج نے بڑی نفرت سے بنو اوس کو دیکھا۔ عورتوں سے مقابلہ کرنا ان کی توہین تھی۔

"جناب! میرے مالک کی لڑکی بہت چھوٹی ہے۔ اس نے تو جذبات میں آ کر یہ بات کہی۔ مگر ان کا انتقام لینا میرا فرض ہے۔ میں ان کا زر خرید غلام ہوں۔" سالم نے کہا۔

بنو خزرج نے اسے نفرت سے دیکھا، پھر حبیب بولا:
"اگر تم یہودی سردار کے گھر پر نہ ہوتے تو میں تمھارے دانت توڑ دیتا، بڈھے۔"

"آپ لوگ جھگڑا نہ کریں۔" کعب بن اشرف بولا۔ پھر وہ اپنے باپ

سے مخاطب ہوا۔

"بابا جان! ہم کسی کو بے بس کر کے دشمن سے صلح پر مجبور نہیں کر سکتے۔"

"ٹھیک ہے۔" بوڑھا یہودی بولا۔ "میں نے صرف ان کی خیر خواہی چاہی تھی۔"

اس کے بعد محفل برخاست ہو گئی اور بنو اوس و بنو خزرج جتنا اشتعال لے کر جمع ہوئے تھے اس سے زیادہ نفرت لے کر رخصت ہوئے وہ دونوں ایک دوسرے سے لڑنے کا عزم کر چکے تھے۔ ان کے جانے کے بعد اشرف اپنے بیٹے سے بولا:

"دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ اس طرح آتش انتقام اور بھڑک جائے گی۔"

"مجھے ڈر تھا کہ وہ لوگ مصالحت کے لیے آمادہ نہ ہو جائیں۔" کعب بن اشرف بولا۔

"نہیں۔" بوڑھے یہودی نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ "یاد رکھو! جب دو فریق مدمقابل آکر مشتعل ہو جائیں تو ان میں کبھی مصالحت نہیں ہوتی۔ اب وہ بار بار آپس میں الجھنے کی کوشش کریں گے اور اسی میں ہماری بھلائی ہے۔"

"ہاں۔" کعب بن اشرف نے کہا۔ "اگر وہ متحد ہو گئے تو سب سے پہلے ہمارے خلاف جنگ کریں گے۔"

وقت اپنے دامن میں بے شمار یادیں سمیٹتا اور گزرتا رہا۔

اوس اور خزرج چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں الجھتے رہے۔ کبھی وہ خود جھگڑتے اور کبھی یہودیوں کی شرپسندیاں انھیں ایک دوسرے کے مقابل لے آتیں۔ اگلے برس بڑا عجیب واقعہ پیش آیا۔ خزرج کے ایک نوجوان نے ان باہمی لڑائیوں کے خلاف آواز اٹھائی تو بنو خزرج نے اسے خود موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان کا خیال تھا کہ دشمن کی طرف داری کرنا یا لڑائی کے خلاف آواز اٹھانا مردانہ خصائل سے عاری کا نتیجہ ہوتا ہے اور ایسے مرد کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ پھر بنو اوس کے ایک جوان مرد نے کہا کہ واقعی ہمیں تصفیہ کر لینا چاہیے کیونکہ ہماری جنگوں سے صرف یہودیوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس بات کے تین یوم بعد اس کی لاش ایک گھاٹی سے ملی۔ اگر وہ قاتل کا سراغ لگاتے تو وہ یہودی کے غلام کے سوا کوئی نہ تھا مگر انھوں نے بنو خزرج سے ایک اور لڑائی لڑ کر انتقام کی آگ بجھائی۔ کبھی انھیں اپنی چراگاہیں اجڑی ہوئی ملتیں تو وہ دوسرے قبیلے سے الجھتے۔ کبھی ایک کا چوری کیا ہوا مال دوسرے کے گھر سے ملتا۔ تو وہ خوامخواہ لڑتے غرضیکہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنی لڑائیوں میں مصروف رہے۔

اور اس طرح چھ برس گزر گئے۔

ان دنوں امن کا زمانہ تھا۔ کچھ دنوں سے بنو اوس اور بنو خزرج پرامن زندگی گزار رہے تھے اور یہودی موقع کی تلاش میں تھے۔

شام کا وقت تھا۔ آفتاب تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں تھا۔ بنو اوس کی تین لڑکیاں ایک گھاٹی کے دامن میں تیر اندازی کی مشق کر رہی تھیں۔ یہ گھاٹی قبیلہ بنو اوس کے سامنے والے پہاڑ کے دامن میں تھی۔ دو پتھروں کے درمیان دراڑ میں تیروں کا نشانہ لگایا جا رہا تھا۔ فضا قہقہوں سے گونج رہی تھی۔ سعاد، لیلیٰ اور خنسا یہاں آکر اپنا شوق پورا کرتیں۔ پچھلے چند ماہ سے انھوں نے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ بنو اوس کا ایک منچلا شاعر منذر انھیں چھیڑتا اور ان پر شعر کستا اور یہ حرکت سعاد کو گوارہ نہ تھی۔ سعاد ان لڑکیوں میں سے تھی جس پر لڑکیاں بھی فخر کرتی تھیں۔ مگر اس نے آج تک کسی لڑکے کو منہ لگانا گوارا نہ کیا تھا۔ اس نے بچپن میں سالم سے نیزہ بازی اور شمشیر زنی سیکھی تھی اور اب وہ تیر اندازی کرتی تھی۔ لڑکیاں اس کی تقلید میں نشانے لگاتی تھیں، ورنہ پورے قبیلے میں اس جیسی لڑکی دوسری نہ تھی۔ اس کا حسن پورے قبیلے میں مشہور تھا۔ سعاد کا تیر نشانے پر لگا تھا اور وہ تالیاں پیٹ کر سہیلیوں سے اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھی اور لیلیٰ کا نشانہ مسلسل چوک رہا تھا تو وہ چڑ رہی تھی۔ جس پر خنسا اور سعاد اسے چھیڑ رہی تھیں۔ ابھی وہ ترکش میں دوسرا تیر رکھ رہی تھی کہ ایک تیر سنسناتا ہوا آیا اور اس دراڑ میں پھنس گیا۔ لیلیٰ اور خنسا چیختی چلاتی ہوئی ادھر ادھر بھاگیں اور سعاد نے تیر کے آنے کی جانب دیکھا۔ چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوا منذر ہنس رہا تھا۔ سعاد کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ لڑکوں کا مذاق اسے گوارا نہ تھا۔ باقی لڑکیاں بھاگ چکی تھیں۔ لہٰذا میدان صاف دیکھ کر منذر قریب آگیا۔

"دیکھا! نشانہ اسے کہتے ہیں۔" اس نے سعاد کو بغور دیکھا۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" اس نے بڑے غصے سے کہا۔

"میں نے سنا تھا کہ آج قبیلہ اوس کا چاند اس گھاٹی میں طلوع ہو گا۔" منذر بولا۔

سعاد غصے سے کانپ رہی تھی۔ اس کے دراز گیسو دو چوٹیوں کی شکل میں سینہ پر پڑے ہوئے تھے۔ چہرہ سرخ اور وہ اپنے یاقوتی ہونٹوں کو کاٹ رہی تھی۔ منذر نے شعر کہا:

"اے سعاد تو غصے میں اتنی حسین لگتی ہے کہ میں خود پر قابو نہیں رکھ سکتا۔"

"تم بہت بدتمیز ہو۔" وہ چلائی۔ "بگڑی ہوئی شاعری کر کے مزد پر فخر کرتے ہو۔"

منذر نے پیار سے اسے دیکھا اور دوسرا شعر پڑھا:

"اگر تو میری ہو جائے تو میں تیری شان میں اتنا طویل قصیدہ کہوں جو کسی عاشق نے نہ کہا ہو۔"

"بدتہذیب۔" سعاد نے منہ پر چانٹا مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا

مگر اس نے سعاد کی کلائی تھام لی۔ سعاد نے جھٹکا دیا مگر منذر نے گرفت اور سخت کر دی۔

"چھوڑ دو میرا ہاتھ۔" وہ بولی۔ "مجھے گھر جانا ہے۔"

"چلو میں تمہارے گھر تک چھوڑ آؤں۔" منذر نے اطمینان سے کہا

"نہیں۔" سعاد نے پھر جھٹکا دیا۔ "میں نہیں چاہتی کہ تمہارے ناپاک قدم میرے گھر تک جائیں۔" اب منذر خاموش اس کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا اور وہ پوری قوت سے ہاتھ چھڑانا چاہتی تھی۔ کئی منٹ گزر گئے سعاد کا غم و غصے سے برا حال تھا

"چھوڑ دو۔" وہ چلائی

"نہیں۔" وہ ہنسا۔ "اب یہ ہاتھ کبھی نہیں چھوٹے گا۔"

"چھوڑ دو اس کا ہاتھ۔" اک کڑک دار آواز فضا میں گونجی۔ منذر اور سعاد نے ایک ساتھ ادھر دیکھا۔ گھاٹی کے موڑ پر ایک گھوڑ سوار ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں تسخیر کر دینے کی مکمل صلاحیت رکھتی تھیں۔ روشن کشادہ پیشانی پر غصے کی شکنیں تھیں۔ مردانہ وجاہت کے ساتھ ساتھ چہرے پر ایک ایسا رعب تھا کہ منذر کی گرفت خود بخود ڈھیلی ہو گئی۔ وہ گھوڑے سے اتر کر گھاٹی میں آ گیا۔

"تم کون ہو؟" منذر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اس سے تمہیں کیا؟" وہ سنجیدگی سے بولا۔ "لیکن لڑکی کو چھیڑنے کی سزا جانتے ہو۔"

وہ مسلح تھا اور تند مزاج، اس لیے اس سے ہر قسم کی توقع کی جا سکتی تھی۔ منذر بری طرح خوفزدہ ہوا اور چپ چاپ گھاٹی سے چلا گیا۔

"آپ یہاں کر رہی تھیں؟" منذر کے جانے کے بعد اس نے سعاد کو دیکھا۔

سعاد گھبرا گئی۔ نجانے کیوں اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ جواب دینے کے بجائے اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تیر کی طرف اشارہ کیا۔ ترکش نجانے کب اس کے ہاتھ سے گر چکا تھا اور اب اس کے قدموں میں پڑا تھا۔

نوجوان نے صورتِ حال کا مشاہدہ کیا اور بولا:

"خوب۔ تو آپ اس سے شوق فرماتی ہیں۔ خیر اچھا شغل ہے۔"

اس نے جھک کر ترکش اٹھایا اسے واپس کرتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔

"لیکن پھر بھی ہو آپ جیسی لڑکیوں کو تنہا ایسی جگہ پر نہیں آنا چاہیے۔"

سعاد حیرت زدہ رہ گئی کہ اس بات کو تنبیہ سمجھے یا تعریف؟

\+ ✲ +

عکاظ کا میلا شروع ہوا تو حسبِ دستور عرب کے مختلف قبیلوں کے لوگ وہاں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ مکے سے دس کوس کے فاصلے پر یہ میلا

ایک نئے کانسٹیبل کو پولیس سب انسپکٹر نے دور ایک سرخ روشنی دکھاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو وہاں تک جہاں یہ سرخ روشنی دکھائی دے رہی ہے تم کو گشت کرنا ہے۔ یہ تمہارا علاقہ ہے۔ میں ہیڈ کوارٹر جا رہا ہوں۔ تم اپنی ڈیوٹی پر جاؤ۔" کانسٹیبل اپنا ڈنڈا ہلاتا ہوا اور سیٹی بجاتا ہوا سرخ روشنی کی جانب چل دیا۔ پورا ایک ہفتہ ہو گیا۔ وہ کانسٹیبل واپس نہیں آیا۔ سب انسپکٹر کو اس کی فکر ہوئی۔ آخر ایک دن بری بری حالت میں وہ کانسٹیبل ہیڈ کوارٹر پہنچا تو سب انسپکٹر نے پوچھا۔ "کہاں چلے گئے تھے تم؟"

کانسٹیبل بولا: "حضور نے سرخ روشنی دکھائی تھی مجھے۔"

سب انسپکٹر نے کہا۔ "ہاں پھر؟"

کانسٹیبل نے کہا: "حضور وہ ایک موٹر کی پچھلی روشنی تھی جو لاہور جا رہی تھی۔"

مرسلہ: بیگم عارف شفیق

لگا تھا۔ ایک نخلستان میں چند کنوئیں تھے جن کے گرد عرب قبائل خیمہ زن ہوتے وہ نہ صرف اپنے اہل و عیال کو بلکہ اپنے بتوں کی چھوٹی شکلیں بھی بنا کر لاتے تھے ان دنوں بھی رنگ برنگ خیموں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ بازار لگا ہوا تھا۔ سب اپنی اشیاء بغرضِ فروخت لائے تھے۔ اونٹ، گھوڑے، بکریاں، تلواریں، ڈھالیں، جانوروں کی کھالیں اور ان کے بالوں سے بنے ہوئے کمبل اور عورتوں کے سنگھار کی بے شمار اشیاء۔ آفتاب خاصا بلند ہو چکا تھا۔ اس کی تند کرنیں سیدھی ہوتے بازار پر نثار ہو کر آنکھوں میں خیرگی پیدا کر رہی تھیں۔ کسی طرف خرید و فروخت ہو رہی تھی، کسی طرف کشتی و دنگل اور کہیں کھیل کود۔ بیشتر عورتیں اپنے خیموں کے سامنے رنگین جھنڈیاں لگائے ہوئے تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ مرد بے محابا شراب پی کر یہاں آ سکتے ہیں۔ بڑے بوڑھے اپنے بتوں کے قدموں میں قربانی کرنے کی تیاری کر رہے تھے اور عفیرہ سعاد کے ساتھ دیگر عورتوں کے ہمراہ میلہ دیکھ رہی تھی۔ ایک طرف چند لڑکیاں دف بجا رہی تھیں۔ ان سے ذرا ہٹ کر چند لڑکے کشتی لڑ رہے تھے۔ عورتوں کا جمگھٹا بڑی دلچسپی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ یہاں پر عفیرہ اور سعاد بھی ٹھہر گئیں۔ ایک قوی ہیکل نوجوان یکے بعد دیگرے دو پہلوانوں کو پچھاڑ کر اب تیسرے سے مصروفِ پیکار تھا۔ سارا مجمع اس کی تعریف کر رہا تھا اور عورتیں اس کے کسرتی جسم کے لیے قصیدہ خواں تھیں۔ سعاد اس کی بہادری سے متاثر اس کا چہرہ دیکھنے کے اشتیاق میں کھڑی

تھی۔ اس کی دراز چوٹیاں سلیقے سے گندھی ہوئی سینے پر پڑی تھیں۔ نوجوان مرد دزدیدہ نگاہوں سے لسے دیکھ رہے تھے مگر اپنے حسن سے بے پروا وہ اس جوان بہادر پہلوان کو دیکھ رہی تھی۔ جس سے مقابلہ کرنے والا اب تیسرا جوان بھی بری طرح ہانپ رہا تھا۔ آخر اس نے اپنے مدمقابل کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر سر سے اونچا کر کے چکر دیا اور آہستہ سے زمین پر چھوڑ دیا۔ یہ انداز زبردست فتح کی علامت تھا۔ مجمع نے تالیاں پیٹیں تو بہادر نوجوان نے ہر طرف گھوم کر سب کا شکریہ ادا کیا۔ سعاد کی طرف رخ کرکے اس کی نظر بھی کی بھی رہ گئیں۔ ایک ساعت تک ان دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر رخ موڑ لیا۔ واپسی پر سعاد نے اپنی ماں سے پوچھا:

"اماں جان! یہ کشتی لڑنے والا جوان کون تھا؟"

زعفیرہ اپنی ساتھی عورتوں سے بولی:

"میری بیٹی سعاد معلوم کرنا چاہتی ہے کہ یہ بہادر کون تھا؟"

"اس کا ہمارے قبیلے سے کوئی تعلق نہیں۔" ایک عورت بولی۔ "میں نے سنا ہے کہ یہ کوئی تاجر ہے اور اس کا نام عمیر ہے۔"

سعاد کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میلے کے ہر ہر گوشے سے "عمیر، عمیر" کی صدائیں آ رہی تھیں۔ اس کا دل کسی بات میں بھی نہیں لگا۔ میلہ دیکھ کر واپس آتے ہوئے اس نے ارد گرد نظر ڈالی مگر وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ بنو اوس نے اپنے دیوتا کے قدموں میں اونٹ قربان کیے تھے اور مرد و زن اس کے خون کی چھینٹیں ایک دوسرے پر ڈال رہے تھے۔ کیونکہ یہ ایک متبرک کام تھا اس لیے سعاد کو بھی اس میں شریک ہونا پڑا۔ صرف اس کا دل نجانے کیوں اداس تھا۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکی کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ دوسرے دن اس نے اسے ایک نئے روپ میں دیکھا۔ وہ دوسرے نوجوانوں کے ساتھ شمشیر زنی کا مظاہرہ کر رہا تھا، آج بھی وہ سب پر غالب نظر آتا تھا۔ اسے دیکھنے کے لیے خواتین ٹوٹی پڑ رہی تھیں اور مرد کمر سے نیچے تہبند لپیٹے ان کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ مرد شراب کے نشے میں دھت چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھے۔ ایک طرف فاحشہ عورتیں کھلے عام مردوں سے بوس و کنار کر رہی تھیں اور کچھ مردوں کی دست درازیوں پر خوشی سے لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ مگر سعاد کو کسی کی پروا نہ تھی۔ ہر طرف غوغا، شور و غل، دف بجانے اور گانے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ مگر وہ سب سے بے نیاز اس بانکے کو دیکھ رہی تھی۔ شام تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ لوگ اپنی اپنی بہادری کا مظاہرہ کرتے رہے۔ حتیٰ کہ سیٹیوں اور گھڑیالوں کی آوازوں نے تمام تماشبینوں کو چونکا دیا۔ یہ عبادت کا اعلان تھا کوئی قبیلہ سیٹی بجا کر اور کوئی گھڑیال بجا کر اپنے لوگوں کو بلاتا جسے سن کر سب اپنے اپنے خیموں کے در پر اپنے دیوتا کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے۔ سعاد بھی اپنے قبیلے کے ساتھ عبادت میں مصروف ہو گئی۔ اس نے اپنے دیوتا سے سکون کی دعا کی۔ آج بنو اوس کی عورتوں نے قربانی کی تھی۔ رات گئے تک یہ سب دف بجا بجا کر ناچتی اور گاتی رہیں۔ پھر انھوں نے ایک دوسرے پر قربانی کے خون کے چھینٹے پھینکے۔ اپنے بت کے گرد چکر لگاتے اور ہر چکر کے بعد اپنے قبیلے سے وفادار رہنے کی قسمیں کھائیں اور پھر اپنی اپنی پیشانی پر خون کے ٹیکے لگاتے اور دیر تک بیٹھی گاتی رہیں۔ سعاد بھی اس عبادت میں شریک تھی مگر اس کا تصور اسے کو دور بہت دور بھٹکا رہا تھا۔ وہ چشم تصور سے عمیر کو دیکھ رہی تھی جو چند لمحوں میں اس کا سب کچھ بن گیا تھا اور اس میلے نے آتش شوق کچھ اور بھڑکا دی تھی۔ وہ اسے ہر لمحہ ایک نئے روپ میں دیکھتی۔ یہ جاننے کے باوجود بھی کہ وہ باہر سے آنے والا ایک تاجر ہے جو جلد ہی چلا جائے گا۔ وہ اس کا قرب چاہتی تھی۔

رات بیت چکی تھی، صبح ہونے کے قریب تھی۔ شب بھر عیاشی اور تفریح کرنے کے بعد عرب غفلت کی نیند سوئے ہوئے تھے۔ ابتدائی شب میں اپنے مالکوں کے مال کا پہرہ دینے والے غلام بھی اب دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکے تھے۔ قمری ماہ کی آخری تاریخیں تھیں۔ چاند جو دیر سے طلوع ہوا تھا، اب بڑی آب و تاب سے زمین کو منور کر رہا تھا۔ سعاد بے کلی قلب سے گھبرا کر اٹھی۔ خیمے کے باہر چاندنی چٹک رہی تھی اور ہر طرف سناٹا تھا۔ بنو اوس کے خیموں کے عقب میں ایک کنواں تھا جو سب سے الگ تھلگ پرسکون جگہ پر واقع تھا۔ سعاد جب بھی ہنگاموں سے گھبراتی، اسی جگہ سکون پاتی تھی۔ وہ اس وقت دل بیتاب کو بہلانے کے لیے ادھر ہی نکل آئی مگر خیموں کی قطاریں پار کرنے کے بعد وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ اس کنوئیں کی دوسری طرف منڈیر سے ٹیک لگائے ہوئے کوئی لیٹا چاند کو دیکھ رہا تھا مگر آہٹ پاتے ہی اس نے گردن موڑ کر ادھر دیکھا۔ سعاد کا دل دھڑک کر رہ گیا۔ اس کا دل چاہا بھاگ جائے مگر قدم جیسے جم گئے تھے۔ وہ آہستہ سے کھڑا ہو گیا۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے۔

"عمیر!" سعاد کی زبان سے نکلا۔ وہ چونک گیا۔

"آپ میرا نام جانتی ہیں؟" اس نے آہستہ سے کہا۔

سعاد نے اسے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اجنبی ہونے کے باوجود میں بہت کچھ جانتی ہوں مگر وہ کچھ نہ بولی۔ البتہ عمیر نے کہا:

"جس دن آپ کو گھاٹی میں دیکھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں نے عشق کی تمام منزلیں ایک ہی جست میں طے کر لیں۔ اگرچہ میں آپ کے نام تک سے ناآشنا ہوں مگر مجھے اس اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ میں آپ کو پسند کرتا ہوں۔"

سعاد کی کیفیت عجیب تھی۔ اظہار عشق کا آتا ہے صرف افسانوں میں ابھی تک عرب کی شاعری میں اس نے بے کانہ اظہار عشق پڑھا تھا مگر اب وہ

محسوس کر رہی تھی جیسے عمیر نے اس کی عزت افزائی کی ہو۔ منہ کے اظہارِ محبت پر وہ چراغ پا ہو جاتی تھی۔ لیکن اس وقت خود کو دنیا کی خوش نصیب ترین لڑکی سمجھ رہی تھی۔ وہ بولی:
"مجھے سعاد کہتے ہیں۔"
پھر وہ دیر تک باتیں کرتے رہے اور جب صبح ہونے لگی تو عمیر نے کہا:
"اب آپ کو لوٹ جانا چاہیے!"
"لوٹ جاؤں گی۔ مگر اگلی شب کے لیے وعدہ دے دیں" سعاد نے مسکرا کر کہا۔
"وعدہ" اس نے ہاتھ بڑھا کر سعاد کا ہاتھ تھام لیا۔ "کل اسی وقت!"
اگلی صبح سعاد بڑی مسرور تھی۔ عمیر کا محبت بھرا انداز اطمینان بخش تھا وہ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔ یہ تصور بڑا مسرت خیز تھا۔ اس دن وہ میلے میں خاص تیاری سے شریک ہوئی۔ اس دن شاعروں نے اپنا کلام سنایا۔ ان اشعار میں خودستائی بھی تھی اور جوانی کے قصے بھی، قبیلوں کی باہمی جنگیں بھی اور عشق و محبت کی داستانیں بھی۔ کچھ لوگوں نے خرید و فروخت کی۔ عمیر نے سعاد کے لیے بے شمار چیزیں خریدیں۔ سعاد بے حد خوش اور آنے والی شب کی منتظر تھی۔ اور جب وہ مقررہ وقت پر وہاں پہنچی تو عمیر پہلے سے اس کا منتظر تھا۔ اس نے کھڑے ہو کر دونوں بازو پھیلا دیے۔ سعاد دوڑ کر ان میں سما گئی۔
"مجھے یقین تھا آپ آچکے ہوں گے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔
"نجانے کیوں آگیا۔" عمیر کے منہ سے نکلا۔ سعاد چونک پڑی۔
"کیوں؟" اس نے عمیر کو دیکھا۔ "کیا آپ کا ارادہ نہیں تھا؟"
"ارے نہیں۔" عمیر ہنسا۔ "میں نے گزشتہ شب وعدہ کیا تھا پھر کیسے نہ آتا۔"
اس نے سعاد کو کنوئیں کی منڈیر پر بٹھا دیا، پھر وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ وہ بولا: "کل میلے کا آخری دن ہے۔ اس کے بعد؟"
"اس کے بعد کیا ہوگا؟" سعاد نے پوچھا۔
"پھر ہمیں بہت احتیاط کی ضرورت ہوگی۔" عمیر نے کہا۔
سعاد خاموش ہو گئی تھوڑے توقف کے بعد بولی: "ہم نے محبت کی ہے گناہ نہیں، پھر میں احتیاط کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔" عمیر اس جواب پر کچھ ملول ہو گیا مگر سعاد اس تغیر کو محسوس نہ کر سکی۔ بلکہ اس نے اسی شوخی بھرے انداز میں کہا:
"عمیر میں ہر ماہ چودہ تاریخ کی چاندرات کو اسی گھاٹی میں تمہارا انتظار کیا کروں گی۔ تم آؤ گے نا؟"

"سعاد" افسردہ عمیر نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ "میں تمہاری کوئی بات رد نہیں کر سکتا۔"
"کوئی بات؟" سعاد ہنسی۔ "کیا تم اتنی سچی محبت کرتے ہو؟"
"ہاں!" عمیر نے جذباتی انداز میں کہا۔ "تم آزما لو، میں کبھی امتحان میں ناکام نہیں ہو سکتا۔"
"اچھا!" سعاد بے اختیار ہنس دی۔ چند دن قبل تک وہ جس کے لیے افسردہ تھی آج وہ اس کا اپنا تھا۔ وہ مسرور تھی، خوش تھی۔
دوسرے دن میلے کے دوران ہی بنو عامر اور بنو کنانہ میں جھگڑا ہو گیا۔ بنو عامر کی ایک لڑکی کو بنو کنانہ کے لڑکے نے چھیڑا تھا جس کے انجام میں پہلے زبانی لڑائی، پھر ہاتھا پائی اور پھر تلواریں کھنچ گئیں۔ کچھ قبیلوں نے بنو عامر کا ساتھ دیا، کچھ نے بنو کنانہ کا۔ تاریخ میں یہ لڑائی جنگ فجار ثانی کہلاتی ہے۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ اس مرتبہ میلے میں بنو اوس اور بنو خزرج میں کوئی جھگڑا نہ ہوا تھا اس بات پر یہودی حیرت زدہ تھے۔ پھر دن گزرتے رہے مگر ان کے امن میں کوئی فرق نہ آیا۔ یہودیوں کے لیے بڑی تشویشناک بات تھی کہ وہ صلح ہوتے مگر ایک دوسرے کے قریب سے گزر جاتے غرضیکہ دونوں قبیلوں میں امن تھا۔ سعاد نے یہ مہینہ بڑے اطمینان سے گزارا۔ ملنے کی بیقراری کے باوجود وہ اپنی قسمت پر نازاں تھی اور چودہ تاریخ کی نصف شب کے بعد وہ دونوں گھاٹی میں بیٹھے تھے۔
سعاد بولی۔ "آپ نے بہت انتظار کرایا۔" اس کے انداز میں غصہ تھا۔
"بھئی تم کیا جانو کتنی مشکل سے آیا ہوں۔" عمیر نے کہا۔ "بہرحال اب غصہ مت کرو۔ آئندہ وقت سے پہلے ہی پہنچ جاؤں گا۔"
سعاد ہنس پڑی۔ عمیر نے شانے پکڑ کے اس کا رخ اپنی جانب کیا۔
"اب تو ناراض نہیں ہو؟"

"میں مذاق نہیں ہوں۔" وہ کچھ گھبرائے سے انداز میں بولی: "بلکہ سوچتی ہوں کہ انتظار کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے۔"

"سچ؟" عمیر مسکرایا۔ "چند دنوں کے عشق میں یہ حال ہے؟"

سعاد جھینپ کر رہ گئی۔ عمیر نے اس کی ٹھوڑی چھو کر آنکھوں میں جھانکا۔ "تیر اندازی چھوڑ دی؟"

"سب ہی کچھ چھوڑ دیا۔" سعاد مسکرائی۔

"کیوں؟" عمیر نے پوچھا۔

سعاد نے اسے دیکھا اور شرما کر اس کے سینے میں منہ چھپا لیا۔

"سعاد!" عمیر جذباتی انداز میں بولا۔ "تم تو بغیر تیر کے بھی شکار کر لیتی ہو۔" اس نے پھر سعاد کا چہرہ اونچا کیا: "ٹھیک ہے نا؟"

"واہ، کیسے؟" سعاد بولی۔

"میں اس کا زندہ ثبوت ہوں۔" عمیر نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "اس دن تم نشانہ ہی تو لگا رہی تھیں۔ اسی تیر نے تو اس جگہ کو گھائل کیا ہے۔" اس نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"اچھا چھوڑیئے۔" سعاد نے خود کو چھڑانا چاہا مگر وہ بولا۔

"پہلے ایک سوال کا جواب دو۔"

"جی، فرمایئے۔" وہ منہ پھیرے پھیرے مسکرائی۔

"ہر شکاری اپنے شکار کا کچھ نہ کچھ کرتا ہے۔ تم اپنے شکار کا کیا کرو گی؟"

"کیا مطلب؟" اس نے ایسے دیکھا جیسے سمجھی نہ ہو۔

"بھئی اپنے اس شکار کا۔" عمیر نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر وضاحت کی۔

سعاد جھینپ گئی مگر خوشی غالب تھی شرماتے ہوئے سے انداز میں بولی:۔

"زنجیروں سے باندھ کر رکھوں گی۔"

"ان زنجیروں سے۔" عمیر پیار سے اس کی چوٹیاں پکڑ کر بولا۔

سعاد پھر جھینپ گئی۔

* * *

اس سے چند دن بعد اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جب سالم نے اسے بتایا کہ عتبہ کا بیٹا اپنے قبیلے میں آیا ہوا تھا اس کے سوئے ہوئے انتقامی جذبات جاگ اٹھے اور عباد کا بدلہ لینے کو بیقرار ہو گئی۔ اس نے اپنی ماں سے وعدہ کیا کہ وہ جلد از جلد اپنے باپ کا انتقام لے گی۔ پھر اگلی ملاقات تک وہ اپنے باپ کے ہتھیار تیز کرتی رہی اور اس مرتبہ اسے بہت دیر تک عمیر کا انتظار کرنا پڑا، اتنا کہ جب وہ آیا تو وہ انتظار کر کر کے نڈھال ہو گئی تھی۔

"عمیر" وہ روہانسی ہو گئی۔ "میں یہ اذیت برداشت نہیں کر سکتی۔"

"آئندہ ایسا نہیں ہوگا سعاد۔" عمیر نے پیار سے کہا۔ "پھر صرف چند گھنٹوں کی بات ہی تو تھی۔"

"چند گھنٹے؟" سعاد نے حسرت سے کہا۔ "میں تو چند لمحے بھی دوری برداشت نہیں کر سکتی۔ جانتے ہو پورا مہینہ کیسے گزرتا ہے۔"

"اگر تم مجھے نہ پا سکیں؟" عمیر نے پوچھا۔ وہ جذباتی سا ہو گیا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" سعاد بولی۔ "مجھے اپنی محبت پر بھروسہ ہے۔"

"لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان جسے چاہتا ہے اسے پا نہیں سکتا۔" عمیر نے کہا۔

سعاد نے محسوس کیا کہ وہ بجھا اداس ہے۔ وہ بولی: "نہیں عمیر یہ ناممکن ہے۔ اگر تم میرا ساتھ نہ چھوڑو تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔"

"میں تمہارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔" عمیر نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"بس تو پھر مت گھبراؤ۔" سعاد بولی۔ "مجھے یقین ہے کہ میری ماں ہماری شادی کی مخالفت نہیں کرے گی۔ ہم شادی کریں گے اور میں تادمِ آخر تمہارا ساتھ نبھاؤں گی۔"

عمیر مسکرا دیا۔

"لیکن عمیر شادی سے قبل مجھے اپنے باپ کے دشمن سے انتقام لینا ہے۔ تم دعا کرو کہ میں اس مقصد میں کامیاب رہوں۔"

"کون دشمن؟" عمیر نے دھڑکتے دل سے استفسار کیا۔

"قبیلہ بنو خزرج کے عتبہ اور اس کی اولاد سے، جنھوں نے میرے باپ کو قتل کیا۔" سعاد نے جواب دیا۔ عزم کی پختگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

* * *

وہ رات بہت ڈراؤنی اور تاریک تھی۔ سعاد نے اپنے باپ عباد کی قبر پہ جا کر کہا: "بابا جان! میرا عہد پورا ہونے کا وقت قریب آچکا ہے میں آج تمہارا انتقام لے کر آؤں گی۔" پھر وہ قبیلے والوں سے کہا: "تم گواہ رہنا میں اپنا عہد پورا کر رہی ہوں۔"

اس کے بعد اس نے مناقے دعا کی۔ "اے مقدس دیوتا میری مدد کر اور مجھے سرخرو کر۔" پھر وہ اپنے مشن پر سالم اور خزاوس کے چند جوانوں کے ساتھ روانہ ہو گئی۔ مگر نجانے کیوں اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ اسے اپنے دل کی دھڑکن خود سنائی دے رہی تھی اور انتقام کی وہ خوشی جس کی آرزو میں اس نے پورا بچپن گزارا تھا نجانے

کمال مفقود تھی۔

عقب کے گھر کا دروازہ آغوشِ محبوب کی مانند کھلا ہوا تھا جیسے کسی کا منتظر ہو۔ سعاد نے اپنے ساتھیوں کو مکان سے باہر ٹھہرنے اور محتاط رہنے کی ہدایت کی اور گھر میں داخل ہو گئی۔ مگر کمرے میں پہنچتے ہی مشعل کی روشنی میں سعاد نے جو کچھ دیکھا وہ اسے ساکت کر دینے کے لیے کافی تھا۔

"عمیر۔" اس کے لبوں سے بس یہی نکل سکا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی اور دکھ کے سائے تھے۔ عمیر کچھ نہ بولا۔ پہلے چپ چاپ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ اور پھر پُر امید لہجے میں بولا۔

"سعاد کیا تم اب بھی مجھ سے محبت کرتی ہو؟"

"ہاں! محبت کبھی نہیں مرتی۔" اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ اس کا خنجر والا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ "مگر ایک بیٹی اپنے باپ کے دشمن سے معانقہ نہیں کر سکتی۔ تم میرے محبوب بعد میں، پہلے باپ کے قاتل ہو جس کا انتقام لینا میرا فرض ہے۔ اگر آج میرے فرض پر محبت غالب آگئی تو رہتی دنیا تک لوگ کہیں گے کہ بیٹی شکست اور پستی کی علامت ہوتی ہے اور میں یہ ذلت کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔"

اس نے پُرعزم انداز سے چہرے پر سختی لیے ہوئے خنجر والا ہاتھ اٹھا کر عمیر پر وار کیا جو عمیر نے نہیں روکا۔ بلکہ اس کے لبوں پر افسردہ تبسم تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ گر چکا تھا۔

"سعاد! میں جانتا تھا کہ آج تم اس روپ میں آؤ گی۔" وہ کراہا۔ "مگر میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہارا ساتھ کبھی نہ چھوڑوں گا۔ میں چاہتا تو اپنے دشمن کا مقابلہ کر سکتا تھا مگر تم جیسے دشمن کو کیسے مایوس کر سکتا ہوں۔"

اس کے لب ہلے اور پھر ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔

"عمیر!" سعاد گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ اُسے محسوس ہوا ہر طرف تاریکی پھیل رہی ہے اور پھر خنجر اس کے ہاتھ سے گر گیا۔

اور دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ سعاد مر کیسے گئی جب کہ اس کے جسم پر کوئی زخم تک نہ تھا۔

# ہار

اندھیرے کمرے میں بھی میں نے صرف لمس سے اس ہار کو پہچان لیا۔ اس کو چھوتے ہی میرے جذبات پر جیسے برف سی جم گئی۔ گلابی رنگ کا ہشت پہلو پتھر سونے کی چھوٹے چھوٹے حلقوں والی زنجیر میں لٹکا ہوا روحی کے سینے پر پڑا تھا۔ میں نے روحی کے ادھ کھلے سینے پر سے ہاتھ ہٹا لیا اور خاموشی سے بے حرکت لیٹا سوچنے لگا کہ میں جاوید کی یاد کو روحی کے دل سے شاید کبھی نہ نکال سکوں گا۔ میری محبت میری وفا میری ساری کتنی ہی بڑھ جائے، روحی کے ذہن کے کینوس سے جاوید کی تصویر نہ مٹا سکے گی۔

جاوید روحی کے رشتے کا بھائی تھا۔ جب روحی کی مجھ سے شادی نہیں ہوئی تھی تو وہ روحی کو اپنا جیون ساتھی بنانے کی کوشش بھی کرتا رہا تھا۔ لیکن انجینئرنگ کا کورس مکمل کرنے کے باوجود سال بھر تک بے روزگار رہنے کی وجہ سے روحی کے ماں باپ نے اس کے مقابلے میں صرف پانچ سو روپیہ مہینہ کمانے والے کالج کے لیکچرار کو ترجیح دی اور اس طرح یہ بے حد حسین اور بے حد باوفا لڑکی میری شریک زندگی بن گئی۔ اس نے جس طرح کے

اپنے تصوّرات کی دنیا کو آباد رکھنے کے لیے وہ اکثر رات کو اس گلابی
رنگ کے ہشت پہلو پتھر والے لاکٹ کو پہن کر بستر پر لیٹ جاتی اور انگریزی
نظموں کی اس کتاب کو دیر تک پڑھتی رہتی۔ پڑھتے پڑھتے وہ کتاب کو سرہانے
رکھ کر آنکھیں موند لیتی۔ اس وقت میں کڑھ کر سوچتا وہ میرا انتظار کر رہی ہے
یا جاوید کا۔ میں جب بھی اس ہار کو دیکھ لیتا روحی کے قریب جانے سے گریز کرتا
وہ خود تو کبھی پیش قدمی کرتی ہی نہ تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ پہلے سے مجھے
علم نہ ہوتا اور بعد کو جب کبھی اس ہار پر نظر پڑتی یا ہاتھ لگتا تو اس کے مَس
سے ہی میرے جذبات سرد پڑ جاتے۔
روحی سے شادی کے بعد یوں تو میری بھی بہت سی جذباتی خواہشیں
اور اُمیدیں پوری نہیں ہوئی تھیں لیکن ان میں سے ایک دلچسپ خواہش
جو اکثر سر اُٹھاتی رہتی تھی یہ تھی کہ روحی مجھے خود پیار کرے۔ میں نے اس سے
کئی بار اپنی زبان سے بھی کہا: "روحی مجھے پیار کرو۔ روحی مجھے پیار کرو۔"
مگر وہ شرم کا بہانہ کر کے ٹال جاتی۔ میرے دل کی کسک اور بڑھ جاتی۔ میں
سوچتا کہ وہ مجھ سے دلی محبت بالکل نہیں کرتی مگر میں اپنے دل کو کیا کرتا؟
اس کی سرد مہری کے باوجود مجھے اس سے عشق تھا۔ روحی کو نہ اس بات کا احساس
تھا نہ علم کہ میں اس کے اور جاوید کے بارے میں کیا کیا جان گیا ہوں اور اس
سلسلے میں میرے احساسات کیا ہیں۔
اُس رات اس لاکٹ کو چھونے کے بعد میں اندھیرے میں آنکھیں
پھاڑے دیر تک نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ میرے ذہن میں تیز آندھی سی چل
رہی تھی۔ جب وہ آندھی رکی اور گرد تھمی تو شعور کی سطح پر ایک ہی بات تھی۔
مجھے اس ہار کو اور اس نظموں کی کتاب کو غائب کرنا ہے۔ یہ دونوں چیزیں
ہماری محبت کے درمیان دیوار ہیں۔ جب تک ان کو نہ برباد کروں گا روحی
کے ذہن سے اس پرانی محبت کی یاد نہ مٹا سکوں گا اور اس کو کبھی مکمل طور سے
اپنا نہ بنا سکوں گا۔ میں دیر تک ایک ایسے پلاٹ پر غور کرتا رہا جس میں یہ دونوں
چیزیں فطری انداز میں غائب بھی ہو جائیں اور روحی کو مجھ پر شک بھی نہ ہو سکے۔

٭

اُن دنوں گھر میں چوہے بہت ہو گئے تھے۔ ایک دن جب روحی کہیں
گئی ہوئی تھی، میں نے جال لگا کر ایک موٹا سا چوہا پکڑا۔ اس کے بعد بلیڈ کی
مدد سے انگریزی نظموں کی کتاب کے بے شمار چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیئے۔
پھر ان پرزوں کو اسی بکس میں رکھا اور چوہے کو بھی جال کھول کر بکس میں ڈال دیا۔
اس کے بعد میں نے بکس بند کر دیا۔ دو ایک دن بعد رات کے وقت جب روحی
نے اپنا بکس کھولا تو قیدی چوہا اچھل کر اس کی گود میں گرا۔ ایک چیخ اس نے
چوہے سے گھبرا کر اور دوسری اپنے محبوب کی نظموں کی کتاب پرزے پرزے
دیکھ کر ماری۔ کئی دن وہ کھوئی کھوئی سی رہی۔ میں نے اس کو ساتھ کی تسلیاں"

شوہر کے بارے میں سپنے سجا رکھے تھے، میں اس سے کافی مختلف تھا۔
رُوحی کے سپنوں میں ایک لمبے قد اور لمبی قلموں والا بیل باٹم پہنے ہوئے
فریم کے رنگین گاگلز لگائے فلمی ہیرو کے انداز میں چلنے اور سیٹی پر فلمی دھن
بجانے والا لڑکا سمایا ہوا تھا اور ان میں سے زیادہ تر باتیں جاوید میں
موجود تھیں۔ روحی ایک ایسے شوہر کے خواب دیکھ رہی تھی جس کے پاس
اپنی کار ہو گی یا کم از کم سرکاری جیپ میں تو سیر کرا ہی دے گا۔ ٹیلیویژن
ریکسی اور ٹیپ ریکارڈر وغیرہ تو گھر میں پہلے سے ہی موجود ہوں گے یا
شادی کے ایک مہینے کے اندر خرید لیے جائیں گے۔ مزے کی بات یہ ہے
کہ اس کو ان سب چیزوں کا شوق، خواہش اور اُمید اس وقت تھی جب
وہ خود ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور اس کے والدین اپنی اوسط
آمدنی اور چار لڑکیوں کی شادی کی فکر کے باعث کچھ زیادہ جہیز بھی نہیں
دے سکے تھے۔

مجھ سے شادی ہوتے ہی اس کے سپنے بکھر گئے۔ اس نے ایک
چھوٹے قد کے موٹے شیشوں والا نظر کا چشمہ لگائے ڈھیلے ڈھالے آدمی کو
اپنا شوہر پایا جس کی قلمیں لمبی نہیں تھیں جو کبھی بیل باٹم نہیں پہنتا تھا کبھی
کوئی فلمی گیت نہیں گنگناتا تھا، اور جو اپنے بوڑھے والدین اور چھوٹے بھائی
بہنوں کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ریکسی، ریفریجریٹر اور ٹیلیویژن خریدنے
کی سکت تو دور کنار اُمید بھی نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ روحی نے مایوس ہو کر اپنی
اُمیدوں اور خواہشوں کو تھپک تھپک کر سلا دیا اور اس بکس کو کھولنے بیٹھ گئی
جس میں جاوید کے دیئے ہوئے تحفے بند تھے۔

جاوید ہماری شادی سے کچھ عرصے پہلے ہی انگلینڈ چلا گیا تھا جہاں
اُسے کوئی نوکری مل گئی تھی۔ رُوحی کے والدین اپنی چہیتی بیٹی کو وطن سے دور
نہیں بھیجنا چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے جاوید کی اس نوکری کے بعد بھی اس
کے رشتے پر غور نہ کیا۔ روحی نے بھی عام مشرقی لڑکیوں کی طرح جہاں
والدین نے چاہا وہیں شادی کرنا منظور کر لیا۔ ہماری شادی کے موقع پر جاوید
بھی آیا اور اس نے رُوحی کو کئی تحفے دیئے۔ جاوید کے دیئے ہوئے تحفوں میں
یہ لاکٹ بھی تھا جو اس نے لندن کے کسی بازار سے خریدا تھا۔ اس کے علاوہ
ایک انگریزی کتاب تھی جس میں رومانی نظمیں تھیں۔ ان تحفوں کے بارے میں
روحی نے خود ہی بڑی معصومیت سے مجھے بتایا تھا۔ جاوید اور روحی کے
درمیان کسی جذباتی رشتے کا علم مجھے خود روحی کی باتوں سے ہوا۔ وہ اکثر بڑی
سادگی سے اپنے جاوید بھائی کا بڑے پیار بھرے انداز میں ذکر کرتی تھی اور
اکثر مواقع پر اس کی مثال دیتی تھی۔ میرے مشوروں اور خیالات سے بھی روحی
متفق نہیں تھی۔ میرے ساتھ کی زندگی کو تو اس نے بڑی مجبوری اور بے دلی
کے عالم میں قبول کیا تھا۔

اور آؤ کہ کوئی خواب نہیں "لا کر دیں مگر اس نے کبھی رات کو سونے سے پہلے یہ کتابیں اس شوق سے نہ پڑھیں۔

گرمیوں کی چھٹی میں تفریح کے لیے ہم لوگ نینی تال گئے۔ واپسی پر میں نے بریلی میں گاڑی بدلنے کی جلدی میں جان بوجھ کر وہ بکس کاٹھ گودام والی ٹرین میں ہی چھوڑ دیا جس میں جاوید کا دیا ہوا لاکٹ رکھا تھا۔ اس لاکٹ کے ساتھ بہت سے کپڑے اور سامان بھی گیا۔ لیکن میرے لیے اس وقت اتنے نقصان میں بھی فائدہ ہی تھا۔ گھر پہنچنے پر جب روحی کو بکس اور بکس کے ساتھ لاکٹ کھونے کا علم ہوا تو اس کے آنسو نکل پڑے۔

چند دن بعد میں نے اس کو خوش کرنے کے لیے سونے کا ایک قیمتی ہار اپنی بڑی مشکل سے جمع کی ہوئی پونجی سے خرید کر دیا۔ ہار پاکر روحی خوش تو ہوئی لیکن اس ہار کو وہ درجہ کبھی نصیب نہ ہوا جو جاوید کے دیئے ہوئے لاکٹ کو حاصل تھا۔ اس ہار کو پہن کر اور آنکھیں موند کر وہ کبھی میرے سینے سے آکر نہ لگی۔

٭

دن گزرتے گئے۔ مجھے اب سکون تھا۔ رات کو روحی کے ساتھ لیٹتے ہوئے مجھے اپنے ڈبل بیڈ پر کہیں وہ منحوس نظموں کی کتاب نظر نہ آتی تھی اور نہ رات گئے میری انگلیاں کسی لاکٹ کے ٹھنڈے سخت پتھر یا زنجیر سے ٹکراتی تھیں۔ اب مجھے کوئی ایسی بات بھی نظر نہ آتی تھی جس سے روحی کے دل میں جاوید کی یاد کی موجودگی کا احساس ہو۔ میں سمجھتا رہا وہ اپنی پرانی محبت کو بھولتی جا رہی ہے یا بھول گئی ہے۔

جب روحی نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ وہ ماں بننے والی ہے تو مجھے مزید خوشی اس خیال سے بھی ہوئی کہ اولاد ہونے کے بعد تو روحی اور بھی میری اپنی ہو جائے گی۔ اپنے بچے کو پاکر وہ اپنے ماضی کے دھندلکے میں چھپے ہوئے سایوں کو اور بھی فراموش کر دے گی۔

روحی کے ماں بننے کے دن قریب آئے تو مجھے پریکٹیکل امتحانات کی نگرانی کے سلسلے میں باہر جانا پڑا۔ میری واپسی سے چند دن پہلے روحی ایک لڑکے کی ماں بن چکی تھی۔ اکیلے میں جب میں نے اس کو لڑکا ہونے پر مبارکباد دی اور خوشی کا اظہار کیا تو اس نے اُمید، شوق اور بے تابی کے ساتھ مجھ سے پوچھا :- "اس کا نام کیا رکھیں گے؟"

جلدی میں میری سمجھ میں کوئی بھی نام نہ آیا تو میں نے اس سے کہہ دیا کہ "کوئی بھی اچھا سا نام رکھ لیں گے۔ تم ہی بتاؤ کوئی نام؟"

"دیکھئے، جاوید بھی اچھا نام ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

میرے سر پر جیسے بم سا پھٹا اور میں بالکل گم صُم رہ گیا۔ اس نے پھر پوچھا: "ٹھیک ہے نا؟"

مجھے نہیں معلوم میں نے کس طرح بے خیالی میں کہہ دیا: "ہاں ٹھیک ہے۔"

اور پھر ایک بہت ہی عجیب بات ہوئی۔ روحی تھوڑا سا اوپر کو اٹھی اور اس نے ہماری شادی شدہ زندگی میں پہلی بار، مجھے پیار کر لیا۔

مجھے معلوم نہیں یہ میری ہار تھی یا جیت؟ ■

غزل

احمد فراز

نامرادی کا یہ عالم بھی تو اے دل نہ رہے
ہم تو اب ترکِ تعلق کے بھی قابل نہ رہے

بزمِ مقتل جو سجے کل تو یہ امکان بھی ہے
ہم سے بسمل تو رہیں آپ سا قاتل نہ رہے

یوں تو ہر شخص ہے اندیشۂ رہزن کا اسیر
کاروانِ نیتِ رہبر سے بھی غافل نہ رہے

آج اس نے شرفِ ہمسفری بخشا تھا
اس طرح سے کہ مجھے خواہشِ منزل نہ رہے

سامنے تو ہو تو سو خواہشیں جاگ اٹھتی ہیں
کاش اب کے میری آنکھوں میں مرا دل نہ رہے

جو بھی ہو صاحبِ محفل وہی کہتا ہے فراز
کہ وہ اٹھ جائے تو محفل سے تو محفل نہ رہے

احمد فراز

نامرادی کا یہ عالم بھی تو اے دل نہ رہے
ہم تو اب ترکِ تعلق کے بھی قابل نہ رہے

بزمِ مقتل جو سجے کل تو یہ امکان بھی ہے
ہم سے بسمل تو رہیں آپ سا قاتل نہ رہے

یوں تو ہر شخص ہے اندیشۂ رہزن کا اسیر
کاروان نیتِ رہبر سے بھی غافل نہ رہے

آج اس نے شرفِ ہمسفری بخشا تھا
اس طرح سے کہ مجھے خواہشِ منزل نہ رہے

سامنے تو ہو تو سو خواہشیں جاگ اٹھتی ہیں
کاش اب کے میری آنکھوں میں مرا دل نہ رہے

جو بھی ہو صاحبِ محفل وہی کہتا ہے فراز
کہ وہ اٹھ جائے جو محفل سے تو محفل نہ رہے

ایسی گفتگو شروع کر دی جس سے سراسر جنسی تحریک ہوتی تھی۔ وہ اپنے ہونٹ میرے رخسار سے لگاتے ہوئے بولی: "پہلی بار جب مجھے ایک مرد نے اسطرح پڑا اس وقت میں چودہ سال کی تھی۔ میں بچی نہیں تھی جوان ہو چکی تھی۔ وہ دوپہر کا وقت تھا خاصی گرمی تھی۔ میں ایک باریک لباس پہنے رہائشی حصے سے دور ایک بیرونی کمرے میں سو رہی تھی۔ سوتے سوتے اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی میرے زیریں لباس کو چھیڑ رہا ہے۔ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سر اُٹھا کر دیکھا ایک تنومند مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ میں نے چیخنا چاہا۔ اس نے ایک ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا پھر اس کے بعد جیب سے رومال نکال کر میرے منہ میں ٹھونس دیا۔ میں نے ہاتھ پاؤں پھینکنے کی جدوجہد کی مگر شاید اسے معلوم تھا کہ عورت ذات کو کس طرح رام کیا جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد اس نے میرے منہ سے رومال نکال لیا۔ میں چاہتی تو اب چیخ سکتی تھی مگر میں نہیں چیخی۔ میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ مجھے وہ سب بڑا اچھا لگ رہا تھا۔" ثریا کا ہاتھ پھسل کر ناف تک آگیا اور پھر اس کے بعد اور نیچے۔ وہ مجھ سے تقریباً چپک گئی۔ اس نے اپنی سفید اور گداز رانوں سے مجھے جکڑ لیا۔ میں نے خود کو جمع کیا اور اس سے دور ہٹتے ہوئے بولی:

"ثریا یہ کیا کر رہی ہو۔ تم دوسری شخصیت کی مالک ہو۔ اس وقت تو تم ایک مرد نظر آ رہی ہو۔"

ثریا ہنسنے لگی۔ ہنستے ہوئے بولی: "مگر تم نے ثابت نہیں کرنے دیا۔"

میں نے ثریا کے رخسار کو بوسہ دیا اور تکیے کے نیچے فرش پر آگئی۔

پھر آرام سے لیٹتے ہوئے بولی: "ثریا جان! میں تم پر قربان! آج تم مرد نظر آ رہی ہو اور تم جانتی ہو کہ میں مردوں سے کس قدر ڈرتی ہوں۔ اس لیے آج تم تنہا سوؤ۔ کل جب تم دوبارہ عورت بن جاؤ گی تو میں بے خوف و خطر تمہارے ساتھ سوؤں گی۔"

ہم دونوں ہی ہنس پڑے۔ میرے نزدیک یہ سب کچھ ایک مذاق سے زیادہ نہیں تھا۔ مگر ثریا کے لیے آئندہ منصوبوں کا ایک حصہ تھا۔ وہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ مجھے ٹٹول رہی تھی اور میرے گرد ایک مضبوط جال بُننے کے لیے کوشاں تھی۔

صبح ثریا کام پر چلی گئی اور میں حسب معمول گھر کے کام کاج میں لگ گئی۔ مگر جانے کیوں اب میرا دل گھر کے کام میں نہیں لگتا تھا۔ وہ اپنائیت جو اس گھر سے پیدا ہو چلی تھی اب ختم ہوتی جا رہی تھی۔ تبدیلیاں بھی تو کتنی آئی تھیں۔ پرویز اب میرا محسن نہیں رہا تھا محبوب بن گیا تھا اور ثریا نے دوستی کی جگہ رقابت سنبھال لی تھی۔ جانے مجھے کب اس گھر سے نکلنا پڑے۔ مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ مجھے برسرِ روزگار ہونا چاہیے تھا۔ اگر یہاں سے نکلنا ہو گیا تو میں کہاں جاؤں گی کہاں سر چھپاؤں گی۔ مجبوری تو نہیں تھا کہ مجھے قدم

قدم پر ماتم کرتے رہیں پھر مجھے اچانک پرویز کا خیال آگیا۔ اگر وہ ڈرامہ نہیں تو اچھا آدمی ہے۔ یقیناً وہ مجھے سہارا دے گا۔ اور اس کی پیشکش پہلے ہی کر چکا ہے۔

میں گھر کے کام میں اتنی ہی دلچسپی لے رہی تھی جس قدر کہ ایک ملازمہ کر سکتی ہے۔ اور ظاہر ہے ثریا نے مجھے اس سے آگے کا درجہ ہی کب دیا تھا یہ روٹی کپڑے پر ملازمت ہی تھی۔ اور اب رقابت کا ایک نیا شاخسانہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایک چھت کے نیچے دو رقیب کیسے رہ سکتے ہیں۔ ایک کو تو آؤٹ ہونا ہی تھا۔ اور ثریا اس قدر جلد ہتھیار ڈالنے والی عورت نہیں تھی چنانچہ مجھے اپنے لیے بہت کچھ سوچنے کی ضرورت تھی۔

میں باورچی خانے میں مصروف تھی کہ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے باہر کوئی گھنٹی بجا رہا ہے۔ یہ کسی کے آنے کا وقت نہیں تھا۔ یقیناً یہ میرا واہمہ تھا۔ گھنٹی ایک بار پھر بجی۔ پھر ایک بار اور۔ یقیناً کوئی بیرونی دروازے پر تھا۔ میرے کان نہیں بج رہے تھے۔ ممکن ہے پرویز ہی آگیا ہو کیونکہ اب وہ اکثر مجھ سے ملنے کے لیے آنے لگا تھا۔ میں باورچی خانے سے باہر آگئی تاکہ جا کر بیرونی دروازہ کھولوں پھر میں اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔ سامنے ہال میں بیٹرن کھڑا ہوا تھا۔ وہ مکان میں کیسے داخل ہو گیا۔ ابھی تو اس نے گھنٹی بجائی تھی۔ یقیناً اس کے پاس فاضل چابی ہو گی۔ گھنٹی بجانے کے بعد جب اس نے دیکھا ہو گا کہ دروازہ نہیں کھولا جا رہا تو وہ چابی استعمال کر کے اندر آگیا ہو گا۔ مگر یہ چابی اسے ملی کہاں سے، کیا خود ثریا نے اسے یہ چابی دی ہے۔ مگر چابی ہونے کے باوجود بیٹرن کو اس طرح اندر نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ میں گھر پر تنہا ہوں وہ گھر میں چوروں کی مانند گھس آیا تھا۔ میں نے ناگواری سے بیٹرن کی طرف دیکھا۔ وہ اسپورٹ کوٹ پہنے ہوئے تھا اور جب اس نے میری طرف دیکھا تو اس کے لبوں پر بڑی گندی مسکراہٹ تھی۔

"سلام عرض کرتا ہوں بیلی خانم!" وہ بڑے بیہودہ انداز میں جھکتے ہوئے بولا۔ "امید ہے کہ آپ کے احوال ٹھیک ہوں گے۔"

میں نے اس کے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا ثریا بھی تمہارے ساتھ آئی ہے۔ وہ کہاں ہے نظر نہیں آ رہی۔"

وہ ہاتھ میں دبے ہوئے پیکٹ کو سنبھالتے ہوئے بولا: "نہیں ڈارلنگ میں تنہا ہی آیا ہوں۔"

"کیا! اکیلے آئے ہو۔ کیوں؟ آخر تمہارا یہاں کیا کام؟" بوکھلاہٹ، گھبراہٹ اور دہشت میں میں نے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

وہ ساتھ لایا ہوا پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا: "میرا ایک دوست کہیں سے اناناس لایا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ثریا اناناس بہت پسند کرتی ہے۔ خاص طور پر اس کا شربت اسے بہت پسند ہے۔ چنانچہ میں نے

انناس کے تین ٹکڑے کر دیئے۔ ایک اپنے لیے رکھ لیا اور دوسرا مجھ کو تھما دیا۔ تیسرا ثریلا کے لیے لیے ہوئے چلا آیا۔ "میز پر تک رکھ دیتا تو خراب ہو جاتا ۔۔۔" وہ خاموش ہو گیا پھر غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "سمجھ میں نہیں آتا آخر تم مجھ سے خوفزدہ کیوں ہو۔"

اصل معاملہ میری سمجھ میں آ گیا تھا۔ ثریلا نے بڑی فن کاری اور مہارت سے یہ منصوبہ تیار کیا تھا۔ بیٹرن کو یہاں بھیجنے سے اس کے دو مقاصد پورے ہوتے تھے۔ ایک تو یہ کہ یہ معلوم ہو جاتا کہ ثریلا کی غیر موجودگی میں یہاں کوئی دوسرا تو موجود نہیں ہے۔ اگر موجود ہے تو وہ بیٹرن کو دیکھ کر میرے بارے میں اچھی رائے قائم نہ کرتا۔ میں اس کی نظروں میں گر جاتی۔ دوسرے یہ کہ ممکن ہے بیٹرن نیک ارادے سے کر نہ آیا ہو اور ثریلا بیٹرن کے ذریعے میری بے حرمتی اور رسوائی کے درپے ہو۔ بہرحال میں ایسی چیز نہیں تھی جسے آسانی سے نگل لیا جائے۔ میں بیٹرن سے مخاطب ہو کر بولی۔ "تمہیں چابی کہاں سے مل گئی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے تمہارے پاس اس گھر کی چابی نہیں ہے۔ کیا ثریلا نے تمہیں یہ چابی دی ہے؟"

وہ عجیب سی ہنسی ہنسنے لگا۔ پھر سگریٹ جلا کر ایک کرسی میں دھنستے ہوئے بولا۔ "معاف کرنا لیلیٰ! ذرا تھک گیا ہوں۔"

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا بیٹرن۔ میں نے یہ پوچھا تھا کہ چابی تمہیں کہاں سے ملی؟" میں نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔

"کیا فرق پڑتا ہے کہیں سے بھی ملی ہو۔ بہرحال میں تمہاری خدمت میں حاضر ہوں۔" وہ بڑی ڈھٹائی سے بولا۔

"مجھے تمہارے یہاں موجود رہنے سے قطعاً دلچسپی نہیں ہے۔ اب تم چلے ہی جاؤ تو بہتر ہے۔ پیکٹ میز پر رکھ دو۔ ثریلا آئے گی تو میں بتلا دوں گی۔"

میں نے کچھ جارحانہ رویّہ اختیار کیا۔

"تمہیں تو نہیں البتہ مجھے یہاں بیٹھنے سے ضرور دلچسپی ہے۔" بیٹرن انتہائی بے شرمی سے بولا۔ "میں بیحد تھکا ہوا ہوں لیلیٰ! ذرا کمر سیدھی کر لوں اور فریج سے بیئر کا ایک ڈبہ نکال کر پی لوں پھر چلا جاؤں گا۔" یہ کہتے ہی وہ اُٹھا اور باورچی خانے کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکوں پھر کچھ خیال کر کے ارادہ ملتوی کر دیا۔ کچھ بھی ہو بہرحال یہ اس کی محبوبہ یا داشتہ ثریلا کا مکان تھا اور جب کہ میری حیثیت اس مکان میں ایک غیر اور اجنبی سے زیادہ نہیں تھی۔ پھر میں اسے روکنے والی کون تھی۔ کچھ دیر بعد بیٹرن بیئر کا ایک ڈبہ اٹھائے ہوئے ہال میں واپس آ گیا۔

"بہت ٹھنڈی بیئر ہے۔ تمہارے لیے بھی ایک ڈبہ لے آؤں لیلیٰ خانم؟" وہ آنکھ میچتے ہوئے بولا۔

"نہیں شکریہ۔ میں بیئر نہیں پیتی۔" میں غصہ دباتے ہوئے بولی۔

"اچھا تو پھر کیا پیتی ہو ماسکاٹ اٹرانی یا جن یا ووڈکا؟" وہ ہنستا ہوا بولا۔ عنقریب ہی غصے سے پھٹنے والی تھی۔ خود کو بڑی مشکل سے روکے ہوئے تھی۔ یہ بلا نرمی اور خوش اسلوبی سے ٹل جائے تو اچھا ہے مگر بیٹرن میری نرمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سر پر چڑھا چلا آ رہا تھا۔ اب اس کی حوصلہ شکنی ضروری تھی۔ میں ڈانٹنے کے انداز میں بولی۔ "بیئر کا آخری گھونٹ لو اور چپ چاپ کھسک جاؤ۔ ابھی مجھے بہت سے کام نمٹانے ہیں۔"

"کام وام تو ہوتے رہتے ہیں۔ سچ کہتا ہوں ایک گھونٹ لے کر دیکھو مزہ آ جائے گا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ خدا تمہارے اس جرم پر تمہیں دوزخ میں نہیں بھیجے گا۔" پھر وہ اپنے مذاق پر خود ہی زور زور سے ہنسنے لگا۔ میں ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔ کیا مصیبت تھی جو گلے پڑ گئی تھی۔ وہ بیئر کے گھونٹ لے رہا تھا اس کے ساتھ سگریٹ بھی پیتا جا رہا تھا۔ اس کی نظریں میری طرف بھی ہوئی تھیں۔ اس نے سگریٹ کا زوردار کش لیا اور دھوئیں کا بادل چھوڑتے ہوئے بولا۔ "بہت دنوں سے خواہش تھی کہ ثریلا کی غیر موجودگی میں تم سے ملنے آؤں۔ تم پہلی نظر میں مجھے بھا گئی تھیں۔ بلکہ میں نے ثریلا سے کہا بھی تھا کہ بڑا اچھا مال ہے۔ لیلیٰ! میں بڑا جوہر شناس ہوں۔ اچھے مال پر ہمیشہ میری نظریں رہتی ہیں۔ تمہیں مجھ سے مایوسی نہیں ہو گی بلکہ تم ثریلا سے زیادہ فائدے میں رہو گی۔ ثریلا کیا ہے تمہارے قدموں کی دھول بھی نہیں۔ تہران میں تم جیسی لڑکیوں کے قدردان مجھ جیسے لوگ ہو سکتے ہیں۔ تم خوش قسمت ہو جو میں تمہاری طرف متوجہ ہو رہا ہوں ورنہ بہت سی خوبصورت لڑکیاں میری قربت کو ترستی ہیں۔"

میں نے کچھ کہنا چاہا مگر اسی وقت بیٹرن اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اِس دلچسپ آپ بیتی کا یہ موڑ
لیلیٰ کی زندگی میں
کیا انقلاب لایا
اگلی قسط پڑھنا مت بھولئے

# پورا جوان

آنکھوں میں کاجل کی گھٹا، لب میں درخشاں، گال گلابستان، سرتاپا موسم بہار کی آمد —
یہ تھی سندری۔ وہ کبھی بچپن کو الوداع کہتی دکھائی دیتی اور کبھی اس بچپن کو گلے لگاتی نظر آتی۔ کبھی وادیٔ شباب میں محوِ خرام، اور کبھی طوفانِ شباب سے بہکتی ہوئی سی لگتی۔

غرضیکہ وہ بچپن اور جوانی کی حدِ فاصل پر کسی بھٹکی ہوئی ہرنی کی طرح دہشت زدہ سی رہتی تھی۔

سوہنے کو سندری سے عشق تھا، سندری کو سوہنے سے محبت تھی لیکن سوہنا اپنی من موہنی کو نہیں پا سکتا تھا اور سندری اپنے من موہن کو حاصل نہیں کر سکتی تھی۔

ان کے راستے کی چٹان کالا سنگھ تھا۔

ایک روز سوہنے نے اپنے چاچا کا گھوڑا مانگا اور سرپٹ ایڑیں مارتا ہوا اٹھارہ کوس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اب وہ ساہنی والا نام کے گاؤں کے باہر کالا سنگھ کے کچی اینٹوں کے بنے ہوئے مکان کے سامنے کھڑا تھا۔

سوہنے کا اصلی نام بلکار سنگھ تھا لیکن وہ اتنا حسین تھا کہ لوگ اسے سوہنا (خوب صورت) کہنے لگے۔ اس کے حسن نے علاقے کی حسین ترین لڑکی کا دل موہ لیا تھا، لیکن اس کے باوجود وہ کس قدر مجبور اور بے بس تھا۔

اس کا گھوڑا بے دم سا ہو کر نتھنے پھڑپھڑا رہا تھا۔ پسینے کی وجہ سے اس کی جلد گیلی مخمل کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ خود سوار کے چہرے پر پسینے کے موتیوں کی بارش ہو چکی تھی۔ اس کا سرخ و سپید چہرہ جو ابھی باقاعدہ داڑھی اور مونچھوں سے بری تھا تمتایا ہوا تھا۔ اس کی تیز آنکھیں گھوم پھر کر کالا سنگھ کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے پہلے کبھی اس آدمی کو نہیں دیکھا تھا

آیا۔ پتا پوچھتا وہ مکان تک پہنچ گیا۔ مکان کے باہر کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ سوہنے کو معلوم تھا کہ کابلا سنگھ کے تین بچے موجود تھے لیکن اس نے بچوں سے ان کے باپ کے بارے میں پوچھ گچھ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

کابلا سنگھ کے پڑوس میں ایک ساہنی رہتا تھا (ساہنی وہ لوگ ہوتے تھے جو کتوں کو ساتھ لے کر جنگلی بلوں کا شکار کرتے تھے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ بلوں کو کھا بھی جاتے تھے) اس وقت ادھیڑ عمر کا ساہنی اپنے صحن کی چھوٹی سی دیوار پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس کے لمبے لمبے پٹے اس کی گدی تک پہنچتے تھے اور ان میں تیل چپڑا ہوا تھا۔ چاند کی شکل کا کنگھا پھنسا ہوا تھا۔ سوہنے نے اس کے قریب پہنچ کر ابرو سے پڑوس والے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:

"کیا کابلا سنگھ اسی مکان میں رہتا ہے؟"

ساہنی نے سر سے پاؤں تک دیکھ کر اس کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا:

"آہو۔"

"وہ گھر میں ہے کیا؟"

"نہیں، صرف اس کے بچے ہیں ـــــ وہ ابھی آتا ہی ہوگا۔"

ساہنی کی بات ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ دور سے گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور سنائی دیا۔ ساہنی نے حقے کی نے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لو وہ آگیا۔"

قریب آکر گھوڑا ایک پھیریاں لینے لگا۔ دھول کے بادل بلبلا کر اس کی ٹاپوں کے نیچے سے نکل کر ادھر ادھر اڑنے لگے۔ اسی کیفیت میں سوار نیچے اتر پڑا۔ سوہنے نے اسے بغور دیکھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ سینہ چھاج کی طرح پھیلا ہوا مگر پیٹ اب بھی مناسب حد سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ ٹانگیں لمبی اور سڈول تھیں۔ چہرے کا رنگ ایسا تھا جیسے کسی تق دق صحرا میں سورج ڈوبنے کے بعد تاریکی پھیل رہی ہو۔ صرف آنکھیں غیر معمولی طور پر چمکیلی تھیں۔ مجموعی اعتبار سے وہ کالے ناگ کی طرح حسین اور پرکشش تھا۔

کابلا سنگھ گھوڑے کی لگام تھامے اپنے احاطے میں داخل ہو گیا۔ ساہنی نے دور سے پکار کر کہا:

"کابلا سنگھ، یہ تم سے ملنے کے لیے آیا ہے۔"

کابلا سنگھ نے اس کی بات بظاہر سنی ان سنی کر دی۔ اس نے احاطے کے کونے میں کھجور کے نیچے والے بانس سے بندھی ہوئی رسی کا پھندا گھوڑے کی گردن میں ڈال دیا ـــــ اس وقت تک گھوڑے پر سوار سوہنا اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔

کابلا سنگھ نے کمر سے پٹکا کھول کر اس سے اپنے جوتے جھاڑتے ہوئے پوچھا۔ "کہو کیا بات ہے؟ کیسے آنا ہوا؟"

"میں آیا تو تھا تمہارا گھوڑا توڑنے کے لیے ....."

کابلا سنگھ نے اس کی طرف پیٹھ پھیر دی اور کچھ رک کر بولا۔

"تو؟"

"لیکن مجھے چار پانچ سال تک انتظار کرنا پڑے گا۔ اس وقت تمہارا گھوڑا توڑنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔"

"چار پانچ سال کے بعد کیا ہوگا ـــــ؟"

یہ کہتے ہوئے بھی کابلا سنگھ نے اس کی طرف ایک نظر ڈالنے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی۔

اس کی بے اعتنائی سے سوہنے کا چہرہ اور بھی تمتما اٹھا۔ اس نے کہا: "اس وقت تک میں پورا جوان ہو جاؤں گا۔"

"یعنی بالغ ہو جاؤ گے۔"

سوہنا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ گھوڑے سے اتر کر اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"میں نے سنا ہے کہ کسی زمانے میں تم نے علاقے بھر میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ اب بھی تمہاری دھاک ہے لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ تم اپنی دھاک کا اس قدر ناجائز فائدہ اٹھانے سے باز نہیں آتے۔"

کابلا سنگھ نے اس کے گھوڑے کی کاٹھی پر کہنی ٹیک دی اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ سوہنا اس کی اس کیفیت کو سمجھ گیا اور اگلی بات کہنے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کرنے لگا۔

گھوڑے کی پیٹھ کے اوپر سے پرلی طرف کو تھوکتے ہوئے کابلا سنگھ نے کہا۔ "چار پانچ سال کے بعد جب تم پورے جوان ہو جاؤ گے تو مجھے امید ہے کہ اس وقت تمہاری عقل اس قدر کچی نہیں رہے گی۔"

سوہنے نے اس کی چوٹ کو توجہ کے قابل نہیں سمجھا۔ اسے تو صرف اپنی بات کہنے میں دلچسپی تھی۔

"تمہاری پہلی بیوی مر چکی ہے۔ اب تم کو اپنا گھر سنبھالنے اور بچوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے عورت کی ضرورت ہے ..... اور تم نے صندری کا ہاتھ اس کے باپ سے مانگا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو ـــــ یہی نہیں، صندری کا باپ بھی اس بات پر راضی ہے ....."

اس کی آواز ایسی تھی جیسے کہیں بہت دور سے بادل گرج رہا ہو۔

اس پر سوہنے نے اپنے گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دیا اور جھکے سے آگے بڑھا تو کمنی کے نیچے سے سہارا ہٹ جانے کے باعث کابلا سنگھ کا ساخوطہ کھا کر سیدھا ہو گیا۔

سوہنا گھوڑے پر سوار ہو گیا اور منہ میں کف بھر کر بولا۔

"اب تم انتظار کرو۔ میں بھی انتظار کروں گا۔ تین — چار — پانچ برس کے بعد میں ایک روز آؤں گا . . . . . اور تمہارا سر کاٹ کر لے جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر سوہنے نے گھوڑے کو ایڑ دی۔ گھوڑا پہلے سمٹا اور پھر پھیر کر یک جست ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

جب تک گھوڑ سوار نظر آتا رہا، کابلا سنگھ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔

٭ ٭ ٭

جس تیز رفتاری سے سوہنا سانئی والا پہنچا تھا، اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ وہ واپس لوٹا پھر بھی اپنے گاؤں تک پہنچتے پہنچتے دن ڈھل گیا۔

مندری اسے گاؤں کے باہر ہی مل گئی۔ وہ نہ جانے کب سے اس کے انتظار میں تھی۔ حسب معمول سوہنا مندری کی گہری آنکھوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی کہنے لگی۔

"تم گاؤں سے نکل کر گئے اور تھوڑی دیر کے بعد کابلا سنگھ یہاں آ پہنچا۔ وہ شادی کی بات پکی کرنے آیا تھا۔"

"تو بات پکی ہو گئی ؟"

"ہاں !" وہ چہک کر بولی۔

سوہنا سوچنے لگا عورتیں بھی کس قدر خطا پوش ہوتی ہیں۔ کیسی دیدہ دلیری سے بات پکی ہو جانے کا اعتراف کر رہی ہے۔

وہ گھوڑے سے اتر چکا تھا۔ اس کا دل بھاری ہو رہا تھا اور وہ لگام ہاتھ میں لیے دھیرے دھیرے چاچے کے مکان کی جانب بڑھ رہا تھا۔

مندری نے بیان جاری رکھا،

"میں گھبرا گئی۔ تم گاؤں میں نہیں تھے اور بات پکی کرنے والا آ پہنچا تھا، پھر بھی میں نے ہمت سے کام لے کر الگ سے کابلا سنگھ کو سب کچھ بتا دیا۔ اسے اس بات کا احساس کرا دیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنی . . . . . کہ ہم ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے کہ تمہیں تو اور بھی لڑکیاں مل جائیں گی، لیکن مندری کو سوہنا اور سوہنے کو مندری نہ مل سکے گی . . . . . "

"پھر ؟"

مندری کھِلکھلا کر چہکتے ہوئے بولی :

"سوہنے ! وہ جتنا باہر سے قدآور ہے اتنا ہی قدآور بھیتر سے بھی نکلا،

میری بات سن کر وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا کر اسے ان سب باتوں کا کچھ بھی پتہ نہیں۔ وہ سیدھا اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ میرا چاچا (باپ) اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ گھوڑے کی ایک رکاب میں پاؤں جما کر اس نے چاچا کی طرف دیکھا اور بولا۔

"سرکار جی ! . . . .

میں نے مندری اور سوہنے کی بات پکی کر دی ہے — اب آپ بیاہ کا انتظام کر ڈالیں تو بہتر رہے گا۔"

سوہنا دم بخود رہ گیا۔

مندری نے اس کی یہ کیفیت دیکھ کر پوچھا۔

"جب تم اس سے ملے تھے تو اس نے کچھ نہ کچھ تو بتایا ہو گا۔"

سوہنا افق کی طرف دیکھ رہا تھا — اندھیرا ہو چکا تھا ———— آکاش پر اکا دکا تارا دکھائی دینے لگا تھا۔

وہ بوجھل آواز میں بولا۔

"نہیں — میں نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔"

☆ — ☆ — ☆

جب سے کابلا سنگھ کی عورت مری تھی اس کے گھر کا کھانا ایک بہری تیار کرتی تھی۔

کابلا سنگھ کی عادت تھی کہ صبح داتن منہ میں ڈال کر کلہاڑے سے ایندھن کے لیے دو چار لکڑیاں پھاڑ ڈالتا تھا۔

آج صبح بھی وہ دانتوں میں داتن دبائے اور ہاتھ میں کلہاڑا اٹھائے احاطے میں پڑے ہوئے موٹے موٹے سٹوں کی طرف بڑھا۔

اسے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنائی دی۔

یہ اس کے اپنے گھوڑے کی آواز نہیں تھی۔

نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے سوہنا گھوڑے سے اتر رہا تھا۔

کابلے نے اس کی طرف حسب عادت توجہ نہیں دی۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں پر تھوک کر اس نے کلہاڑا ہوا میں اٹھایا اور پھر — کلہاڑا لٹھے میں پیوست ہو گیا۔

اس نے دستے کو ہلا جُلا کر بھاری آواز میں کہا۔

"سوہنے ! معلوم ہوتا ہے کہ تم ایک رات ہی میں پورے جوان ہو گئے ہو — مجھے چار پانچ سال تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔"

چند لمحوں تک سکوت رہا۔

ایک دم سوہنے کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا "ہاں کابلا سنگھ میں ایک رات ہی میں پورا — جوان ہو گیا ہوں"

*****

# کیا یہ سال ہمارا ہے ؟

اس مختصر سے مضمون کی ایک ایک سطر ذرا غور سے پڑھئے اور پھر انصاف سے سوچئے کہ کیا ۱۹۷۵ء واقعی خواتین کا سال ہے - اور اگر آدم کے بیٹوں نے انہیں خوش کرنے کے لیے یہ کھلونا دے بھی دیا ہے تو کیا باشعور خواتین اب بھی ان باتوں سے بہل جائیں گی ؟ (ادارہ)

"یہ سال خواتین کا سال ہے ...."

"یہ خواتین کا سال ہے -"

"۱۹۷۵ء عورتوں کا ہے ——"

یہ جملے نہ جانے کب سے میرے ذہن کی دیواروں میں کیلوں کی طرح پیوست ہوتے جا رہے ہیں۔ کوئی نعرہ لگاتا ہے "یہ عورتوں کا سال ہے" تو شدت کا ہتھوڑا ایک بار پھر پوری طاقت سے ان کیلوں پر آن پڑتا ہے - یہ میخیں اندر اور اندر ذہن کی سطح کو چھیدنے لگتی ہیں، دیواروں کے شگاف اور گہرے ہو جاتے ہیں، دراڑیں لمبی ہوتی جاتی ہیں اور میں سوچنے لگتی ہوں کہ ۱۹۷۵ء کیا ہم عورتوں کے لیے یہی دُکھ، یہی کرب لے کر آیا ہے جو پہلے ہی کب ہمارے ذہن کی دیوار ثابت و سالم تھی اور اب ...... اب یہ کیلیں ...... اُف اللہ -! ان پر تو ہم اپنے دکھ کی گٹھریاں بھی نہیں ٹانگ سکتے -

دکھ —— درد —— کرب —— یہی تینوں چیزیں تو ہم حوا کی بیٹیوں کی میراث ہیں - ہم نے تو ان تینوں چیزوں کو اپنے مقدر کا حصہ جان لیا تھا - انھیں اپنا نصب العین سمجھ لیا تھا کہ ہمیں ہمارے بزرگوں نے یہی سمجھایا - یہی لوری دی - کہ :

" سنو! تمھارا مقدر یہی ہے - تمھیں یونہی دکھ کی چادر لپیٹ کر بیٹھے رہنا ہوگا - پاتال کی گہرائیوں میں یونہی دم سادھے بیٹھے رہنا ہوگا ۔"

اور یقین کرو کہ ہم پاتال کی اس گہرائی میں بے حسی کی چادر کی بکل مارے اسی طرح بیٹھے رہتے —— اگر ہمارا ساتھی ہمارا ہاتھ پکڑ کر یہ کہتا —— اُٹھو، دیکھو میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا —— تم ابھی تک اتنے گہرے گڑھے میں پڑی ہو - تمھیں تو میرے ساتھ چلنا چاہئے، بلکہ ہم تم گاڑی کے دو پہیے ہیں —— پرندے کے دو پر ...... چلو ...... چلو —— یہ چادر اتار دو —— اٹھو میرا ساتھ دو -

اور —— ہم بھلکے - ہانپتے کانپتے پاتال کی گہرائیوں سے نکلنے کی جد و جہد میں مصروف ہو گئے کہ ہمارے ساتھی کی مرضی یہی تھی - یہ سر تا پا حکم تھا کہ ہم اور وہ گاڑی کے دو پہیے، پرندے کے دو پر —— اس نے ہمیں یہی بتایا تھا۔ ہماری ہتھیلیوں سے خون بہا۔ ہمارے پاؤں زخمی ہوئے —— باتیں سنیں - ہمیں کسی نہ کسی طور پر ان گہرائیوں سے نکلنا تھا - ہم ابھی باہر نکلنے کو تھے کہ وہ غرّایا —— بڑی تیز ہوتی جا رہی ہو —— تم عورت زاد —— اب کیا ہماری برابری کروگی —— تم اتنا بڑھ کیوں رہی ہو —— تم وہی تو ہو نا —— جس نے آدم کو نکلوایا جنت سے۔ اب پھر آ رہی ہو ہمارے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے —— یہ تمھارا مقام تو نہیں —— تمھاری جگہ تو وہی ہے —— وہ گہرا کنواں، وہ چار دیواری —— وہیں جاؤ بھی ——

اور حوا کی شکستہ دل بیٹی آدم کے بیٹے کے اس جابرانہ رویے پر تڑپ کر رہ گئی - وہ باہر آ نہیں سکتی تھی، واپس جانا نہیں چاہتی تھی —— کہ اب تو اوپر آنے کی جد و جہد میں بے حسی کی چادر بھی اس کے کندھوں سے ڈھلک کر پاتال کی گہرائیوں میں کھو گئی تھی اور اس کا شعور بھی تو بیدار ہوتا جا رہا تھا

فارس سے ایک شخص حبیب ترکِ مکانی کر کے بصرہ پہنچا۔ وہ خاصا دولت مند آدمی تھا گو مسلمان تھا لیکن فارس میں ایسے لوگوں کی صحبت میں رہا جو حلال و حرام میں تمیز نہ رکھتے تھے۔ لہٰذا حبیب نے بھی فارس کے غیر مسلموں کی طرح پیسے دے کر سود حاصل کیا۔ جب وہ بصرہ پہنچا تو ایک مکان خرید کر رہائش اختیار کی اور اپنا پرانا کام بصرہ میں بھی شروع کر دیا۔ ضرورت مند مجبوراً آتے اور حبیب سے روپیہ سود پر لے جاتے کیونکہ وہ سود خور تھا لہٰذا اس سود کے تقاضے کے لئے لوگوں کے دروازے کھٹکھٹاتا اور سود نہ ملتا تو اس سلسلے میں کوئی نہ کوئی چیز طلب کرتا کہ ان لوگوں نے اس کا وقت برباد کیا۔ بعض اوقات تو اس سلسلے میں کافی تو تو میں میں ہوتی اور آخر کار لوگ تنگ آ کر اس کنجوس شخص کو کچھ نہ کچھ دے کر اپنا پیچھا چھڑاتے۔ ایک دن حبیب نے ایک مقروض کے دروازے پر دستک دی۔ بیوی نے بتایا کہ اس کا شوہر گھر پر موجود نہیں ہے۔ حبیب نے عادت کے مطابق اس خاتون سے ہرجانہ مانگا۔ گھر میں اس وقت کچھ اور تو موجود نہ تھا بھیڑ کی سری پڑی تھی۔ وہ حبیب کو بطور ہرجانہ ادا کر دی۔ حبیب نے سری لا کر بیوی کو دی کہ وہ کھانا پکا لے۔ بیوی نے جواب دیا کہ صرف سری کا کیا کروں آٹا اور دیگر چیزیں بھی درکار ہیں۔ حبیب پھر روانہ ہوا اور مقروضوں سے تقاضا کر کے چیزیں بھی وصول کر لایا اور بیوی کو تاکید کر دی کہ جلد کھانا پکائے۔ کھانا تیار ہوا۔ اسی وقت دروازے پر ایک فقیر نے کھانے کا سوال کیا۔ حبیب بھوکا تھا لہٰذا جھنجلا کر اس نے فقیر کو ڈانٹا اور کہا کہ اگر میں اس وقت تم کو کچھ دے بھی دوں تو تم اس سے تونگر نہیں بن سکتے مگر اس سے میرے کھانے کی صورت ضرور پیدا ہو جائے گی۔ فقیر نے جواب دیا: "بابا اللہ تمہیں نیک ہدایت دے اور سیدھے راستے پر چلائے۔" فقیر یہ کہہ کر آگے چلا گیا۔

بیوی نے جب سالن ہنڈی میں نکالا تو وہ سری کے بجائے خون سے بھری ہوئی تھی۔ جب یہ ماجرا حبیب نے دیکھا تو وہ بہت پریشان ہوا اور بیوی کو گواہ بنا کر کہا کہ میں آج سے توبہ کرتا ہوں کہ سود خوری حرام چیز کو اپنے قریب پھٹکنے نہ دوں گا۔ اسی پریشانی کے عالم میں وہ حسن بصریؒ کی طرف جانے کے لئے گھر سے نکلا۔ راستے میں بچے کھیل رہے تھے انھوں نے شور مچایا کہ الگ ہٹ جاؤ حبیب سود خور جا رہا ہے کہ اس کے پیروں سے اڑی ہوئی دھول بھی کسی پر پڑ گئی تو اس کی عاقبت خراب ہو جائے گی۔ یہ فقرے حبیب کے لئے تازیانہ ثابت ہوئے۔ وہ

بھاگم بھاگ حضرت حسن بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے ہاتھ پکڑ لئے۔ آپ گواہ رہیں کہ میں نے آج سے تمام بری باتوں سے توبہ کر لی ہے اور آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ میرے پچھلے گناہوں کو معاف کر دے۔ حسن بصریؒ نے جواب دیا کہ صدقِ دل سے جو بھی گناہوں سے تائب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی مدد ضرور کرتا ہے یہ کہہ کر آپ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور بڑی رقت سے حبیب کے لئے دعا کی۔ حبیب کی آنکھوں سے جھڑی لگ گئی وہ مسلسل روتا رہا۔ بڑی دیر بعد جب طبیعت سنبھلی تو گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک مقروض حبیب کو دیکھ کر بھاگنے لگا حبیب نے اس سے کہا اب تمہیں مجھ سے بھاگنے کی ضرورت نہیں اب مجھے تم سے دور بھاگنا چاہیئے کہیں مجھ عاصی کا سایہ تم پر نہ پڑ جائے۔ جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچے تو بچوں نے پھر شور مچایا کھیل روک دو حبیب تائب ہو کر آ رہا ہے کہیں اس پر دھول نہ پڑ جائے اور ہم گناہ گار ٹھہرائے جائیں۔ بچوں کی یہ بات سن کر حبیب نے اللہ کا شکر ادا کیا اور دل میں کہا کہ اللہ کے نیک بندے حسن بصریؒ کی دعا کتنی جلد قبول ہوئی۔ حبیب دروازے سے پلٹ گیا اور تمام قرض داروں سے کہہ دیا کہ میں نے تمام قرض معاف کر دیا۔ لوگوں کو حبیب کی اس تبدیلی پر بڑی حیرت ہوئی اور جب حبیب کا پورا واقعہ انہیں معلوم ہوا تو ان سب نے بھی اپنے سود کے لین دین جیسے عظیم گناہ کی اللہ سے معافی مانگی حبیب گھر واپس آئے تو انہوں نے اپنا تمام اثاثہ اللہ کی راہ میں خیرات کر دیا اب ان کے پاس مکان اور تن کے کپڑوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اس وقت ایک فقیر نے صدا دی "بابا کچھ کپڑے ہی دے دو" حبیب نے اپنی قمیص اور بیوی کا دوپٹہ اس فقیر کو دے دیا اور گھر میں عبادت میں مصروف ہو گئے۔ عبادت میں دل نہ لگا ان کو ایک خلش بے چین رکھتی تھی کہ جس مکان کے سایہ میں وہ بیٹھے ہیں اس میں حرام کمائی کا تو کوئی حصہ نہیں۔" لہٰذا انہوں نے اس مکان کو فروخت کر کے رقم راہِ خدا میں خیرات کر دی اور تھوڑے سے پیسوں سے دریائے دجلہ کے کنارے ایک جھونپڑی نما عبادت خانہ بنا لیا۔ اس میں وہ میاں بیوی رہنے لگے اب آپ کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ دن کو حسن بصریؒ سے درس اور راہِ سلوک کے مدارج طے کرتے اور رات بھر گھر میں عبادت میں مصروف رہتے۔ آپ قرآن کا تلفظ صحیح مخرج کے ساتھ ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے لوگوں نے آپ کو عجمی کا خطاب دیا۔ ایک مدت اسی طرح گزر گئی۔ بیوی کے پاس جو کچھ تھا وہ ختم ہو گیا اور جب کچھ باقی نہ رہا تو ایک دن بیوی نے آپ سے کہا "اس طرح گزر بسر ہونا مشکل ہے۔ لہٰذا آپ صبح سے کہیں جا کر مزدوری کریں۔" آپ صبح نماز سے فارغ ہو کر مزدوری کرنے چلے اور ایک پُرسکون جگہ بیٹھ کر عبادت میں مشغول ہو گئے۔ شام کو گھر پہنچے تو بیوی نے پیسوں کا تقاضا کیا۔ آپ نے جواب دیا کہ جس کی میں مزدوری کر رہا ہوں وہ دس دن کے بعد پیسے دے گا۔

دسویں دن جب آپ واپس آنے لگے تو پریشان تھے کہ بیوی کو کیا جواب دیں گے۔ دروازے میں داخل ہوتے تو دیکھا کہ بیوی کھانا پکانے میں مصروف ہے۔ آپ نے بیوی سے پوچھا کہ یہ سب کہاں سے آیا۔ بیوی نے جواب دیا کہ آپ جس کے یہاں مزدوری کر رہے ہیں اس نے ایک آدمی کے ہاتھ ایک بوری آٹا ایک ذبح کی ہوئی بھیڑ اور تین سو درہم بھیجے ہیں اور کہلوایا ہے کہ حبیب سے کہنا "اس مزدوری میں ترقی کریں اور اس طرح ہم اس کی بھی ترقی کرتے رہیں گے۔" جب حبیب نے یہ ماجرا سنا تو وہیں سربسجود ہو گئے اور اللہ کا شکر ادا کیا اور سوچا کہ ان دس دنوں کی عدم توجہی کی ریاضت کا اس مالکِ حقیقی نے یہ بدلہ دیا ہے اگر پوری توجہ سے عبادت میں مشغول ہوا جائے تو ان درجات کا کیا کہنا یہ سوچ کر آپ پورے خشوع و خضوع سے عبادت میں مشغول ہو گئے۔

ایک مرتبہ ایک عورت آئی اور زار و قطار روتے ہوئے آپ کے پیر پکڑ لئے اور کہا کہ میرا بچہ عرصے سے گم ہے اور اس کا کہیں سراغ نہیں ملتا میں اپنا بچہ آپ سے لے کر جاؤں گی ورنہ یہیں اپنی جان دے دوں گی۔ آپ نے اسے صبر کی تلقین کرتے ہوئے پوچھا "بی بی اس وقت تیرے پاس کچھ پیسے ہیں؟" اس نے جواب دیا "ہاں دو درہم ہیں۔" آپ نے درہم لئے اور خیرات کر دیئے پھر اس خاتون سے کہا "بی بی اب گھر جاؤ تمہارا بچہ آ گیا ہے۔" عورت گھر آئی تو دیکھا بچہ صحن میں بیٹھا ہے اس نے دوڑ کر گلے سے لگا لیا اور احوال دریافت کیا۔ بچے نے کہا کہ میں کرمان میں ایک دستکار کے یہاں کام سیکھ رہا تھا۔ آج استاد نے مجھے بازار گوشت لینے بھیجا۔ یکایک نہایت تیز ہوا کے ساتھ آندھی اٹھی اور میں اس کی لپیٹ میں آ گیا۔ لیکن میں نے ایک آواز ضرور سنی تھی کوئی کہہ رہا تھا اسے ہوا اسے جلدی بصرہ پہنچا دے۔ جب آنکھ کھلی تو میں یہاں صحن میں بیٹھا ہوا تھا۔

بصرہ میں ایک مرتبہ شدید قحط پڑا۔ لوگ بھوک سے مرنے لگے یہ بات آپ سے برداشت نہ ہوئی کہ اللہ کی مخلوق اس طرح بھوکی مرے آپ نے اہلِ ثروت لوگوں سے قرض لے کر لنگر جاری کر دیا۔ بصرہ اور گرد و نواح کے ہزاروں آدمی روزانہ وہاں سے کھانا کھاتے اور اللہ کا شکر ادا کرتے کچھ دنوں بعد قرض خواہ آنے لگے لیکن آپ کے ادب کی وجہ سے کچھ نہ کہتے تھے۔ آپ کو ان کے ارادے کا پتہ چل گیا تو آپ نے ایک خالی تھیلی اپنے مصلے کے نیچے رکھ دی اور جو بھی آتا آپ تھیلی میں ہاتھ ڈال کر درہم نکالتے اور گن کر اس قرض خواہ کو دے دیتے۔

ایک دن آپ نہانے کے لئے ایک حمام میں گئے اور کپڑے باہر چھوڑ دیے۔ پہرہ کو دیتے اتفاق سے حسن بصریؒ وہاں سے گزرے اور کپڑوں کو پہچان کر وہیں کھڑے ہو گئے۔ جب حبیب واپس آئے تو دیکھا حسن بصریؒ کھڑے ہیں۔ آپ نے فرمایا حبیب یہ کپڑے کس کے بھروسے پر چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے جواب دیا "اس کے بھروسے پر جس نے آپ کو یہاں ان کی حفاظت کے لئے بھیج دیا۔"

ایک مرتبہ حسن بصریؒ حبیب عجمیؒ کے یہاں تشریف لے گئے اس وقت ان کے پاس جو کی ایک سوکھی روٹی اور تھوڑا سا نمک موجود تھا وہ آپ نے حسن بصریؒ کے سامنے رکھ دیا تاکہ گھر آئے ہوئے مہمان کی تواضع ہو سکے۔ حسن بصریؒ نے ایک نوالہ ہی توڑا تھا کہ ایک فقیر نے صدا دی۔ حبیب عجمی نے وہ روٹی فقیر کو دے دی۔ یہ بات حسن بصریؒ نے محسوس کی اور کہا "حبیب تم میں شائستگی تو ہے لیکن علم نہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ مہمان کے آگے سے اس طرح پوری روٹی اٹھا کر نہیں دینی چاہیئے بلکہ ایک ٹکڑا توڑ کر دینا چاہیئے۔" یہ سن کر حبیب خاموش رہے ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ ایک غلام نے دروازے پر دستک دی اور ایک خوان جس میں نفیس کھانے تھے پیش کیا اور ساتھ ہی پانچ سو درہم بھی دیئے۔ حبیب نے درہم تو غرباء میں تقسیم کر دیئے اور کھانا حسن بصریؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ کھانے کے بعد حبیبؒ نے آپ سے کہا کہ مجھے یقین تھا کہ اس سوکھی روٹی کے صلے میں اللہ مجھے شرمندہ نہیں کرے گا۔

ایک مرتبہ حسن بصریؒ مغرب کی نماز کے وقت آپ کے پاس پہنچے انہیں نماز کے لئے کھڑے پایا۔ وہ آیات بلند آواز میں پڑھ رہے تھے حسن بصریؒ نے آپ کے قرآن پڑھنے کے تلفظ پر غور کیا اور جب غلط پایا تو ان کے پیچھے نماز نہ پڑھنے کا فیصلہ کیا اور علیحدہ کھڑے ہو کر نماز ادا کی۔ اسی رات خواب میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوا۔ حسن بصریؒ نے عرض کیا یا اللہ تیری رضا کا ذریعہ ہے؟ حکم ہوا تو نے ہماری رضا پائی لیکن اس کا علم نہیں رکھا۔ حسن بصریؒ نے پوچھا "وہ کونسی رضا تھی؟" تو ارشاد ہوا "اگر تو نماز میں حبیب عجمیؒ کی اقتدا کر لیتا تو تیرے لئے تمام عمر کی نمازوں سے بہتر تھا کیونکہ تو نے اس کی ظاہری عبادت تو دیکھی لیکن نیت نہیں دیکھی۔"

ایک مرتبہ حسن بصریؒ حجاج بن یوسف کے سپاہیوں سے چھپتے ہوئے حضرت حبیب عجمیؒ کی عبادت گاہ میں پہنچ گئے۔ سپاہی بھی انہیں تلاش کرتے ہوئے عبادت گاہ تک آ گئے۔ حبیب عجمیؒ باہر دروازے پر کھڑے تھے۔ سپاہیوں نے آپ سے حسن بصریؒ کے بارے میں دریافت کیا۔ آپ نے صاف صاف بتا دیا کہ حسن عبادت گاہ میں ابھی ابھی داخل ہوئے ہیں۔ سپاہیوں نے عبادت گاہ کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن آپ کا سراغ نہیں ملا۔ سپاہیوں کا افسر حبیب عجمیؒ پر بہت ناراض ہوا اور کہا کہ حجاج تم کو دروغ گوئی پر ضرور سزا دے گا۔ آپ نے فرمایا "یقین کرو میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ یہ حقیقت ہے کہ حسن ابھی میرے سامنے عبادت گاہ میں داخل ہوئے ہیں۔" چنانچہ پھر بڑی شد و مد سے تلاشی لی گئی لیکن حسنؒ کا کہیں پتہ نہ لگا۔ مجبوراً سپاہی واپس چلے گئے۔ حضرت حسنؒ نے باہر آ کر حبیب عجمیؒ سے شکایتی لہجے میں کہا کہ آپ نے تو حق شاگردی خوب ادا کیا اور صاف صاف میرا پتہ بتا دیا۔ انہوں نے جواب دیا "حضرت میں نے سچ بولا اسی وجہ سے بچ بھی گئے اگر میں دروغ گوئی سے کام لیتا تو یقیناً ہم دونوں گرفتار ہو کر حجاج کے پاس پہنچ جاتے۔" حسن بصریؒ نے کہا کہ "یہ تو بتاؤ تم نے کیا منتر پڑھ دیا تھا۔" بھائی کہ وہ سات مرتبہ میرے پاس سے گزرے میرے اوپر ہاتھ رکھا مگر میں ان کو نظر نہ آیا۔" انہوں نے جواب دیا۔ "دس مرتبہ آیۃ الکرسی۔ دس مرتبہ قل ہو اللہ احد اور دس مرتبہ آمن الرسول پڑھ کر میں نے اللہ سے دعا کی کہ اب حسن تیرے سپرد ہیں۔ تو ان کی حفاظت کر۔"

## کیا دیکھتا ہوں کہ

"ڈاکٹر میری لاش پر انجکشن کی پچکاریوں سے لڑ رہے ہیں اور لہولہان ہو رہے ہیں۔ اُدھر کچھ مریض اپنی اپنی نرسوں کو کلوروفارم سنگھا رہے ہیں۔ ذرا دور ایک لاعلاج مریض اپنے ڈاکٹر کو یٰسین حفظ کرا رہا ہے۔ ہر طرف ساگودانے اور مونگ کی دال کی کھچڑی کے ڈھیر لگے ہیں۔ آسمان بنفشئی ہو رہا ہے اور عناب کے درختوں کی چھاؤں میں نیلوفری جھاڑیوں کی اوٹ لے کر بہت سے غلمان ایک مولوی کو غذا بالجبر کے طور پر معجونیں کھلا رہے ہیں۔ تاحدِ نظر کافور میں بسے ہوئے کفن ہواؤں میں لہرا رہے ہیں۔ جابجا لوبان سُلگ رہا ہے اور میرا سر سنگ مرمر کی لوحِ مزار کے نیچے دبا ہوا ہے اور اس کی ٹھنڈک نس نس میں گھُسی جا رہی ہے۔ میرے منہ میں سگریٹ اور ڈاکٹر کے منہ میں تھرمامیٹر ہے۔ آنکھ کھلتی ہے تو کیا دیکھتا ہوں کہ سر پہ برف کی تھیلی رکھی ہے۔ میرے منہ میں تھرمامیٹر ٹھنسا ہوا ہے اور ڈاکٹر کے ہونٹوں میں سگریٹ دبا ہے۔"

مشتاق احمد یوسفی

سو میں نے اسی واسطے تیری لاج رکھ لی۔"

ایک مرتبہ حسن بصریؒ کہیں جانے کے لئے دریائے دجلہ کے کنارے کھڑے کشتی کا انتظار کر رہے تھے۔ حبیب عجمیؒ بھی کہیں جانے کے لئے دریائے دجلہ کے کنارے پہنچ گئے۔ جب کشتی کافی دیر تک نہ آئی تو یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے سے مخاطب ہوئے۔ حبیب عجمیؒ نے حسن بصریؒ سے کہا کہ بغض اور حب دنیا کو قلب سے نکال کر مصائب کو غنیمت تصور کرو اور اللہ پر اعتماد کر کے پانی کی سطح پر اتر جاؤ۔ یہ کہہ کر وہ پانی پر چلتے ہوئے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ حسن بصریؒ نے انہیں حسرت نگاہوں سے دوسرے کنارے پر جاتے ہوئے دیکھا۔ جب مریدوں نے حسن بصریؒ سے حبیبؒ کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے جواب دیا کہ حبیب نے علم اور سلوک تو مجھ سے حاصل کیا لیکن بعض جگہ اعتماد کے معاملے میں جلد بازی کر جاتے ہیں۔ مجھے پانی پر چلنے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں جب پل صراط پر چلنے کا حکم ہوگا۔ میں اللہ تعالیٰ سے اس وقت کے لئے رحمت کا خواستگار ہوں۔"

امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کسی جگہ بیٹھے تھے اتفاقاً حبیبؒ بھی پہنچ گئے۔ انہیں دیکھ کر امام حنبلؒ نے امام شافعیؒ سے کہا میں ان سے ایک سوال کروں گا۔ امام شافعیؒ نے انہیں سوال کرنے سے منع کیا اور کہا ان سے آپ کیا سوال کریں گے یہ دراصل باللہ لوگ ہیں ان کا مسلک ہی الگ ہے۔ لیکن منع کرنے کے باوجود امام حنبلؒ نے سوال کر ہی ڈالا۔ انہوں نے کہا حبیبؒ یہ تو بتاؤ کہ ایک شخص کی پانچوں نمازوں میں سے ایک قضا ہوگئی اور وہ یہ بھول گیا کہ کونسی نماز قضا ہوگئی ہے اب آپ بتائیں اس شخص کو کیا کرنا چاہئے؟ حبیب عجمیؒ نے جواب دیا کہ اس شخص کو پانچوں نمازیں قضا پڑھنی چاہئیں اس لئے کہ وہ خدا سے غافل ہو کر بے ادبی کا مرتکب ہوا ہے۔ یہ سن کر امام شافعیؒ نے امام حنبلؒ سے کہا میں نے اسی لئے آپ کو منع کیا تھا کہ ان لوگوں سے سوال نہ کریں۔"

خلیفہ وقت نے آپ کی خدمت کے لئے ایک کنیز بھیج دی تھی وہ مسلسل بیس سال تک آپ کی خدمت کرتی رہی۔ ایک دن کسی کام سے آپ اس کنیز سے مخاطب ہوئے اور کہا "خدا کی کنیز کو تو بلا دو" تو اس نے کہا "حضور میں ہی تو آپ کی کنیز ہوں۔" آپ نے کہا "گزشتہ بیس سال سے میرے دل میں سوائے خدا کے اور کسی کا خیال ہی نہ آیا۔ آج اتفاقاً مجھے کنیز کا خیال آیا تھا اس لئے تمہیں تکلیف دی ہے۔" ایک رات آپ اپنے کپڑوں میں پیوند لگا رہے تھے۔ سوئی ہاتھ سے گر پڑی۔ آپ نے ٹٹول کر اسے اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ ہاتھ نہ لگی۔ یکایک سارا گھر ایک نور سے منور ہوگیا لیکن آپ نے آنکھیں بند کر لیں اور کہا کہ میں دیئے کی روشنی میں اسے تلاش کر لوں گا۔ اپنے ذاتی کاموں کے لئے میں پروردگار کے نور کو کیوں استعمال کروں۔"

آپ کو قرآن سننے کا بڑا شوق تھا خوش الحان قاریوں سے آپ کلام پاک سنا کرتے تھے اور مضطرب ہو کر گریہ وزاری کرتے۔ ایک دن کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ تو عجمی ہیں قرآن پاک عربی میں ہے، آپ اس کا مفہوم کیسے سمجھ لیتے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ میری زبان ضرور عجمی ہے لیکن دل میرا عربی ہے۔

ایک دن آپ چوک میں سے گزر رہے تھے دیکھا کہ ہجوم لگا ہوا ہے۔ پوچھا کہ یہ تماشا کیا ہے۔ کسی نے بتایا کہ ایک قاتل کی گردن اڑائی جا رہی ہے۔ آپ نے اسی وقت کھڑے کھڑے اس شخص کے لئے دعا فرمائی اور اسی رات کو چند لوگوں نے اس شخص کو خواب میں دیکھا عمدہ لباس پہنے ہوئے جنت میں ٹہل رہا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ سب حبیب عجمیؒ کی دعاؤں کی برکت ہے ان ہی کی دعا کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مجھے بخش دیا۔

ایک رات شدت سے بخار ہوا۔ مریدوں سے کہا کہ اب بلاوا آگیا ہے لہٰذا انتظام کیا جائے اور اسی حالت میں خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ کی وفات ۱۵۶ ہجری میں ہوئی۔ آپ کا مزار مبارک بصرہ میں ہے جو آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔

ڈولی سمیع خاں

# آئیڈیل کی تلاش

## مہکی مہکی بہکی بہکی

میرا آئیڈیل ــــ دراز قد، جاذب نظر شخصیت رکھنے والا نوجوان جو مجھے میری اچھائیوں اور برائیوں سمیت قبول کر سکے۔ ویسے مجھے ڈاکٹر بہت پسند ہیں۔ اگر وہ سعودی عرب میں رہائش پذیر ہو تو کیا کہنے۔

میں ایک نہایت معزز اور دولت مند گھرانے کی پڑھی لکھی ۲۰ سالہ لڑکی ہوں۔ دراز قد، سنہری رنگت، سراپا لاجواب، مجھے چاہت کی تلاش ہے تاکہ میں اپنے آئیڈیل کے پیار کی خوشبو سے مہکی مہکی بہکی بہکی ایک خوشگوار زندگی بسر کر سکوں۔

"م۔ س۔ وشی، حیدرآباد"

## آنکھیں میری سپنے تیرے

میرا بھی ایک آئیڈیل ہے ــــ پائلٹ، دراز قد، مردانہ وجاہت کا جیتا جاگتا مجسمہ، آنکھیں پرکشش اور شرارت سے لبریز، لوٹ کر چاہنے والا ہو۔

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی ہوں، انٹر کی طالبہ، گوری چٹی سراپا دلفریب، طبیعت میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

خدا کرے میرا آئیڈیل جلدی مل جائے ورنہ عمر یونہی بیٹھے بیٹھے سپنے دیکھتے گزر جائے گی۔

"مہرالنسا، کراچی"

## پلکوں کی چلمن

میرا بھی ایک آئیڈیل ہے ــــ ایک غیر معمولی تنخواہ پانے والا خود سر نوجوان جو خوددار، سنجیدہ مگر اکھڑ مزاج ہو۔ وہ بات بات پہ مجھے ڈانٹے اور اگر کبھی مار پیٹ بھی ہو جائے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ وہ مجھے میری تمام خوبیوں اور برائیوں کے باوجود دل سے چاہے اور صرف اسی چاہت کی وجہ سے میں اس کی ہر بات گوارا کر لوں گی۔

میں ایک اچھے گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۱۹ سال۔ انٹر سائنس کی طالبہ گوری رنگت، دلکش چہرہ، لمبے لمبے سنہری بال، نیلی آنکھیں اور مکھڑے پہ پیارا سا تل۔ کاش مجھے میرا آئیڈیل مل جائے تو میں اسے پلکوں کی چلمن میں چھپا کر دونوں جہاں سے بے خبر ہو جاؤں۔

"تنویر قیصر، لطیف آباد"

## ہونٹ ہلے پیار ملا

میرا آئیڈیل —— معزز گھرانے کا تعلیم یافتہ، خوبرو نوجوان، اسمارٹ اور خوش کردار، شکی مزاج ہرگز نہ ہو، اپنا بزنس یا کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو، میرا پیار صرف ایک ایسے انسان کے لیے وقف ہے جو میرے جذبات و احساسات کی قدر کر سکے۔ اس کے ہونٹوں کی معمولی سی جنبش بھی میرے لیے چاہت کا پیغام ہو۔

میں ایک معزز گھرانے کی لڑکی ہوں، عمر ۱۹ سال، تعلیم ایف اے، اسمارٹ، خوش مزاج اور خوش لباس ہوں، رنگ کھلتا ہوا گندمی، سراپا دلکش، جہیز کے لالچی پرے پرے۔

کاش میرا آئیڈیل مجھے مل جائے۔

"ایس، ایف، سیالکوٹ"

## کرن کرن اُجالا

میرا آئیڈیل —— اعلیٰ ظرف، منفرد کردار کا مالک خوبصورت مونچھوں والا نوجوان جسے دنیا نے دکھ درد کے سوا کچھ نہ دیا ہو۔ وہ خلوص مروّت اور شرافت کا جیتا جاگتا شاہکار ہو۔

میں ایک کالی کالی زلفوں والی جوان سال لڑکی ہوں جس کی آنکھوں میں پیار ہی پیار ہے۔ بی ایس سی کی طالبہ ہوں۔ بڑی سگھڑ اور وفا شعار کاش مجھے میرا آئیڈیل مل جائے تو میں اس کی اندھیری دنیا میں یکبارگی اجالا کر دوں۔

"ناھید خان، حیدرآباد"

## بوئے گل

میرا آئیڈیل کوئی ماورائی شخصیت نہیں بلکہ اسی دنیا کا جیتا جاگتا فرد ہے۔ دراز قد، مردانہ وجاہت کا شاہکار، خوش کردار مگر شکی مزاج ہرگز نہ ہو۔ ڈاکٹر یا بزنس مین جو خوشگوار زندگی بسر کرنے کا قرینہ جانتا ہو۔

میں ایک معزز راجپوت گھرانے کی لڑکی ہوں۔ گریجویٹ، دراز قد، سفید رنگت، سراپا دلفریب۔ اگر مجھے میرا جیون ساتھی مل جائے تو میں بوئے گل کی طرح اس کے جسم و جاں میں پھیل جاؤں۔

"مسرت جبیں، راولپنڈی"

## نالۂ دل

میں اونچی اڑانوں کی قائل نہیں۔ میرا آئیڈیل کوئی زرق برق لباس والا شہزادہ ہے اور نہ ہی کوئی جیتا جاگتا یونانی مجسمہ، صرف معزز گھرانے کا تعلیم یافتہ فرد جو کسی اچھے عہدے پر فائز ہو۔ دراز قد، بھوری بھوری آنکھیں اور خوش کردار ہو۔

میں ایک معزز گھرانے کی لڑکی ہوں۔ تعلیم ایف ایس سی، گوری رنگت، سراپا دلفریب۔ مجھے یقین ہے کہ ضرور میرا آئیڈیل مل جائے گا۔ یہ میرے دل کی آواز ہے۔

"ایس۔ ایس۔ ناھید، بہاولنگر"

## شبنم کے موتی

میرا بھی ایک آئیڈیل ہے۔ مجھے شکل و صورت کی پروا نہیں نہ ہی دھن دولت کی۔ صرف خلوص اور سادگی کی دلدادہ ہوں۔ خوش مزاجی البتہ شرط ہے۔ اسے کم از کم چار زبانوں پر عبور حاصل ہونا چاہیے، مگر وہ زبان دراز یا شکی مزاج نہ ہو۔ مناسب عہدے پر فائز ہو اور عمر چالیس سال تک ہو۔

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی باشعور لڑکی ہوں۔ عمر ۱۸ سال، تھرڈ ائیر کی طالبہ، کاش مجھے میرا آئیڈیل مل جائے تو میں اس کے جبینی پیار کے موتی چن چن کر اپنی پلکوں میں پروتی رہوں۔

"زوبی عظمت"

## ادھورے سپنے

میرا آئیڈیل پاک فوج کا جواں سال لیفٹیننٹ ہے۔ دراز قد، سانولی رنگت اور ستاروں کی طرح جگمگاتی ہوئی آنکھیں جن سے ہر گھڑی خلوص اور چاہت کی کرنیں پھوٹتی رہیں۔

میں متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ عمر ۲۲ سال، تعلیم ایف اے، اسمارٹ، قبول صورت اور سادگی پسند۔ خدا کرے میری زندگی کے بکھرے ہوئے خواب کی تکمیل ہو جائے۔

"صالحہ شیخ۔ لیہ"

## جھڑکیاں سسکیاں

میرا آئیڈیل ایک ایسا نوجوان ہے جو اس دنیا سے بیزار اور اپنی ذات سے نفرت کرتا ہو۔ اکھڑ مزاج اور جھگڑالو۔ تعلیم سے بے بہرہ یا معمولی تعلیم یافتہ، تنخواہ اتنی ہو کہ خواہشات سسکتی رہ جائیں۔

میں ایک متوسط گھرانے کی لڑکی ہوں، عمر ۱۹ سال، فرسٹ ائیر کی طالبہ، رنگت قابل دید، سراپا بے حد دلفریب، دولت سے نفرت اور محبت کی پجارن ہوں۔

"شاھین سلطانہ۔ کراچی"

## لبوں کی آہٹ

میرا آئیڈیل — دراز قد نوجوان، سانولی رنگت، ڈاکٹر، پائلٹ یا آرمی آفیسر، تنخواہ اتنی ہو کر خوشگوار زندگی بسر ہو سکے۔ دراصل مجھے ایک ایسے ذہین شجیدہ انسان کی تلاش ہے جسے عورت سے بے وفائی کا داغ مل چکا ہو اور میں اسے اپنی چاہت کی پھوار سے دھو ڈالوں ایک ایسا مسکراتا ہوا چہرہ جس کے لبوں کی سرگوشی سے میں اپنے دل و دماغ میں اس کی آہٹ محسوس کر سکوں۔

میں متوسط گھرانے کی لڑکی ہوں۔ بڑی نازک مزاج اور حساس۔ عمر ۲۱ سال، ایف اے کی طالبہ، سراپا بے حد دلکش۔ میرا ناک نقشہ اداکارہ شبنم سے بہت ملتا جلتا ہے کاش مجھے میرا منا سا آئیڈیل مل جائے شکی مزاج حضرات آپے سے باہر ہونے کی کوشش نہ کریں۔

"مسلمہ سلطانہ، کراچی"

## گونگی دھڑکن

میرا آئیڈیل —— آرمی آفیسر، ڈاکٹر، انجینئر یا کلاس ون آفیسر ہو، دراز قد، اسمارٹ، سلجھا ہوا اور روشن خیال جو منفرد شخصیت کا مالک ہو۔ ذات کا پٹھان ہونا لازمی شرط ہے۔

میں نہایت معزز زمیندار گھرانے کی چشم و چراغ ہوں۔ عمر ۲۱ سال گریجویٹ، گوری رنگت، پرکشش آنکھیں اور سراپا انتہائی دلکش۔ میرے سینے میں پت جھڑ کا سماں ہے اور صرف میرے آئیڈیل کی پکار ہی اس کی رت بدل سکتی ہے۔ "مس شاھین خان، لاہور"

## شعور کی آنچ

مجھے بھی اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے۔ تعلیم یافتہ، روشن خیال نوجوان جو ڈاکٹر یا کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو۔ وہ خوش شکل اور خوش کردار ہو۔ مجھے لالچی اور شکی مزاج مردوں سے سخت نفرت ہے میں ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ عمر ۱۸ سال، تعلیم انٹر، دراز قد، کھلتا ہوا رنگ، متناسب جسم، حسن پرست ہوں مگر یہ میرا شعار نہیں۔ میری چاہت صرف اپنے آئیڈیل کے لیے وقف ہے اور میرے شعور کی جلتی بجھتی چنگاریوں میں بھی صرف اسی کی تڑپ موجود ہے کاش میری آواز میرے آئیڈیل تک پہنچ جائے۔

"صاعقہ ناز، راولپنڈی"

## ادب کی بات

مجھے خوابوں کا شہزادہ نہیں بلکہ ایک حقیقت پسند مشرقیت کا دلدادہ، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پرخلوص شریک حیات کی تلاش ہے۔ خوبصورت نہ سہی لیکن اعلیٰ سیرت اور بلند کردار کا مالک ہو۔ ادبی ذوق شرط ہے۔ آمدنی اتنی ہو کر ضروریات زندگی خوشگوار طریقے سے پوری ہو سکیں۔

میرا تعلق ایک معزز گھرانے سے ہے۔ عمر ۲۲ سال، تعلیم ایم اے، کھلتا ہوا گندمی رنگ، تیکھے نقوش اور دلکش سراپا، بڑی حساس ہوں اور دل درد آشنا رکھتی ہوں۔

کاش میری تمنا پوری ہو جائے۔

"شائستہ، کراچی"

## ہر فن مولا

میرا آئیڈیل — ہینڈسم اور اسمارٹ نوجوان عمر یہی کوئی ۲۷ سال۔ ضدی مگر خوش کردار، خوش لباس اور بے حد سلجھا ہوا انسان تاکہ ہم زندگی کے ہر شعبے میں قدم سے قدم ملا کر چل سکیں۔

اپنے بارے میں کیا عرض کروں کوئی شاعرہ تو نہیں جو شعروں میں بات کروں یہی کہنا کافی ہے کہ خوش شکل اور خوش لباس گریجویٹ لڑکی ہوں۔ بڑی اسمارٹ اور نت نئے فیشن کی دلدادہ، یوں سمجھئے ہر فن مولا ہوں اور زندگی کے کسی مرحلے پر بھی اپنے آئیڈیل کو مایوس نہ کروں گی۔ میں لاہور میں بیوٹی سیلون کھولنا چاہتی ہوں کاش میرا آئیڈیل میرا ہاتھ بٹا سکے تاکہ میں اپنی نئی زندگی کو مسکراہٹوں بھری خوش آمدید کہہ سکوں۔

"مس ناھید گل۔ لاہور"

## شیشے کا گھر

میں بھی متلاشی ہوں ایک آئیڈیل کی، مہذب، تعلیم یافتہ اور نیک سیرت نوجوان جو باوقار شخصیت اور مضبوط ارادوں کا مالک ہو۔ دولت مند یا آفیسر ہونا ضروری نہیں صرف اتنی آمدنی ہو کر خوشگوار گھریلو زندگی بسر ہو سکے۔

میں ایک متوسط گھرانے کی خوبصورت دوشیزہ ہوں عمر ۱۸ سال تعلیم انٹر، شکل و صورت کے اعتبار سے ہو بہو اداکارہ شو کا جیتا جاگتا عکس ہوں۔ گوری رنگت، ادھ کھلی کلیوں جیسی نیم باز آنکھیں، چہرہ آبگینے

کی طرح دمکتا ہوا اور سراپا جادو ہیں۔
کاش میرے تصورات میں جو بسنے والا آئیڈیل ہے مجھے مل جائے۔

"سامیرا نگار، کراچی"

## آنکھ کا تارا

"دوشیزہ" میں آئیڈیل کی تلاش کا کالم پڑھ کر میرے ذہن میں خود بخود ایک تصویر اُبھر آئی۔ شاید یہی میرا آئیڈیل ہے — ایک دراز قد، باوقار، پُرعزت مند نوجوان جس کی شخصیت رعب اور دبدبے سے عبارت ہو۔ بے انتہا خوددار اور مغرور انسان جو اپنی دُھن کا پکا اور قول کا سچا ہو۔ میں اسے اپنی آنکھ کا تارہ سمجھ کر اپنی ساری چاہتیں نچھاور کر دوں گی۔

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی بھولی بھالی لڑکی ہوں۔ حد درجہ ڈرپوک اور رات کے اندھیروں سے سخت خوف زدہ۔ مجھے اجالوں کی ضرورت ہے۔ میری شکل و صورت سیدھی سادی مگر سیرت کا جواب نہیں۔

"مونا غزل۔ حیدرآباد"

## سنتے جھروکے

میرا آئیڈیل — اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان، مردانہ وجاہت کا پیکر، دلکش شخصیت، سیر و تفریح کا دلدادہ، آمدنی اتنی ہو کہ مجھے یہ احساس ہی نہ ہو کہ میں ایک غریب کی گود میں پلی ہوئی نازک اندام لڑکی ہوں۔

میں ایک سید گھرانے کی چشم و چراغ ہوں۔ عمر ۱۸ سال، تعلیم میٹرک، سانولی رنگت، دُبلی پتلی، سبک رفتار اور پھول کی پتی کی طرح چکنی اور اور نرم و نازک ہوں۔ یہ خیال رہے کہ میرے تصور میں بسنے والا آئیڈیل ہرگز جہیز کا لالچی نہیں، کیونکہ میں اپنے دل اور دماغ کے جھروکوں سے اس کی شخصیت کا سراغ لگا چکی ہوں۔

"کوثر یاسمین، کراچی"

## گاتی بھیرسے پجارن

میری کزن کو اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے۔ عمر یہی کوئی ۲۵ سال دراز قد، خوبصورت اور اسمارٹ نوجوان جس کی آنکھوں میں شرارت اور دل میں خلوص ہو۔ تعلیمی معیار ایم اے، انجینئر، کیپٹن یا کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو۔

میری کزن کا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے ہے۔ عمر ۱۹ سال، بی اے کی طالبہ، دراز قد، گوری رنگت، سراپا دلفریب، بڑی سلیقہ مند اور حساس لڑکی ہے۔ وفاشعاری کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے آئیڈیل کی پجارن بن کر عمر بھر

اس کے گیت گاتی رہے گی۔

"صبا ناز، کراچی"

## تیرا گھر، میری جنت

میری ایک سہیلی کو اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے۔ دراز قد، تعلیم یافتہ اور پُرخلوص نوجوان جو اعلیٰ ذوق اور بلند کردار ہو۔ اعلیٰ عہدہ ضروری نہیں۔

میری سہیلی ایک بھولی بھالی لڑکی ہے۔ عمر ۲۱ سال، تعلیم میٹرک، خوش اخلاق اور وفا کی پتلی جو اپنی صلاحیتوں سے ایک غریب کے گھر میں بھی جنت کا سماں پیدا کر سکتی ہے۔ اس کی سیرت قابلِ رشک ہے۔

"فہمیدہ کنول، کراچی"

## بھولی شہزادی

میرا بھی ایک آئیڈیل ہے۔ ڈاکٹر، پائلٹ یا آرمی آفیسر جو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ آزاد خیال بھی ہو کیونکہ مجھے خوامخواہ کی بندشیں ہرگز گوارا نہیں۔ ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ پٹھان خاندان سے ہو۔

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی ہوں۔ میٹرک پاس، دُبلی پتلی اور نازک سی۔ میرا حسن و جمال روایتی شہزادیوں جیسا ہے، لیکن پیار کی بھوکی ہوں۔

کاش مجھے میرا آئیڈیل جلدی مل جائے تو اپنے حسن کی کرنوں سے اس کی شخصیت کو منور کر دوں۔

"نیلوفر خان، سرگودھا"

## پیکرِ تصویر

میرا آئیڈیل — دراز قد، صحت مند، خلوص کا پیکر نوجوان جو ایک حد تک آزاد خیال ہو۔ مصور ہو تو دوچند نصیب کیونکہ مجھے مصوری کا بڑا شوق ہے۔ وہ زندگی کی بنیادی ضرورتوں کو آسانی سے پورا کر سکے۔

میں سیدھے سادے گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۱۹ سال، سانولی رنگت، سراپا زلفِ دراز کا شہکار اور خدوخال سے حد دلفریب۔ اگر مجھے میرا آئیڈیل، میرا مصور مل گیا تو میں جی جان سے اس کی خدمت کروں گی۔ یہ خیال رہے کہ جہیز میں ایک روپے کا چھلا بھی نہیں مل سکتا۔

"عائشہ سلطان انصاری"

## ضرورت قدردان کی

میرا آئیڈیل ایک خوبصورت، ذہین اور دلفریب شخصیت کا مالک نوجوان ہے جو ثابت قدم اور باوفا ہو۔ تعلیم کم از کم میٹرک اور آمدنی اتنی کہ

سی بڑھتی ہوئی مہنگائی کی آندھی میں باعزت زندگی بسر ہو سکے۔
میں ایک متوسط گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۲۰ سال، تعلیم ایف اے، ناک نقشہ دلفریب اور خانہ داری کے ساتھ ساتھ سلائی کڑھائی میں بھی ماہر ہوں۔ کاش مجھے میرا آئیڈیل مل جائے۔

"ش، مردان"

## مہک چمک

میرا بھی ایک خوبصورت سا آئیڈیل ہے۔ دراز قد، کشادہ سینہ، بڑی بڑی آنکھیں، مردانہ وجاہت کا پیکر، ڈاکٹر، انجینئر یا کوئی بزنس مین ہو جو صحیح معنوں میں میرا جیون ساتھی بن سکے۔
میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی خوبصورت لڑکی ہوں۔ عمر ۱۸ سال، تعلیم ایف ایس سی۔ میں اپنے آئیڈیل کی بڑی بے چینی سے منتظر ہوں تاکہ دونوں مل کر ایک ایسے مثالی گھر کی داغ بیل ڈال سکیں، جس میں پیار کی مہک اور چاہتوں کی چمک ہو۔

"نسرین خان۔ ایبٹ آباد"

## پیار کی آندھی

میں نے اپنے نہاں خانۂ دل میں چھپے ہوئے آئیڈیل کو الفاظ کا روپ دینے کی ہمت کی ہے جو میرے سپنوں کا پیکر ہے۔ خوبرو، تعلیم یافتہ اور فراخ دل نوجوان جو ایک خوشگوار ازدواجی زندگی کی ضمانت دے سکے۔ خوش اخلاق اور خوش گفتار ہو اور مجھے کچھ اس طرح ٹوٹ کر پیار کرے کہ میں اس کی نظروں کے سامنے بار بار بکھرتی اور سمٹتی رہوں۔ وہ شکی مزاج ہرگز نہ ہو۔
میں ایک معزز گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۱۹ سال، میٹرک کی طالبہ، سفید رنگت، سراپا دلفریب، میری سرمگیں آنکھوں میں حیا کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔
کاش مجھے میرا آئیڈیل مل جائے۔

"آر خان، لاہور"

## برہا کی تپش

میرا بھی ایک آئیڈیل ہے۔ ڈاکٹر، انجینئر یا بزنس مین جو دراز قد، خوبصورت اور پرکشش شخصیت کا مالک ہو اور عملی زندگی کا ہر چیلنج قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔
میں متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ عمر ۲۰ سال، تعلیم میٹرک، دراز قد، دلکش ناک نقشہ، خد و خال دلفریب۔ سلائی کڑھائی میں ماہر ہوں۔ بے حد روشن خیال اور نفاست پسند ہوں۔ میں سچی محبت کی متلاشی ہوں اور زندگی کے اس مرحلے میں داخل ہو چکی ہوں جہاں اپنے آئیڈیل سے دوری کی تاب نہیں لا سکتی۔
کاش "دوشیزہ" کے توسط سے میری آرزو پوری ہو جائے۔

"سمرین اشرف، کراچی"

## یادوں کا دھواں

میرا آئیڈیل آرمی کیپٹن یا سول میں اعلیٰ عہدیدار ہو۔ عمر تقریباً ۳۰ سال، دراز قد، بڑی بڑی روشن آنکھیں اور ہونٹوں پر ہر گھڑی مسکراہٹ کھیلتی نظر آئے۔ وہ شکی مزاج اور پابندیاں لگانے والا نہ ہو اور مجھے زندگی کی تمام آسائشیں مہیا کر سکے۔
میرا تعلق متوسط طبقے سے ہے۔ عمر ۲۳ سال، تعلیم بی اے، گوری چٹی، سراپا دلکش۔ میرا آئیڈیل مجھے ٹوٹ کر چاہے اور میری تمام محرومیوں کا ازالہ کرے تاکہ میرے دل و دماغ سے پرانی یادوں کا دھواں یکسر چھٹ جائے۔

"پروین، ساہیوال"

## چاہت تیری رواں رواں

میرا بھی ایک آئیڈیل ہے۔ روشن خیال، ڈاکٹر، کیپٹن یا بڑا بزنس مین، کاروباری ذہن کا مالک۔ شخصیت ایسی ہو کہ دیکھ کر تحفظ کا احساس پیدا ہو۔ میں خوبصورتی سے زیادہ خوب سیرتی کی قائل ہوں۔
میرا تعلق ایک نہایت معزز زمیندار پنجابی گھرانے سے ہے جہاں مجھے زندگی کی ہر آسائش میسر ہے۔ عمر ۲۳ سال، تعلیم ایف اے، دبلی پتلی سانولی سی لڑکی جس کا رواں رواں اپنے آئیڈیل کی چاہت میں گزرتا ہے۔
مجھے یقین ہے کہ مجھے میرا چاہتا آئیڈیل ضرور مل جائے گا۔

"مس پروین، حیدرآباد"

## سوز و ساز

میں نے بھی اپنے لیے ایک آئیڈیل تراشا ہے۔ ایئر فورس یا نیول آفیسر، دراز قد، پروقار اور مردانہ وجاہت کا پیکر، سنجیدہ مزاج مگر بڑی بڑی آنکھیں شرارت سے لبریز ہوں۔
میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی انتہائی خوبصورت لڑکی ہوں۔ سفید رنگت، سنہرے بال اور بڑی بڑی شربتی آنکھیں، یوں بھی بجلی گرانے والی

آواز بڑی پُرسوز پائی ہے جسے سنتے ہی سامعین دل کے سلسلے تڑپ اٹھتے ہیں۔ سیر و سیاحت کی بڑی شوقین ہوں۔

"صوبیہ مغل، کوئٹہ"

## غضب کی کاٹ

میرا آئیڈیل کیا ہے!

انتہائی ہینڈسم فوجی کپتان یا کسی اور معزز عہدے پر فائز نوجوان جس کے قدم دھرتی پر اپنی شرافت کا نقش بناتے جائیں۔ روشن خیال اور اعتماد کرنے والا انسان چالاکی ہرگز نہ ہو۔ اگر وہ چوہان فیملی سے ہو تو زہے نصیب ورنہ کسی معزز پٹھان گھرانے سے متعلق ہو۔

میں معزز چوہان فیملی کی گریجویٹ لڑکی ہوں۔ عمر ۲۲ سال، نہایت حسین اور حساس لڑکی جس سے مل کر انتہائی غضب ناک انسان بھی نرم پھویا بن جاتا ہے۔ میں ہر ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کرنے والی معصوم لڑکی ہوں اور مجھے خداداد صلاحیتوں پر بڑا ناز ہے۔

میں اپنے آئیڈیل کی پکار کی منتظر ہوں۔

"شمین چوہان، کراچی"

## فن کار

میرا آئیڈیل — اسمارٹ تعلیم یافتہ نوجوان، قبول صورت اور خوش لباس، عمر یہی کوئی ۲۸/۲۵ سال، دولت مند نہ سہی مگر وہ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی کا ضامن بن سکے۔

میں ایک نہایت معزز گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۲۰ سال تعلیم میٹرک، بے حد ذہین اور حساس، ناک نقشہ دلفریب، سنہری رنگت، فنونِ لطیفہ سے گہری دلچسپی ہے۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ صرف اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے۔

خدا کرے مجھے میرا آئیڈیل جلدی مل جائے۔

"م۔ بخاری، لاڑکانہ"

## باوفا — پُرخلوص

میرا آئیڈیل اچھے عہدے پر فائز وہ نوجوان ہے جو باوفا اور پُرخلوص شوہر ثابت ہو سکے۔ وہ خوش اخلاق اور خوش لباس ہو اور معزز پنجابی گھرانے سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ مالی اعتبار سے اس قابل ہو کہ زندگی کی بنیادی ضروریات آسانی سے مہیا کر سکے۔

میں معزز کشمیری گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ تعلیم انگلش میڈیم انٹر، رنگ صاف، دلفریب، امورِ خانہ داری میں ماہر ہوں۔ میں قدامت پسند ہوں نہ الٹرا ماڈرن۔ البتہ حالات کے مطابق ڈھل سکتی ہوں۔

"ج، ج، ح۔ کراچی"

## شرافت — شرطِ اوّل

ہمیں اپنی باجی کے لیے حقیقت پسند رفیقِ حیات کی تلاش ہے۔ معزز کھاتے پیتے گھرانے کا مہذب اور تعلیم یافتہ نوجوان بزنس مین یا اعلیٰ عہدے پر فائز، اگر ڈاکٹر ہو تو بہت خوب، پاکستان سے باہر ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ صحت مند، خوش مزاج اور خوش کلام ہو اور صحیح معنوں میں پُرخلوص، ہمدرد اور ساتھ نبھانے والا۔ شرافت البتہ شرطِ اوّلین ہے۔

ہماری باجی کا تعلق ایک نہایت معزز گھرانے سے ہے۔ عمر ۲۴ سال، تعلیم ایم ایس سی، تیکھے نقوش اور سراپا دلکش، بلند کردار اور عالی ظرف، طبعاً ذہین اور سگھڑ۔ سلائی اور کڑھائی میں ماہر۔ بہت سے انعامات حاصل کر چکی ہیں۔ والد صاحب ایک بہت بڑے ادارے کے جنرل منیجر ہیں۔

"عنبر خلش، کراچی"

## جنت کے مزے

میرا آئیڈیل — آرمی کمیشن، نیول آفیسر، ڈاکٹر یا بزنس مین۔ ایک ایسا سلجھا ہوا انسان جو خوبصورت اور خوب سیرت بھی ہو۔ شکی مزاج تو ہرگز نہ ہو۔

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی اسمارٹ لڑکی ہوں۔ بڑی نازک طبع اور حساس مگر شوخ اور شریر بھی ہوں۔ میرے نقوش تیکھے اور سراپا بڑا دلکش ہے۔ میں گھر کو جنت بنانے کے فن سے بھی بخوبی واقف ہوں اس لیے میرا آئیڈیل عمر بھر بہاروں سے کھیلتا رہے گا۔

"نائیلہ ثروت، بہاولنگر"

## مفلس کا چراغ

دل تو نہیں چاہتا کہ اپنے آئیڈیل کے بارے میں زبان کھولوں لیکن حالات کی ستم ظریفی نے مجبور کر دیا ہے۔ غریب والدین کی اکلوتی نورِ نظر ہوں اور کوئی بہن بھائی نہیں ہے۔ بچارے پیٹ کاٹ کاٹ کر میری تمام ضروریات پوری کرتے ہیں۔ ان کی اس بے مثال قربانی سے ایک مقامی کالج میں ایف ایس سی کی طالبہ ہوں۔ غربت کی وجہ سے

رنگ انگلیاں بھی اٹھاتے ہیں مگر مجبور والدین کا بس نہیں چلتا۔ مجھے یہ صورت حال ذرا بھی نہیں بھاتی۔ اس لئے ہر گھڑی بجھا بجھا سا رہتا ہے۔
میرے غریب والدین نے مجھے اس امید پر تعلیم دلائی ہے کہ مستقبل قریب میں ان کا سہارا بنوں لیکن یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔ میں ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں۔ بھلا میرے غریب والدین کب تک صرف میری خاطر اپنی جان پر کھیلتے رہیں گے۔
اس گھٹے گھٹے ماحول میں پہلے میرا پوشیدہ آئیڈیل کا تصور سخت بے چین کر دیتا ہے۔ میرا آئیڈیل دراصل ایک ایسا تعلیم یافتہ اور باشعور نوجوان ہے جو میرے دل و دماغ کے دکھتے ہوئے ناسور کے لیے مرہم فراہم کر سکے اور اس طرح میری زندگی کی تھرتھراتی ہوئی ناؤ کو سنبھالا دے کر میری خداداد صلاحیتوں کو گھن لگنے سے بچالے۔

• شبانہ نازلی، کراچی

## میرا ساون روٹھا جائے

میرا بھی ایک آئیڈیل ہے — ایک معزز گھرانے کا تعلیم یافتہ خوبرو نوجوان جو حقیقت پسند اور فراخ دل ہو، مردانہ وجاہت کا پیکر اور عملی زندگی کا تجربہ رکھنے والا ایسا انسان جو اپنی چاہتوں کے سہارے میرے دل میں اپنا گھر کرے۔ آمدنی اتنی ہو کہ موجودہ دور کی بنیادی ضروریات خوشگوار طریقے سے پوری ہو سکیں۔
میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی ہوں۔ بی اے کی طالبہ، کھلتا ہوا سانولا رنگ، سراپا بے حد پرکشش۔ یوں بھی بڑی حساس طبع ہوں۔ پچھلا ساون میری تنہائیوں پر آنسو بہاتے رخصت ہو گیا۔ خدا کرے پھر وہی درد ناک سماں بندھ جائے۔ کاش میرے دل کی بات پوری ہو جائے۔

• ک، ن، کراچی

## سیدھی سادی بات

میری بہن کو اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے۔ معزز گھرانے کا اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص جو آفیسر ہو یا بزنس میں ہو، صحت مند، قبول صورت اور خوش اخلاق ہو۔ اگر وہ غیر ممالک میں رہائش پذیر ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔
میری بہن یو پی کے معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ عمر ۲۲ سال، تعلیم ایم اے، راولپنڈی میں کلاس ون آفیسر ہے۔ وہ بڑی سگھڑ، خوش مزاج اور ملنسار ہے۔

- جنس لطیف کی محبت آتش دان اتھاہ سمندر ہے اور مرد کی محبت ایک جوئے کم آب۔
- عفو کی لذت انتقام کی تلخی سے بہتر ہے۔
- دنیا انسان کی حسن سعی، حسن سلوک اور حسن معاملہ سے بہشت بن سکتی ہے۔
- اپنے آرام و آسائش کے لیے ہی محنت نہ کرو بلکہ قوم و ملک کی مشترکہ دولت میں اضافہ کرنے کے لیے خون پسینہ ایک کر دو۔

خدا کرے اس کے دل کی مراد بر آئے۔

• بیگم شہناز حسن، کراچی

## ڈھلتے سائے

میرا آئیڈیل معزز آرائیں گھرانے کا ایک ایسا خوبصورت تعلیم یافتہ نوجوان ہے جو خوش کردار اور خوب سیرت ہو۔ اعلیٰ پوسٹ پر فائز یا بزنس میں۔ اس کا ذاتی مکان اور زمین بھی ہو۔ آمدنی اتنی کہ اس مہنگائی کے دور میں باعزت زندگی بسر ہو سکے۔ لالچی اور مطلب پرست ہرگز نہ ہو۔
میں ایک معزز آرائیں گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۱۷ سال، تعلیم میٹرک، رنگ کھلتا ہوا گندمی۔ میں دل و جان سے اپنے آئیڈیل کی منتظر ہوں اور سوچتی ہوں کہ وقت کے ڈھلتے سائے کہاں تک انتظار کریں گے۔

• رضیہ سلطانہ، [illegible]

## گریۂ شب گاہی

میرا آئیڈیل اسی دنیا کا جیتا جاگتا فرد ہے۔ انجینئر، ڈاکٹر، ملٹری کیپٹن یا کلاس ون آفیسر۔ عمر یہی کوئی ۳۵ سال، دراز قد، اعلیٰ تعلیم یافتہ، باوقار اور مردانہ وجاہت کا مکمل نمونہ بالکل اداکار محمد علی کی طرح۔ وہ خوش لباس، خوش مزاج، پُرخلوص اور وفا شناس ہو۔ عالی حوصلہ اور مضبوط قوت ارادی کا مالک جو حالات کا مقابلہ اپنے زور بازو اور سوجھ بوجھ سے کر سکے۔
میں ایک معزز ایرانی گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۲۸ سال، تعلیم بی اے۔ میرا سراپا اعلیٰ ظرفی اور خوش سیرتی سے تراشا ہوا بے مثال

عبدالرحمن خان
مکان نمبر ۵۰۸-۱۲، لیاقت آباد کراچی

---

میں ایک ۲۵ سالہ پڑھا لکھا غیر شادی شدہ نوجوان ہوں اور آپ کو دل و جان سے قبول کرنے کو تیار ہوں۔

شاہ زمان
پاور ہاؤس۔ پوسٹ بکس ۵۶۴۔ دیرہ۔ دوبئی (ٹرشل اسٹیٹ)

---

آپ کو اپنے معیار کے مطابق سمجھتا ہوں۔ عمر ۲۴ سال، شادی شدہ
تنخواہ ۱۴۳۰/- روپے ماہانہ۔

محفوظ، ۳ سباب روڈ
پوسٹ بکس ۱۸۳ - پشاور کینٹ

---

عمر ۳۰ سال، گریجویٹ شادی شدہ۔ ذاتی پریس اور نیوز ایجنسی

سراج احمد معرفت المشیر پرنٹرز
۲۱، شہاب مارکیٹ، نزد الحسن کافی ہاؤس
ناظم آباد - کراچی

انجو رانی کے نام!

آپ کا انداز تحریر بہت پسند آیا۔ فوج میں کیپٹن کے عہدے پر ہوں۔ کار، بنگلہ سب موجود ہے۔

کیپٹن جے، رحمان
پوسٹ بکس نمبر ۶۲۰۶ - کراچی ۲

---

آپ کے معیار پر پورا اترتا ہوں۔ میں انجینئر ہوں

محمد حسین، بی ایس سی۔ الیکٹریکل انجینئر
وارڈ نمبر ۸ - محلہ ڈی نکا صاحب - شیخوپورہ

---

آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ سرکاری ملازم۔ تنخواہ ۱۵۰۰/- روپے ماہانہ۔

اے۔ ایل۔ جاوید
اے ۲/۶ پوسٹ گریجویٹ ہاسٹل
جناح پوسٹ گریجویٹ سینٹر۔ کراچی

رعنا تبسم کے نام!

میں آپ کی خوبیوں کا قائل ہوں۔ عمر ۲۵ سال، سرکاری ملازم

---

تنخواہ ۵۰۰/- روپے ماہانہ۔

ایم۔ ایم۔ عباسی کلرک
لیبر آفس بنگلہ ۱ - اے - جی او آر کالونی - حیدرآباد

---

آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ عمر ۱۹ سال، میٹرک، ذاتی کاروبار اور مکان۔

طالب حسین اوٹھو
سیفی پور دہار، سیہون شریف ضلع دادو

---

میں آپ کے آئیڈیل کے مطابق ہوں۔ عمر ۲۲ سال۔ تنخواہ ۴۰۰/- روپے ماہانہ۔

اظہر علی صدیقی
معرفت مشاہد علی صدیقی سینئر اکاؤنٹنٹ
پریمیر شوگر ملز لمیٹڈ تخت بھائی - صوبہ سرحد

رفعت جبیں کے نام!

میں آپ کی خوبیوں کا سخت قائل ہوں۔ ڈپلومہ سول انجینئرنگ، انگریزی کمپنی میں ۳۰۰۰/- روپے ماہانہ پر ملازم ہوں۔ پنجاب سے تعلق ہے۔ جہیز کو لعنت سمجھتا ہوں۔

ایم۔ آر۔ رانا
پوسٹ بکس نمبر ۲۵۱۹ - دوبئی (ٹرشل اسٹیٹ)

---

دنیا میں بہت سے دکھ اٹھا کر مقام پایا ہے۔ کار اور مکان بھی ہے اور نہایت معقول ملازمت۔

IFTIKHAR AHMED
ISHOJ . STRANDGARDEN NO-6
I ST . T.H. KOBENHAVN DEMARK

---

آپ کے معیار پر پورا اترتا ہوں۔ عمر ۲۵ سال، پیشہ ڈسپنسر

میں آپ کے احساسات کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ پہلا آئی ٹی اے
میں آفیسر ہوں۔ تعلیم پی ایس سی سکنڈ کی ۔/۹۰۰ روپے ماہانہ

ناصر
۳۰۰۔ پی آئی بی کالونی۔ کراچی ۵

---

آپ کے خیالات کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ عمر ۲۳ سال۔ تنخواہ
۔/۹۰۰ روپے ماہانہ۔

انجم اقبال
۲۷۴۔ ڈی۔ جانفی چوک۔ غلام محمد آباد۔ لائلپور

رخسانہ خالد کے نام!
میں آپ کے آئیڈیل پر پورا اترتا ہوں۔ تعلیم یافتہ انجنیئر۔ آمدنی
۔/۹۰۰۰ روپے

حیدر علی
پوسٹ بکس ۲۸۳ جدہ۔ سعودی عرب

---

میں آپ کے خیالات کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ عمر ۲۴ سال۔ پیشہ
ڈرائیور۔ تعلیم میٹرک۔ تنخواہ ۔/۳۵۰۰ روپے ماہانہ۔

محمد ڈرائیور
پوسٹ بکس نمبر ۳۴۳۸، دیرہ، دوبئی (یو اے ای)

---

آپ کے منفرد خیالات سے بہت متاثر۔ عمر ۲۵ سال۔ تنخواہ
۔/۶۰۰ روپے ماہانہ۔ منقول جائداد۔

ایم ضمیر جیلی
پوسٹ بکس ۱۸۳۔ پشاور کینٹ

---

آپ کے خیالات کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ عمر ۲۶ سال۔ تعلیمی بی اے
آمدنی ۔/۵۰۰ روپے ماہانہ۔

ایم اے خان
۲۳/۲ ڈی۔ ایریا۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

ذکیہ فاروق کے نام
ایک اجلے جذبے کے تحت آپ کے پیغام کو لبیک کہہ رہا ہوں
امید ہے مایوس نہ کریں گی۔

فاروقی
اولڈ ہوسٹل بے بی ایم سی۔ کراچی ۳۵،

---

آپ ہی میرے آئیڈیل ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدے پر
فائز ہوں۔

"۳۰ ج"
معرفت محمد ہارون۔ خدیجہ منزل ہتھر ڈوڈ
پٹنی کمل مین OT1/12/2 اولڈ ٹاؤن۔ کراچی ۲۰

عشرت ناز کے نام
آپ کے خیالات میری شخصیت سے بہت مطابقت رکھتے ہیں
میں آپ کی تحریر سے بہت متاثر ہوا ہوں۔

سرفراز
پوسٹ بکس ۹۶۳۔ شارجہ (یو اے ای)

---

آپ کے معیار پر پورا اترتا ہوں۔ میرا تعلق بھی کشمیر سے ہے۔ ملتی
نوجوان ہوں۔ تنخواہ ۔/۴۰۰۰ روپے ماہانہ۔ پاکستان میں کافی جائداد ہے

A.H. QUMI

P.O.BOX NO. 334 ABU DHABI (U.A.E)

نادرہ کراچی کے نام:
آپ کے خیالات دوشیزہ میں پڑھے۔ دس سال سے انگلینڈ میں
مقیم ہوں۔ یہیں سے پوسٹ گریجوایشن کیا۔ ماہوار آمدنی دس ہزار روپے
ہے۔ کراچی میں بھی ۲/۳ ہزار کی ملازمت آسانی سے مل سکتی ہے۔ جہیز
کا قطعی خواہشمند نہیں۔

M. IQBAL MSc

72 LUMB LANE BRADFORD - 8

(W. YORKS) ENGLAND

پروین کراچی کے نام:
آپ کے خیالات سے کافی متاثر ہوا ہوں۔ سرکاری آفیسر ہوں۔

زیڈ معرفت یسین
۱۰۴ اولڈ اولڈ ہاسٹل بے پی ایم سی۔ کراچی

آپ کے معیار کا حقیقی سب ہوں۔ عمر ۲۷ سال، تعلیم بی اے۔
ذاتی بزنس، آمدنی ۔/۸۰۰ روپے ماہانہ۔

افضال احمد زبیری
پوسٹ بکس ۹۱۱۲۔ نئی کراچی۔ کراچی ۳۶

نمین مغل کے نام!
اگر آپ سنجیدہ ہیں تو میں آپ کے لئے ایک چیلنج ہوں۔ براہ راست
جلد از جلد رجوع فرمائیں

A.A. KHAN

P.BOX 1897 DUBAI AIRPORT (U.A.E)

میں سروقد صدی آپ کے خیال کے عین مطابق ہوں۔ ڈنمارک
میں مستقل رہائش ہے۔ آمدنی نہایت معقول ہے۔ میں آپ کے ساتھ ایک
دوسرے کے دکھ درد بانٹنے کو تیار ہوں۔

MOHAMMAD SALEEM

GARTNERGADE 9H - ST - TH

2200 COPENHAGEN - N DENMARK

افشاں ناز سکھر کے نام:
آپ کی تحریر سے سخت متاثر ہوں۔ عمر ۳۲ سال۔ سائنس گریجویٹ
سرکاری ملازم۔ تنخواہ ۔/۹۵۰ روپیہ ماہانہ
ایس ایم خورشید
ڈبلیو ایم الیکٹریکل۔ پی او ایف
سنجاول سائٹ۔ ضلع کیمبل پور،

مس غزالہ کے نام!
میں آپ کے جذبات کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ باعزت عہدے
پر ملازم ہوں۔ تنخواہ ۔/۱۰۰۰ روپیہ ماہانہ
سید خالد ندیم
بلاک نمبر ۱۷، ڈیرہ غازی خان

ص ب کراچی کے نام:
آپ کے اور میرے جذبات و خیالات میں بہت مطابقت
ہے۔ آپ کے معیار کے عین مطابق ہوں۔ ذہین نوجوان ہوں۔ آپ کی ای
ہونی والی شرطیں مجھ میں موجود ہیں۔
سید نیاز حسین
کاہنا نو، تحصیل و ضلع لاہور،

مس شیبا خان کے نام
آپ یقیناً میری آئیڈیل ہیں۔ میں ایک خوبصورت اور اسمارٹ
انجینئر ہوں۔ تنخواہ ۔/۱۵۰۰ روپیہ ماہانہ
ظہور الحق۔ شفٹ انجینئر
منگلا آئیڈل پاور اسٹیشن۔ منگلا۔

فوزیہ بٹ کے نام
میں شاید آپ کے معیار پر پورا اتر سکوں۔ ملک کی ایک پاکستانی فرم
میں اچھے عہدے پر فائز ہوں۔ تنخواہ ۔/۱۹۰۰ روپیہ ماہانہ۔ کشمیری خاندان
ظہیر اختر
۲/۱/۵-۴ ناظم آباد، کراچی ۱۸

شہناز کراچی کے نام:
آپ کا آئیڈیل بن سکتا ہوں۔ تعلیم بی ایس سی، مقامی بینک
میں آفیسر ہوں۔ تنخواہ ۔/۹۵۰ روپیہ ماہانہ۔
شمیم ۲/۳/27 جیکب لائن، کراچی

سروش افشاں کے نام!
آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ تعلیم بی اے۔ تنخواہ ۔/۸۰۰
روپیہ ماہانہ۔
ایم۔ صدیق احمد
بی پی او، ڈسٹرکٹ پلاننگ آفس، بہاولنگر

انجم سلطانہ کے نام
دوشیزہ میں آپ کے خیالات پڑھے۔ عمر ۲۸ سال تعلیم ایف ایس
سی۔ تنخواہ ۔/۲۸۵۰ روپیہ ماہانہ۔ گوجرانوالہ کے راجپوت خاندان سے
تعلق رکھتا ہوں
محمد اقبال۔ آپریٹر
پوسٹ بکس نمبر ۹۳۸ - ابوظہبی (یو اے ای)

م س کراچی کے نام
میں آپ کے خیالات سے کافی مطمئن ہوں اور یہاں کامیاب
زندگی بسر کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ہم ایک دوسرے کے آئیڈیل ہیں
براہ راست رجوع فرمائیں۔

M. ASKAR KHAN

P.O. BOX NO. 6775, SALAMYA - KUWAIT

---

آپ کے خیالات کی بے حد قدر کرتا ہوں۔ یہاں کی فرم کا
باعزت ورکر ہوں۔ تنخواہ ۔/۳۰۰۰ روپیہ ماہانہ۔ تعلیم یافتہ ہوں۔

ABDUL HAMID BALOCH

P.O. BOX NO 339 ABU DHABI (U.A.E)

عالیہ کراچی کے نام
میں آپ کے خیالات سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ مجھ سے بہتر
آئیڈیل چراغ لے کر بھی ڈھونڈنے سے نہ ملے گا۔ ماہانہ آمدنی ۹ ہزار
روپے۔
محمد حسین زیدی
پوسٹ بکس ۲۸۴ - جدہ - سعودی عرب

---

میں آپ کے تصوراتی خاکے کے عین مشابہ ہوں۔ عمر ۲۹ سال،
سعودی عرب میں سات ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ پاتا ہوں
آر لے خان معرفت پرویز اسحاق ڈار

**شوکت تھانوی بجلی کی کڑک چمک سے**

بہت گھبراتے تھے۔ ایک دن تیز بارش ہو رہی تھی۔ شوکت گھر پر تھے۔ خوفناک قسم کی کڑک کے بعد بجلی کی چمک شروع ہوئی تو وہ بہت گھبرائے۔ بیگم کو ہدایت کی کہ کھڑکیاں بند کر کے پردے چڑھا دیں۔ ایک صاحب اور بھی موجود تھے۔ بیگم شوکت نے تو شوکت تھانوی کی بات کا نوٹس نہ لیا۔ شوکت کے دوست نے بیگم شوکت سے پوچھ لیا: "آخر کیا بات ہے کھڑکیاں بند کرنے پر اصرار کر رہے ہیں۔" انھوں نے جواب دیا: "یہ ان کی آج کی نہیں ہمیشہ کی عادت ہے کہ جہاں بجلی چمکی اور ان کے اوسان خطا ہوئے۔"

دوست نے شوکت سے ڈر کی وجہ پوچھی، تو انھوں نے نہایت معصومیت سے کہا: "آپ بھی خوب چیز ہیں کیا آپ نے نہیں سنا کہ بجلی ہمیشہ سیاہ رنگ کی چیز پر گرتی ہے۔"

ایس ایم رضا      ہزار روپے ماہانہ

26 GROVE ROAD LUTON BEDS, ENGLAND

**رخشندہ طلعت کے نام!**

آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ عمر ۲۵ سال۔ آمدنی ۵۰۰/- روپے ماہانہ

غلام محمد

محمد نیجو منزل۔ محلہ ڈرو ضلع سانگھڑ

**شہزادی گل لاہور کے نام**

آپ کے خیالات اور احساسات سے متفق ہوں۔ عمر ۲۴ سال، تعلیم ایم ایس سی۔ امریکہ جا رہا ہوں جہاں ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کروں گا۔ تنخواہ ۲۵۰/- ڈالر فی ہفتہ۔ اس پتے پر خط لکھیں

فرخ فاروق

47 - 51 - 39 STREET SUNNYSIDE,

N.Y 11001 REGO PARK NEWYORK,

**نعیمہ گجرات کے نام**

میں معزز گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ عمر ۲۵ سال، تعلیم ایف اے۔ تنخواہ ۵۰۰/- روپے ماہانہ۔

غضنفر علی جعفری

اسٹور کیپر ریاست آفس۔ کالا باغ۔ میانوالی

**زبیدہ گل راولپنڈی کے نام**

آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ عمر ۲۶ سال گریجویٹ آمدنی تقریباً ۳۰۰/- روپے ماہانہ۔

جاوید اعجاز۔ شنکر بازار مردان

**اختر اقبال کے نام**

آپ کے معیار پر پورا اترتا ہوں۔ عمر ۲۸ سال تعلیم ایم اے۔ محکمہ نہری بطور ضلعدار ملازم ہوں۔

چوہدری عبدالرحمٰن ضلعدار

معرفت اکبر دواخانہ بلاک نمبر ۱۔ ڈیرہ غازی خان

**شاہینہ ناز وہاڑی کے نام**

آپ کے خیالات سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ سرکاری ہسپتال میں فارماسسٹ ہوں۔ عمر ۳۱ سال۔ تنخواہ ۲۵۰۰/- روپے ماہانہ

ن ۔ م

پوسٹ بکس نمبر ۳۲۵ ۔ شارجہ (یو اے ای)

**مایا دیوی کے نام،**

آپ کے جذبات و احساسات کی دل و جان سے قدر کرتا ہوں عمر ۲۵ سال، گریجویٹ۔ ریونیو آفیسر

ناصر

مکان نمبر ۱۴/۷ نیمن ٹاؤن کاسی روڈ۔ کوئٹہ

**مس عرفانہ عرفان کے نام**

میں آپ کو اپنا آئیڈیل تصور کرتا ہوں۔ تعلیم بی اے۔ والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں اور پچاس ایکڑ اراضی کا واحد مالک۔ عنقریب یورپ جا رہا ہوں۔

شیخ ظفر بی اے

معرفت بشیر میڈیکل سٹور مین بازار۔ صادق آباد

**نسیمہ ممتاز کے نام،**

میں معزز اور اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ عمر ۲۶ سال تعلیم میٹرک۔ ملٹری میں بطور نائب پوسٹ ملازم ہوں۔ تنخواہ ۳۰۰۰/- روپے ماہانہ۔

محمد اقبال کلرک نمبر ۱۴۸۰۹

فرسٹ رجمنٹ عمان آرٹلری ہیڈ کوارٹر

روستاق۔ سلطنت عمان

**شائستہ کے نام**

میں معزز اور اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ ملٹری میں بطور کلرک

ملازم ہوں۔ تنخواہ ۳۰۰۰/- روپے ماہانہ

محمد صادق ارشاد ۱۴۸۱۵

فرسٹ رجمنٹ عمان آرٹلری

ہیڈ کوارٹر رستاق۔ سلطنت عمان

زاہدہ جہلم کے نام

میں آپ کے معیار پر پورا اترتا ہوں۔ عمر ۲۲ سال، تعلیم میٹرک

تنخواہ ۲۰۰۰/- روپے ماہانہ۔ جہلم کا رہنے والا ہوں

ایم ارشاد جہلمی

پوسٹ بکس نمبر ۸۱۳۹ - صلالہ، سلطنت عمان

---

آپ کے کالم سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ پانچ سال سے ڈنمارک

میں مقیم ہوں۔ تنخواہ ۷۵۰۰/- ماہانہ

B.A. CHOWDHRY

VAEVERGADE - 6 ST. TV. 2200

K.B.H.N. DENMARK

درخشندہ کراچی کے نام

میں آپ کے جذبات و خیالات کی دلی قدر کرتا ہوں۔ عمر ۲۱ سال

تعلیم ایف ایس سی۔ ایئر فورس میں ہوں۔

نفیس اکرم - ایئرمین

میس نمبر ۱ - پی اے ایف بیس کورنگی کریک کراچی ۳

---

میں آپ کے معیار پر پورا اترتا ہوں۔ عمر ۱۹ سال تنخواہ ۴۰۰/-

روپے ماہانہ — سپاہی محمد عارف ۴۳۵

ٹیپ کمپنی ایس ایس جی چراٹ۔ ضلع پشاور

آپ کے خیالات پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ عمر ۲۶ سال۔ عمان

ملٹری میں سارجنٹ کے عہدے پر ہوں۔ تنخواہ نہایت معقول۔

سارجنٹ محمد جان بیگ نمبر ۷۶۸۰

فرسٹ رجمنٹ عمان آرٹلری

ہیڈ کوارٹر رستاق۔ مسقط عمان

زاہدہ (ج) کراچی کے نام

میں آپ کے خیالات کی ہوبہو تصویر ہوں۔ معقول تنخواہ

A. REHMAN

VOGNMANDSMARKEN 17. I. TV

2100 KOBEN HAVN. Ø DENMARK

---

فوجی نوجوان ہوں۔ تعلیم میٹرک، تنخواہ ۳۰۰۰/- روپے ماہانہ

جہیز کی قطعی ضرورت نہیں

فضل کریم خان کوش

فرسٹ رجمنٹ عمان آرٹلری بی بیٹری

ہیڈ کوارٹر سلایر ظفار۔ سلطنت عمان

---

معزز گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ تعلیم بی اے۔ تنخواہ ۹۰۰/-

روپے ماہانہ — محمد اقبال ایوبی

ایڈمن آفیسر۔ نسیم آئل ملز

سورج کنڈ روڈ - ملتان

ع فاطمہ کے نام!

دوشیزہ میں آپ کا کالم پڑھا۔ میں ایک قبول صورت، دراز قد،

صحت مند نوجوان ہوں۔ پیشہ انجینئرنگ۔ تنخواہ ۸۰۰۰/- روپے

ماہانہ ہے۔ — محمود الرحمٰن

پوسٹ بکس ۷۸۷ - ابوظہبی (یو اے ای)

شیریں (ملتانی) کے نام!

آپ کی تحریر نے مجھے سخت متاثر کیا ہے۔ عمر ۳۰ سال، تعلیم ایم اے

تنخواہ تقریباً ۲۰۰۰/- روپے ماہانہ۔

نسیم اے چوہدری

معرفت پوسٹ بکس نمبر ۱۵۸۸ - لاہور

******

# دوشیزہ کی محفل

**محمد امین، کراچی**

گزشتہ چند ماہ سے دوشیزہ کا باقاعدگی سے مطالعہ کر رہا ہوں اور اسے خواتین اور مردوں دونوں کے لیے ایک معیاری اور منفرد رسالہ پایا ہے۔ "آئیڈیل کی تلاش" ایک اچھا سلسلہ ہے۔ لیکن جہاں اس کے مثبت پہلو ہیں وہاں میرے خیال میں اس کے چند منفی پہلو بھی ہو سکتے ہیں۔ مثلاً ایک لڑکی کے خط کے جواب میں جو خطوط چھپتے ہیں ان میں اس بات کی تو کوئی ضمانت نہیں ہوتی کہ لڑکی کو جواب لکھنے والے اپنے مقصد میں حقیقی پرخلوص ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب لڑکی ان سے رابطہ قائم کرے تو وہ اسے پریشان کریں یا بلیک میل کرنے کی کوشش کریں۔ یہ صورتحال ادارہ دوشیزہ کے نیک مقصد کے لئے خطرناک ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ممکن ہے کہ موصوف ایک مشغلے کے طور پر مذاقاً یا تفریحاً فرضی لڑکی کے نام سے خط لکھ دیتے ہوں یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کے جواب میں کتنے خطوط آتے ہیں۔ پھر اس فرضی لڑکی کے نام جو خطوط لکھیں انھیں بھی پریشان کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آئیڈیل کی تلاش کے سلسلے میں لڑکے اور لڑکیوں کے جتنے خطوط شائع ہوتے ہیں وہ سب صحیح اور اپنے مقصد میں پرخلوص و سنجیدہ ہیں۔

ج۔ امین بھتیا: ہمارے کام کے دو پہلو ضرور ہوتے ہیں اور لوگ شروع شروع میں مقصد کو کچھ نہ پا کے اسے تفریح کا نشانہ بنانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ اس کام کے اچھے نتائج، شرپسند اور سماج دشمن ذہن رکھنے والے لوگوں کا منہ بند کر دیتے ہیں۔ ہم نے یہ کام معاشرے کے سب سے اہم اور پیچیدہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے شروع کیا ہے اگر غلط قسم کے لوگ اسے تفریح سمجھ کر الٹی سیدھی حرکتیں کریں تو اس سے گھبرا کر ہمیں ایک نیک کام سے دستبردار نہیں ہونا چاہیے۔ ہر گھر میں جوان لڑکی، بہن یا بیٹی کی صورت میں موجود ہے اور اچھا رشتہ تلاش کرنا ہر گھر کا سب سے پریشان کن مسئلہ ہے۔ اگر شرپسند ذہن اس حقیقت کو مذاق سمجھ کر تفریح لینا چاہیں تو کل ان کے ساتھ بھی قدرت کوئی بھیانک مذاق کر سکتی ہے۔ ہم نے اپنی جگہ خود کو درست سمجھ کر ہی مقصد کا کام شروع کیا ہے امید ہے کہ لوگ ایک دن اس کام کی افادیت کو پہچانیں۔ اس طرح کے سنجیدہ رجحان رکھنے سے قوم اپنے مسائل خود حل کر سکتی ہے ورنہ قوم مزید پستی اور پریشانیوں میں گھر کے رہ جائیں گے اور کوئی ہمیں راہ بتانے والا نہیں ملے گا۔

**ایس اختر اقبال رضوی، منظور کالونی**

میں کالم آئیڈیل کی تلاش کے سلسلے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

گریہ بات تو طے ہے کہ آپ نے بہت اچھا قدم اٹھایا ہے۔ لیکن یہ
کہ بغیر کسی شک کے ہمارے مشرقی ماحول میں رہنے والی لڑکیاں اپنے
آئیڈیل کا صرف سوچ سکتی ہیں خواب دیکھ سکتی ہیں مگر اسے
پا نہیں سکتیں۔ کیونکہ اس معاملے میں اٹھائے جانے والے کسی بھی اقدام
کو والدین بغاوت کا نام دیتے ہیں۔ چند بڑے شہروں کی لڑکیوں
کے لیے تو ان کا حصول شاید اتنا دشوار نہ ہو لیکن کم ترقی یافتہ علاقوں
میں آئیڈیل ڈھونڈنے یا انہیں رسالے کے ذریعے پانے کا تصور
بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ لڑکیاں سب
سے پہلے والدین کو اعتماد میں لیں تاکہ ان معاملات کو آگے بڑھانے
میں مدد مل سکے۔ آئیڈیل کی تلاش کے کوپن کا یہاں چھاپنے
کی ضرورت نہیں۔ وہی کوپن پرچے کے ساتھ شامل کر کے اس
کی قیمت بڑھا دیں۔ یہ اقدام زیادہ مناسب رہے گا۔ ایک بات یہ
بھی کہ اپنے آخر میں محض یہ کہہ دینے سے کہ آپ نے بتا دیا
مقصد حل نہیں ہو پاتا۔ آپ نے اپنے خط میں اپنے متعلق تفصیل
سے نہیں لکھا تھا اسی لیے شائع نہیں ہو سکا۔ آئندہ اس بات کا
خیال رکھ کر خط لکھیے انشاءاللہ ضرور شائع کیا جائے گا۔

## ظہور فاروقی، کراچی

اپنی غزل کے چند اشعار بھیج رہا ہوں۔ اگر آپ نوک پلک
سنوار کر شائع کر دیں تو یہ بات باعث مسرت ہوگی۔
ج: بھیا اگر غزل کسی اچھے شاعر کو دکھا کر بھیجتے تو
ہمیں قدرے آسانی ہو جاتی۔ عنایت ہوگی اگر کسی
شاعر سے اصلاح لینے کے بعد بھیجیں۔

## آمنہ بلوچ، کراچی

حبیب صاحب کو ایک آئیڈیل بہن کی تلاش ہے اور
یہی خواہش میرے دل میں بھی ہے کہ اس مادیت پرست دنیا کے
لوگوں سے ہٹ کر کسی ایسے شخص کو اپنا بھائی بنا سکوں جو اپنے
اور مجھے دونوں کو سمجھ سکے۔ حبیب بھائی میری گزارش
پر توجہ دیں تو ہم دونوں کی اس خواہش کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

## تاجدار، بنوں

آپ میری بہت پیاری اور عزیز باجی ہیں۔ میں آپ کے

مضامین شروع سے پڑھتا آ رہا ہوں۔ صرف آپ کے کالم پڑھنے
کی خاطر میں اسکول سے گھر تک کا فاصلہ پیدل طے کرتا
تھا۔ اس طرح دونوں کا کرایہ بچا کر آپ کا رسالہ خرید پاتا تھا تب
میرے ذہن کی پیاس بجھتی تھی۔ جنوری میں پہلی دفعہ رشید
راولپنڈی کے جی ٹی اسٹیشن پر دیکھا۔ اس وقت سے اس رسالے
کو اپنا لیا ہے۔ "آئیڈیل کی تلاش" میں ایک دفعہ محترمہ س ن
قاسمی صاحبہ کے لیے ایک خط لکھا تھا آپ تک پہنچا یا نہیں۔ ہر ماہ رسالہ
دیکھتا ہوں اور آہ بھرتا ہوں۔ کیا آپ کی نظروں سے مجبور کی
گزارش نہیں گزری۔ مجھے آپ ہی سہارا دیجیے۔
ج: تاجدار بھیا۔ آپ کی عقیدت اور خلوص کی مشکور
ہوں۔ آئیڈیل کی تلاش میں پیام بھیجنے والوں کے لیے لازم
ہے کہ وہ اپنی تعلیم، آمدنی کے متعلق صاف گوئی سے لکھیں۔

## نوشاد، ٹنڈو (سانگھڑ)

مجھے رسالہ نواب شاہ جا کر خریدنا پڑتا ہے۔ کیا ایسا نہیں
ہو سکتا کہ مجھے اپنے گاؤں کے کسی قریبی اسٹال سے مل جایا کرے۔
رسالہ معیاری اور مستقل ہے اسی لیے خریدے بغیر نہیں رہ سکتا۔

## رینا سحر، راولپنڈی

اپنی نوعیت کا منفرد ماہنامہ ہے۔ افسوس بھی ہوتا ہے
حیرت بھی کہ میں ایک عرصے تک اس سے بے خبر رہی۔ ایک غزل
بھیج رہی ہوں۔ میری غزلیں اور افسانے اکثر شائع ہوتے رہتے
ہیں۔ مگر بتائیے کہ حوصلہ افزائی ہو سکے گی یا نہیں؟
ج: آپ کی غزل کسی قریبی شمارے میں شائع ہو جائے
گی۔ اپنے افسانے اور دیگر نگارشات ضرور بھیجیے۔ تعاون
کا شکریہ۔

## نسیم اختر گل، کراچی

پچھلے شمارے میں حبیب اختر صاحب کا خط پڑھا۔ میرے تو
بھائی کے بھی ہیں لیکن پھر بھی میں چاہتی ہوں کہ کسی ایسے
شخص کو بہن کا پیار دوں جو اس نعمت سے محروم ہو۔ اگر حبیب بھائی
چاہیں تو میں انہیں سگی بہن کا پیار دے سکتی ہوں۔ ایک بات اور
میں سحر صاحبہ کی بات سے متفق ہوں کہ اشعار کی محفل دوبارہ شروع

رد کی جاسکے۔

## ہ ، لاہور

یہ مرد کتنے چالاک ہیں۔ رسالہ ہے تو دوشیزہ کا لیکن
دھیرے دھیرے یہ لوگ اس پر قبضہ جماتے جا رہے ہیں۔ اونٹ
والی زبردستی تو کوئی ان سے سیکھے۔ مجال ہے جو پوچھ لیں کہ دوشیزہ
کی محفل میں ان کا کیا کام! خاص طور پر اسلم صاحب تو بہت زیادہ
حاضری دیتے ہیں اور وہ بھی شکوہ شکایت کے ساتھ کہ عورتیں
تو مردوں کے ساتھ لالچ کے تحت شادیاں کرتی ہیں۔ خون کا گھونٹ
پی کر ان کی باتیں سنتے رہتے ہیں مگر کسی دن غصہ آگیا تو بھری بزم
میں انہیں جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔ اور میری ایک رائے بھی
شامل کر لیجئے کہ ایکس سیتاپوری صاحب کی کہانی کا سلسلہ اس
رسالے میں مت شروع کریں کیونکہ ہم اس میں ہلکی پھلکی اصلاحی
مگر دلچسپ باتیں سننا چاہتے ہیں۔ دوسرے سب کالم مجھے پسند
ہیں۔ اگر کوئی نئی چیز پیش کرنا ہے تو وہ اوسط ذہن کے قارئین کو
بھی مزہ دینے والی ہو۔

## عارف عزیز زبیر، کراچی

شہناز سحر کی یہ بات پڑھ کر بہت غصہ آیا کہ مردوں کے
افسانے شائع نہ کیا کریں۔ مگر سحر صاحبہ یہ سمجھتی ہیں کہ صرف خواتین
ہی اچھے افسانے لکھ سکتی ہیں تو یہ ان کی بھول ہے۔ ادب کے میدان
میں مردوں کا پلڑا ہمیشہ بھاری رہا ہے۔ انہیں شاید ہے کہ
جتنے مواقع ملتے ہیں عورتوں کو وہ نصیب نہیں۔ وہ صرف گھریلو
زبان میں محدود کردار کے تانے بانے بُن سکتی ہیں بلکہ میں تو یہ
کہوں گا کہ چند ایک کو چھوڑ کر بیشتر عورتیں غیر حقیقی باتوں سے
اپنے افسانوں کے تانے بانے بُنتی ہیں۔ امید ہے سحر صاحبہ اس
سے اتفاق کریں گی۔ نیز "تین عورتیں تین کہانیاں" کا نام "تین
اشخاص تین کہانیاں" رکھ دیا جائے تو زیادہ اچھا رہے گا — کیا
خیال ہے؟

## راشدہ فردوس، بہاولپور

"آئیڈیل کی تلاش" ایک بے باک کالم ہے اور اتنی بیباکی
کی اب ہمارے معاشرے میں اشد ضرورت ہے لیکن تحقیقات

کہ اتنے بغیر بھی یکسر اعتماد نہ کریں بلکہ بہتر ہے کہ اپنے والدین
کو درمیان میں لا کر رشتہ بھیجنے والوں سے خط و کتابت کریں تاکہ
کسی دھوکے کی صورت میں انہیں پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔ آپ کی
کہانیاں پسند آئیں۔ خدا کرے انہیں پڑھ کر بہتوں کو عبرت ہو۔ ایک
غزل بھیج رہی ہوں۔ پیشگی شکریہ۔

## خالدہ ارم، لاہور

مئی کا "دوشیزہ" ہاتھ آیا۔ تحریریں پڑھیں اور آپ کو دعا دی۔
امید ہے آئندہ بھی ایسا ہی صاف ستھرا ادب دوشیزہ کے ذریعے
پڑھنے کو ملے گا۔ بس ایک شکایت ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ
خواتین کو جگہ دیا کریں۔ مردوں کو زیادہ لفٹ نہ دیں ورنہ سارے
پرچے پر ان کا قبضہ ہو جائے گا۔ بلاؤں کی کہانی بھیج رہی ہوں
کیا میری دوسری نگارشات کو بھی جگہ مل جائے گی۔ جواب ضرور دیجئے۔
ج: خالدہ! ہر اچھی چیز کو دوشیزہ میں جگہ ملتی ہے
اگر آپ کی کوئی تحریر اچھی ہوئی تو کیوں نہ شائع کریں
گے۔ بلاؤں کی کہانی شائع ہو جائیگی۔ کچھ اور بھی بھیجئے۔

## نور الدین کراچی

اتفاق سے اس دفعہ میرے پاس دوشیزہ کے دو دو پرچے
آگئے۔ ایک میں نے خریدا تھا۔ دوسرا میرا دوست میرے لیے لایا۔
اسے معلوم ہے کہ میں اچھی تحریریں پڑھنے کا شوقین ہوں اور یہی سبب
ہے کہ میں نے دونوں ڈائجسٹ پڑھ ڈالے۔ اچھی کہانیاں بار بار بھی
پڑھ لوں تب بھی ان کا لطف ضائع نہیں ہوتا۔ "کرکٹ کا شاہ" اور
"شادی" بہت پسند آئے۔ فراز صاحب کی غزل نے زیادہ لطف
نہیں دیا۔ اس دفعہ ان کی اچھی سی غزل لگائیے۔

## امجد خان، راولپنڈی

جون کا شمارہ ہاتھ میں ہے۔ افسانے اور مستقل سلسلے حسب
روایت دلچسپ تھے۔ ٹائیٹل بھی پرکشش تھا۔ ایک تجویز پیش کر رہا
ہوں کہ جس صفحے پر ٹوکن ہو اس کی دوسری طرف کچھ مت چھاپا
کریں۔ ٹوکن کاٹنے سے وہ صفحہ ضائع ہو جاتا ہے۔ دوسری بات
یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک دو صفحات آئیڈیل کی تلاش میں ایسی
لڑکیوں کے لیے بھی مخصوص کر دیں جو ہم جیسے غریب لوگوں کو اپنا
آئیڈیل سمجھتی ہوں۔ آخر ہم بھی دل رکھتے ہیں۔ اُن شہزادیوں کے

اور نئے ادیبوں والے خلاء پر پڑھ کر کمتری کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے۔ کیا ہم جیسے غریب لوگوں کو پسند کرنے والی لڑکیوں سے دنیا خالی ہو گئی ہے۔ پھر یہ طبقہ کہاں جائے جو ملک کی اسّی فیصد آبادی پر مشتمل ہے۔

## نذر حسین انجم، کوئٹہ

میں لمبے عرصے سے اردو میں افسانہ نگاری کرتا ہوں۔ اگلے ماہ انشاء اللہ اپنا افسانہ بھیجوں گا۔ مضمون "گوہر بغداد" مجھے بہت پسند آیا۔ "تین عورتیں تین کہانیاں" کا سلسلہ اس پرچے میں آنے کے بعد اور نکھر گیا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس "دوشیزہ" کے پچھلے شمارے نہیں ہیں۔ اس لیے مسلسل ناولوں کے سلسلے پوری طرح نہیں پڑھ پایا۔ شمارے مل جانے کے بعد اپنی رائے سے مطلع کروں گا۔

## شازیہ شیراز، ملتان

ایم بی بی ایس کی طالبہ ہوں مگر لکھنے پڑھنے کا چسکا بچپن سے ہے۔ "دوشیزہ" خواتین کا معیاری رسالہ ہے لیکن "آئیڈیل کی تلاش" میرے خیال میں اچھا سلسلہ نہیں ہے کیونکہ اس میں لڑکیاں بڑے عامیانہ انداز سے اپنی تعریفیں کرتی ہیں اور پھر ان میں کوئی ایک بھی ایسی نہیں ہوتی جو ایڈیٹر، ریڈنگ، اسٹڈی یا اسی قسم کے پیشے کو پسند کرے۔ ایک کہانی بھیج رہی ہوں اگر پسند آئے تو مطلع کیجیے۔

ج: آپ کی کہانی بہت مبہم ہے۔ واقعات کا آخر تک پتہ نہیں چلتا۔ دوبارہ سیدھے سادے انداز سے لکھ کر بھیجیے ضرور شائع کریں گے۔

## میم اختر صدیقی، کراچی

کیا عورتوں کی کہانیوں کی طرح مرد حضرات کے لیے اسی قسم کا سلسلہ شروع نہیں کیا جاسکتا جس میں وہ بھی اپنے مشاہدات اور تجربات لکھ سکیں۔ اس کے علاوہ مجھے مشہور شاعر احمد فراز کا مجموعہ کلام درکار ہے۔ ٹی وی کی ڈرامہ نویس حسینہ معین کا پتہ بھی چاہیے تاکہ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتی ہیں۔

ج: "تین عورتیں تین کہانیاں" میں مرد حضرات بھی حصہ لے سکتے ہیں۔ آپ نے غالباً غور نہیں فرمایا کہ تین کہانیوں میں ایک مرد کی کہانی بھی ہوتی ہے۔ احمد فراز کی نظموں اور غزلوں کے مجموعے "درد آشوب"، "تنہا تنہا"، "نایافت" اور "میرے خواب ریزہ ریزہ" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کا نیا مجموعہ کلام "جاناں جاناں" زیرِ اشاعت ہے۔ شائع شدہ مجموعے آپ بازار سے حاصل کر سکتے ہیں۔ حسینہ معین کو آپ ٹیلی ویژن کارپوریشن کراچی کی معرفت خط لکھ سکتے ہیں۔

## عنبر شاہد، کراچی

ریحانہ فاروقی آپ کی کیا لگتی ہیں۔ میرے شوہر کا خیال ہے وہ آپ کی بہن ہیں۔ میں افسانہ بھیج رہی ہوں۔ کیا شائع ہو جائے گا۔ میرا پہلا نام رقیہ تھا۔ شادی کے بعد بدل لیا ہے اس سلسلے میں آپ کے پرچے کی بھی ممنون ہوں۔

ج: شادی کی مبارک باد لیجیے۔ ریحانہ فاروقی ہماری کیا لگتی ہیں؟ چلیے یہ سوال آپ پر چھوڑا۔ آپ خود بوجھیے۔ آپ کا بھیجا ہوا افسانہ کسی کا ذاتی خط معلوم ہوتا ہے۔ کوئی دلچسپ افسانہ یا کہانی بھیجیے۔

★★

## شرقِ اوسط کا دورہ

"دوشیزہ" کے بے شمار قارئین نے ہمیں شرقِ اوسط کے دورے کی دعوت دی ہے۔ ہم اُن کی اس پُرخلوص دعوت کے بے حد شکر گزار ہیں۔ فوری طور پر دورہ کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ انشاء اللہ اکتوبر کے مہینے میں، میں اپنی چیف ایڈیٹر رخسانہ سہام مرزا اور حسن عباس کی معیت میں مشرقِ وسطیٰ کے تفصیلی دورے پر آؤں گی۔ جو احباب مجھے بلاد و ممالک کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تحریری، تصویری یا زبانی معلومات فراہم کریں گے اُن سے تبادلۂ خیال کر کے مجھے بے انتہا خوشی ہوگی۔

"رعنا فاروقی"

# غزل

پروین شاکر

متاعِ قلب و جگر ہیں ہمیں کہیں سے ملیں
مگر وہ زخم جو اُس دستِ شبنمیں سے ملیں

نہ شام ہے، نہ گھنی رات ہے نہ پچھلا پہر
عجیب رنگ تیری چشمِ سرمگیں سے ملیں

میں اِس وصال کے لمحے کا نام کیا رکھوں
ترے لباس کی شکنیں تری جبیں سے ملیں

ستائشیں مرے احباب کی نوازش ہیں
مگر صلے تو مجھے اپنے نکتہ چیں سے ملیں

تمام عُمر کی نا معتبر رفاقت سے
کہیں بھلا ہو کہ پل بھر ملیں، یقیں سے ملیں

یہی رہا ہے مقدّر مرے کسانوں کا
کہ چاند بوئیں اور ان کو گہن زمیں سے ملیں

چالیس پینتالیس سال کی عمر ایسی نہیں ہوتی کہ سر کے بال سفید ہو جائیں۔ مادام شارل ابھی چالیس سال کی بھی نہیں ہوئی تھی مگر اس کے سارے بال سفید ہو چکے تھے۔ وہ خیاطی کا کام کرتی تھی اور پیرس کے اچھے اور معزز خاندان کی عورتیں اس سے کپڑے سلوانے آتی تھیں۔ ان میں بیشتر عورتیں مادام شارل سے عمر میں بڑی تھیں مگر ان کے بالوں میں کہیں سفیدی کا نشان تک نہ تھا۔ مادام شارل کے سفید بال عورتوں میں تجسس کا سبب بنے ہوئے تھے۔ کئی عورتوں نے اس سے ان بالوں کے بے وقت سفید ہونے کی وجہ پوچھی مگر وہ ہنس کر ٹال گئی۔ میں بھی مادام شارل کے گاہکوں میں تھی اور اکثر اس سے کپڑے سلوانے آتی تھی۔ مادام شارل کے سنجیدہ حسین مگر خوبصورت اور پُرکشش چہرے سے میں بہت متاثر تھی مگر ان سے کہیں زیادہ اس کے سفید بال میری فکر اور توجہ کے مرکز تھے۔ ایک دن جبکہ میرے علاوہ اور کوئی مادام شارل کے قریب نہیں تھا میں نے بڑی سنجیدگی سے اس سے اس کے سفید بالوں کے بارے میں پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ حسب معمول ہنس کر ٹال جائے گی۔ مگر اس بار وہ ہنسی نہیں خاموش بیٹھی کام کرتی رہی پھر اس نے سر اٹھا کر بڑی گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ایک خاموش سا احتجاج اس کی نظروں سے آشکارا تھا جیسے اسے اس سوال سے تکلیف پہنچی ہو۔ میں شرمندہ سی ہو گئی۔ واقعی کسی سے ذاتی نوعیت کے سوال کرنا یا اس کی ذاتیات کو کریدنا یا اس کے کسی راز سے واقف ہونے کے لیے اصرار کرنا بڑی اوچھی سی بات

---

ایک ہی رات میں اس کے بال برف کی طرح سفید ہو گئے

حساس و ذہین کے لیے ایک نازک سی کہانی

ہے۔ ہر شخص کی ذاتی زندگی میں جانے کتنے گوشے کتنے غم چھپے ہوتے ہیں جنہیں وہ لوگوں کی نظروں سے بچا کر رکھتا ہے تاکہ بے جا سوالات اور ان سے ابھرنے والی ٹیسیں اور کسک سے محفوظ رہ سکے۔ زخموں کی رونمائی تکلیف کو کم نہیں کرتی بلکہ درد کو کچھ اور بڑھا دیتی ہے اس لیے لوگ اپنی تکلیف اور دکھ بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ظاہر ہے مادام شارل کے بال بلاوجہ تو سفید نہیں ہوئے تھے اور سفید ہوتے بھی تو یوں! سفید نہ ہوتے۔ وہ عمر کے اس حصے میں نہیں تھی جہاں بالوں کی سفیدی کا تصور کیا جا سکتا۔ ممکن ہے اس کے پیچھے کوئی دوسری بات ہو اور یہی کھوج مادام شارل کے گالوں کو پشیمان رکھتی تھی۔

میں نے بھرپور نظروں سے مادام شارل کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں انتہائی معذرت آمیز لہجے میں بولی۔ مادام مجھے افسوس ہے۔ میں اپنے تجسس پر بے حد شرمندہ ہوں۔ کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گی۔ مادام شارل کے لبوں پر ایک ضعیف سی مسکراہٹ ابھری اور وہ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "مادام لیوں! کیا میرے سفید بالوں کا راز جاننا ضروری ہے۔ لوگ تو سیاہ بالوں کا راز پوچھتے پھرتے ہیں۔" میں مادام شارل کے خوبصورت جواب سے بہت لطف اندوز ہوئی۔ وہ کچھ کھلی تھی۔ میں بات آگے بڑھانے کی غرض سے مسکراتے ہوئے بولی "تمہارے ان سفید بالوں میں جو کشش ہے وہ سیاہ بالوں میں نظر نہیں آتی۔ مجھے ڈر ہے کہیں سفید بال پیرس کا فیشن نہ بن جائیں۔" مادام شارل بھی میرے مزاح سے محظوظ ہوئی۔ اس نے پیالی ایک طرف رکھ دی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ "تم نے مجھے متاثر کیا ہے مادام لیوں! تم سے باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے۔" اور واقعی مادام شارل نے اس وقت جو کچھ کہا تھا وہ بہت زیادہ تھا۔ وہ بہت کم گو اور خاموش طبیعت کی عورت تھی۔ ہوں ہاں اور سر ہلا کر کام نکال لیتی تھی۔ مادام شارل نے دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکا دیں اور ہتھیلیوں پر اپنا چہرہ رکھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ "مجھے تم دوسری عورتوں سے مختلف نظر آتی ہو۔ وہ بات جو میں زندگی میں کسی سے نہ کہہ سکی۔ اور شاید مادام آخر دم تک کہہ سکوں، سوچتی ہوں تمہیں بتا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی کی لکیریں کھنچ گئیں۔ پھر وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی "میں وہ راز اپنے سینے میں دفن قبر تک لے جانا چاہتی تھی۔ بہت خاموشی سے، اس تاثر کے ساتھ جیسے وہ حادثہ میری زندگی میں کبھی رونما ہی نہیں ہوا۔" پھر فوراً ہی مادام شارل نے مجھ سے بہت عجیب سوال کیا "مادام لیوں! تم صاحب اولاد تو ہوگی۔؟"

"ہاں خوش قسمتی سے میرے کئی بچے ہیں۔" میں نے قدرے حیرانی سے جواب دیا۔

"تو پھر تمہیں ضرور سننا چاہیے۔" مادام شارل مسکراتے ہوئے بولی۔ "مگر ایک شرط ہے اور مجھے امید ہے کہ تم ضرور اس شرط کی پاسداری کرو گی۔ شرط یہ ہے کہ تم یہ بات کسی کو بتاؤ گی نہیں۔ اپنی حد تک محدود رکھو گی۔ بلکہ بھول جاؤ گی۔"

مادام شارل نے اپنی زندگی کے اوراق کھولنا شروع کیے۔ خیال تھا مادام شارل کا آبائی پیشہ نہیں تھا بلکہ وقت اور حالات سے مجبور ہو کر اس نے یہ کام شروع کیا تھا۔ ورنہ تو وہ خود [illegible] تھا۔ مادام شارل کبھی اس قدر تنہا نہیں تھی جیسی کہ وہ آج تھی۔ مادام شارل پیرس کی نہیں فرانس کے کسی اور شہر کی رہنے والی تھی۔ اس کا تعلق فرانس کے ایک قدیم اور معزز خاندان سے تھا۔ بیس سال کی عمر میں اس کی اس کے چچازاد بھائی سے شادی ہو گئی۔ شادی کے ٹھیک چھ مہینے بعد ایک مختصر سی علالت کے بعد اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ شوہر کی موت کو مادام شارل نے جس طرح محسوس کیا اس کا تذکرہ فضول ہے۔ بس اتنا کہنا کافی ہے کہ شوہر کی موت کے بعد شاید وہ بھی مر گئی ہوتی۔ مگر اس کے شکم میں ایک ننھی سی جان پرورش پا رہی ہوتی۔ چند مہینے بعد مادام شارل ایک خوبصورت بچے کی ماں بن گئی۔ بچے کا نام ہنری رکھا گیا۔ ہنری شکل و صورت میں بالکل باپ پر گیا تھا اور مادام شارل اس کی پرورش اور تربیت بھی باپ کے نقش قدم پر کرنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہنری عادات و اطوار میں بالکل اس کے شوہر پر جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہنری نے ماں کو مایوس نہیں کیا۔ اس نے بڑی توجہ سے لکھا پڑھا اور اس کی عادتیں اتنی شائستہ اور پیاری تھیں کہ مرحوم شوہر مادام شارل کی نظروں میں پھر گیا۔ ہنری جوان کیا ہوا کہ مادام شارل کا دکھ یک دم ڈھل گیا۔ وہ ہنری کے رکھ رکھاؤ میں شوہر کی جھلک محسوس کر رہی تھی۔

ہنری بڑی خوبیوں کا جوان تھا۔ باپ کی طرح سادہ اور شریف النفس بلکہ بعض صفات میں وہ باپ سے بھی آگے بڑھا ہوا تھا۔ اٹھارہ سال کا ہونے کے باوجود اس کی کسی لڑکی سے دوستی یا شناسائی نہ تھی۔ وہ نظریں اٹھا کر لڑکیوں کی طرف دیکھتا بھی نہ تھا حالانکہ اس عمر میں نوجوانوں کی یہ فطرت ہوتی ہے۔ خصوصاً فرانس میں تو کسی نوجوان کا یہ طرۂ امتیاز ہوتا ہے کہ بیک وقت اس کی کئی لڑکیوں سے شناسائی ہو مگر ہنری ان باتوں سے بہت دور تھا۔ اسے صرف مطالعے سے شغف تھا اور وہ ہمہ وقت کتابوں میں گم رہتا تھا۔

وقت بڑا اچھا گزر رہا تھا کہ بدقسمتی سے مادام شارل کو [illegible] انیسویں سال میں داخل ہوتے ہی ہنری ایک عورت پر عاشق ہو گیا۔ خیر یہ بھی کوئی ایسی افسوسناک بات نہیں تھی۔ زندگی میں یہ وقت بھی آتا ہے۔ ممکن تھا مادام شارل اس پر خوش ہو جاتی مگر اس واقعے کا تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ وہ عورت شادی شدہ تھی۔ نہ صرف شادی شدہ تھی بلکہ اس کے کئی بچے بھی تھے۔ اس

کا نام ٹینی تھا اور اس کا شوہر شہر کا ایک بڑا تاجر تھا۔ مادام شارل کو شاید اس بارے میں پتہ نہ چلتا اگر ہوا یہ کہ ٹینی کا شوہر اچانک دیوالیہ ہو گیا اور اُسے فوری طور پر چار ہزار فرانک کی ضرورت پڑی۔ اور یہ چار ہزار فرانک ہنری نے ماں سے طلب کیے۔ مادام شارل کے پاس اتنی کثیر رقم نہیں تھی اس نے معذوری ظاہر کر دی۔ ہنری نے ارادہ ظاہر کیا کہ وہ اپنے ایک چچا کے پاس جاکر وہ رقم فراہم کرے گا۔ ہنری کا چچا خاصا مالدار تھا مگر اس کی کنجوسی بھی اپنی جگہ مسلم تھی۔ مادام شارل نے منع کیا مگر ہنری نہیں مانا اور چار ہزار فرانک لینے چچا کے پاس چلا گیا۔

رات گزر گئی مگر ہنری کی واپسی نہیں ہوئی۔ مادام شارل نے سوچا شاید وہ چچا کے پاس رک گیا ہے مگر جب وہ ضرورت کا سامان لینے باہر نکلی تو اس نے ایک ایسی خبر سنی کہ اس کی حرکت قلب بند ہوتے ہوتے رہ گئی۔

رات کسی چور نے ہنری کے چچا کو بھاری شمعدان مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ سامان کی ٹوکری مادام شارل کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھی اور وہ دیر تک سکتے کے عالم میں کھڑی رہ گئی تھی اور جب وہ واپس گھر آئی تو اس نے ہنری کا خون آلود کوٹ دھوتے ہوئے دیکھا۔ مادام شارل رونے لگی۔ اس نے فوراً ہنری کو کہیں بھاگ جانے کے لیے کہا۔ ہنری کسی دوسری جگہ روپوش ہو گیا مگر تیسرے ہی دن پھر واپس آگیا اور بولا مجھ سے رہا نہیں جاتا۔ اس کے علاوہ میں ٹینی کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مادام شارل نے اسے بہت روکا طرح طرح کے واسطے دیئے مگر وہ نہیں مانا اور ٹینی سے ملنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ پولیس وہاں تاک میں بیٹھی تھی اس نے ہنری کو گرفتار کر لیا۔

ہنری پر قتل کا مقدمہ قائم ہو گیا۔ پیشیاں پڑنے لگیں۔ مادام شارل نے بچے کچھے زیورات بیچ کر ایک وکیل کی خدمات حاصل کیں۔ ہنری کے خلاف مقدمہ کمزور کیا جا سکتا تھا مگر اس سلسلے میں ٹینی اور اس کے شوہر کا نام آتا۔ انہیں عدالت میں حاضر ہونا پڑتا۔ ہنری نے رو رو کر مادام شارل اور وکیل کو مجبور کیا کہ درمیان میں ٹینی اور اس کے شوہر کا نام نہ آنے پائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہنری کے خلاف کیس بہت مضبوط ہو گیا۔ اسے ایک بگڑا ہوا جرائم پیشہ نوجوان تصور کر کے سزائے موت سنا دی گئی۔ پھر پھانسی کی تاریخ بھی مقرر کر دی گئی۔ اس دوران میں ٹینی ایک بار بھی ہنری سے ملنے نہ آئی اس کی جھلک بھی دکھائی نہ دی۔

وہ رات جو ہنری کی زندگی کی آخری رات تھی۔ مادام شارل پر بہت بھاری گزری۔ افسوس کہ ماں کے کرب اور دکھ کو الفاظ میں نہیں سمویا جا سکتا الفاظ اس کیفیت کو پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ مختصر یہ کہ مادام شارل کی زندگی بھر کی کمائی چھینی جا رہی تھی۔ وہ ٹوٹ رہی تھی تڑپ رہی تھی۔ اس کا دل دھواں ہوا جا رہا تھا۔ اٹھ اٹھ کر بیٹھتی تھی اور پھر اٹھ کر بے تابی سے ٹہلنے لگتی تھی۔ وہ رو نہیں سکتی تھی اس لیے کہ رونا تو بہت آسان ہے۔ بس مکمل رہی تھی چپ چاپ بیٹھی رہی تھی۔ مرنے سے پہلے ہمیشہ کی جدائی سے پہلے وہ آخری بار ہنری کو جی بھر کے دیکھ لینا چاہتی تھی مگر مشکل یہ تھی کہ ایک رات پہلے پھانسی کے ملزم کو کسی سے ملنے نہیں دیا جاتا خواہ وہ کوئی ہو۔

رات ہوتے ہی مادام شارل جیل کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ جیلر سے ملی، روئی، گڑگڑائی، اس کے پیروں پر گر پڑی۔ جیلر کا دل پسیج گیا۔ اس نے کہا کہ وہ رات کو گیارہ بجے آئے۔ وہ راز داری کے ساتھ اسے ہنری سے ملا دے گا۔ جیلر نے مادام شارل سے وعدہ لیا کہ وہ کسی سے اس ملاقات کا تذکرہ نہیں کرے گی کیونکہ اس میں اس کی ملازمت جانے کا خطرہ ہے۔

جیل میں مکمل تاریکی تھی۔ تمام کوٹھریاں تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کئی کوٹھریوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے جیلر اور مادام شارل ایک تنگ و تاریک کوٹھری کے سامنے رک گئے۔ جیلر نے سرگوشی میں مادام شارل سے کہا کہ وہ ہنری کو سلاخوں کے قریب بلائے گا۔ وہ بڑی خاموشی سے اس سے ملے اور منہ سے کوئی بات نہ کرے ورنہ دوسری کوٹھریوں کے ملزم اس طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ مادام شارل نے سر ہلا کر حامی بھر لی اور خود بھی سلاخوں سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ جیلر نے آہستہ سے آواز دے کر ہنری کو قریب بلایا اور ایک طرف دور جاکر کھڑا ہو گیا۔ ہنری سلاخوں کے قریب آگیا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر مادام شارل کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہونٹوں تک لے جاتے ہوئے تھرائی ہوئی آواز میں بولا "میں جانتا تھا ٹینی! میری محبت رنگ لا کر رہے گی۔ خدا کا شکر ہے تم آخری لمحات میں آگئیں۔"

اسی صبح مادام شارل نے دیکھا کہ اس کے سر کے سارے بال سفید ہو چکے تھے کہانی سن کر میرے دل پر ایک عجیب سا بوجھ آپڑا تھا۔ میں نے مادام شارل سے کہا۔ "تم نے ہنری کو بتایا نہیں کہ تم ٹینی نہیں اس کی ماں ہو؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ میں ماں تھی۔" مادام شارل نے جواب دیا اور قریب رکھا ہوا لباس اٹھا کر پھر ٹانکنے لگی۔

* *

وہ نرم پڑ گیا۔ پیار بھرے شاکی انداز میں دیکھتا ہوا بولا۔
"بختاور! کیا ہو گیا تھا تم سے باتیں کرنے کو ——— قریب آؤ نا
——— وہاں کیوں کھڑی ہو ———"
بینا نے پردہ چھوڑ دیا ——— آہستگی سے چلتی ہوئی پاس
آ گئی ——— اپنائیت سے کسی ہوئی شرجیل کی بات کرنا ——— اور
نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں ——— لیکن ان نگاہوں میں ذرا بھی
برعکس نہ التفات تھا نہ دلداری ——— عام سا انداز تھا، سرسری سی
نگاہیں، پھیکی سی مسکراہٹ اور روکھے جذبات تھے۔
"بے حسی کی بھی انتہا ہوتی ہے ———" شرجیل نے اس کا ہاتھ
پکڑ کر کھینچا۔
"ارے ارے ——— کیا کرتے ہیں ———" ایک پل بھر کو وہ
حیران ہوئی پھر سنبھل گئی ——— آہستہ سے ہاتھ چھڑا کر پاس پڑی کرسی
پر بیٹھ رہی ——— وہ مسکرایا تھا، مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔
"مجھے دیکھ کر کہاں کھو گئی تھیں ———"
"کھوئی تو کہیں بھی نہ تھی ——— پوری طرح ہوش میں تھی۔"
"پھر میری ہی سمجھ کا قصور رہا ہوگا ——— بعض اوقات عقل جانے
کہاں چرنے چلی جاتی ہے۔"
اس نے کچھ اس سادگی سے کہا کہ بے اختیار بینا ہنس پڑی، پھر
پوچھا۔ "زخم تو ٹھیک ہو گئے نا ———؟"
"ان زخموں کی کسے پرواہ ہے۔ ان سے بڑے بڑے زخم کھائے ہیں"
وہ اداسی سے مسکرایا۔
"اچھا ———" ایک پل کو بینا کی آنکھوں میں چمک لگی۔ "کیسے
کھائے وہ زخم ———؟"
"چھوڑو اس بحث کو، اچھی اچھی باتیں کرو ——— اگر موڈ ہو تو
آؤ تاش کھیلتے ہیں۔"
"جیسی آپ کی مرضی ———"
درمیان میں چھوٹی سی تپائی رکھ کر وہ دیر تک بیٹھے تاش کھیلتے رہے۔
ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی گپ شپ چلتی رہی ——— ایک دوسرے پر چوٹیں کرتے
رہے ——— کبھی کبھی سنجیدگی سے الجھ پڑتے اور ایسے میں خلافِ عادت
شرجیل ہی نرم پڑ جاتا ——— وہ اس کی عادتوں کی یہ تبدیلی بینا کے لیے
بہت حیرانی کی تھی ——— اس کے انداز بدل گئے تھے ——— اطوار بدل
گئے تھے ——— مزاج میں وہ سختی اور اکڑپن دور ہو گیا تھا۔ لہجے میں
وہ تلخی باقی نہ رہی تھی، نگاہوں میں وہ کڑواہٹ جیسے وہ اپنے کیے پر
پشیماں ہو ——— اپنے سابقہ رویے کی تلافی کر رہا ہو۔ بینا یہ سب

محسوس کر رہی تھی۔ کبھی دل ہی دل میں مسکراتی اور کبھی الجھ جاتی۔
اس دن رات دیر تک شغل ہوتا تھا جب شرجیل نے شراب کے نشے
میں وحشت لیے دھکے دے کر کمرے سے باہر دھکیل دیا تھا۔
اس واقعہ کو تقریباً کئی ہفتے گزر چکے تھے ——— اپنی
توہین کا احساس اب بھی ہوتا تھا ——— اور بعض اوقات تو اس کا
دل چاہتا کہ شرجیل سے اپنی اس توہین کا سخت انتقام لے ——— اور
توہین کا یہ احساس بعض اوقات اتنی شدت اختیار کر جاتا کہ وہ اچھی بھلی
باتیں کرتے کرتے ایک دم سے بھڑک اٹھتی ——— غصے میں بھر جاتی
آنکھیں سیدھی ناک پہ لگتی ——— ایسے ہی حیرانی سے دیکھتے ہوئے شرجیل نے ٹوکا۔
"کیا بات ہے کھیل میں دل نہیں لگ رہا ہے کیا ؟"
اس کے چہرے پر بیزاری کے تاثرات تھے ——— پتے پھینک کر
سیدھی ہو بیٹھی ——— جلے انداز میں بولی۔
"بلاوجہ وقت ضائع کیا ——— ہونہہ ———!"
یہ سن کر وہ بجھ سا گیا ——— اسی سنجیدگی سے بیٹھا رہا۔ اس کے
پھیکے رویے پر ناراضگی میں ہی اس کا دل بھر آیا ——— چند لمحے پہلے کا وہ
خوشگوار تاثر جاتا رہا۔ وہ اس کی طرف جھکا، بازو کو ذرا سا چھوتے ہوئے بولا۔
"ناراض ہو گئیں کیا ———؟"
بینا نے نفرت سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
"مجھے یہ بے تکلفی اچھی نہیں لگتی ——— فاصلہ رکھا کریں۔"
شرجیل نے اسے دیکھا ——— اس کے چہرے پر پھیلی بیزاری اور
اجنبیت کے احساس کو محسوس کیا ——— پرسکون انداز میں بولا۔
"کبھی کبھی اتنی تلخ کیوں ہو جاتی ہو۔"
"آپ تو بڑے شیریں ہیں نا ———" وہ جلے بھنے انداز میں بولی۔
"بہرحال تم جیسا بھی نہیں ہوں ——— کب جانے کا ارادہ ہے
جنگلی بلی ———"
"جب تک اس جنگل میں قید ہوں ———"
"بہت خوب ———" وہ مسکرایا۔ اور نچلے لہجے میں بولا۔
"خاک سے پیار کروں۔"
"ڈرتی ہوں کیا ان سے ———"
"ہاں بھئی تم تو بڑی بہادر ہو ——— تمہاری کیا بات ہے
ایک دفعہ پہلے تو ہم ہی ہیں ——— تم جیسی ہمت والے ہی کم ہیں۔"
"فضول باتیں نہ کریں ———" وہ بچی جنگلی بلی کی طرح پھر اکڑ گئی۔
"کیا بات ہے ———؟" شرجیل نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پتے
ایک طرف کر کے رکھ دیئے ——— غور سے اس کے چہرے کو دیکھا۔ "تمہارا

"منہ کیوں بگڑ گیا ایک دم سے ——؟"
"پاگل ہو شرجیل۔"
"اس میں پاگل پن کیا ہے ——" وہ ایک دم سے ہنس پڑا۔
"بجز اس کے کیا کرتے رہیں گے ——؟" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی —— پیشانی پر شکنیں لیے وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی ——
شرجیل نے پیچھے سے اس کا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔
"بیٹھو ——"
"چھوڑ دیں مجھے ——"
"کیوں اتنی جلدی جا رہی ہو میرے پاس سے —— تمہارا یہ انداز اجنبی کا سا ہے اور تکلیف دہ بھی بینا ——"
"میں کچھ سننا نہیں چاہتی —— چھوڑ دیں میرا ہاتھ ——"
وہ اٹھ کر اس کے مقابل آ گیا —— بہت آہستہ سے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا:
"جاؤ —— اپنے کمرے میں جاؤ اور ٹھنڈے دل سے اپنے رویے پر غور کرو —— شاید پھر اپنا یہ نیا انداز تم بدل سکو اور اس کمی کو ختم کر سکو جو تمہارے لہجے میں آ گئی ہے ——"
اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پردہ اٹھا کر باہر نکل گئی۔
رات کے کھانے پر سبھی موجود تھے —— شرجیل بھی تھا اور بینا بھی۔
آج بہت دنوں بعد شرجیل کھانے کی میز پر آیا تھا۔ وہ کافی دنوں سے اس کی خالی کرسی بینا کو اس کی کمی کا احساس دلایا کرتی۔ وہ آج اتنے دنوں بعد اسے یہاں دیکھ کر انجانی سی خوشی محسوس کر رہی تھی۔ خانم بھی خوش تھیں۔ سب ہی خوشگوار موڈ میں تھے اور ایسا بہت دنوں کے بعد ہوا تھا —— ہنسی مذاق اور باتوں کے درمیان کھانا چل رہا تھا۔
خانم اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگیں:
"اتنے دنوں بعد تمہیں سب کے ساتھ دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے شرجیل۔" کھانا کھاتے اس نے سر اٹھایا:
"آپ ہی کیا —— خوش تو اور لوگ بھی نظر آ رہے ہیں۔" وہ شرارت بھرے انداز میں مسکرایا۔ بینا نے کھانے سے ہاتھ روک لیا۔ نظر اٹھا کر اسے دیکھا —— اس کے ہونٹوں پر پھیلتی مسکراہٹ کا احساس کیا اور زیر لب آتی مسکراہٹ کو چھپا کر پلیٹ پر جھک گئی۔
"میری کرسی پر کون بیٹھا کرتا تھا خانم ——؟" وہ پوچھ رہا تھا
"خالی پڑی رہتی تھی —— تمہاری کمی کا احساس دلایا کرتی تھی۔"
"کیا صرف آپ کو ہی محسوس ہوتی تھی یا دوسروں کو بھی؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔ پھر خود ہی بولا:

ایک مشاعرے میں ایک شاعر صاحب شعر پڑھ رہے تھے تو فوٹوگرافر تصویر لینے لپکا۔ شاعر صاحب فرمانے لگے۔ "نا نہیں! یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ بھلا میری تصویر لے کر کیا کیجئے گا!"
شوکت تھانوی کہیں ساتھ ہی بیٹھے تھے یکدم بول اٹھے۔ "تصویر اس لیے اتار رہے ہیں کہ ایک تو بچوں کو دکھا کر ڈرائیں گے۔ دوسرے جو لوگ صفائی کا خیال نہیں رکھتے انہیں دکھا کر عبرت دلوائیں گے۔"

"مگر دوسروں کے دلوں کا حال آپ کیا جانیں —— بڑے گھاگ ہیں وہ ——"
بینا دل ہی دل میں مسکرا دی —— بولی کچھ نہ —— بیٹھی آرام سے کھانا کھاتی رہی
کھانا ختم کر کے سب اٹھنے لگے۔ کرسی کو پیچھے دھکیلتے ہوئے شرجیل بولا: "خانم چائے پلوائیں —— خوب اچھی سی ——"
"اچھی چائے تو بینا ہی بناتی ہے۔" وہ سر ہلاتی ہوئی مسکرا کر بولیں۔
"پھر اسی سے کہیں ——"
"تم خود کیوں نہ کہو ——"
"میری مانے گی —— مجھ سے خفا ہے ——"
ہاتھ دھوتے ہوئے بینا نے اس کی بات کو سنا —— مڑ کر دیکھا۔
"پلاؤ گی ——" شرجیل اسی کو دیکھ رہا تھا۔ "مہربانی ہوگی —— کیا خیال ہے ——"
"خیال تو اچھا ہے ——" اس نے جملہ شرجیل کی طرف اچھال دیا۔
"شکریہ ——"
بینا نے جاتے جاتے مڑ کر دیکھا —— اور مسکراتی ہوئی کچن کو چل دی۔
سب ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے —— بیگم [illegible] آ گئیں، ان کے ساتھ شبو بھی تھی —— نارنجی سوٹ میں ملبوس گندمی رنگ کے ساتھ بہت شگفتہ لگ رہی تھی۔ بینا ان سے بڑے تپاک سے ملی۔ سب کو چائے پیش کی۔ شرجیل کو کپ تھماتے ہوئے مسکرا کر کہنے لگی۔

"اتنے دن ساتھ رہ کر بھی کچھ اندازہ نہ لگا سکی ——— یہ تو ہے
شرجیل بھائی ہوا ہیں تاشا ——— وہ عجیب و غریب طبیعت کے
مالک ہیں ——— انھیں سمجھنے کی کوشش میں انسان خود کو ہی کھو بیٹھے۔
اور میرا وقت اتنا فالتو نہیں کہ یہ جھنجھٹ کرتی پھروں۔"
"آپ سنجیدہ ہیں!" وہ حیرانی سے بولی
"تم ایک ذکر سے بیٹھیں میں نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔" پھر
اس موضوع پر ان دونوں کے درمیان اور کوئی بات نہ ہوئی ——— شرجیل
نے انھیں اتنی محویت سے باتیں کرتے دیکھا تو پاس آ گیا۔
"کیا میٹنگ ہو رہی ہے۔"
"کچھ آپ ہی کے متعلق باتیں تھیں۔"
"میرے متعلق ——— کیا باتیں تھیں بھئی۔"
"آپ کے بتانے کی نہیں۔" وہ شوخی سے ہنسی
"تم بتاؤ بینا۔"
"عورتوں کی پرائیویٹ باتیں نہیں پوچھا کرتے۔"
"اس کی خبر نہ تھی ———" وہ ہنستا ہوا صوفے میں آ گیا۔ کچھ دیر بعد
ایک سگریٹ سلگائی اور سب سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔
سب کے جانے کے بعد بینا اپنے کمرے میں آئی ——— خود کو
اس وقت بہت پرسکون پایا ——— دریچے کا پردہ ہٹا کے دیر تک وہاں
کھڑی ہلکے سروں میں کچھ گنگناتی رہی پھر لباس تبدیل کیے بغیر ہی بستر میں
گھس گئی۔

"آج کا دن دلچسپ گزرا۔"
آنکھیں موند کر اس نے سوچا ——— اور آپ ہی آپ مسکرا پڑی
چند ہی لمحوں بعد وہ بے خبر سو رہی تھی۔

---

بیگم ملک کے گھر پارٹی تھی ——— ان کا بیٹا پانچ سال بعد
امریکہ سے واپس آیا تھا اور بالکل صحیح سلامت ——— ورنہ سب کو یہی
دھڑکا لگا ہوا تھا کہ یہ لاابالی اور خود سر شخص ضرور اپنے ساتھ کسی کو بیاہ لائے گا۔
بیگم ملک اور بینا کی رشتہ میں کچھ لگتی تھیں ——— اور اس نے پارٹی میں
آنے کا پکا وعدہ کر لیا تھا ——— بہت دنوں سے ادھر کوئی تفریح نہ
ہوئی تھی طبیعت اور بور ہو رہی تھی۔ سوچا تھا لطف رہے گا سنتے تھے لوگ
دیکھنے کو ملیں گے۔ اچھا وقت گزرے گا۔ وہ بہت ہی سگر کی ہی آئی ... کے
علاوہ سبھی جا رہے تھے۔ خلاف توقع شرجیل کا تیار ہو گیا ——— سب
کے ساتھ پارٹی میں شرکت کرنے لگا تھا اس نے اپنے طور پر ... بعد
تک بدل کر دیا تھا۔ سب ... اور اس کی تبدیلی پر بہت خوش آئی تھی

رات کے تقریباً ساڑھے نو بج رہے تھے ——— بینا شام کو کلاس سے واپس آئی۔
تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گئی۔ آرام ملا تو لیٹے لیٹے نیند سی آ گئی۔ ماجد نے آ کر جگایا
پلکیں جھپکا کر وہ مسکرا دی۔
"ہمشیرہ پارٹی میں نہیں جانا کیا ——— ؟"
وہ بالوں کو برابر کرتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔
"کیا وقت ہو گیا ماجد ——— بہت دیر تو نہیں ہو گئی ——— ؟"
"سات بجنے کو ہیں ——— بس اٹھیے بھی اب۔"
وہ مسکرا دی۔ اس کے گال سہلاتے ہوئے بولی۔
"چائے تم بنا لاؤ ماجد، مہربانی ہو گی ———"
وہ ہنس پڑا ———
"ہر دم چائے کی سوجھتی ہے آپ کو ——— کیسے پی لیتی ہیں اتنی چائے؟"
"بری عادت ہے کیا ———" وہ مسکرائی۔
"بری نہیں تو اچھی بھی نہیں ہے۔"
"کافی سمجھدار ہو گئے ہو ———" بینا نے پیار سے اسے دیکھا، بولی:
"اور تم جو اتنی ٹافیاں دن بھر چباتے رہتے ہو وہ کچھ نہ ہوا ———"
"وہ اچھے مزے کی ہوتی ہیں نا۔"
"اور چائے مزے کی نہیں ہوتی ہے ———" بینا مسکرائی۔
"ایسی بیکار چیز ہوتی ہے کیا پسند آتی ہے آپ کو۔" وہ برا
سا منہ بنا کر بولا۔
"چلو گے یا یونہی بحث کیے جاؤ گے۔"
"لاتا ہوں ——— لاتا ہوں۔ آپ اٹھیے تو سہی۔"
"خوب ابھی بنا لاؤ اسٹرانگ سی ———"
"بہت بہتر سرکار ———" وہ شوخی سے ہنستا چلا گیا۔

گرم گرم پانی سے نہا کر وہ تازہ دم ہو گئی۔ طبیعت کی سستی جاتی رہی — پھر کپڑوں کا انتخاب کرنے لگی۔ کافی دیر تک وارڈ روب کھولے کپڑے الٹتی پلٹتی رہی، پھر سبز رنگ کی خوبصورت سی ساڑھی نکال لی جس پہ بیچ ستاروں کا کام بنا ہوا تھا۔ اس کام سے فراغت پا کر اہتمام سے تیار ہوئی۔ بال خود سنوارے۔ گیٹ اپ کے ساتھ سبز ساڑھی میں لپٹی وہ ایسی اچھی لگ رہی تھی کہ آئینہ دیکھ کر خود ہی محجوب سی ہو گئی اور مسکراتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ ایک کا ہلکا چھناتی ہوئی سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ شرجیل سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اس نے مینا کو یوں بنا ٹھنا دیکھا تو ہنس پڑا۔

"بڑے ٹھاٹھ ہیں بھئی — چہرے پر گلاب ہی گلاب کھلے ہیں —"

"خود بھی تو ایسی شان سے تیار ہوئے ہیں۔"

"اچھا لگ رہا ہوں —؟" وہ اشتیاق سے مسکراتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"مجھے نہیں پتہ —"

چوٹ سنبھالتی وہ سیڑھیاں اتر گئی — صبیحہ اور راجو بھی تیار کھڑے تھے — راجو سیاہ سوٹ میں خاصا اسمارٹ لگ رہا تھا — صبیحہ نے مینا کو دیکھا اور پیار سے ہاتھ تھام لیا۔ بولی:

"ہائے ہمشیر کتنی اچھی لگ رہی ہیں آپ —"

"سچ بھابی —" ایک لحظہ کو اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔

"سچ — بالکل سچ — کہیں نظر نہ لگ جائے۔"

"تمہارے ہوتے ہوئے اس کا خطرہ مجھے نہیں ہو سکتا۔" مینا ہنس کر بولی۔

"کیوں بناتی ہیں ہمشیر۔"

"بنانے کی کیا بات ہے — ایسی پیاری سی تو ہو تم —"

پارٹی بڑی شاندار تھی — مہمانوں کی خاصی بھیڑ تھی۔ ایک سے ایک اچھی صورتیں دیکھنے میں آ رہی تھیں — گیٹ کے باہر کاروں کی لمبی قطار تھی — بیگم مراد کا دیور ریحان اچھی شخصیت کا مالک تھا۔ چہرے پر شادابی اور شگفتگی تھی۔ باتیں کرنے کا انداز متاثر کر دینے والا تھا — مسکراتے ہوئے مہمانوں کو ریسیو کر رہا تھا — شرجیل وغیرہ کے ساتھ مینا کو دیکھ کر ایک لمحہ کو ٹھٹکا۔

"ہیلو ریحان —" شرجیل نے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔

"کیسے ہو — بھئی" پھر جھک کر آہستہ سے پوچھا۔ "شادی کر لی کیا بھئی؟"

شرجیل ہنس پڑا۔

"کمال کرتے ہو بھئی —" اس نے مینا کا تعارف ریحان سے کرایا۔

"یہ میری کزن مینا ہیں۔ تبدیلی آب و ہوا کے لیے ہمارے پاس آئی ہیں۔"

"خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔

"آپ لوگ اندر چلیں، بھابی ادھر ہی ہیں۔"

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی وہ اندر آ گئی — یہاں روشنیوں کا چراغاں تھا۔ قمقموں کی دودھیا روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی — اداس اجالی سی روشنی میں وہ اور بھی حسین نظر آنے لگی — اندر آتے ہی تو شہلا سے ملاقات ہو گئی — سب سے چھوٹی بھابی وہ اس کا ہاتھ تھام کر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ اتنے مہمانوں کے درمیان وحشت سی ہو رہی تھی — سگریٹ اور سینٹ کی ملی جلی خوشبو سے سارا ہال مہک رہا تھا۔

دونوں پہلی ادھر ادھر کی دلچسپ باتیں کرتی رہیں۔ ہنستی ہنساتی رہیں — شہلا کے والدین گاؤں میں رہتے تھے۔ وہاں کوئی کالج نہ تھا دونوں بہنیں تعلیم کی غرض سے خالہ کے پاس ٹھہری ہوئی تھیں۔ شہلا متضاد طبیعت کی مالک تھی۔ بہت سنجیدہ اور سمجھدار ہونے کے ساتھ ہی ساتھ خاصی شوخ بھی تھی۔ موقع محل دیکھ کر بات کرتی۔ ہر طرح کی محفل میں کھپ جاتی ہر قسم کے لوگوں سے گزارہ کر لیتی۔ لوگوں کے مزاج کو سمجھ کر اسی کے مطابق باتیں کرتی۔ لوگ اس سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے — مصوری سے بھی لگاؤ تھا، گاتی بھی اچھا تھی، اس کے علاوہ کئی قسم کے ساز بھی بجا لیتی تھی۔ ڈانس میں بھی کافی ماہر تھی اور مینا سوچ رہی تھی کہ اتنی بہت سی خصوصیات ایک ہی انسان میں کیسے جمع ہو جاتی ہیں۔ بوفے ڈنر کا انتظام تھا۔ لوگ ٹولیوں میں کھڑے کھا رہے تھے۔ کبھی ہال میں مکمل خاموشی چھا جاتی اور کبھی اک دم سے ہی شور سا اٹھ کھڑا ہوتا۔ کسی کونے سے کوئی شوخ قہقہہ گونجتا اور سب کی نظریں ادھر ہی اٹھ جاتیں۔

"تکلف نہ کیجیے مس مینا —"

آواز سن کر وہ پلیٹ تھامے پیچھے مڑی — ریحان کھڑا مسکرا رہا تھا — مینا نے اس کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس کیں تو کچھ گھبرا کر کچھ شوخ ہو کر کہنے لگی:

"تکلف کیسا —"

وہ ایک قدم آگے آ گیا — پوچھنے لگا۔

"کیا ایکٹیویٹیز رہتی ہیں آپ کی —؟"

"کوئی خاص نہیں —" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

"پھر بھی —"

"میوزک سے شوق رکھتی ہوں۔"

"ویری گڈ — پھر تو یقیناً آپ دلچسپ ہوں گی۔"

وہ کچھ نہ بولی، پلیٹ تھامے آہستہ آہستہ کھاتی رہی — کسی

کے بجائے ریحان دوسری طرف چلا گیا ---- شہلا اس کی جانب دلچسپی سے
جھک آئی اور سرگوشی میں بولی:

"ریحان بھائی کی نظریں آپ کو ٹٹول رہی تھیں۔"

مینا ہنس پڑی۔

"اپنی خیر مناؤ ---- تمہیں ساتھ ہی رہنا ہے اس گھر میں۔"

"میں تو انہیں ریحان بھائی کہتی ہوں۔" شہلا بے باکی سے بولی۔

"کہنے سے کیا ہوتا ہے ----" وہ ہاتھ روک کر بولی۔ "یہ بنائے ہوئے رشتے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ ویسے تمہارا رہا لاٹ صاحب امریکہ سے ہو کر آئے ہیں۔ خاصے رنگین مزاج ہوں گے۔"

"خیر ہے ---- تجربہ ہے ----"

مینا نے مسکراتے مسکراتے ہاتھ روک لیا ---- کچھ دور کھڑے ریحان کو
دیکھا ---- مسکرا کر شہلا کی طرف دیکھا اور بولی:

"تجربہ ہے اور صرف اس میں کوئی شک نہیں، لیکن شہلا
کیا خیال ہے ----؟"

وہ ہنس کر دوسری طرف مڑ گئی۔

ڈنر کے بعد میوزک کا پروگرام تھا ---- تھوڑے سے لوگ باقی رہ
گئے تھے۔ خوشگوار موڈ میں باتوں میں مصروف تھے۔ سنجیدگی عروج پر تھی۔ ہنسی
مذاق کے ساتھ گرم گرم کافی سرو کی جا رہی تھی۔ شہلا اور مینا بھی ایک طرف کو
بیٹھی کافی پی رہی تھیں۔ ذرا فاصلے پر شرجیل اور ریحان چند دوسرے لوگوں
کے ساتھ بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی شرجیل مڑ کر ان دونوں کی طرف بھی دیکھ لیتا اور
مسکراہٹ خود بخود ہونٹوں پر آ جاتی۔ ریحان کی نظروں کو مینا نے بارہا خود پر
بھٹکتے پایا ---- ان نظروں میں دلچسپی کا نمایاں انداز تھا مگر مینا کو ان نظروں کی
ذرا بھی پرواہ نہیں لگ رہی تھی۔

"شہلا ----" مینا اس کی طرف جھکی

"کیا بات ہے ----؟"

"تمہارے ریحان بھائی تمہارے نظر باز معلوم ہوتے ہیں۔"

شہلا نے آہستہ سے اس کا ہاتھ دبایا۔

"مطمئن رہو، شرجیل بھائی کے آگے اس کی دال نہ گلے گی۔"

"شرجیل کا کیا ذکر ----" مینا نے برا سا منہ بنایا۔

"کیوں، آیا چانس گنوا رہی ہو مینا، شرجیل بھائی اتنے اچھے ہیں۔ کم از کم
مجھے تو بہت پسند ہیں۔"

"تو پھر تم اپنی قسمت آزماؤ نا ----" مینا نے ہنس کر بات ٹالنا
چاہی۔

وہ مسکرائی۔

"تم اجازت دیتی ہو ----؟"

"اجازت ----" وہ حیران ہوئی۔ "بھلا میری اجازت کی
تمہیں کیا ضرورت پڑ گئی، میرا ان سے کیا واسطہ۔"

"یہ پھر کبھی، وقت آنے دو۔" شہلا ایک آنکھ دبا کر شرارت سے
مسکرائی۔

"ایسا موقع کبھی نہ آئے گا۔"

"یہ تو وقت بتائے، مجھے معلوم ہے خانم بھی تمہیں پسند کرتی ہیں اور میرا
خیال ہے شرجیل بھائی بھی تم سے متاثر ہیں اور ہونا بھی چاہئے تم چیز
ہی ایسی ہو ----"

مینا ہنس پڑی ---- "اچھا! کیسی چیز ہوں؟"

"لڑکا ہوتی تو بتاتی ----" شہلا نے اس کی کمر میں چٹکی بھری۔

خالی کپ مینا نے قریبی تپائی پر رکھ دیا۔ ایک اچٹتی سی نظر سامنے بیٹھے
شرجیل پر ڈالی اور ---- اور اس کے چہرے پر سوچ کا انبار لگ گیا۔

شہلا کی آواز پر چونک کر اسے دیکھا وہ کہہ رہی تھی:

"میں بتا سکتی ہوں اس وقت تمہارے ذہن میں کیا ہے۔"

"جی ہاں، بہت پہنچی ہوئی ہیں نا آپ ----"

چہرے پر چھایا رہتا ہے بیٹا" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈال کر بولی ——— بینا مسکرا دی بولی کچھ نہیں۔ گانے کی آواز پر وہ ادھر
ہی متوجہ ہو گئیں۔

بیگم ملک کے کوئی جاننے والے تھے ——— بہت اچھا گا رہے
تھے پھر بھی ملک وقفے وقفے سے شرکت کر رہے تھے ——— ان کے بعد دوسروں نے
بھی دو ایک دھنیں سنائیں ——— اور پھر بیگم مراد بینا کے سر ہو گئیں
بینا نے بہت انکار کیا مگر اس کی ایک نہ چلی۔ انھوں نے زبردستی اس کا ہاتھ
پکڑ کر اٹھا دیا ——— وہ دھڑکتا دل لیے پیانو پر جا بیٹھی۔ کبھی اتنے لوگوں کی
موجودگی میں گانے کا اتفاق نہ ہوا تھا ——— گھبراہٹ ہو رہی تھی ——— تھوڑی
دیر سرخ چہرے کے ساتھ یونہی پیانو کے تاروں کو چھیڑتی رہی پھر بہت پیاری
سی غزل چھیڑ دی ——— ہر شخص دم بخود تھا ——— خوبصورت
غزل پر سوز آواز اور اس پر گانے کا دل کو لوٹ لینے والا انداز۔

جونہی اس نے غزل ختم کی سب سے پہلے بجنے والی تالی ریحان کی تھی ———
پھر پورا ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا ——— اور سب کے بے حد اصرار پر
اسے دوبارہ گانا پڑا ——— غزل ختم کر کے پسینہ پونچھتی وہ اپنی جگہ پر جا بیٹھی۔

"بہت خوب مس بینا! آپ نے تو غضب کی آواز پائی ہے۔" ریحان
اس کے قریب آ گیا اور مسکراتے ہوئے تعریف کرنے لگا۔ بینا کچھ نہ بولی ایک
نظر اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"آپ فلم کے لیے کیوں نہیں گاتیں۔"

"جی ——— ؟" اس نے حیران ہو کر نظریں اٹھائیں۔

"اتنی اچھی آواز ہے کیوں نہ فلم میں چانس لو ——— اس خداداد
صلاحیت سے فائدہ اٹھانا چاہیے آپ کو۔"

"اتنی شوقین نہیں ہوں۔" وہ ناگواری سے بولی۔ "اور نہ ہی میری
آواز اتنی اچھی ہے ——— آپ کچھ مبالغے سے کام لے رہے ہیں۔"

"بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے اتنی اچھی آواز بہت کم سنی ہے۔"
بینا کچھ نہ بولی۔ اسے نظر انداز کر کے شمع کے ساتھ باتوں میں مصروف
ہو گئی۔ وہ بھی اپنی جگہ پر چلا گیا۔

خاصی رات گئے واپسی ہوئی۔ بینا تھکن سے نڈھال تھی پچھلی سیٹ
سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ شرجیل نے ڈرائیو کرتے کرتے دو ایک بار پلٹ
کر اسے دیکھا ——— تھکن سے اور نیند کے جھونکوں میں جھکتے ہوئے چہرے کے ساتھ آنکھیں
موندے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ پلکوں کی جھالر رخساروں پر چھائی تھی
اور بالوں کی کچھ لٹیں پیشانی پر جھک آئی تھیں اور ہلکی ہلکی سی سانسیں لیتی
ہوئی وہ ایک طرف کو ڈھلکی بیٹھی تھی۔

"بینا ——— بہت تھک گئیں کیا ——— ؟"

شرجیل کی آواز پر چونک کر اس نے آنکھیں کھول دیں ——— ایک
ہاتھ سے بالوں کو برابر کیا اور سیدھی ہو بیٹھی۔

"کچھ اتنی زیادہ بھی نہیں ———"

"نیند آ رہی ہے ؟"

"ہاں ———"

"بہت جلد سونے کی عادی ہو ابھی تو ساڑھے گیارہ ہی بجے ہیں۔"
بینا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آ گئی، جھجکتے ہوئے لہجے
میں بولی: "ہاں آپ کی رات تو دو بجے کے بعد شروع ہوتی ہے۔"
شرجیل ہنس دیا ——— کتنی ہی دیر ہنستا رہا پھر کہنے لگا۔

"خوب جان گئی ہو مجھے ——— سچ ہی کہتی ہو میری رات واقعی
بہت دیر سے آتی ہے ——— کیا کروں جلد گھر آ بھی جاؤں تو بستر پر بیٹھا
کروٹیں بدلتا رہتا ہوں۔ نیند ہی نہیں آتی۔"

"عادت جو خراب کر لی ہے آپ نے۔"

"سدھارنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"کیا ضرورت پیش آ گئی ؟"

"ضرورت ——— ؟" وہ ہنسا۔ "پھر کبھی بتاؤں گا ——— مناسب
وقت کا انتظار کر رہا ہوں۔"

——— بینا کچھ نہ بولی ——— بیٹھی کھڑکی سے باہر جھانکتی رہی۔ کھڑکی کی
راہ آنے والی ہوا بالوں کو بکھیر رہی تھی جسے وہ ایک ہاتھ سے برابر کرتی جا رہی
تھی ——— ہلکی سی ٹھنڈک کا احساس ہو رہا تھا ——— اور یہ ٹھنڈک
بہت بھلی لگ رہی تھی اس وقت۔

بابو اور نسیم بھی نیند سے نڈھال تھے ——— چپ چاپ بیٹھے
تھے کوئی کچھ نہ بول رہا تھا ——— بابو کو پتا تھا [illegible]
کر ٹیک لگا کے آدھے سوتے آدھے جاگے عالم میں چپ چاپ بیٹھا تھا شرجیل
نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ اس کے سر پر ہلکے سے چپت جمائی،

"سو رہے ہو کیا صاحبزادے ؟"

"نہیں بھیا ———" وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"سب کو ہی نیند آ رہی ہے۔" وہ ذرا سامنے جھک کر بولا۔ "ایک میری
ہی آنکھوں سے نیند غائب ہے ——— جانے ایسا کیوں ہے شاید
عادتوں سے تنگ ہوں۔"

کوٹھی آ گئی تو سب جلدی سے اتر پڑے ——— شرجیل [illegible]
پر کنجیاں گھماتے بیٹھا رہا ——— بینا نے کچھ [illegible]
پلٹ کر دیکھا۔ وہ ادھر ہی دیکھ رہا تھا [illegible] ہاتھ کے اشارے سے
قریب بلا لیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا ——— "کچھ [illegible]

کی نیم روشنیوں سے جھلملا [illegible] ہی بسے لگتے تھے
چاروں طرف اونچے اونچے لمبے لمبے پتوں والے درخت کھڑے تھے
تھوڑی دور تک قدرتی چشمے ابل رہے تھے' ان کا پانی اتنا ہی شفاف اور ٹھنڈا
تھا ——— بینا بے خودی کی حالت میں سب کچھ دیکھتی رہی ——— خوش
ہوتی رہی۔ اتنے لمبے سفر کے بعد سب تھکن سے نڈھال ہو گئے تھے۔
غسل کے بعد فوراً گرم چائے کا دور چلا اور تھوڑی دیر کو لیٹ رہے۔ سب سے
پہلے شہلا اٹھی' مڑ کر دیکھا' بینا اور اجالا ایک ہی بستر پر تھیں ——— بینا کو
نیند سی آ گئی تھی۔ شہلا نے اسے بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔
"بھئی اب اٹھو نا ——— ہم یہاں سونے کے لیے تو نہیں آئے۔"
"چائے پی لوں تو اٹھتی ہوں ——— "بینا نے سر اٹھایا۔
"اچھا تو بستر پر جاگ رہی ہیں' میں سمجھی سو گئیں۔"
"ارے نیند کس کم بخت کو آئی تھی۔" ہنستی ہوئی اٹھ بیٹھی۔
باری باری سب اٹھ گئے۔ تھکن اتار کر سب موڈ میں آ گئے تھے
خالہ اور بیگم مراد نے الگ محفل جمالی۔ راحو بچوں کے ساتھ لگ گیا اور جوانوں
کی ٹولی باہر گھومنے چل دی۔ سامنے چیڑ اور دیودار کے لمبے لمبے درخت تھے
جن پر چڑیوں کا بسیرا تھا۔ ننھے ننھے جھرنوں کے سریلے نغمے کانوں میں رس
گھول رہے تھے۔ شہلا اور بینا ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے سب سے
الگ تھلگ چل رہی تھیں ——— ریحان کی آواز پر پلٹ کر دیکھا:
"آپ لوگ اپنی دنیا کیوں الگ بسا بیٹھی ہیں بھئی۔ سب کا ساتھ
دیجیے نا مس بینا؟"
"کچھ پرائیویٹ باتیں ہو رہی ہیں۔" وہ ہنس کر بولی۔
"پھر تو معاف کیا ——— یہ پرائیویٹ باتیں ختم ہو جائیں تو
سب میں شامل ہو جائیے گا' یہ اچھا نہیں لگتا کہ آپ ہم سے کٹ کر رہیں۔"
دونوں ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔
"اللہ خیر کرے ——— "بینا ہنس کر بولی۔ "تمہارے ریحان
بھائی مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہیں۔"
"رشک آتا ہے تمہاری خوش نصیبی پر۔" شہلا ایک ٹھنڈی
سانس بھر کر بولی۔ بینا ہنس پڑی۔
"ہاں ——— جے دیکھو آپ پر ہی مرا جا رہا ہے جیسے ہم تو کسی کو
نظر ہی نہ آتے ہوں ——— تم سب کا اسکوپ مارتی ہو ——— بہت
بری ہو۔"
"اب میرا کیا قصور ——— "وہ بدستور ہنس رہی تھی۔
"مجھ پر کیوں خفا ہوتی ہو' تم بھی قسمت آزما لو۔"
"ہائے اپنے ایسے نصیب کہاں ——— " شہلا نے ایسی ٹھنڈی
سانس بھری کہ بینا بے ساختہ ہنس دی' ہنستے ہوئے اس کی چوٹی پر ایک چپت
جمائی۔
"بڑے خطرناک موڈ میں نظر آ رہی ہو۔ کسی کو دیکھ کر پھسل نہ جانا۔"
"وہ ہی کون گیا ہے۔" اس نے مصنوعی افسردگی سے کہا۔
"راہ میں بہت ملیں گے۔"
"پھر وہ ان راہ چلتوں کی کیا بات ہے' جب اپنے ہی بیگانے
ہو گئے ———"
"اپنا کون ——— ؟" بینا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا' کہیں
اپنے سے مراد ریحان تو نہیں؟"
شہلا ہنس پڑی۔
"کیا بات کہی ہے۔ تمہارا دھیان بھی ادھر ہی لگا ہے۔"
"کیوں بکواس کرنے پر تلی ہو۔" بینا نے بیزار ہو کر منہ بنایا۔
"پھر وہ اس قصے کو آؤ اُدھر چلتے ہیں' کیسی خوبصورت جگہ ہے۔"
دونوں ساتھ ساتھ چلتی ایک کنج میں جا بیٹھیں۔ انہیں یہاں بیٹھے ذرا
سی دیر ہوئی تھی کہ پوری ٹولی آ دھمکی۔
"آ گئی شامت تمہاری ——— " شہلا نے بینا کے چٹکی بھری۔ وہ
ہنس دی۔
"جل تو نہیں رہی ہو؟"
"خوش ہو رہی ہوں۔ ویسے خطرہ بھی ہے ——— تم ایک ہو اور
ادھر تین تین ہیں۔"
"تین کون؟" وہ حیران ہوئی۔
"ریحان بھائی نمبر ایک ——— شرجیل بھائی نمبر دو اور رضا۔"
بینا ہنس پڑی۔
"ارے واہ سب کو میرے ہی سر تھوپ دو۔"
وہ لوگ قریب آ گئے۔ ساتھ ہی بیٹھ رہے۔
"ختم ہو گئیں آپ کی پرائیویٹ باتیں۔" ریحان پوچھ رہا تھا۔
بینا کچھ نہ بولی ——— اس کی طرف دیکھا بھی نہیں ——— "ویسے لڑکیوں
کی پرائیویٹ باتیں ہوتی مزے کی ہیں۔" رضا ہنس کر بولا۔
"کیوں بینا ٹھیک کہا نا؟"
"کیا پتہ ——— !" وہ ہولے سے مسکرائی۔
وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا:
"کبھی چھپ کر سننے کو دل چاہتا ہے۔"
"بڑے بے ایمان ہیں آپ ——— یہ عادت اچھی نہیں۔"
رضا ہنس کر چپ ہو رہا۔

[illegible] بیت بازی [illegible] ——
شرجیل نے ایسے ایسے مزاحیہ اشعار سنائے کہ سب کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔ وہ اس وقت خاصے موڈ میں تھا۔ ریحان اور رضا شعر و شاعری کے معاملے میں بالکل کورے تھے ان کے بدلے شرجیل ہی جواباً شعر پڑھتا رہا ——
اور بینا دل ہی دل میں اس کے ذوق اور اس کی قابلیت کی داد دیتی رہی۔ بیت بازی میں اچھا خاصا لطف آیا۔ وقت کا احساس ہی نہ رہا۔ جب ہوا میں کافی ٹھنڈ آ گئی تو سب جانے کو اُٹھے۔

کھانے کے بعد صبیحہ، ماجد اور رضا پھر سیر پر آمادہ تھے —— چاندنی رات کا لطف لینا چاہتے تھے مگر دوسروں نے ان کی تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ یوں بھی دن بھر کے سفر کے بعد تھکن باقی تھی —— صبح چڑیوں کے شور سے بینا کی آنکھ کھلی تو کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا کر دیکھا —— ہلکی سی روشنی چاروں طرف پھیلی تھی —— سفید پروں والے بگلے آسمان کی پہنائیوں میں اڑتے پھر رہے تھے —— اور موسم انتہائی خوشگوار اور آزاد لگ رہا تھا —— بے ترتیب بالوں کو سمیٹتی وہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی باہر آ گئی —— راہ میں آگے کا سنی اور زرد پھولوں کو توڑتی وہ قریبی چشمے کے پاس آکر ٹھہر گئی —— ایک چٹے سے پتھر پر بیٹھ کر پانی کو گرتے ہوئے دیکھنے لگی —— اس وقت خود کو بہت سبک اور تازہ دم محسوس کر رہی تھی —— قریب پڑے ننھے ننھے پتھر پانی میں اچھالتی رہی۔ ہلکے سروں میں کچھ گنگناتی رہی —— ہاتھ میں تھامے پھول بے دھیانی میں پانی میں جا گرے۔ جھک کر انہیں اُٹھایا، سیدھی ہوئی تو سامنے سے رضا کو آتے دیکھا، دیکھ کر مسکرا دی —— وہ قریب آ گیا ——

”کیا ہو رہا ہے —— !“
”دیکھ لیں۔“ وہ شگفتگی سے مسکرائی۔
”بڑی جلدی جاگ گئیں۔“
”کچھ اتنی جلدی بھی نہیں —— روز ہی اسی وقت آنکھ کھلتی ہے ——“
”مجھے تو دیر تک سونے کی عادت ہے۔“
”پھر آج کیسے اُٹھ گئے۔؟“
”نئی جگہ پر آ کر معمول میں تھوڑی سی تبدیلی تو کرنی پڑتی ہے۔ اور پھر جاگ جانے پر فائدہ ہی ہوا۔“ وہ مسکرا رہا تھا۔
”فائدہ کیسا —— ؟“ وہ ایک پل کو حیران ہوئی۔
”آپ سے تنہائی میں جو ملاقات ہو گئی۔ ورنہ ہر لمحہ سارے لوگ ہی گرد رہتے ہیں آپ سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا ——“

”تنہائی میں بات کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی بھئی۔“
”آپ سمجھتی کیوں نہیں بینا ——“ وہ جھنجھلا گیا، ”یا سب کچھ سمجھ کر بھی انجان بن رہی ہیں۔“
”کیا سمجھوں بھئی —— جانے آپ کیا سمجھانا چاہ رہے ہیں۔“
”اجازت ہو تو صاف صاف کہہ دوں —— ناراض تو نہ ہوں گی؟“
”ایسی کونسی بات ہے بھلا —— ! اور پھر ناراضگی کیسی —— !!“
وہ کچھ دیر چپ چاپ کھڑا رہا۔ کچھ سوچتا رہا پھر اسے دیکھا۔
”میں آپ کو بہت پسند کرتا ہوں بینا !“
”اچھا —— واقعی ——“ وہ سادگی سے مسکرائی اور اپنے انداز میں بولی،
”میں بھی آپ کو پسند کرتی ہوں۔“
”سچ کہہ رہی ہیں نا —— !“
”ہاں —— جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی نہیں۔ آپ اچھے انسان ہیں اور اچھے انسانوں کو سب ہی لائیک کرتے ہیں۔“
”سب کی بات چھوڑیئے اپنی کہئے ——“
”بتایا تو کہ میں بھی آپ کو پسند کرتی ہوں۔ آپ کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ دلکش شخصیت کے مالک ہیں آپ ——“ پھر اس نے مسکرا کر رضا کی طرف دیکھا۔
”اور کچھ سننا چاہتے ہیں آپ ؟“
”نہیں ——“ وہ پانی پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا —— مڑ کر بینا کو دیکھا —— بولا ”کبھی آپ کو اچھی طرح اپنی پسند کا مطلب سمجھاؤں گا۔“

بینا کو اس ذکر سے بوریت ہونے لگی تھی ——— بات کا موضوع بدلتے
ہوئے بولی:
"ابھی پیاری جگہ ہے نا ——— ؟"
"ہاں اچھا وقت گزرے گا۔ شہر کے ہنگاموں سے ہٹ کر کبھی کبھار ایسی
جگہوں پر آنا لطف دے جاتا ہے ——— آپ کا کیا خیال ہے بینا۔"
"میں تو ایسی جگہوں کی عاشق ہوں۔ میرا بس چلے تو یہیں رہ جاؤں۔"
"کہنے کی بات ہے ———" وہ اسے دیکھتا ہوا بولا۔ "شہری زندگی
کے ہم لوگ اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ یہاں کے پُرسکون ماحول سے صرف چند
دن ہی لطف اٹھا سکتے ہیں، زیادہ نہیں۔ اس کے بعد بور ہو جائیں گے۔"
"کیا خبر آپ ٹھیک ہی کہتے ہوں ———" وہ ایک لمبی سی سانس لے کر
اٹھ کھڑی ہوئی۔
"اب چل دیں ——— ؟"
"ہاں ——— دیکھوں دوسرے لوگ اٹھ گئے یا نہیں۔"
"چلئے پھر ———" وہ ساتھ ہی آ گیا۔ ——— ریسٹ ہاؤس کے
سامنے لگے املتاس کے درخت سے ٹیک لگائے کوئی کھڑا تھا۔ باتوں کی آواز
پر مڑ کر دیکھا۔ بینا اور رضا تھے ——— انہیں ساتھ ساتھ دیکھ کر شرجیل
کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا ——— پوری آنکھیں کھولے انہیں دیکھتا رہا۔
وہ اردگرد سے بے خبر باتیں کرتے اندر چلے گئے۔ ناشتے کی میز پر سبھی موجود تھے
ناشتہ کرتے ہوئے باتوں میں مصروف تھے ——— ایک شرجیل تھا جو خاموش
بیٹھا آملیٹ کاٹ کاٹ کر کھا رہا تھا ——— کبھی کبھی ہاتھ روک کر سامنے
بیٹھی بینا کو بھی دیکھ لیتا جو دوسروں سے ہنستے ہوئے باتوں میں مصروف
تھی۔ ناشتے کے بعد مختلف کھیل کھیلے جانے لگے۔ پھر کھیل سے اکتا کر سیر کو نکل
گئے ——— شرجیل وہیں رک گیا ——— ناول لے کر کمرے میں چلا گیا۔
الفاظ نظروں سے گزرتے رہے مگر ذہن کہیں اور ہی بھٹک رہا تھا۔ چہرے سے
الجھن سی ٹپک رہی تھی ——— کچھ نڈھال نڈھال سا بستر پر پڑا تھا۔ اس نے اپنے
ذہن کو ادھر اُدھر کی باتوں میں بہلانے کی کوشش کی۔ "خود اپنی سمجھ نہ آ رہی
تھی۔ میں کیوں اتنا بدل گیا ہوں۔"
تھوڑی دیر بعد بینا نے کھڑکی سے سر نکالا۔ شرجیل نے تکیے سے سر اٹھا
کر اسے دیکھا۔
"کیا کر رہے ہیں آپ؟"
"کیوں ——— ؟"
"چلئے نا سیر کو۔"
"سب تو ہیں، ایک میرے نہ چلنے سے کیا فرق پڑے گا۔"
"میں لڑائی کے موڈ میں نہیں ہوں۔"
"تم جاؤ میں آرام کرتا ہوں ———"
"آرام کرنے آئے ہیں یہاں ؟"
"یہ تو میں نہیں جانتا، بہرحال اس وقت تھوڑی دیر آرام کرنے کی
خواہش ہے۔"
"میں نے ڈسٹرب تو نہیں کیا ؟"
"نہیں ——— !"
"اچھا آپ آرام کیجئے میں تو چلی۔"
وہ مسکراتے ہوئے پیچھے ہٹ گئی ——— ایک لمحہ ٹھہر کر شرجیل
نے کھڑکی سے باہر جھانکا وہ تیز تیز قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی۔
"میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم اتنی بے حس بھی ہو سکتی ہو ——— !"
کتاب رکھ کر اس نے کمبل میں منہ چھپا لیا ——— لنچ کے وقت رضا نے
آکر جگایا۔
"کیا بوریت پھیلا رکھی ہے یار ——— "
وہ انگڑائی لیتا ہوا اٹھ بیٹھا ——— رضا کے ہشاش بشاش چہرے کو دیکھا
اس پر پیار سا آیا ——— خاموشی سے سگریٹ سلگا لیا۔
"سیر کیسی رہی ——— ؟"
"بہت لطف آیا ——— تم نے خوامخواہ مِس کیا۔ شام کو ذرا دوسری
طرف چلیں گے ——— اسکیٹنگ کا مقابلہ ہو رہا ہے دیکھنے چلو گے نا ——— ؟"
"موڈ ہوا تو ———" اور یہ کہتا ہوا وہ سگریٹ پھینک کر باتھ روم
کی طرف چلا گیا۔
شام کو سب اسکیٹنگ کا مقابلہ دیکھنے جا رہے تھے۔ لڑکیاں خاصے
اہتمام سے تیار ہوئیں۔ بینا کاسنی ساڑی میں بہت سج رہی تھی۔ چہرے پہ
بڑی شگفتگی اور رعنائی تھی اور انداز میں والہانہ پن۔ تیاری مکمل ہو گئی تو سب
اسکیٹنگ ہال کی طرف چلے۔ راستے بھر ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ وہاں پہنچے تو مقابلہ
شروع ہونے والا تھا۔ کاؤنٹر سے ٹکٹ خرید کر سب اندر گئے۔ یہاں اور
بھی بہت سے لوگ تھے۔ غیر ملکی لوگ بھی کافی تعداد میں نظر آ رہے تھے۔ سوات
کی پہاڑیاں سیر و تفریح کے لیے بہت مشہور تھیں ——— اور اس سیزن
میں تو یہاں کی بہار دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔
"کیا کلاس کی جنٹری ہے۔" شہلا بولی۔
"ڈھونڈ لو یہاں کسی کو۔" بینا مسکرائی۔
"تمہارے سامنے اپنی دال کہاں گلے گی۔"
"کیوں بلاوجہ بناتی رہتی ہو شہلا۔ کچھ زیادہ ہی باتیں کرنے لگی ہو۔"
"جانے تم میں کیا بات ہے جو ہر کوئی دیکھتے ہی یوں پھسل پڑتا ہے۔"
"اچھا بس چپ رہو مقابلہ شروع ہونے والا ہے۔"

شور شروع ہو چکا تھا ——— جو لوگ عمارت سے باہر کھڑے تھے،
کبھی کبھی آپس میں ٹکراتے تو زور کا قہقہہ پڑتا ——— مقابلہ وہ بڑے شوق سے
دلچسپی سے دیکھ رہے تھے ——— بعد میں یہ مقابلہ ایک پہاڑی لڑکی نے جیتا۔
لڑکیوں نے تالیاں پیٹ پیٹ کر ہتھیلیاں سرخ کر لیں ——— ایک لڑکی
کی جیت پر سبھی لڑکیاں خوش تھیں جیسے یہ مقابلہ خود انھوں نے جیتا ہو۔

واپسی میں ایک ریسٹورنٹ میں گئے۔ وہاں کی آئس کریم کافی مزیدار
تھی۔ سب نے شوق سے کھائی۔ ریسٹورنٹ سے نکل کر خاصی دیر یونہی سرسبز
پہاڑیوں پر چہل قدمی کرتے رہے، پھر کچھ خریداری کا پروگرام بنا۔ سب نے
اپنی اپنی پسند کی چیزیں خریدیں۔ کچھ غیر ضروری چیزیں بھی خریدی گئیں۔
یہاں آ کر جیسے پیسوں کی کسے پروا تھی۔ شرجیل نے سب کی نظر بچا کر ہاتھی دانت
کا بنا ہوا خوبصورت سا ہار خرید لیا۔

دکان سے باہر نکلے تو سائیس کی آوازوں نے تنگ کر دیا۔ سیاحوں
کی تفریح کے لیے سائیس گھوڑے لیے گھومتے پھر رہے تھے۔ ہر شخص کو دیکھ کر
آواز لگاتے:

"گھوڑا لاؤں صاحب، ہمارا نمبر گھوڑا، فسٹ کلاس ہے، ایک دم فسٹ
کلاس، ہوا کا مافق۔"

"ادھر آؤ میم صاحب، یہ گھوڑا دیکھو طبیعت خوش ہو جائے گا۔"

بینا ہمیشہ سے ہی رائیڈنگ کی شوقین تھی۔ گھوڑے دیکھ کر مچل گئی۔
بڑھ کر ایک گھوڑے کی لگام تھام لی ——— شرجیل اسے دیکھ کر مسکرا دیا،
اس نے بڑھ کر دوسرے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ ریحان اور رضا بھی ساتھ ہی آ
گئے۔ بقیہ لوگ واپس ریسٹ ہاؤس چل دیے۔

یہاں پر رائیڈنگ کرتے ہوئے بینا کو اور ہی لطف آیا ——— دیر
تک مختلف سڑکوں پر سرپٹ گھوڑا دوڑاتی رہی ——— ایک دوسرے
سے شرطیں لگائیں، چوٹیں کھائیں، ہنستے ہنستے سب کچھ برداشت کر گئی۔
کافی دیر بعد تھک کر ایک طرف کو بیٹھ رہی، ساتھ ہی شرجیل بھی آ گیا۔

"تھک گئیں ——— ؟"

"ہاں ——— !"

"کیا بہت زیادہ ؟"

"نہیں ——— کچھ اتنا زیادہ بھی نہیں۔ ویسے لطف آیا۔"

"تھوڑا سا ستا لو پھر دوسری طرف چلتے ہیں۔"

"کہاں ؟"

"کشتی کی سیر کریں گے۔"

"نہ نہ" اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"کیوں ——— ؟ موڈ نہیں۔"

"ویسی ہی کچھ نہیں۔"

"یا تھک گئی ہو ———"

"تھک بھی گئی ہوں ——— اور موڈ بھی نہیں ہے۔"

"تھک گئی ہو تو دوسری بات ہے ——— موڈ تو میں بنا دیتا ———"

بینا کچھ نہ بولی ——— چٹان سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔

قدرے توقف کے بعد بولی:

"آپ کیوں کھڑے ہیں یہاں ———"

شرجیل نے اسے دیکھا اور مسکرا دیا ——— جیب میں ہاتھ ڈال کر
وہ ہار نکالا اور مسکراتے ہوئے جھک کر بینا کے گلے میں ڈال دیا
اس نے بڑی بڑی حیران کن آنکھوں سے اسے دیکھا، کچھ کہنے کی کوشش کی —
چپ سی رہ گئی۔ لاپروا انداز میں بیٹھی رہی۔

"بڑے شوق سے میں نے یہ تمہارے لیے خریدا ہے۔ پسند آیا ؟"

اس نے کچھ اس انداز سے پوچھا کہ وہ چونک سی گئی۔ غور سے اسے
دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک تھی ——— بینا کچھ کہے ایک ٹک کر
دیکھتی رہی پھر سر جھکا لیا۔

وہ قریب آ گیا۔ مدھم آواز میں ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا:

"میں ان دنوں کچھ عجیب باتیں سوچ رہا ہوں ——— جانے یہ
سوچ میرے حق میں کیسی ہے ——— تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں، کچھ
کہنا چاہتا ہوں ——— لیکن تمہارے موڈ کا پتہ ہی نہیں چلتا ———
ہر بات پر لڑ پڑتی ہو، کٹ حجتی پر اتر آتی ہو، اکدم سے بیگانہ بن جاتی ہو —
ان حالات میں بھلا میں کیا کہوں ——— اور کیسے ؟"

بینا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آتنی نرمی اور کچھ ایسا
ہی تاثر تھا کہ اس کا دل ڈول گیا ——— ایک لمحے کو گھبرائی پھر خود کو
سنبھال لیا۔

"مجھ سے کچھ نہ کہیں ———"

شرجیل نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا ——— کچھ سوچا اور سگریٹ
سلگاتا ہوا واپس مڑ گیا ——— اور تھوڑی ہی دیر بعد جب وہ ریسٹ
ہاؤس واپس جا رہا تھا تو اس نے دیکھا وہ رضا کے ساتھ ہنستی ہوئی اس طرف
جا رہی تھی جہاں پانی میں رنگین بادبانوں والی چھوٹی چھوٹی کشتیاں کھڑی تھیں،

●●●

(باقی آئندہ)

رخسانہ سہام مرزا

# تیسری دنیا

## تیسری دنیا کے معاشی مسائل کے حل کے

لیے گذشتہ قسط میں اوپیک کا ذکر آیا تھا۔ اوپیک ان مسائل کے حل میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے اور ترقی پذیر دنیا پر یہ حقیقت آشکار ہو گئی ہے کہ ان کے معاشی مسئلوں کو اوپیک ہی بطریق احسن حل کر سکتی ہے۔ حال ہی میں یورپ کو معاشی اتحاد و ترقی کی تنظیم نے اور ای سی ڈی (جس کا تفصیلی ذکر مسلمان ممالک کے ذکر میں آئے گا) نے ایک جائزہ شائع کیا ہے جس کی رو سے اوپیک نے گزشتہ برس کم ترقی یافتہ ممالک کو گرانقدر امداد فراہم کی
اوپیک نے اپنے تیل کے محدود وسائل اور محصولوں کا تین
فی صد اور قومی آمدنی کا دو فی صد حصہ ترقی پذیر ممالک کو ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس امداد کے ملنے سے جو سب سے بڑا فائدہ ہوا وہ یہ ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک کو مستقبل میں اپنی قومی آمدنیوں کے ایک بڑے حصے کی ادائیگی کے وعدے بھی کئے گئے۔ کویت اپنی قومی آمدنی کا چھ فی صد سعودی عرب قومی بجٹ کا دس فیصد اور عرب امارات اپنی قومی آمدنی کا پندرہ فیصد حصہ دینے کا وعدہ کر چکے ہیں۔ ان رقموں کا جو تیسری دنیا کے مفادات کے لیے صرف کی جائیں گی جب ہم مغربی ممالک کی قومی آمدنیوں کے تناسب سے مقابلہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان مغربی ممالک نے ترقی پذیر ممالک کو بہت کم امداد دی ہے۔ اس طرح یورپی ممالک کی کل قومی آمدنی کا پانچ فی صد حصہ ترقی پذیر ممالک کو بطور امداد مل رہا ہے۔ امریکہ دنیا بھر میں اس بات کا بہت پراپیگنڈہ کرتا ہے کہ وہ دوسرے ممالک کو زبردست مالی امداد کرتا ہے لیکن اس کی طرف سے ترقی پذیر ممالک کو دی جانے والی امداد صرف ۰ء۲۳ فی صد ہی ہے۔ امریکہ سے زیادہ تو مغربی جرمنی ترقی پذیر ممالک کی امداد کر دیتا ہے۔ تقریباً ۰ء۲ فیصد حصہ ترقی پذیر ممالک کو اس کی قومی آمدنی سے ادا کر دیا جاتا ہے۔ ان مختصر سے حالات کو جاننے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ اوپیک ہی وہ ادارہ ہے جس نے بہت کم وقت میں تیسری دنیا کے ممالک کو زبردست امداد دی ہے تاکہ یہ ممالک غربت و افلاس کے عفریت سے نجات حاصل کر سکیں اور ان ملکوں میں رہنے بسنے والے عوام معاشی ترقی اور فلاح کے راستوں پر گامزن ہو سکیں۔ اوپیک کی اہمیت تیسری دنیا کے تیل کے ذخائر کی بدولت زیادہ ہے ورنہ مغربی دنیا ہو یا یورپی دنیا۔ سب تیسری دنیا کے تیل برآمد کرنے والے ممالک سے فیضیاب ہوتے ہیں لیکن تیل کی قیمتوں میں توازن قائم رکھنے میں سیاسی حربے استعمال کرتے ہیں جبکہ تیسری دنیا کے ممالک تیل کی قیمتوں پر اپنا کنٹرول رکھنا چاہتے ہیں آج کے دور میں تیل کی قیمتیں خاصی بڑھی ہیں۔ اب جو سب سے اہم بات تیسری دنیا کے ممالک کے لیے ضروری ہے یہ ہے کہ ان کو ملنے والی امداد کو مالی امداد نہیں کہا جائے اور جو کچھ بھی ترقی پذیر ممالک میں کام کئے جائیں ان کو پہلی یا دوسری دنیا کے ممالک کا کارنامہ نہ گردانا جائے۔

تیسری دنیا نے جب سے اپنے مسائل کے حل کے لیے اوپیک سے امداد لینی شروع کی ہے۔ پاکستان کو بھی بہت سے معاشی فائدے ہوئے ہیں۔ سعودی عرب نے ۱۰ ملین ڈالر اور کویت نے ۵۰ ملین ڈالر کے قرضے گزشتہ برس دیئے۔ عرب امارات نے ایک ریفائنری اور تیل کی پائپ لائن ملتان سے کراچی تک بچھانے کے لیے قرضہ دیا۔ یہ پائپ لائن ۵۶۰ میل لمبی ہوگی۔ اسی طرح ملتان میں ایک کارخانہ قائم ہوگا۔ اس قسم کی بہت سی مثالیں اور بھی دی جا سکتی ہیں کہ تیل برآمد کرنے والے ممالک تیسری دنیا کے لیے کیا کام کر رہے ہیں اور تیسری دنیا کی زیادہ تر ترقی انہی کی مرہون منت ہے۔

(جاری ہے)

●●●

**نصیر** اور نسرین کی اچانک ملاقات چوبیس برس بعد دلی میں پالم کے ہوائی اڈے پر ہوئی۔ وہ ایک طویل مدت کے بعد وطن پلٹا تھا۔ وہ ہندوستان سے بھاگا تھا۔ اسی نسرین کو دل کے مندر سے نکالنے اور اسے بالکل فراموش کر دینے کی غرض سے وہ نہ جانے کتنے ملکوں میں مارا مارا پھرا تھا۔ اس نے ان گنت تکلیفیں اٹھائی تھیں، سختیاں جھیلی تھیں یہی نسرین کے ہجر میں۔ وہ اس سے چھوٹنے کے غم میں دوسری جنگ عظیم میں معمولی سپاہی کی طرح بھرتی ہو گیا تھا۔ سینکڑوں بار گولیوں کے آبشار سے گزرا، کئی بار زخمی ہوا، مرتے مرتے بچا، جب آخری بار پاؤں کی ہڈی ٹوٹنے سے ہلکا سا لنگ صحت یاب ہونے پر بھی باقی رہ گیا تو اسے فوج سے فارغ خطی مل گئی تھی۔ پھر وہ اپنے طور ایشیا، افریقہ جنوبی و شمالی امریکہ۔ کناڈا، الاسکا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، انڈونیشیا، ملائشیا، فلپائن اور برما میں سیر کرتا رہا۔ کہیں کہیں چھوٹی تجارتیں بھی کیں، کہیں کہیں اپنی فرم کی شاخیں بھی کھولیں اور کہیں کہیں اپنے بنے ہوئے مال کے لئے نئی نئی منڈیاں بھی تلاش کیں اور نئے نئے معاہدے بھی کئے اس لئے کہ نصیر حقیقتاً ہندوستان کے چند بڑے پونجی پتیوں میں سے تھا۔ بمبئی اور احمد آباد میں ان کی کئی کاٹن ملیں تھیں۔ کانپور میں بھی ایک کاٹن مل تھی، گورکھپور میں بھی شکر مل۔ پھر بمبئی میں قالینوں کا کارخانہ اور کلکتہ میں ایک

جوٹ مل۔ اس کی ایک ٹی اسٹیٹ آسام میں تھی اور ایک کیر الا میں؛ اس کی عدم موجودگی میں اس کا سارا کاروبار اس کے اعزا اور معتمد ملازمین بڑے سلیقے سے چلاتے رہے تھے۔ اس کے پاس بے انتہا دولت تھی۔ اس کے پاس بہت سے کام تھے۔ اس کے دل بہلانے اور ذاتی غم کو بھول جانے کے بہت سے ذریعے تھے۔ اس نے لاکھ چاہا کہ نسرین کا خیال دل سے نکال دے، پر وہ نہ نکلا۔ ایک گوشت میں پیوست کانٹے کی طرح وہ رگ و جان میں گھسا کھٹکتا ہی رہا۔ کھٹکتا ہی رہا۔

آج بھی وہ اسی ظالم کی یادیں دل میں لئے واپس پلٹ آیا۔ چھبیس برس بعد وطن آنے پر اس کے دل میں بے تحاشہ یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ان تمام مقامات کو ایک نظر پھر دیکھ لے۔ جہاں جہاں وہ اور نسرین ساتھ ہنستے ہوئے ایک دوسرے کی محبت میں سرشار گھومے پھرے تھے۔ وہ ایک دن سے زیادہ دلی میں نہ ٹھہر سکا تھا۔ اس لئے کہ ہر یاد کے ساتھ کچھ ایسے واقعات وابستہ تھے جو کہ اس کے دل کو برماتے تھے، سینہ چھلنی کرتے تھے۔

نسرین اس کی محبوبہ و معشوقہ نہ تھی، اس کی بیاہی عاشق بیوی تھی۔ کیسے پیار اور محبت کے چھ مہینے دونوں نے ہر لمحہ ساتھ گزارے تھے۔ سچ مچ دن عید تھے اور رات شب برات۔ جو دیکھتا یہی کہتا کتنا اچھا جوڑا ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر فدا۔ دونوں حسین، دونوں پڑھے لکھے مہذب اور دونوں دولت مند۔ نصیر احمد آباد کے سب سے دولت مند تاجر کا بیٹا اور نسرین سیٹھ عبد الکریم کروڑپتی کی واحد چشم و چراغ، مگر بے عیب ذات خدا کی۔ نصیر میں ایک بہت بڑی کمزوری تھی۔ وہ شراب پیتا تھا۔ اور وہ بھی اس ڈھنگ سے کہ یا تو مہینوں ایک قطرہ نہیں، یا جب پینے پر آتا تو پانچ سات دن لگاتار سوائے شراب کے اور کچھ نہیں، وہی کھانا وہی پینا وہی بچھونا، وہی زمین وہی آسمان، وہی عزیز، وہی دوست، وہی معشوقہ، وہی بیوی۔ پلنگ اور اس کے ارد گرد کا حصہ ہر طرح کی آلائش سے پر۔ ڈاکٹر کھڑے ہیں۔ نرسیں نگرانی کر رہی ہیں۔ مہترانیاں ہر لمحہ صفائی کے لئے تیار ہیں اور وہاں یہ حالت، لاکھ چاہو کوئی چیز حلق سے اتر جائے سوائے شراب کے، پینا ممکن، جس کو عرف عام میں کہتے ہیں "برسٹ" ہونا یعنی پھٹ جانا۔

بس شراب نوشی کے خلاف سارے بند حسن سارے نیک عزائم ٹوٹ جاتے تھے اور مستی و بے خودی کا وہ سیلاب آتا کہ نصیر کی عزت، حمیت، شرافت، انسانیت اور محبت تنکے کی طرح بہہ جاتی تھی اور وہ ایسی حرکتیں کر بیٹھتا تھا جن کا اس کے جیسے آدمی کے بارے میں وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

نہ نسرین اس کمزوری سے واقف تھی نہ نصیر کے خسر سیٹھ عبد الکریم کو اس کی خبر تھی۔ سیٹھ صاحب باوجود پابند مذہب اور حاجی ہونے کے نئے ڈھنگ کے کاروبار سے واقف تھے پھر بھی وہ شراب نوشی کے سخت خلاف تھے اور اگر انہیں نصیر کی اس کمزوری کی بھنک بھی مل جاتی تو وہ نسرین کا تڑپ تڑپ کر مر جانا پسند کرتے لیکن کبھی نسرین کا ہاتھ نصیر کے ہاتھ میں نہ دیتے۔ خود نسرین کو شراب سے الرجی تھی۔ اسے اس کی بو سے قے آتی تھی۔ دور سے دیکھ لینا ہی اس کے درد سر کے لئے کافی بہانہ تھا۔ کسی میخانے یا بار کے سامنے سے گزر جانا ہی اس کو مضمحل بنا دیتا تھا۔ بمبئی میں شراب ممنوع ہونے نے اس کو بہت کچھ ایسی آفتوں سے محفوظ رکھا تھا۔ وہ سکھ چین کی نیند سوتی تھی، نہ کوئی خطرہ، نہ کوئی ڈر اور اس نسرین پر نصیر نے اچانک "برسٹ" کی آفت ڈھائی۔

نصیر اس شب ایک مشہور فلم ستارہ کے ہاں اکیلا ہی دعوت میں گیا تھا۔ نسرین کی ادھر پندرہ بیس دن سے کچھ طبیعت ماندی تھی۔ لیموں چٹنی اور کھٹی چیزیں کھانے کا شوق بڑھ گیا تھا۔ اس رات گرانی سر کی وجہ سے شوہر کے ساتھ نہ جا سکی تھی۔ نو ہی بجے سے بستر پر لیٹی نیند بلا رہی تھی۔ وہ ناز نخرے کر رہی تھی۔ چھ مہینے سے سر کسی کے بازو اور سینے کو تکیہ بنانے کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ شادی کے بعد پہلی دفعہ اس شب پہلو میں نہ تھا۔ غرض گیارہ بجے کے قریب نیند کی دلہن بڑی منتوں سماجتوں کے بعد خراماں خراماں آئی۔ مگر وہ بمشکل ایک گھنٹہ سوپائی ہو گی کہ اسے محسوس ہوا کہ پورا سانڈ اس کسی نے اس کے منہ پر انڈیل دیا۔ وہ تڑپ کر جاگی تو دیکھا نصیر شراب میں دھت دونوں ہاتھوں میں بوتلیں لئے اس کو پیار کرنے کے لئے منہ چومنے کے لئے اس پر جھکا ہوا ہے۔ اسے محسوس ہوا یہ شوہر نہیں بلکہ گندگی میں لسا ہوا کوئی بھدیلا ہے وہ پھڑک کر نصیر کے پھیلے ہوئے ہاتھوں سے نکلی اور تھو تھو کرتی باتھ روم میں بھاگی۔ نصیر نے لڑکھڑاتے

ہوتے پوچھا کیا نسرین جس میں منہ کی کلیاں انڈیل رہی تھی کہ نصیر نے پیچھے سے آکر اسے دبوچنا چاہا۔

"اب کہاں جائے گی میری فری!" نصیر نے نشے میں چور آواز میں کہا۔

نسرین باز کے چنگل میں پھنسی ہوئی کبوتری کی طرح پھڑپھڑائی اور اس نے اپنے میاں کو پوری قوت سے دھکیل دیا۔ نصیر لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا اور حمام کے فرش پر گر پڑا۔ شراب میں دھت نصیر کو اب غصہ آگیا۔ وہ غرا کر بولا "اچھا! تو ہم سے لڑنا چاہتی ہے تو فیر (پھر) یہ دیکھ اور یہ سنبھال یہ لے!"

اور اس نے نسرین کو ٹانگ سے زور سے کھینچا کہ وہ منہ کے بل گر پڑی اور حمام کے چکنے فرش نے اسے گھس کر لہولہان کر دیا۔ اس کی دونوں کہنیاں بھی چھل گئیں۔ اس نے گرتے گرتے "ہائے" کی تھی "یہ لے! یہ لے!" کی بوچھاڑ کے ساتھ منہ پر طمانچے پڑے۔ پہلے تو وہ درد سے تڑپ رہی تھی لیکن طمانچوں نے اسے بت کی طرح بے حس و حرکت بنا دیا۔ نصیر شراب کے نشے میں سمجھا دشمن کو زیر کر لیا۔ وہ ہانپ رہا تھا اس نے اور جاتے جاتے ہوئی سی گالی دے کر بولا "ارام زادی! ہم سے لڑتی ہے۔ اس گھر میں رہنا ہے تو سیدھی طرح رہ، نہیں تو نکل جا! دور ہو جا! ابھی نکل!"

نسرین خاموشی سے اٹھی اور اس نے بیڈ روم میں جا کر باہر جانے کے لئے کپڑے بدل لئے۔ وہ اپنا پرس لئے باہر جا رہی تھی کہ نصیر منہ سے بوتل لگائے باتھ روم سے جھومتا ہوا نکل رہا تھا۔ نسرین کی تیاری دیکھ کر دھاڑا "اچھا! جا رہی ہے تو جا ہمیشہ کے لئے جا! میں نے تجھے طلاق دی" اور جب وہ اس پر حسرت و نفرت کی نگاہ ڈالتی ہوئی چلی گئی تو وہ پوری بوتل ایک سانس میں خالی کر کے بولا "چلی گئی سالی! اچھی گئی!" وہ ہنستے ہنستے رونے لگا اور بوتل پوری چڑھا گیا۔ یہاں تک کہ بے ہوش ہو گیا۔

نسرین نے پالم کے ایئرپورٹ پر جب نصیر کو ٹیکسی سے اترتے دیکھا تو وہ اسے پہچان نہ سکی تھی۔ اکیس برس کا جوان رعنا اب ۴۵ برس کا ایک سوکھے بوڑھے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ گورا رنگ جھلس گیا تھا۔ کنپٹیوں کے پاس بال سفید ہو گئے تھے اور جس کا ہر قدم مضبوطی سے پڑتا تھا اب لڑکھڑانے لگا تھا۔ چہرے پر گہرے

نشانات تھے اور اس کی ست جیسی بڑی بڑی بلند آنکھیں سکڑی اور بے آب تھیں۔

چوبیس برس کا زمانہ ایک عمر ہوتا ہے کم سے کم نسرین کو تو وہ ایک جگ محسوس ہوا تھا۔ وہ سترھویں سال میں تھی کہ اس کی شادی ہو گئی تھی۔ مسرت چھ مہینے اس نے خوشی، عیش و عشرت کے دیکھے پھر چوبیس برس کا بے آب و گیاہ صحرا شروع ہو گیا۔ اور دل کی نگری میں پیاس بجھانے والی ایک بوند بھی نہ ملی۔ اس کی پیاس بجھتی بھی کیسے! نسرین ان بیویوں میں سے تھی جو زندگی بھر ایک جام سے پی سکتی تھیں۔ اس کا وہ ساغر ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ اسے نصیر سے بے پناہ محبت تھی۔ شراب سے نفرت ایک بیماری تھی جس کا یہ عشق بھی مداوا نہ تھا۔

وہ اسی رات احمد آباد سے بمبئی چلی گئی تھی۔ اس نے میکے پہنچتے ہی غصے اور غم کے زیر اثر باپ سے ساری روداد بیان کر دی تھی۔ اور انہوں نے دوسرے ہی دن ایک وکیل کے ذریعہ نصیر کو نسرین کے مہر کا نوٹس بھیج دیا تھا۔ ممکن ہے مقدمہ دائر ہوتا اور نصیر اپنے حواس میں آجاتا تو بگڑی بات بن جاتی۔ مگر نصیر نے بات بڑھنے نہ دی۔ اس نے فوراً ہی ایک لاکھ گیارہ ہزار کا کیش بھیج دیا اور ڈاکٹروں کی اجازت ملتے ہی وہ یورپ چلا گیا۔

نسرین کے دل میں جو غم و غصہ کا طوفان اس رات کے واقعے سے اٹھا تھا وہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔ بس ایک آندھی تھی جس نے تھوڑی دیر رنجشوں کی گرد اڑائی پھر آنسوؤں کا چھینٹا پڑتے ہی غبار دھل چھٹ گیا۔ دل کا مطلع صاف ہو گیا تھا۔ نسرین نے اپنے آپ کو ملامت کرنا شروع کر دی تھی۔ وہ محبت کے امتحان میں پوری نہ اتری تھی۔ اسے یقین تھا وہ نصیر کا مرض، اطاعت اور محبت اور ہمت سے دور کر سکتی تھی۔ اس نے جلد بازی سے کام لیا۔ وہ کڑوی پڑتے ہی بھاگ نکلی۔ مگر اب تو چڑیاں کھیت چگ گئی تھیں۔ پچھتاوے سے کیا حاصل! مگر ندامت و خجالت منع کرنے سے رک نہیں جاتی۔ اس کے یہاں تو ان جذبوں کے بڑھ جانے میں بھی پیٹ میں ہونے سے اور نصیر کی نشانی منیر کے پیدا ہونے سے گویا سونے پر سہاگے کا کام ہو گیا تھا۔

نصیر کو معلوم نہ تھا کہ اس کی یادگار ایک بیٹا بھی ہے۔ سیٹھ عبدالکریم نے سوائے چند لوگوں کے کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہونے دی تھی۔ وہ بچاس کے باپ اس کی ماں بلکہ سارے خونی رشتوں کا مجموعہ بن بیٹھے تھے۔ کسی کو تیکی پرورش و پرداخت کے سلسلے میں ایک پیسہ خرچ کرنے کی اجازت نہ تھی نسرین تک کو وہ اس معاملے میں رقیبانہ نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ اس کے روادار نہ تھے کہ نسرین اپنے بچے کے لئے کوئی قمیص، کوئی نیکر، کوئی دودھ کا ڈبہ یا کسی قسم کی کوئی چیز خرید لے۔ ایسے میں بھلا وہ اس چیز کی کیسے اجازت دیتے کہ ان کے نالائق اور بابجی داماد کو اس کی اطلاع بھیج دی جائے کہ سیٹھ جی کی کوٹھی میں اب بھی کوئی ایسی شے ہے جس پر اس شرابی کا شرعاً اور قانوناً سب سے زیادہ حق ہے۔ اور سیٹھ جی اس سے بے حق کئے جا سکتے ہیں انہوں نے اس کا، نواسے کی جگہ اپنا ہی بیٹا کہہ کر لوگوں سے تعارف کرایا۔ نسرین کو بھی "ممی" یا "امی" کی جگہ اس سے "آپا" ہی کہلوایا۔

خود منیر کو بھی اپنے چودھویں سال تک حقیقی باپ کا نام معلوم نہ تھا۔ اتفاق سے ایسا ہوا کہ اسے اس سال جونیئر کیمبرج کے امتحان کا فارم بھرنا تھا تو سیٹھ جی کو مجبوراً منیر کو اس کے باپ کا نام بتانا پڑا۔ نصیر کا نام جس تمہید کے ساتھ انہوں نے منیر پر ظاہر کیا اس نے منیر کے دل میں نصیر کی طرف سے ہمیشہ کے لئے نہ جانے والی نفرت بھر دی۔

سیٹھ جی نے بیٹی اور نواسے کو بڑے اہتمام سے اپنے سامنے بٹھایا۔ پھر منیر کو ایک گمنام شرابی کی کہانی سنائی جو اپنی بیوی پر طرح طرح کے ظلم کرتا تھا اور جس نے بالآخر ایک شب شراب کے نشے میں اس عصمت مآب کو پیٹا اور گھر سے نکال دیا اور ایسی حالت میں گھر سے نکالا جب اس بے چاری کے بطن میں تین مہینے کا بچہ بھی تھا۔ پوری کہانی اس ڈرامائی انداز میں سنائی گئی اور شوہر کے کردار کی اتنی تاریک تصویر کھینچی گئی کہ چودہ سالہ منیر غصے سے مٹھیاں نوچنے لگا۔

جب نواسے کی یہ حالت دیکھی تو سیٹھ نے فاتحانہ طور پر مسکرا کر کہا "یہ ہیں تمہارے باپ کے کرتوت اور اس کا نام ہے نصیر" منیر بے ساختہ چیخ پڑا "نہیں! نہیں! وہ میرا باپ نہیں ہیں کیا ایسے سفّاک آدمی کو اپنا باپ نہیں مان سکتا" اور وہ نانا کی گود میں پڑ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

نسرین کے دل پر دو طرح کی چوٹیں لگیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے منہ پر اس کے چہیتے شوہر کی اس قدر ذلت کی گئی۔ نصیر یقیناً اتنا برا نہ تھا جتنا بھیانک بنا کر سیٹھ جی نے پیش کیا تھا۔ سوائے اس ایک رات کے وہ ایک مثالی شوہر ثابت ہوا تھا۔ بیوی کا سچا عاشق اس کے گرد بھنورے کی طرح پھرنے والا۔ آقا کی جگہ غلام، نسرین کی چشم و ابرو پر چلنے والا۔ کہانی کے دوران نصیر کی محبت کی یادوں کے مجموعی اثر نے اس کو بار بار اکسایا کہ وہ باپ کو بیچ میں ٹوک دے اس سے کہہ دے کہ اس کا شوہر کبھی بھی بدمزاج نہ تھا اور نہ ہی اس نے اس سے کبھی برا سلوک کیا۔ مگر وہ باپ کو خفا نہ کرنا چاہتی تھی، اس لئے وہ خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی۔

دوسرے یہ کہ منیر بجائے اس کے کہ ماں کی گود میں سر ڈال کر سسکیاں بھرتا۔ اس سے ہمدردی کا اظہار کرتا، اس کو اپنے اس رویے سے یقین دلاتا کہ وہ اسے ماں ہی نہیں بلکہ باپ بھی سمجھے گا، وہ نانا کے زانو سے لپٹا اور اس نے فریاد رس کو سمجھا گویا اتنا سا لڑکا بھی دینے والا ہاتھ پہچاننے لگا تھا۔ اس میں دنیا داری کی بو ابھی سے آگئی تھی۔ اس کا بے اختیار جی چاہ رہا تھا کہ وہ منیر کو سیٹھ کی گود سے کھینچ کر دو طمانچے مارے کہ تیرا باپ اتنا برا بھی نہیں ہے کہ تو ناخلف اسے "سور" کہے اور پھر بیٹے کو چھاتی سے لگا کر اس کے اور اپنے آنسوؤں سے جل تھل بھر دے۔ مگر اس نے چودہ سال میں وہ محبت کھو دی تھی جس سے وہ منیر کو اپنے باپ سے چھین لیتی۔ یا شوہر کے متعلق اسے جھٹلاتی۔ عورت ہمیشہ مرد کی پشت پناہی کی طالب ہوتی ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے، وہ اسی طرح کی خلق کی گئی ہے۔ نسرین کی زندگی میں دو مردوں میں ایک نصیر تھا اور دوسرا سیٹھ۔ نصیر چلتی پھرتی ابرِ بہار کی چھاؤں ثابت ہوا تھا اور اس کی زندگی سے اس طرح غائب ہوا تھا جیسے جلتے توے سے پانی کی بوند۔ اب جو کچھ سہارا تھا وہ سیٹھ کا تھا۔ ایک مضبوط بڑی کا درخت جس کے سائے میں وہ پلی، پروان چڑھی اور اب بھی باوجود اس کے پھلوں کی کمی اس کے اسی کی تنومند شاخوں پر گھونسلا بنائے بیٹھی تھی۔ سیٹھ کو خفا کرنا گویا خود اپنے ہاتھوں نشیمن برباد کرنا تھا۔ اسی لئے وہ نصیر کی برائی خاموشی سے سنتی رہی اور

[illegible]

سرسبز ہوتے دیکھتی رہی۔ بے بس عورت اشوہر سزا مرے چکا تھا، اب اپنا ہی باپ اپنا ہی بیٹا، اس کے سچ مچ گواہ، بلکہ دلیل بن کر اسے بدترین سزائیں دے رہے تھے۔

سیٹھ کے انتقال کے بعد جب اکیسواں سال پورا کر کے منیر نے نانا کے کارخانے اور ان کی دولت پر مالکانہ تصرف کا حق حاصل کیا تو نسرین کو زیادہ خوشی نہ ہوئی۔ وہ دل ہی دل میں اس پر کڑھتی رہی کہ منیر اس سے بھی زیادہ جائیداد اور دولت کا صحیح حق دار ہونے کے باوجود اس کا دعویدار بننے کو تیار نہ تھا وہ اپنے وجود میں باپ کی شرکت نہ چاہتا تھا۔ گویا وہ بن باپ ہی کے پیدا ہو گیا تھا۔ نسرین نے دو ایک بار بیٹے کے دل سے باپ کی نفرت نکالنے کی کوشش کی، لیکن اس پر تو جیسے نصیر کے تذکرے سے ہی بھوت سوار ہو جاتا تھا۔

اب کے البتہ جب وہ بیمار ہوئی اور جب اسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تو اس نے منیر کو زبردستی اپنے پلنگ پر بٹھا کر اپنی ازدواجی زندگی کے بچے کھچے واقعات بے کم و کاست بیان کر ڈالے تھے اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ یہ اسی شرابی کی یاد تھی جس نے اسے سیٹھ جی کے شدید اصرار کے باوجود دوسرے نکاح پر آمادہ نہ ہونے دیا تھا۔ ماں کی زبان سے اس کے چند مہینوں کی خوشی اور غم سے لبریز زندگی کا حال سن کر منیر کے ہاں ایک غیر شعوری نرمی ضرور پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اب چودہ برس کے لڑکے کی جگہ تئیس برس کا تعلیم یافتہ جوان تھا۔ وہ انسانی کمزوریوں سے واقف ہو گیا تھا اور اس میں ایک طرح کی رواداری آ گئی تھی۔ پھر باپ سے نفرت نانا نے اس کے خمیر میں ڈال دی تھی۔ اسے اس نفرت سے محبت سی ہو گئی تھی۔ ماں کی پہلی کوشش میں ہی اس کا دل سے نکل جانا کوئی آسان بات نہ تھی۔ گو اوپر کی سطح ٹھنڈی پڑ گئی تھی مگر ہانڈی کی تہہ میں اب بھی گرم کھولن باقی تھی۔

نسرین بمبئی میں صحت یاب ہونے کے بعد اپنے مخصوص ماہر قلبی ڈاکٹروں کو دکھانے دلی آئی ہوئی تھی۔ آج وہ اس کے سینی ٹوریم سے بالکل ہی تندرست ہو کر نکلی تھی اور ہوائی جہاز سے بمبئی جا رہی تھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ اب بھی نصیر مل جاتا تو وہ باپ بیٹے میں بآسانی صلح کرا دیتی اور شاید اس کی اجاڑ زندگی پھر سے آباد ہو جاتی

اور اس کے دل میں نہ جانے کتنے ایسے سفروں کی وہ یادیں سانپ بچھو بن کر ڈس رہی تھیں۔ جو اس نے اپنے چہیتے شوہر کے ساتھ کاٹے تھے۔

نصیر آج ہی صبح کلکتے سے دلی آیا تھا۔ پورا دن اس نے نئے بھارت کی نئی راجدھانی دیکھنے میں صرف کیا تھا۔ وطن کے یوسف نے اس زلیخا کو پھر سے جوانی بخش دی تھی۔ بڑھاپے کے آثار جو کہیں کہیں باقی رہ گئے تھے وہ اس کے نکھار کو بڑھاتے تھے۔ نئی نئی عمارتیں دیکھتا رہا، پھر دل نہ مانا اور وہ قطب مینار دیکھنے چلا گیا اس کی سیر اس نے اس سے پہلے نسرین کے ساتھ کی تھی۔ وہاں پہنچتے ہی اسے نسرین کی وہ فطری کمزوری یاد آ گئی جو اس وقت اس کے لئے بہت تشویش بن گئی تھی۔ وہ نصیر کے ساتھ ہنستے بولتے قطب کے سب سے اونچے حصے تک چڑھ گئی تھی، لیکن جیسے ہی اس نے نیچے جھانک کر دیکھا وہ کانپنے لگی تھی۔ خوف نے اس میں اس بلا کی کمزوری پیدا کر دی تھی کہ وہ تقریباً سات بار مختلف جگہوں پر رک کر بمشکل نصیر کے سہارے سے نیچے اتری تھی۔ نصیر نے اس وقت بار بار یہی سوچا تھا کہ قطب مینار کو باقاعدہ تفریح گاہ بنانے کے لئے اس میں اس طرح لفٹ لگا دی جائے اور اسی طرح اس کے ایک حصے میں کچھ اضافہ کر کے اچھا سا ریستوران کھول دیا جائے جس طرح پیرس کا آئفل ٹاور میں ہے تو سرکاری آمدنی میں خاصا اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اگر سرکار اس غرض کے لئے تیار نہ ہو تو وہ خود ایک لمیٹڈ کمپنی قائم کر کے یہ کام انجام دے گا۔ مگر احمد آباد پہنچتے ہی اس کے پرستار ہونے کے سارے منصوبے خاک میں مل چکے تھے۔ وہ قطب مینار سے اسی لئے نظر بچاتے ہی بھاگ کھڑا ہوا تھا اور یہاں دو چار دن قیام کرنے کے وہ اسی شام کو بمبئی کے لئے سیٹ بک کرا کے پالم ہوائی اڈے پہنچا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہاں پہنچ کر

کے مختلف پرائیویٹ نمبروں اور ایمبولینسوں سے مل کر وہ ایجنٹ لوٹ جائے گا، اور وہاں سے حیدرآباد سے ہوتا ہوا احمدآباد۔ وہ انھی خیالات میں ٹیکسی سے اترا اور لونج میں اپنے لئے جگہ ڈھونڈنے لگا تھا۔ وہاں صرف ایک نشست خالی دکھائی دی۔ وہ برقعہ پوش نسرین کے بغل میں تھی۔ گو نسرین نے اسے پہچان لیا تھا۔ مگر وہ اسے نہ پہچان سکا۔ نقاب نے اس چہرے پر پردہ ڈال رکھا تھا جس کی تصویر اس کے دل کے پردوں میں ہر وقت کھنچی رہتی تھی۔ وہ ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح ایک لمبی سانس لے کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی اس کے نتھنوں نے اس سینٹ کی خوشبو محسوس کی جو نسرین کا دل پسند تھا۔ اس نے گھبرا کر نسرین کی طرف دیکھا۔ برقعے میں لپٹی ایک سکڑی سمٹی خاتون نظر آئی کیسے پوچھے کہ کیا نام ہے؟ پھر نسرین تو اس کے ساتھ بے پردہ گھومتی تھی، اجنبی برقعہ پوش خاتون سے اس کو کیا نسبت؟ وہ اپنے خیالات اور جذبات سے پریشان ہو کر کرسی سے اٹھ کر لونج کو میدان سے جدا کرنے والی ریلنگ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور مختلف طرح کی یادوں میں کھو گیا۔

نسرین کے دل میں پنکھے لگے تھے۔ جب نصیر بغل میں آکر بیٹھا تھا تو وہ کانپنے لگی تھی، اب جبکہ ریلنگ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا تھا تو اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ جس کے ملنے کے لئے دعائیں مانگا کرتی تھی، وہ اتنا قریب آکر پھر ہاتھ سے جایا چاہتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چل کر نصیر کے پاس کھڑی ہو گئی اور اس سے گفتگو کا بہانہ ڈھونڈنے لگی۔ نصیر جو ستاروں سے آنکھیں لڑائے اس کی حرکت چمک میں نسرین کی آنکھوں میں آنسو دیکھ رہا تھا پھر اسی محبوب خوشبو سے چونکا، اس نے پلٹ کر برقعہ پوش کو دیکھا۔ نسرین نے کانپتے ہاتھوں سے نقاب الٹ دی۔ وہی بھولا چہرہ مگر چوبیس سال کا غم زدہ، وہی غزالی آنکھیں مگر جام کی جگہ درد سے بھرے دو کٹورے، وہی گلاب کی پنکھڑیاں ہونٹ، مگر خزاں دیدہ مرجھائی ہوئی کلیوں جیسے!۔

نصیر کے جسم میں زلزلہ سا آگیا، بوٹی بوٹی کانپی۔ بمشکل منہ سے آواز نکلی "نسرین؟"

اس نے بھی گھٹی آواز میں جواب دیا "جی ہاں، وہی آپ کی لونڈی!"

نصیر بمشکل اپنے کو قابو میں رکھ سکا۔ اس نے ریلنگ کو مضبوطی سے ہاتھوں سے زور سے پکڑ لی اور میدان کی طرف رخ کر کے کہا "بس یہی ایک آرزو تھی کہ تم سے ایک بار معافی مانگنے کا موقع مل جائے۔ میں نے تمہیں دھوکا دیا تھا۔ اپنی شراب نوشی چھپائی اور نشے کے عالم میں تم پر بڑے ظلم کئے۔ میں نے اپنے جرموں کی پاداش میں اپنے کو خود کافی سزا دی۔ ہندوستان سے جاتے ہی آسٹریلیا کے کلینک میں چھ ماہ پڑا رہا۔ شراب کی لت پر فتح پا کر میں وہاں سے نکلا۔ اس رات کے بعد سے آج تک ایک بوند حلق سے نہیں اتاری۔ کتنا دکھ ہوتا ہے ان نشوں کو چھوڑنے میں تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتیں، لیکن میں نے ان تکلیفوں کو برداشت کیا، پھر بھی زندگی بے سود اور بے کار سی محسوس ہوئی۔ بیمار ہو گیا۔ مجھ کو کمیشن مل سکتا تھا۔ میں نے سختیاں جھیلنے کے لئے ایک معمولی سپاہی کی زندگی پسند کی۔ نہ جانے کتنی بار گولیوں کی بوچھار سے صاف گزرا۔ مگر سوائے ٹانگ ٹوٹنے کے حسبِ خواہش موت نہ آئی۔ سچ ہے۔ موت کا ایک دن معین ہے!"

نسرین سے صبر نہ ہو سکا۔ وہ اس کے نسبتاً کمزور ہاتھ کو پکڑتے ہوئے بولی "کاش تم مجھے اطلاع دے دیتے۔ شراب ترک کرنے کے بعد کاش مجھے اطلاع دے دی ہوتی پھر ہماری زندگیاں اس طرح اجاڑ نہ گذرتیں۔"

نصیر نے تعجب سے پوچھا "لیکن تمہیں مجھ سے نفرت نہیں؟"

اس نے نظر نیچی کر کے کہا "محبت کے گھر میں نفرت کی گنجائش کہاں سے ہوتی ہے!"

نصیر نے اسے اور بھی گھبرا کر دیکھا "ارے سیٹھ جی نے تمہاری دوسری شادی نہیں کر دی؟" اس نے پوچھا۔

نسرین نے غرور سے سر اونچا کر کے کہا "انھوں نے شروع میں تو بہت زور دیا تھا۔ مگر جب ہمارا منیر پیدا ہو گیا تو پھر ہم دونوں اس کی پرورش میں تن من سے لگ گئے۔"

اس نے کانپتے ہونٹوں سے پوچھا "یہ منیر کون ہے؟"

وہ آہستہ سے بولی "تمہارا بیٹا۔ وہ تین مہینے کا پیٹ میں تھا جب میں گھر سے نکالی گئی!"

نصیر نے "اُف! اُف!" کہہ کر اپنے ہاتھوں سے منہ چھپا لیا۔ "ارے میرا بیٹا تمہاری گود میں، اور مجھے کچھ خبر نہیں، مجھ سے یہ بات چھپا کر سیٹھ جی نے مجھے سب سے بڑی سزا دی!"

نسرین نے کہا "انھیں یقین تھا تم آسمان سے ٹپک پڑو

گے اور اپنا ہی جیسا بنا دو گے۔"
وہ بولا "غلط نہ تھا۔ ان کا یہ خدشہ! اگرچہ یہی سچ شاید
میری پوری زندگی برباد ہونے سے بچا لیتا۔ وارث
کے نہ ہونے سے ہر مرد بے پروا ہو جاتا ہے۔ اس
کو کسی کے لئے ایک اچھی مثال بننے کا موقع نہیں ملتا۔ اس کی
ضرورت ہی نہیں محسوس ہوتی۔ مجھے تو ہر وقت یہ محسوس ہوتا تھا
میں ایک بے سود سی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ مجھ پر کوئی کسی قسم کی
ذمے داری نہیں ہے۔ مگر اپنا بیٹا، اپنا وارث! ..." وہ اور وہ رک
کر بڑی بے چینی سے پوچھنے لگا "اب تو وہ جوان ہو گیا ہوگا۔ شکل و
صورت کیسی ہے؟" وہ مسکرا کر بولی "باپ کی جوانی کی تصویر ہے۔"
وہ آبدیدہ ہو کر بولا "خدا کرے کہ سیرت بھی باپ
جیسی نہ ہو!"

اتنے میں ہوائی جہاز کے چھوٹنے کا اعلان ہوا۔ میدان میں
جانے کے لئے راستہ کھول دیا گیا۔ دونوں جہاز میں دو پاس
پاس ملی ہوئی سیٹوں پر بیٹھے۔ گلے شکوے بھی ہوتے اور میٹھی میٹھی
پیار کی باتیں بھی۔

کئی گھنٹے کا راستہ پلک جھپکتے میں کٹ گیا۔ آپس میں طے
ہو گیا کہ وہ ہفتہ عشرہ یہیں مزید ٹھہرے گا اور بیٹے کو اپنے سے
مانوس کرنے کی آہستہ آہستہ کوشش کرے گا۔

"سینٹا کروز" میں وہ اترے تو منیر ماں کو خلاف معمول
نہ لینے آیا تھا۔ کیڈیلک لئے غفور ڈرائیور موجود تھا۔ وہ سیٹھ جی کا
پرانا ملازم تھا اور نصیر کو پہچانتا تھا۔ اس نے جب دولہا میاں کو
بیٹا کے ساتھ دیکھا تو وہ باغ باغ ہو گیا۔ نسرین نے اس سے پوچھا
"منیر کیوں نہیں آیا؟"

وہ کچھ سٹپٹا کر بولا "کسی دعوت میں گئے ہیں۔ مجھے کہا
تھا کہ تم جا کر ماں کو لے آنا۔"

اس نے نسرین کا اسباب ڈگی میں رکھا تو نسرین کے
خاموش اشارے پر نصیر کی [illegible] نصیر نے شہر کے
ہوٹل میں قیام کا نام لیا اور موٹر میں نسرین کے ساتھ سوار ہونے
میں پس و پیش کی تو وہ بولی "کوٹھی سیٹھ جی کے نام ہے۔ اب وہ ہمارا
گھر ہے یا آپ کے بیٹے کا۔ ہمارے گھر میں ٹھہرنے میں آپ کو انکار
کرتے شرم نہیں آتی؟"

وہ لاجواب ہو کر خاموشی سے نسرین کے ساتھ موٹر
میں بیٹھ گیا۔

موٹر اسی جانی پہچانی سہ منزلہ عمارت کے سامنے جا کر
رکی جہاں آتے جاتے سیٹھ جی کی موجودگی میں بھی اسے ہمیشہ
مسرت ہوتی تھی۔ نئی نئی قلعی اور مرمت ہوئی تھی۔ اس لئے اس
کے پرانے پن میں بھی ایک خاص طرح کا حسن تھا۔ نسرین اسے اپنے
ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ دروازے کے بالکل ہی مقابل
دیوار پر سیٹھ جی کی قد آدم تصویر آویزاں تھی۔ نصیر کو ایسے محسوس
ہوا جیسے سیٹھ جی کھڑے اسے بڑی نفرت اور حقارت سے دیکھ رہے
ہیں جیسے تصویر کے بے جان لب ہل رہے ہیں اور ان سے آواز آرہی
ہو "بے شرم، بے غیرت، شرابی! تو پھر اس گھر میں اسے برباد کرنے
آیا!" — اور نصیر دروازے پر ہی ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ نسرین ہاتھ
پکڑ کر اسے اندر لے گئی۔

نصیر پشت کی جانب جو کھڑکی تھی اس پر جا کر کھڑا ہو گیا۔
ادھر ایک چھوٹا سا سدا بہار چمن تھا۔ اس میں چھٹکی ہوئی چاندنی
بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اس چمن کی بہاریں اس نے کئی بار
نسرین کے ساتھ لوٹی تھیں اور ان کی چھیڑ چھاڑ پر اکثر پھول مسکراتے
اور ہنستے تھے۔ شیریں یادوں کا سلسلہ غفور کے دروازہ کھولنے
اور جھانکنے سے ٹوٹا۔

اس نے پوچھا "بیٹا دولہا میاں کا سوٹ کیس کس کمرے
میں رکھوں؟"

نسرین نے کچھ شرما کر کچھ سٹپٹا کر کہا "مہمان کے کمرے
میں۔"

جب غفور دروازہ بھیڑ کر چلا گیا تو وہ نصیر سے اپنی [illegible]
میں بولی "میں چاہتی ہوں منیر آپ سے مل لے۔ جاتے تو میں
اسے آپ کا نام بتاؤں۔"

نہ جانے کیوں نصیر عرق عرق ہو گیا۔ اس نے پیشانی سے
پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "ہاں! نہ جانے سیٹھ جی نے کتنی بار اس
کے دل میں میری طرف سے زہر بھرا ہوگا۔ مگر اپنے لئے کوئی نیا نام بھی
تجویز کرنا پڑے گا۔!"

وہ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ ایک موٹر زور سے ہارن دیتی ہوئی
پورٹیکو کی طرف بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ پھر ایسا معلوم ہوا جیسے

دو موٹروں میں ٹکر ہوئی اور شیشوں کے ٹوٹنے کی جھنکار سنائی دی۔ نسرین "ارے یہ کیا ہوا" کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی۔ نصیر نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ مگر دروازے کے باہر ہی ٹھٹک گیا۔ منیر ٹکر مارنے والی موٹر سے دھاڑتا ہوا اترا۔

"بیوقوف! اڈیٹ! ام آرن پہ آرن دے رہا ہے تم ہم کو راستہ کیوں نہیں دیتا!"

غفور جو دونوں موٹروں کے درمیان کچھ دبا سا چوٹ کھایا ہوا سسکی سی لے رہا تھا بولا۔

"چھیا میں ڈگی سے بٹیا کا اسباب نکال رہا تھا، میں موٹر کیسے ہٹاتا!" منیر بولا "بیٹا؟ بیٹیا ام سمجھا ہمارا آغا!"

نسرین نے برآمدے سے پوچھا "ارے کیا ہوا غفور؟" منیر اس کی طرف لڑکھڑاتا ہوا بڑھا "تم آگیا آغا، ہمارا پیارا آغا" لیکن جیسے منیر نسرین کے قریب آیا وہ غصے سے بھڑک کر بولی "ارے تم نے شراب پی ہے بدتمیز!"

وہ ہنس کر بولا۔ "بڑے کاروبار میں پینا (پیا) ہی پڑتا ہے آغا۔ زیادہ نہیں پی، بس تمہاری صحت کے تین جام ڈارلنگ آغا!" اور وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھا۔

نسرین ناک پہ رومال رکھ کر ابکائی لیتی ہوئی چیخی "ارے موئے آخر تجھ کو بھی باپ کا ورثہ مل گیا۔ ہائے اللہ! میں نے لاکھ جتن کئے مگر باپ کا خون رنگ لا کر ہی رہا" اور وہ باتھ روم کی طرف بھاگی۔ شراب نے کھولتی ہانڈی کا تہہ نشین ابال باہر پھینک دیا۔ منیر ماں کے پیچھے لپکتا ہوا بولا "میرے شوہر باپ کا نام تم نے کیوں لیا آغا؟ اس بدمعاش کا خون! اس شوہر کا ورثہ! نہیں! ہرگز نہیں!" اور اس نے باتھ روم کے قریب رکھے ہوئے گملوں میں ایک ٹھوکر کھائی اور منہ کے بل وہ برآمدے کے فرش پر آرہا۔

غفور اپنی چوٹ بھول کر اسے اٹھانے دوڑا۔ مگر نسرین نے باتھ روم کے اندر جا کر اس کا دروازہ دھڑاک سے بند کر لیا۔

اور نصیر نیچی نظریں کئے گردن جھکائے کوٹھی سے باہر نکل گیا۔

تم کہتے ہو۔
میں تم سے محبت کرتا ہوں
پھر یہ کیسی محبت ہے
کچھ تو مجھے سمجھاؤ۔
چاہتے کیا ہو
بتلاؤ
میں تم سے یہ کہنے سے رہی
کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں
چھپ چھپ کر آہیں بھرتی ہوں
یہ باتیں ساری بوگس ہیں
یہ جملے خالی برتن ہیں
میں تم کو چاہوں!
کیوں چاہوں؟
میں مشرق کی ایک بیٹی ہوں
نہ جانے کس کی امانت ہوں
اور خیانت ———
نہیں ایمان میرا ———
اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو
تو مجھ کو کیوں جتلاتے ہو۔
اگر اتنی ہمت ہے تم میں
تو پھر
یہ لو میرے گھر کا پتہ
اور ابا سے میرے
بات کرو۔

———

# آپ کا بیوٹی سیلون

## نگہت حسین، کراچی

س: باجی میرے دانتوں کا رنگ پیلا ہے۔ آپ نے جو منجن تیار کیا ہے براہِ مہربانی مجھے بھی بھیج دیں، پیسے جتنے ہوں گے دے دوں گی۔

ج: ہم منجن آپ کو کیسے بھیجیں، آپ نے اپنا پتہ تو لکھا ہی نہیں۔

## اسماء نورانی، کراچی

س: کیا بیسن کے ساتھ چہرہ دھونے سے رنگت نکھر جاتی ہے، میں نے سنا ہے اگر چہرے پر دانے نکلتے ہوں تو بیسن کے ساتھ منہ دھونا چاہئے کیا یہ درست ہے۔؟

ج: آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ بیسن میں اگر لیموں کا عرق بھی شامل کر لیا جائے تو اس سے اور بھی زیادہ فائدہ ہو سکتا ہے۔

## جمیلہ رشید، لاہور

س: باجی میری ناک کے مساموں میں سیاہ رنگ کی کوئی چیز ہر وقت پھنسی رہتی ہے جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ خدارا اس مصیبت سے نجات دلائیے۔

ج: ایسی بہن فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ یوں کریں اپنی ناک پر کلینزنگ کریم مل لیں پھر کسی کھلے منہ کے برتن میں کھولتا ہوا گرم پانی لیں اور اس کی بھاپ لیں کم از کم پانچ منٹ تک منہ پر تولیہ ڈال کر بھاپ لیں پھر کسی کھردرے تولیے کے ساتھ ناک کو رگڑیں۔ مہینے میں چار بار یہ عمل کریں، مسام بالکل صاف ہو جائیں گے۔

## شکیلہ، لاہور

س: باجی میری عمر ۲۰ سال ہے۔ خاصی صحت مند ہوں۔ مجھے ایک پریشانی ہے وہ یہ کہ مجھے پسینہ بہت آتا ہے۔ گرمیوں میں تو برا حشر ہوتا ہے۔ ویسے بھی زیادہ لوگ ہوں تو مجھے پسینہ آتا ہے خدارا میری مشکل حل کریں۔

ج: شکیلہ بہن۔ جسم سے زیادہ مقدار میں پسینہ خارج ہونا نروس نیس کی نشانی ہے۔ یہ کوئی خاص بیماری نہیں ہوتی۔ آپ زیادہ گھبرایا نہ کریں۔ آپ کے گرد زیادہ لوگ ہوں تو بیکار نروس بھی نہ ہوا کریں۔ آپ کو خود اعتمادی کی کمی کی وجہ سے ایسا ہو جاتا ہے لہٰذا اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کریں۔ آپ کی یہ تکلیف خود بخود دور ہو جائے گی۔ گرمیوں میں آپ روزانہ دن میں دو مرتبہ صبح و شام ضرور نہایا کریں۔ پرفیوم، خوشبو عطریات وغیرہ بھی ضرور استعمال کریں۔

## سمیرا خان، راولپنڈی

س: باجی چہرے کی رنگت نکھارنے کے لیے اور دیگر داغ دھبے دور کرنے کے لیے کوئی مفید لیکن سب سے آسان طریقہ بتائیے۔

ج: سب سے آسان طریقہ پیشِ خدمت ہے۔ دودھ کی بالائی میں گلاب کا عرق، بیسن اور ایک سے دو لیموں کا رس ملا کر کریم سی بنا لیں اور اسی کریم سے دن میں تین مرتبہ چہرہ دھویا کریں۔ ایک مہینے کے اندر اندر رنگت نکھر جائے گا۔

## نصرت ترین اور سیما

س: کیا ویکس کے ساتھ بال ایک بار نکالنے سے دوبارہ پھر آجاتے ہیں یا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے ہیں۔ نیز اس کا استعمال کیسے ہوتا ہے۔

ج۔ ویکس سے بال ہمیشہ کے لیے دور نہیں ہوتے۔ آپ اپنے لیے SOHNI ویکس خرید لیں استعمال کا طریقہ ڈبے کے اوپر لکھا ہوتا ہے۔

## اقبال میمن، کوٹری — فرزانہ شہناز، کراچی

ج: آپ کو بہت جلد بذریعہ ڈاک تیل بھیج دیں گے۔

## صبیحہ بانو، شیخوپورہ

ج: صبیحہ بہن آپ اپنے بالوں کے لیے SILVIKRIN — EGG SHAMPOO استعمال کریں۔ شیمپو کرنے کے بعد ASTRALON CONDITIONER بھی استعمال کریں۔ استعمال کا طریقہ شیشی کے اوپر لکھا ہوتا ہے۔

## شازیہ، لاڑکانہ

ج: شازیہ بہن جن گریوں کا آپ نے نام لکھا ہے اگر وہ ہمیں یہاں سے مل گئیں تو ضرور بھیج دیں گے۔ آپ اپنا ایڈریس تو لکھئے۔

## ر، پ فورٹ سنڈیمن

س: میں اپنے تمام چہرے کے بال دور کرنا چاہتی ہوں کیا ویکس کے ساتھ بال ہمیشہ کے لیے ہٹ جائیں گے یا بار بار استعمال کرنا پڑے گی۔ کیا ہاتھوں اور ٹانگوں کے بال بھی [illegible]

[illegible]

[illegible] استعمال کر سکتی ہیں۔

## آنسہ ناظمہ، راولپنڈی

س: میرے چہرے پر بہت زیادہ چکناہٹ رہتی ہے اور وہ بھی ایسی کہ میرا چہرہ سانولا سانولا سا لگنے لگتا ہے لیکن چہرہ دھونے کے بعد پھر نکھر آتا ہے۔ میں اس وجہ سے بہت پریشان ہوں، کوئی اچھا سا مشورہ دیجئے۔

ج: آپ اپنا چہرہ دن میں تین چار مرتبہ ضرور دھویا کریں۔ اس کے علاوہ جب چکناہٹ محسوس ہو تو روئی بھگو کر چہرے پر پھیرا کریں۔ جلد کی چکناہٹ کو ختم کرنے کے لیے سب سے پہلے مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں آلو، شلجم، پیاز وغیرہ کم کھائیں جڑ والی سبزیاں بھی کم کھائیں۔ اسٹرنجنٹ چہرے پر استعمال کیا کریں۔ چکنی کریموں سے پرہیز کریں۔ چقندر کا رس پئیں اور چھلکا چہرے پر ملا کریں۔

## رانی کنول، لائل پور

ج۔ اسٹرنجنٹ کا استعمال آپ بھی کریں۔ چکنی کریمیں جو آپ استعمال کر رہی ہیں ان کا استعمال فوراً بند کر دیں۔ قبض کا بھی علاج کروائیں اناج خوب کھایا کریں۔ چہرے کی چکناہٹ ختم کرنے کے لیے آنسہ ناظمہ کو جو مشورے دیئے ان پر عمل کریں۔

## ناہید بٹ

ج: ناہید بہن بالوں کے سلسلے میں نیلوفر کو جو مشورے دیئے ہیں ان پر عمل کریں۔ اس کے علاوہ اپنا سر سیکا کائی کی پھلیوں کے ساتھ دھویا کریں۔

آپ کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں [illegible] دو ٹکڑے پانی [illegible] اور سبزیاں بھی خوب [illegible] ایک چمچ [illegible] کیا کریں۔

[illegible]

[illegible] بتائیں اس کے [illegible]

شادی سے پہلے مولوی ابل کے بڑے ٹھاٹ
تھے۔ لمکتری لٹھے کے تہبند کی جگہ گلابی رنگ کی سبز دھاریدار (جالی)
ریشمی خوشابی لنگی، دو گھوڑا بوسکی کی قمیص جس کی آستینوں کی چنٹوں
کا شمار سینکڑوں تک پہنچتا تھا۔ اودے رنگ کی مخمل کی واسکٹ جس کی
ایک جیب میں قطب نما بجتا تو دوسری جیب میں نسوار کی نقرئی ڈبیا ہوتی
تھی۔ سر پر بادامی رنگ کی شہدی لنگی جس میں سے کلاہ کی مغلئی جھلکتی
رہتی تھی۔ ہاتھ میں عصا جس پر جگہ جگہ گلٹ کے بند اور پیتل کے
کوکے جڑے تھے۔ بالوں میں کوئی بڑا کا فرتیل جس کی خوشبو گلیوں
میں اٹکتی رہ جاتی تھی۔ قدرے اوپر اٹھی ہوئی پلکوں والی آنکھوں کے
پپوٹوں میں سرمہ تو جیسے رچ کر رہ گیا تھا۔ انگلیوں میں مہاجنوں کے لائے
ہوئے بڑے بڑے نگینوں والی چاندی کی انگشتریاں جو وضو سے پہلے ان
میں چار پانچ بار اترتی تھیں۔ مگر ان کی ترتیب میں کبھی کوئی فرق نہ دیکھا
گیا۔ اور پھر مولوی ابل کی آواز! شکر ہے اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی یہ نعمت
کلام پاک کی تلاوت میں استعمال ہوئی ورنہ اگر مولوی ابل ماہیے کی کلی
الاپ دیتا تو گاؤں بھر کی لڑکیوں کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ ہر عید پر
خطبے کے بعد اس کے سامنے گھر گھر سے جمع کیے ہوئے ڈیڑھ سو روپے
کی پوٹلی جب آ رکھی جاتی تو وہ نمازیوں کے سامنے چالیس پچاس روپے
گاؤں کے مسکینوں، محتاجوں میں بانٹ دیتا اور ان سے کہتا کہ مجھے

دعائیں نہ دو، اس اللہ جل شانہٗ کو یاد کرو جو پتھر میں کیڑا پیدا کرتا ہے تو وہیں سے اسے خوراک بھی پہنچاتا ہے۔ مجھے دعائیں نہ دو، مجھے اس نے کیا نہیں دیا۔ صحت، اطمینان، بے فکری، مجھے تو اس کی رحمتوں کے خزانے سے اور کچھ نہیں چاہیئے۔"

لیکن شادی کے بعد اللہ جل شانہٗ کی رحمتوں نے ایک اور صورت اختیار کر لی۔ مولوی آبل کے یہاں اولاد کا کچھ ایسا تانتا بندھا کہ جب ایک سال اس کی بیوی کے یہاں کوئی اولاد نہ ہوئی تو وہ سیدھا حکیم کے یہاں دوڑا گیا۔ اسے یقین تھا کہ بچہ نہیں ہوا تو زیب النساء کے نظامِ تخلیق میں کوئی گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے۔ زیب النساء کے یہاں بچہ نہ ہونا ایسا ہی تھا جیسے پوری رات گزر جانے پر سورج طلوع نہ ہو۔ اور جب اگلے سال سورج طلوع ہوا تو مولوی آبل کی جان میں جان آئی۔ یقیناً اولاد کی افراط خدائے ذوالجلال کی رحمتوں میں سے ایک رحمت تھی، مگر مشکل یہ آن پڑی کہ ریشمی خوشابی لنگی صافی بن کر رہ گئی تھی۔ بوسکی کی قمیص برسوں پہلے پوتڑوں کے روپ اختیار کر کے غائب ہو چکی تھی اور اب اس کی جگہ گاڑھے کے چولے نے لے لی تھی جو کئی بار دھلنے کے باوجود یوں میلا میلا سا لگتا تھا جیسے اسے بُنتے وقت جلاہے نے سوت کے تانے بانے میں تھوڑی سی غلاظت بھی بُن ڈالی ہے۔ مطلاّ کلاہ کی داڑھی مونچھیں نکل آئی تھیں۔ انگشتریوں کی چاندی کا پیتل لڑکیوں کے بُندوں جھمکوں کی نذر ہو چکا تھا۔ سرخ سرخ پپوٹوں والی آنکھوں میں پتلیاں کچھ اس طرح بہت اوپر اٹھ گئی تھیں کہ مولوی آبل ہر وقت نزع کے کرب میں گرفتار نظر آتا تھا۔ تابڑ توڑ بہت سے بچوں کے ساتھ زمانے میں بھی تابڑ توڑ تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ مولوی آبل نے اپنی پہلوٹھی کی بیٹی مہرالنساء کے لیے جو جوتا ایک روپے میں خریدا تھا اب وہی جوتا موچی نے اس کی سب سے چھوٹی [illegible] النساء کے لئے چھ روپے میں تیار کیا تھا اور جب مولوی آبل نے شکوہ کیا تو موچی بولا "میں نے تو مولوی جی آپ کی خاطر زیادہ دام نہیں مانگے۔ کوئی اور ہوتا تو چھ چھوڑ دس مار لیتا۔ چمڑے کو آگ لگ گئی ہے۔ قیمتیں یوں ایک دم زن سے اوپر ہو گئی ہیں کہ لگتا ہے کہ دنیا بھر کی گائیں بھینسیں کہیں کوہ قاف پر بھیج دی گئی ہیں۔ پونے چھ کی لاگت سے ایک چونّی کما رہا ہوں۔ چلئے آپ چونّی کو بھی جانے دیجئے۔ اس میں ذرا سا بھی جھوٹ ہو تو ڈوب کر مروں۔ جنازہ تک نصیب نہ ہو۔"

اگر دعاؤں کے بدلے میں آسمانوں سے ضروریاتِ زندگی کا اترنا ممکن ہوتا تو اس روز مولوی آبل خدا سے اپنی [illegible] کے لئے جوتے مانگتا۔ رات کو زیب النساء سے مشورہ کیا۔ اور جب اس نے

تو زبان سے کچھ کہنے کی بجائے لحاف کا ایک کونہ اٹھا کر مولوی آبل کو مہر النساء کے پاؤں دکھائے تو وہ بچوں کی طرح ایک دم رو دیا اور دوسرے روز صبح کی نماز اور وظائف کے بعد پہلے چھ روپے موچی کی ہتھیلی پر رکھے اور پھر [illegible] کی دکان سے اٹھ کر گلی میں کیا آیا، اللہ جل شانہٗ کو حاضر و ناظر مان کر نسوار سے توبہ کر لی۔

نمازیوں کی تعداد بڑھنے کی بجائے گھٹ رہی تھی یا ضروریاتِ زندگی کی قیمتیں گھٹنے کی بجائے بڑھ رہی تھیں اور پھر اولاد بڑھ رہی تھی اور اولاد کے ساتھ مولوی آبل کے بالوں کی سفیدی بڑھ رہی تھی۔ ادھر مہرالنساء نے چودھویں سال میں قدم رکھا ادھر مولوی آبل کی یہ حالت ہو گئی کہ رکوع میں گیا ہے تو اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ سجدے میں چلا ہے تو بس پڑا ہے۔ ہوشیار مقتدیوں کو وقت بے وقت کھانسی کا دورہ پڑتا تو ممکن ہے مولوی آبل ایک ہی سجدے میں ظہر کو عصر سے ملا دیتا۔ رمضان المبارک میں تراویح پڑھانے کی امانت حسبِ دستور اسی کے سپرد ہوئی۔ مگر وہ مولوی ابوالبرکات جو آیات یا الفاظ کی غلطی تو کیا کبھی زیر زبر کی غلطی کا بھی مرتکب نہیں ہوا تھا۔ البقرہ سے النساء میں جا نکلا۔ اور سورۃ رحمٰن پڑھنا شروع کی تو ایک رکعت ہی میں اسے دوبارہ پڑھ ڈالا۔ چودھری فتح داد کو جو کسی تحصیل [illegible] ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ کے جب اسے اس استغراق پر سرزنش کی تو ایک بار مولوی آبل کے جی میں آئی کہ پکار اٹھے "آپ کے یہاں تو لونڈوں کی کھیپ ہے نا چودھری صاحب، آپ کے بھی کوئی بیٹی ہوتی اور وہ اب جوان ہو گئی ہوتی تو میں آپ کو بتاتا کہ ایک سورت کو دوبارہ کیسے پڑھ لیا جاتا ہے۔" لیکن چودھری فتح داد کی یہ سرزنش زیادہ تر فہمائشی نوعیت کی تھی۔ ورنہ یہی چودھری ہی تو تھا جو برسوں سے مولوی آبل کے گھر میں ہر شام گھی لگی ایک روٹی اور دال شوربے کا ایک سکورا اس التزام سے بھیجتا تھا کہ جیسے ایک وقت ناغہ ہو گیا تو سورج سوا نیزے پر اتر آئے گا۔ اور حد یہ تھی کہ جس روز روٹی یا دال سالن بھجوانے میں ذرا سی دیر ہو جاتی تو چودھری فتح داد بنفسِ نفیس مولوی آبل سے معافی مانگنے آتا "آج وظیفہ دیر سے پہنچا ہو گا تو میں اس غفلت کی معافی مانگتا ہوں۔ چودھرائن ذرا بیمار تھی اور کھانا [illegible] نے تیار کیا۔ سو حرام زادی یہ بھول گئی کہ آپ کے یہاں سے وظیفہ وقت پر نہ گیا تو مجھے ایک روزہ رکھ کر کفارہ ادا کرنا ہو گا۔"

یہ وظیفہ مختلف نوعیت کے تھا اور جبلت کو [illegible] مولوی آبل کے یہاں نہ آٹا گندھتا تھا اور نہ ہنڈیا پکتی تھی۔ مولوی آبل کے [illegible] مندوں کے ہاں سے ایک وقت [illegible] کے قریب [illegible] تھیں۔ ادھر زیب النساء نے گھر میں [illegible]

دینے کا سلسلہ بیاہ کے تین برس پہلے ہی سے شروع کر دیا تھا۔ جمعرات کو
ہر لڑکی چھوٹے بچوں سے خلیفوں پہ بند ادا سی شکر رکھ کر لاتی تو زیب النساء
کو وہ چنگیریں ان کے لیے الگ رکھ دینا پڑتیں۔ اس روز دونوں وقت
سب خوب سیر ہو کر کھاتے۔ جو وظیفہ باقی بچتا انہیں دھوپ میں سکھایا
جاتا اور مہینے میں چار بار انہیں گڑ کے شربت میں ابال کر مزیدار ٹکڑے
تیار کیے جاتے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ انسان کو پیٹ بھرنے کے لیے روٹی
کے علاوہ پیٹ ڈھانکنے کے لیے کپڑا بھی تو چاہیے۔ چودھری فتح داد ہر
نئی فصل پر مولوی آبل کو ایک پوشاک بھی پیش کرتا تھا لیکن جب یہ
پوشاک گھر میں آئی۔ ایکا ایکی درزی کی دوکان سج گئی۔ زیب النساء، مہر
اور زاہدہ اور شمن کو پاس بٹھا کر لٹھے کے تہ بند کا تیا پانچا کر کے رکھ دیتی
اور ریلی نمبروں کے بہت سے جوڑے نکل آتے۔ ململ کی پگڑی سے بھی کچھ
ایسا ہی ہوتا رہتا اور یوں چند مہینوں کے لیے مولوی آبل کی اولاد بالکل
ننگی ہونے سے بچ جاتی۔ اس دوران میں اگر کسی کی نکاح خوانی کے سلسلے
میں یا نماز جنازہ پڑھانے کے ضمن میں چند روپیہ نکلتے تو وہ مہرالنساء کے
جہیز کی خاطر ٹین کے ایک ڈبے میں رکھ دیے جاتے۔ بچوں کے پیٹ بڑھ
رہے تھے اور باقی جسم سکڑ رہا تھا —— زیب النساء کے کنگن جو کبھی اس
کی سانولی کلائیوں میں کسے رہتے تھے اب ذرا سے جھٹکے سے پہنچے پر آ
جاتے تھے اور اس کی لانبی پلکوں کے پیچھے جوانی کا جوش بھی سرد ہو کر رہ چکا
تھا اور جب وہ پلکیں جھپکتی تھی تو اس کے چہرے پر یہ راکھ اڑتی ہوئی
معلوم ہوتی تھی۔ خود مولوی آبل زندگی کے ذرا ذرا سے حادثوں کے درمیان
بالکل ہی پچک کر رہ گیا تھا انہی دنوں اسے مولوی ابوالبرکات کی بجائے مولوی
آبل کہا جانے لگا تھا۔ کنپٹیوں کے بال تو بالکل سفید ہو چکے تھے اور دانتوں
پر مسوڑوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ تلاوت کرتے وقت کئی بار دانتوں
کی ریخوں میں سیٹیاں سی بج اٹھتی تھیں۔ مگر آواز کا ٹھاٹ وہی تھا۔ صحیح مخرج
سے نکلے ہوئے حروف یوں بجتے تھے جیسے پیتل کی تھالی پر تھوڑی تھوڑی کوڑیاں
گر رہی ہوں۔ البتہ اس آواز میں لرزش سی ضرور آ گئی تھی۔ جو پہلے نمازیوں
کو بہت اجنبی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن چودھری فتح داد کو اس ارتعاش کا سبب
معلوم تھا کیونکہ مولوی آبل اس سے مہرالنساء کے لیے رشتہ ڈھونڈنے کے
سلسلے میں بات کر چکا تھا۔ چودھری نے اس مقصد کے لیے سارے گاؤں
پر نظریں دوڑائی تھیں۔ رات کو بستر پر لیٹ کر ایک ایک گھر میں جھانک آیا
تھا۔ اور کئی نوجوان اسے جچے بھی تھے مگر ساری مشکل یہ تھی کہ مولوی آبل کو
سب جانتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ مہرالنساء کے ٹکڑوں پر پلی ہے اور
وسے کے ٹکڑوں پر پلی ہوئی جوانی میں برکت کم ہوتی ہے اور آنسو زیادہ۔ اور
یہ بات بھی کسی سے چھپی ہوئی نہ تھی کہ اب مولوی آبل کو جہیز کے لیے
بیس پچیس روپے ملتے ہیں جن سے مہرالنساء کا جہیز تو خیر کیا بنا ہوگا دوسرے نو
بچوں کے لیے جوتا کپڑا بھی شاید ہی مہیا ہو سکے ہوں۔ ایک دو جگہ چودھری
نے بات بھی کی مگر مخاطب کچھ یوں تیورا کر پیچھے ہٹے جیسے پھول کی پتیوں میں
سے اچانک بھڑ نکل آئی ہو۔

لیکن مولوی آبل اور زیب النساء کی دعائیں رائیگاں نہ گئیں۔ انہی
دنوں سالہا سال کا بھولا بھٹکا شمیم احمد شہر سے گاؤں لوٹ آیا اور یہاں کپڑے
کی چھوٹی سی دوکان کھول لی۔ خدا یار ایک حافظ قرآن کا اکلوتا بیٹا تھا۔
والد کے مرنے کے بعد مولوی آبل کے ہاں قرآن مجید حفظ کرنے کی کوشش
کرتا رہا اور جب مسیں بھیگنے لگیں تو بوڑھی ماں کو یہیں گاؤں میں چھوڑ کر شہر
بھاگ گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی ہیڈ کلرک کے یہاں ملازم ہو گیا ہے،
اسی ہیڈ کلرک نے کچھ عرصے کے بعد اسے ایک دوکان کے سامنے گز بھر جگہ لے
دی جہاں وہ کٹ پیس بیچتا رہا اور اپنی ماں کو بھی شہر بلا لیا۔ پھر جب اس نے
تجارت میں کافی مہارت حاصل کر لی تو خدا یار کی بجائے شمیم احمد کا نام اختیار
کر کے گاؤں آ گیا۔ اسی نے بڑی منت خوشامد سے مولوی آبل کو مجبور کیا کہ وہی
اس کی دوکان سے بوہنی کرے تاکہ تجارت میں برکت ہو اور نقد سودا چلتا رہے۔

اس روز آبل نے اپنے شاگرد اور اس کی بوڑھی ماں کا دل رکھنے
کے لیے اپنی زندگی کا شاید سب سے بڑا فیصلہ کیا۔ زیب النساء کے پاس
گیا۔ "عارف کی ماں! شمیم احمد کہتا ہے کہ وہ میری ہی بوہنی سے کاروبار
شروع کرے گا۔ تم کہو تو مہرن کے لیے ایک سوٹ کا کپڑا لے لیں۔ جہیز کے
لیے ضرورت تو ہے ہی۔ اور یوں سارے گاؤں والوں کے سامنے بوہنی کی
رسم ادا ہو گی۔ اس بے چارے کا بھی کچھ کام چل جائے گا۔ پھر شمیم احمد کا دل رکھنا
تو میرا فرض ہے۔ ایک تو پرانا شاگرد ہے، دوسرے حافظ عبدالکریم مرحوم
کا نور نظر ہے۔ تیسرے —— مولوی آبل نے رک کر ادھر ادھر دیکھا اور
پھر سرگوشی میں بولا "عارف کی ماں! اللہ جل شانہٗ کی قسم مجھے تو کچھ یوں لگتا
رہا ہے جیسے اللہ جل شانہٗ نے اسے مہرن ہی کے لیے آسمان سے اتارا ہے۔"

اس بات پر زیب النساء کی آنکھوں کی ہوا کو ایک لمحے کے لیے تو جیسے جھیل میں بدل گئی "تمہارے منہ میں گھی شکر" وہ بولی اور گلے میں لٹکتی ہوئی چابی قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر نکالی۔ صندوق کھولا اور ٹین کا ڈبہ نکال کر آپل کے سامنے رکھ دیا۔ "خدا تیری زبان مبارک کرے۔ بیٹی تو جب بھی مہرن کو دیکھتی ہوں ایسا لگتا ہے جیسے پہاڑ اٹھا رکھا ہے پر دیر تک بیٹھے بیٹھے جلانگا [?] ہے" اور رونے لگی، ساتھ ہی مسکراتی بھی رہی۔ اور جب مہرالنساء کسی کام سے اندر آئی تو فوراً بول اٹھی "بیٹی! باہر دھوپ میں ٹکڑے سوکھ رہے ہیں ذرا ان کو بیٹھیا [?] الٹ کر رکھ دو ورنہ سب ٹکڑے کونوں میں بٹ جائیں گے۔ جاؤ میری بچی ــــ" اور مہرالنساء کے گالوں کی لالی نے جواب دیا کہ میں سب سمجھتی ہوں ماں۔ شمیم احمد کی دوکان پر آپا میاں میری بوہنی کرنے چلے ہیں۔

مہرالنساء باہر چلی گئی تو مولوی آپل نے ڈبے کی کل متاع جیلے [?] تینتالیس روپے نکال کر جیب میں رکھے اور اٹھتے ہوئے بولا "دعا کرنا مہرن کی کہیں شادی لگ جائے تو میں پانچ سات برس کے لیے تو پھول کی طرح ہلکا پھلکا ہو جاؤں۔"

زیب النساء آنسو پونچھتی اور مسکراتی رہی اور مولوی آپل شمیم احمد کی دوکان کو چل دیا۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے جن میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو ناکوں اور ہونٹوں پر انگلیاں رکھے یوں کھڑی تھیں جیسے ان کی نظریں رنگ رنگ کے کپڑوں کے ساتھ سل کر رہ گئی ہوں۔ مولوی آپل دوکان میں داخل ہوا تو شمیم احمد اس کے قدموں میں بچھ بچھ گیا۔ اور جب مولوی آپل نے اپنی خوبصورت آواز میں قرآن شریف کی چند آیات کی تلاوت کی تو ایک سماں بندھ گیا۔ تلاوت کے بعد اس نے ایک کپڑا پسند کیا۔ گلابی رنگ پر نیلے پھولوں میں جگہ جگہ زرد رنگ کے نقطے تھے۔ "ایک زنانہ سوٹ کا کپڑا کاٹ دو۔" مولوی آپل نے معمول سے ذرا بلند آواز میں کہا اور ایک نظر گھوم کر بھی دیکھ لیا۔ شمیم احمد نے گز اٹھا کر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھا اور سات گز کپڑا ناپا۔ قینچی اٹھا کر ایک بار ـــــ پھر بسم اللہ پڑھی اور کپڑا کاٹا۔ تہہ کیا اور آخری بار بسم اللہ پڑھ کر مولوی آپل کے سامنے یوں رکھ دیا جیسے مفت میں ـــــ محض تحفۃً پیش کر رہا ہے۔

"قیمت؟" مولوی آپل نے اب کے حاضرین کی طرف نہیں دیکھا فقط اپنی جیب میں ہاتھ ڈال دیا۔

شمیم احمد مارے احترام کے کٹنے لگا۔ ایک لمحے تک ہاتھ ملتا رہا پھر کھنکارا اور بولا "چھ روپے گز کے حساب سے ۴۲ روپے ہوئے قبلہ!"

دوکان میں بیٹھے ہوئے سب تھان جیسے مولوی آپل کے دماغ پر دھب دھب گرنے لگے۔ بوکھلا کر اس نے جیب سے ہاتھ نکالا اور ایک روپیہ واپس جیب میں رکھ کر باقی رقم شمیم احمد کے سپرد کر دی۔ عورتوں کی انگلیاں ہونٹوں سے اٹھ کر ناک پر اور ناک سے ماتھے پر جا ٹکیں جیسے جگہ [?] نہ ملتی ہو۔ مولوی آپل نے کپڑا بغل میں لیا تو شمیم احمد بولا "قبلہ نے بڑی نوازش فرمائی ہے۔ اس بیچارے نے نرخ میں کوئی رعایت نہیں کی۔ میں آپ کا پرانا خادم ہوں پھر تلافی کر دوں گا انشاءاللہ تعالیٰ۔"

مولوی آپل کپڑے کو بغل میں لے کر اٹھا تو اس کا جی چاہا کہ شمیم احمد سے کہہ دے "اللہ جل شانہٗ ہی تلافی کرے گا عزیزی شمیم احمد، اس لیے کہ تم نے کپڑا بیچا ہے تو میں نے بھی اپنی بیٹی بیچنے کی کوشش کی ہے۔" لیکن وہ تو ایک دم سے جیب کے خالی ہو جانے کا خیال تھا جس پر اٹھتے ہی اس نے قابو پا لیا اور وہ بولا "یہ تو تمہارا حق تھا شمیم احمد، یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی؟ اللہ جل شانہٗ تمہیں اور تمہارے کاروبار میں برکت دے۔"

"آمین" شمیم احمد نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"آمین" زیب النساء نے کپڑے کی نرمی اور رنگینی کو دیکھ کر مولوی آپل کے ان الفاظ کے جواب میں کہا "اللہ کرے اس کپڑے سے ہماری مہرن کا سہاگ مہکے۔"

چند ہی روز بعد ایک شام کو جب مولوی آپل کے دروازے کی زنجیر بجی۔ اس وقت آنے والے عموماً حلوہ یا کھیر وغیرہ لاتے تھے۔ اس لیے زنجیر کی آواز سنتے ہی چھوٹے بچے ڈیوڑھی کی طرف لپکے۔ لیکن جانے مولوی آپل کو کیا سوجھی۔ خلاف معمول کڑک کر بولا "ٹھہرو" بچے رک گئے۔ سب کے چہرے لٹک گئے۔ عمدۃ النساء کو رو بھی دی مگر مولوی آپل اس کو دلاسہ دیے بغیر بڑی بے پروائی سے آگے بڑھا۔ جوں ہی ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا خوشبو کا ایک فرّاٹا [?] سا اٹھا اور ساتھ ہی آواز آئی "السلام علیکم قبلہ۔"

یہ شمیم احمد تھا۔ مصافحے کے لیے بڑھانے کے لیے اس کا ہاتھ بندر کی طرح ناچ اٹھا۔ اور جب اس نے رک رک کر کہا "آپ کی خدمت میں ایک درخواست لے کر آیا ہوں قبلہ، اس لیے آپ کو بے وقت زحمت دی" تو مولوی آپل کو شمیم کی پوشاک سے اٹھتی ہوئی مہک کچھ گھناؤنی محسوس ہوئی۔ یہ درخواست یہاں ڈیوڑھی میں بھی سنی جا سکتی تھی لیکن مولوی آپل گردن موڑ کر پکارا "میں ابھی آیا عارف کی ماں" اور پھر شمیم احمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس تیزی سے حجرے کی طرف چلا کہ شمیم احمد کو تنگ تہبند کا قدم [?] اٹھا رکھنے کے لیے اسے دوسرے ہاتھ سے گھٹنوں تک اٹھا دینا پڑا۔

دونوں ایک حجرے میں پہنچے تو وہاں چند نمازی آگ جلائے ہارون الرشید کے انصاف کی کہانیاں سن رہے تھے۔ دوسرے حجرے میں اندھیرا تھا یہاں عموماً اندھیرا ہی رہتا تھا اور یہ اکتالیس اکتالیس دنوں کی مسلسل چلہ کشی کے لیے مخصوص تھا۔ شمیم احمد کو وہیں چھوڑ کر مولوی آپل پہلے حجرے سے جلتی ہوئی ایک لکڑی اٹھا لایا اور اندھیرے حجرے کا ایک کونہ جیسے جاگ اٹھا

یہاں مولوی کی کمر جھکی تھی۔ زیب النساء چند قدم پر جا کر رک گئی اور سسکیاں
لینے لگی۔
اور پھر مولوی آبل نے زیب النساء کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں جکڑ
لیا اور اسے بے ڈھنگے پن سے کھینچ کر آنگن کے ایک گوشے میں لے جا کر
یوں بولا جیسے گھر میں آگ لگنے کی اطلاع دے رہا ہو "عارف کی ماں! سنو
یہ زبیدہ تو جوان ہو گئی ہے!"
اور زیب النساء آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر زبیدہ کی طرف یوں دیکھنے لگی
جیسے وہ اب تک والدین کی بے خبری میں مہرن کے عقب میں بیٹھی پلتی بڑھتی
رہی تھی۔
کچھ دیر کے بعد مولوی آبل نے بغیر ضرورت کے گلا صاف کیا اور ام
بحود زیب النساء کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "فکر نہ کرو بیوی اللہ جل شانہٗ
کی رحمتوں سے مایوس ہونا کفر ہے۔"
زیب النساء نے مولوی آبل کا ہاتھ کس قدر سختی سے اپنے کندھے
سے گرا دیا "شرم کرو، پہلے میرا ہاتھ پکڑے چلے آتے، اب کندھا ہلا رہے
ہو۔ جوان جہان بیٹیاں کیا کہیں گی کہ اولاد کے سامنے ــــ" زیب النساء
نے فقرہ پورا کرنے کی بجائے اپنا دوسرا کندھا اچکا دیا۔
مولوی آبل کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ پکارا "شمس!"
شمس النساء قطار میں سے نکل رہی تھی کہ مولوی آبل نے جیسے سہارا
لینے کی خاطر اپنے عقب میں دیوار کو ٹٹولنے کے لیے ہاتھ ہلایا اور کوئی سہارا
نہ پا کر ٹوٹی شاخ کی طرح جھوم سا گیا۔ چلتے ہوئے شمس النساء کے پاؤں کے
تلوے ایک دم چپٹے چپٹے زمین پر نہیں لگ جاتے تھے بلکہ اس کے جسم کی طرح
اس کے پاؤں میں بھی لہراؤ سا تھا۔ سب سے پہلے ایڑی زمین کو چھوتی تھی
پھر تلوے کا خم جھکتا تھا اور اس کے بعد پنجے کی اٹھی ہوئی انگلیاں باری
باری جیسے لپک لپک کر دھرتی کو چھوتی تھیں۔ تب جا کر دوسرا قدم اٹھتا تھا۔
"کچھ نہیں بیٹی۔ کچھ نہیں۔ جاؤ" یہ مولوی آبل تیزی سے ڈیوڑھی کی
طرف جاتے ہوتے بولا۔
شمس النساء حیران ہو کر اپنی ماں کو دیکھنے لگی۔
اور زیب النساء زار زار روتی وہیں ڈھیر ہو گئی، زبیدہ اور شمس اس
کی طرف لپکیں۔
مولوی نے باہر جا کر چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر دیوار کے
قریب سے چمکتی ہوئی اکنّی اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لی۔
گھر میں کل دو ہی بکس تو تھے۔ اب ان میں سے ایک میں سوکھے ٹکڑے
رکھے جانے لگے تھے اور دوسرے میں قرآن اور رحل کی گڑیاں اور دستر کی نقروں
کی جوڑی کی گوریاں پڑی رہتی تھیں۔ گاؤں میں لڑکیوں کا پرائمری اسکول بھی
کھل گیا تھا۔ اس سے اب بکالی کی [illegible]
کم رہ گئی تھی اور اسی لیے سوکھے ٹکڑے اب بکنے کی بجائے چندہ روز کے
بھالے جانے لگے تھے۔ نمازیوں کو بھی لانے کی بجائے لگ گئی تھی۔ بعض وقت
تو مولوی آبل اذان دے کر دیر بیٹھا تا اور جب دیکھتا کہ نمازیوں کے
انتظار میں نماز قضا ہو رہی ہے تو کچھ یوں کھویا کھویا سا اٹھ کر اندر مسجد میں
آ جاتا جیسے کوئی بڑا ناگوار فرض ادا کرنے چلا ہے۔ جمعہ کی نماز پر جب چند کسان
جمع ہو جاتے تو وہ بڑی رقت سے خطبہ دیتا۔ اسلام میں نماز کی اہمیت اور
علمائے دین کی خدمت کی برکت کا تذکرہ کرتا اور کہتا "تمھیں یاد ہوگا کہ کتنے
ہی زلزلہ آیا تھا! کیوں آیا تھا؟ ترک میں بھونچال آیا تو کتنے ہی گاؤں کو
زمین نگل گئی۔ کیوں نگل گئی؟ مسلمان ہر جگہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہو رہے
ہیں۔ کیوں ہو رہے ہیں؟ کیوں یہ کبھی سوچا ہے تم نے؟ اور بھلا تم کیوں
سوچو، تمھیں تو گندم کے نکھارنے دین سے بیگانہ کر رکھا ہے۔ یہ نماز نہ پڑھنے
اور علمائے دین کی خدمت نہ کرنے کے نتیجے ہیں۔ یہ قہر الٰہی ہے جو آتا ہی جاتا
ہے۔ سمجھے؟ اور کیا تم اپنے گاؤں کو بھی زمین کے پیٹ میں اتارو گے؟ بتاؤ
بتاؤ نا ــــ" اس قسم کے جذباتی خطبوں کے بعد مقتدیوں میں ذرا سا اضافہ
ہوتا اور ایک دو روز تک [illegible] "دیکھیے" آنے لگے۔ مگر پھر وہی سناٹا ہو
جاتا جس میں زبیدہ کی آنکھیں چمکتیں، شمس کا جسم لچکتا، صحن کے خالی بکسوں
میں سوکھے ٹکڑے اور بچوں کے جوتوں بنے بجتے اور تالیاں بجاتے اور قرآن
کی گڑیاں اچھل اچھل کر ایک دوسرے کے سر پر گھسی پڑتیں۔
مولوی آبل کے صرف دو ایسے سہارے تھے جو کبھی نہ ٹوٹے۔ اللہ
جل شانہٗ اور چودھری فتح داد۔ اللہ جل شانہٗ کا یہی کرم کیا کم تھا کہ مولوی
آبل اور زیب النساء اب تک زندہ تھے اور اب تک ان کی ساری اولاد
زندہ تھی اور مہرالنساء کا بیاہ اس ٹھاٹ سے ہوا تھا کہ زبیدہ اور شمس کے
لیے رشتے کے پیاموں کا سلسلہ ٹوٹنے ہی میں نہ آتا تھا۔ لیکن مولوی آبل
جس شدت سے مہرالنساء کے بر کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا اسی شدت
سے وہ زبیدہ النساء اور شمس النساء کے لیے آنے والے پیاموں سے متنفر
تھا۔ ابھی تو کل کی بچیاں ہیں بھئی۔ ابھی تو گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔ شمس نے
تو ابھی تک قرآن مجید بھی ختم نہیں کیا۔ میں ذرا ذرا سی پونی ایسی بچیوں
کو کس دل سے اٹھا کر پرائے گھروں میں بھیج آؤں؟ زبان دو ماں نہیں دوں
گا۔ اگلے سال دیکھا جائے گا۔"
"دیکھا جائے گا؟" وہ زیب النساء سے زبیدہ اور شمس پر بے تحاشا
آتی ہوئی جوانی کی اطلاعیں پا کر کہتا "اللہ جل شانہٗ رحم فرمائے گا۔ توکل
بڑی چیز ہے عارف کی ماں! کسان جب دھرتی میں بیج بوتا ہے تو اللہ
جل شانہٗ پر توکل کرتا ہے۔ توکل نہ کرے تو بیج وہیں مٹی میں مٹی ہو کر جاتے

کچھ دیر تک خاموشی رہی، چودھری ذرا سا کلبلایا، پھر بولا "سنا ہے بیٹی مہرالنسا اور شمیم احمد کی تو خوب نبھ رہی ہے پر ساس اس کے پاؤں نہیں ٹکنے دیتی۔"

"جی ہاں" مولوی اٹل نے بڑے دکھ سے کہا "لیکن میں نے کبھی کوئی دخل نہیں دیا۔ بیٹی بیاہ دی جاتے تو پرائی ہو جاتی ہے۔"

"مگر ساس سے کیوں نہیں بنتی؟"

"بس وہی غریبی مفلسی کے طعنے۔ آدھی کل ہے، تو سو کے ٹکڑوں پر پلی ہے، تیرے کپڑوں سے کفن کی بو آتی ہے، تو اپنے ساتھ کیا لائی ہے؟ ایسی ہی عورتوں کی باتیں۔"

"ہوں" چودھری کچھ دیر تک کچھ سوچتا رہا، پھر بولا "بیٹی پرائی نہیں ہو جاتی قبلہ! بیاہ کے بعد تو اس کے حقوق بڑھ جاتے ہیں۔ اب اگر ساس اس قسم کی ہے تو آپ کا فرض ہے کہ ان طعنوں کا موقع ہی نہ دیں۔ وہ بیٹی مہرالنسا کو کنگلی کہتی ہے نا؟ اب ہماری بیٹی کے بچہ ہوگا تو اس کے لیے آپ ریشم کے کپڑے اور طلائی قریاں اور سونے کے گھنگروؤں والے کنگن بھیج دیجئے اور پھر دیکھئے کس طرح بڑھیا کا مان بھی بڑھے گا اور بڑھیا کی پلید زبان بھی کٹ جائے گی۔ ٹھیک ہے نا قبلہ؟"

ٹھیک ہے، مولوی اٹل نے سوچا۔ بہت حد تک ٹھیک ہے مگر ایک حد تک محال بھی ہے۔ یہ سب سامان آخر آئے گا کہاں سے؟ اور کیا عارف کی ماں نے آج سے آٹھ مہینے پہلے مہرن کے بارے میں جو اندازہ لگا تھا وہ درست تھا؟ اب مولوی اٹل کا وہاں دیر تک نچلا بیٹھے رہنا مشکل تھا۔ تو کیا سچ مچ مہرن بیٹی کے بچہ پیدا ہونے والا ہے؟ اس نے تو زیب النسا سے کبھی پوچھا ہی نہ تھا اور زیب النسا نے بھی حیا کے مارے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ مولوی اٹل بیٹیوں کے پیٹوں کو ٹٹولتے پھرنے کے سخت خلاف ہے۔

مولوی اٹل ڈیوڑھی ہی سے پکارا "عارف کی ماں"

زیب النسا بھاگی آئی "خدا خیر کرے، کیا ہوا؟ چودھری کیسا ہے؟"

"اللہ جل شانہ رحم فرمائے گا" مولوی اٹل بولا "عارف کی ماں! اپنی مہرن بیٹی کیسی ہے؟"

زیب النسا چونکی "تمھیں کس نے بتایا؟"

"کب تک ہوگا؟" مولوی اٹل تو آج آپے سے باہر ہو رہا تھا۔

"بس اللہ چاہے گا آج کل میں" زیب النسا جھینپ کر بولی "پر تمھیں کس نے بتایا؟"

مولوی اٹل تقریر کے سے انداز میں بولا "بس یہی موقع ہے جب ہم مہرن بیٹی کو اس کی ساس کے طعنوں تشنوں سے چھٹکارا دلا سکتے ہیں

جو اپنے نواسے نواسی کے لیے بہت سا۔۔۔"

"اللہ کرے نواسہ ہو" زیب النسا نے مولوی اٹل کی بات کاٹ دی۔

"جو کچھ بھی ہو" مولوی اٹل نے لفظوں کے تار کو جوڑا "ہم بچے کے لیے بہت سا سامان بھیج کر اپنی بیٹی کا مان بھی بڑھائیں گے اور اس بدبخت بڑھیا کی پلید زبان بھی کاٹ دیں گے ہمیشہ کے لیے۔ ٹھیک ہے نا؟"

"کہنا تو بڑا آسان ہے پر کرو گے کہاں سے؟" زیب النسا نے پوچھا۔

"توکل عارف کی ماں توکل" مولوی اٹل کے ذہن میں چودھری فتح داد کا میٹھا میٹھا ہمدردانہ لہجہ گھوم رہا تھا۔ "اللہ جل شانہ پر تکیہ کرو" خود مولوی اٹل کو اس وقت چودھری پر تکیہ تھا۔

شام ہوتے ہی زیب النسا نے برقعہ اوڑھا، عارف کو ساتھ لیا اور مہرالنسا کے یہاں چلی گئی۔ رات گئے واپس آئی۔ برقعے کو ایک طرف رکھ کر آہستہ سے بولی "جاگ رہے ہو عارف کے ابا؟"

"ہاں عارف کی ماں۔ کیوں؟" مولوی اٹل نے لحاف میں سے کہا۔

"بڑی تکلیف میں ہے مہرن بیٹی۔ شمیم احمد سو رہا تھا بے چارہ۔ غالباً کل تک ہو جائے گا" زیب النسا نے بڑی کھنکتی ہوئی آواز میں سرگوشی کی۔ "سچ اماں؟" زبیدہ تڑپ کر بستر پر اٹھ بیٹھی۔

"ہائے" مولوی اٹل اور زیب النسا حیران رہ گئے اور پھر اس موضوع پر مزید اظہار رائے کے بغیر ہی سو گئے۔

دوسرے روز بھی کچھ ایسی ہی کیفیت رہی۔ جب بیٹی مارے درد کے چیختی ہے اور ماں باپ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے۔

اور پھر آدھی رات کو ایک نائن نے ڈیوڑھی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مولوی اٹل نے لپک کر زنجیر کھولی۔ مہرن کے یہاں بیٹا ہوا تھا۔ سارا گھر جاگ اٹھا اور کافی دیر کے بعد سب اپنی اپنی مسکراہٹیں سمیٹ کر اونگھنے لگے تو مولوی اٹل زیب النسا کے پاس آیا "اب کیا ہوگا؟"

"چودھری کیسا ہے؟" زیب النسا نے پوچھا۔

"اللہ جل شانہ ہی رحم فرمائے" مولوی اٹل نے کہا۔

زیب النسا اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی "طلائی قریاں اور سونے کے کنگنوں کو تو چھوڑو جانے دو، میں تو کہتی ہوں مگر ریشم کا ایک ایک جوڑا ہی نہ ہوا تو ناک رہ جائے گی۔ کوئی سبیل ہے؟"

"نہیں" مولوی اٹل سوچ میں پڑ گیا اور جب بولا تو اس کی آواز میں غصہ تھا "تمھاری عقل بھی تو ماری گئی ہے اور جانے وہاں [illegible] کہ انھیں سات بیٹیاں ہیں اور پہلی ہی بیٹی کے بیاہ پر کپڑے [illegible] یہاں تک کہ انگلیوں کے چھلے بھی [illegible] مرحوم [illegible] کی بیٹی کا بیاہ تھا [illegible]

زیب النساء بڑی مہارت سے اٹھے جہتے آنسو پی گئی۔ بولی۔
"چودھری کیسا ہے؟"
"وہیں جا تا ہوں" مولوی اُبل نے جاہی لے کر کہا۔ "ذرا سا بھی بچا ہوا تو مہرن کا شوہر پوچھے گا۔ ہو سکتا ہے اللہ جل شانہ، کوئی سبیل پیدا کر دے۔"

مولوی اُبل کافی دیر تک واپس نہ آیا۔ زیب النساء نے بڑھتے کو جا کر انگیٹھی پر ڈال دیا اور عارف کو منہ ہاتھ دھو کے اور تیار ہو جانے کو کہا۔ زبیدہ اور شمس نے ضد کی کہ وہ بھی اپنے بھائی کو دیکھنے جائیں گی۔ "ابھی ٹھہر و بیٹی!" زیب النساء یوں آہستہ سے بولی جیسے اس وقت ذرا سی بھی بلند آواز سے بات کی تو کوئی چیز چھن سے ٹوٹ کر رہ جائے گی۔

انتظار

انتظار

ماں کے تیور دیکھ کر بچے بھی سہمے بیٹھے تھے اور ماں چڑیا کے اڑنے تک سے چونک کر ڈیوڑھی کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔

اور پھر ڈیوڑھی کے کواڑ دھڑاک سے بج کر کھلے اور مولوی اُبل زندگی میں شاید پہلی بار بھاگتا اور ہانپتا ہوا اندر آیا اور چلایا "عارف کی ماں عارف کی ماں!"

زیب النساء باہر لپکی۔ اور اس کے پیچھے زبیدہ، شمس، عارف، قمرن، حمیدہ اور دوسرے سب بچے یوں نکلے جیسے کمرے میں سے کسی بگولے نے انھیں اٹھا کر باہر بکھیر دیا ہے۔

اور مولوی اُبل اسی ہنستے ہوئے لہجے میں چلایا "مبارک ہو عارف کی ماں! تم تو اس کے جوتے کو رو رہی تھیں۔ اللہ جل شانہ، نے جوتے، چپّی اور ٹوپی تک کا انتظام فرما دیا۔ جنازے پر کچھ نہیں تو بیس روپے ضرور ملیں گے ابھی کچھ دیر تک جنازہ اٹھے گا ۔۔۔ چودھری فتح داد مر گیا ہے نا!"

زیب النساء نے اس زور سے اپنی چھاتی پر دو ہتڑ مارا کہ بچے تک دہل کر رہ گئے۔

اور پھر ایک دم جیسے کسی نے مولوی اُبل کو گردن سے دبوچ لیا۔ اس کی اوپر اٹھی ہوئی پتلیاں بہت اوپر اٹھ گئیں۔ پھر ایک لمحے کے دردناک سناٹے کے بعد مولوی اُبل جو مرد کے چلا چلا کر رونے کو ناجائز اور خلافِ شرع قرار دیتا تھا، چلا چلا کر رونے لگا اور بچوں کی طرح پاؤں پٹختا ہوا ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر باہر گلی میں بھاگ گیا۔

نعیم حسین تنگاو

# انٹرویو

مجھ کو اپنوں سے نہ نا پو میری توہین ہے یہ
مجھ کو نظروں سے نہ بھانپو میری تذلیل ہے یہ
میرے کپڑوں کو نہ دیکھو میرا چہرہ نہ تکو
مفلسی میں تو یہی حال ہوا کرتا ہے
علم اور فن میرا جوہر ہے لیکن
ان میں تم پرکھو ________ !!
کل کے اخبار میں لکھا تھا جگہ خالی ہے
"ایک سیکریٹری کی"
جو کہ قابل ہو سمجھ دار پڑھی لکھی ہو
اُردو انگریزی روانی سے جو لکھ سکتی ہو

________

نوکری مجھ کو یقیناً یہاں مل جائے گی
میری تعلیم اسی وقت کے کام آئے گی
ہو کے بے تاب خوشی سے میں پکاری اماں
کہہ دو سُشبو اور سجو سے یہ پیاری اماں
تنگ دستی کے سیاہ پوش زمانے بدلے
فاقہ مستی کے ستم خیز نشانے بدلے
خوش خیالی سے کے یہ گھر سے چلی ________
کشمکش کو کمرۂ انٹرویو میں پہنچی ________
کہہ اٹھی جذبات میں بے ساختہ ________
کتنے ارمانوں سے امیدوں سے آئی ہوں یہاں
اور اپنے ساتھ لائی ہوں ہنر کی ڈگریاں
اپنے آفس میں جگہ دے کر مجھے
میرے گھر والوں کی قسمت پھیر دو۔
مگر ________ ؟
تک رہے تھے وہ مجھے اور میں انھیں

# الجھن

جی ایم ناز

***

محترم ناز صاحب!

سلام مسنون! ایک مدت سے آپ کی تحریروں کی پرستار رہی ہوں۔ ابھی چند ماہ ہوئے ہیں مجھے ایک مسئلے سے دوچار ہونا پڑا ہے جو میں کسی اور سے نہیں کہہ سکتی۔ سوچا سوچا کہ آپ ہی سے عرض کر پاسکوں تو بہتر ہے۔ مسئلے تو نظر انداز مت کیجئے اور جواب جلد دیں۔

میری منگنی اپنے تایا کے بیٹے کے ساتھ ہوئی ہے۔ ہم اکٹھے رہتے تھے۔ شروع میں تو ہم ہنستے جھگڑتے رہتے تھے لیکن اب چند ماہ سے میرے منگیتر کی طرف سے قدم اٹھایا گیا جس سے مجھے پتہ چلا کہ وہ مجھے دلچسپی لیتا ہے۔ پسند تو مجھے بھی بہت ہے۔ بڑھتے بڑھتے بہت بے تکلفی ہو گئی ہے۔ اکیلے میں ملنے میں کوئی روک ٹوک نہیں کیونکہ ہمارا پردہ نہیں۔ وہ کئی دفعہ بہت بے تکلفی چاہتا ہے (آپ سمجھ گئے ہوں گے) میں بہت منع کرتی ہوں لیکن وہ کہتا ہے کہ جس دن میں کوئی ایسی حرکت کروں کہ شادی سے پہلے تمہاری عزت پر حرف آئے وہ میری زندگی کا آخری دن ہو گا۔ کہتا ہے بس وہ معلوم نہیں کرو گا۔

باقی سب کچھ ہو گا لیکن میں کہتی ہوں یہ سب بھی اچھا نہیں۔ مگر اس کا کہنا ہے کہ تو وہ کہتا ہے کہ یہ نہیں کہتا تا کہ کسی سے ہوتا ہے۔ مگر کیونکہ ہم اکٹھے رہتے ہیں اس لئے مجھے اس کی عادتوں کا پتہ ہے وہ بہت سی باتیں کرتے ہیں لیکن وہ کبھی کوئی حرکت نہیں کرتا۔ میں نے اسے آزما کر دیکھا ہے۔ وہ بہت مضبوط کردار کا مالک ہے اس کے متعلق سب کا کہنا ہے کہ شریف، نیک اور اخلاق بہت اچھا ہے اس میں کوئی ایسی بری بات نہیں۔

میں نے اسے یہ بھی کہا تھا کہ تم اپنی بات منواتے ہو میں جی ایم ناز صاحب سے پوچھوں گی کہ تمہیں بینڈل کیسے کروں۔ کہنے لگا یقیناً وہ میرے حق میں فیصلہ کریں گے۔ کہتا ہے کہ تم میری ہونے والی بیوی ہو لیکن میں ابھی سے تمہیں بیوی سمجھتا ہوں۔ میں نے آج تک کسی لڑکی کو چھوا تک نہیں۔ اگر تمہیں پیار کر لیتا ہوں تو کہو گے کم از کم اتنا حق تو ہے میرا۔ لیکن میں کہتی ہوں کہ گناہ ہے۔ آج نہیں تو کل شادی تو ہو جائے گی تم اتنا صبر نہیں کر سکتے۔

ناز صاحب آپ ہی بتائیں میں اس سے کیسا جانی بات منوایا کروں۔ میں ایک متوسط گھرانے کی ہوں اور معقول ذہن ہے۔ میں اگر کوئی بات کروں تو وہ ویسی شدت کے ساتھ قائل کر لیتا ہے۔ سب کا خیال ہے کہ وہ عام لڑکوں کی طرح میرے ساتھ کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا کیونکہ وہ کسی کے سامنے ایسی بات کرتا ہے، خط، فون یا پیغام رسانی، کبھی ایسی حرکت نہیں کرتا۔ بلکہ ایک دفعہ میں نے اس سے کہا کہ تم مجھے بے حد قربت بناتے ہو تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہنے لگا کہ میں اتنا بدنصیب ہوں کہ ابھی تک تمہارا اعتماد حاصل نہیں کر سکا۔ ہماری شادی میں ابھی کافی دیر ہے۔ ویسے وہ کوشش کر رہا ہے کہ جلد از جلد شادی ہو جائے۔ پلیز مجھے ضرور بتائیں کہ میں اس سے کیا کہوں، کیسا سلوک کروں۔ میں آپ کو بتاتی چلوں کہ مجھے sex کے متعلق کوئی خاص علم نہیں تھا۔ اس نے لئے ایک طریقہ سے بتایا اور میرے ذہن میں اب یہ کوئی الجھن ہے۔ جنس اس طرح رہ گیا ہے۔ اس کے بعد آپ کی کتابیں پڑھیں تو مجھے احساس ہوا جیسے میرے منگیتر کی کوئی چھوٹی باتیں ہیں۔ میری عمر اس وقت بیس سال ہے اور اس کی ۲۴ سال ہے۔ میں نے ایک عورت سے پورا معاملہ کہہ دیا ہے۔ خدا کرے آپ اس کو قابل قبول سمجھیں۔ میں بڑے بے چینی سے جواب کا انتظار کروں گی۔ جلد جواب دیں۔ مہربانی ہو گی۔ شکریہ

"مضطرب"

ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہ درست آپ کے اندر یا احساس صرف کم عمری کی حد تک پیدا ہوا ہو اور آپ نے ابھی تک عملی طور پر اس کو آزمایا ہی نہ ہو۔ گویا آپ ابھی تک صرف اس نرگسیت میں مبتلا ہوں۔ کبھی کبھی محض خیال کر آدمی حقیقت کچھ سمجھتا ہے۔ بہرحال نوعیت کچھ بھی ہو۔ آپ کو (اگر یہ داستان مکمل درست نہیں سمجھتی) فوری طور پر ذہنی تجزیے کی ضرورت ہے۔ تاخیر خطرناک ہو سکتی ہے۔ آپ کو چاہئے کہ فوری طور پر کسی ماہر نفسیات سے مشورہ کریں۔

❋❋❋

محترم بھیا جی ایم ناز صاحب!

تسلیمات: اس ماہ کا دوشیزہ پڑھا۔ اس سے پہلے کبھی کبھار گئی۔ اتفاق سے دوشیزہ پر نظر پڑی۔ اس کے بعد ایک مضمون میں کچھ ایسی کھوئی کہ رسالہ گھر پر مانگ کر لانا ہی پڑا۔ پھر ہر ماہ کسی نہ کسی طرح رسالہ حاصل کر ہی لیتی ہوں۔ سب سے زیادہ اس ماہنامے میں جس چیز نے متاثر کیا وہ آپ کے کالم کی نفسیاتی الجھنیں اور ان کے جوابات تھے۔ عرصے سے کئی رسالوں میں آپ کے کالم اور نفسیاتی الجھنوں کے حل پڑھتی چلی آ رہی تھی۔ سوچا کرتی تھی کہ کسی طرح آپ سے اپنے متعلق نفسیاتی حل طلب کروں۔ آپ ایک عرصے سے عوام کی خدمت کر کے ثواب حاصل کر رہے ہیں، ان کی دعائیں لے رہے ہیں۔ یقیناً آپ مجھے بے پروا نہیں ہوں گے کہ مجھے میری الجھنوں سے نجات نہ دلائیں جس کی وجہ سے میں خود کو گناہگار سا سمجھتی ہوں۔ میری زندگی کا انحصار صرف آپ کے جواب پر ہی ہے۔

میری الجھن یہ ہے کہ پچھلے چھ ماہ سے مجھے اپنے اندر اتنی زبردست تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے ایک دم رونے کو جی چاہنے لگتا ہے اور حلق میں کوئی چیز پھنسی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہے۔ رات کو اکثر واہیات سے خواب آتے ہیں۔ کل جب دوشیزہ میں محترمہ فریحہ صاحبہ کے حل کا جواب پڑھا تو کچھ کچھ اپنے مسائل کا حل محسوس ہوا اور سمجھ میں کچھ آیا کچھ نہیں۔ بہرحال میرا اصل مسئلہ تو اس سے بھی پہلے کا ہے یعنی کہ چھ ماہ سے پہلے کا۔ نہ جانے میرا دل کیا ہے کوئی اچھی چیز دل چاہتا ہے کہ کاش یہ اپنی ہو جائے، چلیں بات یہاں تک ہو تو پھر قابل گرفت نہیں مگر یہ کیا کسی خوبصورت مرد اور خوبرو معصوم کو دیکھ کر نہ جانے کیا ہونے لگتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ ریڈیو پر کسی کی خوبصورت آواز سنوں تو دل چاہتا ہے کاش یہ خوبصورت آواز اپنی ہو۔ دل میں احساس ندامت بہت ہوتا ہے اور پھر اس پر تو یہ کر کے سوچ کر گناہ کا اثر غالب آ جاتا ہے کہ کتنی بری بات ہے کہ میں اس قسم کی باتیں سوچتی ہوں اور وہ بھی مردوں کے بارے میں۔ پھر اس بات پر بھی رونا آ جاتا ہے احساس گناہ مٹانے کے لیے نماز میں اس قدر دعائیں مانگتی ہوں۔ کبھی

کوئی بات ہو یعنی کہ اذان کی آواز آتے ہی نماز کے بعد ہمیشہ زیادہ تر یہی دعا مانگتی ہوں۔ "اے خدا! مجھے معاف کر دینا میں بہت گناہگار ہوں۔" مجھے علم ہے آپ کہیں گے کہ احساس ندامت اور مغفرت کی دعا مانگنا اچھی بات ہے مگر میرا دل نہیں مانتا۔ سوچتی ہوں کہ اگر میرے دلی خیالات کا علم کسی اور کو ہو جائے تو لوگ مجھے کتنی غلط سمجھیں گے کیونکہ بظاہر میں کسی مرد میں دلچسپی نہیں لیتی اور لوگ کہتے ہیں کہ یہ لڑکی کتنی اچھی ہے۔ اس کو غلط قسم کے خیالات سے ہی نفرت ہے۔ اسی بات کے پیش نظر جب میں سوچتی ہوں کہ اگر لوگوں کو علم ہو جائے کہ میں ہر مرد کو اس نظریے سے دیکھتی ہوں اور پسند کرنے لگتی ہوں کہ شاید یہ بھی میرا ہو جائے۔ خوبصورت چیزوں کو پسند کرنا بقول آپ کے غلط تو نہیں ہے مگر بات صرف خوبصورت چیزوں تک ہی محدود نہیں اور یہ احساس گناہ مجھے ختم کر کے دم لے گا۔ ہر وقت رونا میرا معمول بن گیا ہے۔ اس احساس پر کہ میرے گناہوں کی مغفرت نہیں ہو سکتی۔ مذہب کی باتوں سے دلی لگاؤ ہے اور جب اسلام کے شروع کے دور کے حالات اور اس وقت کی عورت کی پاکیزہ حیثیت کے متعلق پڑھتی ہوں تو اپنے باطن پر لعنت بھیجتی ہوں۔

پچھلے چھ ماہ سے میری پریشانی میں اضافہ ہو گیا ہے اور احساس گناہ زیادہ بڑھ گیا ہے یعنی کہ دل میں جذباتیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اپنے جذباتی اور غلط خیالات کو روک سکنا بس کی بات معلوم نہیں ہوتی۔ حالانکہ یہ بے چینی اور بڑھتی جاتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا ایسا کیوں ہے؟ شاید آپ کچھ راہ کر سکیں۔ اپنے خیالات کو روکنا میرے بس میں نہیں۔ مذہب سے دلچسپی از حد ہے جب سے ہوش سنبھالا ہے مجھے یاد نہیں کہ کوئی نماز چھوڑی ہو۔ میں آپ سے اپنی تعریف کروانے کے لیے نہیں کہہ رہی بلکہ آپ کو اپنے ماحول اور حیثیت سے زیادہ سے زیادہ واقف کرانا چاہتی ہوں۔ آپ جو مشورہ بھی دیں گے میں بسر و چشم قبول کروں گی۔ زندگی سے جی اتنا اچاٹ ہو گیا ہے کہ جب اس قدر گناہگار ہوں تو جینے کا فائدہ۔ میری عمر بیس سال ہے اور میں کالج کی طالبہ ہوں۔

ش۔ کراچی

عزیزہ ش صاحبہ!

خاصی تاتنی باتیں لکھنے کے باوجود اصل بات کو آپ چھپا گئیں۔ میں مسائل حل کرتا ہوں، پہیلیاں نہیں۔ حل کرنا میرا کام نہیں۔ میں مسائل صرف اسی وقت حل کر سکتا ہوں جب مسئلے کو صاف اور کھل کر بیان کیا گیا ہو۔ تاکہ میں پہیلی میں بات کو غلط سمجھ جاؤں گا تو جواب بھی غلط ہو گا۔ آپ صرف دو طرح کی آواز اور شکل و صورت کو ہی پسند نہیں کرتیں بلکہ بات کچھ اس سے بھی آگے ہے جو آپ نے صاف نہیں لکھی۔ اس طرح کا جواب کیا دوں۔

مستحق بات نہیں تھی اور ہمیشہ یہ ظاہر کیا کہ یہ بہت گندی سی شے ہوتی ہے
اور اس سے بچنا کہ بہت دور رہنا چاہئے۔ اور اب جب میرے شوہر
میرے قریب ہوتے ہیں تو ان لمحات میں بھی ان پر پابندی لگاتی ہوں
کہ وہ ہاتھ ناپاک ہو گیا ہے۔ اس کے بعد تو گویا قیامت ہوتی ہے۔ تمام
بستر کی چادر وغیرہ تبدیل کرتی ہوں۔ نہاتی اس قدر ہوں کہ تھکن سے نڈھال
ہو جاتی ہوں۔ نہانے کے بعد اور بھی زیادہ وہم کا شکار ہو جاتی ہوں۔ نماز
میں صحیح طریقے سے سجدہ نہیں کر سکتی، پیروں پر بیٹھ نہیں سکتی کہیں پیشاب
کا قطرہ نہ گر جائے جبکہ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ یہ جانتی ہوں کہ میری اس
وہمی طبیعت سے میرے شوہر خوش نہیں ہیں۔ مجھے ان پر ترس آتا ہے
دل خون کے آنسو روتا ہے۔ لیکن میں کیا کروں۔ اف خدا کیا کروں!

یہاں تک تو ٹھیک ہی تھا۔ اس قیامت کو تو میں بہر حال برداشت
کئے ہوئے تھی لیکن اب اس سے بھی زیادہ شرمناک مرض میں گرفتار ہو گئی
ہوں۔ یہ بات کہتے ہوئے شرم سے ڈوب مرنے کو دل چاہتا ہے لیکن اگر
اس ناسور کا علاج نہ کراؤں گی تو خدا جانے میرا حشر کیا ہو۔ جب میں جنس
مخالف کو دیکھتی ہوں خواہ وہ لڑکا ہو یا آدمی، اجنبی ہو یا اپنا، باپ ہو
یا بھائی سب کو دیکھ کر میرے ہونٹوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ آ جاتی
ہے اور توبہ میری آنکھیں فوراً ایک ہی جانب اٹھ جاتی ہیں۔ جب اپنی
مسکراہٹ روکنے کی کوشش کرتی ہوں تو چہرہ عجیب مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔
استغفار پڑھتی ہوں۔ خدا سے دعا کرتی ہوں لیکن پھر بھی خود پر قابو نہیں پا
سکتی۔ بلکہ بات کرتے ہوئے اچانک میری نگاہیں بار بار بھٹکنے لگتی ہیں۔
لوگ حیران ہو کر عجیب نظروں سے مجھے دیکھنے لگتے ہیں۔ بلکہ اجنبی لوگ غلط
اشارے بھی کر دیتے ہیں۔ اس وقت میرا دل بند سا ہونے لگتا ہے۔ ڈوب
مرنے کو دل چاہتا ہے۔ خدا جانے اب تو لوگ مجھے کیا کیا سمجھنے لگے ہیں۔ عجیب
بات ہے یکسر ترک ہر شخص مجھے بُرا سمجھنے لگتا ہے۔ دوبارہ اس کے ساتھ
ایسی بیہودہ حرکت نہیں ہوتی۔ میں نے لوگوں سے چھپنا شروع کر دیا ہے
گھر میں جمعدار، دھوبی، دودھ دینے والے سے باتیں کرتے ہوئے حتیٰ کہ
بازار میں کپڑا خریدتے وقت بھی اچانک اس مرض کا حملہ ہو جاتا ہے۔ کس
قدر بدنامی، رسوائی ہو رہی ہے میری۔ ابھی تک میرے شوہر کو ان باتوں
کا غالباً احساس نہیں ہوا ہے۔

میرے محسن میری مدد فرمائیں۔ مجھے اس ہولناک تباہی سے نجات
دلائیں۔ خدا آپ کو اس کا بہت بڑا اجر دے گا۔ ۔۔ ص ت، کراچی"

محترمہ ص ت صاحبہ

آپ نے اپنا کوئی فرضی نام نہیں لکھا اور نہ ہی یہ لکھا ہے کہ آپ کا
خط شائع کیا جائے یا نہیں۔ ایسی صورت میں فیصلہ مجھے ہی کرنا تھا۔ بی بی آپ
کالم میں خواہ آپ کے مسئلے پر کتنی ہی روشنی ڈالی جائے تاہم آپ کے مسئلے کا حل
تک صاف گوئی سے کام لے کر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود بھی چند
اور سوالات کرنے ہوں گے۔ دیکھئے گندگی کے احساس سے ان حالات اپنے
ہاتھ اور کپڑے صاف دھوتے رہنا ایک عام سا نفسیاتی مرض ہے اور اس سے ہم
لوگوں کو آئے دن سابقہ پڑتا رہتا ہے یعنی ایسے مریضوں سے۔

عموماً ناپاکی اور گندگی کا یہ احساس بچپن کے کسی دھچکے یعنی TRAUMA
سے ہو سکتا ہے۔ آپ یقیناً تین سے چھ برس کی عمر میں کسی ایسے حادثے یا دھچکے
کا شکار ہوئی ہیں جو آپ کے ذہن پر شدید قسم کا احساس گناہ اور احساس جرم
کا نقش چھوڑ گیا ہے۔ دراصل ایسے لوگ ناپاک چیز کو صاف کرنے میں مصروف
نہیں رہتے بلکہ وہ اپنے لاشعور میں چھپے ہوئے اس احساس گناہ کو بار بار دھونے
کی کوشش کرتے ہیں جو ان کے ذہن سے چپک سا گیا ہے۔

ایک طرف آپ کو ازدواجی تعلقات سے شدید نفرت ہے (احساس
غلاظت کی بنا پر) دوسری طرف جنسی نا آسودگی کا شدت سے احساس ابھرتا ہے
جنسی نا آسودگی کا احساس آپ کو بار بار صنف مخالف کی طرف چوری چوری
دیکھنے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ کشش جو آپ نے انتہائی کم سنی میں محسوس
کیا تھا جس کی بنا پر آپ TRAUMA کا شکار رہی ہیں اب لاشعور سے ابھر کر
شعور میں آنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ چنانچہ آپ کی نظریں بار بار اس شے
کی طرف اٹھ جاتی ہیں جو جنس کا محور ہے۔ اور ہو سکتا ہے آپ کے اندر دوانہ
حصے سے انتقامی کارروائی کا احساس بھی ہو اور آپ اسے دیکھ کر طنزیہ مسکرانے
پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ بہر حال آپ کے ذہن کی چھان پھٹک کرنے کے بعد ہی پتہ
چل سکتا ہے کہ آپ کے اندر کون سا احساس گناہ تڑپ رہا ہے۔

آپ میرے مندرجہ ذیل سوالات کا جواب دیں تو میں آگے بڑھ سکوں گا۔
(۱) کیا آپ کو ایام میں شدید تکلیف ہوتی ہے۔ (۲) کیا آپ کو اپنے
عورت ہونے پر بھی غصہ آتا ہے (۳) جب مرد و عورتوں کو دیکھتی ہیں تو
ذہن میں کیا خیالات آتے ہیں۔ کیا یہ خیالات شوہر سے بھی آتے ہیں
یا صرف دوسروں سے ہی وابستہ ہیں (۴) کیا آپ زندگی میں کبھی جنسی طور پر
آسودہ ہوئی ہیں ۔۔۔ اگر جواب نہیں میں ہے تو کیا آپ کو آسودگی کی خواہش
محسوس ہوتی ؟ (۵) کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپ کے شوہر آپ سے جبر
کریں (۶) کیا انتہائی بچپن میں آپ نے کسی کو ازدواجی تعلقات میں یکجا
سے مگر دیکھا ہے تو اس کا رد عمل کیا تھا (۷) بچپن کا کوئی اہم واقعہ جو
آپ کے خیال میں آپ کی موجودہ زندگی سے وابستہ ہے (۸) آپ خواب
کس قسم کے دیکھتی ہیں۔

ان سوالات کے جوابات آنے پر ہی کچھ اور عرض کر سکوں گا۔

✻✻✻

کشف و کرامات اولیائے کرام کا خاصہ ہے۔ جو کبھی کبھی بزرگانِ دین کے مبارک توسط سے اللہ کے نیک بندوں کو اس کے لطف و کرم کے صدقے میں عطا ہوتا ہے۔

## بابا سید شان احمد صاحب

کا شمار بھی انہی برگزیدہ ہستیوں میں ہے جنہیں روحانی انعام و اکرام سے نوازا گیا اور اس کا منہ بولتا ثبوت حقیقتِ حال سے متعلق وہ اہم پیش گوئیاں ہیں جو بذریعہ کشف کُلی کی صورت میں ان پر ظاہر ہوتی رہیں۔ بابا جی شادی بیاہ، مقدمات، محبت میں کامیابی یا ناکامی، مالی مشکلات اور اولاد وغیرہ سے متعلق آپ کے سوالات کے جوابات بذریعہ کشف دینے پر رضامند ہو گئے ہیں اور وہ پلک جھپکتے میں آپ کے حال اور مستقبل کے تانے بانے میں جھانک کر فوراً خدا لگتی کہہ دیں گے۔ صرف ضرورت ہے اس نام کی جس سے آپ زیادہ پکارے اور پہچانے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ آپ کی والدہ محترمہ کا نام، عمر اور مقام پیدائش۔ آپ ایک وقت میں صرف دو سوال کر سکتے ہیں۔ جوابات کے لیے جوابی لفافہ بھیجنا ضروری ہے۔ بابا جی کے جوابات کا کوئی نذرانہ نہیں ہے۔ صرف انہی سوالات کے جوابات دیئے جائیں گے جن کے ساتھ "روحانی ڈاک" کا کوپن ہوگا۔

نام ---------- والدہ کا نام ----------
مقام پیدائش ---------- عمر ----------
مکمل پتہ ----------
----------

خط لکھنے کا پتہ۔
روحانی ڈاک
ماہنامہ "دوشیزہ" پوسٹ بکس ۵۸۸
کراچی ۳۹

# لڑکیو!

لڑکیوں کے نام تو پیارے ہیں
لیکن صورتوں پر حسرتیں ہیں
ان کی آنکھوں میں کتنی گہرائی ہے
لیکن یہ گہرائی فقط تنہائی ہے
اور ان کے ہونٹوں پر جو روشن ہے
وہ پپڑایا ہوا تبسم چھپانے کا جتن ہے

لڑکیو!
تم نوجواں ہو
اور شادابی کی اک ایسی علامت ہو
جو مٹ جائے تو پوری کائنات اک ایسے سناٹے میں گھر جائے
فرشتوں کو بھی جس میں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہو۔

تمہیں کیا ہو گیا ہے لڑکیو!
بے بات کی باتوں پہ ہنس دینے کی عادت کیوں گنوا بیٹھی ہو؟
پھولوں کو ہوا سے توڑ کے
اور بے خیالی میں مسل دینے کی عادت کیوں بھلا بیٹھی ہو؟

تم کس سوچ میں گم ہو؟
مسلسل سوچتی اور اپنی سوچوں سے ہراساں لڑکیو!
اک پل ادھر آؤ
مری آنکھوں سے اس دنیا کو دیکھو
پھر جو چاہو تو چلی جانا

زمیں بھیگی ہوئی ہے
آسماں نیلا ہے
سرخ اور سبز رنگت کے پرندے اڑ رہے ہیں
جھاڑیاں پھولوں سے لد کر جھومتی ہیں
تیز جھونکے سربلند اشجار کے پتوں کو چھو کر گنگناتے ہیں
تڑپتے ہنستے ہنستے لوٹ جاتے ہیں

ابھی کچھ وقت ہے
سورج کے ڈھلنے میں ابھی دو چار پل
دو چار صدیاں
اب بھی باقی ہیں

میں ابھی بستر میں ہی تھا کہ کمرے کے باہر سے کچھ آہٹ ہوئی، پھر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اپنے بازو کی طرف دیکھا۔ نسیم غالباً بہت سویرے اٹھ گئی تھی اور اب غسل خانے میں تھی، مجبوراً مجھی کو اٹھنا پڑا۔ دروازے پر ایک کم عمر نوجوان بلکہ لڑکا کھڑا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی یہ کون ہے۔ پھر بھی میں نے اس کو اندر بلا لیا اور سگریٹ پیش کرتے ہوئے اس کی آمد کا مقصد پوچھ لیا۔

وہ کچھ پریشان سا تھا اور سگریٹ قبول کرتے ہوئے بھی ہچکچا رہا تھا۔ اس کی گھبراہٹ سے مجھے یہ تو لگ گیا کہ پوری طرح اس کو جانچ نہ سکوں۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ بیس بائیس برس کی رہی ہوگی، چہرہ بہت ہی دلکش بلکہ بہت ہی خوبصورت تھا۔ اس کے کوٹ پر ٹائی نہیں لگی ہوئی تھی بلکہ گردن میں اونی مفلر اس طرح لپٹا ہوا تھا کہ جیسے وہ ابھی کھیل کے میدان سے لوٹا تھا۔

"میرا نام شکر ہے۔ مجھے شکر۔" وہ کچھ کچھ شرمندہ اور گھبرایا ہوا تھا۔

میں نے کہا، بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر، آپ چائے پئیں گے یا کافی ....؟"

مگر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کسی بچے کو شرارت کرتے ہوئے پکڑ لیا گیا ہو۔ وہ نسیمہ کو دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ میں نے جب نسیمہ کو دیکھا تو چند ساعتوں کے لیے سب کچھ بھول گیا۔ وہ بہت ہی خوبصورت تھی، مگر اس وقت نہانے کے بعد بلا میک اپ کے بیٹھی چیئر میں ڈریس میں وہ بالکل سامانِ آرائش کی دکانوں کا ماڈل معلوم ہو رہی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر تیوریاں دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ ایک اجنبی کو اپنے کمرے میں دیکھ کر اسے غصہ آ گیا تھا۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ سارے کمرے میں تمام سامان انتہائی بے ترتیبی سے بکھرا پڑا تھا۔

"میں چلتا ہوں، پھر آپ سے ملوں گا ——" وہ انگریزی ہی میں بہت ہی گھبراہٹ میں یہ کہہ کر چلا بنا اور میں صرف دروازے کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔

"یہ کون تھا، کیوں آیا تھا؟" اپنی خفگی چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے نسیمہ نے پوچھا۔ مگر میں نے اپنی لاعلمی اور حیرت کا اظہار کیا۔

"بدمعاش ہے، کل رات کو ڈائننگ ہال میں برابر مجھ کو گھور رہا تھا اور صبح بھی اس نے گولف کلب سے ہوٹل تک میرا پیچھا کیا۔"

"مبارک ہو، آپ کے عشاق یہاں بھی آ پہنچے، مگر بھئی میں کسی سے خواہ مخواہ کی ڈوئیل لڑنے کو تیار نہیں ہوں۔"

"میں خود ہی صورتِ حال سے نپٹ لوں گی۔" وہ بدستور خفگی سے بولی۔

جب ہم اپنے کمرے سے نیچے آئے اور ڈائننگ ہال میں ناشتے کی میز پر بیٹھے تو نسیمہ توسے کی ٹکڑی پر ہاتھ صاف کر چکی تھی۔ میں بھی بظاہر لاپرواہی سے سگریٹ پینے میں مشغول تھا، مگر میرا خیال برابر اس خوبصورت لڑکے کی طرف ہی تھا۔ مگر نسیمہ کا کہنا ٹھیک تھا کہ وہ بدمعاش ہے تو آنا بھا اور کبھی بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میرے کمرے میں مجھ سے ملاقات کرنے آ پہنچے۔ ویسے اس کے چہرے سے شرافت برستی تھی اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس کا تعلق کسی بڑے گھرانے سے ہے۔

جب ہم گھوڑوں پر سوار ہو کر کھلن مرگ کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو مجھے اس کی ایک جھلک پھر دکھائی دی۔ وہ نیچے گولف کورس کی طرف سے مڑ کر بالا جانے والی سڑک کی طرف دھیرے دھیرے جا رہا تھا۔

دن بھر کی تفریحات اور برف پوش پہاڑیوں کے دامن میں گھومتے ہوئے اور نسیمہ کے ساتھ شادی سے پہلے کی باتیں کرتے ہوئے مجھے اس کا بالکل خیال نہ آیا۔ دن بھر کی تفریح سے نسیمہ بہت تھک گئی اور ہوٹل کے کمرے میں پہنچتے ہی وہ بستر پر گر کر ایسی بے سدھ لیٹی کہ ذرا ہی دیر میں سو گئی۔ میں نے اس کو جگانا مناسب نہ سمجھا اور کھانے کے لیے اکیلا ہی ڈائننگ ہال چل دیا۔ وہاں دو تین سیاح مل گئے اور میں ان سے دیر تک دنیا زمانے کی باتیں کرتا رہا۔ جب رش کچھ کم ہوا اور میں اکیلا کافی پینے کو رہ گیا تو جانے کہاں سے شکر میرے پاس آ گیا اور بغیر میری اجازت لیے میری ہی میز پر بیٹھ گیا۔ میں نے چاہا کہ کچھ بدمعاشی اور ترش روئی سے کام لوں مگر اس کا معصوم چہرہ دیکھ کر یہ خواہش ہوئی کہ اس سے باتیں کی جائیں۔

"آپ کی وائف کھانے پر نہیں آئیں؟" اس نے بچوں کی سی معصومیت سے پوچھا۔

"کیا آپ ان کو جانتے ہیں؟" بہت ہی بے اختیارانہ طور پر میرا لہجہ کچھ تیز ہو گیا۔

"نہیں، مگر میں ان کو بہت پسند کرتا ہوں۔" یہ جملہ بہت ہی حیا کے ساتھ اس نے انگریزی میں کہا۔

میں کچھ عجیب سناٹے میں آ گیا۔ اگر وہ اتنا دلکش، معصوم اور حیادار نہ ہوتا تو شاید اس وقت ڈائننگ ہال میں کوئی غیر خوشگوار واقعہ ہو جاتا، مگر اس کو میں خاموشی سے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ میرے ذہنی اضطراب اور غم و پیچ کا اندازہ لگاتا ہوا بولا: "اس کے لیے میں صبح آپ سے معافی مانگنے آیا تھا۔"

میں اب بھی کچھ نہ بولا۔ مجھے قتا کے ڈرامے اور موپاساں کی وہ کہانیاں یاد آنے لگیں جن میں کم عمر لڑکے بیاہتا عورتوں سے معاشقے کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ پڑھتے ہوئے مجھ کو بڑا مزا آتا تھا اور کبھی خود میں بھی تو مسز جلشی کے متعلق عجیب عجیب سے اینٹی ہیرو سے تصورات رکھتا تھا، مگر یہ سب وہ سب انگلینڈ اور فرانس کی باتیں ہیں اور میں نے تو مسز جلشی پر کبھی کچھ نہ ظاہر کیا۔ یہاں صاحبزادے کو کیا سوجھی کہ نہ صرف میری نئی نویلی بیوی کا پیچھا کریں بلکہ اس کے شوہر سے بھی یکایک اس خاکساری سے اپنے عشق کا اعتراف کرنے آ پہنچیں۔ "شوہر، بیوی" یہ الفاظ ذہن میں آتے ہی مجھ کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ ابھی چار پانچ مہینے قبل میں خود ایک طالب علم تھا اور شادی ہی کے سلسلے میں قانون کا امتحان چھوڑ گیا تھا اور نسیمہ —— نسیمہ تو اب بھی کسی اسکول یا کالج کی طالبہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس کو بیوی کہنا تو شاید غلط تھا۔ یہ سب باتیں میرے ذہن میں چند منٹوں کے اندر آئیں، اور وہ لڑکا میز پر سر جھکائے ہوئے کافی سیٹ سے کھیلتا رہا۔

"آپ کیا کرتے ہیں؟ کہیں پڑھتے وڑھتے ہیں؟" میں نے بات بدلنا چاہا۔

"نہیں، میں نے سینئر کیمبرج کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا۔ [illegible] ہوں، جلد ہی ٹریننگ پر چلا جاؤں گا۔ [illegible]

سے مطالبہ رہتی ہے جب کہ اس کو بقائے دوام ملنے والا ہو کہ کسی ہر عہد
اور ہر ملک و قوم میں تشنگی پر محیط رہتا ہے۔

میں ان باتوں کے بارے میں حال ہی میں خاصا شدت سے سوچنے لگا
ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھ کو حال ہی میں اپنے بیٹے خالد کے کئی خطوط ملے ہیں
جن میں اس نے مختلف طریقوں سے مجھ سے دنیا میں محبت کی ضرورت پر
بحث کی ہے۔ اس نے ایک خط میں لکھا ہے کہ "محبت ایک اہم سماجی ضرورت
ہے۔" میں نے سنجیدگی سے اس کی رائے سے اتفاق کیا ہے اور اکثر اوقات
ہم دونوں میں اختلاف رائے بھی رہا ہے۔

دفتر سے آتے ہی معلوم ہوا کہ خالد یہاں آگیا ہے اور ابھی نہا کر سویا
ہے۔ میں نے نسیم سے کچھ تفصیل پوچھنا چاہی مگر اس نے تشویش سے صرف
اتنا ہی کہا کہ "دو دن کی چھٹی لے کر آیا ہے۔ کچھ پریشان لگتا ہے۔"
نسیم کا خیال تھا کہ کالج میں کسی سے جھگڑا ہو گیا ہے یا کوئی پیسے کی
فوری ضرورت آپڑی ہے کہ خود مانگنے آگیا ہے۔ میں نے شرارت آمیز
لہجے میں کہا:

"معلوم ہوتا ہے صاحبزادے کو کسی سے عشق ہو گیا ہے۔"

وہ بڑبڑا کر بولی۔ "ہٹئے۔ آپ کو تو ایسی ہی سوجھتی ہے۔"

میں خالد کے کمرے میں گیا۔ وہ برابر آنکھیں کھولے چھت کو دیکھے
جا رہا تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا۔ "آگئے آپ۔" وہ کچھ شرمندہ شرمندہ سا
تھا۔ مگر میں نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ وہ باقاعدگی سے میرے
سوالوں کا جواب دیتا رہا۔

باتوں باتوں میں خود خالد ہی اصل موضوع کی طرف آگیا اور اس نے
بہت ہی بااعتماد اور سنجیدہ انداز میں کہا کہ وہ سحاب کے بغیر زندہ نہیں رہ
سکتا ——!

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر تم سحاب میں دلچسپی رکھتے ہو اور وہ بھی
تم سے متاثر ہے تو پھر تم میرے پاس کیوں آئے ہو۔ تم دونوں مل کر جو فیصلہ
کرلو گے وہ مجھ کو منظور ہے۔" مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ نسیم دروازے سے لگی
ہم دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔

"بات اتنی آسان نہیں ہے ——" خالد نے اصل مشکل کی
طرف مجھ کو متوجہ کرایا —— "اصل میں سحاب کا رویہ کچھ واضح نہیں ہے۔
میرے خیال میں وہ اپنے گھر والوں کے خلاف شاید نہ جا سکے اور اس کے گھر
والوں کی رائے اس سے شاید مختلف ہوگی۔"

"میں تمہارا مطلب سمجھ گیا مگر اس سلسلے میں میرا دلچسپی لینا قطعی مناسب
نہیں ہوگا۔ پہلی بات تو یہ کہ ہماری تمہاری بے تکلفی کچھ دوستوں جیسی ہے
دنیا والے وہ باپ بیٹوں میں اس طرح کی مناسبت اور بے تکلفی کو شاید کچھ
زیادہ اچھی نظر سے نہ دیکھیں ——"

"مگر ڈیڈی آپ تو دنیا والوں کو گولی مارنے کی تلقین کرتے ہیں۔"

"ہاں جہاں تک میری سوچ بچار اور رائے کا تعلق ہے دنیا والوں کے
بارے میں میرا رویہ یقیناً ایسا ہی رہتا ہے مگر یہ معاملہ ایسا ہے جس میں صرف
میری رائے کچھ زیادہ دور تک نہیں جا سکتی —— خیر چھوڑو ——
ان سحاب کے گھر والوں سے میری کچھ واقفیت نہیں ہے۔ جو کچھ تم نے بتایا
ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ خاصے پیسے والے ہیں اور اس کی بنا پر
کچھ خود دماغ لوگ ہیں۔ بہرحال اگر میں کسی ذریعے سے بات چیت کا کوئی سلسلہ
نکالوں تو اس کی نوعیت بڑی باضابطہ اور باقاعدہ ہوگی۔ اس صورت میں وہ
سوال اٹھیں گے جن کے جواب فی الحال میرے پاس نہیں ہیں۔ اول یہ کہ
لڑکے کی عمر یعنی تمہاری عمر صرف بیس برس ہے۔ اس قدر کم عمری میں شادی
کی عجلت کا کیا جواز ہے۔ دوسری بات اس سلسلے میں یہ اٹھے گی کہ تم ابھی پڑھ
رہے ہو۔ تعلیم مکمل کئے بغیر شادی کی کیا تک۔ یہ وہ نازک سے نکتے ہیں کہ میں
لوگوں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دوں کہ گھر میں اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ یہاں اللہ
کا دیا اول تو کچھ ہے نہیں اور اگر ہو بھی تو لوگ آج کل لڑکی دیتے وقت لڑکے
کے گھر والوں کی حیثیت نہیں بلکہ خود لڑکے کا مستقبل دیکھتے ہیں۔ مگر تمہارا خیال
فارن سروس میں جانے کا ہے جس کے لئے تم شروع ہی سے کہتے رہے ہو تو
تم کو کچھ ضرورت سے زیادہ محنت کرنا ہوگی۔ اگر تم نے شادی کر بھی لی تو ایسی
صورت میں تمہارا فارن سروس کا خیال تشنۂ تکمیل رہے گا کیونکہ شادی اور
اس کی ذمہ داریاں تم کو مقابلے کی تیاری کا وقت ہی نہ دیں گی۔ یہ بات میں
صاف صاف نہ صرف ایک دوست اور ایک باپ کی حیثیت سے کہہ رہا
ہوں بلکہ ایسا کہتے ہوئے میرے سامنے خود سحاب کی خوشی و مسرت کا بھی
سوال ہے۔ تم یہ فرض کر سکتے ہو کہ یہی باتیں کسی لڑکی کا باپ بھی کہہ سکتا ہے۔"

خالد چپ رہا جس سے مجھے یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ میری رائے سے
اتفاق کر رہا ہے یا اختلاف۔

"مگر پھر بھی جذبات کی [illegible] ——" میں
نے پھر کہنا شروع کیا۔ "ان [illegible]
شادی کر لینے پر رضامند کر دو۔ اگر [illegible] آجائے تو
میں بصد شوق تم دونوں کا استقبال کروں گا۔ اس صورت میں وہ تمام
مشکلیں جو میں نے دلائل کی شکل میں تمہارے سامنے پیش کی ہیں خود بخود حل
ہو جائیں گی۔"

خالد نے شک کی نظر سے چونکا اور حیرت سے بولا:

"ڈیڈی —— آپ ——"

"ہاں ہاں میں ——" میں نے [illegible]

احساس رہا ہوں کہ تم سحاب کو بتا دو پھر بھی باقاعدہ کچہری میں مقدمے کے لیے بھی تیار رہوں گا ——"

خالد سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے چہرے پر بڑی شرارت آمیز مسکراہٹ پھیلی اور اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے پھر سنجیدگی سے کہا: ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے —— محبت اور جنگ میں سب کچھ روا ہے ——"

خالد میری باتوں سے خوش ہو گیا۔ اسے کامیابی کا کچھ کچھ یقین پیدا ہو چلا تھا۔ اس نے پوری دلچسپی سے رات کا کھانا کھایا اور صبح سویرے ہی گاڑی سے واپس یونیورسٹی کے لیے چل دیا۔

نسیم بظاہر میری باتوں سے ناراض تھی لیکن خالد کو خوش دیکھ کر وہ بھی مطمئن ہو گئی۔ صرف میرے دل میں چھپا تھا۔ معلوم کیوں دل آپ ہی آپ بیٹھا جا رہا تھا۔

درمیانی مدت میں وہی سب کچھ ہوا جو ہر دور، ہر زمانے میں اور ہر ملک میں اور ہر قوم میں ہوتا آیا ہے۔ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی مگر خالد کے لیے مزید جیسے زمین آسمان کے نظام میں زبردست فرق پڑ گیا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک متوسط درجے کے نوکری پیشہ باپ کے لڑکے خالد میں سحاب کو کچھ زیادہ کشش نظر آئی وہ کسی اور متمول ہم جماعت کی طرف متوجہ ہو گئی۔ خالد نے مجھے لکھا ——

"قمر یار —— کسی ریاست کے معزول والی کا لڑکا ہے۔ یہ والی یہاں سیاسی پناہ گزین ہے۔ والی صاحب کے پاس اتنے قیمتی جواہرات اور نایاب پتھر ہیں کہ ان سے میرے جیسے کتنوں کو خرید کر غلاموں کی ایک پوری فوج تیار کی جا سکتی ہے۔"

امتحان کے دنوں میں وہ دل شکستگی کے ساتھ تھکا تھکا سا واپس گھر آ گیا۔ میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ امتحان میں شرکت کے لیے بھی زور نہیں دیا بلکہ رات کو اپنے ساتھ اس کو ایک پرانی تاریخی فلم دکھانے لے گیا۔ واپسی پر رات گئے تک دنیا زمانے کی باتیں کرتے ہوئے میں نے اس کو اپنی نظروں میں بڑھائی —— "یہ عورتیں فانی ہیں۔ ان کا حسن فانی ہے۔ چند سالوں کے بعد تم سحاب کی طرف نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کرو گے اور تم کو یہ احساس ہوگا کہ ایک زندگی جو تم کو صرف ایک ہی بار صرف اپنے طور پر گزارنے کے لیے دی گئی تھی تم نے کس غلط فہمی کی نذر کر دی۔" اور پھر میں نے باتوں باتوں میں اس کو پلا بڑھنے کا ایک پرانا گھریلو قصہ بھی سنا دیا۔ مجھ کو اس کی فکر نہیں تھی کہ نسیم حسب عادت کمرے کے دروازے سے لگی ہماری باتیں سن رہی ہے۔

"وہ سحاب کی ماں تھی؟" خالد نے حقارت اور اشتعال سے پوچھا۔

"نسیم —— تمہاری ماں ——" میں نے کہا

خالد دنگ رہ گیا۔ صرف اتنا ہوا کہ وہ پلنگ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا جیسے اس کو یقین نہ آ رہا ہو۔

اور اسی وقت نسیم اندر آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے آتے ہی خالد کو گلے لگا لیا۔ "میرے لال! میرے بیٹے!!" —— نسیم ایسے اس کو اپنی گود میں چھپائے لے رہی تھی جیسے کوئی ابھی خالد کو اس سے چھین لے جائے گا —— مگر خالد صرف ایک ہی بات پوچھ رہا تھا۔

"کیوں امی کیا یہ سچ ہے ——؟"

"ہاں" روتے ہوئے ہچکیوں کے بیچ میں نسیم نے کہا۔

دوسرے دن خالد ماں سے ملے بغیر واپس الٰہ آباد چلا گیا۔

نسیم خاموش خاموش ہر کمرے میں ٹہلتی رہتی ہے۔ سر دروازے سے اٹھا کر دریچے سے باہر خالی خالی نگاہوں سے نہ معلوم کیا تکتی رہتی ہے۔ ہماری بات چیت بند ہے جیسے ہم ایک دوسرے کے سامنے مجرم ہوں۔ اس کا خیال ہے کہ خالد کو میں نے ہمیشہ کے لیے اس سے برگشتہ کر دیا ہے۔ مگر مجھے صرف ایک ہی اطمینان ہے کہ میں نے وجہ شکر کہ ایک بار پھر کسی گھر کو خاک ہونے سے بچا لیا ہے۔

# کے ممبر ایک سو روپے دے کر دو سو روپے کے نقد نامے
## ——— حاصل کر سکتے ہیں ———!

دوشیزہ ادبی کلب کی ممبری فیس پانچ روپے فی کس ہے۔ ممبروں کے لیے یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ ان کے میٹریل کی تلاش میں عام قارئین کے خطوط کے مقابلہ میں انھیں ترجیح دی جائے گی اور ان کے خطوط پہلے شائع کیے جائیں گے۔ خط و کتابت میں اپنے ممبری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

### سنہری موقع:

۱۵ر جولائی سے ۱۵ اگست ۸۸ء کے دوران دوشیزہ ادبی کلب کے بننے والے ممبروں کے لیے، سنہری موقع فراہم کیا جا رہا ہے کہ انھی تاریخوں کے دوران "دوشیزہ ادبی کلب" سے سو روپے کے نقد نامے خریدنے والے ممبروں کو تاریخ خریداری سے ٹھیک ایک ماہ بعد سو روپے کے مزید نقد نامے مفت اس صورت میں دیے جائیں گے کہ خریدے ہوئے تمام نقد نامے دوشیزہ ادبی سیٹ نمبر ۱ اور ۲ کے مقابلہ میں استعمال کر لیے جائیں اور ایک ماہ بعد پچاس روپے کے نقد نامے مفت دیے جائیں گے جو تاریخ اجرا سے چار ماہ تک کارآمد رہیں گے۔

مفت ملنے والے نقد نامے کسی کو تحفے میں بھی دیے جا سکتے ہیں یا حسب خواہش فروخت بھی کیے جا سکتے ہیں۔

### آپ کو کیا کرنا ہے:

دوشیزہ ادبی کلب کی پانچ روپے ممبری فیس کے ساتھ سو روپے سیکرٹری دوشیزہ ادبی کلب ماہنامہ دوشیزہ علامہ اقبال روڈ پی ای سی ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹ کے نام اپنے مکمل پتے کے ساتھ بھیج دیجیے۔ ڈرافٹ سے یہ رقم بھیجنی ہو تو کسی بینک کراچی کے لیے دوشیزہ پبلی کیشنز کے نام ڈرافٹ بنوا کر ارسال کر دیجیے۔ دفتر دوشیزہ میں ذاتی طور سے بھی پانچ روپے ممبری فیس کے ساتھ سو روپے جمع کرا کے دوشیزہ ادبی سیٹوں کے نقد نامے خریدے جا سکتے ہیں۔

آپ کی ممبری فیس اور سو روپے جمع ہوتے ہی ہم آپ کو دوشیزہ ادبی کلب کا ممبر بنا کر ممبری کی رسید اور سو روپے کے نقد نامے بھیج دیں گے اور جس تاریخ کو سو روپے کے نقد نامے خریدے جائیں گے اس کے ٹھیک ایک ماہ بعد مذکورہ شرائط کے مطابق پچاس روپے یا سو روپے کے نقد نامے بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ روانہ کر دیے جائیں گے۔ دوشیزہ ادبی کلب کے ممبروں کو کسی سو روپے سے زیادہ نقد نامے نہیں دیے جائیں گے۔

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۴۳

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ
لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور
ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجئے۔ میں آپ
کے ہر فیصلے کی پابند رہوں گا/گی۔

نام ________________

مقام و پتہ ________________

________________

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۴۳

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ
لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور
ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجئے۔ میں آپ
کے ہر فیصلے کی پابند رہوں گا/گی۔

نام ________________

مقام و پتہ ________________

________________

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۴۳

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ
لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور
ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجئے۔ میں آپ
کے ہر فیصلے کی پابند رہوں گا/گی۔

نام ________________

مقام و پتہ ________________

________________

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۴۳

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ
لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور
ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجئے۔ میں آپ
کے ہر فیصلے کی پابند رہوں گا/گی۔

نام ________________

مقام و پتہ ________________

________________

# 52000.00 روپے کے انعامات کی شاندار تقسیم

## دوشیزہ ادبی معمہ ۱۲۱ کے چار اشارے ماہنامہ دوشیزہ کے ایک ہی شمارے سے لیے گئے

## چھبیس ہزار روپے کا پہلا انعام بالکل درست حل بھیجنے والے سات افراد کو ملے گا

ایک غلطی پر ۲۸ روپے ۸۷ پیسے

دو غلطیوں پر ۵ روپے ۱۲ پیسے

[illegible]

| نمبر شمار | نمبر حل | کتاب یا رسالہ | مصنف یا مترجم | صفحہ |
|---|---|---|---|---|
| ۱ | ددہم | ٹوٹے ہوئے تارے | کرشن چندر | ۹۲ |
| ۲ | تباہی | [illegible] | سید ابوالاعلیٰ مودودی | ۷۲ |
| ۳ | روشنی | بستر پر افسانے | پروفیسر [illegible] صدیقی | ۲۰۸ |
| ۴ | خدا | تذکرہ صوفیائے سندھ | اعجاز الحق قدوسی | ۱۷۷ |
| ۵ | مرعوب | تزک بابری | [illegible] | ۴۴ |
| ۶ | [illegible] | [illegible] | شاہ [illegible] الدین | ۲۹۳ |
| ۷ | قربان | مشاہیر کے رومان | [illegible] | ۲۳۹ |
| ۸ | بداخلاق | حاجی لق لق کے لطائف | حاجی لق لق | ۱۲۴ |
| ۹ | رخسار | ماہنامہ دوشیزہ نمبر [illegible] | فاطمہ ثریا | ۳۰ |

بالکل درست حل سات موصول ہوئے جن پر پہلا انعام

مبلغ چھبیس ہزار روپے

بحساب مبلغ تین ہزار سات سو چودہ روپے انتیس پیسے فی حل دیا جائے گا

۱۔ جناب ایم عثمان صاحب [illegible] پاکستان [illegible] کوئٹہ

۲۔ جناب ایم ایل اے صدیقی صاحب۔ [illegible] کراچی

۳۔ محترمہ مہر رضا صاحبہ۔ [illegible] روڈ، راولپنڈی کینٹ

۴۔ جناب احتشام حسین صاحب۔ ۲۵۰ [illegible] کراچی

۵۔ محترمہ رشیدہ پروین صاحبہ [illegible] حیدرآباد

۶۔ جناب [illegible] زیدی صاحب۔ [illegible]

۷۔ جناب عبدالقدوس چوہدری صاحب۔ [illegible] روڈ لاہور

ایک غلطی والے ۴۲۳ حل موصول ہوئے جن پر دوسرا انعام بارہ ہزار پانچ سو روپے بحساب مبلغ ۲۸ روپے ۸۷ پیسے فی حل دیا گیا

اور

دو غلطی والے ۲۰۵۱ حل موصول ہوئے جن پر تیسرا انعام دس ہزار پانچ سو روپے بحساب ۵ روپے ۱۲ پیسے فی حل دیا گیا

انعام یافتگان کی مکمل فہرست "تازیانہ" کراچی میں ملاحظہ کیجئے جو ۱۸ جولائی کو شائع ہو رہا ہے۔

## ڈاک سے ملنے والے حلوں پر تین ہزار روپے کا خصوصی انعام

بالکل درست حلوں میں سے، چار سو روپے ۔۔۔ ایم عثمان کوئٹہ۔ ایم ایل اے صدیقی کراچی۔ مہر رضا راولپنڈی۔ احتشام حسین کراچی

ایک غلطی والے حلوں میں سے، ڈھائی سو روپے ۔۔۔ عاصم حیدرآباد۔ ایم عثمان کوئٹہ۔ غلام محمد میانوالی

دو غلطی والے حلوں میں سے، ایک سو روپے ۔۔۔ امیر حسین جہلم۔ سردار احمد [illegible]۔ [illegible] گجرات۔ [illegible]

دوشیزہ

٦ کہاں کہاں جمع کرائے جاسکتے ہیں؟

دوشیزہ ادبی معموں کے شائقین کی سہولت کی خاطر دوسرے بلاد کراچی میں حسب ذیل سینٹر بنائے گئے ہیں، جہاں ادارہ کی طرف سے فراہم کئے گئے سبز رنگ کے سربند بکسوں میں جن پر "دوشیزہ ادبی معمے" لکھا ہوا ہے آپ حل ڈالے جاسکتے ہیں۔ مقررہ تاریخ اور وقت گزرنے کے بعد ان بکسوں میں حل ڈالنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ان مراکز سے نقد نامے اور خاکے بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

۱۔ قریشی بک اسٹال۔ عیدگاہ۔ ایم اے جناح روڈ۔
۲۔ ستار نیوز ایجنسی، پیر الٰہی بخش کالونی۔
۳۔ ایم ایس نیوز ایجنسی، پہلی چورنگی ناظم آباد
۵۔ کوہ نور بک اسٹال، لی مارکیٹ
۶۔ ہلال بک اسٹال اینڈ نیوز پیپر ایجنسی بس اسٹاپ، سنگی ٹیلر کالونی
۷۔ گل نیوز پیپر ایجنسی۔ کورنگی نمبر ۶
۸۔ ریاض بک سنٹر، نور مارکیٹ برکات حیدری۔ فون نمبر ۶۱۴۸۸۶
۹۔ مومن اسٹور۔ پاپوش نگر۔

---

## صرف نقد ناموں کے لیے

۱۔ حسن بک اسٹال۔ جیلا اسٹریٹ، سعید منزل
۲۔ میگزین بک اسٹال۔ لیاقت آباد نمبر ۱۰
۳۔ لائٹ آف پاکستان۔ برنس روڈ
۴۔ عزیز بک ڈپو، لیاقت آباد
۵۔ ایم، ڈبلیو نادر نیوز پیپر و بک اسٹال، میری ویدر ٹاور،

لاہور

میں نقد نامے، ٹوکن اور خاکے حاصل کرنے کے لیے

۱۔ رفیق نیوز ایجنسی، اخبار مارکیٹ ہسپتال روڈ فون نمبر ۵۸۲۴۹
۲۔ حامد برادرس، چوک دواری
۳۔ شیپ کارنر، ڈاٹسن مارکیٹ
۴۔ ڈی مورہ بک اسٹال۔ واقع ایم سی بلڈنگ مال روڈ،
۵۔ جہانگیر بک اسٹال نزد راحت بیکری لاہور چھاؤنی
۶۔ گلبرگ بک ہاؤس۔ برٹی مارکیٹ گلبرگ
۷۔ ہیپی بک اسٹال۔ مین مارکیٹ گلبرگ۔
۸۔ محبوب بک اسٹال۔ سمن آباد
۹۔ فاروق بک ہاؤس۔ فورٹریس اسٹیڈیم، لاہور چھاؤنی
۱۰۔ شمع بک ڈپو۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ نزد دفتر شمع لاہور

## پچھلے پرچوں کی زبردست مانگ

پچھلے چند دنوں سے ماہنامہ دوشیزہ کے سابقہ شماروں کی زبردست مانگ ہوگئی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دوشیزہ ادبی معمے نمبر ۱۲۱ کے چار اشکال دوشیزہ کے پچھلے ہی شماروں سے لیے گئے تھے

اگر آپ پچھلے ۱۷ شمارے منگوانا چاہیں تو آج ہی ترپن روپے (۵۳٫۰۰) کا منی آرڈر اور اپنا مکمل پتہ ارسال کیجئے۔

منیجر ماہنامہ دوشیزہ پوسٹ بکس ۵۵۵ کراچی ۲۹

# نیا سرف

## صابن سے کہیں زیادہ صاف دھوتا ہے

## فرق صاف ظاہر ہے!

نئے سرف سے صابن کے مقابلے
میں کہیں زیادہ صاف بالکفایت دھلائی

کراچی سے خیبر تک

# تازیانہ

کی دھوم مچ گئی

تازیانہ کس کو نہیں چاہیئے؟

آپ کو بھی ، قوم کو بھی

تازہ نہ ملے تو کمر سہی

ہر تازیانہ اچھا لگے گا

۲۹

تازیانہ پوسٹ بکس ۸۰۹۵ کراچی

صادق میرے شوہر کے ایک دور کے رشتہ دار تھے۔ سنتے ہیں جوانی میں یہ بہت وجیہ آدمی تھے۔ سرحد کے لوگ تو ویسے ہی اپنے ڈیل ڈول اور سرخ و سپید رنگت سے دور سے پہچانے جاتے ہیں لیکن صادق گاؤں بھر میں اپنی پرکشش شخصیت کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی مشہور تھے۔ جس گلی سے گزر جاتے لڑکیاں دروازے کی اوٹ سے جھانکتی رہ جاتیں۔ انھیں خود بھی احساس تھا کہ ان کی نیلگوں آنکھیں جس لڑکی کو ایک نظر مسکرا کر دیکھ لیں وہ مدتوں ان کی راہ میں کھڑی رہتی ہے۔ انھیں خود پر کچھ زیادہ ہی اعتماد ہو گیا تھا جس نے بڑھ کر غرور کی شکل اختیار کر لی۔ ان کا یہ عالم ہو گیا کہ اپنی ہی ذات میں گم رہنے لگے۔ لڑکیوں سے ان کا رویہ خاصا لاابالیانہ ہو گیا۔ کسی نے ہنس کر بات کرنا چاہی تو روکھے پن سے جھڑک دیا۔ اس بے نیازی کے باوجود گاؤں بھر کی لڑکیاں ان کی چاہت میں دیوانی ہوئی جاتی تھیں۔ کچھ لوگ اتنے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ چاہے وہ کسی سے پیار کریں نہ کریں مگر لوگ انھیں چاہتے ہیں۔ صادق انھی میں سے ایک تھا۔ گاؤں کے نوجوان رشک اور حسد کے باوجود محفل میں اس کی موجودگی کے خواہشمند رہتے تھے۔ بچے بوڑھے سبھی اس کے گرویدہ تھے۔ وہ کسی بت کی طرح دلوں میں پوجا جاتا تھا اور شاید اسی احساس نے اسے سب سے بیگانہ کر دیا تھا۔ والدین نے شادی کے لیے دباؤ ڈالا تو کہہ گیا کہ مجھے گاؤں کی کوئی لڑکی اچھی نہیں لگتی۔ کتنے ہی دل ٹوٹے، کتنی غزالی آنکھوں نے چھپ چھپ کر آنسو بہائے مگر صادق نے کسی کی پروا نہیں کی۔ اس کی چاہت میں چپکے چپکے پگھلنے والی لڑکیوں کے بیاہ ہو گئے۔ دو چار نے صادق کو حالِ دل سنانے کی کوشش کی مگر اس بت کافر نے ان سب کا دو ہی لفظوں میں دل توڑ دیا کہ مجھے جس لڑکی کی تلاش ہے وہ تم نہیں ہو۔

ایک دن شام کا وقت تھا۔ گاؤں میں کسی کی شادی تھی۔ صادق کو اس کے دوست گھسیٹ کر لے گئے وہ ان ہنگاموں سے دور دور رہتا تھا۔ دوستوں کے اصرار پر آ تو گیا مگر اس تلاش میں تھا کہ موقع ملے تو کھسک جائے۔ اتفاق سے باراتیوں میں سے کسی کا بچہ سیڑھیوں سے گر گیا۔ افراتفری سی پھیل گئی۔ صادق نے موقع غنیمت جانا اور چپکے سے کھسک کر باہر جانے لگا۔ جیسے ہی دروازے سے نکلتے ہی اچانک کسی سے ٹکرا گیا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو جیسے آنکھوں میں بجلی سی کوند گئی۔ سرخ اور سنہرے گوٹے کناری کے کپڑوں میں یہ کوئی لڑکی تھی یا آسمانی حور جو تمتماتے چہرے سے گھور رہی تھی۔ مہندی رچے گورے گورے ہاتھوں سے ماتھے کی چوٹ سہلاتی ہوئی جب واپس مڑنے لگی تب صادق کو ہوش آیا کہ اگر یہ چاند بادلوں میں چھپ گیا تو شاید اس کی زندگی میں عمر بھر کے لیے اندھیرا ہو جائے گا لپک کر آگے بڑھا اور تیز تیز قدموں سے بھاگتی لڑکی کا آنچل پکڑ لیا۔ بے تابی سے بولا

برابر والے کمروں سے لیلیٰ رخصت نہ ہو جائے اس کا لال اسی طرح گہری نیند سوتا رہے۔

ادھر لیلیٰ کی بارات آئی۔ نکاح کی تیاریاں شروع ہونے لگیں اور عین ممکن تھا کہ نکاح شروع ہو جاتا کہ ایک باراتی نے پکتے کھانے میں سے ایک پلیٹ چاول نکال کر اپنے بچے کو دے دیئے لیلیٰ کے باپ نے یہ حرکت دیکھ کر برا منایا کہ ابھی نکاح ہوا نہیں ہے دیگ کو ہاتھ کیوں لگایا۔ چاول نکالنے والا دولہا کا بہنوئی تھا۔ وہ تیز مزاج آدمی تھا۔ بدتمیزی پر اتر آیا۔ بات بڑھ گئی۔ باراتیوں نے اسے اپنی بے عزتی سمجھا اور دولہا کا بہنوئی تو اس قدر بھڑک کر بھری محفل میں چلانے لگا۔ بولا اگر یہ شادی ہوئی تو میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں گا۔ بات اور زیادہ بگڑ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس جھگڑے نے زیادہ تلخ صورت اختیار کر لی اور لیلیٰ کے باپ نے بارات واپس جانے کا حکم دے ڈالا بارات چلی گئی۔ دیگیں جوں کی توں پڑی رہ گئیں اب یہ سوال اٹھا کہ شادی اسی وقت ہوگی مگر کس سے؟ کسی نے چپکے سے لال صادق کا نام لے دیا۔ جیتی کا معاملہ تھا۔ لیلیٰ کا باپ خود لال صادق کے گھر آیا کہ اپنے بیٹے کو دولہا بنا کر ہمارے ساتھ بھیج دو، قدرت کو میری بیٹی کا ہاتھ اسی کے ہاتھ میں دینا منظور تھا۔ لال صادق کو سوتے سے اٹھایا گیا۔ وہ کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا، سبھوں نے پکڑ کر اسے دولہا بنا ڈالا اور اسی وقت برات دھوم دھام سے لیلیٰ کے گھر چلی آئی، نکاح ہوا، رخصتی ہوئی اور مبارک سلامت کے شور میں لیلیٰ صادق کی دلہن بن کر اس کے گھر آگئی یہاں تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوا۔ پیر بابا نے اپنی دعاؤں سے لال صادق کی تقدیر بدل دی لیکن وہ جو کچھ کہہ رہے تھے غلط نہیں تھا۔ لیلیٰ بڑی تیز مزاج عورت نکلی۔ شادی کے کچھ دنوں بعد ہی میاں بیوی میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ دونوں کی آپس میں کبھی نہیں بنی، لال صادق کی زندگی تلخیوں کی نذر ہو گئی مگر اس شخص نے پھر بھی لیلیٰ سے نباہ کیا۔ ان کا سارا وقت کھیتوں میں گنے پیلنے کی مشین پر گزرا کرتا تھا بہت کم گھر جاتا تھا۔ اب تو ان دونوں کو مرے مدت ہو گئی ہے مگر لوگ اب بھی ان دونوں کے جنون خیز عشق کی کہانیاں مزے لے لے کر دہراتے ہیں۔

شمر بانو سحر۔ پشاور

---

## آپ کی [illegible] زندگی جو سنئے

میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں خود شریف عورت ہوں۔ پڑھی لکھی ہوتی تو کہیں ملازمت کر کے ان حالات سے نجات حاصل کر لیتی جو مجھ پر مسلط کئے گئے ہیں۔ ہنر بھی کوئی نہیں آتا جس کے سہارے اپنی مرضی کی زندگی بسر کرتی اور پھر جسم بیچنے کے لئے ذہن و دل تیار نہیں ہوتے کیونکہ میری ماں نے مجھے گناہ و ثواب کے اصول سکھا کر بچپن سے ڈرا دیا تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتی تو شاید میں یہ عجیب و غریب دھندہ چھوڑ دیتی جس نے میری شخصیت ہی بدل دی ہے۔ میرے اس دھندے کے متعلق تجسس نہ ہو لیں میں سب کچھ بتائے دیتی ہوں کہ ایک عورت جو ایک مالدار شوہر کی بیوی ہے اپنی ازدواجی زندگی کو بچانے کے لئے کیسی کیسی قربانیاں دے رہی ہے۔ اپنی ماں کی میں واحد اولاد ہوں۔ ابا کے متعلق اس لئے نہیں کہتی کہ اس نے میری ماں کو چھوڑ کر دوسرا بیاہ کر لیا تھا اس کے اور بچے ہوئے ہوں گے اس کا علم نہیں کیونکہ وہ پھر اماں سے نہیں ملے اماں دنیا کے ہزاروں لوگوں کی طرح لاوارث تھیں۔ انہوں نے میری پرورش محنت مزدوری سے کی۔ باپ کے نہ ہونے سے ہمارا سماجی رتبہ صفر کے برابر تھا جس کا احساس مجھے شروع سے تھا۔ اماں تنہائی میں اکثر رویا کرتیں۔ مجھے سمجھاتی تھیں کہ بغیر مرد کے عورت کی زندگی کچھ نہیں۔ میں نے خود سری میں تیرے باپ سے علیحدگی کر لی۔ اگر تیرے باپ کی کچھ ضدیں پوری کر دیتی تو وہ مجھ پر کبھی سوکن نہ لاتا اور نہ مجھے چھوڑتا۔ اب اللہ جانے ابا ان سے کس نوعیت کی ضدیں پوری کرانا چاہتے تھے جو اماں نے خود سری میں پوری نہ کیں اور ابا کو اپنی تسکین کے لئے دوسری عورت لانا پڑی۔ میں ان باتوں کی تہہ میں کبھی نہیں گئی۔ بس اماں کو روتا دیکھ کر سوچا کرتی کہ مرد کے لامحدود اختیارات ہیں جو وہ کہتا ہے اسے مان لینا چاہیئے ورنہ اماں کی طرح روتے دھوتے زندگی بسر ہوگی۔ اس وقت ذہن چھوٹا تھا۔ زندگی اور اس کے ظالم تقاضے میری سمجھ سے بالاتر تھے۔ بڑی ہوئی تو غصہ آیا کہ اماں نے دوسرا بیاہ کیوں نہیں کر لیا۔ ایک دن اماں سے پوچھ ڈالا۔ کہنے لگیں لاوارث عورت کو داشتہ تو سب بنانا چاہتے ہیں مگر بیوی بنانے والا کوئی نہیں ملتا۔ تیرا باپ اچھی پوزیشن کا آدمی تھا۔ اور میرے سامنے تیری زندگی تھی کہ میری تو جیسے گزری جائے گی میرا کوئی اقدام تیری زندگی برباد کر دے تب میں اپنی ماں کی عظمت

میرا خیال ہے اس کی ہڈیاں چبانے میں دقت پیش آئے گی

کہ یونس اگر میں آپ کو اچھی نہیں لگتی تو مجھے بتادو تاکہ اپنے بارے میں میں واضح طور پر کچھ سوچ سکوں۔ اس پر وہ سنجیدہ ہو گئے، کہنے لگے تم ایک اچھی بیوی ہو، وفا شعار اور محبت کرنے والی عورت ہو مگر میں تمہیں اپنی اس کمزوری سے بے خبر نہیں رکھنا چاہتا کہ مجھے ورائٹی چاہئے ایک عورت مجھے مطمئن نہیں کر سکتی، میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تمہارے قانونی حقوق پامال کر دوں یا تمہیں دھوکہ دوں۔ تمہیں پانچ چار سال مجبور بنا کر رکھا اب تم میرے بچوں کی ماں ہو اس لئے کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے تم سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں، مجھے تم دوسری عورت گھر میں لانے کی اجازت دے سکتی ہو۔"

میں یونس سے اتنی صاف گوئی کی متوقع نہیں تھی کھڑی کی کھڑی رہ گئی مگر یونس نے مجھے مجبور کیا کہ میں اس معاملے میں چپ نہ رہوں حقیقت پسندی سے اعتراف کر لوں کہ میں کس حد تک برداشت کر سکتی ہوں۔ میں سوکن کے خیال کو اپنے قانونی اور ذہنی حقوق کی پامالی سمجھتی تھی۔ یہ میرا گھر تھا اس میں کوئی دوسری عورت مستقل طور پر کیوں آئے میں نے ان سے کہہ دیا کہ آپ کی دوسری شادی میری خوشیوں اور سکون کی موت ہوگی۔ اس جواب پر وہ مسکرائے، کہنے لگے "یہ بات میں جانتا ہوں کہ تم ایسا ہونے سے مرنا بہتر سمجھو گی۔ تب میری دوسری تجویز یہ ہے کہ تم اس بات سے سمجھوتہ کر لو کہ میں تھوڑی بہت آوارگی کر لوں اور اب میرے اور تمہارے درمیان صرف ایک معاہدہ یہ ہو سکتا ہے کہ تم میرے ساتھ تعاون کرو۔ دوسرے لفظوں میں تم مہینے میں ایک دو دفعہ کہیں نہ کہیں سے میرے لئے عورت لاؤ، صرف بستر کے لئے۔ میرے دل میں اور گھر میں صرف تم رہو گی تم دیکھنا کہ اس کے بعد میں کوٹھوں پر اپنی کمائی لٹانا چھوڑ دوں گا مہینے میں صرف ایک یا دو بار، اور بس۔"

کتنی عجیب خواہش تھی میرے مجازی خدا کی۔ اور کتنی عجیب شرط رکھی تھی انھوں نے سوکن نہ لانے اور کوٹھے بازی سے تائب ہونے

کی قائل ہو گئی کہ اس نے سلمان کی خاطر بہت بڑی قربانی دی اور اس کا پھل اسے اسی صورت میں ملا کہ ایک شریف آدمی کی کوشش سے میرا رشتہ اچھی جگہ طے ہو گیا۔ ہمارے یہاں اچھے رشتے سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ گھر ہو کاروبار اچھا ہو اور بس۔ انھی بنیادوں پر میرا رشتہ طے ہوا۔ میرے ابا کا انتقال ہو چکا تھا ورنہ اماں کا خیال تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی خود طے کرنے آتے گا، سوتیلے بہن بھائیوں کی شکلیں تک نہیں دیکھی تھیں ان سے یہ توقع کرنا فضول تھا کہ ان میں کوئی شادی کے موقع پر آئے۔ اماں اس رشتے پر نازاں تھیں کہ ان کی بیٹی ایک اچھے شخص کو بیاہی جا رہی تھی۔ میرے ہونے والے شوہر کی کھلونوں کی دکان تھی۔ ساس سسر مر چکے تھے، کوئی اور بہن بھائی بھی نہیں تھا شاید اسی وجہ سے ان کی شادی دیر سے طے ہو رہی تھی۔ مختصر یہ کہ میری شادی ہو گئی۔ اماں کو بھی میرے شوہر نے ساتھ رکھا تھا ہر قسم کا سکھ دیا کھانا پینا لاکھوں سے بہتر، محبت بھی خوب کرتے تھے۔ دکھ صرف اتنا تھا کہ اولاد کی انہیں خواہش نہیں تھی کہتے تھے اس سے عورت کا جسم خراب ہو جاتا ہے۔ کم از کم آٹھ دس سال میں تمہیں ماں نہیں بننے دوں گا۔

عجیب خواہش تھی مگر اماں نے مجھے بچپن سے پڑھایا ہوا تھا کہ مرد حاکم ہے اس کی مانتے رہو وہ خوش رہتا ہے اس کے حکم کی سرتابی کرو تو سزا دیتا ہے۔ میں نے چھ سال ان کی خواہش پر یوں ہی گزار دیے اماں کا اس دوران انتقال ہو گیا، اب مجھے تنہائی بہت ستاتی تھی، کاروبار بڑھ گیا تھا۔ میرے شوہر کی مصروفیات بھی بڑھ گئی تھیں ان کی عیاشیاں بھی کھل کر سامنے آنے لگیں یہ تو میں شادی کے کچھ دنوں بعد ہی جان گئی تھی کہ وہ عاشق مزاج ہیں مگر یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس حد تک عیاش ہو جائیں گے کہ راتوں کو بھی گھر نہ آئیں۔ میں نے روٹھا دھونا کیا تو قسمیں کھاتے کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ کچھ دن اچھے گزرتے پھر وہی دھندا شروع ہو جاتا۔ طوائفوں کے کوٹھوں پر راتیں گزار کر آتے تو ساری جیبیں خالی ہو چکی ہوتیں ظاہر ہے اس طرح کاروبار سارا خراب ہونا تھا۔ میں نے ضد میں ان کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا کہ ماں نہ بنوں جس کے نتیجے میں میرے دو بچے ہو گئے۔ بڑا لڑکا اور چھوٹی لڑکی، اولاد کی محبت بڑی شے ہے یہی سوچ کر میں نے اپنی ذمہ داری میں اضافہ کیا تھا لیکن اسے شومئی قسمت کہئے کہ بیٹی کی پیدائش پر بیمار پڑ گئی، جسم پھیل گیا اور بقول ان کے میں جیسی مٹھائی ہی لگتی جو کبھی کبھی شوقیہ طور پر کھانے کو جی چاہتا ہے وہ مجھ سے جسمانی طور پر دور دور رہنے لگے تب میں ڈر گئی کہ کہیں میری ماں والا ڈرامہ دہرایا جائے کہ وہ مجھے چھوڑ کر نئی عورت لے آئیں۔ میں نے انہیں محبت سے سمجھایا

کی یہ عجیب و غریب شرط مجھ پر ہفتوں کی تکرار کے بعد مسلط کر دی گئی
اپنا ازدواجی سکون اور بچوں کی زندگیاں تباہ کرنے سے بہتر یہ تھا کہ
میں ان کی بات مان لوں کیونکہ انہیں چھوڑنا اس لئے ممکن نہیں کہ میں ان سے
محبت بھی کرتی ہوں، ان کے بچوں کی ماں بھی ہوں، اور پھر اتنی آسائشوں
کو کھو دینا بھی بلاشبہ آسان نہیں۔

اس روز کے بعد میں نے شوہر کی خوشنودی کے لئے یہ کام
شروع کر دیا۔ سوسائٹی میں گھومنے پھرنے والی لڑکیوں کی کمی نہیں
پہلے پہلے مجھے اس کام میں دقت ہوتی تھی مگر اب لڑکیاں خود چلی آتی
ہیں کبھی تھوڑی بہت محنت کرنا پڑتی ہے، سو یہ کام اس میں میرے
شوہر کی خوشی پوری ہو جاتی ہے۔ مجھے مہینے میں صرف دو چار گھنٹوں کے
لئے شوہر کی خلوت گاہ عارضی طور پر کسی غیر کے سپرد کرنا پڑتی ہے اور
بس باقی سب ٹھیک ہے۔ وہ قسمیں کھاتے ہیں کہ بیٹی دس سال کی
ہو جانے پر یہ کام ختم کر دوں گا خدا کرے وہ اپنے وعدے پر قائم رہیں
۔ تو تھک گئی لوگوں کی الٹی سیدھی باتیں سنتے ہوئے

رخشندہ شہزاد کراچی

میرے ساتھ جو لڑکا رہتا ہے وہ میرے دوستوں اور
ملنے جلنے والوں کے لئے ایک معمہ بنا ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ میرا
رشتہ دار لڑکا ہے جو یہیں پڑھائی کے سلسلے میں میرے پاس آیا ہوا
ہے لوگ میری اس بات پر یقین نہیں کرتے کیونکہ جب یہی سوال رفیق
سے کرتے ہیں تو وہ خود کو میرا ملازم بتاتا ہے۔ میں نے رفیق کو متعدد
بار سمجھایا ہے کہ تم اپنے آپ کو میرا نوکر مت سمجھا کرو مگر وہ میرے
سامنے سر جھکا کر خاموش ہو جاتا ہے اور اب لوگوں کے نزدیک اس سے
میرا تعلق کچھ مشکوک سا ہو چلا ہے اس لئے میرے لئے یہ ضروری ہو گیا
ہے کہ اس راز سے پردہ اٹھا دوں۔ فرداً فرداً سبھی کو یہ کہانی سنانے کی بجائے
کیا بہتر نہیں کہ میں ایک ہی نشست میں یہ داستان سنا ڈالوں اور مجھے
لوگوں کے اس چبھتے ہوئے سوال سے چھٹکارا مل جائے کہ رفیق سے میرا
کیا رشتہ ہے؟

بہت دن ہوئے جب میں میٹرک میں پڑھ رہا تھا۔ مجھے تعلیم کے
سلسلے میں اپنے گاؤں سے دور رہنا پڑا تھا۔ چھٹیوں میں آنا جانا ہوتا تھا۔ شہری
زندگی کی عادت پڑ چکی تھی۔ گاؤں کے سیدھے سادے لوگوں سے جی گھبراتا
تھا۔ چھٹیاں بڑی مشکل سے گزرتی تھیں میرے والد بڑے سخت گیر
طبیعت کے مالک تھے ان کا یہ حکم تھا کہ چھٹیاں کہیں اور نہیں گزارنا
میں سارا وقت بڑی اذیت اور بوریت سی محسوس کرتا رہتا اور جب میٹرک
کا امتحان دے کر گاؤں آیا تو دل میں ٹھان لیا تھا کہ چاہے اب کچھ بھی کہیں
میں اس دفعہ باہر جانے کی ضد ضرور کروں گا۔ یہاں آیا تو والد صاحب سے
بات کرنے کی ہمت نہیں پڑی اور اس کے کچھ روز بعد حالات ایسے ہو
گئے کہ میں نے یہ چھٹیاں گاؤں میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ یوں ہوا کہ ایک
روز امی نے مجھے اپنے ایک ملنے والوں کے یہاں کام سے بھیجا۔ اس سے
پہلے میرا ان لوگوں کے یہاں بہت کم آنا جانا تھا، ڈرتے جھجکتے کنڈی
بجائی تو ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکی نے دروازہ کھولا۔ گندمی رنگت کی یہ
لڑکی اس لمحے مجھے بہت اچھی لگی کھری کھری آنکھوں سے وہ کچھ دیر اجنبی
بنی مجھے دیکھتی رہی پھر اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے ہی سوال کیا کہ کیا
بات ہے؟ میں گھبرا سا گیا بولا "امی نے بھیجا ہے ماسی زہرہ سے انہیں
کام ہے بلایا ہے۔" اب وہ گھبرا گئی بولی "اندر آ جائیے ماسی سے خود بات
کر لیں۔" میں سحر زدہ سا اس متناسب اعضا والی لڑکی کے پیچھے
چلا آیا۔

یہ رضیہ سے میری پہلی ملاقات تھی مجھے اس کا نام بعد میں
معلوم ہوا اور یہ بھی امی کی زبانی پتہ چلا کہ ماسی زہرہ کی نند کی لڑکی ہے پہلی
بار اپنے ماموں کے گھر آئی ہے رحیم یار خاں میں اس کے والد کام کرتے
ہیں اس سے زیادہ مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی میں نے جاننے کی
کوشش کی مجھے پتہ نہیں یہ لڑکی کیوں بہت اچھی لگتی تھی اس کا چلنا اس
کا بولنا مجھے بہت پیارا لگتا تھا، آنکھوں میں بے پناہ اداسی تھی بات کرتے
کرتے کھو جانا پھر چونک اٹھنا یہ اتنی سادی سنجیدہ ادائیں اس نے جانے
کہاں سے سیکھ لی تھیں جو مجھ جیسے لڑکے کو اپنی طرف کھینچتی تھیں وہ اب
اکثر میری پھوپھی کے گھر آنے لگی تھی۔ میں صرف اسے دیکھنے کے لئے
ان کے یہاں جانے لگا تھا اور صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ کب مسکراتی
ہے۔ دیر تک بیٹھا رہتا تھا، وہ بہت کم ہنستی تھی لیکن جب کبھی کبھار
اس کے ہونٹ کھلکھلا اٹھتے تو ساری فضا میں تازگی اور مستی سی
تیرنے لگتی۔ شاید یہ میرا احساس تھا کہ وہ مونا لیزا کی طرح مسکراتی ہے۔
ہمارے یہاں پردے کی سخت پابندی ہے مگر سبھی میری شرافت
دیکھتے ہوئے مجھے اس سے بات کر لینے پر کبھی خفا نہیں ہوتی تھیں
اور میں نے فیصلہ کر ہی لیا کہ رزلٹ آنے تک میں یہیں رہوں گا یہ دیکھے

خوش ذوق فائر بریگیڈیر

کے لئے کر رہی تھی پھر مسکراتی ہے جیسے جیسے میں اس کے
قریب آ رہا تھا اپنی حیثیت سے واقف ہوں جو ہر ممکن طریقے سے میں اس
کی اداسی دور کرنا چاہتا تھا جس میں بڑی حد تک کامیابی ہو گئی اور اس نے مجھے بتا
ہی دیا کہ اسے کیا غم ہے وہ ایک جواری باپ کی بیٹی تھی۔ اس کی
ماں نے خودداری کی وجہ سے کبھی اپنے حالات کا کسی سے ذکر نہیں
کیا اور نہ ہی وہ گھر چھوڑا جو اس کا اپنا ہوتے ہوتے بھی اپنا نہیں تھا
رضیہ کے باپ نے اپنی زمین بیچ بیچ کر جوا کھیلا شراب پی، عورتوں
سے کھیل کھیلے۔ جب سب کچھ بک گیا تو گھر کے زیور برتن بھی ٹھکانے
لگنے لگے اور تب اس خوددار عورت نے اپنے دونوں بچوں کا پیٹ
پالنے کے لئے سلائی کڑھائی شروع کر دی، اس کی اپنی کمر جھکتی گئی
نظر ساتھ چھوڑتی گئی مگر اس نے کسی کو یہ خبر تک نہ ہونے دی کہ اس کے
گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی ہے آخر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ مکمل طور پر
بینائی کھو بیٹھی۔ ان حالات میں رضیہ بے حد حساس اور جذباتی ہو گئی تھی۔
ماں کے معذور ہونے پر اس نے گھر کی ذمہ داری سنبھال لی لیکن جواری
باپ نے مکان بھی جوئے کی نذر کر دیا اور خود چپکے سے بھاگ گیا نئے
مالک مکان نے انہیں دھکے دے کر نکال دیا اور اب اس کے سوا کوئی
چارہ نہیں تھا کہ وہ اپنے معذوروں بچوں کو لے کر [illegible] بھائی کے پاس
چلی آئے۔ سوتیلا بھائی تھا، زندگی میں ایک آدھ بار بھی اس کے
آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا لیکن اب حالات ایسے تھے کہ اسے اس کے
یہاں آنا پڑا۔ سر چھپانے کو جگہ مل گئی تھی لیکن آگے کیا ہو گا یہ خوف رضیہ
اور اس کی معذور ماں کے چہرے پر اداسی کی چھاپ بن کر چھایا ہوا تھا رضیہ
کو اپنے آپ سے زیادہ اپنے چھوٹے بھائی اور ماں کی فکر تھی اس نے چپکے
چپکے یہاں بھی سلائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ مجھے یہ سب باتیں رضیہ
نے اپنا ہمدرد پا کر بتائیں تو میں اس کی عظمت کا بھی گرویدہ ہو گیا۔ ساتھی سے
کہہ کر میں نے اسے سلائی کے لئے بہت سارے کپڑے دلوائے جو اس نے
بڑے شوق اور لگن سے سی کر دیئے۔ پیسے دیئے تو بگڑ گئی کہ اب
اپنوں سے بھی اجرت لوں گی اس کے بے لوث جذبے نے میرا دل اور
موہ لیا وہ سچ مچ میرا آئیڈیل تھی، محنتی، خوددار، حسین اور حساس
مجھ سے شرماتی بھی تھی مگر سب سے زیادہ قریب بھی سمجھتی تھی۔ اکثر ملتی
تو اپنے چھوٹے بھائی کی باتیں کرتی کہتی ہیں اسے آپ جیسا پڑھا لکھا
انسان بنانا چاہتی ہوں۔ مجھے ڈاکٹر بہت اچھے لگتے ہیں۔ آپ بھی
ڈاکٹری کر رہے تھے نا میں بھی کوشش کروں گی ڈاکٹری پڑھاؤں گی۔ میں اس کی
باتیں سن کر اس کے کردار کی گہرائیوں سے متاثر ہوتا چلا گیا۔ ڈگری
چھوڑنے کا اب بھی نہیں چاہتا تھا لیکن رزلٹ نکل آیا، مجھے کالج میں

دل مل گیا، شہر آنا پڑا اس نے جیسے تحمل سے مجھے رخصت کیا۔
تھی۔ "آپ سے جینے کا حوصلہ ملتا تھا" اب ایسا لگتا ہے جیسے میں
اکیلی رہ گئی ہوں۔" میں اسے کیا کہتا جبکہ میرا اپنا مستقبل ابھی واضح
نہ تھا۔ مجھے تعلیم مکمل کرنے میں ایک طویل مدت درکار تھی اس
دوران حالات اس سے کیا سلوک کریں، یہ سوچ کر حوصلہ ہار جاتا تھا
آیا تو پڑھائی اور دیگر سرگرمیوں نے جکڑ لیا۔ دو سال بعد ایف ایس
کے امتحانات کے بعد گھر گیا تو پتہ چلا رضیہ کی ماں فوت ہو چکی ہے۔
سوتیلی ماں نے رضیہ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ اس کے باپ
نے پتہ ڈھونڈ کر دونوں بہنوں بھائیوں کو زبردستی [illegible] بھیج دیا میری
آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ خدا جانے وہاں باپ اس کے ساتھ کیا سلوک
کرے اپنی مجبوری پر بھی رونا آیا کہ میں اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا
میرے والدین کو میرے احساسات کی خبر نہیں تھی۔ اگر انھیں علم ہو جاتا
تو شاید اس غریب کو گاؤں میں گھسنے نہ دیتے۔ رسوائی کے خوف سے
میں نے کبھی اسے خط تک نہیں لکھا تھا اور اب یہ کہاں سے خبر ملتی
کہ وہ کہاں ہے دل پر بوجھ لئے گاؤں سے چلا آیا۔

وقت گزرتا گیا، میں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی اس دوران گاؤں
آنا بہت کم ہوا۔ اس کے متعلق کسی سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی
یہ اعتراف ہے کہ میں بہت بزدل اور کم ہمت آدمی نکلا۔ اڑتے
اڑتے یہ بات کان میں پڑی تھی کہ وہ بیاہ دوبارہ آئی تھی مگر پھر چلی
گئی کیوں آئی اور کیسے گئی؟ یہ کسی سے میں نے نہیں پوچھا اور اس
طرح میری پہلی محبت یادِ ماضی بن گئی

اس کے کوئی چھ برس بعد میرے گھر کا پتہ پوچھتا ہوا ایک
لڑکا مجھ سے ملنے آیا، میں اسے پہچان نہیں سکا اس نے مجھے ڈرتے
ڈرتے بتایا کہ میرا نام رفیق ہے مجھے میری بڑی بہن رضیہ نے آپ کا
ایڈریس دیا تھا اور کہا تھا کہ میں آپ کے پاس چلا جاؤں

رضیہ کا نام سن کر میں چونک گیا۔ رفیق کے نقوش میں مجھے
رضیہ کی جھلک نظر آ گئی۔ بے تاب ہو کر پوچھا کہ وہ کہاں ہے کیسی ہے
چودہ پندرہ برس کا لڑکا تھا زود رنج ہو کر بولا۔ "وہ تو مر چکی ہیں۔۔
مہینے ہو گئے، ٹی بی سے ہسپتال میں ان کی ڈیتھ ہو گئی ہے" میرا
دماغ ایک دم ماؤف رہ گیا کہ وہ زندگی سے مردانہ وار مقابلہ کرنے والی لڑکی
بھی مر گئی۔ رفیق نے مجھے بتایا کہ ممانی نے ان دونوں کو باپ کے
پاس بھیج دیا تھا وہاں باپ نے رضیہ کا سودا کر دیا۔ پندرہ سو کے
بدلے ایک آدمی سے شادی طے کر دی، رضیہ آپا مجھے لے کر بھاگ گئیں
ماموں کے آگے ہاتھ جوڑے کہ انھیں اپنے پاس رکھ لے۔ ماموں
رضامند ہو گئے مگر ممانی جان کی دشمنی ہی ٹھنی، کچھ عرصہ ساتھ رہے
ایک دن اپنے ایک ملازم کے ساتھ رضیہ کا اسکینڈل مشہور کر دیا ماموں
نے اس من گھڑت کہانی پر یقین کر کے دھکے دے کر نکال دیا پھر ہم
دونوں نے بڑی مصیبتیں اٹھائیں مجھے نہیں معلوم رضیہ آپا نے اور
کہاں دکھ اٹھائے، نمبردار کے گھر نوکری کی جب واپس آتی تھیں تو
روتی تھیں، مجھے پڑھنے بٹھا دیا تھا، میں پانچویں میں تھا جب انہیں
ٹی بی ہو گئی، میں انھیں لے کر اسپتال آیا، یہاں تین مہینے رہیں، کہنے
لگیں تیری پڑھائی کا حرج ہو گا، واپس آ گئیں، اور ایک سال میں ہڈیوں
کا ڈھانچہ ہو کر رہ گئیں، زبردستی ہسپتال لایا یہاں ان کا انتقال ہو گیا
مرنے سے پہلے انھوں نے آپ کا پتہ بتایا تھا اور کہا تھا ان سے کہنا
کہ مجھے ملازم بنا کر رکھ لیں مگر پڑھائی مت چھڑائیں۔

اس وقت میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا، اپنی بزدلی
پر سو بار لعنت بھیجی کہ اس نے عورت ہو کر زندگی سے ڈٹ کر مقابلہ کیا
اور میں مرد ہو کر معاشرے کے سامنے اس کا ہاتھ پکڑنے کی جرأت نہ کر
سکا جبکہ اسے یہ تک معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں اس نے کبھی مجھ سے مل کر
میرے مصائب میں اضافہ کرنے کی کوشش نہیں کی وہ سچ مچ عظیم لڑکی
تھی خدا جانے سنگدلوں نے اس کے ساتھ اور کیا سلوک کیا ہو گا۔ یہ سوچ کر
ذہن میں انگارے دہکتے رہے۔

اور تب سے رفیق میرے پاس ہے میں اسے اپنا بھائی سمجھتا
ہوں مگر یہ خود کو میرا ملازم ظاہر کرتا ہے حالانکہ رضیہ کا بھائی جو ہوا ۔۔۔ اور
یہ میرا عہد ہے کہ اسے ڈاکٹر بناؤں گا خدا کا شکر ہے کہ ذہین ہے محنتی
ہے، میری اپنوں کی طرح خدمت کرتا ہے، اور یہ ہے وہ راز جو میں آج
سب کو بتا رہا ہوں کہ میں رضیہ کو موت کے منہ میں جانے سے تو نہیں
روک سکا لیکن اس کی تلافی کی بس یہی ایک صورت ہے کہ اس کی یہ خواہش
پوری کروں کہ اس کا بھائی رفیق ڈاکٹر بنے تاکہ اس کی روح کو وہ خوشی نصیب
ہو سکے جس کی حسرت لیے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔

جاوید بلوچ۔ تونسہ شریف

## پروین شاکر

دل و نگاہ پہ کس طور کے عذاب اُترے
وہ ماہتاب ہی اُترا نہ اُس کے خواب اُترے

کہاں وہ رُت کہ جبینوں پہ ماہتاب اُترے
زمانہ بیت گیا ان کی آب و تاب اُترے

میں اُس سے کھل کے ملوں سوچ کا حجاب اُترے
وہ چاہتا ہے مری روح کا نقاب اُترے

اُداس شب میں کڑی دوپہر کے لمحوں میں
کوئی چراغ، کوئی صورتِ گلاب اُترے

تری ہنسی میں نئے موسموں کی خوشبو تھی
نوید ہو کہ بدن سے پرانے خواب اُترے

فصیلِ شہرِ تمنا کی زرد بیلوں پر
ترا جمال کبھی صورتِ سحاب اُترے

کبھی کبھی ترے لہجے کی شبنمی ٹھنڈک
سماعتوں کے دریچوں پہ خواب خواب اُترے

تھی۔ حالانکہ پھر بھی مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کی تڑپ جگائی اور انھیں مسلم لیگ کے مقاصد سے آگاہ کیا۔ مسلم لیگی گھرانے اس نوجوان پر فخر کرتے تھے۔ حمیدہ نیاز الدین کے مرحوم بھائی کی بچی تھی جسے انھوں نے پیدا ہوتے ہی احسن کے لیے مانگ لیا تھا پھر وہ ماں کے سائے سے محروم ہو کر اسی گھر میں آ گئی۔ یکم تو منگیتری کی مانگ نکاح کی طرح مضبوط سمجھی جاتی تھی دوسرے ہر وقت کی یکجائی نے احسن اور حمیدہ کو ضرورت سے زیادہ ہی قریب کر دیا تھا۔ بچپنے سے لے کر اب تک انھوں نے اپنا ہر لمحہ ساتھ گزارا، ہر سانس ساتھ لیا تھا اس طرح وہ دونوں ایک جان دو قالب بن گئے اور جب احسن کو تعلیم کے لئے لاہور بھیجا گیا تو حمیدہ مدتوں ویران اور اداس رہی پھر اس نے سہانے مستقبل کی امید پر خود کو احسن کی جدائی کا عادی بنا لیا۔

یونس فارسی داں آدمی انگریزی نہ جاننے کے باعث ہر قسم کی مراعات سے محروم غربت کے دن گزار رہے تھے مگر چونکہ ان دنوں انسان کو دولت کی کسوٹی پر پرکھنے کا رواج نہ تھا لہٰذا حیثیت کا فرق انھیں اور نیاز کو دور نہ کر سکا یہ پورا گھرانہ مسلم لیگی تھا۔

حمیدالدین کے تین بیٹے فیاض، اکرام اور سلیمان اور دو بیٹیاں نسیم اور سلیمہ تھیں۔ سلیمان کے علاوہ یہ تمام گھرانہ کانگریسی تھا۔ ان دنوں ان دونوں گھرانوں میں گرما گرم بحثیں ہوتیں وہ ایک دوسرے کے نظریات پہ تنقید کرتے اگر احسن موجود نہ ہوتا تو بات زیادہ نہ بڑھتی لیکن جذباتی احسن کے ہوتے ہوئے کسی کو مسلم لیگ کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہوتی اس کے دلائل اتنے وزنی ہوتے کہ قائل نہ ہونے کے باوجود حمید اور اس کے دونوں کانگریسی بیٹے خاموشی اختیار کر جاتے۔

*****

ان دنوں حمیدہ کی زندگی بڑی رنگین تھی احسن لاہور سے گھر آیا ہوا تھا چند ماہ قبل اس نے فوج میں کمیشن کے لیے درخواست دی تھی جس کے جواب میں اسے انٹرویو کے لیے جہلم اور پنڈی بلایا گیا جہاں اسے کامیابی حاصل ہوئی تھی اب تیسرا اور آخری انٹرویو باقی تھا جس کے بارے کا اسے کچھ دن انتظار کرنا تھا لہٰذا وہ یہ وقت گھر والوں کے ساتھ گزارنے کے خیال سے آیا ہوا تھا۔ حمیدہ حد درجہ خوش نظر آتی تھی کچھ عرصہ بعد احسن کے کمیشن بننے کا تصور اسے قبل از وقت ہی مسرور کر دیتا تھا وہ خوش تھی مطمئن تھی اور احسن کی سرگرمیوں میں حصہ لے رہی تھی۔ ان دنوں اگرچہ ہندوستان میں تعلیمی ماحول بڑا عجیب تھا اسکولوں میں مسلمان لڑکیوں کو دیوداسیوں کے رقص اور نعت و حمد کی جگہ بندے ماترم سکھایا جاتا جس کے سبب مسلمانوں کے اکثر گھرانے لڑکیوں کی تعلیم کے خلاف تھے کیونکہ اسکولوں کے منتظمین انھیں اپنے انداز فکر میں ڈھالنے کی کوشش کرتے وہ مسلمان جو اس وقت تک مذہب سے بے بہرہ ہو گئے تھے ان کے بچے بآسانی اس ماحول میں ڈھل جاتے مگر نیاز الدین کا گھرانہ عام گھرانوں سے زیادہ مذہبی تھا اس لیے اسکول کی تعلیم کے باوجود احسن اور حمیدہ کے خیالات اسلامی تھے میٹرک کے بعد احسن لاہور بھیج دیا گیا مگر حمیدہ کو مزید تعلیم کی اجازت نہ ملی البتہ مصلحین کی تحریریں اور مسلمان شعراء کے کلام سے اس نے علم کی پیاس بجھائی جس کے تحت میں وہ ہر محفل اور ہر ماحول میں نظریہ پاکستان کو عوام تک پہنچانے کے قابل ہو گئی اور جب احسن چھٹیوں میں گھر آتا اور فارغ وقت میں جلسے کا انتظام کرتا تو اس وقت خواتین میں حمیدہ کو اپنے خیالات عام کرنے اور ان میں آزادی کی امنگ پیدا کرنے کا خوب موقع ملتا۔ احسن اور وہ ایک دوسرے پر فخر کرتے تھے۔ ان دنوں قائد اعظم ریلیف فنڈ میں پیسہ جمع کرنے کے لئے احسن نے ایک ڈرامہ اسٹیج کیا تھا جس کا مقصد لیگ کی امداد تھا مرد و خواتین کا جم غفیر تھا۔ خواتین کے لئے پردے کا علیحدہ انتظام کیا گیا تھا اس ڈرامہ میں ایک مجاہد کی زندگی کو اس خوبصورتی سے پیش کیا گیا تھا کہ ہر دل میں مجاہدانہ زندگی کے لئے تڑپ پیدا ہو گئی تھی اور یہاں پر موجود ہر نوجوان اسی طرح ملک کے لئے قربانی دینے کا متمنی نظر آتا تھا۔ آخری منظر اتنا رقت آمیز تھا کہ عورتیں تو عورتیں مرد بھی رو دیئے تھے اس مجاہد کا رول احسن نے ادا کیا تھا حمیدہ پورے ڈرامہ میں مسلسل روتی رہی تھی اور اس نے واپسی پر جب اس سے احتجاج کیا تو احسن نے اس کا مذاق بنا لیا مگر اس کی اداسی کم نہ ہوئی تو وہ بولا۔

”تمہارا ڈرامہ کیسا رہا؟“

”بہت اچھا۔“ اس نے خود پر قابو پا لیا۔ ”خاص طور پر آپ نے تو کمال کر دیا۔“

”ہم تو خیر ہمیشہ ہی ایسا کرتے ہیں مگر آج تم نے بھی کمال کر دیا بھلا اتنا رونے کی کیا تک تھی میں تو سمجھتا تھا کہ تم بڑی بہادر ہو۔“ احسن نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

حمیدہ کی آنکھیں نہ جانے پھر کیوں بھیگ گئیں۔

”ارے ارے۔“ احسن نے اس کا خیال بٹانا چاہا۔ ”حمیدہ ان موتیوں کو یوں نہ لٹاؤ۔ ہم دولت قطعی پسند نہیں کرتے اور پھر تم تو ایک فوجی کی بیوی بننے والی ہو۔“

حمیدہ نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اس کے ہاتھ احسن کے ہاتھوں میں تھے دوپٹہ ڈھلک کر نیچے آ گیا تھا اس حالت میں کوئی دیکھ لے یہی

گھبراہٹ طاری تھی۔

"کوئی نہیں دیکھے گا۔" احسن نے سرگوشی کی حمیدہ کہاں اور گھبرا گئی، شرم سے چہرہ سرخ ہو گیا کانوں میں پڑی ہوئی بالیاں اس کے دل کی طرح کانپ کانپ کر اس کے گلابی رخساروں سے ٹکرا رہی تھیں وہ احسن کی نظروں کی تپش چہرے پر محسوس کر کے نظریں اٹھانے کا حوصلہ نہ کر سکی تھی۔

"حمیدہ" احسن نے قدرے جھک کر سرگوشی کی۔

"چھوڑئیے" حمیدہ نے کسمسا کر ہاتھ چھڑانے چاہے وہ بری طرح جھینپ رہی تھی احسن کا چہرہ اس کے چہرے کے اتنا قریب تھا کہ وہ اس کے سانسوں کو بخوبی محسوس کر رہی تھی وہ جلدی سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور شرمندہ سی ہو کر بولی "کیا کرتے ہیں؟"

"اپنی قسمت پر رشک کر رہا ہوں۔" احسن نے پیار سے اسے دیکھا۔

"وہ ہاتھ چھوڑ کر بھی تو کر سکتے ہیں۔" وہ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔

"یہ ہاتھ ایک وعدے پر چھوڑوں گا۔" احسن نے اس کی برجستہ گوئی پر ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا؟" حمیدہ نے جلدی سے پوچھا وہ ابھی تک گھبرا رہی تھی کوئی ادھر آ نہ جائے۔

"اب تو نہیں روؤ گی؟" احسن نے بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا، جو گریہ سے سرخ تھیں۔

"نہیں" حمیدہ نے نفی میں گردن ہلائی احسن کی اس بات سے اسے اندرونی خوشی ہو رہی تھی جو اس کے آنسوؤں سے بے قرار ہو گیا تھا۔

اسی رات نیاز الدین کی طویل و عریض بیٹھک میں محلے بھر کے مسلمانوں کی محفل جمی ہوئی تھی کانگریسی اور مسلم لیگی سب ہی موجود تھے گرما گرم بحث جاری تھی۔ اندر پردے کی اوٹ میں نیاز الدین کی بیوی زبیدہ اور حمیدہ بڑی دلچسپی سے بحث سن رہی تھیں۔ فیاض نے استہزائی انداز میں احسن کو دیکھا۔

"کہو احسن لاہور میں کیا حال چال ہیں۔ تمہاری کاوشیں کیا رنگ لا رہی ہیں؟"

"ہماری کاوشوں کا نتیجہ بہت جلد آپ کے سامنے آنے والا ہے۔" احسن بولا۔

"ارے میاں کرامت نے کہا۔ نصف صدی سے تم جیسے لوگ یہی کر رہے ہیں۔ آج تک تو کچھ سامنے آیا نہیں۔ اب کیا توقع کی جائے۔"

چار اچھی ایک جگہ جمع ہوئے اور آپس میں کہنے لگے کہیں سے بہت سی دولت حاصل کی جائے۔ ایک اچھی نے مشورہ دیا کہ حبیب بنک کی بلڈنگ اٹھا کر یہاں لے آتے ہیں چاروں حبیب بنک کی بلڈنگ پر پہنچے اور چبوترے کو پکڑ کر زور لگانے لگے جب کافی دیر گزر گئی تو ان کی بیگمات کو فکر لاحق ہوئی۔ وہ اپنے شوہروں کی تلاش میں نکلیں تو انھیں حبیب بنک کی بلڈنگ کے قریب زور لگاتے ہوئے پایا۔ ان کو غصہ آگیا اور انھوں نے اپنے جوتے اتارے اور شوہروں کو مارنے لگیں تو ایک اچھی بولا "یار ذرا آہستہ آہستہ زور لگاؤ، ڈیشیں گرنی شروع ہو گئی ہیں۔"

مرسلہ: صفیہ صدیقی، الدہلی

"یہ سب فضول اور اوقات گزاری کے مشغلے ہیں۔" حمید نے کہا ——— "قرنوں سے ہم اور ہندو ساتھ ساتھ رہ رہے ہیں مگر یہ نیا شگوفہ چھوڑ کر لیڈروں نے ساری قوم کو بہکا دیا ہے۔"

"صدیوں ساتھ رہنے کے بعد بھی آپ یہ توقع مت رکھیے کہ ہندو آپ سے اخوت برتے گا۔" احسن نے کہا۔ "آپ یہ کیوں بھول گئے کہ ہم دو مختلف قومیں ہیں جو ساتھ رہنے سے ایک نہیں ہو سکتیں۔"

"یہ دو قوموں کا تصور بھی تم ہی جیسے لوگوں نے پیدا کیا ہے۔" فیاض بولا "پہلے ایسا نہ تھا ہم ایک تھے۔"

"آپ نے غلط سمجھا۔" احسن نے کہا۔ "ہندو نے کبھی دل سے ہمیں تسلیم نہیں کیا وہ آپ کا اسی دن سے دشمن ہے جب محمد بن قاسم ساحل سندھ پر اترا تھا اور ہندو کے بت کدے میں اس نے خدا کی وحدانیت کا اعلان کیا تھا۔ اس دن سے آج تک وہ آپ کے خلاف مصروف پیکار ہے۔"

"بے شک بے شک" معمر ماسٹر عزیز نے احسن کی تائید کی۔ وہ پھر بولا۔

"بھائی جان! آپ اپنے ماضی پر نظر ڈالئے۔ راجہ داہر کا حملہ۔ جے پال کی پیش قدمی۔ راجپوتوں کی بغاوت۔ راجہ جسونت سنگھ کی خود مختاری یہ سب مسلمانوں کو پامال کرنے کی کوششیں تھیں کیا اس کے بعد بھی آپ اسے اپنا بھائی اور خیر خواہ کہہ سکتے ہیں؟"

کانگریسی مسلمان ایک دم جواب نہ دے سکے انھیں محسوس ہوا

تھا لہٰذا اس ادھیڑ عمر میں بھی اسے غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی وہاں سے ٹریننگ کے لئے بھیجا گیا چھ ماہ کی ٹریننگ تھی مگر آٹھ سال کی عمر میں گھر بیٹھا رہا یہاں تک کہ اسے ٹریننگ کورس کے بعد محاذ پر بھیج دیا گیا جہاں پہنچ کر خطوں کا سلسلہ کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا

ان دنوں گاندھی اور نہرو پاکستان کا مطالبہ کرنے والے مسلمانوں کے شدید مخالف تھے اور کانگریسی مسلمان بھی پوری طرح سے ان کا ساتھ دے رہے تھے۔ انگریز اور ہندو کے علاوہ خود مسلمان بھی مسلمانوں کے حریف تھے ایک ہی گھر میں دو بھائی ایک کانگریسی دوسرا مسلم لیگی اور وہ تو ہم سے ایک دوسرے کے منصوبے خاک میں ملا دینے کے درپے تھے۔ کانگریسی مسلمان پاکستان بننے کے شدید مخالف اور مسلم لیگی جان دے کر بھی اسے حاصل کرنے کے تمنائی۔ غرضیکہ ملک بھر میں عجیب فضا تھی ادھر دوسری جنگ عظیم جاری تھی انگریزوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی ایک طرف جاپان برما تک آ پہنچا دوسری طرف روس اور جرمن سے معرکہ برپا تھا۔ اس وقت تک ملک کے جوشیلے نوجوان جوق در جوق فوج میں بھرتی ہو رہے تھے جس کے جانے کے بعد متعدد مسلمان نوجوان کو اس مہم کے لئے پلاننگ کر چکے تھے۔ اسی دوران لاہور کالج کے ایک پروفیسر ابرار احمد میرٹھ آئے جو اپنے اعزا کو یہاں سے نکال کر لے جانا چاہتے تھے۔ اس وقت نیاز الدین احسان کے محلے کے دیگر مسلم لیگی گھرانے اس علاقے کو خیر باد کہہ دینا چاہتے تھے

مگر اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے قبل انھوں نے عزیز دوستوں سے مشورہ طلب کیا تو ان سب نے ان کی مخالفت کی ان کے خیال میں آبائی گھروں کو یوں خیر باد کہہ دینا دانشمندی نہ تھی یہاں وہ سینکڑوں برس سے آباد تھے علاقے بھر میں ان کی عزت تھی دوسرے یہ علم نہ تھا کہ حالات کیا صورت اختیار کریں لہٰذا طے پایا کہ فی الحال ہجرت کا خیال ملتوی کیا جائے پھر انھوں نے اپنے پرانے رفیق منندر کمار اور کمار بابو سے مشورہ طلب کیا تو منندر کھل کھلا کر ہنسا اور بولا۔

”حکیم جی۔ آپ ہمارے عزیز کرم فرما ہیں اگر آپ پر کوئی حرف آیا تو ہم جان لڑا دیں گے“ حمید اور اس کے کانگریسی فرزندوں نے سب کو غور سے دیکھا۔ کمار بابو بولا۔

”یہ ہندو مسلمانوں کی حماقت ہے جس کی بدولت یہ نفسا نفسی ہو رہی ہے ورنہ ہم آج تک بھائیوں کی طرح رہے اور آپ اطمینان رکھئے، آئندہ بھی آپ لوگوں کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے“

منندر کا بیٹا دلیپ اور کمار بابو کا بیٹا اشوک بھی موجود تھا۔ دلیپ بولا۔

”چچا جی! آپ کے گھر تک پہنچنے کے لئے دشمن کو ہماری لاشوں پر سے گزرنا پڑے گا۔ اگر سارا ہندوستان بھی فسادات کی لپیٹ میں آ گیا تب بھی کوئی اس محلے میں آنے کی جرات نہ کرے گا آپ کی عزت ہماری عزت ہے“

اس طرح نیاز الدین نے ہجرت کا ارادہ بدل دیا

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا دن ہفتوں اور مہینوں میں ڈھلتے رہے۔ جنگ عظیم مسلسل جاری تھی ایسے میں ہندو نے مطالبہ کیا کہ حکومت کانگریس کے حوالے کر دی جائے مگر انگریز اس مطالبے کو پورا کرنے سے انکاری تھا کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں یہ دن مسلم لیگ کا یوم نجات تھا کہ مسلم لیگیوں نے منایا تھا وہ خوشیاں مناتے تھے کیونکہ اب ہندوستان بھر میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک انھیں کا نعرہ گونج رہا تھا ان میں کام کرنے کی لگن اور حصول آزادی کا جوش بڑھ گیا تھا ایسے میں کچھ کانگریسی بھی صورت حال کا اندازہ کر کے مسلم لیگ میں شامل ہو گئے مگر اب بھی بہت سے ایسے ہی تھے جو ہندوؤں کے ساتھ مل کر لیگیوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے کوشاں تھے مگر اب مسلم لیگیوں کی عملی سرگرمیوں کے سامنے سب مخالفانہ کاوشیں بیکار ثابت ہو رہی تھیں وہ لوگ تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں تھے لیکن کانگریسی مسلمان ان کے عمل کو حماقت گردانتے نیاز کے ہاں وہی محفلیں جمتیں۔ حمید فیاض اور اکرام اسی طرح لیگیوں کا تمسخر اڑاتے ایسے میں حمیدہ کو شدت سے جمیل یاد آتا۔ اگرچہ مدت سے خطوں کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ اب وہ اس کی راہ کے لئے گن گن کر دن گزار رہی تھی یہ تین برس اس کے جانے کے بعد گزرے تھے کبھی اس کے ساتھ بیتا ہوا وقت یاد کرتی۔ کبھی اس کی سرگرمیاں تقریریں جلسے جلوس اور کبھی تنہائی میں کی ہوئی گفتگو کا ایک ایک لفظ اسے یاد آتا اب یہی یادیں اس کی زندگی کا سرمایہ تھیں جن کے سہارے یہ وقت گزار رہی تھی۔ ان دنوں ہندو مسلم دشمنی بڑھتی جا رہی تھی وہ بڑے سے بڑے لیڈر سے لے کر ایک معمولی ہندو تک سب لیگیوں کے مقصد میں رکاوٹ بننے میں کوشاں تھے مگر مسلمان جو عزم کر چکے تھے اس سے کوئی طاقت انہیں نہ ہٹا سکتی تھی ادھر جنگ کے سبب انگریزوں کو موت و حیات کا سامنا تھا ادھر نیاز الدین کو جمیل کے خط کا شدت سے انتظار تھا۔ مگر یہ انتظار ہی رہا کیونکہ یہ جنگ اپنی لپیٹ میں بے شمار ہندوستانیوں کو لے گئی کئی نوجوان اس کی نذر ہو گئے اور انھی میں جمیل کا نام شامل ہونے کی اطلاع بھی آ گئی کہ وہ محاذ پر شہید ہو گیا ہے۔

یہ خبر نیاز الدین کے گھر پر بجلی بن کر گری اور ان کے حوصلوں کو بھسم کر گئی۔ ان کی زندگی بھر کی کمائی جو ان کا بیٹا تھا انھیں بے سہارا چھوڑ گیا تھا

روتے پیٹتے فریاد کرتے رہے مگر اس دکھ کا مداوا نہ کر سکے اور حمیدہ نیم دیوانی سی ہو گئی اسے احسن کی موت کا یقین نہ آتا تھا وہ سوتے سوتے چیخ مار کر اٹھ جاتی یا پہروں ایک ہی طرف تکتی رہتی اس کے ساتھ گزارا ہوا ہر ہر لمحہ اسے یاد آتا اور رخصت والی شب کی باتیں یاد کر کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی نیاز اس کا غم سمجھتے مگر اس کے علاج سے قاصر تھے ان کے اپنے دل سے زندہ رہنے کی امنگ مٹ چکی تھی مگر وہ پھر بھی زندہ تھے تنہائی کا احساس انھیں اب بالکل بے سہارا ہونے کا احساس دلاتا تھا ایسے میں ایک مرتبہ پھر انھوں نے اس گھر کو خیرباد کہنا چاہا مگر اب الیکشن ہو رہے تھے اور مُلکی حالات بھی اس قابل نہ تھے کہ وہ بخیر و عافیت اس سرزمین سے نکل سکتے ۱۹۴۶ء میں انتخابات ہوئے مسلم لیگ نے مرکز کی تیس کی تیس اور صوبوں کی بیشتر نشستیں جیت لیں یہ اس بات کی علامت تھی کہ مسلم لیگ ہی مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ

جماعت ہے۔ اتحادِ ملّی کی یہ ایک ایسی مثال تھی جس پر کانگریسی سخت جھنجھلائے اور اس وقت انھوں نے عجیب چال چلی وہ یہ کہ خضر حیات کو اعتماد میں لے کر اسے اور اس کے ساتھیوں کو مسلمانانِ پنجاب کا نمائندہ بنا دیا اس وقت تک پنجاب کی تمام نشستیں مسلمانوں کے قبضے میں تھیں اور خضر حیات انگریزوں کا مہرہ تھے جس کی پشت پناہی اب ہندو سکھ اور دوسرے غیر مسلم کر رہے تھے۔ لہٰذا اس نئی صورتِ حال سے لیگی سخت برافروختہ ہوئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہاں پر اگر کانگریسی چھا گئے تو دیگر مقامات پر بھی مسلمانوں کو دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا یہ سوچ کر انھوں نے وزارت پر عدمِ اعتماد کے مظاہرے شروع کر دیے جس کی روک تھام کے لیے حکومت نے لیگ پر شدید پابندی لگا دی۔ لیگی دھڑا دھڑ گرفتار ہوئے پریس پر بھی پابندیاں لگائی گئیں۔ اور دیگر جماعتوں کو بھی خلافِ قانون قرار دیا مگر کانگریس پر کوئی پابندی عائد نہ کی جس کی بدولت وہ اپنی من مانی کرتی رہی اس چیز نے مسلمانوں میں نفرت کی آگ بھڑکا دی لیڈروں کے جیل جانے کے بعد نوجوان میدان میں آ گئے آخر اس صورتِ حال سے تنگ آ کر گورنر نے خضر حیات کی وزارت ختم کر کے مسلم لیگ کو وزارت بنانے کی پیشکش کی تو کانگریسیوں نے تخریبی کارروائیاں شروع کر دیں اور ہندوؤں نے شدھی اور سنگھٹن تحریکیں شروع کر دیں جن کا مقصد مسلمانوں کو ان کے مذہب سے برگشتہ کرنا تھا ان کے جواب میں مسلمانوں نے تبلیغی تحریک کا آغاز کیا اس طرح رہا سہا اتحاد بھی ختم ہو گیا اور ہندو مسلم فسادات عام شروع ہو گئے مسلمان تو اب بھی اصول و آئین کے تحت اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشاں تھے لیکن ہندو اور سکھ مکمل طور پر تیاری کر کے اندھا دھند مقابلے پر آ رہے تھے ان کے جاسوس خانے اسلحہ خانے اور اسلحہ ساز

یہ میری ساس کی تصویر ہے

---

کارخانے بن گئے ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ ماسٹر تارا سنگھ نے مسلمانوں کو للکارا کہ پنجاب سکھوں کا ہے یہاں مسلم لیگی وزارت نہیں ہو گی یہ کانگریس کے ایما پر ہوا تھا اس دھمکی پر مسلمان اور بھی مشتعل ہو گئے اور بات اتنی بڑھی کہ سکھوں نے امرتسر کے مسلمانوں کو نشانہ بنایا جو اس حملے کے لیے تیار نہ تھے مگر جب انھیں یہ صورت کیا گیا تو وہ بھی نہتے ہونے کے باوجود مقابلے پر آ گئے اس طرح گھر گھر خون کی ندیاں بہہ گئیں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا گیا ہر گھر میں شب معرکے اٹھائے گئے بغیر ہندوؤں اور سکھوں کا حملہ شروع تھا مگر کانگریسی مسلمان ممبروں نے پاکستان کی مخالفت میں ہندوؤں کا بھرپور ساتھ دیا تھا اب تک ان سے امید وابستہ کیے بیٹھے تھے نیاز الدین نے تو احسن کی وفات کے بعد ایسی مشکلوں کو بالکل خیرباد کہہ دیا تھا مگر حمید الدین اور ان کے بیٹے اب بھی کانگریس اور ہندو لیڈروں کی چکنی چپڑی باتوں میں آ جاتے۔ آخر مسلمانوں کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں اور تین جون کو برصغیر کی آزادی کا اعلان ہوا تو ملک بھر میں آگ لگ گئی اس کے چند ماہ بعد چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو مسلمانوں کی مسرتوں کا ٹھکانہ نہ رہا مگر حمیدہ اس دن بھی بے قرار ہو کر رو دی آج اُسے احسن کی تمام وہ سرگرمیاں یاد آ رہی تھیں جو اس نے پاکستان کے لیے کی تھیں تقسیم کی حد بندی کے لیے کمیشن بٹھایا گیا۔ سرحدی کمیشن کا صدر ریڈ کلف لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے زیر اثر تھا اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن نہرو کا ذاتی دوست تھا کمیشن کے مسلمان اور ہندو اراکین میں سرحد کے تعین کے لیے بحث و تکرار ہوئی اور جب وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکے تو ریڈ کلف

فریاد کرتی رہی وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی کل تک وہ احسن کی منگیتر تھی اس کی ناز
اور آج وہ ایک سمت باختہ عورت جو روزگار کے لئے در در پھر
تھی مگر ناکام تھی۔ چند دن وہ خود فرزدہ سی گھر میں پڑی رہی مگر زبیدہ کی
حت روز بروز گر رہی تھی لہٰذا پانچویں دن وہ پھر سڑکوں کی خاک چھاننے
کے لئے نکل گئی اور لڑکیوں کے ایک اسکول میں گئی موٹی تازی ہیڈ مسٹریس
نے حال سنا اور بولیں۔ "بی بی معاف کرو کس کس کی سنیں یہاں تو ہر کوئی
ایک نئی کہانی سنانے آجاتا ہے" وہ حمیدہ آنسو پیتے ہوئے لوٹ آئی۔
ان کے چند یوم کے بعد اس نے سنا کسی رئیس کے گھر میں ملازمہ کی ضرورت
تھی وہ نئی امیدیں لے کر بڑے دھڑکتے دل سے گھر میں داخل ہوئی پنجابی
مالکن نے بڑی تنقیدی نگاہوں سے اسے جانچا اور حال سن کر اپنی ساتھی
عورت سے بولی۔

"ہندوستانی لڑکی ہے کیسے رکھ لوں نجانے کیسے خاندان کی لڑکی
ہے۔ کیا اعتبار ہے" حمیدہ اسے کیسے یقین دلاتی کہ وہ اعلیٰ گھرانے کی
لڑکی ہے اب تو شرافت کی کوئی علامت بھی باقی نہ رہی تھی وہ دونوں
نیں کرنے لگیں وہ سارا شہر گندا کر دیا ان مہاجروں نے۔ وہ حمیدہ سب
یہ سن کر مایوس لوٹ آئی ہر قسم کی ملازمت سے وہ مایوس ہو گئی تھی اس
رات وہ پھر بیقراری سے اور اس نے خیالوں ہی خیالوں میں احسن سے
ما "احسن! وہاں ہم پاکستان کے طعنے سنتے تھے یہاں ہندوستان کے
کوئی بھی تو ہمیں اپنا نہیں سمجھتا" وہ صبح تک مسلسل روتی رہی اس کا دل
تھا! احسن آئے اور اسے اپنی بانہوں میں چھپا لے جہاں کوئی غم نہ
اور کوئی فکر نہ ہو۔ وقت گزرتا رہا اور امیدیں ٹوٹتی رہیں۔ زبیدہ
کی صحت روز بروز گرتی رہی۔ ابرار دونوں عورتوں کے ساتھ ہمدردانہ
شریفانہ سلوک کرتا اس نے برے وقت میں ان کا ساتھ دے کر انہیں
ہمیشہ کے لئے خرید لیا تھا........ اس دن زبیدہ کی حالت بہت
خراب تھی وہ بولی "حمیدہ بیٹی! میں نے آج تک تجھ سے کچھ نہیں مانگا مگر
آج کہوں......؟"

"چچی جان! آپ حکم دیجئے" حمیدہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔
"نہیں بیٹی وعدہ کر کہ مجھے مایوس تو نہ کرے گی؟" زبیدہ نے آبدیدہ
ہو کر التجا کی۔

"اچھا وعدہ ہے" حمیدہ نے بے قرار ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔
"لئے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"حمیدہ میری بچی" زبیدہ رونے لگی "تو میری بہو بننے والی تھی،
مگر اللہ کو یہ منظور نہ تھا اب میں ماں بن کر یہ التجا کرتی ہوں کہ تو شادی
کر لے۔"

معاف کرنا محترم میری شرم کی کشتیاں آپ کے غسل خانے میں تو نہیں آگئیں

"چچی جان" حمیدہ بڑی طرح رو دی نجانے احسن کی یاد تھی یا کیا
وہ ہچکیاں لے لے کر دیر تک روتی رہی زبیدہ کا دم اکھڑ رہا تھا وہ خود کو
سنبھالتے ہوئے بولی۔

"بیٹی ابرار بہت شریف آدمی ہے اس نے برے وقت میں ہمیں
سہارا دیا تیرے حالات جاننے کے باوجود بھی وہ تجھے اپنانے کے
لئے تیار ہے۔"

حمیدہ روتی رہی اسے اپنے گزرے ہوئے حالات کا خیال تھا۔
واقعی ابرار کی شرافت ہی تو تھی ورنہ لٹی ہوئی عورت کو کون اپناتا ہے۔
زبیدہ پھر بولی۔

"تو نہیں جانتی زمانہ بہت خراب ہے مرد کے سہارے کے بغیر
عورت کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی وہ چوراہے پر پڑی ہوئی اس شے
کی مانند ہوتی ہے جس کی طرف ہر راہگیر ہاتھ بڑھاتا ہے اسے چھوتا ہے
اور چھوڑ دیتا ہے اور مرد ایک ایسا حصار ہوتا ہے جس میں عورت ہر بلا
سے محفوظ ہو جاتی ہے۔"

حمیدہ نے روتے روتے نظریں اٹھا کر اس بدنصیب عورت کو دیکھا
جو پاکستان کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا آئی تھی اور اب اپنے بیٹے کی
امانت کو اپنے ہاتھوں سے دوسروں کو سونپ رہی تھی کتنی مجبور تھی یہ
ماں۔ حمیدہ پھر رو دی۔ زبیدہ بولی "میری بچی میں تیرے جذبات سے واقف
ہوں مگر میں مجبور ہوں تجھے مرنے سے قبل محفوظ کرنا چاہتی ہوں میرے بعد
نجانے تجھے کیسے دور آئیں۔" زبیدہ خود بھی رونے لگی اور پھر نہ جانے

بھی ڈگمگانے لگے۔ وہ احسن سے ملنا چاہتی تھی مگر وہ پیا وہاں کی تھی بعد
احسن کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالتا تھا اسے بوڑھے بدنصیب نے تھام لیا جانے یہ
منظر ناقابل برداشت تھا یا اطمینان بخش کہ اس شب زبیدہ سوتی تو پھر کبھی
نہ جاگی۔ حمیدہ ایک بار پھر تڑپ اٹھی اور وہی احسن کی آخری نشانی بھی
اس سے چھین گئی تھی۔ انسان کتنا مجبور ہے، آنسو تقدیر نہیں بدل سکتے۔
چھنی ہوئی چیز کو واپس نہیں لا سکتے مگر انسان پھر بھی روتا ہے۔ حمیدہ بھی
روتی رہی۔ احسن سے وابستہ ہر چیز ساتھ چھوڑ گئی تھی مگر اس کی یاد بدستور
موجود تھی پہلے کیسے کٹھن دن آئے مگر وہ ایک ساعت کے لئے بھی آ کے
دھندلی نہ ہوئی۔ ماضی کا ایک ایک لمحہ یاد کرتی اور اشکوں کے بے شمار
قطرے نچھاور کرتی اور پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنی اس زندگی سے سمجھوتہ
کر لیا۔ دن رات خود کو مصروف رکھتی ابرار ایک اچھا انسان تھا محبت
ڈھونڈنے کے باوجود وہ اس سے مطمئن تھی اس کے دل میں نہ امنگ تھی نہ
آرزو مگر وہ زندہ تھی زندہ رہنے کے لئے مجبور تھی زندگی کا یہ اصول جو
قدرت نے گلے میں ڈال دیا تھا اسے ہر صورت نبھانا تھا۔ وقت اگر تھم
جائے تو اپنی اہمیت کھو دے اس لئے وہ گزرتا ہے اور گزرتا ہی چلا جاتا
ہے کبھی لمحوں میں کبھی منٹوں میں کبھی دنوں ہفتوں اور مہینوں میں وہ ہر
رنگ اور ہر روپ میں دوڑتا ہے۔ حمیدہ کی زندگی کے بھی دو برس گزر
گئے اور وہ ایک بچے کی ماں بن گئی۔ یہ ایک نئی زندگی تھی نئے احساسات و
جذبات تھے وہ سب کچھ بھول کر اس کھلونے میں مگن ہو گئی۔ احسن اسے
اب بھی یاد آتا مگر اب وہ بے قرار ہو کر نہ روتی اب وہ راتوں کو جاگ
جاگ کر ماضی کو یاد نہ کرتی بلکہ چپ چاپ اس کی روح کو ثواب پہنچا
اور آہستہ آہستہ یہی بچہ اس کے قلبی سکون کا ذریعہ بنتا گیا۔ لیکن قدرت
کسی چیز کو ایک حالت میں دیکھنا پسند نہیں کرتی اس لئے کائنات
کی ہر چیز کو تغیر ہے شاید اس کا یہ سکون بھی اسے پسند نہ آیا کہ ایک
دن ابرار آیا اور بولا۔

"حمیدہ! آج میں بہت خوش ہوں۔" "کیوں؟" حمیدہ نے
اسے دیکھا۔

"آج میرا ایک ایسا شاگرد ملا جس پر میں فخر کرتا تھا اور جس کے
بارے میں مشہور ہو گیا تھا کہ وہ شہید ہو گیا ہے۔"

"اچھا" حمیدہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"ہاں" ابرار بولا۔ "بڑا بہادر آدمی ہے اس نے زمانہ
طالب علمی سے تحریک پاکستان میں عملی حصہ لیا پھر وہ فوج میں بھرتی
ہو گیا اور انگریزوں کی طرف سے مصر اور برما کے محاذوں پر لڑا۔

۱۹۴۶ء میں واپس ہندوستان آیا تو پتہ چلا کہ اس کا سارا
کنبہ فسادات میں مارا گیا اور کچھ لوگ پاکستان ہجرت کر گئے۔ اب وہ
کیپٹن ہے اور مسلسل اسی وقت سے اپنے عزیزوں کی تلاش میں
سرگرداں ہے اس نے ابھی تک شادی نہیں کی کہتا ہے اس لڑکی
سے شادی کروں گا جس سے وعدہ کر کے گیا تھا....."

حمیدہ چپ چاپ سنتی رہی نہ جانے وہ کیا سوچ رہی تھی۔ ابرار
خود ہی بولا۔

"میں نے اسے اپنا پتہ دے دیا ہے کبھی فرصت میں آئے
تو مفصل بات کروں گا تم اس سے مل کر یقیناً خوشی محسوس کرو گی۔"

اور وہ دن اس کی زندگی میں زلزلہ لے آیا۔ ابرار موجود نہ
تھا وہ چھوٹے بچے کو کندھے سے لگائے ہوئے تھپک رہی تھی کہ
اچانک جیپ کی آواز نے اسے چونکا دیا پھر دروازے پر دستک
کی آواز جیسے اس کے دل پر لگی اس کا دل تیزی سے دھڑکا خود پر
قابو کرتے ہوئے وہ بچے کو سنبھالے ہوئی دروازے
کی طرف بڑھی مگر پٹ کھول کر اس کے قدم پیچھے کو ہٹ گئے۔
احسن فوجی وردی میں ملبوس اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"احسن" "حمیدہ" وہ دونوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ
رہے تھے احسن کا چہرہ ایک لمحہ کو چمکا مگر دوسرے ہی لمحے بجھ گیا اور حمیدہ
یہاں مجرمانہ انداز میں کھڑی تھی جیسے کوئی منکوحہ عورت شوہر سے بیوفائی
کے بعد اس کا سامنا کرتے ہوئے گھبراتی ہو اس کا دل چاہا کہ چیخے،
"احسن تم کہاں تھے بھر پور جوانی گنوا گئیں مگر تم نے بے خبر زندگی میں کتنا
انتظار کیا؟"

پھر اس کا دل چاہا کہ رو دے۔

"احسن میں بوڑھے مرد کی بیوی اور اس کے معصوم بچے کی ماں ہوں
مگر میرے من میں آج بھی تم ہو صرف تم ہی۔ آج بھی میں تم سے محبت کرتی ہوں
کیونکہ عورت زندگی میں صرف ایک بار پیار کرتی ہے۔"

مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی اس کے لب کپکپا رہے تھے۔ احسن اسے چند
لمحے بغور دیکھتا رہا پھر خدا حافظ کہہ کر اسی طرح بغیر جواب چاہے مڑ کر اپنے
قدموں واپس چلا گیا۔

سید کاظم رضا

اُس نے دروازہ کھولا تو وہ سامنے کھڑا تھا

"کیسا عجیب اتفاق ہے" اس نے سوچا۔ "اس وقت اگر کچھ اور
یا ہوتا تو شاید وہ بھی مل جاتا۔ میں نے سوچا تھا کہ جب دروازہ کھولوں
کوئی میرے سامنے باہر منتظر کھڑا نظر آئے اور لو دیکھو ایسا ہی ہو گیا ہے۔"
شام کی ہلکی روشنی میں نیلے سوٹ میں ملبوس وہ شخص تجسس بھری
سے اسے تک رہا تھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور نہایت شگفتہ
یں اس سے پوچھنے لگا۔

"کیا مس روبینہ یہیں رہتی ہیں؟"

"جی ہاں میں ہی روبینہ ہوں۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ "آپ
بلا تکلف اندر تشریف لے آیئے۔"

روبینہ کے لہجے میں بے قراری اور اضطراب کی رو مچل رہی تھی۔
عام حالات میں وہ اپنے ہاں آنے والے لوگوں کے ساتھ اس قدر جلد بازی
کا مظاہرہ نہیں کرتی تھی مگر آج کل وقت اس کے حق میں نہیں تھا۔ وہ بیمار
کیا پڑی تھی کہ اس کے چہرے کی ساری تازگی ساری شادابی اس سے چھن
گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی شمعیں دھندلا کر رہ گئی تھیں۔ اسے دیکھ کر اب
اس گلدان کا خیال آتا تھا جس کے پھول کئی روز سے نہ بدلے گئے ہوں۔
یہی دیکھ کر اس کے یہاں پابندی سے آنے والے بھی اس کی عیادت کر کے

بس چلے جاتے تھے۔

یوں تو اس کی طبیعت سنبھل گئی تھی مگر کھوئی ہوئی تازگی توانائی اور شگفتگی بحال کرنے کے لیے اسے اچھی غذا اور ٹانکوں کی ضرورت تھی لیکن اب اچھی غذا اور ٹانک خریدنے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں رہے تھے جتنی رقم وہ لے سکتی تھی بیماری کے دوران ہی بے چکی تھی۔ اب تو اسے یہی سوچ لگی رہتی تھی کہ کوئی آئے تو اس کا کاروبار چلے لیکن جو آتے تھے وہ بڈیوں کے ڈھانچے پر اپنا پیسہ نچھاور کرنے کے قائل نہیں تھے۔ انہیں تو زندگی سے بھرپور گداز جسموں کی تلاش ہوتی تھی۔

روبینہ نے دیکھا کہ اس کی پیش کش کے باوجود وہ آدمی بے حس و حرکت اپنی جگہ پر جا کھڑا اس کے سراپے کا جائزہ لے رہا ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اندر آتے ہوئے ہچکچا رہا ہے۔ روبینہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے کھینچتی ہوئی کمرے کے اندر لے آئی۔ اس آدمی نے کوئی مزاحمت نہ کی مگر اسے خود اپنی یہ حرکت اچھی نہ لگی۔

"ٹھیک ہے میرا پیشہ اچھا نہیں" اس نے جھنجھلاہٹ کے عالم میں سوچا تھا۔ "مگر میں نے اس پیشے میں بھی ہمیشہ ایک معیار برقرار رکھا۔ کاش میرے گھر سے پیسے آ گئے ہوتے تو میں اتنی مجبور ہرگز نہ ہوتی۔"

وہ چھوٹا سا گھر جسے وہ اپنا گھر کہتی تھی۔ اس گنجان آباد صنعتی شہر سے بہت دُور ایک چھوٹے قصبے میں تھا جہاں اس کی بوڑھی ماں تھی۔ بوڑھا مفلوج باپ تھا۔ ایک چھوٹی بہن اور اس سے بھی چھوٹا ایک بھائی تھا جو کسی اسکول میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور جہاں وہ ہر ماہ پابندی سے ایک لگی بندھی رقم بھیجا کرتی تھی۔ اس کے گھر والوں کو یہ معلوم تھا کہ وہ کہیں ملازمت کرتی ہے۔ وہ جب گھر سے چلی تھی تو گھر والوں کو اس نے یہی یقین دلایا تھا کہ وہ بہت جلد کہیں نہ کہیں ملازمت تلاش کرے گی اور ان کے گزارے کے لیے ہر ماہ اپنی تنخواہ میں سے رقم بھیجتی رہا کرے گی مگر یہاں آ کر اُسے معلوم ہوا تھا کہ ملازمت حاصل کرنا اس شہر میں جوئے شیر لانے سے کم نہیں اور یہاں ایک بے سہارا لڑکی کا جسم اگر وہ اس کی قیمت وصول نہیں کر لیتی تو بے مول بھی لٹ جاتا ہے۔ اس وقت اس نے ہوشیاری کے ساتھ فیصلہ کیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ جب جسم لٹ جانا ہی ٹھہرا تو پھر کیوں نہ اس کی قیمت وصول کی جائے۔ اس کاروبار میں اسے بہت جلد یہ گُر بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اگر دُکاندار گاہک سے زیادہ اشتیاق کا اظہار کرے تو مال کی قیمت گر جاتی ہے۔ اُس نے یہ گُر پا لیا تھا تو مول تول میں اس نے گاہکوں کی پروا کرنا چھوڑ دی تھی ـــ اور منہ مانگی قیمت وصول کرنے لگی تھی۔

مگر آج اسے اپنے معیار سے گرنا پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنی بیماری کی اطلاع دیتے ہوئے اپنے باپ کو لکھا تھا کہ وہ اس کے لیے کچھ پیسے بھیج دے جو اس پر قرض رہیں گے اور وہ انہیں جلد سے جلد چکا دے گی مگر اس کے باپ کا خط ہی آیا تھا نہ منی آرڈر ـــ اس پر انتظار اور عذاب بن گیا تھا۔

اور آج جب یہ آدمی پھنسا تھا تو وہ اسے کسی قیمت پر بھی کھونا نہیں چاہتی تھی۔

"آپ بیٹھ کیوں نہیں جاتے" روبینہ نے اس آدمی سے کہا۔ "آپ آخر اتنے اکھڑے اکھڑے کیوں ہیں"

"میں بہت مصروف ہوں" وہ بولا۔ "میں بہت جلدی میں ہوں"

روبینہ کو غصہ آ گیا۔

"تو میں کب کہتی ہوں کہ آپ دیر لگائیے"

اُس نے اپنی ریشمی ساڑھی نوچ کر الگنی پر پھینک دی ـــ اور پیٹی کوٹ کے بٹن کھولنے لگی۔ اس آدمی نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ "مگر میری بات تو سنیے، ذرا را پہلے ـــ!"

"میں مول تول کی قائل نہیں" روبینہ نے بات کاٹتے ہوئے ترشی سے کہا ـــ اور پیٹی کوٹ کو زمین پر گرا دیا۔

"خیر جیسی آپ کی مرضی" وہ بولا۔ اور مسکراتے ہوئے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرنے لگا۔

رخصت ہوتے ہوئے جب اُس نے دس دس کے بیس نوٹ گن کر روبینہ کی ہتھیلی پر رکھ دیئے تو اس کی ساری کوفت تحیر آمیز مسرت میں ڈوب گئی۔ اُس نے آواز میں پیار کی مٹھاس گھولتے ہوئے کہا۔

"آپ کل پھر آئیں گے نا؟"

"نہیں!" وہ بولا ـــ "میں نصف شب کے بعد یہاں سے چلا جاؤں گا"

"آپ کہیں باہر سے آئے ہیں؟" روبینہ نے سوال کیا

"ہاں۔ قاسم پور سے ـــ!"

"قاسم پور" روبینہ کو جیسے بجلی کا ننگا تار چھو گیا ہو۔ "آپ قاسم پور سے آئے ہیں۔ میرے امی ابا بھی تو وہیں رہتے ہیں"

"مجھے معلوم ہے" اس آدمی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا ـــ "یہ دو سو روپے انھوں نے ہی تمھیں دینے کے لیے مجھے دیئے تھے"

ـــ اور وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

# دوشیزہ کی محفل

## ایم اسلم، گوجرانوالہ

مسز شوکت محمود صاحبہ جنہوں نے تین عورتیں تین کہانیاں میں انتقام کے بارے میں لکھا ہے تو میرا خیال ہے کہ بدلہ لینا مشکل کام نہیں مگر بلند کرداری کا تقاضہ ہے کہ انسان درگزر سے کام لے خدا انہیں اجر دے گا۔

## شاہد علی غزل، کراچی

ماہ جولائی کا شمارہ ایک صحافی دوست نے بطور تحفہ دیا اس قلیل عرصہ میں اتنا ستھرا رسالہ دیکھ کر خوشی ہوئی محنت جاری رکھئے۔

## سحر عتیق، کندھ کوٹ

ماہ جون کا دوشیزہ پڑھا۔ سبھی کالم دلچسپ تھے خاص طور پر ثروت چوہدری صاحبہ کا مختصر افسانہ "میں نے کہا تھا" بہت اچھا لگا۔ میری خواہش ہے کہ کہانی یا افسانے کی صورت میں میری تحریر بھی شائع ہو۔ اجازت ملنے پر ہی بھیجنے کی جسارت کروں گا۔

## صائمہ، جہلم

میں آپ سے چند سوال پوچھنا چاہتی ہوں، نقد نامے کیا ہوتے ہیں ان کا مقصد کیا ہے؟ کیا خطوں کے ساتھ کوپن بھیجنا ضروری ہے۔ فیس ڈاک کے ٹکٹوں کی صورت میں بھیج سکتے ہیں یا نہیں؟

ج: نقد نامے کیش واؤچر کہلاتے ہیں یہ فیس کی جگہ بھیجے جاتے ہیں۔ رجسٹرڈ ڈاک کے ٹکٹ کی صورت میں فیس بھیجی جاسکتی ہے اور نقد ناموں کی صورت میں بھی۔ نقد نامے ہر بک اسٹال سے مل سکتے ہیں۔

## مختار حسین، سبیلہ

جولائی کے شمارے میں فرض اور محبت بہترین کہانی تھی۔ ذرا سا پیار، رشتہ اور ورثہ اچھے افسانے تھے۔ زاہدہ صاحبہ نے بھی اچھی بھلی پرسکون محفل کو اکھاڑہ بنا ڈالا۔ آتے ہی لڑائی شروع کر دی کہ مرد ایسے ہوتے ہیں ویسے ہوتے ہیں۔ مل جل کر رہنے میں جو لطف ہے وہ لڑائی جھگڑے میں کہاں۔ کاش یہ بات کوئی زاہدہ صاحبہ کو سمجھائے۔

## جاوید انیس، کراچی

کیا بہنیں مجھے اس محفل میں آنے کی اجازت دیں گی؟ اجازت اس لیے ضروری ہے کہ ان سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ ہم مردوں سے اس قدر بگڑی بگڑی کیوں رہتی ہیں جب دیکھئے ہماری شکایتوں میں لگی ہوتی ہیں۔ زاہدہ صاحبہ اسلم صاحب کو محفل سے نکلوانے کی فکر میں مبتلا ہیں اور ان کی طرح دوسری خواتین بھی اسی غم میں مبتلا ہیں کہ یہ لوگ محفل میں کیوں آتے ہیں۔ بھئی ہماری سمجھ میں نہیں آتا وہ ایسا کیوں سوچتی ہیں جبکہ یہ پرچہ

...ملتا بھی ہے۔ اس کا ایک ہی حل سمجھ میں آتا ہے کہ آپ خواتین کی محفل کا نام بدل کر "آپ کی محفل" یا "ہماری محفل" رکھ دیں اس طرح یہ بلا وجہ کی کدورتیں بھی ختم ہوں گی اور ہم بھی ہر عزت سے بے جھجک ہو کر محفل میں شریک ہو سکیں گے۔ تاریخی کہانیوں کا سلسلہ بند مت کیجئے یہ میری تحریری درخواست ہے۔

## محمد سلیم جاوید، کراچی

ایک افسانہ "سفید رومال" بھیج رہا ہوں امید ہے قابل اشاعت ہو گا۔ میری تحریریں بیشتر رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ امید ہے آپ کے معیار پر بھی پوری اتریں گی۔

## ایم صلاح الدین، کراچی

پچھلی دفعہ "آئیڈیل کی تلاش" کے کالم کے بارے میں اس خطرے کا اظہار پڑھنے میں آیا کہ لوگ بلیک میل کریں گے میری رائے یہ ہے کہ اس خطرے سے بچنے کے لیے بجائے لڑکیوں کے مرد حضرات اپنے خیالات اور پسند کے متعلق لکھیں اور لڑکیاں ان میں سے کسی ایک کو منتخب کریں۔ اس طرح ایک فائدہ یہ ہو گا کہ ہر شخص کو موقع ملے گا کہ وہ اپنی پسند کا اظہار کر سکے جبکہ لڑکیوں کے اس قسم کے اظہار سے محض ایک طبقے کے مردوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اسی فیصد مرد منہ تکتے اور آہیں بھرتے رہ جاتے ہیں۔

ج: تجویز بہت خوب ہے لیکن یہ خطرہ تو بدستور رہے گا کہ لوگ محض تفریح کے طور پر لکھیں یا بلیک میل کریں۔ دراصل ہمارے یہاں لڑکیوں کو اپنی پسند کے اظہار کا موقع نہیں دیا جاتا۔ یہ صفحہ اس مقصد کو پورا کرتا ہے جبکہ مرد اپنی پسند کا اظہار ہر موقع پر بلا جھجک کر سکتا ہے۔ اس کالم کے ذریعے خواتین کی اس غیر ضروری جھجک کو ختم کرنا مقصود ہے جو وہ اپنے ساتھی کے انتخاب کے وقت اپنے اوپر مسلط کر لیتی ہیں۔ پھر بھی ہمیں اس بارے میں اپنے دوسرے قارئین کی رائے کا انتظار رہے گا

## حبیب احمد اطہر، کراچی

حبیب صاحب کی طرح مجھے بھی ایک ایسی بہن کی خواہش ہے جو مجھے خونی رشتوں والی محبت اور سچائی دے سکے۔ میں متقی لڑکا ہوں طالب علم بھی ہوں اور ملازم پیشہ بھی۔ کیا کوئی لڑکی بہن نسیم اختر اور آمنہ نور کی طرح مجھے بھی بھائی کہہ کر پکار سکتی ہے۔

## خالدہ شہاب، لائلپور

ابھی تک میرے افسانے اور مضامین کالج میگزین تک محدود ہیں۔ اب چونکہ کالج کو خیرباد کہہ چکی ہوں اس لیے آپ کی طرف رجوع ہوتی ہوں کیونکہ میرے خیال میں یہ ماہنامہ پختہ ذہن اور سلجھی ہوئی خواتین کے لیے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

## نگہت انوار مہر، ٹنڈو جان محمد

میں اس وقت دسویں کی طالبہ ہوں مگر گزشتہ دو سالوں میں میں نے آٹھ دس افسانے لکھے ہیں۔ دراصل اچھے اچھے افسانے پڑھ کر میرے دل میں یہ خواہش جاگی ہے کہ میں بھی افسانے لکھوں۔ اب آپ بتائیں یہ افسانے میں کس طرح آپ تک پہنچاؤں

ج: نگہت تم پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو۔ اچھا افسانہ لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ نامور افسانہ نگاروں کی تحریروں کو غور سے پڑھو۔ ابھی تم پڑھنے کی طرف توجہ دو۔ پھر بھی اگر تم مصر ہو کہ تمہارا افسانہ شائع ہو تو ہمیں دوشیزہ کے ایڈریس پر بھیج دیجئے۔ پڑھ کر فیصلہ کر سکیں گے کہ تم کیسا لکھتی ہو۔

## شمس الرحمن پروانہ، پشاور

ایک افسانہ اور گاؤں کی کہانی لکھی ہے اگر آپ کی اجازت ہو تو بھیج دوں۔ "آئیڈیل کی تلاش" میں اپنا پیغام بھیجا تھا، ابھی تک شائع نہ ہوا۔ ان سے پوچھئے وہ مجھے اس قابل کیوں نہیں سمجھتیں کہ میرا بھی کسی لڑکی کے نام رشتہ شائع ہو سکے۔

ج: اپنی تحریریں ہمیں بھیج دیجئے۔ پڑھ کر رائے دے سکیں گے۔ آپ کی شکایت کا جواب یہ ہے کہ رشتہ بھیجتے وقت اپنی آمدنی، تعلیم، ملازمت اور دیگر کوائف لکھنا لازمی ہے۔ محض یہ لکھ دینا کہ ہم رشتہ

کر تا چاہتا ہوں کافی نہیں۔

## مس غلام نبی میمن، حیدرآباد

میں نے دوشیزہ کو ایک مخلص دوست سمجھ کر پڑھنا شروع کیا تھا اور اللہ کا شکر ہے کہ ابھی تک میری مونس اور غمگسار رہی ہے۔ میرے قلم میں وہ حسن و بے ساختگی نہیں جو اس رسالے کا معیار ہے تاہم ایک سچا افسانہ بھیج رہی ہوں، پڑھ کر رائے سے مطلع کیجئے۔ ایک شکایت بھی کرتی چلوں کہ پرچے کی ضخامت میں اضافہ کریں، تاکہ ذہنی تشنگی نہ رہے اور اس کے ساتھ انعامی سلسلہ بھی شروع کریں، اس طرح ہمیں اچھا لکھنے کی تحریک ہوگی۔

ج: سچا افسانہ سے آپ کی کیا مراد ہے۔ ویسے ہمیں آپ کا مختصر افسانہ مل گیا ہے شائع ہو جائیگا۔ انعام کی تجویز زیر غور ہے۔ ابھی ضخامت میں اضافہ ممکن نہیں۔

## میاں محمد مختار، شاہ پور

اچھے رشتے کے بارے میں میں نے اپنی رائے بھیجی تھی جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ کیا خطوں کی اشاعت کے لیے فیس بھیجنا پڑتی ہے۔ مجھے اس کے متعلق کچھ پتہ نہیں آپ رہنمائی کیجئے۔

ج: خطوط شائع کرنے کی کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ دراصل ہمیں آپ کا خط نہیں مل سکا تھا، لہذا جواب نہ دے سکے۔

## شمسہ فرخ، لاہور

اردو ادب سے گہرا شغف رکھتی ہوں حقیقت پسندی کا رجحان طبیعت پر غالب ہے اس لیے دوشیزہ کو مطالعہ کے لیے منتخب کیا ہے ایک افسانہ بھیج رہی ہوں، کیا شائع ہو جائے گا؟ اگر آپ کا جواب مثبت ہوا تو میں آئندہ بھی یہ قلمی معاونت جاری رکھوں گی۔

ج: شمسہ آپ کا افسانہ ملا۔ آپ کی تحریر صاف ستھری ہے۔ لیکن پلاٹ بہت پرانا لیا ہے آپ نے۔ سادہ سی بات کہ جھگڑے کا موضوع ہر رنگ میں ڈھالا جا چکا ہے۔ آپ بلاشبہ اچھا لکھ سکتی ہیں آپ کسی نئے موضوع پر افسانہ لکھ کر بھیجیں انشاء اللہ ضرور شائع کریں گے۔

## جہانگیر بیگ، لالہ موسیٰ

اگر آپ خواتین کی دلچسپی کے لیے کچھ کھانے پکانے اور کاڑھنے پرونے کے متعلق کالم بڑھا دیں اور مرد حضرات کے لیے فلمی اور سیاسی خبریں شائع کر دیں تو اس پرچے میں ہماری دلچسپی دوچند ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ ایک درخواست اور ہے کہ دوشیزہ کو ایک ماہ کی بجائے پندرہ روز بعد شائع کیا کریں۔ امید ہے آپ میری ان تجاویز پر سنجیدگی سے غور کریں گے۔

## محمد اسلم، لاہور

دوشیزہ کے قارئین کی خدمت میں محمد اسلم سلام عرض کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں اس محفل کی سب سے زیادہ خفا نظر آنے والی خاتون زاہدہ صاحبہ سے محفل میں شریک ہونے کی اجازت طلب کرتا ہوں۔ خدا کرے وہ فراخ دلی کا ثبوت دیں ورنہ ہم خوامخواہ بے ادب کہلائیں گے کیونکہ محفل میں شرکت تو ضرور کرنا ہے۔ اچھی چیز ہر ایک کو پسند ہوتی ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ہم اس پرچے کو محض اس لیے نہ پڑھیں کہ اس کا نام "دوشیزہ" ہے۔ پھر رائے کا حق ہر کسی کو حاصل ہے۔ زاہدہ صاحبہ بلاوجہ کی خفگی سے اپنا خون خوامخواہ جلا رہی ہیں۔

## انوارالحق ناز سرحدی، پشاور

"آئینہ دل کی تلاش" میں سے نازو سے فیصد لڑکیاں اعلیٰ عہدے داروں کے خواب دیکھتی ہیں۔ کیا آپ ان حسین اور عیش و عشرت کی دلدادہ شہزادیوں کی تصویریں شائع کر سکتے ہیں۔ ہم بھی دیکھیں ان اونچے دماغ والی حسینوں کا اپنا رُخِ مبارک کیسا ہے۔

"لعنت بھیجو ثریا پر۔ تو میرے قریب آؤ تو دیکھو میں تمہیں کیسی خوشی سے ہمکنار کرتا ہوں۔ مجھ کو خواہ مخواہ تنگ نہ کرو۔ میں کچھ ابھی حاضر کرتا ہوں۔ لو سادے چیک پر دستخط کیے دیتا ہوں۔ جو رقم چاہو، بھر لو بس میری گود میں آجاؤ۔ اب مجھ میں برداشت کی طاقت نہیں رہی۔"

وہ پھر میری طرف لپکا۔ میں نے اس کے چہرے پر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک لات بھی جما دی۔ حرامزادے! تم مجھے کیا سمجھ رہے ہو۔ کیا میں طوائف ہوں۔" غصے سے میرا جسم کانپنے لگا۔

اور پھر بیژن جیسے پاگل ہو گیا۔ میرے بھرپور طمانچے نے اسے دیوانہ بنا دیا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے کوٹ اتار کر میز پر ڈال دیا اور میری طرف بڑھتے ہوئے دانت پیس کر بولا۔ تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ آج تک کسی عورت نے یہ جرأت نہیں کی۔ اب تم اس کا مزا چکھو۔ کیا یاد رکھو گی کہ کسی بیژن سے تمہارا پالا پڑا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچتی سمجھتی اور مناسب قدم اٹھاتی۔ بیژن نے بڑی مضبوطی سے مجھے دونوں ہاتھوں سے جکڑ لیا اور اٹھا کر صوفے پر پٹک دیا۔ اس کے ساتھ خود بھی کسی کٹے ہوئے درخت کی مانند مجھ پر آ رہا۔ میں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، لاتیں چلائیں۔ مزاحمت کی، مگر سب بے کار ثابت ہوئے۔ بیژن نے مجھے اژدہا کی مانند جکڑ رکھا تھا۔ پھر مجھے اپنا لباس پھٹنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے بے بسی سے سر ڈال دیا اور بے تحاشا میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں اپنے نصیب پر آنسو بہا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ساری آفات ارضی و سماوی مجھے پریشان اور تباہ و برباد کرنے پر تل گئی ہوں۔ اسی وقت مجھے باہر قفل میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی۔ پھر [illegible] کھلا اور پرویز کا چہرہ دکھائی دیا۔ بیژن اس وقت بھی مجھے نوچنے کھسوٹنے میں لگا ہوا تھا اور میری مزاحمت تقریباً ختم ہو چلی تھی۔ مجھ میں سکت ہی کہاں رہ گئی تھی۔ پرویز ہکا بکا یہ منظر دیکھ رہا تھا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ پھر اس نے ایک وحشیانہ چیخ ماری اور تیزی سے بیژن کی طرف لپکا۔ بیژن نے فوراً مڑ کر دیکھا اور پرویز کو اپنے سر پر موجود پا کر ششدر رہ گیا۔ پھر اس نے جلدی سے پتلون چڑھائی اور اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر باورچی خانے کی طرف بھاگنے لگا۔ مگر پرویز نے ایک جست میں اسے جا لیا اور اسی طرح دبوچے ہوئے زمین پر آ رہا۔ پھر دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ پرویز اسے بری طرح پیٹ رہا تھا اور بیژن اپنے جرم کے تحت صرف اپنا دفاع کر رہا تھا۔ بیژن بار بار اس سے معافی مانگ رہا تھا اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ ایک زوردار مکا اس کے چہرے پر آ پڑتا تھا۔ بیژن کے کپڑے پھٹ گئے تھے آنکھوں اور پیشانی پر نیل پڑ گئے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور ان سے خون رسنے لگا تھا۔ مجھے ایک طرح کا اطمینان تھا کہ کم از کم پرویز نے یہ ضرور سوچا ہو گا کہ اس وقت جو کچھ ہو رہا تھا اس میں کم از کم میری رضامندی شامل نہیں تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو میرے کپڑے پھٹے ہوئے کیوں ہوتے۔ خدا کا شکر ہے کہ پرویز مجھ سے بدگمان نہیں ہوا تھا اور وہ بیژن ہی کو قصوروار جان کر بری طرح اس کی ٹھکائی کر رہا تھا۔ پھر مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں نیم عریاں ہوں اور دو جوان آدمی میرے سامنے باہم دست و گریباں ہیں۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھی اور اپنا پھٹا ہوا لباس سمیٹ کر کمرے میں گھس گئی۔

اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خدا جانے یہ دکھ کے آنسو تھے یا خوشی کے۔ بہرحال میں رو رہی تھی اور مجھے رونے سے سکون مل رہا تھا۔ دروازے کے باہر دو آدمیوں کی لڑائی جاری تھی ایک پٹ رہا تھا دوسرا پیٹ رہا تھا۔ بیژن بار بار پرویز کے آگے ہاتھ جوڑتا، خوشامد کرتا، مگر پرویز سوائے گالیاں دینے اور ہاتھ چلانے کے کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ بڑی بے رحمی سے بیژن کو پیٹ رہا تھا۔ گھونسے، تھپڑ، لاتیں، وہ ان تمام چیزوں سے کام لے رہا تھا۔ پھر مجھے بیژن کی تیز چیخ سنائی دی۔ پھر دہشت زدہ انداز میں بھاگنے اور بیرونی دروازے سے ٹکرانے کی آواز سنائی دی۔ بیژن بھاگ نکلا تھا۔ اس خیال سے مجھے بہت تقویت پہنچی۔ [illegible] نجات اور عافیت کے تصور سے میں ایک دم سست پڑ گئی۔ میں وہیں دروازے کے پاس اکڑوں بیٹھ گئی۔ میرا سر سوچنے سمجھنے سے محروم ہو رہا تھا۔ مجھے یہ بھی احساس نہیں رہا تھا کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں۔ میں زمان و مکاں کی قید سے بالکل آزاد ہو گئی تھی۔ پتہ نہیں کتنا وقت گزر گیا تھا جب مجھے دروازے پر پرویز کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازہ کو تھپتھپاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "نیلی! دروازہ کھولو۔ یہ میں ہوں پرویز۔ وہ موذی بھاگ گیا ہے۔"

پرویز کی آواز سے مجھے بہت سہارا ملا۔ پرویز میرا سہارا ہی تو تھا۔ ہاشم کے بعد دوسرا سہارا۔ گو ہاشم کے لیے میرے دل میں جو جذبات تھے وہ پرویز سے مختلف تھے۔ ہاشم کے ساتھ احترام کا تصور بھی شامل ہوتا تھا مگر پرویز کے ساتھ معاملہ دوسرا تھا۔ ایک منزل ہاشم تھی، تو دوسرا پرویز۔ ہاشم نے مجھے بڑی مصیبتوں سے اور کٹھن حالات سے گزار کر تہران تک پہنچایا تھا اور جب تہران پہنچ گئی تو میری قسمت پرویز سے وابستہ ہو گئی تھی۔ تہران میں پرویز کے علاوہ میرا اور کون تھا اور اگر راستے میں ہاشم میری مدد نہ کرتا تو میں کہاں ہوتی۔ ہاشم اور پرویز میری زندگی کے سنگ میل تھے میرے راستے کے چراغ تھے۔ میں ان کی مدد سے آگے بڑھ رہی تھی۔ مجھے ان کے تصور اور ان کی

قربت سے بڑا سکون ملتا اور طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔ جیسے میں بے حد محفوظ ہوں۔ جیسے ان کی موجودگی میں میرا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکے گا وہ میری سپر تھے۔ میری ڈھال تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب دوسرے کی دوسری طرف سے پرویز نے مجھے آواز دی۔ تو میرا دل بھر آیا اور میں پھٹنے لگی۔ ہاشم، پرویز اور بشیرن۔ تینوں انسان تھے۔ تینوں ابن آدم تھے۔ مگر کتنا فرق تھا ان تینوں میں۔ پرویز کی آواز سن کر میں کچھ سنبھلی اور اپنا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ میں ابھی تک برہنہ بغیر لباس کے بیٹھی ہوئی تھی میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور بستر کی چادر گھسیٹ کر جسم کے گرد لپیٹ لی پھر دروازہ کھول دیا۔ پرویز اندر آیا۔ چند لمحوں تک کھڑا ہوا غور سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔ وہ آگے بڑھا اور میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر آہستہ آہستہ بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ پھر اس نے چادر کا ایک کونا پکڑا اور میرے رخسار، گردن اور شانے پر پڑی ہوئی خراشوں سے خون صاف کرنے لگا اس نے مجھے شدت سے سینے سے بھینچ لیا۔ وہ بڑی نرمی اور اپنائیت سے بولا "روتی کیوں ہو لیلیٰ؟ تمہارے رونے سے مجھے تکلیف ہوتی ہے"

میں پرویز سے لپٹتے ہوئے بولی "اگر تم ذرا دیر اور نہ آتے تو اس کے بعد جو ہوتا میں اس کے انجام سے کانپ رہی تھی۔ میری طاقت جواب دے گئی تھی" میری آواز بھرا گئی۔

"بہرحال اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" پرویز نے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ پھر ذرا دیر تک سوچتا رہا۔ اس کے بعد مجھے مخاطب کر کے بولا "سمجھ میں نہیں آتا یہ کون تھا اور یہاں کس طرح داخل ہوا۔ اگر وہ دروازہ کھول کر آیا تھا تو دروازہ دوبارہ کیسے مقفل ہو گیا۔ کیا تم میرے ان سوالوں کا جواب دے سکتی ہو۔ رونے دھونے سے بہتر ہے تم اس سلسلے میں کچھ بتاؤ۔"

"اس کا نام بشیرن تھا۔" میں نے کہا۔

"بشیرن! کیا تم اسے جانتی ہو؟" پرویز نے پوچھا

"ایک مہینے سے جانتی ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ کس طرح ملی۔ کیا وہ اس سے پہلے بھی کبھی یہاں آیا تھا۔" پرویز نے پوچھا۔ اور اس بار میں چپ رہ گئی۔ اگر بات آگے بڑھتی تو ثریا کا معاملہ کھل جاتا۔ اگرچہ میرا دل چاہتا تھا کہ میں صاف صاف سب کچھ پرویز کو بتلا دوں۔ کیونکہ ثریا نے بشیرن کو یہاں بھیج کر بڑی زیادتی کی تھی اور بہت کمینگی کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے مجھے تباہ و برباد کرنے میں کیا کسر چھوڑی تھی۔ مگر یہ سب سوچنے کے باوجود خاموش ہو گئی بہر حال میں ثریا کو کوئی نقصان نہ پہنچانا چاہتی تھی میری کوشش یہ تھی

کہ ثریا اور میرے درمیان دوستی اور اعتماد کی فضا بحال رہے تو اچھا ہے حالانکہ وہ اس اعتماد کو مجروح کر چکی تھی۔ میں پرویز کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "چھوڑو پرویز! اس ذکر کو جانے دو۔"

میں نے پرویز کے چہرے پر حیرت کے آثار دیکھے۔ پھر وہ دکھی لہجے میں بولا "اگر یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے تو مجھے افسوس ہے مجھے بشیرن کا پتہ بتاؤ تاکہ میں جا کر اس سے معافی مانگ لوں۔"

مجھے یک لخت اپنی غلطی اور حماقت کا احساس ہو گیا۔ ثریا نچ رہی تھی اور میں ماری جا رہی تھی۔ پرویز کے دلی احساسات کا اندازہ کر کے میں کانپ کر رہ گئی۔ ضرورت سے زیادہ عقل مندی اور ہوشیاری آدمی کو مار دیتی ہے۔ ثریا کو بچانے کی کوشش میں میں خود داؤ پر لگ رہی تھی اور بہرحال میں اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ میں یہاں تک نہیں جا سکتی تھی۔ ثریا ایسی عورت اور دوست نہیں تھی کہ جس کی خاطر میں اتنی بڑی قربانی دے سکتی۔ میں اسے بچا رہی تھی اور وہ مجھے بگاڑ رہی تھی۔ میں نے پرویز کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے اداسی جھلک رہی تھی۔ یا تو میں اس قابل نہیں تھی یا وہ میرے قابل نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان میں سے کسی ایک کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے رخسار سے لگاتے ہوئے بولی "پرویز! پرویز! خدا کے لیے مجھ سے بدگمان مت ہو۔ تم میری پریشانی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں بڑی بدقسمت لڑکی ہوں۔ آگے جلوں کی کہانی ہے۔

پیچھے ہٹوں تو آگ ہے۔ میں رکی اور پھر انتہائی التجا آمیز لہجے میں بولی "پرویز! مجھ سے تفصیل نہ پوچھو۔ میں کسی کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی بس یہیں بات ختم کر دو۔"

"اعتماد، کیسا اعتماد اور کس کا اعتماد؟" پرویز چیختے ہوئے بولا "تم بہت سی ایسی باتیں جانتی ہو، جو میں نہیں جانتا۔ اگر تم نے مجھے وہ باتیں نہ بتائیں تو میں سمجھوں گا کہ بشیرن کے تم سے پہلے سے تعلقات تھے اور وہ تمہاری مرضی سے یہاں آیا تھا۔"

میری آنکھوں سے پھر آنسو جاری ہو گئے۔ خدایا میں کس مقام پر آ کھڑی ہوئی تھی۔ سبھی مجھ کو نشانہ بنا رہے تھے۔ سبھی مجھ پر اپنے طعنے تشنے خالی کر رہے تھے۔ میں سب کا ہدف ملامت بنی ہوئی تھی۔ آخر میرا قصور کیا تھا۔ میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا۔ کیا میں دنیا کی سب سے بڑی اور مجرم لڑکی تھی۔ کیا مجھ سے زیادہ بری اور قابل نفرین لڑکی اس دنیا میں کوئی نہیں تھی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں ایک کمزور لڑکی تھی۔ میرے ساتھ ایک کمزوری ہے اور کمزور ہونا دنیا کا سب سے بڑا جرم ہے اور یہ سب جو کچھ ہو رہا تھا۔ میری کمزوری کی سزا تھی۔

"پرویز! کیا تم مجھے نمک حرام سمجھتے ہو۔ آخر میں نے کسی کا نمک کھایا ہے۔" میں ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔

"ہوں۔ تو میرا خیال صحیح نکلا" پرویز کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی "شاید کسی سے نمک حرامی نہیں کرنا چاہیے۔ مگر لیلیٰ کیا میں نے تمہیں نہیں بتایا کہ تمہارے سمیت ثریا کے تمام اخراجات میں برداشت کرتا ہوں۔ پھر یہ ثریا سے نمک حرامی کہاں ہوئی۔ ثریا تو خود نمک حرام ہے۔" اچانک پرویز نے میرا ایک ہاتھ پکڑ کر اس تیزی سے مروڑا کہ درد سے میری چیخ نکل گئی اور میں پھرکی کی مانند گھوم گئی۔ چادر میرے جسم سے پھسل کر فرش پر گر گئی۔ اس کے ساتھ ہی پرویز اپنی اس حرکت پر پشیمان ہو گیا۔ اس نے تیزی سے جھک کر چادر اٹھائی اور میرے جسم کے گرد لپیٹ دی۔ پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑا۔ گھسیٹتا ہوا ہال تک لے آیا اور کرسی پر دھکیل دیا۔ پھر میری طرف جھکتے ہوئے بولا "یہ بشیرن ثریا کا بھیجا ہوا تھا اور اس کے ثریا سے تعلقات ہیں۔ کیوں؟" میں پھر خاموش رہی۔ پرویز ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولا "سنو لیلیٰ غور سے سنو۔ اس واقعے کے بعد سے تم اس گھر میں نہ رہ سکو گی۔ ثریا تمہیں ٹکنے ہی نہ دے گی۔ تم کوئی ایسی جگہ نہیں جانتیں۔ نہ کسی سے تمہاری واقفیت ہے۔ جہاں جا کر تم رہ سکو۔ صرف ایک میں ہوں جو تمہارے کام آ سکتا ہوں۔ تمہیں بہر حال میری ضرورت پیش آئے گی اور میں ہر صورت میں تمہاری مدد کے لیے تیار ہوں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ تم

اس قصہ درست شدہ کہانی ہو جو میری موجودگی میں کوئی فیصلہ کر سکے۔ تمہاری یادداشت کمزور نہیں ہے تو تمہیں یاد ہو گا کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ تمہیں چاہتا ہوں۔ تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ پھر تمہاری طرف کوئی نظر اٹھا کر دیکھے گا۔ میں تمہیں اتنا چاہتا ہوں اور تم مجھ سے اتنی لاپروا ہو۔"

میں دونوں ہاتھوں میں اپنا سر دبا کر بیٹھ گئی۔ اور ثریا اس حیثیت اور رتبے کے بارے میں سوچنے لگی جسے کافی دیر ہو گئی۔ مجھے شانے سے ہلاتا ہوا بولا "اچھا میں جا رہا ہوں۔ تم لڑکیوں کو ذرا مشکل ہوتا ہے۔"

میں نے پرویز کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنکھوں پر ملتے ہوئے بولی "مجھے اس جہنم میں تنہا چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔"

"میں کب جانا چاہتا ہوں۔ مگر شاید تمہیں جہنم میں رہنے سے ڈر ہے۔ بعض لوگوں کو جنت کی فضا راس نہیں آتی [illegible]"

میں نے دونوں ہاتھ پرویز کی گردن میں ڈال دیئے اور اپنا [illegible] اس کے چہرے پر رکھتے ہوئے بولی "بشیرن ثریا کا محبوب ہے۔ وہ یہاں کئی بار آ چکا ہے۔ اور ثریا اس سے کئی بار ہم بستر ہو چکی ہے۔ بہت بے حجاب عورت ہے۔ اسے مجھ سے بھی شرم نہیں آتی۔ وہ میری آنکھوں کے سامنے خوابگاہ میں جاتے تھے اور دروازہ کھلا رکھتے۔"

پرویز مجھ سے علیحدہ ہو کر دوسری کرسی پر جا پڑا۔ پرویز کی حالت محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اسے انتہائی بلندی سے پٹخ دیا ہو۔ وہ دیر تک آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ پھر آنکھیں کھولتے ہوئے آواز میں بولا "لیلیٰ! تم نے میرے ایک شبہے کی تصدیق کر دی ہے۔ اس لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ کچھ عرصے سے میرے دل میں ایک کانٹا چبھ رہا تھا۔ آج وہ کانٹا نکل گیا ہے۔ اب میں آزادانہ طور پر اور عمل کر فیصلہ کر سکتا ہوں۔"

میں اٹھی اور پرویز کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ پھر اس کے زانو پر سر رکھتے ہوئے بولی "میں نے اس بات پر ثریا کی [illegible] کی تھی اور کہا تھا کہ یہ اچھی بات نہیں ہے کہ وہ محبت اور شادی کسی سے کرے اور ہم بستر کسی اور سے ہو۔ اس پر ثریا نے کہا تھا کہ وہ [illegible] کیوں کہ بشیرن اس کی ایک کمزوری سے واقف ہے۔ اگر وہ اسے ناراض کرے تو بشیرن اس کے لیے بہت سی مشکلات پیدا کر دے گا۔"

"کمزوری، کیسی کمزوری؟" پرویز بڑبڑایا۔

ثریا نے مجھے وہ کمزوری نہیں بتائی۔ بشیرن اس کمزوری کی بنا پر ثریا سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ بشیرن سے ایسے تعلقات رکھنے کے باوجود

میں نے بڑی حسرت بار نظروں سے مکان کے در و دیوار پر نظر ڈالی۔ پنڈی کے بعد یہ دوسرا گھر تھا جہاں مجھے سکون و آرام ملا تھا۔ تین ماہ کے قیام کے دوران میں اس گھر سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ اس گھر کی حیثیت اس نخلستان کی سی تھی جو صحرا میں بھٹکے ہوئے پیاسے اور درماندہ مسافر کو اچانک نظر آ جائے۔ اس مکان میں ٹھہر کر میں نے بہت سے خواب دیکھ ڈالے تھے۔ یہیں اسی مکان میں میری زندگی میں بڑی فیصلہ کن اور انقلابی تبدیلیاں آئی تھیں۔ مجھے اس گھر سے کبھی اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ مگر اب سارا کھیل بگڑ چکا تھا۔ میں یہ گھر چھوڑ رہی تھی کیونکہ اب یہ گھر مجھے اپنا مقتل نظر آنے لگا تھا۔ میں جانتی تھی کہ ثریا میری دشمن بن چکی تھی۔ آج کے دن تک وہ میری چھپی ہوئی دشمن تھی۔ مگر اب وہ میرے خون کی پیاسی ہو جائے گی۔ جب عورت عورت کی دشمن بن جاتی ہے تو بہت برا ہوتا ہے۔ کاش میں اور ثریا دوست بن کر رہ سکتے۔ اب یہ ناممکن ہو گیا تھا۔ کیونکہ پرویز ہمارے درمیان تھا۔ ثریا اور میں نے پرویز پر بازی لگائی تھی۔ ثریا یہ بازی ہار گئی تھی اور میں پرویز کے ساتھ جا رہی تھی۔ دنیا میں کم لوگ ایسے ہیں جو اپنی شکست کو صبر و سکون اور خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کریں۔ ثریا بھی انھی لوگوں میں سے تھی۔ وہ مجھے کبھی نہ معاف کرے گی۔

"کھڑی کیا کر رہی ہو، چلو" قریب سے پرویز کی آواز ابھری۔

"سوچتی ہوں ثریا کے لیے ایک رقعہ لکھتی جاؤں" میں نے کہا۔

"نہیں کوئی ضروری نہیں ہے۔ تمھیں جو کچھ کہنا ہے، مجھ سے کہہ دو۔ جب اس سے ملوں گا تو کہہ دوں گا۔ ثریا جیسی عورت کے پاس اپنی کوئی تحریر چھوڑنا سخت حماقت ہے۔ تمھیں یہ اندازہ نہیں کہ کسی چیز سے غلط طور استفادہ کرنے کی ثریا میں بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ وہ ہر چیز سے اپنے مطلب کا کوئی نہ کوئی پہلو اخذ کر لیتی ہے۔ لہٰذا میں تمھیں رقعہ لکھنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ اب چلو جس قدر دیر لگاؤ گی، مسائل پیدا ہوتے چلے جائیں گے۔"

ہم دونوں مکان سے باہر نکل آئے۔ بیرونی دروازے کو مقفل کرنے کے بعد چابی گیلری میں رکھے ہوئے ایک گملے میں ڈال دی۔ ثریا اور میرے درمیان یہ قرار پایا تھا کہ ایک دوسرے کی عدم موجودگی میں چابی اس گملے میں ڈال دیا کریں گے۔ میں گاڑی میں پرویز کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ یہ گاڑی وہی تھی جس میں لیٹ کر میں تہران آئی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب میں گاڑی کے پچھلے حصے میں خود کو سکیڑے سمیٹے نہیں لیٹی تھی بلکہ اگلے حصے میں اس جگہ بیٹھی ہوئی تھی جو ثریا کے لیے مخصوص تھی۔ دیکھا جائے تو یہ فاصلہ کچھ نہیں تھا۔ مگر یہ بہت بڑا فاصلہ تھا۔

گاڑی کے پچھلے اور اگلے حصے کے درمیان کتنا فاصلہ ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ چند فٹ یا چند گز کا، مگر بعض فاصلے فٹ اور گز کے محتاج نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ فاصلے ناپے نہیں جا سکتے۔ دلوں کے فاصلے کون ناپ سکتا ہے۔ ثریا اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی اور اس کی جگہ میں نے لے لی تھی۔ تین ماہ میں میں نے یہ جو فاصلہ طے کیا تھا انیس سال کے عرصے میں وہ نہ کر سکی تھی۔ جب میں پہلی بار اس گاڑی میں سوار ہوئی تھی تو پرویز سے یہ توقع نہ تھی اور سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ میں اس کے پہلو میں بیٹھ کر سفر کروں گی۔ مگر آج حقیقت تھی۔ مجھے کچھ فخر کا احساس ہوا۔ میں پرویز کی گاڑی میں بیٹھی تھی۔ میں پرویز کے دل میں بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میری پلکیں بھی بھیگی جا رہی تھیں۔ ایک عجیب قسم کے غم کا احساس تھا۔ نامعلوم غم اور بوجھ کے تلے میں دبی جا رہی تھی۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں رو رو کر دل ہلکا کر سکوں تاکہ کچھ بوجھ ہلکا ہو، غبار چھٹے۔ مگر فی الوقت ایسا نہ کر سکتی تھی۔ میرے دل و دماغ بڑی شدت سے سوچ رہے تھے کہ اب میرا مستقبل کیا ہو گا۔ میں کہاں جاؤں گی۔ کیا میری قسمت میں بادیہ پیمائی ہی لکھی ہوئی ہے۔ کہیں میرا ٹھکانہ میرا مکان ہے بھی یا نہیں۔ جو سفر میں نے شروع کیا تھا کہیں اس کا اختتام ہے بھی یا نہیں۔ اور اگر ہے تو وہ خوشگوار ہے یا ناخوشگوار۔ مجھے خود کو خوش قسمت تصور کرتے ہوئے ذرا ہچکچاہٹ سی ہوتی تھی۔ میں خوش نصیبی اور اپنی ذات کو دو متضاد چیزیں تصور کرنے لگی تھی۔ جہاں جہاں لیلیٰ ہو وہاں خوش بختی کا کیا کام۔ لیلیٰ کے معنی سیاہی یا رات کے ہیں۔ شاید میرے راستے میں سیاہی ہی سیاہی ہے۔ شاید میری رات کی کوئی صبح نہیں۔

میں سوچتی تھی کہ کامیاب اور کامران ہو کر پنڈی واپس جاؤں گی تو میرے گھر والے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ میں ان پر ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی کہ میں جو گھر سے نکلی تھی تو میرا وہ فیصلہ غلط نہیں تھا۔ مگر حالات اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے کہ میرے پاؤں کہیں جم نہیں پا رہے تھے۔ بس خوشی اس بات کی تھی کہ میں اب تک خود کو جیتی کامیابی کے ساتھ آلودگیوں سے بچاتی آ رہی تھی۔ خدا کرے میں اسی طرح پاک صاف اور منزہ واپس اپنے والدین تک پہنچوں۔ اس سوچ بچار میں میں پرویز کو بھول گئی تھی۔ میں نے مڑ کر پرویز کی طرف دیکھا۔ گاڑی سڑک پر بھاگی جا رہی تھی۔ پرویز کے طور طریقے اور نشست و برخاست سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی اچھے اور شریف خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ ہاشم کے بعد یہ دوسرا شخص تھا جس نے مجھے متاثر کیا تھا۔ ورنہ حالات نے تو مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ شاید اب دنیا اچھے لوگوں سے خالی ہو گئی ہے۔ ہاشم اور پرویز میری زندگی میں نہ آتے تو شاید مرد ذات پر سے میرا اعتماد بالکل ہی ختم ہو جاتا۔ بہرحال اب جو کچھ تھا میرے لیے پرویز تھا۔ میرا سہارا، میری امیدوں اور میرا مستقبل، میں [illegible]

کے شانے سے سر ٹکا لیا۔

پرویز کی گاڑی سڑک پر تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ ہم دونوں ہی خاموش تھے۔ اس وقت ہمارے درمیان گفتگو کرنے کے لیے کوئی موضوع نہیں تھا یا شاید ہم منتظر تھے کہ پہلے کون گفتگو کا آغاز کرتا ہے۔ وہ بھی میری ہی طرح افسردہ اور اداس تھا۔ اس کی بھنویں سکڑی ہوئی اور لب بھنچے ہوئے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ثریا کی طرف سے زبردست جذباتی جھٹکا لگا تھا۔

ایک جگہ ٹریفک کا سگنل سرخ ہوا تو پرویز نے گاڑی روک دی اور میری طرف دیکھے بغیر آہ بھرتے ہوئے کہا "ثریا نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ اس کی ایسی کون سی کمزوری تھی جس کی بنیاد پر شیراز اس سے فائدہ اٹھا رہا تھا۔"

"یہ تو اس نے نہیں بتایا۔ البتہ وہ شیراز سے خوف زدہ نظر آتی تھی۔"

میں نے جواب میں کہا "پرویز سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر آہستہ سے بولا "شاید ثریا ماضی میں کسی جرم کی مرتکب ہوئی ہو اور شیراز اسی جرم کو بنیاد بنا کر بلیک میل کر رہا ہو۔ اور پولیس کی دھمکی دیتا رہتا ہو۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی بتی سبز ہو گئی اور پرویز نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں نے اس سے مخاطب ہو کر پوچھا "پرویز! ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"کیا مجھ پر اعتماد نہیں ہے" اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ تم غلط سمجھے۔" میں جلدی سے بولی "دراصل اب مجھ میں مزید صدمے سہنے کا حوصلہ نہیں رہا۔ جہاں بھی چلنے لے جاؤ لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ میں ثریا اور اس جیسی دوسری لڑکیوں سے بہت مختلف ہوں۔ میں تمہارے ساتھ خود کو سنوارنے کے لیے آئی ہوں بگاڑنے کے لیے نہیں۔"

پرویز کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ مجھے نیم باز نظروں سے دیکھتا ہوا بڑے پرجوش اور دوستانہ لہجے میں بولا "بس تم ایک بار مجھ پر آنکھ بند کر کے اعتماد کر لو پھر دیکھو کہ میں کیا کرتا ہوں۔ کیا تمہیں مجھ میں اور شیراز میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔"

"وہ تو میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں۔ مگر یہ سوچ لو کہ ثریا آسانی سے تمہارا پیچھا چھوڑنے والی نہیں ہے اور رہا میرا سوال تو وہ شاید ہی مجھے کبھی فراموش کر سکے۔"

"میں تمہیں ایسی جگہ لے جاؤں گا جہاں ثریا کا پہنچنا محال ہے" پرویز نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ میں نے تفصیل پوچھنا چاہی مگر پرویز مسکراتے ہوئے بولا "تمہارے زیادہ سوالات سے اعصاب کا تناؤ بڑھ گیا ہے۔"

کئی سڑکیں اور چوراہے گزرنے کے بعد ہم ایک مکان کے سامنے پہنچ گئے۔ یہ مکان ایک چھوٹی گلی میں واقع تھا اور سامنے ایک چھوٹا سا آہنی گیٹ لگا ہوا تھا۔ پرویز گاڑی سے اتر کے گیٹ تک گیا اور گیٹ پر نصب ایک خودکار مواصلاتی آلے کے ذریعے اندر کسی سے بات کرنے لگا۔ دور ہونے کے باعث میں ان کی گفتگو نہیں سن سکی۔ کچھ دیر بعد پرویز نے میری طرف دیکھا اور سر کے اشارے سے اپنے قریب آنے کو کہا۔ میں گاڑی سے اتری اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جلدی سے پرویز کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت گلی میں کوئی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ کسی ٹیکسی یا آدمی کا نشان نہیں تھا۔ میں اپنا پرس سنبھالتے ہوئے پرویز کے قریب پہنچی تھی کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بڑی بے چینی سے کہا "اندر۔ جلدی سے"

اس نے گیٹ کا ذیلی دروازہ کھول کر مجھے اندر دھکیل دیا اور اس کے بعد خود بھی اندر داخل ہو گیا۔ اندر آنے کے بعد اس نے ادھر ادھر دیکھا اور گیٹ پوری طرح کھول دیا پھر اپنی گاڑی بھی اندر لے آیا اور گیٹ مضبوطی سے بند کر دیا۔

مکان دو منزلہ تھا اور بیلڈنگ کے شیشے اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے تھے۔ ایک بڑا سا چوبی دروازہ ہال میں کھلتا تھا اور وہاں خانہ داری کے لباس میں ملبوس ایک جوان عورت ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ بہت خوش اخلاق نظر آتی تھی۔

"مسٹر پرویز! خیریت تو ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "میں یہ سب تفصیل سے بتاؤں گا۔ مسعود گھر پر نہیں ہے" پرویز نے پوچھا۔

"وہ نو بجے کے بعد گھر آئے گا۔" عورت نے جواب دیا اور ہمیں اوپر آنے کا اشارہ کیا۔ ہم زینے طے کرنے لگے۔ میں نے غور سے عورت کا جائزہ لیا۔ وہ دراز قامت اور نازک اندام تھی۔ اس

سامنے والے جزیرے سے دولت نامہ آیا ہے

نے پورا لباس پہن رکھا تھا مگر اس کے باوجود اس کے جسم کی خوبصورتی اور تناسب ظاہر ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس نے جسم خوبصورت رکھنے کے لیے کافی محنت کی ہے۔ وہ مجھے بہت غور اور تجسس سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے لبوں پر پُرتپاک مسکراہٹ تھی اور اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ پرویز اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ "فاطی! ایلی سے ملو۔ ان کے بارے میں سردست اور تو کچھ نہیں کہہ سکتا بس اتنا سمجھ لو کہ یہ میری دوست ہیں۔" پھر میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "اور ایلی! یہ فاطی خانم ہیں۔ میری بہن سمجھو۔ یقیناً میں انہیں بہن جیسا عزیز رکھتا ہوں۔ ان کے شوہر میرے جگری دوست ہیں۔ دس بارہ سال سے ہم تینوں کی دوستی قائم ہے۔ میں نے ہی فاطی اور مسعود کو ملوایا اور پھر ایسا چکر چلایا کہ دونوں شادی کے بندھن میں جکڑے گئے۔"

پرویز کی بات سن کر فاطی ہنسنے لگی۔ دوسری منزل پر [illegible] کے قریب پہنچ کر فاطی رک گئی اور مستعدی سے خم ہو کر مجھے اندر داخل ہونے کے لیے کہا۔ اندر ڈرائنگ ہال تھا جسے بڑی ہنرمندی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ فاطی بڑے اچھے ذوق کی مالک تھی۔ اس کی سلیقہ شعاری سے میں بہت متاثر ہوئی۔ اس نے ہمیں ڈرائنگ روم میں لے جانا چاہا مگر پرویز ہال میں ایک کرسی پر پسر گیا اور ہنستے ہوئے لہجے میں بولا۔ "بس یہیں ٹھیک ہے فاطی۔ بس ذرا جلدی سے چائے بنا لاؤ۔"

فاطی ایک دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ "ذرا میں لباس تبدیل کر لوں۔"

"فاطی کے جاتے ہی میں اور پرویز ہال میں تنہا رہ گئے۔ میں نے تیزی سے اطراف کا جائزہ لیا اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "پرویز! مجھے ڈر سا لگ رہا ہے۔ خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔"

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔" پرویز میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اب کوئی ناخوشگوار بات نہیں ہوگی۔ بس خدا سے یہ دعا ہے کہ کسی طرح ثریا سے میری جان چھوٹ جائے۔ وہ تو میری زندگی کا عذاب بن گئی ہے۔ اب خدا خدا کر کے وہ وقت آیا ہے جب میں بہانہ بنا کر اس سے الگ ہو سکتا ہوں۔ اول تو وہ مارے شرم کے میرے قریب نہیں آسکے گی اور آئی تو اس سے کہوں گا کہ وہ کیسی بے شرم عورت ہے کہ بیرے سے ناجائز تعلقات رکھنے کے باوجود وہ خود کو پاک دامن اور باعفت کہتی ہے اور مجھ سے شادی کرنے کی خواہاں ہے۔"

"یہ تمام باتیں میں تم سے پہلے سوچ چکی ہوں۔" میں نے کہا۔ "ثریا بہت خطرناک عورت ہے۔ تم اس کے ساتھ رہتے ہوئے بھی تین سال میں اسے شناخت نہیں کر سکے جبکہ میں نے دو مہینے میں اسے خوب اچھی طرح پہچان لیا ہے۔"

پرویز نے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا جیسے اسے میرے خیال سے اتفاق ہے۔ اسی وقت فاطی لباس تبدیل کر کے واپس آگئی۔ اس نے خوبصورت اور بیش قیمت لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا لباس چست اور ہلکا نیلا تھا۔ اور اس نے اپنے اخروٹی رنگ کے بالوں کو جمع کر کے پیچھے کی طرف باندھ رکھا تھا۔ اس وقت کوئی جاپانی عورت نظر آرہی تھی۔ وہ ہم لوگوں کے قریب رکی، خوش اخلاقی سے مسکرائی اور کچن کی طرف چل گئی۔ جاتے جاتے وہ پلٹی اور پرویز سے مخاطب ہو کر بولی۔ "تمہیں پتا چلا پرویز! مسعود اس بار چیتے کا شکار نہیں کر سکے۔ معاملہ مانے نے جو اس کے حوالے کر دیا یہ چلا آیا۔ ویسے بھی موجودہ حالات میں کچھ اچھے ثابت نہیں ہوتے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا۔ میں بے اختیار مسکرا دی۔ مگر پرویز اس وقت اپنے موڈ کی وجہ سے کچھ کے موڈ میں نظر نہیں آتا تھا۔ وہ پاؤں پھیلاتے ہوئے بولا۔ "قہوہ بھابھی۔ بس جلدی سے لاؤ کچھ تو تھکن دور ہو۔"

"کیا جنگل سے واپس آتے ہو؟" فاطی شوخی سے بولی۔ پرویز نے معنی خیز نظروں سے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ "جنگل ہی سمجھو۔ بس ہمت درست نہیں ہوئی۔" اس نے فاطی سے کہا۔

"ارے پرویز! آخر ثریا کا کیا بنا۔" فاطی کو جیسے اچانک کچھ یاد آگیا۔ جواب میں پرویز ہنسنے لگا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتا ہوا بولا۔ "اس کا ذکر نہ کرو۔ خدا کا شکر ہے کہ جان چھوٹ گئی۔"

"مجھے یقین نہیں آیا۔" فاطی مسکراتے ہوئے بولی۔ "ثریا اس قبیل کی عورت نہیں ہے کہ آسانی سے کسی کا پیچھا چھوڑ دے اور تم سے دست بردار ہونا تو بہت مشکل ہے۔ مگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو کہوں کہ اس نے بڑا اچھا [illegible] رکھا تھا۔"

پرویز کچھ جھینپ گیا۔ فاطی کچن میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ابلتے ہوئے پانی کی کیتلی، کچھ پیالیاں، چینی اور قہوہ لیے ہوئے ہمارے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ہمارے درمیان پھر گفتگو چھڑ گئی۔ پرویز سیدھا بیٹھا ہوا فاطی سے مخاطب ہو کر بولا۔ "فاطی! اب تم ایک بہت اہم بات غور سے سنو۔ میں جانتا ہوں کہ اس مکان کی اصل مالک تم ہو۔ یہاں تمہارا حکم چلتا ہے۔ تم حکم دیتی ہو اور مسعود اس کی اطاعت کرتا ہے۔ میں تم سے جو کہنے جا رہا ہوں غور سے سنو۔"

"آخر قصہ کیا ہے؟" فاطی کچھ حیرت سے بولی۔

"ابھی بتاتا ہوں۔"

پرویز نے سگریٹ جلائی اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "فاطی ڈیئر! یہ جو خوبصورت سی لڑکی تمہارے سامنے بیٹھی ہوئی ہے، یہ میرے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ فی الحال تم اسے دوست سمجھ لو

اور یہ پوچھنا کہ یہ کون ہے کہاں سے آئی ہے اور میری ملاقات اس سے
کس طرح ہوئی۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ثریا نے لیلیٰ کو قتل
کرنے کا پکا ارادہ کر لیا ہے۔ وہ جب بھی اسے کہیں بھی موقع پا سکی بلا کر
قتل کیے بغیر نہ چھوڑ سکی۔"

نائلہ بہت غور سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں میں تجسس
تھا، تحیر تھا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ پرویز دوبارہ کہنے
لگا "میں اتفاق سے آج صبح اس وقت لیلیٰ کے پاس پہنچا جب کہ وہ ثریا
کے بچھائے ہوئے ایک دام میں پھنس چکی تھی اگر وقت پر نہ پہنچتا تو لیلیٰ کا
حشر بہت خراب ہوتا۔" پرویز نے مختصراً وہ واقعہ نائلہ کو سنا دیا۔ میری
نظریں شرم سے جھک گئیں۔ میں نے کنکھیوں سے دیکھا نائلہ میری طرف
دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر نائلہ ہی نے اس
خاموشی کو توڑا۔ اس نے پرویز سے مخاطب ہو کر کہا "اور تم اب لیلیٰ کو یہاں
لے آئے ہو۔"

"ہاں نائلہ ڈیئر" پرویز نے کہا۔ "اس کے لیے میں ایک قسم کی
درخواست تھی۔ میں چاہتا ہوں تم میری مدد کرو۔ میں لیلیٰ کو جہاں کہیں
لے جاؤں گا وہ جگہ پوشیدہ نہ رہ سکے گی۔ ثریا فوراً اسے تلاش کر لے
گی۔ البتہ لیلیٰ اگر یہاں رہے تو ثریا کو یہاں تک پہنچنے میں دشواری ہو گی۔
یہ مدت کچھ زیادہ نہیں ہو گی۔ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ یا دس دن۔ اس عرصہ
میں میں کوئی مکان تلاش کر لوں گا اور لیلیٰ کو لے جاؤں گا۔"

پرویز کے خاموش ہوتے ہی ایک بار پھر ہال میں سکوت چھا گیا۔ یہ
خاموشی شاید ہم تینوں ہی کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ میرا دل بڑی تیزی
سے دھڑکنے لگا تھا۔ میں اُمید و بیم کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ اس وقت میری
حالت اس مجرم جیسی تھی جو کہ عدالت میں فیصلہ سننے کے لیے کھڑا ہو۔
میں دل ہی دل میں خدا سے دعا کر رہی تھی کہ نائلہ مجھے یہاں رکھنے پر آمادہ
ہو جائے۔ اگر وہ راضی نہ ہوتی تو میرے راستے میں بڑی دشواریاں پیش
آ سکتی تھیں اور ثریا مجھے تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑ سکتی۔ میں نے
نائلہ کی طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ خدا کرے
اس کا فیصلہ مثبت ہو۔ ظاہری طور پر تو نائلہ نیک دل اور پُرخلوص نظر آتی
تھی مگر ہر ایک کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ جانتے ہوئے بھی
مجھے دھڑکا سا لگا تھا کہ نہ جانے کیا ہوگا۔ یہ سوچ کر میری پیشانی بھیگنے لگی۔

نائلہ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر سر اٹھا کر انتہائی سنجیدہ لہجے میں
بولی۔ "پرویز! تمہیں اندازہ ہوگا کہ ایک جوان اجنبی لڑکی کو گھر میں رکھنا
اتنی آسان بات نہیں ہے۔ میں سمجھ سکتی ہوں کہ تم کیا چاہتے ہو۔ کچھ
تھم کر وہ میری طرف مڑی اور معذرت خواہ لہجے میں بولی "معاف

کرنا لیلیٰ! میرا مقصد تمہارا مذاق اڑانا یا دل آزاری نہیں ہے بات یہ
ہے کہ میں تمہارے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔"

نائلہ کے الفاظ سن کر میں ایک بار شرمندہ ہو گئی۔ اہانت تو میری ہوئی
تھی اور دل آزاری بھی میری ہی کی جا سکتی تھی۔ نائلہ کی جگہ کوئی بھی ہوتا یہی
سوچتا۔ بس یہ تھا کہ نائلہ نے خوش اخلاقی سے کام لیا تھا۔ میں اپنی تکلیف کو کم
کرنے کی خاطر نائلہ سے مخاطب ہو کر بولی "تم صحیح کہہ رہی ہو نائلہ خانم!
واقعی میں اجنبی ہوں اور اجنبیوں کا کیا بھروسہ۔ اب اگر میں اپنے بارے
میں کچھ بتاؤں بھی تو خدا جانے تم صحیح سمجھو یا نہ سمجھو۔"

چلو قصہ تمام ہوا۔ میں نے اپنے دل میں سوچا مگر جواب میں نائلہ
نے جو کچھ کہا وہ میری توقع کے بالکل خلاف ثابت ہوا۔ وہ پرویز سے مخاطب
ہو کر بولی "مگر اس کے باوجود میں لیلیٰ کو یہاں رکھنے پر آمادہ ہوں۔ یہ لڑکی
دوسری لڑکیوں سے کچھ مختلف معلوم ہوتی ہے۔ مجھے اس کی معصومیت پسند
آئی ہے۔ میں ذاتی طور پر مطمئن ہوں کیونکہ مجھے تم پر اعتماد ہے مگر
مسعود سے پوچھنا ضروری ہے۔ پرویز! تم جانتے ہو اس گھر میں میری
حکمرانی ہے اور مسعود میری اطاعت کرتا ہے۔ یہ درست ہے مگر اس
قدر اثر و نفوذ کے باوجود میں مسعود کی مرضی اور پسند کے خلاف کوئی
کام نہیں کرتی اور مجھے پوری امید ہے کہ اسے آمادہ کرنے میں کامیاب
ہو جاؤں گی۔"

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ میں نے
کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔ نائلہ ہمارے لیے قہوہ کی دوسری پیالی
تیار کرنے لگی۔ قہوہ تیار ہونے کے بعد نائلہ اور پرویز میں دوبارہ ثریا
سے متعلق گفتگو چھڑ گئی۔ پرویز ثریا سے جان چھوٹنے پر بے حد خوش نظر
آ رہا تھا۔ اور نائلہ اسے مبارکباد پیش کر رہی تھی۔ گفتگو کرتے ہوئے
جانے کتنی دیر ہو گئی تھی کہ اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔ اس کے بعد ہی
نیچے آہنی گیٹ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ نائلہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی اور کھڑکی
کا پردہ سرکاتے ہوئے بولی "مسعود آ گیا۔"

یہ جملہ کیا تھا بم کا گولہ تھا جو میرے کانوں سے آ کر ٹکرایا۔ مسعود کی آمد
کے ذکر سے میں ایک بار پھر دہشت زدہ ہو گئی تھی۔ دیکھیں وہ میرے
بارے میں کیا فیصلہ کرتا ہے۔ پرویز اور نائلہ اسے متاثر کر سکے تو ٹھیک
ہے ورنہ بستر گول۔

دو تین منٹ بعد ہال کا دروازہ کھلا اور مسعود اندر داخل
ہوا۔ پرویز اور نائلہ اس کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے۔ مسعود
تیس پینتیس سال کا رہا ہوگا۔ اس کے سر کے بال گھنے تھے اور رنگ
کھلا تھا۔ شکل و صورت اور وضع قطع سے ڈاکٹر یا یونیورسٹی کا

اُستاد نظر آتا تھا۔ پرویز اور مسعود بغلگیر ہو گئے اور ایک دوسرے کی خیریت پوچھنے لگے پھر مسعود میری طرف مڑا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ "پرویز بہت خوش قسمت آدمی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ ابھی تک آزاد ہے اور شادی کے چکر میں نہیں پھنسا۔"

"اگر تم اپنی شادی پر ایسے ہی پشیمان ہو تو اس کے ازالے کی صورت موجود ہے۔" فالی شوہر کو دھمکاتے ہوئے بولی۔ مسعود کھلکھلا کر ہنسا اور فالی کا ہاتھ پکڑ کر انگلیاں چومنے لگا۔ اس کی اس حرکت پر سبھی ہنس پڑے۔ ان کی گفتگو سے پندرہ منٹ بعد ہی پتہ چل گیا کہ مسعود ایک فرم میں ملازم ہے اور اس کے علاوہ ایک دکان میں اس کا کچھ سرمایہ بھی لگا ہوا ہے۔ وہ بہت خوش مزاج اور ہنس مکھ آدمی تھا اور فالی سے خوب نوک جھونک کرتا تھا۔ ان کے کوئی بچہ نہیں تھا اور مستقبل قریب میں اس کی خواہش تھی کیوں کہ ان کے خیال کے مطابق بچے ہونے کے بعد شوہر اور بیوی کی معاشرتی زندگی میں فرق پڑ جاتا ہے اور وہ کہیں آنے جانے اور گھومنے پھرنے کے قابل نہیں رہتے۔

ہم لوگوں کی موجودگی میں فالی دوپہر کا کھانا نہیں پکا سکتی تھی۔ لہٰذا طے پایا کہ کھانا باہر کھایا جائے مگر پرویز نے اس تجویز کی سختی سے مخالفت کی۔ اسے اندیشہ تھا کہ میں باہر دیکھ لی جاؤں گی چنانچہ اس نے مسعود کو قائل کر لیا کہ وہ دونوں جا کر ہوٹل سے کھانا لے آئیں گے اور سب گھر پر کھائیں گے۔ مسعود اکیلا ہی جانا چاہتا تھا مگر پرویز ضد کر کے اس کے ساتھ چلا گیا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ پرویز نہیں چاہتا تھا کہ کھانے کا بوجھ مسعود پر پڑے۔ دوسرے راستے میں وہ مسعود سے میرے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا تھا۔

مسعود اور پرویز کے جانے کے بعد میں اور فالی گھر پر رہ گئے۔ میں میز پر پڑے ہوئے برتن جمع کرنے لگی مگر فالی نے مجھے روک دیا۔ اور گپ شپ کرنے لگی۔

"تم نے ثریا کے ساتھ یہ دو تین ماہ کس طرح گزارے؟ مجھے حیرت ہے" فالی نے کہا۔ میں سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی تو اس نے وضاحت کی۔ "میں ثریا کو اچھی طرح جانتی ہوں، وہ کوئی اچھی عورت نہیں ہے۔ انتہائی مکار، دغاباز اور خودغرض ہے۔ میں نے اس احمق پرویز کو ہر طرح سے سمجھایا تھا مگر وہ نہیں مانا۔ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ ثریا کسی ایک کی ہو کے رہے۔ پرویز اس کے لیے سونے کا انڈا دینے والی مرغی ہے۔ وہ اتنی آسانی سے پرویز سے دست بردار نہیں ہوگی۔ اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔"

"کیا وہ میری تلاش میں یہاں تک پہنچ جائے گی؟" میں نے پوچھا۔

"یقیناً وہ بہت چلتی ہوئی عورت ہے" فالی نے کہا۔ "اور جب اُسے معلوم ہوگا کہ تم میرے پاس ہو تو وہ میرے اور مسعود کے خلاف ہو جائے گی۔"

"آخر میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ میں اس لڑکی سے بالکل... پرویز اپنی رائے اور فیصلوں میں خود مختار ہے۔ میں نے اسے مجبور نہیں کیا کہ وہ ثریا کو چھوڑ دے۔"

"ثریا کو ان سب باتوں سے کوئی مطلب نہیں۔ اس کے لیے اتنا کافی ہے کہ پرویز تمہاری طرف مائل ہو گیا ہے اور اب تم پرویز کے ساتھ ہو۔"

"فالی خانم! تم ذرا انصاف سے کام لو۔ آخر اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں قسمیہ کہتی ہوں کہ میں نے پرویز کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ جانے کیوں اس کا دل خود میری طرف جھکا ہے۔ پھر اس کے علاوہ میں ایک بیچاری مصیبت زدہ اصفہانی لڑکی ہوں۔ تہران میں میرا کوئی سہارا نہیں، کوئی شناسا نہیں۔ آخر کہیں نہ کہیں مجھے ٹھہرنا تو ہے ہی۔ اس بے رحم شہر میں میں تنہا کس طرح رہ سکتی ہوں؟"

"تہران کسی کی پرواہ نہیں کرتا خواہ وہ مقامی ہو یا اجنبی۔ یہاں زندہ رہنا ایک کارنامہ ہے۔" فالی نے کہا۔

"فالی خانم!" میں فالی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم پرویز کو اچھی طرح جانتی ہو۔ یہ بتاؤ کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ کیا میں اس پر اعتماد کر سکتی ہوں؟"

فالی نے مجھے بڑی عجیب نظروں سے دیکھا۔ پھر اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ ذرا تیز لہجے میں بولی۔ "میں یہ برتن کچن میں رکھ آؤں پھر واپس آ کر تمہارے سوال کا جواب دیتی ہوں۔"

مجھ پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میں شرمندہ اور نادم ہو کر بیٹھی رہی۔ وہ ظاہر ہے پرویز کے بارے میں خواہ وہ کیسا ہی ہوتا مجھے نہیں بتا سکتی تھی کیونکہ پرویز اس کے بے حد قریب تھا۔ بالکل گھر کے فرد کی طرح بلکہ وہ ایک دوسرے کے بھائی بنے ہوئے تھے اور جبکہ میں اس کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ فالی مجھ سے پرویز کی کوئی برائی یا عیب جوئی کیسے کر سکتی تھی۔ یہ تو مجھے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا اب کیا ہو سکتا تھا۔ منہ سے نکلی ہوئی بات واپس نہیں آتی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں کچھ احمق بھی ہوں اور بہت بے تکی باتیں کرتی ہوں۔ کچھ دیر بعد فالی کچن سے واپس آئی اور کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ جلانے لگی۔ وہ ایک کش لگانے کے بعد میری طرف جھکی اور خلافِ توقع انتہائی نرمی سے بولی۔ "دوست تمہاری خدمت میں عرض ہے کہ پرویز ایک انتہائی نیک اور بڑی خوبیوں کا نوجوان ہے۔ اس کی پرورش بہت ناز و نعم سے ہوئی ہے۔ اس کے والد بہت متمول تھے اور بچپن سے لے کر اب تک پرویز کی تمام خواہشات پوری ہوتی رہی ہیں۔ باپ کے انتقال کے بعد بھی پرویز لکھ پتی ہو گیا تھا جب وہ جوان ہوا تو اس نے بڑی بے دردی

سے دولت کمانی شروع کر دی اسے ثریا جیسی عورتوں نے گھیر لیا۔
اس سے پہلے کہ وہ کنگال ہو جاتا اس کی ماں نے اسے سنبھال لیا اور دو دو کرکے
اور جائداد اپنے نام کروالی۔ لیلیٰ خانم! پرویز برا نہیں ہے دل کا اچھا ہے
بس ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے کوئی ایسی بیوی ملے جو بالکل اس کی
ماں کی مانند ہو یعنی ویسی ہی خیر خواہ اور درد مند۔ دراصل پرویز
کی بالکل کسی بھولے اور سرکش بچے کی مانند دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔
جتنا میں نے تمہیں بتایا ہے پرویز کے بارے میں کافی ہے۔ اگر تم با اقتدار
اور باوقار عورت بننا چاہتی ہو سوچے سمجھے بغیر پرویز سے شادی کر لو
جس طرح میں نے مسعود سے شادی کی ہے تم مجھ سے زیادہ خوش قسمت
ہو کیونکہ مسعود پرویز کی مانند متمول نہیں ہے۔ البتہ میں ایک معاملے میں
ضرور تم پر سبقت رکھتی ہوں وہ یہ کہ مسعود پرویز کی مانند فضول خرچ نہیں
ہے۔ بہرحال مجموعی طور پر تم نقصان میں نہیں رہو گی۔"

میں اور فاطی بڑی سرگرمی سے گفتگو کر رہے تھے اور لمحہ بہ لمحہ ہماری
قربت بڑھتی جا رہی تھی کوئی ایک گھنٹے بعد مسعود اور پرویز واپس آ گئے،
وہ روٹی، کباب اور کچھ پھل ساتھ لائے تھے۔ پھل کھانا لیے ہوئے کچن
میں چلا گیا اور فاطی بھی اس کے پیچھے روانہ ہو گئی۔ تنہائی ملی تو پرویز نے
سرگوشی سے مجھ سے کہا "لیلیٰ! میں نے تمہارے بارے میں مسعود سے
بات کی اور وہ راضی ہو گیا ہے۔ تم اس وقت تک یہاں ٹھہر سکتی ہو جب تک
کوئی مکان نہ مل جائے۔" وہ رکا پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "تم
اور فاطی کیا کرتے رہے؟"

"کچھ نہیں بس ثریا کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔" میں نے کہا۔

"فاطی اور مسعود دونوں ہی ثریا کو سخت ناپسند کرتے ہیں وہ
ثریا سے میرے میل جول کی سخت مخالفت کرتے تھے۔ تجربے نے بتایا
کہ وہ اپنی جگہ بالکل درست تھے۔" میں نے کہا۔

"ان اللہ کی بات نہ مان کر میں نے سخت غلطی کی۔" پرویز بولا "مگر
یہ تو سوچو کہ پھر ہماری ملاقات کس طرح ہوتی؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

فاطی اور مسعود کو کچن میں دیر ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً میرے بارے
میں گفتگو کر رہے ہوں گے۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں کچن سے برآمد ہوئے
مسعود ان میں داخل ہوتے ہوئے بولا "بھئی مبارک ہو لیلیٰ خانم فاطی
خانم کو پسند آ گئی ہیں۔ یہ بہت عجیب اور حیرت ناک بات ہے کیونکہ فاطی
خانم بہت کم کسی کو پسند کرتی ہیں۔"

گویا فیصلہ صادر کر دیا گیا تھا۔ اب کچھ عرصے کے لیے کم از کم
ہفتہ دس دن کے لیے مجھے یہیں ٹھہرنا تھا۔ دوپہر کا کھانا بہت اچھے ماحول میں
کھایا گیا۔ قہقہے اور لطیفے چلتے رہے۔ ایک لمحے کے لیے میں سارے
مصائب اور دکھ بھول گئی تھی کیونکہ عرصے کے بعد ایسا ہنستا مسکراتا
بے تکلف ماحول ملا تھا۔ اس ماحول میں شکوے شبہے اور بدگمانیاں نہیں
تھیں۔ لگتا تھا جیسے میں اپنے گھر میں پہنچی ہوئی ہوں۔ شام کو پرویز
مجھے ایک دکان پر لے گیا وہاں میں نے لباس، جوتے اور ضرورت
کی چند چیزیں خریدیں۔ میں ثریا کے گھر سے بے سروسامانی کی حالت
میں بھاگی تھی۔ مجھے ان چیزوں کی ضرورت تھی۔

رات گئے پرویز واپس چلا گیا۔ میں فاطی اور مسعود کے
ساتھ رہ گئی تھی۔ رات اجنبیوں کے درمیان گزری مگر مجھے بہت اچھی
نیند آئی۔ پھر کئی دن گزر گئے۔ فاطی جیسی نیک دل اور مہربان عورت
کے ساتھ میرا دل لگ گیا۔ فاطی اکثر مجھ سے ثریا کے بارے میں گفتگو کرتی
تھی۔ اس نے ثریا کو کبھی اچھے لفظوں سے یاد نہیں کیا۔ جب کہ میرے خیال
کے مطابق ثریا سے برے شخص میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور ہوتی ہے۔
فاطی نے مجھے بتایا کہ ثریا ہم جنس پرست ہے اس پر مجھے یاد آ گیا کہ
ثریا نے ایک رات میرے ساتھ کس قدر نازیبا اور غیر فطری رویہ
اختیار کیا تھا۔

دن گزرتے رہے۔ اس عرصے میں پرویز مجھ سے ملنے آتا رہا۔ جب
کبھی نہ آ سکا تو فون کر کے خیریت معلوم کر لی۔ پرویز میرا پسندیدہ مرد
تھا۔ میرے اطراف میں سوائے اس کے کوئی شخص ایسا نہ تھا جس پر اعتماد کیا
جا سکتا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں پرویز کی محبت میں گرفتار ہو
چکی ہوں۔ اب تک میں نے کچھ لڑکوں کو پسند کیا تھا مگر چاہا کسی کو نہیں
تھا۔ مگر میں پرویز سے محبت کرنے لگی تھی۔ وہ میری آنکھوں سے دل میں
اتر گیا تھا۔ میں ہار گئی تھی وہ جیت گیا تھا۔

مجھے فاطی کے ساتھ ٹھہرے ہوئے شاید سات دن ہوئے تھے۔ مسعود
حسبِ معمول ناشتہ کر کے دفتر جا چکا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں اور فاطی گھر
کے کام کاج میں مشغول ہو گئے پھر میں سلائی مشین کے آگے بیٹھ کر اپنے
لیے ایک کپڑا سینے لگی۔ اس وقت باہر اطلاعی گھنٹی بجنے کی آواز سنائی
دی۔ گھنٹی اس قدر دباؤ کے ساتھ بجائی گئی کہ میں بے ساختہ اچھل پڑی۔
مجھ پر بلاوجہ ایک خوف طاری ہو گیا۔ میں نے سوچا یہ وقت کون ہو
سکتا ہے مسعود ابھی دفتر گیا ہے اور پرویز کے آنے کا یہ وقت نہیں۔ پھر
یہ کون ہے۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس بار گھنٹی کی
آواز کسی چیخ سے مشابہ تھی۔ میرا دل آہستہ آہستہ کانپنے لگا اور میں
نے محسوس کیا کہ نامعلوم خوف سے میری پیشانی پسینے سے بھیگتی جا
رہی تھی۔

فاطی کے گھر میں

لیلیٰ پر کیا گزری

اگلی قسط پڑھنا مت بھولئے

کچھ دیر تو وہ یونہی کرسی پر خاموش بیٹھی اپنی بڑی بڑی آنکھوں
سے گھورتی رہی۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔
میز کو انگلیوں سے ہولے ہولے کھٹکھٹانے لگی پھر اس
ل اٹھالیا اور بے دلی سے پڑھنے لگی۔ اس کے چہرے پر
جھنجلاہٹ کی علامتیں گہری ہونے لگیں۔ یکایک اس
از زور سے دیوار پر دے مارا اور اس کے بعد تو ایسا
ما تھا جیسے اس پر کوئی دورہ پڑ گیا ہو۔ میز پر رکھی ہوئی
ما اور دوسری چیزیں کمرے میں بکھرنے لگیں، یہاں تک کہ

دوات بھی فرش پر گر کر چور چور ہو گئی۔ پھر اس نے کرسی بھی الٹ دی اور بستر پر گر کر ہانپنے لگی۔

جھلاہٹ اور بے بسی کا احساس بڑھتا ہی رہا اور جب نقطۂ عروج پر پہنچا تو وہ تکیے میں سر دیئے پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔

دراصل آج ایک خاص بات ہوئی تھی —— ایک اہم واقعہ جس نے اس کی امید کی آخری کرن کو بھی اندھیروں میں گم کر دیا تھا لڑکا ایم اے تھا اور کسی گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر تھا۔ خوب رو بھی تھا۔ رضیہ نے اسے دیکھا تھا۔ وہ لوگ کئی مرتبہ ان کے گھر آ چکے تھے۔ خاندان بھی اچھا تھا۔ رضیہ کے والدین اپنے طور پر تحقیقات کر چکے تھے۔ بظاہر ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی تھی جو رشتہ نامنظور ہونے کا سبب بنتی رضیہ کو پورا یقین تھا کہ اب کی بار اس کی نیا کنارے لگ ہی جائے گی مگر کچھ دن کی ٹال مٹول کرنے کے بعد معاملہ رضیہ کے بڑے بھائی بشیر صاحب کے سپرد کر دیا گیا۔ انہوں نے نئے سرے سے تحقیق شروع کی۔ رضیہ ابھی تک پر امید تھی۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ اس ٹال مٹول سے اکتا کر لڑکے والوں نے صاف صاف جواب طلب کیا —— اور آج اس نے سنا کہ بشیر صاحب نے کہہ دیا ہے —— ہمیں ابھی لڑکی کی شادی نہیں کرنا ہے —— یہ سنتے ہی رضیہ پر جیسے بجلی گر پڑی۔

ایسا کئی بار ہو چکا تھا اور رضیہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ایسا کیوں کیا جا رہا ہے لیکن اب اس کے لئے اپنے جذبات پر قابو رکھنا اور اپنے ارمانوں کا مزید بے دردی سے گلا گھونٹنا ناممکن ہو رہا تھا۔ ایسے موقعوں پر ہمیشہ ایک خیال اس کے ذہن میں بری طرح چبھنے لگتا تھا۔ وہ ہر بار اس خیال کو ذہن سے جھٹک دینے کی کوشش کرتی۔ اسے اس خیال ہی سے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ لیکن آج وہ

سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔ اور پھر اس نے اسی راہ کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک خطرناک فیصلہ۔

رضیہ موزوں قد، بھرے بھرے بدن اور گول چہرے والی، خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کی بڑی بڑی بیدار حیران سی آنکھوں میں ایک دل آویز چمک تھی لیکن ان آنکھوں میں اکثر حسرت و یاس کی پرچھائیاں بھی تیر آتی لیکن ابھی تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر تھی۔ ملازمت ہی کے دوران میں اس نے ایم اے کیا تھا۔ گھر میں ماں تھی ریٹائرڈ باپ تھا۔ ایک چھوٹا بھائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ ایک اور چھوٹا بھائی ابھی ابھی کسی آفس میں ملازم ہوا تھا۔ ایک بڑے بھائی تھے جو مقامی کالج میں لیکچرار تھے۔ شادی شدہ تھے اور الگ رہتے تھے۔ کچھ عیاش طبع اور فضول خرچ واقع ہوتے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ خاندان کی مدد کیا کرتے اور پھر انہیں اطمینان تھا کہ رضیہ گھر کا سہارا بنی ہوئی ہے۔

ہر جوان لڑکی کی طرح رضیہ کی بھی خواہش تھی کہ اس کی شادی ہو جائے، اس کا اپنا گھر ہو، پیار کرنے والا شوہر ہو جس کی بانہوں میں اسے تسکین ملے، جہاں پہنچ کر وہ سب کچھ بھول جائے۔ کوئی تو ہو جو اس کے حسن و شباب کی چاندنی میں سکھ کا سانس لے سکے، جس کے پیار کی گرمی اس کے ریشہ ریشہ میں سما جائے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے بھی پیارے پیارے بچے ہوں، جن کی معصوم ہنسی اس کی کائنات ہو، جن کی تتلاہٹ اور پیاری پیاری باتوں پر جی کھول کر قہقہے لگا سکے ——— اس نے سوتے جاگتے میں ایسے نہ جانے کتنے ہی خواب دیکھ ڈالے تھے۔

وقت گزرتا گیا۔ اس کا شباب تنہائی کی نذر ہوتا گیا اور اس کے ارمانوں کا گلا گھٹتا رہا۔ اس دوران میں اس کے لئے کئی رشتے آئے دوسرے شہروں سے بھی اور اسی شہر سے بھی۔ دوسرے شہروں سے آئے ہوئے پیاموں کے جواب میں تو اس کے والدین صاف صاف کہہ دیتے کہ لڑکی بیاہ باہر نہیں دینا ہے اور اگر لڑکا اسی شہر کا ہوتا تو ٹال مٹول سے کام لیا جاتا۔ کبھی کہہ دیتے کہ لڑکی کے بڑے بھائی بشیر صاحب سے ملئے وہی فیصلہ کریں گے اور بشیر صاحب کچھ دن چکر کھلانے کے بعد کسی طرح لڑکے والوں پر یہ ظاہر کر دیتے کہ رشتہ منظور نہیں ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ رضیہ کی شادی کر کے اپنے سر خاندان کی کفالت کی مصیبت مول لیں۔

رفتہ رفتہ یہ بات رضیہ کی سمجھ میں آ گئی کہ اس کی حیثیت پیسہ اگلنے والی مشین سے زیادہ نہیں۔ اس کے جذبات اور احساسات سے کسی کو کوئی سروکار نہیں۔ اس کے دل میں اپنے والدین اور بھائی کے لئے بیزاری اور غصے کے جذبات پیدا ہوتے گئے۔ پھر یہ جذبات نفرت اور بغاوت کا رخ اختیار کر گئے۔ اس کے رویّے میں نمایاں فرق آنے لگا۔ وہ گھر کے افراد میں چھوٹوں کے علاوہ کسی سے بہت کم بات کرتی۔ دن بھر اسکول میں لڑکیوں کے ساتھ دل کو بہلائے رکھتی۔ وہاں سے نکلتے ہی ایسی تھکی تھکی اور مضمحل ہو جاتی جیسے گھر جانا ہی نہ چاہتی ہو۔ گھر پہنچ کر بے دلی سے گھر کے کام کرتی اور پھر رات گئے تک ناول پڑھتی رہتی۔ یا بستر پر گم سم پڑی نیند کا انتظار کرتی۔ بشیر صاحب کبھی آتے تو ان کے ساتھ بھی اس کا رویہ روکھا پھیکا برتاؤ ہوتا اور خود اس نے تو ان کے یہاں جانا ہی ختم کر دیا تھا۔ ان تبدیلیوں کو سب نے محسوس کیا لیکن کسی نے کچھ کہا نہیں چپ چاپ نظر انداز کر دیا۔ ضرورت جو تھی۔

ان حالات میں تعجب کی بات نہ ہوتی اگر اس کے قدم غلط راہوں پر پڑ جاتے۔ لیکن وہ شریف لڑکی تھی۔ اگر کبھی جذبات کے طوفان میں گمراہ کن خیالات آتے بھی تو بعد میں اس کا ضمیر ملامت کرنے لگتا۔

اس نے سوچا تھا ہو سکتا ہے چھوٹے بھائی کو ملازمت مل جانے کے بعد اس کی شادی کر دی جائے۔ چھوٹے بھائی کو ملازمت بھی مل گئی لیکن جب اس کے باوجود آج کا واقعہ پیش آیا تو اس کے جذبات کا بند بالکل ہی ٹوٹ گیا۔ تکیے میں سر چھپائے روتی رہی رضیہ نے بغاوت کی ٹھان لی۔ وہ اس راہ پر چلنے کا فیصلہ کر چکی تھی جس کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی وہ ڈرتی تھی۔ اس راہ کے لیے ساتھی کون ہو؟ ساتھیوں کی کمی نہ تھی۔ کئی منچلے اپنے دلوں میں محبت کی شمع جلائے اس کی نظر التفات کے منتظر تھے لیکن رضیہ نے آج تک کسی کو لفٹ نہ دی تھی۔ ان میں وحید بھی تھا، دور کا رشتہ دار۔ رضیہ کے چھوٹے بھائی سے اس کی دوستی بھی تھی۔ اکثر ان کے گھر آتا جاتا رہتا۔ خوش شکل اور تن درست نوجوان تھا۔ عمر میں رضیہ سے چھوٹا ہی تھا۔ بہت عرصے سے کوشش کر رہا تھا کہ رضیہ اس کی جانب مائل ہو جائے لیکن کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ رضیہ نے اسے بے تکلف ہونے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

رضیہ نے اسی کو اپنا ساتھی چنا۔ وحید کی تو امید ہی بر آئی۔ وہ اسے بے تکلف ہونے کا موقع دیتی رہی۔ کئی مرتبہ اسکول سے دوپہر کی چھٹی لے کر اس کے ساتھ فلم بھی دیکھ آئی اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب ....

اس روز رضیہ گھر میں اکیلی تھی۔ اسکول کی کسی وجہ سے چھٹی ہو گئی تھی۔ گھر کے سب لوگ کسی شادی میں گئے ہوئے تھے۔ چھوٹا بھائی تو دیر سے اپنے آفس گیا تھا۔ رضیہ کی ماں نے اس سے بھی ساتھ چلنے کو کہا تھا لیکن اس نے سر درد کا بہانہ کر دیا تھا۔ کیا کرتی جا کر؟ اسے بڑی تکلیف ہوتی جب عورتیں اس کے سامنے اس کی والدہ سے پوچھتیں۔ "رضیہ کی شادی نہیں ہوئی اب تک ——؟"

"نہیں، ابھی نہیں ہوئی۔" اس کی والدہ کہتیں۔

"عمر تو ماشاء اللہ اچھی ہو گئی ہے۔ رشتے تو آئے ہی ہوں گے؟"

"ہاں کئی رشتے آئے مگر کوئی پسند نہیں آیا۔"

رضیہ کا دل تو چاہتا کہ چلا کر پوچھے: آپ کی پسند کیا ہے؟ اور پھر اعلان کر دے کہ یہ لوگ میری شادی کرنا ہی نہیں چاہتے۔

خیر اس کی والدہ نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا اور وہ گھر میں اکیلی بال کھولے خیالوں میں گم لیٹی رہی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور وہ بالوں کو پشت پر ڈال کر انہیں ساڑھی کے پلو سے ڈھکتی ہوئی دروازے کی طرف لپکی۔

وحید کو سامنے دیکھ کر وہ گھبرا سی گئی۔ وہ مسکراتا ہوا اندر آگیا۔

"کوئی نظر نہیں آرہا ہے۔ کہیں گئے ہوئے ہیں کیا سب؟"

"ہاں شادی میں گئے ہیں۔" رضیہ اپنی سانسوں کو درست کرتی ہوئی بولی۔

وحید صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے ہی رضیہ بھی بیٹھ گئی۔

اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد دونوں خاموش ہو گئے۔ شاید انہیں شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ وہ گھر میں اکیلے ہیں۔ وحید رضیہ کی بڑی بڑی سحر انگیز آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس کی سانسوں کی رفتار تیز ہو چلی تھی۔ ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ پھر وہ سحر زدہ سا اٹھا اور ایک دم رضیہ کو اپنے بازوؤں میں بھینچ کر اس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ رضیہ نے معمولی سی مزاحمت کی لیکن وحید کی گرفت سے خود کو چھڑا نہ سکی اور پھر آہستہ آہستہ ایک عجیب سا نشہ اس پر طاری ہونے لگا۔ اس کا ذہن سائیں سائیں کر رہا تھا۔ بدن میں بجلیاں سی دوڑ رہی تھیں اسے اس بات کا بھی ہوش نہ تھا کہ وحید کب اسے پلنگ پر لے آیا — اس کا دل خلاؤں میں اُڑ رہا تھا جہاں ستاروں کی محفل جمی تھی، وہ ایک حسین وادی میں دوڑی جا رہی تھی جہاں گنگناتے آبشار تھے۔ پیروں کے نیچے بھیگا سا سبزہ تھا اور وہ دوڑ رہی تھی اس کا بدن آگ ہو رہا تھا۔ پھر وہ ایک بہت بڑے تاریک گڑھے کے قریب پہنچ گئی — بالکل کنارے پر قریب تھا کہ وہ اس گڑھے میں گر جاتی کہ یکایک اسے ہوش آگیا۔

"نہیں وحید یہ ٹھیک نہیں۔" وہ وحید کو دھکیلتے ہوئے بولی۔

"میں تم سے شادی کروں گا بعد میں۔" وحید نے سرگوشی میں کہا۔

شادی — رضیہ کے ذہن پر جیسے ہتھوڑا سا پڑا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب تم جاؤ وحید۔" اس نے سختی سے کہا۔

"لیکن رضیہ ...." وحید نے کچھ کہنا چاہا

"نہیں نہیں .... خدا کے لیے بس اب جاؤ۔"

وحید چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر خاموشی سے جوتے پہنے اور باہر نکل گیا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا۔ کوئی بات نہیں آئندہ کبھی ....

وحید کے چلے جانے کے بعد رضیہ کچھ دیر دروازے سے سر ٹکائے بے دم سی کھڑی رہی۔ پھر بستر پر گر کر زور زور سے رونے لگی۔ کچھ دیر بعد اس کی سسکیاں مدھم ہونے لگیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ایک گہرے سمندر کے بیچ میں ابھری ہوئی ایک چٹان کے سرے پر کھڑی ہو۔ بس ہوا کا ایک تیز جھونکا یا ذرا سا دھکا اسے سمندر میں غرق کر دینے کے لیے کافی ہوگا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس بار تو وہ گڑھے میں گرنے سے بچ گئی لیکن کیا آئندہ ایسے کسی موقع پر وہ اپنے آپ پر قابو رکھ سکے گی؟ کیا اس تاریک گڑھے میں گرنے سے خود کو بچانا ممکن ہو سکے گا —؟

وہ یہ بھی سوچ رہی تھی ایسی کتنی رضیائیں ہیں جو اس گڑھے میں گرنے سے بچ پاتی ہیں۔

## ایک صفحے کا افسانہ ؟

ثروت چوہدری

# زندگی کا راز

مَیں کل اکیلی تھی اور بہت اُداس اُداس
کانٹوں کی باڑ کے پاس بیٹھی میں اپنے آپ میں گم تھی
میں سوچ رہی تھی۔
کتنے اچھے ہیں وہ لوگ جو
زندگی سے مقابلہ نہیں کرتے اور
ہار مان جاتے ہیں تو ——
زندگی انھیں اپنا سب کچھ دے دیتی ہے
کیونکہ ——
زندگی مرد نہیں عورت ہے
جو اس سے ہارا وہ جیت گیا۔
اور جو اسے جیتنا چاہے وہ اپنا سب کچھ ہار دیتا ہے۔

09 جو عمر بھر شادی نہ کرنے کا عہد کیے بیٹھی تھی آج دو بڑی بڑی شوخ آنکھوں میں بستے ہوئے ڈھلکے ساگر دیکھ کر یوں پگھل گئی تھی کہ اسے اپنا عہد اپنی نخوت اپنی ساری خود اعتمادی ان دو شوخ جھیلوں میں ڈوبتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ نرم تکیے گود میں رکھے سفید لباس میں ملبوس شب دیجور کی طرح سیاہ زلفیں بکھرائے مسہری پر اپنے ہی افسانے کا کوئی پریشان کردار بنی بیٹھی تھی۔ پیڈ کے کاغذ کسی نئے افسانے کے لیے تڑپ رہے تھے اور اس کا پرانا سیاہ قلم اس کے لمس کا منتظر تھا لیکن وہ تو ماضی کے بام و در میں گھوم پھر کر اپنے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ تلاش کرتی پھر رہی تھی...... اس کے کانوں میں انہی باتوں کی بازگشت گھوم رہی تھی جو اس نے اپنی سہیلیوں کے درمیان بیٹھ کر کی تھیں۔

اونھ! شادی؟... کوئی اتنی حسین شے تو نہیں جس کی آرزو کی جائے جس کے ارمان کیے جائیں...... بی بی جسے تم پریم بندھن کہتی ہو...... یہی بعد میں جیون کا روگ بننے لگتی ہے...... مرد ذات سے خدا بچائے۔ ثریا سچ کہتی ہے کہ مرد عورت کو صرف کھٹ مٹھی گولی سمجھتے ہیں...... جب تک دل چاہا چوستے رہے اور جب طبیعت بھری تھوک دیا یا پھر بڑی خاموشی سے نگل گئے...... تم یقین کرو! میں تو مرتے دم تک شادی نہیں کروں گی۔"...... وہ اٹل لہجے میں کہتی تو اس کی سہیلیاں اس کی معصومیت پر کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔

"ارے پگلی...... یہ مرد خواہ کتنا ہی ظالم کتنا ہی بے مروت کیوں نہ ہو لیکن ایک دن ایسا آتا ہے کہ عورت اپنا تن من دھن سب کچھ ہی دے دیتی ہے۔ یہی تو ریت ہے اس دنیا کی..... تو بھی کسی مرد کے سہارے کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتی۔ زندگی کے ایک موڑ پر تیرا دل اپنے آپ ہی چاہے گا کہ کوئی مرد آکر تیرے نازک وجود کو سہارا دے۔"

"نا بی میں نہیں مانتی تمہاری یہ دلیل' عورت جب اپنی کوکھ سے مرد کو جنم دیتی ہے وہ اتنی کمزور نہیں ہوتی کہ مرد کے سہارے کے بغیر زندگی نہ گزار سکے تم نے ماں کو نہیں دیکھا کیا؟" اور جب وہ بحث کرنے کے موڈ میں آجاتی تو اس کی سہیلیاں مصلحتاً یہ سوچ کر خاموش ہو جاتیں کہ کسی دن وہ خود اپنی اس جذباتیت کے آگے سپر ڈال دے گی تب اس سے پوچھیں گے۔

گود میں رکھا ہوا تکیہ سر کے پیچھے رکھ کر وہ مسہری پر لیٹ گئی، اس کا ذہن پھر بھٹکنے لگا اسے یاد آیا جن دنوں اس کے افسانے ملک کے مشہور رسالوں میں دھڑا دھڑ شائع ہو رہے تھے ان دنوں اس کے لیے کتنی ایک اچھے رشتے آئے تھے۔ امی تو امی اپنے محلے کے ورما صاحب جنھیں وہ روزانہ یونیورسٹی جاتے وقت اسکوٹر پر اپنے آفس جاتے ہوئے دیکھتی تھی انھوں نے بھی اپنی امی اور باجی کو اس کے یہاں بھیج دیا تھا اسے پتہ تھا ورما صاحب کو اس سے زیادہ اس کے افسانے پسند ہیں۔ بس اسٹاپ سے گزرتے وقت وہ اپنے اسکوٹر کی رفتار اس قدر دھیمی کر لیتے کہ انھیں اس کی کتابوں میں

دب بہت سے رسالوں کی بھی سی جھلک نظر آ جاتی تو پھر وہ فوراً آگے اسکوٹر کو روک کر پاکر کو دلا دیتے اور اس سے دو چار رسالے لا منگتے۔ پہلا صفحہ کھول کر فہرست میں اس کا نام پڑھتے اور پھر نہایت احترام سے وہ رسالہ اسکوٹر کی باسکٹ میں رکھ کر اسکوٹر دوبارہ اسٹارٹ کر دیتے۔ ورما کی اس حرکت کو اکثر ہی نوٹ کرتی لیکن انجان بنی کھڑی رہتی۔ ورما صاحب کے لیے اس کے دل میں تھوڑی بہت عزت صرف اس لیے تھی کہ انھوں نے کبھی کوئی چھچھوری حرکت نہیں کی تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ تھوڑی تھا کہ وہ اس کے افسانے پسند کرتے کرتے خود اسے پسند کر بیٹھیں۔ ورما صاحب کے رشتے کی بات چلی تو ماں جی نے اسے بہت سمجھایا "فائنل اوپیا" ایم اے پاس ہونے ان کی نظروں میں فرسٹ کلاس گزیٹڈ آفیسر اس کی زندگی میں اجالے بکھیر سکتا تھا۔ لیکن وہ اپنے فیصلے پر اڑی رہی۔ آخر تھی بھی تو ضدی باپ کی بیٹی، لیکن اماں اس کے سامنے روئیں تو اس نے بڑے پیار سے ماں کے کندھے سے لگ کر کہا تھا "اماں آپ کیوں میرے لیے پریشان ہوتی ہیں۔ میں تو زندگی بھر افسانے لکھتی رہوں گی اور اپنے افسانوں ہی سے پیٹ بھر لوں گی۔ ویسے تو اب بھی مجھے تھوڑا بہت معاوضہ ملتا ہے نا جب زیادہ مشہور ہو جاؤں گی تو زیادہ معاوضے ملیں گے۔"

"مری پاگل، تو زندگی بھر بس افسانے لکھے گی۔ تیرے پاس بھی تو انسان کا دماغ ہے یا مشین تھوڑا ہی ہے کہ سوچتی ہے اور سوچ کر بیان کہاں سے بیٹی کی کہ تو افسانے لکھتی رہے گی .... تو پھر کیا جیب خرچ بھی افسانے سے لے گی؟"

اور وہ اماں کی معصومیت پر کھلکھلا کر ہنس پڑی: "ارے اماں بعض افسانے تو ہوتے ہی جھوٹ کا پلندہ ہیں۔ ویسے بھی اس دنیا میں کہانیوں کی کیا کمی۔ کہو تو ابھی ایک افسانہ ورما صاحب پر لکھ دوں۔"

"ہائے بے شرم!" اماں یوں اچھلیں جیسے انھیں کرنٹ لگ گیا ہو۔ "اس بیچارے نے تیرا کیا بگاڑا ہے جو تو اس کا افسانہ لکھے گی۔ ایسا شریف اور نیک لڑکا ہے۔ خدا کی قسم تو نے اس کے اوپر افسانہ لکھا تو جان سے مار ڈالوں گی۔"

"اچھا میری توبہ۔ اب نہیں لکھوں گی افسانہ ورما صاحب کے اوپر۔" اس نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کان پکڑ لیے تو اماں پھر سنجیدہ ہو گئیں۔

"دیکھ بیٹا ——— ورما اتنا اچھا لڑکا ہے اس کی ماں کی حالت اتنی اچھی ہے اور بہن بھی اخلاق والی ہے آخر تو اپنے باپ کی طرح بیکار کی ضد کیوں کرتی ہے؟"

"اچھا اماں یہ بتاؤ کہ تم نے شادی کر کے کیا پایا جو مجھ سے کہتی ہو شادی کر لے۔" اماں اس کا سوال سن کر چپ ہو گئیں۔ ان کی نظروں کے سامنے اس کے باپ کے کستے ہوئے ہاتھ گھوم گئے اور کانوں میں شیروں کی سی دھاڑ گونجنے لگی۔

"بتاؤ نا اماں ——— ؟" اس نے اماں کو خاموش دیکھ کر پوچھا تھا۔

"اے بیٹا میرا کیا پوچھتی ہے۔ میرے تو نصیب ہی خراب تھے سب کے نصیب ایک جیسے تو نہیں ہوتے۔"

"اماں تمھارے نصیب کیسے خراب تھے۔ اللہ نے کسی کے نصیب خراب نہیں بنائے۔ ہم اپنے نصیب خود خراب کرتے ہیں ..... اب کیا یہ چین کی زندگی بری لگ رہی ہے جو بیٹھے بٹھائے شادی خانہ آبادی کر لوں؟" اور آخر کار اماں نے تھک ہار کر رسا صاحب کی ماں کو جواب دے ہی دیا تھا یا ماں کیا کہ یہ دوستی میں لی گئی حضرات نے باتیں کرتے کرتے مسکرا کر ایک قدم آگے بڑھنا چاہا تھا تو وہ بڑی خود اعتمادی سے پیچھے ہٹ گئی۔ افسانوں تک تو محبت اچھی تھی لیکن افسانوں سے باہر وہ اس افسانوی محبت کی قائل نہ تھی اور پھر اس نے تو پہلے ہی عہد کر لیا تھا کہ عمر بھر شادی نہ کرے گی تو پھر یہ بکھیڑے پالنے سے فائدہ کیا ——— ؟ اور یوں بھی وہ اتنی حسین نہ تھی کہ لوگ بلکہ اس کے دل کے بند دروازوں پر دستک دیتے رہتے برسوں پروانے کے شوق میں من مندر کے دوار کھلنے کا انتظار کرتے رہتے۔ چند ایک ایسے جملے اچھالتے بھی لیکن اس کی تیکھی باتوں اور مردوں کے خلاف نفرت کے تیروں کی بوچھار دیکھ کر کھسک گئے ——— اور وہ مسکراتی رہی اور اس کا قلم چلتا رہا۔

لیکن آج رات وہ اس چہرے اور لہجے سے ذہن کے ساتھ اس نے بہت کچھ لکھنا چاہا تو کچھ بھی نہ لکھ سکی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی دکھ بھری آنکھیں آ گئیں اور وہی یاس انگیز لہجہ کانوں میں گونجنے لگا۔

"فرحانہ صاحبہ! میں نے آپ کے زیادہ نہیں صرف دو افسانے پڑھے ہیں۔ ان دونوں افسانوں میں آپ نے بڑی چابکدستی اور بے باکی سے مردوں کے ظالمانہ اور سخت گیر طبیعت کے چند پہلو دکھائے ہیں۔ میں اس پر احتجاج نہیں کر رہا۔ آپ نے جو کچھ لکھا ہے ٹھیک لکھا ہے لیکن میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ اپنی صنف کے ظالمانہ رویے اور بے حسی پر قلم نہیں اٹھائیں گی؟"

"وقار صاحب! میں نے کبھی جانبداری سے کام نہیں لیا... میں نے اپنے چاروں طرف جو کچھ دیکھا اسے افسانوں میں ڈھال دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ مجھے اکثر عورت ظالم کی بجائے مظلوم ہی نظر آئی۔"

"دیکھئے محترمہ! میں تو ایک عام سا فوجی ہوں، کوئی ادیب یا وکیل تو نہیں کہ آپ سے بحث کروں ہاں البتہ اگر آپ پسند کریں تو آپ کو اس خاتون کا تصور ضرور دکھاؤں گا جو آج تک میرے دل کے نہاں خانوں میں اٹکی ہوئی ہے۔ اس کھوٹے نے برسوں کی رفاقت کے بندھن اس بے باکی کی وجہ سے توڑ دیئے ......" کیپٹن وقار نے پاس پڑی ہوئی بیساکھی دائیں ہاتھ سے اٹھا کر اس کی آنکھوں کے سامنے کر دی ......" اس نے منگنی کی انگوٹھی اس لیے واپس کر دی کہ میرا بازو کٹ گیا تھا ......" کیپٹن وقار نے اپنا کٹا ہوا بازو دکھاتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ وہ اپنی زندگی ایک لنگڑے لولے شوہر کے ساتھ نہیں گزار سکتی تھی۔ اس نے منگنی کی انگوٹھی واپس کرتے ہوئے کیا یہ بھی نہ سوچا کہ اس کا یہ رویہ میرا دل توڑ دے گا ...... میری زندگی ویران کر دے گا ...... اور ...... اس نے یہ بھی نہ سوچا فرحانہ صاحبہ کہ میں نے اپنا یہ بازو اور اپنی یہ ٹانگ اپنے وطن کے گلی کوچوں کی مقدس خاک اور اس کے سر کے آنچل کی خاطر کٹوائی ہے۔ میں جب محاذ پر لڑ رہا تھا تو میرے پیش نظر صرف اس کی عصمت اس کی عفت اور وطن کی عظمت تھی ...... اس نے منگنی توڑ کر اس بازو کی توہین کر دی جس نے دس کافروں کو جہنم رسید کیا۔ اس نے منگنی توڑ کر ان قدموں کی توہین کر دی جو سرحدوں پر پہاڑ کی طرح ڈٹ گئے تھے جو زندگی سے لاپروا ہو کر وہ آنکھیں نکال لینے کے لیے آگے بڑھے تھے جو میرے وطن کے جوبن پر اٹھی تھیں ...... اس نے شاید مجھے میری فرض شناسی کی سزا دی ہے۔" ایک گرانڈیل باوقار فوجی کی آواز شدت جذبات سے بوجھل ہو گئی۔ وہ بولتے بولتے رک گیا۔

فرحانہ کا دل دکھ سے بھر گیا ——— اسے اپنی صنف کی خود غرضی پر شرم آنے لگی۔ اس نے تھکے تھکے لہجے میں اس سے پوچھا۔ "کیا نام تھا ...... اس کا ...... ؟"

"اس کا نام ...... اس کا نام صرف ایک "عورت" تھا ...... وہ عورت جو آپ کی نظر میں صرف مظلوم ہے ظالم نہیں ..." کیپٹن وقار نے چبھتے ہوئے لہجے میں جواب دیا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

"کیپٹن وقار ...... آپ غلط سمجھے ...... میں ہر عورت کو مظلوم نہیں کہتی۔ میں صرف مظلوم کو مظلوم کہتی ہوں ...... وہ عورت واقعی ظالم تھی۔ اس نے آپ کی ذات پر نہیں انسانیت پر ظلم کیا ہے آپ تو ہمارا افتخار ہیں ...... آپ تو ہمارے محافظ ہیں ...... آپ ہماری حرمت و ناموس کے پاسبان ہیں ...... یہ آپ کے سینے پر چمکتا ہوا ہلال جرأت آپ کی جوانمردی بہادری اور شجاعت کا گواہ ہے ...... آپ کی تکریم کرنا ہمارا فرض ہے ———" اس کا جواب سن کر کیپٹن وقار ہنس دیئے۔ کھوکھلی اور طنزیہ ہنسی ......

"نہیں فرحانہ علیم ...... ہم لوگوں کو صرف تکریم ہی کی ضرورت

نہیں ... آپ لوگ ہمیں بھلا برداشت کر سکتے ہیں ... لیکن آپ
ہمیں سہارا نہیں دے سکتے ... کیونکہ ہم لوگ ٹوٹے ہوئے اور
ٹنڈے ..... انتہائی بھدے اور بدصورت ہو گئے ہیں ..... اس
نے سسکی توڑ دی کیونکہ وہ غلام تھی .... لیکن اور کتنے درد ختہ آگے بڑھ
آئے ....! میں کہتا ہوں وہ نہیں آپ سب لوگ ظالم ہیں ....
بے درد ہیں .... بے حس ...."

فرحانہ نے سہم کر اس کی طرف دیکھا ... اس کی شربتی آنکھوں میں
دکھ کے گہرے سائے کانپ رہے تھے ... وہ اپنے دائیں ہاتھ سے
گھاس کے نرم نرم تنکے توڑ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر کرب مسکراہٹ کا
روپ دھار کر پھیل گیا تھا۔ کیپٹن وقار نے سر اٹھایا۔ اس کی طرف دیکھا وہ
سر جھکائے چور سی بنی بیٹھی تھی۔

"فرحانہ حلیم صاحبہ ——!" کیپٹن وقار نے اسے پکارا۔

"جی —— " اس نے چھلکتی آنکھیں اوپر اٹھا کر کانپتی سی آواز
میں کہا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ یکدم نروس ہو گیا ...

"میں .... میں ..... بہت شرمندہ ہوں فرحانہ صاحبہ ...
میرا مقصد آپ کی دل آزاری نہیں تھا .... دراصل میں اپنے دل
سے مجبور ہوں .... جب بھی اس موضوع پر گفتگو ہوتی ہے میں
بہک جاتا ہوں ..... خدا جانے اس معاملے میں میں اتنا جذباتی
..... آخر کیوں ہو جاتا ہوں .... آپ کو میری باتوں
سے دکھ پہنچا ہو تو مجھے معاف کر دیجئے ..... میں تو آپ کو یہ بات
بتانا بھی نہیں ..... لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ آپ افسانہ نگار ہیں
تو میں نے سوچا کہ آپ سے اس موضوع پر افسانہ لکھنے کی فرمائش کروں۔
.... لیکن آپ ....." وہ بولتے بولتے یکدم رک گیا ....

"... اور میں آپ کی یہ فرمائش ضرور پوری کروں گی کیپٹن!"
اس نے ایک عزم سے کہا۔

"شکریہ —— شکریہ ——" کیپٹن نے خاص فوجی انداز میں سر
جھکا دیا۔

جواباً وہ مسکرا دی —— ایک پیار بھری عقیدت مندی سی مسکراہٹ
اس کے ہونٹوں پر رینگ گئی۔

"اچھا یہ رہا میرا کارڈ —— اگر آپ کے پاس ٹائم ہو اور مناسب
سمجھیں تو افسانہ لکھ کر غریب خانہ پر آ سکتی ہیں ..... ورنہ پوسٹ
کر دیجئے گا ..... مجھے مل جائے گا ..... میں تو خود آپ کی خدمت
میں حاضر ہوتا ..... لیکن یہ بیساکھی ..... ایک رکاوٹ بن گئی ہے

اور وہ شخص سامنے ٹکرا کر گر گیا

بن گئی ہے۔"

"چلئے اندر چلیں —— شاید محفل موسیقی برخاست ہو چکی ہو ..."
اس نے اس کی بات ان سنی کر کے آہستہ سے کہا۔ دراصل وہ اب اس
موضوع پر گفتگو کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"چلئے ——" کیپٹن وقار نے بیساکھی اٹھائی اور درخت کے
تنے کا سہارا لے کر اٹھنے لگا تو فرحانہ سے اس کا یہ انداز دیکھا نہ گیا۔ بے تاب
ہو کر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ کیپٹن نے مسکرا کر سفید ساڑھی میں لپٹی
ہوئی فرحانہ کو دیکھا اور دھیرے سے بولا، "سہارا مت دیجئے۔ عادت
بگڑ جائے گی۔"

فرحانہ کا دل ایک مرتبہ زور سے دھڑک کر رہ گیا۔ اس نے سر
جھکا دیا لیکن ہاتھ پھر بھی آگے بڑھائے رہی۔

"بڑی ضدی ہیں آپ ... ایک عمر تک یوں سہارا دیں گی تو یہ
دل سہارا ہی سہارا مانگنے لگے گا ——" وہ مسکراتے ہوئے بولا لیکن
فرحانہ کا ہاتھ پیچھے نہ ہٹا۔

"نہیں مانتی ہیں آپ تو یونہی سہی۔" وہ دوبارہ مسکرا دیا اور اس
کا نازک سا ہاتھ تھام کر کھڑا ہو گیا۔ "چلئے ——" اس نے اس کا ہاتھ
آہستہ سے چھوڑ دیا —— اور وہ کیپٹن وقار کے ساتھ دل ہی دل میں بیساکھی کی کھٹ کھٹ
بسائے لان سے اٹھ کر اندر آ گئی۔

اس کا خیال غلط نہیں نکلا۔ رنگ کی محفل اب برخاست ہو چکی تھی۔
شہر کا مشہور پاپ میوزک گروپ کچھ بجا رہا تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ
چلتے ہوئے ایک خالی میز کی طرف بڑھ گئے۔

اور پالی کے اختتام پر کیپٹن وقار نے اس سے پوچھا تھا کہ آپ
ایک افسانہ کتنے دن میں لکھ لیتی ہیں —— "وہ اس کی بے تکلفی پر
کچھ سوچ کر بولی!
"کبھی ایک گھنٹہ، کبھی ایک دن میں ...... اور کبھی ایک ہفتہ
میں ...... ویسے میں وہ افسانہ دو دن میں ضرور مکمل کر کے آپ
کو بھجوا دوں گی ... یا پھر خود حاضر ہوں گی۔"
"شکریہ ——" اس نے فوجی کیپ اتار کر خاص انداز میں سر جھکایا۔
"اور فرحانہ حلیم آج دو دن پورے ہو چکے ہیں ...... لیکن تم
تو ابھی اس زندگی کا افسانہ نہیں لکھ سکیں جو واقعی ظالم تھی ...... اور وہ
پگلا اور بیتابی سے افسانے کا انتظار کرے گا۔" اس نے اپنے سے خطاب
ہو کر کہا اور پھر وہ بیتاب ہو کر اٹھ بیٹھی ...... "نہیں میں افسانہ لکھوں
گی اور ضرور لکھوں گی ......" تکیہ گود میں رکھ کر اس نے دوبارہ پیڈ اور
پین اٹھا لیا ...... رات کے بارہ بج گئے لیکن وہ کچھ بھی نہ لکھ سکی اس
نے کاٹ کاٹ کر لکھا اور لکھ لکھ کر کاٹا ...... اس کی ساری ذہانت
ساری افسانہ نگاری نہ جانے ذہن کے کن گوشوں میں سما گئی تھی ....
"اپنی ذات کی سچی کہانی لکھنا بھی کتنا مشکل ہے یا رب!"
اس نے بڑبڑاتے ہوئے پین اور پیڈ میز پر پھینک دیا ...... وہ شکست خوردہ
سے انداز میں مسہری پر اوندھی لیٹ کر اپنا سر تکیے میں ٹھونس دیا۔ اس کے
کانوں میں دیا سلائی کی کھٹ کھٹ کے ساتھ ساتھ کیپٹن کے الفاظ گونج
رہے۔ "اس نے منگنی توڑ دی ...... کیونکہ وہ ظالم تھی ...... لیکن
اور کتنے دن تک پڑھ آئے ......؟ میں کہتا ہوں وہ نہیں آپ
سب ظالم ہیں ...... بے درد ہیں ...... بے حس ...... وہ
نہیں ...... وہ نہیں ......"

اس نے پریشان ہو کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں ——
"نہیں ...... نہیں ...... کیپٹن ...... ہم سب ظالم نہیں ....
ہمارے دل تو موم سے زیادہ ملائم ہیں کیپٹن ...... ہم تو زندگی کے اک
موڑ پر ہاں ہیں ...... جس کی داستان کی مثال ہے ...... ہم زندگی
کے اک موڑ پر بیٹھی ہیں ...... ماں باپ کے فیصلوں پر قربان ہو جانے
والی بیٹی ...... ہم ایک جگہ بیوی ہیں کیپٹن ...... جو شوہر کو سر
کا تاج بناتی ہے۔ اور ایک جگہ ہم بہن ہیں ...... جو بھائی کی خاطر
اولاد قربان کر دیتی ہے ...... ہمارا ہر روپ ایک دوسرے سے برتر
ہے ہم تو محبت کا اندھیرا ...... ہم تو خلوص کا صحرا ہیں ......
ہم سب ظالم نہیں ہو سکتے ...... اگر اس نے تمہارا دل توڑ دیا تو
اس کا ظرف محدود تھا ...... لیکن میرا ظرف اتنا محدود نہیں کہ میں
کے صندوق میں بند کر کے رکھتا کہ تمام عمر بیٹھ کر دیکھتی رہو ......
یہ احسان فراموشی نہیں کیپٹن ...... میں تمہارے ایثار کا بدلہ
ایثار سے دوں گی اور تمہیں بتاؤں گی کہ ہم سب ظالم نہیں ہوتے ......"
جذبات کی شدت میں وہ بڑبڑاتی چلی گئی ...... پھر دیر بعد سکون سا
مل گیا اور وہ بجلی بجھا کر سو گئی۔

دوسرے دن حسب وعدہ جب وہ کیپٹن وقار کے بنگلے پر پہنچی
تو وہ لان میں بیٹھا ماہنامہ "شباب" کے صفحے پلٹ رہا تھا۔ اس کا آنا وہ صاف نہ
دیکھ سکا۔ وہ "پڑھ رہا تھا۔ قریب ہی میز پر کلیات ساحر اور
عدم کی "نغمہ پرور" اور "زم آہو" پڑی تھیں۔
سر کو ہلکا سا خم دے کر اس نے فرحانہ کا استقبال کیا۔ "بیٹھئے
فرحانہ حلیم —— میں تو آپ کی بجائے ڈاک کا انتظار کر رہا تھا۔" وہ خوش
ہو کر مسکرانے لگا۔
"اور ڈاک کی بجائے میں خود آ گئی ...... کچھ ہرج تو نہیں
ہوا آپ کا —؟"
"ارے نہیں صاحب! ہم نے تو بیکاری اور تنہائی سے تنگ آ
کر عدم اور ساحر کو ساتھی بنا لیا ہے اور "شباب" تو آج خاص طور سے
آپ کا افسانہ پڑھنے کے لیے منگوایا ہے۔"
"فوج سے تعلق رکھنے کے باوجود آپ کو ادب سے اس قدر لگاؤ ہے
میرا خیال ہے آپ مطالعہ کے ساتھ ساتھ کچھ لکھنا بھی شروع کر دیں ......"
"ارے نہیں صاحب ہم فوجی جوان تو صرف بندوقیں، توپیں
اور بم وغیرہ چلانا جانتے ہیں۔ یہ نازک قلم تو ہمارے ہاتھ میں زیب نہیں
دے گا ......" وہ ہنسنے لگا۔
"لیکن میں سمجھتی ہوں کہ آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ آپ کی برادری
کے کرنل محمد خان نے جس ہاتھ سے بندوق چلائی تھی اسی ہاتھ سے قلم بھی
یوں چلایا کہ ہم جیسوں کا دل چاہنے لگا کہ بس اب قلم رکھ دیں۔ میرا خیال
ہے آپ نے "بجنگ آمد" پڑھی ہو گی۔"
"بالکل پڑھی ہے —! لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ نے افسانہ لکھا
کہ نہیں —؟"
"اوہ تو یوں ——" فرحانہ انکار میں سر ہلا کر ہنسنے لگی۔
کیپٹن وقار نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
"معاف کیجئے میں نے آپ سے افسانہ لکھنے کا وعدہ کیا تھا اس لیے
ضرور لکھوں گی ...... لیکن پہلے آپ کو میری ایک شرط ماننا ہو گی۔"
"کہئے کیا شرط ہے آپ کی —؟"
"میری شرط اس کا فیصلہ بھی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ کو

پیش جاؤں گی...... لیکن اس شرط کی شرط یہ ہے کہ آپ اسے میرے
جانے کے بعد کھولیں گے اور پھر میری شرط پوری کریں گے۔"
"انشاء اللہ کوشش کروں گا......"
"کوشش نہیں وعدہ کیجئے جناب!"
"وعدہ ــــ اگر نبھا نہ سکا تو ــــ؟" کیپٹن وقار الجھنے لگا۔
"اس قدر پریشان کیوں ہو رہے ہیں آپ... ! میں نے کوئی
سخت شرط نہیں رکھی ہے۔ بس آپ سے کچھ مانگ لیا ہے۔" فرحانہ نے اس
کی الجھن و پریشانی بھانپتے ہوئے کہا۔
"مجھ سے کچھ مانگ لیا ہے آپ نے....!" وہ حیران ہو گیا ــــ
"فرحانہ علیم میرے پاس اب بچا ہی کیا ہے جو آپ کو دوں گا...." اس
نے اپنی گہری نظریں فرحانہ کی شوخ آنکھوں میں ڈال دیں۔
"آپ نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ آپ کے پاس کچھ نہیں ــــ آپ کے پاس
تو وہ کچھ ہے جو ہم لوگوں کے پاس نہیں..... بہرحال مجھے جو کچھ مانگنا تھا وہ
میں نے مانگ لیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ کس قدر فیاضی سے کام
لیتے ہیں ــــ"
"آپ نے تو مجھے کشمکش و پیچ میں مبتلا کر دیا ہے۔ خدا جانے آپ کی
کیا شرط ہے؟ اور آپ نے کیا مانگا ہے ــــ؟ اور مجھے کیا دینا ہے؟
میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ــــ؟" وہ پریشان ہونے لگا تو فرحانہ اس
کی پریشانی پر کھلکھلا کر ہنس دی۔
چائے وغیرہ پینے کے بعد وہ کیپٹن سے اجازت لے کر چلنے لگی تو
وقار نے ہاتھ پھیلا دیا۔
"شرط کی پرچی تو دیتی جائیے ــــ!"
اور اس نے پرس کھول کر نیلے رنگ کی مڑی ہوئی ننھی سی پرچی وقار
کی ہتھیلی پر رکھ دی۔
"شکریہ۔" وہ مسکرایا۔
"لیکن ابھی مت کھولیے گا۔" وہ جلدی سے بولی۔
"جی ہرگز نہیں کھولوں گا...."
اور جب وہ وقار کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وقار نے بے چین ہو
کر مٹھی میں دبی ہوئی چٹ کھولی ــ لکھا تھا؛
"کیپٹن وقار ایک عورت نے وطن کے پاسبان کا دل توڑ دیا،
لیکن دوسری عورت ٹوٹے ہوئے دل کے ٹکڑے سمیٹ لینا چاہتی ہے۔ یا
دوسرے الفاظ میں آپ اپنے بزرگوں کو میرے گھر بھیجئے میں آپ سے
شادی کرنا چاہتی ہوں۔ فقط فرحانہ"
کیپٹن وقار چکرا گیا۔ اس نے عورت کے بہت سے روپ دیکھے
تھے...... لیکن یہ روپ سب سے انوکھا تھا...... اس قدر ایثار....
اتنا خلوص...... کیپٹن وقار علی خان تم نے اس سے شکوہ ہی کیوں کیا
تھا...... دیکھو وہ سادہ سی لڑکی اپنی صنف پر لگنے والے الزام پر اپنی
ذات قربان کرنے پر تیار ہو گئی ہے...... اس کا ظرف کتنا وسیع اور کتنا
بلند ہے کہ وہ کسی اور کا دیا ہوا دکھ خود لینا چاہتی ہے...... کیا تم بھی اتنے
اعلیٰ ظرف ہو کیپٹن کہ کسی ایسی عورت کو سہارا دے دو جسے تمہاری برادری کا
کوئی شخص داغ دے چکا ہو۔"
نہیں نہیں...... شاید میں ایسا نہیں کر سکتا تھا......
تو پھر تمہیں یہ حق بھی نہیں پہنچتا کہ تم فرحانہ علیم کو اپنی مستقبل زندگی میں شامل
کرو۔ اس کے ضمیر نے فیصلہ سنا دیا اور وہ یہ اٹل فیصلہ کرنے کے بعد اسی
شام کو اس کے گھر پہنچ گیا۔
اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "فرحانہ علیم میں تمہاری شرط
پوری نہیں کر سکتا ــــ"
"لیکن کیپٹن وقار! مسلمان جرنیل ہمیشہ اپنے وعدے اپنی شرطیں
پوری کیا کرتے ہیں ــــ اتنے بخیل مت بنو ــــ جو کچھ میں نے مانگا ہے
فیاضی سے مجھے عطا کر دو۔" فرحانہ نے بڑے وقار سے جواب دیا۔
اور کیپٹن وقار نے اسے منع کیا..... سمجھایا..... بہلایا.....
بحث کی..... لیکن ضدی باپ کی ضدی بیٹی اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی۔
...... اور وہ کیپٹن وقار جو اپنے سے پانچ گنا بڑے دشمن کے سامنے
سر نہیں جھکا سکا تھا، ایک کمزور اور نازک سی لڑکی کے آگے بے بس ہو گیا۔
اور جب اس نے اپنا فیصلہ اماں کو سنایا تو وہ چیخ اٹھیں ساتھ ہی
ٹوٹا ہوتا تو صبر کر لیتی۔ لیکن وہ تو لنگڑا بھی ہے۔ اماں دو تین دن تک گھر
میں بولائی بولائی پھریں ــــ لے کہاں لڑکی تو شادی کے نام سے بھاگتی
تھی اور اب کرنے چلی تو......
"تو کیا ہوا اماں اگر اس کا ایک ہاتھ اور پاؤں نہیں...... وہ ہاتھ
اور پیر اس نے ٹرین کے نیچے رکھ کر شوقیہ تو نہیں کٹوایا...... وطن کے
اوپر قربان کیا ہے...... اس وطن کو بچایا ہے...... جہاں ہم لوگ
رہتے ہیں......" اور پھر اماں مان ہی گئیں...... مانتی بھی
کیوں نہ، لے دے کے ایک ہی بیٹی تھی۔ اس کی خوشی ان کی خوشی بن گئی
اور پھر نصیب بھی تو کچھ ہوتا ہے۔ اللہ کی ذات پر بھروسہ کر کے وہ تیاریوں
میں مشغول ہو گئیں۔
اور جب ایک دن فرحانہ سرخ کپڑوں میں پھولوں سے سجی سجائی
کیپٹن وقار کے ساتھ ہمیشہ کے لیے جانے کو گھر سے نکل کر سفید ٹیکسی کار
میں بیٹھی تو ماں صاحبہ کی آنکھیں تو تنہا اماں کے پاس چلی آئیں۔

..... جسم تپ گیا ..... عجیب عجیب خواہشیں، بالکل بلا کے جذبے اس کے سینے میں انگڑائیاں لینے لگے۔ اس نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر اپنے اوپر چھائے ہوئے وقار کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔ جذبات سے بھرا چہرہ خوشی اور غم کا عجیب سا امتزاج لیے ہوئے اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ اسے اپنے اندر چھپا لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کا ٹوٹا ہوا ادھورا اور آدھی ٹانگ فرحانہ کی نظروں کے سامنے گھوم گئی۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں داب لیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی گھلنے لگی۔

"فرحی ..... میرے پیار ..... میری جان ......"

وہ جنوں کی سرحدوں پر کھڑا ہوا ہولے ہولے اسے پکار رہا تھا اور پھر وہ اچانک ہی پلٹ آیا کہ آگے جانے سے مجبور تھا۔ اس نے سازِ حیات کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ ابھی تک تھرتھرا رہے تھے لیکن وہ ان تھرتھراتے تاروں میں اپنے جنوں خیز جذبوں کی شدت ملا کر نشاط کا کوئی راگ الاپ نہیں سکتا تھا۔ وہ معذور تھا۔ مجبوری کے اس احساس نے جھنجوڑ کر رکھ دیا اور اس نے بے بسی کے عالم میں کھو کر تکیے میں منہ چھپا لیا۔

خشک حلق کو تر کر کے کانپتے ہونٹوں سے فرحانہ نے صرف اتنا کہا۔

"میں کپڑے بدل لوں۔"

وہ منہ سے کچھ بھی نہ بولا صرف ہاتھ سے ملحقہ باتھ روم کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ جھپاک سے غسل خانے میں گھس گئی۔ شاور کے سرد پانی کی بوچھار نے اسے بڑا سکون دیا۔ وہ دیر تک بھیگتی رہی۔

آج زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے سوچا تھا کہ میری سوچیں، میرے خیالات کتنے سطحی کتنے غیر حقیقی تھے۔ مرد کے بنا ناقص عورت ادھوری ہی رہتی ہے۔ "لیکن فرحانہ بی بی سنو، تم تو اب عمر بھر یوں ہی ادھوری اور نامکمل رہو گی کہ یہ تمہارا مقدر ہے۔ اور یہ مقدر تم نے اپنے لیے خود چنا ہے۔" اس کے دھڑکتے دل نے سرکشی کی۔

نہیں ..... نہیں ..... میں ادھوری نہیں، میں مکمل ہوں کیونکہ روح کی محبت بھی تو امر ہوتی ہے۔ دل کے رشتے بھی تو عظیم ہوتے ہیں۔ صرف جسمانی آسودگی ہی تو شادی کا مقصد نہیں ..... اس نے گھبرا کر دل کو سمجھانا چاہا ..... اور پھر میں نے وقار سے شادی اپنے نفس اپنے جسم کے لیے تو نہیں کی۔ میں نے تو ایک نیکی کی بنا ڈالی ہے، بڑی اور عظیم نیکی ......

اس نے اپنی اس نیکی کے نشے میں ڈوب جانا چاہا لیکن وہ دل جو جنم جنم سے اس کے پہلو میں رہتا تھا، اس کے دکھ سکھ کا ساتھی تھا، آج آنکھیں بدلنے لگا تھا ..... "اتنی پرانی رفاقت کا تو کچھ خیال کر دیوں

"آ ذرا ہم بھی دیکھیں تمہارے داماد نے اپنی ساس کو کیا تحفہ بھیجا ہے"

نہ ستاؤ خدارا ....." اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ وہ نہ جانے کب تک بھیگتی رہتی۔ اگر وقار غسل خانے کا دروازہ کھٹکھٹا کر یہ کہتا۔

"کپڑے تو لے لیجئے۔"

اور اسے اپنی بے وقوفی پر ہنسی آگئی۔ وہ کپڑے لیے بغیر غسل خانے میں کپڑے بدلنے آئی تھی۔

"شکریہ۔" اس نے کپڑے وقار کے ہاتھ سے لیے۔ یہ ایک خوبصورت سی نائٹی تھی۔ "اُف اللہ ــــ وقار نے میرے لیے کیا کیا چیزیں لا کر رکھی ہیں۔ میرا کتنا خیال ہے ان کو۔ خوشیوں کے لیے ترسا ہوا یہ انسان بھی کتنا معصوم ہے۔ مجھے اس کو ڈھیر ساری خوشیاں دینی چاہئیں اس کے دکھ بانٹ لینے چاہئیں۔" فرحانہ کے پرانے جذبے جاگ اٹھے۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے کتنا دکھی، پشیمان اور پریشان لگ رہا تھا۔ فرحانہ بال خشک کیے بنا نائٹی پہن کر باہر چلی آئی۔

وقار تکیے میں منہ دیئے لیٹا تھا۔

وہ شرارت سے دبے قدموں چلتی ہوئی ان کی پشت پر پہنچی اور اپنے گیلے بال ان کے چہرے پر جھٹک دیئے۔

انہوں نے چونک کر سر اٹھایا۔

"ارے کیا ہوا ..... آپ رو رہے ہیں؟" وہ گھبرا گئی۔ ان کی سرخ بھیگی آنکھیں اور بکھرے بال، اداس اور خاموش چہرہ اسے پریشان کر گیا۔

"کیا ہوا آپ کو .....؟ بتائیے ..... بتائیے نا .....!" وہ ان کے قریب بیٹھ گئی لیکن وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

"وقار ..... بتائیے نا ..... کیا ہوا .....؟ آپ نہیں بتائیں گے۔ پلیز بتائیے آپ کو میری قسم وقار ..... بتائیے نا؟"

اس کی آواز بھرا گئی۔

وقار بے چین ہو کر اٹھ بیٹھے۔

"اپنی قسم نہ دو فرحی۔ تمہارے سوا میرے پاس اب ہے ہی کیا۔ اور یوں بھی میں تم سے شادی کر کے اتنا بڑا ظلم کر چکا ہوں۔ میں سوچتا رہا تھا فرحی کہ میں نے شادی کا اقرار ہی کیوں کیا تھا۔ میں تو جانتا تھا کہ میں ایک معذور شخص ہوں اور تم ایک معصوم اور جوان لڑکی...... میں تمہارے لیے ہرگز مناسب نہیں تھا.... پھر میں نے اقرار کیوں کیا۔ کیا میں خود غرض تھا، یا پھر میں ظالم بن گیا تھا.... یقیناً میں ظالم ہوں فرحی۔ میں نے تمہارے ساتھ ظلم کیا ہے، بہت بڑا ظلم..... مجھے معاف کر دو فرحانہ خدارا معاف کر دو۔" کیپٹن وقار بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

"کیپٹن وقار..... بس اتنا ہی حوصلہ ہے تمہارا..... تم تو بڑے بہادر بڑے جری انسان تھے۔ تمہیں ہوا کیا جو یوں رو رہے ہو کس نے کہا کہ تم نے ظلم کیا؟..... نہ تم ظالم ہو نہ ہی خود غرض، شادی تم نے مجھ سے نہیں کی، میں نے تم سے کی ہے۔ کیا تم بھی جسمانی قربتوں کو ہی سب کچھ جانتے ہو۔ روحانی پیار بھی تو ایک حقیقت ہے۔ دلوں کے رشتے بھی تو عظیم رشتے ہیں۔ خلوص و محبت بھی تو کوئی شے ہے۔ سنو! ہم دونوں دوست ہیں۔ اچھے، پیارے اور گہرے دوست!" وہ ایک بار پھر فرحانہ بن گئی، مخلص اور دردمند...... وقار کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اسے سمجھاتی رہی اور وقار ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔

"سنو دوست کیا تم اپنے بارے میں، اپنے ماضی، اپنے خاندان اور رشتہ داروں کے بارے میں کچھ نہ بتاؤ گے۔" فرحانہ نے جھک کر پوچھا اور آہستگی سے اس کا سر اپنے زانو پر سے ہٹا کر تکیہ پر رکھ دیا۔

اور پھر رات گئے تک وہ اسے اپنے ابا امی اور چھوٹی بہن کے متعلق بتاتا رہا کہ کس طرح وہ تینوں اچانک حادثے کا شکار ہو کر اسے تنہا چھوڑ گئے۔ ابا اور چچا کے کاروبار، جائیداد، فوج کی ملازمت، محاذ جنگ اور ان دونوں کوٹھیوں کے بارے میں بتاتا رہا جو چچا نے اسے بحالی جرأت ملنے پر اس کے نام کی تھیں۔

دوسرے دن صبح جب وہ کیپٹن وقار کے ساتھ گاڑی میں اماں سے ملنے پہنچی تو ڈرائیور نے گاڑی گھر سے ذرا فاصلے پر روک دی۔

"آگے لے چلو۔" کیپٹن وقار نے کہا۔

"آگے جگہ نہیں ہے جناب، ایک اور گاڑی کھڑی ہے، گلی تنگ ہے۔"

فرحانہ نے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ دردانہ صاحب کے گھر کے آگے اسی رنگ، اسی ماڈل کی نیو کار کھڑی تھی جسے چاروں طرف سے گلی کے بچے گھیرے ہوئے تھے۔

"دیکھئے صاحب۔ آپ کی گاڑی کے ہمزاد نے راستہ روک رکھا ہے۔" فرحانہ نے کیپٹن سے کہا۔

"تو پھر اترتے ہیں..... مجبوری ہے۔" کیپٹن نے کندھے اچکائے ڈرائیور نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ وہ نیچے اتری۔ وقار کا ہاتھ تھام کر نیچے اتارا اور پھر بیساکھی اٹھا کر دینے کے بعد وہ دونوں ساتھ ساتھ چل دیئے۔

"اوہ، یہ گاڑی شاید دردانہ صاحب نے خریدی ہے۔"

"ہاں.... خریدی ہوگی.... لیکن اگر میں اپنی گاڑی میں نہ آیا ہوتا تو شاید یہ سمجھتا کہ یہ کھلا سرقہ ہے.... ماڈل.... کار.... ڈیزائن.... کسی چیز کا فرق نہیں سوائے نمبر پلیٹ کے۔"

"دیکھیں، وہ ہیں دردانہ صاحب۔" اس نے کیپٹن کو اشارے سے بتایا اور وہ دونوں ان کے پاس ہی چلے آئے۔

"مجھے افتخار دردانہ کہتے ہیں۔ میں ان کا پڑوسی ہوں اور ان کی تحریروں کا شیدائی بھی۔ شاید انہیں علم ہو۔" دردانہ نے خود سے فرحانہ کی طرف دیکھا۔ سرخ سرخ آنکھیں، ستا ہوا چہرہ رات بھر جاگنے کی چغلی کھا رہا تھا اور وہ ان تیز نظروں سے بچنا چاہتی تھی۔ اس نے یکدم گھبرا کر کار کی مبارکباد دے ڈالی۔

"شکریہ..... پسند آئی آپ کو؟"

"جی ہاں.... کیوں نہیں...... لیکن یہ آپ نے خریدی کب؟"

"ابھی ابھی لا رہا ہوں۔"

"کیوں رات کیا نیند نہیں آئی تھی آپ کو۔" فرحانہ نے شرارت سے چوٹ کی۔

"جی ہاں، بیگم فرحانہ وقار، نیند تو بے شک نہیں آئی، لیکن اس کی وجہ بے جان اسباب وغیرہ کار نہیں تھی۔ یہ کار تو امی کے اصرار پر خریدی ہے.... انسان دوسروں کی خواہشات کی تکمیل تو کر سکتا ہے، لیکن اپنی خواہشات کی تکمیل پر قادر نہیں ہوتا۔ شاید اس لیے کہ دوسروں کے بس میں ہوتی ہیں۔ وہ ان کو دوسروں کی خاطر دبا لیتا ہے، چھپا لیتا ہے، لیکن پھر بھی وہ آنکھوں سے جھانکتی نظر آ ہی جاتی ہیں۔" وہ رسان سے بولتا چلا گیا۔

اور فرحانہ دوبارہ چوٹ کرنے کے پچھتا رہی تھی۔ اس نے نظریں یوں جھکا لیں جیسے خود اس کے دل کا چور پکڑا گیا ہو۔ "یہ کیا کہہ رہا ہے۔ کہیں یہ پھر چوٹ تو نہیں کر رہا۔ کہیں اس نے تو نہیں جان لیا کہ میں..... میں..... لیکن میں کیا..... مجھے کیا ہوا..... کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں، میں تو خوش ہوں، بہت خوش، میری سب سے بڑی آرزو تکمیل کا روپ پا چکی۔

لڑکی ہے۔ وہ کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتی۔ اسے وقار کسی پارٹی میں ملا تھا۔ اس نے اسے بتایا کہ ٦٥ء کی جنگ میں وہ معذور ہو گیا تو اس کی منگیتر نے منگنی توڑ لی جس کا اس نے بہت اثر لیا اور سب عورتوں سے نفرت ہو گئی کیونکہ وہ سمجھنے لگا تھا کہ سبھی عورتیں ظالم ہوتی ہیں۔ فرحانہ صرف اسے یہ بتانے کے لیے کہ عورت ظالم نہیں، پیار کرنے والی، قربانی دینے والی ہستی ہے اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر بیٹھی۔ میں نے بہت منع کیا۔ سمجھایا۔ ڈانٹا ڈپٹا لیکن اس نے جب رو رو کر مجھے قسمیں دیں تو میں انکار نہ کر سکی۔ یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ میری بیٹی کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتی۔"

"اونہو، دکھی نہیں دیکھ سکتی، پر دکھ دے سکتی ہے۔" انھوں نے طنز کیا۔

"کس کو دے دیئے دکھ اس نے؟" اماں نے الجھ کر پوچھا۔

"تم نہیں جانتیں کیا..... وہ میرا بیٹا.... میرا بچہ... افتخار.... میں اس کی منتیں کر کر کے تھک گئی... میں نے اسے قسمیں دیں کہ بیٹا شادی کر لے... تو ہاں تو کر، میں ایک سے ایک پیاری سی لڑکی ڈھونڈ نکالوں گی لیکن وہ یہی کہہ دیتا ہے۔

"امی.... جس سے کرنا تھی اس نے ہی انکار کر دیا۔ اب کیا کسی کو پسند کروں۔" میں نے فرحانہ کی شادی کی بات اس لیے اس سے چھپائے رکھی لیکن کل جب وہ نکاح میں شامل ہو کر واپس گیا تو بس کمرے میں بند ہو گیا میں جانتی ہوں کہ وہ ساری رات نہیں سویا۔ میں کھڑکی میں جا جا کر جھانکتی رہی۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہا۔ کتابیں پڑھتا رہا۔ ٹہلتا رہا۔ وہ میرا بیٹا مجھ سے اس کا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔ میں اس کی ماں ہوں۔ میں اس کی مرضی اس کی خواہش بہت پہلے سمجھ گئی تھی لیکن تم نے صاف انکار کر دیا۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہتا تو کیا ہوا.... میں تو جانتی ہوں وہ کتنا دکھی ہے کتنا پریشان ہے۔" وہ ماں صاحب کی امی رونے لگیں۔"..... نہ جانے.... وہ اتنا پاگل کیوں بن گیا ہے۔ دنیا میں صرف وہی ایک لڑکی تو نہیں۔ ایک سے ایک پڑی ہے۔"

اماں نرم پڑ گئی تھیں۔"..... اب میں کیا کر سکتی ہوں بہن۔ اب جو ہونا تھا ہو گیا۔"

اور بستر پر لیٹی ہوئی فرحانہ کانٹوں کی سیج پر لوٹنے لگی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی دھڑکنوں کو سنبھالا۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں..... یہ کیا ہوا.... میں نے یہ کیا کیا۔ میں نے کسی کو خوشی دی تو کوئی دکھی ہو گیا.... اب بھلا بتاؤ میں کیا کروں۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ اس قدر سنجیدہ بھی ہو سکتا ہے..... اور اگر میں کیپٹن وقار کو سہارا نہ دیتی تو کون تھا جو انھیں سہارا دے دیتا... ویسا کے لیے تو بہت سی لڑکیاں تیار ہو جائیں گی۔

"اب بھی کچھ نہیں ہوا..... میرا وہ تو اب بھی تیار ہو جائے گا۔"

فرحانہ کا خون یکبارگی گردش کرنا بھول گیا۔

"ارے..... بہن..... کیا کہہ رہی ہو تم... ہوش میں تو ہو... میری بیٹی کو کیا سمجھ لیا ہے تم نے۔ وہ صرف سہاگن بنا چاہتی ہے۔ اور شادی ایک دفعہ ہوا کرتی ہے۔ بار بار نہیں۔ یہ گڑیا گڈے کا کھیل نہیں۔" اماں تیز لہجے میں بولیں تو وہ ساکی امی خاموش ہو گئیں۔

اور فرحانہ..... اس کی نیند تو گئی تھی لیکن اب قرار بھی گیا۔ وہ مضطربانہ کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس کا سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ کافی دیر تک الٹی سیدھی سوچوں سے الجھتی رہی۔ شام کو کیپٹن وقار اسے لینے آئے تو وہ اپنے ساتھ اماں کو بھی لیتی گئی کہ رات ان دونوں میں یہی طے ہوا تھا کہ اماں کو اکیلا نہیں رہنے دیا جائے گا۔

دوسرے دن کیپٹن وقار نے فرحانہ سے پوچھا "فرحانہ بیگم ابھی تک میں نے اپنے دوستوں کو اپنی شادی کی اطلاع نہیں دی۔ دراصل میں انھیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ کیوں نہ کل شادی کی خوشی میں پارٹی دے دی جائے۔"

"میں نے بھی اپنی سہیلیوں کو شادی کی اطلاع نہیں دی۔ اگر ممکن ہو تو انھیں بھی بلا لیا جائے۔"

"ہاں کیوں نہیں..... مل بیٹھنے کا اچھا موقع ہوگا... ضرور ضرور بلاؤ اپنی سہیلیوں کو۔ کیا خیال ہے پارٹی گھر میں ہو یا ہوٹل میں؟"

"میرا ووٹ تو گھر پہ پارٹی دینے کے حق میں جاتا ہے۔ ویسے آپ اماں سے پوچھ لیجئے۔"

"ہاں اماں سے پوچھنا ضروری ہے لیکن آپ کی رضا ہمارا فیصلہ ہے سرکار۔" کیپٹن شوخی سے مسکرائے۔

"شکریہ!" فرحانہ آداب بجا لائی۔

پارٹی کے سارے انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ اماں اور فرحانہ نے مل کر بہت سی ڈشیں بنائی تھیں۔ باہر سے بھی بہت سارا سامان منگوا لیا تھا۔ فرحانہ نے سبز ستاروں بھری جارجٹ کی ساڑی پر بڑا جوڑا باندھا گیا۔ گلے میں بھاری ہار اور ماتھے پہ جھومر لگانے کو وہ تیار نہ تھی لیکن وقار اور اماں کی ضد پہ اسے لگانا پڑا۔ موتیے کی کلیاں جوڑے میں ٹانک کر نہ جانے کیوں اس نے تیز میک اپ کر ڈالا۔ وہ شاید اپنے آپ کو بہت نمایاں کرنا چاہتی تھی یا پھر بے پناہ خوشی اور مسرور ہونے کا اظہار کرنا مقصود تھا۔

وقار کی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے جانے کیوں افتخار صاحب یاد آ گئے۔ اس نے سوچا کاش وقار کا یہ ہاتھ کٹا نہ ہوتا تو وہ کتنے وجیہہ، کتنے شکیل اور خوبصورت لگتے۔

ناصر زیدی

شوقِ دلِ وارفتہ کا اک صیدِ زبوں ہوں
کھلتا ہی نہیں بھید کہ میں کون ہوں کیوں ہوں

بس میں ہے کہاں اہلِ خرد کے مجھے سمجھیں
جو آنکھ سے اوجھل ہے میں وہ عکسِ دروں ہوں

خالق ہوں بہاروں کا سرِ گلشنِ ہستی
جو پھول کھلاتا ہے وہ اک موجۂ خوں ہوں

میں دستِ زمانہ کے مٹاتے نہ مٹوں گا
اک نقشِ وفا ہوں کہ سرِ لوحِ جنوں ہوں

صہبائے حقیقت کا ہوں سرمستِ [illegible]
اک بندۂ آزادِ طلسمات و فسوں ہوں

دے مجھ کو دعا تیری طلب ہے دنیا
تو جیسے سمجھتی ہے میں کچھ اس سے فزوں ہوں

ناصر ابھی مہلت ہے کسی سے تو ملا کیا!
میں منتظرِ ارباب ہوس سے تو بہ دل ہوں

کی وہ ایک باریک سی شریر لٹ صندلی رخساروں پہ جھکی بار بار ابھر رہی
تھی۔ وہ گہری آنکھیں ابھر رہی تھیں جن میں حیا اور پاکیزگی کا کاجل لہرا
رہا تھا، جو اس شگبار موسم میں شاخ گل پہ جھکتے ہوئے اس گلاب سے
مشابہ تھی، جو آنکھیں جھکائے مسکرا رہا ہو۔

* * *

لیلیٰ نے دریچے سے باہر جھانکا۔ بارش تھمنے کے بعد کا منظر بے حد
دلکش تھا۔ دھلے دھلے اونچے درخت، کھلے کھلے پھول، مہکی مہکی ہوائیں
اور چکنی سرمئی سڑکیں دعوت نظارہ دے رہی تھیں۔ نمناک ہوا کے معطر
جھونکے اس کے رخساروں سے ٹکرائے تو اسے بے ساختہ ایک ہفتے قبل کی
وہ دھواں دھار بھیگتی ہوئی شام یاد آگئی جب کیپٹن خیام ان کو گھر تک
چھوڑ کر گیا تھا۔ تب سے اب تک وہ ہزار بار خود کو ملامت کر چکی تھی۔ "تو
توبہ! شکریے کے دو لفظ بھی نہ کہے۔ حد ہو گئی بدتہذیبی کی" فیضی اور وہ
اب تک کئی تاریخی مقامات گھوم چکے تھے۔ آج شالیمار کا ارادہ تھا۔ ایک
ہفتے سے وہ لاشعوری طور پر کیپٹن کی راہ تک رہی تھی۔ شاید وہ آجائے
آئے یا کہیں اچانک مل جائے۔ جوڑا بناتے ہوئے وہ مسلسل سوچے جا
رہی تھی۔ باہر سے فیضی کی بڑبڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ "یہ ریحان بھائی کی
مصروفیات تو کبھی ختم نہ ہوں گی۔ اب اتنے ذرا سے پروگرام کے لئے ٹیکسی
میں جھانکتے پھرو" وہ پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوا تو اس کی بے طرح بسورتی
ہوئی شکل دیکھ کر لیلیٰ ہنس دی۔ "بس بس۔ زیادہ تاؤ مت دلائیے" وہ لڑکیوں کا
عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر بولا "آپ کے ہنسنے سے آگ لگ جاتی ہے
مجھے" گیٹ سے نکل کر یہ دونوں مین روڈ پہ ہو لئے۔ فیضی کا موڈ اب تک
خراب تھا اور لیلیٰ کو ہنسی آئے جا رہی تھی۔ ابھی دو چار قدم ہی چلے تھے
کہ عقب سے ایک سیاہ کار ۔۔۔۔ ان کے قریب آکر رکی۔ "ہیلو ساتھی"
بولتے شیشوں کے عقب سے کیپٹن خیام کا زندگی کی جوت سے جگمگاتا ہوا
چہرہ جھانکا۔ ساتھ ہی وہ دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔
"ہوآیا۔ خیام بھائی" فیضی اسے دیکھ کر کھل اٹھا۔ "ہیلو مس فراز!"
اس نے بھرپور نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ ولی جاد حیٹ کی نارنجی ساڑی
میں یہ نکھری نکھری لڑکی اسے پہلی ملاقات سے زیادہ حسین لگی۔ لیلیٰ اپنی
جگہ سمٹ کر رہ گئی۔ اس اچانک ٹکراؤ سے وہ بوکھلا گئی تھی۔
"آج کدھر کے ارادے ہیں شہزادے" اس نے فیضی کے شانے
پہ بے تکلفی سے ہاتھ رکھ کر پوچھا "شالیمار چلنے" "شہزادہ" کہیں زیادہ
بے تکلف تھا۔ ایک اجنبی سے لیلیٰ کو فیضی کی یہ بے تکلفی پسند نہ آئی۔ وہ فیضی
کو آنکھوں ہی آنکھوں میں گھورتے ہوئے بولی "ٹیکسی بلا لو فیضی" "یہ خادم
کب کام آئے گا۔ آپ ادھر تشریف لائیے" کیپٹن خیام قدرے خم ہو کر کار
۔۔۔ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "میں بھی اس وقت غزنی اور تفریح
کے موڈ میں ہوں" اس کے خوبصورت ہونٹوں پہ ایک دلآویز تبسم پھیل
رہا تھا اور آنکھوں کی مسکراہٹ دلی خوشیوں کی غماز تھی۔
اس کے ساتھ شالیمار کی سرخ روشنیوں اور پانی اچھالتے فواروں،
گھنے درختوں اور پھر بارہ دری میں ٹہلتے ہوئے لیلیٰ کے احساسات کچھ
عجیب سے ہو رہے تھے۔ وہ نہ جانے کون تھا مگر اجنبی ہوتے ہوئے بھی
اجنبی نہ لگتا تھا۔ وہ آج یونیفارم کے بغیر تھا اور جا کیٹ کلر کے دھاری دار
سوٹ میں اپنے دلکش سراپے کی تمام تر جاذبیت اور وجاہت سمیت قدم
سے قدم ملائے چل رہا تھا۔ وہ جو آج ان کے ساتھ تھا کل نجانے کہاں ہوگا!
بارہ دری کے قریب گیسٹ ان میں کافی پیتے ہوئے لیلیٰ نے یہ بات کئی بار سوچی
اٹھتی ہوئی بھاپ کی اوٹ سے جھانکتی وہ گہری حساس آنکھیں بھی اس سوال
کا جواب نہ دے سکی تھیں۔ بہت دیر بعد جب سورج کا نارنجی رنگ دور
آموں کے جھنڈ کے پیچھے اترتا جا رہا تھا تو وہ لوگ گھر کو واپس چل دیئے
۔۔۔۔ پھر کیپٹن خیام سے ان کی کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ فیضی سے ان
کی گہری دوستی ہو گئی تھی۔ ان دونوں کی چھٹیاں قریب الختم تھیں۔ انہی
دنوں کیپٹن بھی جانے کدھر روپوش ہو گیا۔ فیضی کو اس کی گمشدگی پہ بڑی
تشویش تھی اور اس سے ملے بغیر لاہور سے جانے کا تصور بھی بے حد پرملال
تھا۔ کچھ یہی کیفیت لیلیٰ کی بھی تھی۔

* * *

دوپہر کا وقت تھا۔ لان خالی پڑا تھا۔ صرف لیلیٰ آلوچے کے پیڑ
تلے کرسی ڈالے کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ کل اسے اور
فیضی کو واپس پشاور جانا تھا۔ اس وقت وہ سیٹیں ریزرو کرانے گیا ہوا
تھا۔ جب سے عطیہ خالہ اس کے پاس بیٹھی ہوئی مزید رکنے پہ اصرار کر رہی
تھیں مگر وہ بضد تھی۔ ایک تو چھٹیاں ختم ہونے کو تھیں پھر پپا کا بلاوا
بھی آگیا تھا۔ وہ خود بھی ان کے بغیر بہت اداس ہو رہی تھی۔ وہ تو عطیہ
خالہ کی بے پناہ محبت اور ریحان بھائی کے بے پناہ خلوص میں وقت
کا کوئی احساس نہ ہوا تھا۔ اس کی والدہ کے انتقال کے بعد خالہ نے
اسے اپنے پاس رکھنے کی بہت کوشش کی تھی مگر پپا کو اس کی جدائی
پل بھر گوارا نہ تھی۔ عطیہ خالہ کے دو ہی لڑکے تھے ریحان اور فیضی۔ فیضی کو پپا نے
[illegible] اپنے پاس رکھا تھا۔ ریحان بھائی کی شادی ہو چکی تھی بھابی
آج کل اپنے میکے گئی ہوئی تھیں۔ اس لئے کوٹھی اور بھی خاموشیوں میں
ڈوبی ہوئی تھی۔ دھوپ کافی چڑھ آئی تھی۔ لیلیٰ اٹھ کر اندر جانے کا سوچ
رہی تھی [illegible]
[illegible] فیضی [illegible]

کی قسم لیلیٰ! اب میں اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کی بھرپور چاہتیں اور تمام تر محبتیں تمہارے قدموں میں نچھاور کرتا رہوں گا...... مجھ کو آج تک یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ تم مجھ کو اس حد تک پسند کرتی ہو۔ آج اپنے ہاتھوں میرے مقدر پر خوش بختی کی مہر لگا دو!" غیام نے اپنی روشن روشن آنکھیں لیلیٰ فرازی کی طرف اٹھائیں تو دم بخود رہ گیا۔ لیلیٰ کا وجود سرکش طوفانوں کی زد پر آئے ہوئے خزاں رسیدہ پتے کی طرح کپکپا رہا تھا۔ چہرے کی زردیوں، کانپتے لبوں اور نگاہوں کے سکوت نے اسے پریشان کر ڈالا۔ "کیا بات ہے لیلیٰ؟" غیام نے نرمی سے اس کے شانے کو چھوا۔ اور وہ جیسے آتی دیر سے بادِ سموم کی تباہ کاریوں اور حوادثات کی تند و تیز آندھیوں میں بھٹکتی پھر رہی تھی۔ چونک پڑی۔ اس نے ایک نظر غیام کی نگاہوں میں جھانکا اسے محسوس ہوا کہ وہ صدیوں کا فاصلہ پل بھر میں طے کر گئی ہو۔ لیکن دوسرا لمحہ وہ تھا جہاں سچی حقیقتیں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہی تھی۔ اس کا نرم دل سہم کر خائف ہو کر بے تحاشہ چلا اٹھا۔ "نہیں نہیں! ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ "تم...... تم کیا کہہ رہی ہو لیلیٰ!" غیام نے جنگلے پر جھکی لیلیٰ سے مخاطب ہو کر پوچھا اس نے آہستہ آہستہ جنگلے سے سر اٹھایا۔ چاند آنکھوں میں اترتا چلا گیا۔ ندیا کے کنارے بلوط اور یوکلپٹس کے درخت دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ چھدری چھدری شاخوں سے چاندنی چھن چھن کر ندیا کی لہروں میں گم ہو رہی تھی۔ "میں تمہارے جواب کی منتظر ہوں" اس کے کانوں میں غیام کے مضطرب لہجے کی بازگشت گونجتی چلی گئی اور تب وہ اس کی طرف سے رخ پھیر کر پُرسکون انداز میں بولی۔

"سحر کو زبردست غلط فہمی ہوئی ہے کیپٹن! اس لئے آپ کو کوئی میرا فرار جواب نہ دے سکوں گی..." غیام کا دل سینے میں دھڑکنا بھول گیا مگر دوسرے لمحے وہ بے اختیار ہنس دیا اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے قدرے جھک کر بولا "اف بہت شریر ہو تم، یہ مذاق کا وقت نہیں" لیلیٰ نے تڑپ کر ہاتھ کھینچ لیا اور سختی سے بولی "مجھ کو مذاق کی عادت نہیں ہے کیپٹن! اور مذاق وہاں جائز ہے جہاں بے تکلفی ہوتی ہے۔ میرا آپ کا کیا تعلق! آپ انجانے میں غلط فہمی کا شکار ہو گئے لہٰذا حقیقت کا برملا اظہار میرا فرض ہے۔ میں بچپن سے اپنے چچا کے لڑکے سے منسوب ہوں۔ سحر نے بھی مجھ سے کبھی اس بارے میں نہ پوچھا اور نہ میں نے بتایا اب آپ میری طرف سے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں...... میں نہیں! انہیں ایسا ہرگز نہیں...... تم جھوٹ کہتی ہو ...... یہ جھوٹ ہے...... جھوٹ!" ان آنسوؤں میں پتہ نہیں کیا کیا بہا گیا۔ اعلیٰ چھپ چھپ کر ستائش کا اظہار ہو رہا تھا...... اور تب وہ اس کا آنچل تھام کر شدت سے بچوں کی طرح بلکنے لگا۔ "حقیقت نہ چھپاؤ...... صاف

ایک اہم میٹنگ میں

صاف کہہ دو، تم مجھ سے نفرت کرتی ہو...... میں اس قابل نہ سہی مگر کسی کو اپنی ذات سے تو منسوب نہ کرو۔ یہ ظلم نہ کرو لیلیٰ......" ایک درد انگیز التجا ــــ ایک کرب انگیز فریاد اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر گئی اور وہ کچھ کہے بغیر اپنا دامن چھڑا کر بھاگتی چلی گئی....

وہ جنگلے کو تھامے تنہا کھڑا رہ گیا۔ اس کا سانس سینے میں الجھ رہا تھا۔ صدیوں پر بھاری وہ اذیت کوش لمحہ، جس کے متعلق اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا، پل بھر میں بیت گیا۔ ٹوٹے سپنے کی زہر آلود کرچیاں دل و جگر کو چھلنی کرتی رہیں۔ ہوائیں اس کے قریب سے سسکیاں لے کر گزر رہی تھیں...... چاند کے جگر میں سے قطرہ قطرہ لہو کی بوندیں ندیا کی لہروں میں بکھر رہی تھیں...... صنوبر کے پتوں نے اسے سر جھکا کے دیکھ کر مغموم انداز میں ہاتھ ہلائے اور زرد چنبیلی سر نیہوڑا کر ہچکیاں لینے لگی...... گل چاندنی کے پھول رو رہے تھے...... وہ اپنی سوچوں کی ڈگر پر کھڑا ہوا صدیوں سے تھکے ہارے اس انسان سے مشابہ تھا جس کی تلاش کا سرا گہرے پانیوں میں جا گرا ہو، جس کی ہر آرزو حسرت بن کر آنکھ سے ٹپکا ہوا فقط ایک آنسو ہو گئی ہے۔

♦ ♦ ♦

"آہ لیلیٰ! تم نے مجھ سے کس جرم کا بدلہ لیا۔ تم جو میری اتنی اچھی دوست تھیں، تمہارے خلوص کو کیا ہو گیا! خدا کے لئے کچھ تو بتاؤ......"

سحر کی آہ و زاری پر وہ پریشان ہوتی جا رہی تھی دھیمے سے بولی "جو حقیقت تھی وہ میں نے بتا دی۔ سحر تم نے کبھی اس مسئلے پر مجھ سے بات ہی نہیں کی اور اب میں حقیقت ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکی کہ میں کسی سے منسوب ہوں ــــ لعنت ہو اس کم بخت پر، بار بار اس کا ذکر نہ چھیڑنا

کرسے میں کیپٹن خیام کو اس بات سے قطعاً کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ فیضی تیر کی طرح اس کی طرف لپکتا چلا گیا اور وہ کھڑی رہ گئی۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ پچھلے اسے بھی انوائیٹ کیا ہے مگر اتنا یقین نہ تھا کہ وہ بھی آ جائے گا۔ وہ پہلے سے کافی تبدیل ہو گیا تھا۔ سیاہ ڈنر سوٹ اور ٹائی میں اس کی شخصیت کا سحر بری طرح افسردگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا وجود بجھا بجھا بے قرار سا تھا، یا اسے محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا فیضی وقار سے اس کا تعارف کروا رہا تھا۔ وقار کے مقابل اس کی گہری حساس آنکھوں کی پہنائیوں میں شام غم کی چاندنی رات کے دکھ بھرے حالات اور اذیت کوش گھڑیوں کا کرب بری طرح جھلک رہا تھا۔ اس نے لیلیٰ کی طرف دیکھا تک نہیں۔ موسیقی کی لہریں ہر لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھیں اور دھیمے ہوتے سازوں کی دھن پر تہذیب یافتہ کے علمبرداروں کے تھرکتے پاؤں کی جنبشوں میں اسے پورا ہال گھومتا لگ رہا تھا۔ وقار احمد شیخ کی مزید پکڑ کر ہاتھ ملا کے نکتے پھسلتے فرش پر پھسل رہا تھا وہ باہر آ گئی۔ کھلی فضا میں اس نے گہری سانس لی اور دور تک ٹہلتی چلی گئی۔ آخری تاریخوں کا بیمار چاند — بہار کے سرسراتے پتوں میں سے افسردگی کے ساتھ جھانک رہا تھا۔ ہوائیں بوجھل اور پریشان تھیں — ماحول حرماں نصیب آنکھ سے ٹپکتے ہوئے آنسو کی طرح جلتا لگ رہا تھا۔ ہال سے سازوں کی لہریں یہاں تک تعاقب کر رہی تھی عشق پیچاں کی بلند ہوتی ہوئی بیل کے قریب ہو کر اس نے پیچھے دیکھا کوئی ادھر ہی چلا آ رہا تھا جو اسی کی طرح اداس اور تنہا تھا۔ کوئی آیا۔

ایک لمحہ رکا اندھیری رات میں دو ستارے ٹوٹے اور اس کے قدموں میں بکھر گئے۔ وہ اس سرپھرے جھونکے کی طرح چلا گیا جو بیابانوں، جنگلوں اور صحراؤں سے بے پروائی سے گزرتا ہوا پہاڑوں سے ٹکراتا ہوا چلا جاتا ہے اور وہ — صبح دم سرسرانے والی اس نسیم سحر کی طرح کپکپاتی رہی جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی — ساز بج رہے تھے اور وہ زخم دل تھامے اکیلی کھڑی تھی۔ دل سلگ رہا تھا اور کوئی سر جھکائے تنہا جا رہا تھا۔

آج کل دن بہت بے کیف گزر رہے تھے۔ پاپا چند دوستوں کے ساتھ جاپان کی طرف شکار کے لئے گئے تھے۔ فیضی ان دنوں بڑی تھا مند کہ وہ بھی ساتھ ہو لیتا۔ چند روزہ پروگرام تھا۔ لیلیٰ بھی اسے روک نہ سکی تھی۔ وقار سے ملاقاتیں ہوئیں دوپہریں ڈھلتی تھیں اب گھر پر کم ٹھہرتا تھا۔ پاپا اس کے عجیب رویے سے پریشان تو رہتے تھے مگر جانے کیا سوچ کر خاموش تھے۔ انھیں گئے ہوئے آج دوسرا دن تھا۔

آج سردی شدت کی پڑ رہی تھی۔ آسمان پر سیاہ بادلوں کے چھوٹے سے ٹکڑے دائیں سے چلے آ رہے تھے۔ کسی موسم کے تو تیار تھے تیز ہوتی ہوائیں فراٹے بھر رہی تھیں وہ کھڑکی کے پاس سوچتے ہوئے گرم شال لئے انگیٹھی کے پاس کرسی پر نیم دراز تھی۔ کمرے کی خاموشیوں میں گھڑی کی ٹک ٹک بجتی مدھم آہوں کی طرح ابھر رہی تھی جیسے کوئی لمحہ تمام گر کر کھو رہا ہو۔ روتے ہوئے سازوں کے پس منظر میں اس کے کانوں میں کی بھرائی ہوئی آواز سن رہے تھے۔ اس نے کل شام لیلیٰ کو بہت دیر بعد ٹیلی فون کیا تھا۔ "لیلیٰ اجیا نے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا ہے اور ہمیشہ کے لئے جا رہے ہیں۔ چاہو تو تم انھیں روک سکتی ہو۔ وہ بہت دل برداشتہ ہیں۔" وہ فون ہی پر بلک بلک کر رو پڑی۔ لیلیٰ نے سوچوں کی یلغار سے گھبرا کر سر جھٹک ڈالا۔ عین اسی وقت کیپٹن خیام پردہ ہٹا کر اندر آ گیا۔ "کیا بیٹھنے کو بھی نہ کہو گی،" وہ ایک گمبھیر مسکراہٹ کے ساتھ دھیرے سے بولا۔ حیرت زدہ اور گھبرائی گھبرائی لیلیٰ نے کرسی اس کی طرف کھسکا دی۔

سیاہ پتلون، سفید قمیص پر زرد سویٹر پہنے وہ ساحل سے سر پٹختی لہر کی طرح مضطرب لگ رہا تھا۔ وہ خاموش بیٹھی تھی۔ "میں تم سے ایک آخری بات کرنے آیا ہوں۔" اس نے سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش کھینچا۔ پھر قدرے جھک کر بولا۔ "کیا آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہیں کر سکتیں؟" اس کا مختصر سا جملہ ہزاروں التجاؤں اور بے شمار فریادوں کی ایک دلخراش چیخ بن کر اس کے کانوں سے ٹکرایا۔ وہ تھرتھراتی ہوئی اس کے سامنے سے اٹھ کر دریچے میں آ رکی۔ "یہ جواب دو لیلیٰ..." کمرے کی فضائیں رک رک کر سانس لے رہی تھیں اور تب اس نے دھیرے دھیرے سنبھلتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "میں نے پہلے ہی تمام حالات بتا دیئے ہیں اب تو کوئی گنجائش باقی نہیں..." اس کا لہجہ ڈوب گیا اور اس نے مضبوطی سے دریچے کو تھام لیا۔ "لیلیٰ" ایک زخمی پکار کی بازگشت دیر تک گونجتی رہی اور اس گونجتی خاموشی میں ایک لرزاں لرزاں سی سرگوشی ابھری۔ "صرف ایک احسان اور مجھ پر کر دو لیلیٰ! پھر اس کے بعد شاید کبھی تم کو پریشان کرنے نہ آؤں گا.... فقط یہ بتا دو کیا تمہاری محبت واقعی وقار کے لئے وقف ہو چکی ہے—؟" وہ بلبلا اٹھی۔ "میں اپنے ذاتی معاملات میں آپ کو دخل دینے کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتی.... آپ کو اختیار نہیں ہے [illegible] اپنی حد سے آگے مت بڑھئے... اب آپ جا سکتے ہیں [illegible] لینے کے لئے آیا ہوں لیلیٰ!" وہ عجیب سے انداز میں [illegible] کر جاتے ہوئے تم کو کوئی ہرجانہ دے سکوں گا۔ یہ سے اس [illegible] لے صرف بد دعاؤں کے تازیانے رہ گئے ہیں [illegible] ہے تم نے

# بینا

وہ اک دم سے ہی ٹھٹک گیا ——— جسم کا سارا خون کنپٹیوں میں سنسنانے لگا ——— بے بس ہو کر ہونٹ کاٹ ڈالے۔

رضا چپو چلاتے ہوئے کشتی دور لے جا رہا تھا اور بینا مسکراتے ہوئے پانی سے کھیل رہی تھی ——— اسے دیکھ کر اس کا دل ڈوب گیا ———

"بینا یہ سب کیا کر رہی ہو۔"

خاصی دیر بعد وہ واپس آئی ——— مسکراتی ہوئی کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی ——— شرجیل کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر لاپروا سے انداز میں شانے جھٹک کر اندر چلی گئی۔

رات کو ایک ہوٹل میں ڈنر کا پروگرام تھا ——— سیاہ ڈنر سوٹ میں شرجیل بہت اسمارٹ لگ رہا تھا۔ بینا نے پاس سے گزرتے ہوئے اسے دیکھا ——— وہ کچھ بجھا بجھا سا لگ رہا تھا۔ چہرے پر ہمیشہ والی تازگی اور شگفتگی نہیں تھی۔ سوچ کا تاثر تھا ——— کندھے جھکائے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

ہوٹل کے باہر اور اندر سیاحوں کا ہجوم تھا ——— چہروں پر مسکراہٹیں بکھری پڑی تھیں ——— لوگ خوش خوش ایک دوسرے سے باتوں میں مصروف تھے ——— سب مسکراتے چہرے لیے اندر آ گئے۔ یہاں روشنیوں کی بہتات تھی ——— بینا گلابی کپڑوں میں تھی ——— اور اس گلابی لباس میں اس کے چہرے کا رنگ اور بھی نکھر آیا تھا ——— نکھری نکھری دھلی دھلی شفاف آنکھوں میں خوبصورت سی چمک اور ہونٹوں پر مدھ بھری مسکراہٹ تھی ——— شہلا ڈانس کے لیے چلی گئی تھی وہ صوفے پر بیٹھی اردگرد کے لوگوں کو دیکھ رہی تھی ——— ہر چیز میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی ——— دل اتنا خوش ہو رہا تھا ——— سینٹ کی مخصوص سی خوشبو محسوس کر کے گردن موڑ کر دیکھا ——— شرجیل پاس ہی کھڑا تھا۔

"بینا ڈانس کرو گی ———"

"مجھے شوق نہیں ———"

دنیا کے بہترین
ANTIFRICTION
بال سلنڈر اینڈ ٹیپر بیرنگ
کے

# جیک اسٹون

گلشن اقبال سے ملحقہ نئی اسکیم
گلشن خیام
پارک
پارک
پارک
پارک
پارک

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۲۴

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ____________

مقام و پتہ ____________

____________

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۳۴

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ____________

مقام و پتہ ____________

____________

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۳۴

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ____________

مقام و پتہ ____________

____________

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۳۴

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ____________

مقام و پتہ ____________

____________

در حقیقت پسند خاتون کے لیے

نیا سرف
صابن سے کہیں زیادہ صاف
دھوتا ہے
NEW
فرق صاف ظاہر ہے!
نئے سرف سے صابن کے مقابلے
میں کہیں زیادہ صاف بالکفایت دھلائی
LINTAS

بیج بونے سے پہلے ایم اے پی نائٹروفاس اور بعد میں
یوریا کھاد کی پوری مقدار استعمال کیجئے
اور تین گنا زیادہ پیداوار حاصل کیجئے — فرق خود دیکھ لیجئے

**زرعی ترقی میں آپ کے مددگار**

سندھ ایگریکلچرل سپلائز آرگنائزیشن (حکومت سندھ)

# دوشیزہ

شعری کاحصہ ——— رضا دسام ہما
مدیرہ ——— رخسانہ فاروقی
معاونہ ——— حسن عباس
سرورق ——— سلیم اختر
آرٹ ——— راحیلہ

ستمبر ۱۹۷۵ء

جلد — ۵

شمارہ — ۹

دفتر کا پتہ

ٹریڈ کمپلیکس، ۱۰۹ سی سنٹرل کمرشیل ایریا
پی ای سی ایچ ایس کراچی

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ دوشیزہ، پوسٹ بکس ۵۰۰۵ کراچی ۲۹

برانچ آفس

۷ گلستان اسٹریٹ پارک دین تھیل روڈ لاہور
فون ۹۱۷۷۷

قیمت فی پرچہ — ۳ روپے
زر سالانہ — ۳۴ روپے
رجسٹری ڈاک — ۴۰ روپے

ناشر

گولڈن بلاک ورکس لمیٹڈ
پرنٹر
پاکستان ہیرالڈ پریس کراچی

# فحاشی کا بُت

فحاشی کی باقاعدہ وضاحت کے لیے آج تک کوئی جامع اور ہمہ گیر تعریف ممکن نہیں ہو سکی کیونکہ اس کرۂ ارض کے مختلف خطوں میں بسنے والوں کا اس بارے میں اپنا اپنا تصور ہے جس میں تاریخی پس منظر، مذہبی وابستگی، علاقائی رسم و رواج اور اجتماعی شعور جیسے عوامل کا بڑا دخل ہے۔ آسان لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ہر وہ چیز جو کسی طرح جنسی ترغیب کا باعث بن سکتی ہو ہمارے نزدیک فحش ہے، خواہ وہ منہ سے نکلی ہوئی کوئی بات ہو، تحریر ہو یا کوئی تصویر، بھڑکتی ہوئی جذباتی صورتِ حال بھی اس سے مبرا نہیں۔

دراصل فحاشی کا بنیادی تصور بھی بنی نوع انسان کی طرح ہزاروں صدیاں پرانا ہے۔ انسان اپنے ارضی ٹھکانے پر ہر آن بدلتی ہوئی ذہنی کیفیات سے سرشار اپنی ارتقائی منازل سے گزر کر اب خود آگہی کے اس نازک دور میں داخل ہو گیا ہے جہاں اگرچہ اس کے مدتوں کے بھٹکے ہوئے شعور نے پوری طرح آنکھیں کھول دی ہیں لیکن مادی تصورات کی کہر سے اس کی بصیرت کی آنکھ دھندلا گئی ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ ان مقدس اقدار کی پامالی کی صورت میں نکلا ہے جن سے انسانیت کا بول بالا تھا۔ مادہ پرستی کی اُلجھنوں نے انسان کو کربناک ذہنی انتشار اور اعصابی بے چینی میں مبتلا کر دیا ہے اور وہ بسا اوقات محض جذباتی آسودگی کی خاطر جنسی کجروی کا شکار ہو جاتا ہے۔ آپ ذرا اپنے گرد و پیش پر نظر دوڑائیں تو آپ کو دفعتہً یہ ناگوار سا احساس ہو گا کہ جنسی جذبے کی اتنی عریانی کبھی دیکھی نہ کبھی سُنی تھی۔ آخر یہ کیوں — ؟ فلموں میں جنسی کشش کے کھلے مناظر، ٹی وی پر فرضی عشق و محبت کے رنگین فسانے، ریڈیو پر کانوں میں رس گھولنے والی موسیقی کی آڑ میں جنسی جذبات کو بھڑکانے والے عشقیہ گیت اور پاکستانی کلچر کی عکاسی کے بہانے رقصِ بُرد کی تھرکتی ہوئی محفلیں جس میں جسمانی نشیب و فراز کی وضاحت بڑی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ ان سب چونکا دینے والے عوامل نے مل کر ناپختہ ذہنوں پر یقیناً کھلا ڈاکہ ڈالا ہے۔ رہی سہی کسر گلی کوچوں میں جا بجا قائم ہونے والی نام نہاد لائبریریوں نے پوری کر دی تاکہ وہ بھی کہیں ہماری اخلاقی اقدار کو کندھا دینے کی سعادت سے محروم نہ رہ جائیں۔ آج اس مجرمانہ لوٹ کھسوٹ کی بدولت ہماری نئی نسل خاص کر ایک بے نام سی ذہنی خلش اور کرب آمیز جذباتی گھٹن میں مبتلا ہے اور کچھ عجب نہیں جو وہ جنسی بے راہ روی کو ہی اپنے درد کا درماں سمجھ بیٹھی ہے کیونکہ ؎

جب راہ نہیں پاتے تو چڑھ جاتے ہیں نالے

ضرورت اس امر کی ہے کہ ان افراد کے دلوں میں صحت مند ذہنی تربیت، اخلاقی رکھ رکھاؤ اور اسلامی اقدار کی ناقابلِ تردید اہمیت کا بھرپور احساس پیدا کیا جائے تاکہ وہ متعلقہ حقائق کی پرکھ سے متاثر ہو کر خود اپنے ہاتھوں اس فحاشی کے بُت کو چکنا چور کر سکیں ورنہ وہ وقت دور نہیں جب ہم اس جنسی بے راہروی کے کولہو میں پس پس کر نہ اِدھر کے رہیں گے نہ اُدھر کے، گویا دُنیا بھی جیتے جی ہاتھ سے گئی اور عقبیٰ میں وہی کلنک کا ٹیکہ جو لہو و لعب کی زندگی بسر کرنے والی قوموں کا مقدر بن چکا ہے۔

حال ہی میں ہمارے محترم وزیرِ اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو نے فحاشی کے بڑھتے ہوئے رجحان کے پیشِ نظر صوبائی حکومتوں کو اس سلسلے میں سخت ترین اقدام کرنے کی ہدایت کی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس مہم کے بڑے اُمید افزا اور دُور رس نتائج نکلیں گے جو ہمارے معاشرے کی بگڑتی ہوئی اخلاقی صحت کو بحال کرنے میں یقیناً مددگار ثابت ہوں گے۔

# تین عورتیں، تین کہانیاں

عذرا فاروقی

## بیٹی کی
## مانگ کا سیندور چھین کر ...

لوگ کہتے ہیں نصیرالدین کو بیوی کی دن بہ دن زور پکڑتی جوانی کا خوف نگل گیا۔ وہ خود پچاس کے پیٹے میں تھا۔ مضبوط ہاتھ پیروں کا محنتی آدمی تھا۔ صبح شام کارخانے میں کام کر کے لوٹتا تو اس کا چہرہ محنت و مشقت کے فخریہ جذبات سے دمک رہا ہوتا مگر جونہی گھر کی دہلیز پر قدم رکھتا وہ یکلخت بدل جاتا۔ رحمتے اس کی بیوی سولہ سترہ سالہ لڑکیوں جیسے تنگ کپڑوں میں شوخ میک اپ کئے اپنے کھلے بالوں کو ادھر اُدھر جھلاتی صحن میں پھرکنی کی مانند گھومتی تھی۔ شوہر کی آمد کا ذرہ برابر نوٹس نہ لیتی نصیر کے قدم اس کے انداز دیکھ کر وہاں سے پرچم کر رہ جاتے۔ وہ گھٹی آواز میں اپنی اکلوتی بیٹی سکینہ کو آواز دیتا جب کہ وہ جانتا تھا کہ سکینہ پڑوس میں اپنی سہیلی کے پاس بیٹھی ہوگی۔ وہ بارہا رحمتے کو سمجھا چکا تھا کہ چالیس

سال کی عمر میں عورت کا بننا سنورنا اس کی جوان لڑکی کو غلط راستوں پر ڈال سکتا ہے اور پھر جب تم مجھے یونہی اچھی لگتی ہو تو ان لال پیلے رنگوں میں خود کو کیوں تھیٹرتی ہو۔ لیکن رحمتے کو تو جیسے خود کو سجانے کا جنون تھا۔ جوانی میں بھی اس کا یہی حال تھا مگر اس وقت کی بات کچھ اور تھی۔ نصیر اس زمانے میں خود بڑا شوقین طبیعت کا آدمی تھا۔ وہ بیوی کے سنگار پر سو سو طرح کی داد دیتا تھا مگر اب وہ دم خم نہیں تھا۔ سکینہ کی پیدائش کے بعد تو جیسے اس نے اپنے سارے شوق ختم کر دیئے تھے۔ شوہر کا یوں مردہ دل ہو نا رحمتے کو ایک آنکھ نہیں بھایا۔ یہ حقیقت تھی کہ سکینہ بڑی منت مرادوں سے ہوئی تھی مگر وہ خود بیٹے کی خواہش مند تھی۔ بیٹی کے ہونے سے وہ دنیا کے نزدیک تو ماں بن گئی تھی مگر وہ اپنے طور پر خود کو مکمل نہیں سمجھتی تھی۔

ہو سکتا تھا کہ اور بچے ہو جاتے تو رحمتے کی سوچ کا انداز بھی بدل جاتا قدرت کو ایک ہی اولاد دینی منظور تھی اور رحمتے نے اسے ہمیشہ اپنی کوکھ کا کانٹا سمجھا باپ بیٹی سے بے حد پیار کرتا تھا۔ اس کی معمولی سی تکلیف پر ساری ساری رات جاگتا۔ جس بچے کے زیادہ ناز اٹھائے جائیں وہ والدین کو دکھ بھی زیادہ دیتا ہے۔ سکینہ زرد لاغر سی لڑکی تھی۔ ماں کی غیر توجہی سے اس کی صحت کو اور گھن لگ گیا تھا۔ رحمتے کو بھی اپنی بیٹی سے خدا واسطے کا بیر ہو گیا تھا۔ گھر کا سارا کام اسی سے کرواتی۔ بات بات پر میری سوکن کہہ کر اسے آٹھ آٹھ آنسو رلاتی ___ اور جب نصیر گھر پر آتا تو تمک مرچ لگا کر اس کے پھوہڑپن کے قصے سناتی۔ اس کے سلوک کو دیکھ کر ہم لوگ تو اسے سوتیلی ماں سمجھنے لگے تھے مگر جب محلے والوں نے قسمیں کھا کر بتایا کہ رحمتے سکینہ کی سگی ماں ہے تب بڑی حیرت ہوئی۔

ہم نے اس محلے میں نیا نیا مکان لیا تھا۔ یہاں زیادہ تر غریب طبقہ آباد تھا۔ بیشتر مرد کارخانوں میں مزدوری کرتے تھے۔ عورتیں گھروں میں جھاڑو برتن کا کام کرتی تھیں۔ نصیرالدین بھی اسی محلے کا آدمی تھا لیکن اس نے اپنی بیوی کو کہیں کام کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ گھر پر ٹھاٹ باٹ سے رہتی تھی۔ نصیر اکثر ڈبل شفٹ میں بھی مزدوری کرتا

مگر اپنی بیوی بیٹی کے لیے اچھے سے اچھا کھانا اور کپڑا مہیا کرتا رہتا۔ بیٹی کے کپڑے جوڑ کر رکھنے کی بجائے انہیں اپنے استعمال میں لے آتی۔ نصیر اس بات سے چڑتا تھا۔ سکینہ جب تک سمجھدار نہیں ہوتی تھی وہ ماں کی اس زیادتی کا نوٹس نہیں لیتی تھی مگر اب وہ تیرہ چودہ برس کی ہو گئی تھی وہ ماں کو جوبیں گھنٹے چہک چہک ٹونی دیکھتی۔ اندر ہی اندر کڑھتی کہ یہ کیسی ماں ہے جو بیٹی کے واسطے ایک دو بھی کپڑا ٹک سنبھال کر نہیں رکھتی۔ جسے نہ بیٹی کے بیاہ کے لیے کچھ بچا کر رکھنے کا کبھی خیال آتا ہے اور نہ وہ کبھی اس کے پہننے اوڑھنے کی فکر کرتی۔ یہی بات نصیر نے کبھی اشاروں میں اور کبھی کھل کر رضیہ کو سمجھائی کہ اب تو بچی عمر کی عورت ہے گھر میں بیٹی لکڑی کی بیل کی طرح بڑھ رہی ہے۔ اپنے سے زیادہ اس کی فکر کیا کر۔ مگر رضیہ کو ایسی باتوں سے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ وہ اور بھی بن ٹھن کر گھر سے نکلتی۔ نصیر اپنی بیوی کا چلن دیکھ دیکھ کر خون کے گھونٹ بھر کر رہ جاتا۔ آہستہ آہستہ سکینہ ماں سے دور ہوتی گئی۔ وہ اب سمجھنے لگی تھی کہ اس کی ماں روایتی ماؤں سے قطعی مختلف ہے۔ اس کا دل گھر کے ماحول سے اچاٹ ہو گیا۔ جب تک نصیر گھر میں نہیں آ جاتا وہ کام کاج نمٹا کر اپنا سارا وقت پڑھنے میں گزارتی۔ نصیر بیٹی کے دکھ کو سمجھتا تھا مگر بیوی کی فطرت بدلنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ صلح جو آدمی تھا اندر ہی اندر کڑھتا رہا۔ بارہا اسے بیوی کے کردار پر شبہ ہوا جو کسی حد تک درست بھی نکلا کیونکہ وہ رشتے کے بھائی بھتیجوں سے کچھ زیادہ ہی گھلنے ملنے لگی تھی۔ اس کی بات چیت کا انداز بدلتا جا رہا تھا۔ چال میں دن بدن زیادہ لچک پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جوانی

# تین عورتیں، تین کہانیاں

بہن کی

مانگ کا سیندور چھین کر ---

لوگ کہتے ہیں نصیر الدین کو بیوی کی دن بہ دن زور پکڑتی جوانی کا خوف نگل گیا۔ وہ خود پچاس کے پیٹے میں تھا۔ مضبوط ہاتھ پیروں کا محنتی آدمی تھا۔ صبح شام کارخانے میں کام کر کے لوٹتا تو اس کا چہرہ محنت و مشقت کے فخریہ جذبات سے دمک رہا ہوتا مگر جونہی گھر کی دہلیز پر قدم رکھتا وہ یکلخت بدل جاتا۔ رحمتے اس کی بیوی سولہ سترہ سالہ لڑکیوں جیسے تنگ کپڑوں میں شوخ میک اپ کئے اپنے کھلے بالوں کو ادھر ادھر جھلاتی صحن میں پھرکنی کی مانند گھومتی پھرتی۔ شوہر کی آمد کا وہ ذرہ بھر نوٹس نہ لیتی۔ نصیر کے قدم اس کے انداز دیکھ کر دروازے پر جم کر رہ جاتے۔ وہ گھٹی آواز میں اپنی اکلوتی بیٹی سکینہ کو آواز دیتا جب کہ وہ جانتا تھا کہ سکینہ پڑوس میں اپنی سہیلی کے پاس بیٹھی ہوگی۔ وہ بار بار رحمتے کو سمجھا چکا تھا کہ چالیس سال کی عمر میں عورت کا سجنا سنورنا اس کی جوان لڑکی کو غلط راستوں پر ڈال سکتا ہے اور پھر جب تم مجھے یونہی اچھی لگتی ہو تو ان لال پیلے رنگوں میں خود کو کیوں تھیٹرنی بنا رہی ہو۔ لیکن رحمتے کو تو جیسے خود کو سجانے کا جنون تھا۔ جوانی میں بھی اس کا یہی حال تھا مگر اس وقت کی بات کچھ اور تھی۔ نصیر اس زمانے میں خود بڑا شوقین طبیعت کا آدمی تھا۔ وہ بیوی کے سنگار پر سو سو طرح کی داد دیتا تھا مگر اب وہ دم خم نہیں تھا۔ سکینہ کی پیدائش کے بعد تو جیسے اس نے اپنے سارے شوق ختم کر دیئے تھے۔ شوہر کا یوں مردہ دل ہونا رحمتے کو ایک آنکھ نہیں بھایا۔ یہ حقیقت تھی کہ سکینہ بڑی منت مرادوں سے ہوئی تھی مگر دونوں خود بیٹے کی خواہش مند تھے۔ بیٹی کے ہونے سے وہ دنیا کے نزدیک تو ماں بن گئی تھی مگر وہ اپنے طور پر خود کو مکمل نہیں سمجھتی تھی۔ ہو سکتا تھا اگر اور بچے ہو جاتے تو رحمتے کی سوچ کا انداز بھی بدل جاتا۔ قدرت کو ایک ہی اولاد دینی منظور تھی اور رحمتے نے اسے ہمیشہ اپنی کوکھ کا کانٹا سمجھا۔ باپ بیٹی سے بے حد پیار کرتا تھا۔ اس کی معمولی سی تکلیف پر ساری ساری رات جاگتا۔ جس بچے کے زیادہ ناز اٹھائے جائیں وہ والدین کو دکھ بھی زیادہ دیتا ہے۔ سکینہ زرد لاغر سی لڑکی تھی۔ ماں کی غیر توجہی سے اس کی صحت کو اور گھن لگ گیا تھا۔ رحمتے کو بھی اپنی بیٹی سے خدا واسطے کا بیر ہو گیا تھا۔ گھر کا سارا کام اسی سے کرواتی۔ بات بات پر "میری سوکن" کہہ کر اسے آٹھ آٹھ آنسو رلاتی ۔۔ اور جب نصیر گھر آتا تو نمک مرچ لگا کر اس کے چھوٹے بڑے قصے سناتی۔ اس کے سلوک کو دیکھ کر ہم لوگ تو اسے سوتیلی ماں سمجھنے لگے تھے مگر جب محلے والوں نے قسمیں کھا کر بتایا کہ رحمتے سکینہ کی سگی ماں ہے تب بڑی حیرت ہوئی۔

ہم نے اس محلے میں نیا نیا مکان لیا تھا۔ یہاں زیادہ تر غریب طبقہ آباد تھا۔ بیشتر مرد کارخانوں میں مزدوری کرتے تھے۔ عورتیں گھروں میں جھاڑو برتن کا کام کرتی تھیں۔ نصیر الدین اسی محلے کا آدمی تھا لیکن اس نے اپنی بیوی کو کہیں کام کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ وہ گھر پہ ٹھاٹ باٹ سے رہتی تھی۔ نصیر اکثر ڈبل شفٹ میں بھی مزدوری کرتا

ز اپنی بیوی بیٹی کے لیے اچھے سے اچھا کھانا اور کپڑا مہیا کرتا رہتا تھا بیٹی
کپڑے جوڑ کر رکھنے کی بجائے انہیں اپنے استعمال میں لے آتی نصیر
اس بات سے چڑتا تھا۔ سکینہ جب تک سمجھ دار نہیں ہوتی تھی وہ ماں کی
زیادتی کا نوٹس نہیں لیتی تھی مگر اب وہ تیرہ چودہ برس کی ہوگئی تھی
وہ ماں کو جہیز میں گھنٹے جھپک چپکونی دیکھتی۔ اندر ہی اندر کڑھتی کہ یہ کیسی
ماں ہے جو بیٹی کے واسطے ایک دو بھی کپڑا تک سینت کر نہیں رکھتی۔ جسے نہ
بیٹی کے بیاہ کے لیے کچھ بچا کر رکھنے کا کبھی خیال آتا ہے اور نہ وہ کبھی اس
کے پہننے اوڑھنے کی فکر کرتی۔ یہی بات نصیر نے کبھی اشاروں میں اور کبھی
کھل کر رجو کو سمجھائی کہ اب تو بچی عمر کی ہورہی ہے۔ گھر میں بیٹی ککڑی کی
بیل کی طرح بڑھ رہی ہے۔ اپنے سے زیادہ اس کی فکر کیا کر۔ مگر رجو
کو ایسی باتوں سے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ وہ اور بھی بن ٹھن کر گھر
سے نکلتی۔ نصیر اپنی بیوی کا چلن دیکھ دیکھ کر خون کے گھونٹ بھر کر رہ جاتا۔
آہستہ آہستہ سکینہ ماں سے دور ہوتی گئی وہ اب سمجھنے لگی تھی کہ اس کی ماں
روایتی ماؤں سے کتنی مختلف ہے۔ اس کا دل گھر کے ماحول سے اچاٹ ہو
گیا۔ جب تک نصیر گھر میں نہیں آتا وہ کام کاج نمٹا کر اپنا سارا وقت پڑھائی
میں گزارتی۔ نصیر بیٹی کے دکھ کو سمجھتا تھا مگر بیوی کی فطرت بدلنا اس کے
بس میں نہیں تھا۔ صلح جو آدمی تھا اندر ہی اندر کڑھتا رہا۔ بار ہا اسے بیوی
کے کردار پر شبہ ہوا جو کسی حد تک درست بھی نکلا کیونکہ وہ رشتے کے بھائی
بھتیجوں سے کچھ زیادہ ہی گھلنے ملنے لگی تھی۔ اس کی بات چیت کا انداز
بدلتا جا رہا تھا۔ چال میں دن بدن زیادہ لچک پیدا ہوگئی تھی۔ وہ جوانی

جو سکینہ پر آنا تھی راہ بھول کر رحمتے پر پلٹ کر آگئی تھی۔ محلے کے نوعمر چھوکروں سے ہر وقت کا ہنسی ٹھٹھا دیکھنے والوں کو اچھا لگے یا برا، رحمتے نے اس کی کبھی پروا ہی نہیں کی۔ نصیر بگڑتا تو بڑی بڑی آنکھیں نکال کر منہ نوچنے آجاتی۔ کولہے پر ہاتھ رکھ کر بڑے سکھڑے لہجے میں طعنہ دیتی کہ تو نامرد ہوا جا رہا ہے تو میں کیوں تیرے ساتھ ٹھنڈی قبر میں اتروں۔ تیرے جیسی برف کی مٹی سے اگر اللہ نے مجھے نہیں بنایا تو تو کیوں انگاروں پر لوٹتا ہے۔ سدا بیٹی کے ناز رہا کرے اٹھا۔ اس سے فرصت ملے تو آجانا۔ نصیر اس منہ پھٹ عورت کو ہزار کوشش کے باوجود قابو میں نہ لا سکا تو آپ ہی آپ ٹھنڈا پڑتا گیا۔ برفیلی مٹی کے ٹکڑے اس کی ذات میں گھلتے گئے اور پھر ہوا یہ کہ ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ کڑیل آدمی جیسے بالکل ڈھے گیا۔ رحمتے کی شوخیاں بڑھتی گئیں۔ وہ سارا سارا دن باہر گھومتی۔ گھر پر تالا پڑا رہتا جو نصیر کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے کھلتا اور پھر ایک دن یہ دیوار بھی آپ ہی آپ گر گئی——

اس روز دونوں میاں بیوی میں بڑی زور کی لڑائی ہوئی تھی۔ بات یہ تھی کہ نصیر نے سکینہ کی منگنی چپکے سے اپنے دوست کے لڑکے انور سے طے کر دی۔ بیوی سے پوچھنا اس لیے گوارا نہ ہوا کہ وہ کب بیٹی کے معاملات میں دلچسپی لیتی تھی۔ صبح ناشتے کے وقت اس نے سکینہ سے کہا کہ بیٹی شام کو ذرا نہا دھو کر اچھے کپڑے پہن لینا۔ کچھ عورتیں شگن کے لیے آئیں گی۔ رحمتے نے روٹی کھاتے کھاتے ہاتھ روک لیا، تیوری چڑھا کر بولی "کس کا شگن، کیسا شگن؟ یہ صبح ہی صبح پہیلیاں کیوں بجھوا رہا ہے۔" نصیر تیکھے لہجے میں بولا: "تجھے اپنی مٹک چٹک دکھانے سے فرصت ملے تو پتہ بھی چلے کہ گھر میں کون بیاہ کے قابل ہو گئی ہے۔" رحمتے بھڑک اٹھی، چیختے لہجے میں بولی۔ "جب اس کے بہت سارے ہمدرد زندہ ہیں تو میں کون ہوں اس کی فکر کرنے والی۔ تجھے میری چٹک مٹک بری لگے ہے تو دوسری کر لے، پر یاد رکھ اب تو عورت رکھنے کے قابل نہیں ہے۔" نصیر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ مرد بہت ساری باتیں سہہ سکتا ہے مگر ایسی بات جو اس کی مردانگی کو چیلنج کرے اس کے لیے ماں بہن کی گالی سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے۔ وہ بپھر کر اٹھا کہ آج اس کا خاتمہ کر ہی ڈالے۔ روز روز کے جلاپے سے عمر بھر کی قید یا پھانسی کا پھندا بھلا۔ لپک کر رحمتے کی گردن دبوچ لی۔ رحمتے لاکھ منہ زور سہی مگر وہ بھی غیظ و غضب میں بھرے نصیر کی آہنی گرفت تھی۔ بے بسی میں گردن ڈھیلی کر لی۔ تین چار سیکنڈ اور رک جاتے تو رحمتے جان سے چلی گئی تھی۔ سکینہ روتی ہوئی باپ کی گردن میں جھول گئی کہ ابا اسے چھوڑ دے تجھے پھانسی ہو گئی تو میرا کیا ہو گا—— یہی بات تھی جس نے نصیر کے ہاتھ ڈھیلے کر دیئے۔ اس نے نفرت سے رحمتے کو جھٹکا دے کر زمین پر پٹخ دیا——

اور خود تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد کی کہانی اس کے ساتھیوں نے سنائی جو اس کے ساتھ کارخانے میں کام کرتے تھے۔ ان کی زبانی پتہ چلا کہ وہ کام کرتے وقت بڑا پریشان تھا۔ بار بار مشین پر غلط انداز سے ہاتھ مارتا، پھر بوکھلا کر سپروائزر سے معافی مانگنے لگتا۔ اس نے اس روز سپروائزر سے جلدی چھٹی کی درخواست بھی کی تھی۔ بس قسمت تھی کہ سپروائزر نے اسے آدھ گھنٹہ اور کام کرنے کا حکم دیا۔ اگر اسی وقت درخواست منظور کر لیتا تو اس کے ساتھ یہ حادثہ نہ پیش آتا۔ اس آدھ گھنٹے کے کسی ایک سیکنڈ میں اس کا ہاتھ مشین پر غلط پڑ گیا۔ غلطی سنبھالنے کی بوکھلاہٹ میں وہ خود مشین کی لپیٹ میں آگیا اور جب اسے ہسپتال پہنچایا گیا تو اس کی زبان پر یہی لفظ تھے کہ اس کی بیٹی کی آج منگنی ہے کسی طرح مجھے گھر پہنچا دو"۔

یہ ایک ایسا حادثہ تھا جس سے محلے والوں میں سے اکثر رو پڑے۔ روتی پیٹتی تو رحمتے بھی بہت مگر سکینہ کا حال بہت برا تھا۔ اسے بار بار غش آرہے تھے۔ نصیر کا ایک ہاتھ اور پاؤں ضائع ہو گئے۔ ہسپتال میں ڈھنگ کا علاج نہیں ہوا۔ زخم بگڑ گئے۔ اس نے اس دوران بیٹی کی منگنی پکی کر دی۔ اپنے دوست سے وعدہ لیا کہ اس کے بعد سکینہ اور رحمتے کا خیال رکھے گا۔ نصیر چاہتا تو یہ تھا کہ کسی طرح اپنی زندگی میں سکینہ کے ہاتھ پیلے کر جاتے مگر رحمتے نے ماضی میں جو خود غرضی دکھائی تھی اس کے نتیجے میں گھر میں لینے دینے کو تنکا تک نہیں تھا۔ جو تھوڑا بہت پیسہ تھا وہ علاج پر خرچ ہو گیا۔ کارخانے کی طرف سے امداد ملنے کی امید تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ پیسے ملتے ہی سکینہ کی شادی کر دے گا مگر اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ امداد کا پیسہ ملنے میں دیر ہو گئی اور نصیر بیٹی کے بیاہ کی حسرت دل میں لئے اللہ کو پیارا ہو گیا۔ رحمتے نے مرنے والے کی لاش سے لپٹ لپٹ کر بین کئے۔ اپنی زیادتیوں کی معافی مانگی لیکن چہلم کے بعد وہ دوبارہ اپنے رنگ ڈھنگ پر لوٹ آئی۔ وہی چہچہاتے رنگین دوپٹوں کی بہار اس کے آنگن میں اتر آئی۔ پہلے جیسی سج دھج تو نہیں تھی مگر ہونٹوں پر ہلکی ہلکی لالی اور کاجل کی ڈوری کھنچی صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ سکینہ کا حال برا تھا۔ باپ کے بعد وہ بالکل بے سہارا ہو گئی تھی۔ رحمتے نے اس سے اپنا رویہ بدل لیا تھا۔ اب وہ بیٹی کا خیال رکھنے لگی تھی مگر ان دونوں کے درمیان ماضی نے جو فاصلے پیدا کر دیئے تھے وہ کوئی نہ پاٹ سکا۔ سکینہ اسے اپنے باپ کا قاتل سمجھتی تھی۔ چاہنے کے باوجود وہ اسے معاف نہیں کر پائی جب کہ رحمتے دبی زبان سے کبھی کبھار اس سے اپنی ماضی کی زیادتیوں کی معافی مانگ لیا کرتی۔ ماں کی اس تبدیلی پر سکینہ حیران تھی لیکن یہ راز بھی جلد کھل گیا۔ سکینہ کا منگیتر انور اکثر گھر آتا رہتا تھا۔ سکینہ اس سے پردہ کرتی تھی۔ وہ جب آتا سکینہ چھپ جاتی۔ رحمتے اسے بڑی محبت سے بٹھاتی، خاطر تواضع کرتی، بیٹی کے چھوٹے موٹے قصے سناتی مگر اس کے ساتھ

ساتھ اپنی کسی پرانی قمیض کے بٹن بھی بار بار کھول کر بند کرتی سنورتا تئیس
اٹھائیس سال کا بھرپور جوان تھا۔ اس کی آنکھیں اس نظارے سے سلگنے
لگیں۔ یہ آنچ اور بڑھی تو اس کے سارے جسم کو لپیٹ میں لے لیا۔ وہ اپنی
پردہ دار منگیتر کو بھول بھال کر محض اس نظارے کے لیے کھنچا ہوا چلا آتا کہ
کب رحمتے انگڑائی لے اور کب "اوئی توبہ" کہہ کر اپنی تنگ قمیض کے بٹنوں
سے کھیلے۔ یہ کھیل جب بہت آگے بڑھا تو سکینہ کی آنکھوں سے پردہ اتر
گیا۔ اس نے ایک روز خود اپنی آنکھوں سے انور کو رحمتے کے کرتے کے بٹن
کھولتے بند کرتے دیکھا۔ اپنی جگہ اس کے قدم جمے کے جمے رہ گئے اور سکتے
کا یہ عالم اس وقت ٹوٹا جب انور نے شادی سے صاف انکار کر دیا۔ اس
نے اپنے باپ سے کہہ دیا کہ میں فی الحال شادی کرنا نہیں چاہتا، جب
ضرورت ہوگی تو اپنی پسند سے کروں گا۔ سکینہ اس روز پھوٹ پھوٹ
کر روئی۔ وہ انکار کی وجہ خوب سمجھتی تھی، ایک وہ ہی کیا اب تو سارا زمانہ
جان گیا تھا کہ انور سارا سارا دن اس گھر میں کیوں پڑا رہتا تھا۔ انور کے باپ
نے مار پیٹ کر کے اسے ادھر آنے سے روک دیا۔ وہ خود سکینہ سے ملنے آیا
اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر رو دیا، بولا "بیٹی تیرا باپ جو کہتا تھا وہ درست
نکلا۔ میں اسے کتنا سمجھاتا تھا کہ تو بلاوجہ شک کرتا ہے، بعض عورتوں کو
بننے سنورنے کا شوق ہوتا ہے مگر آج پتہ چلا کہ مرنے والے کی آنکھیں جو کچھ
دیکھتی تھیں وہ ہم تم نہیں دیکھ سکے تھے۔ انور کو تیری ماں نے بہکا لیا ہے مگر
میں تیرا ساتھ دوں گا۔ اسے راہِ راست پر لا کر رہوں گا۔"

سکینہ چپ چاپ آنسو بہاتی رہی۔ اگر اس کا بس چلتا تو اپنی ڈائن
ماں کا گلا گھونٹ دیتی۔ ایسی خود غرض عورت کے جینے کا کیا فائدہ جو اپنے
نفس کی وقتی تسکین کے لیے بیٹی کے سہاگ کی بہاریں لوٹ لے۔ وہ انور
کو اس معاملے میں قطعی بے قصور سمجھتی تھی۔ وہ مرد تھا جب عورت خود کو تھالی
میں سجا کر پیش کرے تو کوئی فرشتہ ہی ہوگا جو اپنا ہاتھ نہ بڑھائے۔ سکینہ نے
ماں سے بول چال بالکل ترک کر دی۔ اس کی صحت جو پہلے ہی ٹھیک نہیں
تھی اس نئے حادثے نے اور تباہ کر دی۔ رحمتے کا زیادہ وقت گھر سے
باہر گزرتا تھا۔ انور پر پابندی لگنے سے اس نے باہر چوری چھپے ملنا شروع
کر دیا تھا۔ انور پر باپ کی بازپرس اور منت سماجت کا کوئی اثر نہیں ہوا تو
اس نے ہتھیار ڈال دیئے، بولا "جہاں تیرا جی چاہتا ہے دفع ہو جا مگر یاد رکھ
اس مکار بڑھیا کو میں اس گھر کی دہلیز پر نہیں آنے دوں گا۔" سکینہ تک یہ خبر
پہنچی تو کلیجہ تھام کے رہ گئی۔ اس کی محرومیوں سے بھری زندگی میں آس کا
ایک دیپک تھا وہ بھی بجھ گیا۔ اس کے ذہن و دل پر انور کی صورت نقش
تھی۔ ماں کو سوت کیسے قبول کرتی۔ دل تھام کر اٹھی برقعہ جیسے تیسے اوڑھا
اور اندھیری رات میں چھپتے چھپاتے اپنے سسرال پہنچی۔ سوچا تو یہ تھا کہ اگر

کی ناانصافیوں کی
فہرست بڑی طویل ہے۔ تاریخ آج تک اس کے ماتم
سے فارغ نہ ہو سکی۔ ہم اس میں حضرت مسیح جیسے پاک
انسان کو دیکھتے ہیں جو اپنے عہد کی اجنبی عدالت کے
سامنے چوروں کے ساتھ کھڑے کیے گئے۔ ہم کو اس
میں سقراط نظر آتا ہے جس کو صرف اس لیے زہر کا پیالہ
پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے سچا انسان تھا۔ ہم
کو اس میں فلورنس کا فداکارِ حقیقت گیلیلیو کا نام
بھی مل جاتا ہے جو اپنی معلومات اور مشاہدات کو
اس لیے جھٹلا نہ سکا کہ وقت کی عدالت کے نزدیک
ان کا اظہار جرم تھا۔ تاہم یہ مجرموں کا کٹہرا کیسی عجیب
مگر عظیم الشان جگہ ہے جہاں سب سے اچھے اور سب
سے بڑے آدمی کھڑے کیے جاتے ہیں۔ زیادہ سے
زیادہ جو سزا دی جا سکتی ہے، بلا تامل دے دو،
میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے جس
قدر جنبش تمہارے دل میں پیدا ہوگی اس کا عشرِ عشیر
اضطراب بھی میرے دل کو نہ ہوگا۔

(ابوالکلام آزاد)

انور گھر میں مل گیا تو اس کے قدموں پر سر رکھ کر اپنا قصور پوچھے گی اسے
معلوم تھا اس کا سسر اس وقت کارخانے میں ہوتا ہے۔ انور کی ماں کا
بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ ایک چھوٹا بھائی یوسف تھا وہ بھی باپ
کے ساتھ کام پہ جاتا تھا۔ اسے پورا بھروسہ تھا کہ انور گھر پہ تنہا ہوگا مگر
جیسے ہی اس نے کانپتے ہاتھوں سے دروازہ بجایا وہ پٹ کھلتے ہی بوکھلا
کر پیچھے ہٹ گئی۔ دروازے پر یوسف کھڑا تھا اس کا ہونے والا دیور جو
اپنے بھائی سے کہیں زیادہ گبرو تھا۔ اس کا صحت مند بدن اونچا قد اور
ہنس مکھ چہرہ اپنے بھائی سے کچھ کچھ ملتا جلتا تھا مگر اس کی آنکھیں انور
سے قطعی مختلف تھیں۔ نرم اور مہربان آنکھیں جو آنے والی عورت کے
احترام میں خود بخود جھک گئی تھیں۔ شائستگی سے بولا "آپ۔۔۔ آپ۔۔۔
سکینہ ہیں نا۔۔۔؟" سکینہ نے اس کے لہجے میں احترام اور اپنائیت کا گہرا
جذبہ محسوس کر کے ڈرتے ڈرتے گردن ہلا دی تو آپ ہی آپ پیچھے ہٹ

گیا کہنے لگا "اندر آجائیے یہ گھر آپ کا ہی ہے میں خود بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ آپ سے ملنے آؤں کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں" سکینہ اندر آتے آتے چونک گئی۔ بولی "تمہارے بھائی اندر نہیں ہیں کیا؟" یہ پوچھ کر وہ خود جھینپ گئی مگر یوسف بات کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ بولا "سکینہ بہن انو بھائی سے بات کرنے کی بجائے آپ مجھ سے بات کریں۔ ان کی آنکھوں پر تو پٹی بندھی ہوئی ہے وہ نہ کچھ سن سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے ہیں" سکینہ تو غم سے بھری ہوئی آئی تھی یوسف کے اتنا کہہ دینے پر رو پڑی۔ یوسف نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ گلوگیر ہو کر کہنے لگا "سکینہ قسم اپنے پیدا کرنے والے کی میں تیری پوری مدد کروں گا میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا تو اب بھی انو سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس کی ساری باتیں جان جانے کے بعد بھی تو اس سے محبت کرتی ہے"

سکینہ نے اس لمحے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس ہمدرد کو ہاتھ سے نہیں کھوئے گی اپنے دل کا سارا حال اسے سنا دے گی۔ اس نے رک رک کر بتایا کہ انور کو جی جان سے چاہتی ہے۔ منگنی کو چار سال ہو گئے ہیں انور کا نام تو اس کی روح میں گھل مل گیا ہے۔ اگر وہ اسے نہ ملا تو زہر کھا کر مر جائے گی۔ یوسف مسکرانے لگا جیسے اس کے دل سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہے بولا "سکینہ اب تو چین سے گھر جا کر سو جا میں یہی بات معلوم کرنا چاہتا تھا بس اب تو دل سے یقین کر لے کہ انور تیرا ہے۔ تیرے برے دن جلد بیت جائیں گے یہ میرا تجھ سے عہد ہے"

سکینہ اپنے غم کی گٹھڑی یوسف کے سر پر رکھ کر واقعی ہلکی پھلکی ہو گئی ـــ اور پھر اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد یوسف اچانک گھر میں آن ٹپکا۔ اتفاق سے سکینہ گھر پر نہیں تھی۔ رحمتے سر میں تیل کی مالش کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ سمجھی سکینہ ہوگی مگر جب پٹ کھولا تو یوسف کھڑا تھا۔ وہ یوسف کو پہلے بھی دیکھتی رہی تھی مگر تنہائی میں اس کا یوں بے باکی سے چلا آنا کچھ انوکھا پن لیے ہوتے تھا۔ بولا "سوچا آج آپ کے دیدار کئے جائیں۔ انو بھائی آپ کا جس انداز سے ذکر کرتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ـــ" یہ کہہ کر اس نے بڑی شوخی سے رحمتے کو دیکھا۔ رحمتے چرب زبانی کے جال میں جکڑی گئی۔ وہ دیر تک اس سے باتیں کرتی رہی۔ اسے چائے پانی بھی پلایا۔ پھر آنے کا وعدہ بھی لیا۔ اتنے میں سکینہ بھی آگئی وہ آنکھیں چراتی اندر چلی گئی ـــ اور یوسف دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

انور اور یوسف کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یوسف ہنسوڑ طبیعت کا باتوں باتوں میں گدگدی کرنے والا آدمی تھا جب کہ انور کم سخن اور پیش قدمی میں قدرے بزدلی دکھانے والا سیدھا سادا آدمی تھا۔ رحمتے خود بخود یوسف کی طرف کھنچتی گئی۔ وہ ہلا گلا پسند کرنے والی عورت تھی تبھی بیالیس برس سے زیادہ کی ہونے کے باوجود وہ اب بھی تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ یوسف نے اس کی تعریفوں میں زمین آسمان کے وہ قلابے ملائے کہ وہ انور کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھنے لگی مگر اس سے نجات کی جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو یوسف کے گلے پڑ گئی کہ مجھ سے شادی کر لو۔ یوسف نے جواب دیا کہ پہلے سکینہ کی انور سے شادی کرا دو میں اسی روز تم سے بیاہ کر لوں گا ـــ رحمتے کو یہ تجویز اچھی لگی کہ اس طرح بیٹی کا کانٹا بھی نکل جائے گا اور انور بھی خود بخود راستے سے ہٹ جائے گا۔ چالاک عورت تھی ـــ انور کو بلایا۔ اس سے معافی مانگی کہ وہ اب تک اسے بیوقوف بناتی رہی اب اپنے گناہوں سے تائب ہو کر بیٹی کا گھر بسانا چاہتی ہے یہ کہہ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی ـــ انور کا سویا ضمیر جاگ اٹھا کہ وہ عورت ہو کر اپنے گناہ کا شدت سے احساس کر رہی ہے اسے بھی اپنے کرتوتوں پر شرمندہ ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ اس ٹھگ عورت نے انور کے سامنے اپنی پاکبازی کا کچھ ایسا ڈھونگ رچایا کہ اس نے اپنے باپ سے جا کر معافی مانگ لی اور سکینہ سے بیاہ کی رضامندی دے دی۔ باپ نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر کیا اور ہفتے کے اندر اندر سکینہ کو گھر کی بہو بنا کر لے آیا ـــ اور اس شادی کے کوئی پندرہ روز بعد یوسف نے اپنا وعدہ پورا کیا اس نے اپنی عمر سے دگنی عورت رحمتے سے بیاہ رچا لیا۔ اس عجیب و غریب شادی پر محلے میں بڑی لے دے بھی۔ لوگوں نے یوسف کو لعنت ملامت کی مگر وہ سب سے یہی کہتا رہا کہ اس عورت کو قابو میں رکھنے کا یہی طریقہ تھا ورنہ یہ اور کتنے گھر برباد کرتی پھرتی اب دیکھتا ہوں یہ کیسے گھر سے قدم باہر نکالتی ہے۔

یہ بات صرف سکینہ ہی جانتی تھی کہ یوسف نے اس کی خوشی کی خاطر یہ قربانی دی ہے۔ بہت بعد میں اس نے یہ بھید لوگوں کو بتایا۔ کبھی یوسف سے ملتی تو اسے سمجھاتی تھی کہ بھیا تم نے میری خاطر اپنی زندگی برباد کی ہے تم دوسری شادی کر لو۔ اسے طلاق دے کر اس کے حال پر چھوڑ دو۔ یوسف ہنسنے لگتا کہتا کہ سکینہ تو نہیں جانتی یہ عورت کتنی خطرناک ہے جس دن میں نے اسے چھوڑ دیا یہ سب سے پہلے تیرا گھر برباد کرے گی۔

سکینہ اپنے میاں کے ساتھ راضی خوشی زندگی بسر کر رہی ہے۔ دو بچے بھی ہیں ـــ انور اور یوسف ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ انور کا باپ خوب سمجھتا ہے کہ اس کے بیٹے نے سکینہ کی خاطر یہ قربانی دی ہے وہ بیٹے کے اس فعل کو ستائش بھری نظروں سے دیکھتا ہے کہ میرے بیٹے نے ایک ایسی عورت کے گلے میں مضبوط رسی باندھ دی ہے جو جانے کتنے گھروں کو تباہ کرتی۔

سمیرا خان، میر

مس کوثر اوڈ کے ایک اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ بی۔ اے
کرنے کے بعد مجھے آپا جان کی سفارش پر اسکول میں ملازمت مل گئی تھی۔ بی ایڈ
ایک سال سروس کرنے کے بعد کیا۔ مجموعی طور پر میری ملازمت کو چار سال
ہو گئے ہیں اور اس عرصے میں مجھے بچوں کی نفسیات سمجھنے کا اچھی طرح سے موقع
ملا۔ پہلے میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ بچوں سے کبھی شدید انداز میں باز پرس نہیں
کرنا چاہیے لیکن عملی زندگی میں یہ فارمولا قطعی بے کار لگا۔ بعض بچے اس قدر
شریر اور ڈھیٹ ہوتے ہیں کہ صبر کا پیمانہ چھلک اٹھتا ہے۔ میں نے شروع
شروع میں خاصی ڈھیل دی اور بعد میں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ رفتہ رفتہ
میری نرمی ختم ہوتی گئی اور میں نے دوسری استانیوں کی طرح سخت گیری
کو اپنا شعار بنا لیا۔ ایک روز میری کلاس میں ایک نئی لڑکی رخسانہ نے داخلہ
لیا۔ تیرہ سال کی یہ بچی دیکھنے میں بھولی اور خوبصورت تھی۔ اس کا باپ اوورسیر
تھا۔ یہ لوگ حال ہی میں لاہور سے ٹرانسفر ہو کر آتے تھے۔ رخسانہ خاصی پر اعتماد
اور ذہین لڑکی تھی۔ اس کے لباس کی تراش خراش سے پتہ چلتا تھا کہ اس
کی ماں خاصی سگھڑ اور جدت پسند ہے۔ کچھ دنوں بعد لڑکیوں نے بتایا کہ
مس نئی لڑکی اسکول میں سائیکل پر آتی ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں لڑکیوں
کا سائیکل چلاتے اسکول آنا حیرت انگیز واقعہ تھا اور کسی کو بھی رخسانہ کی یہ
ادا پسند نہیں تھی۔ ہیڈ مسٹرس تک بات پہنچی انھوں نے مجھے بلایا کہنے
لگیں "آپ رخسانہ سے بات کریں کہ یہاں کا ماحول مختلف ہے وہ ایسی
کوئی حرکت نہ کرے جس سے اسکول کی بچیوں کے دلوں میں حیرت اور سنسنی
پیدا ہو۔"

میں نے پہلی دفعہ رخسانہ کو اسٹاف روم میں بلایا۔ اپنی بڑی
بڑی آنکھوں میں حیرت لیے وہ پر اعتماد قدم اٹھاتی میرے سامنے آ کھڑی
ہوئی جب کہ دوسری لڑکیاں اسٹاف روم میں بلاتے جانے کے خوف
سے تھر تھر کانپتی آتی تھیں۔ مجھے رخسانہ کی بے خوفی پر لاشعوری طور پر غصہ
آیا کیونکہ میں نے اس سے بات کی تو احساس ہوا کہ وہ فراخ دل اور
روشن خیال والدین کی اکلوتی بیٹی ہے۔ دو بھائی چھوٹے ہیں مگر والدین
رخسانہ کو بے حد چاہتے ہیں اور اس کی پرورش بھی بالکل لڑکوں جیسے انداز
سے کی ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ ہر جگہ انسان کو وہاں کا ماحول دیکھ کر چلنا پڑتا
ہے۔ لڑکیوں کو تمھارے کپڑوں اور سائیکل پر اسکول آنے پر سخت اعتراض
ہے۔ بہتر ہے کہ تم اپنے ڈھنگ بدل لو۔ اس نے بڑے تحمل سے میری باتیں
سنیں پھر بڑے دھیمے انداز سے بولی "مس مجھے نہیں معلوم کہ مجھے یہاں کس
انداز سے رہنا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ آیندہ بھی مجھے گائیڈ
کرتی رہا کریں۔"

رخسانہ نے اپنی سعادت مندی سے میرا دل جیت لیا تھا۔ وہ
فرمانبردار اور ذہین لڑکی تھی لیکن اس کی طبیعت کچھ ایسی تھی کہ وہ کسی کو اپنا
دوست نہیں بنا سکی۔ گھٹے گھٹے ماحول میں پلنے والی لڑکیوں سے اس کی
ذہنی مطابقت نہیں ہو سکی اس وجہ سے کلاس کی بیشتر لڑکیاں اس سے
جلنے لگیں۔ لاشعوری طور پر اسے نقصان پہنچانے کی کارروائیاں شروع ہو گئیں
کبھی اس کا ہوم ورک پھاڑ دیا جاتا، کبھی اس کی کوئی کتاب یا کاپی غائب
ہو جاتی۔ وہ اپنی ساری شکایتیں مجھ سے کہتی۔ میں نے کلاس کی شریر لڑکیوں
کو اس کی شکایت پر متعدد بار سزا دی اور اس طرح وہ ذہنی طور پر میرے
زیادہ قریب آ گئی۔ ایک دن کلاس میں ایک لڑکی نے رازداری سے بتایا کہ
رخسانہ پلے گراؤنڈ کے سامنے گراؤنڈ میں سائیکل چلاتی ہے اور وہ محلے کے
ایک بدمعاش لڑکے یوسف سے فری ہو کر باتیں کرتی ہے وہ لڑکا اسے
چوری چھپے خط بھی لکھتا ہے۔ یہ بات پھیل گئی۔ مجھ تک بھی پہنچی، میں نے
پھر رخسانہ کو بلایا۔ پہلی دفعہ میں نے اسے اپنے سامنے گھبرایا ہوا محسوس کیا
اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس افواہ میں کچھ حقیقت بھی تھی۔ میں نے اسے اپنے
پاس بٹھایا۔ محبت سے پوچھا کہ "تم یوسف کو جانتی ہو؟" وہ نظریں جھکا کر بولی
"ہاں مس" میں اس جواب پر چونک گئی، پوچھا "تم بتاؤ تمھارا اس کا کیا تعلق
ہے؟" کہنے لگی "وہ میرا دوست ہے۔ میں اس سے ہوم ورک میں مدد لیتی
ہوں۔" رخسانہ کے سادہ سے جواب نے مجھے غصہ دلا دیا کہ آخر یہ لڑکی خود
کو انگریز کی اولاد کیوں سمجھتی ہے۔ میں نے اسے سزا دینے کا فیصلہ کر لیا۔
پوچھا کہ "یوسف تمھیں خط لکھتا ہے؟" کہنے لگی "ہاں مس وہ مجھے لیٹرز لکھتا
ہے۔" میں چیخ پڑی کہ "آخر تمھاری عقل پر پتھر کیوں پڑ گئے ہیں۔ تم اس
لڑکے سے کیوں ملتی ہو۔ وہ تمھیں خط کیوں لکھتا ہے۔ بے وقوف لڑکی یہ
اچھی بات نہیں ہے وہ لڑکا محلے میں تمھارے متعلق غلط باتیں پھیلا رہا ہے
کہ رخسانہ آوارہ لڑکی ہے، مجھ سے محبت کرتی ہے یوسف تمھارے خطوط
سے تمھیں بلیک میل کرے گا۔ تم دیکھنا کہ تمھارے ابو تک جب بات پہنچے گی تو
انھیں کس قدر صدمہ پہنچے گا۔"

رخسانہ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ پہلی بار میں نے اسے نروس ہوتے دیکھا
بولی "مس لاہور کے اسکول میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا۔ وہاں ہمارے ساتھ

گھر آیا تو ذہن چکرانے لگا۔ میں خود کو دیر تک کوستا رہا کہ ایک بہن کی چاہت دل میں بسا رکھی ہے دوسری کے چنگل میں پھنس چکے ہو۔ آخر تمہارا انجام کیا ہوگا۔ ادھر جو راہ اس وقت کے حالات نے بنا دی تھی اس سے نجات بھی ممکن نہیں تھی۔ دوسری بار میں پھر ایسے ہی حالات سے دوچار ہوا۔ منزّی نے مجھے انگوٹھی دی کہنے لگی "یہ میرے پیار کی نشانی ہے شادی کی پہلی رات آپ یہ میرے ہاتھ میں پہنا دیناؔ"

ان دنوں میں اتنا پریشان رہنے لگا کہ بارہا خودکشی کا سوچا۔ منزّی کو جس منزل پر لے آیا تھا اس کو وہیں چھوڑ کر چلے جانے پر ضمیر ملامت کرتا تھا اور ثریا کے خیال سے پیچھا چھڑانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں کیا کروں کہاں جاؤں۔ خود غرض بننے کا سوچتا تب بھی سکتا۔ قربانی دیتا تب بھی روتا۔ بہت سوچا اور خدا نے میری مشکل یوں آسان کی کہ ابا نے مجھ سے میری شادی کی بات کی۔ مجھ سے پوچھا کہ "دونوں لڑکیوں میں جس کو پسند کرتے ہو بتا دو میں تمہارا گھر میں ہی رشتہ طے کرنا چاہتا ہوں" میں نے دبے الفاظ سے بتا دیا کہ دونوں لڑکیاں اچھی ہیں مگر بڑی کی اصولاً پہلے شادی ہونا چاہیے۔ ابا سمجھ گئے کہنے لگے "اچھا میں سوچ سمجھ کر بات کروں گا۔ اس کی بھی مرضی معلوم ہو جائے کہ وہ اپنی کونسی لڑکی کو تمہارے لئے مناسب سمجھتا ہے" ابا سے بات کرنے کے بعد دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ چچا کے یہاں آنا جانا ویسا ہی رہا۔ تبدیلی صرف یہ ہوئی کہ میں نے منزّی سے پہلے والے تعلقات منقطع کر دیئے لیکن اس کی اپنائیت اور بے تکلفی سے دامن نہیں چھڑا سکا۔ اس کا حل صرف یہ تھا کہ ثریا سے بات کر لی جائے۔ اگر وہ میرے بارے میں اتنے ہی ابھرے جذبات رکھتی ہے جتنے میں رکھتا ہوں تب یہ رشتہ فوراً طے ہو جانا چاہیئے۔ اس کے برعکس وہ مجھے محض چچازاد ہونے کی وجہ سے پسند کرتی ہے تب مجھے اپنا فیصلہ بدل کر منزّی کو اپنا لینا چاہیئے۔ یہی سوچ کر میں نے موقع پا کر ثریا سے دو ٹوک بات کر ڈالی۔ محبت کا ڈرامہ کھیلنے کی بجائے یہ کہنا زیادہ آسان تھا کہ میں تمہیں روزِ اوّل سے پسند کر چکا ہوں اور تمہیں تب سے اپنا لینے کی خواہش رکھتا ہوں۔ تم میرے بارے میں اپنی رائے صاف گوئی سے بتا دو۔ ثریا اس بے باکی پر گھبرا گئی۔ میرا خیال تھا وہ شرما کر اپنی اداؤں سے میرے سوال کا جواب دے دے گی مگر اس نے فوراً ہی جواب دیا "میں آپ کے بارے میں کچھ بھی نہیں سوچتی اور نہ آپ سے شادی کا کبھی سوچا ہے" یہ واضح انکار تھا جس پر مجھے برا ابھرا لگا مگر اس کے فوراً بعد مجھے اس کی ایک سہیلی نے بتا دیا کہ وہ آپ کو بہت پسند کرتی ہے مگر اس کا خیال ہے کہ آپ اس کی چھوٹی بہن کو چاہتے ہیں اور شاید منزّی بھی آپ کو بچپن سے چاہتی آئی ہے اس لئے اسے تم دونوں کے درمیان دیوار نہیں بننا چاہیئے۔ مجھے ثریا کی سہیلی پر اعتبار نہیں آیا۔ اس نے قسمیں کھا کر بتایا کہ ثریا بڑی گہری لڑکی ہے وہ دل میں آپ کے سوا اور کسی کو آج تک جگہ نہیں دے سکی ہے۔

میرے لئے یہ اشارہ بہت تھا۔ ثریا کی سہیلی کا یہ مجھ پر بہت بڑا احسان تھا جو اس نے ثریا کی خوشیاں بچانے کے لئے اس سے چھپ کر مجھ پر کیا تھا۔ میں نے ابا سے کہا کہ آپ ثریا کو چچا سے میرے واسطے مانگ لیں۔ میرے والدین نے خاصی عقلمندی کا ثبوت دیا۔ سیدھے چچا سے بات کی۔ چچی پہلے تو ہکا بکا رہ گئیں۔ ان کے خیال میں مجھے منزّی کو مانگنا چاہیئے تھا کیونکہ بظاہر میں اس کے زیادہ قریب تھا لیکن انہوں نے بھی معاملے کی نزاکت کو سمجھ کر خوشی سے اجازت دے دی اور اس طرح میری ثریا سے منگنی کی رسم ادا ہوگئی۔ اس تمام وقت میں منزّی نے بڑے تحمل کا ثبوت دیا۔ میرا خیال تھا وہ رو رو کر جل تھل کر دے گی مگر ان دنوں وہ اپنے امتحان میں مصروف تھی۔ بہت کم نظر آئی۔ منگنی کے بعد میرا اس گھر میں آنا جانا بند ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی مجھے ملازمت میں ٹریننگ کے سلسلے میں کراچی آنا پڑا۔ طے یہ ہوا کہ دو سالہ ٹریننگ کے بعد میری شادی کی تاریخ مقرر کی جائے گی۔

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ اور ہے۔ کراچی میں اپنے ایک دوست کے یہاں قیام کیا۔ رشتے داروں کے یہاں رکنا مجھے اچھا نہیں لگا۔ جب قدم جم گئے تو اسی دوست کی کوشش سے کسی صاحب کے یہاں مجھے کرائے پر ایک کمرہ مل گیا اور یہاں میرا قیام میرے لئے مصیبت بن گیا۔ تنہا آدمی تھا جی چاہتا تھا کہ کسی سے مل بیٹھ کر باتیں کروں کچھ اپنی خواہش کہو تو کچھ واقعات کا ڈراما ئی موڑ کہ مالک مکان کی نوعمر لڑکی اختر جہاں مجھ میں بلاوجہ دلچسپی لینے لگی۔ انکی اماں جان نے یہ دیکھ کر کہ لڑکا اکیلا ہے، اچھی ملازمت پر ہے اور پھر کنوارے لڑکے کو اپنی طرف کھینچ لینا زیادہ مشکل بھی نہیں، انہوں نے اپنی بیٹی کے ہاتھ کے پکے کھانے مجھے کھلانے شروع کر دیئے۔ کچھ دنوں بعد بیٹی صاحبہ نے پرزے بازی شروع کر دی۔ آٹھویں کی طالبہ تھی مگر غضب کے عشق نامے لکھتی تھی۔ ان کی اماں نے تو ذرا سی ڈھیل دی تھی بیٹی دو ہاتھ آگے ہی بڑھ آئی۔ موقع پا کر کمرے میں آ جاتی۔ سوتے سوتے چادر کھینچ لیتی۔ پانی کا گلاس انڈیل دیتی۔ اس کھیل سے میری دلچسپی بھی بڑھی اور ایک رات وہ گھر سے چھپ کر کمرے میں چلی آئی تو

اپنی وارفتگی کی رو میں مجھے بھی بہا لے گئی۔ میں وہاں دو سال رہا۔ خطوں یا
اشاروں میں اسے سمجھا دیا تھا کہ میری منگنی ہو چکی ہے اور اس لڑکی
کو میں بچپن سے چاہتا ہوں مگر اس دیوانی نے میری کہانی کو سچ نہ جانا
اور مجھ سے بیاہ کے سپنے دیکھتی رہی جو ظاہر ہے کبھی پورے نہیں ہونے
تھے۔ میں نے ان کی اماں جان کو بھی بتا دیا تھا کہ میں اپنی چچا زاد بہن سے
منسوب ہوں۔ بڑی بی نے بیٹی کو قابو میں کرنا چاہا مگر ان کی ایک نہ چلی۔
میری ٹریننگ مکمل ہونے پر اندرون سندھ پوسٹنگ ہو گئی۔ ان لوگوں
کو خدا حافظ کہہ کر چلا آیا۔ میری دانست میں یہ کھیل ختم ہو چکا تھا مگر
گیا۔ ثریا سے کوشش کے باوجود ملاقات نہیں ہوئی اور منزلی ایسی کہ جب بھی
کر دو دفعہ چچا کے گھر گیا وہ نظر ہی نہیں آئی۔ میں واپس ملازمت پر آ
گیا۔ دو ماہ بعد ابا نے میری شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ میں چھٹی لے کر
گھر آ گیا۔ پندرہ روز بیاہ میں باقی تھے کہ اچانک چچا نے رشتے سے انکار
کر دیا۔ کہنے لگے "میں اپنی بیٹی کو بدکردار شخص کے حوالے نہیں کر سکتا۔" ابا
بپھر گئے۔ دو چار رشتے داروں کو ساتھ لے کر گئے۔ وہاں انہوں نے
ایک طویل خط ابا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کہنے لگے "یہ خط رشید عثمانی
کی بیٹی کے ہاتھ شہر سے ایک لڑکی نے بھیجا ہے۔ رشید کی بیٹی حبیبہ اور
یہ لڑکی ایک ساتھ اسکول میں پڑھتی ہیں۔ اس لڑکی سے تمہارے بیٹے
کے تعلقات تھے۔ مشتاق اس کی زندگی برباد کر کے آیا ہے۔ وہ لڑکی
خودکشی کی کوشش بھی کر چکی ہے۔ اپنے بیٹے کو سمجھاؤ کہ اس سے شادی کرے"
ابا نے خط پڑھا۔ دو چار لوگوں نے اور پڑھا۔ مجھے بلوایا گیا۔ انکار کی گنجائش
نہیں تھی۔ یہ کراچی کی اختر جہاں کا خط تھا جو مجھ سے واقعی بہت قریب
ہو گئی تھی مگر میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ یہاں تک میرا پیچھا کرے گی
اس نے یہ خط ثریا کے نام لکھا تھا کہ بہن مجھے خودکشی کرنے سے بچا لو مجھے مشتاق
ملا تو خودکشی کر لوں گی۔

چچا نے مجھے بے حد گالیاں سنائیں۔ بولے آئندہ اس منحوس
کا نام بھی میں سننا پسند نہیں کروں گا۔ میں اسے بے حد شریف سمجھتا رہا۔
ان کی ڈانٹ ڈپٹ پر مجھے غصہ آ گیا۔ رواں رواں انتقام کی آگ میں
جلنے لگا۔ میں نے سوچا کہ خود ثریا سے بات کر کے اسے شادی پر آمادہ
کروں گا۔ معاملہ بگڑ چکا تھا۔ اب صرف یہی راستہ رہ گیا تھا۔ میں اپنے
رشتے دار کی شادی میں محض ثریا سے ملنے کے لئے شریک ہوا۔
ثریا ملی مجھے دیکھ کر منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور بھاگ گئی۔ میں نے اس کا
تعاقب کیا۔ وہ بگڑے ہوئے تیوروں میں بولی "آپ میرے متعلق
مجھ سے کوئی غلط توقع مت رکھیے۔ ابا جو کریں گے مجھے منظور ہوگا
آپ کے لئے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس معصوم لڑکی سے شادی
کریں جس کی زندگی آپ کے ہاتھ میں ہے"

میں ہول ہو کر باہر نکلا تو سامنے منزلی نظر آ گئی۔ ان ڈھائی سالوں
میں وہ کچھ سے کچھ ہو گئی تھی اس کا چہرہ مہرہ بدل چکا تھا۔ وہ انتہائی
دلفریب اور تر و تازہ لگ رہی تھی میں اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ
شوخی سے بولی۔ ہاں آنکھیں پھاڑ کر دیکھئے میں منزلی ہوں وہی منزلی
جسے ٹھکرا کر آپ نے ثریا باجی کو اپنانا چاہا تھا مگر جناب وہ اب آپ
سے شدید نفرت کرتی ہیں اور میں آپ سے کبھی نفرت نہیں کر سکتی۔
یہ فرق ہے آپا میں اور مجھ میں" وہ آج بھی اپنے بچپن جیسی بے باک تھی
اور مجھے آج بھی چاہتی تھی۔ اس خیال نے مجھے سہارا دیا کہ چچا سے اس
کے ذریعے بھی انتقام لیا جا سکتا ہے۔ چچا نے مجھے بدکردار کہہ کر بدنام کیا ہے
ثریا نے مجھے غلام سمجھ کر ٹھکرایا ہے تو کیوں نہ میں ان دونوں کو ایک
ہی مہرے سے شکست دوں۔ میں نے منزلی سے اپنے ماضی کے رویے
کی معافی مانگی۔ اسے بتایا کہ تمہاری انگوٹھی آج بھی میرے پاس ہے میں
اسے لوٹانا چاہتا ہوں۔ وہ ہنس کر بولی "مگر اسی طرح جیسا میں نے کہا تھا"
میرے لئے اس کی یہ حوصلہ افزائی بہت تھی۔ اس سے چھپ چھپ کر
ملاقاتیں ہونے لگیں۔ میں بہت تھک چکا تھا۔ ثریا کی بے رخی نے مجھے
بالکل کھوکھلا کر دیا تھا۔ سوچتا تھا منزلی کو اپنا کر سب سے
اپنے حالات سنواروں گا اگر چچا راضی نہیں ہوتے تو جیسا کہ میں نے
کہا تھا ہم سول میرج کر کے یہ شہر ہی چھوڑ دیں گے۔ شادی کی چھٹی میں
نے منزلی کو شیشے میں اتارنے میں صرف کر دی لیکن جس دن میری
قسمت کا فیصلہ ہونا تھا وہ خود نہیں آئی ایک بچے کے ہاتھ رقعہ بھیجا
لکھا تھا "جناب عالی یہ تیسرا زخم بھی برداشت کر لو۔ آخر تم نے مجھے اتنا
بے وقوف کیسے سمجھ لیا تھا کہ ٹھکرائے جانے کے باوجود تمہارے قدموں
میں گر جاؤں گی۔ حضور اب باجی کے غم کے ساتھ ساتھ میرا زخم بھی تمہیں
یاد رہے گا۔ خدا حافظ، مجھ سے کبھی ملنے کی کوشش مت کرنا"

تو صاحب یہ تھا میری ان محبتوں کا انجام اور یہ تھا میرے
الٹے سیدھے منصوبوں کا حشر جس نے مجھے دنیا کے سامنے ذلیل و خوار
کیا۔ ذلت کے طمانچے مارے اور شکست کے احساس نے سارا خود
اعتمادی چھین لی۔ ثریا سے مجھے حقیقتاً پیار تھا۔ اسے کھونے کا دکھ کبھی
نہ بھول پاؤں گا۔ منزلی نے اپنا بدلہ لیا اور جس انداز سے لیا اس نے
مجھے ہفتوں بال نوچنے پر مجبور کیا۔ رہ گئی اختر جہاں جس نے میری شادی
سے کچھ عرصے پہلے ساری بساط ہی الٹ دی اس سے میں قطعی شرمندہ
نہیں ہوں کیوں کہ اس نے جس انداز سے مجھے بدنام کیا ہوگا اس
سے زیادہ میرے سکھ چین کو آگ لگی ہے۔

مشتاق احمد، حیدرآباد

منورہ نوری

بصرہ سے بہت دور سرسبز و شاداب نخلستان کے درمیان ایک بستی آباد تھی جس میں مسلمانوں کے بہت سے گھرانے مدتوں سے رہتے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ معتبر اور پُرعظمت گھرانہ مسلم ابنِ ہاشم کا تھا اس لئے نہیں کہ ایک متمول خاندان تھا یا ان کے اصطبل میں اعلیٰ نسل کے چار گھوڑے اور بزرگوں کی چھوڑی ہوئی تلواریں تھیں بلکہ اس لئے کہ ہاشم کی تین پشتوں سے کسی مرد نے چارپائی پر لیٹ کر جان نہ دی تھی۔ ان کے باپ دادا غزوات میں شریک ہوئے۔ قادسیہ اور یرموک میں کام آئے تھے اور انھوں نے کبھی پیٹھ پر زخم نہیں کھائے بلکہ ان کے سینے کفار کے تیروں سے چھلنی ہوئے تھے۔ بستی کا بچہ بچہ اس خاندان کی تاریخ سے واقف تھا۔ مسلم ابن ہاشم بھی اپنے بزرگوں سے پیچھے نہ تھا۔ وہ بھی متعدد معرکوں میں شریک ہو چکا تھا مگر جب وہ آخری بار دل و جان سے جہاد میں شریک ہوا تو ایک نوجوان بیوی کا شوہر اور دو کمسن بیٹوں کا باپ تھا۔ وہ جہاد سے واپس نہ آسکا۔ چھ ماہ بعد اس کی شہادت کی اطلاع آئی۔ نوجوان صادقہ کیلئے یہ خبر جانکاہ بھی تھی اور وجہ افتخار بھی، اب دکھ درد کے جذبات سے ناآشنا پانچ سالہ عماد اور صرف چار سال کا عاصم اس کا سہارا تھے۔ ان تینوں کے علاوہ اس گھر میں ایک اور ہستی تھی جو ان سب کی توجہ کا مرکز اور خوشیوں کا سوتا تھی۔ وہ تھی سلمیٰ بنت نعمان صادقہ کے چھوٹے بھائی کی نشانی، ماں باپ کی شفقت سے محروم بچی جسے اس نے بھائی کی شہادت اور بھاوج کی موت کے بعد سینے سے لگایا تھا۔ اس طرح سلمیٰ کو ماں کا پیار، صادقہ کو معصوم سی بیٹی اور دونوں بھائیوں کو ایک کومل سی ساتھی مل گئی تھی۔ تینوں بچے ایک ساتھ پڑھتے کھیلتے اور لڑتے مگر ایک دوسرے سے جدا ہونے کا تصور بھی نہ کرتے تھے۔ وقت گزرتا رہا وہ اپنی اور ایک دوسرے کی قدر و قیمت پہچانتے رہے، پڑھتے رہے کھیلتے رہے۔ ان کے لڑائی جھگڑوں میں صادقہ کا فیصلہ ہمیشہ سلمیٰ کے حق میں ہوتا ایسے میں تھوڑی دیر کے لئے وہ بہت مسرور ہوتی، خوش ہو ہو کر انھیں چڑاتی مگر اگلے لمحے خود ہی اپنی چاہت کے سہارے منا لیتی۔ عماد کو منانا تو کچھ بھی مشکل نہ تھا مگر ضدی عاصم کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے اسے کئی کئی جتن کرنے پڑتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ دونوں بھائی متفق ہو کر اس سے نہ بولنے کا فیصلہ کر لیتے ایسے میں سلمیٰ کی حالت قابلِ دید ہوتی۔ وہ ان کی بے دلی سے مایوس ہو کر تالاب کے کنارے کسی پتھر پر ہاتھوں کے کٹوروں میں چہرہ تھام کر بیٹھ جاتی۔ عماد اور عاصم بستی کی دوسری لڑکیوں اور لڑکوں کے ساتھ آ کر اسے جلانے کے لئے اس کے پسندیدہ کھیل کھیلتے تو وہ بے ساختہ رو دیتی۔ تب

عماد پیار سے اس کا ہاتھ پکڑتا اور تمام غصہ بھلا کر محبت سے کہتا ——

"آؤ سلمیٰ میرے ساتھ کھیلو، یہ عاصم تو بہت بُرا ہے نا۔"

کبھی ان دونوں سے مجبور کر وہ روٹھ جاتی اور چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹ جاتی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے خود بخود بھیگے رہتے مگر وہ حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتی تب عماد اگر اسے مناتا یا عاصم اسے پکارتا تو وہ آنکھیں ملتی آنسو پیتی ہوئی چپ چاپ مان جاتی۔ یہ عجیب و غریب فطرت کی کم سخن بچی دونوں بھائیوں کے لئے اہم تھی مگر سلمیٰ ضدی اور تند مزاج عاصم کی طرف ملتفت تھی جو عمر کے ساتھ ساتھ دھیرے دھیرے پروان چڑھ رہا تھا۔ اُدھر اس التفات سے بے خبر عماد تینوں کو محبت سے دیکھتی اور دل کے کسی گوشے میں چھپے ہوئے کسی مسرت انگیز خیال سے مسکرا دیتی کہ دل ہی دل میں سلمیٰ کو عماد سے منسوب کر چکی تھی۔

یوں ان کا بچپن بے شمار تلخ و شیریں واقعات اپنے دامن میں سمیٹے ہنستا کھیلتا گزرتا رہا اور دونوں بھائی دستور کے مطابق بصرہ کے مکتب میں داخل کر دیئے گئے۔ اس مکتب میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ فنِ حرب کی تربیت بھی دی جاتی۔ طلباء کو شہ سواری، نیزہ بازی، شمشیر زنی اور تیر اندازی کے علاوہ نت نئے اسلحہ کے استعمال میں مہارت دلائی جاتی۔ یہاں پر بہترین نسل کے اعلیٰ گھوڑے بھی تھے اور ایک مکمل اسلحہ خانہ بھی، یہاں پر کئی کئی برس کی محنتِ شاقہ کے بعد نوجوانوں کو ہر قسم کی تربیت اور تعلیم کے بعد جہاد کے لئے تیار کیا جاتا۔ اس علاقے کا حاکم مکتب کا سرپرست ہوتا لہٰذا ان دنوں حجاج بن یوسف اس کے اخراجات کا ذمہ دار تھا۔ یہاں پر تربیت پانے والے لڑکوں پر اس کی خاص توجہ تھی۔ یوں تو ہر شام ہی مکتب کے قریب ایک وسیع و عریض میدان میں لڑکوں کو عملی تربیت دی جاتی اور شہر بھر کے لوگ یہاں بغرضِ تفریح جمع ہوتے اور تیغ زنی و شہ سواری کے جوہر کا نظارہ کرتے مگر کبھی کبھی ان کی حوصلہ افزائی کے لئے حجاج بن یوسف بنفسِ نفیس یہاں آتا۔ ایسے میں تعلیمی و فنی مقابلے ہوتے اور پھر ہر مقابلے میں کامیاب ہونے والے طلباء کو انعامات سے نوازا جاتا اور گورنر ان کے نام سپاہیوں کی فہرست میں لکھوا دیتا۔ یہ انعامات دینی کتب، تلوار، ڈھال، یا تیر و ترکش پر مشتمل ہوتے۔ ایسے میں ہونہار نوجوانوں کو انعام حاصل کرنے سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوتی کہ ان کا نام گورنر کے سپاہیوں کی فہرست میں لکھ لیا گیا ہے اور اب مکتب سے فارغ ہوتے ہی انہیں کسی نہ کسی جہاد میں شرکت کا موقع مل جائے گا۔

عماد اور عاصم دونوں مکتب میں غیر معمولی شہرت اور اساتذہ کی نظروں میں ایک اہم مقام حاصل کر چکے تھے۔ انہیں چند برس کے اندر اندر بڑی تیزی سے شفیق معلموں کے زیر سایہ روحانی، ذہنی اور جسمانی تربیت حاصل کرنے کا نایاب موقع مل گیا تھا۔ مکتب میں بھی سرِ فہرست ان ہی کا نام آتا اور کھیل کے مقابلوں میں بھی پہلا انعام ان ہی دونوں میں سے کسی کا ہوتا۔ مگر ہمیشہ کی طرح ان کی فطرت آج بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھی۔ عماد سنجیدہ ٹھنڈے قلب و ذہن کا مالک اور عاصم شاہانہ فطرت، شوخ عادت کا جذباتی نوجوان، اس کا ہر فیصلہ اس کی ابھرتی ہوئی انا کے زیرِ اثر عمل ہوتا تھا۔ مکتب میں فارغ التحصیل طلباء کا سالانہ الوداعی جلسہ منعقد ہوا۔ اس دن شفیق استاد نے ان کی محنتوں کو سراہا، آئندہ زندگی کے لئے کچھ نصیحتیں فرمائیں اور انہیں ان کے فرائض سے آگاہ کیا۔ پھر حجاج بن یوسف نے اپنی عالمانہ اور فصیح و بلیغ تقریر میں جہاد کی اہمیت کا احساس دلایا اور خلیفۂ وقت ولید بن عبدالملک کی طرف سے ہونے والے طلباء میں گھوڑے تقسیم کئے۔ آخر میں کہا کہ بار غیس کا امیر نیزک بغاوت پر اتر آیا ہے۔ اس کی گوشمالی کے لیے قتیبہ بن مسلم کے زیر کمان فوج تیار کرنی ہے تم میں سے کون کون اس میں شرکت کرنا چاہتا ہے یہ سننا تھا کہ طلباء کی اکثریت نے ہاتھ بلند کر دیئے۔ ان میں وہ لڑکے بھی تھے جو ابھی مکتب سے فارغ نہ ہوئے تھے۔ جوشِ جہاد کا یہ عالم دیکھ حجاج بن یوسف کو بے حد خوشی ہوئی پھر اس نے اس سال تکمیلِ تعلیم کرنے والے ہی طلباء کا انتخاب کیا۔ ان کا باقاعدہ خود امتحان لیا اور پھر ان کی کارکردگی کے مطابق عہدے عطا کر کے انہیں اس فوج میں شرکت کی اجازت دے دی ان میں اکثر صرف سپاہیوں کی حیثیت سے فوج میں داخل ہوئے۔ ذہین ترین باعمل اور تند و تیز قسم کے نوجوانوں کو پچاس یا سو سپاہیوں کے دستے کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ عماد بن مسلم سو مجاہدین پر سالار مقرر ہوا۔ عاصم کو خوشی بھی تھی اور افسردگی بھی۔ وہ چونکہ عماد سے ایک سال بعد مکتب میں آیا تھا لہٰذا اس کی ایک سال کی تربیت باقی تھی۔ گورنر نے اسے اسی لئے جہاد پر جانے کی اجازت نہ دی۔ دونوں بھائیوں کا دائمی ساتھ چھوٹنے والا تھا سو دونوں ہی ملول تھے۔ جنگ پر جانے والے سپاہیوں کو چند یوم کی چھٹی ملی تھی لہٰذا وہ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

صبح صادق کا وقت تھا۔ آفتاب اپنی زریں شعاعیں بستی پر نثار کر رہا تھا۔ عماد دربارِ خلافت سے عطا ہونے والے گھوڑے پر سوار جنگی اسلحہ پہنے ہوئے تھا یہی اسلحہ اور گھوڑا اس کی کامیابی کی سند تھا اور جہاد میں شرکت کا اجازت نامہ۔ گھر قریب سے قریب تر آ رہا تھا۔ وہ گھوڑے کی پیٹھ پر تنا ہوا بیٹھا تھا اور گھوڑا آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ یکا یک اس کی نگاہیں ٹھٹک کر رہ گئیں گھر کے عقب والے ریت کے ٹیلے پر سلمیٰ کھڑی تھی۔ یہ وہی ٹیلہ تھا جہاں بچپن میں وہ تینوں ساتھ ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ مگر یہ چند برس [illegible]

کی شخصیت میں زبردست انقلاب آچکا تھا مگر وہ پہلی ہی نظر میں پہچان گیا اور دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ سلمہ کا کتابی چہرہ آفتاب کی طرح شفق سمیٹتی ہوئی شعاعیں اس پر یوں پھیلا رہی تھیں جیسے اس کے منبع نور کا اور چراغ ہو کر آفتاب کو دے رہی ہیں اور اسی نور سے آراستہ ہو کر آفتاب دنیا کو منور کر رہا ہے۔ موزوں قد اور دلکش بدن اب ہشت خوبصورت سانچے میں ڈھل چکا تھا۔ وہ چند لمحے آنکھیں پھاڑ کے تکتا رہا پھر جب سلمہ کھلکھلا کر ہنسی تو اس کی کھنکھناتی ہوئی ہنسی میں چند برس پہلے والی سادگی و بے ساختگی کی جھلک پا کر وہ بے اختیار بول اٹھا۔

"تم اس وقت یہاں ہو؟"

"ہاں!" سلمہ فخر سے بولی۔

"میں نے بڑے کمرے کی چھت پر سے آپ کو اس وقت دیکھا تھا جب آپ سڑک چھوڑ کر بستی کی طرف مڑے۔ میں پہچان گئی تھی کہ یہ ضرور آپ ہی ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں گھر میں داخل ہوئے تو صادقہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ دیر تک عماد کو سینے سے لگائے کھڑی رہی پھر سلمہ بولی۔

"آپ کا گھوڑا اصطبل میں باندھ دوں؟"

"نہیں" عماد نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ تمہارا نہیں، میرا کام ہے۔"

صادقہ نجانے کیا سوچ کر مسکرا دی۔ سالم بھی تو اپنا ہر کام خود ہی کرتا تھا۔ وہ ان دونوں کے بندھن کے بارے میں سوچنے لگی جسے وہ بہت پہلے باندھ چکی تھی مگر جس کا علم ابھی کسی کو نہ تھا۔ عماد کو پچیس دن گھر گزارنے تھے مگر اب زندگی کے طور طریقے بدل چکے تھے۔ اب وہ کھیل کود کی بے تکلف عمر سے نکل چکے تھے۔ سلمہ نے چند دن ایک جھجک سی محسوس کی پھر وہ عماد سے ذرا کھل کر باتیں کرنے لگی۔ ان کے موضوعات عموماً مکتب میں دی جانے والی تعلیم یا عاصم کے بارے میں ہوتے۔ ایسے میں صادقہ ان دونوں کو محو گفتگو دیکھ کر مسرور ہو جاتی مگر عماد تو جیسے بات کا لطف ہی نہ لیتا۔ ہر موضوع پر سنجیدگی سے بات کرنا اور دو ٹوک فیصلہ کرنا اس کی پرانی عادت تھی۔ آخر اس کی روانگی کا دن آ پہنچا۔ وہ ترکستان کے محاذ پر جانے والا تھا۔ ماں نے تحفہ کے طور پر اسے ایک تلوار، چند نصیحتیں اور کامیاب واپسی کی دعا دی۔ اس دن سلمہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ جدائی خواہ کسی بھی مقصد کے تحت ہو بہرحال جدائی ہے۔ ان دونوں بھائیوں سے اسے کس قدر محبت تھی۔ اس کا اندازہ اسے خود بھی نہ تھا۔ وہ بچپن سے ہی ان دونوں کو ضروری سمجھتی تھی۔ لڑائی کے لیے ایک اسے ستاتا تھا اور دوسرے کو وہ خود ستاتی۔ عماد رخصت ہو گیا اور سلمہ روتی رہ گئی۔ صادقہ نجانے کیا سوچتی رہی۔ اس نے اس دوران عماد سے شادی کا تذکرہ کیا تھا مگر وہ ٹال گیا تھا۔ کیوں؟ وہ سمجھ نہ سکی۔

دن ہفتوں اور مہینوں میں ڈھلتے رہے، وقت گزرتا رہا اور سلمہ کے انتظار کی شدت بڑھتی گئی۔ جیسے اسے عماد کی کامیابی کی اطلاعات ملتی رہتی اس سے کہیں زیادہ بے چینی سے وہ عاصم کی منتظر تھی۔ مکتب میں یہ اس کا آخری سال تھا۔ اب وہ کسی بھی دن گھر آ سکتا تھا۔ ہر طرف اس کی ذہانت اور شجاعت کی شہرت عام تھی۔ یہ خبر کسی نہ کسی ذریعے سے بستی میں بھی پہنچ جاتی تو سلمہ کی مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا۔ ان دنوں وہ اکثر اسی کے بارے میں سوچتی وہ کیسا ہو گا؟ یہ تصور دل کی دھڑکن میں تیزی کا سبب بن جاتا۔ عماد کو دیکھ کر اس نے عاصم کی شخصیت کے بارے میں تصور قائم کر لیا تھا۔ دراز قد، کشادہ سینہ، مضبوط بازو اور شائستگی کا مرقع۔ اس خیال میں وہ حق بجانب تھی۔ بچپن سے دونوں بھائیوں میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ بس عماد کا رنگ ذرا سانولا اور آنکھیں سنجیدہ تھیں جبکہ عاصم سرخ و سفید سا اور شوخ آنکھوں کا مالک تھا۔ کبھی کبھی اس کی شوخی تکلیف کا باعث بھی بن جاتی تھی مگر سلمہ کو اس کی یہ ادا بھی عزیز تھی۔ ان دنوں وہ ان ہی خیالات میں کھوئی رہتی۔ ایک سال ان ہی سوچوں کی نذر ہو گیا اور وہ دن اس کے لئے مسرور ترین دن تھا۔ صادقہ پڑوس میں ایک ضعیفہ کی عیادت کو گئی تھی۔ معذور خاتون کی تیمارداری کرنا بستی والے فرض سمجھتے۔ صادقہ کو بھی صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو جاتی۔ اس وقت بھی سلمہ گھر میں تنہا کشادہ صحن میں بیٹھی رنگین کاغذوں سے پھول تیار کر کے دل بہلا رہی تھی۔ کاغذ کے پھول بنانا اس کا بہترین مشغلہ تھا۔ وہ اپنے خیالات میں منہمک تھی کہ اچانک بیرونی دروازہ کھلا اور گھوڑے کی باگ تھامے ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ اس کے مضبوط جسم پر سپاہیانہ لباس وجاہت میں اضافہ کر رہا تھا۔ سلمہ حیرت اور کچھ خوف زدہ سے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔ متعجب وہ بھی کچھ کم نہ تھا۔ سلمہ کے دراز سیاہ گیسو کھلے تھے اور آفتابی چہرہ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سرمئی بادلوں سے جھانکتا ہوا بے تاب سا چاند، وہ دونوں ایک دوسرے کو پہچان کر بھی انجان سے بن گئے تھے۔ وجیہ و شکیل عاصم اور اتنا دراز قد خوبرو مجاہد بچپن والے عاصم سے بالکل مختلف تھا۔ وہ دونوں حیرت زدہ سے محو دیدار تھے، زبانیں گنگ تھیں مگر بعض باتیں گویائی کی محتاج نہیں ہوتیں۔ وہ دونوں خاموش تھے مگر یہ خاموشی دلوں کے نغمے گا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سلمہ اپنی بے پایاں مسرت اور دل کی دھڑکن پر قابو پاتے ہوئے اٹھی۔ کاغذ کے پھولوں کو ایک طرف رکھا۔ عاصم ابھی تک کھڑا تھا۔ گھوڑے کی باگ بدستور ہاتھ میں تھی۔ سلمہ کے اٹھنے سے وہ ہوش کی دنیا میں آ چکا تھا اور جونہی اس کی طرف بڑھی وہ بولا۔

"بہت حسین انقلاب ہے۔"

سلمہ جھینپ کر رہ گئی۔ سینکڑوں مرتبہ بچپن میں عاصم نے اس کی تعریفیں کی تھیں مگر کبھی اس انداز میں دل نہ دھڑکا تھا۔ آج تو جیسے کوئی نئی چیز عالم وجود میں آ گئی تھی۔ اس کے خوبصورت ہاتھ آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے اور عاصم بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"آپ نے پہچان لیا؟"

"پہچاننے میں اس کے دیر لگتی ہے جسے انسان بھول جائے۔" عاصم نے سرگوشی کی۔

"اور جو حواس پر چھا جائے اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔"

سلمہ سرخ ہو گئی۔ نہ جانے اس بات پر شرم محسوس ہوئی تھی یا اپنے بے تکے سوال پر پشیمان ہوئی۔ جلدی سے بولی۔

"کیا آپ کا گھوڑا اصطبل میں باندھ دوں؟"

"بالکل" عاصم ڈھٹائی سے مسکرایا۔

"زندگی بھر یہ کام تمہیں کرنا ہے لہٰذا ابھی سے عادت ڈالو۔" سلمہ اور بھی گھبرا گئی اور جب وہ گھوڑے کو باندھ کر واپس آئی تو عاصم بڑی دلچسپی سے ان پھولوں کو دیکھ رہا تھا، سرخ کاغذ کے ایک سائز کے گلاب جیسے پھول بڑے بھلے لگ رہے تھے۔

"بڑی ماہر معلوم ہوتی ہو اس کام میں؟" عاصم مسکرایا۔

سلمہ کوشش کے باوجود نہ بول سکی۔ اس کے عارض ان پھولوں سے زیادہ سرخ ہو رہے تھے اور عاصم بڑے اشتیاق سے اس کے رخسار پر شفق کی سرخی کو پھیلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ حیرت سے بولا۔

"سلمہ! ان ڈھیر سارے پھولوں کا کیا کرو گی؟"

"ہار گوندھوں گی" وہ مسکرائی۔

"کیوں؟" وہ بولا مگر سلمہ کے جواب دینے سے قبل ہی دروازہ کھلا اور صادقہ داخل ہوئی۔ عاصم کی غیر متوقع آمد نے اسے بے تاب کر دیا وہ تیزی سے آگے بڑھی اور اسے سینے سے لگا لیا۔

عاصم فارغ التحصیل ہو کر آیا تھا مگر اس کا نام سپاہیوں کی فہرست میں درج تھا۔ ان دنوں حجاج بن یوسف کا غضب سندھ پر نازل ہو رہا تھا۔ وہ یکے بعد دیگرے دو فوجیں راجہ داہر سے جنگ لڑنے کیلئے بھیج چکا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ لنکا سے آنے والے مسلمانوں کے جہاز پر سندھ کے ڈاکوؤں نے حملہ کر کے مال و اسباب لوٹ لیا اور خواتین کو قیدی بنا لیا تھا۔ حجاج بن یوسف نے راجہ داہر کو لکھا کہ وہ ان مظلوموں کو ان وحشیوں کے چنگل سے رہائی دلائے لیکن راجہ داہر نے بڑی سرد مہری سے کام لیا جس کے نتیجے میں حجاج بن یوسف نے غضبناک ہو کر دو فوجیں بھیجی تھیں مگر وہ دونوں کے مقابلہ پر پوری نہ اتر سکیں۔ اب یہ خبر عام تھی کہ حجاج بن یوسف تیسری فوج روانہ کرنے کی فکر میں ہے۔ عاصم کو یقین تھا کہ اسے اس فوج کے ہمراہ جانے کا کیونکہ وہ اس سال مکتب میں ہر مقابلے میں اول آنے والا سپاہی تھا۔ اس کا یقین بر حق بجانب تھا۔ ان دنوں اسے واقعی ابھو کے احکامات کا انتظار تھا مگر گھر آ کر سب کچھ بھول گیا۔ شباب کے آغاز نے اسے اور سلمہ کو دور رکھا تھا مگر اس دوری میں جو قربت تھی وہ اس نے بچپن کی اس بے تکلفی میں کبھی محسوس نہ کی تھی۔ اب ہر لمحہ فرحت بخش اور ہر ساعت نشاط انگیز تھی۔ وہ صادقہ کے سامنے بھی سلمہ سے مذاق کرنے سے نہ چوکتا مگر جب وہ موجود نہ ہوتی تو وہ اپنا دل کھول کر سلمہ کے آگے رکھ دیتا۔ ان دنوں گزرنے والا ہر لمحہ ان کی محبت کا گواہ تھا۔ وہ دونوں اپنائیت کے مقدس جذبے سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے وادیٔ عشق میں خراماں خراماں آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک دن صادقہ پڑوس کی ایک بیمار ضعیفہ کی عیادت کو گئی تو عاصم نے سلمہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"سلمہ! میں جہاد پر چلا جاؤں گا تو تم میرا انتظار کرو گی؟"

"میں زندگی کے آخری سانس تک آپ کا انتظار کروں گی۔" وہ اداس سے لہجے میں بولی۔

"سچ ـــ" عاصم مسکرایا۔

"آپ کو شک ہے کیا؟" سلمہ نے پوچھا۔

"نہیں تمہاری بات پر شک کرنا گناہ سمجھتا ہوں۔" عاصم نے اس کے شانے پکڑ لیے اور چند لمحے قریب سے دیکھتا رہا۔ وہ بولی

"آپ یہاں سے جا کر بھول تو نہیں جائیں گے؟"

"سلمہ" عاصم نے تڑپ کر اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا۔

"تمہیں بھول جانا میرے اختیار سے باہر ہے۔ مگر تم یہ سوال کیوں کر رہی ہو؟ کیا تمہیں میری محبت پر یقین نہیں ہے؟"

"نہیں یہ بات تو نہیں" سلمہ افسردگی سے بولی۔

"مگر ڈرتی ہوں۔ ــــــ"

"کس بات سے؟" عاصم نے بے تابی سے پوچھا۔ سلمہ خاموش رہی وہ پھر بولا۔

"تم ڈر رہی کیوں ہو؟"

"کیونکہ مرد وفا کا پرچار تو کرتے ہیں لیکن وفادار ہوتے نہیں۔" اس نے بڑے دکھ سے کہا۔

"نہیں سلمہ ایسا نہیں کہو۔" عاصم نے بڑے والہانہ انداز میں اسے دیکھا

"تم نے زمانۂ جاہلیت کے قصے سن رکھے ہیں جب مرد کے خیال میں عورت صرف ایک کھلونا تھی مگر اسلام نے ایسی تمام فضول باتوں کا خاتمہ

کر دیا ہے اب عورت مرد کے لئے قابلِ احترام ہے تم یقین کرو میں تمہیں ...؟

”نہیں عاصم!“ سلمیٰ نے اس کی بات قطع کی۔

”محبت مرد کے خیال میں ایک وقتی جذبہ ہے لیکن عورت کی زندگی کا روگ بن جاتا ہے میں تو ڈرتی ہوں کہیں ...؟

”نہیں نہیں“ عاصم نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر چوم لئے۔

”اس قسم کا خوف دل سے نکال دو۔ میں ثابت کر دوں گا کہ مرد محبت ملنے میں کتنا مستقل مزاج ہوتا ہے۔ بس تمہیں کچھ عرصہ انتظار کرنا ہوگا!“

”جب تک سانس رہے گی کہ آپ میرے ہیں میں آپ کا انتظار کروں گی“ سلمیٰ نے وعدہ کیا۔

”اور جب یہ آس ٹوٹ جائے گی تو؟“ عاصم نے شرارت آمیز انداز میں کہا۔

”تو کیا اس کے بعد بھی میں زندہ رہ سکتی ہوں؟“

اس جواب سے عاصم بڑی طرح متاثر ہوا۔ یوں ہی مسرتوں میں ڈوبے اور کبھی اداس ہو کر سے وہ دونوں اپنی محبت کے گیت الاپتے رہے ایک دن صادقہ نماز ظہر سے فارغ ہو کر کسی کپڑے کی سلائی میں مصروف تھی عاصم اس کے قریب تخت پر مطالعہ کر رہا تھا اور سلمیٰ قریب ہی چوکی پر بیٹھی کاغذی پھول بنا رہی تھی، عاصم نے نظریں چرا کر چند لمحے سلمیٰ کو دیکھا اس کے ساتھ ہی اسے چند دنوں قبل کی باتیں یاد آگئیں ——— پگلی کہیں کی ——— اس نے پیار سے دل ہی دل میں سوچا اور صادقہ سے بولا۔

”امی۔ یہ سلمیٰ اتنے پھول کیوں بنا رہی ہے؟“ سلمیٰ نے چونک کر اسے دیکھا اور شرارت سے بولی۔

”پھوپی اماں سے کیوں پوچھتے ہیں، خود ہی پوچھئے نا!“

”ہم نے پوچھ لیا تو تم ناراض ہو جاؤ گی“ عاصم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”واہ پوچھ سکے تو اب لگے بہانے بنانے“ سلمیٰ نے کہا۔

سلمیٰ ان دونوں کی نوک جھونک پر مسکراتی رہی۔ وہ تصور ہی تصور میں عماد کو واپس آتے دیکھ رہی تھی۔ وہ گھوڑے سے اتر رہا تھا اور اس کے گھوڑے کی باگ سلمیٰ کے ہاتھ میں تھی۔ عاصم دیر تک سلمیٰ کو دیکھتا رہا پھر بولا۔

”امی“ ان ڈھیر سارے پھولوں سے ایک ہار گوندھیں!“

”کیوں؟“ صادقہ خیالات سے چونکی اور پیار سے عاصم کو دیکھنے لگی۔

”میری دلہن کے لئے“ عاصم نے اچٹتی سی نظر سلمیٰ پر ڈالی۔

”میں اسے خود پہناؤں گا!“

”چل شریر کہیں کا!“ صادقہ نے پیار بھری ڈانٹ دی۔

”ہر وقت مذاق کرتا ہے!“

مگر سلمیٰ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اگر عاصم تنہائی میں اظہارِ عشق نہ کرتا زندگی بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں نہ کھاتا تو شاید اس کی یہ کیفیت نہ ہوتی مگر اب تو سانس لینا بھی دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ صادقہ آہستہ سے بولی۔

”مصنوعی پھولوں کا ہار پہنائے گا اپنی دلہن کو!“

”اتنی محنت اور خلوص سے بنائے ہوئے یہ پھول قدرتی پھولوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہیں!“ عاصم نے برجستہ کہا پھر شاہانہ انداز میں بولا۔

”سلمیٰ ادھر لاؤ سب پھول۔ یہ ہار ہم خود تیار کریں گے“، ماں روکتی رہی مگر اس نے تمام پھول سلمیٰ سے چھین لئے اور دیر تک ہار بناتا رہا۔ سلمیٰ مذاق اڑاتی رہی، تلوار پکڑنے والے ہاتھ سوئی دھاگہ لئے بیٹھے تھے۔ مگر عاصم کو پروا نہ تھی۔ صادقہ پیار سے دیکھتی رہی۔ کتنا شوخ تھا اس کا بیٹا، بچپن سے مذاق کرنا اس کی فطرت تھی۔ اسے پھر عماد کا خیال آگیا۔ سنجیدہ اور باوقار، کس قدر فرق تھا دونوں بھائیوں میں۔ بہت دیر میں عاصم نے ایک خوبصورت ہار مکمل کر لیا اسے ایک سرخ رومال میں لپیٹا اور سلمیٰ کو دیتے ہوئے تحکمانہ انداز میں بولا۔

”سلمیٰ یہ میری امانت ہے تم اسے ہاتھ نہ لگانا، میں اپنی دلہن کو خود پہناؤں گا!“

صادقہ اسے شرارت سمجھ کر ہنستی رہی اور سلمیٰ شرما کر رہ گئی۔ اسی شام عماد چند یوم کی رخصت پر گھر آگیا۔ گھر کی رونق دوبالا ہو گئی۔ دونوں بھائی بستی بھر میں مشہور تھے۔ عماد فرصت کے اوقات میں سب کو ترکستان کے قصے اور مجاہدین کے کارنامے سناتا۔ ان دنوں عاصم اور سلمیٰ بہت محتاط ہو گئے تھے۔ سلمیٰ تو پہلے بھی بے باک نہ تھی مگر اب عاصم نے بھی چھیڑ چھاڑ کم کر دی۔ ان ہی دنوں والیٔ بصرہ نے عاصم کے نام پیغام بھیجا کہ حجاج بن یوسف کی فوج سندھ روانہ ہونے والی ہے اور اسے بھی اس معرکے میں شامل ہونا ہے۔ پندرہ دن کے اندر اندر پہنچ جائے۔ یہ دن عمر کے لئے گئی بھی تھا

اور افسردہ بھی۔ سلمہ کئی بار چپ چپ کر رو چکی تھی۔ حال عاصم کا بھی یہی تھا مگر اسے
جہاد پر جانے کی مقدس خوشی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ صادقہ نمازِ عصر ادا کر
کے تخت پر کچھ متفکر سی بیٹھی تھی۔ دونوں بیٹے اس کے قریب ہی بیٹھے تھے۔
عاصم نہ جانے کیا سوچ رہا تھا کہ عماد بولا۔

"امی آپ کیا سوچ رہی ہیں؟"

صادقہ اس سوال پر چونک سی گئی۔ عاصم بھی متوجہ ہو گیا۔

"سوچتی ہوں" صادقہ توقف کے بعد بولی۔

"پہلے تم جہاد پر چلے گئے تھے اور اب عاصم جانے والا ہے"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی امی" عاصم شوخی سے مسکرایا۔

"سبھی کے بیٹے جہاد پر جاتے ہیں" عماد بھی اس بات پر مسکرایا
مگر صادقہ نے کہا۔

"میرا مطلب ہے کہ میں سلمہ کے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں"

عاصم کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا مگر اس نے خود کو سنبھالا۔ صادقہ خود
ہی بولی۔

"سولہ برس کی ہو گئی۔ اب میں دیر نہیں کروں گی۔ ابھی تو عاصم موجود
ہے اور تم بھی آتے جاتے ہو"

عاصم نے اس بات پر حواس باختہ ہو کر ماں کو دیکھا۔ فقرہ
مبہم تھا مگر وہ بہت کچھ سمجھ گیا تھا۔ عماد سر جھکائے ہوئے ماں کی باتیں سن
رہا تھا۔ کسی نے بھی عاصم کی حالت کو محسوس نہ کیا۔ اس نے بمشکل تمام
خود پر قابو پا لیا۔ صادقہ پھر بولی۔ روئے سخن عماد ہی کی طرف تھا۔

"میں نے تمہیں اور سلمہ کو تمہارے باپ کی زندگی ہی میں منسوب کر دیا
تھا اور میں اسی وقت کی منتظر تھی لہٰذا اب کوئی عذر نہیں سنوں گی۔ عاصم کی
روانگی سے قبل تمہیں شادی کرنی ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

"امی!" عماد کچھ جھجک کر رہ گیا۔

"اگر یہ آپ کی خواہش ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں"

ماں کی آرزو عاصم کی خواہشات کے بالکل خلاف تھی۔ اس تلخ
حقیقت کا انکشاف آج ہوا تھا کہ صادقہ نے سلمہ اور عماد کو بچپن میں ہی منسوب
کر دیا تھا۔ سلمہ اس کی متاعِ حیات جس پر وہ صرف اپنا حق سمجھتا تھا اس کی
نہ تھی۔ وہ چند منٹ ماں کے پاس چپکا بیٹھا رہا پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا
گیا مبادا کوئی سمجھ نہ جائے۔ چند یوم بعد اسے چلا جانا تھا اور جانے سے قبل
اپنے ہاتھوں سے سلمہ کو عماد کے سپرد کرنا تھا۔ اس کا دل چاہا گھر سے دور
بہت دور بھاگ جائے یا چیخ چیخ کر صاف صاف لفظوں میں کہہ دے
کہ سلمہ میری ہے صرف میری، مگر زبان تو جیسے گنگ ہو گئی تھی۔ کئی راتیں اس
نے سوچتے جاگتے کروٹیں بدلتے ہوئے گزار دیں۔ کبھی سوچتا امی کو ہر بات
سے آگاہ کر دے اور کبھی سوچتا کہ عماد کو ہمراز بنا کر ماں کو فیصلہ بدلنے پر
مجبور کر دے۔ آخر کئی دن سوچنے کے بعد اس نے ماں کو تمام حالات سے
مطلع کرنے کا فیصلہ کیا مگر اس کے قدم ڈگمگا گئے۔ صادقہ پڑوسن کی خاتون
سے کہہ رہی تھی۔

"میری زندگی بھر کا سرمایہ یہی دو بیٹے ہیں اور مجھے فخر ہے کہ انھوں نے
کبھی میری مرضی کے خلاف کام نہیں کیا، پھر بھلا عماد یا عاصم میرے فیصلے
سے کیسے انکار کر دیتے"

"ہاں" پڑوسن نے کہا۔

"آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے سلمہ عماد کے لئے بہت موزوں ہے"

عاصم کے قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ چپ چاپ لوٹ آیا۔ وہ کیا کہے کس سے کہے۔
ماں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا گناہ تھا۔ باہر خوشگوار ہوا چل رہی تھی فلک پر
ستاروں کی بزم سجی تھی وہ صحرا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر لیٹ گیا اور نئے سرے سے
حالات کا جائزہ لینے لگا مگر بار بار سوچنے پر بھی انجام ایک ہی سامنے آتا یعنی
کو افسردہ کر کے خوشیاں حاصل کرنے کا تصور لئے خواہ مخواہ ہی اداس کر
دیتا۔ اس کی خاموشی ماں کے خیال میں عماد کی شادی پر اظہارِ مسرت تھی جس
سے ماں مطمئن تھی اور اب اس موضوع کو چھیڑ کر اس کے اطمینان کی دھجیاں
اڑا دینا آدابِ فرزندی کے خلاف تھا۔ وہ سوچتا رہا اور وقت گزرتا رہا پھر
اس نے سوچا کہ عماد کو حالات سے مطلع کر دے ابھی تو کچھ نہیں بگڑا اس کے
جانے میں اور سلمہ کی شادی میں صرف چند یوم باقی تھے۔ ان دنوں میں وہ
بہت کچھ کر سکتا تھا۔ اس شب وہ دیر تک اپنے فیصلے پر غور کرتا رہا۔ پھر وہ
گھر میں داخل ہوا رات گہری ہو گئی تھی اور سب محوِ خواب تھے مگر عماد کے
کمرے کی شمع روشن تھی وہ بچپن سے ہی دیر تک کتب بینی کا عادی تھا
عاصم نے دروازہ کھول کر اندر دیکھا۔ خلافِ معمول آج عماد جلد ہی سو گیا
تھا اور شاید شمع گل کرنی بھول گیا تھا۔ اس کے خمدار بال کشادہ پیشانی کو چوم
رہے تھے اور سانولے چہرے پر صحت مندی یا خوشی کی سرخی تھی۔ عاصم چند
لمحے کھڑا اسے دیکھتا رہا اسے محسوس ہوا کہ عماد خوش ہے، بے حد خوش اس کے
ساتھ ہی اسے بچپن کے کئی واقعات یاد آ گئے۔ پڑوس میں سے کچھ خربوزے آئے
تھے جو صادقہ نے تینوں بچوں میں برابر تقسیم کر دیئے۔ اس وقت دس سالہ عاصم
گھر سے باہر تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا سلمہ نے اپنے حصے کے ساتھ اس
کا بھی حصہ کھا لیا۔ یہ چیز عاصم کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ لڑنے پر
آمادہ ہو گیا۔ قریب تھا کہ ہاتھا پائی ہو جاتی کہ سات سالہ عماد درمیان
میں آ گیا اور لجاجت سے بولا۔

"عاصم تم سلمہ کو کچھ نہ کہو بہت سے کھڑے سے لو۔"

اور پھر تینوں بچے ایک دن تالاب کے کنارے کھیل رہے تھے۔ یہ تالاب زیادہ گہرا نہ تھا مگر پھر بھی صادقہ کی ممانعت تھی کہ وہاں نہ کھیلا جائے۔ اس دن پھر کھیل کھیل میں سلمہ اور عاصم کی لڑائی ہو گئی۔ سلمہ نے اس کے پیچھے دوڑتے دوڑتے اسے زور سے ایک دھکا دیا۔ عاصم سنبھلتے سنبھلتے گرا اور پانی میں ڈبکیاں کھانے لگا۔ سلمہ کے ہوش اڑ گئے اور عماد بھی گھبرا گیا۔ اسی وقت مسجد کے مؤذن ادھر سے گزرے فوراً ہی کود کر عاصم کو تالاب سے نکالا۔ صادقہ اسے پانی میں تر بتر دیکھ کر حیران ہوئی اور پوچھا۔

"کیسے گرے تالاب میں؟" تو عاصم کے بولنے سے قبل ہی عماد بولا۔

"امی اسے میں نے دھکا دیا تھا۔" صادقہ سخت غضب ناک ہوئی اس نے عماد کے ایک چانٹا مارا اور اس کا کھانا بند کر دیا۔ اگلے دن عاصم نے پوچھا۔

"بھائی آپ نے جھوٹ کیوں بولا تھا مجھے سلمہ نے گرایا تھا آپ نے نہیں۔" تو عماد نے سادگی سے کہا تھا۔

"پھر امی سلمہ کو مارتیں اور کھانا بھی بند کر دیتیں۔"

اس وقت یہ باتیں بڑی معمولی تھیں مگر آج بڑی سنگین نظر آ رہی تھیں عاصم سوچ رہا تھا۔ "کیا میری طرح بھائی جان بھی سلمہ کو چاہتے ہیں؟" اس سوال کا جواب بچپن کے سینکڑوں واقعات دے رہے تھے اور عاصم کا دماغ چکرا رہا تھا۔ اس نے ایک نظر سوتے ہوئے عماد کو دیکھا۔ اس کی گہری نیند قلبی اور ذہنی سکون کی غمازی کر رہی تھی۔ کیا وہ اس کے سکون کا خاتمہ کر دے؟ عاصم نے خود سے سوال کیا۔ نہیں عقل نے اس کی نفی کی اور وہ یہ سوچنے لگا۔ بچپن کے کئی واقعات عماد کی بے پناہ محبت کی علامت تھے قصور عاصم کرتا مگر ماں کے روبرو عماد انھیں اپنے سر لے لیتا۔ سینکڑوں بار ایسا ہی ہوا کہ خطا عاصم نے کی مگر سزا عماد کو ملی۔ صادقہ ہمیشہ سزا کے طور پر عماد کا کھیلنا اور کھانا بند کر دیتی مگر وہ زبان سے کبھی نہ کہتا کہ یہ قصور عاصم کا ہے اور عاصم قصور کرنے کے بعد بھی سزا نہ پاتا۔ اس وقت وہ سوچوں میں گم تھا۔ محبت ان دونوں نے کی ہے اور اگر یہ ایک جرم ہے تو اب کی مرتبہ اس کی سزا عماد کو نہیں ملے گی بلکہ وہ خود برداشت کرے گا۔ وہ چپ چاپ چلا جائے گا، دور بہت دور اور جب تک سلمہ کو بھابی کے روپ میں دیکھنے کا حوصلہ پیدا نہ کرے گا واپس نہیں آئے گا۔ یہ فیصلہ کرتے وقت جذباتی عاصم قطعی طور پر یہ بھول گیا کہ محبت ان دونوں نے نہیں بلکہ تینوں نے کی ہے اس جرم میں سلمہ بھی برابر کی شریک تھی۔ اس کا فیصلہ اٹل تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ اگلے دن عماد گھوڑے کی سیر کے لئے گیا ہوا تھا۔ صادقہ اور سلمہ تخت پر بیٹھی تھیں اور قریب ہی چارپائی پر عاصم سر جھکائے ہوئے بیٹھا شاید اپنی روانگی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ صادقہ بولی۔

"سلمہ بیٹی! میں نے تمہاری شادی کا فیصلہ کیا ہے۔"

سلمہ کے عارض تمتا گئے عاصم نے ایک نظر اسے دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ صادقہ بولی۔

"عماد تمہارے لئے بہترین شریک حیات ثابت ہوگا۔"

سلمہ نے چونک کر دیکھا مگر اس مرتبہ عاصم ادھر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکا۔ ماں اور بھائی کی خوشیوں کو پامال کرنا اس کی نیک نیتی کے خلاف تھا۔ اس دن ساری بستی بھر میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ سلمہ اور عماد کی شادی ہونے والی ہے۔ عاصم اپنے فیصلے پر قائم تھا مگر یہ خبر سن سن کر اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ بستی کے لڑکے

---

**ایک** مرد ہمیشہ نظامِ قدرت اور حکمتِ خداوندی پر معترض رہتا تھا۔ ایک روز اس کا گزر تربوز کے کھیت میں سے ہوا۔ اس چھوٹے سے پودے میں اتنے بڑے بڑے تربوز دیکھ کر قدرت کی اس نامناسبت اور ناموزونیت پر ہنسا۔ آگے بڑھا تو آموں کا ایک باغ آیا۔ بڑے بڑے تناور درختوں میں چھوٹے چھوٹے آم دیکھ کر نظامِ قدرت میں اصلاح کی کہ بلحاظِ جسامت آم کا چھوٹا سا پھل تربوزوں کے پودے میں اور تربوزوں کا پھل آم پر لگتا تو یہ نہایت ہی موزوں تناسب ہوتا۔ وہ اسی مسئلہ پر آم کے پھلوں پر ٹکٹکی لگائے ان کی مناسبت پر غور کر ہی رہا تھا کہ ٹہنے سے ایک آم ٹوٹا جو گر کر سیدھا اس کی آنکھ کے ڈھیلے پر جا بیٹھا۔ آنکھ پھوٹ گئی۔ سخت تکلیف ہوئی لیکن وہ ملحدانہ خیالات سے تائب ہو کر فوراً ہی سجدۂ شکر بجا لایا کہ اب تو صرف آنکھ ہی ضائع ہونے پر بلا ٹل گئی۔ اگر میری اصلاح کے مطابق اس پر تربوز لگے ہوتے تو جان کی بھی خیر نہ تھی۔

معلوم ہونے لگی تھی جہاں سے وہ جلد از جلد چلا جانا چاہتا تھا اور پھر اس نے ایک رقعہ لکھا۔

"سلمہ! اپنی محبت کو ایک وقتی جذبہ سمجھ کر فراموش کر دینا۔ میں تمہیں بھائی جان جیسا شریک زندگی ملنے پر مبارک باد دیتا ہوں۔ وہ مجھ سے زیادہ بہتر اوصاف کے مالک ہیں۔ امید ہے تم ان کی محبت میں جلد ہی مجھے بھول جاؤ گی۔ خدا تمہیں خوشیوں سے ہمکنار کرے!"

عاصم

یہ رقعہ اس نے سلمہ کے کمرے میں رکھا اور چپ چاپ باہر نکل گیا اور گھوڑے پر سوار ہوتے وقت غلام سے بولا۔

"صبح امی سے کہہ دینا میں چند یوم کے لئے بصرہ جا رہا ہوں بھائی جان کی شادی سے قبل آنے کی کوشش کروں گا!"

اگلے دن آفتاب خاصا بلند ہو گیا تو غلام نے عاصم کا پیغام دیا۔ سعادتہ حیران سی رہ گئی۔ ایک دم عاصم کا چلا جانا اور سلمہ کی اشکباری ایک معمہ تھی جسے سعادتہ حل نہ کر سکی مگر پھر اس چھوٹے سے رقعے نے حقیقت کا انکشاف کر دیا۔ عماد سلمہ کے کمرے میں کھڑا حیرت سے اسے پڑھ رہا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ رقعے کو پڑھا اور تعجب خیز انداز میں سلمہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"سلمہ! یہ سب کچھ چند دن قبل کیوں نہ بتا دیا ---" سلمہ جواب نہ دے سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تب چند لمحے سکتے کے عالم میں کھڑا رہ کر وہ آگے بڑھا اور ایک سرپرست کی طرح سلمہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"تم عاصم کی امانت ہو۔ وہ واپس آئے گا تو میں تمہیں اس کے حوالے کر دوں گا۔ بخدا مجھے اس سے قبل یہ شک بھی نہ تھا کہ تم دونوں کے جذبات ایک دوسرے کے لئے ایسے ہیں" پھر وہ امی سے مخاطب ہو کر بولا

"امی یہ شادی نہیں ہوگی۔ سلمہ آپ کی بہو بنے گی ضرور مگر عاصم سے منسوب ہو کر۔" سعادتہ نے حیرت سے اسے دیکھا تو اس نے بڑے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"آپ سلمہ کے لئے ایک سہارا چاہتی ہیں نا۔ آپ مطمئن رہئے، میں اسے سہارا دوں گا مگر ایک بڑا بھائی بن کر اور جب عاصم لوٹ آئے گا تو ان کی شادی کر دوں گا ---" اور یہی اسی وقت جب عماد ابن مسلم یہ فیصلہ کر رہا تھا تو عاصم محمد بن قاسم کی فوج میں شامل ہو کر سندھ کی طرف روانہ ہو رہا تھا۔ ماضی کا خیال اپنی محبت اور بچپن کی یادیں جیسے سب اس کے قدموں تلے روندی جا رہی تھیں۔ اس فوج کی راہ میں وہ ٹیلے بھی آئے جن کے عقب میں اس کی بستی تھی مگر اس نے منہ موڑ لیا جیسے ماضی سے رشتہ توڑ چکا ہو۔ اس کے خیال میں چند یوم کے بعد سلمہ اور عماد کی شادی ہونے والی تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ بہت جلد اسے فراموش کر دیں گے۔ ان کی آئندہ زندگی کی خوشی اسے مطمئن کر رہی تھی اور وہ مجاہدین کے ساتھ کشاں کشاں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی منزل سندھ تھی۔ عماد کے آخری فیصلے کے بعد سلمہ مسرور تھی، خوش تھی، دراصل عماد کی عظمت کا صحیح اندازہ اسے اب ہوا تھا۔ وہ اس کی احسان مند تھی۔ ان دنوں اسے روز عاصم کا انتظار رہتا۔ وہ روزانہ باہر نکلتی اور دکان کے عقب والے ٹیلے پر کھڑے ہو کر دور دور تک نظریں دوڑاتی، وہ بڑے کمرے کی چھت پر سے اس سڑک پر دیکھتی جو بصرہ سے بستی کی طرف آتی تھی۔ عماد اس کی حالت دیکھ کر مسکرا دیتا

"گھبراؤ نہیں دو چار یوم تک لوٹ آئے گا ---" مگر کئی دن گزرتے رہے۔ عاصم نہ آیا بلکہ بصرہ سے آنے والے ایک شخص نے بتایا کہ محمد بن قاسم کی فوج سندھ کی طرف کوچ کر چکی ہے اور اس میں ایک دستے کا سالار عاصم تھا۔ اس خبر نے جہاں سلمہ کو ملول کیا وہاں روز روز کے انتظار کی کیفیت بھی ختم کر دی اور اب وہ شدت سے فتح سندھ اور مجاہدین کی واپسی کی منتظر تھی۔

محمد بن قاسم بارہ ہزار سپاہیوں کو لے کر مکران ہوتا ہوا خشکی کے راستے بڑھا جا رہا تھا۔ قنز پور اور ارمابیل کو تسخیر کرتے ہوئے وہ دیبل کی طرف بڑھا۔ وہاں پہنچتے پہنچتے اس کا بھاری جنگی سامان بحری راستے سے آ پہنچ گیا۔ اس میں ایک قلعہ شکن منجنیق تھی جسے پانچ سو آدمی چلاتے تھے اسے "عروس" کہا جاتا تھا۔ اس کی خبر سن کر دیبل کے لوگ قلعہ بند ہو گئے مجاہدین نے محاصرہ کیا۔ خندقیں کھود کر منجنیق نصب کی اور سنگ باری شروع کر دی۔ وقت گزرتا رہا۔ لڑائی رات دن جاری تھی مگر اہل شہر حوصلہ نہ ہارے تھے۔ اس طرح کئی ماہ گزر گئے۔ حجاج بن یوسف کو چونکہ اس جنگ سے قلبی لگاؤ تھا، محمد بن قاسم نے سندھ کے حالات سے اسے مطلع رکھنے کے لئے سندھ سے بصرہ تک ہر دس کوس کے فاصلے پر چوکیاں مقرر کی تھیں اور ہر چوکی پر گھوڑوں اور مخبروں کے ٹھہرنے کا انتظام تھا تاکہ وہ چند گھنٹے رک کر تازہ دم گھوڑے لے کر باآسانی سفر کر سکیں۔ اس معقول انتظام کی وجہ سے پل پل کی خبریں حجاج بن یوسف کو مل رہی تھیں۔ اسے جب معلوم ہوا کہ مسلمان محاصرہ کئے ہوئے فی الحال تسخیر قلعہ میں ناکام ہیں تو اس نے ہدایت بھیجی کہ جیسے بھی ممکن ہو دیبل کے بت کدے پر سنگباری کرو۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ بت کدے پر پتھراؤ شروع کرتے ہی ایک پتھر مندر میں گرا۔ اس مندر میں ایک مجسمہ نصب تھا جس کی اہل شہر پرستش کیا کرتے تھے اس پتھر کی

بہت مجبور ہو کر جھک گیا۔ ہندوستان میں ایک واویلا مچ گئی مسلمانوں کے
دیوتا کے گوشت کھا رہے تھے۔ یہ ایک بدترین شگون تھا یہ دیکھ کر راجہ
نے برہمن آباد کا رخ کیا اور ہر جانب قاصد دوڑائے۔ اس کی آواز
پر ہندوستان بھر کے راجہ کمربستہ ہو گئے۔ ادھر محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف
سے اجازت لے کر دیبل میں ایک مسجد تعمیر کرائی اور نیرون کا رخ کیا۔ یہاں
کا حاکم مقابلے پر نہیں آیا بلکہ اس نے بڑی عزت و احترام سے اطاعت قبول
کی۔ شہری مندروں کے پجاریوں نے بھی خراج کی شرط پر اطاعت قبول کر لی۔
مسلمان سیستان کی طرف روانہ ہوئے۔ یہاں راجہ داہر کے بیٹے بجرا کی
حکومت تھی۔ اس وقت تک مسلمان جس علاقے سے گزرتے ہندو حاکم اور
عوام ان کے کریمانہ اوصاف سے متاثر ہوتے۔ کچھ تو مسلمان ہو کر ان کا ساتھ
دیتے اور کچھ اپنے مذہب پر قائم رہ کر بھی ان کی طرفداری کرتے ——
محمد بن قاسم اور مجاہدین ابھی سیستان کے راستے میں تھے کہ ایک دن مظلوم
ہندو واسل نے باریابی کی اجازت طلب کی۔ محمد بن قاسم ہر خاص و عام
سے ملتا تھا لہٰذا اس مظلوم کو بھی حاضر خدمت کیا گیا۔ اس نے کہا کہ سیستان
کے باشندے تہہ دل سے اطاعت کے لئے تیار ہیں مگر راجہ بجرا نے اپنی
فوج کو مسلح ہونے کا حکم دیا ہے اس کا دعویٰ ہے کہ وہ مسلمانوں کو شکست
دے گا نیز یہ کہ اس علاقے کے ہندو اس راجہ کے ظلم و ستم کا شکار
ہیں۔ یہ راجہ کسی بھی حسین لڑکی کو چھوڑنے کا قائل نہیں اور واسل بھی ایک
خوبصورت بیٹی روپا کا باپ ہے جسے راجہ نے دن دہاڑے اٹھا کر محل
میں ڈال لیا ہے۔

یہ حالات سن کر محمد بن قاسم کو شدید غصہ آیا اس نے واسل سے
وعدہ کیا کہ وہ سیستان پہنچ کر راجہ بجرا کی سرکوبی کرے گا اور اس کی بیٹی لے
کر دلائے گا۔ راستے میں مسلمانوں نے بھروچ کی آبادی کو بھی صلح کن پایا
لہٰذا ان سے مقابلے کی ضرورت نہ پڑی اور سفر جاری رکھا۔ مسلمانوں نے
سیستان پہنچتے ہی شہر کا محاصرہ کر لیا۔ دن پہ دن گزرتے گئے مگر یہ مسلمان
تھکے نہ ہندوؤں نے اطاعت قبول کی۔ مجاہدین نے شدید سنگ باری شروع
کی تو پورے ایک ہفتے بعد راجہ بجرا کی فوج کے حوصلے ماند ہو گئے۔ یہ دیکھ
کر راجہ نے چند خوبصورت رانیوں اور کچھ جانثاروں کو لیا اور رات کی تاریکی
میں فرار ہو گیا۔ ان رانیوں میں ہندو واسل کی بیٹی روپا بھی تھی۔ یہ خبر محمد بن
قاسم کے لئے ایک چیلنج تھی۔ اس نے عاصم کی سرکردگی میں سو سپاہیوں
کا دستہ اس کے تعاقب میں بھیجا۔ رات کا وقت تھا عاصم نے چند گھنٹوں کی
برق رفتاری کے بعد راجہ بجرا کو جا لیا۔ یہاں بھی زبردست مقابلہ ہوا۔ راجہ
کے جانثار اسے بچانے کے لئے مقابلے پر آ گئے مگر مسلمانوں کی یلغار کا اندازہ
انہیں مقابلے کے انجام سے آگاہ کر رہا تھا۔ آخر راجہ بجرا نے اپنے [illegible] کا رخ

کیا۔ وہاں کا حاکم کاکا اس کا دوست تھا۔ کچھ جانثار اس کے ساتھ تھے
مگر روپا عاصم کے ہاتھ آ گئی ایفائے عہد کی اس مثال نے واسل کو اس
قدر متاثر کیا کہ وہ مسلمان ہو گیا۔ اب اس کا نام فرخ اور روپا کا اسلامی نام
اسمہ تھا۔ اسمہ پہلی نظر میں ہی عاصم کے مردانہ حسن اور کردار سے گھائل
ہو گئی۔

سیستان فتح ہو چکا تھا۔ کچھ تو یہاں کے نظم و نسق کے انتظامات اور
کچھ حجاج بن یوسف سے حربی احکامات کے انتظار میں مجاہدین کے
لئے چند دن یہاں قیام ضروری تھا۔ یہاں بھی بے شمار ہندوؤں نے
محمد بن قاسم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ جبکہ دوسروں نے اطاعت قبول کی۔
یہ لوگ اس کے مذہب سے متاثر تھے۔ فرخ باقاعدہ فوج میں شامل ہو چکا
تھا۔ اس نے ہر موقع پر محمد بن قاسم کو بڑے منفعت بخش مشورے دیئے۔ یہ
چیز اسمہ کو عاصم سے بہت قریب لا سکتی تھی مگر عاصم کا محتاط رویہ حیران کن
تھا۔ اس کی نظروں میں اس کے لئے احترام و شائستگی تھی۔ اس کی
نسوانیت کے لئے وہ تحسین آمیز ہوس نہ تھی جو وہ ہندوؤں کی آنکھوں میں
دیکھ چکی تھی اور یہی چیز اسے عاصم کا شیدا بنا رہی تھی۔ عاصم چند دن سے
بخار میں مبتلا تھا۔ امیر لشکر کا حکم تھا کہ مریض کا مکمل علاج اور آرام ضروری
ہے لہٰذا وہ اپنے خیمے میں آرام کر رہا تھا۔ ان دنوں وہ بہت پریشان تھا
وہ راجہ بجرا سے مقابلے سے لے کر آج تک کے واقعات پر غور کر کے متردد
تھا۔ اسمہ کے انداز قابل توجہ تھے وہ پوری طرح اس کی محبت میں گرفتار
ہو چکی تھی ہر چند کہ اس نے ابھی زبان سے کچھ نہ کہا تھا مگر محبت گویائی کی
محتاج نہیں ہوتی۔ دوسرے عاصم جیسے ذکی الحس اور زود فہم مرد کے لئے
ایک لڑکی کی کیفیت کا اندازہ کر لینا چنداں دشوار نہ تھا۔ دیویوں جیسا حسن
رکھنے والی اس لڑکی پر وہ فخر کر سکتا تھا مگر اس کا والہانہ انداز عاصم کے لئے
خوشی کے بجائے افسردگی کا باعث تھا۔ کبھی اسے اس نو عمر حسینہ پر غصہ آتا اور کبھی
رحم کہ اس نادان نے دل بھی لگایا تو کس سے جو پہلے ہی اپنا سب کچھ سلمیٰ کو سونپ چکا

کر چکا تھا۔ ابھی وہ سوچوں میں غرق تھا کہ چاپ ہوئی۔ عاصم نے آنکھیں کھولنے کی ضرورت محسوس کی۔ اسی وقت کسی نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، نرم نرم ٹھنڈا ہاتھ، عاصم کا دل زور سے دھڑکا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا خیال صحیح تھا یہ اسمہ تھی۔ اس کے دراز گیسو کھلے ہوئے تھے، چہرہ دھواں اور آنکھیں فکر کی غماز تھیں۔

"بخار تو آج بھی نہیں اترا"، وہ بولی۔

عاصم مزید پریشان ہو گیا مگر شائستگی سے بولا۔

"اتر جائے گا مگر آپ یہاں کیوں آ گئیں ہے"

"آپ کو دیکھنے"۔ اسمہ نے اس بے ساختگی سے کہا کہ اگر عاصم سلمہ کا اسیر نہ ہوتا تو آج سب کچھ ہار دیتا مگر وہ خود ایک ہارا ہوا جواری تھا اب اس کے پاس کچھ بھی نہ بچا تھا لہٰذا اس نے کہا۔

"اسمہ! تم جاؤ میں آرام چاہتا ہوں"۔

پھر اسمہ کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے موتیوں سے نظر بچانے کے لئے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس رات حجاج بن یوسف کی خدمت میں جانے والا قاصد لوٹ آیا۔ یہ سپاہی عاصم کا ہم مکتب رہ چکا تھا لہٰذا عاصم دیر تک اس سے بصرہ کے حالات پوچھتا رہا۔ کئی بار اس کا دل چاہا کہ اس سے اپنے گھر کی خیریت پوچھے تو وہ جواب دے سکتا تھا "سب گھر خیریت ہے اور سلمہ تمہاری منتظر ہے" مگر جانے کیوں ہمت نہ ہوئی۔ عبداللہ خود ہی بولا

"تمہارے گھر بھی سب خیریت ہے"۔۔۔۔۔ عاصم کا دل زور سے دھڑکا۔۔۔۔

"عماد کا ایک دوست مجھے ملا تھا۔ عماد ان دنوں رخصت لے کر گھر آیا ہوا ہے اس کی شادی ہونے والی ہے۔۔۔۔"

عاصم آنکھیں پھاڑے سکتے کے سے عالم میں اسے تک رہا تھا۔ یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ شادی کس سے ہونے والی ہے۔ عبداللہ خود ہی بولا

"سنا ہے پچھلے برس عماد کی شادی ہوتے ہوتے رہ گئی مگر اب ہو رہی ہے۔ عماد کا دوست اسی مقصد سے تمہاری بستی جا رہا ہے جس دن میں بصرہ سے رخصت ہوا ہوں اس کے دوسرے دن شادی تھی"

عبداللہ اِدھر اُدھر کی باتیں کئے جا رہا تھا مگر عاصم تو جیسے وہاں موجود ہی نہ تھا۔ ابھی تک ایک آس تھی کہ شاید کوئی معجزہ ظہور پذیر ہو اور سلمہ اسے مل جائے مگر آج وہ بھی ٹوٹ گئی تھی۔ وقت چپ چاپ گزرتا رہا۔ مسلمان آگے بڑھتے رہے۔ عاصم جنگ میں مصروف عجیب کشمکش کا شکار تھا۔ ایک طرف ماضی ایک ناسور بن گیا تھا جسے وہ کسی طور پر فراموش کرنے میں کامیاب نہ ہوا تھا۔ دوسری طرف اسمہ کی دیوانگی حد سے بڑھ گئی تھی۔ وہ جس قدر محتاط تھا وہ

اتنی ہی اس کے لئے بے قرار، عاصم پہروں اس محبت کے انجام پر پریشان ہو جاتا۔ پھر مجاہدین نے سیسم کی طرف رخ کیا۔ اس وقت علاقے کے چند قوموں نے ان کا ساتھ دیا۔ بہت سے مسلمان ہو کر اسلام میں شریک ہو گئے اور سیسم کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اب کی مرتبہ محمد بن قاسم نے سندھ کے تمام حالات مفصل لکھے اور قاصد کے فرائض عاصم کے جو کچھ عرصہ سے اب اپنی ذات تک کو فراموش کر دینا چاہتا تھا۔ امیر لشکر سن کر وہ پریشان ہو گیا۔ عہد رفتہ کی یادوں اپنے گھر کی موجودہ صورت اسے مضطرب کر گئیں مگر محمد بن قاسم کے حکم کے سامنے مجبور تھا آخر وہ پر گھوڑا بدلتا سفر کرتا ہوا البصرہ کی جانب روانہ ہو گیا کئی روز کی مسلسل مسافت کے بعد وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں سے اس کی بستی کے ٹیلے نظر آتے تھے اس کا دل چاہا کہ گھوڑے سے اتر کر اس جگہ کا طواف کرے جہاں اس کی محبت نے جنم لیا تھا۔ اس کی روح مچل گئی کہ یہاں کے ذرے ذرے کو پیار کرے جہاں اس نے سلمہ کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بچپن گزارا تھا مگر اسی جگہ اس کی محبت پامال ہوئی تھی۔ ان ہی در و بام نے شاید اس کی اپنی سلمہ کو عماد کی بیوی بنتے بھی دیکھا تھا۔ پچھلے برس ہی تو اسے عبداللہ نے بتایا کہ عماد کی شادی ہونے والی ہے اور اسے یقین تھا کہ وہ سلمہ کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ تصورات کا ہجوم اسے بے چین کئے دے رہا تھا۔ اس کا گلا رندھ گیا۔ وہ اس نخلستان میں کیوں آیا ہے جسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ چکا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ بستی سے گانے بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نوعمر لڑکیاں دف بجا رہی تھیں۔ عاصم نے سوچا کہ عماد کی شادی پر بھی یونہی دف بجے ہوں گے آج بھی کسی عماد کی شادی ہو رہی ہے اور شاید آج بھی کسی عاصم کی دنیا لٹ رہی ہو گی۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

بستی سے دور آ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اب وہ اپنی بستی سے بہت دور تھا۔ گھر بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ حجاج بن یوسف کا حکم تھا کہ راجہ داہر کے دارالحکومت پر فوری طور پر حملہ کر دو اس نے محمد بن قاسم اور مسلمان فوج کے لئے ضروری ہدایات پر مشتمل ایک مکتوب بھی روانہ کیا تھا عاصم جسے لے کر لوٹ آیا اب تک وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ بستی سے گزرتے ہوئے چند گھنٹوں کے لئے اپنے گھر ضرور رکے گا مگر اپنی سلمہ کو عماد کے روپ میں دیکھنے کی تاب نہ تھی اس نے چلتے وقت عہد کیا تھا کہ جب تک اسے اس رشتے میں دیکھنے کا حوصلہ پیدا نہیں ہو گا وہ واپس نہیں آئے گا اور اس کے قلب میں اتنی ہمت آج تک نہ ہوئی تھی لیکن اس میں بوڑھی ماں کا کیا قصور تھا اسے اپنی پیاری امی یاد آ گئی جس نے ان دونوں بیٹوں کے لئے عمر گزار دی تھی وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ اس مرتبہ وہ ماں کی قدم بوسی کے بغیر آگے نہ بڑھے گا

اس نے سوچا چاہے سلمیٰ کو دیکھ کر دل پر کچھ ہی گزرے مگر وہ اس شفیق ہستی کو مایوس نہیں کرے گا۔ اس فیصلے کے بعد وہ بے چین ہو گیا۔ اسے اپنے گھر کی یاد بُری طرح ستانے لگی۔

بستی کی طرف مڑنے سے قبل اس نے گھوڑا روکا اور چند منٹ ٹھہر کر خود کو گھر جانے کے لئے تیار کرنے لگا۔ سلمیٰ سے سامنا اس کے ایثار اور برداشت کے لئے سخت آزمائش تھی۔ اس کی اپنی سلمیٰ اب عماد کی امانت تھی جو اسے بے حد عزیز تھا۔ عین اسی وقت ایک گھڑ سوار اس کے قریب سے گزرا مگر چند قدم جا کر رک گیا۔ یہ عبدالعزیز تھا جو مکتب میں لڑکوں کو شہسواری سکھاتا تھا۔ دونوں بڑے تپاک سے ملے عاصم دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔

عبدالعزیز بولا۔

"تمہاری والدہ فریضہ حج ادا کرنے گئی ہیں اور تمہارے بھائی کے گھر ایک ماہ قبل لڑکا پیدا ہوا ہے۔"

عاصم کو خوشی بھی ہوئی اور افسردگی بھی۔ سلمیٰ ایک بچے کی ماں بن گئی تھی۔ اب وہ اس مقدس رشتے میں آکر یقیناً اس کی محبت کو بھلا چکی ہو گی اور عماد جو اس کے بچے کا باپ ہے جانے دنیا جہان سے سب سے زیادہ عزیز ہو گا۔ پھر اس کا دل چاہا آگے بڑھے۔ چند گلیوں کے عقب میں اس کا گھر تھا۔ وہاں جائے اور سلمیٰ کے بچے کو دیکھے پیار کرے مگر وہ نخلستان کی طرف مڑنے کی ہمت نہ کر سکا۔ ماں موجود نہ تھی اور سلمیٰ اس کے خیال میں اسے بھول چکی تھی مگر وہ اسے کبھی نہ بھلا سکتا تھا اور آج چند لمحوں کا سامنا جذبوں کے گہری دبی چنگاریاں بھڑکا دے گا جس کے لئے وہ کسی صورت بھی تیار نہ تھا پھر اس نے دل پر پتھر رکھا، گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سندھ کی جانب روانہ ہو گیا۔

حجاج بن یوسف کا حکم پاتے ہی محمد بن قاسم نیرون پہنچا۔ کچھ عرصہ اسلامی فوج نے یہاں قیام کیا پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ راستے میں قلعہ شہباز فتح کیا اور سندھ کے مغربی کنارے خیمہ زن ہو گئی۔ یہاں بہ قریب کے علاقوں کے حاکم اور ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد مسلمانوں کے اخلاق حسنہ اور محمد بن قاسم کے اعلیٰ کردار سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گئی۔ اب محمد بن قاسم چاہتا تھا کہ راجہ داہر بھی اطاعت اختیار کرے مگر اب تک وہ تمام ہندوستان کے راجاؤں کو جمع کر چکا تھا۔ چنانچہ اس نے محمد بن قاسم کا وہ وفد جو اس نے بغرض مصالحت روانہ کیا تھا بڑی رعونت اور تیزی سے لوٹا دیا اور خود اسلامی فوج کے مقابلے کے لئے دریائے سندھ کے مشرقی جانب ڈیرے ڈال دیئے۔ ہر طرف تیر انداز مقرر کر دیئے تاکہ اگر مسلمان دریا پار کر کے ادھر آنا چاہیں تو انہیں تیروں کا نشانہ بنا لیا جائے۔

ان دنوں مسلمانوں کی حالت عجیب تھی۔ جونہی وہ کشتیوں کو جوڑ کر

پل بنانے کی کوشش کرتے تیروں کی بارش ہونے لگتی اور جانی نقصان کر کے ناکام لوٹ آتے۔ ان دنوں عاصم بھی بہت بے چین تھا۔ عشق میں ناکام ہونے کے بعد اور گھر بار چھوڑ کر وہ اپنی ذات سے بھی بیگانہ ہو گیا۔ ان چند برسوں میں اسے بھول کر بھی اپنی ادھوری جوانی کا احساس نہ ہوا تھا۔ کسی کا حسن بھی اسے متاثر نہ کر سکا تھا مگر اب اسمہ کے انداز اسے مسلسل سوچنے پر مجبور کئے ہوئے تھے۔ کبھی وہ سوچتا کہ سلمیٰ عماد کی ہو چکی ہے اب اسمہ کو اپنانے میں کوئی حرج نہیں۔ کبھی وہ سوچتا کہ سلمیٰ کو فراموش کرنا ناممکن ہے مگر جب وہ جہاد سے فارغ ہو کر گھر جائے گا تو اسمہ اس کے اور سلمیٰ کے درمیان ایک آڑ ہو گی جس کے عقب میں وہ عماد اور سلمیٰ سے اپنے احساسات کو چھپا سکے گا۔ ان دنوں وہ رات دن اسمہ کے بارے میں سوچتا اور ایک دن یہ فیصلہ خود ہی خود ہو گیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

ہوا یوں کہ مسلمان فوجوں کا ایک دستہ کشتیوں کا پل جوڑ کر دریا عبور کر کے مشرقی کنارے پر پہنچنا چاہتا تھا کہ یک دم راجہ داہر کے مختلف جگہوں پر چھپے ہوئے تیر اندازوں نے تیر برسانے شروع کر دیئے۔ اس دستے کے ساتھ اسمہ کا باپ فرخ بھی تھا۔ ایک سنسناتا ہوا تیر آیا اور اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ اس کشتی میں شہید تو کئی مسلمان ہوئے تھے مگر اسمہ کی تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔ فرخ اس کا باپ بھی تھا اور ماں بھی۔ اب وہ بے آسرا ہو گئی تھی۔ باپ کا جتنا بھی غم کرتی کم تھا۔ اس رات عاصم اپنے خیالات میں گم اسلامی خیموں کے عقب میں چہل قدمی کرتا ہوا دور نکل گیا مگر ایک خیمے کے قریب وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ کوئی بڑے سے پتھر سے ٹیک لگائے دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھا تھا۔ عاصم آہستہ آہستہ قریب گیا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ یہ اسمہ تھی جو پہلے ایک طرز محبت کی آگ میں سلگ رہی تھی اور اب باپ کے غم نے اسے ہر طرف سے بے گانہ کر دیا تھا۔ عاصم نے دیکھا وہ ملول کامل کو تک رہی تھی۔ اس کا انداز اس درجہ حسرت ناک تھا کہ عاصم بے چین ہو گیا۔ چند منٹ وہ ساکت سا کھڑا اسے تکتا رہا مگر اسمہ کو جیسے

گرد وپیش کی بھی خبر نہ تھی یوں تو اس نے کئی بار اسے کھوئے کھوئے دیکھا
تھا مگر آج تو وہ قطعی دیوانی نظر آرہی تھی۔ عاصم کو خود بخود اپنے مجرم ہونے کا
احساس ہوا۔ اسے محسوس ہوا کوئی کہہ رہا ہے۔

"عاصم تم گناہ گار ہو، مجرم ہو، تم مسلسل اس کے جذبات مجروح کرتے
رہے ہو یہ جرم کبھی معاف نہیں ہو گا۔"

اس آواز سے بچنے کے لئے اس نے آہستہ سے پکارا ——

"اسمہ —— " وہ چونک پڑی، چند لمحے اسے دہشت ناک نظروں سے
دیکھتی رہی اور پھر رو دی۔ عاصم پشیمان سا ہو گیا۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ وہ اس
کے سامنے رو رہی تھی۔ عاصم نے آگے بڑھ کر اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا تو
ڈھلکتی ہوئی اسمہ بے سہارا سی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح اس کے بازوؤں میں گر
گئی۔ اسی لمحے ایک بہت بڑا فیصلہ ہو چکا تھا۔ عاصم ایک لڑکی سے جدائی
کے لئے دست بردار ہو چکا تھا مگر اب دوسری کو مایوس نہ کر سکتا تھا لہٰذا اسے
دن ہی اس نے امیر لشکر کی اجازت سے اس دیوانی سی لڑکی سے نکاح کر لیا۔
انہی دنوں حجاج بن یوسف کا مکتوب لے کر قاصد لوٹ آیا اس نے لکھا تھا
کہ اگر دریا عبور کرنے میں ابھی تک ناکام رہے ہو تو یہ کام اندھیری رات میں انجام
دو۔ مسلمانوں نے حکم کی تعمیل کی اور چاند کی آخری تاریخوں میں ایک
شب انھوں نے دریا پار کر لیا۔ یہاں حق و باطل کا زبردست مقابلہ ہوا۔ اس
لڑائی میں راجہ داہر قتل ہوا اور اس کی فوج پامال ہوئی۔ اس وقت تک عاصم
کی زندگی میں ایک ٹھہراؤ آ چکا تھا۔ اس نے مجاہدانہ زندگی کے ساتھ نئی
زندگی کا آغاز بڑے خلوص سے کیا تھا۔ یہ نہیں کہ اسے ماضی یاد نہ رہا تھا۔
سلمہ کی باتیں اس کی ہنسی سادہ لوحی اور محبت اسے سب اسی طرح یاد تھا جیسے
یہ سب کل کی ہی بات ہو مگر اب وہ ایک مجاہد تھا ایک شوہر تھا اور پھر ایک بچی
کی پیدائش نے اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ کر دیا۔ اس نے ہر چیز کو فراموش
کر کے خود کو فرائض کی انجام دہی کے لئے وقف کر دیا اور زندگی بڑے سکون سے
گزرنے لگی۔ وقت گزرتا رہا سورج ہر روز مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں ڈوبتا
رہا چاند ہر ماہ ایک خمیدہ لکیر کی شکل میں ظاہر ہو کر اپنا سفر شروع کرتا بڑھتے
بڑھتے ماہ کامل ہوتا اور پھر گھٹ کر اپنا سفر ختم کر دیتا اور ہر شب جھلملاتے
انجم تیں اور صبح کی روشنی میں غائب ہوتی رہیں۔ دن یونہی گزرتے گئے۔ بصرہ
سے آنے والے قاصد وہاں کی خبریں سناتے رہے ہر لمحہ نئے واقعات ظہور پذیر
ہوتے رہے۔ اس نے سنا کہ مادر کا انتقال ہو گیا۔ وہ آبدیدہ ہو گیا جس بستی
کے لئے گھر جانے کو طبیعت مچلتی تھی وہ ختم ہو چکی تھی جیسے اپنے گھر سے آخری
رشتہ بھی ٹوٹ گیا ہو۔ ان دنوں مسلمان وقت کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی سے
آگے بڑھ رہے تھے۔ راجہ داہر کی ایک رانی نے قلعہ راور میں فوج جمع کی تھی

محمد بن قاسم نے سنا تو اس قلعہ کا محاصرہ کیا اور سنگباری شروع کر دی۔ مسلمان
بھی اتنا کڑا لڑے حتیٰ کہ قلعہ کے برج ٹوٹ گئے۔ رانی اپنی خواصوں سمیت نذر
آتش ہو گئی اور قلعہ فتح ہو گیا۔ پھر مسلمانوں نے برہمن آباد کا رخ کیا جہاں پر
راجہ جے سنگھ مسلمانوں کو پسپا کرنے کے لئے فوجیں جمع کر رہا تھا۔ مسلمانوں نے
راستے میں بہرور اور دھلیلہ کے قلعے فتح کئے۔ برہمن آباد پہنچتے ہی شہر کا
محاصرہ کر لیا۔ جب محاصرہ نے طول کھینچا تو اہل شہر بہت گھبرائے آخر شدید
مزاحمت کے بعد وہ پسپا ہو گئے اور شہر پر محمد بن قاسم کا قبضہ ہو گیا۔ یہاں
سے مجاہدین بابیہ اور پھر ملتان پہنچے جن دنوں انھوں نے ملتان کے قلعہ
کا محاصرہ کیا انھیں سامان رسد کی کمی سے دو چار ہونا پڑا مگر ان کے پائے
استقلال میں لغزش نہ آئی آخر یہ شہر بھی فتح ہوا۔

ابھی مسلمان فتوحات میں مصروف تھے کہ خلیفہ ولید بن عبدالملک
کا انتقال ہو گیا اور اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک تخت خلافت پر متمکن
ہوا۔ اس کا اثر سندھ میں مصروف مجاہدین پر بہت برا پڑا۔ کیونکہ نئے خلیفہ
نے مزید پیش قدمی کے لئے روک دیا۔ پھر ۹۶ ہجری میں حجاج بن یوسف
کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت سلیمان بن عبدالملک نے پہلا کام یہ کیا کہ محمد بن
قاسم کو معزول کر کے واپس بلا لیا اور اس کی جگہ یزید بن ابی کبشہ کو مامور
کیا۔ اس وقت سندھ کے مسلمانوں کی حالت عجیب تھی محمد بن قاسم کا قصور
اتنا جرم تھا کہ اس کا چچا حجاج بن یوسف سلیمان کی تخت نشینی کے خلاف
تھا جس کی پاداش میں محمد بن قاسم بدترین موت مارا گیا۔ عاصم یہ سب خبریں
حیران ہو ہو کر سنتا اور پریشان ہو جاتا کیا ذاتی چپقلش کی وجہ سے مسلمان
حکمران ایسا بھی کر سکتے ہیں؟ سلیمان بن عبدالملک نے جو کچھ کیا تھا اس کے
بارے میں سن کر عاصم بالکل ہی دل برداشتہ ہو گیا۔ اب وہ اس سرزمین پر
جا کر کیا کرے گا جہاں نہ صرف محمد بن قاسم بلکہ موسیٰ بن نصیر اور طارق بن
زیاد کے ساتھ بھی اسی قسم کے سلوک کئے گئے تھے۔ یہ سب خبریں اسے مختلف
اوقات میں آنے والے ان سپاہیوں سے ملتی رہتی تھیں جو عراق آتے جاتے
تھے۔

سال پر سال گزرتے رہے عاصم کی جوانی ڈھل گئی۔ وقت کے ساتھ
ساتھ دنیا سے بیزار ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی اسمہ اس کی دلجوئی کرتی اور کبھی اس
کی تیرہ سالہ بیٹی حفصہ اس کے گھر کے بارے میں پوچھتی تو پرانے زخم ہرے
ہو جاتے، جوانی مٹ چکی تھی مگر درد و محبت کی خلش آج بھی محسوس ہوتی۔
وہ حفصہ کو تو ٹال دیتا مگر پھر مہینوں دل نہ سنبھال سکتا۔ پھر اس نے سنا کہ
حضرت عمر بن عبدالعزیز تخت خلافت پر متمکن ہوتے ہیں اور انھوں نے
خلافت راشدہ کی یاد تازہ کر دی ہے۔ وقت کچھ اور گزر گیا اب وہ جوانی کی

بڑا ہو چکا تھا۔ اس کی کنپٹیوں پر سفید بال چمکنے لگے تھے۔ سفر جاری ہو
گئی تھی تب اس نے ایک دن سنا کہ اس کا پیارا بھائی عماد ابن سلم شہید ہو
گیا ہے۔ اس دن وہ بہت اداس رہا۔ بچپن کی سینکڑوں باتیں اسے یاد
آئیں اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور اس وقت اس نے فیصلہ کیا کہ وہ واپس
اپنی بستی میں جائے گا۔ دوسرے دن اس نے رخت سفر باندھا اور عازم سفر
ہوا۔ جوں جوں منزل قریب آ رہی تھی عاصم کی بے تابی بڑھتی جا رہی تھی۔
آج ایک طویل مدت کے بعد وہ سلمہ کو دیکھنے والا تھا عاصم یہی کچھ سوچ رہا
سوچ رہا تھا۔ پھر وہ ٹیلے نظر آنے لگے جن کے پیچھے اس کا گھر تھا ایک
چھوٹا سا تالاب تھا، سب کچھ وہی تھا وہی ٹیلے وہی میدان، وہی راستے
گھر سے تھوڑے فاصلے پر تھا کہ اس نے دیکھا کہ اس کے گھر سے بے شمار بچے
نکل کر ادھر ادھر جا رہے ہیں۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک بچے سے پوچھا تو وہ
بولا "ہم اپنی معلمہ سے پڑھ کر واپس جا رہے ہیں" عاصم کو بڑی خوشی ہوئی
گھر گھر علم پہنچ چکا تھا پھر اس نے ایک بچے سے پوچھا۔
"اس گھر میں کون رہتا ہے؟" اس بچے نے سامنے سے آتے
ہوئے ایک سولہ سترہ سالہ لڑکے کی طرف اشارہ کیا عاصم حیران رہ گیا بالکل
عماد سے مشابہ یہ لڑکا اسی طرف آ رہا تھا۔ عاصم گھوڑے سے نیچے اترا اور
اس سے بولا "بیٹے تمہارا نام کیا ہے؟"
جناب مجھے سالم بن عماد کہتے ہیں۔ لڑکا بولا۔ عاصم کو بے حد
خوشی ہوئی وہ شفقت سے بولا۔
"میں تمہارا چچا ہوں" سالم حیرت و مسرت سے چند لمحے تکتا
رہا۔ پھر وہ دونوں بغل گیر ہو گئے۔ پھر سالم نے اسد اور حضرمہ کو بعد احترام
سواری سے اتارا اور وہ سب گھر کی جانب بڑھے۔
"گھر میں کون کون ہے؟" عاصم نے خواہ مخواہ ہی سوال کیا۔
"گھر میں ——— امی جان اور پھوپی جان"
"پھوپی جان؟" عاصم نے چونک کر دیکھا اس کے قدم لڑکھڑا
گئے تھے۔
"ہاں ہاں ——— سلمہ پھوپی"
عاصم کو محسوس ہوا کہ کسی نے اس کے سر پر پہاڑ دے مارا۔ اس کا
گلا خشک اور آنکھیں پھٹ گئی تھیں۔
"تو کیا بھائی جان نے سلمہ سے شادی نہیں کی تھی؟" اس نے
خود سے سرگوشی کی۔
"نہیں" سالم لاپرواہی سے بولا "پھوپی جان نے شادی نہیں کی
وہ معلمہ بن گئی ہیں"
تھوڑی دیر بعد وہ لڑکھڑاتے قدموں سے گھر میں داخل ہوا تو ایک
شفیق سی خاتون نے ان کی پیشوائی کی۔ یہ عماد کی بیوی تھی۔ پھر اس نے
دیکھا کہ سلمہ اپنے کمرے سے نکل کر آ رہی تھی اس کے بال سفید تھے اور لباس
بھی سفید، چہرے پر تقدس ہی تقدس تھا اس نے حیرت سے عاصم کو دیکھا
اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ پھر اسد اور حضرمہ کو دیکھا اور پھر عاصم کو مگر
اب ان کی آنکھوں میں چمک تھی نہ مسرت بلکہ دکھ تھا شکوہ تھا جیسے کہہ رہی ہو
"محبت مرد کے لئے ایک شغل مگر عورت کی زندگی کا روگ بن جاتی ہے"
عاصم کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ اس شب سلمہ نے وہ سرخ رومال عاصم کو
واپس لوٹا دیا جس میں وہ ہار رکھا تھا اور بولی۔
"آپ کی امانت محفوظ ہے آپ نے کہا تھا ناکہ ہاتھ مت لگانا میں
اپنی دلہن کو خود پہناؤں گا میں نے اسے آج تک نہیں چھوا"
عاصم کو محسوس ہوا کہ وہ مجرم ہے۔ اس نے ایک ایسا جرم کیا ہے
جو کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔ اگلی صبح سلمہ چپ چاپ آنکھیں بند کئے اپنے
بستر پر پڑی تھی بالکل اسی طرح جیسے بچپن میں عماد اور عاصم دونوں سے
ناراض ہو کر لیٹ جاتی تھی اور اس کی آنکھوں کے گوشے چپکے چپکے
بھیگتے رہتے تھے۔ پھر عماد اسے آ کر مناتا تھا مگر آج اسے منانے والا
کوئی نہ تھا۔ اسد نے آنسو خشک کرتے ہوئے ایک سفید چادر اس پر
ڈال دی۔ دفعتاً عاصم کو محسوس ہوا کہ اس کے کانوں میں کوئی سرگوشیاں
کر رہا ہے سالوں قبل کی پرانی باتیں دوہرا رہا ہے۔
"جب تک مجھے آس رہے گی آپ میرے ہیں میں آپ کا
انتظار کروں گی"
"اور جب یہ آس ٹوٹ جائے گی؟
تو کیا اس کے بعد بھی میں زندہ رہ سکوں گی؟"
"سلمہ ———" عاصم رو دیا۔
مگر اب اس پکار کا جواب دینے کے لئے سلمہ موجود نہ تھی۔
دوسرے دن بستی والوں نے دیکھا کہ بستی کی فرشتہ صفت نورانی
چہرے والی معلمہ کی قبر پر بے شمار تازہ پھول پڑے تھے مگر ان پھولوں
پر ایک بوڑھے مجاہد نے کاغذ سے بنے ہوئے پھولوں کا ایک پرانا ہار ڈالا
اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ———
اس کا دل خون ہو گیا تھا اور آنکھوں سے لہو کے آنسو ٹپک
رہے تھے۔

٭ کرشن چندر ٭

پھول صرف کیاریوں اور گملوں میں ہی نہیں اگتے، یہ دلوں میں بھی اُگتے ہیں،

"**تمھیں** کس طرح کا مکان چاہیئے؟"

کرائے کے مکان کے دلال نے مجھ سے پوچھا، وہ مجھ سے تم کہہ کر کبھی مخاطب نہ ہوتا لیکن اس نے میری بوسیدہ پتلون پر نظر ڈالی۔

"مجھے ایسا مکان چاہیئے جس میں کمرہ تو بے شک ایک ہو لیکن اس کے ساتھ غسلخانہ ہو، سامنے لان ہو، لان میں ہری گھاس ہو اور ہری گھاس کے کنارے پھول ہوں۔"

"پھولوں کے درمیان دھوپ کھانے والی چھتری ہو اور چھتری کے نیچے ایک حسینہ بیٹھی ہو۔" دلال نے تصویر مکمل کی۔ "مسٹر تمہیں مکان کی بجائے اپنی عقل کا بیمہ کرانا چاہیئے۔"

آدمی سمجھدار معلوم ہوتا ہے۔ میں نے مکان کے دلال کی طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھ کر سوچا۔

دلال نے میرے قریب آکر بہت آہستہ سے پوچھا

"کرایہ کیا دوگے؟"

"پچیس روپے؟"

"پچیس روپے؟" دلال زور سے چیخا۔ "پچیس روپے میں صرف گھاس آسکتی ہے مکان نہیں۔۔۔"

میں نے کہا

"میں نے تمھیں مکان دلانے کے تین روپے ادا کر دیئے، یہ بات تمھیں رقم وصول کرنے سے پہلے کہنی تھی، اب سیدھے سیدھے مکان دکھاؤ۔"

دلال تین روپوں کی رسی سے بندھا بندھا ایک اڑیل ٹٹو کی طرح چلنے لگا۔ میں نے سوچا ہر شخص کے گلے میں ایک رسی ہوتی ہے، تین روپے والی، تین سو روپے والی یا تین ہزار والی یا تین لاکھ وا لیکن رسی ہر ایک کے گلے میں ہوتی ہے یوں تو مجھے بھی اپنے گلے کے لئے ایک رسی کی تلاش تھی لیکن تین روپے والی نہیں پھانسی والی۔ میں مرجانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

چلتے چلتے میرے دل نے مجھ سے پوچھا

"جب تم مرجانے کا فیصلہ ہی کر چکے ہو تو مکان تلاش کر کی کیا ضرورت ہے۔"

میں نے اپنے دل سے کہا

"تم بیچ میں مت بولو، تمھاری وجہ سے اس حالت کو گیا ہوں، تمھاری وجہ سے میں نے غلط عورت سے محبت کی پہلے

غلط پیشہ اختیار کیا۔ اپنے دوست غلط چنے ساری عمر غلط ڈگرے پر چلا۔ اب تم میرے اور میری موت کے درمیان بولنے والے کون ہوتے ہو۔؟"

"میں بولتا کہاں ہوں؟" دل نے کہا۔ "انتہائی انکساری سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر جب مرنا ٹھہرا تو مکان تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے کیوں نہ ایک پیڑ تلاش کر لیا جائے، ایک دریا، ایک جھیل یا ریل گاڑی کا پہیہ یا کوئی تیز سا چمکتی چھرا زہر۔؟"

"تم بڑے احمق ہو۔" میں نے دل سے کہا۔ "آج تک تم مجھے نہ سمجھ سکے مجھ جیسا انسان ایک عامیانہ اور سستی قسم کی موت کیسے مر سکتا ہے۔ میں ایک بہار آفریں موت چاہتا ہوں، ایک خوبصورت کمرہ لیمپ شیڈ کی مدھم مدھم سنہری روشنی میں میرے ہاتھوں میں چھلکتا ہوا جام چھت کے پنکھے کے ہک سے لٹکتی ہوئی ریشمی ڈوری میں میرا جھولتا ہوا جسم اور کھڑکی سے باہر ایک خوبصورت لان، لان میں ہری ہری گھاس، گھاس کے کنارے پھول، دھوپ کھانے والی چھتری کے نیچے بیٹھی ہوئی حسینہ چاہے وہ ہمسائے کی بیوی کیوں نہ ہو۔"

"رات کو دھوپ کہاں سے آئے گی اور وہ حسینہ رات کے وقت کھلی چھتری میں کیونکر تمہارے لئے منتظر رہے گی۔؟"

دل نے پوچھا

دل چپ ہو گیا

سامنے ایک مکان بھی آ گیا

عمدہ مکان تھا، ایک لمبے چوڑے زینے پر چڑھ کر پہلی منزل پر ایک خوبصورت سا کمرہ تھا۔ ہر دیوار کا رنگ الگ الگ تھا گہرے گولڈن، نارنجی، قرمزی، دیوار گیر وارڈ روب نیلے پتھر والا آتش دان ایک ملحقہ کمرہ اور بھی تھا جو دیواریں زرد، گلابی، بنفشی اور مدھم رنگ کی اس کمرے کے ایک طرف باتھ روم بنی ہوئی تھی اس سے ملحق ایک اور کمرہ تھا۔ اس میں دو وارڈ روب تھے، ایک میرے لئے اور ایک میری بیوی کے لئے، دیوار گیر آئینے تھے، پہلے دو سال عشق کرنے کے لئے اور اس کے بعد ساری زندگی منہ چڑانے کے لئے میں فرش پر لٹے سلیپر پیٹی کوٹ اور بچے کی..... کا تصور کرنے لگا یہ تصور اس قدر خوش آئند تھا کہ میں جلدی سے دروازہ کھول کر ملحقہ غسل خانہ میں داخل ہو گیا۔

غسلخانہ بہت بڑا، صاف اور ستھرا تھا، فرش پر سفید ٹائلیں دیواروں پر ہلکے نیلے رنگ کی ٹائلیں، ہرے رنگ کا واش بیسن اور اسی رنگ کا باتھ ٹب، سامنے کھڑکی سے نچلی منزل کا برآمدہ اور برآمدہ سے باہر کا لان نظر آتا تھا جس پر ہری ہری گھاس کے کنارے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس کے قریب سات رنگوں والی دھوپ کی چھتری کے نیچے

ایک ستره اٹھاره برس کی حسینہ دنیا کا عظیم ترین ادب یعنی جاسوسی ناول پڑھ رہی تھی۔

میں نے خوش ہو کر کہا

"آہا خودکشی کرنے کے لئے کتنی اچھی جگہ ہے۔" پھر میں نے فوراً مڑ کر دلال سے پوچھا

"اس کا کرایہ کتنا ہوگا؟"

"چار سو روپے"

"احمق — !" میں نے برافروختہ ہو کر کہا۔ "میں نے تم سے پچیس روپے والا مکان دکھانے کو کہا تھا!"

دلال مجھ سے کچھ کہے بغیر سیڑھیاں اتر گیا۔

دوسرا مکان جو دلال نے مجھے دکھایا وہ بھی اچھا خاصا تھا پہلے مکان کا ساز و سامان تو اس میں نہ تھا نہ وہ تازہ وادا کی کیفیت، نہ دیواروں کا وہ رنگ و روپ مگر عمدہ اور صاف ستھرا ضرور تھا، کمرے صرف دو تھے اور دونوں صرف ایک ہی غسلخانے میں کھلتے تھے ایک طرف کچن تھا، کچن سے باہر برآمدہ اور برآمدے کے نیچے ایک خوشنما صحن میں ہری ہری گھاس اگی ہوئی تھی

"اس میں پھول کہاں ہیں؟" میں نے دلال سے پوچھا

"پھول خود اگا سکتے ہو" وہ بولا۔ "دھوپ والی چھتری خرید سکتے ہو، چھتری کے نیچے کسی حسینہ کی بجائے تم اپنی بیوی کو بٹھا سکتے ہو۔"

"پھول اگانے کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "دھوپ والی چھتری کے لئے میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور بیوی . . . ؟ میاں! بیوی میرے پاس ہوتی تو میں مکان ڈھونڈتا؟ اچھا خیر جس کام کے لئے مجھے مکان چاہیئے یہ بھی ٹھیک رہے گا۔ میں گھاس پھوس کا ایک گملا رکھ دوں گا۔ گملے کے اوپر ایک دھوپ والی چھتری کے بجائے اپنی بوسیدہ کالی چھتری رکھوں گا اور اس کے اندر ایک حسینہ کا تصور بھی کروں گا مگر اس کا کرایہ کیا ہوگا؟"

"ڈھائی سو روپے۔"

"احمق ڈھائی سو روپے والا مکان کیوں دکھاتے ہو، صرف پچیس روپے والا مکان چاہیئے۔"

دلال نے میری بات کا جواب نہ دیا چپکے سے مکان کے باہر ہو گیا۔

تیسرا مکان جو میں نے دیکھا اس میں سب سے پہلے غسلخانہ آتا تھا۔ پھر سیڑھیاں چڑھ کر ایک کمرہ آتا تھا کمرے سے ملحق ایک کچن تھا حالانکہ غسلخانہ ہونا چاہیئے تھا۔

"اس علاقے میں جتنے مکان بنے ہوئے ہیں ان میں رہنے والے کمرے کے ساتھ ہی کچن رکھا گیا ہے اور غسلخانہ سیڑھیوں میں۔"

"وہ کیوں۔"

"وہ اس لئے کہ عورت کچن میں رہ کر ہر وقت اپنے شوہر پر نظر رکھ سکتی ہے۔ دیکھو اس کچن کے ساتھ والا کمرہ نیچے جانے والی سیڑھی کے سامنے کا غسلخانہ تک نظر آتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "خیریت گزری، میں نے کبھی کوئی بیوی نہیں پالی اس لئے میں کسی کی نگہبانی سے نہیں ڈرتا۔ رہا غسلخانے کے دور ہونے کا سوال تو میرا کیا ہے، میں غسلخانے کو کچن اور کچن کو غسلخانے کے طور پر استعمال کر لوں گا۔ مجھے تو دونوں ایک ہی طرح کے بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

دلال نے میری فراست کی داد دیتے ہوئے کہا۔

"وہ آپ جانیں اور مالک جانے اگر یہ مکان آپ کو پسند ہے تو نکالئے سو روپے؟"

"سو روپے!؟" میں نے چیخ کر کہا۔ "سو روپے؟"

"سو روپے اس کا ماہانہ کرایہ ہوگا۔"

"ارے بھائی۔" میں نے ہاتھ جوڑ کر دلال سے کہا۔ "میں نے تمہیں صرف پچیس روپے والا مکان دکھانے کو کہا ہے اور تم ہو کہ سینکڑوں کی بات کرتے ہو۔"

دلال نے کہا۔ "میرا کام تو آپ کو مکان دکھانا ہے کیا معلوم کہ آپ کو کون سا پسند آجائے یہاں میں نے اکثر لوگوں کو دیکھا ہے کہ پچیس روپے والا مکان ڈھونڈنے آتے ہیں اور چار سو روپے والا مکان لے لیتے ہیں ایسے بھی دیکھے ہیں کہ چار سو روپے والا مکان لینے نکلتے ہیں اور پچیس روپے والے مکان پر قانع ہو جاتے ہیں، گاہک کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔"

اب وہ دلال جس بلڈنگ کے اندر مجھے لے گیا وہ پانچ منزل والی اور جہاز نما تھی اس کی کنکریٹ کی چھت کے چھجے پر ایک دخانی جہاز کی تصویر بنی ہوئی تھی اور اس پر لکھا تھا۔ S. S. ATMARAM

دلال نے کہا۔ "اس بلڈنگ کے اندر گوشت کھانا منع ہے، پیاز کھانا منع ہے، شراب پینا منع ہے۔"

"یوں تو بیوی کے ساتھ رہنا بھی منع ہوگا؟" میں نے پوچھا

دلال نے میری طرف حیرت سے دیکھا

کی بیوی اپنی بک بک سے تھکے ہارے شوہر کا دماغ پریشان کر رہی تھی۔ شوہر خاموشی سے اس کی فضول بکواس سن رہا تھا۔ جب جواب کچھ بھی نہ ملا تو بیوی بری طرح سے جھنجلا گئی۔

غصے سے بولی۔ "آخر تم بولتے کیوں نہیں؟ کیا سوچ رہے ہو؟"

شوہر نے سر کھجا کر سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں یہ حساب لگا رہا ہوں کہ اگر تم اپنے میکے سے اتنے لفظوں کا تار دیتیں تو تمہارے باپ کو دو سو پچھتر روپے بارہ آنے صرف کرنا پڑتے۔"

"پھر میاں سوچنا بھی منع ہوگا، آسمان کی طرف تکنا بھی منع ہوگا، بستر پر اوندھے لیٹ کر سگریٹ پینا بھی منع ہوگا، کندھے پر تولیہ ڈال کر اور دروازے پر کھڑے ہو کر سیڑھیوں سے اترتی ہوئی کسی شوخ و شنگ حسینہ کو دیکھنا بھی منع ہوگا۔ مسٹر میں مکان دیکھنے آیا ہوں ونوبھاوے کے آشرم میں داخلہ لینے نہیں آیا۔"

یہ کہہ کر میں مکان سے باہر آ گیا۔

اب دلال مجھے جس مکان میں لے گیا وہ واقعی پچیس روپے والا مکان معلوم ہوتا تھا، نہ لان، نہ گھاس، نہ پھول، چوتھی منزل پر ایک کمرہ تھا۔ کھڑکیوں پر لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں تاکہ مالک مکان کے تقاضوں سے گھبرا کر کرایہ دار کھڑکی سے نہ کود جائے دیواروں پر بتیس برس پرانی سفیدی تھی جو اب سیاہی میں تبدیل ہو رہی تھی چھت کے سیاہ جالوں کے درمیان ایک بجلی کا پرانا پنکھا لٹک رہا تھا۔ میں نے بھی اپنے تصور میں منظور کر لیا تھا کہ چلو لان نہ سہی، گھاس نہ سہی، پھول نہ سہی، حسینہ نہ سہی اس کمرے میں پنکھے کا ہک تو ہے جس سے لٹک کر جان تو دی جا سکتی ہے"

"مگر غسل خانہ کہاں ہے؟"

"وہ سامنے ہے۔" دلال نے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔

میں جلدی سے غسل خانہ میں گھسا۔ غسل خانے میں ایک بڑی بڑی آنکھوں والی لحیم شحیم عورت ذبح شدہ مرغی کے پر نوچ رہی تھی مجھے دیکھ کر وہ غنچہ دہن ہنس دی اور جب اس کا موٹے موٹے کالے ہونٹوں والا اٹھارہ انچ لمبا غنچہ کھلا تو مجھے اس کے اندر پان کی پیک میں رنگے ہوئے دانت بہت خوفناک دکھائی دئے۔ میں گھبرا کر پیچھے لوٹنے ہی والا تھا کہ اس کافر ادا نے کولہے مٹکا کر کہا۔

"تم نئے کرایہ دار معلوم ہوتے ہو۔"

"معلوم ہوتا ہوں کہ نہیں البتہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ غسل خانہ کس کا ہے؟ آپ کا یا میرا؟"

"ہم دونوں کا ہے، میرا بھی اور تمہارا بھی۔"

"تمہارا بھی اور میرا بھی۔" اس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ جیسے میرا اور اس کا زندگی بھر کا رشتہ پکا ہو گیا ہو۔ میں نے گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹایا اس نے فوراً ایک قدم آگے بڑھا کر کہا۔

"تم آجاؤ، فکر نہ کرو، مل جل کر گزارہ کر لیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی، میں گھبرا کر دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے مرغی کا آخری پر زور سے نوچ کر اپنے منہ میں لے لیا اور اس سے دانت صاف کرتے ہوئے بولی۔

"اب پچاس روپے میں مالک مکان کمرے کے ساتھ الگ غسل خانہ دینے سے تو رہا۔"

میں نے بلڈنگ سے باہر آ کر دلال سے کہا۔

"اگر تم مجھے پچیس روپے والا مکان نہیں دکھا سکتے تو میرے تین روپے واپس کر دو۔"

دلال نے کہا

"شریفوں کے علاقے میں تو پچیس روپے والا مکان نہیں مل سکتا ہاں اگر آپ کو گندی بستی میں رہنے پر اعتراض نہ ہو تو میں آپ کو پچیس روپے والا مکان دکھا سکتا ہوں۔"

"چلو چلو۔ مکان دکھاؤ، باتیں نہ بناؤ۔"

وہ مجھے گندی بستی میں لے گیا جو شہر کا سب سے زیادہ گندہ علاقہ تھا جہاں شہر کے نہایت غریب لوگ رہتے تھے جہاں تنگ گلیاں تھیں غلاظت کے انبار تھے، کھلی موریاں تھیں۔

نکڑ پر اس نے گندی بستی کے دلال کو لے جا کر کچھ باتیں کیں اور پھر دونوں مل کر میرے پاس آئے اور میرے دلال نے مجھ سے کہا۔

"اس بستی میں پچیس روپے والا مکان نہیں ہے۔"

"تو پھر کس کرائے کا مکان ہے؟"

"سولہ روپے والا مکان ہے۔"

"تو سولہ روپے والا ہی دکھاؤ۔"

"سولہ روپے والا مکان بھی خالی نہیں ہے البتہ ایک ہے وہ تمہارے لائق نہیں ہے۔"

"میرے لائق کیوں نہیں؟" میں نے گندی بستی والے دلال کی جانب دیکھ کر پوچھا۔

"گندی بستی کے کرایہ دار نے تھوڑی کھجا کر کہا "صاحب اس کھولی کا کرایہ دار کل ہی مر گیا۔"

"تو بہت اچھا ہے کھولی خالی تو ہو گئی؟"

"ہاں خالی تو ہو گئی صاحب۔" گندی بستی کا دلال اپنی کمنی کھجا کر بولا۔ "مگر وہ کرایہ دار اپنی ہی طرح غریب مجدور تھا اور چوڑیوں کے کارکھانے میں کام کرتا تھا۔"

"مزدور تھا تو کیا ہوا آخر وہ چوڑیاں بناتا تھا، چوریاں تو نہیں کرتا تھا؟"

"نہیں صاحب، یہ بات نہیں۔" گندی بستی کا دلال اپنی کمر کھجاتے ہوئے بولا۔ "تھا تو چوڑی بنانے والا مگر دھونکنی دھونکتے دھونکتے اور جلتی ہوئی ریت پھانکتے پھانکتے وہ بیمار ہو گیا۔"

"تو اس میں کیا ہے ہر آدمی اپنی زندگی میں بیمار ہوتا ہے اور کسی نہ کسی وجہ سے بیمار ہوتا ہے چاہے وہ ریت پھانکنے سے ہو یا زیادہ کھانے سے بیمار ہو۔"

"تم سمجھتے نہیں صاحب!" گندی بستی کا دلال اپنی ران کھجاتے ہوئے بولا۔ "بات اصل میں یہ ہے کہ اس کو بخار ہو گیا تھا جس کو تم لوگ تپ دق بولتے ہو اور وہ اس کھولی میں پانچ سال بیمار رہا اور کام کرتا رہا اور اپنے جینے کے لئے لڑتا رہا کیونکہ اس کے چار بچے تھے اور ایک بیوی تھی جب وہ مر گیا تو اس کی بیوی اور بچے کھولی خالی کر گئے کیونکہ وہ سولہ روپے کرایہ نہیں دے سکتے تھے وہ شہر کے باہر جھونپڑوں میں چلے گئے جہاں اونٹ ڈھونے والے رہتے ہیں اس لئے میں تم کو بولتا ہوں کہ یہ کھولی خالی تو ہے پر تمہارے لائق نہیں۔"

چھوٹی سی کھولی تھی، تاریک دیواریں، چرچراتا ہوا دروازہ، زنگ آلود کنڈی، کھڑکی کی زنگ آلود سلاخیں اور ان آہنی سلاخوں کے باہر گندی اینٹوں والی موری، میں نے باہر سے نظر ہٹا کر پھر اندر دیکھا تو ایک کونے میں پانی کا نل نظر آیا جس کے منہ میں میلی دھجیاں ٹھونسی گئی تھیں پھر بھی ان دھجیوں کے سرے سے پانی سبزی مائل فرش پر ٹپ ٹپ گر رہا تھا جیسے خون زخم سے بہتا ہو۔

پھر مجھے کونے میں مٹی کا ایک گملہ نظر آیا جس میں گلاب کی شاخ پر صرف ایک پھول تھا... گلاب کا ایک بڑا سرخ پھول۔

"یہ کیا ہے؟"

گندی بستی کا دلال اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر ہنستا ہوا بولا۔

"یہ تمہارے لئے ہے صاحب۔"

"میرے لئے؟" میں نے حیرت سے پوچھا

"ہاں صاحب!" دلال نے کہا۔ "مرتے سمے مرنے والے نے کہا تھا جو کوئی میری جگہ آئے اس کمرے میں اسے یہ گملہ دے دینا اور اسے یہ بولنا کہ ہر روز اس کی مٹی میں پانی دے جس سے یہ گلاب کا پودا ہرا رہے۔ پگلا تھا وہ۔"

یکایک میرے سارے بدن میں جھرجھری سی دوڑی اور مجھے کانپتا ہوا چھوڑ گئی۔ میں ان تاریک دیواروں میں گھرے ہوئے اس گلاب کے پھول کو تکنے لگا، چاروں طرف گھٹن اور سیلن اور نا امیدی اور یہ پھول اکیلا اندھیرے میں اور گندگی میں اور بدصورتی میں اور بھوک میں، یہ پھول اکیلا ننگی اینٹوں والے علاقے میں، مکڑی کے لٹکتے ہوئے غلیظ جالوں میں، زنگ آلود آہنی سلاخوں کے درمیان یہ پھول کھلا، انسان کے دل میں اگتا ہوا اور انسان کے حوصلے اور بہادری اور عظمت کی طرح سر بلند فطرت سے لڑتا ہوا، موت پر ہنستا ہوا، لیکن پھول مر جائے گا۔

ایک دن یہ پھول مرجھا جائے گا۔ میں نے سوچا اس کھولی کی غلیظ گھٹن اس کی ساری شادابی چوس لے گی تاریکی اس کا رنگ و روپ چھین لے گی اس پر مکڑی کے جالے پھیل جائیں گے اور یہ سیلی ہوئی دیواریں چاروں طرف سے تازہ ہوا کو روکے رہیں گی اور یہ پھول مرجھا جائے گا۔ جیسے وہ چوڑی والا مزدور مر گیا تھا لیکن یہ پھول زندہ رہے گا اور ہر روز لاکھوں کروڑوں آدمیوں کے دلوں میں کھلے گا جو چوڑی بناتے ہیں، دفتر جاتے ہیں، کرگھا چلاتے ہیں اور اینٹ پہ اینٹ اس طرح جوڑ کر رکھتے ہیں جس طرح محبت کرنے والا انسان بوسے پر بوسہ رکھتا ہے۔ یہ پھول ہر روز ان انسانوں کے دلوں میں اگے گا اور زندگی اور مسلسل جدوجہد کا جادو جگائے گا۔ ۔ ۔ ۔

یہ پھول مر نہیں سکتا

میں نے وہی کھولی کرائے پر لے لی اور اس دن سے وہیں رہتا ہوں۔

** احمد فراز

کشیدہ سر سے توقع عبث جھکاؤ کی تھی
بگڑ گیا ہوں کہ صورت یہی بناؤ کی تھی

وہ جس گھمنڈ میں بچھڑا قلق تو اس کا ہے
کہ ساری بات محبت میں رکھ رکھاؤ کی تھی

سبھی نے حرف و سخن کو لہو دیا لیکن
غزل میں بات تیرے درد کے رچاؤ کی تھی

وہ مجھ سے پیار نہ کرتا تو وار کیا کرتا
کہ دشمنی میں بھی شدت اسی لگاؤ کی تھی

چراغ جاں کو کہاں تک بچا کے ہم رکھتے
ہوا بھی تیز تھی منزل بھی چل چلاؤ کی تھی

فراز دردِ طلب بھی سراب ہی نکلا
وفا کی لہر بھی جذبات کے بہاؤ کی تھی

اکیلے پار اتر کے یہ ناخدا نے کہا
مسافرو یہی قسمت شکستہ ناؤ کی تھی

میں زندگی سے نبرد آزما رہا ہوں فراز
میں جانتا تھا یہی ایک راہ بچاؤ کی تھی

اور ہاں تو عطیہ خان آج صبح ناشتے پر مجھے نہ پاکر تم کس قدر حیران ہوگی اور شاید فریحہ خان بھی اپنے بائیں ہاتھ والی خالی کرسی دیکھ کر اپنی بھوری آنکھوں کو بار بار جھپکتے ہوئے اور اپنے کٹے ہوئے سنہرے بالوں کو ایک جان لیوا انداز سے پیچھے جھٹک کر معنی خیز نظروں سے تمہاری طرف دیکھے گی اور تم گھبرا کر نگاہیں جھکا لو گی۔ بے چاری فریحہ جس کی اونچی ہیل والی سینڈل ٹیبل کے نیچے سے ہمیشہ ہی میرے پاؤں کچلتی رہتی تھی آج مجھے نہ پاکر کس قدر اداس ہوگی (درحقیقت بھابی میز پر جھک کر فریحہ سے سرگوشی کریں گی (جو سرگوشی ہرگز نہیں ہوگی) "آج ناصر فرمان نہیں آیا۔"

"ہوں" بڑے بھیا تیزی سے سینڈوچ نگلتے ہوئے سر ہلانے کی کوشش کریں گے اور بھابی بیگم کی نظریں سب پر سے ہوتی ہوئی مایوس ہو کر اپنی پلیٹ پر جھک جائیں گی اور تب حسب معمول سب سے آخر میں منصور اندر داخل ہوں گے اور میرے بائیں ہاتھ والی کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے رک جائیں گے اور ان کی بھاری آواز کمرے کے سکوت کو توڑ دے گی۔

"یہ آج ناصر کہاں رہ گیا۔"

"خان بہادر صاحب تیکھی نظروں سے انہیں دیکھیں گے اور تم تم عطیہ خان ——۔ تمہارے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی پیالی کانپ کانپ جائے گی۔ تمہاری نگاہیں بے اختیار بھٹکنے لگیں گی اور تب منصور انہی قدموں سے واپس لوٹ کر میرے کمرے کی طرف آئیں گے۔

"ارے یار ناصر باہر نکلو۔ آج کیا جاگنے کا ارادہ نہیں۔"

لیکن ناصر تو کبھی کا جا چکا ہوگا عطیہ خان اور میرا خالی کمرہ دیکھ کر منصور کی شربتی آنکھوں کے سرخ ڈورے اور گہرے ہو جائیں گے۔ وہ بوکھلا کر ادھر ادھر جھانکیں گے اور پھر جونہی پیپر ویٹ کے نیچے دبا ہوا یہ ننھا سا نیلا کاغذ نظر پڑے گا وہ اسے اٹھا کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے پڑھنے کی کوشش کریں گے۔

منصور!

تم سے ملے بنا جا رہا ہوں دوست: معاف کر دینا میں سعدیہ کے پاس جا رہا ہوں تاکہ اس کا معصوم سا دل ٹوٹ نہ جائے۔ وہ سنہرے سپنے جو ان سات سالوں میں میں نے دیکھے سارے کے سارے یہیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ دعا کرنا دوست کہ میں سپنوں کے اس سنہرے جال کو توڑ سکوں جس نے مجھے مسلسل سات برس تک الجھائے رکھا۔"

تب صاحبزادہ منصور نڈھال اور افسردہ تھکے تھکے قدموں سے ڈرائنگ روم میں آئیں گے۔ تم جواب طلب نظروں سے انہیں دیکھو گی اور وہ ہاتھ میں پکڑے نیلے کاغذ کے پرزے کو تمہاری گود میں پھینک دیں گے اور تم شاید ساری جان سے لرز جاؤ گی لیکن یہ کتنی عجیب بات ہے عطیہ خان کہ اس خط میں میں نے تمہارے لئے کچھ نہیں لکھا۔ ایک لفظ بھی نہیں۔ جانے کیوں۔ ہاں تو عطیہ خان منصور بغیر ناشتہ کئے ہی چل دیں گے اور تم —— تم شاید اس بے لذت ناشتے کے بعد چھوٹے چھوٹے قدموں سے میرے کمرے میں آؤ۔ سب کچھ وہی ہوگا عطیہ خان سب کچھ وہی ہوگا لیکن میں نہیں ہوں گا —— میں ناصر فرمان لیکن میری اہمیت ہی کیا ہے۔ ایک بڑا معمولی سا بے حد عام سا انسان!

تیز ہوا کے برفیلے جھونکوں سے اس کے رگ و پے میں ایک عجیب سنسنی سی پیدا ہونے لگی تو اس نے کھڑکی کے پٹ ہولے سے بند کر دیئے —— ہاں تو عطیہ خان یہ رہی میری اہمیت۔ یوں بھی اس گھر میں میں ایک ناقابل چیز تھا جس کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ ہولے ہولے چلتا ہوا ہیٹر کے پاس رک گیا اور اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھوں کو گرماتے ہوئے اس نے سوچا ممکن ہے یہ سب کچھ نہ ہو اور عطیہ خان حسب معمول ڈرائنگ روم سے نکل کر اپنی اونچی ہیل سے فرش کو بجاتی اپنی بادامی مرسڈیز میں بیٹھ کر یونیورسٹی چل دے لیکن عطیہ خان اپنی کلاس کو لیکچر دیتے وقت تمہاری آواز کپکپا نہیں جائے گی۔ اپنے کولیگز کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے (تم جو یونیورسٹی میں واحد خاتون پروفیسر ہو اور تمہارے نام کے ساتھ نہ جانے کتنی ڈگریاں چپکی ہوئی ہیں) کیا تمہاری آنکھوں میں نمی نہیں تیر جائے گی۔ کیا تمہیں یہ خیال نہیں آئے گا عطیہ خان کہ میں —— میں ناصر فرمان آج تمہاری دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا ہوں کبھی لوٹ کر نہ آنے کے لئے۔ میں —— جس نے تم سے پیار کیا، تمہیں چاہا، اس طرح جیسے کوئی چاہت کا مارا پجاری کسی دیوی کی پرستش کرتا ہے —— ہاں عطیہ خان ذرا اپنے دونوں کان کھول کر سن لو۔ میں نے تو اپنی چاہتوں کی ساری کلیاں یکبارگی تمہارے چرنوں میں ڈال دی تھیں اور اب جبکہ میں سعدیہ کے پاس جا رہا ہوں بالکل تہی دامن ہوں۔ سعدیہ کو دینے کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہیں لیکن وہ پھر بھی خوش ہے بہت خوش۔ اور ہاں عطیہ خان یہ مجوزہ خبر تم سب کے لئے کتنی دھماکہ خیز ثابت ہوگی کہ میں سعدیہ سے شادی کرنے والا ہوں۔ میں ناصر فرمان جو گزشتہ سات برس سے عطیہ خان کے عشق میں بری طرح مبتلا رہا اور جس نے ان سات سلگتی ہوئی برساتوں کا ایک ایک لمحہ عطیہ خان تمہاری پوجا میں گزارا اب سعدیہ

سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔ ہے نا عجیب اور دھماکہ خیز بات۔ سعدیہ بہت خوش ہے۔ عطیہ خان شاید یہ بھی خوش ہوں لیکن پھر یہ دل کیوں ٹوٹا ٹوٹا بکھرا بکھرا سا لگ رہا ہے۔ وہ ہیٹر کے پاس سے ہٹ کر پھر دریچے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ باہر چاندنی اسی طرح چھٹکی ہوئی تھی سفید سفید ٹھنڈی ٹھنڈی سی چاندنی نیچے برآمدے میں اتر آئی تھی اور کوئی دم میں دریچے کی راہ عطیہ خان کے کمرے میں بکھر بکھر جانے کی کاش میں بھی اسی چاندنی کا ایک حصہ ہوتا —— اس نے دریچے سے باہر جھانکتے ہوئے سوچا —— ہاں تو ناصر فرمان اگر میں سچ مچ اس چاندنی کا ایک حصہ ہوتا تو اس وقت دریچے کی راہ اداس اداس کرنوں کی صورت میں عطیہ خان کے کمرے میں اتر جاتا اور عطیہ خان کے خوبصورت ہونٹوں پر دمکتی ہوئی مسکراہٹ کو ہولے سے چوس لیتا۔ اس نے سرد دریچے کے پٹ ایک بار پھر کھول دیئے تیز ہواؤں کی سرد لہریں موج در موج اندر گھس کر جب اس کے چہرے سے ٹکرائیں تو اسے بے حد طمانیت محسوس ہوئی اس کا جی چاہا کہ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل جائے اور کسی انجانی منزل کی طرف چلتا رہے۔ سرد ہواؤں کے یہ تھپیڑے اس کے سینے کی دیوار سے ٹکرا ٹکرا کر واپس لوٹ کر جاتے رہیں اور وہ یونہی چلتا رہے —— یہ کیسی آگ ہے ناصر فرمان جس نے تمہارے اندر اتنی گرمی، اتنی تپش پیدا کر دی ہے کہ جنوری کی یہ سرد ہوائیں بھی اس آگ، اس تپش کو ٹھنڈا نہیں کر پا رہی تھیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ناصر فرمان کہ تم عطیہ خان سے جدا نہیں ہونا چاہتے۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اوہ میرے معبود۔ کیا میں عطیہ خان کو کبھی نہ بھول سکوں گا۔ وہ عطیہ خان جسے میں مسلسل سات سال تک پوجتا رہا اور آج سے ٹھیک پورے سات سال پہلے وہ بھی جنوری کی ہی ایک سرد رات تھی جب میں خان بہادر عمران احمد کے ساتھ اس وسیع کوٹھی کے پورچ میں کھڑا حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ جنوری کی سرد سرد بوکھلائی ہوئی ہوائیں بالکل آج ہی کی طرح یوکلپٹس، بادام اور خوبانی کے پتوں سے گلے مل مل کر سسکیاں لے رہی تھیں۔ خان بہادر صاحب نے کار کو لاک کر کے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا تھا اور میں نگاہیں جھکائے اپنی ہی سوچوں میں گم ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا تھا۔

"ان سے ملو یہ تمہاری تائی اماں ہیں۔" خان بہادر صاحب کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں نے گھبرا کر جلدی سے نگاہیں اٹھائیں۔

"آداب!"

"جیتے رہو بیٹے۔ فرمان سے بہت مشابہ ہے۔"

وہ فوراً ہی خان بہادر صاحب کی طرف متوجہ ہو گئیں

بس یونہی کھڑی رہیے میں ایسے بھی معائنہ کر لوں گا

انہوں نے مضطرب سا ہو کر میری طرف دیکھا اور میری آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ میں نے پلکیں جھپک کر تائی اماں کی طرف دیکھا۔ ہلکے فیروزی رنگ کی ساڑی، گردن سے ذرا اونچا جوڑا، گلے اور کانوں میں ہلکا جگمگاتا ہوا زیور —— تو یہ ہیں تائی اماں جن کے متعلق میرا خیال تھا کہ وہ چادر میں لپٹی لپٹائی بے حد دقیانوسی قسم کی خاتون ہوں گی۔ دراصل ابا نے مجھے اپنے خاندان کے متعلق بہت کم بتایا تھا۔ میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا تھا کہ غیر خاندان میں اپنی مرضی سے شادی کرنے کی وجہ سے ابا کو جائیداد سے عاق کر دیا گیا تھا۔ امی کی زندگی نے بھی ان کے ساتھ وفا نہ کی اور میں بچپن ہی میں ماں کی شفقت سے محروم ہو گیا۔ چند روز بعد ابا بھی ساتھ چھوڑ گئے۔ مرنے سے قبل انہوں نے خان بہادر صاحب کو بلوایا تھا وہ ان کا تار ملتے ہی ہاسپٹل پہنچ گئے اور تب ابا نے ان سے کہا۔

"بھائی جان میں نے آپ کو اس لئے زحمت دی ہے کہ آپ ناصر کو اپنی سرپرستی میں لے لیں۔"

"تم بے فکر رہو فرمان یہ میرا ہی بیٹا ہے۔"

ابا کی بجھی بجھی آنکھوں میں چمک سی آ گئی اور چہرہ پرسکون ہو گیا اسی شام وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اور آج میں خان بہادر کے ساتھ یہاں چلا آیا تھا۔ جہاں کا ایک ایک ذرہ میرے لئے اجنبی اور بیگانہ تھا۔ میں بہت بے چین اور مضطرب سا ہو رہا تھا فوراً ہی بیگ زمین پر رکھا اور خان بہادر صاحب

کی طرف دیکھا جو نہ جانے کیا سوچ رہے تھے اپنی طرف دیکھتا پاکر وہ زیر لب بڑبڑائے۔

"باقی لوگوں سے تو صبح ہی ملاقات ہو سکے گی۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ میں بے حد تھکا ہوا تھا اور آرام کرنا چاہتا تھا۔ تب ہی خان بہادر صاحب نے گھنٹی بجا کر نوکر کو بلایا اور کہا۔

"انہیں اپنا کمرہ دکھا دیجئے۔"

میں شب بخیر کہہ کر اس کے پیچھے ہی چلا آیا۔ کمرہ بہت نفاست سے سجا ہوا تھا۔ سبز رنگ کے بھاری پردے، خوبصورت قالین، نرم و گداز بستر، کارنس پر سجے ہوئے گوتم بدھ اور اپالو کے مجسمے، چند تصویریں اور نازک نازک گلدانوں میں سجے ہوئے سرخ اور سفید پھول سب کچھ وہی تھا عطیہ خان جو آج ہے۔ ان سات طویل سالوں میں اگر کوئی اضافہ ہوا ہے تو سنہری فریم میں جڑی ہوئی میری تصویر کا جو میں نے صاحبزادہ منصور کے اصرار پر کارنس پر رکھ دی تھی۔ وہ دریچے کے پاس سے ہٹ کر کارنس کے پاس کھڑا ہو گیا اور اپنی تصویر کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر دیکھنے لگا۔

"تو یہ ثابت ہوا ناصر فرمان کہ تم ——— تم اپنی تمام تر خوبصورتی اور وجاہت کے باوجود عطیہ خان کے معیار پر پورے نہیں اتر سکے"

اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنے قریب پڑے ہوئے بکس میں تصویر رکھتے رکھتے رک گیا ——— نہیں ——— نہیں عطیہ خان میں سے ساتھ لے کر نہیں جاؤں گا۔ اسے یہاں ہی چھوڑ جاؤں گا تاکہ تم مجھے کبھی نہ بھلا سکو! میں تمہیں ہمیشہ یاد آتا رہوں۔ عطیہ خان تمہارے دل کا بند دروازہ جس پر مسلسل سات سال تک دستک دیتے دیتے میرے ہاتھ تھک گئے ہیں کسی دن اچانک ہی کھل جاتے اور تمہیں احساس ہو کہ تم نے ناصر فرمان کو کھو کر اچھا نہیں کیا۔ جب تم پڑھاتے پڑھاتے تھک جاؤ گی، تمہارا دل یونیورسٹی جانے کو نہیں چاہے گا اور تمہارے سیاہ بالوں میں چاندی گھلنے لگے گی تب تم چاہو گی تمہارا بھی ایک ننھا سا گھر ہو جہاں تمہارے بھولے بھالے بچے ہوں، محبت کرنے والا شوہر ہو اور تب ——— تب یہ تصویر تمہیں میری یاد دلائے گی اور تم پچھتاؤ گی عطیہ خان تمہارے اندر ایک نرالی کسک جاگ اٹھے گی۔ ہاں عطیہ خان میں یہ تصویر یہیں چھوڑ جاؤں گا ——— ہے نا خود غرضی والی بات"

اس نے تصویر کارنس پر رکھ دی اور دفعتاً اس کا ذہن ماضی کے دہکتے ہوئے پرتو میں کھو گیا۔

جنوری کی وہ صبح بے حد چمکیلی اور روشن تھی یا جانے یہ سب میرے ہی احساسات کی جھلکیاں تھیں ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہی میرے چاروں اور روشنیاں سی لپک اٹھی تھیں میں حیران حیران سا کھڑا تھا کہ خان بہادر صاحب نے میز کے سرے پر بیٹھے ہوئے نوجوان سے مجھے متعارف کراتے ہوئے کہا۔

"یہ ہیں صاحبزادہ مسعود ہمارے بڑے صاحبزادے۔"

سرخ و سپید رنگت اور اونچے لمبے قد والے صاحبزادہ مسعود نے اپنے بے حد نفیس کپڑے کے سرخ اور نارنجی لکیروں والے سنہرے گاؤن کی ڈوریاں کستے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"اور یہ ہیں ناصر فرمان، اب یہ مستقلاً یہاں ہی رہیں گے"

انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا ان کی خوبصورت آنکھوں کے بھاری پپوٹے ان کی شب بیداری کا پتہ دیتے تھے۔ ان کے مضبوط ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیتے ہوئے میں نے محسوس کیا جیسے یہ کسی بے حد مخلص اور پرخلوص شخص کا ہاتھ ہو۔

"یہ اسلام آباد یونیورسٹی میں ریسرچ کر رہے ہیں۔ ایڈنبرا یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے بعد حال ہی میں یہاں آئے ہیں۔"

خان بہادر صاحب ان الفاظ کے ساتھ ہی سامنے کی طرف مڑے اور اپنے خاص انداز میں مسکراتے ہوئے بولے

"اور یہ ہیں رفعت مسعود۔"

میں نے حیرت سے اس موٹی اور کسی حد تک بے ڈھنگے جسم والی خاتون کو دیکھا۔ اس کے سفید مارننگ گاؤن کی ڈوریاں نیچے لٹک رہی تھیں اور وہ لاپرواہی سے مسکراتی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس مسکراہٹ میں بڑی اپنائیت اور خلوص تھا۔ میری نظریں بے اختیار صاحبزادہ مسعود کے کھلاڑیوں جیسے حسین جسم کی طرف ہٹ گئیں اور مجھے رفعت مسعود اور صاحبزادہ مسعود کا یہ جوڑ کچھ نامناسب سا لگا۔

"ناصر صاحبزادہ مسعود سے بے حد مشابہ ہیں، آپ نے دیکھا امی جان۔"

وہ جھک کر تائی اماں سے مخاطب ہوئیں۔

"ہاں" تائی اماں نے مجھے غور سے دیکھا۔ "ناصر اور منصور دونوں نے آنکھیں اور ناک تو بالکل فرمان بھائی کے چرا لئے ہیں۔"

"اور یہ ہیں عطیہ خان۔"

میں نے چونک کر دیکھا اور وہی روشنیاں جو ڈائننگ روم میں داخل ہوتے ہی میری طرف لپکی تھیں میرے ارد گرد ناچنے لگیں۔ میں حیرت سے حسن و خوبصورتی کے اس نازک سے مجسمے کو دیکھنے لگا۔

نازک نازک سے گلابی ہونٹ، لانبی لانبی خوبصورت آنکھیں جن کے
اوپر سیاہ ریشمی پلکوں کی بے حد گھنی جھالریں تھیں، ٹھوڑی کے نیچے ہلکا
سا گڑھا تھا۔ اس نے ایک دفعہ پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور میں بس دیکھتا
ہی رہ گیا۔

"عطیہ نے فلاسفی میں ڈاکٹریٹ حاصل کیا ہے۔ یہاں یونیورسٹی
میں پروفیسر ہیں اور آج کل انگلش لٹریچر میں ڈاکٹریٹ کرنے کے لئے
تھیسس لکھ رہی ہیں۔" اور تب میں ایک دم ہی مرعوب سا ہو گیا اور ــــ
اور یہ تم تھیں عطیہ خان، تم جو پہلی ہی نظر میں مجھے اپنے بے حد قریب
دل کے بالکل پاس محسوس ہوئی تھیں اور میں نے سوچا تھا یہ تم ہی وہ روح
نشاط ہو جسے میں برسوں سے ڈھونڈ رہا تھا اور جانے کب سے
تمہارا منتظر تھا۔

تمہیں دیکھ کر مجھے دفعتاً یوں محسوس ہوا جیسے میری تلاش و جستجو اب
یکبارگی ختم ہو گئی ہے، جیسے اس سے آگے اب میرے لئے کوئی منزل نہیں
اور یہ کتنی عجیب سی بات تھی عطیہ خان کہ میں ایک ہی نظر میں تمہیں اپنے
دل میں جگہ دے بیٹھا۔ تمہارے لئے تو یہ بات انہونی سی ہے کہ یوں بھلا
کسی کو ایک نظر دیکھ کر انسان کیسے اسے عمر بھر کی آرزو بنا لیتا ہے اس کے
پیار میں کبھی ہوش و خرد سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے لیکن میں تمہیں کیسے بتاؤں
کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ لوگ تو بن دیکھے بھی کسی انجانی، کسی ان دیکھی ہستی کی
چاہت میں دیوانے ہو جاتے ہیں لیکن تم عطیہ خان تم جو فلاسفی کی موٹی موٹی
کتابیں پڑھتی ہو اور ہیر رانجھا، شیریں فرہاد، سسی پنوں سب کی محبت
کا مذاق اڑاتی ہو اور انہیں محض فرضی قصے سمجھتی ہو بھلا یہ کیسے جان سکو
گی کہ میں تمہیں ایک نظر دیکھتے ہی تمہیں پانے کی تمنا کرنے لگا تھا۔ میں
ایک دم ہی تم سے مرعوب ہو گیا۔ جانے تمہارے حسن سے یا تمہارے
حسن خیال سے اور میں جو تم سے مرعوب ہونے کے باوجود تمہیں بہت
دلچسپی سے تک رہا تھا خان بہادر صاحب کی آواز سے چونک پڑا۔
"اور یہ فریحہ خان ہیں، ہماری چھوٹی صاحبزادی ایم فل
کی طالبہ۔"

گیہوں کے پکے ہوئے خوشے کی مانند سنہری رنگت،
ترشے ہوئے بھورے بال، گول چہرہ، بھرے بھرے سرخ ہونٹوں
کے نیچے ہلکا سا خم، وہ اپنی مسکراتی ہوئی، بولتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی
تھی۔ اتنے ڈھیر سارے حسین لوگ یہاں بستے ہیں۔ میں نے سوچا اور خان
بہادر صاحب کے بیٹھتے ہی خود بھی فریحہ خان کے بائیں ہاتھ والی خالی
کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرے مقابل تم تھیں عطیہ خان اور بائیں ہاتھ والی کرسی
خالی تھی اس سے پہلے نانی اماں بیٹھی تھیں دیکھتے ہی دیکھتے باورچی

بیرے ناشتہ چننے لگے۔ میں نے چور نظروں سے ایک بار پھر تمہاری طرف
دیکھا۔ سفید ریشمی گاؤن میں جس کے گلے اور آستینوں پر کشمیری کڑھائی
مجھے تم کسی دور دیس سے آئی ہوئی کوئی بھولی بھالی سی شہزادی لگیں
میں نے ایک نظر فریحہ خان اور پھر رفعت مسعود پر ڈالی۔ ان کے سفید گاؤن
کی ڈوریاں اب بھی نیچے لٹک رہی تھیں اور وہ لاپرواہی سے دونوں ہاتھ
ٹیبل پر رکھے آگے کو جھکی صاحبزادہ مسعود سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ تب ہی
قدموں کی چاپ پر میں نے مڑ کر دیکھا۔ سیاہ رنگ کے وولن ٹو پیس سوٹ
میں وہ بہت شاندار لگ رہا تھا۔ گندمی رنگ، بڑی بڑی شربتی آنکھیں
ستواں ناک، غالباً یہ صاحبزادہ منصور ہیں۔ میں نے سوچا۔ تب ہی وہ
میری بائیں ہاتھ والی خالی کرسی پر بیٹھتے بیٹھتے رک گیا۔
"آپ کی تعریف؟"
خان بہادر صاحب کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں
پڑ گئیں۔
"آپ لوگ ناشتہ کریں" انہوں نے فریحہ خان اور رفعت
بھابی کو ادھر دیکھتے پا کر کہا۔
"مجھے ناصر فرمان کہتے ہیں۔" میں نے اپنا تعارف
کراتے ہوئے کہا۔
"ناصر فرمان" وہ اپنی ایڑیوں پر گھوم گیا اور سوالیہ نظروں سے
نانی اماں کی طرف دیکھا۔
"تمہارے چچا زاد بھائی ہیں اور اب یہ مستقلاً یہیں رہیں
گے۔ اور ناصر بیٹے یہ ہمارے چھوٹے صاحبزادے منصور ہیں۔"
"اوہ بہت خوب، بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" اس نے
گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔
"اور آپ کے والد صاحب؟" اس نے پوچھا
"جی ان کا پرسوں شب انتقال ہو گیا۔"
"اوہ ــــ ہوں" وہ لمحہ بھر کو چپ سا ہو گیا۔ "بہت
افسوس ہوا۔ مجھے ہمیشہ ہی سے ان سے ملنے کا اشتیاق رہا۔ سنا ہے ڈ
سے بہت مشابہ تھے۔"
"جی ہاں۔" میں نے غور سے انہیں دیکھا
"غیر ضروری باتیں پھر بھی ہو سکتی ہیں" خان بہادر صاحب نے
تلخی سے کہا اور وہ دھیمے سروں میں سیٹی بجاتے ہوئے میرے قریب والی
کرسی پر بیٹھ گیا۔
"ناشتہ کر لو بیٹے۔"
"نہیں ممی شکریہ، میں صرف چائے لوں گا۔" وہ کرسی سے ٹیک

لگا کر نیم وا آنکھوں سے سب کو دیکھنے لگا۔ خان بہادر صاحب خاموشی سے کچھ پر ایک ناگوار سی نظر ڈالی اور مالٹے کا رس اپنے گلاس میں ڈالنے لگے۔
اپنے ٹوسٹ پر مکھن لگاتے ہوئے میں بڑی محویت سے عطیہ خان کو دیکھ رہا تھا۔

"کہیں ہاتھ نہ کاٹ لیجئے گا۔" میرے کان کے بالکل قریب کسی نے سرگوشی کی تو چھری منّا میرے ہاتھ سے گر پڑی۔ میں بری طرح گھبرا گیا۔ میرے قریب صاحبزادہ منصور جھکے مسکرا رہے تھے۔ ان کی خوبصورت آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ میں انہیں ایک نظر دیکھ کر رہ گیا اور پھر فوراً ہی میرے پاؤں کو کسی نے کچل دیا۔ میں نے چونک کر قریب بیٹھی فریحہ خان کی طرف دیکھا۔ اس کے بھرے بھرے رسیلے ہونٹوں پر بے حد پیاری مسکراہٹ نمایاں تھی اور وہ سر جھکائے ناشتہ کر رہی تھی۔ میں نے سوچا ان سب لوگوں کے ساتھ وقت بہت اچھا گزرے گا اور پھر بڑے سکون، بڑی طمانیت سے ناشتہ کرنے لگا۔
اور جب تم نے چائے بنانے کے لئے ٹی پاٹ اٹھایا تو میں نے بھی اپنی پیالی تمہاری طرف بڑھا دی۔ تم نے ناگواری سے میری طرف دیکھا اور چائے بنا دی۔ دوسری صبح میں اپنے لئے چائے بناتے بناتے رک گیا تھا اور میں نے مسکراتے ہوئے پیالی تمہاری طرف بڑھا دی تھی۔ تب تم نے نگاہیں اٹھا کر کسی قدر ناگواری سے مجھے دیکھا تھا اور میرے لئے چائے بنا دی تھی اور پھر وہ دن اور آج کا دن ہمیشہ تمہیں میرے لئے چائے بناتی رہیں۔ ہاں تو عطیہ خان اس دن ناشتے کے بعد منصور مجھے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گئے اور ڈھیروں باتیں کرتے رہے۔ وہ سیاست میں ایم اے کر رہے تھے لیکن ان کی سوچیں تم سب سے الگ تھیں۔ تم جو سوپر انٹلیکچول ہو اور بہت اونچے آدرش رکھتی ہو۔ بات بات پر قہقہے لگانے والے ہنس مکھ اور مخلص سے منصور میں بہت متاثر ہوا اور ہم جلد ہی گہرے دوست بن گئے۔ میں چند دنوں میں سب سے مانوس ہو گیا۔ رفعت بھابی میرا بے حد خیال رکھنے لگیں ان کے سینے میں ایک بے حد نرم دل تھا اور وہ بے حد معصوم اور بھولی بھالی سی تھیں۔ ہم سب ایک دوسرے کے کتنے قریب آ گئے تھے۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں صدیوں سے یہاں ہی رہتا چلا آیا ہوں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں عطیہ خان اگر تم میری زندگی میں نہ آئی ہوتیں تو کون سی قیامت آ جاتی لیکن تم تو میری زندگی میں یوں آئیں کہ میں تمہارے سوا سب کچھ بھول گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے جنم جنم سے میں تمہیں جانتا پہچانتا ہوں۔ بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں جو برسوں ہمارے لاشعور میں چھپے رہتے ہیں اور جب کبھی نظر پڑتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ہم مدتوں سے جانتے ہیں۔ مجھے بھی کچھ یوں محسوس ہوتا تھا عطیہ خان

ہاں یار کچھ زکام سا ہو گیا ہے

جانے تم کب سے میرے دل میں رچ بس گئی ہو اور میں ازل سے تمہاری ہی پوجا کر رہا ہوں۔

میں نے بارہا سوچا عطیہ خان کہ آخر تم ہی کیوں، فریحہ خان کیوں نہیں پیاآخر فریحہ خان کے لئے کسی ایسے جذبے نے میرے دل کو کیوں جھنجوڑا۔ اس کے بھرے بھرے بے حد رسیلے سرخ ہونٹ اور مسکراتی ہوئی بھوری بھوری آنکھیں مجھے ہرگز متاثر نہ کر سکیں لیکن تم —— تم میرے ہوش و حواس پر بری طرح چھا گئی تھیں۔ میرا بس یہی جی چاہتا تھا کہ تم میرے سامنے بیٹھی رہو اور میں تمہیں خوبصورت گیت سناتا رہوں تمہیں دیکھ کر اکثر مجھے میرا جی کا کوئی بے حد شوخ سا رومانی گیت بے اختیار یاد آ جاتا ہے۔ سردیوں کی خنک شاموں میں اکثر منصور کے اصرار پر ہم برآمدے میں کرسیاں ڈال لیتے۔ اسے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں بے حد اچھی لگتی ہیں۔ فریحہ کافی بنا کر لاتی۔ تمہارے نازک نازک ہاتھوں میں کافی کی ننھی ننھی سی پیالی، اس میں سے اٹھتا ہوا دھواں اور اس کے پس منظر میں تمہارا باوقار اور خوب صورت چہرہ دیکھ کر میرا دل مچل اٹھتا اور میں فریحہ کے کان میں سرگوشی کرتا۔
"اس بے حد خوبصورت شام کو مجھے میرا جی کا ایک بڑا ہی خوبصورت سا گیت یاد آ رہا ہے۔" اور تب فریحہ خان کی فرمائش پر میں نے وہ گیت سنایا۔ وہی گیت جو میں نے تمہارے لئے یاد کر رکھے تھے لیکن عطیہ خان ان گیتوں نے کبھی تمہارے دل کے تاروں کو نہیں چھوا۔ تم نے کبھی اس سوز کو محسوس نہیں کیا جو میری آواز میں ڈھل جاتا تھا اور جب سات سال مسلسل تمہیں گیت سنانے کے بعد ایک شام اچانک ہی

میں نے محسوس کیا کہ تمہارا دل شاید پتھر کا تھا؛ تب مجھے یوں لگا جیسے میں پاگل پجاری تھا اور تم ایک دیوی ہیں اپنے آپ سے بیگانہ تمہارے سامنے بیٹھا گاتا رہا اور جب گاتے گاتے میری بینک کے تار ٹوٹ گئے تو میں نے جانا کہ میں تو محض ایک پتھر سے مخاطب تھا۔

میں — میں جو ایک بے حد عام سا انسان ہوں جو تمہاری طرح اتنی اونچی باتیں نہیں سوچ سکتا میری اڑان تو صرف تمہاری ذات تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ میں یہ کبھی نہ جان سکا عطیہ خان کہ تم مجھ سے نفرت کرتی تھیں یا محبت، تم تو میرے لئے ایک ایسا لاینحل مسئلہ تھیں جسے میں مسلسل سات سال تک حل نہ کر سکا۔

مجھے تمہارے ہاں رہتے ہوئے بہت دن ہو گئے تو میں نے خان بہادر صاحب سے سروس کرنے کی اجازت مانگی تو انہوں نے مجھے یونیورسٹی میں داخلہ لینے پر مجبور کر دیا منصور بے حد خوش تھا۔ تم نے اور فریحہ خان نے میرے سبجیکٹ کو سخت ناپسند کیا۔ ویسے خوش تم بھی تھیں۔ جانے یہ میرا اپنا احساس تھا یا سچ مچ ایسا ہی تھا۔ زندگی ان دنوں بہت معروف ہو گئی تھی۔ میں اور منصور شام گئے یونیورسٹی سے آتے۔ صاحبزادہ مسعود ہفتے کی شام کو اسلام آباد سے آجایا کرتے تھے لیکن وہ زیادہ تر لائبریری میں رہتے اس کے باوجود اکثر شامیں بہت مزے سے گزرتیں۔ لیکن تب ہی منصور الیکشن کے لئے کھڑا ہو گیا اور ہماری مصروفیات بہت بڑھ گئیں۔ ہم دونوں رات گئے تک ہوسٹلوں میں گھوم گھوم کر کنویسنگ کرتے ان دنوں یونیورسٹی اکھاڑہ بنی ہوئی تھی۔ "جامعہ سبز ہے" "جامعہ سرخ ہے" کے نعرے وقفے وقفے سے گونجتے رہتے اور عطیہ خان تمہیں تو منصور کا الیکشن میں کھڑا ہونا ہرگز پسند نہ تھا۔ خان بہادر اور فریحہ نے بھی ناگواری کا اظہار کیا لیکن منصور اپنی دھن کا پکا تھا۔

ان دنوں اکثر تین تین دنوں تک تم سے ملاقات نہ ہوتی منصور اکثر بغیر ناشتے کے ہی مجھے ساتھ دھکیل لے جاتے اور میں تمہیں صرف ایک نظر دیکھنے کے لئے تڑپ کر رہ جاتا۔ منصور میری حالت سمجھتے ہوئے ہنس دیتے۔

"پتھر سے سر مت ٹکراؤ ڈیر ورنہ خود ہی ٹوٹ کر رہ جاؤ گے۔"

سوچتا ہوں کتنا سچ کہا تھا منصور نے میں یوں ٹوٹا ہوں عطیہ خان کہ میرا سارا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا ہے۔ وہ ایک بے حد اندھیری رات تھی جب میں اور منصور چند دوستوں کو ہوسٹل چھوڑ کر واپس آ رہے تھے۔ منصور کار کا دروازہ کھول ہی رہا تھا کہ قریب سے ایک کار دھول اڑاتی ہوئی گزری اور اس میں سے چلنے والی گولی منصور کے شانے کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔

"منصور" میں چیخا

"ٹھیک ہوں دوست۔" وہ شانے کو ایک ہاتھ سے دبا ہوئے بولا۔

اور جب ڈاکٹر زیدی سے ڈریسنگ کرا کر ہم رات گئے گھر پہنچے تو تمہارے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی اور تم برآمدے میں ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑی تھیں۔ تمہیں یوں کھڑے دیکھ کر میرا دل خوشی سے اچھل پڑا جانے کیوں میرے دل میں یہ احساس سما گیا کہ شاید تم میرا انتظار کر رہی ہو۔

"عطیہ" میری آواز جذبات سے بوجھل ہو رہی تھی۔ "کیا کر رہی ہو اتنے رات گئے۔"

تم نے چونک کر میری طرف دیکھا

"کچھ نہیں یونہی نیند نہیں آ رہی تھی۔" تمہارا چہرہ سپاٹ تھا تم واپس جانے کے لئے مڑ گئیں اور میرا دل بجھ کر رہ گیا۔

"غالباً آسکر وائلڈ کے فلسفے پر غور فرمایا جا رہا تھا" منصور نے شوخی سے کہا۔ تم نے رک کر ناگواری سے دیکھا اور پردہ اٹھا کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئیں۔ تم نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ منصور کے شانے پر یہ کیسا زخم ہے۔ اس سمے تم کتنی بے حس سی ہو رہی تھیں۔ صبح خان بہادر اور صاحبزادہ مسعود نے منصور کے زخمی ہونے کا سن کر سمجھایا کہ وہ یونین کی صدارت کے لئے مت کھڑا ہو لیکن اس کا رنگ جذبات کی شدت سے سرخ ہو گیا۔

"ہرگز نہیں۔ کیا میں ان کے اوچھے ہتھکنڈے دیکھ کر ڈر جاؤں۔ شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں موت سے ڈر کر دستبردار ہو جاؤں گا تو یہ ان کی غلط فہمی ہے میں جامعہ کے وقار کے لئے سینے پر گولی کھانے کو تیار ہوں۔ جامعہ سبز ہے اور سبز ہی رہے گی۔"

خان بہادر غصے سے ناشتے کی میز سے اٹھ گئے۔ منصور ہم بغیر ناشتے کے یونیورسٹی چلے گئے۔ الغرض انہی ہنگاموں میں الیکشن ہوئے اور منصور جیت گئے۔ ہم بہت خوش تھے لیکن گھر میں اس موضوع پر بہت کم بات ہوئی۔

فریحہ نے مبارکباد دی اور تم سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا عطیہ خان، الیکشن جیتنے کے بعد منصور کی مصروفیات اور بھی بڑھ گئیں اس لئے میری اکثر شامیں تنہا ہی گزرنے لگیں اور میں زیادہ تر وقت تمہاری شاندار لائبریری میں گزارنے لگا اور یوں مجھے صاحبزادہ مسعود الحسن کے قریب ہونے کا موقع ملا۔ وہ ایک بے حد خوبصورت، نرم اور گداز دل رکھتے تھے لیکن انہوں نے اپنی ذات پر وہ جو ایک خول سا چڑھا رکھا تھا

اس نے ان کی اصل شخصیت کو جانے کہاں چھپا ڈالا تھا

وہ وسط اپریل کی ایک بے حد خوبصورت شام تھی جب میں اور منصور یونیورسٹی یونین کی ایک ہنگامی میٹنگ اٹینڈ کر کے گھر آئے تم اور فریحہ خان لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھی تھیں۔ تمہارے ہاتھ میں آسکر وائلڈ کی دلکش کور والی کتاب تھی۔ تم نے لمحہ بھر کو کتاب سے نظر اٹھا کر ادھر دیکھا تھا اور پھر نگاہیں جھکا لی تھیں۔ فریحہ مجھے تمہاری طرف بہت غور سے دیکھتے پا کر ہنس دی اور تب ہی صاحبزادہ مسعود ہاتھ میں ریکٹ گھماتے ہوئے اپنے کمرے سے باہر نکلے۔ کھیل کے لباس میں وہ بہت شاندار اور نوعمر سے لگ رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے منصور نے ہولے سے کہا۔

"مجھے بھیا پر بہت ترس آتا ہے۔ جانتے ہو بھابی عمر میں بھی ان سے بہت بڑی ہیں ان میں ذہنی ہم آہنگی بھی نہیں۔ میں نے کتنا کہا تھا بھیا سے کہ وہ انکار کر دیں لیکن ۔۔ سچ تو یہ ہے کہ بھابی بھی قابلِ رحم ہیں۔ اگر ان کی شادی بھیا کے بجائے کسی اور سے ہوتی تو وہ زیادہ خوش رہتیں لیکن یہ ہماری غلط روایات اور بیکار اصول ——"

تب تم نے نہایت ناگواری سے اسے دیکھا تھا اور میں نے سوچا تھا عطیہ خان کہیں یہ روایات میری راہ میں حائل نہ ہو جائیں کہیں یہ اصول میری ذات سے ٹکرا کر مجھے ہی توڑ پھوڑ نہ دیں اور تب ہی صاحبزادہ مسعود ہمارے قریب آ گئے۔

"ہیلو" - "ہیلو" انہوں نے بیٹھتے ہوئے فریحہ سے کافی کی فرمائش کی اور منصور کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے۔

"بھیا آپ دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

ان کی آنکھوں میں سایہ سا لہرا گیا اور وہ ہولے سے مسکرا دیئے

"بیوقوف اب تو بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اور پھر بھلا رفعت غریب میں کیا کمی ہے۔" وہ ہنس دیئے لیکن ان کی ہنسی میں گہرے درد کی گھٹی گھٹی سی پکار تھی۔ میرا دل دکھی ہو گیا۔ منصور نے ہونٹ بھینچ لئے اور تب میں نے سوچا ہم دوسروں سے اپنا درد کیوں چھپاتے ہیں تاکہ کوئی اس درد کی تہہ تک نہ پہنچ جائے۔ اس ہنسی میں بھی کتنے آنسو گھلے ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی ان آنسوؤں کی نمی کو پالے تو ہم اور بھی زور سے ہنستے ہوئے آنکھیں مسل ڈالتے ہیں کہ نہ جانے آنکھوں میں اچانک کیا پڑ گیا۔ صاحبزادہ مسعود کے لئے دیر تک میرا دل کڑھتا رہا۔ ان کے جانے کے بعد تم اور فریحہ بھی اٹھ کر چلی گئیں لیکن میں اور منصور وہیں بیٹھے رہے۔ منصور نے مجھے بتایا کہ بھیا شروع سے ہی ناہید باجی کو پسند ناہید جو تمہاری ماموں زاد بہن تھی لیکن وہ تو بچپن سے ہی رفعت بھابی سے منسوب تھے یوں تین لہلہاتی ہوئی زندگیاں فضول روایات کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ بھیا ہمیشہ کے لئے دکھی ہو گئے۔ ناہید باجی گھلتے گھلتے موت کو گلے لگا بیٹھیں اور رفعت بھابی کو وہ پیار کبھی نہ مل سکا جس کی وہ حقدار تھیں۔ منصور کے لہجے میں دکھ کی خلش تھی۔ اس کی آواز بھرا گئی اور وہ لمحہ بھر کو چپ سا ہو گیا۔ "لیکن ناصر میں ان روایات کے آگے کبھی نہ جھکوں گا۔ میں ساجدہ سے ہرگز شادی نہیں کروں گا وہ ساجدہ جسے پیدا ہوتے ہی میرے ساتھ منسوب کر دیا گیا۔ میں فرہان چچا کی طرح اپنی مرضی کے مطابق اپنی خوشیاں چھین کر لوں گا۔" وہ جذباتی ہو گیا اور میں بہت دیر تک تمہارے متعلق سوچتا رہا۔ کہیں میں بھی تمہیں کھو نہ بیٹھوں۔ تمہیں کھونے کا تصور بڑا ہی جان لیوا تھا۔ میں نے سوچا عطیہ خان میں تمہارے بغیر جی نہ سکوں گا۔ اس رات میں بہت مضطرب رہا۔

اگلا دن بھی کچھ اچھا نہ گزرا کیونکہ یونیورسٹی یونین کے چکر میں پولیس نے منصور کو حراست میں لے لیا اور تین دن کی مسلسل کوششوں کے بعد ہی ضمانت پر رہائی مل سکی۔

وہ بہار کی ایک خوبصورت شام تھی۔ موسم بے حد رومانٹک سا ہو رہا تھا۔ تم اور فریحہ خان لان میں کرسیاں ڈالے بیٹھی تھیں۔ میں اور منصور تمہیں وہاں بیٹھا دیکھ کر وہیں آ گئے۔ تم نے لمحہ بھر کو نظریں اٹھا کر ہمیں دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔ تمہاری پشت پر گلاب کی جھاڑیوں میں تمہاری ساڑھی کے رنگ سے ملتا ایک بڑا سا گلاب کھلا ہوا تھا اور اس خوبصورت شام کو میرا جی چاہا کہ گلاب کا وہ خوبصورت پھول تمہارے بالوں میں سجا دوں۔

"کیا دیکھ رہے ہو ناصر" فریحہ نے پوچھا

"سوچ رہا ہوں وہ خوبصورت پھول اس حسین شام کو کتنا اداس اور تنہا ہے۔ اگر اسے کسی کے بالوں کی زینت بنا دیا جائے تو؟"

مسز سمتھ نے اپنے شوہر سے پوچھا۔ "اچھا اگر آج کی پارٹی میں مہمان مجھ سے گانے کی فرمائش کریں تو میں کیا کروں؟"

مسٹر سمتھ نے سنجیدگی سے جواب دیا

"کرنا کیا ہے۔ تم گانا سنا دینا۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں انہیں خود اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

"تو پھر کرڈ الئے یہ احسان بے چارے تنہا پھول پر۔" فریحہ ہنسی اور عطیہ خان اس بے حد جذباتی لمحے میں میں نے جھک کر بڑے پیار سے پھول توڑا اور تمہارے جوڑے میں لگا دیا۔ تم نے سر موڑ کر مجھے دیکھا۔ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تمہارے رخسار بھی گلاب کے ہم رنگ ہو گئے ہوں۔ تم مجھے دیکھ رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کاش وقت اسی لمحے جامد ہو کر رہ جائے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہ سنہری لمحہ جو سات سالوں میں صرف ایک بار میری زندگی میں بغیر کسی آہٹ کے آیا دبے پاؤں نکل گیا۔ میں نے سوچا عطیہ خان میں جو تمہاری چاہت میں دیوانہ ہو رہا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کر تمہاری بے نیازی سے مایوس ہو کر چلا جاؤں۔ تمہیں بھلانے کے لئے دوسری راہوں پر چل نکلوں تو ممکن ہے تب میری چاہت تمہارے دل میں جاگ اٹھے اور تم سوچو تم نے مجھے کھو کر اچھا نہیں کیا۔ اب وقت ہے عطیہ خان اپنی اس دنیا سے باہر نکل آؤ۔ اس خول کو توڑ دو اور مجھے مایوسیوں کے گرداب میں گرنے سے بچا لو۔ پھر نہ جانے کیا ہو جائے۔ وقت ان چہروں کو کتنا بدل ڈالے وہ نگاہیں جو کبھی تمہاری طرف محبت سے دیکھتی تھیں شاید نفرت میں بدل جائیں۔ نہیں ــ نہیں میں نے خود کو جھنجھوڑا' یہ نگاہیں تمہاری طرف کبھی نفرت سے نہیں اٹھ سکتیں۔ اس دل نے تو تم سے پیار کرنا سیکھا ہے' نفرت کرنا نہیں۔ میں جانے کب سے تمہیں دیکھ رہا تھا تم نے نگاہیں اٹھائیں اور تمہاری ان بے تحاشا خوبصورت آنکھوں میں ڈوب جانے کو جی چاہا۔

اس دن میں بہت خوش تھا۔ کتنا خوش فہم' یوں سمجھتا تھا جیسے تمہارے جوڑے میں پھول لگا کر میں نے تمہیں جیت لیا ہے۔

انہی دنوں فریحہ خان باہر جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی وہ پی ایچ ڈی کے لئے ایڈنبرا جا رہی تھی۔ تم خوش تھیں مگر میں اور منصور اداس تھے۔ منصور کو لڑکیوں کی حد سے زیادہ ایجوکیشن پسند نہ تھی لیکن لاکھ سمجھانے پر بھی فریحہ نہ مانی اور ایڈنبرا روانہ ہو گئی۔ ہم سب اسے سی آف کرنے ایرپورٹ پر آئے تھے۔ رفعت بھابی کی آنکھیں مسلسل رونے سے سرخ ہو رہی تھیں اور تم عطیہ خان تم بھی بے حد سنجیدہ تھیں۔ فریحہ ضبط سے کام لیتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ ایرپورٹ سے واپس آ کر ہم سب خاموشی سے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے اور تب ہی ڈاکٹر زیدی حسب معمول اپنی جرمن بیوی کا ہاتھ پکڑے مسکراتے ہوئے ہیلو کا نعرہ لگاتے اندر گھس آئے۔ ان کے ساتھ شرمائی شرمائی سی ایک پیاری شکل کی لڑکی تھی۔

"یہ میری بھانجی ہے سعدیہ درانی۔" انہوں نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

اداس اس خوبصورت شام کو جب ہم سب بے حد اداس ہو رہے تھے ہم نے سعدیہ درانی کو نہایت گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ رات گئے تک ڈاکٹر زیدی اور ان کی بیوی کے قہقہے گونجتے رہے۔ سعدیہ نگاہیں جھکائے مسکراتی رہی اور تم عطیہ خان تم بھی کبھی کبھی ڈاکٹر کی انتہائی پرلطف بات پر ذرا کی ذرا مسکرا دیتیں اور تب میرا جی چاہتا تم یونہی بھولے ہوئے مسکراتی رہو اور میں اپنی آنکھوں میں دنیا جہان کا پیار لئے تمہیں تکتا رہوں۔

وقت نے کئی پہلو بدلے میں نے ایم اے کر لیا۔ مجھے خان بہادر نے اپنی ایک مقامی برانچ کا منیجر بنا دیا۔ منصور کو اس کی سیاسی مصروفیات کی بنا پر امتحان دینے کی اجازت نہ ملی اور وہ اگلے سال بھی امتحان نہ دے سکے کیونکہ وہ جیل میں تھے تب انہوں نے اپنے آپ کو ملک و قوم کے لئے وقف کر دیا۔ خان بہادر ان سے ناراض تھے لیکن انہیں اس ناراضگی کی پرواہ کب تھی۔ تم اپنے تمام تر حسن و ملاحت کے ساتھ ویسی ہی تھیں' وہی عطیہ خان' اس دوران کئی ایسے نازک لمحے آئے۔ میرا جی چاہا تمہیں ایک بار صرف ایک بار کہہ دوں۔ ۔ ۔ ۔ عطیہ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ تم سے پیار کرتا ہوں۔ میرا ہاتھ تھام لو دوست۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے مت ٹھکراؤ لیکن وہ بے حد جذباتی اور کمزور سے لمحے بادِ صبا کے جھونکوں کی طرح آ آ کر گزر جاتے۔ میں خود پر قابو پا لیتا۔ اظہار تمنا کر کے میں خود کو تمہاری تیکھی تیکھی نظروں میں گرانا نہیں چاہتا تھا۔ تم جو میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا تھیں۔ تمہیں پانے کی آرزو نے میرے وجود کو ایک انوکھا سوز بخش ڈالا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میرا سراپا اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ میں نے بارہا بڑے سکون' بڑے درسان سے سوچا عطیہ خان کہ تمہاری تمنا سے دستبردار ہو جاؤں بالکل ایسے ہی جیسے چپکے سے تم اچانک ہی میرے بہت قریب آ گئی تھیں تا کہ میں تمہیں یکسر بھول کر زندگی کی کوئی نئی راہگزر تلاش کروں لیکن جانے کیوں میرے اندر گھپ اندھیرا سا ہو گیا جیسے میرے وجود کی ساری روشنی ساری جگمگ تمہاری چاہت تمہاری تمنا کے دم سے تھی اور میں تمام تر کوشش کے باوجود بھی تمہاری تمنا سے دستبردار نہ ہو سکا۔

ہاں تو عطیہ خان میں نے سعدیہ درانی کا ذکر کیا تھا۔ اس کی اکثر شامیں ہمارے ہاں گزرنے لگیں۔ وہ بے حد سادہ اور شرمیلی سی لڑکی تھی۔ مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر بری طرح گھبرا جاتی۔ رخسار سرخ سرخ ہو جاتے۔ پلکیں لرزنے لگتیں۔ ایسے میں وہ بہت اچھی لگتی اور میرا جی چاہتا عطیہ خان کہ تم بھی مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر یوں ہی گھبرا جایا

کرو اور پھر گھبراہٹ میں تم سے کبھی چاٹ کی پیالی، کبھی پانی کا گلاس گر کر ٹوٹ جایا کرے۔ کیسی عجیب خواہش تھی میری۔ ہاں تو وہ سعدیہ درانی تم سب سے مختلف تھی۔ تم جو فارغ اوقات میں میری کوریلی فلابیر اور برنارڈ شا کو پڑھتی تھیں اور بہت اونچی اونچی باتیں سوچنے کے ساتھ ساتھ آسکر وائلڈ کی زندگی کے چیدہ چیدہ نکات پر بحث کیا کرتی تھیں اس سعدیہ ڈرانی کی سادگی کا مقابلہ کر سکتی تھیں۔ ایک شام جب تم آسکر وائلڈ کا بار بار ذکر کر رہی تھیں تو اکثر پاس سعدیہ نے آہستگی سے پوچھا تھا۔

"یہ آسکر وائلڈ کون ہے' کیا بڑے بھیا کا کوئی دوست ہے؟"

وہ ایک بے حد اداس سا دن تھا۔ میں لائبریری میں پرانی کتابیں الٹ پلٹ رہا تھا۔ تم ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی وہاں سے گئی تھیں تمہارے مخصوص پرفیوم کی خوشبو میرے چاروں اور سرگوشیاں کر رہی تھی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تم یہیں کہیں میرے قریب ہی موجود ہو۔ تمہارا تصور بڑا دل آویز تھا عطیہ خان لیکن سعدیہ نے آ کر تمہارے حسین تصور کو اتھل پتھل کر ڈالا۔

"اوہ آپ۔" وہ مجھے وہاں دیکھ کر گھبرا گئی "وہ کہاں ہیں باقی سب لوگ۔ میں سمجھی شاید لائبریری میں ہوں۔" وہ نگاہیں جھکائے ہوئے بوکھلائی ہوئی سی بولتی چلی گئی۔

"غالباً سب لوگ کسی دعوت پر گئے ہیں' آپ بیٹھئے۔"

وہ جھجکتی ہوئی بیٹھ گئی۔ کئی لمحے ہمیں چھوتے بغیر دبے پاؤں ہمارے قریب سے گزر گئے۔ میں خاموشی سے گھبرا کر ان کتابوں کو دیکھنے لگا جو ابھی تم میز پر چھوڑ گئی تھیں۔

"ناول ہیں کیا؟" سعدیہ نے پوچھا

"ہاں' میں نے قرۃ العین کا سفینۂ غم دل سعدیہ کے ہاتھ میں دے دیا اور خود ایک دوسرے ناولٹ کو دیکھنے لگا۔ لائبریری میں گہری خاموشی تھی

میں نے کتاب کی اوٹ سے سعدیہ کو دیکھا اس کی آنکھوں میں الجھن تھی اور وہ نہایت بیزاری سے ورق الٹ رہی تھی۔

"توبہ ناصر بھائی یہ کیسا ناول ہے کوئی اچھی سی کتاب دیجئے نا' رضیہ بٹ یا اے آر خاتون کا کوئی ناول۔"

میں سعدیہ کے لئے ناول ڈھونڈتے ہوئے سوچنے لگا قرۃ العین کو تو صرف تم ایسی سپر انٹلکچوئل لڑکیاں ہی پڑھ سکتی ہیں اور سچ تو یہ ہے عطیہ خان کہ کبھی کبھی تم بھی تو مجھے قرۃ العین کے کسی ناول کی ہیروئن ہی لگتی تھیں جو افسانوی ماحول سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آ گئی تھی۔

**حضرت عبداللہ بن مبارکؒ**
کی خدمت میں ایک روز ایک نوجوان حاضر ہوا اور آپ کے پاؤں پر گر کر زار زار رو دیا اور عرض کیا۔ "میں نے ایک ایسا گناہ کیا ہے کہ میں اسے شرم کے مارے بیان نہیں کر سکتا۔"

آپ نے فرمایا۔ "بتلا تو سہی تو نے آخر کیا کیا ہے۔"

اس نے کہا۔ "میں نے زنا کیا ہے۔"

آپ نے فرمایا۔ "میں ڈر گیا تھا کہ شاید تو نے کسی کی غیبت کی ہے۔"

وقت اپنی مخصوص چال چلتا رہا۔ دو سال جیسے پلک جھپکتے میں بیت گئے۔ تم کیمبرج سے لوٹ آئیں۔ وہ بہت خوبصورت ہو گئی تھی اسے اس بات پر بے حد حیرت تھی کہ میں ابھی تک کنوارا ہوں اور اس نے نہایت خلوص سے مجھے مشورہ دیا کہ میں سعدیہ درانی کو اپنا لوں۔

"بے حد پیاری اور معصوم سی لڑکی ہے ناصر بھائی۔"

اور میں نے سوچا تھا عطیہ خان کہ جس دل میں تمہاری چاہت نے گھر بنا رکھا ہو وہاں بھلا کسی اور کا گزر ممکن ہے۔ انہی دنوں سعدیہ چلی گئی۔ جاتے سمے وہ بے حد اداس تھی۔ اس کی سیاہ پلکیں بار بار آنسوؤں سے بھیگ جاتیں۔ رخسار زرد ہو رہے تھے۔

"آپ سب مجھے بے حد یاد آئیں گے۔" جاتے جاتے اس نے کہا۔

اس کے پرسوز لہجے نے مجھے چونکا دیا' وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ تب میں نے دکھ سے سوچا کہیں یہ لڑکی انجانے میں مجھ سے پیار تو نہیں کرنے لگی۔ اگر ایسا ہے تو میرے خدا تو ہی اس پر رحم کر۔ اس کا بھیگی بھیگی پلکوں سے بار بار پیچھے مڑ کر دیکھنے کا انداز بڑا جان لیوا تھا۔ میں نے بڑے خلوص سے دعا کی۔ "خدایا یہ لڑکی مجھے بھول جائے۔ اگر یہ مجھ سے کوئی امید وابستہ کر بیٹھی ہے تو کہیں ایسا نہ ہو اس کا ننھا سا دل اس دکھ کو سہار نہ سکے۔" میں بہت دیر تک اس بے حد سادہ اور معصوم سی لڑکی کے لئے کڑھتا رہا۔

ں اور بہت سے۔ میں سعدیہ کو بھول گیا بلکہ سب کچھ بھول گیا۔ مجھے کچھ یاد تھا تو صرف یہ کہ میں ناصر فرمان ہوں جو عطیہ خان تمہاری چاہت میں ڈوب ڈوب کر ابھرنے کی کوشش کر رہا ہے میں سعدیہ درانی کو بالکل بھول بیٹھا تھا کہ اچانک ہی غیر متوقع طور پر اس کا خط آ گیا۔ میں کتنی ہی دیر تک خط ہاتھ میں لئے حیران حیران سا بیٹھا رہا۔ اس نے لکھا تھا۔

ناصر فرمان!

جانے تمہیں یاد بھی ہو گا یا نہیں کہ ایک
بے حد عام سی لڑکی کبھی تمہاری زندگی میں آئی
تھی لیکن وہ لڑکی دو سال کی مسلسل کوششوں
کے باوجود بھی تمہیں نہیں بھلا سکی۔ سوچتی ہوں
کہ دل میں تمہاری چاہت لئے میں جس اجنبی
انسان کو سونپ دی جاؤں گی، کیا یہ اس کے
ساتھ فریب نہیں ہو گا۔ کیا اس فریب کے بعد
میں جی سکوں گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا
تم مجھے اپنا نہیں سکتے ناصر فرمان ۔ ؟"

وہ ننھا سا نیلا کاغذ کتنی ہی دیر تک میرے ہاتھوں میں لرزتا رہا بیوقوف لڑکی تم یہ خود کو کیا روگ لگا بیٹھیں۔ مجھے اس پر بے حد ترس آیا اور میں نے سوچا میں اسے خط لکھوں گا۔ اسے سمجھاؤں گا۔ وہ مجھ سے ایک ایسی خواہش کا اظہار کر رہی ہے جو اب میرے بس کی بات نہیں ایک نرم و نازک سا دل تھا جو عطیہ خان کی نذر ہو گیا اور اب میرا دامن خالی ہے اسے دینے کے لئے میرے پاس کچھ بھی نہیں، کچھ بھی تو نہیں میں بالکل تہی دامن ہوں سعدیہ درانی۔ میں سعدیہ کے خط کو یونہی لاپروائی سے میز پر ڈال کر باہر نکل آیا اور جانے کس جذبے کے تحت تمہارے کمرے کا پردہ اٹھا کر اندر جھانکا۔ تم میز پر کاغذ بکھرائے جانے کس جانکاہ مسئلے میں الجھی ہوئی تھیں کہ تمہیں میرے آنے کی خبر تک نہ ہوئی تمہارے سیاہ گھنیرے بال، تمہاری پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ گھنی ریشمی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا کاش کوئی وقت کے پاؤں میں زنجیر ڈال دے۔ تم یونہی نگاہیں جھکائے بیٹھی رہو اور میں تمہیں دیکھتا رہوں ملگجی سی روشنی میں تمہاری سیاہ لانبی پلکوں کا سایہ تمہارے گلابی رخساروں پہ لرز رہا تھا۔ بے اختیار میرا جی چاہا تمہارے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دوں۔ محبت کے ان سارے جذبات نے جو ان سات سالوں میں میں نے سینت سینت کر رکھے تھے اکا ایکی ہی میرے وجود کو گھیر لیا۔

"عطیہ!" میں نے پکارا
تم نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "آپ! ناصر فرمان آیئے۔"
تمہاری آنکھوں میں کتنی خوبصورتی، کتنا حسن تھا۔ ان بے تحاشا خوبصورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے میرا جی چاہا کہ تم سے شکوہ کروں۔ تم نے اب تک مجھے کتنا نظر انداز کیا عطیہ خان لیکن تم نے نگاہیں جھکا لیں اور میں ہولے ہولے چلتا ہوا تمہاری پشت پر جا کھڑا ہوا اور اپنے دل کی بے قابو دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے میں نے کہا۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں عطیہ" مجھے اپنی آواز خود ہی بہت بوجھل اور گھمبیر سی لگی۔

"کہئے" تم نے ذرا سا گردن موڑ کر مجھے دیکھا اور اس بے حد جذباتی لمحے میں، میں نے تمہارے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ میں تمہارے بہت قریب تھا اور تمہارے مخصوص پرفیوم کی خوشبو نے میرے مشام جاں کو آن کی آن میں معطر کر دیا اور میں نے وہ بات جو سات سالوں میں تم سے نہ کہہ سکا تھا۔ بڑے رسان، بڑی طمانیت سے کہہ دی۔

"میں نے جب پہلی بار تمہیں دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے میں برسوں سے تمہیں جانتا ہوں، جذبوں کی کوئی زبان نہیں ہوتی عطیہ خان میرے پاس بھی زیادہ الفاظ نہیں۔ میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔ اگر تمہیں نہ پا سکا تو اگرچہ جی جان سے نہ گیا پاگل ضرور ہو جاؤں گا۔ بتاؤ عطیہ کیا تم زندگی کے سفر میں میرا ساتھی بننا پسند کرو گی۔ عمر بھر کے لئے میرا ساتھ دو گی؟"
میں نے رک کر سوالیہ نظروں سے تمہیں دیکھا۔ تمہاری نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور ہاتھ تیزی سے کاغذات کو الٹ پلٹ کر رہے تھے۔ میں تمہاری پشت سے ہٹ کر تمہارے سامنے آ کھڑا ہوا۔ تب تم نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ وہی سادہ اور سپاٹ سی نظریں ہر قسم کے تاثرات سے خالی، میں کتنی ہی دیر تک تمہارا جواب سننے کو منتظر کھڑا رہا لیکن تم یونہی بے نیازی سے بیٹھی رہیں۔

جیسے۔ جیسے میری بات تمہارے نزدیک کوئی وقعت کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتی۔ جیسے میں کوئی کھلنڈرا سا فلرٹ کرنے والا لڑکا تھا جو ہر روز ایسی باتیں نہ جانے کتنی لڑکیوں سے کہتا ہو۔ تم نے میرے سچے جذبے کی کس قدر توہین کی۔ کس بری طرح مجھے نظر انداز کر دیا۔ میں ناصر فرمان جو بہت خود دار بہت انانیت پسند تھا جو سات سال سے تمہاری محبت کی آگ میں جل رہا تھا لیکن کبھی تم سے اس کا اظہار نہ کر سکا کہ میں تمہیں چاہتا ہوں، تم سے پیار کرتا ہوں اور اب جبکہ میں اس بے حد کمزور لمحے میں اظہار کر بیٹھا تھا اور تم نے میری بات کو ذرا سی بھی اہمیت نہ دی۔ میں نے ایک دفعہ پھر تمہاری طرف دیکھا تم یونہی

بے نیازی سی بیٹھی تھیں اور تب سے اس سے میرے سینے کے اندر کچھ چیخ کر رہ گیا اور میں بے اختیار جانے کے لئے مڑا۔

"بیٹھئے نا ناصر صاحب۔" تم نے اخلاقاً روکا لیکن میں چلا آیا۔ بے حد افسردہ تھکا تھکا اور بکھرا بکھرا سا۔ تو عطیہ خان تم نے مجھے ٹھکرا کر اچھا نہیں کیا تھا۔ عطیہ خان محبت سے بھرا ہوا دل تو وہ انمول موتی ہے جو سینکڑوں خزانے لٹا کر بھی حاصل نہیں ہوتا۔ میرے سینے میں ایک ہوک سی اٹھی اور میرے اندر عجیب سی ویرانیوں نے ڈیرہ ڈال لیا میں خالی خالی دل لئے کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔

تو ناصر فرمان تم جو سات سالوں سے مسلسل نظر انداز کئے جا رہے ہو آج سچ مچ بالکل بے معنی اور بے وقعت سے ہو کر رہ گئے ہو۔ تمہارے وہ سارے رنگین سپنے، وہ سارے چمکیلے خواب محض خواب ہی تھے جو یکبارگی ٹوٹ کر بکھر گئے۔ اس سے میرا جی چاہا عطیہ خان کہ ان چمکیلے خوابوں کی کرچیاں چن کر اپنے دامن میں سمیٹ لوں، یہ خواب جو مجھے بے حد عزیز تھے لیکن کبھی خوابوں کی کرچیاں بھی چنی جا سکتی ہیں۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں جیسے مدت سے ان بے خواب آنکھوں نے کوئی خواب نہ دیکھا ہو۔ میرا جسم یوں تپ رہا تھا جیسے کسی جلتے ہوئے صحرا میں ننگے پاؤں چلتے ہوئے مجھے صدیاں بیت گئی ہوں چاہت کا وہ محل جو میں نے سات سالوں میں ایک ایک اینٹ کر کے تعمیر کیا تھا اچانک گر کر ٹوٹ گیا۔

ہاں تو ناصر فرمان یہ محض ریت کے گھروندے تھے جو ذرا سی ہوا سے ٹوٹ کر بکھر گئے۔ میں نے بے حد دکھ سے سوچا اور آنکھیں موند لیں۔ میرا وجود جیسے اندر ہی اندر چیخ چیخ کر ٹوٹ رہا تھا۔ میرا جی چاہا کہ میں تمہیں بلاؤں، تمہیں پکاروں اور تمہارا دامن پکڑ لوں اور چیخ چیخ کر کہوں۔

خدا کے لئے میرے وجود کو بکھرنے سے بچا لو، مجھے ریزہ ریزہ ہونے سے بچا لو عطیہ خان مجھے سہارا دو۔ ممکن تھا کہ میں پھر اٹھ کر تمہارے کمرے میں چلا جاتا کہ منصور آ گئے۔

"ناصر سنا تم نے آج اسکول کی دو طالبات اغوا ہو گئی ہیں۔ طلبا ہڑتال کر رہے ہیں۔ چلو ہم بھی چلتے ہیں۔" وہ بہت پریشان تھے۔

"آج میں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں گا۔" میں نے افسردگی سے کہا۔ میں جو ہر قدم پر منصور کا ساتھ دینا چاہتا تھا بہت چاہا کہ اپنے ٹوٹے دل کو سنبھال کر اور اپنے ریزہ ریزہ ہوتے وجود کو اکٹھا کر کے اس کا ساتھ دے سکوں لیکن ناکام رہا۔ اسے تنہا ہی جانا پڑا لیکن

جاتے جاتے منصور لمحہ بھر کو رکا۔ "پتھروں سے سر ٹکرانے والوں کو سوائے زخموں کے اور کچھ نہیں ملتا۔

مائی ڈیر اب بھی وقت ہے ان راہوں سے پلٹ آؤ۔ زندگی اس کے علاوہ بھی بڑا حسن ہے۔" اس نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا اور باہر نکل گیا۔

میں نے سوچا کتنا سچ کہا تھا منصور نے پتھروں سے سر ٹکرانے والوں کو سوائے زخموں کے اور کیا ملتا ہے بھلا۔ میں نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھ لئے اور بہت دیر بعد جب میں نے آنکھوں سے ہاتھ اٹھائے تو باہر اندھیرا پھیل رہا تھا اور ہوا کے جھونکے دریچے کی راہ اندر آ کر میز پر پڑے سعدیہ کے خط کو چھیڑ رہے تھے۔ میں نے جھک کر خط اٹھا لیا

---

محبت کرنے والوں کے دل بہت نرم ہوتے ہیں۔ میرا دل سعدیہ کے لئے دکھی ہو گیا جو دو سال سے میری راہ دیکھ رہی تھی کہ شاید میں اس کے پاس چلا آؤں۔ اب شدت انتظار سے گھبرا کر اس نے قلم کا سہارا لیا تھا اور جو شاید اب بھی دریچے میں کھڑی ہو کر میری راہ دیکھ رہی ہو گی اور نہ جانے کب تک یونہی دریچے میں ہر روز صبح شام کھڑی ہو کر یونہی میری راہ دیکھتی رہے گی کہ شاید میں اس کے پاس چلا آؤں اور تب ہی بہت پہلے کے پڑھے ہوئے نذر الاسلام کے یہ اشعار بے اختیار نوکِ زبان پر آ گئے۔

ــــــہ تمہیں چھوڑ کر اے رفیقہ!
میرے سینے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے
ٹوٹے ہوئے سینے کی جھونپڑی میں بیری کی آگ جل رہی ہے
اس آگ سے میرے ہی دل کو خاک سیاہ ہونے دو
دکھ سے میرا سینہ زخم خوردہ ہے

وہ دکھ جو مجھے محبت کے سودے میں ملا
لیکن میں اُسے دکھی نہیں ہونے دوں گا
وہ جو سوکھے پھولوں کا ہار لئے میرا انتظار کر رہی ہے
اور میں نے اپنے ٹوٹتے ہوئے دکھی دل کے ساتھ سوچا۔
سعدیہ کے پاس نہیں جاؤں گا تو وہ یونہی میری راہ دیکھتے دیکھتے
ے جائے گی اور پھر ایک دن اس کا دل میری طرح ٹوٹ جائے گا۔
ی ان اذیت ناک لمحوں سے گزرے گی جن سے میں آج گزر رہا
ے۔ تب ان بے حد گداز اور نرم لمحوں میں میں نے سعدیہ کے دل کو
ٹنے سے بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ سادہ سی معصوم لڑکی جو تمہاری
ح اونچے آدرش نہیں رکھتی جو آسکر وائلڈ کا نام تک نہیں جانتی اور
... جو مجھ سے پیار کرتی ہے -- میں جو اپنا دل تمہارے پاس ہار
ا ہوں۔ پیار سے بھرا ہوا دل تو ایک انمول موتی ہے! اور میں
س موتی کو ٹوٹنے نہیں دوں گا۔ میرا دل ٹوٹا ہی ہے لیکن میں سعدیہ
دل کو نہیں ٹوٹنے دوں گا — میں یہ فیصلہ کر کے مطمئن ہو گیا لیکن
دل — میرا دل جیسے کسی شدید اور گہرے دکھ سے پگھل رہا تھا گھل
تھا لیکن بظاہر میں نے خود کو مطمئن کر لیا۔ ڈنر کے لئے گیا لیکن تم
ود نہیں تھیں۔ صبح ناشتے پر تمہیں دیکھا اور تمہاری طرف چائے
پیالی بڑھاتے ہوئے سوچا۔

آج آخری بار تمہارے ہاتھوں کی بنی ہوئی چائے پی
ے۔ میں نے الوداعی نظروں سے تمہیں دیکھا تاکہ تمہاری تصویر کو
ہوں میں چھپا لوں۔ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے تم مجھے
ی طرف دیکھتا پا کر شرما گئی تھیں اور تمہارے رخسار اور تمہارے کانوں
لوئیں سرخ ہو گئی تھیں — اے ناصر فرمان خبردار فیصلے کی ان آخری
ڑیوں میں ڈگمگا ؤ مت۔ کسی غلط فہمی میں خود کو مبتلا نہ کرو۔ میں نے
اسے جھٹ سے نظریں ہٹا لیں اور خاموشی سے چائے پینے لگا —
ں تو عطیہ خان اب آنے والی صبح تم مجھے ناشتے کی میز پر نہیں پاؤ گی۔
ں بہت سویرے یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اگرچہ ایک بار پھر تمہیں دیکھنے
بہت جی چاہتا ہے لیکن میں تم سے آخری بار نہیں ملوں گا مبادا میرا
دہ متزلزل ہو جائے۔ میرے قدموں میں لرزش آ جائے اور میرا وہ
صلہ جو میں نے بڑی اذیت، بڑا دکھ سہنے کے بعد کیا ہے تمہیں دیکھ کر
ٹ جائے۔ سوچتا ہوں عطیہ خان دکھ تو ہماری حیات کی راہ میں کہیں نہ
یں سے ضرور آ ٹپکتا ہے۔ دکھ کا اور ہمارا تو ازلی و ابدی ساتھ ہے پھر
ں دکھوں سے کیوں گھبراؤں، سکھ کی چاہت میں دکھ سے کیوں دوسروں
کا دامن بھروں۔ جب یہاں بھی دکھ ہیں تو کیوں نہ وہاں جا کر سعدیہ کو سکھ
کا پیام دوں اور دکھ سے اپنا دامن بھر لوں۔ بہت دن پہلے میں نے فرسکہ
خان کی نوٹ بک میں ایک ہندی کویتا پڑھی تھی۔ جانے کس کی تھی۔

سکھ کہیں نہیں ملتا
سکھ کوئی ایسی شے نہیں جو ہر ایک کی میراث ہو
سکھ کسی ریسٹورنٹ، کسی ہوٹل، کسی پکچر ہاؤس میں نہیں ملتا
آدمی ٹوٹ جاتا ہے بکھر جاتا ہے، مر جاتا ہے
لیکن سکھ نہیں ملتا
سکھ کے سپنے سجانے والے دیکھ
سکھ کی چھاؤں تو ایک دھوکہ ہے
سکھ کہیں بھی نہیں ہے دنیا میں
سکھ کا احساس ہی اصل سکھ ہے

ہاں تو عطیہ خان سکھ کہیں نہیں ملتا۔ یہ انسان کے اپنے اندر سے ابھرتا ہے اور میں سعدیہ کے پاس جا رہا ہوں۔ اس سکھ کی تلاش میں جو نہ یہاں ہے اور نہ سعدیہ کے پاس، لیکن میں جا رہا ہوں اور اپنے سات سالوں کے ایک ایک لمحے کو جو میں نے تمہاری چاہت، تمہاری آرزو میں کاٹے ہیں اور وہ سنہرے خواب جو میں نے تمہارے لئے دیکھے تمہاری دہلیز پر ہی چھوڑے جا رہا ہوں۔ سوچتا ہوں عطیہ خان شاید ہم دکھ پال کر خوش ہوتے ہیں جبھی تو میں --- میں ناصر فرمان تمہاری چاہت، تمہارے پیار اور نہ پا سکنے کے دکھ کو دل میں لئے سعدیہ کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ سعدیہ جس سے میں نے اپنی زندگی کے کسی بھی لمحے میں محبت نہیں کی اور تمہیں عطیہ خان تمہیں چھوڑے جا رہا ہوں — تم جسے میں نے مسلسل سات برس ایک دیوی کی طرح پوجا اور ان سات برسوں کا ایک ایک لمحہ تمہیں پانے کی تمنا میں بیت گیا۔ اور اب — اب کیا میں تمہیں بھول پاؤں گا۔ نہیں عطیہ خان۔ نہیں کبھی نہیں۔ اس نے نڈھال سا ہو کر دریچے سے سر ٹیک لیا اور ——

اپنے قیمتی بیڈ پر بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے عطیہ خان نے سوچا —— "میں تم سے محبت کرتی ہوں ناصر فرمان، شدید محبت۔" اور پھر بڑے سکون اور بے حد طمانیت سے اپنی گھنیری پلکوں کی چلمنیں گرا دیں۔

ثروت چوہدری

# من مندر اور دیوتا

کنواریاں بھی کتنی بھولی ہوتی ہیں ———

من مندر کے سنگھاسن پر دیوتا کے چرنوں میں اپنی آشاؤں کے
پھول بکھیرتی رہتی ہیں اور ———

کٹھور دیوتا ان پھولوں کو اپنے قدموں تلے روندتا ہوا دیوی کی
آشا کو نراشا میں بدل کر بھگوان جانے کس اور چل دیتا ہے۔

شاید اس کے من مندر میں جس دیوی کی مورتی سجی ہوتی ہے
وہ اتنی من موہنی اور کامنی ہوتی ہے کہ ہمارا اور اس کا کوئی مقابلہ
ممکن نہیں۔ لیکن بھگوان ———

تُو نے یہ کیسا دستور بنایا ہے کہ ———

جنھیں ہم چاہتے ہیں وہ ہمیں نہیں چاہتے۔

اور ———

جو ہمیں چاہتے ہیں، ہم ان کی چاہت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

رمضان المبارک کا مہینہ تھا گرمی اپنے عروج پر تھی عبداللہ اور اس کی بیوی دونوں روزے سے تھے۔ گھر کا عالم بھی زبوں حالی کا آئینہ دار تھا۔ غربت و افلاس نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ اس کے باوجود دونوں میاں بیوی صبر و ضبط کے ساتھ ساتھ زہد و تقویٰ سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ صبر و شکر کا یہ عالم تھا کہ شکایت کا ایک لفظ اشارتاً بھی زبان پہ نہ آتا تھا۔ اس عالم میں ایک مصیبت اور سر پہ آ گئی یعنی کہ ان کے یہاں پہلے بچے کی پیدائش کا وقت بھی قریب تھا۔ آخر وہ گھڑی آن پہنچی۔ بچہ خوبصورت اور تندرست تھا۔ دونوں میاں بیوی تنگدستی کے باوجود شاداں و فرحاں ہو گئے انھوں نے بچے کا نام سہل رکھا۔ ایک بات جو انھوں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ بچہ ایک مرتبہ کے علاوہ دوسری مرتبہ رویا تک نہیں۔ انھیں ایک عجیب سا احساس یہ بھی ہوا کہ ایک نور کی چادر آہستہ آہستہ ان کے گھر میں پھیلتی جا رہی ہے جس سے ان کی اپنی روحیں بھی منور ہو رہی تھیں۔

ماں نے لاکھ کوشش کی کہ بچہ دودھ پی لے لیکن بچے نے کسی طرح دودھ نہیں پیا۔ شام کو جب اذان کی آواز گھر میں آئی تو بچے نے ماں کے دودھ کو منہ لگایا اور اسی طرح اس نومولود بچے نے پورا رمضان گزارا۔ ماں کو بچے کی غیر معمولی حرکات کا اندازہ مسلسل ہوتا رہا۔ جب بچہ تین سال کا ہوا تو میاں بیوی نے فیصلہ کیا کہ بچے کو اس کے ماموں محمد بن سوار کے پاس بھیج دیا جائے جو زہد و تقویٰ اور سلوک و طریقت میں دور دور تک اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ جب سہل ان کے پاس آئے تو انھوں نے تبسم کر فرمایا "خدا کا شکر ہے بیٹے تم اپنی منزل کی پہلی سیڑھی پر آ گئے"۔

سہل اور ان کے ماموں محمد بن سوار عبادت میں مشغول رہتے۔ ایک دن سہل نے اپنے ماموں سے کہا ماموں جان میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ بدن سے آج تک عرش کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ ماموں نے کہا تم ابھی بچے ہو اس قسم کی باتوں کا ذکر سوائے میرے اور کسی سے نہ کرنا البتہ رات کو سونے سے پہلے جو ورد میں بتا رہا ہوں ایک مرتبہ پڑھ لیا کرنا اور آہستہ آہستہ اس ورد کو سات تک بڑھا لینا۔ سات سال کی عمر میں قرآن پڑھ کر دوسری تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ ۱۲ سال کی عمر سے روزے رکھنے کا اور دو ... شروع ہوا۔ اب انھوں نے روزے مسلسل رکھنا شروع کئے۔ ان

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجئے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ______

مقام و پتہ ______

______


ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شامل مقابلہ کر لیجئے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ______

مقام و پتہ ______

______


ٹوکن دوش

دوشیزہ ادبا

لی ہیں اور مجھے ہ

ہے۔ منسلکہ حل

کے ہر فیصلے کا پا

نام ______

مقام و پتہ ______

میں داخل ہوگئے نماز کے بعد لوگوں پر نظر ڈالی اور کہا "خلص اہل عمل تو کم ہیں البتہ کلمہ گو زیادہ ہیں۔"

ایک مرتبہ آپ نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اور پا پیادہ چل دیے راہ میں ایک بیابان جگہ پر ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ آپ نے خیال [illegible] دیر لانے میں اسے اعانت کی ضرورت ہے۔ یہ خیال کرکے آپ اس ضعیفہ کی طرف بڑھے اس نے جب آپ کو قریب آتے دیکھا تو زمین سے ایک مٹھی مٹی بھری۔ جب آپ قریب آگئے تو اس نے مٹھی کھول دی مٹھی میں مٹی کے بجائے سونا تھا اس ضعیفہ نے آپ سے کہا تم تو دوسروں کی دولت پر غرور کرتے ہو لیکن مجھے غیب سے دولت ملتی ہے یہ کہہ کر وہ غائب ہوگئی۔ جب آپ بیت اللہ شریف پہنچے اور خانہ کعبہ کا طواف شروع کیا تو کیا دیکھتے ہیں کہ کعبہ اس ضعیفہ کا طواف کر رہا ہے۔ جب آپ اس کے قریب پہنچے تو ضعیفہ نے کہا "سہیل جو اختیاری طور پر یہاں پہنچتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کعبہ کا طواف کرے لیکن جو اضطراری طور پر آتے ہیں کعبہ خود ان کا طواف کرتا ہے۔"

آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ایک ایسے خدا رسیدہ بزرگ کا نیاز حاصل ہوا جو شب و روز دریا کے اندر مقیم رہتے تھے صرف پانچ وقت کی نماز کے لیے باہر آتے تھے میں نے ان کے کپڑے کبھی گیلے نہیں دیکھے فرمایا میں نے خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہے اور ایک بڑا پرندہ لوگوں کو پکڑ پکڑ کر بہشت میں لے جا رہا ہے۔ اس پر مجھے حیرت ہوئی۔ ندا آئی "یہ پرندہ تقویٰ ہے اور آج اہلِ تقویٰ اس کے طفیل جنت میں داخل ہو رہے ہیں۔"

"آپ نے فرمایا پیٹ بھر کر کھانے سے خواہشاتِ نفسانی اپنے عروج کو پہنچتی ہیں اور نفس اپنی مرادیں طلب کرنے لگتا ہے۔"

اہل اخلاص کو مصائب کا شکار بنا کر اللہ تعالیٰ آزماتا ہے اور اور اگر وہ ثابت قدم رہتے ہیں تو قرب عطا کرتا ہے ورنہ آتش فراق میں ڈال دیتا ہے۔

عالم کا درجہ بیشک بلند ہے لیکن عالم کی شناخت یہ ہے کہ ازل سے جو مقدرات قائم ہو چکے ہیں ان پر راضی رہے۔ علماء کی بھی تین قسمیں ہیں اوّل وہ عالم جو اپنے علوم ظاہری کو لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ دوم وہ عالم جو علوم باطنی کو اہلِ باطن کے سامنے پیش کرے سوئم وہ عالم جس کے علم کو اس کے اور خدا کے سوا کوئی نہ جانتا ہو

اسلام کے تین تریں اصول ہیں اوّل اخلاص و اعمال میں حضور اکرمؐ کی اتباع دوم رزق حلال سوم افعال میں اخلاص پیدا کرنا۔

افضل انسان وہی ہے جو بدعملی کو ترک کرکے نیک خصلت



اختیار کرے۔ فقرا کو نظر تحقیر سے مت دیکھو ان میں اکثر نائب اور وارث انبیاء ہوتے ہیں۔ کسی شخص نے آپ سے التجا کی کہ میں آپ کی صحبت میں رہنا چاہتا ہوں آپ نے جواب دیا میرے بعد کس کی صحبت اختیار کروگے اس نے کہا [illegible] کی صحبت [illegible] سے اس کی صحبت اختیار کروں۔ اس نے پوچھا کیا شیر آپ کے نزدیک آجاتا ہے تو آپ نے فرمایا "جب میں اسے کتا کہہ کر آواز دیتا ہوں تو وہ آجاتا ہے۔"

آپ بیمار پڑے اور صحت روز بروز گرنے لگی۔ یہ حال دیکھ کر مریدوں و معتقدین نے جان لیا کہ یہ آپ کا آخری وقت ہے اس وقت کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ کی وفات کے بعد خلیفہ کون ہوگا اور بر سر منبر وعظ کون کرے گا آپ نے فرمایا شاذول گبر آتش پرست میرا خلیفہ ہوگا آپ نے اس آتش پرست کو بلوایا اور کہا کہ میری وفات کے تین دن بعد نماز ظہر کے بعد وعظ کہنا۔ یہ سننے کے بعد وہ سر جھکا کر واپس چلا گیا۔

جنازے میں لوگوں کا اژدہام تھا اس میں وہ آتش پرست بھی شامل تھا اور بد حواسی کے عالم میں چاروں طرف نگاہ کرتا تھا اور کہتا تھا لوگو دیکھو کتنے فرشتے کاندھا دینے کے لیے آسمان سے اترے ہیں۔

آپ کے وصال کو تیسرا دن تھا ظہر کے وقت مسجد میں لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا شاذول گبر اپنے قومی لباس میں مسجد میں داخل ہوا اور منبر پر بیٹھ کر اس نے خطاب کیا لوگو! تمہارے سردار نے مجھے تم سب کا راہنما بنایا ہے اور یہ بھی فرمایا تھا کہ تیری آتش پرستی کا وقت ختم ہو رہا ہے اس نے اپنا قومی لبادہ اتار کر پھینک دیا اور کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کیا لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا میں تو ظاہری لبادہ اتار کر مسلمان ہوگیا ہوں لیکن اگر تم اپنے پیر و مرشد سے ملنا چاہتے ہو تو باطنی زنار کاٹ کر پھینک دو۔ اس کے ان جملوں سے لوگوں پر اس قدر اثر ہوا کہ تمام آنکھیں پرنم ہوگئیں۔

ایک مرتبہ ایک شخص آپ کے سامنے سے گزرا تو آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ یہ شخص اہل باطن میں سے ہے آپ کے انتقال کے بعد وہ شخص آپ کے مزار پر بیٹھنے لگا۔ کچھ لوگ جنہوں نے آپ کا یہ قول سنا تھا انھوں نے اس سے کہا حضرت نے آپ کو اہل باطن کہا تھا لہٰذا آپ اپنی کوئی کرامت دکھائیے۔ اس شخص نے قبر سے مخاطب ہوکر کہا سہیل کچھ تو فرمائیے اندر سے آواز آئی "خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے نہ اس کا کوئی شریک!" پھر اس شخص نے کہا کہ ایسے مواقع پر سہیل کہنے والے کی قبر روشن ہو جاتی ہے آواز آئی میری قبر بھی اللہ تعالےٰ نے منور فرما دی ہے۔ آپ کی وفات ۲۸۳ھ میں ہوئی اس وقت آپ کی عمر ۸۰ سال کی تھی۔

●●●

## قسط نمبر ۹

بینا گھر واپس آکر اسے اتنا سکون ملا۔ اس کے اس طرح اچانک واپس آجانے پر پاپا خوش بھی تھے اور حیران بھی ——— اس کی صحت پہلے کے مقابلے میں کہیں بہتر تھی۔ پاپا کو دیکھ کر بہت اطمینان ہوا ——— بینا اپنے گھر آکر بہت خوش تھی ——— تمام دن وہ خود کو مصروف رکھتی ——— پاپا کے چھوٹے موٹے کام کرتی ——— اپنے ہاتھ سے ان کے لیے نئی نئی ڈشش تیار کرتی۔ پھول پودوں کی دیکھ بھال کرتی ——— میوزک اچھا خاصا سیکھ لیتی تھی، اکثر پاپا کو بھی سنایا کرتی ——— وہ خوش ہو کر اس کی پیٹھ تھپک کر تعریف کرتے۔

بہرحال وہ خود کو بہلائے رکھتی پھر بھی ذہن اکثر بھٹک کر شرجیل کی طرف چلا جاتا۔ اس سے ہمدردی بھی محسوس کرتی اور نفرت بھی۔ اپنے اس دوہرے جذبے پر خود ہی حیران ہوتی۔ خود اپنی سمجھ نہ آتی۔ ——— وہ ضدی اور مغرور مزاج لڑکا جانے میرے انکار کو کس طرح برداشت کر پایا ہوگا ——— مگر اب میں کر بھی کیا سکتی ہوں۔ سب کچھ گوارا کر سکتی ہوں مگر یہ نہیں کہ کوئی میرے پندار کو ٹھیس پہنچائے ———

وہاں اس نے اچھا وقت گزارا تھا ——— اکثر بیتے دنوں کی یاد اسے بے چین کر دیا کرتی لیکن پھر بھی کبھی دوبارہ وہاں جانے کی خواہش دل میں پیدا نہ ہوتی ———

"میں اپنے گھر میں بہت خوش ہوں۔"

اس دن موسم بہت اچھا ہو رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بے حد فرحت بخش تھی۔ اردگرد روشوں پر کتنے ہی پھول بکھرے پڑے تھے ——— بینا ایک درخت سے ٹیک لگائے کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی ——— پتے ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے قدموں میں گر رہے تھے ——— ہینڈلوم کی سادہ سی ساڑی میں بہت معصوم لگ رہی تھی ——— گیٹ کی راہ آتی کار کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی ——— یہ پاپا کے پرانے جاننے والے مسٹر عثمان ان کی خوبصورت بیگم اور اکلوتا بیٹا اعظم تھے۔ مسٹر عثمان کی یہ دوسری شادی تھی۔ بیوی خوبصورت اور جوان ملی تھی۔ بہت خوش تھے ——— واقعی پیسے میں بڑی طاقت ہے ——— مسکراتی ہوئی وہ ان کی طرف بڑھی۔

"آداب انکل ———"

"کیسی ہے ہماری بیٹی ——— عثمان صاحب نے پیار

سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا
"بالکل ٹھیک انکل ——" وہ مسکرائی۔
"کیا حال ہے بیٹا ——" بیگم عثمان نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
"اچھی ہوں آنٹی آپ سنائیں —— آئیں آپ لوگ اندر چلیں، پاپا ادھر ہی ہیں۔"
وہ انھیں لیے ڈرائنگ روم میں آئی۔ عزیز صاحب دیوان پر نیم دراز اخبار پڑھ رہے تھے —— مہمانوں کو آتا دیکھ کر مسکراتے ہوئے اٹھ بیٹھے —— اخبار ایک طرف رکھ دیا۔
"آؤ بھئی عثمان بڑے دنوں بعد آئے۔"
"کچھ مصروفیت ہی ایسی رہی —— یوں بھی پچھلے دنوں باہر گیا ہوا تھا اسی لیے آنا نہ ہوا۔"
پاپا اور عثمان صاحب باتوں میں لگ گئے۔ وہ بیگم عثمان کے پاس صوفے پر آ رہی۔
"کیا کر رہی ہو ان دنوں تم ——" انھوں نے بیناؔ سے پوچھا۔
"کچھ نہیں کھیل کود کر ہی وقت گزار رہی ہوں۔" وہ مسکرائی۔ بیگم عثمان ہنس پڑیں۔ کہنے لگیں۔
"سنا ہے تم میوزک سیکھ رہی تھیں۔"
"کسی نے گپ اڑائی ہوگی۔"
"تمھارے پاپا بتا رہے تھے۔"
"پھر تو ٹھیک بات ہے۔" وہ ہنسی۔
"کسی دن تم سے کچھ سنیں گے۔"
"ضرور ——"
کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر بات بیناؔ کی ذات پر آ گئی بیگم عثمان کہنے لگیں۔
"اب تم کیا سوچ رہی ہو بیٹا ——"
"کس چیز کے متعلق آنٹی ——" وہ کچھ نہ سمجھی۔
"سنا تھا کہ —— کہ احمر نے ......"
اور ان کی اس ادھوری بات کو سن کر بیناؔ زرد پڑ گئی —— سانسیں حلق میں پھنسنے لگیں —— کچھ بول نہ پائی۔ پیلے چہرے کے ساتھ ہاتھ دھرے بیٹھی رہی۔
"بات واقعی بہت تکلیف دہ ہے مگر تم اس کا اثر نہ لینا۔ یوں تو ہوتا ہی رہتا ہے۔"
"ارے نہیں آنٹی۔" وہ دکھ چھپا کر ہنس دی۔ "کون سا میرا اس سے دلی تعلق تھا —— اور پھر یہ بندھن تو پاپا اور ممی کا باندھا ہوا —— وہی جانیں اس کے متعلق ——"
"کسی حد تک ٹھیک ہی کہتی ہو پھر بھی تمھیں دکھ تو ہوا ہوگا۔"
"کچھ ایسا بھی نہیں —— یوں تو فطری سی بات ہے اور میرا خیال ہے یہ کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں ہے جس کا اثر زیادہ دنوں تک رہے —— لوگوں پر تو اس سے بھی بڑے حادثے گزر جاتے ہیں —— میں تو بہت پُرسکون زندگی گزار رہی ہوں۔" اور بیناؔ کو یہ بات خود ہی مہمل سی لگی۔
"تمھارے پاپا تمھارے لیے پریشان رہتے ہیں۔"
"کیوں بھلا —— ؟"
"تم شاید شادی پر رضامند نہیں ہو رہی ہو —— ایک دن ذکر کر رہے تھے مجھ سے۔"
وہ دلی تاثرات چھپا کر ہنس دی۔
"ایسی کونسی جلدی ہے آنٹی —— ابھی اتنی بڑی تو نہیں ہو گئی کہ وقت گزرا جا رہا ہو۔"
"بہرحال لڑکیوں کی شادی بیاہ کی یہی عمریں ہوا کرتی ہیں۔" بیناؔ کو اب اس ذکر سے الجھن ہو رہی تھی —— بیزاری سے سوچا ان کو دوسروں کے راز جاننے سے کتنی دلچسپی ہوتی ہے —— دوسروں کے متعلق باتیں بنانا ان کا خاص مشغلہ ہے —— خود کو کوئی نہیں دیکھتا اب یہی آنٹی ہیں بھلا ان کی عمر شادی کی تھی —— عثمان صاحب کا پیسہ دیکھ کر ان پر ریجھ گئیں، خود کو نہیں دیکھتیں میری فکر پڑ گئی۔
"میرا خیال ہے اب تمھیں شادی کر لینی چاہیے —— کہیں عمر نہ گزر جائے۔"
بیگم عثمان کی بات پر اس نے سر اٹھا کر انھیں دیکھا —— زیرِ لب تھوڑا سا مسکرائی۔ بولی:
"میں تو آپ سے بہت چھوٹی ہوں آنٹی اور آپ نے ابھی تین سال قبل ہی شادی کی ہے۔"
یہ سن کر وہ کچھ خفیف سی ہو گئیں —— جھینپ مٹانے کو ہنس پڑیں، پھر بات خود پر آنے لگی تو موضوع بدل دیا۔
"جہاں تم گئی تھیں وہاں کیسا وقت گزرا؟"
"خالہ کے پاس —— بہت اچھا وقت گزارا میں نے وہاں، سب لوگ بہت اچھے ہیں۔ میرا بڑا خیال رکھتے تھے۔"
"پھر چلی کیوں آئیں؟"
"کیا مطلب آنٹی —— وہیں رہ جاتی؟ اپنا گھر اپنا ہی

ہوتا ہے۔"

چائے آگئی تھی، اس نے اُٹھ کر سب کے لیے بنائی ——— اکرم سولہ سترہ سال کا نوجوان سا لڑکا تھا ——— کافی صحت مند اور خوبصورت، اپنی عمر سے کہیں بڑا لگتا تھا ——— بیٹھا خاموشی سے رسالے دیکھ رہا تھا ——— بینا کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے کر چھوٹے مہذب لفظوں میں اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر رسالے پر جھک گیا۔ عثمان صاحب بینا سے مخاطب ہوئے:

"اپنے انکل کو بھول گئی کیا بیٹا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں انکل آپ تو اتنے اچھے ہیں۔"

"پھر آتی کیوں نہیں ہماری طرف؟"

"آؤں گی ضرور کسی روز ———"

"گھوما پھرا کرو، تمہارا دل بہلا رہے گا ——— چند دن کی تو زندگی ہوتی ہے، ہنس کھیل کر گزار دو ——— کسی بات کی فکر نہ کرو، ہنسنے کا ساتھ سب دیتے ہیں روتے کا کوئی نہیں۔ کم از کم اپنا تو یہی تجربہ ہے۔"

"آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں انکل ———" وہ مسکرائی۔

"اگلے ہفتے ہمارا کچھ گھومنے گھمانے کا پروگرام ہے۔ میری بہن کی بچیاں بھی آئی ہوئی ہیں۔ تم بھی ساتھ چلو۔ یقیناً دلچسپی محسوس کرو گی۔"

"اپنے گھر سے یوں بھی بہت دور رہ چکی ہوں انکل اب کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا ——— پاپا بھی اکیلے رہ جاتے ہیں۔"

"بہانے بنا رہی ہے بیٹی۔"

"بہانہ نہیں انکل سچ کہہ رہی ہوں ——— یوں بھی میں اتنی گھومنے پھرنے کی عادی نہیں ہوں۔"

"بہرحال ہم اگلے سنیچر کو جائیں گے اگر موڈ ہو تو آجانا۔"

"دیکھوں گی اگر موڈ ہوا تو آجاؤں گی انتظار نہ کیجیے گا۔"

وہ لوگ چلے گئے تو وہ اپنے کمرے میں آگئی ——— کچھ دیر بیٹھی میوزک سے دل بہلاتی رہی پھر اُکتا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ کپڑے تبدیل کیے بال سنوارے، کچھ پیسے پرس میں ڈالے اور باہر نکل آئی ——— پاپا برآمدے میں بیٹھے تھے ——— وہ ان کے پاس آئی۔

"میں جا رہی ہوں پاپا۔"

"کہاں ——— ؟"

"کچھ شاپنگ کروں گی ——— آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتائیے۔"

"میرے بیٹے تم کیا شاپنگ کرو گی۔" وہ ہنس پڑے۔

"واہ کیوں نہیں ——— کوئی مجھے اتنی تمیز نہیں کیا ———"

"چھوٹی سی تو ہو، چیزوں کی کیا پہچان۔"

"کچھ اتنی چھوٹی بھی نہیں ہوں۔"

"میرے نزدیک تو ایسا ہی ہے۔"

"آپ کے نزدیک تو ہمیشہ ہی چھوٹی سی رہوں گی۔" وہ ہنستی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

بازار میں خوب رونق تھی۔ دکانیں جگمگا رہی تھیں۔ اندر کی لائٹوں میں چیزیں اتنی اچھی لگ رہی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا سبھی کچھ خرید ڈالے لوگ اپنی اپنی ضروریات کی چیزیں خرید رہے تھے ——————

——————— بینا بھی پرس سنبھالتی اندر چلی گئی ——— اپنی ضرورتیات کی چند چیزیں لیں اور پاپا کے لیے رومال خرید لیے۔ بل دے کر مڑی ہی تھی کہ کوئی اُس سے لپٹ گیا ——— یہ رعنا تھی اس کی پرانی ساتھی ——— جس کے ساتھ اس نے آنرز کیا تھا۔ کالج کے زمانے میں دونوں میں بڑی دوستی تھی پھر رعنا اپنی فیملی کے ساتھ نیروبی چلی گئی اور اس کا کچھ پتہ نہ رہا۔ آج اتنے دنوں بعد کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"ہائے بینا تمہیں دیکھنے کو کتنا دل چاہ رہا تھا۔"

"بےمروت کبھی خبر تو لی نہ۔"

"تم جانو خط لکھنے کے معاملے میں ہمیشہ کی چور ہوں۔ باجی کے پاس رہ کر جب پڑھائی کرتی تھی تب بھی گھر بہت کم خط لکھتی تھی اور امی کی ڈانٹ سنتی تھی ——— پچھلے ماہ نیروبی سے واپس آتے تو تمہارے گھر گئی تھی مگر معلوم ہوا کہ تم اپنے کسی رشتے دار کے پاس دوسرے شہر گئی ہوئی ہو ——— سناؤ کیسی گزر رہی ہے۔"

"آؤ باہر چل کر باتیں کریں گے۔" بینا اس کا ہاتھ تھامے دکان سے باہر آگئی۔ اتنے دنوں بعد رعنا سے مل کر بہت خوش تھی۔

"کیا موڈ ہے؟" اس نے رعنا سے پوچھا۔ "چائے چلے گی؟"

"ضرور چلے گی ——— اب کچھ زیادہ ہی عادی ہو گئی ہوں چائے کی۔"

"کیوں بھلا۔؟"

"بیکاری میں چائے کی طلب بھی کچھ بڑھ جاتی ہے۔" وہ ہنسی۔

بینا اس کی طرف مڑی، مسکرا کر پوچھا:

"ابھی تک یونہی گھوم رہی ہو یا کچھ شادی وادی کا بھی چکر ہے۔"

"تھوڑا تھوڑا ———" وہ آنکھ کا کونا دبا کر مسکرائی۔

"یہ بات ہے ——— پھر کب تک ارادہ ہے۔"

"جلد ہی ——— تم اپنی سناؤ ——— اکرم کب تک واپس آ رہا ہے؟"

اور اس بات پر بینا کا رنگ پھیکا پڑ گیا ——— جیسے ہاتھ پیروں

کی جان ہی نکل گئی ہو۔ کچھ بول نہ پائی۔ ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ دل پہ بوجھ سا آن گرا ——— آج یہ روحانہ پوچھ رہی ہے احمر کے متعلق، کل کو جانے کون کون پوچھے ——— لاکھ چھپانے پر بھی بات بھلا کب تک چھپی رہ سکتی ہے ——— جسے معلوم ہوگا باتیں بنائے گا۔ کچھ ہمدردی جتائیں گے کچھ طنز کریں گے اور یوں میری ذات مذاق کا نشانہ بن کر رہ جائے گی ——— یہ سوچ کر وہ ایک دم سے ہی سنسنا اٹھی۔

"تم نے بتایا نہیں بینا، احمر کا کیا پروگرام ہے۔ کب تک واپس آ رہا ہے۔؟"

روحانہ کی بات پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ بیزاری سے شانوں کو جھٹکا۔

"چھوڑو اس موضوع پر پھر کبھی بات کریں گے۔ آؤ چائے پینے چلتے ہیں۔"

دونوں چلتی ہوئی سامنے والے چھوٹے سے ریستوران میں چلی گئیں سب سے بچتی بچاتی ایک کونے والی میز پر بیٹھ رہیں۔ چائے پینے کے دوران زیادہ تر کالج کے زمانے کی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ اپنی شرارتوں کے قصے دہرائے جاتے رہے ——— اس زمانے میں بینا بہت شوخ اور کھلنڈری سی ہوا کرتی تھی۔ کالج کی شریر ترین لڑکیوں میں شمار ہوتا تھا اور اب یہ سب کچھ کتنا بدل گیا تھا۔ وہ زمانہ نہ رہا تھا ——— وہ باتیں نہ رہی تھیں ——— وہ حالات نہ رہے تھے ——— مزاج میں خاصی تبدیلی آگئی تھی۔ شرارتیں تو دور کی بات، ہنسنا بھی جیسے بھول گئی ہو ——— پیلا چہرہ لیے اداسی سے اِدھر اُدھر پھرا کرتی ——— خود میں ایک کمی کا احساس کرتی ——— اور یہ احساس بڑا جان لیوا تھا ——— اک دم اتنی بلندی سے گرنا کتنا ظالم ہوتا ہے ——— روح تک کچلی گئی تھی ——— اپنا وجود خود ہی اپنی نظروں میں چھوٹا لگنے لگا تھا ——— اس خوفناک حادثے کے بعد تو جیسے اس کا جینا ہی مشکل تھا۔

پھر پاپا کی کوششوں سے وہ کسی حد تک سنبھل گئی ——— خانم کے یہاں گئی تو بہت بہل گئی تھی پھر وہیں پر شرجیل ملا اور ایجانے میں ہی اس کی اکڑ اور گستاخ سے لڑکے سے وہ متاثر ہو گئی ——— دل میں اس کے لیے کچھ جذبے پیدا ہو گئے۔ پچھلی باتوں کو کسی حد تک بھول گئی، خود کو اس کی ذات میں گم کر دیا ——— مگر پھر اچانک ہی دل پر چوٹ پڑی۔ اس کی خودداری کو چوٹ پہنچائی گئی۔ اس نے بُری طرح اس کی توہین کی اور جہاں سے وہ چلی تھی پھر اسی مقام پہ آ پہنچی دل میں نیا زخم لیے ———

چائے ختم کر کے دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے باہر آ گئیں۔ بینا نے اسے اپنے یہاں چلنے کو کہا۔ اس نے پھر کسی دن آنے کا وعدہ کیا اور چلی گئی۔

صبح پاپا کورٹ چلے گئے تو وہ اپنا سامان سمیٹ کر باہر برآمدے میں آ بیٹھی۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ ہلکی ہلکی دھوپ میں خوشگوار سی حدت تھی۔ لان میں لگی گھاس سنہری ہو رہی تھی۔ وہ ٹانگیں دھوپ میں پھیلائے بیٹھی نٹنگ کر رہی تھی ——— بیکاری میں یہ اچھا مشغلہ ہوتا ہے ——— کبھی کبھی سر اٹھا کر گیٹ کی طرف بھی دیکھ لیتی۔ سامنے والی سڑک پر موٹروں کا ہجوم تھا۔ ہر رنگ اور ہر سائز کی موٹریں تیزی سے بھاگی جا رہی تھیں۔ ہلکے سُروں میں گنگناتے ہوئے وہ بڑی محویت سے اپنے کام میں مشغول تھی۔ خود کو اس وقت بہت پُرسکون اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ عین اسی وقت ہلکے سے شور کے ساتھ ایک موٹر اندر آ گئی، بجری پر سے چرچراتی برآمدے کے پاس آ کر رُک گئی۔ بینا نے اسے دیکھا اور مسکرا پڑی۔ وہ روحانہ تھی۔ موٹر بند کرتے ہوئے اُتر رہی تھی۔

"بڑی عمر ہے تمہاری۔ یاد ہی کر رہی تھی ———"

"گپ کیوں چلاتی ہے بینا، سب جانتی ہوں، منہ دیکھے کی باتیں ہیں۔"

"اتنی بے اعتباری ———"

وہ ہنستی ہوئی پاس ہی بیٹھ رہی ——— پوچھنے لگی۔

"کیا کرتی رہتی ہو سارا دن؟"

"اِدھر اُدھر کے کاموں میں وقت گزر جاتا ہے۔ کوئی خاص شغل تو ہے نہیں۔"

"میری مانو تو کہیں سروس کر لو، وقت اچھا کٹ جائے گا۔"

"سوچتی تو ہوں مگر پاپا نہ مانیں گے ——— اور پھر اب تو مجھے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے کوئی ایسی بات نہ ہو جو ———"

بینا کچھ کہتے کہتے رُک گئی ——— روحانہ نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا

"کیا کہنے لگی تھیں۔؟"

"کچھ نہیں ———" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "تم سناؤ کیسی گزر رہی ہے ——— شرارتوں کا وہی عالم ہے یا کچھ سنجیدگی بھی آئی مزاج میں۔"

"اب وہ دن کہاں رہے ———" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "کالج لائف کی تو بات ہی دوسری ہوتی ہے ——— شرارتوں میں لطف بھی آتا ہے ——— اب تو سب کچھ چھٹ گیا۔ کیا بے فکری کا زمانہ ہوا کرتا تھا۔"

"اب کونسی فکریں لگ گئیں۔"

وہ ہنس پڑی۔ بولی۔ "کچھ ادھر اُدھر کی۔"
"اچھا یہ بات ہے ——" بینا نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ پوچھا:
"کون محترم ہیں ؟"
"جینوا میں ہی ملاقات ہوئی تھی۔ اب وہ بھی یہیں پر آ گیا ہے۔"
"پھر تو مزے ہیں تیرے۔"
"ہیں تو سہی ——" وہ بےساختہ ہنس پڑی۔ بینا نے ایک دھپ اس کی پیٹھ پر لگائی۔
"بے شرمی کی بھی حد ہوتی ہے۔"
"اور کیا —— تم کیا جانو اس مزے کو۔ تم تو بچپن میں ہی بیاہ کر کے بیٹھ گئیں کچھ تو لطف لیا ہوتا زندگی کا۔"
بینا کی مسکراہٹ نوچی گئی —— چہرے پر سوچ کا سا رنگ آ گیا۔ کچھ بول نہ پائی۔ رومانہ پوچھنے لگی۔
"کبھی احمر کا خط وغیرہ آتا ہے ؟"
بینا نے کوئی جواب نہ دیا —— خاموشی سے میٹھی ننگ کستی رہی۔ خود کو سنبھالتی رہی —— اب تو اسے اس ذکر سے ہی وحشت ہوتی تھی —— چند لمحے سکوت رہا پھر رومانہ اس کی طرف جھک آئی۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہنے لگی:
"بینا احمر کے نام پر تم چپ سی کیوں ہو جاتی ہو —— کوئی ایسا ویسا معاملہ تو نہیں ہے —— کہیں اور تو دل نہیں لگا بیٹھی ہو۔"
بینا کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ ایک نظر اسے دیکھا پھر لمبی سانس لیتے ہوئے سر جھکا لیا۔
"کیا بات ہے بینا —— ؟" رومانہ نے آہستہ سے اس کا بازو چھوا۔ "احمر تمہیں پسند نہیں کیا —— ؟"
"رومانہ —— احمر سے اب میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔"
"کیا —— ؟" حیرت کے مارے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے —— یہ کیونکر ہوا —— ؟"
"بس ہو گیا جو کچھ ہونا تھا —— تقدیر پر کس کا زور —— اور پھر مجھے اس کا کوئی غم بھی نہیں ہے —— میں نے احمر کو دیکھا ہی نہیں، کوئی دلی تعلق بھی نہیں تھا۔ والدین نے یہ بندھن باندھا تھا اس وقت میں کچھ بولنے کے قابل نہ تھی —— اور اب کچھ بولنے کو رہ نہیں گیا ہے۔"
"بہر حال تمہیں دکھ تو ہوا ہوگا ؟"
"بچپن کی بات تھی۔ اپنے ساتھ احمر کا نام سنتی چلی آئی تھی، کچھ نہ کچھ تو لگاؤ ہو ہی جاتا ہے۔ بہر حال کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وقت گزرنے

اچھا شوہر تلاش کرنے کیلئے یہ بیچاری آج پندرہ مرتبہ بیوٹی پارلر کر چکی ہے

کے ساتھ ساتھ سب کچھ بھول جاؤں گی۔"
"بہت بُری خبر سنائی بینا —— یہ اچھا نہ ہوا ——" وہ اداس ہو گئی۔
"میں کیا کر سکتی ہوں —— کسے الزام دوں بھلا۔ اور کون جانے کس کا قصور ہے۔"
"پھر اب کیا پروگرام ہے تمہارا ؟"
"کچھ نہیں ——"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے، کچھ تو سوچتی ہو گی اپنے مستقبل کے متعلق ؟"
"رومانہ —— حالات مجھے اس ڈگر پر لے آئے ہیں کہ کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی مفقود ہو گئی ہے —— پاپا کو اس بات کا بہت دکھ ہے۔ بہت سے لوگوں کو اس کے متعلق پتہ چل گیا ہے اور بھلا ان کی زبانوں کو کون روک سکتا ہے۔"
"بینا ——" وہ دکھ سے بولی۔ "تم اس بات کا اتنا اثر نہ لینا۔"
"ارے نہیں ——" وہ آنکھوں میں نمی لیے ہنس پڑی۔
"بڑی سخت جان ہوں، تم فکر نہ کرو۔"
"خدا تمہارے حق میں بہتر کرے۔"
وہ اداس اداس سی اٹھ گئی۔ آہستہ سے بینا کا شانہ تھپتھپایا اور اپنی موٹر کی طرف بڑھ گئی۔ بینا اپنی جگہ پر ساکت بیٹھی اسے دیکھتی رہی —— کچھ بول نہ پائی۔ اسے خدا حافظ بھی نہ کہا۔ موٹر چلی گئی تو وہ چند لمحے سیدھی بیٹھی لمبے لمبے سانس لیتی رہی، پھر فوراً ہی ننگ میں مصروف ہو گئی۔
"کون جانے حالات مجھے کہاں لے جائیں۔"

■

صدیق علی خاں پاپا کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ بڑے

کاروبار کے مالک تھے۔ بہت ماڈرن گھرانا تھا۔ اکثر ہی پاپا سے ملنے آیا کرتے تھے۔ انھی کے یہاں پارٹی تھی۔ پاپا کے بے حد اصرار پر بینا کو بھی جانا پڑا۔ یوں بھی لوگوں کا سامنا کرنے سے ان دنوں وہ کترانے لگی تھی۔ وہ بات عام ہو رہی تھی جسے اس کے پاپا ہر ممکن طریقے سے چھپانا چاہتے تھے۔ بینا نے خود کو گھر میں قید کر لیا تھا۔ پھر بھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جگہ کوئی جاننے والا ضرور مل جاتا اور بات اس کی اپنی ذات پر آ ٹکتی جیسے سن کر اسے وحشت سی ہونے لگتی۔ بہرحال حالات کا مقابلہ تو کسی طور کرنا ہی تھا۔ کہاں تک خود کو چھپائے پھرتی۔

تیار ہو کر پاپا کے ساتھ پارٹی میں گئی۔ یہاں بڑا ہنگامہ تھا۔ طرح طرح کے فیشن دیکھنے میں آ رہے تھے۔ بڑی ماڈرن قسم کی جنریٹی تھی۔ عورتیں نیم عریاں لباس پہنے بے باکی سے مردوں کے ساتھ گھل مل کر قہقہے لگا رہی تھیں ہال میں ڈھیر سارے لوگ تھے اور ان کے ہاتھوں میں نازک نازک سے جام عورتیں بھی مردوں کا ساتھ دے رہی تھیں۔ دور سے آتی میوزک کی دھن پر پیر ہلکے ہلکے تھرک رہے تھے۔ بیگم صدیق علی خاں نے شوخ رنگ کی بھاری کام دار ساڑی پہن رکھی تھی۔ بڑے خوبصورت انداز میں صوفے کے بازو پر ذرا سا جھکی نزاکت سے شیمپین کا گلاس تھام رکھا تھا۔ ادھیڑ عمری میں بھی خاصی دلکش شخصیت کی مالک تھیں۔ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے بڑے خوشگوار لہجے میں لوگوں سے باتوں میں مصروف تھیں۔ بینا کو دیکھ کر دلکشی سے مسکرائیں، بڑھ کر ہاتھ تھام لیا۔

بینا آہستگی سے ان کے پاس بیٹھ رہی۔ چہرے پر بیزاری کی سی کیفیت تھی۔ کسی چیز میں دلچسپی نہ لے رہی تھی۔

"یہ عزیز صاحب کی بیٹی ہے نا —" بینا کو قریب سے آواز آئی۔ آہستہ سے گردن موڑ کر دیکھا۔ بھاری بھرکم سی عورت اسے دیکھتے ہوئے قریب بیٹھی عورت سے سرگوشیوں میں کچھ کہہ رہی تھی۔ بینا نے ایک نظر انھیں دیکھا پھر اٹھ گئی۔

راہداری سے گزرتے ہوئے دبی دبی سرگوشیوں میں اپنا نام سن کر غیر ارادی طور پر رفتار مدھم پڑ گئی

"یہی بینا ہے نا —— عزیز صاحب کی بیٹی، سنا ہے اسے طلاق ہو گئی ہے۔"

"ہاں ٹھیک سنا ہے تم نے۔"

"آخر کوئی وجہ تو ہوئی۔" لہجے میں تجسس تھا۔

"یقیناً ہوئی لیکن اپنی خامیاں کون بتاتا ہے۔ بلاوجہ لڑکے والوں کو الزام دے رہے ہیں۔"

بینا سانس روکے سب کچھ سنتی رہی۔

"سنا ہے عزیز صاحب اپنی بیٹی کی شادی کی فکر میں ہیں۔"

"فکر کیوں نہ ہو گی۔ لیکن رشتہ تو ملے۔ طلاق یافتہ لڑکی کو کون پوچھے گا، لاکھ خوبصورت سہی۔"

بینا اک دم سے ہی سنسنا اٹھی۔ سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے۔ بمشکل دہلیز کا سہارا لے کر سنبھل سکی۔ سفید چہرہ لیے دوسری طرف بڑھ گئی۔ آنکھوں میں آئی نمی کو پلکیں جھپکا جھپکا کر روکتی رہی یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی عزت سر بازار نیلام کر دی گئی ہو۔ اپنا وجود خود اپنی ہی نظروں میں حقیر معلوم ہونے لگا۔ مارے دکھ کے چہرہ پیلا پڑ گیا۔ جیسے سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو۔

نسبتاً اندھیرے میں جا کر اس نے ہتھیلیوں کی پشت سے آنسو پونچھے اور چپ چاپ اندر چلی گئی۔ محفل زوروں پر تھی۔ وہی شوخی وہی چہل پہل —— پینے پلانے کا شغل بھی ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی سب سے الگ تھلگ ایک طرف کو بیٹھ رہی۔ دل اتنا بُرا ہو رہا تھا۔ آنسو تھے کہ خود بخود امڈے چلے آ رہے تھے۔ خود پر جبر کیے بیٹھی رہی۔ لوگوں کی نظروں سے خود کو بچاتی رہی مبادا کوئی اور کچھ کہہ دے۔ کسی طرف سے ہنسی کی آواز آتی تو اک دم سے ہی چونک پڑتی کہیں کوئی مجھ پر تو نہیں ہنس رہا۔ پریشان ہو کر ادھر اُدھر دیکھتی رہی گھٹی گھٹی سانسیں لیتی رہی۔

ڈنر کے بعد اچانک ہی واپسی کے لیے تیار ہو گئی۔ بیگم صدیق علی خاں اسے گیٹ تک چھوڑنے آئیں۔ اس کی اداس صورت دیکھ کر پیار سے ہاتھ تھام لیا۔

"اداس ہو رہی ہو بینا۔"

"نہیں آنٹی ——" وہ زبردستی مسکرائی۔

"جو کچھ ہوا اسے بھولنے کی کوشش کرو، یوں تو زندگی میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس سے بھی بڑے بڑے حادثے ہو جاتے ہیں۔"

بینا نے جھکا ہوا سر اوپر اٹھایا۔ خاموش نظروں سے انھیں دیکھتی رہی، آنکھوں میں جھلکتے آنسوؤں کی نمی لیے ہولے سے مسکرا پڑی۔

"مجھے کوئی غم نہیں اور —— شاید یہ اچھا ہی ہوا۔"

اور اس رات وہ بستر پر لیٹتے ہوئے اتنی سرد ہو رہی تھی، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اب جی نہ پائے گی گھٹن کا احساس شدید تر ہو رہا تھا یہ ذلت یہ رسوائی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ لوگوں کی زبانوں پر تالے تو نہیں ڈالے جا سکتے تھے اور ان کی باتیں برداشت کرنے کا حوصلہ بھی نہ تھا۔ اب وہ کس طرح غرور سے سر اٹھا کر چل سکے گی، کس کس کی نظروں کا مقابلہ کرے گی۔ یہ بات تو اب عام ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی ذات لوگوں کے

سے زائد حل ملنے پر قرعہ اندازی کے ذریعے ایک کا نام نکالا جائے گا۔ بصورت دیگر بالکل درست حل بھیجنے والے شخص یا اشخاص کو دیا جائے گا۔ اگر کوئی صحیح حل موصول نہ ہونے کی صورت میں پہلا انعام ایک غلطی والے حل بھیجنے والے شخص یا اشخاص کو دیا جائے گا۔ بعد ازاں بقیہ انعامات بھی اسی تناسب سے غلطی والے حل بھیجنے والوں کو دیے جائیں گے۔ ہر دوشیزہ ادبی معمے کا صحیح حل ظاہر ہونے کے بعد ماہنامہ دوشیزہ کراچی میں ان صاحب قلم حضرات کے یا ان کتابوں کے نام چھاپے جائیں گے جن سے اس دوشیزہ ادبی معمے کا اشارہ اخذ کیا گیا تھا۔ ادارہ دوشیزہ ادبی معموں کی ذمہ داری صرف ان مصنفین، شعرا، مؤلفین، مرتب یا مترجم حضرات کے نام یا تخلص یا اس کتاب کا نام جس سے اشارہ اخذ کیا گیا ہو شائع کرنے تک محدود ہے۔ ماہنامہ دوشیزہ میں شائع کی گئی اسناد قطعی، آخری اور حل بھیجنے والوں کو لازمی قبول کرنا ہوں گی۔ اگر کسی کتاب کے ایک سے زیادہ مصنف، شاعر، مؤلف یا مترجم ہوں تو کسی ایک کا نام یا مختصر نام شائع کرنا کافی ہوگا۔ کسی کتاب میں ایک مصنف، شاعر، مؤلف، مرتب یا مترجم کسی دوسرے صاحب قلم کے الفاظ نقل، اختصار یا ترجمہ کر کے شائع کرے تو اصل صاحب قلم کا نام یا اس کی نقل، ترجمہ، اقتباس یا اختصار کرنے والے مصنف، شاعر، مرتب، مؤلف یا مترجم کا نام یا مختصر نام شائع کیا جا سکتا ہے۔

۷۔ ایک دوشیزہ ادبی معمے میں ایک کوپن کے ساتھ آئے ہوئے حلوں پر صرف ایک انعام یا کسی ایک انعام کا صرف ایک حصہ دیا جا سکتا ہے مگر بڑے انعام کو چھوٹے انعام پر ترجیح دی جائے گی، الگ الگ کوپنوں کے ساتھ آئے ہوئے حلوں پر، خواہ وہ ایک ہی نام اور پتے سے بھیجے گئے ہوں، ہر کوپن کے ساتھ آئے ہوئے حل پر الگ انعام یا انعام کا حصہ دیا جائے گا۔ اگر انعامات کی تقسیم کے اعلان کے بعد کسی وقت کسی انعام کا کوئی اور حقدار پایا گیا یا کسی انعام پانے والے کی غلطیاں زیادہ پائی گئیں یا ایک کوپن کے ساتھ آئے ہوئے حلوں پر ایک سے زیادہ انعامات کا اعلان پایا گیا تو اس کی تلافی بعد میں انعامات کی تقسیم میں اسی حساب سے ترمیم کی جا سکے گی مگر انعامات کی ادائیگی کے بعد ایسی کوئی تبدیلی نہ ہو سکے گی اور اس کی تقسیم کو قطعی اور ناقابل تنسیخ قرار دیتے ہوئے ادا شدہ انعامات یا ان کے کسی بھی حصے کے لئے کسی کا کوئی مطالبہ جائز تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ ایک کوپن پر اور اس کے ساتھ آنے والے حل یا حلوں پر بھیجنے والے کی حیثیت سے صرف ایک شخص کا نام اور پتہ لکھا ہونا چاہیے۔ گروپ، ادارے، فرم، عہدے یا کمپنی کا نام حل بھیجنے والے کے نام کے طور پر استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ ایسے حلوں کو غیر مستحق قرار دیا جا سکتا ہے۔

۸۔ ماہنامہ دوشیزہ کراچی کا کوئی کارکن یا کارکن کا قریبی عزیز دوشیزہ ادبی معمے میں حصہ نہیں لے سکتا۔

۹۔ کوئی خاکہ جو ان شرائط کی یا دوشیزہ ادبی معمے کے ساتھ ماہنامہ دوشیزہ کراچی میں شائع ہونے والی تمام ہدایات کی پابندی نہیں کرتا غیر مستحق قرار دیا جا سکتا ہے۔ غیر مستحق قرار دیے جانے والے کسی بھی خاکے کی فیس داخلہ واپس نہیں کی جائے گی۔ اگر کسی کی ادا کردہ فیس اس کے بھیجے ہوئے خاکوں کے حساب سے زیادہ ہوئی تو ایسی زائد فیس بھی واپس نہیں کی جائے گی۔ شرائط یا ہدایات کی خلاف ورزی یا فیس ناکافی ہونے کے باعث غیر مستحق قرار دیے جانے والے خاکوں سے متعلق کسی قسم کی اطلاع دینے کی کوئی ذمہ داری مالکان دوشیزہ پر نہیں ہے۔ حلوں کی وصولیابی کے لئے مقررہ تاریخ اور وقت کے بعد پہنچنے والے حلوں پر انعام نہیں دیا جائے گا [illegible]۔

۱۰۔ دوشیزہ ادبی معموں میں شرکت کے لیے یہ واضح شرط ہے کہ فریقین کو دوشیزہ ادبی معموں سے متعلق تمام تنازعات میں مدیر ماہنامہ دوشیزہ کراچی کا ہر فیصلہ قبول ہوگا۔ ان کا ہر فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا اور ہر حل بھیجنے والا قانونی طور پر اس فیصلے کا پابند ہوگا۔

۱۱۔ دوشیزہ ادبی معموں کی یہ شرائط مالکان ماہنامہ دوشیزہ کراچی اور ہر حل بھیجنے والے کے درمیان ایک ایسے معاہدے کی حیثیت رکھتی ہیں جو ہر حالت میں کراچی میں تحریر پایا ہوا اور کراچی ہی میں مکمل اور عمل پذیر ہونا طے پایا ہے۔ اس سلسلے میں صرف کراچی کی عدالتوں کو حق سماعت ہے۔

۱۲۔ ہر دوشیزہ ادبی معمے کے انعامات کی ادائیگی کے بعد اس کے بھیجے ہوئے حل اور اس سے متعلق کاغذات ضائع کیے جا سکتے ہیں۔ نیز کسی انعام کی ایک بار ادائیگی یا عدم ادائیگی کے بعد تقسیم انعامات کا ہر حل بھیجنے والا پابند ہوگا۔

۱۳۔ غیر ممالک سے دوشیزہ ادبی معموں میں حصہ لینے والے شائقین کے انعامات پاکستانی کرنسی میں ادا کیے جائیں گے۔

۱۴۔ اگر دوشیزہ ادبی معموں کے کسی مقابلے میں سیاسی، غیر سیاسی یا ہنگامی حالات کی وجہ سے اعلان کردہ انعامی رقم مکمل طور پر جمع نہ ہو سکے تو ادارہ کو اختیار ہوگا کہ مجموعی رقم کا ۵ فیصد منہا کر کے باقی رقم انعام یافتگان میں تقسیم کر دے۔

۱۵۔ معمے کی آخری تاریخوں میں اگر آپ کو دوشیزہ ادبی معموں کے کوپن دستیاب نہ ہوں تو ہر کوپن کے لیے تیس پیسے کے ڈاک ٹکٹ اپنے حلوں کے ہمراہ بھیجیے۔

۱۶۔ دوشیزہ ادبی معموں کے سربند بکسوں میں اپنے حل ڈالنے سے پہلے احتیاطاً لفافوں میں بند کر دیجیے۔

۱۷۔ ایک کوپن کے ساتھ ایک ہی معمے کے کئی حل بھیجے جا سکتے ہیں۔ ایک کوپن کے ساتھ مختلف نمبروں کے معموں کے حل کسی صورت میں قابل قبول نہیں ہوں گے۔

دوشیزہ ادبی معموں میں اب آپ الگ الگ کوپنوں کے ساتھ بھیجے ہوئے حلوں کا الگ الگ انعام حاصل کر سکتے ہیں چاہے حل ایک ہی نام اور پتے سے کیوں نہ بھیجے گئے ہوں — لیکن اس رعایت سے آپ اسی صورت میں فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب آپ دوشیزہ ادبی معموں کی شرط نمبر ۲ کی پابندی کرتے ہوئے ایک منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر سے ایک کوپن کے ساتھ ایک ہی شخص کی طرف سے بھیجے گئے حلوں کی فیس بھیجیں۔ اگر منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر کے ذریعے کئی کوپنوں کے ساتھ آئے ہوئے حلوں کی فیس بھیجی جاتی ہے تو زائد کوپن نظر انداز کر دیے جاتے ہیں اور انعام صرف ایک کوپن پر ایک ہی دیا جاتا ہے۔

"میرے لیے کچھ نہ سوچیں پاپا ——— میں بہت مطمئن ہوں، میری فکر نہ کریں آپ ———"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بیٹا ——— تمھاری ماں زندہ ہوتیں تو مجھے اتنی فکر نہ ہوتی ——— وہ حالات کو سنبھال لیتیں۔ میں مرد ہوں۔ ان حالات سے بہت پریشان ہو گیا ہوں۔ یہی بہتر سمجھتا ہوں کہ جلد از جلد تمھیں بیاہ دوں۔"

"پاپا ———" بیٹا نے بڑی بے بسی سے انھیں دیکھا۔ "مجھے شادی نہیں کرنی ———"

"تمھاری ضد مجھے بہت دکھ دیتی ہے بیٹا۔ کسی طرح میری بات مان جاؤ تو بہت اچھا ہو ——— میں تم سے شرمندہ ہوں۔ میری ہی نا سمجھی نے تم پر یہ داغ لگایا ہے کتنے چاؤ سے میں نے تمھارا بیاہ رچایا تھا ——— تمھاری ماں بہت خوش ہوئی تھیں ——— تمھیں بیاہ کر انھوں نے بڑے سکون سے جان دی تھی ——— لیکن ——— لیکن مجھے کیا پتہ تھا کہ اس خوشی کے پیچھے کوئی طوفان چھپا ہے ——— اب تو میں تمھیں مجبور بھی نہیں کر سکتا، صرف سمجھا سکتا ہوں ——— التجا ہی کر سکتا ہوں ——— مجھے حق بھی کیا رہ گیا ہے کہ تم پر زبردستی کر دوں"

"پاپا ———" وہ تڑپی۔ "ایسی باتیں نہ کریں ——— پلیز ———"

اس نے پیار سے پاپا کا ہاتھ تھام لیا۔ آہستہ آہستہ سہلاتی رہی۔

"میری بات مان لو بیٹا ———" ان کے لہجے میں التجا تھی، کچھ ایسا ہی تاثر تھا کہ وہ بیقرار ہو گئی۔

"خدا کے لیے مجھے اور پریشان نہ کریں پاپا ——— میں مجبور ہوں مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں ———"

پاپا نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ——— کروٹ بدل کر لیٹ رہے ———

"پاپا ———" وہ ان پر جھک آئی۔ "آپ مجھ سے ناراض ہو گئے۔" انھوں نے آنکھیں کھول دیں اور اداسی سے مسکرا دئے۔ آہستہ سے اس کے بال سنوارے۔

"نہیں بے بی ——— جاؤ آرام کرو۔ میں بھی سونا چاہتا ہوں۔"

اور وہ کمرے کی لائٹ آف کرتے ہوئے دبے قدموں باہر آ گئی

صبح خلافِ معمول پاپا ناشتے پر نہ آئے تو وہ کچھ پریشان سی ہو کر ان کے کمرے میں گئی۔ وہ کمبل اوڑھے لیٹے تھے۔

"پاپا۔ آفس نہیں جائیں گے کیا ——— ؟"

انھوں نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ چہرہ کمبل سے باہر نکالا اور بیٹا یہ دیکھ کر پریشان ہو گئی کہ وہ ایک ہی رات میں برسوں کے مریض معلوم ہونے لگے تھے ——— وہ ان پر جھک گئی۔ پریشان ہو کر پوچھا:

"کیا ہوا پاپا ؟"

"بخار ہو گیا ہے۔"

"میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔"

ڈاکٹر آیا۔ دیکھ کر دوا دے گیا۔ وہ تمام دن اپنے پاپا کے پاس ہی رہی۔ ان سے اچھی اچھی باتیں کر کے ان کا دل بہلاتی رہی۔ وقت پر انھیں دوا پلاتی۔ اخبار پڑھ کر سنایا۔ ان کے ہاتھ پیر دباتی رہی۔ پاپا کی پریشان صورت دیکھ کر خود پریشان ہوتی رہی لیکن اب وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ پاپا کی بات ماننے کا حوصلہ نہ تھا اور انھیں فکرمند بھی نہ دیکھ سکتی تھی۔ تمام وقت خود سے الجھتی رہی۔ پاپا سے نظریں چراتی رہی۔ وہ زیادہ وقت خاموش ہی رہتے۔ آنکھ بند کئے کچھ سوچتے رہتے۔ وہ بات بھی کرتی تو ہوں ہاں کر کے ٹال جاتے۔

رفتہ رفتہ ان کی بیماری میں اضافہ ہوتا گیا ——— چند ہی دنوں میں صدیوں کے مریض معلوم ہونے لگے اور بیٹا ان کی بیماری کا قصوروار خود کو ٹھیراتی۔ اس کے مسلسل انکار نے پاپا کو بہت دکھ پہنچایا تھا۔ کسی طرح بیماری سے سنبھل ہی نہ رہے تھے۔ جوان بیٹی کی فکر انھیں کھائے جا رہی تھی۔ وہ اب اس سے کچھ کہتے بھی نہ تھے۔ عجیب قسم کی بے بسی اور لاچاری سے اس کی طرف دیکھتے رہتے ——— اور بیٹا ان کی نظروں میں اپنے لیے اتنا پیار اور اتنا دکھ دیکھ کر ندامت سے سر جھکا لیتی

"پاپا کتنے اچھے ہیں اور میں کتنی بری ہوں ——— پر اس دل کا کیا کروں جو کسی طور ان کی بات مانتا ہی نہیں۔ پاپا بھی مجبور ہیں اور میں بھی ———"

اور اس رات پاپا کی طبیعت اچانک ہی زیادہ خراب ہو گئی۔ گھبرا کر اس نے ڈاکٹر کو فون کر دیا ——— وہ آیا۔ بڑا سا انجکشن پاپا کے بازو میں لگایا۔ دوا میں کچھ تبدیلی کی، ٹمپریچر لیا اور چند ضروری ہدایتیں دے کر چلا گیا ——— بیٹا بڑے حوصلے سے آنسو ضبط کئے ان کے بستر کے پاس بیٹھی تھی۔ پاپا کا مرجھایا چہرہ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔ کچھ عجیب سے ہی احساسات اس پر طاری تھے۔ دل چاہ رہا تھا ان کی گود میں منہ چھپا کر رو دے۔ پاپا کی سانس تیز تیز چل رہی تھی اور بخار کی حدت سے چہرہ سرخ ہو رہا تھا ——— مگر پر موت کی سی خاموشی چھائی تھی اور اس خاموشی میں اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

"اگر پاپا کو کچھ ہو گیا تو ——"

اور یہ سوچ کر ہی وہ تڑپ گئی —— پاپا سے اک دم سے ہی اتنی محبت معلوم ہونے لگی۔ رات گئے تک ان کا ہاتھ تھامے بستر کے پاس ہی بیٹھی رہی۔ یونہی بیٹھے بیٹھے اونگھ سی گئی۔ پھر پاپا کے کراہنے کی آواز آئی تو چونک کر سیدھی ہو بیٹھی۔

"کیسی طبیعت ہے پاپا ؟"

انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے دیکھ کر آہستہ سے مسکرائے۔

"ٹھیک ہوں تم جا کر سو رہو —— ایسا نہ ہو کہ تمہاری طبیعت بھی خراب ہو جائے۔"

"میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی پاپا —— مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی ہے۔"

وہ اور کچھ نہ بولے۔ آنکھیں کھولے چھت کو گھورتے رہے۔ چہرے پر بے اندازہ تکلیف کے آثار تھے۔ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے چپ چاپ لیٹے تھے۔ کبھی کبھی آہستہ سے گردن گھما کر بیٹا کی طرف بھی دیکھ لیتے۔ وہ کرسی سے اٹھ کر ان کے قریب آ گئی۔ پیار سے ان کا بازو تھام لیا۔

"آپ اچھے ہو جائیں گے پاپا ——"

وہ کچھ نہ بولے۔ یونہی سوچوں میں ڈوبے لیٹے رہے۔ ذرا بھی جنبش نہ کی۔

"آپ پریشان ہیں پاپا —— میری وجہ سے ——"

"ہاں بیٹا ——" وہ آہستہ سے بولے۔ "مجھے تمہاری وجہ سے چین نہیں آتا —— سوچتا ہوں اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم کیا کرو گی —— کس کے سہارے جیو گی۔ میری بات مان لو تو کتنا اچھا ہو —— موت آئے گی بھی تو سکون کے ساتھ۔"

"پاپا ——" اس نے سسکتے ہوئے ان کے سینے پر سر رکھ دیا۔ "آپ جلدی سے اچھے ہو جائیں میں آپ کی ہر بات مان لوں گی۔"

"میں تم پر زبردستی نہیں کرنا چاہتا بے بی۔"

"زبردستی کی بات نہیں پاپا۔ آپ کی خوشی میری خوشی ہو گی۔"

"جاؤ جا کر سو رہو رات کافی گزر چکی ہے۔"

"اب تو آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں نا ——"

"پہلے ہی کب تھا۔" وہ مسکرائے۔ پیار سے اس کا ماتھا چوم لیا۔ بیٹا ہتھیلیوں کی پشت سے آنسو پونچھتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے کمرے میں آ کر بھی وہ کتنی ہی دیر تک تکیے میں منہ چھپائے سسکتی رہی۔

"کیسی طبیعت ہے تمہاری ـــــــ ؟"

وہ انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ ایک ہاتھ سے بکھرے بال برابر کرتے ذرا سی مسکرائی۔

"ٹھیک ہوں ـــــــ"

"پچھلے دنوں بھی سنا تھا بیمار تھیں ـــــــ"

"ہاں بخار ہو گیا تھا ـــــــ"

"اب بھی کمزور لگ رہی ہو ـــــــ" اور یہ کہتے ہوئے عادل کی ماں نے اس کا ہاتھ چھوا ـــــــ چونک کر اسے دیکھا۔

"تمہیں تو اب بھی بخار ہے۔"

"شاید ـــــ" وہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ چہرے پر بیزاری کی سی کیفیت تھی۔

"اتنا بیمار کیوں رہتی ہو ــ؟"

"اب مجھے کیا پتہ ـــــــ بیماری اپنے بس کی تو نہیں ہوتی۔"

وہ رکھائی سے بولی۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کر کے وہ چلی گئیں ـــــــ ان کے جانے کے بعد پاپا اس کے کمرے میں آئے۔

"بیٹا ـــــــ"

"جی پاپا ـــــــ" وہ اٹھ بیٹھی۔

"تمہیں پھر بخار ہو گیا ہے ؟"

بینا کچھ کہے ایک لمحے کو وہ انہیں معصومیت سے تکتی رہی، پھر سر جھکا لیا۔

"تمہارا اس طرح مسلسل بیمار رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ عادل کی ماں جی یہی کہہ رہی تھیں ـــــــ"

وہ جھنجھلا گئی۔ آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"اب اس میں میرا کیا قصور پاپا۔ میں جان بوجھ کر تو بیمار نہیں پڑتی نا ـــــــ"

"تم بیمار پڑ جاتی ہو تو مجھے بھی فکر ہوتی ہے ـــــــ اس کے علاوہ عادل کے گھر والے بھی باتیں بناتے ہیں۔ آج ہی ان کی ماں بہت فکر مند ہو کر گئی ہیں۔"

"سب کو میری ہی فکر کیوں پڑ گئی پاپا ـــــ" وہ تنگ آ کر بولی۔ "دوسروں کے لیے اور کوئی کام نہیں ہے کیا ـــــــ"

"تم کیا جانو ان سب باتوں کو ـــــــ" انہوں نے آہستہ سے کہا اور تھکے تھکے سے قدم اٹھاتے باہر چلے گئے۔

بینا کی آنکھوں میں ڈھیروں ہی آنسو بھرے تھے۔ پاپا کے جاتے ہی وہ چھلک پڑے۔ کتنی ہی دیر بازوؤں میں چہرہ چھپائے روتی رہی۔ اندھیرا دبے پاؤں اندر آ گیا تھا جب وہ بستر سے اٹھی۔ ہاتھ بڑھا کر لائٹ جلائی۔ آئینے کے سامنے کھڑی خود کو غور سے دیکھتی رہی۔ اپنی اجڑی صورت اور زرد چہرے کا احساس کیا۔ کچھ سوچ کر باتھ روم میں گھس گئی۔ کپڑے بدل کر ہلکا ہلکا میک اپ کیا۔ کپڑوں پر ڈھیر سارا سینٹ چھڑکا۔ لائٹ بند کی اور پرس ہلاتی عزیز صاحب کے کمرے میں آ گئی۔ وہ کسی کیس کی تیاری میں مشغول تھے ـــــــ بینا کو دیکھ کر قلم روک لیا۔

"میں جا رہی ہوں پاپا ـــــــ"

"کہاں ـــــــ ؟"

"ذرا رومانہ کی طرف جاؤں گی ـــــــ آپ کی کار لے جاؤں، کہیں جانا تو نہیں ہے آپ کو ـــــــ ؟"

"مگر تمہاری طبیعت ـــــــ ؟"

"میں ٹھیک ہوں ـــــــ"

"جاؤ اچھا ـــــــ مگر ذرا جلدی آنا۔ رات ہو رہی ہے۔"

لمبے سنسان برآمدے کو طے کر کے وہ پورچ کی طرف آئی۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور آہستگی سے ڈرائیو کرتی ہوئی رومانہ کی طرف چل دی۔

بڑی سی کوٹھی پر سناٹا چھایا تھا ـــــــ چند نوکر ادھر ادھر گھوم رہے تھے ـــــــ کار بند کرتے ہوئے وہ اندر آئی ـــــ ڈرائنگ روم میں رومانہ کی ممی، اس کے چھوٹے بھائی بہن اور چند دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ رومانہ کی ممی بینا کو دیکھ کر مسکرائیں۔

"آؤ بھئی بڑے دنوں بعد آئیں۔"

"کچھ مصروف تھی ممی اور تو کوئی بات نہیں ـــــــ"

"ہاں منگنی کے بعد لڑکیاں مصروف ہو ہی جایا کرتی ہیں ـــــــ"

وہ ہنس پڑیں ـــــــ بینا کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی ـــــــ پوچھا ـــــــ

"رومانہ کدھر ہے ـــــــ ؟"

"اپنے کمرے میں ـــــــ بلاؤں یا ادھر ہی جا رہی ہو ـــــــ"

"وہیں مل لوں گی ـــــــ"

طویل برآمدے کے آخری سرے پر رومانہ کا کمرہ تھا۔ اندر سے میوزک کی شوخ آواز آ رہی تھی۔

بینا پردہ اٹھا کر اندر چلی گئی۔ رومانہ کو دیکھ کر ہنس پڑی۔ وہ ریکارڈ لگائے ڈانس کی مشق کر رہی تھی۔

"یہ کیا اچھل کود ہو رہی ہے ـــــ بند کرو اسے"

آواز کو آہستہ کرتے ہوئے اس نے بینا کو اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

بے مروّت کتنے دنوں بعد آئی ہے ــــ میں اگر خود نہ آتی تمہارا تو کبھی دل ہی نہ چاہا ہے ــــ"

"ایسی بات نہیں۔ تمہیں کیا پتہ میں کتنی بیمار رہی۔"

"بیمار تھیں یا دلچسپیوں میں گم تھیں ــــ" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"دلچسپی کا ہے کی بھلا ــــ"

"بہت خوب ــــ" وہ ہنسی۔ "بغیر کسی دلچسپی کے ہی چپ چاپ انگوٹھی پہن لی۔"

بینا کچھ چپ سی ہو گئی ــــ آہستہ لہجے میں بولی۔ "یہ سب کچھ پاپا کی مرضی سے ہوا ہے ــــ"

"اور تمہاری مرضی کو اس میں دخل نہیں ہے ــــ"

"کیا بتاؤں ــــ" اس نے لمبا سانس لیا۔ "ایسے مقام پر آ گئی ہوں جہاں خوشی اور غم کا احساس ہی مٹ گیا ہے۔"

رومانہ ایک پل کے لیے حیران ہوئی ــــ آہستہ سے اس کی جانب جھک آئی ــــ پوچھا:

"تم اداس ہو ــــ تمہاری مرضی کے بغیر ــــ"

بینا نے جلدی سے بات کاٹی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ــــ میں مطمئن ہوں۔"

"پھر چہرے پر خزاؤں کی دھول کیوں جمی ہے۔"

"پچھلے کئی دنوں سے بیمار چلی آ رہی ہوں ــــ بخار پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

"کوئی وجہ تو ہو گی اس بیماری کی ــــ"

"وجہ کیا ہو گی ــــ" وہ بات ٹالنے کو بولی۔ "چائے پلواؤ، بڑا [illegible] ہو رہا ہے ــــ"

چائے پینے کے دوران دونوں ہنستے مسکراتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں ــــ یونہی باتیں کرتے کرتے اچانک بینا چپ سی ہو جاتی ــــ کچھ سوچنے لگتی۔ رومانہ نے اس کی کیفیت کو محسوس کیا ــــ آہستہ سے اس کے بازو کو چھوا، سرگوشی میں پوچھنے لگی۔

"بینا! وہاں تمہارا کوئی چکر تو نہیں چل گیا تھا؟"

"کہاں ــــ؟"

"وہیں جہاں تم رہنے کے لیے گئی تھیں ــــ"

"خانم کے یہاں ــــ"

"ہاں میں وہیں کی بات کر رہی ہوں ــــ"

"چکر کیسا ــــ؟" وہ مسکرائی

"بزمت ــــ صاف صاف بتاؤ، مجھے شبہ ہے کہ تم وہاں سے کچھ گڑبڑ کر کے آئی ہو ــــ اور یہ منگنی محض تم نے اپنے پاپا کو خوش کرنے کے لیے کی ہے ــــ"

"کیا کہنے آپ کی قیافہ شناسی کے ــــ" وہ دلی تاثرات چھپا کر ہنس پڑی۔

"مجھ سے چھپاؤ گی بینا ــــ میں لوگوں کے دلوں کی بات ان کے چہرے سے پڑھ لیا کرتی ہوں ــــ"

کپ میں قہوہ انڈیلتے ہوئے بینا نے سرسری انداز میں اسے دیکھا۔ منہ بنا کر بولی:

"جانے تم کیا ہانک رہی ہو ــــ"

"تمہیں میری قسم سچ سچ بتاؤ ــــ" رومانہ نے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا ــــ بینا نے ہاتھ میں پکڑی چائے کی پیالی قریب ہی تپائی پر رکھ دی ــــ چند لمحے یونہی ساکت بیٹھی رہی پھر کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی:

"وہ خانم کا بیٹا تھا ــــ اکھڑ اور گستاخ سا مگر ــــ میں اسے پسند کرتی تھی ــــ اور نہیں جانتی کہ میرے متعلق اس کے کیا جذبات تھے ــــ پھر ایک دن اس نے میری توہین کی اور اس واقعہ کے بعد اچانک ہی مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا ــــ لیکن میں نے اسے ٹھکرا دیا ــــ اور پھر ہماری آپس میں بری طرح بگڑ گئی ــــ اور میں چپکے سے اپنے گھر واپس آ گئی ــــ پاپا میری وجہ سے بہت پریشان رہتے تھے ــــ میں نے ان کی مرضی پر سر جھکا دیا ــــ جانے یہ اچھا ہوا یا برا ــــ"

"تمہیں اسے چھوڑنے کا کوئی دکھ نہیں ــــ؟"

"میں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے رومانہ ــــ اور اسی میں شاید بہتری بھی ہے ــــ"

"تم خود کو فریب دے رہی ہو بینا ــــ ایک ذرا سی بات کی وجہ سے تم نے اپنی خوشیاں خود ٹھکرا دیں ــــ یہ اچھا نہ ہوا۔ میں بخوبی جانتی ہوں کہ تم اسے بھول نہیں پائی ہو ــــ اور شاید کبھی نہ بھول سکو گی ــــ"

وہ تڑپ کر اس کی طرف مڑی ــــ مگر کچھ بول نہ پائی ــــ خاموش نظروں سے اسے دیکھتی رہی ــــ آنکھوں میں چمکتے آنسوؤں کی نمی اور ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ لیے کہنے لگی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے ــــ اور اب تو میں موجودہ حالات سے پوری طرح مطمئن ہوں ــــ وہ وہیں کی بات تھی

یہاں آکر میں نے کبھی یاد نہیں کیا ——" اور ایسا کہتے ہوئے اسے خود اپنی ہی آواز اجنبی لگی۔

"میں تمہاری طبیعت اور تمہارے مزاج کو اچھی طرح سمجھتی ہوں تم جیسی حساس لڑکی کسی بات کو اتنی جلدی قبول نہیں کر سکتی۔"

"شکریہ کہ آپ میرے متعلق اتنا کچھ جانتی ہیں —— بہرحال اس سے زیادہ اب کچھ جاننے کی کوشش نہ کرنا ورنہ خود اپنا دماغ خراب کرو گی ——"

ریحانہ خاموش تھی —— نظریں جھکائے بیٹھی تھی —— کمرے میں مکمل خاموشی تھی اور اس خاموشی سے بینا کو وحشت سی ہونے لگی ——

"ریحانہ ——"

اس نے نظریں اٹھائیں —— اور بینا نے دیکھا اس کی آنکھوں میں بہت سارے آنسو مچل رہے تھے

"تم کیوں اداس ہو رہی ہو ——"

وہ اس پر جھک آئی۔ اس کا سرد ہاتھ تھام لیا —— ہونٹ دبا کر اپنے آنسو روکے اور بنا کچھ کہے پرس اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گئی۔

☪

شام ڈوب چکی تھی۔ ہوا کافی سرد اور تیز تھی۔ بستر کے قریب ہی ہیٹر رکھا تھا۔ کمرہ خاصا گرم تھا پھر بھی بینا سردی محسوس کر رہی تھی —— کمبل اوڑھے چپ چاپ بستر پر پڑی تھی —— آج پھر اسے بخار ہو گیا تھا —— تمام جسم ٹوٹ رہا تھا —— آنکھیں موندے سونے کی کوشش کر رہی تھی —— اپنی بیماری کو پاپا سے چھپا رکھا تھا۔ ان کے سامنے جاتی تو مسکراتی ہی رہتی —— وہ اسے دیکھ کر مطمئن ہو جاتے —— دل میں لگے گھاؤ کو نہ دیکھ پاتے —— آنکھوں میں چھپے آنسوؤں کا اندازہ نہ کر سکتے ——

سامنے والی کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹ گیا تھا —— سرد ہوا کے جھونکے اندر آ رہے تھے —— بینا بستر سے اٹھی پردے برابر کیے اور پھر لیٹ رہی —— اسی وقت پاپا اندر آ گئے۔

"کیا کر رہی ہو بینا ——؟"

"اس خوبصورت موسم کا لطف لے رہی ہوں پاپا۔" وہ چہرے پر بشاشت لاتے ہوئے بولی۔

"کپڑے تبدیل کر کے ڈرائنگ روم میں آؤ۔"

"کیوں پاپا —— کوئی آیا ہے ——؟"

"ہاں —— عادل ہے —— تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

بینا سرد پڑ گئی —— ایک نظر بے بسی سے پاپا کو دیکھا پھر بنا کچھ کہے سر جھکا لیا —— وہ پریشان انداز میں بیٹھی رہی۔

"کیا بات ہے بے بی ——"

"پاپا —— میں اس کے سامنے نہیں جاؤں گی۔"

وہ ہنس پڑے۔

"کیا حرج ہے۔ منگنی کے بعد ایسا تو ہوتا ہی ہے۔"

"مگر پاپا ——" وہ الجھ گئی۔

"کپڑے بدل کر تم ادھر ہی آ جاؤ۔ میں چلتا ہوں۔"

پاپا کے جانے کے بعد وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہی —— دل کی دھڑکن پہلے سے کہیں زیادہ تھی —— عادل کا سامنا کسی طور سے نہ کرنا چاہتی تھی —— اس کے سامنے جانے کے خیال سے ہی چہرے کا رنگ اڑ گیا —— خود پر جبر کرتے ہوئے اٹھ کر کپڑے بدلے ہلکا ہلکا میک اپ کیا —— ایک بار خود کو آئینے میں دیکھا اور راہداری سے گزر کر ڈرائنگ روم کی طرف آ گئی۔

پردہ اٹھاتے ہوئے ہاتھ لرز سے گئے، کسی طرح قدم ہی نہ اٹھ رہے تھے —— یونہی پردہ تھامے کھڑی رہی ——

"آ جاؤ بینا ——" اندر سے پاپا کی آواز آئی۔

وہ چونکی اور عجلت سے پردہ اٹھا کر اندر چلی گئی۔ ایک اچٹتی سی نظر اس نے عادل پر ڈالی اور لاپروائی سے چلتی ہوئی پاپا کے قریب صوفے پر بیٹھ رہی ——

"کیسی طبیعت ہے مس بینا ——" وہ براہ راست اس سے مخاطب تھا ——

بینا نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پلو کو شانے پر جماتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھی۔ سرد سے انداز میں بولی:

"ٹھیک ہوں ——"

"امی نے بتایا تھا کہ آپ کچھ بیمار تھیں —— خیریت پوچھنے چلا آیا ——"

وہ کچھ نہ بولی۔ خاموشی سے بیٹھی کلائیوں میں پڑی چوڑیاں گھماتی رہی —— اسی وقت ہی پاپا کو فون کال پر جانا پڑا۔

"تم لوگ باتیں کرو میں ابھی آیا ——" اور یہ کہتے ہوئے پاپا چلے گئے۔

کمرے میں سکوت چھا گیا —— بینا گھبراہٹ سی محسوس کرنے لگی۔ دل چاہا اٹھ کر بھاگ جائے مگر یہ کسی طور ممکن نہ تھا۔

"بینا —— آپ نے مجھے دیکھ کر خوشی محسوس کی ——؟"

عادل کی آواز پر اس نے پہلو بدل کر اسے دیکھا ——— وہ ہونٹوں پر پُراسرار سی مسکراہٹ لیے اسی کو تک رہا تھا۔ بینا ان نظروں سے گھبرا سی گئی ——— چہرہ جیسے جلنے لگا ہو ——— بینا کچھ کہے آہستہ سے سر جھکا لیا۔

"اگر آپ کو پسند ہو تو کسی دن کہیں سیر کے لیے چلتے ہیں۔"

بینا نے اکتاہٹ اور بیزاری سے شانے جھٹکے ——— حکمانی سے بولی،

"گھر میں ہی میرے لیے کافی مصروفیت ہوتی ہے سیر و تفریح کے لیے فی الحال وقت نہیں ———"

"آپ کی مرضی ——— ویسے بات مان لیتیں تو مجھے خوشی ہوتی۔"

"مجھے افسوس ہے ——— میں کہیں نہ جا سکوں گی۔"

"خیر میں مجبور نہ کروں گا ———"

اسی اثنا میں چائے آگئی ——— وہ جھکی چائے بنا رہی تھی اور عادل دلچسپی سے اس کے خوبصورت چہرے کو تک رہا تھا ——— جھکی پلکوں اور گلابی چہرے کے ساتھ وہ اتنی بھلی لگ رہی تھی۔ بالوں کی ایک لٹ رخسار پر جھول رہی تھی اور چہرے پر معصوم سا نور پھیلا تھا۔

وہ اس کے مقابل صوفے پر بیٹھا تھا ——— چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے کبھی کبھی سرسری نظروں سے بینا کو دیکھ لیتا۔ جو بس بے تعلق نظریں جھکائے بیٹھی تھی ——— کسی دلچسپی اور گرمجوشی کا اظہار نہ کر رہی تھی ——— انداز میں اتنی ہی لاپروائی اور سرد مہری تھی ———

خالی کپ درمیانی تپائی پر رکھتے ہوئے وہ کہنے لگا:

"کتنے مزے کا موسم ہے اور آپ ہیں کہ اندر بیٹھی ہیں، چلیے باہر کا ایک چکر لگا کر آتے ہیں ———"

اس کے ہونٹوں کی اداسی میں ایک زخمی سی مسکراہٹ اُبھری

"آپ سیر کے خاصے شوقین معلوم ہوتے ہیں ———"

"درست ——— بشرطیکہ اچھا ساتھی مل جائے، اور آپ سے بہتر ساتھی بھلا کون ہو سکتا ہے۔"

بینا نے دیکھا وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا ——— اس کے چہرے پر رنگ سا آگیا ——— ہونٹ کاٹتے ہوئے پلکیں جھکا لیں، کچھ بول نہ پائی۔

سگریٹ سلگاتے ہوئے وہ اُٹھ کر دریچے میں جا کھڑا ہوا ——— کچھ دیر باہر جھانکتا رہا پھر ——— واپس مڑا ——— آہستہ آہستہ چلتا ہوا پاس آگیا ——— مدھم آواز میں ٹھیرے ٹھیرے لہجے میں کہنے لگا۔

"آپ سے ملنے کا کتنا اشتیاق تھا ——— سوچا تھا آپ کو لے کر کہیں کسی خوبصورت سی پُرسکون سی جگہ پر بیٹھ کر اچھی اچھی باتیں کروں گا ——— مگر آپ مان ہی نہیں رہی ہیں ——— خیر پھر کبھی سہی ——— اب کے آؤں گا تو ضرور لے جاؤں گا ——— اور آپ کو میری بات ماننی پڑے گی ——— مانیں گی نا ——— ؟"

وہ مسکراتا ہوا قریب آگیا ——— دلچسپی سے اس کی جانب جھک آیا ——— بینا گھبرا سی گئی ——— پلکیں جھپک جھپک کر اسے دیکھا کچھ بول نہ پائی ——— وہ ہنستا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

"اچھا میں چلتا ہوں ——— آئیے ہاتھ تو ملائیے ———" اور یہ کہتے ہوئے اس نے بینا کا چھوٹا سا سفید ہاتھ تھام لیا۔

"آپ کے ہاتھ کتنے گرم ہیں ———" وہ چونکا "بخار ہے کیا ——— ؟"

وہ کچھ نہ بولی آہستہ سے ہاتھ چھڑا لیا۔

"ٹھیک سے اپنا علاج کروائیں بھئی ——— یہ کیا کہ ہر دم بیمار ہی رہتی ہیں ——— ایسے کیسے کام چلے گا۔"

"آپ کیا سمجھتے ہیں۔ میں جان بوجھ کر بیمار ہو جاتی ہوں ———" وہ جل کر بولی۔

"میں نے یہ کب کہا ——— لیکن اس طرح بار بار آپ کی بیماری کا سن کر اُلجھن ہوتی ہے۔"

"تو نہ سنا کریں۔"

"بہت خوب ———" وہ ہنس دیا۔ "مزاج کی بھی خاصی تیز ہیں ———"

بینا نے ناگواری سے اسے دیکھا ——— پہلو بدل کر رہ گئی کچھ بول نہ پائی۔

"جائیں آپ آرام کریں ——— میں پھر کسی وقت آؤں گا مگر اب آؤں تو آپ کو بالکل ٹھیک ٹھاک پاؤں ———" اور یہ کہتا ہوا وہ پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا ——— اس کے جانے کے بعد بھی بینا یونہی بیٹھی رہی ——— کتنی ہی دیر گزر گئی ——— پاپا اندر آئے تو اس نے سر اٹھایا ———

"عادل گیا ——— ؟"

"جی ———" وہ آہستہ سے بولی اور سوئے سوئے قدموں سے اپنے کمرے کو چل دی ——— "باقی آئندہ"

ٹیکسی اس گاڑی کا پیچھا کرو

اس کو راہ پر لگانا بہت آسان تھا مگر میں نے جب دیکھا کہ وہ سیاستے میں اٹکھیلیاں نہیں کرتی، آنکھیں نہیں مٹکاتی اور شباب کے باوجود اس کی گدرائی میں بھاری پن نہیں ہے۔ اس کی چال میں الھڑپن گھلا ہوا ہے اس کے چھوٹے چھوٹے قدم کتنی یکسانیت اور توازن سے پڑتے ہیں جن میں بیک وقت آشنا قدموں کی لغزش بھی نہیں ہے تو میرے دل نے کہا شیرو! ابھی یہ کچی کلی ہے اسے تڑپنے اور مسلنے کا گھناؤنا کام مت کر۔ چنانچہ کریم سیٹھ کے ڈر کے کو میں نے بڑی سختی سے ڈانٹا کہ آئندہ پروین کے بارے میں کوئی بات نہ سوچے ورنہ (.....) انہی دنوں مجھے آپ بھی پروین کے گرد منڈلاتے نظر آ گئے۔ ایمان سے اگر پروین کی نظروں میں آپ کیلئے سچائی نہ پڑھ لیتا تو کب کا آپ کے سر پر ناریل پھوٹ چکا ہوتا۔ ویسے مجھے تم سے خطرہ تو نہیں لیکن سالے آجکل کے نوجوانوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ آج عشق کرتا ہے جان چھڑکتا ہے اور کل جب پانی سر سے اونچا ہو جائے تو کتنی آسانی سے یہ کہہ کر نکل جاتا ہے کہ میں کیا کروں۔ مجبور ہوں تم یہ کرو وہ کرو اور آخر میں لڑکی یا تو خودکشی کر لیتی ہے یا پھر زندگی بھر کے لیے روگ پال لیتی ہے اس لیے مجھے تمہاری یہ عاشقی واشقی پسند نہیں۔ اگر تم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو تو بتاؤ بقیہ انتظام میں کر لوں گا؟

شیرو نے مجھے سوچنے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت دی تھی لیکن وہ دن میرے فیصلے کے پابند نہ تھے۔ اس لڑکی کو خواب میں تو میں نے چاہا تھا لیکن اسے اس روپ میں میں نے کبھی نہ دیکھا تھا کہ مجھے زندگی بھر کے لیے اسے اپنانا ہوگا۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے گھٹے ہوئے لبوں پر کس کا نام ہے؟ اس کے نینوں کے دیپ مجھے زندگی کے اندھیروں میں اجالا بھی دے سکیں گے یا نہیں اگر میں انکار کروں تو شیرو ہی کی نظر سے نہیں بلکہ خود اپنی نظر سے بھی گر جاؤں گا۔ کیا کروں، کیا نہ کروں؟

وہ لڑکی جسے میں نے تفریح و زماں کی سستی سطح پر پسند کیا تھا میرے لیے مسئلہ بن گئی تھی۔ اب تک میرا ذہن اس کے جسم، صورت اور سیرت کی گرفت نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک ہفتہ ختم ہو گیا دو دن اور گزر گئے لیکن شیرو میرے پاس جیسی پایا۔ اس عرصہ میں وہ مجھے کہیں نہیں دکھائی دیا۔ اب میرا احساس بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ ہر طرف ہر جگہ ہر لمحہ اس کی منتظر آنکھیں میرا پیچھا کر رہی تھیں۔ ہر ساعت مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ہی میری نگاہ اٹھی اس کی متلاشی آنکھوں سے ٹکرا جائے گی۔ دروازہ کھلتا ہو یا آہٹ ہوتی ہو تو یہ معلوم ہوتا کہ شیرو کھڑا ہے۔ شیرو آگیا۔ یہ سب کیوں ہو رہا تھا۔ کیا پروین کو میں پسند نہیں کرتا تھا یا میری پسند کا معیار کچھ اور تھا؟ نہیں ان میں سے کوئی بات بھی نہ تھی بلکہ ایک کمزور سا خیال تھا کہ اتنی عجلت کی شادی کہیں ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بن جائے لیکن مجھے اس پر یقین تھا پھر میں کیوں ڈر رہا تھا۔ وہ لمحے بڑے اذیت ناک تھے جنہیں میں برداشت نہیں کر سکا اور شیرو کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ واقعی میرا منتظر تھا لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے میرے اس اہم ترین فیصلے سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی لیکن میں نے اسے اپنی رضامندی سنا ہی دی۔ اس نے صرف ایک بار تولنے والی نظروں سے مجھے دیکھا اور آؤ کہہ کر چل دیا۔ چودھری رشید کے ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں کہاں آ گیا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد چودھری صاحب نے مجھ سے کچھ سوالات کیے اور جواب سے مطمئن ہونے کے بعد انہوں نے کہہ دیا کہ کل شام سے پارٹ ٹائم میں ان کے دفتر میں آ کر کام شروع کر دوں اور جب ہم رخصت ہونے کیلئے دونوں اٹھ رہے تھے، تو چودھری صاحب نے پانچ سو روپے پیشگی دے کر مجھے مبہوت کر دیا۔ اتفاقات کی اس رفتار پر مجھے یقین نہیں آیا لیکن سب کچھ اس طرح اور اتنی آسانی سے ہو رہا تھا کہ میں جھٹلا نہیں سکتا۔

زندگی میں پہلی بار اتنے بہت سے روپے میری جیب میں تھے جو میرے اپنے تھے۔ چودھری رشید کے مکان سے باہر جب سارے روپے میں نے شیرو کے سامنے پیش کیے تو وہ چونک کر پیچھے ہٹ گیا اور کہنے لگا "پاگل میرا ہاتھ تنگ تھوڑی ہے اس لیے اپنے پاس رکھو اور شادی کا انتظام کرو، اگلے ماہ میں پھر پوری تنخواہ دلوا دوں گا" یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور میں سوچتا رہا یہ شخص کتنا عظیم ہے جسے میں غنڈہ تصور کرتا تھا۔ امتحان کے نتیجے تک سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ اب میں پورا دن کام کرنے لگا اور میری تنخواہ بھی چار سو روپے ماہانہ ہو گئی تھی۔ آہستہ آہستہ میں نے رقم پس انداز کرنی شروع کر دی اور پھر شیرو کی کوششوں کے طفیل میری شادی پروین سے ہو گئی لیکن اس دن کے بعد شیرو مجھ سے ملنے سے نہ جانے کیوں کترانے لگا اور میں ہزار کوشش کے باوجود اس کے سامنے اظہار تشکر نہیں کر پایا۔

مجھے یقین ہے کہ وہ سب کچھ سننے کے بعد کہہ دیگا:

"پاگل میرا ہاتھ تنگ تھوڑی ہے جاؤ عیش کرو"

* *

ابو الاثر حفیظ جالندھری

یہ ملاقات ، ملاقات نہیں ہوتی ہے
بات ہوتی ہے ، مگر بات نہیں ہوتی ہے

باریابی کا بُرا ہو کہ اب اُن کے در پر
اگلے وقتوں کی مدارات نہیں ہوتی ہے

غم تو گھنگھور گھٹاؤں کی طرح اُٹھتے
ضبط کا دشت ہے ، برسات نہیں ہوتی ہے

یہ مرا تجربہ ہے ، حُسن کوئی چال چلے
بازیِ عشق ، کبھی مات نہیں ہوتی ہے

وصل ہے نام ہم آہنگی و یک رنگی کا
وصل میں کوئی بُری بات نہیں ہوتی ہے

ہجر تنہائی ہے سورج ہے سوا نیزے پر
دن ہی رہتا ہے یہاں رات نہیں ہوتی ہے

ضبطِ گریہ کبھی کرتا ہوں تو فرماتے ہیں
آج کیا بات ہے برسات نہیں ہوتی ہے

مجھے اللہ کی قسم ، شعر میں تحسینِ بُتاں
میں جو کرتا ہوں مری ذات نہیں ہوتی ہے

فکرِ تخلیقِ سخن ، مسندِ راحت پہ حفیظ
باعثِ کشف و کرامات نہیں ہوتی ہے

## آسمانی میک اپ

میرا آئیڈیل میرے تصور میں جس قدر خوبصورت ہے، شاید میں اس کا سراپا پورا بیان نہ کر سکوں۔ دراز قد، سانولا سلونا نوجوان جو دل میں خلوص اور آنکھوں میں شرارت کی جوت جگائے ہوئے ہو۔ بہت بڑا بزنس مین جو سیر و سیاحت کا شوقین ہو اور دیس دیس کی فطری رنگینیوں سے لطف اندوز ہو سکے۔

میں ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ عمر ۱۸ سال، متناسب خد و خال اور سراپا انتہائی پرکشش، میرا قدرتی میک اپ اپنا جواب نہیں رکھتا۔ میں دولت پرست نہیں لیکن ایک باوقار زندگی اور معاشرے میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے لیے اسے بہت ضروری سمجھتی ہوں۔

زاہدہ پروین - ڈیرہ غازی خاں

★★ ذاکرہ سمیع خاں ★★

## د کی ہچکی

میرا آئیڈیل ایک مخلص ساتھی ہے جس کا دل میری طرح چوٹ
ایا ہو اور جو میرے سارے دکھوں کو سمیٹ کر میرا دامن مسرت کی کلیوں
بھر دے۔ عمر یہی کوئی ۲۴/۲۵ سال۔ کسی اچھے عہدے پر فائز یا ذاتی
نس جو خوشگوار زندگی کا ضامن ہو سکے۔

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۲۰ سال تعلیم ایم
اے، اسمارٹ جسم، خوش رنگ، خوش مزاج۔ میٹرک کے بعد شادی ہو
ئی تھی جو ایک دکھ درد کی ہچکی بن کر میرا سارا ذہنی سکون چھین لے گئی۔
کاش میرے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا کسی ایسے مخلص اور حساس
سان کے کانوں تک پہنچ سکے جو میری بکھری ہوئی زندگی کو اپنی چاہت
کے دامن میں سمیٹ لے۔

نسرین - راولپنڈی

## پلکوں کے اشارے

میرا بھی ایک آئیڈیل ہے ——— عمر یہی کوئی ۲۶/۲۸ سال،
دراز قد، چوڑے چکلے سینے والا صحت مند انسان جو ہر شخص سے کم تکلف
سے زیادہ بات کرے۔ وہ کسی بھی عہدے پر ہو مگر ایک گنگناتی ہوئی
خوشیوں سے بھرپور زندگی گزارنے کے قابل ہو۔

میں ایک متوسط گھرانے کی لڑکی ہوں۔ بی اے فائنل کی طالبہ، شکل و
صورت کے اعتبار سے اس صناعِ دو جہاں کی بنائی ہوئی ایک مسکراتی ہوئی
تصویر ہوں۔ ادبی ذوق ورثے میں ملا ہے مگر حقیقت پرست ہوں۔ ممکن
ہے میری پسند کی شخصیت یہیں کہیں موجود ہے۔

ناہید اشرف - کراچی

## چشم نم

میرا آئیڈیل ——— ایک تعلیم یافتہ، سلجھا ہوا، روشن خیال
نوجوان، سرکاری ملازم، تنخواہ کم از کم ۱۲۰۰/- روپے ماہانہ، ذات پات
کی کوئی قید نہیں نہ کار کوٹھی کی ضرورت، صرف ذاتی گھر ہو۔ وہ صاحبِ
نظر ہو اور صحیح معنوں میں میرا ہمسفر، رازدان اور مددگار ثابت ہو۔ جہیز کا لالچی
اور شکی مزاج نہ ہو۔

میں ایک معزز گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۲۴ سال، تعلیم ایم اے،
ایم ایڈ، تنخواہ ۸۰۰/- روپے ماہوار، میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔
اور میں اپنی ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کی واحد کفیل ہوں۔ میرے آئیڈیل

کو ہر لمحے مدد کا احساس ہوتا رہتا ہے۔

شمس، کراچی

## غزالی آنکھیں

میرا آئیڈیل ——— خوبرو، دراز قد، مردانہ وجاہت
کا جیتا جاگتا مجسمہ، خوش مزاج، خوش گفتار، آنکھیں پرکشش اور شرارت
سے لبریز، کسی اچھے عہدے پر فائز ہو جو زندگی کو خوشگوار طریقے
سے گزار سکے۔ اگر میرا آئیڈیل غیر ملک میں مقیم ہو تو کیا کہنے!

میں ایک معزز گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۲۲ سال، تعلیم ایم بی
ایس، گوری رنگت، غزالی آنکھیں، دراز گیسو اور بے حد پرکشش۔
کاش میری تمنا پوری ہو جائے۔

ڈاکٹر "ح"

## پیار کی مالن

میں نے بھی اپنے لیے ایک آئیڈیل تراشا ہے ———
خوبصورت، خوب سیرت، بلند کردار نوجوان، شرافت اور وجاہت کا
جیتا جاگتا شاہکار، صحت مند، خوش مزاج اور خوش کلام، پاکستان سے
باہر کسی اچھی پوسٹ پر ہو۔

میں ایک معزز گھرانے کی خوبصورت دوشیزہ ہوں۔ عمر ۲۲ سال،
تعلیم بی اے، دراز قد، رنگت سرخ و سپید، سراپا انتہائی دلفریب،
سلیقہ مند اور حساس لڑکی ہوں۔
کاش میرا آئیڈیل مل جائے تاکہ میں اس کی زندگی کی راہوں میں
چاہت بھری خوشیوں کے پھول بکھیرتی جاؤں۔

شوبیہ، صادق آباد

## دل کی بات

میرا آئیڈیل ذرا مختلف قسم کا ہے۔ آجکل لڑکیوں کو تو خوبصورت
اور دولت مند نوجوانوں کی تلاش ہے۔ مگر مجھے تو کسی ایسے نوجوان کی تلاش
ہے جو دل کا اچھا ہو، حسن اور دولت پر جان نہ دیتا ہو، امیر ہو یا غریب،
بہرحال قبول صورت اور سلجھا ہوا انسان ہو جو خوشگوار ازدواجی زندگی بسر
کرنے کے آداب سے بخوبی واقف ہو۔

میرا تعلق ایک معزز گھرانے سے ہے۔ ایف اے کی طالبہ ہوں اور
شکل و صورت کے اعتبار سے کافی دلکش ہوں۔
میں اپنے آئیڈیل کی پکار کی منتظر ہوں۔ شمیمہ شہاب، گجرات

## دامنِ بہار

میرا آئیڈیل ——— ایک تعلیم یافتہ، مہذب اور اسمارٹ سا نوجوان خوش مزاج اور آنکھیں شرارت سے بھرپور، کسی اچھے عہدے پر فائز ہو تاکہ باعزت اور خوشگوار زندگی بسر ہو سکے۔

میں ایک معزز گھرانے کی لڑکی ہوں، تعلیم انٹر، سانولی سلونی، سگھڑ اور بڑی حساس ——— مجھے یقین ہے کہ مجھے میرا آئیڈیل ضرور مل جائے گا اور میں اس کی چاہت کے دامن کو بہاروں سے بدل دوں گی

رعنا پروین۔ کراچی

## بھٹکتی نظریں

میرا آئیڈیل ——— انجینئر، فوجی آفیسر یا ڈاکٹر جو بڑا مخلص اور خوش کردار ہو۔

میرا تعلق متوسط گھرانے سے ہے۔ تعلیم ایف اے، عمر ۲۲ سال، ایک گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر ہوں۔ نقش و نگار خوبصورت اور سراپا دلفریب میری نظریں اپنے آئیڈیل کی تلاش میں بھٹکتے بھٹکتے تھک گئی ہیں۔

کاش میرے دل کی مراد جلد ہی بر آئے۔

ناھید، سیالکوٹ

## خودسری سلامت

میرا بھی ایک آئیڈیل ہے ——— کلاس ون آفیسر، انجینئر یا بزنس مین، دراز قد، سانولا سلونا، اسمارٹ نوجوان، خودسر، اکھڑ مزاج مگر دل چاہت میں ڈوبا ہوا۔ پاکستان سے باہر ہو تو پھر خوب!

میں ایک معزز گھرانے کی زیرِ تعلیم دوشیزہ ہوں، دراز قد، سانولی سلونی، خوبصورت گیسو اور نشیلی آنکھیں۔ کاش مجھے میرا آئیڈیل مل جائے تو اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے نہاں خانۂ دل میں سیٹ کر اس کی پجارن بن جاؤں۔

ن، ایوب۔ کراچی

## طرحِ نو

میرا آئیڈیل ——— ایک اسمارٹ، جدید فیشن کا متوالا آرمی، ایئر فورس آفیسر یا بزنس مین جس کی چاہت بھری خوبصورت آنکھیں مجھے ہر گھڑی بے چین رکھیں۔ وہ سیر و سیاحت کا شوقین اور ٹوٹ کر چاہنے والا ہو۔

میں ایک برقعے سے قدر کی بڑی اسمارٹ اور خوبصورت لڑکی ہوں

بادامی آنکھیں، تیکھے نقوش اور دلکش سراپا۔ گیسو میرے سانپ کی صفت پذیر شانہ ہیں۔

کاش مجھے میرا آئیڈیل مل جائے تو زندگی اور بھی حسین ہو جائے۔

شاھدہ، کراچی

## ایک تمنا ——— سادہ سی

میرا آئیڈیل کوئی خوبصورت اور اسمارٹ نوجوان نہیں بلکہ ۲۵/۲۳ سال کا عام سا انسان جو صحت مند، خوش مزاج اور رحم دل ہو مغل برادری سے تعلق رکھتا ہو، شکی مزاج ہرگز نہ ہو، ازدواجی زندگی کی جملہ ضروریات آسانی سے مہیا ہو سکیں۔

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں، عمر ۲۰ سال، تعلیم مڈل، گوری رنگت، متناسب جسم اور نقش و نگار دلچسپ۔ میں سادگی پسند اور نماز روزے کی پابند ہوں۔

مجھے امید ہے میری یہ سادہ سی تمنا ضرور پوری ہو جائے گی۔

دافی، این۔ بورے والا

## کہاں ہے منزل تیری

میں نے اپنے سپنوں میں کوئی حسین شہزادہ نہیں بسا رکھا صرف ایک ایسا ہمدرد انسان جو خلوص کی قدر کرنا جانتا ہو اور کسی معزز پیشے سے تعلق رکھتا ہو۔ دراصل مجھے ایک ایسے ہم سفر کی تلاش ہے جو خود بھی زندگی کے دکھ اور تلخیاں سمیٹ چکا ہو تاکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دکھ بانٹ سکیں ——— میں اس شخص کا انتظار کروں گی۔

میں ایک معزز گھرانے کی دکھی دوشیزہ ہوں۔ عمر ۲۰ سال، تعلیم بی اے شکل و صورت بھی بہت خوب ہے۔ یوں بھی اللہ میاں نے ہر نعمت سے نواز رکھا ہے۔ فقط دل تنہا ہے۔ اتنی نازک اور حساس ہوں کہ ذرا سا صدمہ جان کا روگ بن جاتا ہے۔ میں اکیلی چلتے چلتے تھک گئی ہوں۔ کاش مجھے میرے آئیڈیل کی چاہت کی ٹھنڈی چھاؤں مل جائے تو میں بھی تھوڑا سا سستا لوں۔

خدا کرے یہ انتظار کی گھڑیاں جلد ہی ختم ہو جائیں۔

تسنیم راحت۔ لاہور

## آسِ نراش

میں ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں جہاں بچوں کی افراط کے

کشف و کرامات اولیائے کرام کا خاصہ ہے۔ جو کبھی کبھی بزرگانِ دین کے مبارک توسط سے اللہ کے نیک بندوں کو اس کے لطف و کرم کے صدقے میں عطا ہو جاتا ہے۔

## بابا سید شان احمد صاحب

کا شمار بھی انہی برگزیدہ ہستیوں میں ہے جنھیں روحانی انعام و اکرام سے نوازا گیا اور اس کا منہ بولتا ثبوت حقیقتِ حال سے متعلق وہ اہم پیش گوئیاں ہیں جو بذریعہ کشف تجلّی کی صورت میں ان پر ظاہر ہوتی رہیں۔ بابا جی شادی بیاہ، مقدمات، محبت میں کامیابی یا ناکامی، مالی مشکلات اور اولاد وغیرہ سے متعلق آپ کے سوالات کے جوابات بذریعہ کشف دینے پر رضامند ہو گئے ہیں اور وہ پلک جھپکتے میں آپکے حال اور مستقبل کے تانے بانے میں جھانک کر فوراً خدا لگتی کہہ دیں گے۔ صرف ضرورت ہے اس نام کی جس سے آپ زیادہ پکارے اور پہچانے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ آپ کی والدہ محترمہ کا نام، عمر اور مقامِ پیدائش۔ آپ ایک وقت میں صرف دو سوال کر سکتے ہیں۔ جوابات کے لیے جوابی لفافہ بھیجنا ضروری ہے۔ بابا جی کے جوابات کا کوئی نذرانہ نہیں ہے۔ صرف انہی سوالات کے جوابات دیئے جائیں گے جن کے ساتھ "روحانی ڈاک" کا کوپن ہوگا۔

نام ——————— والدہ کا نام ———————

مقامِ پیدائش ——————— عمر ———————

پورا پتہ ———————

———————

خط لکھنے کا پتہ

**روحانی ڈاک**

ماہنامہ "دوشیزہ" پوسٹ بکس ۵۹۸ کراچی ۲۹

باعث کچھ یوں کر بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ مجھے بھی اس بھرے گھر میں کبھی ماں باپ یا بہن بھائی کا پیار نہ مل سکا۔ سچ پوچھئے بالکل حکم کی غلام بن کر رہ گئی ہوں لیکن میں نے محض دکھاوے کی خاطر اپنی کچلی ہوئی شخصیت پر ایک مصنوعی خول چڑھا رکھا ہے۔ میرے والدین نے میرے لیے لفظ "بوجھ" تراش رکھا ہے اور اس لفظ کے سنتے ہی میرے دل و دماغ کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ مجھ آس کی ماری کو بھی ایک آئیڈیل کی تلاش ہے ـــــ ایک سانولے سلونے رنگ کا صحت مند نوجوان جو ڈاکٹر یا انجینئر یا کسی اچھے عہدے پر فائز ہو، شرط صرف اتنی ہے کہ وہ سعودی عرب یا خلیجی ریاستوں میں رہائش پذیر ہو۔ خوش شکل، خوش اخلاق اور خوش کلام ہو۔

میں معزز شیخ گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ عمر ۱۸ سال، ماسٹر کی طالبہ، کھلتا ہوا گندمی رنگ، خدوخال دلفریب اور سراپا دلکش۔ نماز روزے کی پابند ہوں۔

خدا کرے میرا آئیڈیل پلک جھپکتے ہی مجھے اس جہنم نما زندگی سے نکال کر اپنی چاہت کے دامن میں چھپا لے۔

یاسمین فاطمہ، کراچی

## پیار کا آنچل

مجھے بھی اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے ـــــ دراز قد، اسمارٹ اکھڑ مزاج نوجوان جو دنیا کا ٹھکرایا ہوا ہو۔ میں اس کے سارے دکھ درد اپنے پیار کے آنچل میں چھپا لوں گی۔ وہ مجھے میری خوبیوں اور برائیوں سمیت صدق دل سے قبول کرے۔ اگر آرمی میں ہو تو بہت خوب، آمدنی صرف اتنی ہو کہ عزت سے گزارہ ہو سکے۔

میں ایک متوسط گھرانے کی سیدھی سادی بھولی بھالی لڑکی ہوں۔ بالکل نازک سی کانچ کی گڑیا، عمر ۱۹ سال، تعلیم انٹر، کھلتا ہوا سانولا رنگ، سراپا دلفریب اور سیرت لاجواب۔

کاش مجھے میرا آئیڈیل مل جائے۔

تہمینہ ناز، لاہور

## آفتابی چہرہ

میرا آئیڈیل ـــــ دراز قد، مردانہ وجاہت کا جیتا جاگتا پیکر، ہنس مکھ، خوب سیرت اور اپنی دل لبھانے والی آنکھوں میں پیار کی قندیلیں جلائے ہو، کسی اچھے عہدے پر فائز یا بزنس مین ہو اور شکی مزاج تو ہرگز نہ ہو۔

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۱۵ سال، تعلیم میٹرک کھلتا ہوا گندمی رنگ، دمکتا ہوا گول چہرہ، خوبصورت آنکھیں اور سراپا دلفریب۔ جہیز کے لالچی دور ہی رہیں تو بہتر ہے

ن۔ ص۔ لطیف آباد

## کہتا ہوں سچ کہ......

مجھے بھی اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے۔ معزز گھرانے کا دراز قد، اسمارٹ نوجوان جس کی شخصیت پرکشش اور جو سچائی کا دلدادہ ہو اور جھوٹ سے سخت نفرت کرنے والا ہو۔ آزاد خیال ہو پر شکی مزاج ہرگز نہ ہو۔ اگر غیر ممالک میں رہائش پذیر ہو تو زہے نصیب!

میں ایک امیر گھرانے کی دوشیزہ ہوں۔ عمر ۲۰ سال، سچائی میرا جزو ایمان ہے اور چاہت کی متوالی ہوں

کاش مجھے میرا آئیڈیل مل جائے۔

شمشاد، لاہور

## سہرے کا کانٹا

میرا آئیڈیل ڈاکٹر یا انجینئر یا اعلیٰ درجے کا بزنس مین ہے جو شرافت کا جیتا جاگتا پیکر ہو، خوش شکل، خوش اخلاق اور خوش لباس ہو۔ شکی اور تنگ نظر ہرگز نہ ہو۔

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۱۸ سال، تعلیم میٹرک کھلتا ہوا گندمی رنگ، نقش و نگار پرکشش اور سراپا دلفریب۔ میں فطرتاً بڑی چنچل لیکن خوش مذاق اور صدمہ سگھڑ بھی ہوں۔ سوتیلی ماں میرے لیے سہرے کا کانٹا بن گئی ہے اور اسی وجہ سے آج تک باپ کے پیار سے بھی محروم رہی ہوں۔

کاش میرا آئیڈیل آگے بڑھ کر میری امیدوں کا چراغ روشن کر دے۔

آر۔ عثمانی۔ لاہور

## دل ٹوٹا جہاں چھوٹا

میرا بھی ایک آئیڈیل تھا جو خاندانی روایات کی بھینٹ چڑھ گیا اور ایک ایسے سر پھرے کے پلے باندھ دی گئی جو انسان کم اور پاگل زیادہ تھا۔ بہرحال شکر ہے کہ صرف چار ماہ بعد ہی اس جہنم نما زنداں سے نجات مل گئی۔ مجھے تو زندگی کی دوڑ میں ایک ایسے شخص، نیک نفس اور صاحب کردار کی ضرورت ہے جو مجھے میری تمام خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کر سکے۔ جو شکی مزاج اور سخت گیر نہ ہو اور

اپنی چاہت کے چھینٹوں سے میرے مقدر کی سیاہی کو مٹا سکے۔ مجھے
آرمی آفیسر یا ائیر فورس آفیسر، انجینئر یا بزنس مین پسند ہیں۔
میں ایک قدامت پرست گھرانے کی ۲۲ سالہ ایف اے پاس
لڑکی ہوں۔ قبول صورت، سیدھی سادی اور صاف دل۔ میں بڑی
سگھڑ اور ہنر مند ہوں۔ کاش میرا آئیڈیل میری قدر پہچان سکے۔

س، ک ۔ سرگودھا

## قصہ مختصر

میرا آئیڈیل کوئی آسمانی فرشتہ یا خوابوں کا شہزادہ نہیں بلکہ
زمانے کی ستم ظریفیوں کا ایک سسکتا ہوا ساز جس سے میں اپنی چاہت
کے سہارے پرکشش نغمے پیدا کر سکوں۔
میں ایک متوسط گھر کی الھڑ دوشیزہ ہوں عمر ۲۰ سال تعلیم
میٹرک، گوری رنگت، ناک نقشہ دلفریب اور سراپا حجاب۔

میمونہ ناز ۔ کراچی

## نین کٹوری

میرا آئیڈیل ـــــ میرا دیوتا دراز قد، تعلیم یافتہ، اسمارٹ
نوجوان جس کا اپنا پیارا سا گھر اور خوبصورت سی گاڑی ہے۔ لاکھ آزاد
خیال سہی مگر وہ شکی مزاج تو ہرگز نہیں۔ وہ میری چاہت، پرخلوص
ساتھی اور دنیاوی جنت کا متلاشی ہے جس کے لیے میں اپنے
دیدہ و دل فرش راہ کیے بیٹھی ہوں۔
میں ایک دولت مند گھرانے کی چہیتی لڑکی ہوں۔ عمر ۱۹ سال،
بی اے فائنل کی طالبہ، عادتاً متانت سے بے حد شناسا ہوں۔
میری پرکشش غلافی آنکھوں کا حسن ناقابل بیان ہے۔ یہ پیاری پیاری
سی دو نرم و نازک کٹوریاں جن سے ہر لمحہ دیوتا کی چاہت چھلکتی رہتی
ہے۔
کاش میرا آئیڈیل میری شمع امید کو فروزاں کر دے۔

سمن وجیہہ ۔ کراچی

## صحرا کا پھول

مجھے بھی تلاش ہے ایک ایسے انسان کی جو معزز گھرانے سے
ہو دراز قد، بلند کردار اور خوبصورت نوجوان جو سراپا دلکش و پرکشش
ہو۔ آمدنی اتنی ہو کہ زندگی کی ضروریات آسانی سے میسر ہو سکیں۔
میں ایک غریب مگر معزز گھرانے کی دوشیزہ ہوں۔ عمر ۲۲ سال

درمیانہ قد، پھول سا چہرہ، سراپا شاخ گل کی طرح نرم و نازک۔ انشاء اللہ
ایک مثالی رفیقِ حیات ثابت ہوں گی۔

م سلطانہ ۔ مانسہرہ ۔ ہزارہ

## آ بھی جاؤ!

میرا آئیڈیل ـــــ معزز امیر گھرانے کا چشم و چراغ، وجیہہ اور اسمارٹ
نوجوان ڈاکٹر، انجینئر، آرمی کیپٹن یا کوئی بزنس مین۔ کتابی چہرہ، گھنگھریالے بال
روشن خیال، خوبصورت آنکھیں اور ہونٹوں پر ہر گھڑی مسکراہٹ
کھیلتی نظر آئے۔ شکی مزاج اور پابندیاں لگانے والا نہ ہو۔
میرا تعلق نہایت معزز اور امیر گھرانے سے ہے۔ عمر ۲۱ سال،
کھلتا ہوا گندمی رنگ، ناک نقشہ دلفریب اور مسکراتی ہوئی بادامی
آنکھیں۔ گھر بھر کی اکلوتی اور لاڈلی ہونے کے باعث ذرا ضدی سی ہوں۔
کاش مجھے میرا آئیڈیل جلدی مل جائے اور انتظار کی کٹھن
گھڑیاں آن کی آن میں ختم ہو جائیں۔

شازیہ ارشاد آرائیں ۔ ڈگری

## حقیقت پسندی

مجھے بھی اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے۔ ڈاکٹر، انجینئر یا ٹیکنیکل لائن
میں اچھے عہدے پر فائز نوجوان جس کا بیرون ملک جانے کا پروگرام ہو
رنگ روپ یا ذات پات کی کوئی قید نہیں۔ شکی مزاج اور جہیز کا لالچی
نہ ہو اگر تنہا ہو تو بہتر ہے۔
میں ایک باوقار گھرانے کی لڑکی ہوں۔ دسویں کی طالبہ، شکل و صورت
کے اعتبار سے بہت خوب ہوں۔ والد صاحب ڈاکٹر ہیں۔ اللہ کا دیا

سب کچھ ہے۔
میرے آئیڈیل کا حقیقت پسند ہونا بہت ضروری ہے، کیونکہ مجھے بناوٹ سے سخت نفرت ہے۔
ناھید شاہ۔ ایبٹ آباد

## چراغِ خانہ

میرا آئیڈیل جاذب نظر شخصیت کا مالک ہے۔ بنک آفیسر، انجینئر یا لیکچرار، خوش اخلاق، نیک سیرت اور پُرخلوص، میرے نزدیک انسان کی سب سے بڑی دولت اس کی اعلیٰ ظرفی اور بلند کردار ہے اور خیالات کی ہم آہنگی بھی خوشحالی کا سبب بن سکتی ہے۔
میں معزز تعلیم یافتہ گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۲۲ سال، تعلیم انٹر، کھلتا ہوا گندمی رنگ، تیکھے نقش اور سراپا دلفریب۔ میں بڑی پُرکشش اور اسمارٹ ہوں۔ میرے نزدیک عورت کا اصل مقام اس کا اپنا گھر ہوتا ہے جسے وہ اپنی خوش اخلاقی، قوتِ ارادی اور سلیقہ مندی سے جنت کا نمونہ بنا سکتی ہے بشرطیکہ اس کے اندر یہ صلاحیتیں موجود ہوں۔
مجھے یقین ہے کہ میرا آئیڈیل ملنا کچھ دشوار نہیں۔
دردانہ ارم۔ کراچی

## نظروں کے چراغ

میری ایک گہری سہیلی کو اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے ——
تعلیم یافتہ، روشن خیال، اعلیٰ عہدے پر فائز نوجوان جو زندگی کی ضروریات خندہ پیشانی سے پوری کر سکے۔ وہ مشرقیت کا دلدادہ اور خوبصورتی سے زیادہ خوب سیرتی کا قائل ہو کیونکہ اصل چیز تو نظروں کے چراغ ہوتے ہیں جن کے جلتے رہنے سے دلوں میں اجالا ہو جاتا ہے۔
میری سہیلی ایک معزز، کھاتے پیتے تعلیم یافتہ گھرانے کی لڑکی ہے عمر ۲۳ سال، انٹر کی طالبہ، گوری رنگت، تیکھے نقوش اور سراپا قابلِ تعریف۔
خدا کرے میری سہیلی کو اس کا آئیڈیل جلد ہی مل جائے۔ اگر وہ پاکستان سے باہر ہو تو زہے نصیب۔
ا۔ ب۔ ت۔ کراچی

## چاہت کی لَو

میرا آئیڈیل —— دراز قد، خود سر اور اکھڑ مزاج نوجوان جو مجھے میری تمام خوبیوں اور برائیوں سمیت دل سے چاہے۔ آمدنی اتنی ہو کہ ایک خوشگوار زندگی بسر ہو سکے اگر غیر ممالک میں رہائش پذیر ہو

تو چنداں مضائقہ نہیں۔
میں ایک متوسط گھرانے کی سیدھی سادی بھولی بھالی دوشیزہ ہوں۔ دراز قد، قبول صورت اور سیرت لاجواب۔ مجھے دولت سے نفرت ہے مگر محبت کی پجارن ہوں۔
کاش مجھے میرا آئیڈیل مل جائے تاکہ میری چاہت کی لَو اور بھی بھڑک جائے۔
مہ وشین مسعود۔ لاہور

## مرادوں کے پھول

مجھے اپنی بہن کے لیے رفیقِ حیات کی تلاش ہے۔ معزز سُنّی گھرانے کا تعلیم یافتہ نوجوان بزنس مین یا کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو۔ قبول صورت، خوش اخلاق اور خوش کلام ہو۔ لالچی تو ہرگز نہ ہو۔
میری بہن ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ عمر ۲۱ سال، تعلیم بی ایس سی، گوری رنگت، ناک نقشہ اور سراپا دلفریب، بڑی سگھڑ اور سلیقہ شعار ہے۔
کاش میری بہن کی مرادوں کے پھول کھل جائیں۔
بیگم منظور خان۔ کراچی

## آس کی پیاس

سُنا ہے عزیبوں کو کبھی آئیڈیل نہیں ملا کرتے، لیکن میں اپنی مفلسی کے باوجود بھی اپنے نہاں خانۂ دل میں چھپی ہوئی چاہت کو بے نقاب کر رہی ہوں۔ دراصل مجھے تلاش ہے ایک انسان کی جو بے حد دکھی ہو، عمر بھر دستِ شفقت سے محروم رہا ہو لیکن دلِ درد آشنا رکھتا ہو اور اس نے بڑی کٹھن جد و جہد کے بعد معاشرے میں ایک منفرد مقام پایا ہو۔ وہ اسمارٹ، خوش شکل اور خوش اخلاق ہو۔
اب میری سنئے۔ میں ایک نہایت غریب گھرانے کی لڑکی ہوں اور میرے ماں باپ کے پاس سوائے میری نقدِ جاں کے کچھ اور دینے کو نہیں۔ میں میٹرک کی طالبہ ہوں۔ بڑی حساس اور سنجیدہ ہوں، ایک دُبلی پتلی سی خوش رنگ گڑیا ہوں، حوادث کی ماری ہوئی۔ بس اک آس لگائے بیٹھی ہوں کہ کاش کوئی دلِ درد آشنا رکھنے والا انسان مجھے اس مفلسی کے چنگل سے نکال کر میری آس کی پیاس بجھا سکے۔
رافی تبسم۔ سکھر

## دلِ ناداں

میرا آئیڈیل —— انجینئر، ڈاکٹر یا آرمی آفیسر ہمیں کوئی

۲۸/۳۰ سال، دراز قد، مردانہ وجاہت کا پُرخلوص پیکر اور مضبوط قوتِ ارادی کا مالک جو موقع پڑنے پر کٹھن حالات کا پامردی سے مقابلہ کر سکے۔

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی سیدھی سادی سی لڑکی ہوں، رنگ صاف اور تیکھے نقوش۔ میرا دل بڑا ہی نازک اور حساس ہے اور کبھی ذرا سی خلش پر واقعی بھٹکنے لگتا ہے۔

کاش "دوشیزہ" کی وساطت سے مجھے کوئی مضبوط سا سہارا مل جائے تو زندگی سکون سے کٹ جائے۔

نیلوفر یاسمین۔ حیدرآباد

## تیری چاہت میری راحت

میری باجی کو اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ، بلند کردار، باذوق اور وجیہہ نوجوان جس کی مالی حالت مطمئن زندگی گزارنے کی ضامن بن سکے۔ وہ خدمتِ وطن یا خدمتِ خلق کے کسی بھی شعبے سے وابستہ ہو۔ انہیں دراصل ایک ایسے انسان کی ضرورت ہے جو ٹوٹ کر چاہے اور ان کا ہمدم و دمساز بن جائے۔

میری باجی کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی ہے وہ تھوڑا سی کم اور عملی زیادہ ہیں۔ عمر ۲۵ سال، تعلیم بی ایس سی، خوب کھلتا ہوا گندمی رنگ، بیضوی چہرہ، چھریرا بدن، ان کی جمالیاتی حسن کا پرتو ان کی جامہ زیبی، مہمان نوازی اور بے مثال آرائش میں نظر آتا ہے جس نے ان کی شخصیت کو جگمگا دیا ہے۔ وہ خلوص اور وفاداری کا پیکر ہیں اور صوم و صلوٰۃ کی پابند، صاف گوئی اور سادگی تو گویا ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔

خدا کرے ہماری باجی کے دل کی بات پوری ہو جائے۔

زینت صدیقی۔ کراچی

## آوازوں کے سائے

میرا آئیڈیل ایک اسمارٹ اور شرارتی بھری آنکھوں والا ڈاکٹر، انجینئر، آرمی آفیسر یا کسی اعلیٰ عہدے پر فائز نوجوان ہے جو زندگی کی ضروریات کو خوشگوار طریقے پر پورا کر سکے۔ فیشن ایبل اور زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے والا ہو لیکن خشک مزاج اور دل پھینک ہرگز نہ ہو۔

میں ایک متوسط پنجابی گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ عمر ۱۸ سال، میٹرک کی طالبہ، سانولی سلونی، اسمارٹ لیکن بھولی بھالی، ناک نقشہ دلفریب، سچ پوچھئے تو مجھے اپنے دل کی دھڑکنوں میں اپنے آئیڈیل کی پکار سنائی دیتی ہے۔

ادم، ناز۔ کراچی

ایک دفعہ بغداد میں سخت خشک سالی ہوئی اور قحط پڑ گیا۔ بادشاہ نے صرف مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ شہر سے باہر جائیں اور مسنون طریقے کے مطابق نماز استسقاء ادا کریں اور اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا کریں۔ شاہی حکم کے مطابق بغداد کے تمام مسلمان شہر سے باہر نکلے۔ نمازِ استسقاء ادا کی اور انتہائی عجز و انکساری کے ساتھ دعائیں کرتے رہے، لیکن بارش نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ اس کے بعد بادشاہ نے حکم دیا کہ اب یہودی اپنی شریعت کے مطابق بارش کی دعائیں مانگیں۔ چنانچہ جب یہودیوں نے دعا مانگی تو بارش ہو گئی۔ یہ دیکھ کر بادشاہ حیرت میں پڑ گیا اور علمائے کرام کو بلا کر اس کے متعلق پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے مسلمانوں نے دعا مانگی تو قبول نہ ہوئی، یہودیوں کی دعا فوراً قبول ہو گئی۔ یہ ایک عقدہ تھا جسے متعدد علماء حل نہ کر سکے اور بادشاہ کو کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ آخر حضرت ابو محمد سہل بن عبداللہ تستریؒ تشریف لائے اور فرمایا "اللہ تعالیٰ اسلام کی وجہ سے ہم مسلمانوں سے محبت کرتا ہے اور اس کی مہربانی ہے کہ اس نے ہمیں ہدایت بخشی۔ وہ ہماری دعا مانگنے اور تضرع و زاری کرنے سے پیار رکھتا ہے اس لیے ہمیں دینے میں تاخیر کرتا ہے"

## دیپ جلے بلا ٹلے

میرا آئیڈیل کوئی فلمی ہیرو یا شہزادہ نہیں بلکہ ایک پُرخلوص اور اسمارٹ نوجوان جو ازدواجی زندگی کے آداب سے بخوبی واقف ہو اور جملہ ضروریات آسانی سے مہیا کر سکے۔ وہ تھوڑا سا مغرور بھی ہو مگر خشک مزاج ہرگز نہیں۔

میں ایک کھاتے پیتے پنجابی گھرانے کی بڑی اسمارٹ لڑکی ہوں عمر ۲۰ سال۔ بی اے کی طالبہ، کھلتا ہوا گندمی رنگ، ناک نقشہ دلفریب

اور اسے محسوس ہو رہا ہو خوبصورت اور پرکشش جو ہر لڑکی آئیڈیل کی راہ تکتی رہتی ہیں۔

کاش میرا آئیڈیل میری گھپ اندھیروں میں ڈوبی ہوئی دل کی وادی میں چراغاں کر دے۔

روحی ۔ کراچی

## وفا کے موتی

میرا بھی ایک آئیڈیل ہے ـــــــ گریجویٹ نوجوان انجینئر اور خوش کلام، سرکاری ملازم یا کسی پرائیویٹ فرم میں ہو۔ تنخواہ تقریباً چھ سو روپے ماہانہ، جہیز کا لالچی نہ ہو۔

میں ایک متوسط اچھوت گھرانے کی لڑکی ہوں، عمر ۲۴ سال تعلیم انٹر، ناک نقشہ گوارا، بڑی سگھڑ اور پُرخلوص، رفیقِ حیات سے وفاداری کی پوری طرح قائل ہوں۔

ثریا بیگم

## بول وے سگھڑ کانواں .....

میرے دل کے مندر میں جو برسوں کا تراشا ہوا آئیڈیل چھپا ہے وہ بہت خوبصورت اور نہ ہی سرخ و سپید ہے، البتہ قبول صورت ضرور کہہ سکتے ہیں۔ معزز گھرانے سے تعلق رکھنے والا سانولا سلونا، بڑی بڑی آنکھوں اور چوڑے سینے والا نوجوان بزنس مین یا سرکاری ملازم جو آزاد خیال ہو مگر شکی مزاج ہرگز نہ ہو۔

میں ایک دولت مند شیخ گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ عمر ۱۸ سال، تعلیم ایف اے، رنگ صاف اور سراپا دلفریب۔ میرے دل کی دھڑکنیں اور میرے جذبات و احساسات صرف میرے آئیڈیل کے لیے وقف ہیں۔ جب موسمِ بہار میں کبھی کوئل کی کوک کو سنتی ہوں تو دل بے اختیار پکار اٹھتا ہے ـــــ

بول وے سگھڑ کانواں کوئل کوک رہی

شبنم سحر ۔ ہری پور۔ ہزارہ

## داغِ حرماں

مجھے اپنی سہیلی کے لیے آئیڈیل کی تلاش ہے، ایک پُرخلوص اعلیٰ ظرف اور بلند کردار نوجوان جو ایک جنم جنم کی پیاسی، دل شکستہ اور ٹوٹی ٹوٹی سی بکھری بکھری لڑکی کا سہارا بن سکے۔

میری سہیلی حیدرآباد دکن کے ایک معزز گھرانے کی لڑکی ہے۔

تعلیم میٹرک، پرائمری اسکول میں ٹیچر ہے۔ سانولی سلونی سی خوددار اور حساس گڑیا جو بچپن سے والدہ کی شفقت سے محروم ہو کر بھائیوں کی بے اتفاقی کا شکار ہو گئی۔

کاش اس کا آئیڈیل اس کے درد کا درماں بن کر اسے مالی اور ذہنی آسودگی مہیا کر سکے۔

فرح دیبا ۔ حیدرآباد

## درد کی کاٹ

میرا آئیڈیل ایک ایسا تعلیم یافتہ، ہمدرد اور درد آشنا انسان ہے جو میرے اس دکھ درد کو سمجھ سکے جو میرے سینے کے اندر سانپ کی طرح کنڈلی مارے ہر لمحہ پھنکارتا رہتا ہے۔ میرے والد چار سال سے صاحبِ فراش ہیں اور چلنے پھرنے سے قطعی معذور، بھائی چھوٹے چھوٹے اور زیرِ تعلیم، کوئی بھی ایسا مونس و غمخوار نہیں جو ہمارے سر پر ہاتھ رکھ سکے۔ سوچ سوچ کر ذہن پاگل ہوا جاتا ہے اور ہر لمحہ یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ جانے آن کی آن میں کیا ہو جائے۔

میں ایک معزز آرائیں گھرانے کی دوشیزہ ہوں۔ عمر ۲۶ سال، تعلیم بی ایس سی، رنگ روپ دلفریب، قدرت نے مجھے خلوص اور سلیقہ مندی سے نوازا ہے۔

کاش مجھے میرا آئیڈیل ایک ہمدرد انسان کے روپ میں مل جائے تو زندگی کی ساری محرومیاں بھول جاؤں۔

شاہدہ ۔ راولپنڈی۔

## جنت کا سماں

میری کزن سعدی کو اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے۔ ایک خوش شکل اور خوب سیرت اعلیٰ بزنس کا مالک نوجوان جو ذاتی بنگلہ اور کار کے ساتھ کسی بڑے شہر میں رہائش پذیر ہو۔

سعدی کا تعلق معزز آرائیں گھرانے سے ہے۔ تعلیم بی اے، چھریرا بدن، رنگ روپ جاذبِ نظر، بڑی سگھڑ، سلیقہ مند اور وفا شعار لڑکی ہے جو اپنی صلاحیتوں سے گھر میں جنت کا سماں پیدا کر سکتی ہے۔

فرح ناز ۔ حیدرآباد

## پیاسی پلکیں

میرا آئیڈیل ـــــ تعلیم یافتہ، دیندار اور صحت مند انسان

جو سرکاری ملازم ہو، آمدنی کم از کم ۲۰۰۰ روپے ماہانہ۔ عمر یہی کوئی ۲۸ سال۔ خوش اخلاق، خوش کلام اور خوش صورت ہو۔

میں ایک متوسط گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۲۲ سال۔ تعلیم ایف اے، دُبلی پتلی گوری چٹی، میرے سگھڑ پنے کا جواب نہیں۔ میں اکثر اپنے آئیڈیل کی یاد میں آب دیدہ ہو جاتی ہوں اور اب تو آنسوؤں کے سوتے بھی خشک ہونے لگے ہیں۔

خدا مجھے بامراد کرے۔

ص، ض، پشاور صدر

## آنگن آنگن کرنیں تیری

میرا بھی ایک آئیڈیل ہے۔ ایک تعلیم یافتہ، خوبصورت، اسمارٹ اور ساڈرن نوجوان اعلیٰ عہدے پر فائز یا ذاتی کاروبار ہو۔ اس کی شخصیت دلفریب اور خدوخال پُرکشش ہوں۔ چہرے پر مسکراہٹ آنکھوں میں شرارت لیکن دل خلوص کی تجلی سے معمور ہو۔

میں ایک کھاتے پیتے کشمیری گھرانے کی لڑکی ہوں۔ تعلیم انٹر، اسمارٹ اور خوبصورت، دُبلی پتلی سی گنگناتی ہوئی گڑیا ہوں۔ ہمدردی اور غم گساری میرا شعار ہے۔ بڑی وفا پرست ہوں اور دیس دیس کی سیر کرنے کا بڑا شوق ہے۔

کاش میرا نہاں خانۂ دل میرے آئیڈیل کی کرنوں سے منور ہو جائے۔

فوزیہ، فوزیہ۔ لاہور

## سُرخ گلاب

میری سہیلی کا آئیڈیل، ڈاکٹر یا انجینئر، اسمارٹ اور پُرکشش، طبیعت میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ بے حد مخلص ہو مگر شکی مزاج ہرگز نہ ہو۔

میری سہیلی معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ عمر ۲۰ سال، تعلیم بی اے، بھرا بھرا سڈول جسم، ناک نقشہ دلفریب، دہکتے ہوئے گال جیسے سرخ گلاب، چہرے پر معصومیت، آنکھیں نظریں جھکی کردہ جائیں۔

کاش میری سہیلی کو اپنا دل پسند ہم سفر مل جائے۔

افشاں۔ ڈیرہ غازی خان

## ارضی کہکشاں

ہم تین بہنیں ہیں، ہم شکل و ہم خیال اور شاید اسی لیے ہمارا

* * * * * * * * * * * * * * * * * * * *

آئیڈیل کا تصور بھی بالکل ایک جیسا ہی ہے۔ انجینئر، پائلٹ یا کوئی یونیورسٹی پروفیسر جو غیر ملک میں رہائش پذیر ہوں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر کہیں تین سگے بھائی ہمارے آئیڈیل کے روپ میں مل جائیں۔ ذات پات کی کوئی قید نہیں، صرف اتنا کہ شریف گھرانے سے تعلق ہونا چاہیے۔

ہمارا تعلق ایک بڑے دولت مند کشمیری بٹ خاندان سے ہے۔ تینوں ایم بی بی ایس کی طالبہ ہیں۔ ایک ہی کالج میں پڑھتی ہیں اور خداداد ذہانت کے سہارے اعلیٰ پرواز چڑھ رہی ہیں۔ ہمارا شمار کالج کی خوبصورت ترین لڑکیوں میں ہوتا ہے۔

خدا کرے کہ ہمارے آئیڈیل جلد ہی مل جائیں تاکہ ہم اپنی چاہت کی چاندنی سے ان کی زندگیوں کو جگمگا دیں۔

ثمرین، فوزین، عنبرین
حیدرآباد

ممتاز فاطمہ کے نام!

آپ کے منفرد خیالات کی بہت قدر کرتا ہوں۔ ایک ٹریڈنگ کمپنی کا منیجر ہوں۔ تنخواہ ۳۰۰۰/- روپے ماہانہ۔

سید ثروت علی جعفری

معرفت مسٹر شہزادہ، پوسٹ بکس نمبر ۲۱۲۵ ۔ دیرہ ۔ دوبئی

✲

آپ کے اور میرے خیالات میں بڑی مطابقت ہے۔ سینئر اسٹور کیپر کے عہدے پر فائز ہوں۔ تنخواہ ۳۰۰۰/- روپے ماہانہ

محمد اسلام زیدی

پوسٹ بکس نمبر ۲۰۸ ۔ ابوظہبی (یو اے ای)

✲

میں آپ کے خیالات سے سخت متاثر ہوا ہوں۔ پیشہ ملازمت، تنخواہ ۲۵۰۰/- روپے ماہانہ۔

محمد رفیق بٹ

پوسٹ بکس نمبر ۳۱ ۔ ابوظہبی (یو اے ای)

✲

یقیناً آپ ہی میرا آئیڈیل ہیں۔ تعلیم بی ایس سی، ذاتی بزنس، معقول آمدنی۔

JALMAN RANA

AL-ZAIB TRADERS

P.O. BOX NO 4059 DUBAI (U.A.E)

✲

انشاءاللہ آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔ پیشہ ملازمت، تنخواہ نہایت معقول

قادر علی

پوسٹ بکس نمبر ۵۴۷ ۔ شارجہ (یو اے ای)

✲

آپ کے خیالات کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ تعلیم بی اے۔ ذاتی بزنس، آمدنی ۲۰۰۰/- روپے ماہانہ۔

شاہد ندیم

آٹو سٹورز ۔ جی ٹی روڈ ۔ صادق آباد ۔ ضلع رحیم یار خان

ریحانہ رفیق کے نام!

میں آپ کے معیار پر پورا اترتا ہوں۔ عمر ۳۰ سال، انجینئر، تنخواہ ۱۵۰۰/- روپے ماہانہ

ایس ایس حسین

پوسٹ بکس نمبر ۱۲۷۵ ۔ ۱۱۹ ہوٹل ایمبیسیڈر ۔ لاہور

✲

آپ کے اور میرے خیالات میں بڑی مطابقت ہے۔ تعلیم ایم اے، بکاکس [illegible] انجینئر، آمدنی ۱۰۰۰/- روپے ماہانہ

حسن، د

معرفت انجم پرویز ۔ ایف پی او ایس سی ۔ کوہاٹ

شہزادی گل کے نام!

آپ کی سہیلی کے منفرد خیالات میرے دل کی آواز ہیں۔ تعلیم میٹرک تنخواہ ۵۰۰/- روپے

سید اکبر

بلاک نمبر ۲۲ بی ۔ کوارٹر نمبر ۹۹۵ ۔ کورنگی نمبر ۱ ۔ کراچی

✲

آپ کی سہیلی کے دکھ بھرے حالات نظر سے گزرے۔ میرا تعلق بھی مانسہرہ سے ہے۔ عمر ۲۳ سال۔ تنخواہ ۲۵۰/- روپے ماہانہ

امان خان سواتی

معرفت محمد سلیمان ویم ۔ پوسٹ بکس نمبر ۸۴ ۔ پشاور صدر

✲

میں آپ کی سہیلی کا آئیڈیل ہوں۔ عمر ۲۱ سال، تعلیم میٹرک، تنخواہ ۷۰۰/- روپے ماہانہ ۔ ذاتی مکان

ایم زاہد

معرفت ابراہیم رپورٹر "مشرق" میہوں شریف

ضلع دادو ۔ سندھ ۔

الو نیر ثمر خان کے نام!

میں آپ کے معیار کے عین مطابق ہوں۔ عمر ۲۴ سال، تنخواہ ۳۵۰۰/- روپے ماہانہ ۔ ناظم آباد کراچی میں ذاتی مکان بھی ہے جس کا ۴۰۰/- روپے ماہوار کرایہ ملتا ہے

منظور حسین مغل

معرفت ماسٹر ولی محمد صاحب ۔ پوسٹ بکس ۲۹۱۸

دیرہ ۔ دوبئی (یو اے ای)

✲

معزز پٹھان گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ تنخواہ ۲۵۰۰/- روپے ماہانہ ۔ دسمبر میں پاکستان آرہا ہوں۔

SULTAN ROME PARWANA

DUBAI ELECTRIC CO,

P.O. BOX 564 DUBAI (U.A.E)

✲

آپ کی سادہ دلی اور صاف گوئی قابل تعریف ہے تعلیم یافتہ

ہوں اور تنخواہ ۸۰۰/- روپے ماہانہ

شہزاد علی رانا

معرفت ناصر محمود حبیب بنک لمیٹڈ۔ منگورہ۔ سوات

---

آپ کے خیالات پڑھ کر خوشی ہوئی۔ معزز عہدے پر فائز ہوں۔ تعلیم یافتہ، عمر ۲۷ سال، معقول تنخواہ

صابر علی خاں

یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ۔ منگورہ۔ سوات

---

میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں۔ محکمہ نہر میں ضلع دار کے عہدے پر ہوں۔ جہیز یا کسی شے کی ہرگز ضرورت نہیں

ایم۔ ایچ۔ خان ضلعدار

مکان نمبر ۶، گلی نمبر ۵۵، سعدی روڈ۔ کرشن نگر۔ لاہور

آر۔ ابن کے نام!

آپ کے خیالات سے پوری طرح متفق ہوں۔ عمر ۳۰ سال، تعلیم میٹرک، پیشہ پائپ فٹر، تنخواہ ۳۵۰۰/- روپے ماہانہ

سید مراد علی شاہ

معرفت سید وہاب۔ پوسٹ بکس ۲۱۹۱

ابوظہبی (یو۔ اے۔ ای)

---

آپ کے خیالات کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ تنخواہ نہایت معقول۔ خوشگوار زندگی۔

محمد صادق

پوسٹ بکس نمبر ۸۰۷۔ ابوظہبی۔ (یو۔ اے۔ ای)

---

انشاء اللہ آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔ عمر ۲۲ سال، تعلیم میٹرک، پرائیویٹ فرم میں سیلزمین، تنخواہ ۴۵۰/- روپے ماہانہ۔ کافی جائداد کا مالک ہوں

حامد بیگ

مکان نمبر B - 8/454 گلی نمبر ۱۰

محلہ موہن پورہ۔ راولپنڈی

---

"دوشیزہ" میں آپ کے خیالات پڑھ کر محسوس ہوا کہ اب منزل قریب تو ہے۔ ذاتی کاروبار، نہایت معقول آمدنی

عبدالخالق شاہین

میں نے آپ سے مردانہ ورزش کے اسپرنگ مانگے تھے

معرفت طارق لیبارٹریز۔ مین بازار چشتیاں

بہاول پور ڈسٹرکٹ

ریحانہ ناز کے نام!

آپ کی تحریر نے مجھے بے چین کر دیا ہے۔ عمر ۳۰ سال، تعلیم بی اے، خود مختار کاروبار کا مالک ہوں۔ آمدنی ۱۲۰۰/- روپے ماہانہ۔ ذاتی مکان اور زمین بھی ہے۔

ایس۔ ایم۔ خان

معرفت پوسٹ بکس ۱۸۰۳۷ - کراچی ۳۳

---

آپ کے خیالات سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ عمر ۳۵ سال، تعلیم مڈل۔ آمدنی ۳۰۰۰/- روپے ماہانہ، بنک بیلنس ۵۰۰۰۰/- روپے

حاجی محمد حسین

پوسٹ بکس نمبر ۲۸۷۲۔ دیرہ، دوبئی (یو۔ اے۔ ای)

---

آپ کی درد بھری داستان سے سخت متاثر ہوا ہوں۔ ملازمت پیشہ، تنخواہ ۲۵۰۰/- ماہانہ، کراچی میں بھی ذاتی بزنس ہے۔

محمد جمیل خاں

پوسٹ بکس ۲۴۵۲۔ ابوظہبی (یو۔ اے۔ ای)

رضوانہ علی کے نام:

آپ کے خیالات کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ تعلیم بی ایس سی۔ نہایت معقول تنخواہ۔

HANIF RANA

AL-ZAIB TRADERS

P.O.BOX.NO 4059 DUBAI (U.A.E)

---

میں آپ کے تصور کے عین مطابق ہوں۔ عمر ۲۳ سال، تنخواہ
نہایت معقول۔ پشاور کا رہنے والا ہوں

تاج محمد
پوسٹ بکس ۱۸۲۹ - دوحا - قطر

**مں، ش حیدر آباد کے نام!**

میں ایک نہایت اسمارٹ، جاذب نظر نوجوان ہوں۔ عمر ۲۸ سال، تعلیم ایم اے، امریکن کمپنی میں ۶۰۰۰/- روپے ماہانہ پر ملازم ہوں۔

اقبال احمد خان
پوسٹ بکس نمبر ۲۹۰۲ - دہران - سعودی عرب

---

انشاء اللہ آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور عمدہ عہدے پر فائز ہوں۔

ایس اے معرفت محمد ہارون صاحب
انسپکشن ڈویژن ہیڈ آفس نیشنل بینک آف پاکستان
پی آئی ڈی سی ہاؤس۔ ڈاکٹر ضیاء الدین روڈ۔ کراچی

**شازی لاہور کے نام!**

آپ کے منفرد خیالات کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ عمر ۲۲ سال تعلیم بی ایس سی۔ تنخواہ ۵۰۰/- روپے ماہانہ۔

زاہد نقوی معرفت صابر حسین کوروی
اسٹیٹ بینک آف پاکستان، پشاور صدر

**سحر چوہدری کے نام!**

معزز زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ عمر ۲۶ سال آپ کے ڈاکٹری کے ادھورے خواب کی تکمیل اپنا فرض سمجھوں گا مدت سے منتظر ہوں کسی ایسی آواز کا جو کانوں میں رس گھول دے۔

کیپٹن ایم۔ آر محمود
پی۔ آر۔ سی مردان

---

آپ کے خیالات کی تہِ دل سے قدر کرتا ہوں۔ گورنمنٹ انجینئر تنخواہ ۶۰۰۰/- روپے ماہانہ۔

جاوید اقبال
پوسٹ بکس نمبر ۳۹۸ - ابوظبی (یو اے ای)

**کومل شہزاد کے نام!**

میں آپ کے معیار پر پورا اترتا ہوں۔ عمر ۲۴ سال، پلاننگ انجینئر ہوں۔

خالد پرویز
۲۰۵۔ پلاننگ ڈیپارٹمنٹ۔ واپڈا ہاؤس۔ لاہور

---

آپ کے خیالات سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ عمر ۲۹ سال تنخواہ ۹۰۰/- روپے ماہانہ۔

صابر خان
یونائیٹڈ بینک لیمیٹڈ۔ منگورہ سوات

**نادیہ اسلام آباد کے نام!**

آپ کے خیالات کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ تجارتی فرم میں منیجر ہوں، تنخواہ ۱۵۰۰/- روپے ماہانہ

ایس، ایچ بخاری
پائنیر ٹریڈنگ کارپوریشن۔ پوسٹ بکس ۱۹۵ - لاہور

---

معزز آرائیں خاندان سے تعلق رکھتا ہوں اور ایک اعلیٰ پیشے سے منسلک ہوں، آمدنی ۱۰۰۰/- روپے ماہانہ۔

ناصر چوہدری
آفیسرز میس - پی آر سی - مردان

**ش، ف بٹ کے نام!**

آزاد کشمیر کا رہنے والا ہوں۔ عمر ۲۵ سال، تعلیم بی اے۔ پاک فضائیہ میں LABORATORY TECHNICIAN ہوں۔ تنخواہ ۶۰۰/- روپے ماہانہ۔

PAK / 62842 F/T ILYAS
LAB/TECH
M.I. ROOM P.A.F. BASE CHAKLALA RAWALPINDI

**آر، رحیم یار خان!**

آپ کے جذبات سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ عمر ۳۱ سال، تنخواہ ۷۰۰/- روپے ماہانہ۔

کے، ایم، ڈبلیو خان
۱۲۸ اے/سی سول کوارٹرز۔ کوہاٹ روڈ۔ پشاور

**عذرا ناز گوجرانوالہ کے نام!**

معزز شیخ خاندان کا فرد ہوں۔ عمر ۳۰ سال، ٹرانسپورٹ کا وسیع کاروبار۔

شیخ محمد یوسف
معرفت پرائیر دی ملتان گڈز ٹرانسپورٹ۔ خوشاب ضلع سرگودھا

سرو جمال کے نام!
آپ کے منفرد خیالات سے سخت متاثر ہوا ہوں۔ عمر ۲۵ سال
مت پیشہ، تنخواہ ۵۰۰/- روپے ماہانہ۔
ایم حسین
مکان نمبر ایم سی ۱۲۷۶ ۔ گرین ٹاؤن کراچی ۲۵

مس خان کوئٹہ کے نام!
وفا اور خلوص سے عبارت آپ کے خیالات پڑھے۔ عمر ۲۶ سال،
ایم اے، تنخواہ ۱۰۰۰/- روپے ماہانہ۔
قیصر ایم حبیب
آفیسر حبیب بنک لمیٹڈ۔ منگورہ۔ سوات

---

میں آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔ تنخواہ نہایت
معقول۔
شیخ محمد حسین
ایئر کنڈیشن فوڈین ۔ پوسٹ بکس ۹۱۳ ابوظہبی
(یو اے ای)

آئی اے تبسم لائلپور کے نام!
آپ کے خیالات کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ الیکٹریشن، تنخواہ
۶۰۰۰/- روپے ماہانہ۔

ANJAM MASUD
POST BOX NO 402 S.K ABBAS BALAM
DOHA, QATAR.

طلعت صدیقی کے نام!
آپ کے خیالات کے مطابق میں آپ کے معیار کے عین مطابق
ہوں۔ عمر ۳۰ سال، انجینئر، تنخواہ ۱۴۰۰/- روپے ماہانہ۔
صولت حسین
معرفت کاسٹ ایسوسی ایٹس۔ ۲۷۹ شاداب کالونی ۔ لاہور

ثوبیہ عالم خان کے نام!
"دوشیزہ" میں آپ کے خیالات بہت پسند آئے۔ عمر ۲۴ سال،
تعلیم میٹرک۔ ماہانہ آمدنی ۶۸۰/- روپے
محمود علی معرفت الصدیق
ہارڈ ویئر اسٹور ۔ نزد چوک فوارہ ۔ پشاور صدر

تمیزہ ھری پور ھزارہ کے نام!
میرے اور آپ کے خیالات میں بڑی مطابقت ہے۔ عمر
۳۱ سال، تعلیم انٹر، تنخواہ ۸۰۰/- روپے ماہانہ۔
انیس احمد معرفت سلیمان وسیم
پوسٹ بکس نمبر ۸۴ ۔ پشاور صدر

---

میں آپ کے خیالات کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ میں ٹرانسپورٹ
کے سلسلے میں دوبئی مقیم ہوں۔ ۱۵ برس سے میری چار بسیں چلتی ہیں اور
ناظم آباد کراچی میں پانچ لاکھ کی جائداد موجود ہے۔
ایم اے ڈی
پوسٹ بکس ۸۷۴ ۔ دوبئی (یو اے ای)

نازیہ تبسم ھری پور کے نام!
آپ کے منفرد خیالات سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ عمر ۲۶ سال،
تعلیم میٹرک، تنخواہ ۴۵۰/- روپے ماہانہ۔
طاہر پردیسی
معرفت محمد اکبر خان ہیڈ کلرک
ایکسٹرا اسسٹنٹ ڈائریکٹر فشریز، پشاور ڈویژن، پشاور

اے این ھری پور کے نام!
آپ کی تحریر مجھے بہت پسند آئی۔ عمر ۲۵ سال، تعلیم یافتہ،
معقول تنخواہ۔
ظفر اقبال
یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ۔ ستار مارکیٹ
منگورہ۔ سوات

روبی کے نام!
آپ کے جذبات و احساسات نے سخت متاثر کیا ہے۔ عمر
۲۸ سال، تعلیم بی اے، تنخواہ ۲۴۰۰/- روپے

MOHD YOUNIS QAMAR
P.O. BOX 3052
ENC. DIV. DEF. DEPTT MUSCAT_ OMAN

روبی عظمت کے نام!
آپ کے خیالات کی دل و جان سے قدر کرتا ہوں۔ عمر ۳۴ سال،
سلطنت عمان میں اچھے عہدے پر ہوں۔ تنخواہ ۳۵۰۰/- روپے ماہانہ

M. S. ZAHID
POST BOX 470 MUSCAT , OMAN

م۔ بخاری کے نام!
آپ کے خیالات میں مجھے اپنے آئیڈیل کا عکس نظر آتا ہے۔ عمر
۲۸ سال، تعلیم بی اے، تنخواہ ۷۰۰/- روپے ماہانہ

طاہر معرفت سید لیاقت حسین نقوی
کلیم برانچ ۔ اسٹیٹ بنک آف پاکستان، پشاور صدر

**شہلا ناز بی کے نام!**
آپ کے خیالات میری نظروں سے گزرے۔ میں آپ کی تعلیم جاری رکھنے کی پوری کوشش کروں گا۔ عمر ۲۰ سال۔ تعلیم ایف ایس سی، تنخواہ ۔/۳۵۰۰ روپے ماہانہ۔

A.A.KALIA ELECTRICIAN
C/o HAWKER SIDNEY POWER ENGG:CO.LTD
P.O.BOX 3341 DUBAI, (U.A.E)

**یا سمین انگار کے نام!**
آپ کی صفات قابلِ صد ستائش ہیں۔ عمر ۲۳ سال تعلیم بی ایس سی تنخواہ ۔/۵۰۰ روپے ماہانہ۔

زاہد نقوی ۔ کوارٹر نمبر بی بلاک ۱۲۸
سول کوارٹرز ۔ کوہاٹ روڈ، پشاور

**عشرت ناز کے نام!**
مجھے آپ جیسے آئیڈیل کی تلاش تھی۔ عمر ۲۵ سال۔ تعلیم میٹرک، سرکاری ملازمت، تنخواہ ۔/۲۵۰۰ روپے ماہانہ۔

عبدالمنان بٹ
پوسٹ بکس نمبر ۸۱۶۵ ۔ صلالہ سلطنتِ عمان

**شاہین سلطانہ کے نام!**
میں بڑے دکھ درد کی منزلیں طے کر کے اس مقام تک پہنچا ہوں۔ آپ کا قدر دان ہوں۔ عمر ۲۱ سال تعلیم انٹر۔ تنخواہ ۔/۲۵۰۰ روپے ماہانہ۔

قادر علی خان
پوسٹ بکس ۵۴۷ ۔ شارجہ (یو اے ای)

---

م۔ تجاری (لاڑکانہ)، مک۔ آن (کراچی)
عائشہ سلطان نصاری، فہمیدہ کنول (کراچی)
ناہید خان (حیدرآباد)، شائستہ خان (کراچی)

—— آئیڈیل کی تلاش ——

کے کالم میں جولائی کے شمارے میں مندرجہ بالا خواتین کے خطوط شائع ہوئے تھے۔ یہ ہم سے دفتر کے پتے پر رابطہ قائم کریں۔

---

وہ خوش ہیں راہِ محبت میں آزما کے مجھے
بڑے حسین ملے ہیں صلے وفا کے مجھے

نہ لا سکا کبھی لب تک میں حالِ دل اپنا
مواقع لاکھ ملے عرضِ مدعا کے مجھے

سنا رہی ہیں یہ پیغام ہچکیاں میری
کہ تم نے یاد کیا آج یاد آ کے مجھے

میرے شعور میں جو پل رہا تھا مدت سے
وہ راز تم نے بتایا ہے مسکرا کے مجھے

نہ جانے کون سی یہ بھی ادائے فطرت تھی
سپردِ خاک کیا آدمی بنا کے مجھے

یہ انتقامِ محبت بھی کم نہیں مظہر
وہ خوش ہے نہ کبھی بزم سے اٹھا کے مجھے

حامد مظہر

## ایس ایم نصیر خان میانہ، ملتان

"دوشیزہ" لگ بھگ پانچ برس سے باقاعدہ پڑھ رہا ہوں اور میری متفقہ رائے ہے کہ اس کا معیار برقرار رہے۔ "آئیڈیل کی تلاش" کے عنوان سے جن خواتین کے خطوط شائع ہوتے ہیں انہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عورتیں اپنی ہی نہیں ملک کے نوجوانوں کی بھی زندگیاں تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر نرگس صاحبہ کا خط پڑھئے جو جون کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ اسے پڑھ کر رونا بھی آیا اور ہنسی بھی۔ رونا اس بات کا کہ بیچاری اپنا جیون ساتھی تلاش کرنے میں کتنی تگ و دو کر رہی ہے اور ہنسی اس بات پر کہ ان کی شرائط تو کوئی قارون کے خزانے کا مالک بھی پوری نہیں کر سکتا۔ بی بی اگر زندگی سکون سے بسر کرنا ہے تو سادگی اور سچے خلوص کے ساتھ بسر کرنا سیکھو۔ اسی میں ہم سب کی بقا ہے۔ بہرحال میں ان عورتوں کو کیا نصیحت کروں۔ ماشاء اللہ پڑھی لکھی ہیں سب باتیں سمجھتی ہیں۔ اب ہوس زر نے آنکھوں پہ پردے ڈال دیئے ہیں تو ہم کیسے سمجھائیں۔

## محمد امجد، لائل پور

گزشتہ چند ماہ سے آپ سے رابطہ قائم نہیں کر سکا جبکہ "دوشیزہ" باقاعدگی سے مطالعہ میں رہا۔ اس دوران پرچے میں کئی تبدیلیاں بھی ہوئیں۔ مثلاً صمصام صاحب کا کالم بند ہو گیا۔ اس کی جگہ روحانی ڈاک کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ تبدیلی آپ کے نزدیک درست سہی مگر اس کی شرائط میں کوپن کا لازمی ہونا ہمارے لیے اس لیے درد سر بن گیا ہے کہ کوپن کبھی ایسے صفحے پر ہوتا ہے جس کے کٹنے سے کبھی غزل کٹ جاتی ہے کبھی افسانہ غائب ہو جاتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوپن ایسی جگہ لگایا جائے جہاں سے کوپن کے کاٹ دینے سے کوئی ادبی نقصان نہ ہو۔ دوسری سب سے بڑی تبدیلی جو ہمیں بڑے دکھ سے برداشت کرنا پڑ رہی ہے وہ جی ایم ناز صاحب کا اچانک رخصت ہو جانا ہے۔ یقین مانیے کہ ان کی وفات کی خبر نے ایسا صدمہ اور رنج دیا جیسے اپنے شفیق بھائی، دوست اور ناصح کے چلے جانے سے ہوتا ہے۔ "دوشیزہ" تو اپنے سہاگ سے محروم ہو گئی ہے۔ "دوشیزہ" کے لاکھوں پڑھنے والے ان کے غم میں شریک ہوں گے۔ ان کا انداز بیان اور نصیحت کا مشفقانہ رویہ اپنے اندر کتنی اپنائیت سمیٹے ہوتا تھا کہ انسان ان کی ہر بات کو خود بخود ماننے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ آہ! اس ملک کے لاکھوں لوگ ان کے مفید مشوروں سے محروم ہو گئے۔ ہم اپنی انجمن فروغ ادب کی جانب سے ان کے اہل خانہ کی خدمت میں دلی تعزیت کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ و ارفع مقام عطا فرمائے۔

ایک عرض یہ ہے کہ خواتین کے عالمی سال کے سلسلے میں "دوشیزہ" کا کوئی نمبر نہیں نکالا۔ اس طرف توجہ دیجئے۔

## ایم اسلم، گوجرانوالہ

یہ بے چاری لڑکیوں کا قصور نہیں کہ وہ اچھے عہدوں والے لڑکوں کو اپنا آئیڈیل سمجھتی ہیں۔ آج کے مادہ پرست دور میں ہر شخص پیسے کے لالچ میں دیوانہ بنا ہوا ہے۔ دھن دولت کے سوا یہاں کسی کو کچھ اور سوجھتا ہی نہیں، پھر بیچاری لڑکیاں

یہ کیوں نہ چاہیں کہ انھیں بھی اچھا پیسے والا شوہر ملے ——
افزاالحق ناز سرحدی صاحب کا یہ کہنا کہ آجکل لڑکیاں اتنا اونچا
اُڑتی ہیں کہ نیچے دیکھتی ہی نہیں، بالکل غلط ہے۔ اس حمام میں
ہم سب ننگے ہیں۔ ناز سرحدی صاحب دور کیوں جاتے ہیں
اپنے نام کی طرف ہی دیکھ لیں۔ والدین نے ان کا نام صرف
افزاالحق رکھا ہوگا مگر انھوں نے ناز سرحدی کا اضافہ کر دیا،
صرف اس لیے کہ لوگ ناز سرحدی کے اضافے سے متاثر ہو
جائیں، لوگوں پر نام کا رعب پڑے۔ بس یہی حالت سارے
معاشرے کی ہے کہ ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کے لیے
ہر اچھا بُرا کام کر کے امراء کی فہرست میں جانا چاہتے ہیں۔ بس
اب یہی معاشرے کا چلن رہ گیا ہے، بیچاری عورتوں سے
پھر گیا گلہ۔

## رانی تبسم، سکھر

اگست کے شمارے میں حبیب احمد ظفر صاحب کا خط
پڑھا، انھیں ایک بہن کی تلاش ہے اور مجھے ایک بھائی کی۔
میں ان شاء اللہ انھیں بھائیوں جیسا سچا اور پُرخلوص پیار دونگی
مجھے وہ اپنا ایڈریس بھیجیں۔ رسالہ بہت اچھا ہوگیا ہے۔ بینا
ناول بہت پسند ہے۔ ناز صاحب کی وفات کا صدمہ ہوا
خدا انھیں جنت میں اونچا مقام دے۔

## ناہید ممتاز، وزیرآباد

آپ شاید مجھے بھول چکی ہوں گی لیکن اتنی مصروفیت
کے باوجود میں نے آپ کو یاد رکھا۔ میری باجی کی شادی تھی، آنا
ہنگامہ رہا پھر انھیں تعلیم جانا تھا۔ ان کے جانے کے بعد آپ کو
خط لکھ رہی ہوں۔ اب تو ماشاءاللہ ہمارا رسالہ خاصا مقبول ہو
چکا ہے۔ آپ کو بہت دنوں پہلے ایک افسانہ بھیجا تھا۔ اس
کی اشاعت کی منتظر ہوں۔ اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میں افسانہ اچھا
نہیں لکھ سکتی تو آئندہ کچھ اور بھیجا کروں مگر پلیز جواب تو دیجئے۔

ج: ناہید ہمیں آپ یاد ہیں۔ آپ نے یاد رکھا
اور خلوص سے خط لکھا ہمارے دل میں آپ کی
قدر اور بڑھ گئی۔ آپ کا افسانہ واقعی اچھا
نہیں تھا۔ آپ افسانے کی بجائے ہمیں چھوٹے
چھوٹے دلچسپ اقتباسات، چٹکلے اور لطیفے
بھیجا کریں۔ ہم ان شاءاللہ ضرور شائع کریں گے۔

## بیگم منظور خان، کراچی

رسالے میں ایک دو چیزوں کی کمی بُری طرح کھٹکتی
ہے۔ ایک تو باورچی خانے کو نظرانداز کئے ہوئے ہیں جس
کا ہماری عملی زندگی میں بہت زیادہ دخل ہے۔ اس کے علاوہ
کشیدہ کاری اور سلائی کڑھائی وغیرہ کے متعلق بھی نمونے شائع
کئے جانے چاہئیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس معاملے
میں اپنی خدمات پیش کروں؟

ج: آپ ہمیں سلائی کڑھائی کے نمونے ضرور
بھیجئے۔ اگر سب بہنوں کی فرمائش یہی ہے۔
تو ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔

## زاہدہ برکی، رانی برکی، کیمبلپور

بینا ناول مجھے بہت پسند ہے۔ اگر آپ اشعار کا بھی
سلسلہ شروع کردیں تو ہماری دیرینہ خواہش پوری ہوجائے۔
افسانے سبھی اچھے ہوتے ہیں۔ سچ مانئے ان کے پڑھنے سے ہمارا
شعور بیدار ہوتا جارہا ہے۔

## کاشف، مظفرگڑھ

میں مظفرگڑھ کا صحافی ہوں اور سوشل ورکر بھی۔ ادبی
ذوق رکھتا ہوں اس لیے ملک کے تقریباً سبھی رسالے مطالعہ میں رہتے
ہیں۔ اتنے ڈھیر سارے پرچوں میں "دوشیزہ" نے اپنی منفرد
حیثیت منوالی ہے۔ اس کی مبارکباد لیجئے۔ یہ بات اس لیے
اور بھی زیادہ مسرت کا باعث ہے کہ خواتین کا پرچہ ہوتے ہوئے
مردوں کے ذوق کی بھی پوری پوری تسکین کرتا ہے۔ مجھے
اس میں ذرا بھی سقم نہیں ملا جو تنقید کروں۔

## شیخ فریدہ غزل، کراچی

اگر حبیب بھیا پسند کریں تو میں انھیں بہن کا خلوص دے
سکتی ہوں۔ مجھے ان کے جواب کا انتظار رہے گا۔

ج: فریدہ آپ کی طرح دیگر بہنوں نے بھی
اسی خواہش کا اظہار کیا ہے جو ہم نے خطوط

کی صورت میں شائع کر دی تھی مگر حسیب صاحب نے ہمیں اپنا ایڈریس نہیں بھیجا۔ وہ جب بھیج دیں گے ہم شائع کر دیں گے۔

## آر، زیڈ ، رحیم یار خاں

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رسالہ نئے دور کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ مبالغہ آرائی یا فیم کا سانشہ دینے والی کہانیوں سے پاک ہے لیکن اس کے باوجود اس میں تھوڑی سی کمی ہے وہ یہ کہ بعض اوقات افسانے مبہم ہوتے ہیں۔ گزشتہ کے شمارے میں افسانہ "ایک دن ایک رات" بہت مبہم تھا۔ سچی کہانیوں کی تعداد بڑھا دیں تو دلچسپی اور بڑھ جائے گی۔ آئیڈیل کی تلاش کا کالم بہت بامقصد ہے۔ لڑکیوں کو اپنے متعلق ذرا سچائی سے کام لینا چاہیے کیونکہ ان کی مبالغہ آرائی سے معاملہ بگڑ سکتا ہے اگر اس کالم کو والدین کا اعتماد بھی حاصل ہو جائے تو بہت سے مسائل حل ہو جائیں کیونکہ ایسے معاملات میں ان کی پیش قدمی زیادہ مفید ہوتی ہے۔

## محمد حسین کنول ، حاصل پور

بہت دفعہ سوچا کہ پرچے میں کچھ لکھوں مگر ڈرتا ہوں کہ کہیں مایوس نہ کر دیا جاؤں کیونکہ آپ کے یہاں غزلوں کا معیار بہت بلند ہے۔ ڈرتے ڈرتے غزل بھیج رہا ہوں۔ کیا شائع کے قابل ہے۔ دوشیزہ کا سالانہ چندہ کس پتے پر ارسال کیا جا سکتا ہے۔

ج: کنول صاحب ابھی آپ کو مزید مشق کی ضرورت ہے۔ اچھے شعراء کا کلام پڑھیے۔ اپنے کلام کی کسی شاعر سے اصلاح لیتے رہیے۔ انشاء اللہ اچھا کہنے لگیں گے۔ رسالے کا چندہ آپ اسی ایڈریس پر بھیج سکتے ہیں جو آپ نے اپنے اس خط پر تحریر کیا تھا۔

## نسیلم خان، کراچی

حسیب بھائی کے لیے ایک خط لکھا تھا آپ نے شائع نہیں کیا۔ شاید آپ ان لوگوں کو ترجیح دیتی ہیں جو سالانہ خریدار ہوں۔ میں دوشیزہ مستقل پڑھتی ہوں۔ کیا اتنا حق بھی نہیں رکھتی کہ میرا خط شائع کر دیں۔ جناب ناز صاحب کے انتقال پر ملال کی خبر نے بہت رنج دیا۔ انھوں نے بہت سے دکھی لوگوں کی مدد کی ہے۔ ہم سب کی دلی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ خدا انھیں ان کی نیکیوں کا اجر دے۔ اشعار کا اچھا سلسلہ آپ نے کیوں بند کیا اسے دوبارہ شروع کر دیں۔ دونوں مسلسل کہانیاں بہت اچھی جا رہی ہیں۔ احسان آپ اس سوال کو خوب گول کر گئیں کہ ریحانہ فاروقی آپ کی کیا لگتی ہیں۔

## سیف اللہ نیازی ، میانوالی

یہ بیٹھے بٹھائے ان عورتوں کو کیا ہو گیا ہے، شور مچانے لگتی ہیں کہ مردوں کو پرچے میں لفٹ نہ دیں۔ مانا کہ یہ سال ہم لوگوں نے آپ کے نام وقف کر دیا ہے مگر اتنی بھی خودسرمت ہو کہ بلا وجہ لڑائی جھگڑوں پر اتر آؤ۔ کبھی ہم نے بھی کسی ایڈیٹر سے کسی بھی پرچے میں یہ شکایت کی ہے کہ عورتوں کا داخلہ بند کر دیا جائے بولو جواب دو؟

## راگنی ، لیاقت آباد

اگست کا شمارہ پڑھا۔ یوں تو تمام مضامین دلچسپ تھے مگر مجھے "ناگ پھنی" اور "اجالے کا گھاؤ" بہت پسند آئے دونوں کے مصنفین کو مبارکباد پہنچا دیجیے۔ "اے وطن" بہتر کہانی ہوتی اگر تاریخی واقعات حاوی نہ آ جاتے۔ اس کہانی میں افسانہ کم اور تاریخ زیادہ ہے۔ ایک مشورہ یہ ہے کہ آپ اداریہ کے بعد تصوف یا تاریخ کے اوراق دیا کریں۔ "تین عورتیں تین کہانیاں" آخری صفحات میں ہوں تو دلچسپ ترتیب ہو جائے گی۔

## محمد اقبال کپاڈیہ ، کراچی

اگر آپ "آئیڈیل کی تلاش" میں ان لڑکیوں کو جگہ دیں جو سقوط ڈھاکہ کے بعد لٹ پٹ کر پاکستان آئی ہیں یا پھر ان غریب اور بیوہ عورتوں کے کوائف لکھیں جن کا اس دنیا میں کوئی سہارا نہیں تو میرے نزدیک یہ موجودہ صفحات کی نسبت زیادہ بامقصد اور اصلاحی کالم بن جائے گا۔ جو لڑکیاں اب اس کالم میں حصہ لیتی ہیں وہ تو بڑے نخرے والی ہیں انھیں تو ایسی اداؤں سے کوئی نہ کوئی اچھا رشتہ مل ہی جاتا ہے۔ مصائب میں گھری خواتین کی مدد کریں تو کچھ فائدہ بھی ہو۔

اوجھل ہوئے نگاہ سے جب فاصلوں کے رنگ
خوابوں میں آ بسے ہیں کئی قربتوں کے رنگ

اب کے اُفق پہ کس نے سیاہی بکھیر دی
کس نے لٹا دیئے یہ مری حسرتوں کے رنگ

موسم کی طرح کھل گیا احباب کا چلن
خوابوں کی طرح ٹوٹ گئے حوصلوں کے رنگ

آنچل اڑا تو تیرے گلِ تر بکھر گئی
کھڑکی کھلی تو جاگ اُٹھے قربتوں کے رنگ

دیکھو تو مرے جسم میں خوں کا نشاں نہیں
زرد آ گیا ہوں دیکھ کے میں قاتلوں کے رنگ

پلکوں کی چلمنوں میں لرزتے ہیں آج تک
تیری گلی کو مڑتے ہوئے راستوں کے رنگ

گھر کے اُداس طاق میں ٹوٹا سا آئینہ
ہر روز دیکھتا ہے مری حیرتوں کے رنگ

البم میں میری آج بھی محفوظ ہیں ضیاؔ
یادوں کے پھول غم کی دھنک چاہتوں کے رنگ

**ضیاء شبنمی**

---

**ذوالفقار انجم جعفری**

وفا میں ہم یہاں برسوں اُن سے دور گئے رہے
محبتوں کی رہی زباں وفا کے لب پہ سلے رہے

ہزار دوریاں رہیں ہزار فاصلے رہے
تمہیں تو غم فراق کے دنوں سے بھی گلے رہے

جہاں سے گئے دل لگی تمہیں تو کون سے گئے
رہِ وفا میں منزلوں سے دور قافلے رہے

یہ دورِ ہجر میں کبھی جلا کبھی ذرا بجھے
خزاں کی گرد میں بھی گلاب پھول کھلے رہے

وہ ان کی جستجو میں نظر کی خواہش آرزو
جہانِ شوق میں بھی خوشبوؤں کے سلسلے رہے

## قسط نمبر ۱۷

ایرانی ... لیلیٰ کی ہنگامہ خیز سرگزشت

ایران کے چھوٹے سے شہر یزد کی ایک ستم رسیدہ لڑکی ہے۔ جب وہ تیرہ سال کی تھی تو ایک اجنبی نے جبراً اس کے دامن عصمت کو داغدار کر دیا پھر مزید ستم یہ کہ جب وہ سولہ سال کی ہوئی تو اس کے والدین نے اس کی مرضی اور پسند کے خلاف آقا میر نامی ایک گنوار اور ادھیڑ شخص سے اس کی شادی کر دینا چاہی۔ لیلیٰ اس صورت حال اور جبر سے سخت نالاں اور بیزار ہو گئی۔ اس کی مایوسی اس قدر بڑھی کہ وہ گھر سے بھاگ نکلی۔ اس کی منزل تہران تھی۔ اس نے تہران کے بارے میں اپنی سہیلی نرگس سے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہ ہائی اسکول پاس تھی اور اس کا خیال تھا کہ وہ تہران جا کر اپنی زندگی سنوار سکے گی اور جب کسی قابل ہو جائے گی تو والدین کے پاس واپس آ کر سرخرو ہو جائے گی۔

لیلیٰ اصفہان میں اپنی بہن کے پاس جانے کا بہانہ بنا کر ایک ٹرک پر سوار ہو گئی۔ ٹرک کے ڈرائیور ہاشم اور اس کے معاون غلام کو لیلیٰ کی بات کا یقین نہیں آیا مگر اس کے باوجود وہ اسے اصفہان پہنچانے پر تیار ہو گئے۔ راستے میں رات کو وہ ایک قہوہ خانے میں رکے اور اسی رات ایک اجنبی جارحانہ حملے کی غرض سے لیلیٰ کے کمرے میں داخل ہوا مگر لیلیٰ نے شدید مزاحمت کر کے اس حملے کو ناکام بنا دیا۔ اس جدوجہد میں اجنبی کی ایک انگلی شدید زخمی ہو گئی کیونکہ روشنی ہونے پر لیلیٰ نے دیکھا کہ اس کی ایک انگلی خون میں ڈوبی ہوئی تھی اور ناخن میں بھی کھال پھنسی ہوئی تھی۔

سفر دوبارہ شروع ہوا۔ راستے میں ایک چیک پوسٹ پر گشتی پولیس نے ٹرک روک لیا اور لیلیٰ کے بارے میں استفسار کیا۔ ہاشم نے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ لیلیٰ اس کی عزیزہ ہے اور وہ اسے اصفہان چھوڑنے جا رہے ہیں۔ آگے بھی پولیس کا خطرہ تھا لہٰذا ہاشم نے لیلیٰ کو سمجھا بجھا کر ایک کار میں منتقل کر دیا۔ کار میں فریدہ اور امتیاز تھے وہ دونوں بھی اصفہان جا رہے تھے۔ ہاشم نے لیلیٰ کو یقین دلایا کہ وہ بہت جلد اصفہان آ کر اس سے ملے گا اور اسے اس کی منزل مقصود تک پہنچائے گا۔ کار کا سفر شروع ہو گیا اور بہت جلد لیلیٰ کو اندازہ ہوا کہ فریدہ اور امتیاز جو خود کو بھائی بہن کہہ رہے تھے، اچھے لوگ نہیں تھے۔ ان کی حرکات اور گفتگو مشکوک تھی اور پھر لیلیٰ کا شک اس وقت یقین میں بدل گیا جب ایک پولیس آفیسر نے ان کی کار کی تلاشی لی اور جب وہاں سے گلوخلاصی ہوئی تو فریدہ اور امتیاز لیلیٰ کو اپنے ساتھ تہران چلنے پر مجبور کرنے لگے۔ فریدہ نے لیلیٰ پر سختی کی اور اسے دھمکیاں بھی دیں۔ وہ کچھ دور گئے تھے کہ ایک جیپ ان کا تعاقب کرتی ہوئی نظر آئی۔ خدا جانے وہ کس کی گاڑی تھی۔ پولیس کی یا لیلیٰ کے والد اور بھائیوں کی جو شاید اس کی تلاش میں آ رہے تھے۔ دونوں صورتیں ہی لیلیٰ کے لیے مایوس کن تھیں۔ ادھر فریدہ اور امتیاز بھی اچھے لوگ ثابت نہیں ہو رہے تھے۔ خدا جانے اسے کہاں اور کس مقصد سے لیے جا رہے تھے۔ لیلیٰ کشمکش و پیچ میں مبتلا تھی۔ اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

Rafa

پر جھک گیا لیکن اس کی مزاحمت اور مشتعل نظروں کی وجہ سے پرویز کسی جذباتی عمل سے گزر گیا۔ پرویز نے پہلی بار اس کی اس حرکت کو مذاق سمجھا لیکن پھر بڑی عاجزی اور انکساری سے شادی کی درخواست کر ڈالی۔ اس واقعے کے بعد ثریا کے بارے میں اس کے مزاج اور طرز عمل میں خاصی تبدیلی آ گئی۔ اب وہ اس کے جسم کا غلام نہیں رہا تھا اور اس مسلسل دوری کی وجہ سے ثریا بے چین رہنے لگی۔ اور پھر ایک دن بیژن چپکے سے گھر میں آ گھسا تا کہ بقول اس کے وہ اس ہرجائی کو اپنے ہاتھوں پکڑ سکے۔

شروع میں بیژن نے لیلی کو باتوں سے رام کرنا چاہا۔ اس نے لیلی کی بڑی تعریفیں کیں، زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیئے مگر لیلی کا دل نہ پگھلا بلکہ اس نے بیژن کی توہین کر دی۔ اپنی اہانت پر بیژن آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے اپنا رویہ یک لخت تبدیل کیا اور لیلی پر دست درازی شروع کر دی۔ لیلی نے ہر چند دفاع کیا مگر بیژن کی درندگی کے آگے ناکام رہی۔ بے بسی اور مجبوری سے لیلی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ نازک لمحات آنے والے تھے کہ پرویز اتفاقیہ طور پر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے بیژن کی بری طرح پٹائی کی۔ بیژن وہاں سے بھاگ نکلا۔ پرویز نے لیلی سے بیژن کے بارے میں پوچھا تو اس نے ثریا کو بچانے کی خاطر لاعلمی کا اظہار کیا۔ پرویز لیلی کی گول مول باتوں سے شک میں پڑ گیا۔ لیلی اس تصور سے ڈر گئی کہ کہیں پرویز خود اس سے بدگمان نہ ہو جائے چنانچہ اس نے بیژن اور ثریا کے تعلقات کے بارے میں پرویز کو سب کچھ بتلا دیا اور اس کے ساتھ ہی پرویز کی حالت غیر ہو گئی۔ اس وقت کرسی کے نیچے انہیں ایک البم ملا جس میں سے ثریا، بیژن اور ایک بچے کا گروپ فوٹو برآمد ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیژن ثریا کا سابق شوہر ہے اور وہ بچہ ان کا بیٹا ہے۔ یہ انکشاف پرویز کے لیے اور تکلیف دہ ثابت ہوا مگر وہ حیرت انگیز طور پر جھیل گیا۔ پھر اس نے لیلی سے کہا کہ وہ فوراً یہ مکان چھوڑ دے اور اس کے ساتھ چلے کیونکہ راز ظاہر ہو جانے کے بعد ثریا بہت شدید انتقام لے سکتی ہے۔ پرویز لیلی کو لے کر اپنے دوست مسعود کے یہاں لے گیا اور مسعود اور اس کی بیوی فاطی اس بات پر آمادہ ہو گئے کہ لیلی اس وقت تک ان کے ساتھ ٹھہرے گی جب تک کہ پرویز کو کوئی مکان نہیں مل جاتا۔ لیلی مسعود اور فاطی کے ساتھ رہنے لگی۔ دن اطمینان اور سکون سے گزرنے لگے مگر ساتویں دن ہی یہ اطمینان رخصت ہو گیا۔ باہر کسی نے اطلاعی گھنٹی بجائی تھی اور آواز ایسی تھی کہ لیلی کا جی دہل گیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی پیشانی پسینے سے بھیگتی جا رہی ہے۔

اب آپ پڑھئے

میں نے کمزور اور لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا: ”کون ہے۔“ نیچے سے ایک اجنبی آواز سنائی دی: ”معاف کیجئے گا خانم! زحمت ہوگی۔ ذرا آپ نیچے آئیں۔“

”تم کون ہو؟“ میں نے دوبارہ پوچھا۔

”میں نے عرض کیا نا کہ آپ نیچے آئیں۔“ وہی اجنبی آواز سنائی دی۔

”پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو۔“ مجھے بھی ضد سی ہو گئی تھی اور خوف کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔ دوسری طرف وہ شخص بھی اب کچھ ناراض سا ہو گیا تھا۔ اس نے انتہائی خشک اور تلخ لہجے میں کہا:

”میں پولیس اسٹیشن سے آیا ہوں اور تم سے ضروری کام ہے۔ فوراً نیچے آجاؤ۔“

میرے ہاتھ گویا کانپ گئے۔ ہمارے درمیان میں پولیس کہاں سے آ گئی تھی۔ میں نے بلند آواز سے فاطی خانم کو آواز دی۔ فاطی برتن دھو رہی تھی۔ میری گھبرائی ہوئی آواز سن کر بھاگی ہوئی آئی اور میرا دہشت سے اڑا ہوا چہرہ دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”کیا بات ہے لیلی! تمہارا رنگ سفید کیوں ہو رہا ہے اور کانپ کیوں رہی ہو؟“ اس نے حیرانی کے عالم میں پوچھا۔ میں نے اسے ماجرا بتایا تو آنکھیں بند کر کے دیوار سے ٹک گئی۔ کچھ دیر بعد مجھے فاطی کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی: ”معاف کیجئے گا جناب! یہ خاتون میری مہمان ہیں۔ اب بتائیے کیا کام ہے؟“ اس کے بعد ہی مجھے دوسری آواز سنائی دی: ”مجھے اسی خاتون سے کام ہے۔ ان کے خلاف ایک رپورٹ ہے اور رپورٹ درج کرانے والا ساتھ موجود ہے۔ آپ ان خاتون کو کہہ دیں کہ نیچے آ جائیں تو بہتر ہے۔“

”ابھی حاضر ہوتی ہیں۔“ کہتے ہوئے فاطی نے مڑ کر دیکھا اور میری گھبراہٹ کو محسوس کرتے ہوئے ایک ہاتھ میرے شانے پر رکھ دیا اور نرمی

سے بولی "آخر اس قدر گھبرانے کی کیا بات ہے؟ ممکن ہے انہیں تم سے کوئی کام نہ ہو اور وہ محض غلط فہمی کی بنا پر یہاں آ گئے ہوں۔"

فاطمی نے جلدی جلدی لباس اور بال درست کئے اور نیچے چلی گئی میں نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا اگر سوائے ایک کانسٹیبل اور فاطمی کے کوئی نہ دکھائی دیا۔ کوئی تیسرا شخص بھی تھا غالباً وہ اوٹ میں کھڑا ہوا تھا۔ فاطمی ہی سے گفتگو کر رہی تھی اور اس کا موڈ بہت خراب نظر آ رہا تھا۔ اچانک کانسٹیبل فاطمی کی طرف متوجہ ہوا اور سنجیدہ لہجے میں کہنے لگا "چور اسی گھر میں ہے اور آپ پولیس کے فرائض میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتیں۔" اس کے بعد ہی ایک دوسری آواز سنائی دی کسی نے فاطمی سے مخاطب ہو کر دھمکی آمیز لہجے میں کہا "اگر تم نے لیلیٰ کو ہمارے حوالے نہیں کیا تو میں تمہارے خلاف بھی رپورٹ درج کرا دوں گی۔ تم ایک چور کو ناجائز پناہ دیئے ہوئے ہو۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک جرم ہے۔"

میں اپنی جگہ سن رہ گئی۔ یہ صاف ثریا کی آواز تھی۔ وہ بدبخت میرے تعاقب میں یہاں تک آ پہنچی تھی حالانکہ پرویز کے خیال کے مطابق وہ یہاں تک نہ پہنچ سکتی تھی لو گویا فاطمی ہی کا خیال درست نکلا وہ آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑنے والی تھی۔ خوف اور مایوسی سے مجھے بخار کی سی کیفیت محسوس ہونے لگی۔ اس وقت فاطمی کی آواز سنائی دی۔ وہ غصے کے عالم میں ثریا سے کہہ رہی تھی "ثریا شرم کرو، میں حیران ہوں کہ آخر تمہاری شرم و حیا کو کیا ہوا ہے۔ کیوں تم ایک معصوم اور بے قصور پر چوری کا الزام لگا رہی ہو؟" پھر مجھ سے آگے کچھ نہ سنا گیا۔ ثریا بہت زور زور سے فاطمی کو دھمکیاں دے رہی تھی۔ ان کے لڑنے جھگڑنے کی آواز آتی رہی۔ میری تو جیسے بری حالت ہو گئی تھی۔ آنسوؤں نے میرے چہرے کو ڈھانپ لیا تھا اور میرا ذہن بالکل تاریک ہو گیا تھا۔ جانے کتنی دیر ہو گئی اور جانے وہ کیا باتیں کرتے رہے۔ پھر فاطمی واپس آ گئی میری حالت دیکھ کر دلاسا دیتے ہوئے بولی "ڈرنے کی ضرورت نہیں لیلیٰ! آخر تم نے کیا ہی کیا ہے۔"

"میں نے سن لیا ہے۔ وہ مجھ پر چوری کا الزام لگا رہی ہے اور پولیس کو بھی ساتھ لائی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ ثریا بہت حرام زادی ہے اس نے پولیس کو رپورٹ درج کروائی ہے کہ تین ماہ قبل تم اس کے مکان سے اس کے زیورات اور دوسری قیمتی اشیاء چرا کر کہیں بھاگ گئی ہو۔"

"تو کیا مجھے ان کے ساتھ پولیس اسٹیشن جانا پڑے گا؟" میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہو جاتا تو پڑے گا ڈیئر۔ جب چوری ہی نہیں کی ہے تو خوف کس بات کا۔ تمہاری واپسی بھی جلدی ہو جائے گی۔ اس عرصے میں یکس پر ویز کو اور مسعود کو فون کرتی ہوں تم اطمینان رکھو تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہو گا۔" اس نے ریسیور اٹھایا اور پرویز کا نمبر ملانے لگی۔

میں سوچ میں پڑ گئی تھی۔ اس لمحے میں خدا سے موت کی تمنا کر رہی تھی۔ کس قدر بچتے بچاتے میں یہاں تک پہنچی تھی مگر پولیس اچانک ہی اور بالکل غیر متوقع طور پر میرے سر پر نازل ہو گئی تھی۔ ثریا تو ایک آفت تھی ہی مگر پولیس ایک دوسری آفت تھی۔ اگر پولیس اسٹیشن پر میری شناخت ہو گئی اور انہیں معلوم ہو گیا کہ میں کون ہوں تو میرا انجام کیا ہو گا۔ مجھے بحفاظت تمام یزد بھیج دیا جائے گا۔ مگر بحفاظت تمام کیوں۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں بھی ہوں گی کیونکہ میں چوری کے جرم میں ماخوذ ہوں۔ خیر میں آزاد کر دی جاؤں گی پھر اس کے بعد والدین اور بھائیوں کا رویہ میرے ساتھ کیسا ہو گا اور یزد کے لوگ مجھ پر کیا کیا نہ ہنسیں گے، کیسے کیسے فقرے چست نہ کریں گے کیا میں زندہ رہنے کے قابل رہ جاؤں گی۔ میں اپنی خانم میرٹک پاس جو بھاگ کر تہران قسمت بنانے گئی تھی اور باقاعدہ چوری کرائی تھی۔ اس لمحے میں جیسے زمین میں گڑ سی گئی تھی۔ پھر مجھے فاطمی کی آواز سنائی دی۔ وہ بار بار فون کر رہی تھی مگر پرویز نہ ملتا تھا وہ کہیں گیا ہوا تھا اور کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں گیا ہوا ہے۔ تھک ہار کر اس نے مسعود کا نمبر ملایا مگر بدقسمتی سے وہ بھی دفتر سے کسی کام کے سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا اور اس کی واپسی کے بارے میں کچھ طے نہ تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ مصیبت آتی ہے تو چاروں طرف سے آتی ہے۔ ادھر نیچے سے بار بار کانسٹیبل بلند آواز سے مجھے بھیجنے کے لئے کہہ رہا تھا اور فاطمی ہر بار میرے لباس تبدیل کرنے کا بہانہ کر کے ٹال جاتی تھی۔ بہرحال کافی دیر گزر گئی پرویز نہ ملا نہ مسعود۔ اب معاملے کو مزید طول نہیں دیا جا سکتا تھا۔ فاطمی نے بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے بے چارگی عیاں تھی۔

"سب قسمت کی باتیں ہیں فاطمی خانم! میں بہت بری قسمت لے کر پیدا ہوئی ہوں۔ اس میں کسی کا کیا دوش؟" میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ میں پولیس اسٹیشن جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ چلتے چلتے میں نے کہا "فاطمی خانم! میں تہران میں کسی کو نہیں جانتی۔ یہاں میرا کوئی نہیں۔ خدا جانے پولیس اسٹیشن پر کیا صورتِ حال پیش آئے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم میرے ساتھ چلی چلو۔ میں تنہائی کے عذاب سے بچ جاؤں گی اور مجھے ڈھارس رہے گی۔"

"لیلیٰ میں مکان اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ اس کے علاوہ وہ لوگ یہاں

موجود رہنا ضروری ہے تاکہ شہر یار اور مسعود کو قتل کے بارے میں اطلاع دے سکوں اور فوراً ہی کچھ کیا جا سکے۔" ثریا نے جواب دیا۔ وہ اپنی جگہ مت ل چنانچہ میں نے اصرار نہیں کیا۔ میں باہر آئی تو کانسٹیبل اور ثریا میرے منتظر تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ثریا کے چہرے کے عضلات کھنچ گئے اور اس کی آنکھوں میں غصہ عود کر آیا۔ غراتے ہوئے بولی: "تم پر خدا کی مار! تم نے میرے ساتھ کیا برائی کی تھی کہ تم میری زندگی بھر کی کمائی سے ہاتھ صاف کر بیٹھیں" میں ثریا کے سفید جھوٹ پر حیران رہ گئی۔ وہ کس دیدہ دلیری سے میرے منہ پر جھوٹ بول رہی تھی حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں نے کوئی چوری نہیں کی ہے البتہ جان بچا کر بھاگی ہوں لیکن وہاں صفائی پیش کرنے کا موقع نہیں تھا۔ سڑک پر گاڑی کھڑی ہوئی تھی مجھے اس میں بٹھا دیا گیا اور اس کے بعد ہی گاڑی چل پڑی۔

میں پچھلی نشست پر ثریا کے ساتھ بیٹھی تھی اور آگے کانسٹیبل ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ بہت جلد گاڑی شاہراہ پر دوڑنے لگی۔ میں نے پشت کی طرف سے کانسٹیبل کا جائزہ لیا۔ اس کے بال خاصے بڑے تھے جو کہ عموماً پولیس والوں کے نہیں ہوتے۔ پھر میں نے سوچا شاید تہران میں پولیس کے لوگ بڑے ہی بال رکھتے ہوں مگر جانے کیوں وہ مجھے شروع سے ہی کچھ اچھا آدمی نظر نہیں آیا تھا۔ پھر اس کا حلیہ میری نظروں میں کھٹک گیا اس نے کمر سے پیٹی بھی نہیں باندھی تھی جو کہ کانسٹیبل لازمی طور پر باندھتے ہیں اور اس پر ان کا نمبر درج ہوتا ہے۔ کانسٹیبل سے گزر کر میری نظریں ڈرائیور پر جم گئیں۔ وہ ستائیس اٹھائیس سال کا نوجوان تھا اور اس کا چہرہ بہت کریہہ تھا۔ اس کے بال بھی بڑے تھے اور داڑھی ترشی ہوئی نہیں تھی۔ میں آئینے میں اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی غیر معمولی بات تھی اور چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی جس کے کئی معنی اخذ کئے جا سکتے تھے میں گھوم کر ثریا کی طرف دیکھنے لگی اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ تھی۔ ان کی مسکراہٹوں کی وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔

گاڑی نے ایک موڑ کاٹا اور ایک ذیلی سڑک پر آ گئی پھر کچھ دور چلنے کے بعد ایک کچی سڑک پر اتر گئی۔ اب گاڑی کی رفتار بھی پہلے سے بہت تیز ہو چکی تھی۔ کافی دور نکل آنے کے بعد کانسٹیبل نے سر سے ٹوپی اتار کر ایک طرف پھینک دی۔ ثریا جو اب تک حیرت انگیز طور پر خاموش تھی مضحکہ اڑانے والے انداز میں مخاطب ہو کر مجھ سے بولی: "خوب لیلیٰ خانم! ہمارا خیال تھا کہ تم بہت عقلمند اور ہوشیار ہو۔" اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی اور جیسے اس کا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ "تم یزد سے میرا [illegible] تہران آئی تھیں تاکہ اس سے شادی کر کے میری جگہ ہتھیا سکو۔ کیا تم نے کوئی خواب دیکھا تھا خانم!"

میں اس کے لہجے اور طرز تخاطب پر ذرا بھی حیران نہ ہوئی۔ میں جانتی تھی کہ ثریا کیسی عورت تھی۔ میں سنبھالا لیتے ہوئے بولی: "مجھے عقل مندی کا قطعاً دعویٰ نہیں ہے اور تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں چور بھی نہیں ہوں" جواب میں ثریا قہقہہ مار کے ہنسنے لگی اور کانسٹیبل نما شخص کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی: "سن رہے ہو تقی! یہ کیا کہہ رہی ہے۔ یہ چور نہیں ہے۔" ثریا نے جس طرح تقی کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا اور جس انداز میں اسے مخاطب کیا تھا اس سے ان کے درمیان بے تکلفی اور ایک گہری شناسائی کا اندازہ ہوتا تھا۔ میرے ذہن میں شبہے نے سر ابھارا مگر میں شبہے کو دبا کر مضبوط لہجے میں بولی: "پولیس اسٹیشن پہنچ کر جھوٹ سچ کھل جائے گا۔" ثریا پھر ہنسنے لگی اور اس کے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھے ہوئے وہ تینوں افراد بھی ہنسنے لگے۔ خوف سے میرا دل بیٹھ گیا۔ تو میرا شبہ صحیح تھا۔ یہ کانسٹیبل فرضی تھا۔ یہ لوگ آپس میں ملے ہوئے تھے اور ثریا نے مجھے قابو میں کرنے کے لئے یہ ڈرامہ کھیلا تھا۔ میں نے خود کو سمیٹ لیا اور گاڑی کے دروازے کو کھولنے لگی۔ ثریا میرے ارادے کو تاڑ گئی۔ مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولی: "لیلیٰ خانم! میں تمہاری طرح عقل مند تو نہیں ہوں مگر تھوڑی بہت سمجھ ضرور رکھتی ہوں۔ میں نے دروازے کو مضبوطی سے لاک کر دیا ہے لہٰذا کسی حماقت کی ضرورت نہیں۔" میری امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اسی وقت مجھے ڈرائیور کی خونخوار آواز سنائی دی: "لڑکی غور سے سنو۔ جس طرح ہو چپ چاپ بیٹھی رہو۔ کوئی شرارت کی تو تمہاری ناک اور کان کاٹ کر تمہارے پرس میں رکھ دیا جائے گا۔ سمجھیں؟"

میرا شبہ یقین میں تبدیل ہو گیا۔ مجھے اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ میں سنگین مصیبت میں پھنس گئی ہوں مگر اب پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا کیا کیا جا سکتا تھا۔ خدا جانے یہ لوگ مجھے کہاں لئے جا رہے تھے اور ان کے کیا ارادے تھے۔ بہرحال ثریا کا بچھایا ہوا یہ جال بہت مضبوط تھا اور میں مکمل طور پر اس کے قابو میں تھی۔ وہ مجھے ایک بھیڑ کی مانند بے بس کئے ہوئے مذبح خانے کی طرف لئے جا رہے تھے۔ اب اگر شہر یار اور مسعود مجھے تلاش کرتے بھی تو کہاں کرتے۔ یہ لوگ مجھے پولیس اسٹیشن تو لئے نہیں جا رہے تھے۔ خدا جانے ان کی منزل کہاں تھی اور ان کے کیا ارادے تھے۔

گاڑی بہت جلد شہر کی حدود سے باہر نکل آئی اور برق رفتاری سے نامعلوم منزل کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ ڈرائیور کرخت لہجے میں تقی سے مخاطب ہو کر بولا: "اب جلدی سے تم یہ لباس اتار دو۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

تقی لباس اتارنے میں مشغول ہو گیا۔ اندر وہ دوسرا لباس پہنے

ہوا تھا۔ لوفروں جیسا لباس، سرخ قمیض اور لمبے بال۔ جھک کر دوسرے
ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ تقی نے فوراً ایک لوک دار چاقو نکال لیا اور دوڑ کر
میری شہ رگ سے لگاتا چلا گیا۔

”کوئی نہیں یا شور مچایا تو خود کو مردہ سمجھو۔“ مردہ تو میں پہلے ہی ہو
چکی تھی۔ حلق سے ایک آواز بھی نہ نکلی۔ مخالف سمت سے آتی ہوئی گاڑی
زن سے میرے قریب سے نکل گئی اور میں حسرت و یاس سے اسے دیکھتی
رہ گئی۔ اس گاڑی میں بیٹھے ہوئے شخص نے نگاہ غلط انداز سے بھی مجھے
نہ دیکھا تھا۔ تقی نے چاقو میری شہ رگ سے ہٹا لیا۔ میں خوف سے کانپتی
ہوئی آواز میں بولی ”تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

ثریا ہنس پڑی۔ ہنستے ہوئے بولی ”نہ ڈر لاڈلی خاتونوں کی تمنا!
ہم تجھے بہشت لے جا رہے ہیں جہاں تو بہترین کپڑے پہن سکے گی اور
عمدہ اور مرغن غذائیں تجھے کھانے کو ملیں گی۔ تیرے اختیار میں جدید ترین
ماڈل کی گاڑی ہوگی اور تیرے قدر دانوں کا شمار نہیں ہوگا!“

میں ثریا کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ سر جھکا کر رونے لگی تو یہ تھا اپنا انجام
ثریا نے سگریٹ جلایا اور دھواں میرے منہ پر چھوڑتی ہوئی بولی ”آنسو
نہ بہاؤ۔ جو مجھ سے غداری کرتا ہے اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔ اب میں
دیکھتی ہوں کہ پرویز تمہیں کس طرح نجات دلانے آتا ہے۔ جب تک اس
کے ہاتھ تم تک پہنچیں گے تمہارا حلیہ ہی تبدیل ہو چکا ہوگا پھر شاید خود
پرویز تمہاری طرف ایک نظر ڈالنا بھی پسند نہ کرے گا“ اس کے بعد وہ فحش
گالیاں بکنے لگی۔ ایسی گالیاں جنہیں میرے کانوں نے کبھی نہ سنا تھا۔
میرا چہرہ سرخ ہو گیا اور میں منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

پندرہ منٹ بعد گاڑی کی رفتار ہلکی پڑ گئی اور اب وہ ایک بڑے سے
باغ میں داخل ہو رہی تھی۔ باغ کے گرد فصیل تھی اور سامنے ایک بڑا سا
آہنی گیٹ تھا جس میں سے ہو کر گاڑی ایک بڑی سی عمارت کے سامنے
رکی تھی۔ یہ عمارت سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی تھی اور بہت خوبصورت تھی
گھنی مونچھوں والا ایک تنومند شخص گاڑی کے قریب آیا اور جھک کر مجھے
دیکھنے لگا۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھ گیا۔ میں نے گردن گھما کر اطراف کا
جائزہ لیا۔ ہر طرف کاجو اور چنار کے درخت پھیلے ہوئے تھے پھر میری
نظریں سفید بالوں والی ایک بوڑھی عورت پر جم گئیں وہ عمارت سے نکل
کر تیزی سے گاڑی کی طرف آ رہی تھی۔ تقی اور ڈرائیور گاڑی سے نکل کر
باہر کھڑے ہو گئے۔ بوڑھی عورت قریب آئی تو تقی اس سے کچھ کہنے
لگا۔ پھر دروازہ کھولتے ہوئے مجھ سے بولا ”آؤ باہر نکلو میں خانم سے
تمہارا تعارف کراؤں۔“

تقی کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس سے کہ میرا دل کانپ
کر رہ گیا لگتا تھا جیسے مجھے موت کا حکم سنا دیا گیا ہو۔ تقی میرے گاڑی
سے نکلنے کا منتظر رہا مگر میرا تو جیسے جسم سن ہو گیا تھا گویا میں بت بن کر
رہ گئی تھی۔ میرے لیے کھڑا ہونا تو دور کی بات تھی میں ہاتھوں کو
نہ ہلا سکتی تھی۔ میری نظریں گھوم پھر کر اس سفید بالوں والی پر
گئیں۔ بوڑھی تو اسی دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے
قصے کہانیوں کی وہ چڑیل نظر آ رہی تھی جو انسانی خون پی کر زندہ
اور سامنے کا خوبصورت اور پرشکوہ مکان بھی مجھے زنداں سے کم نہ
تھا۔ اب شاید میری قسمت اس بوڑھی عورت اور اس مکان سے وابستہ ہو
گئی تھی۔ میں سوچ میں گم تھی کہ مجھے تقی کی کرخت آواز سنائی دی۔
مجھ سے مخاطب تھا ”میں نے تم سے باہر نکلنے کے لئے کہا تھا۔
بہری ہو گئی ہو؟“ میں نے خود کو سنبھالا اور چاہا کہ اٹھوں مگر ثریا
نے میری پسلیوں میں زوردار کہنی ماری اور غصیلے لہجے میں بولی ”
تقی کی آواز نہیں سنائی دے رہی ہے۔ جلدی سے گاڑی سے
تمہارا خیال تھا کہ یزد سے تہران آتے ہی پرویز کو بتا دو گی۔ یہ تھا
تقی۔ ہونہہ۔“ ثریا طنزیہ انداز میں ہنسی ”اب تم بھی کیا یاد کرو گی میں
ممی کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ جانتی ہو تمہاری کیا قیمت مقرر ہوئی؟
کچھ ہزار تومان نقد۔ یہ کچھ ہزار مجھے ابھی اور اسی وقت ملیں گے جب
ہاتھ ممی کے ہاتھ میں دے دوں گی۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے
گھونسہ میرے بازو پر رسید کر دیا۔ درد کی شدت سے سسکی
کو میں نے حلق میں ہی گھونٹ لیا۔ تکلیف کے اظہار سے فائدہ
کون سے میرے ہمدرد وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں تو سبھی
تھے۔ انسانی گوشت پر پلنے والے، بالآخر میں ہمت کر کے اٹھی
سے باہر نکل آئی مگر اس وقت تک تقی کا ضبط جواب دے گیا
وہ بہت زیادہ مشتعل ہو چکا تھا۔ اس نے میری کلائی پکڑی اور
سے گھسیٹ کر ممی کے سامنے کر دیا۔ تکلیف اور درد سے میری
گئی اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ مجھے محسوس ہوا جیسے
کے درمیان ہوں اور مجھے ذبح کرنے کے لئے لے جایا جا رہا ہے
والی عورت جسے وہ ممی کہہ رہے تھے بالکل قریب آ گئی اور میرے
اور چہرے کی طرف اس طرح دیکھنے لگی جیسے اندازہ کر رہی ہو
مال صحیح خریدا ہے یا نہیں۔ وہ کچھ دیر تک مجھے سامنے کھڑ
رہی پھر تحکمانہ لہجے میں ”ذرا گھومو“ میں اس کا مقصد ہی نہ سمجھ
نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اگلے ہی لمحے تقی نے مضبوط
شانے میں انگلیاں گاڑ دیں اور ہونٹ چباتے ہوئے بولا ”کیا
سنا ممی گھومنے کے لئے کہہ رہی ہے“ پھر انتظار کئے بغیر اس نے

حکومتِ سندھ کی عائد کردہ پابندی کی وجہ سے تین ماہ بعد شائع ہوگا!

گھما دیا۔ تقی کے ہاتھ مجھے اپنے جسم پر رینگتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ
دونوں ہاتھوں سے پشت کی جانب سے مجھے ٹٹول رہی تھی۔ کولہوں اور کمر
سے اس کے ہاتھ ہوتے ہوئے میری رانوں کے درمیان پہنچ گئے۔ پھر
اس نے مجھے دوبارہ مڑنے کے لئے کہا۔ اس بار میں نے تقی کا انتظار
نہیں کیا، خود ہی گھوم گئی۔ تقی بہت ظالم آدمی تھا۔ پہلے پہل اس نے
اذیت رسانی کا سامان پیدا کر لیا تھا۔ اب میرا چہرہ پہلے کی مانند ممی کے سامنے
تھا۔ اس بار اس نے میرا سینہ ٹٹولنا شروع کیا، پھر اس کے ہاتھ سرکتے
ہوئے ناف تک آ گئے۔ اس کے بعد اس نے میرے بازوؤں اور شانوں
کا جائزہ لیا اور مسکراتے ہوئے بولی: "کچھ موٹی ہے۔ کھاتی پیتی ہوئی معلوم ہوتی
ہے۔ آج کل مرد موٹی عورتوں کو پسند نہیں کرتے۔ بہر حال ٹھیک ٹھاک
کرنے کے بعد چل جائے گی۔" ثریا بھی قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ مسرت
بھرے لہجے میں بولی: "تو پھر فیصلہ پسند آ گئی نا۔ چلو معاملہ طے ہوا۔" ممی نے
اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تقی سے مخاطب ہو کر بولی: "تقی اسے
اندر لے جاؤ اور نسرین کا کمرہ دے دو۔ نسرین واپس آئے گی تو اس کے لئے
کسی دوسرے کمرے کا بندوبست کر دیں گے۔ اور خورشید سے کہہ دینا کہ
اس پر نظر رکھے ویسے تم بھی اس کی کڑی نگرانی کرو گے۔ میں ذرا فرصت
پالوں تو پھر اس کے بارے میں سوچوں گی اور دوسرے انتظامات
کروں گی۔"

تقی نے دوبارہ میرا بازو پکڑ لیا مگر اس بار گرفت بہت نرم اور
دوستانہ تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا: "تشریف لے چلئے خانم۔ آپ کا
جو بھی نام ہو مگر یہاں تمہیں کسی دوسرے نام سے پکارا جائے گا۔ آئیے
چلیں۔" تو کام تمام ہو چکا تھا۔ میں بک چکی تھی اور میرا سودا بخیر و خوبی
طے پا گیا تھا۔ دونوں فریق خوش تھے۔ خریدنے والا بھی اور فروخت
کرنے والا بھی۔ اگر کوئی گھاٹے میں رہا تھا تو وہ میری ذات تھی۔ انتہائی
بے بسی اور مایوسی کے عالم میں میں نے چہرہ گھمایا اور ثریا سے مخاطب
ہو کر بولی: "خدا تمہیں ذلیل کرے۔ آخر میں نے تمہارے ساتھ کیا برائی کی
تھی۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہاری اس زیادتی کو قدرت معاف کر دے گی۔ تم
یقیناً ایک دن اپنے عبرتناک انجام کو پہنچو گی۔"

ثریا اور ممی اور شاید وہاں موجود تمام لوگ اس قسم کے مناظر کے
عادی ہو چکے تھے۔ وہ سب میری بات سن کر ہنسنے لگے۔ ثریا ہنستے ہنستے
بولی: "احمق لڑکی میں نے تیرے ساتھ کوئی برائی نہیں کی ہے۔ یہ تو حساب
بے باق کیا ہے۔ دو تین ماہ بعد پرویز خود یہاں آتا اور تمہیں بہت ہی
سستا اور ارزاں قیمت پر فروخت کر جاتا۔ میں نے تمہیں اچھے داموں
فروخت کیا ہے۔ اسے ایک طرح سے اپنی عزت افزائی سمجھو۔ تمہیں
نہیں کہ یہاں تمہیں بڑے اچھے اچھے گاہک ملیں گے۔ پڑھے لکھے بھی ملیں گے
ایسے ـــــــ اور مالدار کہ وہ تم پر سب کچھ نچھاور کر دیں گے۔" اس کے بعد تقی مجھے
ساتھ لئے ہوئے مکان کے اندرونی حصے کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک
راہداری سے گزرنے کے بعد وہ ایک بڑے سے کمرے کے سامنے آ
گیا۔ کمرہ مقفل تھا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا، کسی خالہ کو آواز دینے لگا تو
دیکھا ایک بوڑھی پستہ قد عورت وہاں نمودار ہوئی۔ اس کا چہرہ سیاہ
اور کدورت آلود تھا۔

"دروازہ کھولو۔" تقی نے اس سے کہا۔

"یہ نسرین خانم کا کمرہ ہے۔ اس نے جاتے وقت مجھ سے کہا تھا
میں یہ کمرہ کسی کو نہ دوں۔" خالہ نے جواب دیا۔ تقی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ غصے
کے عالم میں بولا: "بکواس مت کرو۔ کیا معلوم نسرین کی کب تک واپسی ہو۔ اس
علاوہ خود ممی نے یہ کمرہ دینے کے لئے کہا ہے۔"

خالہ نے نظریں اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا اور کمرے سے چابیوں کا
گچھا نکال کر دروازہ کھولنے لگی۔ اس کے سیاہ ہونٹوں پر مسکراہٹ
اس نے تقی سے پوچھا: "نئی ہے؟"

"بکواس مت کرو۔ دروازہ کھولو۔"

"خوبصورت ہے۔ کہاں کی ہے؟" خالہ نے تقی کے غصے کو نظر انداز
کرتے ہوئے پوچھا۔ شاید وہ اس ماحول کی عادی ہو چکی تھی۔

"یہ لڑکی ہے مگر تمہیں ان باتوں سے کیا سروکار۔ جو کہا جا رہا ہے
کرو۔" تقی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"لڑکی تو اچھی معلوم ہوتی ہے۔ کون لایا ہے؟"

"ثریا۔"

"کون ثریا۔ وہ جس نے ایک بار خود کشی کی کوشش کی تھی؟"
خالہ نے پوچھا اور تقی یک لخت بگڑ گیا: "نہیں یہ دوسری ثریا ہے۔
بکواس بہت کر رہی ہو خالہ۔ اب جلدی سے دروازہ کھولو۔"

دروازہ کھل گیا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ کمرے کی ایک کھڑکی
پشت کی طرف باغیچے میں کھلتی تھی۔ کمرے کا فرش نیلے ٹائل کا تھا۔ اس
کے قریب ہی سفید رنگ کی ایک بڑی اور خوبصورت سی مسہری بچھی ہوئی
تھی۔ ایک طرف کپڑوں کی الماری تھی اور اس کے ساتھ ہی سنگھار میز
ہوئی تھی۔ کمرے میں اور بھی بہت ساری آرائش و زیبائش کی چیزیں
تھیں مگر سب سے بدترین بات یہ تھی کہ وسط میں ایک چھوٹی سی میز پر
ایک بوتل، چند گلاس اور ٹرے میں برف کے ٹکڑے رکھے ہوئے تھے۔

ان چیزوں کا کیا عمل تھا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ اس مکان کے تمام لوگ شراب پینے پر مجبور ہیں۔

تقی اس وقت تک سکوت اختیار کئے رہا جب تک کہ میں نے بھرپور نظروں سے کمرے کا جائزہ نہیں لے لیا پھر وہ واپسی کے لئے مڑا اور دروازے پر رک کر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "اب جو میں کہوں اسے غور سے سنو۔ فرار کا خیال دل سے نکال دو۔ ممکن ہے اس کوشش میں تم یہاں سے چلی جاؤ۔ یہاں کے ملازمین بھی دھوکہ پروف ہیں لہٰذا انہیں دھوکہ دینے یا ساز باز کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔ اس کے علاوہ وہ ڈنا چلاتا ہوا دیلروں سے ٹکرانا بھی فضول ہے۔ روح کا جسم سے نکلنا آسان ہے مگر یہاں سے فرار ہونا دشوار ہے۔ لہٰذا فرمانبرداری اور اطاعت اختیار کرو کہ اس میں تمہاری بھلائی ہے۔ یہاں تمہیں کسی چیز کی تکلیف اور کسی محرومی کا احساس نہیں ہوگا۔ جو کہو گی حاضر کر دیا جائے گا۔ صرف تمہاری جنبشِ ابرو کی ضرورت ہے۔ مگر یہ سب اسی صورت میں ممکن ہے جب تم سرکشی سے احتراز کر کے اطاعت اختیار کرو۔ ممی جو کہے سر جھکا کر سن لو اور اطاعت کرو۔ ممی کے کہنے پر چلو گی۔ اس کے آگے سر جھکا دو گی تو عیش کرو گی۔ وہ عیش جس کا تم تصور بھی کیا ہوگا۔ یہاں تمہیں ہر چیز ہر عیش و آرام میسر ہوگا۔ بہترین لباس، جدید ترین گاڑی اور اچھا خاصا ذاتی اکاؤنٹ شہزادیوں کی مانند ہوگی ساتھ کر پانی پینے کی ضرورت بھی پیش نہ آئے گی۔ ممی وفادار اور اطاعت شعار لڑکیوں کی بہت قدر کرتی ہے۔ انہیں پلکوں پر بٹھا کر رکھتی ہے۔ لیکن اگر ——" تقی ذرا رکا پھر لہجہ بدلتے ہوئے بولا "تم نے ممی سے نافرمانی کی یا یہاں سے بھاگنے اور دھوکہ دینے کی کوشش کی تو تمہارا انجام بہت عبرتناک ہوگا۔ سو گی نہیں، موت کو ترسو گی، موت کی تمنا کرو گی مگر موت نہیں آئے گی۔ ممی کی مرضی کے بغیر موت بھی نہ آسکے گی۔ موت تم سے آنکھیں چرائے گی۔ تمہیں معلوم نہیں مگر جلد معلوم ہو جائے گا کہ ممی کس قدر سنگدل عورت ہے۔ ناپسندیدہ لڑکیوں کو وہ معاف کرنا نہیں جانتی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے ان کے چہروں پر تیزاب ڈالتی ہے اور دور کھڑی ہو کر اس تماشے سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ تمہارے لئے موقع ہے تم ممی کا دل مٹھی میں لے سکتی ہو پھر دیکھو تمہارے لئے جنت زمین پر اتر آئے گی۔" تقی نے کہا اور اچانک رخ پھیر کے چل دیا۔

خالہ وہیں دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ مجھے ستائش کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چابی کا گچھا ابھی تک دبا ہوا تھا۔ تقی کے جانے کے چند منٹ بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی "تمہارا نام کیا ہے؟" میں اس قدر ناراض اور ہراساں تھی کہ میں نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ چند منٹ تک انتظار کرتی رہی پھر شانے اچکاتے ہوئے بولی "جو بھی نام ہو فرق نہیں پڑتا کیونکہ ممی تمہارے لئے کوئی دوسرا نام منتخب

نہیں نہیں پکنک کے لیے یہ جگہ قطعی اچھی نہیں ہے

کرے گی۔ اسے جدید ترین اور خوبصورت نام پسند ہیں اسے سکینہ، زیب، صغریٰ اور کبریٰ جیسے ناموں سے سخت چڑ ہے۔" پھر وہ رکی اور دروازے سے باہر جھانکنے کے بعد آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی میرے پاس آئی اور بے حد نرم اور مشفقانہ لہجے میں بولی "میں جانتی ہوں تم رنجیدہ اور بے حد دکھی ہو مگر میں کیا کروں۔ اس میں میرا کیا قصور۔ مجھ سے کچھ بات کرو۔ میں یہاں تمہاری خدمت پر مامور ہوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا "کیا بات کروں۔" وہ میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی "کنواری ہو؟"

"یہی سمجھ لو۔" مجھے اس کا سوال کچھ عجیب سا لگا تھا۔

"تمہاری عمر بھی کچھ زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔" خالہ نے کہا اور اس کے بعد گویا تسلی دینے کے انداز میں بولی "پریشان نہ ہو تم جیسی لڑکیاں پہلے بھی یہاں آتی رہی ہیں۔ پہلے تو انھوں نے بہت چیخ و پکار اور شور شرابا مچایا مگر بعد میں رام ہو گئیں۔ یہاں رہنے والی لڑکیوں کو بعد میں یہاں قہقہے لگاتے اور چہلیں کرتے دیکھنا۔ یہاں کی زندگی کوئی بری نہیں ہے۔ بس عادت کی بات ہے۔ ایک بار دل لگ گیا اور دل لگانا ہی پڑتا ہے کیونکہ اس میں بھلائی ہے ورنہ بڑی مصیبتیں ہیں —— اچھا اب میں چلوں گی تمہارے لئے کپڑے لے آؤں۔ تمہارے یہ کپڑے گندے ہیں ان سے پسینے کی بو اٹھ رہی ہے۔"

خالہ کا جملہ ختم ہوا تھا کہ راہداری میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی تیز قدموں سے اسی طرف آ رہا تھا۔ پھر دروازے کے قریب ہی کسی عورت کی غصے بھری آواز سنائی دی "خالہ، خالہ کس جہنم میں چلی گئی ہو تم۔"

"مجھے تو خود بھی ہے" خالہ بہت سے بڑبڑائی۔ "ممی نے ان تمام کتابوں کو بیچ کر بہت کر رکھا ہے۔ ہر ایک جگہ پر حکم چلاتی ہے۔" پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بلند آواز میں بولی "خالہ تمہیں جب بھی کوئی قاعدے کا احتیاط سے تو پہلے دروازہ بند کر کے جانا چاہیے مگر نہیں بند کروں گی کیونکہ یہاں تمہارا ماحول ہے اور تم بہت وحشت زدہ ہو۔ مگر ایک بات کا خیال رکھنا کہ ہرگز مت جانا۔ خوامخواہ یہاں پہلی کرنے میں ماہر ہیں۔ خدا ناخواستہ کبھی اور رنگ رکھے سے ہم جیسوں کا … لے جاتے ہیں ۔۔۔ اور خالہ کے شوہر … کی کوشش کر کے میری ساری خواب … میں کسی کی … ہوں گی یہ عورت ماری جاؤں گی۔"

خالہ یہ کہہ کر مڑنے والی تھی کہ ایک عورت تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی۔ خالہ کو یہاں دیکھ کر اس کا پارہ چڑھ گیا۔ "تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ میں نے تمہیں کپڑے ڈرائی کلیننگ کے لئے بھیجا تھا کیا تمہیں نہیں معلوم کہ آج مجھے ایک ضروری جگہ جانا ہے۔" پھر اچانک ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑ گئی۔ وہ کچھ دیر تک مجھے حیرت سے دیکھتی رہی پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اس نے سر کو اس طرح جنبش دیا جیسے مجھے سلام کر رہی ہو یا میری خیریت پوچھ رہی ہو۔ میں نے غور سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ بہت خوبصورت اور اچھے نقوش کی عورت تھی۔ اس نے گہرا میک اپ کر رکھا تھا اگر میک اپ میں نہ ہوتی تو بھی اس کی خوبصورتی میں کوئی فرق نہ پڑتا مگر شاید میک اپ ہم عورتوں کی کمزوری ہوتی ہے۔ اس کے جسم پر جینز کی تنگ پتلون اور چست بلاؤز تھا جس سے اس کے تمام جسمانی نشیب و فراز ابھر آتے تھے۔ آنکھیں بڑی اور چمکدار تھیں۔ عمر زیادہ سے زیادہ بیس سال ہی ہوگی۔ اس کے چہرے پر ایک قسم کی شرارت اور شوخی تھی۔ میری پلکیں جلنے لگیں۔ اس عورت میں میں اپنا مستقبل دیکھ رہی تھی۔ شاید کچھ عرصے بعد میں بھی اس جیسی ہو جاؤں۔ اس نے میری کیفیت کو محسوس کر لیا اور خاموشی سے میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت خالہ نے بہت سہارا دیا۔ وہ اس عورت کا بازو پکڑتے ہوئے بولی "نوشی خانم یہ نئی آئی ہیں ابھی انھوں نے یہاں ایک رات بھی نہیں گزاری ہے ان سے بات کریں گے تو ممی ناراض ہوں گی۔"

"ممی کی ناراضگی تو خوامخواہ کی ہوتی ہے۔ آخر گفتگو کرنے میں حرج کیا ہے" نوشی منہ بناتے ہوئے بولی۔

"توبہ توبہ نوشی کیسی بات کرتی ہو" خالہ نے کہا۔ "کیا یاد نہیں اس دن ممی نے کیسی جھاڑ پلائی تھی" خالہ نے گویا نوشی کو یاد دہانی کراتے ہوئے کہا۔ نوشی بگڑ گئی۔ جھلاتے ہوئے بولی "اچھا تم یہاں سے دفع ہو جاؤ جلدی سے میرے کپڑے ڈرائی کلین کروا کے لاؤ۔ ذرا جلدی۔"

"میں تمہارے کپڑے لا چکی ہوں۔ وہ تمہاری مسہری پر پڑے ہوئے ہیں" خالہ نے کہا۔

"اچھا تو ٹھیک ہے پھر تم جا کر کوئی اور کام کرو۔ میں ذرا اس لڑکی سے بات کرتی ہوں" نوشی نے کہا اور خالہ کو کمرے سے باہر بھیج دیا۔ اس کے بعد وہ ایک کرسی پر جم گئی اور میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کے بولی۔ "تمہیں یہاں کون لایا ہے؟"

"ڈیڈی" میں نے مختصراً کہا۔

"اچھا وہ جو احاطے میں کھڑی ہوتی تھی جسے ممی نے … تو وہاں بیٹھے ہیں" نوشی نے کہا۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولی "وہ کبھی خود بھی یہاں رہ چکی ہے ایک گاہک اس پر عاشق ہو گیا اور بھاری رقم دے کر خرید کر لے گیا۔"

"کیا انسان بھی خریدے اور بیچے جاتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہے تو ایسا ہی مگر یہاں صورت ذرا مختلف ہے" نوشی نے کہا "ممی ہم جیسی لڑکیوں سے مشاہرے پر معاہدہ کرتی ہے جس کی رو سے ہم اس کی بھاری رقم کی مقروض ہوتی ہیں۔ اب اگر ہم کہیں بھاگیں بھی تو بھاگ نہیں سکتے اور بھاگ بھی جائیں تو ممی کے گرگے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ وہ یا تو ہمیں واپس لے آتے ہیں یا مار ڈالتے ہیں۔ اگر معاملہ عدالت یا پولیس تک پہنچ جائے تو وہاں بھی کچھ نہیں ہوتا کیونکہ ہم مقروض ہوتے ہیں اور اس بھاری رقم کی ادائیگی واجب ہوتی ہے۔ رقم اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ لڑکیاں ادا نہیں کر سکتیں ناچار وہ پھر ممی کے قبضے میں آ جاتی ہیں اور اس کے بعد ان سے اس قدر برا سلوک ہوتا ہے کہ وہ فرار کے نام سے کان پکڑتی ہیں۔ اب اگر کوئی ان لڑکیوں میں دلچسپی لیتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ لڑکی کی طرف واجب قرض کی بھاری رقم ممی کو ادا کرے اور یہ ہر گاہک کے بس کی بات نہیں ہوتی ۔۔۔ یہ جو تمہاری ڈیڈی تھی نا اس پر ایک مالدار گاہک عاشق ہو گیا اس نے بھاری رقم کے عوض اسے ممی سے خرید لیا۔ بعد میں سنا کہ ڈیڈی کے یہاں ایک بچہ بھی ہوا۔ میں نے اس بچے کو نہیں دیکھا، مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ بچہ کہاں پل رہا ہے وہ بچہ اس عورت کے ساتھ رہ رہا ہے جہاں خود میری بہن کا بچہ پرورش پا رہا ہے۔ یہ بات صرف مجھے معلوم ہے" نوشی کا یہ کچھ فقرہ تھا۔

مجھے محسوس ہوا کہ نوشی کچھ بری عورت نہیں ہے کم از کم یہاں کے لوگوں سے تو مختلف ہی ہے۔ اس کی گفتگو کا لہجہ اور انداز بہت دوستانہ تھا۔ ایک حد تک اس نے میرا اعتماد بھی حاصل کر لیا تھا۔ ہم تقریباً آدھے گھنٹے تک گفتگو کرتے رہے پھر وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور میرے رخسار کو بوسہ دیتی ہوئی بولی "پریشان ہونے اور جان ہلکان کرنے کی ضرورت نہیں۔ انشاءاللہ کوئی نہ کوئی تم پر مہربان ہو گا اور تمہیں یہاں سے

**تصویر** جس قدر بڑی، شاندار اور نفیس ہوتی ہے اسی قدر اسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے، تاکہ اس کے خدوخال واضح طور پر نمایاں ہو سکیں اور صناع کے کمال اور تصویر کے حسن و قبح کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ یہی حال بڑے لوگوں کا ہے، جنہوں نے دنیا میں کسی نہ کسی حیثیت سے کارِ نمایاں کئے ہیں۔ ہم عصر بے لاگ رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں۔ ان میں موافق بھی ہوتے ہیں اور مخالف بھی (وہ آدمی ہی کیا جس نے کچھ مخالف پیدا نہ کئے) موافق مخالف دونوں مبالغہ کرتے ہیں۔ ان میں مخلص بھی ہوتے ہیں اور ریاکار بھی، خود غرض بھی ہوتے ہیں اور بے نفس بھی۔ رائے کے جانچنے کے لیے قیمت بھی دیکھنی پڑتی ہے۔ ہم عصر کیسا ہی بے لاگ ہو اپنے زمانے کے حالات، خیالات اور الجھنوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک مدت کے بعد جب سب جانبداریوں، مخالفتوں اور حمایتوں کا گرد و غبار چھٹ جاتا ہے تو اصل حقیقت آشکارا ہوتی ہے۔

نکال لے جائے گا۔ خود مجھے یہاں آتے ہوئے تیرہ ماہ ہو چکے ہیں پہلے بہت پریشان ہوتی تھی اب عادت ہو گئی ہے۔ ایک بات کہوں، اسے ایک بہن کا مشورہ سمجھو، اگر تم مار پیٹ اور خون خرابی سے بچنا چاہتی ہو تو جو ممی کہے اس پر بے چوں چرا عمل کرو۔ سرکشی یہاں جان کا زیاں ہے۔ جب میں اپنا وہ وقت یاد کرتی ہوں تو مارے دہشت کے جسم کانپنے لگتا ہے۔ میں نے ممی کی حکم عدولی کر دی تھی جانتی ہو کیا ہوا تھا۔ ممی ایک رات کو تقی اور ایک دوسرے آدمی کے ساتھ میرے کمرے میں آئی۔ پھر میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے گئے اور ان دونوں نے میرے ساتھ ہر وہ کام کیا جو وہ ایک مدت سے کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے خوب دل کے ارمان نکالے۔ جانے کب کی چھپی ہوئی دشمنیاں نکالیں۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہو گیا۔ صبح تک میں آٹھ ہٹے کٹے نوجوانوں کی درندگی کا شکار بن چکی تھی۔ میری حالت مرنے والی ہو گئی تب چھوڑا ورنہ جانے کیا ہوتا۔ میں تو اپنی ہمت کو داد دیتی ہوں۔ عورت بھی کیا پہاڑ شے ہے۔ میں پھر بھی زندہ رہی اور زندہ تمہارے سامنے ہوں ۔۔۔ تو میں نہیں چاہتی کہ تمہارا حشر بھی کچھ ویسا ہو۔ لوگوں نے ابتدا میں مجھے سمجھایا تھا مگر میں مذاق سمجھی تھی۔ خدا کے لئے کہیں تم مذاق نہ سمجھ بیٹھنا۔ ممی جو کہے سر جھکا کر اس پر عمل کرو۔ یہاں اس طرح چلو کہ کہیں تمہیں سزا اور عقوبت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ یہاں سزا دینے کے طریقے بڑے عجیب ہیں۔ سخت جسمانی ایذا دی جاتی ہے۔ یہ حرام زادہ تقی یہاں اسی لئے رکھا گیا ہے۔ کوشش کرو کہ تقی کا ہاتھ تم تک نہ پہنچے۔ وہ نئی لڑکیوں کا شکاری ہے۔ بس کسی موقع کی تلاش میں رہتا ہے وہ کوئی بہانہ تراش کر نئی لڑکیوں کو آلودہ کر دیتا ہے۔ مجھے اس سے سخت نفرت ہے۔ میں ۔۔۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ خالہ بہت تیز رفتاری اور انتہائی بدحواسی کے عالم میں کمرے میں داخل ہوئی: "نوشی! ممی آ رہی ہے خدا کے لئے تم اپنے کمرے میں چلی جاؤ اور یہاں کا ماحول گڑبڑ نہ کرو۔" اس نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ نوشی اس طرح دروازے کی طرف تیزی سے جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ وہ سلام کئے بغیر برق رفتاری سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ خالہ نے اطمینان کی گہری سانس لی اور خود کو مستعد ظاہر کرنے کے لئے دروازہ مقفل کر دیا۔

ممی، ممی، ممی ۔۔۔ ہر شخص مجھے ممی سے ڈرا رہا تھا پہلے تقی پھر خالہ اور اس کے بعد نوشی۔ آخر یہ کیا بات تھی۔ کیا یہ نوشی ممی کی ایجنٹ تھی۔ شاید ممی کی طرف سے اس بات پر مامور کی گئی ہو کہ مجھے ہموار کر کے اور میں جلد ہی راستے پر آ جاؤں اور پھر اس وقت ممی کی آمد کا کیا مقصد تھا۔ وہ کیوں میرے کمرے میں آ رہی تھی۔ کیا تقی بھی اس کے ہمراہ ہو گا۔ کیا اسی وقت ۔۔۔ میرا مطلب ہے ۔۔۔ میرا مطلب ہے ۔۔۔ میں اس سے آگے نہ سوچ سکی اور نوشی والا واقعہ ذہن میں تازہ کرنے لگی۔ پھر مجھے اچانک ایک خیال آیا۔ شاید نوشی اسی لئے میرے پاس بھیجی گئی ہو کہ ہونے والے واقعے کے لئے پہلے سے ذہنی طور پر مجھے تیار کر دے۔

چند منٹ بعد دروازے پر قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر کسی نے تحکمانہ انداز میں خالہ کو آواز دے کر بلایا اور دروازہ کھولنے کے لئے کہا۔ پھر دروازہ کھلا اور ممی دو مردوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک تقی تھا اور دوسرا میرے لئے اجنبی تھا۔ ممی کے لبوں پر مسکراہٹ تھی تقی اور وہ دوسرا آدمی دروازے کی دونوں طرف کھڑے ہو گئے۔ ممی آہستہ قدم

سے چلتی ہوئی میرے قریب آ کر بیٹھ گئی اور میرے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "غور سے سنو لیلی! تمہارا نام بڑا فرسودہ اور روایتی ہے۔ سب سے پہلے تو تمہارا نام تبدیل کرنا ہے۔ آج سے تمہارا نام "فلاورز" ہے یعنی پھول اور تم ہو بھی پھول کی طرح شگفتہ اور تر و تازہ۔ کیا خیال ہے؟" اس نے پوچھا پھر میرا جواب سنے بغیر دوبارہ کہنے لگی "اب میں یہ معلوم کرنا چاہوں گی کہ تمہاری روش میرے ساتھ کیسی ہوگی۔ اچھی لڑکی کی مانند پیش آؤ گی یا تمہارے ساتھ کچھ محنت کرنا پڑے گی؟" اس کا جملہ تمام ہو رہا تھا کہ میں نے منہ میں جمع کیا ہوا تھوک پچکاری کی صورت میں اس کے چہرے پر پھینک دیا اور غصے سے چیختی ہوئی بولی "حرام زادی، کمینی، کتیا!"

ممی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور آنکھیں ہلکی سرخی سے دہکنے لگیں مگر اگلے ہی لمحے وہ اس طرح پرسکون ہو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولی "آؤ تقی! اپنا کام شروع کر دو۔ میں اپنی آنکھوں سے یہ خوشنما منظر دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے اس سے بڑی دلچسپی ہے۔"

مجھے امید نہیں تھی کہ نازک صورت حال اس قدر جلد پیش آ جائے گی۔ ابھی مجھے اس جہنم میں آئے ہوئے وقت ہی کتنا گزرا تھا مگر وہ ساعت وہ آزمائش کی گھڑی آ ہی پہنچی تھی ـــــ حرکت قلب تیز ہو گئی۔ میں نے دروازے پر کھڑے ہوئے تقی اور اس کے ساتھی کی طرف دیکھا۔ دونوں مجھے گرسنہ نظروں سے گھور رہے تھے۔ انھیں دیکھ کر مجھے وہ گدھ یاد آ گئے جو درخت کی کسی خشک ٹہنی پر بیٹھے مرنے والے کی آخری سانس کا انتظار کرتے ہیں۔ تقی کا حکم مل چکا تھا مگر وہ میری توقع کے مطابق مجھ پر جھپٹے نہیں۔ اپنی جگہ کھڑے مجھے گھورتے رہے۔ شاید ممی کا یہ بھی فرمان ہو کہ پہلے حکم پر شکار پر نہ جھپٹیں ممکن ہے اس طرح شکار دہشت زدہ ہو کر سر ڈال دے۔ اگر دھمکی سے ہی کام نکل جائے تو اس سے آگے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ بہرحال وہ شدت سے اس بات کے منتظر تھے کہ ممی دوسرا حکم دے اور وہ مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔ اب میرے سامنے دو راستے تھے اور مجھے جلد ہی ان میں سے کسی ایک کا فیصلہ کر لینا تھا۔ اول تو یہ کہ ممی کے سامنے اپنی شکست تسلیم کر لوں اور وہ جو کہے اس پر سر جھکا کے عمل کروں۔ دوئم یہ کہ اپنے موقف پر ڈٹی رہوں اور تقی اور اس کے ساتھی کو موقع فراہم کر دوں کہ وہ میری بوٹیاں نوچ ڈالیں۔ پھر مجھے نوشی کی بات یاد آ گئی اور میرا جسم جھنجھنا کے رہ گیا۔ میں نے غور کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ دونوں صورتوں میں میرا انجام ایک ہے اور اس سے مفر نہیں۔ یہ مکان ایک جدید ترین اور اعلیٰ درجے کا قحبہ خانہ ہے۔ یہاں سے رستگاری ممکن نہیں۔ بہرصورت یہاں آنے والے گاہکوں کا دل خوش کرنا پڑے گا۔ ممی کا حکم ماننے کے باوجود اور اس کی حکم عدولی کی صورت میں بھی۔ تو پھر کیا ضروری ہے کہ میں ان منحوس اور شیطان صفت تقی اور اس کے ساتھی سے اپنی ہڈیاں تڑواؤں۔ نوشی خالہ اور خود تقی کا خیال درست تھا کہ میں بے چوں چرا ممی کی اطاعت کروں اسی میں میری بھلائی ہے۔

اس سے پہلے کہ ممی تقی کو دوسرا حکم صادر کرتی اور وہ میری طرف بڑھتے میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور ممی سے مخاطب ہو کر بولی "میں تم سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ انھیں باہر بھیج دو۔"

ممی کا غصہ ابھی رفع نہیں ہوا تھا وہ کینہ توز نظروں سے مجھے گھورنے لگی۔ شاید میرا منشا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"میں تم سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ انھیں باہر بھیج دو۔" میں نے دوبارہ کہا۔ ممی سوچ میں پڑ گئی۔ وہ میرے بارے میں کچھ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور اشارے سے تقی اور اس کے ساتھی کو چلے جانے کے لئے کہا۔ ان دونوں کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ ممی کے اس فیصلے سے خوش نہیں ہوئے ہیں۔ ان کے کام و دہن کی لذت چھن رہی تھی شکار ان کے پنجے سے جا رہا تھا۔ تقی ممی سے مخاطب ہو کے انتہائی ناگواری سے بولا "ممی اس کی بات پر مت جاؤ اس کو اس کی گستاخی کی سزا ملنی چاہیئے۔" ممی نے اس کی بات نہیں سنی۔ ہاتھ ہلاتے ہوئے جھلا کر بولی "جاؤ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔"

وہ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ جاتے جاتے دروازہ بند کرتے ہوئے تقی نے بڑی خونخوار نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ سخت اشتعال کے عالم میں تھا اس کی آنکھوں اور چہرے سے صاف پڑھا جا سکتا تھا کہ وہ میری بات سے خوش نہیں ہوا ہے اور کبھی نہ کبھی بدلہ ضرور لے گا۔ ان کے جانے کے

بعد ممی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں دوبارہ بستر پر بیٹھ گئی
"کیا بات ہے۔ تم مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہو؟" ممی نے بالآخر خود ہی پوچھا۔
اس کا غصہ ابھی تک باقی تھا۔ میں زبردستی چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے
بولی "تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"
"کیا تمہیں بتایا نہیں گیا کہ مجھ سے سرکشی مت کرو۔ جو کہا جائے اس
پر عمل کرو۔" ممی نے تلخ لہجے میں کہا۔
"ہاں مجھے معلوم ہے مگر میں اس ماحول میں کبھی نہیں رہتی۔ میں
تمہاری ہر بات ماننے کے لئے تیار ہوں مگر تھوڑی رعایت اور مہلت کی
بھی درخواست کروں گی۔" میں نے کہا۔
"گویا تم سرکشی اختیار نہیں کرو گی؟" ممی کو میری بات کا یقین
نہیں آیا تھا۔
"بالکل نہیں مگر جیسا کہ میں نے کہا مجھ پر زیادہ بار نہ ڈالا جائے۔
میں خود کو اس ماحول کی عادی بنانے کی کوشش کروں گی۔"
ممی بہت غور سے مجھے دیکھنے لگی۔ وہ حیران تھی کہ اس قدر جلد
مجھ میں تبدیلی کیسے پیدا ہو گئی۔ وہ نظروں ہی نظروں میں مجھے ٹٹول
رہی تھی۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولی "ٹھیک ہے میں تمہارا خیال رکھوں
گی۔" پھر توقف کیا اور دوبارہ بولی "مگر تمہیں بھی مجھے مطمئن کرنا پڑے گا۔"
"وہ کس طرح ممی؟" میں نے پوچھا۔
ممی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں ہاتھ سے لباس برابر کیا
اور اس کے بعد دونوں ہاتھ میز پر ٹیک کر براہ راست میری آنکھوں میں دیکھنے
لگی۔ عمر کے ساتھ ساتھ ممی موٹی اور تھل تھل ہو گئی تھی۔ اس کی گردن بہت موٹی
تھی اور ایک کی جگہ دو ٹھوڑیاں نمودار ہو گئی تھیں۔ اس کا وجود میرے نزدیک
بہت کریہہ اور گھناؤنا تھا۔ اسے دیکھتے ہی نفرت جاگ پڑتی تھی مگر اس وقت
نفرت کا اظہار مصلحت کے خلاف تھا۔ چنانچہ جبر کر کے میں نے اپنے چہرے پر
شادابی اور خوش دلی پیدا کر لی جیسے ممی مجھے بھلی لگ رہی ہو۔ پھر ممی نے
بولنا شروع کیا۔ اس کی آواز کیا تھی زہر کی بوند تھی جو میرے کان میں ٹپک
رہی تھی مگر مجھے اسے سننا تھا۔ وہ مجھ پر نظریں جمائے کہہ رہی تھی "جو
میں کہہ رہی ہوں اسے غور سے سنو اور کان میں ڈال لو تم کتنی ہی تقدیر اور
با اثر ہو میرے چنگل سے رہائی ملنا ناممکن ہے۔ یہاں تم سے بھی زیادہ
طاقتور اور ہوشیار لڑکیاں آئیں مگر میں نے انہیں ناکوں چنے چبانے
پر مجبور کر دیا۔ میں نے ان کی چولیں ایسی کسیں کہ وہ اپنا نام تک بھول گئیں
اگر تم نے مجھے چلانے یا الجھنے کی کوشش کی تو اپنی شکل تک پہچاننے کے قابل
نہ رہو گی۔ تقی اور داؤ تمہارے چہرے پر تیزاب ڈالیں گے پھر تم دیکھو گی کہ
تمہارے چہرے پر کیسے گل بوٹے نمودار ہوتے ہیں۔ تم مرنے کی تمنا کرو گی مگر
تمہیں مرنے نہیں دیا جائے گا۔ سمجھ رہی ہو میری بات۔ میں قاتل نہیں ہوں
جو قتل کر کے پھروں البتہ زندگی کو موت سے بدتر بنا دیتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں
کہ تم میری ان باتوں کو گوش گزار کر لو اور ہمیشہ یاد رکھو۔"
میں نے سر کو اس طرح ہلایا جیسے اس کی اطاعت پر پوری طرح
کمربستہ ہوں۔ اس کے بعد ممی نے کچھ نہیں کہا۔ چلتی ہوئی دروازے کی طرف
روانہ ہو گئی۔ اس نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ دوسری طرف
تقی اور داؤ کھڑے ہوئے تھے۔ ممی نے ان سے کچھ کہا جو میں نہ سن سکی۔
پھر اس کے بعد ممی دوبارہ میرے پاس آ گئی۔ چند منٹ بعد تقی کمرے
میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں سرخ جلد والی ایک کاپی دبی ہوئی تھی پھر اس
نے کاپی سے دو فارم نکال کر ممی کو دیئے۔ ممی نے قلم نکالا اور فارموں کو پُر
کرنے لگی۔ میں حیرت اور تجسس سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ فارم پُر کرنے
کے بعد ممی میری طرف بڑھی اور قلم میرے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے بولی۔
"دستخط کرو۔" میں نے قلم ہاتھ میں لے لیا اور سوالیہ نظروں سے ممی کی طرف
دیکھتے ہوئے بولی "یہ کیا ہے۔ کس چیز کے دستخط کروں؟" جواب میں ممی نے
اتنی زور سے میز پر مکا مارا کہ میں بے ساختہ اچھل پڑی اور دور کھڑے ہوئے
تقی نے گرجدار آواز میں کہا "ممی کیا بات ہے۔ میں آؤں کیا؟" ممی نے اس
کی طرف توجہ نہیں دی۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولی "بکواس مت کرو چپ چاپ
دستخط کر دو۔ اگر یہ تمہاری موت کا حکم نامہ ہے تو بھی تمہیں دستخط کرنا ہے۔"
میں جانتی تھی یہ فارم کس چیز کے ہیں اور کیوں بھروائے جا رہے ہیں
اور اس پر دستخط کرنے کے معنی واقعی موت کے تھے۔ زندگی بھر کی غلامی۔
نوشی اس طرف اشارہ کر چکی تھی مگر چارہ کیا تھا۔ دستخط نہ کرتی تو وہ
بہ جبر کروا لیتی۔ ممی ایک ظالم عورت تھی۔ بے بسی محسوس کر کے میری آنکھوں
میں آنسو آ گئے۔ میں ذرا بھی ہچکچاتی تو وہ آواز دے کر تقی کو بلا لیتی اور اپنا
جسم جلانے سے بچنے کے لئے لامحالہ مجھے دستخط کرنا پڑتے تو پھر ہنسی خوشی
کیوں نہ کروں۔ بات بھی یہی رہے گی ـــــ آہ یہ تہران، تہران کی آسودہ
مجھے کھا گئی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ خوبصورت اور روشن تہران کے پیچھے کس
قدر تاریکی، گندگی اور آلودگی ہے۔ یہاں اس قدر منظم طور پر معصوم لڑکیوں کی
عصمت فروشی کا کاروبار کیا جاتا ہے اور لوگ باخبر ہوتے ہوئے
بھی بے خبر ہیں۔
تہران مجھے کس قدر مہنگا پڑا تھا اور جانے ابھی قسمت میں کیا لکھا ہے؟
میں نے سپر ڈال دی اور تھرتھراتے ہوئے ہاتھ سے دونوں فارموں پر دستخط کر
دیئے۔ اس کے ساتھ ہی ممی کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی اور ایک

سکینہ کا سیاہ ہونٹوں پر ایک ملائمت سے بھری ہوئی مسکراہٹ نمودار ہوتی
اس کی ڈوگریا نگاہیں بھی بدل گئی تھیں۔ اب اس کا چہرہ بڑا پر خلوص اور
مہربان نظر آنے لگا تھا۔ یا پھر یہ اس کا پلٹ تھی۔ میں حیران رہ گئی۔ خالہ ممی
کے لئے بہت آسان اور دوگز رہ گئی ثابت ہوئی تھی۔ یہاں میں نے
مزاحمت بھی کیا کی تھی اور مجھ میں سکت ہی کہاں تھی۔ مجھے تو جیسے انسانوں
سے ڈر آنے لگا تھا۔

ممی نے دونوں خادمہ کو کہہ کر سرخ جلد والی کاپی میں رکھ دیئے
اور ٹھنڈی سانس بھر کے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر میرا پرس اٹھا لیا۔
اس کے گندے اور سیاہ لبوں پر بڑی مہربان مسکراہٹ تھی۔ میں نے
ہاتھ بڑھا کر اپنا پرس لینا چاہا مگر ممی نے مجھے روک دیا۔ "بیٹھی رہو جانی
میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ تمہارے پرس میں کیا ہے۔" اس نے میز پر میرا پرس
الٹ دیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "تمہارے پاس کچھ زیادہ رقم نہیں ہے حالانکہ
تم جیسی لڑکیوں کو پرس میں کم از کم ہزار تومان رکھنا چاہیئے۔ پھر اس کے علاوہ
یہ پرس تمہارے شایان شان نہیں ہے۔"

ممی نے بلا تکلف کرگ ... میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں کی ایک
گڈی نکال لی۔ اس میں سے چار ہزار نکال کر میرے پرس میں ڈال دیئے
"یہ چار ہزار ہیں۔ کم از کم اتنی رقم ساتھ رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ قرض سمجھو
جب تم کمانے لگ جاؤ گی تو میں واپس لے لوں گی۔"

میں وحشت کے مارے لرزنے لگی "نہیں نہیں مجھے یہ رقم
نہیں چاہیئے۔"

"آخر کیوں فلاور جان۔ یہ رقم تو بہت ضروری ہے۔ ابھی چند دن تک
تو میں تمہیں باہر نکلنے کی اجازت نہیں دے سکتی مگر اس کے بعد تمہیں تقی کے
ہمراہ باہر بھیجوں گی تاکہ تم اسٹور سے اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق لباس
اور آرائش و زیبائش کی دوسری اشیاء خرید سکو۔ تمہاری کپڑے کی الماری
طرح طرح کے لباس سے پر ہونی چاہیئے ۔۔۔ تم نہیں جانتیں کہ میرے
دوست کسی لڑکی کو دوسری مرتبہ اسی لباس میں دیکھنا پسند نہیں کرتے" یہ کہتے
ہوئے ممی اٹھ کھڑی ہوئی پھر بلند آواز سے تقی کو مخاطب ہو کر بولی "تقی!
خالہ کو یہاں بھیجو۔"

کچھ دیر بعد خالہ وہاں نمودار ہوئی۔ ممی نے اسے حکم دیا کہ وہ میرے
پاس موجود رہے اور تقی سے کہا کہ وہ جا کر آرائش گر کو لے آئے تاکہ میرے
چہرے کو ٹھیک کیا جاسکے۔

ممی اور تقی چلے گئے۔ میں خالہ کے ساتھ کمرے میں رہ گئی۔ اس
نے چھوٹتے ہی پند و نصائح کے دفتر کھول دیئے جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ممی کو
ہرگز ناراض نہ کروں اور اپنے پاس آنے والے گاہکوں کو ہر طرح خوش
رکھنے کی کوشش کروں۔ یہاں آنے والے لوگ بڑے مالدار اور باحیثیت
ہوتے تھے وہ جس لڑکی سے خوش ہو جاتے تھے اسے مالا مال اور نہال
کر دیتے تھے۔ ان باتوں سے مجھے خوشی نہیں ہوئی بلکہ تکلیف ... میری
آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ میرے رونے سے خالہ گھبرا گئی اور خوشامد کرنے
لگی کہ میں رونا بند کر دوں ورنہ کہیں ادھر ممی آ نکلی تو اس کی شامت
آجائے گی۔

"فلاور جان! خدا کے لئے رونا نہیں تم تو مجھے عذاب میں پھنسا دو
گی۔" خالہ نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"مجھے فلاور مت کہو۔" میں جھنجلا کے بولی "میرا نام لیلیٰ ہے۔"

"تمہارا نام کچھ بھی ہو مگر یہاں تم فلاور ہو۔" خالہ نے مجھے
سمجھایا "یہاں سب کو تاکید کر دی گئی ہے کہ تمہیں فلاور کہہ کر پکارا جائے۔ جو
اس کی خلاف ورزی کرے گا اس کو سخت سزا دی جائے گی اور تم خود کس
سے مبرا نہیں ہو۔" میں کچھ کہنا چاہ رہی تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور دو
نوجوان عورتیں اندر داخل ہوئیں۔ ان دونوں کے ہاتھ میں سیاہ رنگ
کے چمڑے کے پرس جھول رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے ہوتا گے تھی خالہ
سے پوچھا "کیا فلاور خانم یہی ہیں؟"

"ہاں یہی ہیں۔" خالہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"آؤ میرے ساتھ چلو۔" اس عورت نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ
پکڑتے ہوئے کہا۔

لیلیٰ کی سرگزشت
کا سبق آموز اور
عبرت ناک موڑ
آئندہ شمارہ کا
ملاحظہ فرمائیے

# بچے کا پہلا سال

ایک زمانہ ایسا تھا کہ لوگ بچے کی عمر کے پہلے سال کو تعلیم کے دائرے سے خارج سمجھتے تھے جب
بچہ کم از کم بولنا شروع نہ کرتا اسے صرف ماں یا دایہ کی زیر نگرانی رکھا
تھا اور یہ فرض کر لیا جاتا تھا کہ وہ لفظاً ہی بچے کے نیک و بد کو ایسی
طرح سمجھتی ہیں کہ انہیں سکھانے کی ضرورت نہیں۔ فی الحقیقت لوگ
خیال غلط تھا۔ اکثر بچے سال بھر کے بھی نہ ہونے پاتے کہ مر جاتے اور جو
رہ جاتے ان میں سے کتنی ایک کی صحت ہمیشہ کے لئے خراب ہو جاتی غلط
تربیت کی وجہ سے خطرناک ذہنی عادات کی بنیاد پہلے ہی پڑ جاتی حقیقت ہمیں حال ہی میں معلوم ہوئی ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ اکثر لوگ شیر خوار بچوں کی پرورش کے معاملے میں سائنس کا دخل پسند نہیں کرتے کیونکہ اس سے ماں کی مامتا اور بچے کے لاڈلے پن کا جو دلآویز تصور ان کے ذہن میں موجود ہے اس کو صدمہ پہنچتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ اندھا دھند محبت اور لاڈ پیار اور چیزیں ہیں اصل محبت اور چیز ہے۔ جن والدین کو اپنے بچوں سے سچی اور اصلی محبت

ہے وہاں بچوں کی تربیت کے لئے سائنس کے اصولوں پر عمل کرنے سے نہیں گھبراتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مغربی ممالک میں اس قسم کی محبت انہی لوگوں میں سب سے زیادہ پائی جاتی ہے جن کے کوئی اولاد نہیں ہوتی یا جو شوہر یا شکر دہ ہو کی مائیں اپنے بچوں کو کسی یتیم خانے کے حوالے کر دینا چاہتے ہیں۔ اکثر تعلیم یافتہ والدین سائنس کی معلومات سے متنفر ہونے کی بجائے استفادہ کرتے ہیں نہ صرف یہ بلکہ ان پڑھ لوگوں میں بھی سائنس کا شعور روز بروز بڑھتا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بچوں کی اموات روز بروز کم کی جاتی ہیں۔ اگر لوگ پوری احتیاط سے کام لیں تو نہ صرف اموات کی تعداد اور بھی کم ہو جائے گی بلکہ جو بچے زندہ رہیں گے ان کی دماغی اور جسمانی حالت بہتر ہو گی۔

جسمانی صحت کے ماہر ڈاکٹر ہی ان مسائل کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ مسائل اس مضمون کے دائرے سے خارج ہیں۔ ہم یہاں جسمانی صحت کے مسائل پر اسی حد تک بحث کریں گے جس حد تک ان کا تعلق ذہنی یا نفسیاتی زندگی سے ہے اور ان پر اس وقت بحث کرنا یوں ضروری ہے کہ اول تو عمر کے پہلے سال میں جسمانی زندگی اور ذہنی زندگی میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے دوسرے اگر شروع میں بچے کے جسم کا کما حقہ خیال نہ رکھا جائے تو چند ایسے نقائص پیدا ہونے کا احتمال رہتا ہے جو بڑے ہو کر تعلیم کے رستے میں حارج ہو جاتے ہیں، اس لئے ہر چند کہ جسمانی صحت پر بحث کرنا ڈاکٹروں ہی کا حصہ ہے تاہم اس موقعہ پر ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ اس سے متعلق کچھ عرض کریں۔

نوزائیدہ بچہ کسی چیز کا عادی نہیں ہوتا۔ اس کی تمام حرکات کسی عادت کی وجہ سے نہیں بلکہ اضطراراً سرزد ہوتی ہیں۔ اگر ماں کے پیٹ میں اس نے بعض عادتیں اختیار کر لی ہیں تو وہ کم از کم ایسی نہیں کہ پیدا ہونے کے بعد بھی اس کے کام آ سکیں۔ یہاں تک کہ سانس لینا بھی اسے پیدائش کے بعد سیکھنا پڑتا ہے اور بعض بچے تو مر ہی اس لئے جاتے ہیں کہ تنفس کا عمل دیر میں سیکھتے ہیں۔ ایک زبردست خواہش بچہ فطرت کی طرف سے اپنے ساتھ لاتا ہے اور وہ چوسنے کی خواہش ہے۔ جب تک بچہ اس عمل میں مصروف رہتا ہے بہت خوش رہتا ہے۔ باقی تمام وقت وہ ایک تحیر کے عالم میں گزارتا ہے جس سے یوں نجات حاصل ہوتی ہے کہ دن رات کا بیشتر حصہ نیند میں گزر جاتا ہے۔ پندرہ دن کے بعد یہ حالت بدل جاتی ہے اور بعض باتیں مثلاً دودھ پینا وغیرہ تواتر کے ساتھ ظہور میں آنے لگتی ہیں اس لئے بچہ ان باتوں کا متوقع رہتا ہے۔ یوں کہئے کہ اب وہ بعض چیزوں کا عادی ہو جاتا ہے اور جن باتوں کا عادی ہو انھی کو پسند کرتا ہے، گویا قدامت پسند بن جاتا ہے اور قدامت پسند بھی ایسا کہ غضب! پھر عمر بھر ایسا نہیں ہوتا۔ ہر نئی چیز اسے ناپسند ہوتی ہے۔ اگر بچہ اس عمر میں بولنے کے قابل ہو تا تو بڑے بوڑھوں کی طرح اپنی ناپسندیدگی کا اظہار ان الفاظ میں کرتا کہ میاں جانے دو اس عمر میں اب ہم بھلا نئی نئی باتیں کیوں کر سیکھ سکتے ہیں ۔۔۔ تاہم شیر خوار بچے نئی عادتیں بہت جلد اختیار کر لیتے ہیں۔ اس دوران میں اگر کوئی بری عادت سیکھ لیں تو وہ بعد میں اچھی تربیت کے رستے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ اس لئے شیر خواری کے زمانے کی عادات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے۔ اگر شروع شروع کی عادات اچھی ہوں تو بہت سہولت ہوتی ہے۔ علاوہ بریں شیر خوارگی کے زمانے کی عادت اتنی راسخ ہوتی ہے کہ بڑے ہو کر وہ بالکل جبلت معلوم ہوتی ہے اس لئے اعمال پر اس کا اثر بہت گہرا ہوتا ہے۔ جو عادتیں بعد میں سیکھی جاتی ہیں ان میں یہ پختگی کبھی نہیں ہوتی۔ اس لئے زمانہ طفلی کی عادات خاص طور پر توجہ کی مستحق ہیں۔

اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ اول اور سب سے مقدم صحت، دوم سیرت۔ ہم چاہتے یہ ہیں کہ بچہ بڑا ہو کر ایک ایسا انسان ثابت ہو جس کے اوصاف پسندیدہ ہوں اور جو اپنے گرد و پیش سے بوجہ احسن عہدہ برآ ہو سکے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ صحت اور سیرت دونوں کے مطالبات ایک ہیں جو چیز ایک کے لئے مفید ہے وہی دوسرے کے لئے مفید ہے۔ یہاں بحث سیرت سے ہے لیکن جو اصول ہم سیرت کی بہتری کے لئے وضع کریں گے وہی صحت کے لئے بھی مفید ہیں۔ گویا یہ نہیں ہو سکتا کہ بچہ تنومند تو ہو لیکن اس کے اخلاق برے ہوں یا ٹھیک ہوں تو ہوں لیکن اس کا جسم امراض کا شکار ہو۔

آج کل ہر تعلیم یافتہ ماں جانتی ہے کہ بچے کو صرف مقررہ اوقات پر دودھ پلانا چاہئے۔ اس سے بچے کا ہاضمہ درست رہتا ہے یہ بجائے خود ایک نہایت معقول وجہ ہے لیکن اس کے علاوہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی یہ بہت مفید ہے۔ شیر خوار بچہ اتنا بے عقل نہیں ہوتا جتنا ہم اسے سمجھتے ہیں۔ اسے ایک دفعہ یقین ہو جائے کہ رونے سے مطلب نکل آتا ہے تو وہ ضرور روتا ہے لیکن جب بڑا ہو کر اس عادت کے زیر اثر وہ ہر وقت رونی صورت بنا کر لوگوں کے گلے شکوے کرتا رہتا ہے تو لوگ اسے چمکارنے کی بجائے اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ لوگوں کا یہ سلوک اسے از حد ناگوار گزرتا ہے اور وہ دنیا کو خود غرض اور ہمدردی کے جذبے سے مبرا سمجھ لیتا ہے۔ اگر لڑکی ہو اور بڑی ہو کر خدا اسے حسین بنا دے تو بے جا توجہات اور بے جا خاطر مدارات کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور یہ نقص اور بھی مستحکم ہو جاتا ہے۔ یہی حال دولت مند لڑکوں کا ہوتا ہے کہ بچپن میں بگڑ جاتے

ہیں تو پھر تمام عمر بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ جس شخص کی پرورش شیر خوارگی کے زمانے میں غلط طریقے پر ہو وہ بڑا ہو کر اگر ذہین اور تندرست ہے تو ضدی اور حریص ہوتا ہے اور اگر بے بضاعت ہے تو لوگوں کی عز و منصب دیکھ کر کڑھتا رہتا ہے۔ اس لئے اخلاقی تعلیم روز اول ہی سے شروع کر دینی چاہیئے تاکہ نہ غلط توقعات پیدا ہوں، نہ بعد میں انھیں مجروح ہونا پڑے۔ اگر شروع میں اس کا تدارک نہ کیا جائے تو بعد میں بچے کی خواہشات کو ٹھکرانے سے اس کے دل میں غصے اور رنج کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

گویا بچے کی تربیت اس طرح کرنی چاہیئے کہ نہ تو اسے لاڈ پیار اور چاؤ چونچلوں سے بگاڑا جائے نہ اس کی طرف سے بالکل ہی بے توجہی برتی جائے مثلاً جو بات صحت کے لئے ضروری ہے اس میں کوتاہی نہ کرنا چاہیئے۔ بچے کو ہوا اور بارش سے تکلیف پہنچ رہی ہو تو اسے اٹھا لینا چاہیئے تاکہ اسے سردی نہ لگے اور وہ بھیگ نہ جائے۔ لیکن اگر بچہ بغیر کسی جسمانی تکلیف سے رونا شروع کر دے تو اسے رونے دینا چاہیئے ورنہ وہ بیجا خدمت کرانے کا عادی ہو جائے گا۔ جب اس کی دیکھ بھال کی جائے تو بہت زیادہ چاؤ اور اہتمام کرنا فضول بلکہ مضر ہے۔ جو بات مناسب ہو وہ کر دینی چاہیئے اور ضرورت سے زیادہ پیار محبت اور ہمدردی کا اظہار نہ کرنا چاہیئے بچوں کی پرورش چاؤ چونچلوں سے نہیں بلکہ متانت اور سنجیدگی سے کرنی چاہیئے گویا وہ بچہ نہیں بلکہ بڑی عمر کا انسان ہے۔

بچوں میں بڑوں کی سی عادتیں تو پیدا نہیں ہو سکتیں لیکن ہاں یہ خیال ضرور رکھنا چاہیئے کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جو ان کی عادات کے رستے میں رکاوٹ ثابت ہو۔ مدعا یہ کہ بچہ مزاج دار نہ بن جائے ورنہ بعد میں اسے سخت مایوسی کا سامنا ہو گا اور یوں دیکھئے تو وہ خود بھی اس قابل نہیں کہ اس میں اس قدر اہمیت کا احساس پیدا کیا جائے۔

بچوں کی پرورش میں سب سے مشکل بات یہ ہے کہ والدین کی غفلت اور لاڈ پیار کے بین بین رہنا پڑتا ہے۔ بچے کی صحت کو درست رکھنے کے لئے ہر وقت اس کی نگہداشت کرنی پڑتی ہے اور اس کی خاطر بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ والدین کو بچے سے بہت زیادہ الفت ہو لیکن مصیبت یہ ہے کہ جہاں والدین کو محبت زیادہ ہوتی ہے وہاں اکثر ان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ جن والدین کو اپنے بچوں سے بہت محبت ہے ان کے نزدیک اولاد بہت زیادہ اہم ہوتی ہے مگر احتیاط نہ برتی جائے تو بچہ بھی اس بات کو محسوس کرنے لگتا ہے اور جتنا اہم اسے والدین سمجھتے ہیں اتنا ہی اہم وہ بھی اپنے آپ کو سمجھتا ہے۔

جب اسے خود بینی کی عادت پڑ جاتی ہے اور بڑے ہو کر لوگ والدین کی طرح اس کی خوشامد در آمد نہیں کرتے تو اسے مایوس ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ نہ صرف پہلے سال بلکہ بعد میں بھی جب کبھی بچہ بیمار ہو والدین خندہ پیشانی اور بظاہر بے فکری کے ساتھ اس کا علاج کریں اور بات کا بتنگڑ نہ بنائیں۔

پرانے زمانے میں بچوں کو جکڑ کر بھی بہت رکھا جاتا تھا اور ان سے لاڈ بہت کیا جاتا تھا۔ ان کے اعضاء کو حرکت کرنے کا موقع نہ دیا جاتا تھا۔ کپڑے ضرورت سے زیادہ گرم ہوتے تھے۔ فطری حرکات پر پابندیاں عائد کی جاتی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ان کو ہر وقت گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے۔ ان کے سامنے گانے گاتے پھرتے تھے اور انھیں چوبیس گھنٹے چوما چاٹی کا تختۂ مشق بنائے رکھتے تھے۔ یہ بہت غلط طریقہ تھا۔ اس سے بچے بگڑ جاتے تھے اور ہر وقت ماں باپ کے گلے کا ہار بنے رہتے تھے۔

صحیح اصول یہ ہے کہ بچے کی فطری حرکات و خواہشات پر پابندیاں عائد کیجئے نہ اسے ان سے تجاوز کرنے دیجئے۔ بچے کے لئے آپ جو تکلیف اٹھاتے ہیں اس سے بچے کو بے خبر رہنا چاہیئے۔ خدمت کرانے کا چسکا اسے نہ پڑنے دیجئے جہاں تک ممکن ہو ایسی کامیابی کا لطف اسے ضرور اٹھانے دیجئے جو خود اس کی اپنی کوشش کا نتیجہ ہو۔ جدید تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے بچے کو خارجی قواعد و ضوابط کی غلامی سے آزاد کیا جائے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ خود بچے کے دل میں انضباط کا احساس پیدا کیا جائے اور اس احساس کا پیدا کرنا عمر کے پہلے سال میں نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ مثلاً جب بچے کو سلانا ہو تو اسے گود میں نہ لینا چاہیئے۔ بازوؤں میں تھام کر سو جا سو جا نہ کرنا چاہیئے بلکہ اس کے پاس تک نہ ٹھہرنا چاہیئے۔ اگر آپ ایک مرتبہ یوں کریں گے تو بچہ دوسری مرتبہ بھی یہی چاہے گا اور تھوڑے عرصے میں بچے کا سلانا ایک مصیبت بن جائے گا۔ بچے کو اٹھا کر بستر میں سلا دینا چاہیئے اور ایک دو باتیں کر کے اسے اکیلا چھوڑ دینا چاہیئے۔ ممکن ہے وہ چند منٹ تک روتا رہے لیکن اگر وہ بیمار نہیں تو تھوڑی دیر میں خود بخود چپ ہو جائے گا۔ اس کے بعد جا کر دیکھئے تو مزے کی نیند سو رہا ہو گا۔ لاڈ پیار سے ایک تو اس کی سیرت بگڑ جائے گی دوسرے وہ سوئے گا بھی کم۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ نوزائیدہ بچہ ماں کے پیٹ سے کوئی عادت ساتھ نہیں لاتا۔ اس کی عادات فطری اور اضطراری ہوتی ہیں چنانچہ اسے اشیاء کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اشیاء کے احساس کے لئے یہ ضروری ہے کہ اشیاء کا بار بار تجربہ ہو۔ سو وہ رفتہ رفتہ ہی حاصل ہوتا ہے پیدائش کے تھوڑے عرصے بعد بچہ ٹٹول کر چھونے کے مس، ماں کی چھاتی یا دودھ کی بوتل

کے حس باصرہ، شامہ اور ذائقہ ماں یا آیا کی آواز سے مانوس ہو جاتا ہے۔ سال کا ہو کر وہ شے کو دیکھنے کی قابلیت بعد میں پیدا ہوتی ہے کیونکہ نوزائیدہ بچے کی آنکھیں ابھی اس قابل نہیں ہوتیں کہ وہ اشیاء کی شکلوں کو واضح طور پر دیکھ سکے۔ جب مختلف احساسات کے ذریعہ سے بچے کے ذہن میں عادات وضع ہو جاتی ہیں تو حس باصرہ اور نظر کی بدولت ذہن میں اشیاء کے تصورات شکل پذیر ہونے لگتے ہیں۔ خاص خاص احساسات اس کے دل میں خاص خاص اشیاء کی توقعات پیدا کرتے ہیں۔ (دودھ کی بو آتی ہے تو چھاتی یا بوتل کے حس کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ ماں کی آواز آتی ہے تو ماں کی شکل دیکھنے کا منتظر ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ) تاہم کچھ عرصے تک اشخاص اور اشیاء میں تمیز نہیں کر سکتا۔ جس بچے کو کبھی بوتل کا دودھ اور کبھی چھاتی کا دودھ پلایا جائے اس کے نزدیک کچھ عرصے تک ماں اور بوتل ایک ہی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس تمام عرصے کے دوران میں تعلیم کا ذریعہ محض جسمانی ہونا چاہیئے۔ بچے کی تمام مسرتیں زیادہ تر گرماہٹ اور خوراک تک محدود ہوتی ہیں اور اس کے تمام دکھ محض جسمانی ہوتے ہیں۔ اس کے افعال اور اس کی عادات یوں شکل پذیر ہوتی ہیں کہ جو چیز اس کے ذہن میں مسرت سے تعلق رکھتی ہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو دکھ سے متعلق ہو اس سے گریز کرتا ہے۔

بچے کا رونا ایک حد تک تو ایک اضطراری حرکت ہے جو دکھ کی وجہ سے ظہور میں آتی ہے اور ایک حد تک ایک ارادی فعل ہے جو بچہ مسرت حاصل کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ شروع شروع میں وہ محض دکھ کی وجہ سے روتا ہے لیکن جب اس دکھ کو دور کیا جائے (جیسا کہ کیا جاتا ہے) تو بچے کے دل میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ رونے کے نتائج خوشگوار ہوتے ہیں۔ چنانچہ رفتہ رفتہ بچے کو یہ عادت ہو جاتی ہے کہ نہ صرف دکھ دور کرانے کے لئے روتا ہے بلکہ مسرت حاصل کرنے کے لئے بھی اس حربے کو کام میں لاتا ہے۔ یہ اس کی ذہانت کی پہلی فتح ہوتی ہے لیکن باوجود انتہائی کوشش کے جب تک اسے دکھ نہ پہنچ رہا ہو وہ ویسا نہیں رو سکتا جیسا دکھ کے وقت روتا ہے۔ ہوشیار ماں اس قسم کے رونے اور اس قسم کے رونے میں بخوبی تمیز کر سکتی ہے۔ عقلمندی یہی ہے کہ جب بچے کا رونا جبکہ کاذبانہ ہو تو اس پر بالکل توجہ نہ کی جائے۔ بچے کو اٹھائے لئے پھرنا اور اس سے کھیلتے رہنا یا اس کے سامنے گنگنانا آسان بھی ہے اور پر لطف بھی، لیکن بہت جلد بچہ اس قسم کی تفریح کا عادی ہو جاتا ہے جو اس کی نیند میں خلل انداز ہوتی ہے۔ شیر خوار بچے کا بیشتر وقت (سوائے دودھ پینے کے وقت کے) نیند میں گزرنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ بعض والدین کو یہ باتیں سخت معلوم ہوں لیکن تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بچے کی صحت اور خوشی کے لئے یہ باتیں بہت مفید ہیں۔

بچے کے لئے جو تفریحات والدین مہیا کرتے ہیں ان کو تو ایک خاص حد کے اندر رکھنا چاہیئے لیکن جو تفریحات وہ خود اپنے لئے پیدا کرے اس کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ شروع ہی سے اسے اس بات کا موقع دینا چاہیئے کہ وہ آزادی سے ہاتھ پاؤں ہلا سکے اور اپنے اعضا کام میں لا سکے۔ پہلے زمانے کے لوگ بچوں کو باندھ کر رکھا کرتے تھے اس کی وجہ سستی کے سوا اور کچھ نہ تھی کیونکہ جن بچوں کو کھلا رکھا جائے ان کی نگہداشت زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ حیرت ہے کہ ان لوگوں کی مامتا بھی ان کی سستی پر غالب نہ آ سکتی تھی۔ جب بچے کی نظر ٹھیک ہو جاتی ہے تو وہ متحرک چیزوں کو خصوصاً جو ہوا سے ہل رہی ہوں، دیکھ کر خوش ہوتا ہے لیکن پھر بھی جب تک وہ اشیاء کو پکڑنا نہ سیکھ لے اس کی دلچسپیوں کا دائرہ بہت محدود رہتا ہے۔ جب پکڑنا سیکھ لے تو یہ دائرہ یکلخت وسیع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصے تک تو محض گرفت ہی کی مشق اتنی مسرت انگیز ہوتی ہے کہ وہ گھنٹوں اس میں مشغول رہتا ہے۔ چیخنے کا شوق بھی اسی زمانے میں پیدا ہوتا ہے۔ چیخنے کے زمانے سے ذرا پہلے وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں پر قابو حاصل کرتا ہے۔ شروع شروع میں پاؤں کی انگلیوں کی حرکات محض اضطراری ہوتی ہیں۔ بعد میں بچہ یہ دریافت کرتا ہے کہ وہ انہیں اپنی مرضی سے بھی ہلا سکتا ہے۔ اس احساس سے وہ اتنا خوش ہوتا ہے گویا بہت بڑی مملکت حاصل کر لی ہے کیونکہ انگلیاں اب اجنبی نہیں رہتیں بلکہ جسم کا جزو بن جاتی ہیں۔ اس کے بعد اگر بہت سی چیزیں بچے کے آس پاس ایسی ہوں جنہیں وہ پکڑ سکے تو اسے دل بہلاوے کا بہتیرا سامان مہیا ہو جاتا ہے۔ بچے کو تفریح میں بھی ایسی ہی حرکات سے دلچسپی ہوتی ہے جو تعلیم کے نقطہ نظر سے ضروری ہیں البتہ گر جانے یا چوٹ لگ جانے یا کسی تکلیف دہ چیز مثلاً پن یا سوئی کے نگلنے سے اسے بچانا ضروری ہے۔ پہلے تین مہینے کے عرصے میں بچہ دودھ پیتے وقت تو بہت خوش ہوتا ہے لیکن باقی تمام وقت اس کی طبیعت اکتائی سی رہتی ہے۔ جب وہ گرم میں ہو تو سو جاتا ہے۔ جاگ رہا ہو تو کوئی نہ کوئی بے چینی اسے ضرور رہتی ہے، انسان کی خوشی کا انحصار اس کی ذہنی قابلیت پر ہے لیکن تین مہینے سے کم عمر کے بچے کو نہ تو کسی چیز کا کافی تجربہ ہوتا ہے نہ وہ اپنے اعصاب پر قادر ہوتا ہے اس لئے مسرتوں سے محروم رہتا ہے۔ جانوروں کے بچے نسبتاً بہت جلد زندگی سے لطف اٹھانے کے قابل ہو جاتے ہیں اور ان کی مسرتیں تجربے پر منحصر نہیں ہوتیں۔ انسان کا بچہ اگر محض جبلت پر تکیہ کرے تو اس کی خوشیوں اور دلچسپیوں کا حلقہ تنگ رہتا ہے۔ بچہ اپنی عمر کے پہلے تین ماہ عام طور پر اکتایا رہتا ہے۔ اس اکتائے رہنے میں بھی حکمت ہے۔ اس سے [illegible]

آتی ہے۔ اگر بچے کو بہت زیادہ بہلایا جائے تو وہ سوتا بھی کم ہے۔

جب بچہ دو تین مہینے کا ہو جاتا ہے تو مسکرا سکتا ہے۔ چار ماہ تک اشخاص کے متعلق اس کے جذبات اشیاء سے ممیز ہونے لگتے ہیں۔ اس عمر کو پہنچ کر ماں اور بچے میں سماجی تعلقات کا امکان شروع ہو جاتا ہے۔ بچہ ماں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کر سکتا ہے اور کرتا ہے اور نہ صرف جانوروں کی آواز بلکہ اور طرح سے متاثر ہوتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد تحسین و تعریف کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ میرے اپنے بچے میں اس خواہش کے واضح آثار پانچ مہینے کی عمر میں ظاہر ہوئے۔ میز پر ایک وزنی گھنٹی پڑی تھی بڑی مشکلوں سے اس نے اسے اٹھایا اور اٹھا کر ہلائی اور فخر سے مسکرا کر سب کو باری باری دیکھنے لگا۔ جب یہ خواہش پیدا ہو جائے تو گویا ایک زبردست حربہ معلم کے ہاتھ آ جاتا ہے۔ یہ حربہ تعریف اور ملامت کا حربہ ہے۔ بچپن کے تمام تر زمانے میں اس سے بڑا کام لیا جا سکتا ہے لیکن اس حربے کو از حد احتیاط سے استعمال کرنا چاہیئے بعد میں بھی اس سے بہت حد تک احتراز واجب ہے۔ تعریف نسبتاً کم مضر ہوتی ہے لیکن تعریف نہ تو اس فراخدلی سے کرنی چاہیئے کہ اس کی قدر ہی جاتی رہے اور نہ اس بخل کے ساتھ کہ بچے کو اس کے حاصل کرنے کے لئے بہت زیادہ زور لگانا پڑے۔ جب بچہ پہلی دفعہ قدم اٹھائے یا پہلی دفعہ الفاظ منہ سے نکالے تو کسی معقول شخص کو اس کی کارگزاری کو سراہنے میں تامل نہ کرنا چاہیئے۔ جب کبھی بچہ بہت سی کوششوں کے بعد کسی مشکل کو حل کرے تو اس کی تعریف ضرور کرنی چاہیئے۔ بچے کو یہ احساس دلانا چاہیئے کہ ہمیں اس کی خواہش اکتساب کے ساتھ ہمدردی ہے۔

عام طور پر بچے میں خواہش اکتساب اتنی زبردست ہوتی ہے کہ اس کے لئے محض مواقع مہیا کر دینا ہی کافی ہوتے ہیں۔ باقی سب کچھ وہ خود ہی کر لیتا ہے۔ مثلاً بچے کو گھٹنوں چلنے یا پاؤں پاؤں چلنے یا اسی طرح کی دیگر حرکات سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ باتیں کرنا البتہ خود بول کر اسے سکھاتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ارادتاً الفاظ سکھانے کی کوشش کرنا غیر ضروری ہے۔ بچے اپنی ترقی کی رفتار خود ہی متعین کرتے ہیں۔ اسے تیز تر بنانے کی کوشش کرنا غلطی ہے۔ مرتے دم تک انسان کا یہ حال ہوتا ہے کہ مشکلیں پیش آتی ہیں ان پر قابو پاتا ہے اور اس سے مزید کوشش کے لئے حوصلہ بڑھتا ہے۔ اس سے بہتر طریقہ شوق کے بڑھانے کا اور کوئی نہیں۔ مشکلات نہ اتنی زیادہ ہونی چاہئیں کہ کام کرنے کا شوق ہی مر جائے اور نہ اتنی کہ طبیعت کو اکسا نہ سکیں۔ ہم کچھ سیکھتے اسی بات سے ہیں جو ہم خود کرتے ہیں۔ بڑوں کو صرف یہ کرنا چاہیئے کہ ایک دفعہ بچے کو کر کے دکھا دیں۔ مثلاً اس کے سامنے ایک دفعہ جھنجھنا بجا دیں اور پھر بچے کو چھوڑ دیں کہ وہ خود اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرے۔ جو کام دوسرے لوگ سرانجام دیں ان سے شوق پیدا ہوتا ہے یا نئے کام کر

سکتے ہیں لیکن جب تک بچہ وہ کام خود نہ کرے اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

باقاعدگی اور وقت کی پابندی شروع بچپن اور خصوصاً پہلے سال میں بہت ضروری ہیں۔ غذا، خواب اور رفع حاجت کے لئے شروع ہی سے باقاعدگی کی عادت ڈالنی چاہیئے۔ گردوپیش کے حالات و واقعات مانوس ہونا ذہنی نقطہ نظر سے بہت ضروری ہے۔ اگر ایک ہی بات باقاعدگی سے پیش آتی ہے تو بچے کو اس کے پہچاننے میں آسانی ہوتی ہے۔ ذہن پر ضرورت سے زیادہ بوجھ نہیں پڑتا اور بچہ محسوس کرتا ہے کہ میں محفوظ ہوں۔ بچہ کمزور اور بے بس ہوتا ہے۔ اسے تسکین کی ضرورت ہے۔ اگر اسے یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ہر بات باقاعدگی کے ساتھ ہوتی ہے اور کوئی نئی بات یکلخت اس کی زندگی میں خلل نہیں ڈال سکتی تو وہ خوش رہتا ہے۔ جب عمر بڑی ہوتی ہے تو نئی نئی باتوں کا شوق پیدا ہوتا ہے لیکن زندگی کے پہلے سال میں ہر نئی بات سے بچے کو ڈر محسوس ہوتا ہے جس سے اسے جہاں تک ہو محفوظ رکھنا چاہیئے۔

اگر بچہ بیمار ہو اور آپ متفکر ہوں تو اپنی فکر حتی الامکان اس پر ظاہر نہ ہونے دیجئے ورنہ وہ بھی متفکر ہو جائے گا۔ کوئی ایسی بات نہ کرنی چاہیئے کہ جس سے بچے کی طبیعت میں ہیجان پیدا ہو۔ اگر بچے کو ٹھیک نیند نہ آئے یا اس کا پیٹ خراب ہو تو بچے کے سامنے بے پروائی ظاہر کرنی چاہیئے۔ اسے یہ احساس نہ ہونا چاہیئے کہ اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے ورنہ وہ معمولی باتوں میں بھی آپ کی خوشامد اور ترغیب کا خواہشمند ہوگا۔ اس بات کا خیال نہ صرف عمر کے پہلے سال میں بلکہ بعد میں بھی رکھنا چاہیئے۔ بچہ بڑا ہو تو اس اصول پر بیش از بیش کاربند ہونا چاہیئے۔ بچے کے دل میں یہ احساس کبھی نہ پیدا ہونے دینا چاہیئے کہ اس کے معمولی افعال مثلاً کھانا پینا جو خود اس کے لئے مسرت کا موجب ہیں آپ کی ممنونیت کا باعث ہیں۔ اگر اس میں یہ احساس پیدا ہو جائے تو وہ خوشامد کا متوقع رہتا ہے حالانکہ اسے ایسی باتیں خود بخود بغیر ترغیب کے کرنی چاہئیں۔

یہ کبھی خیال مت کیجئے کہ بچے میں اتنی عقل کہاں جو ان باتوں کو سمجھے۔ بچے کے قویٰ کمزور ہیں اور اس کا علم محدود، لیکن جہاں یہ کوتاہیاں اس کے رستے میں حارج نہ ہوں وہاں اس کی ذہانت بڑوں سے کم نہیں ہوتی۔ بچہ جو کچھ شروع کے ایک سال میں سیکھتا ہے پھر عمر بھر ایک سال کے عرصے میں اتنا نہیں سیکھ سکتا۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ بچے کی ذہانت بہت تیز ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ بچے کو یہ سمجھ کر کہ ایک دن اسے بڑا ہونا ہے اور دنیا کے کاروبار میں حصہ لینا ہے اس کی موجودہ سہولتوں پر یا اپنی خوشی پر اس کی آئندہ بہتری کو قربان مت کیجئے اس سے اسے بہت نقصان پہنچتا ہے۔

* ٹھیک تربیت دینے کے لئے محنت اور علم دونوں کا ہونا ضروری ہے *

رام لعل

# دوراہا

گاڑی کے ڈبے میں گھستے ہی اسے پہلی صورت جو نظر آئی وہ اس کے محبوب کی تھی

پلیٹ فارم سے آ گئی تب کہیں جا کر سوماتا کی آنکھ کھلی۔ اس نے گھبراہٹ میں اپنا سامان پیک کیا اور قلی کو پکارا۔ قلی اس کا سامان باہر رکھنے لگا اور وہ اپنے بکھرے ہوئے بال درست کرنے لگی۔

"گورکھپور جانے والی گاڑی چل تو نہیں گئی؟"

قلی نے اس کی بات سُنی اَن سُنی کر دی۔

وہ جھنجلا اٹھی۔ "بڑے میاں، میں پوچھتی ہوں گورکھپور جانے والی گاڑی ——؟"

"گورکھپور جانے والی گاڑی تو حضور بس اب چھوٹنے ہی والی ہوگی —— ذرا وقت تو دیکھئے اپنی گھڑی میں۔"

"اچھا چلو چلو —— سارا ٹائم تو باتوں میں ہی نکلا جا رہا ہے۔"

قلی نے سارا سامان اٹھا لیا تو اچانک اس کے ہاتھ سے باسکٹ پھسل کر گر پڑی۔ کئی چھوٹی موٹی چیزیں پلیٹ فارم پر لڑھکتی بکھرتی چلی گئیں۔ اُون کے گولے، سلائیاں، سیب، بسکٹ اور دو چار خطوط، ایک دوسرے قلی نے جلدی سے آگے بڑھ کر کچھ مدد کر دی لیکن سوماتا نے غصے کی وجہ سے اُس کا شکریہ بھی ادا نہ کیا پھر وہ جلدی سے آگے بڑھ گئی ہر بات سے اُلجھتی ہوئی، اپنے پھسل پھسل کر بکھرتے ہوئے بالوں سے، ساڑی کی سلوٹوں سے اور آگے سے پلٹ پلٹ کر تکنے والی نگاہوں سے ——

دراصل وہ گورکھپور جانا ہی نہیں چاہتی تھی اور یہ پرنسپل اور شانتا
کے لئے اس نے بہت کوشش کی تھی۔ اس نے پرنسپل مائیکل کو یقین دلانا
چاہا تھا کہ وہ آنے سے بالکل مجبور ہے کیونکہ وہ اتنا لمبا سفر اکیلے کس
طرح کرے گی لیکن پرنسپل نے اپنے آخری خط میں کچھ ایسے الفاظ میں
اس سے آنے کی خواہش کی تھی کہ وہ بالکل بے بس ہو گئی۔ مجبوراً اس نے
تار دے دیا ——— پچیس کو تیسرے پہر گودھانی میل سے پہنچے۔

کل رات بھر جب تک اس کی آنکھ نہیں لگ گئی تھی پرنسپل مائیکل
کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجتے رہے تھے "آپ کے پتی کے ہونٹوں
پر آخری دم تک آپ کا نام تھا۔ وہ آپ سے کتنا پریم کرتا تھا۔ مرنے سے
چند گھڑیاں پہلے اس نے آپ کی تصویر سامنے والی دیوار پر خود اپنے لرزتے
ہوئے ہاتھوں سے آویزاں کرتے ہوئے کہا ——— "میری ساری چیزیں
سوہانا کو یہاں بلا کر دے دی جائیں ——— ہم نے اس کی ساری
چیزیں اکٹھی کر رکھی ہیں۔ آپ آئیں گی تو آپ کے پتی کی یاد میں ایک جلسہ
کیا جائے گا اور اسی جلسے میں اس کی چھوٹی چھوٹی مگر قیمتی چیزیں اور
یادگاریں آپ کے حوالے کی جائیں گی۔ سب اسٹوڈنٹ آپ کا دیدار کرنے
کے لئے بیتاب ہیں۔"

ششیتل بہت دنوں سے بیمار تھا۔ اس نے سوہانا کو بلانے کے
لئے دو تین خط بھی لکھے لیکن سوہانا نے کسی بھی خط کا جواب نہیں دیا تھا ———
جب ... ایک سال پہلے دلی میں اس سے جھگڑا کر کے گھر سے چلا گیا
تھا تو اس نے یہی کہا تھا ——— "میں اب کبھی لوٹ کر نہیں آؤں گا ———"
اس طرح اس نے اپنی بات پوری کر دکھائی۔ ششیتل کا غصے اور دکھ سے
بھرا چہرہ ابھی تک سوہانا کی نظروں کے سامنے تھا۔ ششیتل جب کبھی غصے سے
بھڑکنے لگتا تو اس کا چہرہ لال ہو اٹھتا تھا۔ اس کے چہرے پر اچانک بہت
سی جھریاں ابھر آتی تھیں اور وہ بوڑھا دکھائی دینے لگتا تھا۔ اس دن بھی
جب وہ آخری بار گھر چھوڑ کر جا رہا تھا تو اس کے کندھے ایک عجیب انداز
سے جھک گئے تھے۔ وہ ایک اجنبی کی طرح دبے پاؤں یہاں سے چلا گیا تھا مگر
ہمیشہ کے لئے نکل جانے کی دھمکی تو وہ پہلے بھی کئی دفعہ دے چکا تھا
لیکن ہر بار وہ دوسرے تیسرے دن واپس لوٹ آتا۔ گھر سے جاتے وقت
سوہانا اسے روکنے کی کوشش ضرور کرتی اور شاید اسی لیے وہ بار بار لوٹ
بھی آتا تھا مگر آخری موقع پر تو سوہانا نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ روکتی
بھی کیسے، وہ بھی اس وقت غصے سے بھری ہوئی تھی۔ وہ اس سے دن رات
جو کچھ کہتا رہتا تھا اسے سننے کے لئے یہی بہتر تھا کہ وہ اسے چھوڑ کر چلا ہی
جائے۔ ایک ایسے شکی مزاج شوہر کے ساتھ نباہ بہت مشکل ہو جاتا ہے جو
ہمیشہ اپنی بیوی کو کسی پچھلے آدمی کا طعنہ دینے سے گریز نہ کر سکے۔ جب کبھی
کھانا ناپسند ہو، اس کے کپڑے وقت پر پریس نہ ہوں یا کسی وجہ سے
اس کی بات پوری نہ کی جا سکے تو بڑی آسانی سے اس کا صرف یہی مطلب
لیا جاتا ہے کہ سوہانا پہلے والے آدمی کے خیالوں میں کھوئی ہوئی ہے۔
اس پہلے والے آدمی کا نام سن سن کر سوہانا کے کان پک گئے
تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ پہلا آدمی اگر اس وقت سامنے آ کر کھڑا ہو جائے
تو وہ اس کو گولی ہی مار دیتی۔ صرف ششیتل کو یقین دلانے کے لیے کہ
اس کے دل میں اس کی کوئی چاہت موجود نہیں۔ یہ درست تھا کہ وہ
آدمی اس کی زندگی میں کبھی آیا ضرور تھا لیکن بہت پہلے جب ابھی اس کی
شادی بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ بھی تھوڑی سی دیر کے لئے بس، ایک
سپنے کی طرح۔ سپنے تو ہر کوئی دیکھتا ہے۔ کسی کے سپنے پورے ہو جاتے ہیں
کسی کے بکھر جاتے ہیں۔ اس کے سپنے بکھر گئے تھے لیکن اسے اس کا
کوئی غم نہیں تھا۔ اسے اس آدمی سے کہیں زیادہ خوبصورت پریم کرنے
والا مگر شکی مزاج شوہر ملا تھا۔ اس نے ششیتل کو بہت پسند کیا تھا۔
اسے اپنا بھرپور پیار دیا تھا۔ محبت کی بازی ہار کر بھی اپنا سب کچھ اس
کے حوالے کر دیا تھا۔ پہلی محبت میں دل ہار چکنے کے پچھتاوے کے علاوہ
بھی عورت کے پاس بہت کچھ باقی رہ جاتا ہے، اتنا کچھ کہ اس سے وہ اپنے
شوہر کے جیون کو مکمل جنت بنا سکتی ہے لیکن ششیتل جسے سوہانا کے بارے
میں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا اس بات کو دل سے کبھی نہ نکال سکا۔ سوہانا
کے بار بار یقین دلانے کے باوجود بھی وہ اس بات کو نہ بھول سکا۔ وہ
ہمیشہ اسی وہم میں مبتلا رہا کہ ساگر ابھی تک سوہانا کے سپنوں میں بسا
ہوا ہے۔ آخر سوہانا نے روز روز کی اس تکرار سے تنگ آ کر ایک دن
چیخ چیخ کر کہہ بھی دیا "ہاں، ہاں، ہاں ——— وہ بسا ہوا ہے میرے سپنوں
میں، بس تم یہی سننا چاہتے ہو نا میرے منہ سے تو کان کھول کر سن لو۔ وہ
میرے سپنوں میں پہلے دن کی طرح اب بھی بسا ہوا ہے اور ہمیشہ بسا رہے
گا ———" یہ سن کر ششیتل کا رنگ زرد پڑ گیا۔ جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔
ہونٹ کپکپانے لگے اور اس کے کندھے جھکتے چلے گئے۔ پھر وہ چلا گیا۔
سوہانا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ایک سال تک اس نے اپنے بارے میں
کوئی اطلاع نہ دی۔ وہ اس کے بارے میں بالکل بے خبر رہی۔ وہ اسے یاد
کرتی رہی۔ اس کے بارے میں کہیں نہ کہیں پتہ چلاتی رہی۔ پھر اس کی واپسی
سے ناامید ہو کر نوکری کر لی۔ ایک دن اچانک اس کا خط آ گیا۔ وہ پہلے تک
گورکھپور کے ایک مشن اسکول میں پڑھا رہا تھا۔ پھر اس کے اور بھی دو تین
خط آئے اور تھوڑے ہی دن بعد اس کے مرنے کی خبر آ گئی۔ سوہانا کو اس
بات کا بڑا دکھ تھا کہ وہ مرنے سے پہلے اسے یہ یقین کیوں نہ دلا سکی کہ وہ اُسے

ساگر سے کہیں زیادہ چاہتی ہے۔

گورکھپور کی گاڑی ابھی تک نہیں چھوٹی تھی۔ ہاں بار بار سیٹی ضرور دے رہی تھی۔ قلی نے جلدی سے اس کا سامان سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں پھینک دیا اور وہ لپک کر رینگتی ہوئی گاڑی میں سوار ہو گئی۔ چلتی ہوئی گاڑی سے ہی اس نے قلی کی جانب پیسے پھینک دئے اور ایک لمبی "اُف" کی آواز نکالتی ہوئی پلٹی تو سامنے ایک سیٹ پر ساگر کو بیٹھا دیکھ کر وہ حیران ہو گئی۔ وہ سفید ٹریلین کی شرٹ پر ایک خوش رنگ ٹائی باندھے ہونٹوں میں سگریٹ دبائے چہرے پر تیس پینتیس سال کی سنجیدگی لیے بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں دھوکا نہیں کھا سکتی تھیں۔ وہ یقیناً ساگر ہی تھا۔ وہ بھی ایک عرصہ کے بعد اُسے دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ جلدی سے اس کے پاس آیا ——— پوچھا "تم سومانا ——— کیسی ہو۔ کہاں جا رہی ہو ؟"

کچھ لمحوں میں ہی سومانا کو یقین ہو گیا کہ ساگر کی یہاں موجودگی محض ایک اتفاق ہے۔ وہ اس ڈبے میں جہاں تک اس کے ساتھ سفر کرے گی وہ بھی ایک اتفاق ہی ہوگا۔ اس وقت وہ نہ گاڑی سے کود سکتی ہے اور نہ اس قسم کی حرکت کر کے وہ بے وقوفی کا ثبوت دے سکتی ہے۔ ایک نارمل انسان کی طرح وہ اس کی باتیں سنے گی اور اپنی باتیں سنائیں گی۔
اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ سوچ کر سومانا بڑے نرم لہجے میں بولی "ذرا مدد کر دیجیے تا میرا سامان ایک طرف رکھوا دیجئے۔ میں گورکھپور تک جا رہی ہوں اور آپ ——— " "میں گورکھپور سے آگے جا رہا ہوں۔" ساگر نے جواب دیا۔

گورکھپور تک پہنچنے کے لیے پورے سات گھنٹے کا سفر تھا۔ ان سات گھنٹوں میں سے پہلے تین گھنٹے تو انہوں نے اسی ڈبے میں بیٹھ کر آپس کی باتوں میں گزار دیے۔ کون کہاں پر ہے ——— کس کے ساتھ ——— اب تک کیا کیا بیت چکی ہے اور کیا دونوں اپنے اپنے جیون سے مطمئن ہیں ؟ ——— جب آخری سوال پر بات چیت کرنے کی نوبت آئی تو لنچ کا وقت ہو چکا تھا۔ ایک اسٹیشن پر اُتر کر دونوں ڈائننگ کار میں چلے گئے۔ ساگر نے بڑے دُکھ بھرے لہجے میں اُسے بتایا کہ میں ہر مہینے چھ سو میلے کا تیل پھونک کر جگہ جگہ بھٹکتا پھرتا ہوں۔ دُور دراز علاقوں میں موٹر پارٹس بیچنے کے لیے گھومتا ہوں۔ آدھی سے زیادہ تنخواہ بیوی کے حوالے کر دیتا ہوں۔ اس سے وہ اپنا اور دو بچوں کا پیٹ پال لیتی ہے۔ میرا اس عورت سے اب دل بھر گیا ہے پتہ نہیں کیوں ؟ شاید اس میں اب کوئی خوبصورتی باقی نہیں رہی۔ کافی موٹی اور بھدی ہو گئی ہے بات بات پر غصہ کرتی ہے

وہ مجھ سے بھی اسی قسم کا سلوک روا رکھتی ہے۔ کبھی کبھی دو انسان جو ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے ایک دوسرے سے سخت نفرت کیوں کرنے لگتے ہیں۔ لیکن نفرت کرتے ہوئے بھی وہ کتنے بے بس نظر آتے ہیں۔ ایک دوسرے سے الگ بھی نہیں ہو سکتے۔ ساتھ رہنے سے کہیں زیادہ مشکل الگ ہو جانا ہوتا ہے۔ الگ ہو جانے کی خواہش ہی ہمارے لیے بہت مشکل بن گئی ہے۔ میرا خیال ہے ہم کبھی الگ نہیں ہو سکیں گے۔ ہمیشہ کڑھتے رہیں گے ایک دوسرے پر بڑبڑاتے رہیں گے اور ایک دوسرے پر پیالے اور گلاس بھی پھینکتے رہیں گے۔ کبھی کبھی مجبور ہو کر ایک دوسرے سے پیار بھی کرتے رہیں گے۔ کتنی عجیب زندگی ہے سومانا۔ کیا میری حالت سے تمہیں میرے ساتھ کچھ ہمدردی کا خیال آیا ؟ ساگر نے کتنا عجیب سوال پوچھ لیا تھا اس سے جس کے لیے وہ اس بھری دنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی تھی۔
اس نے اُس سے ہمدردی کے بارے میں پوچھ کر لفظ ہمدردی کی کتنی توہین کی تھی۔ سومانا کتنی ہی دیر تک کھڑکی کے باہر خلاؤں میں گھورتی رہی۔ آنکھوں میں آنسو آنے لگے تو اس نے کالا چشمہ لگا لیا۔ کتنی ہی دیر تک وہ خاموش بیٹھی رہی اور اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روکتی رہی۔ جب اس کا دل کچھ سنبھلا تو اس نے ساگر کو سب کچھ بتا دیا۔ شیتل اور اپنے بارے میں اور بڑے ہی صاف الفاظ میں اس پر واضح کر دیا کہ اس نے اپنے شوہر سے اس سے کہیں زیادہ محبت کی ہے لیکن اس کے شوہر نے اس کی محبت کا کوئی صلہ نہیں دیا۔ شاید وہ اتنی جلد مرتا بھی نہیں مگر وہ اس شک کی بنا پر گھل گھل کر چل بسا جو کہ اُسے اپنی بیوی اپنے جیون ساتھی پر تھا۔

لنچ ختم ہو چکا تھا۔ وہ دونوں ابھی تک وہیں بیٹھے تھے۔ وہ ابھی کچھ دیر تک وہیں بیٹھے رہنا چاہتے تھے۔ ساگر کو یہ سن کر بڑا دکھ ہوا کہ اس کا نام ایک آدمی کی موت کا باعث بنا۔ دونوں کے سامنے کافی پڑی پڑی ٹھنڈی ہو گئی۔ کافی دیر تک دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہے سنے بنا بیٹھے رہے جیسے دونوں اچانک گونگے ہو گئے ہوں یا دونوں کے پاس الفاظ کا خزانہ ختم ہو گیا ہو۔ بیرا اچانک بل لے کر آیا تو وہ اپنی خاموشی سے چونکے۔ ساگر نے اُسے اور کافی لانے کے لیے کہا اور سگریٹ سلگا کر کئی لمبے لمبے کش لیے۔ سومانا کھڑکی کے باہر دھوپ میں بھاگتے ہوئے کھیتوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس دھوپ کی تیز روشنی اس کے چہرے پر بھی پڑ رہی تھی۔ اس کے ترشے ہوئے بال ہوا کے جھونکوں سے عجیب انداز سے اڑ رہے تھے۔ اس نے بار بار اُڑتی ہوئی ساڑی کے پلو کو گردن میں لپیٹ لیا۔ بیرا کافی رکھ کر چلا گیا تو ساگر نے سومانا کو کافی کی پیالی پیش کی اور کہا۔ "میرا خیال ہے تمہاری بدقسمتی کا میں ہی قصوروار ہوں، پوری طرح قصوروار۔ لیکن تم ہی بتاؤ اب میں

کیا کروں؟ میں اپنے گھر بار اور دھندے میں گردن تک دھنس چکا ہوں ان سے نکلنا بھی چاہوں تو نہیں نکل سکتا۔ میرے پاس کچھ روپے ہیں چاہو تو ان سے زندگی میں کچھ پیر جمائے جا سکتے ہیں کم سے کم انسان کو اکھڑا ہوا ہونے کی پریشانی تو نہیں ہوگی۔ تم چاہو تو میری حفاظت میں کہیں بھی رہ سکتی ہو۔ پٹنہ، کھنڈیا، گوہاٹی میں۔ میں ہر جگہ برابر تمہارے پاس آتا جاتا رہوں گا۔ ویسے بھی جب کبھی میری ضرورت محسوس ہوگی میں اور زیادہ محنت کر کے کچھ تمہارے لیے بھی کما لیا کروں گا۔ تمہارے ساتھ شادی تو نہیں کر سکوں گا لیکن جو دیکھ بھال میری بیوی مجھ سے چاہتی ہے وہ تمہاری بھی ضرور کروں گا۔ کیا تم میرا یہ آفر قبول کر سکتی ہو؟"

سوہانا اس کی جانب گہری نظروں سے دیکھتی رہی۔ کتنی ہی دیر تک دیکھتی رہی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ساگر اس کی اس سنجیدگی سے کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکا۔ اچانک گاڑی گورکھپور پہنچ گئی۔ وہ جلدی سے ڈائننگ کار سے نکلے تو چلتے چلتے ساگر نے ایک بار پھر اُسے یقین دلایا "میں تمہاری حفاظت کا پورا ذمہ لیتا ہوں لیکن شادی نہیں کر سکوں گا۔"

پلیٹ فارم پر بہت سے لوگ سوہانا کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ مشن اسکول کے پرنسپل مائیکل، ٹیچر اور اسٹوڈنٹس سب اُس کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے سوہانا کی تصویر دیکھ لی تھی جو کہ شیتل کے کمرے میں لگی رہتی تھی۔ انہوں نے سوہانا کو دیکھتے ہی فوراً پہچان لیا اور اُسے گھیر لیا۔ اس وقت تک سوہانا نے ساگر کو کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ وہ بڑی مشکل میں پڑ گئی تھی۔ کیا کرے؟ اپنے مرنے والے شوہر کی مسٹریس بن کر گزارا کرے یا زندگی بھر ایک غیر شادی شدہ عورت کی طرح زندگی بتائے۔ وہ پلیٹ فارم پر کھڑی سوچتی رہی۔ مشن اسکول والے اس کے سامان کے بارے میں بار بار پوچھ رہے تھے۔ پرنسپل مائیکل بڑے دھیمے لہجے میں اُسے بتا رہا کہ ہم نے فیصلہ کیا ہے اور آپ بھی اسے قبول کر لیں تو آپ کو شیتل کی خالی کی ہوئی جگہ آفر کی جا سکتی ہے۔ یہ کتنا ونڈرفل ہوگا۔ سارے اسٹوڈنٹس اور اسٹاف والے خوش ہو جائیں گے۔ آپ کو نہیں معلوم شیتل نے کتنی جلد سب کا دل جیت لیا تھا ——

سوہانا کو ایسا لگا جیسے وہ کلاس روم میں کھڑی ہو۔ اس کے سامنے اسٹوڈنٹس کا ہجوم ہے۔ اس کے پیچھے دیوار پر شیتل کا ایک بہت بڑا پورٹریٹ ٹنگا ہوا ہے۔ وہ پورٹریٹ کو پہلی بار بڑے دھیان سے دیکھتی ہے۔ شیتل کی آنکھوں میں اُسے اتنا گہرا سمندر پہلے کبھی نہیں دکھائی دیا تھا۔ دکھ درد اور خواہشوں کا ایک پرسکون سمندر۔ یہ لوگ اُس سے وہی کچھ پڑھنا چاہتے ہیں جو کچھ شیتل انہیں پڑھاتا رہا ہے۔ یکایک کسی انسان نے انہیں کیا پڑھایا ہوگا، کیسے پڑھایا ہوگا جو یہ لوگ اُس سے اتنی گہری محبت رکھتے ہیں۔

شیتل کوئی بہت بڑا آدمی نہیں تھا جیسا کہ اس پورٹریٹ میں دکھایا گیا تھا۔ وہ ایک سیدھا سادا انسان تھا۔ اندر سے ٹوٹا ہوا اور باہر سے بھی وہ ٹوٹ چکا تھا۔ شاید اسی ٹوٹ پھوٹ نے اُسے ایک اعلیٰ ظرف انسان بنا دیا ہو جس کی وجہ سے سب اس سے خوش تھے۔ چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ سب اس سے محبت کرتے تھے اور اس کی موت کے بعد وہ اس کی بیوہ کو بھی وہی درجہ دینا چاہتے تھے جو انہوں نے شیتل کو دیا تھا۔

سوہانا کو اندر ہی اندر بڑا ڈر لگا۔ اس نے شیتل کے پورٹریٹ پر اپنا سایہ بھی پڑتا ہوا دیکھا، بالکل ایک صلیب کی طرح۔ اس نے گھبرا کر سب سے نظریں ہٹا لیں۔ ساگر کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑا تھا اس آس میں کہ سوہانا اپنا سفر جاری رکھے گی۔ گورکھپور میں نہیں اُترے گی لیکن سوہانا ساگر کو دیکھتے ہوئے یہ سوچ رہی تھی کہ یہ وہ ساگر نہیں ہے جسے وہ کالج کے زمانے میں جانتی تھی۔ یہ کوئی دوسرا ہی تھا۔ ایک بزنس مین، زندگی کو بھی بزنس کے اُصولوں پر تولنے والا۔ کالج کے زمانے کا ساگر تو بہت اچھا اور محبت کرنے والا انسان تھا جس کے لیے وہ اپنی زندگی تیاگ دینے پر تیار تھی۔ کیا اب وہ ایسے انسان کے ساتھ اپنے ادھورے سپنے کو پورا کر سکتی ہے؟ ——

—— نہیں، بالکل نہیں۔ نہ ہی وہ اپنے مرحوم شوہر کی روح کو مزید رنج پہنچانا چاہتی تھی۔ اس کی روح کو شیتل کی مسٹریس بن کر ہی سکون پہنچایا جا سکتا تھا اور وہ اس کی روح کو سکون پہنچانے پرنسپل مائیکل اور اسٹوڈنٹس کے ساتھ مشن اسکول ضرور جائے گی۔

اچانک گاڑی نے چلنے کے لیے سیٹی دی۔ دفعتاً سوہانا کے اندر بھی ایک حرکت پیدا ہوئی۔ بہت تیز قسم کی حرکت۔ اس نے اپنا سامان اتروانے کے لیے لوگوں کی طرف دیکھا اور کمپارٹمنٹ کے سامنے جا کر اپنا سامان نکلوایا۔ بہت سے اسٹوڈنٹس سامان اتارنے کے لیے اندر لپکے۔ وہ سب کے سب خوش تھے۔ سوہانا نے چپکے سے ساگر کی طرف مسکرا کر آخری نگاہ ڈالی۔ اس مسکراہٹ میں دکھ بھی تھا مگر اس کے ساتھ ہی یہ مسکراہٹ کافی پرسکون تھی —— طوفان کے گزر جانے والے سمندر کی طرح ——

گاڑی آہستہ آہستہ رینگ کر پلیٹ فارم سے نکلنے لگی۔ ساگر کمپارٹمنٹ کے دروازے میں کھڑا سوہانا کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا لیکن وہ منہ پھیر کر لوگوں کے ہجوم میں چلی آئی۔ چپ چاپ، ہر طرف سے لاپروا اور اپنے مرحوم شوہر کی یادوں میں کھوئی ہوئی ——

# تیسری دنیا

رخسانہ سلام مرزا

ملائشیا تیسری دنیا کا بہت اہم ملک ہے۔ جنوب مشرقی ایشیا میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ ایک لاکھ تیس ہزار مربع میل ہے اور آبادی ایک کروڑ اٹھارہ لاکھ ستاسی ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ ملائشیا میں جزیرے زیادہ ہیں۔ آبادی خاصی گنجان ہے۔ دنیا میں یہ ملک اپنے ساحلی علاقوں کی وجہ سے حسین اور صحت افزا علاقہ کہا جاتا ہے۔ اس ملک کے دو خطے ہیں۔ ایک ملائی جزیروں پر مشتمل ہے اور دوسرا سمندری ساحلی خطہ ہے۔ اس کے کچھ جزیرے ملایا کے ساحل سے دور سنگاپور سے ملے ہوئے ہیں اور سرحدی علاقے کہلائے جاتے ہیں۔ ملائشیا کا ساحلی علاقہ تقریباً تین ہزار میل ہے۔

ملائشیا کا دارالخلافہ کوالالمپور ہے۔ اس شہر کی آبادی ساڑھے تین لاکھ ہے۔ یہ شہر بہت خوبصورت ہے اس شہر میں جو اسپورٹس اسٹیڈیم بنایا گیا ہے وہ بہت لاجواب ہے گزشتہ مہینوں میں اسی اسٹیڈیم میں محمد علی باکسر نے جو بگنر سے ہیوی ویٹ چیمپئین شپ کا مقابلہ جیتا تھا اس سے قبل اسی اسٹیڈیم میں ایشین کھیل ہوئے اور پاکستانی ٹیم نے ایشین ہاکی فائنل کھیلا تھا۔

ملائشیا میں ایک سو فی صد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے تاریخ بتاتی ہے کہ ان علاقوں میں اسلام عرب تاجروں کے توسط سے پہنچا۔ یہ تیرہویں صدی کی بات ہے۔ ملایو راجدھانی میں مشرقی ساٹرا پہلی ریاست تھی جہاں اسلام کی روشنی پھیلی تو اردگرد کا علاقہ بھی ان نورانی کرنوں سے دمک اٹھا۔ اسلام ان علاقوں میں اسقدر پروان چڑھا کہ ملائی تہذیب کی بنیادیں ہل گئیں۔ ان علاقوں پر غیر ملکی تسلط بھی رہا۔ زیادہ تر یہ علاقے پرتگال کے پاس بھی رہے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ آزاد ہو گئے۔ ان علاقوں میں شخصی حکومتیں بھی قائم رہیں لیکن یہ علاقے مہذب دنیا سے بہت ملے جلے تھے اس نئے جدید تہذیب سے روشناس ہوئے اور جمہوری اقدار کی طرف گامزن ہوئے۔ شاہوں کی سلطنتیں ختم ہوتی گئیں یہاں تک کہ جدید ملائشیا کی بنیاد اکثر چھوٹی راجدھانیوں کے باپ سے ہوئی اور طے پایا کہ جمہوری نظام اپنایا جائے گا۔ ملائشیا کو جدید خطوط پر چلانے میں تنکو عبدالرحمٰن کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

تنکو عبدالرحمٰن ملائشیا کے وزیراعظم رہے اور اسلامی دنیا کی ہی نہیں پوری تیسری دنیا کی ایک اہم شخصیت ہیں قارئین کو یاد ہوگا کہ تیسری دنیا کے مسلم ممالک میں تنکو عبدالرحمٰن کو ایک بڑا اعزاز دیا گیا تھا۔ یہ اعزاز ان کو اسلامی کانفرنس کے موقعہ پر اسلامی سیکریٹریٹ کا سیکریٹری جنرل مقرر کر دیا گیا۔

تنکو عبدالرحمٰن کے بعد ملائشیا کی دوسری اہم شخصیت تنکو عبدالرزاق ہیں جو آج کل ملائشیا کے وزیراعظم ہیں۔ ان کو پہلی اور دوسری دنیا میں بھی خاصی اہمیت اور شہرت ملی۔ جرمنی میں تو ان کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ ایک زمانے میں ملائشیا کو ان کے دم قدم سے خاصے فوائد ہوئے۔ غیر جانبدار دنیا میں تنکو عبدالرزاق نے بہت سیاسی کام کیا۔ بڑی طاقتوں کے مفادات سے الگ رہ کر اپنے ملک کو پروان چڑھانے میں ان کی خدمات بہت زیادہ ہیں۔ تنکو عبدالرزاق ایک زندہ دل اور بیباک خطیب بھی ہیں اور آج تیسری دنیا میں ان کو ایک معقول شخصیت گردانا جاتا ہے

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ملائشیا کے علاقوں میں برطانوی اور جاپانی فوجوں کا تصادم ہوا۔ برطانیہ کو بہت سے علاقوں سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ سنگاپور کی شکست تو تاریخ جنگ میں بہت اہم ہے جہاں سے لارڈ ویول جو برطانوی فیلڈ مارشل تھے ہتھیار ڈال دینے کا حکم دے کر بھاگ گئے تھے اتحادیوں کی فتح کے بعد یہ علاقے جاپان سے الگ ہوئے اور وقت کے ساتھ ساتھ برطانوی اثر سے نکل گئے

ملائشیا ستمبر ۱۹۶۳ء میں وجود میں آیا۔ اس سے قبل مختلف سیاسی دور گزرے جن کی تاریخ خاصی طویل اور دلچسپ ہے لیکن ایک زندہ قوم کی طرح ملائی باشندوں نے ترقی کے منازل طے کیں ملائی عوام کو اپنی غربت اور اپنی کم مائیگی کا احساس تھا۔ ان کی لیڈر شپ اچھی تھی اس لئے اب ملائشیا کا وجود دوسرے مسلمان ملکوں کے مقابلے میں ایک نمائندہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ترقی کے منازل طے کرنے کے لئے ملک میں صنعتوں کا قیام کیا گیا۔ زراعت کو فروغ ہوا۔ ملائشیا کا آئینی نظام بہت اچھا ہے۔ اس کا ذکر کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ذرا سی تفصیل ملائشیا کے قیام کی بیان کر دی جائے ملائشیا نو ملائی ریاستوں کا ایک فیڈریشن ہے جن میں جوہور، کیدہ، کیلنتان، ملاکا، نگری سنمبیلان، پہانگ، پرلس، سیلنگور، ترنگانو وغیرہ کچھ جزیرے شامل ہیں۔ پارلیمانی جمہوری نظام رائج ہے۔ ملائشیا کا سربراہ پانچ برس کی مدت کے لئے چنا جاتا ہے اس کا چناؤ نو ریاستوں کے سربراہ کرتے ہیں۔ اس طرح ایک کانفرنس آف رولرز بنائی گئی ہے جس میں نو ملائی ریاستوں کے شاہ اور پانچ دوسرے علاقوں کے گورنر شامل ہوتے ہیں۔ ملک کا سرکاری مذہب اسلام ہے لیکن دوسرے مذاہب کو بھی خاصی آزادی دی گئی ہے۔ ملائشیا کی وفاقی پارلیمنٹ میں دو ایوانی مقننہ موجود ہے۔ ایک کو سینیٹ اور دوسری کو ایوانِ نمائندگان کہا جاتا ہے۔ وزیر اعظم کا چناؤ ایوان نمائندگان کی پارلیمنٹ میں ہوتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ ملائشیا کا باشندہ ہو۔ اس کو سربراہ حکومت اختیارات تفویض کرتا ہے۔ وزیر وفاقی حکومت مقرر کرتی ہے۔

ملائشیا کا کرنسی نظام ڈالر کی طرز پر ہے۔ ملک میں ملائشی ڈالر کا سکہ چلتا ہے۔ ملائشیا میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جن میں ملائی چینی ہندوستانی علاقائی زبانیں اور بولیاں شامل ہیں لیکن ملائی زبان ایک ہے جو قومی زبان ہے اور سرکاری زبان انگریزی ہے۔ ملائشیا ایک زرعی ملک بھی ہے لیکن ربڑ تیل چاول اناناس اور ناریل بہت پایا جاتا ہے۔ کوئلہ سونا چاندی تانبہ وغیرہ بھی ملتے ہیں۔ لکڑی کی بھی بہتات ہے۔

ملائشیا میں ربڑ کو اہمیت حاصل ہے سب سے بڑی صنعت ربڑ کی صنعت ہے تقریباً چالیس لاکھ ایکڑ رقبہ ربڑ کی پیداوار کے لئے ریزرو ہے اور لاکھوں افراد کا رزق ربڑ کی پیداوار سے منسلک ہے۔ ربڑ بھی اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے جو دنیا بھر میں برآمد کیا جاتا ہے اس کے علاوہ مچھلیاں بھی بہت ہوتی ہیں اور دنیا کے دوسرے علاقوں کو برآمد کی جاتی ہیں۔ ملائشیا میں جنگل بھی زیادہ ہیں جہاں قیمتی لکڑی بھی بہت ملتی ہے۔

ملائشیا اقوام متحدہ کا رکن بھی ہے۔ سترہ ستمبر ۱۹۵۷ء کو اس کو رکنیت ملی۔ لیکن تیسری دنیا کے بہت فعال ملکوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ سیاسی طور پر مسلمان ملکوں میں اس کا اہم مقام ہے۔

ملائشیا کی ترقی میں جدید تعلیم کا بہت عمل دخل ہے۔ پورے ملک میں تعلیم عام کی جا رہی ہے اور بڑے تعلیمی ادارے موجود ہیں جن کی وجہ سے لوگ جدید دنیا سے قریب تر آ گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملائشیا کا مستقبل یقیناً تابناک ہے جو تیسری دنیا کے لئے ایک اہم بات ہوگی۔

# پیاسا ہونٹا

سنیش بترا

یک جان و دو قالب سہیلیوں کے آنگن میں جب مرد داخل ہو تو ——

**ہوٹل** کے کوریڈور میں سے گزرتے ہوئے بیرے نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ رتنا اور اس کے پیچھے راکیش کمرے میں داخل ہوا۔ کمرہ بہت بڑا تو نہ تھا لیکن نہایت سلیقے سے سجا تھا۔ فرش پر ہلکے گلابی رنگ کا ایک خوبصورت پھولدار قالین تھا جس کا رنگ زردی مائل دیواروں کی وجہ سے اور بھی زیادہ کھل رہا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ لگا ہوا ڈبل بیڈ تھا جس کے دونوں طرف سائیڈ ٹیبل پر پڑھنے کے لئے ٹیبل لیمپ رکھے تھے۔ سامنے کھڑکی پر جالی کا ایک مہین سا پیلا پردہ ہوا میں سرسرا رہا تھا اور آسمان کو چھوتی ہوئی لہراتی دھوپ سے نہائی کنچن جنگا کی سفید دودھیا چوٹی کھلی کھڑکی میں یوں جھانک رہی تھی جیسے وہ شاید اس ہوٹل کا حصہ بھی ہو۔ رتنا نے مسکرا کر راکیش کی طرف دیکھا اور راکیش نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے بیرے سے کہا

"ٹھیک ہے یہی کمرہ، سامان لگا دو۔"

بیرے نے ہاتھ میں جھولتے ہوئے دو سوٹ کیس ڈرائنگ روم کے تختہ نما ریکوں پر لگا دیئے اس نے باتھ روم میں جھانکا اور تولئے اور صابن وغیرہ پر ایک نظر ڈال کر باہر آ گیا۔

"صاحب کچھ کافی وغیرہ لاؤں۔"

"کافی —؟"

راکیش نے پلٹ کر دیکھا

"ارے دار جلینگ میں تو چائے ہونی چاہیئے، رتی چائے پیو گی نا؟"

رتنا کھڑکی میں سے منظر دیکھ رہی تھی اس نے گھوم کر دیکھے

بغیر اثبات میں سر کو ہلکی سی جنبش دے دی۔

"دیکھو دار جلینگ کی بہترین چائے ہونی چاہیئے اور کھانے کے لئے چکن سینڈوچز۔"

اس نے جیب سے دو روپے نکال کر بیرے کو ٹپ دیتے ہوئے کہا۔ بیرے نے نہایت ادب سے سر جھکا کر نوٹ تھام لئے اور دروازہ بند کر کے چلا گیا۔

بیرے کے چلے جانے کے بعد رتنا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہی تھی کہ کب راکیش اسے اپنی بانہوں کے گھیرے میں سمیٹ لیتا ہے لیکن وہ اس بارے میں کوئی پہل نہیں کرنا چاہتی تھی اس نے ایک ہی نظر میں باہر اور راکیش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دار جلینگ کتنی اچھی جگہ ہے۔"

وہ اس طرح سے راکیش کو اپنے پاس آنے کی دعوت دے رہی تھی وہ شادی کے بعد ہنی مون ہی کے لئے تو دار جلینگ آئے تھے

"ہاں رتی اسی لئے تو تمہیں یہاں لایا ہوں؟"

راکیش نے گلے سے مفلر اتار کر کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے کہا "یہاں چائے کے باغیچے، ہمالیہ کی اونچی اونچی چوٹیاں، ماؤنٹیئرنگ انسٹی ٹیوٹ، بوٹینیکل گارڈنز، ٹائیگر ہل سبھی چیزیں تمہیں بے حد پسند آئیں گی۔ پچھلی بار جب ہم آئے تھے تو مال روڈ کے پاس اسٹینڈرڈ ہوٹل میں ٹھہرے تھے؟

"ضرور پہلے بھی کسی لڑکی کے ساتھ آئے ہوں گے۔"

رتنا نے عورت کے روایتی شکی انداز میں پوچھا

"ہاں یہ کم بخت جگہ ہے ہی ایسی۔"

راکیش نے اسے چڑاتے ہوئے کہا

رتنا کی خودی کو جیسے ٹھیس سی لگی ہر عورت اپنے خاوند کو اپنی ملکیت سمجھتی ہے۔

"تب پشپا زندہ تھی۔"

رتنا بھول ہی گئی تھی کہ راکیش کی پہلے بھی شادی ہو چکی تھی اسے جیسے راکیش پر ترس آ گیا۔ اس نے قریب جا کر راکیش کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ پشپا پانچ سال گزرنے پر بھی اسے بہت یاد آتی تھی لیکن وہ اس طرح اپنے ہنی مون کو خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے اور راکیش کے درمیان اس وقت کسی بھی تیسری ہستی کو لانے کے لئے تیار نہ تھی اس نے راکیش کا ہاتھ اپنی کمر میں ڈال لیا اور اس کے سینے کے ساتھ لگی اسے کنکھیوں سے تکنے لگی راکیش کی چاہت میں دوسری شادی

ہو لیکن وہ تو پہلی بار دلہن بنی تھی!

اس کا سینہ بری طرح دھڑک رہا تھا اور اس کی سانسیں تیز ہو رہی تھیں۔ یکایک راکیش کی گرفت مضبوط ہو گئی اور اس کا چہرہ اس کے ہونٹوں پر جھک گیا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ راکیش نے اس کا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور پھر ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرتے ہوئے دروازہ کھولنے چلا گیا

بیرے نے میز پر چائے لگا دی اور باہر چلا گیا رتنا اپنے بالوں کو سنوارتی اس کے سامنے کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔

"چائے بناؤں۔"

"ہاں! یہ تو عورتوں کا پیدائشی حق ہے!"

راکیش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

رتنا کو راکیش کا یہی مردانہ پن تو بھا گیا تھا وہ اس طرف چاؤ سے دیکھنے لگی۔ راکیش کے بالوں میں عین پیشانی کے پاس ایک سفید لٹ تھی جو اس کے چہرے کو اور بھی دلکش اور بارعب بنا رہی تھی۔ راکیش ادھیڑ عمر میں داخل ہو چکا تھا لیکن اس کا سرولنہ بانکپن اور جاہ و جلال اور بھی نکھر گیا تھا اس کی ہر جنبش میں ایک خود اعتمادی جھلکتی تھی۔ وہ نہایت خوش تھی کہ وہ آخر کار راکیش کو پانے میں کامیاب ہو گئی تھی

کمرے میں ڈرائینگ ٹیبل کا قدِ آدم آئینہ رتنا کو چائے بناتا دیکھ رہا تھا۔ رتنا نے چائے بناتے ہوئے کنکھیوں سے راکیش کی طرف دیکھا اس کی نگاہیں بھی اس کی طرف جمی تھیں نگاہیں ملتے ہی راکیش مسکرا دیا اور رتنا نے چائے کی پیالی آگے بڑھا دی لیکن فوراً ہی پیچھے ہٹا لی۔

"یوں نہیں! اٹھ کر پہلے میرے پاس آئیے!"

راکیش اٹھ کر رتنا کی کرسی کے پیچھے کھڑا ہو گیا اور رتنا نے کرسی کی اوٹ کا سہارا لیتے ہوئے اپنا سر اس کے سینے سے لگا دیا۔

راکیش نے جھک کر اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔

"اب لیجئے! چائے حاضر ہے۔"

وہ شرارت سے مسکرا دی۔

راکیش نے آگے بڑھ کر اسے تھام لینا چاہا! لیکن رتنا نے فوراً پیالہ اپنے اور راکیش کے درمیان حائل کر دیا۔

راکیش ایک لمحہ ٹھٹک کر مسکرایا۔ اسے رتی کی یہی ادائیں تو پسند تھیں۔

"رتی رات کو پکچر چلو گی نا؟"

راکیش نے چائے پیتے ہوئے پوچھا

"کیوں نہیں آپ کا حکم کیسے ٹالا جا سکتا ہے۔"
رتنا مسکرا دی
"اچھا رتی۔"
راکیش نے چائے کا پیالہ ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔
"میں سیٹیں ریزرو کرا آتا ہوں، تم منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو
جاؤ۔ باتھ روم میں گرم پانی تو آ ہی رہا ہے۔"

راکیش کے چلے جانے کے بعد رتنا دروازہ بند کر کے سوٹ
کیس میں سے کپڑے نکالنے لگی۔ راکیش کا ریشمی سلیپنگ سوٹ اور
اونی ڈریسنگ گاؤن نکال کر وہ انہیں بڑی دیر تک دیکھتی رہی اور
پھر انہیں گالوں سے لگا کر نہایت پیار سے سہلاتے ہوئے کپڑے بستر
پر رکھ دیئے۔ اس نے اپنی ساڑھیاں اور کوٹ نکال کر ہینگر میں ٹانگ
دیئے اور پھر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر گنگنانے لگی۔ آئینے میں سے
جھانکتا چہرہ اگرچہ سانولا تھا لیکن ایک نامعلوم خوشی کی وجہ سے وہ
دمک رہا تھا۔ پچھلے دو تین دنوں سے اس کے چہرے کی ہر شکن میں ایک
عجیب ملائمت آ گئی تھی۔ وہ پینتیس برس کی بجائے صرف بیس بائیس برس
کی لگ رہی تھی اس کے بال کہیں کہیں سے سفید ضرور ہو گئے تھے لیکن
خضاب کے جادو نے اسے بالکل جوان سا بنا دیا تھا۔ رنگ صاف
ہونے پر بھی اس کے تیکھے نقش، اپنی طرف متوجہ ضرور کر لیتے تھے اس
کا ابھرا جسم اور نمایاں کولہے مالتی کے دبلے پتلے مرجھائے جسم سے
کہیں خوبصورت تھے مالتی جو اس کی قریبی دوست تھی وہ نہ صرف
سیتا پور کے انٹر کالج میں اکٹھی پڑھاتی تھیں بلکہ وہ دونوں ایک ساتھ
اکٹھی رہتی بھی تھیں۔ آئینے کا عکس اس بات کا صاف گواہ تھا اس نے
اڑسی ہوئی ساڑی پیٹی کوٹ کی گرفت سے آزاد کر دی اور وہ بل کھاتی
ساڑھی کو ڈھیلا چھوڑتی باتھ روم کی طرف بھاگ گئی حتیٰ کہ آئینے سے
باتھ روم کے دروازے تک اس کی اتاری ہوئی ساڑھی پلنگ کا سہارا
لیتے فرش پر بچھ گئی۔

وہ کافی دیر تک باتھ روم میں گنگناتی رہی، کئی دھنیں، کئی بول
اس کے لبوں پر آ آ کر تھرکتے رہے اور پھر جب وہ کمرے میں دوبارہ داخل
ہوئی تو اس کے بدن سے صابن اور یوڈی کلون کی ملی جلی خوشبودار
لپٹیں اٹھ رہی تھیں، اس نے جلدی سے نئے کپڑے پہنے، بالوں
میں کنگھی کی، چہرے پر میک اپ کیا اور سینٹ کے سپرے کے بعد
وہ کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ کنچن جنگا کی چوٹی پر سورج کی
ارغوانی کرنیں اپنی جگمگاہٹ پھیلا رہی تھیں۔

سامنے مال روڈ پر باقی بلڈنگوں سے بلند، کلاک ٹاور اپنا سر
اٹھائے دارجیلنگ کی نگہبانی کر رہا تھا اس سے نیچے بس اسٹینڈ
اور مارکیٹ کا کھلا احاطہ اور پھر اس سے اور نیچے چائے کے باغات
نظر آ رہے تھے۔

ہوا میں ایک تازگی اور عجیب سی خوشبو رچی ہوئی تھی جسے
اس نے نیل گری کے اسٹیشن سے چلتے ہی محسوس کیا تھا اور وہ گاڑی
کے ننھے منے ڈبے کھلونے ہی تو معلوم ہوتے تھے وہ کھلونا سا انجن
جس کے آگے بیٹھا ہوا آدمی ریلوے لائن پر برابر ریت ڈالتا رہتا تھا
تاکہ گاڑی کے پہیے پھسل نہ جائیں۔ گاڑی کئی جگہ کنڈلی نما چکر کاٹتی
کبھی یکدم سینکڑوں فٹ اوپر چڑھ جاتی اور کبھی چشم زدن میں
سینکڑوں فٹ نیچے اتر جاتی، گاڑی جب چھوٹے چھوٹے شہروں
کے بازاروں میں سے گزرتی تو اس نے لوگوں کو چلتی گاڑی میں سے اتر کر
سودا خرید کر دوبارہ چڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ دیکھ دیکھ کر لطف اندوز
ہوتی رہی گویا وہ پھر اپنے بچپن میں لوٹ گئی ہو۔ وہ لوگوں کے اجلے کپڑے
اور ان پہاڑی قصبوں کی صفائی کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی لیکن جو چیز
اسے سب سے انوکھی لگی وہ اسٹیشنوں پر بوجھ ڈھونے والی قلی عورتیں
تھیں ان کے جسم گٹھے ہوئے، کاٹھی مضبوط اور چہرے نہایت گورے
اور دلکش تھے۔ کنچن جنگا کی چوٹی کو اب لہراتے سایوں نے ڈھانپ لیا
تھا۔ ایک ہفتے پہلے اسے گمان بھی نہ تھا کہ راکیش اس سے اس قدر جلدی
شادی کرے گا اور وہ دونوں ہنی مون کے لئے دارجیلنگ آ گئے اور
پھر اس کھڑکی میں تو اس کے بجائے مالتی کو ہونا چاہئے تھا کتنی حیرانی
کی بات تھی کہ رتنا سے راکیش کی ملاقات مالتی کے باعث ہوئی تھی۔ یہ
مالتی ہی تھی جس کی طرف راکیش جھکا چلا جا رہا تھا لیکن شادی رتنا کی قسمت
میں لکھی تھی اسے رہ رہ کر مالتی پر ترس آ رہا تھا لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ
خود کیا کرتی!

رتنا کی عمر مشکل سے پندرہ سولہ سال تھی جب اس کے
والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس نے ابھی میٹرک کا امتحان بھی نہ دیا
تھا۔ گھر میں ماں تھی اور دو چھوٹے بھائی جو ابھی دوسری تیسری ہی میں
پڑھ رہے تھے۔ ماں بھی کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہ تھی لیکن یہ صرف اس
کی ہمت اور لگن تھی کہ سلائی کڑھائی کر کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو
پڑھا کر اس نے رتنا کو اس قابل کر دیا کہ وہ بی اے بی ٹی کرنے کے بعد
کسی اسکول میں نوکری کر سکے۔ رتنا کو نوکری ملی بھی تو ماں اور بھائیوں
سے دور، اس نے دور رہ کر بھی گھر بار سنبھالا اور جب اس نے بھائیوں
کو اس قابل کر دیا کہ وہ اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہو سکیں تو وہ اس
منزل پر پہنچ گئی جہاں اس کی عمر کی لڑکیوں کے لئے رشتے ملنا ناممکن،

جاتے ہیں اور پھر اس دنیا میں ماں کے سوا اس کا گھر بسانے کی فکر بھی کون کرتا۔ وہ بے چاری بھی چار سال ہوئے اس کی شادی کا ارمان لئے چل بسی تھی۔

بتیس تینتیس سال کی عمر میں اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد رتنا کو اچانک احساس ہوا کہ وہ دنیا میں اکیلی رہ گئی ہے۔ اس کی زندگی کے بہترین سال ماں اور بھائیوں کی دیکھ بھال میں بلیدان ہو گئے تھے۔ اس کی ذمہ داریاں ختم ہو گئی تھیں لیکن اس کی اپنی زندگی ویران اور سنسان ہو کر رہ گئی تھی۔ اب کوئی اگر اس کا ساتھی تھا تو مالتی جو اسی اسکول میں آرٹ ٹیچر تھی۔ دونوں اکٹھی ایک ہی مکان میں رہتی تھیں۔ چھوٹا سا شہر ہونے کی وجہ سے وہ کہیں نکل نہ پاتیں۔ ان کی زندگی گھر کی چار دیواری میں، لڑکیوں کی کاپیاں جانچتے ایک دوسرے سے الٹی سیدھی بحث کرتے، ریڈیو کے پروگرام سنتے اور ناول پڑھتے گزرنے لگی۔

مالتی بھی قریب قریب اس کی ہم عمر تھی اور اس کی زندگی کے حالات بھی زیادہ مختلف نہ تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ اپنی شکل و صورت اور بدن کمزور ہونے کی وجہ سے کسی کی نظروں میں کھب نہ سکی تھی۔ تین چار بار مسترد کئے جانے کے بعد اس نے پکا فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ شادی ہی نہ کرے گی اور اس عمر پر پہنچنے کے بعد مالتی کو اپنا فیصلہ غلط سا معلوم ہوا لیکن اب مجبوری سے سمجھوتا کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اسے آرٹ سے بے حد لگاؤ تھا اور اس نے اپنی تمام صلاحیتیں تصویریں بنانے میں لگا دی تھیں جیسے وہ زندگی کے لٹے ہوئے خزانے کی تلافی آرٹ کی دنیا سے کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے فالتو وقت میں تصویریں بناتی رہتی۔ رتنا نے اپنے ذمے گھر کا انتظام لے لیا تھا۔ یہ مصروفیات ان کے تنہائی کے احساس کی شدت کو کسی حد تک کم کر دیتیں۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتیں ہمیشہ اکٹھی جاتیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب تھیں کہ ایک کا تصور دوسری کے بنا کچھ نامکمل سا محسوس ہوتا۔

کچھ ہی مہینے پہلے لکھنؤ کی سالانہ للت کلا اکیڈمی کی نمائش میں مالتی نے بھی اپنی بنی ہوئی تصویریں بھیجی تھیں۔ اس نمائش کے موقع پر مالتی اور رتنا دونوں موجود تھیں۔ رتنا اپنی عادت کے مطابق نمائش کے کاموں میں مصروف ہو جاتی وہ سارا وقت ریسپشن پر بیٹھی آنے والوں کو کیٹلاگ دیتی رہتی۔ قریب ہی وزیٹرز رجسٹر پڑا رہتا جس میں نمائش دیکھنے کے بعد لوگ اپنے تاثرات لکھ دیتے ایک روز نمائش میں آنے والے لوگوں میں راکیش بھی تھا۔

—— نہ جانے کیوں رتنا اس کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی جب تک وہ ہال میں لگی ہوئی تصویروں کے درمیان گھومتا رہا اس کی نگاہیں اس کے قیمتی سوٹ میں سے جھانکتی گٹھا وہ پشت کا پیچھا کرتی رہیں۔ اس کا جی یہ چاہا کہ وہ بھی اٹھ کر اس کے قریب ہال میں گھومنے لگے لیکن نمائش میں آنے والے وزیٹر کے رجسٹر نے جیسے اس کا راستہ روک لیا تھا کچھ دیر بعد جب وہ نمائش دیکھ کر اس کے ڈسک کے پاس سے گزرا تو بھیڑ ختم ہو گئی تھی اور وہ اکیلی ہی بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مے آئی ہیو یور کمنٹس پلیز"

اور اس نے وزیٹرز بک اس کی طرف سرکا دی۔ راکیش نے ایک لمحہ اس کی طرف دیکھا اور پھر وہ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ رتنا کی نگاہیں اس پر جمی تھیں۔ اس کی شکل و صورت، لباس، بولنے چالنے کا شائستہ ڈھنگ اس کی باذوقی، باشعور شخصیت کا پتہ دیتے تھے لکھنے کے بعد اس نے رجسٹر رتنا کو تھما دیا۔

رتنا نے ایک ہی نظر میں اس کے لکھے ہوئے تاثرات کو پڑھ لیا تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

ان تاثرات میں مالتی کی تصویروں کی بے حد تعریف تھی۔ تعریف تو اور لوگوں نے بھی کی تھی لیکن اس نے یہاں تک لکھا تھا کہ ان تصویروں کے بغیر نمائش ایک بے حد عامیانہ اور گھٹیا معیار کی ثابت ہوتی۔

"تھینک یو مسٹر راکیش! آپ نے تو مس مالتی کی پینٹنگز کی بہت تعریف کی ہے!"

"وہ ہیں ہی اسی قابل!"

"آپ مس مالتی سے ملنا چاہیں گے! وہ اس وقت نمائش میں ہی موجود ہیں!"

اس نے یہ نہ جانے یہ سب کیوں کہہ دیا۔ شاید اس لئے کہ وہ چاہتی تھی کہ راکیش کچھ دیر اور وہیں رک جاتے۔

"ضرور۔"

اور رتنا راکیش کو مالتی سے ملانے ہال کے اندر لے گئی۔ وہ راستے میں اپنا تعارف کراتی جا رہی تھی۔

"میرا نام رتنا ہے مجھے مالتی کی بہت ہی قریبی سہیلی ہونے کا فخر حاصل ہے ہم دونوں سیتاپور میں اکٹھی ہی رہتی ہیں۔"

"سیتاپور میں! بزنس کے سلسلے میں تو اکثر مجھے وہاں آنا جانا پڑتا ہے!"

"تو اگلی بار آپ ہمارے ہاں ضرور آئیے گا؟"

انھیں مالتی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن رتنا کو راکیش سے باتیں کرنے میں مزہ آرہا تھا۔ وہ تو چاہتی تھی کہ مالتی ابھی کچھ عرصے اور نہ ملے لیکن پھر اچانک وہ ایک کونے میں کھڑی دکھائی دے گئی۔

"مالتی! یہ مسٹر راکیش ہیں! انھیں تمھاری پینٹنگز بہت پسند آئی ہیں! تم سے ملنے کے لیے...."

"بے حد بے چین ہیں!"

راکیش نے جملہ مکمل کرتے ہوئے کہا اور پھر وہ ہنس دیا۔ مالتی اور رتنا بھی مسکرا دیں۔

راکیش بڑی دیر تک مالتی کی تصویروں کی اور اس کے اسٹائل کی تعریف کرتا رہا۔ مالتی بھی بڑی انکساری سے اپنی زندگی اور آرٹ سے لگاؤ کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں ایک نئی چمک آگئی تھی۔ جانے سے پہلے راکیش نے مالتی اور رتنا کو اپنے ہاں مدعو کر لیا۔

اگلے روز چائے پر مالتی اور راکیش دیر تک حسین، گجرال، جیمنی رائے، مجومدار، کھنہ اور لکھنؤ کے مقامی چترکار رنجیت، دفکر، کوشک، بشت، شیش رائے، مظفر احمد وغیرہ کی باتیں کرتے رہے۔ سریلزم، کیوب ازم، بنگال، کول، ماڈرن پینٹنگز اور دوسرے ایسے ہی جانے پہچانے اور انجان سے الفاظ رتنا کے کانوں سے ٹکراتے رہے۔ اسے ایسے معلوم ہوا کہ جیسے اس نے راکیش کو اتنی بڑی دنیا میں سے ڈھونڈ کر پھر کھو دیا ہو اور جیسے اس کو کھوتے ہوئے راکیش کو اس کی عزیز ترین سہیلی مالتی اپنے ساتھ کسی سنہری رتھ میں بٹھا کر بھاگ گئی ہو۔ جیسے وہ اس بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی ہو۔ بالکل تنہا۔ ان کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب رتنا ان کے پاس سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں گھومنے لگی اور پھر وہ کب ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا پہنچی۔ اسے مالتی پر رشک آرہا تھا۔ کاش وہ بھی کلاکار یا ادیب ہوتی۔

اچانک اس کی نگاہیں ہاتھی دانت کے ایک لیمپ کی طرف اٹھ گئیں۔ اتنا خوب صورت لیمپ اس نے آج تک نہ دیکھا تھا اور پھر اس کا دھیان کمرے میں پڑی دوسری چیزوں کی طرف گیا۔ بہت ہی خوبصورت فرنیچر، پردے اور قالین تھے لیکن اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے گھر کی ہر چیز اس بات کی منتظر تھی کہ کب کوئی جادو کی چھڑی ان کے پاس سے گزرے اور وہ اپنی گہری نیند سے بیدار ہو کر گھر کو اپنی موجودگی سے منور کر دیں۔

جب وہ ڈرائنگ روم میں واپس لوٹی تو راکیش اور مالتی ابھی تک آرٹ کی دنیا میں غرق تھے۔ باتوں باتوں میں اچانک راکیش نے اس سے پوچھا۔

"کیوں رتنا جی، آپ کو میرا گھر پسند آیا؟ پشپا کی موت کے بعد اس گھر کو دیکھنے والا ہی کوئی نہیں ہے!"

اور پھر اس نے بتایا کہ کس طرح چار سال پہلے پشپا اسے اس دنیا میں اکیلے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ رتنا نے ہمدردی کے کچھ الفاظ کہنے کے بعد کہا۔

"آپ کے ہاں تو اتنی خوبصورت چیزیں ہیں کہ بس دیکھتے رہنے کو ہی جی چاہتا ہے!"

مالتی نے ان باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سے اور پھر آرٹ کی بحث کو ایک نیا موڑ دیتے ہوئے کہا۔

"ہر زمانے کا آرٹ اس زمانے کے مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔ اگر آج کا آرٹسٹ سمبلز کا سہارا لینے پر مجبور ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ پچھلی علامتیں آج کی ضرورتوں کا مفہوم ادا نہیں کر سکتیں۔"

رتنا کو ایسا محسوس ہوا جیسے مالتی جان بوجھ کر راکیش کو واپس آرٹ کی دنیا میں لے جانا چاہتی تھی۔

"لیکن مالتی جی!" راکیش کہہ رہا تھا "آپ ایسے سمبلز تو نہ بنائیے جنھیں آپ کے علاوہ دوسرا آرٹسٹ بھی نہ سمجھ سکے۔ میں سمبلز کے خلاف نہیں لیکن نئے مفہوم ادا کرتے کرتے اگر معنوں کو اس قدر الجھا دیا جائے کہ ان کے سر پیر ہی کوئی نہ سمجھ سکے تو یہ سمبلزم کس کام کا!"

مالتی اپنے نظریے کے حق میں نہایت لمبی چوڑی دلیلیں پیش کرنا چاہتی تھی لیکن رتنا نے یاد دلایا کہ انھیں سیتا پور واپس لوٹنا تھا اور آخری بس کا وقت بھی نکلا جا رہا تھا۔

سیتا پور لوٹنے پر رتنا اور مالتی دونوں کو کچھ ایسا لگا ہو جیسے وہ لکھنؤ سے مکمل طور پر نہ لوٹی ہوں جیسے ان کے وجود کا کوئی نہ کوئی حصہ لکھنؤ میں ہی رہ گیا ہو۔ اب وہ دونوں بات کیے بنا چپ چاپ اپنی گفتگو کے کاموں میں لگی رہتیں جیسے وہ اپنے دل کی بات ایک دوسرے سے کہنے سے ڈرتی ہوں۔

کچھ دنوں بعد راکیش ان کے پاس آیا۔ مالتی نے اپنی نئی پینٹنگز دکھائیں جنھیں راکیش نے بہت سراہا۔ رتنا نے راکیش کے لیے اچھے اچھے کھانے تیار کیے اور جب شام کو وہ سب موم بتیوں کی روشنی میں ان کو کھانے کے لیے بیٹھے تو راکیش میز کی سجاوٹ، روشنی کی نفاست اور کھانوں کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکا۔

"رتنا جی، آپ تھوڑا سا وقت نکال کر میرے غریب خانے کی دیکھ بھال سنوارنے کا ذمہ اٹھا لیں تو غریب خانہ تاابد آپ کا ممنون رہے گا!"

راکیش نے خاص لکھنوی انداز میں رتنا کی تعریف کی۔

"اجی سرکار یہ بندی کی خوش قسمتی ہے کہ ناچیز کو ذرّہ سے آفتاب
بنا دیا۔" رتنا نے اسی لکھنوی انداز میں آداب بجا لاتے ہوئے کہا اور پھر
سب قہقہوں میں ڈوب گئے۔

چند روز بعد رتنا کو لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ رتنا ڈیہری کی گاڑی سے
اترتے ہی سیدھی راکیش کے ہاں گئی۔ راکیش دفتر میں تھا۔ نوکر نے کھول
دیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں اپنے ساتھ لایا ہوا ناول کھول کر پڑھنے لگی۔ دفعتاً
اسے محسوس ہوا جیسے کمرے میں رکھی ہوئی بے ترتیب چیزیں اس کی طرف
دیکھ دیکھ کر فریاد کر رہی ہوں۔ اسے راکیش کی فرمائش یاد آ گئی اور وہ چیزوں کو
نئی ترتیب دینے لگی۔

اس نے ڈرائنگ روم کے دو ایک پردے اتار کر بیڈ روم کے پردوں سے
تبدیل کر دیے تاکہ پردوں کے رنگ اس قرینے سے کھل اٹھیں۔ فرنیچر کی ترتیب
درہم برہم کر کے انھیں ایک نئے زاویے اور نئے انداز سے سجا دیا۔ دیواروں
پر لگی ہوئی تصویروں کو اس طرح تبدیل کر دیا کہ موضوع کے مطابق ٹھیک سے ان پر
روشنی پڑ سکے۔ کمرے میں چند گملے رکھوا دیے تاکہ ان میں ایک نئی تازگی آ
سکے۔ اسی دوران اس نے چائے کے لیے کچھ ضروری چیزیں بھی تیار کر لیں۔
وہ نوکر کی مدد سے ابھی کمرہ پوری طرح تیار بھی نہ کر پائی تھی کہ راکیش آ گیا۔
وہ کمرہ دیکھتے ہی یوں چونک اٹھا جیسے گھر کی ہر چیز پر ایک نکھار آ گیا ہو۔
رتنا اس وقت باتھ روم میں منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔

"بنسی!" راکیش نے نوکر سے پوچھا۔ "یہ سب کیا ہے؟"
"جی۔ وہ بی بی جی آئی ہیں نا سیتا پور سے۔ انھوں نے یہ سب کر دیا ہے۔
اب تو کمرہ اچھا لگ رہا ہے صاحب؟"
"اچھا۔ لیکن بی بی جی ہیں کہاں؟"
رتنا غسل خانے سے منہ ہاتھ دھو کر نئی ساڑھی پہنے کمرے میں داخل ہوئی
راکیش ایک لمحہ گم صم اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔
"ارے رتنا — تم"
رتنا ہلکی پیازی ساڑھی میں خوب کھل رہی تھی۔
"تم نے تو گھر کا نقشہ ہی بدل ڈالا"
"بنسی! صاحب کے لیے چائے لاؤ!"
رتنا نے گھر کی مالکن کے انداز میں بنسی سے کہا۔
چند ہی لمحوں میں چائے سامنے آ گئی تھی لیکن یہ چائے دفتر کی چائے
سے کتنی مختلف تھی۔
رتنا کو [illegible] ہوئے تکلف نے راکیش اور [illegible]

راکیش نے چائے کی بے حد تعریف کی۔
"اچھا راکیش، میں اب گھر جاؤں گی۔"
وہ لکھنؤ میں اپنی ایک سہیلی کے ہاں ٹھہری تھی۔ اس نے اپنی چھوٹی سی
اٹیچی اٹھا لی۔
"رتنی!"
رتنا نے پہلی بار راکیش کو اس بے تکلفی سے اپنا نام لیتے سنا۔ اس کے
سارے بدن میں جھرجھری سی آ گئی۔
"رتنی! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم... تم ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جاؤ"
اس کی آواز میں ایک التجا تھی۔ وہ دونوں ایک لمحہ ایک دوسرے کو
دیکھتے رہے۔ ایک لمحہ جس میں صدیاں بیت گئیں اور پھر رتنا بھاگ کر راکیش کے
سینے سے لگ گئی۔

اگلے روز صبح ہی ان کی شادی ہو گئی۔ اس شادی میں دو ایک دوستوں
کے سوا کوئی نہ تھا۔ رتنا نے چاہتے ہوئے بھی مالتی کو اطلاع نہ دی تھی اور پھر
اطلاع بھی کیسے دیتی۔ شام کو وہ ہنی مون کے لیے دارجیلنگ روانہ ہو گئے
کمرے کی کھلی کھڑکی میں آسمان کا نارنجی رنگ گہرے سرمئی سایوں
میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ کنچن جنگا اور دوسری چوٹیاں دھند کے بادلوں میں گم
ہو چکی تھیں مگر رتنا کے پیار کے دھندلکے اس کی حیات کا پتہ دے
رہے تھے۔

رتنا ابھی تک مالتی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ اسے شادی کی
اطلاع کیسے دے۔ وہ اسے کیونکر دے سکتی تھی کیونکہ اس خیال نے کہ وہ مالتی
کے چلے جانے کے بعد کس قدر اکیلی اور بے سہارا ہو جائے گی اسے اس بات
پر اکسایا تھا کہ وہ آگے بڑھ کر خود ہی راکیش کو جیت لے۔
مالتی میں حالات سے لڑنے کی اس سے کہیں زیادہ طاقت تھی۔
وہ ایک سہارا لے کر زندہ رہ سکتی تھی۔ اس کے ماں باپ زندہ تھے لیکن
رتنا اس سہارے کے بنا کیسے زندہ رہ سکتی تھی۔ شاید مالتی اس کو سمجھ پائے
گی —

شاید نہیں —
شاید کبھی نہیں —

کنچن جنگا کا پہاڑ ڈراؤنی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اسے ایسے
معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ تیزی سے پھیلتا چلا جا رہا ہو اور وہ ابھی اسے کچل
کر رکھ دے گا۔ وہ کھڑکی سے پیچھے ہٹنے لگی۔
دروازہ کھلا اور وہ داخل ہوتے ہوئے راکیش کے سینے سے
لپٹ کر لگ گئی۔
"آپ اتنی دیر کہاں چلے گئے تھے —"

نورین حفیظ

## روبینہ، راولپنڈی

س: میں اپنی مونچھوں کو بلیچ کرنا چاہتی ہوں۔ کسی کریم کا نام بتائیں اس کے علاوہ میرے چہرے پر تل بڑھتے جا رہے ہیں۔ کوئی علاج بتائیں۔ یہ بھی بتلیئے کہ ویکس کے استعمال سے بال دوگنے تو نہیں نکلتے۔

ج: مونچھوں کو بلیچ کرنے کے لیے ڈاکٹر ڈالیز کریم بیچ استعمال کریں تلوں کے لیے اسٹل بین فریکل کریم استعمال کر کے دیکھیں۔ دھوپ میں اور آگ کے قریب زیادہ نہ بیٹھا کریں۔ ویکس سے بال دوگنے نہیں نکلتے۔

## "ایک بہن" پشاور سے

ج: آپ نے لکھا ہے کہ آپ کا خط بھی شائع نہ کریں۔ نام بھی شائع کرنے سے منع کیا ہے۔ پھر کس طرح آپ کو جواب دیں۔ کوئی فرضی نام ہی لکھ دیا ہوتا۔ یوں بھی آپ نے اس قدر طویل خط لکھا ہے اور اتنے زیادہ سوالات پوچھے ہیں کہ ڈائجسٹ میں جواب دینا ناممکن ہے۔ آپ یوں کریں اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ بھیج دیں ہم آپ کو براہ راست جواب دے دیں گے۔

## شمائلہ، کراچی

س: میرے چہرے پر بے تحاشہ کیل اور پھنسیاں نکلتی ہیں جن کی وجہ سے میں بے حد پریشان ہوں۔ میں ان پھنسیوں کو کس طرح ختم کروں؟

ج: رات کو سونے سے قبل چہرے کو دھو کر خشک کر لیں اور پھر آرڈینا

ری کلینسنگ کریم لگائیں۔ جلد کی صفائی کا بھی خیال رکھا کریں۔ اپنا تولیہ بھی صاف ستھرا رکھیں۔ پھل اور سبزیاں کثرت سے کھائیں۔

## ناہید، کراچی

س: کلینزنگ ملک کو کب اور کس وقت استعمال کیا جاتا ہے۔؟

ج: کلینزنگ ملک جلد کی صفائی کی خاطر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے میک اپ کرنے سے پہلے یا میک اپ اتارتے وقت استعمال کیا جاتا ہے

## شہزادی یاسمین، راولپنڈی

س: میری پیشانی پر ہلکی ہلکی شکنیں نمودار ہو رہی ہیں۔ میں انہیں دور کرنا چاہتی ہوں۔

ج: روزانہ کولڈ کریم کے ساتھ اپنی پیشانی پر مالش کیا کریں۔ مالش نیچے اوپر کی جانب ہونی چاہیے۔ یہ مالش صبح شام کسی وقت کر سکتی ہیں

## غزالہ، ملتان

س: مجھے چہرے کی رنگت نکھارنے کا کوئی طریقہ بتائیں۔ یہ بھی بتایئے میک اپ کرنے کا کیا طریقہ ہے؟۔

ج: رات کو سونے سے قبل منہ دھو لیں پھر بالائی اور لیموں ملا کر چہرے پر ملا کریں۔ صبح اٹھ کر چہرہ کسی اچھی قسم کے صابن کے ساتھ دھو ڈالا کریں۔ چند ہی دنوں میں رنگ صاف ہو جائے گا اور جلد بھی نرم ہو جائے گی۔

میک اپ سے پہلے چہرے کی کلینزنگ کر لیا کریں۔ اگر ہو سکے تو کولڈ کریم سے چہرے کا مساج بھی کر لیا کریں۔

سب سے پہلے چہرے پر فاؤنڈیشن لگائیں۔ جلد چکنی ہے تو اسی شیڈ کا پاؤڈر بھی لگائیں پھر آئی میک اپ کریں۔ آنکھوں

کا میک اپ جوڑوں کی تہریوں تک کیا جاتا ہے۔ آئی میک اپ میں سب سے پہلے آئی شیڈ لگایا جاتا ہے۔ آئی شیڈ لگاتے وقت اپنے لباس کے رنگ کو مد نظر رکھیں۔ پھر مسکارا لگائیں، اس کے بعد آئی لائنر کی باری ہے پھر اپنی بھنوؤں کو برش کریں اور آئی برو پنسل کی مدد سے انھیں رنگیں۔ پھر بلش اون لگائیں اور سب سے آخر میں لپ اسٹک لگائیں۔

## نادیہ، ملتان

ج: پیاری بہن آپ اپنا ایڈریس لکھا ہوا جوابی لفافہ بھیج دیں۔ ہم آپ کو مشورہ براہ راست ہی دے سکیں گے۔ انشا اللہ بہت جلد۔ ویسے آپ کی تسلی کے لیے فی الحال اتنا عرض کر دوں کہ یہ پریشانی والی بات نہیں۔

## جبین گل، کوہاٹ

س: میرے چہرے پر بچپن سے چھپک کے داغ ہیں۔ ایسا کوئی نسخہ بتائیں جس سے یہ داغ دور ہو جائیں اور میرا رنگ بھی نکھر جائے۔

ج: ابھی بہن یہ داغ تو دور نہ ہو سکیں گے۔ البتہ رنگ ضرور نکھارا جا سکتا ہے۔ آپ یوں کریں کہ سنگترے کے چھلکے سکھا کر پیس لیں۔ دو کپ مسور کی دال لیں اور اسے دو کپ کھولتے ہوئے دودھ میں ڈبو دیں۔ جب دال دودھ جذب کر لے تو سلتے میں پھیلا کر سکھا دیں۔ کچھ روز بعد وہ بالکل سوکھ جائے تو اسے باریک پیس کر پسے ہوئے چھلکوں میں ملا کر رکھ دیں۔ رات کو سونے سے قبل تھوڑا سا مسالہ دودھ میں ملا کر کریم سی بنائیں اور چہرے پر مل کر سو جائیں۔ صبح کسی اچھے صابن کے ساتھ دھو ڈالیں۔ دن میں ایک مرتبہ لیموں بھی چہرے پر رگڑ کر ملا کریں۔ جب سوکھ جائے تو دھو ڈالیں۔

اس کے علاوہ اپنی غذا کا خاص طور سے خیال رکھیں پھل سبزیاں، دودھ وغیرہ کا استعمال بڑھا دیں۔ تیز چائے نہ پیا کریں۔

## پروین، کراچی

ج: آپ نے مرض کی پوری تفصیل تو لکھی نہیں ورنہ ڈاکٹر یا حکیم سے ضرور مشورہ کرتی۔ اگر اب بھی مشورے کی ضرورت ہو تو دوبارہ خط لکھیں۔

## احمد عرفان، گوجرانوالہ

ج: بالوں میں جو کریم استعمال کر رہے ہیں وہ کرتے رہیے۔ نہانے سے پہلے کسی بھی تیل کے ساتھ آپ مساج کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ تیل خالص ہو۔ اور بازاری نہ ہو۔ ناریل کا تیل استعمال کر لیں۔ آپ کے بال کبھی پتلے نہیں ہو سکتے۔

صبح شام ورزش کیا کریں۔ روزانہ ایک گلاس دودھ میں SANATOGEN ملا کر پئیں۔ ویٹ بھی اٹھایا کریں۔ کھانے میں پھل اور سبزیاں زیادہ مقدار میں شامل کریں۔ سبزیاں کچی کھائیں تو اور بھی اچھا ہے۔ دودھ، انڈا، مچھلی، گوشت وغیرہ خوب کھائیں۔ صبح شام کچھ دیر کھلی ہوا میں لمبے لمبے سانس لیا کریں۔ کتابیں اچھی قسم کی پڑھا کریں۔

## سلمیٰ کنول، نگہت، لائلپور

ج: چہرے کے داغ دھبے دور کرنے کے لیے اور دانوں کو ختم کرنے کے لیے دوا بذریعہ وی پی بھیج دیں گے۔ اپنا مکمل پتہ فوراً بھیج دیں۔

## محمد شفیع، پشاور کینٹ

س: میرے بال کافی گر چکے ہیں۔ اگر آپ نے کوئی تیل تیار کر رکھا ہو یا کوئی بازاری تیل جو آپ کا پرکھا ہوا ہو مجھے بذریعہ وی پی بھیج دیں۔

ج: اگست کے شمارے میں "نگہت حسین" کو تیل بنانے کی ترکیب بتائی ہے آپ بھی وہی تیل اپنے گھر میں تیار کر والیجئے۔ یہ تیل ہر دوسرے روز رات کو سونے سے قبل سر میں اچھی طرح جذب کر لیا کریں اور صبح اٹھ کر کسی اچھے سے شیمپو کے ساتھ سر دھو ڈالیں۔

## نزہت حسین، کراچی

ج: پسے ہوئے نمک کو سرسوں کے تیل میں ملا کر دانتوں پر ملا کریں۔ کھانے میں وٹامن "د" اور کیلشیم کا اضافہ کر دیں۔

## بشریٰ ناز، پشاور

ج: آپ روزانہ اصلی شہد کو نیم گرم پانی میں گھول کر نہار منہ پیا کریں

ان چیزوں میں جن میں (CHO) کاربوہائیڈریٹس اور فیٹس ہوں استعمال میں لائیں۔

## مسز ابرار حسین، کراچی

ج : محترمہ! آپ پلکوں پر زیتون کا تیل اور کسٹر آئل ملا کر لگایا کریں۔ کوئی حرج نہیں۔ سر کے بالوں میں استمدی تیل وغیرہ استعمال کریں۔ سر دھونے کے لیے اتنا تیز صابن استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آئندہ ایسا کوئی صابن استعمال نہ کیجیے گا۔ اگر ہو سکے تو ریٹھے سے سر دھوئیں یا پھر آملے اور ہرڑ کو ساری رات پانی میں بھگو کر صبح جوش دے کر اس پانی سے سر دھوئیں۔

## نسیم جہاں، ملتان

ج : آپ چنبیلی کا تیل اور لیموں کا رس بیسن میں شامل کر کے کریم سی بنا لیں اور روزانہ اس کریم کو بازوؤں پر ملا کریں۔ ضرور فائدہ ہوگا۔

## سلمیٰ یوسفی، گوجرانوالہ

ج : اپنے بالوں کو روزانہ مت دھویا کریں۔ ہفتے میں چار مرتبہ دھونا کافی ہے۔ سر میں زیتون کا تیل لگایا کریں۔
قبض کے لیے کسی ڈاکٹر سے بھی مشورہ کریں۔ رات کو دودھ میں ایک چمچہ روغنِ بادام ملا کر پئیں۔ اس کے علاوہ سبز پتوں والی سبزیاں اور پھل بکثرت استعمال کریں۔ قبض دور کرنے میں فائدہ مند ثابت ہوں گی۔

## فاخری، پشاور

ج : کھانے کے بعد درد کی وجہ گیسٹر یا پیٹ کی خرابی ہی ہو سکتی ہے آپ فوراً کسی ڈاکٹر سے مشورہ کریں اور مکمل علاج کرائیں۔



## صبیحہ سلطانہ، کراچی

ج : محمد شفیع صاحب کو جو مشورہ دیا ہے اسی پر آپ بھی عمل کریں۔ پلکوں کے لیے کسٹر آئل خالص ہو تو بہتر ہے۔ یہ آنکھوں میں چلا جائے تو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

## ستارا جمیل، حیدر آباد

میرے چہرے پر برص کے داغ ہیں جس کی وجہ سے میں شدید احساسِ کمتری کا شکار ہو گئی ہوں کیا آپ کسی ایسے معالج کا پتہ دے سکتی ہیں جو اس مرض سے مجھے نجات دلادے بے حد مشکور رہوں گی۔

ج : ستارا آپ اپنے علاج کے سلسلے میں محمد نواز صاحب سے رجوع کریں۔ محمد نواز صاحب قیصر سینما کراچی کے مینیجر ہیں۔

## فاطمہ رشید، کراچی

ج : آپ پلاسٹک سرجری کے لیے سول ہسپتال سے معلومات حاصل کر سکتی ہے۔

## مسرت حیات، لاہور

ج : مینی کیور کے لیے آپ کو مندرجہ ذیل چیزوں کی ضرورت ہوگی
(BUFFER) بفر
ایمری بورڈ (EMERY BOARD)
(ORANGE STICK) اورنج اسٹک
(NAIL BRUSH) نیل برش
(CUTICLE CUTTER) کیوٹی کل کٹر
(CUTICLE REMOVER) کیوٹی کل ریمور
(NAIL POLISH REMOVER) نیل پالش ریمور
(HAND CREAM) ہینڈ کریم

## فاطمہ شہناز، راولپنڈی

س : باجی چہرے پر مساج کرنے کا کیا طریقہ ہے؟
ج : کلینزنگ کریم کے ساتھ ٹھوڑی تک پیشانی، رخسار پر نقطے لگائیں مگر ناک کے حصے کی کریم انگلیوں پر لگی رہنے دیں۔
چہرے میں پہلے گردن کا مساج کیا جاتا ہے اور یہ بے حد

ضروری ہے۔ گردن پر مساج نیچے سے اوپر کی جانب کیا جاتا ہے یعنی ہاتھوں کی حرکت نیچے سے اوپر کی جانب ہوگی۔ نیچے سے اوپر تقریباً چھ دس بار جائیں۔ پھر چہرے کی تمام کریم پھیلا دیں اور چہرے کا مساج شروع کریں۔

ٹھوڑی کے نچلے حصے سے جبڑوں پر سے ہوتے ہوئے کانوں کے نیچے تک چلی جائیں یہ عمل سات بار کریں۔

پھر ٹھوڑی کے اوپری حصے سے مساج شروع کریں اور کانوں کے نچلے حصے تک لے جائیں۔ اب ناک کے نتھنوں کے پاس سے شروع کریں اور رخسار کی ہڈی کے نیچے سے ہوتے ہوئے ہلکا سا دباؤ دے کر کنپٹی تک لے جائیں۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک وقت میں ایک سی حرکت کریں یہ عمل تین بار کریں۔

اب ناک کے نتھنوں کے قریب سے ہاتھوں کی پہلی دو انگلیوں سے اوپر کی طرف یعنی ناک کی دونوں سائیڈوں پر آئیں مڑیں اور پھر دوسری انگلی کو ناک کی سائیڈوں پر گول گھمائیں۔ چار بار یہ عمل کریں۔

دونوں ہاتھوں کی دوسری انگلی کو آنکھوں کے گرد دائرے کی شکل میں گھمائیں۔ اس طرح کہ یہ دائرہ آہستہ آہستہ پھیلتا ہے آنکھ کے کنارے پر ناک کے قریب تھوڑا سا رکنا پڑے، پھر گھمائیں پھر رکیں، یہ دائرہ جب آہستہ آہستہ پھیل کر ختم ہونے لگے تو پیشانی پر آجائیں۔ پیشانی پر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں نیچے سے اوپر کی طرف لائیں اور پھر کنپٹیوں کی طرف مڑ جائیں۔ یہ عمل تین بار کریں۔

ناک پر ایک ہاتھ سے اوپر سے نیچے کی طرف مساج کریں۔ اس جگہ انگلیوں کی پوروں سے مساج کیا جاتا ہے۔

اب رخساروں پر کچھ دیر تھپکیاں دیں۔

آخر میں چہرے پر انگلیاں دوڑائیے اور پھر کسی نرم سے ٹشو پیپر کے ساتھ چہرہ پونچھ لیں۔

**سعید قریشی، لائلپور**

س: میری عمر ۱۸ سال ہے۔ میٹرک کا طالب علم ہوں۔ جب پڑھنے بیٹھتا ہوں تو چکر آنے لگتے ہیں، سر درد ہونے لگتا ہے اور آنکھوں میں پانی آجاتا ہے۔

ج: آپ اپنی نظر ٹیسٹ کرائیں۔

## صبح

نہ جانے تری کیسی ادا یاد آئی
ستارے سے مہکی چاندنی نکھر آئی
تصور میں اکثر سے آنسوؤں سے
تمہیں شام غم کی کہانی سنائی
نہ جانے شب وصل کیا بات تھی وہ
دل سے جو نکلی ہونٹ تک نہ آئی
ہوا سے سنا جب تم زندگی سے
غم عشق نے بار بار مات کھائی
وہ ہے راشدہ رہگزر آندھیوں کی
جہاں ہم نے شمع محبت جلائی

راشدہ ناہید ملک

# دوشیزہ ادبی معمے ۲ کے شاندار اور غیر معمولی نتائج

## تاریخ میں توسیع کی گئی تو انعامی رقم بھی بڑھا دی گئی

## 53,000 کی بجائے 65,500 روپے کے انعامات تقسیم کئے جا رہے ہیں

# دُرست حل صرف ایک نکلا

**پہلا انعام 30000 کی بجائے 40000 روپے ادا کیا جائے گا،**

انعام کی ادائیگی ۸ ستمبر ۷۵ء کو شام کے ۶ بجے دفتر دوشیزہ میں "بینک ڈرافٹ" کے ذریعے کی جائے گی،

صحیح حل دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۳

| شمار | صحیح حل | کتاب یا رسالہ | مصنف یا مترجم | صفحہ |
|---|---|---|---|---|
| ۱ | عورت | مجنوں کی ڈائری | قاضی عبدالغفار | ۲۹ |
| ۲ | مطالب | مجنوں کی ڈائری | قاضی عبدالغفار | ۷ |
| ۳ | انتشار | تیسرا آدمی | شوکت صدیقی | ۳۲ |
| ۴ | دُھل | گریز | عزیز احمد | ۳۱۶ |
| ۵ | بادشاہ | گلی کوچے | انتظار حسین | ۹۴ |
| ۶ | دامن | سُرخ فیتہ | قدرت اللہ شہاب | ۸۱ |
| ۷ | دھوکے | رقصِ شرر کے بعد | تسلیم سلیم چھتاری | ۲۲۵ |
| ۸ | پتھر | برسات کے دن برسات کی راتیں | انتصار حسین | ۱۳۸ |
| ۹ | حدود | گریز | عزیز احمد | ۳۲۳ |

دوسرا انعام ۱۲,۵۰۰ کی بجائے ۱۴,۰۰۰ روپے

تیسرا انعام ۱۰,۵۰۰ کی بجائے ۱۱,۵۰۰ روپے

ایک غلطی پر ۱۰۲ روپے ۹۴ پیسے فی کس

دو غلطیوں پر ۲۲ روپے ۳ پیسے فی کس

ایک اور دو غلطیوں کے انعامات ارسال کر دیئے گئے،

**امیر بیگم صاحبہ 4/AVB انگارہ گوٹھ لیاقت آباد کراچی نے بالکل دُرست حل بھیج کر پہلا انعام ۴۰,۰۰۰ روپے حاصل کیا۔**

ایک غلطی والے ۳۶ حل موصول ہوئے جن پر دوسرا انعام ۱۴ ہزار روپے حسبِ مبلغ ۱۰۲ روپے ۹۴ پیسے فی حل دیا گیا۔

اعجاز حسین لاہور۔ آنسہ طلعت کراچی۔ مسعود حسین حیدرآباد۔ اللہ بخش ٹھٹھہ۔ خدا بخش ٹھٹھہ۔ رسول بخش ٹھٹھہ۔ غلام رسول بدین۔ ڈاکٹر حسین کوٹری۔ محمد سلطان لالہ موسیٰ۔ غفار خان پنڈی۔ ولی محمد لاہور۔ یاسین شیخ سولت۔ تبسم جہاں کوئٹہ۔ رحیم جان کوئٹہ۔ عبدالحمید لاہور۔ جعفر حسین اوکاڑہ۔ مناسیاں اسلام آباد۔ نذیر شاہ حیدرآباد۔ مظہر جمیل ایبٹ آباد۔ محمد اشرف گجرات۔ مزمل حسین ڈیرہ غازی خان۔ عادل رشید جھنگ۔ یعقوب بٹ جہلم۔ شاہ محمد راولپنڈی۔ سہیل اختر آزاد کشمیر۔ فصیح الدین شیخوپورہ۔ محمد کمال پاشا مانسہرہ۔ طاہر محمود پشاور۔ خورشید نسیم سکھر۔ حبیب احمد جیکس آباد۔ عزیز احمد سیالکوٹ۔ ارشد بشیر نواب شاہ۔ نگہت سلطانہ کراچی۔ طلعت سلطانہ کراچی۔ سائرہ علی کراچی۔ شمیم حسین بہاول نگر۔ محمد سراج پاکپتن۔ انوری بیگم شاہدرہ۔ نزہت پروین ملتان۔ امین الدین مری۔ واحد حسین کراچی۔ علی اکرم گجرات۔ متین خان اوکاڑہ۔ نذیر احمد فورٹ سنڈیمن۔ کمال احمد خانیوال۔ سلیم قریشی واہ کینٹ۔ نواب خان ساہیوال

عبدالرب وہاڑی۔ سمیع خان جیکب آباد۔ شائستہ کمال لاڑکانہ۔ ندیم محمد برکت
حیدرآباد۔ الطاف حسین کیمبل پور۔ شاکر راولپنڈی۔ سرور خان پشاور۔ نواب علی
سرگودھا۔ تحسین اختر عارف والا۔ نیاز محمد واہ کینٹ۔ محمد اقبال خان ہزارہ۔
محمد اسحاق ہزارہ۔ مجیب الرحمٰن ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ قدسیہ ایبٹ آباد۔ نہال عبداللہ
شکارپور۔ عبدالوحید میرپور خاص۔ محمد الیاس خیرپور۔ حامد خان مدوجڑی۔ نور
علی لاہور۔ اشفاق علی سکھر۔ عبدالستار میانوالی۔ محمد وزیر جھنگ۔ عنایت حسین
خان پور۔ طاہرہ مردان۔ قیصر حسین منڈی حاصل پور۔ جاوید میاں بستی۔
شارق سمیع حیدرآباد۔ طارق محمود لاہور۔ مجیب عالم ایبٹ آباد۔ عبدالقوی
ڈیرہ اسمٰعیل خان۔ نور محمد بہاولپور۔ سعید اختر ڈیرہ نواب۔ محمد علی چیچہ وطنی
فخرالدین کراچی۔ رئیس عالم کوہاٹ۔ محمد اسحٰق چنیوٹ۔ یاسمین اختر کراچی۔ طاہر
بیگ حیدرآباد۔ شاہد بیگ حیدرآباد۔ کلثوم باقی دادو۔ وقار عظیم جھنگ۔
اللہ یار خان گھوٹکی۔ شکیل عالم احمد پور شرقیہ۔ احمد علی گوجرانوالہ۔ محمد مجتبیٰ لیاقت
پور۔ کریم سلطان ہمانیاں۔ فریدہ خاتون کراچی۔ نجمہ محمد حیدرآباد۔ ولی جان ٹنڈو
در محمد خیرپور۔ علی نواز نواب شاہ۔ خالد بٹ لاہور۔ اکرم خان پشاور۔ ظفر علی
راولپنڈی۔ شاہ حسین ملتان۔ یار محمد سیہون شریف۔ نعمان خان مردان۔ کیلی
سرگودھا۔ عثمان خان کراچی۔ محمد ابراہیم کراچی۔ یعقوب ناجی لاہور۔ محمد شفیع
جام شورو۔ عبدالرشید لائل پور۔ غلام علی قصور۔ رسول بخش احمد پور شرقیہ۔
نسیم بیگم کراچی۔ نگار سلطانہ کراچی۔ شاہ جی ٹھٹھہ۔ شریف الدین آزاد کشمیر۔ ظہور عالم
مظفر گڑھ۔ مشتاق احمد لاہور۔ خلیل تیمور گوجر خان۔ لیاقت حسین کراچی۔ خالد سعید
کراچی۔ سلوت سعید کراچی۔ سعید لودھی کراچی۔ عبدالقدوس چوہدری لاہور۔
علی نواز حیدرآباد۔ فرزانہ نذیر سکھر۔ شمع ناز کراچی۔ محبوب بخش کوٹڑی۔ رفیق نیاز
بہاولپور۔ تحسین احمد پشاور۔ سائرہ کراچی۔ افتخار غازی لاہور۔ نسیم اختر
راولپنڈی۔ فرخ مراد حیدرآباد۔ علی نواز مگسی سکھر۔ نذیر شاہ کالا باغ۔

●●●

دوشیزہ ... ۲۲ کا حل ... قرعہ اندازی ... بحساب مبلغ ۲۲ روپے ... حل دیا گیا۔

ثمر حیات سیال جھنگ۔ عطاءاللہ عارف والا۔ خلیل احمد لاہور۔
جہانگیر بٹ لاہور۔ مغل شاہ راولپنڈی۔ محمد سرور راولپنڈی۔ اسلام الدین خیرپور۔
معین الدین خیرپور۔ جمال احمد حیدرآباد۔ مہربان خان ہزارہ۔ قربان خان ہزارہ۔
شکیل بروہی حیدرآباد۔ ایم سمیع جمال کراچی۔ محمد اسلم کراچی۔ بےبی افشاں پروین
کراچی۔ عبدالرحمٰن بھوپالی کراچی۔ مقبول الٰہی اوکاڑہ۔ میر رضا خان راولپنڈی۔
ایم عاصم حیدرآباد۔ اجمل خان نوشہرہ۔ شوکت جمیل راولپنڈی۔ فیروز الدین
لاہور۔ محمد الیاس کراچی۔ سمیع اللہ خان پور۔ محمد ہارون حیدرآباد۔ محمد حسان
جلال آباد۔ محمد اشرف منڈی حاصل پور۔ اقبال رضوی کراچی۔ چاند اورنگ زیب
لائل پور۔ سکندر خان ملتان۔ عبدالرؤف ڈیرہ غازی خان۔ لے سبحان لاہور۔
نرگس خاتون ملتان۔ طفیل محمد سکھر۔ ماہ جبیں کراچی۔ اورنگ زیب میرپور۔
ارشاد احمد لاہور۔ ناز بیگم خیرپور۔ ولایت خان کوئٹہ۔ برکت خان کوئٹہ۔
مرتضیٰ حسین سکھر۔ نجمہ محبوب پشاور۔ نگہت کبیر گھوٹکی۔ صفدر عباس مردان۔
یاسمین کھتری کراچی۔ نوشاد حسین خیرپور۔ بیگم عزیز لاڑکانہ۔ سید علی لائل پور۔
عامر بیگ ملتان۔ عاقل رضوی لاہور۔ افسر علی کراچی۔ نثار کاظمی حیدرآباد۔
فیض احمد کوئٹہ۔ اقتدار حسین پشاور۔ غلام نبی ساہیوال۔ چوہدری
محمد حسین بنوں۔ محمد عثمان کراچی۔ سمیع خان کراچی۔ سعید احمد خیرپور۔ نوشابہ بیگم
لاہور۔ نائلہ چوہدری لائل پور۔ روشن آرا نواب شاہ۔ ضیاءاللہ ڈیرہ غازی خان۔
محمد مقصود خان میرپور خاص۔ شمس خان کوئٹہ۔ ابرار حسین بستی۔ غلام نبی میمن کراچی۔
پروین بیگم کراچی۔ سلامت علی لاہور۔ منور حسین راولپنڈی۔ نواب الدین بہاولپور۔
فریدہ احمد لاشاری جیکب آباد۔ مہ جبیں مردان۔ قادر بخش شکارپور۔ عثمان بلوچ
رحیم یار خان۔ علی احمد سومرو دادو۔ ناہید ناز حیدرآباد۔ نسرین خانم حیدرآباد۔
رابعہ گوہر سکھر۔ زرینہ کراچی۔ روبینہ کراچی۔ احمد چوہان لاہور۔ شاہ نواز
کوٹڑی۔ اقبال انصاری سیالکوٹ۔ عمیر لودھی نواب شاہ۔ فرح لودھی
نواب شاہ۔ واجد علی نوشہرہ۔ ظہور علی ایبٹ آباد۔ خلیق الزماں ٹنڈو آدم۔
حمید زماں ٹنڈو آدم۔ اظہر حسین لاہور۔ رحمت نسیم جھنگ۔ دلاور خان شہداد پور۔
آسیہ صفدر لائل پور۔ عنایت اللہ جیکب آباد۔ نصرت ہاشمی سانگھڑ۔ عزت حسین
کراچی۔ مجاز حسین کراچی۔ نادرہ خاتون ملتان۔ غمشاد بیگ لاڑکانہ۔
نیلوفر قریشی بہاولپور۔ فرحت رضوی کوئٹہ۔ شمس زبیر شیخوپورہ۔ سلیمان حیدر
شاہدرہ۔ شیخ حیات راولپنڈی۔ غلام حسین شاہ کیمبل پور۔ محمد طفیل ایبٹ آباد۔
رانا محمود پاکپتن۔ یاور علی اسلام آباد۔ واجد علی اسلام آباد۔ میر محمد خان
حیدرآباد۔ محمد حنیف گجرات۔ ظہور عالم میانوالی۔ باقر حسین مردان۔ محمد کلیم
احمد پور شرقیہ۔ بختو خان گوجرانوالہ۔ عزالسعید کراچی۔ زاہدہ سلطانہ
عنبر جبیں چیچہ وطنی۔ نصیر چوہدری چکوال۔ محمد یونس کوہاٹ۔ بشیر احمد ٹھٹھہ۔
رخسانہ پروین بہاول نگر۔ فرزانہ پروین بہاول نگر۔ عمران شہزاد ملتان۔
ذاکر علی حضرو۔ ثمینہ کھاریاں۔ ظفر پرویز سیالکوٹ۔ غلام علی جہلم۔ نور محمد
احمد پور شرقیہ۔ شبیر خان کوئٹہ۔ عبدالقدوس چوہدری لاہور (دو حل)۔
شفیع محمد کراچی۔ آفتاب احمد سکھر۔ بشیر عالم لاہور۔ محمد سعید ... جنید تقوی
راولپنڈی۔ شگفتہ رانی سوات۔ فرزند علی ایبٹ آباد۔ پیارے خان حیدرآباد

ثناء اللہ سکھر۔ شہاب علی کراچی۔ قدسیہ باقری۔ سلیم جہانیاں منڈی۔ عطاء اللہ
جہلم۔ اقبال احمد۔ منیر پور۔ پروین بیگم کراچی۔ جاوید مجاہد حیدرآباد۔ تحسین اختر
شیخوپورہ۔ مہدی میانوالی۔ ناظم خان خانپور۔ محمد سلیم اسلام آباد۔
ولی محمد عبداللہ ڈیرہ غازی خان۔ اقبال بیگ لاہور۔ ندیم قادری میانوالی۔
نیاز محمد لاہور۔ کمال حسن اٹک۔ منظور نیازی میانوالی۔ قاضی مجید کراچی۔
عفت آرا حیدرآباد۔ نسیم شیخ لاہور۔ راشد سلطان کراچی۔ فدا حسین
راولپنڈی۔ مہتاب رضوی گجرات۔ ارشاد علی راولپنڈی۔ الیاس الاکوڑی
صابرہ نعیم جہانیاں۔ محمد یوسف ملتان۔ منشاد خان لاہور۔ رشید ملک۔ شگفتہ
راحیلہ خاتون منڈی آدم۔ فرحانہ قریشی پشاور۔ صدیق علی خان شہداد پور۔ افتخار
حسین منڈی حاصل پور۔ محمد ریاض حسن ابدال۔ الطاف حسین سرگودھا۔
رحیم گل پشاور۔ آفتاب گل پشاور۔ مہر گل پشاور۔ دلشاد پٹھانہ ٹوبہ ٹیک سنگھ۔
عبدالوحید نکسی کوٹری۔ شہنشاہ حسین راولپنڈی۔ شاہد رضوی بہاولنگر۔
ریاض زیدی لطیف آباد۔ عشرت بیگ خانیوال۔ شریف احمد خیرپور۔ یوسف
خان گوجرانوالہ۔ رشیدہ یاسمین کوئٹہ۔ بشیر حسین صادق آباد۔ شابت علی
ٹھٹھہ۔ افضال حسین خیرپور۔ انسر علی ملاہ ملی۔ محمد نسیم ملتان۔ لال خان
کوئٹہ۔ جاوید حسین لائل پور۔ شاہین رفیق اوکاڑہ۔ حامد علی بہاولپور۔
رفیق نواز سکھر۔ ظفر محمود ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محبوب مرزا حیدرآباد۔ واثق الظفر
نیاز محمد شاہدرہ۔ خوار عباس راولپنڈی۔ حسین احمد کراچی۔ تمیس احمد کراچی۔
ذکی احمد کراچی۔ محمد منیر لاہور۔ لیاقت حسین شیخوپورہ۔ آصف علی کراچی۔
شجاعت علی کراچی۔ رحمت علی کراچی۔ منور بیگم سوات۔ عزیز انور گھوٹکی۔
عبدالشکور ملتان۔ فیض احمد پشاور۔ محمد عارف گجرات۔ حسن عسکری کامرہ۔
بلقیس جمیل حیدرآباد۔ جمیل الدین میرپور خاص۔ ملک رشید بہاولپور۔
فخر الدین سرگودھا۔ مطلوب حسین ٹھٹھہ۔ جمیلہ خاتون کراچی۔ ذوالفقار
راولپنڈی۔ قادری بلوچ جیکب آباد۔ حیدر بخش کوٹری۔ سرائو خان پشاور۔
رفیق احمد سانگھڑ۔ شفیق اختر ایبٹ آباد۔ سرفراز ملک اوکاڑہ۔ محمد عمر کوئٹہ۔
میانوالی۔ عزیز میاں چشتیاں۔ جمیل اختر کراچی۔ شکیل اختر کراچی۔
مشتاق احمد کراچی۔ آفاق احمد کراچی۔ محمد طارق شیخوپورہ۔ عطا محمد راولپنڈی۔
مقبول جمال اسلام آباد۔ عبدالصمد جہلم۔ فرحت آرا لائل پور۔ شاہد کاظمی لاڑکانہ۔
مظاہر حسین خیرپور۔ شریف الدین میانوالی۔ نکہت سلطانہ کراچی۔ ناہید
سلطانہ کراچی۔ شرافت اللہ کراچی۔ شفاعت خان واہ کینٹ۔ ولایت علی
سرگودھا۔ علی احمد جہلم۔ محمد سلیمان پشاور۔ معراج رشید سیالکوٹ۔
ہاشم رضا جھنگ۔ اخلاق احمد میانوالی۔ ولی محمد لاہور۔ حبیب الرحمٰن
لاہور۔ خورشید عالم کوئٹہ۔ کامران زیدی راولپنڈی۔ عقیل خیرپور۔
مسعود شاہ حیدرآباد۔ منظر عالم جہلم۔ وقار محمد برکت حیدرآباد۔ ادریس علی

شمیم مشتاق کراچی۔ تسلیم اختر کراچی۔ تنویر حسین احمد پور شرقیہ۔ صابر علی
سیالکوٹ۔ لطیف صدیقی کبیر والا۔ انوار احمد خان پاک پتن۔ خالد تبسم
ساہیوال۔ تنویر سلطانہ شیخوپورہ۔ مرزا محمد دہلوی۔ کاظم حسین لاہور۔ طاہرہ
ملتان۔ فیروز خان حیدرآباد۔ محمد سلیم لاہور۔ احمد دین سکھر۔ خورشید اکرم
بہاولنگر۔ جان خان منڈی بہاؤالدین۔ مجید انصاری منڈی بہاؤالدین۔
محمد ایوب مانسہرہ۔ الطاف قریشی لائل پور۔ شاہد جمال راولپنڈی۔ کاوش
حیدرآباد۔ حق نواز جمشید واہ کینٹ۔ طاہر بیگ خیرپور۔ عزیزہ بیگم ملتان۔ مجید
محبوب جھنگ۔ محمد نواز خان ہزارہ۔ احمد خان ہزارہ۔ گل خان ہزارہ۔
غلام ربانی خانپور۔ جاوید فاضل سیالکوٹ۔ سرفراز حسین میرپور خاص۔
مقبول احمد لاہور۔ فیاض علی کراچی۔ فراست خان سکھر۔ شہزادہ بیگ
پشاور۔ نظام الدین ایبٹ آباد۔ کریم شہاب لاڑکانہ۔ سجاد احمد کھاریاں۔
باقر علی گجرات۔ حشمت بیگ ملتان۔ سلطان بیگم احمد پور شرقیہ۔ فصیح انجم
سوات۔ تاج بلوچ سکھر۔ بلقیس اختر ڈیرہ غازی خان۔ افشاں سعید
سیالکوٹ۔ طالب کنڈیارو۔ محمد رفیع پشاور۔ حسن نواب میرپور خاص۔
سرکار احمد لاہور۔ یوسف غازی راولپنڈی۔ عالیہ جعفری کراچی۔ اشتیاق بیگ
صادق آباد۔ جمیلہ بیگم جہلم۔ فاطمہ خانم ملتان۔ شہناز بیگم پشاور۔ صابر حسین
مردان۔ افتخار احمد ڈیرہ اسمٰعیل خان۔ کریم داد خانپور۔ انور کمال ملتان۔
صفیہ احمد کراچی۔ نسیم احمد کراچی۔ حسن علی کراچی۔ تصور خانم لاہور۔ ممتاز بخاری
کوہاٹ۔ شیراز احمد واہ کینٹ۔ اے۔ جی۔ کاردار۔ لاہور۔ سرفراز صدیقی۔
پشاور۔ عبدالغنی حیدرآباد۔ محمود خان سکرنڈ۔ معراج الدین کوئٹہ۔ قمر النساء
کوٹ لکھپت۔ ستار حسین سرگودھا۔ محمد اسمٰعیل جہلم۔ محمد خلیل کراچی۔ کامران
مرزا لاہور۔ انیس کاظمی راولپنڈی۔ محمد ادریس ملتان۔ رحمان شاہ حیدرآباد۔
سلطان احمد خیرپور۔ حسن رضوی میرپور خاص۔ غلام نبی اثیر لاہور۔ (ادریس علی)
انیلہ خاتون کراچی۔ درخشندہ جمال ملتان۔ عشرت آرا خیرپور۔ عبدالرحمٰن
بنوں۔ ہاشم خان ہزارہ۔ نور جہاں بیگم کراچی۔ قاضی حامد علی بدین۔ اختر
بیگ لائل پور۔ رحیم جان سوات۔ دلاور حسین لورالائی۔ غلام دین کوہاٹ۔
امام دین کوہاٹ۔ فرقان رباب قصور۔ رحمان رباب قصور۔ علیم الدین لاہور۔
ظہور جمال کراچی۔ اکرم علی خیرپور۔ کرم دین احمد پور شرقیہ۔ منصور علی کوہاٹ۔
نوشابہ شریف ایبٹ آباد۔ عزیزہ بیگم ڈیرہ غازی خان۔ عنایت اللہ سرگودھا۔
اعجاز ملک بہاولپور۔ نیاز خان میانوالی۔ محمد عاقل جہلم۔ وزیر حسن شیخوپورہ۔
قمر عباس حیدرآباد۔ نسیم اختر خیرپور۔ فضل صدیقی لاہور۔ صبیحہ بانو لائل پور۔
ناصر خان کوئٹہ۔ ناظم خٹک پشاور۔ ارم جہاں سوات۔ شاہجہاں بیگم کوئٹہ۔

(باقی نام صفحہ ۱۴۲ پر)

## چوّن ہزار روپے کے انعامات 54000.00

[illegible] اکتیس ہزار روپے

### دوسرا انعام، ایک غلطی والے حل پر، بارہ ہزار پانچ سو روپے تیسرا انعام، دو غلطی والے حل پر، دس ہزار پانچ سو روپے

فیس داخلہ فی حل ایک روپیہ ایک نام اور ایک ٹوکن کے ساتھ دو روپے پچاس پیسے میں تین حل بھیجے جا سکتے ہیں۔ اس حساب سے جتنے چاہے حل بھیج سکتے ہیں۔ دوشیزہ ادبی معمہ ۴ کے اپنے تمام خاکوں کے ساتھ ایک ٹوکن دوشیزہ ادبی معمے کا ضرور بھیجیے جو ماہنامہ دوشیزہ کے تازہ شمارے سے کاٹا گیا ہو۔ مفصل شرائط اور ہدایات کی پابندی لازمی ہے جو ماہنامہ دوشیزہ کراچی میں شائع ہوتی ہیں۔ ایک شخص صرف تین ٹوکنوں پر ایک انعام حاصل کر سکتا ہے۔

دفتر ماہنامہ دوشیزہ ۹۸ سی سنٹرل کمرشل ایریا، علامہ اقبال روڈ، پی ای سی ایچ ایس، کراچی ۲۹ میں دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۸ ستمبر ۵ بجے شام تک اور ڈاک سے ۹ ستمبر

## دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۴

| نمبر | اشارے | ممکن الفاظ | | | حل نمبر.... | حل نمبر.... | حل نمبر.... |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | ـــــ کی خدمت زندگی کا مقصد تھا | باپ | ملک | قوم | | | |
| ۲ | محبت ایسا موضوع ہے جو ہمارے ـــــ اور خواہشات سے تعلق رکھتا ہے | جذبات | دل | نفس | | | |
| ۳ | اللہ کے ہاں اسے کس ـــــ کا مستحق ہونا چاہیئے | جزا | سلوک | انعام | | | |
| ۴ | نواب مسلمانوں کے ـــــ لیڈر تھے | سچے | مسلّمہ | بیباک | | | |
| ۵ | ـــــ کے دو رخ ہوتے ہیں | حالات | مقدمے | آئینے | | | |
| ۶ | جس قدر ـــــ ترقی کرے گی میرا نام روشن ہوگا | لڑکی | دُنیا | نسل | | | |
| ۷ | ایک سال کے بعد ـــــ ہوتی ہے | برسی | عیدالاضحیٰ | سالگرہ | | | |
| ۸ | دنیاوی ـــــ قطعی طور پر ہیچ ہیں | نعمتیں | علوم | آسائشیں | | | |
| ۹ | ـــــ کے پاس ایک ہنر ہوتا ہے جسے دستِ غیب کہتے ہیں | تھانیدار | تحصیلدار | | | | |

نام اور مکمل پتہ ______________________

دستخط ______________

ڈاک سے اپنے حل اور فیس اس پتے پر بھیجیے :- **دوشیزہ ادبی معمہ ۴**، ماہنامہ دوشیزہ پوسٹ بکس ۸۰۹۵ کراچی ۲۹

دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۴ کا صحیح حل ۱۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کو ایک بجے دن دفتر دوشیزہ پر مطبوعہ کتابوں کے مکمل حوالوں کے ساتھ آویزاں کر دیا جائے گا۔
اور ۱۳ ستمبر کو صحیح حل روزنامہ مشرق کراچی ـــــ لاہور، پشاور، کوئٹہ میں شائع ہوگا۔ انعام یافتگان کی مکمل فہرست اکتوبر ۸۸ کے تازہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے۔

(بقیہ انعام پانے والوں کے نام)

میر جہاں بیگم مری۔ انجمن آرا خان پور۔ مسعود شاہ گجرات۔ رفاقت حسین سکھر۔ انصار صدیقی شہداد پور۔ فقیر محمد کوٹری۔ محبوب علی مانسہرہ۔ محمد یاسین صادق آباد۔ کہکشاں ناز لاہور۔ حبیب الرحمٰن کراچی۔ نایاب کیپٹن کراچی۔ محمد محسن رضا کیمبلپور۔ حسینہ بانو کراچی۔ رحمان شاہ سکھر۔ ظہور وارثی حیدرآباد۔ قیصر جعفری راولپنڈی۔ عمران خان تلہ گنگ۔ سعدیہ فراز اسلام آباد۔ حسین خان

## کلیم کی آخری تاریخ ۱۰ ستمبر ۷۵ء

دوشیزہ ادبی معمّے کے انعام یافتگان کی مکمل فہرست شائع کی جا رہی ہے۔ حسبِ معمول پہلے انعام کی تار کے ذریعے خوشخبری پہنچا دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ معمّہ ۳۰ میں ایک غلطی اور دو غلطی کے انعام پانے والے خوش نصیبوں کو فرداً فرداً بذریعہ ڈاک اطلاع دی جا چکی ہے اور اطلاع کے دو دن بعد انعامی رقوم بھی ارسال کر دی گئی ہیں جو اس رسالہ کی اشاعت سے قبل آپ کو مل چکی ہوں گی۔ اگر آپ کو انعامی رقم نہ ملے تو آپ سمجھتے ہیں کہ آپ انعام کے حقدار تھے تو ایک روپیہ کلیم فیس کے ساتھ اپنے بھیجے ہوئے حل کی تفصیلات سے مطلع فرمائیں یعنی کس تاریخ کو کتنے حل بھیجے تھے فیس کس طرح روانہ کی تھی منی آرڈر رسید نمبر پوسٹل آرڈر یا نقد رقم نمبر کا حوالہ دیجئے۔ اگر حل رجسٹری ڈاک سے بھیجے گئے تھے تو رجسٹری نمبر ہونا ضروری ہے۔ آپ کا حل کس انعام کا مستحق ہونا چاہیے تھا ایسے تمام کلیم ہمیں زیادہ سے زیادہ ۱۰ ستمبر تک مل جانے چاہئیں۔ اس تاریخ کے بعد کوئی کلیم قابلِ غور نہ ہوگا۔ اگر آپ کا کلیم درست ثابت ہوا تو انعامی رقم کے ساتھ آپ کی کلیم فیس بھی واپس کر دی جائے گی۔

ہم نے بڑی احتیاط کے ساتھ حلوں کی بار بار جانچ کی ہے اس لیے ہمارا یہ خیال ہے کہ کوئی کلیم درست ثابت نہیں ہوگا۔ اسی بنا پر ایک اور دو غلطیوں کے انعامات روانہ کر دیئے گئے ہیں۔ ایک اور دو غلطیوں کے جتنے بھی کلیم درست نکلیں گے ان کو ادارہ اپنی طرف سے انعامی رقم پیش کرے گا اور روانہ کردہ انعامی رقم میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ درست حل کے کلیم اگر صحیح ثابت ہوں گے تو اعلان کردہ رقم میں تبدیلی ناگزیر ہوگی۔ کلیم کی مدت ۱۰ ستمبر ۷۵ء کے گزرنے کے بعد ۲۰ ستمبر کو درست حل کا انعام ادا کر دیا جائے گا۔

کوئٹہ۔ فضل شاہ ساہیوال۔ خالدہ ناز بنوں۔ نصرت شہریں کراچی۔ اشفاق علوی ایبٹ آباد۔ محمد خان لائل پور۔ ساجد قادری اوکاڑہ۔ محمد ملک مانگھر۔ تیق صدیقی خانیوال۔ یار خان پشاور۔ عبد القیوم میانوالی۔ صادق شاہ حیدرآباد۔ محمد رشید جہلم۔ عطیہ گل بہاول پور۔ عائشہ رانی واہ کینٹ۔ فرحت تنویر کوئٹہ۔ صابر جمیل ساہیوال۔ شاکر علی کراچی۔ یونس راجہ میرپور خاص۔ امیر حسن لالہ موسیٰ۔ محمود حسین حیدرآباد۔ پروین جعفری سرگودھا۔ اکرم فاروقی ڈیرہ اسماعیل خان۔ نظیر شاہ قصور۔ شائستہ نازلی لورالائی۔ فقیر محمد حیدرآباد۔ رب نواز سکردو۔ یعقوب بٹ سیالکوٹ۔ شہزادی شہناز جیکب آباد۔ نثار علی کراچی۔ شریف بابو اوکاڑہ۔ صفدر ہاشمی لاڑکانہ۔ صدر الدین لاہور۔ بدر عالم راولپنڈی۔ حسین عالم راولپنڈی۔ تسنیم اختر پشاور۔ عثمان خان سوات۔ فہیم علی خاں مردان۔ زبیدہ خاتون لاہور۔ مسرت جہاں خیرپور۔ ریاض احمد لائل پور۔ عرفان علی سکھر۔ شیخ عبداللہ حیدرآباد۔ عزیز بٹ لاہور۔ سارا بابر سکندر پشاور۔ یاسمین صبا گجرات۔ فتح خان کوئٹہ۔ حیدر علی کراچی۔ خیر محمد راولپنڈی۔ محمد حنیف سکھر۔ عبد الحفیظ نوابشاہ۔ ارشاد علی ملتان۔ معراج خالد بہاول نگر۔ شجاع الدین اسمٰعیل آباد۔ نگہت فردوس شیخوپورہ۔ افضل شاہ ایبٹ آباد۔ شرافت علی میانوالی۔ شفقت اللہ لاہور۔ محمد فاروق راولپنڈی۔ آلِ حسن میرپور۔ امین خان سکردو۔ عفت ناز کوٹری۔ ابو الحسن کراچی۔ فریدہ انجم سکھر۔ ثریا امین لاہور۔ رضیہ بیگم شورکوٹ۔ سائرہ بیگم گوجر خان۔ آسیہ خلیل سرگودھا۔ عصمت علی منڈی حاصل پور۔ تجمل حسین بنوں۔ عمران خان خانپور۔ محمد وصی نواب شاہ۔ بشریٰ رحمٰن ڈیرہ غازیخان۔ نواب علی ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ شہاب قریشی لاہور۔ عنایت صابری کراچی۔ سلطانہ کوکب پشاور۔ ناصر بیگ کوئٹہ۔ ظہور رچی راولپنڈی۔ شمع ناز شیخوپورہ۔ روشن علی شیخوپورہ۔ قدرت علی شیخوپورہ۔ عمرانہ خان شاہدرہ۔ مزاہد قریشی سیالکوٹ۔ صغیر حسین مردان۔ جانباز خاں ایبٹ آباد۔ یٰسین خان سوات۔ عامر سہیل لاہور۔ احمد ندیم خیرپور۔ اسلم علی سکھر۔ شکیلہ بیگم گھوٹکی۔ عزیز آفتاب ٹنڈو آدم۔ ناظر علی کراچی۔ زینت بیگم ٹنڈو محمد خان۔ غلام فرید سکھر۔ تبسم شوکت لیاقت پور۔ سنجیدہ خاتون احمد پور شرقیہ۔ رسول بخش جیکب آباد۔ عابد علی کراچی۔ فرح کریم حیدرآباد۔ نجمہ محبوب کوئٹہ۔ اقبال بٹ بستی۔ احمد یار خاں مردان۔ اصغری بیگم لائل پور۔ نفیس احمد خیرپور۔ جاوید اطہر سکھر۔ ظفر علی کوٹری۔ شاہانہ یاسمین روہڑی۔ بشیر خاں کوئٹہ۔ علی خاں کوئٹہ۔ خذین خان مردان۔ وسیا خان مردان۔ عطا محمد شورو۔ لطیف بٹ لاہور۔

# ۶۰،۰۰۰ ساٹھ ہزار روپے کے انعامات

پہلا انعام بالکل درست حل پر **۳۶** ہزار روپے

## دوسرا انعام: ایک غلطی والے حل پر، تیرہ ہزار روپے — تیسرا انعام: دو غلطی والے حل پر، گیارہ ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل ایک روپیہ ایک نام اور ایک کوپن کے ساتھ دو روپے پچاس پیسے میں تین خاکے بھیجے جا سکتے ہیں۔ اس حساب سے جتنے چاہے حل بھیج سکتے ہیں، دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۵ کے اپنے تمام خاکوں کے ساتھ ایک کوپن دوشیزہ ادبی معمے ۵ ضرور بھیجے جو ماہنامہ دوشیزہ یا تازیانہ سے کاٹا گیا ہو۔ مفصل شرائط اور ہدایات کی پابندی لازمی ہے جو تازیانہ یا دوشیزہ کراچی میں شائع ہوتی ہیں ایک شخص الگ الگ کوپنوں پر الگ الگ انعام حاصل کر سکتا ہے۔

دفتر ماہنامہ دوشیزہ ۹۔۲۴ سی سنٹرل کمرشل ایریا علامہ اقبال روڈ، پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ میں دستی حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۹ اکتوبر رات دس بجے تک اور ڈاک سے ۱۰ اکتوبر

## دوشیزہ ادبی معمے نمبر ۵

| نمبر | اشارے | ممکن الفاظ | | | حل نمبر.... | حل نمبر.... | حل نمبر.... |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | دو اپنی ___ کے اس بھیانک انجام کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا | زندگی | محبت | شادی | | | |
| ۲ | دنیا کا کون سا کونا ہے جس میں یہ ___ خانہ خراب نہیں پہنچے۔ | سی آئی اے | فرنگی | ہپی | | | |
| ۳ | ___ سازی میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ | ظروف | برتن | جلد | | | |
| ۴ | میں ہی آپ کی ___ ہوں۔ | بیٹی | بیوی | بلی | | | |
| ۵ | آنکھوں سے ایک سی ___ ٹپکتی ہے۔ | مایوسی | اداسی | وحشت | | | |
| ۶ | اس ___ کی سرخی کو دھونے کے لیے تھوڑا سا پانی کافی ہوگا۔ | قتل | فصل | زخم | | | |
| ۷ | ناکام جئے اور ناکام مرے، یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا ___ ہے۔ | کارنامہ | المیہ | حادثہ | | | |
| ۸ | انوکھی حقیقتیں ہم پر ___ ہی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ | خواب | بیداری | مباحثہ | | | |
| ۹ | محبت ایک ___ ہے۔ | فن | سچائی | روگ | | | |

نام اور مکمل پتہ ______________________

دستخط ______________

بذریعہ ڈاک سے اپنے حل اور فیس اس پتے پر بھیجئے: **دوشیزہ ادبی معمے ۵** ماہنامہ دوشیزہ، پوسٹ بکس ۸۰۹۵۔ کراچی ۲۹

دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۵ کا صحیح حل ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو ایک بجے دن دفتر دوشیزہ پر مطبوعہ کتابوں کے مکمل حوالوں کے ساتھ آویزاں کر دیا جائے گا۔

## ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۵۴

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شاملِ مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ______________

مقام و پتہ ______________

______________

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۵۴

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شاملِ مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ______________

مقام و پتہ ______________

______________

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۵۴

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شاملِ مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ______________

مقام و پتہ ______________

______________

ٹوکن دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۵۴

دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط میں نے پڑھ لی ہیں اور مجھے ہر شرط کا ایک ایک لفظ منظور ہے۔ منسلکہ حل شاملِ مقابلہ کر لیجیے۔ میں آپ کے ہر فیصلے کا پابند رہوں گا/گی۔

نام ______________

مقام و پتہ ______________

______________

کراچی سے خیبر تک

# تازیانہ

کی دھوم مچ گئی

تازیانہ کس کو نہیں چاہیئے؟

آپ کو بھی قوم کو بھی

تازہ نہ ملے تو اگلا سہی

ہر تازیانہ اچھا لگے گا



تازیانہ پوسٹ بکس ۸۰۹۵ کراچی

بدلتا موسم بدلتے رنگ
کریپ میں بدلتے موسم کو خوش آمدید کہیے
KHL (S) 4-78

# دوشیزہ

جلد (۵)

شمارہ (۱۰)

اکتوبر ۔۔۔ ۱۹۷۵ء

اسپیئر پارٹس اور فروخت
کے بعد سروس کی سہولت
تمام ممتاز ڈیلروں
سے دستیاب ہے۔

میرے سسر چوہدری علیم الدین اپنے علاقے کے بڑے بارسوخ آدمی تھے۔ کاروباری معاملات میں غضب کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ جبکہ ان کے چھوٹے بھائی ظہیر الدین سخت نالائق نکلے۔ باپ کی کمائی عیش و عشرت میں اڑاتے رہے۔ میرے سسر نے انہیں راہ راست پر لانا چاہا تو لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے تھے۔ ان کے حال پر چھوڑ کر میرے سسر چوہدری علیم الدین نے اپنے باپ کے کاروبار میں بھرپور دلچسپی لی۔ محنت رائیگاں نہیں گئی۔ ان کے باپ کی زندگی میں ہی کاروبار دوگنا ہو گیا۔ موت نے مہلت نہ دی ورنہ وہ دونوں بیٹوں میں جائیداد تقسیم کر جاتے۔ ان کے مرنے کے بعد بڑے بھائی نے چھوٹے کا بہت خیال رکھا۔ زمانے کے نشیب و فراز سمجھا کر کاروبار سے دلچسپی پیدا کرنا چاہی۔ کچھ عرصہ تک وہ کام پر جاتے بھی رہے۔ مگر بری عادتیں مشکل سے ہی چھٹکارا کرتی ہیں۔ جلد طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ سیر و تفریح میں شامل ہونے لگے اور وہ اپنی پرانی روش پر لوٹ گئے۔ یار دوستوں نے مشورہ دیا کہ بھائی سے حصہ لے کر اپنا علیحدہ کاروبار کرو۔ لوگوں کے کہنے میں آ کر بھائی سے علیحدگی کا مطالبہ کر بیٹھے۔ بڑا بھائی جانتا تھا کہ سارا پیسہ چٹکیوں میں اڑا دے گا مگر اب سمجھانے کا دور بھی چلا گیا تھا۔ تنگ آ کر جائیداد میں بٹوارہ کر دیا۔ یار دوستوں نے پھر کان بھرے کہ بڑا بھائی بے ایمانی کر گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ باپ کے مرنے کے بعد کاروبار میں کچھ تبدیلیاں کرنے سے منافع بڑھ گیا تھا جبکہ جائیداد کے بٹوارے پر یہ پیسہ میرے سسر نے اپنی محنت سے کمایا ہوا ظاہر کر کے اس کی تقسیم سے انکار کر دیا تھا اور یہ بات جائز بھی تھی۔ اس وقت تو چچا ظہیر الدین کو عیاشی کے لیے پیسوں کی ضرورت تھی۔ ان معاملات پر کوئی توجہ دیئے بغیر خاموشی سے اپنا حصہ لے کر علیحدہ ہو گئے۔ مگر چند برس بعد جب سب کچھ کھا پی کر برابر کر دیا تو پھر ہاتھ پھیلا کر بڑے بھائی کے دروازے پر آ کھڑے ہوئے۔ میرے سسر نے ڈانٹ کر بھگا دیا کہ جن خود غرضوں نے علیحدگی کا مشورہ دیا تھا انہی سے امداد طلب کرو۔ چچا ظہیر الدین منہ لٹکا کر واپس لوٹ گئے ـــ ان کی بیوی نے مشورہ دیا کہ تمہارے ساتھ زیادتی ہو گئی ہے۔ کورٹ میں دعویٰ کر دو۔

یہ جھگڑا بہت طویل مدت تک چلا۔ اس وقت میرے شوہر سلمان دس بارہ سال کے تھے۔ میرے سسر کے دو ہی بچے تھے سلمان اور سلمیٰ۔ سلمان جیٹھے تھے۔ سلمیٰ ان سے کچھ برس بعد پیدا ہوئی تھی۔ میری ساس بیمار صورت تھیں۔ بچے تو ہو جاتے تھے مگر کبھی ایک،

گھٹنے ٹیک کر رہ گئے۔ سلمان اور سلمیٰ کی [illegible] زندگی ہو گئی۔ دونوں بچے
والدین کی آنکھوں کا تارا تھے۔ چچا ظہیر الدین کے چار بچے تھے۔ دو لڑکیاں
دو لڑکے۔ باپ کی ناکام زندگی کا ان پر گہرا اثر پڑا۔ ماں کی تربیت بھی
[illegible] نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکے دونوں نالائق نکلے۔ پھر سات سے زیادہ
پڑھ کر نہیں دیا۔ لڑکیاں [illegible] صورت کی تھیں۔ پڑھائی لکھائی سے
انھیں بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ چچا نے آخری داؤ یہ ملا کر اپنے بیٹے کے
لیے سلمیٰ کا رشتہ مانگا اور سلمان سے اپنی چھوٹی بیٹی صفیہ کا بیاہ کرنا
چاہا۔ اس مقصد کے لیے دونوں میاں بیوی نے سینکڑوں چکر کاٹے۔
مجھے یہ ساری باتیں میری ساس نے بعد میں بتائیں کہ سلمان کے [illegible]
نے سر توڑ کوشش کی کہ وہ کسی طرح ان کے قابو میں آ جاتے۔ مگر وہ ناکام
رہے۔ میرے سسر نے صاف لفظوں میں ان دونوں رشتوں کو ٹھکرا دیا کہ
میرے [illegible] ہیں انھیں میں بیٹے بیٹی جہنم میں نہیں جھونک
سکتا۔ اس جواب نے چچا ظہیر الدین کو سیخ پا کر دیا۔ پھر [illegible]
دھمکاتے گئے۔ خوب ایک دوسرے کے خلاف کیچڑ اچھالی گئی۔ نوبت
یہ آ گئی کہ میرے سسر نے قسم کھالی کہ جیتے جی ظہیر کی صورت نہیں دیکھوں
گا اور اس بات پر وہ قائم رہے۔ میرا رشتہ انھوں نے اپنی زندگی
میں ہی طے کر دیا تھا۔ میرے والد سے ان کی گہری دوستی تھی اور یہی
دوستی میرے رشتے کا سبب بنی۔ جب میں میٹرک کا امتحان دے رہی تھی
جب سلمان سے میری منگنی ہوئی۔ طے یہ ہوا تھا کہ بی اے کے بعد شادی
ہو گی۔ سلمان اپنے باپ کے کاروبار میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔ ان کا خیال تھا
کہ سلمیٰ کا بھی رشتہ طے ہو جاتا تو دونوں بہن بھائی کی ایک ساتھ شادی
کر دیں گے۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ میرے سسر کو اچانک ہارٹ
اٹیک ہو گیا اور پھر یہ ہوا کہ میری ساس نے چہلم کے بعد ہی شادی کی تجویز
رکھ دی۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کا دیور ظہیر الدین بھائی کی موت کی آڑ لے کر پھر
سے گھر میں آنے جانے لگا ہے۔ سلمان نادان لڑکا ہے۔ اس وقت
باپ کی موت نے اسے خاصا جذباتی بنا رکھا ہے وہ اپنے چچا کے کسی
بھی جال میں آسانی سے پھنس جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ اس کی شادی
کر دی جائے تاکہ اس کے چچا کا لالچ خود بخود ختم ہو جائے۔

میرے ابو کو یہ بات معقول لگی انھوں نے جھٹ پٹ میری شادی
کر دی۔ یہاں میری ساس نے مجھے سارے حالات سمجھائے کہ بہو تمھیں
ان معاملات سے نمٹنا ہے۔ میرا دیور ہمارا سکھ نہیں چاہتا وہ لالچی آدمی
اپنی جائیداد ہڑپ کر چکا ہے اور اس کی نظر سلمان پر ہے۔ وہ سلمان
کو الو بنانے کی فکر میں ہے۔ اب یہ تمھارا کام ہے کہ ان حالات سے
سلمان کو باخبر رکھو۔

مگر سب باتیں انھوں نے میرے [illegible] کے سامنے [illegible]
سلمان کا موقف کچھ اور تھا۔ وہ کہتے تھے کہ چچا ظہیر کچھ بھی ہوں ہمارے بزرگ
ہیں۔ ہم پر ان کا احترام واجب ہے۔ یہ درست سہی کہ ماضی میں ابا جان
سے ان کی نہیں بنی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ چچا عیاش تھے ان کے سارے
مطالبات ناجائز ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں ابا جان کی طرح ان سے
تعلقات دشمنی کی حد تک نہیں بگاڑنا چاہتا۔ وہ آتے ہیں تو مجھ سے خوشی
[illegible] ملیں۔ میں اتنا بچہ نہیں ہوں کہ ان کی چالوں میں آ کر اپنے گھر
یا کاروبار کو نقصان پہنچاؤں۔

سلمان ٹھیک کہتے تھے۔ پھر بھی میں چچا ظہیر سے ڈرتی تھی میں
سلمان کے کہنے پر ان کی بیوی بچوں سے عزت ضرور کرتی مگر ساس کے
کہنے کے مطابق مجھے ان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنی تھی کیونکہ ان کی دو
کنواری جوان بیٹیاں تھیں۔ جن کا رشتہ ٹھکرایا جا چکا تھا اور وہ کسی
وقت بھی انتقام لے سکتے تھے لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ میری شادی
کے بعد چچا ظہیر خود بخود کٹ گئے۔ میری ساس سے کسی معمولی سی بات
پر جھگڑا کر کے انھوں نے آنا جانا ترک کر دیا۔ میری ساس بہت خوش
ہوئیں کہ تم روٹھے ہم چھوٹے۔

ایک طویل مدت تک ان لوگوں سے میل ملاپ نہ ہوا اس دوران
میری نند سلمیٰ کی شادی بھی ہو گئی۔ سلمان نے اس موقع پر ان سب کو
مدعو کیا مگر وہ نہ آئے۔ سلمیٰ سے اپنے بیٹے کا بیاہ کرنا ان کا ارمان تھا
یہ بھی پورا نہ ہوا۔ کہلا بھیجا کہ ہم اب غیر ہوتے اچھے تمہارے حالات میں
ہم سے کوئی توقع نہ رکھنا۔ سلمیٰ کی شادی کے بعد ساس کو میری فکر
ہوئی کہ اب اولاد ہو جانا چاہیے۔ میری شادی کو بھی ڈھائی تین سال
ہو چکے تھے۔ اولاد کے ابھی تک کوئی آثار نہ تھے۔ سلمان کو اس کی اتنی
فکر نہ تھی مگر میری ساس ارمان میں مری جا رہی تھیں کہتی تھیں
کیا پتہ یہ کم بخت ظہیر کوئی تعویذ گنڈے کرا رہا ہے۔ اس کی نظر آج بھی
اس جائیداد پر ہے۔ وہ شر پسند ہے۔ اگر سلمان کے اولاد نہ ہوئی تو
پھر اپنی بیٹی کا رشتہ لے کر آ جائے گا۔ میں بھی خوف زدہ ہو گئی۔ ڈاکٹر
حکیم تعویذ گنڈوں کے چکر میں پڑ گئی۔ مگر اولاد نہ ہوئی۔ اور اسی عرصے
میں ایک ستم یہ ہوا کہ سلمیٰ میری نند اپنی شادی کے ڈیڑھ سال بعد
شدید بیمار ہو کر میکے آ گئی۔ سلمیٰ مجھ سے دو تین برس چھوٹی تھی مجھے
اس سے چھوٹی بہنوں جیسا پیار تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس لڑکی
نے کبھی روایتی نندوں والا چلن دکھایا ہی نہیں۔ باپ کی بہت لاڈلی
تھی ان کے مرنے کے بعد بہت حساس ہو گئی تھی۔ سلمان نے اسے بہت
محبت دی۔ میری ساس بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھیں شادی کی بھی

خوب دیکھ بھال کی [illegible]
برگرا، لڑکا [illegible] بہت [illegible]
میں نے سلمیٰ سے کرید کرید کر اس کے سسرال اور شوہر کی باتیں پوچھیں
پہلے وہ ٹالتی رہی مگر میرا تجسس بہت بڑھا تو آخر کہہ دیا کہ وہ سال
سے پال کر لائی ہے کہ منہ سے کچھ کہتی نہیں اندر ہی اندر گھلے جا رہی ہے
میرے پیار محبت سے پوچھنے پر اس نے شرما شرما کر بتایا کہ سال بھر
سال سے شوہر کی جنسی محرومی کی جھنجلاہٹ کا نشانہ بنی ہوئی ہے اس
کے شوہر نامدار کھوکھلے آدمی تھے اپنی کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لیے
بیوی پر الٹے سیدھے تجربے کرتے رہتے تھے۔ اپنی ناآسودگی کے ایسے
ایسے ایذا رساں طریقے اپنا رکھے تھے کہ ایک سلمیٰ ہی تھی جو جھیل گئی۔
میں نے تو ایسے واقعات کبھی سنے نہ پڑھے۔ سلمان کو بتایا، ساس سے
مشورہ لیا۔ سلمیٰ کا باقاعدگی سے علاج کرایا۔ اس کے شوہر کو بلا کر ان باتوں
کی تصدیق چاہی۔ وہ گڑبڑا گیا۔ اس کا خیال تھا سلمیٰ سخت جان لڑکی
ہے اس زیادتی کو خاموشی سے سہتی رہے گی۔ مگر اب معاملہ بگڑ چکا تھا
بزرگوں نے لعنت ملامت کی کہ میاں ایسی ہی زندگی بسر کرنی ہے تو
کسی جانور کو پال لیتے یوں ایک معصوم لڑکی کی جان پر ظلم توڑتے ہو۔ مختصر
کر لوگوں کے کہنے سننے پر وہ شخص طلاق دینے پر آمادہ ہو گیا۔
مہر معاف کر دیا، جہیز کا سامان لوٹا دیا گیا اور سلمیٰ طلاق لے کر گھر لوٹ
آئی۔ سال ڈیڑھ تو اس کے مکمل علاج میں لگ گئے۔ وہ ذہنی طور پر
مریضہ بن گئی تھی میں دوسری شادی کا مشورہ دیتی تو بگڑنے لگتی مجھ
سے ہفتے ہفتے بات نہ کرتی کہ بھابی کو میرا یہاں رہنا گوارا نہیں ہے کبھی
ایسی بات سوچتی ہے۔ میں بھی آخر انسان تھی۔ اس کے چڑچڑے پن
نے مجھے بھی بیزار کر دیا۔ یہ رشتہ ویسے بھی نازک ہوتا ہے مگر وہ ہمدردی
کی مستحق تھی مگر میں خود اپنی محرومی کی آگ میں سلگ رہی تھی۔ ہماری
آپس میں ناچاقی رہنے لگی۔ میری ساس سمجھدار عورت تھیں۔ اس بات
کا مجھے آج احساس ہوتا ہے کہ بیٹی سے محبت ہونے کے باوجود انہوں
نے اکثر میرا ساتھ دیا۔ اور شاید ان کی یہ نیک دلی کا نتیجہ تھا کہ شادی
کے تقریباً چھ برس بعد خدا نے مجھے ماں بننے کی سعادت سے نواز دیا۔ یہ
خوش خبری ہمارے مختصر سے کنبے کے لیے نئی زندگی ملنے سے کم نہ تھی۔
میری ساس نے میرے پیر دھو دھو کر پیے اور خدا کی قسم میں ان کی مہربانیاں
کبھی نہیں بھلاؤں گی کہ میرے اولاد نہ ہونے کی مدت انہوں نے بڑے
صبر و سکون سے گزاری جبکہ عموماً ساس اپنی بہو سے بیٹے کی علیحدگی
ہی بہانہ بنا لیا کرتی ہیں۔ بہر حال جب میرے حمل کا اعلان ہو چکا تھا گھر
میں بچے کی آمد کا احساس گھر کے کونے کونے میں مسرتیں جگا گیا۔ اور پھر

### غالب سے عشق

ایک تقریب میں ایک
مہذب خاتون نے غالب
کے کئی شعر پڑھ کر سنائے۔ کسی نے کہا آپ
کو غالب سے بہت عشق ہے۔ مہذب خاتون
نے گھبرا کر کہا۔ "آہستہ بولیے میرے شوہر
بہت شکی ہیں، سن لیں تو گھر میں قیامت آ
جائے گی۔"

بھابھی بیٹا ہوا ماشاء اللہ صحت مند اور ہو بہو اپنے دادا کی تصویر تھا۔ سلمیٰ
کا رویہ یکسر بدل گیا وہ بھتیجے کو پا کر اپنا سارا غم بھول گئی۔ یہ وہ وقت
تھا جب ہمارا سارا گھرانہ خوشی اور سکون محسوس کر رہا تھا۔ ایسے میں
سلمان نے اپنے چچا کو بھی خوشیوں میں شریک کرنا اپنا فرض سمجھا بھتیجے
کے عقیقے میں سلمان نے خود چچا ظہیر کو منایا۔ ان کے گھر والے تو ہنوز
بدظن تھے۔ وہ لوگ اپنا حسد چھپا نہ سکے مگر چچا ظہیر آ گئے۔ میرے بیٹے
کے لیے کچھ تحائف بھی لائے تھے جو میری ساس نے خوشی سے قبول کر
لیے۔ اور اس طرح چچا کا ہمارے یہاں آنا جانا ہو گیا۔ گو ان کے گھر کے
دیگر افراد نے تعلقات منقطع ہی رکھے۔ لیکن چچا ظہیر کا رویہ ہم سے
بدل گیا وہ سلمان اور مجھ سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے۔ میری
ساس سے بھی روایتی دیور بھابی والی چھیڑ چھاڑ کرنے لگے تھے۔ سلمیٰ
اور میرے بیٹے خرم کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر آتے تھے۔ ہر وقت اپنی
اولاد کی نالائقی کا رونا روتے تھے کہ آج سلمان جیسا بیٹا ہوتا تو میں
بھی بھائی کی طرح چارپائی پر بیٹھ کر روٹی کھاتا۔
اس روز چھٹی کا دن تھا۔ سلمیٰ نے وقت گزاری کے
لیے ایک اسکول میں ملازمت کر لی تھی۔ سلمان اور امی نے اسے بہت
سمجھایا تھا مگر ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ یہ جتنا مصروف رہے گی اس کے
حق میں اچھا ثابت ہو گا۔ ملازمت کے بعد وہ خاصی سنبھل گئی تھی گھر آنے
کے بعد سارا وقت خرم کے ساتھ گزارتی۔ اس روز وہ صبح سے خرم کو
اٹھائے اٹھائے پھر رہی تھی میں کپڑوں کو دھوپ لگانے کے لیے
ٹرنک کھول کھول کر گرم چادریں نکال رہی تھی سلمان بھی گھر پر تھے کہنے
لگے آج اپنی بندوق ہی دیکھ لیں بہت دنوں سے شکار پہ جانا نہیں
ہوا۔ وہ باہر برآمدے میں بندوق صاف کروانے بیٹھ گئے۔ اسی وقت چچا
ظہیر اپنے مخصوص انداز میں کھکھارتے گیٹ میں داخل ہوتے میری

خوش ہوتے تھے میرا [illegible] تھا۔ پلاٹ [illegible] کا بیٹھ کر
کر بھر بھری بنتی اور مرا دھر [illegible] جیسا محبت بھری
نظروں سے دیکھ رہی ہے کہ بیت بیٹھے ہیں سامنے غور سے تیز
لیے ہیں محنت کر اور حاصل کرنے جہاں کا آغاز [illegible] کیسے کیسے نازک
احساسات جنم دیتا ہے۔ سارا دن کام کرنے کے بعد تھکن بھی [illegible] لطافت
آمیز درد پیدا کرتی تھی۔ [illegible] ہنس مکھ آدمی تھا کسی
سے لڑائی نہ جھگڑا، اپنے کام سے کام رکھتا تھا باقی سارا وقت ہنسی مذاق
میں گزار دیتا۔ ایک دن یہ حادثہ ہوا کہ کام کرتے کرتے میرا بلڈوزر ایک
دم رک گیا۔ وہ میرا ساتھی تھا میرا یار تھا۔ مجھے اس پر اعتماد تھا اسے بھی مجھ
پر مان تھا مگر اللہ جانے اس روز اس کی کونسی کل بگڑ گئی کہ میں نے بہت
زور لگایا وہ نہ چلا تھوڑی بہت مرمت کرنا مجھے بھی سکھایا گیا تھا اس
سے کام نہ نکلا تو مایوس ہو گیا۔ بلڈوزر لے کر سیدھا راولپنڈی آیا۔
ورکشاپ میں اسے مرمت کے لیے دے آیا۔ وہاں میری ڈیوٹی بدل
گئی مجھے اس کے درست ہونے تک ورکشاپ میں کام سیکھنا پڑا۔
صبح آٹھ بجے ورکشاپ کے لیے روانہ ہوتا اور شام پانچ بجے ڈیوٹی
ختم ہوتی تب گھر لوٹتا۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ مجھے یہاں کتنی مدت تک
رہنا پڑے گا۔ حالات کچھ ایسے نظر آئے کہ شاید میرا قیام طویل ہو جائے
میں نے یہی سوچ کر بھاگ دوڑ کی اور سیٹلائٹ ٹاؤن میں کرایے پر
مکان لے لیا۔ مکان کیا ایک چھوٹا سا سر چھپانے کو گھر مل گیا تھا۔
صبر شکر کرنے والا آدمی ہوں اس کو بھی محل سمجھ کر لطف لیا اور اپنی لو
میری زندگی میں کچھ شوخ رنگ ابھرے راستے میں آتے جاتے چلبلی
بار بار اٹھنے لگی۔ وہ کالی کالی آنکھیں مجھے دیکھ کر مسکرانے لگیں اور
رفتہ رفتہ مسکراہٹ اور شوخی کے ساتھ ساتھ ان میں انتظار کی سی
کیفیت بھی شامل ہو گئی۔ میں سیدھا سادا دیہاتی انسان ضرور تھا مگر محبت
کی نظریں تو خوب پہچانتا تھا کہ اس کی خاطر یہ شناخت ہمارا [illegible] رہا
ہے۔ پیار کی خوشبو تو دنیا میں سب سے زیادہ تیکھی ہوتی ہے۔ میری ناک
نے اسے سونگھ کر اپنے اندر اتار لیا۔ میں نے ان متوالے نینوں کا پیغام
سمجھ کر انہیں احترام سے اپنے من مندر میں بٹھا لیا کہ یہی تو وہ لڑکی ہے
جو عرش سے اللہ نے تیرا جوڑا بنا کر اتاری ہے۔ میں خوش لباس انسان
تھا۔ دیہات کی فضا میں پل کر جوان ہوا تھا۔ اپنے جسم اور چال سے
بہت سے لوگوں میں ممتاز نظر آتا تھا شاید نسرین اسی لیے مجھ سے
متاثر ہوئی تھی ورنہ میں کہاں اور وہ کہاں۔ نازک کانچ سی شہری گڑیا۔
جیسے چاہنے والے بے شمار ہوں گے کیونکہ وہ تھی ہی ایسی پیاری چیز
کہ جو دیکھے بس دیکھتا ہی رہ جائے [illegible] کی خواہش کرے۔ اس کے والدین

آپ کے یہاں کھانے کا انتظام معقول ہونا چاہیے۔
میرے شوہر پیٹ کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھتے ہیں

●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●●

بھی اچھی حیثیت کے تھے اور وہ خود بھی پڑھی لکھی شائستہ اطوار کی لڑکی
تھی۔ سماجی مرتبے کے اعتبار سے میں اس کے قطعی ہم پلہ نہ تھا مگر پیار
اور سچائی حالات اور موقع محل کہاں دیکھتی ہے۔ اس سے میری دلچسپی
روز بروز بڑھتی گئی اور جب اس کی بے قراری میری راتوں کی نیندیں
حرام کرنے لگی تو مجھے مرد بننا پڑا۔ ایک جرأت مند مرد ہی اپنی محبت کے
حصول کے لیے ہر کٹھن کام کر گزرتا ہے۔ میں نے اس سے بات کرنے
میں پہل کی اس روز مجھے ایسا لگا جیسے ہم ازل سے اسی لمحے کے منتظر
تھے جیسے آج قریب قریب ٹکڑے ہو جانے سے ہی ہم دونوں کی ذات
کی تکمیل ہو گئی ہو۔ نسرین میری ہی طرح باوفا اور بہادر تھی۔ میں نے
عشق کے آداب نبھاتے اس نے حسن کی روایتیں ڈھونڈ لیں۔ جان
ہتھیلی پر رکھ کر مجھ سے ملتی رہی۔ ایک دوسرے پر مرمٹنے کے عہد و پیمان
ہوتے۔ نہ وہ فلموں کی شوقین تھی اور نہ ہی میں نے کبھی فلمیں دیکھی
تھیں مگر اس کے اور میرے درمیان جو باتیں ہوتیں وہ اعتماد اور سچائی
کے قلم سے لکھے گئے وعدے تھے جو ایک عورت ہونے کے رشتے سے
اسے نبھانے تھے اور ایک مرد کی حیثیت سے میں نے کیے۔ اس نے
کہا تھا کہ تیرے سوا کسی اور کی چاہت بھی نہ کروں گی اور میں نے کہا تھا
کہ میری زندگی میں تجھے کوئی اور حاصل نہ کر سکے گا شاید آپ ہماری
چاہتوں کی گہرائی کو اس وضاحت کے بعد پہنچ سکیں کہ رات کی
تنہائیوں میں بھی ہم دونوں ملے مگر میں نے کبھی اس کے بدن کی [illegible]

# دوشیزہ ادبی معموں کی شرائط

**صحیح حل کے اعلان میں مالکان "دوشیزہ" کی مرضی کا قطعی دخل نہیں ہوگا بلکہ صحیح حل ماہنامہ دوشیزہ کی طرف سے کتابوں اور رسالوں کے باقاعدہ حوالوں سے شائع کیا جائے گا۔ دوشیزہ ادبی معمے کے تمام اشارے اردو کی مطبوعہ کتابوں اور رسالوں سے لئے گئے ہیں؛**

********************

۱ — معمے داخلہ ایک روپیہ فی خاکہ ہے۔ ایک ہی نام اور ایک ہی کوپن کے ساتھ دو روپے پچاس پیسے فی خاکہ بھیجے جا سکتے ہیں۔ اس حساب سے جتنے چاہیں حل بھیج سکتے ہیں۔ تمام حل چھپے ہوئے یا سادہ کاغذ پر اتنے صاف لکھے گئے ہوں کہ پڑھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ خاکے روشنائی یا بال پن سے پُر کرنا ضروری ہے۔ ہر خاکے کے نیچے یا کاغذ پر بھیجنے والے کا نام اور مکمل پتہ روشنائی یا بال پن سے لکھا ہونا چاہیے۔ پنسل سے لکھے ہوئے یا کٹے پھٹے، تبدیل شدہ، مشکوک یا نامکمل خاکے غیر مستحق قرار دیے جائیں گے۔ ایک بار حل بھیجنے کے بعد ان میں ترمیم کرنا ممکن نہیں ہے۔

۲ — ایک شخص کے ایک ساتھ بھیجے گئے تمام حل کے ہمراہ ماہنامہ دوشیزہ ... سے کاٹا ہوا متعلقہ دوشیزہ ادبی معمہ کا کوپن اور اس کے علاوہ بھیجے گئے منی آرڈر کی رسید یا پاکستانی پوسٹل آرڈر نتھی کئے ہوئے اسی لفافے میں وصول ہونے لازمی ہیں۔ پوسٹل آرڈر کراس کر دینے چاہئیں۔ پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر کی پشت پر دوشیزہ ادبی معمہ کا نمبر، حل بھیجنے والے کا نام، مکمل پتہ اور اس کے دستخط ہونے لازمی ہیں۔ ایک بار معمے کا نمبر، نام، پتہ، دستخط تحریر کئے جانے کے بعد ان میں سے کسی میں تبدیلی قابل قبول نہ ہوگی۔ ادارہ دوشیزہ کو حق ہوگا کہ انعامات کی ادائیگی سے پہلے تصدیق کرے کہ انعام پانے والا وہی ہے جس کے دستخطوں کے ساتھ پوسٹل آرڈر یا منی آرڈر رسید پر موصول ہوئے تھے۔ بند لفافہ کھلنے پر یا دفتر دوشیزہ میں دستی حلوں کے بکس کھلنے پر اندر سے جو حل یا ان کے متعلق کاغذات نکلیں ان کی تعداد یا نوعیت کے متعلق، نیز کسی لفافے میں سے کوئی بھی حل نہ نکلنے یا اس سے متعلق ضروری کاغذات کوپن یا رسید منی آرڈر وغیرہ برآمد ہونے کے متعلق مالکان دوشیزہ یا ان کی طرف سے اس کام کے لئے مقرر کردہ کسی بھی افسر کی تصدیق صحیح اور درست تسلیم کی جائے گی۔

۳ — تمام حل متعلقہ دوشیزہ ادبی معمہ کے کوپن اور فیس کے ساتھ ماہنامہ دوشیزہ کراچی میں شائع کی جانے والی تاریخ مقررہ اوقات تک یا ان سے پیشتر دفتر دوشیزہ ۹۰۹ سی سنٹرل کمرشل ایریا علامہ اقبال روڈ پی ای سی ایچ ایس کراچی میں وصول ہونے چاہئیں۔ مالکان دوشیزہ اپنے خصوصی اختیارات کو کام میں لاتے ہوئے مقررہ تاریخ یا مقررہ وقت کے بعد مگر صحیح حل ظاہر کئے جانے سے پہلے پہلے جو حل ہائے وصول ہوں، کو شامل مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مقررہ تاریخ یا وقت کے اندر ارسال کئے ہوئے حل جو کسی بھی ڈاک یا کسی سبب سے نہیں پہنچ سکے یا دیر سے پہنچے ہیں انہیں شامل مقابلہ کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ لفافہ پر دوشیزہ ادبی معمہ کا نمبر لکھنا ضروری ہے۔ منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر یہ ضرور لکھ دیجئے کہ یہ دوشیزہ ادبی معمہ نمبر...... کی فیس ہے۔

یہ منی آرڈر یا پوسٹل آرڈر صرف ایک ہی شخص کی طرف سے ایک کوپن کے ساتھ بھیجے گئے حلوں کی فیس ہے۔ دفتر کے دوسرے شعبوں کی کوئی رقم اس میں شامل نہ کیجئے۔ ڈاک سے حل بھیجتے وقت لفافے پر اپنا پتہ اور متعلقہ دوشیزہ ادبی معمہ کا نمبر واضح طور پر لکھئے۔ ڈاک سے بھیجنے کے علاوہ دفتر دوشیزہ میں رکھے گئے مقامی حلوں کے بکس میں بھی ڈالے جا سکتے ہیں۔ حلوں کے وصول نہ ہونے، دیر سے وصول ہونے، ضائع ہو جانے یا گم ہو جانے کی صورت میں مالکان دوشیزہ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ کسی بھی دوشیزہ ادبی معمہ کا صحیح حل ظاہر کرنے کی تاریخ اور حل وصول ہونے کی آخری تاریخ اور وقت سے پہلے حلوں کی وصولیابی کی آخری تاریخوں میں اضافہ کیا جا سکتا ہے یا بالکل ہی منسوخ بھی کیا جا سکتا ہے۔ منسوخی کی صورت میں اس معمہ سے متعلق آئی ہوئی فیس واپس کر دی جائے گی۔ کوئی اشارہ غلط شائع ہو جانے کی صورت میں اس میں ترمیم کا اعلان کیا جا سکتا ہے یا اسے قطعاً منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ اشارہ منسوخ ہو جانے کی صورت میں اس اشارہ کا جو بھی جواب کسی نے لکھا ہوگا اس کی غلطی شمار نہیں کی جائے گی۔

۴ — جو الفاظ آپ موزوں سمجھتے ہوں ان پر کسی قسم کا نشان نہ لگائیے۔ ان الفاظ پر کراس (x) لگا دیجئے جو آپ کی دانست میں غیر موزوں ہوں۔ اس کے علاوہ ہر خاکے میں ہر اشارے کے آگے ۲، ۳ سادہ خانے دیئے گئے ہیں۔ جو ۲، ۳ مزید حلوں کے لئے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اس طرح ہر چھپا ہوا خاکہ ۴ حلوں کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر چھپا ہوا خاکہ ایک حل کے لئے استعمال کرنا ہو تو صرف غیر موزوں الفاظ کو کاٹ دینا کافی ہوگا۔ ہر غیر موزوں لفظ پر اس طرح کا نشان x لگا دیجئے۔ ایک بات یاد رکھئے سادہ کاغذ پر بھیجے جانے والے حل کی ترتیب میں اکثر غلطی ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اشارہ نمبر ۱ کی جگہ اشارہ نمبر ۲ کا اور اشارہ نمبر ۲ کی جگہ اشارہ نمبر ۱ کا جواب لکھ دیا گیا تو دو غلطیاں شمار کی جائیں گی۔ اس سے بچنے کے لیے چھپے ہوئے خاکے استعمال کیجئے جو پاکستان بھر میں ہر بک سٹال سے قیمتاً مل سکتے ہیں۔ صحیح حل ڈاک سے منگوانے کے لیے جوابی لفافہ اور پچاس پیسے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کیجئے۔

۵ — دوشیزہ ادبی معموں میں استعمال کئے گئے تمام اشارے اردو کی صرف ان کتابوں اور رسالوں سے اخذ کئے جائیں گے جو پاکستان اور قیام پاکستان سے قبل موجودہ پاکستانی علاقوں سے شائع ہوتے ہوں۔ اگر ایک کتاب یا رسالے کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہوں یا ایک اشارہ کئی کتابوں میں شامل ہو تو ان میں سے کسی کتاب یا کتاب کے کسی بھی ایڈیشن میں سے اشارہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ ہر ایڈیشن کو بجائے خود ایک علیحدہ کتاب سمجھا جائے گا۔

۶ — ہر دوشیزہ ادبی معمہ کا صرف ایک ہی حل ہے جسے کوئی بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔ تمام حل وصول ہونے کی تاریخ گزر جانے کے بعد دوشیزہ ادبی معمہ کا حل ظاہر کر دیا جائے گا۔ صحیح حل

[illegible] جنگ [illegible]
[illegible] آیا۔ اس [illegible]
کو دن میں دو دو دو چار خط لکھتا رہا کہ تمہارا شوہر اب دن کا سپاہی
ہے۔ جتنے جانا تھا پھر واقعی سے سرخرو ہو کر تمہیں گلے لگانے آئے
گا۔ وہ باہمت لڑکی مجھے پیار بھرے خط لکھتی رہی کہ تو بن جانے کا
تمہارا فیصلہ میں نے دل سے قبول کیا مگر میرے محبوب تو اپنی پہلی جھلک
بھی دکھا جانا ورنہ میں مر جاؤں گی۔ کشمیر کے محاذ پر مجھے نسرین کا وہ خط ملا
جس نے مجھے خوشی سے دیوانہ کر دیا۔ میں بیٹے کا باپ بن گیا تھا۔ اسی
وقت چھ گھنٹے کا آؤٹ پاس بنا کر سیدھا چپاری کے بازار گیا۔ مٹھائی
وغیرہ خرید کر واپس پوسٹ پر آیا اور اپنے ساتھیوں میں مٹھائی بانٹی۔
انہوں نے چھوٹا سا جشن منا ڈالا۔ کوئی ناچ رہا تھا کوئی گا گا کر مجھے مبارکباد
دے رہا تھا۔ ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا صحیح لطف وہی محسوس کر سکتے
ہیں جنہوں نے محاذ کے دن گزارے ہوں۔ میں نے نسرین کے خط کا
وہ حصہ جس میں اس نے بیٹے کی خوشخبری لکھی تھی دوستوں کے
کہنے پر باری باری سب کو دکھایا اور سبھی نے مجھے بھینچ بھینچ کر گلے لگایا
تین چار دن تک میرا ذہن اور جسم اتنا ہلکا پھلکا رہا کہ جیسے میں بادلوں
میں تیر رہا ہوں۔ میں نے چھٹی کے لیے درخواست دے دی۔ اس
کا جواب آیا بھی نہیں تھا کہ نسرین کی بیماری کی اطلاع ملی۔ لکھا تھا۔
"جلد آ جاؤ میں بہت بیمار ہوں" خط کی کپکپاتی تحریر سے نسرین کی حالت
کا اندازہ ہو رہا تھا۔ میری ساری خوشی کافور ہو گئی۔ میں اپنے کمانڈر سے
ملا کہ میری بیوی بیمار ہے چھٹی مل جائے تو عنایت ہو گی۔ وہ کہنے لگا کہ
انور تم جانتے ہو دشمن تاک میں ہے۔ ایسے نازک وقت میں سپاہیوں
کی چھٹیاں کینسل کی جاتی ہیں اور تم چھٹی مانگ رہے ہو۔ وطن کا پیار بیوی
کے پیار سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ پہلے وطن کے فرائض ادا کرو وہاں
تمہاری بیوی کو سنبھالنے والے بہت سے رشتے موجود ہیں۔ ان کی
بات ذہن کو تو لگی مگر اس سالے دل کو کون سمجھاتا۔ سر جھکا کر میں
واپس تو آ گیا مگر اندر ہی اندر کلیجہ سا کٹ رہا تھا۔ مورچے میں بیٹھا ہر پل
نسرین کے لیے دعائیں مانگتا۔ ان دنوں مشرقی پاکستان کی لڑائی زوروں
پر تھی۔ ان کی بات بھی اپنی جگہ درست تھی۔ شام کو لنگر سے کھانا آیا
تو دو لقمے بھی حلق سے نہیں اترے۔ یار دوستوں نے بہت سمجھایا کہ
صبر کرو اللہ بہتر کرے گا۔ مگر دل نے کسی کی تسلی قبول نہیں کی۔ ایک
طرف بیوی بیٹا تھا اور دوسری طرف وطن کے دفاع کا سوال تھا۔ آخر
مجھے وطن کی حفاظت کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس دوران نسرین
کا ایک خط آیا لکھا تھا "یاد ہے میں نے تم سے چلتے وقت پوچھا تھا کہ

واپس [illegible] نسرین [illegible]
پوچھا اس [illegible] کے بعد تم [illegible]
دہرا رہی ہیں [illegible] آؤ گے نا؟"
نسرین مجھ کو کیسے بتاؤں کہ اس خط نے میرے دل میں کیسا
طوفان مچایا۔ مگر جنگ کے حالات [illegible] تھے [illegible] آپ
کو جنگ کے حالات میں نہیں سنا رہا کیونکہ یہ صرف میری محبت
کی کہانی ہے جس میں جنگ نے یہ کردار ادا کیا کہ میں اپنی محبوب بیوی
سے ملنے نہ جا سکا۔ اور جب جنگ اپنے بھیانک نتائج کے ساتھ ختم ہو
گئی تو میں سیدھا اپنے کمانڈر کے پاس پہنچا کہ اب مجھے رخصت چاہیے
کمانڈر نے چھٹی جلد دینے کا وعدہ کر لیا۔ خوش خوش مورچے میں آیا۔
نسرین کے پچھلے سارے خطوط نکالے اور پڑھنے بیٹھ گیا۔ آخری خط
سب سے پہلے ہاتھ میں آ گیا اور سب سے پہلے جملے پر نظر پڑی وہ
یہی تھا "واپس آؤ گے نا؟" آپ یقین کریں یہ لفظ سرگوشی بن کر میرے
کانوں میں سنائی دینے لگے جیسے نسرین بار بار یہ دہرا رہی ہو۔ میں
چونک گیا۔ ادھر ادھر دیکھا کوئی دور نزدیک نہ تھا اور اس سے پہلے
کہ میں اس آواز کی تہہ تک اترتا میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی
جس نے درد کا روپ دھار کر میرے سارے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا
میں نے دل پر ہاتھ رکھا وہ تو جیسے کسی نے نوچ کر باہر ہی پھینک دیا
تھا۔ ایک چیخ ماری اور گر کر بے ہوش ہو گیا۔ مجھے فوراً پوسٹ کمانڈر
نے ایم۔ آئی روم بھیج دیا۔ وہاں ڈاکٹر نے معائنے کے بعد چھٹی پر جانے
کا مشورہ دیا۔ اس خبر نے میری حالت بہتر کر دی مگر اس کے باوجود
ذہن پر نامعلوم سا بوجھ ہو گیا تھا۔ اسی روز میں نے اپنا مختصر سامان
سنبھالا اور راہداری لے کر فوجی گاڑی میں سوار ہو کر مظفر آباد آ گیا۔
وہاں سے بس کے ذریعے پنڈی آیا۔ میرا فرض تھا کہ میں پہلے اپنے
والدین کے پاس جاتا تاکہ ماں کی مامتا ٹھنڈی ہوتی مگر میرے قدم مجھے
پنڈی کی گلیوں میں لے آئے۔ انہی گلیوں میں پہلی بار میں نے نسرین
کو کھڑکی سے جھانکتے دیکھا تھا۔ یہاں کی ایک ایک اینٹ میری
محبت کی یادگار بنی ہوئی تھی۔ بھاگتے قدموں سے گلی عبور کی اور تیر
کی طرح گھر میں داخل ہوا۔ مگر وہاں تو در و دیوار جیسے روتے نظر آ رہے
تھے۔ نسرین کے قہقہے تھے نہ ننھے بچے کے رونے کی آواز۔ پاگلوں کی طرح
نسرین کو آوازیں دیتا کبھی اس کمرے میں گھستا کبھی دوسرے میں۔ میری
ساس غسل خانے سے نکلیں اور بھاگ کر مجھ سے لپٹ کر رونے لگیں۔
شور سن کر سالے سالی کی بیوی بھی جمع ہو گئیں اور تب میرے کانوں میں
یہ سیسہ پگھلا دیا گیا کہ نسرین مجھے پکارتی آسمانوں کی وسعتوں میں گم ہو

چکی ہے۔ اس کے بعد [illegible] خالقِ حقیقی کے حضور چلا گیا۔ وہ مر گئی — مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ یقین میں کیسے کرتا کہ اس کا باپ دکھ لانے کے لیے قبرستان لوگوں سے پکڑ کر پہنچایا میں نے [illegible] ایک چھوٹا [illegible] اور میری میری کل کائنات تھی — [illegible] آج میں بڑی دوست [illegible] ایک ایسی آگ روح میں سلگتی رہتی ہے جس نے مجھے نیم دیوانہ کر دیا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ شیخ یہ سرگوشیاں میرے گرد منڈلاتی رہیں گی۔ تم واپس آ تو گئے نا؟ آپ بتائیے کہ شمع فریدی کے اس سوال کا جواب کیسے دوں ——— ؟

خورشید انور۔ راولپنڈی

[illegible]

یہ میرے قبیلے کی کہانی ہے۔ شیلانہ آفریدی کی کہ آغا آفریدی کی اکلوتی اولاد تھی۔ بلوری آنکھوں والی شیلانہ اپنی قبائلی سہیلیوں میں سب سے منفرد تھی۔ حسن کے اعتبار سے تو وہ تھی ہی لاکھوں میں ایک، لیکن سب سے بڑی مصیبت تو اس کا ذہن تھا جو بچپن سے ہر بات کو نئے انداز سے سوچتا تھا۔ اور یہ سوچ کچھ ایسی کچی تھی کہ بعض اوقات آغا آفریدی بھی پریشان ہو جاتا تھا۔ قبائلی رسم و رواج پر شیلانہ جیسی کفری باتیں کر جاتی تھی جسے سن کر اس کی بھولی بھالی سہیلیاں ہائے اللہ کتنا کفر بکتی ہے تو کہہ کر اس سے دور دور رہنے لگی تھیں۔ مگر اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ اس کا باپ اپنی بیٹی کی ذہانت بھانپ کر اسے پڑھانے کا فیصلہ کر چکا تھا جو ہمارے قبائلی روایات کے منافی تھا۔ آغا کا دبدبہ سب پر غالب تھا اس لیے رشتے ناتے کے لوگ کچھ بول نہ سکے۔ شیلانہ کے چچا نے تھوڑا بہت جھگڑا کیا کیونکہ شیلانہ اس کے اکلوتے بیٹے ضمیر آفریدی کی ٹھیکرے کی مانگ تھی۔ آغا جان نے اسے کہہ دیا کہ تو بھی اپنے بیٹے کو پڑھائی کے زیور سے آراستہ کر۔ میں اپنی بیٹی کی ذہانت کو ضائع نہیں کر سکتا۔ اس پر بھائی نے بگڑ کر بات چیت بند کر دی۔ آغا آفریدی نے اس کی ناراضگی کا کوئی اثر نہ لیا اور شیلانہ کو پشاور کے ایک اسکول میں داخل کرا دیا۔ وہ عام لڑکیوں سے تیز تھی ایک کے بعد ایک جماعت پھلانگتی چلی گئی۔ اس کے ذہن کو جیسے روشنی ملتی گئی۔ بہت سے سوالات جو اس کے اندر ہی اندر بھٹکا کرتے تھے اب اپنا صحیح راستہ پا کر مطمئن ہونے لگے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر یہ احساس بھی بیدار ہو گیا کہ اس کے قبیلے کے لوگ بہت اندھیروں میں ہیں۔ اسے اپنے گاؤں کے گبرو جاہلیت کی پرستش کرتے نظر آنے لگے ان میں اس کا منگیتر ضمیر آفریدی بھی تھا جو خیبر کلے کے حسب نسب کا اکلوتا بیٹا ہونے کے باوجود آج تک اس کا دل نہیں جیت سکا تھا۔ اونچا لمبا سرخ و سفید رنگ کا یہ نوجوان گلے میں سنہری کارتوسوں کی پیٹی سجائے سر پر سنہری دھاری والی بڑی سی پگڑی باندھے جس کی سے گزرتا تھا لڑکیاں بالیاں ہاتھ کا چھجا بنائے اسے دور تک جاتا دیکھتی رہتی تھیں۔ وہ سب شیلانہ کی قسمت پر رشک کرتی تھیں جسے اس کے باپ نے بیس ہزار کا ٹھیکرہ رکھ کر مانگ لیا تھا۔ مگر ایک شیلانہ بدنصیب تھی جو اس گبرو سے آج تک محبت تو کجا انسیت بھی پیدا نہ کر پائی تھی۔ جوں جوں تعلیم اس کے دل و دماغ پر اپنا اثر کرتی گئی اسے ضمیر آفریدی ظالم سفاک آدمی نظر آتا گیا۔ جب دل ہی کسی کو قبول نہ کرے تو وہ چاہے سونے کا بنا ہوا کیوں نہ ہو نظر بھر کر دیکھنے کو بھی طبیعت نہیں چاہتی۔ یہی حال شیلانہ کا تھا۔ ضمیر آفریدی بہانہ کر کر کے اپنے تایا سے ملنے آتا تھا۔ چھٹیوں میں تو اس کے سو سو چکر ہوتے تھے لیکن یہ کافر ادا شیلانہ اسے غیروں کی طرح سلام دعا سے آگے کبھی نہ بڑھنے دیتی جس سے اس کی آتشِ شوق کو اور ہوا ملتی۔ کبھی سوچتا کہ اس کی تعلیم چھڑا کر جلدی سے بیاہ کر لے تاکہ اس کے بڑھتے نخرے خطرے کے نشان سے اوپر نہ چلے جائیں۔ کبھی سوچتا کہ وہ تنہائی میں مل کر اس کے دل کا حال جان لینے کی کوشش کرے۔ مگر اپنے تایا کے تیور دیکھ کر ڈرتا تھا کہ کہیں وہ یہ مانگ ہی نہ توڑ بیٹھے۔ اور شاید یہ ممکن ہو بھی جاتا کیونکہ آغا آفریدی سمجھ چکا تھا اس کی بیٹی سے ضمیر کا جوڑ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ بیٹی کے انداز بھی دیکھ چکا تھا مگر ابھی وہ فیصلہ کر نہ پایا تھا کہ اجل نے آ لیا۔ شیلانہ میٹرک کا امتحان دے کر گھر رزلٹ کے انتظار میں دن گن رہی تھی۔ اس کے آغا نے وعدہ کیا تھا کہ کالج میں داخلہ ضرور دلائے گا مگر یہ سب کچھ دھرا رہ گیا۔ آغا آفریدی موت کا بلاوا نہ ٹال سکا اور اچانک ہی ہمیشہ کی نیند سو گیا۔ شیلانہ پر تو آسمان ٹوٹ پڑا۔ باپ کا سہارا کیا چھنا ہی تھا ساتھ ساتھ اس کی اپنی تقدیر بھی ظلمت میں جا چھپی۔ کیونکہ دفنانے کی رسومات کے دوران اس کے چچا نے جرگہ [illegible] سے اعلان کر دیا تھا کہ وہ چہلم کے بعد بھائی کی بیٹی کو اپنے بیٹے سے بیاہ کر لے جائے گا وہ مرحوم بھائی کی روح پر بیٹی کے کنوارے پن کا بوجھ زیادہ عرصے تک نہیں ڈال سکتا۔ یہ وہ اعلان تھا جو شیلانہ کے

بیٹے باپ کی موت سے کم پریشان کن نہیں تھا۔ بات مشروع ہوتی
کہ اسے بیاہ کر جاتا ہے تو شاید وہ اتنی بے کل نہ ہوتی۔ اصل وجہ یہ تھی
کہ وہ قبیلے کے ایک پڑھے لکھے نوجوان ساحر گل کو دل دے بیٹھی تھی۔ مڈل
کا امتحان دینے لڑکوں کے اسکول گئی تھی وہاں اسے اپنے علاقے کا ساحر
گل مل گیا جو کالج میں پڑھتا تھا۔ کسی کام سے اسکول آیا ہوا تھا۔ سیاہ
مخمور سی آنکھوں والے اس لڑکے میں کچھ ایسی بات ضرور تھی کہ یہ کمزور
دل لڑکی رات بھر اسی کے خیال میں گم رہی اور جب تک امتحانات ہوتے
رہے وہ ایک دوسرے ہی امتحان میں مبتلا رہی۔ محبت جیت گئی فاصلے
مٹ گئے۔ ساحر گل اب ایف اے کر کے بی اے کا امتحان دے رہا تھا اور
اس عرصے میں وہ دونوں ایک دوسرے کے خاصے قریب آ گئے۔ شیلانہ
کو یقین تھا کہ وہ جب اپنے آغا سے اپنی پسند کا دبے لفظوں میں ذکر
کرے گی تو وہ ضرور کچھ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ میٹرک کے بعد اس کا
اپنی ماں سے یہ تذکرہ کرنے کا ارادہ تھا مگر گاؤں آنے پر پتہ چلا کہ آغا
کی بازار میں کسی معمولی سی بات پر ملک زرین خان شینواری سے تلخی ہو
گئی۔ ملک آغا آفریدی نے اسے ماں کی گالی دے ڈالی۔ جو جھگڑے
کا سبب بن گئی۔ جھگڑا تو جرگے نے اسی وقت ختم کروا دیا لیکن غیرت کا ملک
زرین خان اندر ہی اندر سلگتا رہا۔ ماں کی گالی اسے ہمیشہ لڑائی پر اکساتی
رہی۔ اور یہ ساحر گل اسی زرین ملک کا بیٹا تھا۔ اس جھگڑے کی روداد
سننے کے بعد شیلانہ کو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی وہ کسی مناسب موقع کی
تلاش میں تھی کہ سارا کھیل ہی ختم ہو گیا۔ آغا آفریدی کے جنازے میں
ملک زرین بھی شریک تھا مگر اس غم میں مبتلا تھا کہ ملک آغا آفریدی
اپنی موت کیوں مرا اس کی گولی کا نشانہ کیوں نہ بن سکا۔ اس کی دی ہوئی
گالی آج بھی کانٹا بن کر دل میں چبھ رہی تھی اور ادھر شیلانہ کا دماغ اس
بوجھ سے پھٹا جا رہا تھا کہ وہ چند ماہ بعد زبردستی ضمیر آفریدی کی بیوی
بنا دی جائے گی جب کہ وہ خود کو ساحر گل کی امانت سمجھتی تھی۔ یہ عہد
وہ اسے دے بھی چکی تھی لیکن اب اس کی حیثیت ایک بے بس پنچھی
جیسی تھی۔ وہ اپنے چچا کے بس میں تھی جو اس کے آغا کے چالیسویں پر
اسے بہو بنانے آ رہا تھا۔ لوگ کہتے ہیں باپ کا جتنا غم شیلانہ نے
کیا قبیلے کی کسی اور لڑکی نے اتنا غم کبھی نہ کیا تھا۔ وہ دن بہ دن زرد ہوتی
گئی۔ کوئی اس کے دل کا حال نہ جانتا تھا۔ ماں سے کہنا چاہتی تھی مگر
ہمت نہ ہوتی تھی۔ چالیس روز پورے ہو گئے۔ ضمیر آفریدی اپنی بیوی
اور بابا منصور کے ساتھ آ گیا۔ اس کی جیب میں ہرے ہرے نوٹ
بھرے ہوتے تھے۔ شیلانہ کے مستقبل کا فیصلہ ہونے والا تھا اور اگر اس
لمحے بھی وہ چپ کی آگ میں جلتی رہی تو پھر ساری عمر پچھتاتے گزرنا تھی۔ وہ
ایک ہجوم سے گزرتی تھی۔ مہمانوں کے لیے رات کو عمدہ کھانے کا انتظام
ہو رہا تھا۔ اس کی بے بسی نے اسے اجازت دے دی کہ وہ دو گھڑی
کے لیے اپنی کسی سہیلی کے پاس جا سکتی ہے کہ ہم فیصلہ کرتے وقت وہ
سامنے دیکھتے۔ اسے اطلاع ملی تھی آج حفاظتی مینار میں ساحر گل ڈیوٹی
دے رہا تھا۔ وہ قصبے سے چلی اور بھاگتی بھاگتی حفاظتی مینار کے نزدیک
آ گئی۔ اس کا آنچل ساحر گل نے دور سے پہچان لیا۔ وہ باہر آ گیا۔ ہچکیوں
اور آنسوؤں کے درمیان شیلانہ نے پوری کتھا سنائی کہ آج اس کے
بیاہ کا دن مقرر ہو رہا ہے۔ کچھ کرنا ہے تو کرو میں تمہارے ساتھ ہوں۔
ساحر گل نے اسے دلاسہ دیا۔ گھبرانے کی بات نہیں باتیں جذباتی ہو کر
سوچو گی تو دونوں کچھ نہ کر پائیں گے۔ میں آج بابا سے بات کرتا ہوں وہ
ضرور کوئی حل سوچ نکالیں گے۔ اس وقت تم سیدھی گھر چلی جاؤ میں
کل تم سے ملنے گھر آؤں گا۔ شیلانہ آنسو پونچھتی دل کو ڈھارس دیتی گھر
لوٹ آئی۔ اس وقت تک سب کچھ طے ہو چکا تھا کہ اس جمعہ کو سادگی
سے نکاح کی رسم ادا کر کے شیلانہ کی رخصتی ہو جائے گی۔ اب اس کا
ایک سہارا روشن تھا کہ کل کی رات ساحر گل اس کے لیے کیا پیغام لاتا ہے
ساحر گل پر اسے اعتماد تھا وہ اسی آس کے سہارے آرام سے سو گئی۔
دوسرا دن بے چینی سے کٹا۔ اور ادھر ساحر گل نے ڈرتے ڈرتے اپنے
دل کی بات اپنے بابا سے کہہ ڈالی۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ کل رات
اس کے بابا ملک زرین نے ان دونوں کی ساری باتیں اپنے کانوں سے
سن لی ہیں وہ اس لڑکی کو پہچان نہیں سکا تھا ساحر گل نے بتا دیا کہ وہ
آغا آفریدی کی لڑکی شیلانہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کا باپ بھڑک
اٹھے گا پر ایسا نہیں ہوا نام سننے کے بعد بھی ملک زرین کے ہونٹ
زیر لب مسکراتے رہے۔ ساحر گل نے سہمے سہمے انداز سے یہ بھی کہہ
دیا کہ وہ اس لڑکی کے بغیر جی نہیں سکتا۔ باپ نے گرج کر پوچھا "لڑکی
کی ٹھیکے کی مانگ کتنے میں رکھی گئی ہے"؟ ساحر گل نے بتایا کہ بیس
ہزار مقرر ہوتے تھے۔ اب ساحر گل بچوں کی طرح مچل گیا کہ بابا ہم اس
مانگ سے زیادہ رقم ادا کر سکتے ہیں کسی طرح شیلانہ کا بیاہ رکوا دو۔
ملک زرین بیٹے کی اس بات پر بپھر اٹھا گرج کر بولا "ساحر گل کیا ضمیر
آفریدی تم سے زیادہ طاقتور ہے"؟ ساحر گل نے باپ کی اس بات پر
اپنی رگوں میں خون تیزی سے دوڑتا محسوس کیا۔ وہ گردن اونچی کر کے
بولا "نہیں بابا میں اسے ہرا سکتا ہوں" اس پر ملک زرین بگڑ گیا "کیا
تمہیں اپنے بازوؤں پر بھروسہ نہیں رہا جو پیسوں کا سہارا لے کر لڑکی
حاصل کرنا چاہتے ہو۔ بیاہ دو کہ وہ میرے دشمن کی بیٹی ہے اور اس کے باپ
نے مجھے گالی دی تھی۔ یہ دشمنی ابھی تازہ ہے۔ اس کی ماں بہن کی کیسی قیمت

پر تمہارے سپرد نہیں کرے گی۔ محبت ایک عبادت سمجھا جاتا ہے جو ہماری
کی طاقت کا راستہ ہے۔ ہم جنرل سنگھ سے کہیں اس رہ تیرہ بابا
سدا کا اصول ہے بشرطیکہ لڑکی کی رضا بھی شامل ہو۔ ساحر گل باپ
کے اس فیصلے پر مقصد سمجھ کا اس نے متذبذب ہو کر پوچھا "بابا اگر
دونوں قبیلے آپ کے دشمن ہو جائیں گے" بوڑھا قصبہ ان دونوں کی نیت
نیچی پہاڑی پر واقع بستی ملک زریں خان نے اسی ڈھنگ سے جواب
دیا کہ یہ پروا مجھے کرنا ہے تمہیں نہیں۔ تم لڑکی کو لے کر دور چلے جاؤ چند دن
بعد حالات درست ہونے پر میں تمہیں بلا لوں گا۔ جاؤ آج ہی اپنا کام
کرو۔ اور ساحر گل کے بازوؤں میں جیسے بجلی سی بھر گئی

اس رات ڈھلتے ہی جیسے اندھی طاقتوں کے گھوڑے ہنہنانے
جیسے ہر شے اس سازش میں شریک ہو گئی تھی۔ ساحر گل دبے پاؤں
رات کے اندھیرے میں چھپتا چھپاتا شیلانہ سے ملنے آیا۔ وہ اپنی بلوریں
آنکھیں کھولے اس کے قدموں کی آہٹ کا انتظار کر رہی تھی۔ ساحر
آیا تو منہ سے کچھ نہ بولا اور نہ یہ وقت کچھ کہنے سننے کا تھا فیصلہ ہو چکا تھا
اب صرف عمل کرنا تھا اس نے بانہیں پھیلا دیں شیلانہ ان میں سما گئی
اس نے پھول سی شیلانہ کو اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ شیلانہ نے اس فیصلے
کو قبول کر لیا۔ لمحہ بھر میں شیلانہ کا بستر اس کے وجود سے خالی تھا اس کی
جگہ ساحر گل کے رکھے ہوئے تیس ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں نظر آ رہی
تھیں جن پر ساحر گل نے احتیاطاً تکیہ رکھ دیا تھا اور اس سے پہلے کہ اس
راز سے پردہ اٹھتا ساحر گل کی گھوڑی ان دونوں کو بہت دور لے گئی۔ وہ
ساری رات چلتے رہے۔ دن کو کسی غار میں پناہ لے کر پھر رات کو سفر
پر روانہ ہو گئے۔ تین دن تین رات اسی طرح چھپ چھپ کر چلنے کے
بعد انہوں نے تیراہ کی پہاڑیوں میں پناہ لے لی۔ ایک غار کو صاف ستھرا
کر کے عارضی گھر بنا لیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ چند دن یہاں ٹھہر کر انہیں تعاقب
کرنے والوں کے ارادے بھانپ لینے چاہئیں۔ تاکہ اس کے بعد پناہ
کا نیا ٹھکانہ بنایا جا سکے۔ اگر یہاں کوئی آنے میں کامیاب نہ ہوا تو وہ نیچے
اتر کر تیراہ کی وادی میں اپنی نئی دنیا بسا لیں گے اور اس وقت تک وہیں
رہیں گے جب تک ان کا بابا دونوں کو لوٹنے کا پیغام نہ بھیجے۔

ادھر صبح شیلانہ کی بے بے اٹھی وضو کر کے نماز پڑھی گھر میں
سناٹا سا لگا۔ اس وقت تک شیلانہ اٹھ جایا کرتی تھی۔ تسبیح پھیرتے ہوئے
جگانے کا ارادہ کر کے اس کے پلنگ تک آئی تو کلیجہ دھک سے رہ گیا
بستر خالی تھا تکیے تلے دبے نوٹ صبح کی ہوا سے پھڑپھڑا رہے تھے گھبرا کر
تکیہ اٹھایا تو تیس ہزار کی گڈیاں دبی ہوئی تھیں۔ سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا کہ
لڑکی اپنی قیمت ادا کر کے خود چلی گئی ہے مگر کہاں۔ وہ اور بھرات

# غزل

نعیم حسین فگار

ملے گا جب بھی وہ اک شخص دل جلائے گا
نہ کچھ ہماری سنے گا نہ خود سنائے گا

چلے بھی جاؤ کہ اب ہم نہ تم کو روکیں گے
تمہارے قرب کا غم اب نہ دل اٹھائے گا

جواں ہے درد کی ناگن مچل کے ڈس لے گی
پھر اس کے کاٹے کا منتر کوئی نہ پائے گا

عجیب دور ہے ہر شخص اپنا قاتل ہے
کسی کا دکھ بھلا کیسے کوئی بٹائے گا

جو اعتبار کا شیشہ تھا چکنا چور ہوا
ایک اعتماد کا غم عمر بھر رلائے گا

سُرخ پتھر یہ دل کا نازک ہے
ذرا سی ٹھیس سے کم بخت ٹوٹ جائے گا

فگار جاگتی آنکھوں سے خواب مت دیکھو
جو جا چکا ہے وہ اب لوٹ کے نہ آئے گا

❖ ❖ ❖

لاشعور میں کیسی کیسی بھیانک آرزوئیں چھپ کر رہتی ہیں

ایک نفسیاتی کہانی

حادثے کا نام سن کر میرا ذہن ہمیشہ انسان کی ناتمام تمناؤں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی تشنہ تمنائیں دنیا میں حادثات بن کر رونما ہوتی ہیں۔ لوگ انہیں اتفاقات سمجھتے ہیں مگر تجربات و مشاہدات نے مجھ پر ثابت کیا ہے کہ انسان حادثے کی تیاری خفیہ اور بالکل انجان طریقوں سے برسوں کرتا رہتا ہے۔ تب کہیں جا کر دنیا میں ایک حادثہ رونما ہوتا ہے۔

اگر آپ کو میری رائے سے اختلاف ہے تو ذیل کا واقعہ سنیئے!

یہ گزشتہ خزاں کا ذکر ہے جب میں ایک اعصابی مرض سے نئی نئی صحت یاب ہوئی تھی اور ہنگاموں سے دور آرام و سکون کی خاطر چند دنوں کے لئے بوڑھے ڈاکٹر گارسکے کے پاس شہر نیل کے چمکیلے ساحلوں پر آئی ہوئی تھی۔

رات بھیانک اور شدید طوفانی تھی۔ سمندر میں سخت تلاطم آیا ہوا تھا۔ موجیں اٹھ اٹھ کر آسمان کا منہ چوم رہی تھیں اور درخت مارے خوف کے جھک جھک کر گیتی کے سینے سے چمٹ گئے تھے۔

میں افسردہ اور سہمی ہوئی سی تھی۔ ایک اعصابی تکیہ بانہوں میں گول کر لی تھی اور اپنے سیامی بلّے کو گود میں لئے چپ چاپ آتش دان کے پاس بیٹھی ہوئی ہوا کی سسکیوں کو محو ہو کر سن رہی تھی۔ ڈاکٹر گارسکے اپنی نسوار کی ڈبیا پر چٹکی بجاتے ہوئے حسب معمول مجھے بہلانے کے لئے اپنی تجربات سے معمور زندگی کے واقعات سنا رہا تھا۔ موسم کے سلسلے میں میری افسردگی

سے بچایا۔ اس محبت بھرے لہجے میں نے اپنے بھائی کو دیکھا ہے۔ میں اس
حادثے کا ذمہ دار ہوں۔ کار میں چلا رہا تھا۔ وہ مجھے منع کرتا تھا مگر میں نے
اس کی ایک نہ سنی۔ ایسی احمقانہ بات تھی۔ اس کے بار بار منع کرنے کے
باوجود میں کار لے کر پکنک پر چلا گیا۔ بارش کی پروا کیے بغیر کار لے کر آگے
کو بڑھتا ہی چلا گیا۔ دراصل میں آج نصف شب تک منزل پر پہنچ جانا
چاہتا تھا۔ اس کی بیوی کے ہاں بچہ ہونے والا تھا۔ اس لئے اس کا وہاں
پہنچنا ضروری تھا۔ یہ خبر نہ تھی کہ وہ میرے ہاتھوں اس حادثے کا شکار
ہو جائے گا۔"

اور یہ کہتے کہتے وہ یک لخت زمین پر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ ڈاکٹر
گلزار نے اس کی شال کھول کر پھینک دی اسے ہوش میں لانے کی تدابیر
کرنے لگا پھر میری طرف مڑ کر بولا "وقت کم ہے۔ مجروح کو فوری
آپریشن کی ضرورت ہے۔ یہ آدمی جلدی ہوش میں آ جائے گا۔ اسے تو
محض ذہنی دھچکا لگا ہے۔ خوف کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا ہے۔ میں مجروح
کو لے کر اسپتال جا رہا ہوں۔ اس کی زندگی کی امید کم ہے۔"

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر گلزار نے جلدی سے اپنا برساتی کوٹ پہنا اور
لوگوں کی مدد سے مجروح کو کار میں ڈال کر رات کے اندھیرے اور طوفان کے
مسلسل شور میں اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں بے ہوش مریض کی طرف متوجہ ہو
گئی۔ اپنے سیاہ رو سیاہی پٹے کو اونی شال میں لپیٹ کر اور اس کے
سر پر کنٹوپ کس کر آتش دان کے پاس ایک مخملی نرم کرسی پر بٹھا دیا اور
خود ڈاکٹر گلزار کی ہدایات کے مطابق مریض کے سرہانے بیٹھ کر اس کے
ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگی تاکہ اسے دوا پلاؤں۔

کچھ دیر بعد مجھے نیند سی آنے لگی۔ میں ایک کشن کے سہارے
نیم دراز ہو گئی اور آنکھیں بند کر لیں مگر اچانک کراہنے کی آواز سے میری
آنکھ کھل گئی اور میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

"میں نے اس کی جان لی ہے ۔۔۔ میں نے اسے مارا ہے۔
میں گناہ گار ہوں ۔۔۔ میں ۔۔۔"

ابھی وہ پوری طرح ہوش میں نہ آیا تھا۔ اس کی زبان سے عجیب
عجیب نامکمل فقرے نکل رہے تھے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ اسے بے ہوش
دیکھ کر مدفون جذبات اپنی پرانی قبروں سے سر باہر نکالنے کی کوشش
کر رہے ہیں۔

اس کا چہرہ لاش کی طرح زرد اور اس کا جسم برف کی طرح سرد
تھا۔ میں نے اس پر جھک کر آہستہ سے کہا "دوا پی لو۔"

میری آواز سن کر وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ پھر
بولا "مہرو!" اور نا امیدی کے انداز سے منہ پھیر لیا۔

میں نے ملائمت سے کہا "یہ دوا پی لو۔"

وہ یک دم ہوش میں آ گیا اور بولا "نہیں مجھے مت پلاؤ ۔۔۔
ہر گز نہیں ۔۔۔ مجھے تنہا چھوڑ دو اور چلی جاؤ ۔۔۔"

میں پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ کیا کروں۔ پھر بولی "تمھیں غلط فہمی
ہوئی ہے۔ میں مہرو نہیں ہوں ۔۔۔ دوا پی لو۔"

"مہرو نہیں ہو تو اور کون ہو؟ میں تمہارے قابل نہیں۔ پھر کیوں
دوا پلا رہی ہو۔ دھوکا مت دو مجھے۔"

میں نے ملائمت سے پوچھا "مجھے کیا معلوم کہ مہرو کون ہے؟ میں تو
تم کو بھی نہیں جانتی۔ تم کار کے ایک حادثے میں زخمی ہو گئے اور یہاں
لائے گئے تھے ۔۔۔ مہرو کون ہے ۔۔۔؟"

"میری بھاوج ہے۔"

"اور تمھیں اس سے دلچسپی ہے؟" میں نے دوا پلاتے پلاتے
پوچھا۔

"اسے بھی مجھ سے دلچسپی تھی۔" اب اسے ہوش آ گیا تھا۔ بات
کرتے کرتے رک گیا اور پوچھا ۔۔۔ "میرا بھائی؟ وہ کہاں ہے،
کیا مر گیا؟"

میں نے کہا "اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ فوری طور پر آپریشن
کے لئے اسپتال پہنچا دیا ہے۔ فکر نہ کرو وہ بچ جائے گا۔"

اس نے گردن پھیر لی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "نہیں ۔۔۔ وہ
نہیں بچے گا۔ میں نے اسے مار ڈالا ہے۔"

"وہ ابھی زندہ ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"مگر کار پل پر سے الٹ گئی تھی۔ وہ ایک کھڈ میں جا گرا تھا۔ وہ زندہ
نہیں رہ سکتا۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تم نہیں چاہتے کہ وہ زندہ رہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"اگر وہ مر گیا تو میں خودکشی کر لوں گا۔ مجھے اپنے بھائی سے محبت
ہے۔ میں تمام عمر اس سے محبت کرتا رہا مگر قسمت کو یہی منظور تھا کہ وہ میرے
ہاتھوں موت کے گھاٹ اترے۔"

"قسمت کو تو نہیں ۔۔۔ یوں معلوم ہوتا ہے تم کو یہی منظور
ہے کہ وہ موت کے گھاٹ اترے۔ تمھیں معلوم ہے کہ وہ ابھی زندہ ہے
مگر تم بے حیائی میں اس کے متعلق یوں باتیں کر رہے ہو جیسے وہ مر چکا
ہے۔ میرے یقین دلانے کے باوجود کہ ابھی وہ زندہ ہے تمھیں اس کی
زندگی کا یقین نہیں آتا۔ اس پر بھی تم اپنے بھائی کی محبت کے دعویدار
بنتے ہو؟"

"کیا تمھیں میری محبت میں شبہ ہے؟" اس نے غصے سے تیز ہو کر کہا۔

ثروت چوہدری

# اندھیرا باہر کا منظر اور میں

ہوسٹل کی زندگی بڑی عجیب ہے لیکن ہے بڑی پُرسکون،
دور دور تک سائیں سائیں کرتے ہوئے سیاہ لبادہ اوڑھے
کسی بھوت کی مانند کھڑے ہوئے درخت،
اور کبھی کبھی کسی گزرتی ہوئی بس یا ٹرک کی پُرشور آواز،
کبھی دور سے کسی گیدڑ کی اداسی اور دہشت پھیلاتی ہوئی چیخ،

ویران ویران سے پُرہیبت پہاڑ
یہ سب کچھ میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا
میرے اندر تو اس سے بھی بھیانک منظر سجا ہے۔
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اس منظر میں ایک اضافہ ہوں
بال بکھرے، دانت نکلے، پنجے نکالے ایک چڑیل ہوں،
لڑکیاں اپنے اپنے کمروں کی بتیاں روشن رکھتی ہیں
لیکن میں ــــــــ
اپنے اندھیرے کمرے میں نرم و گداز بستر پہ سوچتی ہوں کہ
میں ــــ میں کس سے ڈروں؟ ــــــــ

اس اندھیرے سے؟ ــــــــ
یا باہر کے منظر سے؟ ــــــ یا ــــــ
اپنے آپ سے ــــــــ

[illegible] جانتے [illegible] تب سے برداشت کا حوصلہ تھا۔
[illegible] اندر چلی گئی —— پاپا کا چہرہ سفید پڑ
گیا —— [illegible] ایک نظر سامنے بیٹھی عادل کی ماں پر ڈالی
[illegible] طبیعت [illegible] گھبراہٹ سی آ گئی —— بیرا آہستگی سے چلتی ہوئی
[illegible] میں آئی اور آہستگی سے انگوٹھی اتار کر ان کی گود میں ڈال دی۔
بیٹا —— عزیز صاحب تڑپے ——
"میں ٹھیک کر رہی ہوں پاپا ——" پھر وہ بیگم رحمٰن کی
طرف مڑی۔
"بہتر ہے کہ آپ یہاں سے فوراً تشریف لے جائیں ——"
ایک جھٹکے سے اٹھ کر وہ باہر چلی گئیں ——
"یہ کیا ہو گیا بینا ——" عزیز صاحب کراہے۔ بینا
نے بڑھ کر انھیں تھام لیا ——
"آپ کی بیٹی اس فیصلے سے خوش ہے پاپا ——" وہ پھیکی سی
مسکراہٹ کے ساتھ بولی —— اور پھر پاپا کی بگڑتی حالت
کا اندازہ کر کے گھبرا اٹھی —— وہ ایک ہاتھ سینے پر رکھے گہری گہری
سانسیں لے رہے تھے —— پسینے سے سارا جسم بھیگ رہا تھا۔
"پاپا ——"
انھوں نے ایک نظر اسے دیکھا اور بےدم سے ہو کر بستر پر گر
پڑے۔ بینا نے اپنے حواس بجا رکھے سینے پر ہاتھ رکھ کر دل کی دھڑکن
کا اندازہ کیا —— وہ کہیں زیادہ تھی —— پاپا بےہوش ہو چکے
تھے ان کے ہاتھ پیر سیدھے کر کے اس نے فوراً ڈاکٹر کو فون کیا۔ ڈاکٹر
نے آ کر ان کا معائنہ کیا —— دل کی حالت دیکھی اور بازو میں بڑا
سا انجکشن لگا دیا —— بہت دیر بعد پاپا کو ہوش آیا۔ آہستہ
سے جنبش کی ——
"پاپا ——" وہ ان پر جھکی ——
وہ کسمسا کر رہ گئے ——
"انھیں ہوش آ گیا ہے —— اب مکمل آرام کی ضرورت ہے
یہ دوا دیے جا رہا ہوں، ہر چار گھنٹے بعد دینی ہو گی —— اور اگر کوئی
خاص بات ہو تو مجھے فون پر اطلاع دیں ——"
ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ آہستہ سے کرسی گھسیٹ کر پاپا کے
پاس ہی بیٹھ رہی —— ان کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا —— آہستہ
آہستہ سانس لے رہے تھے —— بینا بمشکل تمام خود پر قابو پائے
بیٹھی تھی —— آنسو نکلنے کو مچل رہے تھے مگر وہ ضبط کر رہی تھی
اور ضبط کی اس کوشش میں خود اس کے سینے میں درد کی لہریں اٹھنے لگیں

[illegible] بہت [illegible] —— [illegible]
گھر بھر کی سی خاموشی چھا گئی تھی۔ پاپا [illegible] ہو رہا تھا
دھڑکنوں کی سی کیفیت [illegible] جنبش [illegible] اور پھر
بےدم سے ہو جاتے —— دوا کا وقت ہو گیا تھا —— بینا
گلاس میں دوا انڈیل کر ان کے قریب آ گئی —— آہستہ سے آواز دی
"پاپا ——"
انھوں نے آنکھ کھول دی۔
"کیسی طبیعت ہے پاپا ——؟"
"ٹھیک ہوں ——" وہ دھیمے لہجے میں بولے پھر آنکھیں بند کر لیں
"یہ دوا پی لیں۔"
اس نے سہارا دے کر انھیں اٹھایا —— اور دوا کا گلاس
منہ سے لگا دیا —— رک رک کر انھوں نے دوا پی پھر لیٹ گئے۔
تھوڑی دیر بعد آنکھ کھول کر اسے دیکھا۔
"بینا —— خانم کے یہاں کال بک کرو ——"
بینا کچھ نہ بولی —— بس ان کے حکم کی تعمیل کر دی۔ ٹیلیفون
لا کر ان کے بستر کے پاس ہی رکھ دیا —— آہٹ پا کر انھوں نے
آنکھ کھول دی ——
"تم پریشان نہ ہونا بیٹی میں ٹھیک ہوں ——"
"نہیں پاپا —— میں پریشان نہیں ہوں —— آپ
کوئی زیادہ بیمار تھوڑا ہی ہیں ——"
بینا نے دیکھا وہ کب سے اپنے ہونٹ کاٹ رہے تھے ——
آنکھوں کے کناروں سے آنسو ڈھلک کر تکیے پر گرتے رہے۔
"یہ کیا کرتے ہیں پاپا ——" وہ ان پر جھک گئی۔ "پھر میں
بھی رونے لگوں گی۔"
"میری بچی ——" انھوں نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ
پھیرا ——
"سب ٹھیک ہو جائے گا پاپا، آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں"
"جاؤ تم جا کر سو رہو —— خاصی رات ہو گئی ہے۔"
"مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی ہے پاپا ——"
"آ جائے گی —— سونے کی کوشش کرو ورنہ تمہاری
طبیعت بھی خراب ہو جائے گی۔"
"اونہہ —— مجھے کچھ نہیں ہوتا —— اور پھر آپ کو دوا
بھی تو پلانی ہے۔"
وہ [illegible]

[illegible] پاپا —
وہ اور مجھ سے جب [illegible] ہے —
وقت گزر گئی تھی کہ بیٹا نے ایک سال اٹھایا — تیمارداری کی کٹھنی بھی تو اور ستم ہوئی۔

"نو بجے وہ — پاپا نے اٹھنے کی کوشش کی۔ بیٹا نے ریسیور ان کے ہاتھ میں تھما دیا —

"تم باہر جاؤ بیٹی، مجھے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنی ہیں —" بیٹا خاموشی سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

پانچ منٹ بعد اندر گئی — پاپا کے چہرے پر سکون کا احساس تھا — سرہانوں میں ٹیک لگائے بیٹھے تھے —

"کیا وقت ہو گیا بیٹا —"

"بارہ بجنے کو ہیں —"

"اب تم جاؤ سو رہو — میں ٹھیک ہوں —"

"مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی پاپا —"

"بات مانا کرتے ہیں بیٹی — ضرورت پڑی تو میں خود تمہیں بلا لوں گا —"

ان کے بے حد اصرار پر وہ بادلِ نخواستہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ تنہائی ملی تو آنسو بہہ نکلے —

"پروردگار کس آزمائش میں ڈال دیا ہے تو نے"

دیر تک وہ بازوؤں میں منہ چھپائے سسکتی رہی، اور پھر جانے کیسے آنکھ لگ گئی —

چند ہی گھنٹے کی نیند کے بعد وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

اُف خدایا کتنا بھیانک خواب تھا — جلدی سے لائٹ جلا کر گھڑی دیکھی چار بجنے کو تھے — پیروں میں چپل ڈال کر پاپا کے کمرے کی طرف بھاگی — کمرے میں مدھم سا بلب جل رہا تھا اندر وحشت ناک سناٹا تھا۔ اس نے بڑی لائٹ جلائی — پاپا پر نظر پڑی وہ چت لیٹے تھے۔ آدھا جسم کمبل کے اندر تھا — دواؤں کی ٹرے نیچے پڑی تھی۔

میں کیوں پاپا کے کہنے سے سونے چلی گئی — وہ خود پہ جھنجھلا اٹھی۔ گلاس میں دوا انڈیل کر کانپتے ہاتھوں سے ان کا شانہ ہلایا —

"پاپا دوائی لیں —"

اور اس کے ساتھ ہی اسے کرنٹ سا لگا — اس کو ٹھٹک کر حقیقت کا احساس ہو گیا کہ اس کے پاپا اسے چھوڑ چکے ہیں۔

"پاپا — پاپا بولیے نا — آپ بولتے کیوں نہیں"

اس کے پاپا تو اس سے ہمیشہ کے لیے روٹھ گئے تھے پھر جلد

# چہرے

بیس سال کی عمر میں
آپ کا چہرہ وہ ہے جو قدرت عطا کرتی ہے۔
تیس سال کی عمر میں اس کی جو ہیئت ہو جاتی
ہے وہ زندگی کے تجربات اور زمانے کے حوادث کا
نتیجہ ہے اور
ساٹھ برس کی عمر میں آپ کا چہرہ وہ شکل
اختیار کر لیتا ہے جس کے در اصل آپ مستحق تھے۔

فرانسس روڈمین

کیسے ہوتے — اسے چکر سا آ گیا — ڈگمگائی اور ایک دلدوز چیخ کے ساتھ ان کے بے جان جسم پر گر پڑی —

ہوش آیا تو خود کو خالہ کی گود میں پایا — پورے اٹھارہ گھنٹے بعد وہ ہوش میں آئی تھی — وہ ایک بار آنکھ کھول کر ادھر ادھر دیکھا پھر جیسے کچھ یاد آ گیا — بے بسی سے خالہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"خالہ میرے پاپا —"

"خدا کی یہی مرضی تھی بیٹا — تم اپنی طبیعت کو سنبھالو"

"میرے پاپا مجھ سے روٹھ گئے خالہ — انہیں کیسے مناؤں"

وہ یوں بے قرار ہو کر روئی کہ آس پاس بیٹھے لوگوں کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

پھر تو جیسے اس کے اندر کی ساری حس ہی ختم ہو گئی ہو۔ نہ بولتی — نہ کچھ کہتی — بس چھت دیکھتی جانے کیا سوچ جاتی — خالہ بہت ضد کرتیں تو ایک آدھ کپ دودھ یا تھوڑا سا سوپ لے لیتی — ان کی ڈھیر ساری باتوں کے جواب میں بس ہوں ہاں کر کے رہ جاتی — خالہ کی مسلسل دیکھ بھال اور مناسب علاج سے وہ کئی دنوں بعد تھوڑا سنبھل سکی مگر وہ اس قدر کمزور ہو گئی تھی کہ دو قدم بھی چلتی تو ہانپنے لگتی، چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا — سارا رنگ روپ جانے کہاں کھو گیا تھا — اجڑی اجڑی صورت لیے ادھر ادھر تکا کرتی — اکثر راتیں جاگ کر گزرتیں۔ خالہ اسے سنبھالنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھیں۔ ہر دم اس کے پاس رہتیں۔ ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس کا ذہن بٹاتے

ہو گئے۔ وہ جیسے اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گئی۔ شرجیل ڈاکٹر کو رخصت کر کے ادھر آیا ——— مینا پر نظر پڑی جو ستون سے لگی کھڑی تھی۔ اندھیرے میں اس کا سراپا بہت پُراسرار لگ رہا تھا ——— شرجیل کے تیزی سے اُٹھتے قدم رُک گئے۔ چونک کر پوچھا۔

"کون ——— ؟"

وہ خاموش رہی کچھ بول نہ پائی، سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا۔

شرجیل کچھ آگے بڑھا ——— پھر پہچان کر اس کے چہرے پر حیرت کے آثار پیدا ہوئے۔ آنکھوں میں چمک سی آ گئی ——— آہستہ سے پکارا،

"مینا ——— !"

اور مینا کو یوں لگا جیسے اس ہلکی سی سرگوشی پر وہ ابھی اپنا سب کچھ ہار جائے گی۔ کانپتے ہاتھوں سے ستون کا سہارا لیا۔ شرجیل چند لمحے خاموش اسے تکتا رہا پھر پوچھا۔

"تمہارے بابا کیسے ہیں مینا ——— ؟"

بابا کا نام سن کر ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے۔

"میرے بابا مر گئے شرجیل ———" وہ سسکی۔

"اوہ! ———" شرجیل کے چہرے پر کرب اُمڈ آیا۔ اس نازک سی معصوم لڑکی پر اتنا ترس آیا۔ جھجکتے ہوئے آہستہ سے اس کا بازو تھپکایا۔

"خدا تمہیں صبر دے۔ یوں رویا نہیں کرتے ——— خود کو سنبھالو ——— تم روؤ گی تو خود کو بھی کھو دو گی ——— اور اگر تم کھو گئیں تو ———" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

اور سسکتی ہوئی مینا نے آہستہ سے اپنا سر اس کے کاندھے پر ٹکا دیا۔

"آؤ اوپر چلتے ہیں، یہاں اندھیرے میں اکیلی نہ بیٹھا کرو۔"

وہ اس کا بازو تھامے تھامے اوپر اپنے کمرے میں لے آیا۔ لائٹ جلاتے ہوئے اس کے چہرے پر نظر ڈالی اور حیران سا رہ گیا۔ وہ کتنی بدل کر آئی تھی۔ کتنی کمزور اور لاغر نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر ویرانی ہی ویرانی تھی ——— وہ چپ چاپ کرسی پر نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ بھیگی پلکوں سے آنسو آہستہ آہستہ چھلک کر رخساروں پر گر رہے تھے۔ شرجیل نے اسے روتے دیکھا، اس کے دکھ کو محسوس کیا۔ آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"چپ ہو جاؤ مینا! میں تمہیں روتے نہیں دیکھ سکتا۔ جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ ایک دن مجھے بھی جانا ہے اور تمہیں بھی۔ اور پھر کوئی بھی لوٹ کر نہ آئے گا۔ چاہے کوئی کتنا ہی روئے، کتنا ہی تڑپے ——— یہی دنیا کا دستور ہے اور قدرت کا یہی نظام ہے۔" اور ایسا کہتے ہوئے اس نے رومال نکال کر اپنے ہاتھوں سے مینا کے آنسو خشک کئے۔ مینا نے گہری سانس لیتے ہوئے خود کو سنبھال لیا۔ اُجلی سی روشنی میں شرجیل پر نظر ڈالی۔ وہ ویسا ہی تھا ——— ذرا بھی تو نہ بدلا تھا۔ اتنا ہی وجیہہ، اتنا ہی جاذبِ نظر۔

"کیا دیکھ رہی ہو اس طرح ——— ؟" وہ مسکرایا۔

"کیا بہت تبدیلی آ گئی مجھ میں ——— ؟"

مینا نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نظریں جھکا لیں۔ شرجیل سگریٹ سلگاتا ہوا سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے گہری خاموشی رہی۔ پھر وہ بہت مدھم آواز میں بولا۔

"مینا ——— تمہارے جانے کے بعد میں بہت اداس ہو

---

ایک مرتبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک شخص کے تین دوست تھے وہ مرنے لگا تو ایک دوست کو بلا کر پوچھا اس وقت تم میری کیا مدد کر سکتے ہو۔ اس نے کہا: میں عمر بھر آپ کی خدمت کرتا رہا لیکن اب بالکل بے بس ہوں اور موت کو کسی طرح نہیں روک سکتا۔ پھر دوسرے کو طلب کیا، وہ کہنے لگا: میں اس مشکل وقت میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ مرنے کے بعد آپ کو نہلاؤں، نیا کفن پہناؤں، خوشبوؤں میں بساؤں، جنازہ اٹھاؤں، کسی عمدہ جگہ قبر کھدواؤں اور دفنانے کے بعد پھول چڑھا کر واپس آ جاؤں۔ اس کے بعد تیسرے کو بلایا وہ کہنے لگا: آپ فکر نہ کریں میں موت کے بعد بھی آپ کا ساتھ دوں گا۔ قبر میں آپ کے ہمراہ جاؤں گا اور جب آپ قیامت کے دن قبر سے نکلیں گے تو میں آپ کے ساتھ ہوں گا۔

پہلے دوست کا نام مال، دوسرے کا نام عیال اور تیسرے کا نام اعمال ہے۔"

خالد خورشید۔ کراچی

اور طرح یہ احساس بھی تو اُس کے وجود کا لازمی جزو بن گئی تھی۔ سامنے
ویرانیاں ہی ویرانیاں تھیں، لامحدود اندھیرے ——— زندگی کے
بے مقصد اندھا دھند میں بھٹکتی آ رہی۔ دل چاہتا اپنی اس تڑپتی، پیاسی
اور بکھری ہوئی زندگی کو کسی اور کو تھما دے مگر ——— کس کو ——— کس کو ———
کوئی بھی تو اس بھری دنیا میں میرا نہیں رہا۔

شام دھیرے دھیرے نیچے اتر آئی تھی۔ ملگجا سا اندھیرا کمرے میں پھیل
رہا تھا اور اس اندھیرے اور سکوت میں آہستہ آہستہ اس کی سسکیاں گھل گئیں۔
خیالات کا طلاطم دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا ——— الجھن تھی کہ بڑھتی ہی جا
رہی تھی۔ اس کا تلخ ماضی تمام تر تلخیوں کے باوجود شعور کی حدود میں داخل ہو
رہا تھا۔ اعصاب پر بوجھ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ہر ممکن طریقے سے پچھلی باتوں کو ذہن
سے جھٹکنا چاہا مگر ——— بے بس سی ہو گئی ——— بہت پہلے کی خوش باش
سی زندگی یاد آ گئی ——— جب وہ بہت چھوٹی سی تھی۔ ماں کے زرد و نحیف
اور لاغر سے وجود کی دھندلی سی شبیہ اس کے ذہن میں اُبھری ———
گھر کے بڑے ہال میں فنکشن ہوا تھا۔ ہال کو خوب اچھی طرح سجایا گیا تھا۔ بہت سے
مہمان آئے تھے۔ وہ لال غرارہ سوٹ میں مسکراتی اِدھر اُدھر پھر رہی تھی ———
ایک خوبصورت سا لڑکا بھی تھا جو شاید اس سے چند سال بڑا تھا۔ وہ بھی چمکیلی
شیروانی میں تھا۔ دونوں کے گلے میں پھولوں کے ہار تھے۔ کسی نے اسے بتایا کہ
تمہاری شادی ہو رہی ہے تو وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگی تھی ———
اور اس کے ننھے سے دل نے سوچا تھا کہ روز روز اس کی شادی ہو۔ اسی
طرح اچھے اچھے کپڑے پہنے اور ایسی اچھی چیزیں تحفوں میں ملیں ———
پھر اُس لڑکے کے ساتھ فوٹو بھی تو اتاری گئی تھی ——— اس کے بعد
وہ جانے کہاں چلا گیا ——— اور ایک دن وہ سو کر اٹھی تو اس کے پپا
نے اسے گود میں لے کر پیار کرتے ہوئے بتایا تھا کہ تمہاری ممی اللہ میاں
کے پاس چلی گئیں ——— پپا کو اس دن اس نے پہلی بار روتے دیکھا
تھا اور اسے کتنا عجیب سا لگا تھا۔ بھلا بڑے لوگ بھی کہیں روتے ہیں۔
روتے تو بچے ہیں۔ پاپا نے اپنی زندگی اُس کے لیے وقف کر دی۔ اس
سے اتنا پیار کرتے۔ کبھی اس کی خواہش کو نہ ٹھکراتے۔ ہر خواہش، ہر ضد
پوری کرتے۔ وہ کافی بڑی ہو گئی تھی مگر اس کے پپا اسے چھوٹی سی بچی
ہی سمجھا کرتے۔ اسی طرح اُس سے پیار کرتے، اس کی ذرا ذرا سی بات
کا خیال رکھتے ——— اور اسی لاڈ نے اسے بہت ضدی اور بڑی حد تک
خود سر بھی بنا دیا تھا۔ پھر وہ شعور کی حدود میں داخل ہوئی تو اس کے متعلق
سب کچھ جان گئی۔ اسے وہی چمکیلی شیروانی والا خوبصورت سا لڑکا یاد آ گیا جو
اُس کا شوہر تھا۔ عجیب سا ہی لگاؤ اس سے محسوس ہوتا ——— کوئی اس کا نام
لے کر اسے چھیڑتا تو وہ سرخ پڑ جایا کرتی ——— پھر ——— پھر ایک دن اچانک
طلاق کے کاغذات آ پہنچے ——— یہ اس کی خوش باش زندگی میں پہلی
ٹھوکر تھی۔ پہلا غم، پہلا درد تھا جو ایک ٹیس بن کر اس کے وجود میں سما
گیا اور وہ جو اتنی خود دار اتنی بلند تھی اور جسے اپنی عزت ہر شے سے
زیادہ عزیز تھی اس کے ماتھے پر طلاق کا داغ آ لگا تھا ——— اور
اس داغ نے اس حساس لڑکی کو خود اپنی ہی نظروں میں گرا دیا ———
جسے اپنا پن بہت عزیز تھا۔ زندگی کی یہ پہلی چوٹ اسے بہت بھاری
تھی ——— پاپا خود بھی اس غم سے نڈھال ہو گئے تھے ——— کس
سے اس ظلم کی شکایت کرتے۔ کس سے اس زیادتی کی وجہ پوچھتے۔
کوئی بھی تو اس خاندان کا نہ رہا تھا ——— نہ اس کی امی نہ ابا ———
دونوں ہی قبر میں جا سوئے تھے۔ کس چاؤ سے انھوں نے اپنے بیٹے
کا بیاہ رچایا تھا۔ ان کی ننھی سی بیٹی کو اپنی بہو بنایا تھا ——— اور ان
کے مرنے کے بعد اتنے سال گزر جانے پر ان کے بیٹے نے جانے کس
بنا پر اس بندھن کو توڑ دیا تھا۔ ان کی لاڈلی بیٹی کو اتنا بڑا دکھ دے دیا
تھا ——— طلاق یافتہ لڑکی کی عزت اس معاشرے میں کیا ہے
بینا بخوبی جانتی تھی اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ساری دنیا، سارا
سماج اس پر ہنس رہا ہو، اسے حقیر سمجھ رہا ہو ——— اس دکھ
نے اسے بہت بیمار بنا ڈالا۔ وہ جو اتنے نازوں سے پلی تھی یہ دکھ
برداشت نہ کر پائی ——— بیمار ہوتی ہی چلی گئی ——— اس کے
پاپا اس کے لیے چھپ چھپ کر پہروں رویا کرتے۔ انھوں نے ڈاکٹروں
کی لائن لگا دی مگر دل کے رستے ہوئے زخم بھلا دواؤں سے بھی دور ہوتے
ہیں کبھی ——— پھر کسی نے انھیں مشورہ دیا کہ اسے کسی پہاڑی
مقام پر بھیج دیجیے ورنہ اسے ٹی بی ہو جائے گی ——— اور پھر وہ اس
طرح خالہ کے پاس آ گئی ——— یہاں آ کر اسے دکھ بھی ملا اور سکون بھی
شرجیل کی تلخ و ترش باتیں ——— جذبات کو مجروح کر دینے والے
انداز کو بھی برداشت کر گئی ——— اس کی باتوں کو کوئی اہمیت نہ دیتی!
سر اٹھا کر برابر جواب دیتی رہی ——— پھر ——— پھر اچانک
اس کے پاپا اسے اس بھری دنیا میں اکیلا چھوڑ کر ایسی دنیا میں چلے
گئے جہاں سے آج تک کوئی واپس نہیں آیا ——— اور اس
طرح وہ ایک بار پھر اسی جگہ آ گئی جہاں سے ایک دن وہ بڑے زعم
اور تنفر سے واپس گئی تھی ——— اب اور تب میں کتنا فرق ہے۔
اس وقت اس کے پاپا زندہ تھے اور اس کا وجود ان کے نزدیک
جان سے بھی پیارا تھا۔ وہ کسی پر بوجھ نہ تھی ——— اور اب ———
ہلکے سے دھندلکے میں اس کی سسکیاں کمرے کا سکوت توڑنے لگیں
جیسے اس گھر کے لیے ایک فالتو سی شے ہوں ——— یہ سوچ کر

ان یار ذرا یہ تو بتاؤ کل رات ایک بجے گھر لوٹنے پر
تمہاری بیوی نے کیا کہا۔؟

"بینا —— کیوں رو رہی ہو —— ؟" شرجیل کی آواز
دکھ سے بوجھل تھی "ارے —— کیا بات ہے ——" شرجیل نے
پیار سے اس کے رخساروں پر بہتے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے پونچھا۔
بینا زرد چہرہ لیے ہونٹ دبائے اپنی سسکیاں روکتی رہی
پلکوں سے آنسوؤں کے موتی ڈھلک کر رخساروں پر گرتے رہے۔
"بینا —— پلیز بینا —— کچھ تو بولو یوں کیوں رو رہی ہو؟"
اور سسکتی بینا بے اختیار ہمدردی اور نامعلوم اپنائیت کے
تحت اس کے شانے سے جا لگی۔
"شرجیل —— میں تنہا ہوں —— بالکل تنہا۔ بالکل بے
سہارا۔ میرا کوئی نہیں ہے اس دنیا میں ——"
"بینا۔ ایسا کیوں کہتی ہو ——" شرجیل تڑپ اٹھا ——
"ایسا نہ کہو بینا —— دیکھو یہاں سب تم پر کتنے مہربان ہیں۔ ڈیڈی
تمہیں بیٹی کی طرح چاہتے ہیں، خانم تم سے اتنا پیار کرتی ہیں —— اور
—— اور میں ——"
"نہیں —— نہیں مجھے ترس کھایا ہوا پیار نہیں چاہیے۔"
وہ تڑپ کر رو دی —— "مجھے یہ ترس کھایا ہوا پیار نہیں چاہیے
شرجیل ——"
چیخیں ضبط کرنے کی کوشش میں اس کی آواز گھٹ رہی تھی وہ
چہرہ دکھ کی شدت سے سفید پڑ گیا تھا ——
بینا کی یہ بات شرجیل کے دل میں گھاؤ ڈالتی اور احساس کو
زخمی کرتی گزر گئی۔ شرجیل کا دل چاہا اس معصوم اور دکھی لڑکی کا سارا دکھ

ر کے اس کا کلیجہ پھٹنے لگا —— حالانکہ سب اسے پو
ہے۔ سراج صاحب اور خانم اسے بالکل اپنی بیٹی کی طرح
تے تھے۔ راجو اور نسیمہ اسی طرح اس سے پیار کرتے شفقت
ہے —— خاص طور پر خانم اس کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ اس
ت پیار سے پیش آتی تھیں۔ چھوٹی اور بڑی سبھی باتوں میں
سے مشورہ لیا جاتا۔ اسے گھر کا ایک اہم ممبر سمجھا جاتا۔ لیکن کبھی
بینا کو یہ لگتا جیسے یہ ہمدردی، یہ محبت، یہ مہربانیاں اس پر ترس
کی جا رہی ہیں —— اور یہ احساس ہی اس کے لیے بڑا
را تھا۔ وہ جو صد درجہ حساس، نازک اور دکھوں کی ماری تھی ——
بار ٹھکرائی جا چکی تھی۔ اور ان ٹھوکروں نے اسے خود اپنی نظروں
را دیا تھا۔ اپنا وجود حقیر سا معلوم ہونے لگا۔ اپنے آپ سے نفرت
وس ہوتی —— اور پھر —— شرجیل کا بدلا انداز
—— وہ جو پہلے اتنا تلخ تھا اب کتنا نرم ہو گیا ہے —— اس
ملائم لہجہ، باتوں میں ہمدردی اور پیار کی جھلک —— یہ سب کچھ
محسوس کر کے وہ اندر ہی اندر گھلتی رہتی —— اس کے سامنے
کے دیجتے نا ج رہے تھے۔ چہرے پر کھنڈر جیسی ویرانی اور
شان جیسی اداسی تھی —— غم واندوہ میں ڈوبی الم زدہ سی
ن کے ساتھ ادھر ادھر پھرا کرتی —— یوں لگتا جیسے اب
بھی ٹھیس پہنچی تو وہ کرچی کرچی ہو جائے گی۔ ایسا محسوس ہوتا
وہ سب کی نظروں سے، دلوں سے گر گئی ہے۔ یہاں کے در و دیوار
حقارت سے دیکھتے ہیں۔ اس احساس تلے دب کر اس کی
نک کچلی گئی تھی "سب کی مہربانیاں خاص طور پر میرے لیے
ہیں۔ کیا میں ایسی ہوں کہ لوگ مجھ پر ترس کھائیں۔ رحم کریں،
دی جتائیں —— کیا —— کیا یہی میری حیثیت ہے۔
میری زندگی ہے!" وہ کھڑکی کی چوکھٹ تھام کر بری طرح
ی ——
"بینا ——" شرجیل کی بھاری سی آواز قریب
ئی۔
وہ چپ چاپ اس کے شانے پر اپنے بھاری ہاتھ رکھے لب
بھینچے کھڑا رہا کرب سے ہونٹ کاٹتا رہا۔ بینا کی گھٹی گھٹی سی سسکیاں
دل ہلائے دے رہی تھیں۔
"بینا —— بینا اس طرح نہ رویا کرو —— خدا کے لیے۔"
اس نے روتی سسکتی بینا کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اپنی
موڑ لیا —— چند لمحے اس کے بھیگے چہرے کو دیکھتا رہا۔
پلکیں جھکی تھیں، اور آنسو موتیوں کی طرح جھر رہے تھے ——

نے طے کیا ہے کہ ہم صرف اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے ملیں گے۔ کاش مینا اس معاہدے کو توڑ دے ۔" ——— شرجیل کے دل سے آواز نکلی۔

"وہ صرف مجھے اپنا دوست سمجھتی ہے۔ فقط ساتھی۔ اے کاش یہ وقتی ساتھ دائمی ساتھ بن جائے ———" اس نے دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی ———

"آپ کیا سوچ رہے ہیں شرجیل ——— ؟" مینا کی بات پر اس نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"بڑی خوبصورت باتیں سوچ رہا تھا مینا ——— جاگتے میں بڑا حسین خواب دیکھ رہا تھا۔ خوامخواہ تم نے مجھے بیدار کر دیا ———"

"شرجیل ———" مینا کی آواز میں نمایاں لرزش تھی ——— "جاگتی آنکھوں کے خواب بڑے بھیانک ہوتے ہیں شرجیل۔ بڑے بھیانک ———"

وہ کپکپا سی گئی اور مضبوطی سے شرجیل کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہاں مینا ——— مجھے اس کا احساس ہے ———" شرجیل نے ایک گہری سانس لی۔ چہرے پہ ابر سا چھا گیا۔

"شرجیل تم ——— تم ———" مینا کے لب کپکپائے۔ جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ شرجیل نے سر جھٹک کر بیزاری سے کہا۔

"چھوڑو یہ یاسیت بھری باتیں۔ ہم موسم کا لطف اٹھانے آئے ہیں۔ اچھی اچھی باتیں کرو ——— پیاری پیاری ——— کرو بھی ——— اور سنو بھی ———"

"بہتر حضور ———" مینا شوخی سے بولی۔ دونوں مسکراتے ہوئے آگے بڑھ آئے۔ قریب سے کٹا رے والا آوازیں لگا تا گزر رہا تھا مینا نے اسے روک لیا۔

"کھاؤ گے شرجیل ——— ؟"

"نہیں کٹا رے کھاؤں گا ——— !" اس نے مینا کو گھورا

"تو کیا ہوا ——— ؟"

"تو ہوا یہ کہ تم یہ واہیات چیز کھاؤ گی اور مجھ سے تو پوچھنا بھی نہیں ———"

"میں تو لوں گی ———" مینا چھوٹی سی بچی کی طرح مچل گئی۔ شرجیل کو اس کے اس انداز پہ بے حد پیار آیا ——— جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک روپیہ کا نوٹ نکالا۔

"مینا بھائی کٹا رے والے ———" وہ بڑا سا منہ بنا کر بولا۔ ایک روپیہ کے اتنے کٹا رے آئے کہ مینا کے دونوں ہاتھ بھر گئے۔

"اتنے کٹا رے ——— باپ رے ——— مر جاؤ گی کھا کر۔ آدھے مجھے دے دو۔"

"نہیں ———" وہ ضد پہ اکڑ آئی۔

"بیوقوف لڑکی نقصان کریں گے یہ۔ اتنے ڈھیر سارے کھاؤ گی تو گلا ایسا خراب ہو گا کہ ایک ہفتہ تک بولو گی تو ایسی عجیب عجیب آوازیں نکلیں گی کہ محلے کے بچے سمجھیں گے کہ کوئی بھونپو بج رہا ہے۔"

مینا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ شرجیل نے زبردستی اس کے ایک ہاتھ میں تھامے کٹا رے چھین کر قریب بہتی جھیل میں اچھال دیئے۔

"ہائے میرے کٹا رے ———" مینا چیخی۔

"بڑی قیمتی چیز ضائع ہو گئی نا ——— بعد میں غم منا لینا۔ آؤ ذرا اوپر چل کر ٹھنڈی ہوا کا لطف لیتے ہیں ———" شرجیل نے ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹا۔ وہ مزے مزے سے کٹا رے کھاتی ساتھ ہو لی۔ جنگلی پھولوں اور سبزے سے ڈھکی پگڈنڈی پر وہ اوپر ہی اوپر چلے جا رہے تھے۔ مینا اس وقت ہر دکھ ہر غم پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ خود کو بہت سبک محسوس کر رہی تھی۔ شرجیل کا ساتھ اتنا اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اکھڑ اور مغرور سا لڑکا کتنا نرم اور کتنا ہمدرد ہو گیا تھا۔ اب مینا اسے سامنے پا کر اپنا ہر دکھ ہر درد بھول جایا کرتی۔ ساتھ چلتے چلتے آہستہ آہستہ منہ چلا کر کٹا رے کھاتے ہوئے اس نے ذرا سر اوپر اٹھا کر شرجیل کی طرف دیکھا ——— بڑی دلچسپی کے ساتھ ——— شرجیل نے اس کی نظروں کا احساس کیا مسکراتے ہوئے آہستہ سے اس کے گال کو چھیڑا۔

"کیا دیکھ رہی ہو اس طرح ——— ؟"

مینا کے چہرے پر بڑی دلآویز مسکراہٹ پھیل گئی جس میں طمانیت کی جھلک تھی۔

"مزے کے ہیں کٹا رے، کھلائیے گا ——— ؟" اس نے چٹخارے لیتے ہوئے شوخی سے پوچھا۔

"پٹو گی ——— بہت زور کا ہاتھ پڑے گا ———" شرجیل نے مصنوعی غصے سے گھورا ——— وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ نقرئی گھنٹیوں جیسی آواز پہاڑیوں کے دامن میں گونج اٹھی ——— شرجیل نے اس کا ہاتھ تھاما اور آگے بڑھ گیا ——— ماحول میں بڑی ترو تازگی اور شگفتگی تھی۔ سرمئی اجالوں میں سبزے سے ڈھکی وادی بے حد پر اسرار سی لگ رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے جنگلی پھول اپنے رنگوں، بھینی بھینی خوشبوؤں اور مچلتی اداؤں سے سجا رہے تھے ——— دو دو پہاڑیوں

پھر آباد ہوتے ہوئے [illegible] شین بھی ملتی تھیں اور دور سے
یہ روشنی اتنی بھلی لگ رہی تھی ——— یوں بھی موسم کا لطف بڑھا رہا تھا اور گرد
کا نظارہ کرتے رہے تو کافی دیر ہو گئی ——— گھاٹ پر کافی ٹھنڈ تھی، ہوا کا
ایک سرد جھونکا آیا تو بینا کپکپا اٹھی۔
"اچھی خاصی سردی ہو رہی ہے یہاں، اور تم نے کوئی گرم کپڑا
بھی نہیں پہن رکھا ———" شرجیل نے بینا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا
گلابی چہرہ سردی کی شدت سے اور بھی گلابی ہو گیا تھا۔
"یہاں کے موسم کا تو تمہیں پتہ ہی ہے۔ اپنا خیال رکھا کرو۔"
"اب مجھ سے کچھ نہیں ہوتا اپنے لیے ——— دل چاہتا ہے
اپنا وجود کسی اور کے حوالے کر دوں۔" اس کے لہجے میں بے پناہ
یاسیت اور تھکن تھی ——— شرجیل نے دکھی ہو کر اس کی طرف
دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شبنم تیر رہی تھی ——— اور آنسو ضبط کرنے
کی کوشش میں اس کا چہرہ اور بھی سرخ ہو رہا تھا ——— بینا کی بات
سن کر شرجیل کے چہرے پر غبار سا آ گیا۔ بینا کا وہ دکھ بھرا لہجہ شرجیل
کے دل میں تیر سی چبھا گیا۔
"بینا ———" شرجیل نے بے اختیار اس کی کمر میں ہاتھ
ڈال کر بانہوں کا حلقہ تنگ کر دیا ——— خواب آلود لہجے میں مدھم سی
سرگوشی ابھری۔ "بینا تمہارا وجود اتنا سبک ہے کہ میں ——— میں
بآسانی ———"
"شرجیل ———" وہ تڑپ کر اس کی بانہوں سے نکل گئی
اس کی آنکھوں میں سسکتی ہوئی روح کا سارا کرب کھنچ آیا ——— اور
چہرہ یاسیت کی تاریکی میں ڈوب گیا ——— نمناک آنکھوں سے شرجیل
کو دیکھا آہستہ سے اس کے لب کپکپائے۔ "میرے وجود کا بوجھ
اب صرف قبر ہی سنبھال سکتی ہے شرجیل ———"
"بینا ——— بینا ———" شرجیل کا دل شدید کرب سے
پھٹنے لگا۔ مضبوطی سے اسے شانوں سے تھام لیا۔ گرفت اتنی مضبوط
تھی کہ بینا کو تکلیف کا احساس ہونے لگا ——— چند لمحے یونہی
ساکت گزر گئے۔ وہ بھیگی پلکوں کی حسین جھالر کو اٹھتے گرتے دیکھتا رہا
پھر دھیرے سے مسکرایا۔ ایسی مسکراہٹ جس میں دل کا درد بھی چھپا تھا۔
"اتنا جذباتی ہونا بھی ٹھیک نہیں پارٹنر ———" شرجیل نے
پیار سے اس کے شانے پر تھپکی دی ——— "ٹھیک کہتا ہوں نا؟"
اس نے بینا کی آنکھوں میں جھانکا ——— اس کے لبوں پر زخمی سی
مسکراہٹ ابھری۔ آہستہ سے شرجیل کے ہاتھ شانوں پر سے ہٹا دیئے۔
"لو میرا کوٹ پہن لو، خاصی سردی ہو رہی ہے۔" شرجیل اپنا کوٹ
اتارتے ہوئے بولا۔
"آپ کا کوٹ؟" بینا ہنس پڑی۔ "اتنا لمبا، اتنا بڑا ———"
"صرف سردی سے بچاؤ کرنا ہے محترمہ، آپ کو کسی فیشن شو میں
شرکت نہیں کرنی ——— کیا سمجھیں ——— !" اور ایسا کہتے ہوئے
اس نے کوٹ بینا کو پہنا دیا۔
"اور آپ ——— آپ کو سردی ———" اس نے بات
ادھوری چھوڑ دی۔
"میری بات چھوڑو میں مرد ہوں ——— مرد بڑی بڑی سختیاں
جھیل جاتے ہیں اور تم لڑکیاں اتنی نازک ہوتی ہو کہ خود اپنا بوجھ نہیں
سنبھال سکتیں ذرا سی سردی بھی لگ گئی تو ہفتوں بخار میں جلتی رہو گی۔"
وہ شرجیل کی بات سن کر دلکش انداز میں مسکرائی اور کوٹ کی
لمبی لمبی آستین جس میں اس کا ننھا سا نازک ہاتھ چھپ گیا اسے جھلاتی ہوئی
ساتھ ساتھ چلتی رہی۔
"واپس چلا جائے ———" شرجیل نے مڑ کر پوچھا۔
"جیسی آپ کی مرضی ———"
پھر وہ واپسی کو چل پڑے۔ ادھر کا راستہ بہت ٹیڑھا میڑھا
اور قدرے خطرناک بھی تھا۔ نوکیلی چٹانیں پھسلواں ڈھلوان اور گہری
کھائیاں ———
"بینا بہت سنبھل کر احتیاط کے ساتھ ———" شرجیل نے تنبیہ کی۔
"اچھا ہے گر جاؤں کسی کھائی میں تاکہ میری ہڈیوں کا سرمہ بن جائے۔"
بینا نے ہنستے مسکراتے ہوئے کہا۔
"خیال برا نہیں ——— وہ سرمہ میں اپنی آنکھوں میں لگاؤں
گا اور پھر میری آنکھوں کی روشنی اتنی تیز ہو جائے گی کہ زمین میں گڑے
خزانے بھی نظر آنے لگیں گے۔ پھر تو دنیا کے سارے خزانے میرے
ہوں گے۔ پیسہ ہی پیسہ، اور پھر شرجیل صاحب عیش کریں گے ———
پلیز ٹرائی کرو بینا یہ اس طرف والی کھائی کافی گہری ہے میرے خیال
میں یہ زیادہ مناسب رہے گی۔ اچھا سرمہ بنے گا۔"
بینا شرجیل کی بات پر ہنستی رہی اور پہاڑیوں میں جلترنگ سے
بجتے رہے ——— دونوں سنبھل سنبھل کر آہستہ آہستہ نیچے اتر رہے
تھے۔ ایک غیر ہموار جگہ بینا لڑکھڑائی جسم کا توازن برقرار رکھنے کی کوشش
میں شرجیل سے جا ٹکرائی۔ شرجیل نے مضبوطی سے اسے بانہوں میں تھام
لیا۔ بینا کا سر اس کے چوڑے چکلے سینے سے جا لگا اور شرجیل نے بہت
دھیرے سے بہت آہستگی سے اس کے بال چوم لیے ——— یوں لگا

کشف و کرامات اولیائے کرام کا خاصہ ہے۔ جو کبھی کبھی بندگانِ دین کے مبارک توسط سے اللہ کے نیک بندوں کو اس کے لطف و کرم کے صدقے میں عطا ہو جاتا ہے۔

## بابا سید شان احمد صاحب

کا شمار بھی انہی برگزیدہ ہستیوں میں ہے جنہیں روحانی انعام و اکرام سے نوازا گیا اور اس کا منہ بولتا ثبوت حقیقتِ حال سے متعلق وہ اہم پیش گوئیاں ہیں جو بذریعہ کشف تجلی کی صورت میں ان پر ظاہر ہوتی رہیں۔ بابا جی شادی بیاہ، مقدمات، محبت میں کامیابی یا ناکامی، مالی مشکلات اور اولاد وغیرہ سے متعلق آپ کے سوالات کے جوابات بذریعہ کشف دینے پر رضامند ہو گئے ہیں اور وہ پلک جھپکتے میں آپ کے حال اور مستقبل کے تانے بانے میں جھانک کر فوراً خدا لگتی کہہ دیں گے۔ صرف ضرورت ہے اس نام کی جس سے آپ زیادہ پکارے اور پہچانے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ آپ کی والدہ محترمہ کا نام، عمر اور مقامِ پیدائش۔ آپ ایک وقت میں صرف دو سوال کر سکتے ہیں۔ جوابات کے لیے جوابی لفافہ بھیجنا ضروری ہے۔ بابا جی کے جوابات کا کوئی نذرانہ نہیں ہے۔ صرف انہی سوالات کے جوابات دیئے جائیں گے جن کے ساتھ "روحانی ڈاک" کا کوپن ہوگا۔

نام ــــــــ والدہ کا نام ــــــــ
مقامِ پیدائش ــــــــ عمر ــــــــ
مکمل پتہ ــــــــ
ــــــــ

خط لکھنے کا پتہ
**روحانی ڈاک**
ماہنامہ "دوشیزہ" پوسٹ بکس ۸۸۵
کراچی ۲۹

"تمھیں کیا پتہ ——؟ تمھاری بھی تو ابھی شادی نہیں ہوئی۔"
"نہیں ہوئی تو کیا ہوا —— مجھے سب باتیں تو معلوم ہیں۔"
وہ آنکھیں نچا کر بڑی بے باکی سے بولی۔
"کوئی اسکرو تو ڈھیلا نہیں ہو گیا۔" شرجیل نے اسے ڈانٹا
"ایسی واہیات باتیں کہاں سے سیکھی ہیں ——"
"منوج ——" شیلا نے بے حد شرارت سے ہنستے ہوئے
صرف اتنا ہی کہا۔ شرجیل نے اسے پرے دھکیل دیا۔
"دفع ہو جاؤ یہاں سے ——"
وہ شوخی سے ہنستی ہوئی بینا کی طرف چلی گئی —— شرجیل نے
مسکرا کر اس نٹ کھٹ اور خوبصورت سی لڑکی کو دیکھا جو بے شرم ہونے
کی حد تک بیباک تھی —— مگر بہت نیک اور بڑی پرخلوص۔
دونوں دریچے میں کھڑی کافی پیتی رہیں۔ کبھی کبھی شیلا کا شوخ
قہقہہ بھی فضا میں گونج جاتا۔ جیسیکا اور راجو کیرم کھیل رہے تھے۔ کھیل کم
رہے تھے لڑ جھگڑ زیادہ رہے تھے۔ شرجیل نے کافی ختم کر کے خالی کپ
نچلی تپائی پر رکھا اور سگریٹ سلگا لی۔ پھر رات خاصی گزر گئی۔ سڑکوں
پر سناٹا چھا گیا تو محفل برخاست ہوئی۔ شیلا اپنے گھر کو چلی تو شرجیل نے
اسے روک لیا۔
"اکیلی جا رہی ہو ——؟"
"ہاں —— کیوں ——؟"
"رات اتنی گزر گئی ہے۔ باہر اندھیرا ہے اور یہاں سے
تمھارے بنگلے کا فاصلہ بھی کچھ کم نہیں۔ ڈر نہ لگے گا تمھیں ——"
"بینا —— تیرا شرجیل تو چھوکریوں سے بھی گیا گزرا ہے۔
اندھیرے سے ڈرتا ہے ——" اس نے شرارت سے ہنستے ہوئے
بینا سے کہا۔
"تیرا شرجیل" کہنے پر بینا کچھ جھینپ سی گئی، ہلکی سی مسکراہٹ
کے ساتھ کمرے سے باہر چلی گئی۔
"شیلا تم کسی دن بُری طرح پٹو گی مجھ سے۔" شرجیل نے
غصے سے کہا۔
"ارے جاؤ —— دھمکی دینا کسی اور کو، شیلا تمھارے رعب
میں آنے والی نہیں ہے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔
"چلو اچھا بکواس بند کرو، دیر ہو رہی ہے تمھیں گھر چھوڑ آؤں۔"
"خوا مخواہ میرے گلے پڑ رہے ہیں۔" اس نے بُرا سا منہ بنایا۔
"لعنت ہے اس پر جو تمھارے گلے پڑے۔ زندگی بھر کا روگ
لگانا ہے کیا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بھی تمھیں سنبھالنا میرے لیے مشکل ہو جاتا ہے
کجا ساری زندگی بھر ——" شرجیل نے اس کی بات کا دوسرا ہی مطلب
لے کر شرارت سے اسے چھیڑا۔
"منوج کا چکر نہ ہوتا تو دیکھتی تم کیسے میرے شکنجے سے بچ کر جاتے۔
چاہے اس کے لیے مجھے گھر ہی کیوں نہ چھوڑنا پڑتا۔ تمھاری خاطر تو بینا
دھرم بھی چھوڑ دیتی۔ پر منوج نے سارا معاملہ ہی بگاڑ دیا ——" شرجیل
اس کی ایسی دلچسپ باتوں سے بہت لطف لے رہا تھا۔ ساتھ ساتھ
چلتے ہوئے دونوں ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں کرتے رہے۔ پھر شیلا کا
بنگلہ آ گیا۔ گیٹ پر چھوڑ کر اسے چیئرز کہا اور واپس مڑ گیا۔ اپنے کمرے کی
طرف جاتے ہوئے شرجیل نے بینا کے کمرے پر نظر ڈالی۔ ہلکی سی نیلی
روشنی اس بات کا ثبوت تھی کہ وہ سونے کے لیے لیٹ گئی ہے۔
شرجیل نے صرف اتنا ہی جانا کہ وہ سونے کے لیے لیٹ گئی ہے
یہ نہ جانا کہ وہ بستر پر لیٹی بے چینی سے کروٹیں بدل رہی ہے۔ جلتی جلتی
آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ دن تو کسی نہ کسی طرح کٹ جایا کرتا
رات آتی تو درد کا گھاؤ بن جاتی۔ ٹھکرائے جانے کی ذلت اور اکیلے پن کا
احساس بڑا جان لیوا تھا۔

وہ بے چینی سے بستر پر پڑی کروٹیں بدلتی رہی۔ رات کی اس
تنہائی میں ایک اضطراب پنہاں تھا۔ چاروں سمت بے کراں سناٹے چھائے
ہوئے تھے۔ سرد ہوا سسکیاں لیتی پھر رہی تھی اور ماحول بے حد سوگوار
سا تھا۔ آنسوؤں سے اس کا تکیہ بھیگ گیا تھا۔ آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت
سے پونچھتی بکھرے بالوں کو برابر کرتی وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔ ایک گہری سانس
لے کر اس نے سامنے پھیلے درختوں کے سایوں کو دیکھا جو رات کی تنہائی
میں بڑے پراسرار لگ رہے تھے پھر وہ وہیں برآمدے کی چوکھٹ سیڑھیوں
پر بیٹھ گئی۔ ساری کائنات پر ایک سوگواری سی طاری تھی۔ وہ گزرتے
وقت کی دہلیز پر کھڑی چاروں طرف پھیلے امڈتے اندھیروں، ان بے حس
خلاؤں اور ویران ویران سی فضا کو دیکھتی رہی —— آنسوؤں کی
لڑیاں رخساروں پر بہتی رہیں۔ اپنی زندگی اسے بالکل بے مقصد اور
دھندلی دھندلی نظر آئی۔ خوشی اور سکھ سے عاری اذیت ناک حال
اور بھیانک مستقبل۔ وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بُری طرح رو پڑی۔
"بینا ——" کسی کی سرگوشی نما آواز —— ذرا سا بھاری اور
دکھی سا لہجہ اور لہجے میں چھپا بہا پیار ——
بینا نے آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر شرجیل کو دیکھا۔
"یوں تو تم مر جاؤ گی بینا ——" اس کی آواز میں بے حد دکھ تھا۔
یہ بات اور اس دکھ بھرے لہجے کو محسوس کر کے اس کی آنکھیں یوں چھلک
اٹھیں جیسے بھرے پیالے کو ٹھیس لگ جائے۔ وہ سسکتی ہوئی اس کے
بازوؤں پر بکھر گئی —— شرجیل آہستہ آہستہ اس کے نرم ملائم بالوں
پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ کرب سے بوجھل سناٹا ——

"بیٹا —— بیٹا تمہیں یوں روتا دیکھ کر میرا دل مضطرب ہونے لگتا ہے —— شرجیل کے لیے میں سب پا جاؤں گی ایسا سوز اور ایسی رحم سی آ جاتی ہے کہ محسوس ہونے لگے کہ دل پھٹنے لگتا ہے۔" "چپ ہو جاؤ —— چپ ہو جاؤ بیٹا —— یوں تو تم خود کو بھی ہلکان کر لو گی بیٹی —— زندگی بڑی کٹھن ہوتی ہے۔ اس میں ہزاروں طوفان چھپے ہوتے ہیں بیٹا —— خوشیوں کے بھی اور دکھوں کے بھی اور ان طوفانوں کا بہت حوصلہ مندی سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے تمہیں سب کچھ بھول جانا ہے بیٹا —— تمہیں جینا ہے —— تمہیں جینا ہے بیٹا ——"

"کس کے لیے شرجیل —— کس کے لیے ——؟" اس نے تڑپ کر چہرہ اوپر اٹھایا —— شرجیل چند لمحے یونہی ساکت بیٹا پلکوں کے ڈوبتے ساحلوں کو دیکھتا رہا پھر اس کا بھیگا بھیگا سرخ چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر سرگوشی کی۔

"تمہیں کس کے لیے جینا ہے بیٹا —— یہ تمہیں وقت بتائے گا"

اور ایسا کہتے ہوئے اس نے اپنے لب اس کے کانپتے ہونٹوں پر رکھ دیئے اس کی سانسوں کی گرمی سے بیٹا کے رخسار جھلس گئے۔ لبوں کا گداز تھوڑی سی گرمی اور ہلکا سا دباؤ —— یہ سب محسوس کر کے وہ کپکپا گئی —— اک دم سے خود کو چھڑا کر دور ہٹ گئی —— سرخ چہرے کے ساتھ شرجیل کو دیکھا۔

"بیٹا کچھ اختیاری اور کچھ غیر اختیاری فعل ہوا کرتے ہیں اور اسی غیر اختیاری فعل کے تحت میں ایسا کر بیٹھا —— تمہیں عورت سمجھ کر نہیں —— اپنا ساتھی اپنا پیارا دوست سمجھ کر۔ میری اس حرکت میں جنس کو قطعی دخل نہیں ہے۔"

وہ کچھ نہ بولی بیٹھی پلکیں گراتی اٹھاتی رہی۔ چاند کی نرم ملائم سنہری روشنی میں وہ بھیگی پلکوں اور گیلے رخساروں کے ساتھ بہت [illegible] میں بےحد حسین لگ رہی تھی۔

"میرے دوست سو جاؤ کافی رات بیت گئی ہے۔" آہستہ سے اسے بستر پر لٹایا اور سر تک لحاف میں ڈھانپ دیا۔

"کچھ سوچنا نہیں پرسکون ہو کر سو جانا ——"

بیٹا چند لمحے چہرہ لحاف میں چھپائے اس کی چاپ کا انتظار کرتی رہی پھر ذرا دیر بعد لحاف ہٹا کر چہرہ باہر نکالا۔

"آپ جائیے میں ٹھیک ہوں ——" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ شرجیل نے جھک کے اس کے گال تھپتھپائے۔

"اب رونا نہیں ورنہ خادم کو دکھ ہوگا ——" بیٹا مسکرا دی۔

"اچھا شب بخیر ——" شرجیل مسکراتا ہوا پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

شرجیل چلا گیا —— پھر وہی تنہائی —— وہی کرب اور وہی دکھ جسے بھولنے کی کوشش میں وہ پہلے سے بھی زیادہ نڈھال ہوتی جا رہی تھی۔ نصیب کی سیاہیوں کو خود سے لپٹائے چپ چاپ ساکت سی بستر پر بیٹھی تھی —— یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے سارے جسم کی جان نکال لی ہو۔ اس کا ذہن پھر جلنے لگا۔ بےچینی سے اس نے تکیہ پر سر جھکا لیا۔

"پروردگار تو کیوں میرے ذہن کو روشنی نہیں دکھاتا —— یہ کیسی تاریکی ہے —— کیا میرے مقدر میں صرف تاریکیاں ہی لکھی ہیں۔ تاریکی اور بھیانک اندھیرے ہیں اپنے مستقبل سے کتنی خوفزدہ ہوں۔ میرا تو کوئی بھی نہیں رہا اس بھری دنیا میں۔ اس جگہ میں میرا کوئی نہیں رہا۔ میں کہاں جاؤں گی ——؟ زندگی کیونکر گزرے گی۔" بےحرف —— بےصدا سوچیں اسے ڈستی رہیں اور وہ اندر ہی اندر گھلتی رہی —— آنسو موتیوں کی طرح بند پپوٹوں سے جھڑتے رہے۔ اس نے سر جھٹک کر چہرہ لحاف سے باہر نکال لیا —— کھڑکی سے چاند کی نرم روپہلی چاندنی سامنے گھنے درختوں سے چھن چھن کر اس کے بستر تک آ رہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر چپ چاپ لیٹی نرم سنہری چاندنی کو تکتی رہی۔ چاروں سمت بیکراں سناٹا اور سکوت چھایا تھا اور جب روحانی کرب حد سے بڑھا تو وہ بستر چھوڑ کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔ چاند کی نرم ملائم سنہری روشنی چاروں اور بکھری ہوئی تھی —— آس پاس اور لمبے لمبے تناور درخت اپنی عظمت پہ نازاں کھڑے تھے۔ فضا میں پھولوں کی باس رچی تھی اور بہت خوشگوار سی خنکی —— ہوا دھیرے دھیرے مہندی کی باڑ اور بوگن ویلیا کی بیلوں میں سرسراتی پھر رہی تھی۔ ہوا کے فرحت بخش جھونکوں نے اس کے جلتے ذہن کو بےحد سکون پہنچایا۔ وہ چوکھٹ پر کہنیاں ٹکائے۔ دھندلی دھندلی نگاہوں سے خلاء کو تکتی رہی اور رات آہستہ آہستہ بیتتی رہی —— بیتتی رہی —— بوجھل پلکوں سے اس نے دور ابھرتے سویرے کو دیکھا اور اللہ اکبر کی مقدس آواز سن کر وہ باتھ روم میں گھس گئی۔ وضو کیا، نماز پڑھی اور نماز کے بعد اس کے دونوں ہاتھ خدا کے حضور دعا کے لئے اٹھ گئے۔

"یا الٰہی مجھے سکون دے ——" اس نے کپکپاتے ہونٹوں سے دعا مانگی اور آنکھوں میں آئی نمی کو جذب کرتی نڈھال سی ہو کر بستر پر گر پڑی —— آہستہ سے آنکھیں موند لیں اور چند ہی لمحوں بعد وہ بےسدھ ہو کر گہری نیند سو رہی تھی۔

—— "باقی آئندہ"

# غزل

ریاض حسین قمر

اے جان! ذرا محفلِ دل آ کے سجاؤ
تاریک سفر ہے دیے الفت کے جلاؤ

آرام سے کٹ جائے شبِ ہجر کسی کی
گر مے نہیں دردِ تہہِ مینا ہی پلاؤ

یہ میری تمنا ہے کہ بن جاؤں میں کندن
تم آتشِ الفت میں مجھے اور جلاؤ

اب زخمِ جگر اور بھی بڑھ جائے تو اچھا
تم تیرِ نظر ٹھیک نشانے پہ لگاؤ

یہ دل تو سدا جور و ستم سہتا رہا ہے
کیا خوف جو افسانۂ غم اور سناؤ

دیکھو تو میرے دل کا ابھی زخم ہرا ہے
آہستہ چلو بادِ محبت کی ہواؤ

کہنا کے قمر نے یہ ستاروں کو صدا دی
میں بہت پریشان ہوں میرے پاس نہ آؤ

# غزل

اقبال پیرزادہ

حوصلہ ہے تو سزا دو مجھ کو
میں بُرا ہوں تو مٹا دو مجھ کو

پہلے الزام تراشو مجھ پر
پھر سرِ دار سجا دو مجھ کو

میں بہرحال پہنچ جاؤں گا
میری منزل کا پتہ دو مجھ کو

ساتھ دو گے تو فضا چمکے گی
میں کہ شعلہ ہوں ہوا دو مجھ کو

یا تو حساس بنو میری طرح
ورنہ پتھر کا بنا دو مجھ کو

# سپنوں کا قیدی

کرشن چندر

[illegible]

سپنے دیکھنے والے ہیرو کے لیے کرشن چندر کا حسین تحفہ

**میری** شکل و صورت ایسی نہیں ہے کہ کوئی عورت ایک بار مجھے دیکھ کر دوسری بار مجھ پر نگاہ ڈالنے کی تکلیف گوارا کر سکے۔ میری بیوی یہی سمجھتی تھی کہ اس دنیا میں ہر عورت کی آبرو میری وجہ سے خطرے میں ہے۔ عام طور پر عورتیں مجھ سے ایسا سلوک کرتی ہیں جیسے گھر میں پرانے فرنیچر سے کیا جاتا ہے اور اس طرح مجھ سے مخاطب ہوتی ہیں جیسے میرے سر پر ٹوپی نہیں سبزی کا ٹوکرا رکھا ہو اس پر بھی میری بیوی جل جل کر خاک ہوئی جاتی ہے۔ اکثر مجھ سے پوچھتی ہے

"وہ کیا بات کر رہی تھی تم سے؟"

"کہہ رہی تھی، مٹر کا بھاؤ اس قدر مہنگا کیوں ہو گیا ہے؟"

"جھوٹ بولتے ہو۔ وہ تو تمہارے صوفے میں گھسی پڑ رہی تھی اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور کیا گہرا میک اپ کیا تھا اس نے اور کیا کاسنی رنگ کی ساڑھی پہنی تھی اس نے اور کیسی تیز خوشبو لگا کے وہ رجھانے آئی تھی تمہیں مردار!"

"مگر وہ میرے دوست کی بیوی ہے۔ سات اس کے بچے ہیں اس کی بڑی لڑکی کی شادی فروری میں ہونے والی ہے وہ پچاس برس کی معمر عورت ہے۔ کہہ رہی تھی، بھائی صاحب آپ...."

"بھائی صاحب!" میری بیوی نے طنزاً دہرایا

میں نے پھر اپنا جملہ دہرایا۔ "کہہ رہی تھی بھائی صاحب پشپی کی شادی میں آپ برابر شریک رہیں گے۔ سب کام آپ کو کرنا پڑے گا ان کے ساتھ۔"

"اس سے کہو اپنی بیٹی کے پھیروں کے سمے چار پھیرے تم سے بھی لگوا لے۔"

"کیا کہتی ہو؟" میں نے غصّے سے بھڑک کر کہا۔ "اس شریف عورت پر ایسی غلیظ تہمت لگاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی!"

"حرام زادی، کُٹنی آئے تو سہی دوبارہ میرے گھر میں اس کی چُٹیا کاٹ کے نہ پھینک دوں!"

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں اس پچاس برس کی بڑھیا سے عشق کروں گا۔"

"ارے تم۔ تمہیں تو اگر مٹی کی عورت بھی مل جائے تو

کس سے عشق کرو۔ تمہیں تو اگر کوڑے کے ڈھیر پر گری پڑی گلی سڑی بھکارن بھی مل جائے تو اس سے بھی آنکھیں لڑا لو۔ میں دیکھتی نہیں ہوں کیسی بے حیائی سے تم میری سہیلیوں کو تکتے ہو؟ تم حیوانی آدمی ہو؟"

"ہاں ہاں، میں جانور ہوں!"

"جانوروں سے بھی بدتر!"

غم اور غصے سے کھولتا ہوا میں گھر سے باہر نکل گیا۔ دن بھر کی آفس کی جھک جھک کے بعد یہ سوچ کر آیا تھا کہ رشیدہ صاف ستھرے کپڑے پہنے چائے دانی پر عمدہ سی ٹی کوزی چڑھائے میز پر چمکتے ہوئے پیالے رکھے عمدہ سی چائے بنائے گی۔ یہاں یہ افتاد پڑی

تیز تیز قدموں سے چلتا، جلتا بھنتا نکڑ کے ایرانی ریستوران میں چلا گیا اور ایک چائے کا آرڈر دیا۔

"سنگل کہ ڈبل؟" چھوکرے نے پوچھا

"سنگل!"

"اسپیشل کہ چالو؟" چھوکرے نے پھر پوچھا

"چالو!" میں نے کہا

"ہلکی کہ کڑک؟"

"کڑک"

میں نے کڑکتی ہوئی آواز میں کہا اور چھوکرا مسکراتا ہوا پلٹ گیا اور کچن کے کاؤنٹر کے بیرے سے بولا۔ "ایک سنگل چالو کڑک! بابو آج پھر گھر سے لڑ کے آیا ہے!"

یہ بڑی سخت دنیا ہے آدمی کارخانے میں کام کرے تو کولہو کے بیل کی طرح گھمایا جاتا ہے دفتر میں کام کرے تو میز پر دھوبی کے کپڑے کی طرح پیٹا اور نچوڑا جاتا ہے۔ گھومنے پھرنے کا کام ہاتھ میں لے تو گھنٹوں دفتروں کے باہر سڑایا جاتا ہے۔ یہ بڑی سخت دنیا ہے پہلی ہی نظر میں ہر شخص آپ کو دیکھ کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ آپ اس کے پاس اس کی پاکٹ مارنے کے لئے آئے ہیں اور اگر غور سے دیکھا جائے تو ہمارے نظام زندگی میں ماڈرن بزنس ایک قسم کا شریفانہ پاکٹ ماری کے سوا اور کیا ہے اور مقابلے کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ کون کس کی زیادہ پاکٹ مار سکتا ہے مگر میں اس وسیع و عریض اور چاروں طرف پھیلی ہوئی اس مہیب اور خوفناک مشین کا ایک پرزہ ہوں، ایک چھوٹا سا خلیہ ہوں، ننھا سا ذرہ ہوں، کس طرح اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہوں۔ ان لوگوں نے مجھے مار مار کے اور گھسا گھسا کے اور گھما گھما کے بالکل اپنی مشین پر فٹ کر لیا ہے اور اب میری دلچسپی صرف اس میں ہے کہ کسی طرح چلتا رہے اور میں کسی طرح چلتا رہوں مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھے آئل نہیں دیتے۔

اور میرا زنگ صاف نہیں کرتے ہیں اور میں اسی طرح دن رات
مشقت کرتا ہوا اس مشین کے اندر گھس گھس کر ٹوٹ جاؤں گا پھر
وہ مشین سے نکال کر پھینک دیں گے اور میری جگہ ایک نیا پرزہ لے
آئیں گے مگر یہ میرا گھر کیسے چلے گا؟ اور کون اس کا کرایہ ادا کرے
گا اور کہاں سے رما کے لئے ساڑھی لے کے آؤں گا کس طرح چھوٹی
بچی کی اسکول کی فیس ادا اور بڑے لڑکے کے کالج کی فیس ادا ہوگی اور
وہ پچیس روپے جو میں ہر ماہ اپنی بوڑھی ماں کو مظفر گڑھ کے قصبے
میں بھیجتا ہوں کیسے بھیج سکوں گا؟ یہ بڑے اہم سوال ہیں میرے
لئے اور انہیں سلجھاتے ہوئے میرے سر کے بال سفید ہوتے
جا رہے ہیں لیکن رما کو ان سوالوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے وہ
اس باہر کی سخت گیر وحشتناک دنیا کا اندازہ بھی نہیں کر پاتی جس
میں مجھے کام کرنا پڑتا ہے اور گھر آتے ہی مجھے کانٹوں میں گھسیٹنا
شروع کر دیتی ہے حالانکہ اس روز جب میرا اور رما کا ریڈیو
گرام کے بارے میں جھگڑا شروع ہوا وہ گھر کے دروازے کے
باہر ایک عمدہ فیروزی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے ہنس ہنس کر
ایک عورت کو الوداع کہہ رہی تھی اور اس کی باتوں کا لہجہ بہت
ہی میٹھا اور دلکش تھا اور میں اس کے خوشگوار موڈ کو دیکھ کر
بہت خوش ہوا اور سوچا کہ آج شام کی چائے پر اس سے گاجر کے
حلوے کی فرمائش کروں گا۔

مگر ہوا یہ کہ اس عورت کے جانے کے بعد رما نے اپنی خوبصورت
فیروزی رنگ کی ساڑھی اتار دی اور فوراً ایک میلی دھوتی پہن لی
اور یہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ ہمارے یہاں کی عورتیں صرف
مہمانوں کی خاطرداری کے لئے عمدہ ساڑھی کیوں پہنتی ہیں اور جوں
ہی مہمان چلے جاتے ہیں ساڑھی اتر جاتی ہے شگفتہ مزاجی بھی اتر
جاتی ہے پھر فوراً بھنویں تن جاتی ہیں تیوریوں پر بل آ جاتے ہیں
اور کمر پر دونوں ہاتھ رکھ کر تیز تیز آواز میں دھمکاتے ہوئے
رما مجھ سے کہتی ہے۔

"کچھ معلوم بھی ہے تمہیں؟"
"کیا؟" میں نے سہم کر پوچھا

"پشپی کی ماں آئی تھی۔ ان لوگوں نے نیا ریڈیو گرام
خریدا ہے!"

"وہ پشپی کے جہیز کے لئے ہوگا!"
"پشپی کے جہیز کے لئے الگ خریدا ہے یہ گھر کے لئے ہے
ایک تم ہو چھ سال سے اسی ڈیڑھ سو روپلی والے گھٹیا سیٹ
کو سمیٹے بیٹھے ہو جس کی مرمت کراتے کراتے میرا دیوالہ پٹ چکا ہے
کم بخت کوئی اسٹیشن نہیں بجاتا ٹھیک طرح سے، ریڈیو سیلون
بجاؤ تو قاہرہ کا اسٹیشن بجنے لگتا ہے ایک دن اٹھا کے پھینک دوں
تمہارے اس کھٹارہ سیٹ کو؟"

"پھینک دو؟"
"تو تم لا کے کیوں نہیں دیتے ہو مجھے نیا ریڈیو گرام؟"
"دو ہزار کہاں سے لاؤں؟"
"جہاں سے پشپی کا باپ لاتا ہے!" رما چلا کر بولی
"پشپی کا باپ تو ایک بڑی فرم میں ایگزیکٹو ہے اور تین
ہزار تنخواہ پاتا ہے۔"

"تو تم یہ ذلیل نوکری چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔"
"یہ ذلیل نوکری چھوڑ دوں تو دوسری ذلیل نوکری کہاں
سے ملے گی؟"

"مشانتا کے باپ کو کیسے مل گئی، ساڑھے تین سو کی نوکری
چھوڑ کر اسے ساڑھے سات سو کی نوکری کیسے مل گئی، کچھ معلوم بھی
ہے وہ لوگ قسطوں پر ایک ریفریجریٹر لے کے آئے ہیں اور اب یہ
فلیٹ چھوڑ کے ایک بڑے فلیٹ میں جانے والے ہیں اور ایک
تم ہو جب سے تمہارے پلے بندھی ہوں اس گندے سڑے بدبودار فلیٹ
میں قید کر رکھا ہے!"

"یہ بدبودار فلیٹ ہے؟" میں نے غصے سے کہا
"بدبودار فلیٹ؟ - اس کو فلیٹ کہنا لفظ فلیٹ کی توہین
ہے۔" رما بھی گرم ہو کر بولی۔ "دیواروں میں دراڑیں، کچن میں تل
چٹے، کوریڈور میں اندھیرا، کمروں میں سیلن ہے، یہ گھر ہے کہ اصطبل
ہے؟ میرے مائیکے کے نوکر اس سے بہتر گھر میں رہتے ہیں میرے
مائیکے کے کتے اس سے بڑے کمروں میں لوٹتے ہیں!"
"میں کتا ہوں؟" میں غصے سے چلایا
"چلاؤ مت، میں نے تم کو کتا نہیں کہا!"
"میں ٹرّاتا ہوں؟" میرا خون غصے سے کھولنے لگا۔ "میں
مینڈک ہوں، میں جانور ہوں؟ تو تم میرے ساتھ رہتی کیوں ہو؟"
"کون رہتا ہے تمہارے ساتھ، میں ابھی مائیکے جاتی
ہوں!" یہ کہہ کر رما نے چابیوں کا گچھا ساڑھی سے کھول کر زور سے فرش
پر پٹخ دیا اور آنکھوں میں آنسو لئے گھر سے نکل گئی۔
رما گھر سے نکل کر نکڑ کے ایرانی ریستوران میں پہنچی اور
کاؤنٹر پر ایک طرف ہونٹ بھینچے آنکھوں میں آنسو لیے

کھڑی ہو گئی اور جب ٹیلیفون فارغ ہوا تو ایک چھوکرے سے بولی "ذرا بکنگ آفس ٹیلی فون کرنا پوچھنا آج رات لکھنؤ جانے والی گاڑی سے فرسٹ کلاس سیٹ ملے گی؟"

"دو سیٹیں خالی ہیں" چھوکرے نے ٹیلیفون ملا کے بتایا۔

"اچھا" رما بولی

"ریزرو کروا دوں" چھوکرے نے پوچھا

"نہیں میں خود کرا لوں گی" رما نے بڑی سختی سے جواب دیا اور ایرانی ریستوران سے باہر نکلنے لگی تو چھوکرے نے کہا "ٹیلیفون کے بیس پیسے حساب میں لکھ لو۔ بابو کی بیوی میکے جا رہی ہے"

لیکن مائیکہ تو ایک عارضی پناہ گاہ ہے مائیکے جا کے بھی پلٹنا پڑتا ہے۔ خواب اور حقیقت سپنے اور سچائی میں اتنا فاصلہ ہے کہ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ میں کس سے کس کی بے وفائی کا گلہ کروں اور کس کے مزاج کی کج ادائی کو بدنام کروں؟ کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے رما اس عہد کی عورت نہیں ہے نہ اس کا حسن نہ اس کا مزاج نہ اس کی طبیعت، اس کی شخصیت کی کوئی ادا اس زمانے کی نہیں ہے اس کے سارے خواب ماضی کے خواب ہیں جہاں رنگین کمروں کے پیچھے سرسراتے ہوئے ریشمی پردوں کے اندر موم کی شمعیں روشن ہوتی ہیں اور دالان در دالان پردے گرائے جاتے ہیں اور کوری مراحیوں کے گرد موگرے کے ہار لپیٹے جاتے ہیں اور گلاب کی سی ہتھیلیوں پر کنول کی سی کٹوریوں میں خوشبوئیں سجائے مامائیں چاندی کے چھپر کھٹ پر بال کھولے ہوئے کسی مغل شہزادی کی طرح شاعرانہ مزاج رما کے سولہ سنگھار میں مصروف ہو جاتی ہیں حالانکہ اس بیسویں صدی کی مشینی دنیا میں کتوں کی طرح ایک دوسرے پر لپکتی ہوئی خواہشوں کی کائنات میں یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے اور کس کے لئے ممکن ہے اور کیسے کیسے معصوم جذبوں اور بے گناہ زندگیوں کا گلا گھونٹ دینے کے بعد ممکن ہے اس کا گلہ میں کس سے کروں اور سمجھاؤں کس کو اور کس کو بتاؤں کیونکہ میرے ماحول کی دنیا میں کون ہے جو اس قسم کے بیکار کے سپنوں کا قیدی نہیں ہے اور کون ہے جو اپنی جگہ اپنے ماحول میں اپنی زندگی کے لئے ایک ایسا بیکار تعیش آمیز خواب نہیں دیکھتا اور اسی خواب کے گرد طواف کرتے ہوئے آدھے سچ اور آدھے سپنوں کی دھوپ چھاؤں میں اپنی پوری زندگی بسر نہیں کر دیتا یہ عہد کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ ہر شخص کا اپنا ایک الگ خواب ہے اور کسی کو فرصت نہیں ہے

کہ وہ جھانک کر اپنے بالکل قریب کسی دوسری روح کے سپنے کو دیکھے یا سمجھنے کی کوشش کر سکے یا اس کے سپنے سے اپنے سپنے ملائے

کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس کارزار حیات میں ہر شخص اپنے سپنے کی بندوق اٹھائے چل رہا ہے یا اپنے سپنے کی بیڑیاں یا ہتھکڑیاں پہنے یہ سوچتا ہے کہ وہ آزاد کیوں نہیں ہے کیا واقعی ان لوگوں کی آنکھیں ہیں یا یہ کہ ہر جگہ اپنے سپنوں کا گیت سنتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کے ہاتھ ہیں یا یہ کہ ہر جگہ اپنے ہی سپنوں کا جال بنتے ہیں۔ کیا ان لوگوں کی کوئی مشترک منزل ہے یا یہ کہ ہر جگہ اپنے اپنے سپنوں کی ٹانگوں سے چلتے ہیں اور اپنے محبوب کے چہرے میں بھی اپنے ہی سپنے کا چہرہ تلاش کرتے ہیں یہ کس طرح کی خود غرضی ہے جس کے لئے ان لوگوں نے باہر کی ہر حقیقت کو چاند کو سورج کو، زمین کو، بارش کو، آبشار کو، جھیل کو، شفق کو اور مانند کی ہر خوبصورتی کو، ممتا کو، محبت کو، رفاقت کو، قربت کے ہر لمحے کو اور اس کی فصل کے ہر خوشے کو اپنے اپنے سپنوں کی کھونٹیوں سے باندھ کے الگ الگ کھڑا کر دیا ہے اور اب سب حیران ہیں کہ یہ دنیا آگے کیوں نہیں چلتی؟

●

ہر روز دانا کل کل سے تنگ آ کر میں نے خودکشی کی ٹھانی جب چیزیں سمجھ میں نہ آئیں اور مسئلہ کا کوئی حل دریافت نہ ہو اور مفاہمت کی کوئی صورت نہ نکلے اور زندگی ہر لحظہ عذاب بن جائے اس وقت آدمی بے بس ہو کر یوں بھی سوچتا ہے اس وقت اتفاق سے اس دن کا جھگڑا بھی بہت طویل اور خطرناک تھا گھر کے نوکر نے چینی کی ایک پلیٹ توڑ ڈالی تھی اور رما نے چاہا کہ آسمان سر پر اٹھا لیا تھا اور نوکر کو برطرف کرنے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔

"ایک چینی کی معمولی سی پلیٹ کے لئے اتنا غصہ کرتی ہو؟" میں نے رما کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"تمہارے لئے معمولی ہو گی میرے لئے بہت ہے جس گھر میں تین سال سے چینی کا ایک ہی سیٹ چلا آ رہا ہو" اس گھر کے لئے چینی کی ایک پلیٹ کا نقصان کوئی کم نقصان نہیں ہے؟"

"دوسری آجائے گی۔"

"دوسری آجائے گی مگر ایسی تو نہیں آئے گی" ملیر سیٹ کا سیٹ چوپٹ کر دیا اس حرامزادے شودر نے!"

"گالی مت دو۔" میں نے کڑک کر کہا۔ "شودر ہوا تو کیا آخر وہ بھی ایک انسان ہے۔"

"ہاں۔ ہاں تم تو اس کی طرفداری کروگے ایک شودر دوسرے شودر کا ساتھ نہیں دے گا اور کون دے گا؟" رما چمک کر بول اٹھی

میں دھک سے رہ گیا، بات سچی تھی پر آج تک میں نے رما کو نہیں بتائی تھی، رما سے شادی کرنے کی خاطر اپنی محبت کو کامیاب انجام تک لے جانے کی خاطر ہی میں نے رما اور اس کے ماں باپ سے جھوٹ بول دیا تھا ایسی محبت کی خاطر میں نے اپنا نام ذات پات حسب نسب تک چھپا ڈالا تھا اور اپنی دانست میں آج تک یہی سمجھتا رہا کہ رما کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔

رما مجھے چپ دیکھ کر بڑھ بڑھ کر بولنے لگی۔ "ہمت ہے تو کر دو انکار؟ ایک بار تو چھوٹے منہ سے کہہ دو نا! تم سمجھتے ہو میں کچھ نہیں جانتی ہوں۔ تمہاری اصلیت سے واقف نہیں ہوں؟ مگر مجھے اس لنگڑے سریندر کی ماں نے سب کچھ بتا دیا تھا وہ تو تمہاری سات پشتوں کو جانتی ہے اس نے مجھے بتایا تھا کہ تم بانکے پور کے رہنے والے نہیں ہو موضع کھیلو کے جولاہے ہو اور تمہارا باپ بھی جلاہا تھا اور ماں بھی جلاہن تھی اور تم گھر سے بھاگ کر شہر آگئے اور کسی نہ کسی طرح تعلیم حاصل کر کے کرشن کانت شرما بن گئے اور مجھ نگوڑی کو پھانس لیا۔"

"پھانس لیا؟" میں نے گرم ہوتے ہوئے پوچھا

"پھانس نہیں لیا تو اور کیا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم ذات کے دھنئے جلاہے ہو، بدتوے اور بدخوارہ ہو اور سات پشتوں تک تمہاری رگوں میں بدو جنئے کا خون نہیں رہا تو میں ایک چھتری کی بیٹی ہو کر تمہیں منہ نہ لگاتی، تم سے محبت کرتی؟ تمہارے منہ پر بھی نہ تھوکتی!"

یکایک میں غصے سے کانپنے لگا، اپنی جگہ سے اٹھ کر چلنے لگا۔ "تو تھوک دو نا مجھ پر۔ تھوک دو میرے منہ پر اور اپنی محبت پر جو انسان کو نہیں دیکھتی اس کی ذات کو دیکھتی ہے جو اس کے کام اور اس کی مجبوری کو نہیں دیکھتی صرف اپنی خوشیوں کا بگل بجا بجا کر ہر وقت لڑنے پر آمادہ رہتی ہے لعنت ہے ایسی زندگی پر۔

اس طرح جینے سے تو مر جانا بہتر ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے دروازہ بند کر دیا اور گھر سے باہر نکل کر سمندر کی طرف چلا آیا، میرے جسم کا رواں رواں کانپ رہا تھا اور میں خودکشی کا تہیہ کر چکا تھا، اب زندہ رہنا بے سود ہے۔

تاریک ناتھ روڈ سے گزر کر میں کاٹ مارہ چوک کی طرف بڑھا اور بسوں کا اڈہ کراس کر کے سمندر کے کنارے آگیا۔

باہر کھلی ہوا میں آکر گھر کی گھٹن اور تاریکی سے دور مجھے یہاں سمندر کا کنارا بہت چمکیلا اور روشن معلوم ہوا ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا اور سمندر کی مچلتی ہوئی سنہری لہروں میں لوگ بگ نہا رہے تھے اور خوشی کی دھوم مچا رہے تھے عورتیں خوب صورت لباس پہنے ہوئے چہل قدمی کے لئے باہر نکل آئی تھیں اور اپنے بچوں کو گود میں اٹھائے یا پھر انہیں دھکیلتی ہوئی یا اپنے عاشقوں کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے اٹھلاتی ہوئی سیر گشت کر رہی تھیں۔

میں نے سوچا۔ میں کپڑے اتار کر سیدھا سمندر میں گھس جاؤں گا اور نہاتے نہاتے دور نکل جاؤں گا جہاں سے واپس آنے کا کوئی امکان بھی نہ ہو کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا، خس کم جہاں پاک جیسے لہروں پر ایک بلبلہ پھوٹ گیا، ایسے ہی سمجھو میں مر گیا۔

بھیل پوری والے کی دکان پر گاہکوں کا جم غفیر تھا، پیلی پیلی بیسنی سویاں اور نمکین سیو اور بھنا ہوا چیوڑا اور سفید سفید کرکرے مرمرے اور ہری ہری مرچیں اور چٹ پٹی چٹنی۔ میرے منہ میں پانی آنے لگا۔

"پہلے ایک بھیل پوری کھالوں۔ میں نے سوچا مرنا تو ہے ہی!"

بھیل پوری کھا کر میں آگے سمندر کی طرف بڑھ گیا ایک جگہ ریت پر کھڑے ہو کر قمیض اتارنے لگا، پہلے قمیض اتار دوں گا پھر پتلون پھر اندر کی چڈی پہنے سیدھا سمندر میں گھس جاؤں گا اور ختم، اتنے میں میری نگاہ بنارسی گول گپے والے پر پڑی آلو کی ٹکیاں تلی جا رہی تھیں اور تیل میں سوں سوں کی آواز پیدا کرتی ہوئی بھوری ہوتی جا رہی تھیں۔

شیشے کے ایک بڑے گول باؤل میں شفاف سنہرے کرارے گول گپے بھرے ہوئے تھے اور بہ مصالحے کی چاٹ والے پانی کی ہنڈیا کے گرد مو گرے کے پھولوں کی وینی الجھی ہوئی تھی اور سفید سفید دہی بڑوں پر ہری اور لال مرچوں کی ہوائیاں چھوٹ رہی تھیں۔

"تھوڑے سے گول گپے کھالوں۔ میں نے سوچا مرنا تو ہے ہی۔"

گول گپے کھا کر مزہ آگیا ہونٹوں اور زبان سے اور ناک سے اور آنکھوں سے گویا دھواں اٹھ رہا تھا اور زبان بار بار چٹخارے لیتی ہوئی معلوم ہوتی تھی خوب شکم سیر ہو کر کھایا اور پھر مرنے کے لئے آگے چلا۔

آگے چل کر گویا سمندر کے بالکل کنارے جا کر مجھے آئس کریم والا ملا۔ ایلومونیم کے شفاف تکونوں میں قلفیاں جمائی تھیں اس نے کھوئے کی قلفی تھی اور پستے کی قلفی تھی اور بادام کی قلفی تھی اور دو طرف بڑے بڑے چمکتے ہوئے تھالوں میں سفید سنہرے فالودے کے لچھے کے لچھے بھرے رکھے تھے۔

آخری بار قلفی بھی کھا لیں، اصلی پنجابی قلفی، میں نے سوچا اس میں حرج ہی کیا ہے اس کے بعد مرنا تو ہے ہی۔"

قلفی کھا کر میرے سارے جذبات سرد پڑ گئے ایسا معلوم ہوا جیسے دل و دماغ پر کسی نے بالائی کی تہیں جما دی تھیں اور ساری روح کو ایر کنڈیشنڈ کر دیا ہے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں مجھے نیند سی آنے لگی اور مجھے یہ سوچ سوچ کر حیرت ہونے لگی کہ مجھے مرنا ہوگا، واقعی مرنا ہوگا، کیا مرنا آج کی بجائے کل پر نہیں ٹالا جا سکتا؟

ابھی میں اسی طرح سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے ایک تیز جھٹکے سے میرا بازو پیچھے سے پکڑ لیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو رما تھی۔

"گھر سے مرنے کے لئے آئے تھے اور یہاں آئس کریم کھا رہے ہو ارے تم پنجابی!" رما زور زور سے ہنسنے لگی

رما نے بہت عمدہ ساڑھی پہن رکھی تھی بالوں میں جوہی کی وینی لگائی تھی اور وہ بہت پیاری اور تندرست معلوم ہو رہی تھی میں نے مسکرا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ رما نے میرے ہاتھ کو ہولے سے جھٹک کر آنکھیں مٹکا کر بڑی ادا سے کہا۔

"اکیلے اکیلے کھا گئے نا ساری آئس کریم!"

"تم بھی کھا لو جتنی چاہو!" میں نے اپنے دل کے اندر سمندر کی طرح پھیلی ہوئی فراخدلی سے کہا۔

"نا۔ میں یہ سڑی بسی آئس کریم نہیں کھاتی مجھے تو ایرانی کے ریفریجریٹر والی آئس کریم کھلاؤ تم۔"

ایرانی کے ریستوران میں جا کر میں نے چھوکرے سے کہا

"دو آئس کریم دے دو۔!"

"سنگل کہ ڈبل؟" وہ بولا

"ڈبل۔"

"اسپیشل کہ چالو؟"

"اسپیشل!"

"ونیلا کہ ٹوٹی فروٹی؟"

"ٹوٹی فروٹی۔"

"گھر لے جاؤ گے کہ یہاں کھاؤ گے؟"

"گھر لے جاؤں گا!"

چھوکرا آئس کریم کاؤنٹر پر جا کر بولا۔ "دو ڈبل ٹوٹی فروٹی پیک بابو کی بیوی سے صلح ہو گئی ہے!"

# یورپ کی چندروزہ مہمان

منگنی کی وہ نازک سی تابناک انگشتری جو کبھی کسی مغربی دوشیزہ کی انگلیوں میں شادی کا اقرار بن کر چمکتی تھی اب رفتہ رفتہ اپنی اہمیت اور رومانی کشش کھوتی جا رہی ہے۔

اب تک یورپ میں برطانیہ ہی ایک ایسا ملک تھا جہاں قدیم و جدید تہذیب بڑی خوبصورتی سے ہم آہنگ ہو کر ایک نئے معاشرے کو تشکیل دے رہی تھی لیکن گزشتہ چند سالوں سے جرمنی، اٹلی، فرانس اور امریکی ممالک سے آیا ہوا انقلابی رجحان بہت سی معاشرتی قدروں اور روایتوں کی قدیم بنیادوں کو کھوکھلا کر چکا ہے۔ اب یہاں کی نئی نسل کی ایک کثیر تعداد ایسی بھی ہے جو شادی کے معاملات میں چرچ، پادری اور مذہبی رسوم کو محض ایک بیکار سا تکلف سمجھتی ہے اور شادی سے پہلے منگنی کی انگوٹھی کو قطعی غیر ضروری خیال کرتی ہے۔ دلہن بننے والی بعض دوشیزاؤں کے خیال میں شادی کے مخصوص لباس کے ساتھ کنول کی کلیوں کا گلدستہ جو عام طور پر کنوارپن کا سمبل سمجھا جاتا ہے اب فرسودگی اور رجعت پسندی کی یادگار کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔

تیزی سے بدلتے ہوئے انقلابی رجحانات اب برطانیہ کی میرج گائیڈ کونسل کے لیے درد سر بن گئے ہیں اس لیے کہ گزشتہ چند سال کی ناکام شادیوں کا تناسب پچھلے سالانہ ریکارڈ سے کئی گنا بڑھا ہوا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ۷۴ء میں صرف لندن شہر کی ہر دس شادیوں میں سے تین شادیاں قطعی ناکام ہوئیں اور جن کا نتیجہ مستقل علیحدگی کی صورت میں نمایاں ہوا۔ انہی بدلتے ہوئے رجحانات کی بروقت روک تھام کے لیے برطانیہ کی میرج گائیڈ کونسل نے ایک مثالی سروے کے لیے تقریباً چار سو غیر شادی شدہ لڑکیوں اور لڑکوں سے ایک سوالنامے کے ذریعے معلومات فراہم کیں۔ ان لڑکیوں میں سے ایک بڑی تعداد طالبات پر مشتمل ہے۔ ان سے معلوم کیا گیا تھا کہ وہ منگنی کی رسم کو شادی

منگنی صدیوں سے ہر معاشرے کی ایک رومانی رسم رہی ہے۔ شادی سے پہلے لڑکی لڑکے کو ایک دوسرے سے مانوس کرنے کے لیے یہ رسم برطانیہ میں لازمی سمجھی جاتی ہے۔ مگر یورپ کی نئی نسل نے منگنی تو منگنی شادی کی رسم کو غیر ضروری سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ یورپ میں بھی منگنی کا حشر سب سے بُرا ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر دیکھئے یہ رسم وہاں کس کسمپرسی کے عالم میں سسک رہی ہے۔

نے یہ ممکن بھی ضروری سمجھتی ہیں اور منگنی کی غیر موجودگی ان کو کس حد تک
پسند یا ناپسند ہے۔ شادی کی مروجہ قدیم رسمات کے بارے میں نئی نسل
کی دوشیزاؤں کا ردِ عمل دریافت کیا گیا۔

کونسل نے اپنے سروے کے نتائج زیادہ با مقصد بنانے کے لیے
بعض شادی شدہ جوڑوں سے بھی رابطہ قائم کیا۔ اور بعض لڑکیوں کے والدین
سے بھی ان کے خیالات معلوم کیے ہیں۔ اس کے علاوہ ماہرینِ نفسیات نے
بھی اس رپورٹ پر اپنی سفارشات دی ہیں۔

اس سروے رپورٹ سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں وہ ظاہر کرتے
ہیں کہ آجکل کی بیشتر لڑکیاں مذہب، گرجا اور پادری یا والدین کے لازمی
دخل کو اپنے شادی کے معاملے میں قطعی غیر ضروری سمجھتی ہیں اور منگنی کا
طویل زمانہ گزارنے کو بھی جو برطانیہ میں خصوصاً شادی سے قبل ہر لڑکی کے
لیے ضروری ہے، بے معنی قرار دیتی ہیں۔ ان کی نظر میں آج کے دور میں منگنی
ایک بے مقصد رسم ہے۔

۲۲ سالہ مس کیتھی جو ایک برطانوی بینک میں بطور پرسنل سیکریٹری
ملازم ہیں ان کا کہنا ہے کہ وہ تقریباً دو سال تک اپنے پسند کے لڑکے (بوائے
فرینڈ) کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے جاتی رہی اور اب آٹھ ماہ سے وہ
اس کے ساتھ ہی رہ رہی ہیں۔ جب مس جونز سے معلوم کیا گیا کہ وہ
دونوں جلد ہی شادی کرنے کا کوئی ارادہ رکھتے ہیں تو انھوں نے نفی میں
جواب دیتے ہوئے کہا: "ہمارا عام رواج کے مطابق شادی کرنے کا کوئی
پروگرام نہیں۔ جب کبھی ہم نے باہمی طور پر ایک ساتھ تمام عمر گزارنے کا
فیصلہ کر لیا تو کسی قریبی شادی کے رجسٹریشن آفس میں جاکر دونوں دستخط
کر آئیں گے۔"

ایک لڑکی جو چند ماہ سے اپنے ایک ہی بوائے فرینڈ کے ساتھ
فلم دیکھنے جاتی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے والدین کو صرف اتنا اعتراض
ہے کہ مجھے منگنی کی رسم کے بعد ہی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ وقت
گزارنا چاہیے تھا۔ اس طرح یہ باہمی میل جول اچھی نظر سے دیکھا جاتا۔" بہرحال
ہم نے ماں باپ کی دل شکنی کا خیال کرتے ہوئے اتنا کیا کہ میں نے منگنی
کی انگوٹھی پہن لی۔ اس نے اس بات پر تعجب کیا کہ محض ایک معمولی سی
رسم کی ادائیگی یا عدم ادائیگی کسی لڑکی کے لیے عزت اور بے عزتی کا سوال
بھی بن سکتی ہے؟

۲۲ سالہ مس کرنیلی کا خیال ہے کہ جو تہذیب و تمدن کے لوازمات
شادی کی رسمات کی شکل میں اس کے ماں باپ کو ملے تھے اور جن کو ملے
نصف صدی کا عرصہ بیت گیا ہے، وہی شادی کے دم چھلے اب اس کے والدین
اس کو سونپ رہے ہیں۔ مس کرنیلی ایک گارمنٹ فیکٹری میں سپروائزر ہے۔

آئندہ سال وہ اپنے پسندیدہ لڑکے سے شادی کرے گی جس کا اعلان اخبار
میں چھپ جائے گا جس کے بعد وہ ایک شادی شدہ زندگی گزارنے لگے گی۔

مانچسٹر کے ایک کاروباری شخص آرتھر بیکر نے اپنی لڑکی کو اپنی
پسند کے لڑکے کے ساتھ شادی کرنے کی اس وقت تک اجازت نہ دی جب تک اس نے
منگنی کا زمانہ نہ گزار لیا۔ آرتھر بیکر کی عمر اس وقت ۶۵ سال ہے۔ اس نے
۳۰ سال پہلے شادی کی تھی اور اس شادی سے پہلے کورٹ شپ کا دو سال
کا طویل زمانہ گزارنا پڑا تھا۔ اس کی لڑکی نے صرف باپ کی ناراضگی سے ڈر کر
باقاعدہ منگنی کی رسم کی پابندی کرنے کے بعد شادی کی اور اس بات کا عہد
کر لیا کہ منگنی جیسی فضول رسم کو اپنے بچوں کے لیے ہرگز ضروری نہیں سمجھے
گی۔

برطانیہ اور امریکہ میں اب نئی نسل چند خاندانوں میں برسوں سے
مروج شادی کے اصولوں اور رسموں کے خلاف سرکشی ہی ہے۔ اس پر
چرچ کے حلقوں نے بڑی تشویش کا اظہار کیا ہے۔ شادی کو مذہب کی
عائد کردہ شرائط کے ساتھ وابستہ رکھنے کے لیے ایک اقدام جو فوری طور پر
کیا گیا وہ یہ ہے کہ بعض گرجاؤں میں اب باقاعدہ کلاسز لگنے لگی ہیں۔ ان
کلاسز میں منگنی اور کورٹ شپ کے پس پشت جو بنیادی خیال ہے اس کی
اہمیت پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ ان کلاسز میں لڑکے اور لڑکیاں اپنے
والدین کے ساتھ حصہ لیتے ہیں۔ لندن کے مغربی علاقے کے ایک چرچ
میں گزشتہ دنوں ایک ایسی ہی کلاس ہو رہی تھی۔ بیشتر لڑکیاں اپنے بوائے
فرینڈز کے ساتھ آئی تھیں۔ میرج کونسل کا نمائندہ بھی موجود تھا۔ کلاس کے
بعد اس نے لڑکوں اور لڑکیوں سے آئندہ زندگی کے پروگرام پر بحث کی۔
ان کی باہمی پسند کا تجزیہ کیا اور بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں پر ثابت کر
دیا کہ انھوں نے جو ساتھی اپنے لیے چنا ہے وہ ایک خوشگوار زندگی بسر کرنے
کے لیے کس حد تک مناسب یا غیر مناسب رہے گا۔ اس براہِ راست رابطے
کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب ان لڑکوں اور لڑکیوں نے علیحدہ بیٹھ کر اپنا موازنہ کیا تو
واقعی بہت سی باتیں جو کونسلر نے ایک اچھی شادی شدہ زندگی کے لیے
لازمی قرار دی تھیں، صحیح معلوم ہوئیں۔ کونسلر نے مختلف لڑکوں اور لڑکیوں
سے پوچھا تھا کہ انھوں نے شادی کا فیصلہ ملاقات کے کتنے عرصے بعد کیا تھا۔
بوائے فرینڈ کی عمر اور ان کی اپنی عمر میں کتنا فرق ہے ——— بوائے
فرینڈ یا گرل فرینڈ ایک دوسرے میں کس لحاظ سے دلچسپی لیتے ہیں اور
ان کی باہمی پسند کی چیزیں کیا ہیں۔ پھر جب دوسرے ہفتے کلاسز
لگیں تو کونسلر کے سامنے پہنچ کر بہت سے لڑکوں اور لڑکیوں نے ایک
دوسرے کے لیے اپنی عجلت پسندی کا اعتراف کرتے ہوئے آئندہ زندگی
کی بے راہ روی اور اس کے ضرر رساں نتائج سے بچنے کا وعدہ کیا۔

## میرج کونسل

میں دنیا میں سب سے بڑی مشکل سے جورج سے پیچھا چھڑا کر ولیم سے شادی کی اور جب اس کے ساتھ ہنی مون پر گئی تو — وہاں مجھے ایک بڑا ہی شاندار مرد ملا۔

اس سروے رپورٹ میں میرج گائیڈ کونسل کو نئی پود کے لیے ایک ضروری رہبر ادارہ بتاتے ہوئے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ملک بھر میں ایسی کلاسز کو عام کیا جائے جہاں جوان نسل کو حقیقی رہنمائی ملے اور انہیں اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کے لیے ایسے پیمانے ملیں جنہیں وہ صرف اس دلیل کی بنا پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں کہ —— "ایسا تو ہوتا ہی آیا ہے۔"

امریکہ کی میرج گائیڈ کونسل کے ایک گروپ کا یہ کہنا کہ "آج شادی کرو —— پھر کل کی باہمی زندگی پر سوچو۔" بظاہر برطانوی سوشل مفکرین کے خیال کی ضد معلوم ہوتا ہے لیکن امریکی گروپ کا خیال ہے کہ شادی کے بعد ہی پوری طرح ذمہ داریوں کو محسوس کرنے کا موقع ملتا ہے اور ایک دوسرے کو صحیح پس منظر کے ساتھ سمجھنے کا موقع میسر آتا ہے۔ برخلاف اس کے منگنی کا زمانہ ازدواجی زندگی کی عملی ذمے داریوں سے آزاد زمانہ ہوتا ہے، اس لیے کامیاب شادی کے لیے منگنی کو لازمی قرار دینا حقائق کا منہ چڑانا ہے۔"

ماہرین نفسیات کا ایک گروپ "ٹرائل میرج" کے نظریے پر یقین رکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شادی کا فیصلہ کر کے ہم ایک ایسا اہم قدم اٹھاتے ہیں جس کے نتائج صرف باہمی برتاؤ پر منحصر ہوتے ہیں۔ منگنی کا زمانہ اور شادی شدہ دور ایک دوسرے سے کبھی مطابقت نہیں رکھ سکتے کیونکہ یہ خواہ کتنا ہی طویل ہو، غلط ساتھی کے چناؤ کے سدباب کے لیے کوئی دوسرا راستہ نہیں دکھا سکتا۔ ان ماہرین نفسیات نے "ٹرائل میرج" کا تصور پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرد اور عورت شادی کی بندشوں سے آزاد رہ کر جب ایک خاصا طویل زمانہ میاں بیوی کی حیثیت سے گزار چکے ہوتے ہیں تو اس عارضی رابطہ کو یا تو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں یا اسے مستقل صورت دینے کے لیے عام "رسم و رواج"

کے مطابق شادی کر سکتے ہیں۔

ایک اہم گروپ اور بھی ہے جو "میرج کنٹریکٹ" کے نظریے پر یقین کامل رکھتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب جرمنی اور جاپان میں خصوصاً "کنٹریکٹ میرج" کو ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت شروع کیا گیا تو اس کے نتائج زیادہ صحیح ثابت نہ ہوئے کیونکہ کنٹریکٹ میرج شوہر یا بیوی کو تقریباً دو سال تک چند پابندیوں کے ساتھ زندگی گزارنے کا ایسا موقع فراہم کرتا ہے جس میں وہ باہمی عدم تعاون یا کسی اور بنا پر اگر ایک دوسرے سے علیحدگی کے خواہاں ہوں تو وہ کنٹریکٹ کو منسوخ کر کے پھر آزاد ہو سکتے ہیں۔

سروے رپورٹ میں کنٹریکٹ میرج کے اعداد و شمار دیے بغیر اس منصوبے پر سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس وقت کے حالات اور معاشرتی تقاضے ایسے تھے کہ اس کنٹریکٹ میرج کے منصوبے کو محض عارضی طور پر نافذ کر کے امریکی، برطانوی اور دیگر فوجیوں کی داشتہ جاپانی اور جرمن حاملہ لڑکیوں کو تحفظ دیا گیا تھا۔ برطانیہ میں البتہ میرج کنٹریکٹ پرانی رسم سے علیحدہ کوئی چیز نہیں اور ایک قدیم زمانے سے تمام مذہبی رسوم کے ساتھ میرج کنٹریکٹ لڑکی اور لڑکے کے حقوق جائیداد وغیرہ کے تحفظ کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔ آج بھی برطانیہ میں میرج کنٹریکٹ کو بڑی اہمیت حاصل ہے لیکن نئی نسل کے ایک قطعی انتہا پسند طبقے نے اس کو شادی کے راستے میں ایک روڑا سمجھ کر ہٹانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ حال ہی برطانیہ میں چند ایسی شادیاں بھی ہوئیں جن میں دولہا دلہن کے بچوں نے بھی شرکت کی یعنی ماں باپ نے اولاد ہونے کے بعد ایک دن جب شادی کا قصد کر لیا تو برضا و رغبت شادی کر لی۔

برطانیہ میں اس وقت لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد دفتروں اور فیکٹریوں میں کام کرتی ہے۔ ان میں بین الاقوامی ادارے بھی ہیں، غیر ملکی فیکٹریاں بھی جہاں انہیں غیر ملکی لڑکوں کے ساتھ دن یا رات کا بیشتر وقت گزارنا پڑتا ہے۔ اس میل جول کا نتیجہ اکثر شادی کی صورت میں بھی رونما ہوتا ہے اور عموماً مذہب یا خاندانی روایات کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے اور شادی رجسٹریشن آفس میں ہو جاتی ہے۔ ان معاشرتی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے برطانیہ کی میرج گائیڈ کونسل نے ماہرین سے مشورہ کرنے کے بعد اپنی سفارشات تیار کر لی ہیں جو بہت جلد قانونی تحفظ کے لیے حکومت برطانیہ کو بھیج دی جائیں گی۔ جن کے نفاذ کے بعد برطانیہ میں یقیناً ایک معاشرتی انقلاب آجائے گا۔ نئی نسل کی نظریں ان سفارشات پر لگی ہوئی ہیں۔

# خواتین کا عالمی سال

اور کوئی فائدہ ہوا اس سے یا نہ ہوا۔ کم از کم یہ بات تو دنیا نے تسلیم کر ہی لی کہ عورتوں کی بھی کوئی حیثیت ہے ان کے بھی کچھ حقوق ہیں اور ان حقوق کے حصول کے لیے وہ جدوجہد بھی کرنے کی مجاز ہیں۔

عورتوں کی حق تلفی اور ان کے ساتھ ناروا سلوک صدیوں کے بگاڑ کا نتیجہ ہے اور یہ معاشرے کو ہر دور میں ورثے میں ملتا رہا ہے۔ موجودہ دور جسے ترقی یافتہ زمانہ کہا جاتا ہے اور مثالیں دے دے کر باور کرایا جاتا ہے کہ خواتین زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں۔ ——— میں اس سطحی جائزے سے ہٹ کر جو فریب نظر کے سوا کچھ بھی نہیں اس ذہنی مقام اور حیثیت کی بات کروں گی جو مردوں نے عورت کو دیا ہے؟ آج بھی لوگ عورت کو گھر میں قید رکھنا چاہتے ہیں (مناسب حد بندی کی میں خلاف نہیں) لیکن سڑکوں پر چوراہوں پر، راہ چلتی خواتین کو کن معنی خیز نظروں اور اشاروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بس میں سفر کرتی ہوئی طالبہ کو کیسے کیسے فقروں کا سیسہ اپنے کان میں انڈیلنا پڑتا ہے۔ ملازمت پیشہ خواتین کو کیسے کیسے امتحان درپیش ہوتے ہیں یہ باتیں اس سال بھی جوں کی توں ہیں ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔

کچھ لوگوں کا وطیرہ وحید ہاشمی کے لفظوں میں یوں ہے "آپ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں عورت کو قید ہونا چاہیے۔ اسے گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیے آپ کیوں ہر عورت کے سینے میں اس نیکی اور بلندی کو سلا کر وہاں یک دبی سہمی سہمی مظلوم اور بے کس ہستی پیدا کر رہے ہیں۔ جو ہمیشہ آپ کی زبان سے دیکھے تو آپ کی آنکھوں سے چلے تو آپ کے کندھے پر بوجھ ڈال کر۔ یہ سب مردوں کا بالکل بے مقصد نظریہ عورت کو مجبور، مظلوم اور اپنا محتاج ہی دیکھنا پسند کرتے ہیں [illegible] کہ عورت کتنی ہے۔ اس کو ٹکی بھری اور اندھی مخلوق کی بجائے تندرست روشن دل و دماغ کی ساتھی کیوں نہیں پیدا کرتے تاکہ آپ کا سفر حیات بصد راستہ اُلجھا ہوا ہے ایسے دوست پاکر آپ کو راہ اٹھانے کی ضرورت بھی نہ پڑے گی۔ تم عورت کو اس لیے ہی کیوں دیکھتے ہو کہ وہ مرد کے لیے بنی ہے۔

عورت ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کے علاوہ بھی کچھ اور ہے اس کی ایک انفرادی حیثیت ہے ان رشتوں سے بلند ہو کر بھی دیکھیے وہ جسے تم ناقص العقل قرار دے چکے ہو ہر اعتبار سے تمہارے مساوی حقوق کی حقدار ہے وہ بھی انسان ہے اور کائنات کے تنظم ہنر اور رنگینی میں عورت کی اہمیت تمہارے مقابلے میں زیادہ ہی ہے پھر کیوں تم قدم قدم پر عورت کی تذلیل کرتے ہو سرِ راہ بیہودگیاں پوسٹروں پر سرِ عام یہ نقش تصویریں تمہارا یہ گمراہ کن پروپیگنڈہ آخر تمہارے قول و فعل میں یہ تضاد کیوں ہے؟

تم کہتے ہو عورت تو تمام تر احترام کی سزاوار ہے مگر جب وہ خود ہی بن سنور کر نکلتی ہیں تو تمہارے جذبات مشتعل ہوتے ہیں لیکن تم تو راہ چلتی ان باوقار اور سادہ لڑکیوں کو بھی معاف نہیں کرتے جو مڑ کر تمہاری طرف نفرت کی نظر ڈالنا بھی گوارہ نہیں کرتیں۔ تم تو بس اسٹاپوں پر کھڑی ہوئی گھبرائی ہوئی طالبات کو بھی نہیں بخشتے۔ جن کی جبیں شرم اور غصے سے عرق آلود ہوتی ہے۔ تم تو ان کو بھی قابل عزت نہیں جانتے جو تمہارے قدم سے قدم ملا کر محنت کرتی ہیں۔ اپنے نازک شانوں پر معاش اور ذمہ داری کا بوجھ اٹھائے ثابت قدمی سے مشقت کرتی ہیں اور تم نے دل کے قریب سے جو امانت نکلی تھی اس کا کیا حشر کیا؟

حوا کی بیٹیوں تمہیں جو کچھ کہنا ہے جلدی جلدی کہہ ڈالو کہ تمہارا سال ختم ہونے میں صرف چند ماہ رہ گئے ہیں پھر تمہیں لب کشائی کی اجازت نہ ہوگی اگر ایسی کوئی جرأت کرو گی بھی تو فتنہ، گستاخ، بدزبان اور نہ جانے کیسے کیسے خطابات سے سرفراز کی جاؤ گی۔ مرد نے اپنی ذات کا بڑا پن اپنی ہستی کی برتری جتلانے کے لیے یہ سال تمہیں عطا کیا ہے کہ تمہیں ایک ٹھوکر اور لگانے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

**ڈاکٹر مسیح خاں**

چند دلچسپ خطوط میرے سامنے ہیں۔ مسقط کے ایک سنگل "آپریٹر" محمد امین صابر تحریر فرماتے ہیں۔ "آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ "کتنے" لڑکیوں نے کتنے لڑکوں کے خط کا جواب دیا اور "کتنے" لڑکیوں نے کتنے لڑکوں سے رشتہ جوڑا، ملاقات "کی" یا کر شادی "کی" یا نہیں یہ میرا پہلا مرتبہ ہے جو کہ میں آپ سے "مدعو" ہوں اور میں دیکھتا ہوں جس صاحبہ پر میں خط لکھ رہا ہوں اگر اس نے میرا جواب بائی ڈاک نہیں دیا تو میں ضرور اس سے ملوں گا اور اپنا رشتہ طے کر دوں گا۔"

بھائی محمد امین صابر صاحب۔ آپ خواہ مخواہ کے جھنجھٹ میں پڑ گئے جو راستہ آپ نے اختیار کیا ہے وہ خاصا طولانی ہے ماشاء اللہ آپ سنگل آپریٹر ہیں، شارٹ کٹ کی بات کیجئے۔ ٹک ٹک ٹک۔ ٹک! آپ نے جو اعداد و شمار ہم سے طلب کئے ہیں اس کے لئے مکمل ایک ڈیپارٹمنٹ چاہیئے۔ اگر آپ واقعی انٹرسٹڈ ہوں تو فنڈز جمع کیجئے۔ یہ تحقیقاتی کام بھی ہم اپنے ذمے لے لیتے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ہر ماہ تقریباً دنیا بھر سے صرف "آئیڈیل کی تلاش" کے دو ہزار خطوط آتے ہیں جن میں سے ہم بمشکل تمام دو سو خطوط شائع کر پاتے ہیں۔ ان تمام خطوط کو احتیاط کے ساتھ پڑھنا اور ان کی کانٹ چھانٹ کافی تکلیف دہ کام ہے۔ صابر میاں ہر آدمی آپ کی طرح بے عیب اور صاف زبان تو نہیں لکھ سکتا۔ محمد امین صابر صاحب آپ صبر سے کام لیجئے، اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔"

عبدالکریم ملتانی سوات سے لکھتے ہیں "الونیہ شر سوات کا پتہ فوری طور پر بھیجئے"

ملتانی صاحب! پتہ نہیں آپ کو سواتی بننے کے لئے کتنا عرصہ درکار ہے بہر حال آپ کسی طرح سواتی بھی بن جائیں تو بھی

ادارہ دوشیزہ سے آپ کو کسی لڑکی کا پتہ نہیں مل سکتا۔ یہ ہماری پالیسی کے خلاف ہے۔ ہم اپنے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتے۔ اگر گھر والی کا خوف نہ ہو تو ڈنکے کی چوٹ اپنی آفر دوشیزہ میں چھپوا دیجئے۔

ایک صاحب دفتر دوشیزہ میں تشریف لے آئے ان کے سر، ہاتھ، بازو اور جسم پر بے شمار پٹیاں بندھی ہوئی تھیں جسم کا کوئی حصہ ہمیں سالم نظر نہیں آیا تو ہم نے ازراہ ہمدردی ان سے پوچھ لیا۔ محترم یہ کیا حالت بنا رکھی ہے آپ نے۔" بڑے اطمینان سے بولے۔ "کچھ نہیں جی! پچھلے مہینے دوشیزہ میں میں نے ایک لڑکی کے نام اپنی آفر چھپوا دی تھی غلطی سے میری بیوی نے وہ پرچہ پڑھ لیا تھا۔"

ملتانی صاحب ایسی بھرپور تسلی کے لئے اپنی بیگم سے رجوع فرمایئے پھر مجھے اطلاع دیجئے میں آپ کے تفصیلی خط کا بے چینی سے انتظار کروں گی۔

بنی غازی لبیا سے ایس اے اے کاظمی صاحب تحریر فرماتے ہیں: "میرا خط آئیڈیل کی تلاش میں نہیں چھپتا ہے آخر کیوں؟ لڑکی شیعہ ہو، سید خاندان سے تعلق رکھتی ہو، مالی پوزیشن مضبوط ہو، خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ سیرت بھی پاک ہو، نیز والدین کی خدمت گزار ہو۔"

کاظمی صاحب! ابھی ابھی چیف ایڈیٹر نے مجھے ٹوکا ہے کہ آپ کی فرمائش میں مالی پوزیشن مضبوط نہیں بلکہ متوسط درج ہے دیکھئے نا! آپ نے لڑکی خوب صورت مانگی ہے، نیک سیرت بھی، شیعہ بھی اور تعلق بھی خاندان سادات سے ہو جب اتنی ساری خوبیاں آپ ایک لڑکی میں چاہتے ہوں تو میں نے سوچا مالی پوزیشن کو متوسط رکھنے کی بجائے مضبوط کیوں نہ کر دیا جائے میرے بھائی آپ دوشیزہ غور سے نہیں پڑھتے اس میں مردوں کی پسند نہیں چھپتی ہے۔ آپ اگر معاوضہ ادا کر کے بھی اپنی پسند چھپوانا چاہیں تو دوشیزہ کے صفحات اجازت نہیں دیں گے۔ دوشیزاؤں کی پسند کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے آپ صرف اپنی آفر دے سکتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ آپ کی آفر فوراً قبول کر لی جائے مناسب یہی ہے کہ آپ شادی بیاہ کرانے والے اداروں سے رابطہ قائم کریں وہ آپ کی مشکل آسان کر دیں گے۔ مزید برآں آپ نے ایک شرط اور تحریر کی ہے کہ لڑکی والدین کی خدمت گزار ہو اس سلسلے میں عرض ہے کہ ایک سردارنی اپنی ساس اور سسر کو بے حد دق کیا کرتی تھی آخر سردار جی تنگ آ گئے اور انہوں نے اپنی بیوی کو سرزنش کرتے ہوئے کہا تمہیں وہ ہماری شرط یاد نہیں رہی جو ہم نے شادی سے پہلے طے کی تھی"۔

سردارنی بڑے اطمینان سے بولی۔ "میں خلاف ورزی تو نہیں کر رہی ہوں۔"

"کیسے۔" سردار جی نے غضبناک انداز میں پوچھا "میرے بوڑھے ماں باپ کو تنگ کیوں کرتی ہو؟"

"آپ نے تو یہ شرط رکھی تھی کہ لڑکی والدین کی خدمت گزار ہو۔" سردارنی بولیں۔ "جاؤ۔ جا کر ابھی میرے والدین سے پوچھ آؤ کہ میں کیسی خدمت گزار لڑکی ہوں۔"

کاظمی صاحب! اپنی مجوزہ شرائط میں جگہ جگہ نہ سہی، ایک آدھ جگہ ترمیم کر لیجئے۔ ورنہ تاریخ سے ڈرتے رہئے یہ ظالم ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔"

مسقط کے کرین آپریٹر اے بٹ نے ماہنامہ دوشیزہ کے نام خط لکھا ہے جس پر ایڈریس درج کیا ہے۔ ماہنامہ دوشیزہ پوسٹ بکس نمبر ۴ اسعد بازار کراچی۔" اور مخاطب کیا ہے اپنے کسی عرفان بھائی کو۔

"میں نے دوشیزہ میں شادی کا اشتہار پڑھ کر کٹنگ آپ کو بھجوائی تھی۔ کیا وجہ ہے کہ آپ نے جواب نہیں دیا۔ میں اپنی زبردستی منگنی سے بدظن تھا آپ نے مجھے دنیا سے بدظن کر دیا۔"

"بٹ بھائی نازو انداز اٹھانے کے لئے کرین کام نہیں آتے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر دل چھوٹا نہ کیجئے، زبردستی کی منگنی سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ فیصلے میں ترمیم اس وقت ہوگی جب آپ عمر کے اس حصے سے نکل چکے جہاں زبردستی کی تہمت خواہ مخواہ لگ جاتی ہے اگر آپ دنیا سے واقعی بدظن ہو گئے ہیں، رخصت کا ارادہ پکا ہو تو اپنے نئے ایڈریس سے مطلع کیجئے، میں آپ کو خط ضرور لکھوں گی۔"

بیروت سے عاطف صاحب لکھتے ہیں۔ "اگر دوشیزہ کی قیمت آپ کو یہاں معلوم ہو جائے تو آپ کھانا پینا چھوڑ دیں۔"

"عاطف بھائی! دوشیزہ کی قیمت سے خوفزدہ ہو رہے ہیں آپ۔ ہمارے ملک میں قیمت ہی دوشیزہ کی لگتی ہے یہاں دوشیزہ نہ ملے تو لوگ کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں پتہ نہیں آپ پر کیا کچھ گذری۔

محمد شفیق عاصم جی ریلوے کالونی نمبر ۲ شورکوٹ روڈ جھنگ نے ایک طویل ناصحانہ خط میں اپنی ماؤں اور بیٹیوں کو یوں مخاطب کیا ہے :۔

"تعجب ہے ان نادان مشرقی بیٹیوں پر جنہوں نے مشرقیت کے پاکیزہ ماحول کی دھجیاں اڑا دیں، میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ ہر لڑکی کا آئیڈیل ہوتا ہے لیکن یہ آئیڈیل چلتا پھرتا ڈرامہ نہیں ہوتا، عورت کا خوبصورت آئیڈیل اس کا چھوٹا سا گھر ہوتا ہے آئیڈیل اس کا مجازی خدا ہوتا ہے۔ اس دن سے ڈر و جب لڑکیاں اپنے آئیڈیل کی تلاش میں ناکامی کے بعد مشرقیت سے بے نیاز ہو کر گوگی بے سری عینک لگائے بیل باٹم جیسے واہیات لباس پہن کر یہ کہتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئیں گی :۔

"منڈا شہر لاہور دا میرے دل تے تیر چلا دے"

اور آپ جیسے مشرقی مرد سینے پر ہاتھ رکھ کر چلائیں گے :۔

"آ سینے نال لگ جا ٹھاہ کر کے"

عاصم جی اپنے طویل خط کے آخر میں خانم صدیقی لاہور کے نام جو مختصر سا پیغام آپ نے لکھا ہے وہ کس کے سینے کے لئے ہے آپ کو تو خانم کی بجائے اپنے سینے کے لئے گولیوں کو دعوت دینا چاہیئے۔ ٹھاہ۔ ٹھاہ۔ ٹھاہ!!

کراچی کی زینب بیگم بڑی ترشروئی سے پوچھ رہی ہیں کیا اس کالم میں خط چھپوانے کے لئے کوئی معاوضہ تحفہ دینا ہوتا ہے یا آپ کا رشتہ دار ہونا ضروری ہے۔" بی بی زینب —! کوئی معاوضہ نہیں، کوئی تحفہ نہیں یہ جو آپ نے پوچھا ہے کہ خط چھپوانے کے لئے آپ کا رشتہ دار ہونا ضروری ہے۔ بی بی! چھپنے سے پہلے نہیں چھپنے کے بعد رشتہ داری ہو جاتی ہے، یہ ہر گھر کا مسئلہ ہے، ایک آفاقی مسئلہ، اس لئے ہم سب رشتہ دار ہیں، ہمارے اس جذبے اور خلوص کی توہین نہ کیجئے جس کے تحت ہم نے یہ کالم شروع کیا تھا، دوبئی کے محمد حسین، مری کے راجہ انور اور لاہور کے چودھری رحمت کے لئے بھی ہمارا یہی جواب ہے

گجرات کے اسلم صاحب کو یہ فکر دامنگیر ہے کہ اگر دوشیزہ میں ان کا خط اور پتہ چھپ گیا تو بے شمار لڑکیاں ان کے پیچھے پڑ جائیں گی اور مستحق لڑکی اپنے حق سے محروم ہو جائے گی اس لئے ان کی چٹھی خاموشی کے ساتھ سائرہ کو پہنچا دی جائے، اسلم بھائی مجھے تو دال میں کچھ کالا کالا نظر آتا ہے۔ سچ سچ بتایئے آپ کو جوان بچوں سے خوف آتا ہے یا بوڑھی بیوی سے۔

ڈنمارک سے رشید احمد صاحب نے متوک کے بھاؤ اپنی آفر بھیجی ہیں، شاید ہی کوئی ایسی لڑکی ہے جو انہیں پسند نہ آئی ہو رشید بھائی آپ اچھے کاروباری آدمی ہیں، ہول سیل کا کام کرنے والے کو ریٹیل کی فکر نہیں کرنی چاہیئے اس لئے آپ کی ایک بھی آفر شائع نہیں کی جا رہی ہے۔

ایک خاتون نے ہمیں لکھا۔ خدا اور اس کے پیارے رسولؐ کا واسطہ ہے میرے شوہر آپ کے نام ایک خط پوسٹ کر رہے ہیں جس میں انہوں نے اپنے آپ کو غیر شادی شدہ لکھا ہے اور شہناز کے نام اپنی آفر بھیجی ہے۔ خدا کے لئے وہ خط شائع نہ کیجئے۔ وہ نہ صرف شادی شدہ ہیں بلکہ تین بچوں کے باپ ہیں۔ اگر آپ نے یہ خط چھاپ دیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی۔ دوسرے دن شوہر کا خط بھی آ گیا۔ اس کے بعد مسلسل ان کے خط آتے رہے مگر کوئی خط شائع نہ ہو سکا۔ ہم انہیں کیسے بتائیں کہ آپ کی شکایت ہم نہ ندگی بھر دور نہیں کر سکتے، کیا جانتے بوجھتے کوئی مکھی نگل سکتا ہے؟

بے شمار خطوط ایسے بھی ملتے ہیں جس میں مطالبہ کیا جاتا ہے کہ جن کی شادیاں ہو چکی ہیں وہ اپنا تعارف کرائیں جواباً عرض ہے کہ ابھی ہمارے معاشرے میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ صداقت کو فوری طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ جب تک ہم لنڈا بازار کے سوٹ کو پیرس اور امریکہ میں مقیم اپنے کزن کا پریزنٹ بتلاتے رہیں گے اتنا حوصلہ کہاں سے لائیں گے — نو بیاہتا جوڑے دوشیزہ کے دفتر آ کر اعتراف تو کر لیتے ہیں مگر رشتہ داروں اور عزیزوں کے خوف سے اعلان نہیں کرتے۔

جہلم سے رضیہ اور گوجر خان سے عالیہ نے مشورہ دیا ہے کہ آئیڈیل کی تلاش میں چھوٹے شہروں کو بڑے شہروں پر ترجیح دی جائے۔ بہن رضیہ اور عالیہ! آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر، اس سے واقعی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شہر میں رہنے والوں کے وسائل بہت زیادہ ہوتے ہیں ضرورت چھوٹے چھوٹے شہر اور قصبات کے وسائل کو بڑھانے کی ہے۔ اگر ایک چھوٹے سے قصبے کی لڑکی دوشیزہ کی معرفت کسی اچھی جگہ پہنچ جائے تو واقعی یہ اچھی خدمت ہو گی۔

ایک عرصے سے یہ مطالبہ شدت پکڑتا جا رہا ہے کہ آئیڈیل کے صفحات بڑھائے جائیں اور پرچے کی ضخامت میں بھی اضافہ کیا جائے۔ پیارے بھائیو اور بہنو! پرچے کی ضخامت بڑھانے میں ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن اتنا ہمیں معلوم ہے کہ اسی قیمت میں ضخامت بڑھانے کے بعد ہم اس لائق بھی نہیں رہیں گے کہ اب تک جو کچھ چھاپتے رہے ہیں وہی چھاپ سکیں۔

داد تو ہمیں ڈگروں کے حساب سے ملتی ہے مگر بہنیں سالانہ خریداری کی طرف کچھ کم توجہ دیتی ہیں اگر ہمارے قارئین تین تین مزید سالانہ خریدار بنانے کی مہم شروع کریں تو ایک مہینہ میں دوشیزہ ایک لاکھ سے تجاوز کر جائے گا۔ میں اس ضمن میں ہر تجویز کا خیر مقدم کروں گی۔ غیر ملکوں میں مقیم اپنے بھائی اور بہنوں کی میں بے حد شکر گزار ہوں جو اپنا قیمتی زرمبادلہ بھیج کر دوشیزہ کے سالانہ خریدار بن رہے ہیں میں نے حکومت پاکستان کے ایک اعلیٰ افسر کو بتایا ہے کہ اس سال کے خاتمہ پر میں اپنے غیر ملکی خریداروں کی مکمل فہرست پیش کروں گی اور یہ ثابت کروں گی کہ دوشیزہ سے زیادہ سالانہ خریدار کسی اور رسالے کے نہیں ہیں۔ میں غیر ملکی زرمبادلہ پر اس لئے زور دے رہی ہوں کہ یہ میرے ملک کی ایک اہم ضرورت ہے خلوص نیت سے کئے جانے والے چھوٹے کام میں بھی ملک کی خدمت کا جذبہ کارفرما ہو تو مثبت نتائج ہر صورت میں نکلتے ہیں۔

سویڈن کے روشن بھائی آپ کا ایک خط بھی اس لئے شائع نہیں ہو سکا کہ آپ کا ایڈریس ہم سے پڑھا نہیں جا سکا اگر آپ اپنا ایڈریس CAPITAL LETTERS میں لکھ دیں تو خط چھپ جائے گا۔

غیر ملکی بھائیوں اور بہنوں کے خطوط کے علیحدہ جواب دینا ہمارے بس کی بات نہیں، ایک ایک خط پر جو ڈاک خرچ آتا ہے وہ ہماری کھال اتارنے کیلئے کافی ہے اس لئے ایسے خطوط کے جوابات انہی کالموں میں دیئے جائیں گے۔ دوبئی کے راشد غنا کے جواب میں عرض ہے کہ دوشیزہ کے پچھلے پرچوں کی خوبصورت جلدیں تیار ہو گئی ہیں آپ منگوا سکتے ہیں۔

طویل خطوط کے لئے ان صفحات پر قطعاً جگہ نہیں مل سکتی، سچ پوچھئے تو تمام خطوط پڑھنے کے لئے بڑی مشکل سے وقت ملتا ہے اس لئے جہاں تک ہو سکے مختصر، مختصر اور مختصر خطوط لکھئے ایسے خطوط جلد شائع ہو جائیں گے۔

ایس ایم سلیم ابوظہبی کو شکایت ہے کہ ان کا خط شائع نہیں ہوا، بھائی سلیم آپ کا خط کیسے شائع ہو سکتا ہے جبکہ آپ نے ایک ہی خط میں آئیڈیل کی تلاش، دوشیزہ کی محفل اور انتظامیہ کو مخاطب کیا ہے آپ خود فیصلہ کریں کہ اس خط کو سب سے پہلے کس کے پاس جانا چاہیئے جبکہ ڈرافٹ ساتھ ہو۔ ظاہر بات ہے یہ خط انتظامیہ کے پاس چلا گیا اور ڈرافٹ کے ساتھ انتظامیہ کی فائل میں لگ گیا

سکھر کے آفتاب صاحب اور لائل پور کے ظہور الٰہی ان لوگوں میں شامل ہیں جو تازہ دوشیزہ پڑھتے ہی ٹیلیگرام دے دیتے ہیں "میں شادی کے لئے تیار ہوں"

کئی مرتبہ رات کو ایک بجے کے لگ بھگ ہرکارہ یہ ٹیلیگرام میرے ہاتھ میں تھما کر انعام کا انتظار کرنے لگا۔ بھائی آفتاب اور بھائی ظہور الٰہی آپ ہی بتایئے میں اس کو کیسے یقین دلاؤں کہ میری شادی ہو چکی ہے اور میرے بچے جوان ہو رہے ہیں اور یہ ٹیلیگرام میرے لئے نہیں ہے۔

عطا الحق سبحانی گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی قاسم پور کالونی ملتان سے لکھتے ہیں "آئیڈیل کی تلاش کا کالم شروع کر کے

آپ ملک وملت کی کوئی ٹھوس بلکہ حقیقی خدمت نہیں کر رہی ہیں۔ * بھائی سبحانی صاحب اس خدمت کے لئے ہم نے آپ کو وقف کر دیا ہے۔ میں تو اس کالم سے فرسٹریشن کم کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ آپ اپنے ذہن کو آلائشوں سے پاک رکھنے کی کوشش کیجئے۔ ذہن کی بدبو پیٹ کی بدبو سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔

آئیڈیل کی تلاش دعاؤں کا کالم ہے۔ اس کالم کے طفیل مجھے جتنی دعائیں ملتی ہیں شاید ساری زندگی میری ماں نے بھی اتنی دعائیں نہ دی ہوں۔ مگر آپ کی نظروں میں اس کالم کی افادیت نہ ہو تو بھائیو! اور بہنو! میں آپ کے پرخلوص مشوروں کی روشنی میں اگلے ماہ سے یہ کالم بند کرنے کے لئے تیار ہوں۔

### محبت کے بدلے محبت

میرا آئیڈیل دراز قد، سیاہ اداس آنکھوں والا اور سیاہ چمکدار بالوں والا نوجوان ہے جو بیرون ملک رہتا ہو۔

میں ایف اے کی طالبہ ہوں۔ یو پی کے معزز سید گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میری صورت اور سیرت دونوں لوگوں کے لیے قابل رشک ہے۔ کاش میرا آئیڈیل وہی محبت دے جو میں اُسے دینا چاہتی ہوں۔

(مس وقار، لاہور)

### انتظار ہے!

میں ایک سیدھے سادے خوش شکل انسان کی منتظر ہوں جس کا ذاتی کاروبار ہو اور آمدنی کم از کم تین ہزار روپے ماہانہ اور رہائش لاہور میں ہو۔

میں ایک معزز راجپوت گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں، تعلیم میٹرک ہے اور خانہ داری میں ماہر ہوں۔

(ش، ف، لاہور)

### شہزادوں جیسی چال!

میرے آئیڈیل کے لیے دولت، عزت، تعلیم وغیرہ کی کوئی قید نہیں صرف شرافت کا مجسمہ ہونا چاہیے۔ چال شہزادوں جیسی انتہائی پرکشش اور اسمارٹ ہونی چاہیے۔

میں ایک پڑھی لکھی دوشیزہ ہوں، سرکاری ملازم، تنخواہ ڈیڑھ ہزار روپے، خوش شکل اور خوبصورت جسم کی مالک اور پاکیزگی کی دولت سے مالا مال ہوں۔

(فرخت افزا۔ سیالکوٹ)

### سانولی سلونی!

میرا آئیڈیل کاروباری اور زندگی کی ہر آسائش آسانی سے پورا کرنے والا نوجوان ہے۔ میں ایک امیر گھرانے کی ۱۷ سالہ دوشیزہ ہوں۔ تعلیم میٹرک، قد اور جسم نہایت مناسب مگر رنگ ذرا گہرا سانولا ہے جس سے میں خوفزدہ نہیں ہوں۔

(ف، ج، لاہور)

### لمبا انتظار!

میرا آئیڈیل معزز پنجابی گھرانے سے تعلق رکھتا ہو، لمبا چوڑا ہینڈسم شگفتہ مزاج ہو، بلند خیالات کا مالک ہو۔

میں ایک معزز سید سنی گھرانے کی گوری چٹی دراز قد اور اسمارٹ لڑکی ہوں۔ اپنے آئیڈیل کا عمر بھر انتظار کروں گی

(ق، ح، کراچی)

### جنت کیا ہے؟

میرا آئیڈیل سانولے رنگ اور موٹی موٹی آنکھوں والا ہے۔ قد ساڑھے پانچ فٹ ہو۔ ہم دونوں محبت کی اس معراج پر پہنچیں کہ جنت کا تصور سامنے آ جائے۔

میرا رنگ گندمی، موٹی موٹی آنکھیں، درمیانی ناک اور بھرے بھرے گال ہیں۔ شوخ چنچل، عمر صرف اٹھارہ سال ہے

(شہر بانو، کراچی)

### تاب انتظار نہیں!

میرا آئیڈیل خوبصورت آنکھوں والا آزاد خیال سیر و تفریح کا دلدادہ نوجوان ہے۔ شگفتہ مزاج اور جہیز کا لالچی نہ ہو۔ امریکہ یا لندن میں مقیم ہو۔

میں بہت دکھی متوسط طبقے کی لڑکی ہوں۔ تعلیم میٹرک، عمر ۱۸ سال، گوری رنگت اور پرکشش آنکھوں کی مالک ہوں۔ مزید انتظار کی تاب نہیں۔

(شمائلہ انجم، لاہور)

### مسکین شوہر!

میرا آئیڈیل آرمی افسر، ڈاکٹر یا کاروباری نوجوان ہے جو گھریلو اخراجات میں چیخ چیخ نہ کرے۔ وفادار ہو۔ بری عادتوں کا دلدادہ نہ ہو۔

میں ایک مہذب گھرانے کی ایف اے پاس غریب لڑکی ہوں۔ عمر ۲۰ سال۔

(دیبا کوثر، گجرات)

### پھولوں کی مہک!

میرا انتخاب ایک اسمارٹ صحت مند اور بلند ہمت نوجوان ہے۔ جس کی آمدنی کافی معقول ہو۔ وہ کچے دھاگے سے مجھ جیسی گڑیا کو خوش

شکل، ہنستی کھیلتی، پھولوں کی مہک والی آرائیں خاندان کی لڑکی یاد رہے کہ جس کی سہیلیاں اس کی مسکراہٹ، ذہانت اور قسمت کی تعریف کرتی ہیں۔
مجھے اس جوہری کی تلاش ہے، جو میرا معزز خاندان اور میرا پیار پرکھ کر میری قدر کرے اور میں اس کا دامن خوشیوں سے بھر دوں۔
(مس نشاط، کراچی)

**شریف خون:**
آج دوشیزہ کا پرچہ نظروں سے گزرا۔ انتہائی تھکاوٹ کے باوجود آئیڈیل کے کالم کو پڑھا۔ چپکے چپکے آنسو بہائے۔ مدتوں کی دبی خواہش جو صرف سینہ میں دفن ہے شاید کبھی پوری نہ ہو سکے۔ اس پوری نہ ہونے والی خواہش نے سر اٹھایا۔ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہوں۔ پاؤں میں گھنگھروں کی بیڑی ہے۔ جو نہ چاہتے ہوئے بھی دوسروں کو خوش کرتے ہیں۔ جی ہاں معاشرہ کے شریف لوگوں کو جو اس کوٹھے پر آتے ہیں۔ میری اداؤں کی تعریف کرتے ہیں اس وقت جذبات میں مر مٹنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ اپنی شرافت پردہ میں لے جاتے ہیں اور ہم مجبور رہتے ہیں اور یہاں سے نکل کر ہمیں ایک گالی سمجھتے ہیں۔ وعدے تو بڑے بڑے کرتے ہیں، لیکن اپنانے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا۔ جانے کیوں ان دیواروں سے ان سے نفرت ہوئی جب سے ہوش سنبھالا۔ نہ ماں نظر آتی نہ باپ کا روپ ہے اس گھر میں۔ سب لوگ کاروباری ہیں۔ جانے کن لوگوں کے درمیان میں ہوں۔ ماں تو ایسا نہیں کرواتی جس میں شریف خون ہو۔ جانے کیوں میری رگوں میں شریف خون گردش کرتا ہے۔ اب تک خود کو بہت بچایا ہے گندگی سے، جہاں تک ہو سکا، لیکن کب تک؟ بس دل میں چاہتا ہے سب بندھن توڑ کر بھاگ جاؤں، لیکن پھر سوچتی ہوں جاؤں کہاں؟ کوئی ہے میرا اس دنیا میں۔ یہاں سے نکل کر آگے بھیڑیے منہ کھولے ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ انجام اس سے زیادہ بھیانک ہو۔ کوئی شریف مجھے گلے نہیں لگائے گا۔ کتنی چاہتی ہے ایک خواہش ہے اب دوشیزہ میں لکھنے پر مجبور ہوں کہ میں خوبصورت ازدواجی زندگی گزاروں۔ جہاں میرا پیار، خلوص، دعا صرف ایک کے لیے ہو۔ کوئی میرے لیے ہو صرف میرے لیے۔ ہمارے آنگن میں خوبصورت پھول ہوں۔ کتنا ارمان ہے مجھ جیسی پاگل کو کسی فوجی کی زندگی میں داخل ہونا۔ چاہتی ہوں کہ کوئی فوجی انسان ہو۔ فوجی جسے صحیح معنوں میں انسان کہتے ہیں۔ کتنا ارمان ہے۔ جب وہ ملک و قوم کی خاطر محاذ پر جائے۔ مجھے شدت سے پیار کرکے خدا حافظ کرے۔ میں بھیگی بھیگی آنکھوں سے اس کے قدموں میں ایک عبادت سمجھ کر جھک جاؤں۔ اپنی مخلص دعاؤں کا نذرانہ پیش کروں۔ جب تک محاذ سے واپس نہ آئے اس کی زندگی کے لیے سجدے کرتی رہوں۔ قوم کے لیے شہید ہو تو فخر سے اس کی بیوہ کہلاؤں اور ساری زندگی اس کی ان خوبصورت یادوں میں گزار دوں جو وہ مجھے دے گیا ہو۔ اور

مر جاؤں۔ غازی بن کر آئے۔ تو ایک پجارن کی طرح ان گنہگار آنکھوں کو جو صرف اس کے لیے ہوں منتظر پائے۔ اس کے قدموں سے لپٹ لپٹ جاؤں۔ کتنی پگلی ہوں جو ایسا سوچتی ہوں۔ کون ہے جو اتنا بڑا جگرا اور اتنا بڑا دل رکھتا ہو، جو مجھے اپنا لے۔ کوئی بھی تو نظر نہیں آتا۔ شاید مجھ جیسی تمام لڑکیوں کا مقدر یہی ہے۔
(نازو۔ لاہور)

**محبت بھرا دل:**
میرا آئیڈیل ایک تعلیم یافتہ، خوبرو، لمبا چوڑا، غیور اور ہمدرد انسان ہے۔ عمر ۲۴/۲۵ سال ڈاکٹر، فوجی یا کسی اعلیٰ عہدے پر فائز پُرخلوص ساتھی ہو۔ پٹھان ہونا ضروری ہے۔
میں ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں، عمر ۱۷ سال ہے۔ فرسٹ ایئر کی طالبہ ہوں۔ لوگوں کے خیال میں خوبصورت بھی۔ انتہائی حساس طبیعت اور محبت بھرا دل رکھتی ہوں۔ (ط، ی، میانوالی)

**خلوص کا جوہری:**
میرا آئیڈیل بزنس مین یا کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو۔ عمر ۲۷/۲۸ سال۔ بے حد جاذب نظر اور خلوص کا جوہری ہو۔ لالچی اور تنگ مزاج ہرگز نہ ہو۔
میں انتہائی معزز اور ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ خوبصورتی میں لاثانی، سیر و تفریح کی شوقین، تھوڑی سی شوخ چنچل بھی ہوں۔ میرا آئیڈیل اگر مل جائے تو گھر کو حقیقی جنت بنا دوں گی۔ (لاثانی، بہاولنگر)

**استری میں ماہر استری:**
میرا آئیڈیل کیپٹن یا سویلین افسر ہے۔ مدد کرتے ہوئی اس کا شعار ہو۔ عورت کی عزت کرنا جانتا ہو۔ دراز قد لوگ مجھے بہت پسند ہیں۔ صرف بہادر اور ہر مشکل میں مسکرانے والے لوگ متوجہ ہوں۔
میں بڑے معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ تعلیم ایف اے۔ گھر کے سارے کام جھاڑو برتن سے لے کر استری تک بخوبی کرتی ہوں۔ اگر کسی کو مجھ جیسی استری مل جائے تو گھر میں چار چاند لگ جائیں۔ میں پُرکشش چہرے اور خوبصورت آواز والی ایک بہادر لڑکی ہوں۔ اس لیے بہادروں کو پسند کرتی ہوں۔
(بہادر لڑکی۔ لاہور)

**سپنے کی تعبیر!**
اگر آپ نے ذہین، خوش شکل اور مسکراہٹیں بکھیرنے والی ساتھی کا سپنا دیکھا ہے تو میں اس کی تعبیر ہوں۔ اعلیٰ تعلیم میرا زیور ہے، سیرت میرا گہنا ہے اور سچا پیار میرا وعدہ ہے۔ معزز آرائیں خاندان میں نیک تربیت، کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم۔ اعلیٰ مگر مہذب شریفانہ ماحول میرا سرمایہ ہے۔ عمر ۲۲ سال ہے۔
میرا خواب ایک صحت مند اور باہمت اعلیٰ ملازم یا بزنس مین نوجوان

ہے جس زمیں پر بھی سکون اور محبت کا تحفہ دیں تاکہ زندگی میں وہ بہتریوں اور کامیابیوں سے ہمکنار ہو۔ (سلمیٰ نعیم، کراچی)

## صورت نہیں سیرت

میرا آئیڈیل تعلیم یافتہ، برسرِ روزگار اور محنتی شخص ہے۔ لالچی اور شکی مزاج نہ ہو۔ عمر تیس پینتیس سال ہو، خوبصورتی سے زیادہ خوب سیرتی سے مالا مال ہو۔

میں ایک سیدھی سادی بھولی بھالی خوب سیرتی میں یکتا لڑکی ہوں تعلیم بی ایس سی ہے۔ (شاہین، راولپنڈی)

## پیاس ہائے پیاس

میرا آئیڈیل دولت مند، اعلیٰ تعلیم یافتہ، کار کا مالک ۱۹، ۲۰ سال کا نوجوان ہے۔

میں ایک بے حد حساس اور خوبصورت لڑکی ہوں۔ تعلیم میٹرک اور عمر ۱۸ سال۔ آئیڈیل کی شدت سے متلاشی ہوں۔ کاش میرا آئیڈیل جلد مل جائے۔ (گلنار، کراچی)

## جوڈو سے منہ پھیر لئے

میرے سپنوں کا شہزادہ آرمی آفیسر، ڈاکٹر یا انجینئر ہے۔ آزاد خیال عمر ۲۵/۳۰ سال، منفرد شخصیت کا مالک لیکن لالچی ہرگز نہ ہو۔

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی شوخ و چنچل ماڈرن لڑکی ہوں عمر ۱۸ سال، تعلیم ایف اے، امسال جوڈو بھی اچھی طرح جانتی ہوں اس پہلو کو وہ ہرگز نظرانداز نہ کرے۔ (شمیلہ خان، راولپنڈی)

## جہیز ہی جہیز!

نہ خوبصورت نہ بدصورت، گندمی رنگت، پرکشش نقش اور اسمارٹ عمر ۲۴/۲۵ سال، صحت مند، اچھی کمپنی کے ملازم یا کاروباری حضرات توجہ فرمائیں۔

اب ذرا میری سنئے، شوخ، چنچل، تعلیم بی اے۔ رنگت سانولی، سیر و تفریح کی شوقین، عمر ۲۰ سال، جہیز کی بہت گنجائش ہے۔ کراچی کے حضرات کو ترجیح دی جائے گی (راحیلہ یونس، راولپنڈی)

## سُندر سپنا

میرے دکھ سکھ کا ساتھی میرا آئیڈیل دراز قد، نشیلی آنکھوں اور پرکشش چہرے والا وہ جوان ہے جو صاحب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب سیرت بھی ہو۔ میجر یا آرمی کا کیپٹن ہو، انجینئر ہو اگر پائلٹ مل جائے تو کیا کہنے۔ تنہا ہو اور خوشحال ہو تو بہت بہتر۔ جہیز کا لالچی اور شکی مزاج نہ ہو۔

میں ایک معزز خاندان کی سنہری رنگت، گداز جسم اور پرکشش چہرے کی ۲۲ سالہ دوشیزہ ہوں، ایم اے کا آخری سال ہے (سلمیٰ جبیں، سکھر)

## عزت میں یکتا، دولت میں خستہ

میرا آئیڈیل خوددار اور غیرت مند کاروباری یا ملازم پیشہ شخص ساری برائیوں سے پاک اور مجھ سے مکمل مخلص ہو۔

میں میٹرک پاس ۱۹ سالہ مسلم دوشیزہ ہوں۔ میرا گھرانہ عزت میں یکتا اور دولت میں خستہ ہے۔ اپنے ہمسفر کو خلوص اور پیار کی دولت سے مالا مال کر دوں گی۔ (نسرین سوز، راولپنڈی)

## دل کا غنی؟

میرا آئیڈیل ٹیکنیکل کام سے آراستہ ہو، شکی مزاج ہرگز نہ ہو، خوبصورت، ہنس مکھ اور دل کا غنی ہو۔

میری عمر ۱۹ سال ہے ایف اے کی طالبہ ہوں۔ تین بھائی بہن بھی مسقط اور بحرین میں سکونت پذیر ہیں۔ جو شخص ان تینوں جگہوں میں سے کسی جگہ بھی جانا پسند کرے گا اُسے ترجیح دوں گی۔ (ش، ب۔ کراچی)

## صرف میری محبت

اچھے خدوخال کا مالک اور ہنستی مسکراتی آنکھوں والا میرا آئیڈیل ہے۔ بزنس مین یا کسی اونچے عہدے پر فائز نوجوان کو ترجیح دوں گی۔

میں ایک معزز کھاتے پیتے خاندان کی فرد ہوں۔ سرخ و سفید رنگت خوبصورت نقوش کی مالک ہوں، تعلیم میٹرک (ص، رحیم یار خان)

## بادلوں کے راہی؟

میرا آئیڈیل اچھے کردار کا مالک ہوائی کمپنی میں ملازم شخصیت ہے جو عورت کو خدا کا عطیہ سمجھے۔ عمر ۲۴/۲۵ سال ہو۔ مجھے زیادہ عمر کے مرد پسند نہیں۔

میری عمر ۲۰ سال ہے۔ تعلیم بی اے، رنگ گندمی اور اسمارٹ، کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق، اس کے علاوہ افسانے اور ناولوں کی بہت شوقین ہوں۔ لالچی اور خودغرض حضرات تکلیف نہ کریں۔ (سیما خان، راولپنڈی)

## پی آئی اے کا پیا

میرا آئیڈیل پی آئی اے کا ملازم لمبا چوڑا خوبصورت دیوتا ہے۔ آنکھیں شوخ اور ذوق شائستہ ہو، تنخواہ ایک ہزار روپے تاکہ گزارہ ہو سکے۔ عمر ۲۶/۲۷ سال اور ہاں میرا دیوتا شکی مزاج ہرگز نہ ہو۔

میں گندمی رنگت، گول چہرے اور کشیلی آنکھوں والی ایک سانولی سلونی لڑکی ہوں۔ حلقۂ احباب میں خوش مزاج تصور کی جاتی ہوں۔ اب تک کوئی شخص میرے معیار پر پورا نہیں اترا۔ کاش دوشیزہ کی مدد سے میری مشکل حل ہو جائے۔ (نازنین غزل۔ کراچی)

## دل کی آواز!

میرا آئیڈیل ڈاکٹر یا ایک کامیاب بزنس مین ہے۔ جو زندگی کو ہنس کھیل کر گزار لے۔ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ اسمارٹ اور خوش ذوق

بھی ہو شکی مزاج بالکل نہ ہو۔
ستواں ناک، پرکشش آنکھیں، مناسب جسم، قد پانچ فٹ اور گوری رنگت کی نازک سی لڑکی ہوں، سرخ ہونٹوں نے میری شخصیت کو اور بھی جاذب نظر بنا دیا ہے۔ بی اے کی طالبہ ہوں۔ چند وجوہ کی بنا پر تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ ان مشکلات میں دل نے سہارے کو آواز دی ہے کاش وہ مل جائے۔

(ارم - کراچی)

## چاہت کی کلیاں

میرا آئیڈیل اس دنیا کا جیتا جاگتا کردار ہے۔ اس کی شکل نہ تو شہزادوں جیسی ہے اور نہ ہی فرشتوں جیسی خصلتوں کا مالک ہے۔ جس کا انداز آرام کن نہیں نہ شکل بھی نہیں ہے۔ وہ تو ایک ایسا انسان ہے جس کو معاشرہ نے کوئی جگہ نہیں دی ہے اور وہ پیار و محبت کے نام سے آشنا بھی نہیں ہے ان مشکلات کے باوجود اس نے معاشرہ میں اپنے زور بازو سے ایک منفرد مقام پیدا کیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ دلی سکون سے محروم رہا ہے۔ میں اپنی چاہت کی کلیاں ایسے انسان کے قدموں میں بکھیر دوں کی تاکہ وہ بھی بھول کر ماضی کا ذکر نہ کرے بلکہ ایک خوش آئند مستقبل کی طرف نظر رکھے۔ میں نے بی اے کا امتحان دیا ہے۔ عمر ۲۰ سال قد ۵ فٹ اور رنگ سفید اور قبول صورت ہوں۔ خوش اخلاق اور خوب سیرت ہوں۔ وفا شعاری کا یہ عالم ہے کہ ساری عمر اپنے آئیڈیل کی پجارن بن کر اس کی عظمت کے گن گاؤں گی۔

(نائلہ صدف - پشاور)

## سچائی پہلی شرط؛

میرا آئیڈیل ایسا ہو جو مجھے دنیا کی خوشیاں دے سکے۔ سچا اور آزاد خیال ہو۔ بزنس مین یا کسی اچھے عہدے پر فائز ہو۔ قبول صورت اور پرکشش ہو میں ایک متوسط گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۲۲ سال، رنگ کھلتا ہوا سانولا، مناسب نقش اور تعلیم میٹرک۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے سوائے غموں کے اور کچھ نہیں پایا۔ اپنے بھی بیگانے ہو گئے ہیں۔ میری ماں دنیا سے ایسی گئی کہ اپنے ساتھ ہماری خوشیاں بھی لے گئی۔ ہم ہر کسی کے لیے بوجھ ہیں۔ کوئی بھی اپنا نہیں ہے۔ خدا کرے دوشیزہ کے ذریعے میری آواز میرے آئیڈیل تک پہنچ جائے۔ ساری زندگی اس کی پوجا کروں گی۔ (دیبل، کراچی)

## بند مکان کا ہو!

مجھے بھی اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے۔ تعلیم یافتہ، خوش اخلاق، خوش کردار، پرخلوص نوجوان جو کسی اچھی سروس یا باعزت پیشے سے وابستہ ہو تاکہ زندگی آرام سے گزر سکے۔ ایک شرط یہ بھی کہ وہ ملتان کا رہنے والا ہو۔ میں ایک معزز زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ تعلیم بی اے، عمر ۲۲ سال، کھلتا ہوا گندمی رنگ، خوش مزاج۔

ڈارلنگ لگتا ہے ہم کوئی چیز بھول کر جا رہے ہیں

کاش میرا آئیڈیل جلد مل جائے۔ (سعیدہ بانو - ملتان)

## کلاس ون آفیسر:

ڈاکٹر، انجینئر یا کوئی کلاس ون آفیسر، اسمارٹ ہو، آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہو، دلچسپ باتوں سے محظوظ کرتا ہو، دولت سے نفرت ہو۔ انتہائی چاہنے والا اور پرخلوص ہو۔ باتیں حقیقت سے قریب تر ہوں۔ انتہائی شریف اور متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا ہو، ملتان کے علاقے کا ہو، جہیز کا لالچی بالکل نہ ہو۔ یہ ہے میری سہیلی کا آئیڈیل۔
میری سہیلی بی اے اور متوسط پڑھے لکھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ سڈول جسم ہے عمر ۲۰ سال ہے

(رسا جی - ڈیرہ غازی خان)

## جہیز — نہ بابا نہ!

میرا آئیڈیل اسی دنیا کا رہنے والا ہے۔ چاہے خوبصورت نہ ہو اسمارٹ ضرور ہو۔ آزاد خیال ہو۔ شکی مزاج ہرگز نہ ہو اور نہ ہی بدل ہو۔ پیک۔ اتنا کماتا ہو کہ زندگی کی تمام ضروریات پوری ہو جائیں۔ عمر کی کوئی قید نہیں مگر تعلیم انٹر تک ہو، جیب لاپرواہ سا ہو۔
میری عمر ۱۹ سال ہے قبول صورت اور اسمارٹ ہوں۔ اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ معمولی تعلیم یافتہ ہوں۔ میں چشمہ لگاتی ہوں۔ جہیز کی آس رکھنے والے قطعی خط نہ لکھیں ہم اپنی حیثیت کے مطابق جہیز دیں گے۔
اگر مجھے میرا آئیڈیل مل جائے تو میں اپنی تمام زندگی اس کے قدموں

میں منتظر رہوں گی۔ (اسیہ ممتاز، کراچی)

## روشن آنکھیں، دلکش سراپا

میرا آئیڈیل عمر ۲۸/۲۹ سال، اسمارٹ نوجوان ہو۔ کیپٹن، ڈاکٹر کیپٹن یا ایئر فورس پائلٹ یا نیول آفیسر ہو۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں ہوں، ضدی ہو، شکی مزاج ہرگز نہ ہو۔ دراز قد ہو، کھلتا ہوا گندمی رنگ، شوخ و شریر ہو اور پُرخلوص ہو، خوبصورت خدوخال کا مالک ہو۔ کھاتے پیتے اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتا ہو۔

میں ایک معزز خاندان اور متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ عمر ۱۹ سال ایف اے پاس ہوں۔ دلکش سراپا، سفید رنگت اور میانہ قد، خوبصورت آنکھیں اور گداز جسم ہے۔ چہرے کے نقوش اچھے ہیں۔ شوخ و شریر ہوں۔ کاش مجھے میرا آئیڈیل مل جائے تو اس کی روشن آنکھوں میں ڈوب ڈوب جاؤں۔ (ایم شاہین۔ ڈیرہ غازی خان)

## ہپی نہیں چلے گا!

میرا آئیڈیل ہینڈسم، اسمارٹ، کشادہ سینہ، رعب دار اور لاابالی قسم کا ہو۔ سنجیدہ بھی ہو اور شوخ بھی! شکی مزاج ہرگز نہ ہو۔ ذاتی بزنس ہو تو زیادہ اچھا ہے یا پھر اچھے عہدے پر فائز ہو۔ تعلیم یافتہ سلجھا ہوا مرد ہو، میرے جذبات و احساسات کی قدر دل سے کرنے والا ہو۔ وہ خلوص، وفا، مروت اور شرافت کا نمونہ ہو۔ رنگ خواہ سانولا ہو یا گندمی۔ نقش بھی تیکھے ہوں۔ خوبصورت قد ہو۔ آجکل کے ہپی ٹائپ لڑکے زحمت گوارا نہ کریں۔ لڑکیوں جیسی عادات رکھنے والا مرد میرا آئیڈیل نہیں اور نہ ہی لڑکیوں کی طرح شرماتا ہو۔ اس کی چاہت صرف میرے لیے ہو۔ ادھر اُدھر لڑکیوں کے پیچھے بھاگنے والا نہ ہو۔ اس کی نظر میں شرافت ہو، کنجوس ہرگز نہ ہو۔ فضول خرچ بھی زیادہ نہ ہو۔

میں ایک معزز لیکن متوسط گھرانے کی لڑکی ہوں۔ تعلیم یافتہ ہوں، نہایت نازک مزاج، حساس، خوددار قسم کی لڑکی ہوں، گندمی کھلتا رنگ، نقوش نہایت پُرکشش، دلکش سراپا، خوب سیرت، سلیقہ شعار ہوں۔ (روزی، لاہور)

## باوقار بھی، خوش گفتار بھی!

میرا آئیڈیل —— تعلیم یافتہ، خوش گفتار، باوقار جو کسی اعلیٰ عہدے پر فائز یا زمیندار نوجوان ہے۔ اگر سید خاندان سے تعلق رکھتا ہو تو بہت خوب!

میں ایک معزز سید زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں، تعلیم انٹر، عمر ۲۸ سال، پچیس بیگھہ زمین زرعی کی مالک، رنگت گوری، دلکش نقوش، سراپا حسین۔ (فاخرہ پروین۔ ملتان)

## انسانیت کی قندیل!

میری ایک گہری سہیلی جو کہ معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ سعودی عرب میں ۔/۔۔۔۳ روپیہ ماہانہ پر ملازم ہے اپنے آئیڈیل کی منتظر ہے۔ عمر تقریباً ۲۵ سال ہے جبکہ ۱۵ سال سے ملازمت کی بالکل نہیں لگتی۔ جس کی سیرت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کا آئیڈیل کوئی آسمان سے اترا شہزادہ یا حسن و رعنائی کا مجسمہ نہیں ہے لیکن انجینئر، ڈاکٹر، آرمی یا بینک آفیسر جو بھی ہو دل میں انسانیت کی قندیل فروزاں رکھتا ہو۔ بے شک گوارا صورت ہو لیکن صورت کے ساتھ سیرت کا قدردان بھی ہو۔ خاص طور پر ایسا فرد جس نے اپنے قوتِ بازو سے اپنا مقام خود حاصل کیا ہو۔ عمر ۳۰ سال سے زائد نہ ہو اور اگر بیرونِ ملک ہو تو کیا کہنے۔ (تابندہ نسیم، فیصل آباد)

## ہائے مجبوری!

میرا آئیڈیل ایک خوب اور نیک قسم کا نوجوان ہے، خوش مزاج اور شریف گھرانے سے تعلق رکھتا ہو جو زندگی کی صرف بنیادی ضروریات آسانی سے پوری کر سکے۔ میں ایک شریف گھرانے کی سید لڑکی ہوں۔ والد والدہ حیات ہیں۔ اس لیے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ مڈل کی طالبہ ہوں اور کافی قبول صورت ہوں۔ عمر ۱۵ سال ہے۔ مجبوری کی وجہ سے کم عمری میں شادی کر رہی ہوں ورنہ ابھی پڑھنے کا خیال تھا۔ باپ زندگی میں اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں مگر ان کے پاس دینے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ (یاسمین۔ ساہیوال)

## پُرسکون زندگی!

میرا آئیڈیل —— ڈاکٹر یا تعلیم یافتہ اسمارٹ سلجھا ہوا نوجوان ہے جو خوب سیرت، خوش اخلاق اور بلند کردار ہو۔ کسی لالچی ہرگز نہ ہو۔ ازدواجی زندگی پُرسکون گزارنے کا خواہاں ہو۔

میرا تعلق متوسط گھرانے سے ہے۔ ایف اے کی طالبہ ہوں۔ عمر ۲۰ سال، رنگت صاف، اسمارٹ جسم، نقش و نگار پُرکشش، لمبے بال، خوب سیرت، سلیقہ شعار اور نماز کی پابند ہوں۔ کاش میری منتظر پلکوں کو میرا آئیڈیل مل جائے۔ (ر۔ پروین، کراچی)

## دُبلی سی، پتلی سی۔

میں بھی متلاشی ہوں اپنے آئیڈیل کی۔ سانولا سلونا اسمارٹ سا نوجوان، تعلیم کم از کم بی اے، عمر ۳۰ سال، بے حد محبت کرنے والا، پہاڑ سا ثابت قدم ہو۔

سنا ہے آئیڈیل صرف خوبصورت لڑکیوں کو ملتے ہیں۔ میں خوبصورت تو نہیں ہاں سانولے رنگ کی دُبلی پتلی اسمارٹ سی لڑکی ہوں۔ عمر ۲۳ سال، ایک اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ طبیعت بہت زیادہ حساس پائی ہے۔ جہیز زیادہ نہ مل سکے گا۔ (ش۔ ا۔ پشاور)

## پیار کا ساگر!

میرا آئیڈیل کوئی تصوراتی شخص نہیں بلکہ اس جیتی جاگتی دنیا کا باسی ہے لیکن اس کے بارے میں لکھنے سے پہلے میں اپنی حقیقت سے آگاہ کر دوں

میں ایک اردو بولنے والے سید تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں عمر تقریباً ۲۱ سال، ایم بی بی ایس کی اسٹوڈنٹ، قد ۵ فٹ ۲½ انچ، بیحد پرکشش فگر کی مالک، معقول صورت اور عینک لگاتی ہوں، خوش مزاج اور پروقار شخصیت کی مالک۔

میرا آئیڈیل کسی شریف بلوچ خاندان یا یو پی کے سید گھرانے کا ہونا چاہیئے جو ۳۰ سال تک کا ہو، آرمی آفیسر یا انجینئر ہو، ڈاکٹر بھی چل سکتا ہے۔ اس کا رنگ سانولا ہو، آنکھیں براؤن جن میں کچھ کھوئی کھوئی سی ہوں۔ ایسا ہونٹ مونچھوں میں چھپا ہوا ہو۔ لہجہ شیریں، بات کرنے کا انداز دھیما ہو۔ تھوڑا اکھڑ سا ہو لیکن مزاج والا، پرمزاج، دراز قد، بالوں سے پُر کشادہ سینہ۔ لاابالی نہ ہو۔ شکّی مزاج اور کنجوس نہ ہو۔ موسیقی کا دلدادہ ہو۔ حقیقت پسند ہو۔ میرا ہاتھ مانگنے میرے والدین کے پاس آئے۔

مجھے یقین ہے کہ میرا آئیڈیل اس دنیا میں موجود ہے۔ اگر وہ مجھے مل جائے تو میں اس کو کبھی پیار کی تشنگی کی شکایت نہ ہونے دوں گی۔ (ناز شاہین کراچی)

**کون پوچھتا ہے؟**

میرا آئیڈیل بے حد ہینڈسم ہے، شکّی مزاج ہرگز نہ ہو، کسی کے آنے جانے پر پابندی نہ رکھے۔ تنخواہ اتنی ہو کہ اس مہنگائی کے دور میں آرام سے گزارہ ہو سکے اور کچھ بچ بھی جائے۔ مکان اپنا ہو۔

میں خود بیحد دلکش سراپا کی مالک ہوں۔ تعلیم تھوڑی ضرور ہے مگر امورِ خانہ داری سے پوری طرح واقف ہوں۔ ہم لوگ غریب ہیں اس لیے ہمیں کوئی نہیں پوچھتا۔ شاید دوشیزہ کا یہ کالم میری مشکل حل کر دے۔ (نورین نازلی کراچی)

**آواز دے:**

میرا آئیڈیل، کھلتا ہوا گندمی رنگ، شرارت سے لبریز آنکھیں، مردانہ وجاہت کا پیکر، اعلیٰ تعلیم یافتہ، اسمارٹ، روشن خیال، ڈاکٹر، انجینئر یا بزنس مین، جو کسی بیرونی ملک میں معقول مشاہرے پر ملازم ہو، خوش اخلاق ہو، شکّی مزاج ہرگز نہ ہو۔

میں ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ ایف اے کی طالبہ ہوں عمر ۱۸ سال ہے۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، سیر و تفریح کی دلدادہ۔ سلائی کڑھائی میں بہت ماہر ہوں۔ برائے مہربانی جہیز کے لالچی رجوع نہ فرمائیں۔

میرے کان آئیڈیل کی پکار سننے کے لیے بیتاب ہیں۔ (امینہ بشیر لاہور)

**بند دروازے:**

میرا آئیڈیل ---- ایک خوبصورت صاحبِ جائیداد نوجوان ہو جو بینک آفیسر، سول یا آرمی آفیسر ہو۔ خوش ذوق، نیک سیرت اور جینٹ فیملی سے تعلق رکھتا ہو۔ اس کی آنکھیں ہر وقت شرارت سے لبریز ہوں۔ ایسی شخصیت کا مالک ہو جو دوسروں کو متاثر کر سکے اور جس کے ساتھ جاتے ہوئے تحفظ کا احساس ہو اور کافی دولتمند ہو کیونکہ دولت بھی آجکل کی انفرادی و اجتماعی ضرورت بن چکی ہے۔

میں ایک معزز اور اعلیٰ جٹ خاندان سے تعلق رکھنے والی ۲۰ سالہ بی اے فائنل کی طالبہ ہوں۔ نہایت سلجھی ہوئی اور بااخلاق لڑکی ہوں۔ بے حد اسمارٹ جسم کی مالک، خوبصورت سہیلیوں میں "سویٹ لڑکی" مشہور ہوں۔ کاش مجھے میرا آئیڈیل مل جائے، میں ایک منفرد اور مثالی شریکِ زندگی ثابت ہوں گی۔ اے میرے آئیڈیل تیرے لیے میری محبت کے سمندر چھلکنے کو بیقرار ہیں۔

(مس ن ملک - ...)

**میری ہنسی دراصل کم نہیں:**

ہر انسان کی طرح مجھے بھی اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے۔ اپنے آئیڈیل کی خصوصیات لکھنے سے پہلے مناسب ہے کہ اپنے بارے میں کچھ بتا دوں۔ میں ایک کھاتے پیتے معزز پنجابی پٹھان خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں میڈیکل کی طالبہ ہوں۔ میرا قد ۵ فٹ ۳ انچ ہے۔ بڑی بڑی براؤن آنکھیں، گورا رنگ، گھونگھریالے بال، عمر ۲۰ سال ہے۔ بہت شریر اور ہر وقت ہنسنا میری فطرت ہے جس سے مریضوں کے دکھ درد بانٹ لیتی ہوں۔

میرا آئیڈیل ایک ایسا شخص ہے جس کی عمر ۲۸ سال تک ہو، سانولا رنگ (کالا ہرگز نہیں) بڑی بڑی براؤن آنکھیں، دراز قد، کشادہ سینہ، پتلے ہونٹ، کھڑی ناک، آزاد خیال، خوش مزاج اور خاندانی ہو۔ موسیقی سے دلچسپی رکھتا ہو۔ شکّی اور کنجوس ہرگز نہ ہو۔ مذہبی خیالات رکھتا ہو۔ بولنے کا انداز دھیما اور خوبصورت ہو۔ میرے ہی پیشے سے تعلق رکھتا ہو۔ اگر آرمی آفیسر ہو تو بھی ٹھیک ہے۔ پنجابی یا پٹھان خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔

میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں کہ میں نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ ایک دم درست ہے۔ (سحر گل - کراچی)

**ہنر کار --- ہنر کی مٹی:**

مجھے تلاش ہے جس کی، "وہ ہمسفر کہاں ہے۔"

مجھے نہ کار چاہیئے نہ کوٹھی، نہ دولت کی تمنا ہے نہ آفیسر کی تلاش ہے۔ آئیڈیل ایسا ہے جس کے ساتھ عزت کی زندگی بسر ہو سکے۔ میں اپنے حسن کی تعریف میں یہ کہنا نہیں چاہتی کہ میری آنکھیں بہت خوبصورت ہیں اور نہ یہ کہتی ہوں کہ میرے بال بہت لمبے ہیں۔ ایک میٹرک پاس غریب باپ کی بیٹی کس چیز کی تمنا کر سکتی ہے۔ میری عمر ۱۶ سال ہے۔ خدا کرے کہ میری آواز میرے آئیڈیل تک پہنچ جائے۔ (شگفتہ نسرین - ساہیوال)

**چند خوبیاں، چند خامیاں:**

میں نے ایف ایس سی (میڈیکل) فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے۔ عمر ۱۸ سال ہے۔ اپنے آپ کو حور پری نہیں سمجھتی۔ اپر مڈل کلاس سے تعلق

رکھتی ہوں۔

میں حقیقت پسند ہوں۔ اس لیے اپنے آئیڈیل میں دنیا جہاں کی خوبیاں یکجا دیکھنے کی خواہشمند نہیں ہوں کچھ خامیاں بھی ہونی چاہئیں۔ بس قبول صورت ہو۔ خوددار اور باعزت ہو۔ مجھے امید ہے کہ میرا آئیڈیل میرے خوابوں کی تعبیر ہوگا لیکن خواب تو آخر خواب ہی ہوتے ہیں۔ (کرن اقبال۔ کراچی)

## دو سال بعد؛

میری لڑکی کی عمر ۱۸ سال ہے۔ میٹرک کی طالبہ ہے مجھے اس کے لیے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو دو سال بعد شادی کرے جب تک وہ ایف اے کرلے۔ کوئی انجینئر، ڈاکٹر، سرکاری یا فوجی آفیسر ہو، معزز خاندان سے تعلق رکھتا ہو، عمر زیادہ نہ ہو۔

لڑکی شکل و صورت کی اچھی ہے اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔

(بیگم اورنگ زیب۔ کراچی)

## پیار کی آرزو،

میرا آئیڈیل نہ کوئی کروڑ پتی ہے اور نہ کوئی بزنس مین۔ مجھے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو سروس کرتا ہو اور میرے دل کے زخموں کو خلوص اور پیار سے بھر دے۔ میرا دل زخموں سے چور ہے۔ بچپن میں بزرگوں کے جذباتی فیصلہ کو میں نے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی انتھک کوشش کی لیکن وہ بے وفا میرا نہ ہو سکا۔ مجھے ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو سادہ ہو، شوخ ہو، شکی ہرگز نہ ہو۔ دل پھینک نہ ہو، عاشق مزاج نہ ہو۔ مجھے اتنا پیار دے کہ ماضی کے دکھ بھول جاؤں اور اگر وہ پنجابی ہو تو اور بھی اچھا ہے۔

میں ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ عمر ۲۰ سال۔ ایف اے کا امتحان دے کر رزلٹ کا انتظار کر رہی ہوں۔ شکل اچھی نہیں تو بری بھی نہیں۔ قبول صورت ہوں۔ مجھے دولت کی آرزو نہیں۔ والدین کے گھر ہر خواہش پوری ہو جاتی ہے۔ صرف اپنے ساتھی سے پیار کی آرزو ہے۔ کاش میرا آئیڈیل وہ شہزادہ کی صورت مجھے مل جائے۔ دل و جان سے اسے خوش آمدید کہوں گی۔ میرے ڈیڈی (جی آفیسر ہیں۔ (شازی، کراچی)

## مکہ معظمہ کی نیلو؛

میرا آئیڈیل سعودی عرب، مکہ معظمہ یا پھر عرب کی سرزمین پر رہنے والا خاندانی اور برسرروزگار ہو۔ تاجر، ڈاکٹر یا مستقل ملازمت والا ہو۔ عمر تقریباً ۳۰ سال ہو۔ نیک ہو۔ میری دو بہنیں مکہ معظمہ میں شادی کر کے رہتی ہیں۔ میرے ایک بھائی کی شادی عنقریب انشاء اللہ مکہ معظمہ کے پنجابی خاندان میں ہونے والی ہے۔ میرے ماں باپ دادا سورت (انڈیا) کے رہنے والے ہیں۔ تاجر خاندان کی بیٹی ہوں۔ میرا قد ۵ فٹ ۲ انچ، تعلیم واجبی۔ عمر ۲۲ سال، رنگ گورا، آنکھیں بڑی۔ (نیلو، مکہ معظمہ)

## دل کی آواز

میرا آئیڈیل ایک خوبصورت اور اسمارٹ نوجوان ہے۔ جو کسی بھی اچھے عہدے پر فائز ہو۔ عمر ۳۰/۳۵ سال۔ طبیعت میں لاابالی پن نہ ہو اور ٹوٹ کر پیار کر سکے۔

میں ایک سلیقہ مند، سلیقہ ور، میٹرک ہوں۔ عمر ۲۰ سال، رنگ گورا، جسم متناسب، قد درمیانہ۔ کاش میرے دل کی آواز میرے آئیڈیل تک پہنچ جائے۔

(م۔ ت۔ ملتان)

## خوددار کی تلاش؛

میرا آئیڈیل ہے خوددار، خوش لباس، خوش شکل اور مضبوط کردار کا مالک۔ میں پُرسکون زندگی کی خواہش مند ہوں۔ عمر ۲۵/۲۳ سال۔

میں کیا ہوں مجھے تصویر کھینچنی نہیں آتی۔ خدا نے شکل بھی دی ہے عقل بھی۔ گریجویٹ ہوں۔ کسی سے خوبصورت ذہنی سکون کی۔ (شبنم، اسلام آباد)

## جھیل جیسی آنکھیں؛

میرا آئیڈیل دراز قد، جاذب نظر، معزز شیعہ گھرانے کا اعلیٰ عہدے پر فائز اور انتہائی شریف ہو۔

میں ایک سید (شیعہ) خاندان کے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ عمر ۱۸ سال، تعلیم میٹرک، دراز قد، لمبی لمبی سیاہ زلفیں، جھیل جیسی آنکھیں سنہری رنگت، جینز کے لباس پسند ہیں۔ (ر۔ ب، ملتان)

## آواز بھاری چہرہ کرخت

جس طرح ہر لڑکی کا کوئی نہ کوئی آئیڈیل ہوتا ہے اسی طرح ہمارا بھی ایک آئیڈیل ہے لیکن ہم اپنے آئیڈیل سے محبت نہیں کرتے صرف پسند کرتے ہیں اور ہم اس کالم میں شامل بھی محض اس لیے ہو رہے ہیں کہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہمارے آئیڈیل کا بھی کوئی وجود ہے یا نہیں۔ ہمارا آئیڈیل کچھ یوں ہے۔

ساڑھے چھ فٹ لمبا قد ہو، جسم اسمارٹ رنگ گندمی ہو، دبی دبی مسکراہٹ اور گہری سوچ والی آنکھیں ہوں۔ آرمی یا ایئر فورس میں سروس کرتا ہو لیکن گھرانہ زمیندار ہو۔ چہرے پہ وقار ہو، چال پُر رعب ہو، آواز بھاری اور درد بھری چہرے پر قدرے کرختگی بھی ہو، طبیعت میں سختی اور حکم منوانے کا عادی ہو، لڑکیوں کے معاملے میں لاپرواہ ہو۔

ہم خاصے حسین اور زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہماری عمر ۱۸ برس ہے، قد ۵ فٹ ۵ انچ ہے۔ گلابی مائل سفید رنگت ہے

(نکہت وقار۔ سرگودھا)

## ہے کوئی ــــــ ؟

میرے دل میں ایک آئیڈیل برسوں سے چھپا بیٹھا ہے۔ باوقار، شریف، با خلوص، اعلیٰ تعلیم یافتہ، انجینئر، اسمارٹ نوجوان جو کسی بیرون ملک ~~خاص کر لندن یا مشرق وسطیٰ~~

خاص کر لندن یا مشرق وسطیٰ میں معقول مشاہرے پر ملازم ہو، اس کی پاکستان میں کافی جائیداد ہو۔ سید یا مغل ہو۔ یہ خیال رہے کہ میرے تصور میں بسنے والا آئیڈیل ہر گز جہیز کا لالچی نہیں۔

میں ایک معزز متوسط تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ ناک نقشہ دلفریب، کٹے ہوئے بال، دُبلی پتلی اسمارٹ لڑکی ہوں۔ عمر ۱۸ سال۔ ایف اے کی طالبہ، کھلتا ہوا گندمی رنگ، سیر و تفریح کی دلدادہ، روشن خیال اور سلجھے ہوئے ذہن کی مالک ہوں۔ مجھے بیرونِ ملک میں رہائش پذیر اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے

(رابعہ جبیں۔ لاہور)

خانم صدیقی

آرائیں خاندان سے تعلق ہے۔ شریف ماں باپ کا شریف بیٹا ہوں۔ لاہور کا رہنے والا ہوں۔ دو سال سے ابوظہبی میں ملازم ہوں۔

• ایس مودی" ایف ایس سی پوسٹ بکس ۳۲۲۴۔ ابوظہبی (یو اے ای)

**نو زائنہ کراچی کے نام!**

شاید میں آپ کا آئیڈیل ہوں۔ سلطان قابوس میں انجینئر ہوں۔ تنخواہ ۹۰۰۰/- روپیہ ماہانہ، عمر ۳۸ سال۔

• ایم زاہد" پوسٹ بکس نمبر ۷۰۴۔ مسقط۔ عمان

**ریحانہ ناز کراچی کے نام!**

آپ کی دکھ بھری داستان پڑھ کر دل بھر آیا۔ عمر ۲۶ سال، تنخواہ معقول، بینک میں ملازم ہوں۔ • محمد نعیم ملتانی" پوسٹ بکس ۲۶۳۰ ابوظہبی (یو اے ای)

**شہزادی گل مانسہرہ کے نام!**

ہزارہ کا رہنے والا ہوں۔ عمر ۳۰ سال، گندمی رنگ، نیلی آنکھیں، تنخواہ ۵۰۰۰/- روپیہ ماہوار۔ آپ کی جھولی خوشیوں سے بھر دوں گا۔

• ایم خان" پوسٹ بکس نمبر ۲۲۲۰۶۔ الصفاۃ۔ کویت

---

میری عمر ۲۵ سال ہے، آمدنی معقول

• اصغر خان" اے جی حبیب بینک، پوسٹ بکس ۲۶۸۱، ابوظہبی (یو اے ای)

---

میں ایک تیس سالہ موٹی آنکھیں، خوش شکل اور ہر لحاظ سے صحت مند، گندمی رنگ انسان ہوں۔ مدینہ منورہ میں بحیثیت ڈاکٹر مقیم ہوں۔

" ڈاکٹر محمد اقبال" ماسٹر، مسجد نبوی۔ مدینہ منورہ۔ سعودی عرب

---

غریب ہونا کوئی بری بات نہیں، انسان کے اعمال اچھے ہونے چاہئیں۔ آپ کی شادی ہوئی اور ختم ہوگئی اس کا کوئی پروا نہیں۔ میں ایک غیور قبیلے اور معزز گھرانے کا فرد ہوں۔ سرکاری ملازمت ہے، صاحب جائیداد بھی ہوں۔ ایبٹ آباد ہزارہ سے تعلق ہے۔ عمر ۲۱ سال۔

• حوالدار محمد مسکین" ایف ایس ایف ٹریننگ اسکول تربیلہ ضلع ہزارہ

**انوسنہ شمر خان سوات کے نام!**

میری تنخواہ ایک ہزار درہم ہے۔

• محمد بخش" پوسٹ بکس نمبر ۱۱۰۔ ابوظہبی (یو اے ای)

---

مجھے آپ جیسی شریکِ حیات کی تلاش ہے جو میرے دلِ ناداں کو کڑے وقت سنبھالا دے

" مظفر اقبال" آر ای این۔ پی این ایس مددگار معرفت الیکٹرک ایڈ کیانڈ کراچی

---

افغان ضلع سے میرا تعلق ہے۔ سرکاری شعبے میں ڈرافٹسمین ہوں۔ ۹۰۰/- روپے ماہوار تنخواہ ہے " شمس الرحمٰن" ڈی / ماتی سوات

---

آپ کے خیالات پڑھ کر انتہائی متاثر ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ منزلِ مقصود پہ پہنچ گیا۔ عمر ۲۵ سال، تنخواہ ۵۵۰/- روپے، سنٹرل گورنمنٹ کے ایک محکمے میں یو ڈی سی ہوں۔ • محمد عثمان کھوکھر" پوسٹ بکس نمبر ۲۴۰۔ راولپنڈی

---

## موسمِ بہار کے ساتھ ساتھ

# دوشیزہ میں بھی خوشگوار تبدیلیاں آ رہی ہیں

اس دور کے اکثر بچے ایسی باتیں کر جاتے ہیں جن سے بڑوں کو اپنے چھوٹے پن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ذہین بچوں کی معصوم باتیں ہمیں لکھ بھیجئے تاکہ ان بچوں کا بیسویں صدی کے بچوں سے موازنہ کیا جا سکے۔ بچوں کی تصویروں کے ساتھ نام اور عمر بھی لکھئے۔

آپ کسی بھی فن میں مہارت رکھتے ہوں، دفتر دوشیزہ میں تشریف لے آئیں۔ آپ کا خوبصورت انٹرویو تصویروں کے ساتھ شائع کر دیا جائیگا۔

خاتونِ اول بیگم بھٹو کی کونسی بات آپ کو زیادہ پسند آئی ــــ ؟

ہمسایہ کو آپ سے شکایت ہے یا آپ کو اپنے ہمسایہ سے شکایت ہے۔ تفصیل آپ لکھئے فیصلہ ہم کریں گے۔

وہ جو دوسروں کو اجالا عطا کرتے ہیں یا وہ جو اجالے دفن کر دیتے ہیں۔

ترقی یافتہ اقوام کا ہم سے موازنہ !

ہمیں ایسے ٹیلنٹس TALENTS کا نام اور پتہ بتا دیجئے جو گوشۂ گمنامی میں چھپے ہوئے ہیں۔ دنیا سے روشناس کرانا ہمارا کام ہے۔

بہت سی کہانیاں بچوں کو سنائی جاتی ہیں جن سے وہ سبق بڑے ہو کر حاصل کرتے ہیں۔ ان کہانیوں کو خود بڑے پڑھنے کی ضرورت ہے۔

نئی نسل کیا چاہتی ہے؟ نئی نسل ہم سے بدظن ہے یا ہم نئی نسل سے بدگمان ہوتے جا رہے ہیں

ہم وطنوں کے تحفظ اور ملک کی عظمت کے لیے قربانیوں کی ضرورت ہے یا نہیں۔ ہمارا رجحان قربانی سے گریز کی طرف کیوں بڑھ رہا ہے ؟

وطن سے دور رہنے والے دوستوں کو وطن کی کون کونسی باتیں یاد آتی ہیں،

ہر ماہ آپ ہم سے جھوٹ بولنے کی کوشش کیجئے۔ سال کے ختم پر ہم سب سے بڑے جھوٹے کو سب سے بڑا انعام دیں گے !

## آئیڈیل کی تلاش ــــ دوشیزہ کا مقبول ترین کالم

تین عورتیں۔ تین کہانیاں | بسنت اور فرار | ناقابلِ فراموش سلسلے

دوشیزہ کی محفل اور بے شمار دلچسپ افسانے

**دوشیزہ کی کہانیاں آپ کو سونے نہیں دیں گی !**

ماہنامہ دوشیزہ ۔ پوسٹ بکس ۱۰۵۵ ۔ کراچی ۲۹

میں خود کو آپ کے آئیڈیل کے مطابق سمجھتا ہوں۔ ذاتی کاروبار اچھی آمدنی، عمر ۲۴ سال، رنگت سانولی، تعلیم انٹر آرٹس۔
"کمال کمار" کنگرانی ہاؤس نزد پرانا حبیبیہ ہائی اسکول شاہ مجتبائی بازار جیکب آباد

---

میں ایک خوبصورت صحت مند ۲۳ سالہ نوجوان ہوں تعلیم بی اے۔ دفتر میں بطور اسسٹنٹ کام کرتا ہوں۔ تنخواہ -/۱۵۰۰ روپے ماہوار۔ صوبہ سرحد قبائلی علاقہ سے تعلق ہے۔ "محمد ایاز خان" اسسٹنٹ انڈسٹری برانچ
قبائلی ترقیاتی کارپوریشن۔ مچنی روڈ۔ پشاور صدر

---

میں بالکل آپ کا تراشا ہوا آئیڈیل ہوں۔ عمر ۲۱ سال، پاکستان ایئر فورس میں مکینک ہوں۔ معزز پٹھان فیملی سے تعلق ہے۔ ذات کا خٹک ہوں، رنگ گورا سانولا۔ "شاکر اللہ خٹک" گاؤں و ڈاکخانہ ڈاگ بیسود ملا اندخیل تحصیل نوشہرہ۔

**شازیہ لاہور کے نام:**

دوبئی میں میرا اپنا کاروبار ہے۔ اگلے سال موسم گرما میں یورپ کے دورہ پر جا رہا ہوں۔ رہائش راولپنڈی کی ہے۔ عمر ۲۵ سال
"رفیق مرزا" پوسٹ بکس نمبر ۳۷۴۳۔ دوبئی (یو اے ای)

---

میں ایک خوبصورت پرکشش ۲۴ سالہ نوجوان ہوں۔ تعلیم بی ایس سی اور سرکاری ملازم۔ زندگی میں آپ جیسی رفیقۂ حیات مل گئی تو ان شاء اللہ بہت بڑا انتقام حاصل کروں گا کاش میری زندگی میں آپ قوس و قزح بن کر آجائیں۔
"سید خورشید احمد" کمرہ نمبر ۲۔ علی اسٹوری بلڈنگ
۱۰ ایریا۔ پی او ایف ایس۔ واہ کینٹ۔ راولپنڈی

---

جو آپ چاہتی ہیں وہی ہوں کا تعلیم اور ترقی میں خدمت ایک بلند مقام دیا ہے۔ "ح س" معرفت محمد طاہر سیمن پاکستان انجینئرنگ کمپنی
۲۷ بی۔ اسٹیٹ ایونیو۔ ایس آئی ٹی ای۔ کراچی

**رفعت جبیں کراچی کے نام:**

میں یورپ کی ایک بہت بڑی فرم میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوں
"ایم اے خان" پوسٹ بکس نمبر ۴۰۰۔ مسقط سلطنت آف عمان

**نازفاطمہ کراچی کے نام:**

الیکٹریکل سپروائزر ہوں۔ عمر ۲۲ سال، ماہوار آمدنی -/۹،۰۰۰ پاکستانی روپے۔ "محمد رفیق مغل کشمیری" پوسٹ بکس ۳۸۸۵ شارجہ (یو اے ای)

---

حبیب بینک اے جی۔ زیورچ میں ملازم ہوں۔ تنخواہ معقول۔
"محمود احمد" حبیب بینک اے جی زیورچ پوسٹ بکس ۲۷۸۱ ابوظہبی (یو اے ای)

میں کویت میں عرصہ ۱۵ سال سے ملازمت کر رہا ہوں۔ عمر ۳۴ سال، تنخواہ چار ہزار روپے ماہوار۔ انشاء اللہ آپ کی تمام پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔
نام کوئی نہیں لکھا۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۱۴۲۳۔ کویت

---

آپ کے خیالات اور احساسات کی تہہ دل سے قدر کرتا ہوں۔ تعلیم مڈل، عمر ۲۰ سال۔ مسقط عمان گورنمنٹ کا ملازم ہوں۔ تنخواہ چار ہزار روپے
"چوہدری مراد محمد بلوچ" اورارانی بلوچ۔ فرسٹ رجمنٹ
عمان آرٹلری ڈی بیٹری۔ پوسٹ بکس ۸۹۷ رستاق۔ سلطنت آف عمان

---

میری عمر ۲۶ سال ہے۔ آمدنی -/۳،۰۰۰ روپے ماہوار۔ آرمی میں سگنل آپریٹر ہوں۔ اگر آپ تصویر دیکھنا چاہیں تو وہ بھیج دوں گا۔
"محمد امین" ۸۱۶۴ سگنل آپریٹر فرسٹ رجمنٹ
عمان آرٹلری سی بیٹری۔ رستاق۔ سلطنت آف عمان۔ مسقط

---

دراز قد، رنگ گورا، تنخواہ -/۵،۰۰۰ روپے ماہوار۔ آپریٹر کی حیثیت سے ملازم ہوں۔ "اختر رضا" معرفت محمد جلیل ۴۵۳۴۳ کیو ایم برانچ
ایف ایچ کیو۔ پوسٹ بکس نمبر ۹۰۳۰۱ اے ڈی۔ ڈی ایف ابوظہبی (یو اے ای)

---

آپ کی تحریر کردہ سطور سے بیحد متاثر ہوا ہوں۔ آپ کی شرط اولیں کے سوا تو دوسری تمام باتوں پر پورا اترتا ہوں۔ عمر ۲۶ سال۔ تعلیم بی اے (فرسٹ ایئر)۔ راشد ہسپتال میں ملازم ہوں۔ آمدنی معقول، خاندانی تعلق حیدرآباد دکن سے ہے۔ "علی رضوی" معرفت عبداللہ جعفر محمد
پوسٹ بکس نمبر ۲۵۲۰۔ دوبئی ایئرپورٹ۔ دوبئی (یو اے ای)

---

میں آپ کے خیالات سے متفق ہوں۔ ۲۰ سال کا ایک خوبصورت نوجوان ہوں۔ تعلیم ایف اے ہے۔ ذاتی کاروبار ہے۔ کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے ساتھ آپ کو تکلیف ہرگز نہیں ہوگی۔
"منور شید" خورشید میڈیکل اینڈ جنرل اسٹور۔ گوادر

---

آپ کی تحریر میرے دل کی آواز ہے۔ جہیز کو لعنت سمجھتا ہوں۔ تعلیم ایف اے۔ سرکاری ملازم ہوں، تنخواہ -/۱۵۰۰ روپے۔ رنگ سانولا۔ قد ۵ فٹ، عمر ۲۲ سال۔ "منیر اقبال" معرفت فیولنگ سپرنٹنڈنٹ عبدالرشید بٹ
پاکستان نیشنل کمپنی۔ کراچی ایئرپورٹ۔ کراچی

**ریحانہ ناز کراچی کے نام:**

اگر ڈنمارک آنے میں اعتراض نہ ہو تو میں آپ کے دکھوں کو دور کرنے

کہ ہر ممکن کوشش کروں گا۔
MOHD SALEEM
GARTNERGADE-9II-ST-TH, 2200
COPENHAGEN-N-DENMARK

آر۔ امین کے نام!
عمر ۱۸ سال۔ چار سال سے ڈنمارک میں مقیم ہوں۔ تعلیم میٹرک
S.W.R ROSTI PLASTIC A/S INDUSTRIVE,19
4000 ROSKKILDE, DENMARK

---

میرا یو پی سے تعلق ہے۔ ابوظہبی میں ۵ سال سے ملازم ہوں۔ کراچی میں ذاتی مکان، رنگ گورا [illegible] عمر ۲۵ سال، تنخواہ ۳۵۰۰ روپے، تعلیم مڈل، ٹیلیفون ٹیکنیشن کی حیثیت سے کام کرتا ہوں
"ایم اے ایچ خان" پوسٹ بکس نمبر ۳۰۰۔ ابوظہبی (یو اے ای)

---

آپ کے خیالات کی بے حد قدر کرتا ہوں۔ آپ کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔ تنخواہ ۲۵۰۰/- روپے ماہوار ہے۔
"محمد صادق" ۲۲/ای۔ گلبرگ مین مارکیٹ۔ لاہور

تسنیم۔ ہری پور کے نام!
عمر ۳۲ سال، تنخواہ چار ہزار پاکستانی روپے۔ پاکستان میں کچھ ذاتی کاروبار بھی ہے۔ معقول جائیداد بھی ہے۔ تعلیم ایف اے پاس ہوں۔
"اختر عباس" پوسٹ بکس نمبر ۹۵۱۔ دوبئی (یو اے ای)

---

جس طرح جیٹ برادری میں الجھا ہوا ذہن کبھی کبھی اور کہیں کہیں ٹکراتا ہے اسی طرح آدمی برادری میں کریک کرتی کوئی اور کہیں کہیں ہوا کرتا ہے میں ایک کریک آدمی ہونے کے ساتھ انجینئر بھی ہوں، جس کے پاس اپنی مشکلات کے ہزاروں حل ہوتے ہیں اور وہ کبھی ہمت نہیں ہارتا۔
"ایم ایس اویس" ۸۳/E/۲ فلیٹ نمبر ۵ پی ای سی ایچ ایس نرسری، کراچی

زیب، کراچی کے نام:
آپ کی دل گداز تحریر نظر سے گزری اور اپنے خیالات کے مطابق پایا امید ہے کہ آپ کے دکھوں کا مداوا کر سکوں گا۔ میں ایک دراز قد پرکشش اسمارٹ ۲۹ سال کا نوجوان ہوں۔ ابوظہبی میں ایک برٹش فرم میں بحیثیت سول انجینئر ۵۰۰۰/- روپے (پاکستانی) پر ملازم ہوں۔
"جمال اشرف" پوسٹ بکس نمبر ۶۶۲۔ ابوظہبی (یو اے ای)

فرح ناز حیدرآباد کے نام!
میرا تعلق آرائیں گھرانے سے ہے۔ قبول صورت، تعلیم ایف اے، آمدنی
۳۰۰۰/- روپے پاکستانی۔ عمر ۲۹ سال۔ "ابن ہانی غنی" پوسٹ بکس ۱۱۵۲۔ دوحہ قطر

سیما لاہور کے نام!
ایف اے پاس ہوں۔ پنجاب کے معزز خاندان کا فرد ہوں۔ دوبئی میں ایک شپنگ کمپنی میں سپروائزر ہوں۔ تنخواہیں شرعی ہیں۔ دراز قد ہوں اور اللہ کے فضل و کرم سے خوبصورت ہوں۔ عمر ۲۸ سال۔ تنخواہ ۴۰۰۰ روپے پاکستانی۔
"محفوظ الرحمٰن منہاس" پوسٹ بکس ۱۷۵۶ دوبئی (یو اے ای)

---

آپ کے خیالات کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ تعلیم بی اے، سرکاری ملازم غیر شادی شدہ، عمر ۲۸ سال، تنخواہ ۴۰۰ روپے
"ناظم خان" معرفت فیشن ہاؤس کینٹ بازار۔ ایبٹ آباد

شافی رباب کراچی کے نام:
مجھے صرف اپنے ہم خیال کی ضرورت ہے۔
"ایس مرزا" پوسٹ بکس نمبر ۸۱۶۔ شارجہ (یو اے ای)

ناہید اشرف کراچی کے نام:
عمر ۲۱ سال، تعلیم میٹرک، ٹیکنیکل کام، تنخواہ ۳۰۰۰/- روپے پاکستانی
"محمد اسحٰق" پوسٹ بکس نمبر ۱۵۱۔ ابوظہبی (یو اے ای)

ایس اے لاہور کے نام:
میں آپ کے معیار پر پورا پورا اترتا ہوں۔ تنخواہ ۲۲۰۰/- روپے ماہوار عمر ۳۰ سال، تعلیم میٹرک۔ "عبدالخالق" جنرل ہسپتال، نجران، سعودی عرب

نفیسہ نور کراچی کے نام:
آپ کی تحریر پڑھی، میں کس حد تک متاثر ہوا آپ ان دو جملوں سے اندازہ لگائیں کہ آئینہ سامنے نہیں اور عکس آئینے میں ہے۔
"منصور" منصور سنزری پروڈکشن ۶/۸۶ لیاقت آباد۔ کراچی ۱۹

آر۔ رحیم یار خان کے نام:
عمر ۳۰ سال، تعلیم بی اے، ماہوار ذاتی آمدنی ۳۰۰۰ روپے۔
"ڈی کے ناز" پوسٹ بکس نمبر ۱۳۰۷ دیرہ دوبئی (یو اے ای)

---

مجھے ایسا ساتھی چاہیے جو میرے دکھ بانٹ سکے۔ تعلیم بی ای (الیکٹریکل انجینئرنگ) نیم سرکاری فرم میں ملازم ہوں ۲۵۰۰/- روپے تنخواہ، بہاولپور کا رہنے والا ہوں۔ عمر ۲۵ سال۔ شخصیت پرکشش "ایم اے خان"
P.O BOX NO, 8741 SALMICH CENTRAL KUWAIT

---

شاید زندگی بھر کی جستجو اور سچی لگن نے میری منزل قریب کر دی ہے میں سب انجینئر ہوں اور اپنے ہی مکان میں تنہا اپنے خوابوں کی تکمیل کی خواہش

کا منتظر ہوں۔ "بی حیدرآبادی" معرفت منیجر حبیب بینک
مقابل اپوا اسکول یونٹ ۸ لطیف آباد۔ حیدرآباد سندھ

---

آپ کے دکھ بھرے خط نے بیقرار کر دیا، میں بھی آپ ہی کی طرح
دکھی ہوں۔ بڑی محنت سے ترقی کی ہے۔ گورنمنٹ ملازم۔ عمر ۳۰ سال۔ تنخواہ
۵۰۰/- تعلیم بی اے۔ ایل ایل بی۔ شکل و صورت آپ دیکھ کر ہی اندازہ کر
سکتی ہیں۔ "احمر خان" فیڈرل بی ایریا مکان نمبر ۸-۵۹ بلاک ۱۴ گلبرگ کراچی

**رانی تبسم۔ سکھر کے نام:**

تنہا ہوں، دکھی ہوں، شفقت سے محروم ہوں۔ مجھے ہر معاملے میں
اپنا ہم خیال پاؤ گی۔ "ایم علی محمد ذاب"
چوہان کاٹن فیکٹری۔ چشتیاں شریف۔ ضلع بہاولنگر

---

میں مظفرگڑھ کے معزز خان دان سے تعلق رکھتا ہوں، زمیندار ہوں
ہر طرح خوش رہو گی۔ "پرنس نعیم کاشف" ایڈیٹر الطاہر ڈیلی سوڈ مظفرگڑھ

---

میں مدت سے ایسے ہی آئیڈیل کا منتظر تھا۔
"غلام رسول" معرفت الف ح وارث پوسٹ بکس ۵۰ ابوظبی (یو اے ای)

**شاہدہ راولپنڈی کے نام:**

معزز آرائیں خاندان سے تعلق ہے۔ تعلیم ایف اے۔ سینئر ٹائم کیپر کی
حیثیت سے ملازم ہوں۔ تنخواہ ۳۵۰۰/- روپے۔
"فیاض اسلم" پوسٹ بکس ۲۰۸ - ابوظبی (یو اے ای)

---

ڈنمارک میں ۶ سال سے مقیم ہوں۔ عمر ۲۶ سال، تنخواہ ۷۰۰۰/- روپے
"ایف احمد" TASTRUP GARDSVE 75
2630 TASTRUP-KOPENHAGEN DANMARK

---

آپ کے خیالات پر سو فیصدی پورا اتروں گا۔ ۲۵ سال عمر اور آرائیں
خاندان سے ہوں۔ ڈپلوما انجینئر ہوں۔ تنخواہ ۶۲۵/- روپے
"اے چوہدری" ۲/۳۳ کمرشیل ایریا ڈرگ کالونی کراچی ۲۵

---

آپ کے حالات نے مجھے بیحد متاثر کیا۔ میں انشاءاللہ آپ کے
معیار پر پورا اتروں گا۔ آپ ہمیشہ مجھے مونس و غمخوار پائیں گی۔ ایک باعزت
پیشے سے منسلک ہوں۔ آمدنی ۶۵۰/- روپے ماہوار
"ایم اے" معرفت محمد افضل خان ایم اے بی ایڈ گورنمنٹ کالج کوٹلی آزاد کشمیر

---

معزز آرائیں برادری سے تعلق ہے۔ تعلیم ایف اے۔ ۳۰ سالہ خوبرو
نوجوان ہوں۔ تنخواہ ۵۰۰۰/- روپے ہے۔ پاکستان میں زرعی زمین اور مکان بھی ہے۔
"ایم اے سلیمی" پوسٹ بکس ۴۰۲ دوبئی (یو اے ای)

**مس نازاں اسلام آباد کے نام:**

میں خود کو آپ کا آئیڈیل تصور کرتا ہوں، یقین دلاتا ہوں کہ آپ
کے دکھ بانٹ لوں گا۔ مسقط میں بحیثیت انجینئر کام کر رہا ہوں۔ تنخواہ ۹۰۰۰/-
روپے اور عمر ۲۵ سال۔ رہنے والا راولپنڈی کا ہوں۔
"محمد افضل" پوسٹ بکس ۳۶۹۴، سلطنت آف عمان

**تسنیم راحت لاہور کے نام:**

تسنیم کی تحریر پڑھ کر کچھ ایسا اندازہ ہوا کہ وہی میری آئیڈیل ہے۔
"محمد اعجاز" ڈیفنس ڈی پی ڈی رجمنٹ پوسٹ بکس ۳۹۰ ابوظبی (یو اے ای)

---

میری عمر ۲۹ سال ہے۔ تنخواہ ۳۰۰۰/- روپے ماہوار۔
"محمد اسمٰعیل" پوسٹ بکس ۱۵۰ - ابوظبی (یو اے ای)

---

سندھی خاندان کا فرد ہوں عمر ۳۲ سال، میٹرک، پرائیویٹ فرم میں ملازم
آمدنی ماہوار ۸۰۰/- مزید ذاتی تعریف کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کے آئیڈیل سے
ہر حال مطابقت رکھتا ہوں۔
"محمد بخش" زمیندار موٹرز کیپٹل مارکیٹ۔ ٹنڈو محمد خان ضلع حیدرآباد

**عنبر آفریں کے نام:**

ابوظبی میں دو بڑی دکانوں کا مالک ہوں، ذاتی گاڑی کے علاوہ
راشن وغیرہ کے لیے اسپیشل گاڑی۔ ماہانہ ۲۵ ہزار پاکستانی کرنسی کی آمدنی ہے
اولاد کی خاطر دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔
"ح ج ف ر" پوسٹ بکس ۱۴۷ السین۔ ابوظبی (یو اے ای)

**ثوبیہ صادق آباد کے نام:**

آپ کے منفرد خیالات سے بیحد متاثر ہوا ہوں۔ عمر ۲۹ سال، تعلیم
میٹرک، تنخواہ ۲۵۰۰/- "محمد امین سبحانی" پوسٹ بکس ۱۵۱ ابوظبی (یو اے ای)

---

آپ کے خیالات قابل قدر ہیں۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں
کہ میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں F.N CHOUDHRY
KONGE VEJEN-131 ST-TV. 3460 BIRKEROD DANMARK

**نازیہ تبسم۔ ہری پور ہزارہ کے نام:**

میں ایک جرمن کمپنی میں ٹائم کیپر ہوں۔ تنخواہ ۲۲۵۰/- روپے ہے۔
پچھلے تین سال سے ابوظبی میں ملازم ہوں۔ جنوری ۷۹ء میں پاکستان آنے
کا ارادہ ہے۔ "محمد لطیف تبسم" پوسٹ بکس ۱۰۵ ابوظبی (یو اے ای)

میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں۔ اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے والدین دو سال کی عمر میں فوت ہو گئے۔ زمانے کی ٹھوکریں کھاتے کھاتے بی ایس سی ایم اے کیا۔ اب ذاتی کاروبار ہے ماہوار آمدنی دس ہزار روپے ہے جس کا بلا شرکت غیرے مالک ہوں۔ عمر ۳۲ سال۔

• اشرف داد خان بلوچ "زمیندارہ اکمانہ خیر پور گمبو براستہ جنڈو ضلع بدین۔ سندھ

## ڈاکٹر "ح" کے نام!

انشاء اللہ میں آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔ انگلش کمپنی میں جنرل فورمین ہوں تنخواہ ۱۰۰۰/- روپے، تعلیم ایف اے۔ سول انجینئرنگ سپروائزر کا کورس بھی کیا ہے۔ دوسرے بھی کہتے ہیں۔ عمر ۲۵ سال۔

• ایم۔ اے۔ الحاج "پوسٹ بکس نمبر ۲۰۲۹ دوبئی (یو اے ای)

---

یقیناً آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔ عمر ۳۲ سال، تقریباً دو لاکھ روپے کی شہری اور دیہاتی جائیداد کا مالک ہوں۔ سرکاری عہدہ دار۔ ماہوار آمدنی تقریباً ۲ ہزار، خود مختار نوجوان ہوں۔

• انجم "معرفت سید اعجاز حسین نقوی معرفت بھٹی بلڈنگ جناح پارک۔ شیخوپورہ

## سیمو ہناز، کراچی کے نام!

میں آپ کا آئیڈیل ہوں۔ تنخواہ معقول ہے۔ تعلیم ایف اے۔

• محمد بخش بلوچ "پوسٹ بکس نمبر ۱۱۰۔ ابو ظہبی (یو اے ای)

## یاسمین فاطمہ کے نام!

تعلیم ایف اے، عمر ۳۱ سال۔ تنخواہ ۱۹۰۰/- سلطان آرمی میں کلرک

"نثار احمد (نادر)" SULTANATE OF OMAN

GUARD UNIT 15460 NB/ARF

H.Q MUASKAR AL MURTAFA'A

## سینہ ناز، لاہور کے نام!

معزز زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں، تنخواہ نہایت معقول، عمر ۳۱ سال۔ "جاوید اقبال" دوحہ قطر۔ عربین گلف، پوسٹ بکس نمبر ۲۳۲

## دیبا، حیدر آباد کے نام!

آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ معقول تنخواہ ہے عمر ۲۹ سال تعلیم میٹرک۔ • محمد شریف "پوسٹ بکس نمبر ۱۱۲ ابو ظہبی (متحدہ عرب امارات)

## طلعت صدیق کراچی کے نام!

عمر ۳۳ سال تعلیم بی اے، ادب، قانون اور سیاست سے لگاؤ۔ ذہنی میں دستہ دار عہدہ۔ دبلا پتلا اور دراز قد۔ آئیڈیل کا قرآن اور حدیث کے مطابق قدر دان۔ روشنی مزاج اور ذہین۔ لالچی سسرال سے بھی پرہیز کرتا ہوں۔ ذات پات اور ظاہر داری کا قائل نہیں۔ حکومت کی طرف سے بہت جلد سعودی عرب جانے والا ہوں۔

---

منور شہزاد چوہدری "معرفت میاں ناظر لیمن اینڈ کمپنی ۴۳ سدی مل لاہور

## مس شمس کے نام!

میں انجینئر اور مقامی انجینئرنگ کالج میں لیکچرار ہوں۔ تنخواہ معقول۔

• ظفر "پوسٹ بکس نمبر ۶۹۷۔ کراچی

## رضیہ سلطانہ کے نام!

وہ تمام اوصاف مجھ میں موجود ہیں جن کی آپ دلدادہ ہیں۔ عمر ۲۲ سال کافی وسیع کاروبار ہے۔ جنرل اسٹور کا مالک

• محمد جمیل شاہ "معرفت جنرل اسٹور شاہ پور شہر تحصیل شاہ پور ضلع سرگودھا

## ص، ض پشاور کے نام!

میں پشاور کے ایک معزز گھرانے کا چشم و چراغ ہوں تعلیم ایف اے عمر ۲۳ سال۔ ذاتی کاروبار آمدنی ۸۰۰/- روپے

• مہم زکے خان "معرفت ممتاز خان تمباکو ڈیلر چوک یادگار، دو بالاٹی (کرزیمانی)

---

میں آپ کے معیار پر پورا اترتا ہوں تعلیم ایف اے سرکاری ملازم تنخواہ ۶۵۰ اور کچھ جائیداد کا مالک بھی ہوں۔

• محمد ناصر معرفت چنار گل دکاندار۔ ایم ای ایس چوک۔ چارٹ ضلع پشاور

## ش ت، بٹ لاہور کے نام!

آپ کے پُرخلوص خیالات نے بے حد متاثر کیا یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ مجھ کو بے حد پُرخلوص پائیں گی۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔

• انجم "معرفت پوسٹ بکس ۱۵۸۸۔ جی پی او لاہور

## تنویر قیصر کے نام!

آپ کے خیالات میں لمبے پیٹ والی بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ اعلیٰ خاندان، عمر ۲۸ سال۔ بی اے اسٹوڈنٹ۔ برسر روزگار

• شاہد شاہ "معرفت یو بی ایل۔ پرنس علی روڈ۔ حیدر آباد

## کومل شہزاد لاہور کے نام!

آپ کے معیار پر پورا اترتا ہوں۔ ایئر فورس میں انجینئر ہوں، عمر ۲۴ سال۔ فلائنگ آفیسر "جاوید اعوان" ایئر فورس بی اے بیس سرگودھا

---

صرف اتنا ہی کافی ہے کہ میں ۲۴ سالہ نوجوان ہوں ہینڈسم اور صحت مند ہوں۔ پٹھان فیملی سے تعلق رکھتا ہوں۔ ایم اے اکنامکس کا امتحان دے سکا ہوں۔ آج کل گورنمنٹ سروس میں ہوں۔ تنخواہ ۱۰۰۰/- روپے۔

• ایم اے خان احمد زئی "معرفت اختر احمد ڈیوٹی آفیسر پاکستان ٹیلیویژن اسٹیشن۔ فورٹ روڈ۔ پشاور کینٹ

## مس خان ساہیوال کے نام!

میری عمر ۲۵ سال ہے۔ تعلیم میٹرک، ذاتی کاروبار آمدنی ۱۰۰۰/-

شاھدہ محبوب

پھر اُس سے ملوں دل کو یہ ارمان بہت ہے
جو شخص مجھے دیکھ کے انجان بہت ہے
کل تک تھا جسے ناز تغافل پہ خود اپنے
وہ آج مجھے دیکھ کے حیران بہت ہے
پردے میں تبسم کے چھپا لیتی ہوں آنسو
جینے کے لیے مجھ کو یہ سامان بہت ہے
راس آ گئی آخر مجھے یہ تلخئ دوراں
اب جبرِ غمِ زیست بھی آسان بہت ہے
تا حدِ نظر تجھ کو ہی میں دیکھ رہی ہوں
کم تجھ سے ملاقات ہے پہچان بہت ہے
آتی ہیں بہت کم تری یادوں کی براتیں
اب دل کے بہل جانے کا امکان بہت ہے
اے شاہدہ چہروں کا اک انبار ہو لیکن
یہ شہرِ وفا آج بھی ویران بہت ہے

# قسط نمبر ۱۸

## لیلیٰ

قمر الاسلام عثمانی

ایران کے چھوٹے سے شہر یزد کی ایک ستم رسیدہ لڑکی ہے۔ جب وہ تیرہ سال کی تھی تو ایک اجنبی نے جبراً اس کے دامنِ عصمت کو داغدار کردیا پھر مزید ستم یہ کہ جب وہ انیس سال کی ہوئی تو اس کے والدین نے اس کی مرضی اور پسند کے خلاف آقا میر نامی ایک گنوار اور ادھیڑ شخص سے اس کی شادی کردینا چاہی۔ لیلیٰ اس صورت حال اور جبر سے سخت دل برداشتہ ہوگئی۔ اس کی مایوسی اس قدر بڑھی کہ وہ گھر سے بھاگ نکلی۔ اس کی منزل تہران تھی۔ اس نے تہران کے بارے میں اپنی سہیلی نرگس سے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہ ہائی اسکول پاس تھی اور اس کا خیال تھا کہ وہ تہران جاکر اپنی زندگی سنوار سکے گی اور جب کسی قابل ہوجائے گی تو والدین کے پاس واپس جاکر سرخرو ہوجائے گی۔

لیلیٰ اصفہان میں اپنی بہن کے پاس جانے کا بہانہ بنا کر ایک ٹرک پر سوار ہوگئی۔ ٹرک کے ڈرائیور ہاشم اور اس کے ساتھی غلام کو لیلیٰ کی بات کا یقین نہیں آیا مگر اس کے باوجود وہ اسے اصفہان پہنچانے پر تیار ہوگئے۔ راستے میں رات کو وہ ایک قہوہ خانے میں رکے اور اسی رات ایک اجنبی جارحانہ حملے کی غرض سے لیلیٰ کے کمرے میں داخل ہوا مگر لیلیٰ نے شدید مزاحمت کرکے اس حملے کو ناکام بنادیا۔ اس جدوجہد میں اجنبی کی ایک آنکھ شدید زخمی ہوگئی کیونکہ روشنی ہونے پر لیلیٰ نے دیکھا کہ اس کی ایک انگلی خون میں ڈوبی ہوئی تھی اور ناخن میں پھنسی ہوئی کھال جیسی ہوئی تھی۔

سفر دوبارہ شروع ہوا۔ راستے میں ایک چیک پوسٹ پر گشتی پولیس نے ٹرک روک لیا اور لیلیٰ کے بارے میں استفسار کیا۔ ہاشم نے تعریف کرکے جان چھڑائی کہ لیلیٰ اس کی بڑی بہن ہے اور وہ اسے اصفہان چھوڑنے جارہے ہیں۔ آگے بھی پولیس کا خطرہ تھا لہٰذا ہاشم نے لیلیٰ کو سمجھا بجھا کر ایک کار میں منتقل کردیا۔ کار کے مالک فریدہ اور امتیاز تھے وہ دونوں بھی اصفہان جارہے تھے۔ ہاشم نے لیلیٰ کو یقین دلایا کہ وہ بہت جلد اصفہان پہنچ کر وہاں سے اس کی منزل تہران تک پہنچ جائے گی۔ کار کا سفر شروع ہوگیا اور بہت جلد لیلیٰ کو اندازہ ہوگیا کہ فریدہ اور امتیاز جو خود کو بھائی بہن کہہ رہے تھے ایسے لوگ نہیں تھے۔ ان کی حرکات اور گفتگو مشکوک تھی اور پھر لیلیٰ کا شک اس وقت یقین میں بدل گیا جب ایک پولیس آفیسر نے ان کی کار کی تلاشی لی اور جب وہاں سے گلوخلاصی ہوئی تو فریدہ اور امتیاز لیلیٰ کو اپنے ساتھ تہران چلنے پر مجبور کرنے لگے۔ فریدہ نے لیلیٰ پر سختی کی اور اسے طمانچے بھی مارے۔ وہ کچھ دور گئے تھے کہ ایک جیپ ان کا تعاقب کرتی ہوئی نظر آئی۔ خدا جانے وہ کس کی گاڑی تھی، پولیس کی یا لیلیٰ کے والدین کے ساتھیوں کی جو شاید اس کی تلاش میں نکلے تھے۔ دونوں صورتیں ہی لیلیٰ کے لیے ایک سی تھیں۔ اب فریدہ اور امتیاز بھی اچھے لوگ ثابت نہیں ہورہے تھے۔ خدا جانے وہ اسے کہاں اور کس مقصد سے لیے جارہے تھے۔ لیلیٰ کشمکش و پیچ میں مبتلا تھی، اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔

حقیقت نے [illegible] رفتار بڑھا کر تعاقب میں [illegible] ایک ٹرک [illegible] راستہ روکے کھڑا تھا اور وہ ٹرک ہاشم کا تھا۔ [illegible] کار میں لیلیٰ کو سوار کرتے وقت ہاشم نے [illegible] تیز نہیں [illegible] ہاشم کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوں گے مگر ان دونوں نے خلاف ورزی کی [illegible] ہاشم کو [illegible] ان کی گاڑی [illegible]۔

ہاشم نے لیلیٰ کو دوبارہ اپنی تحویل میں لے لیا اور [illegible] بتایا کہ [illegible] پولیس [illegible] کی تلاش میں ہے۔ راستے میں وہ پھر ایک قہوہ خانے میں رکے اور ہاشم نے خلوص اور ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے لیلیٰ سے [illegible] تہران پہنچنے میں اس کی مدد کرے گا۔ قہوہ خانے سے نکلتے وقت لیلیٰ کی نظر ایک اجنبی پر پڑی [illegible] لیلیٰ کانپ کر رہ گئی۔ یہ وہی اجنبی تھا جس نے گزشتہ رات قہوہ خانے میں اس پر [illegible]۔ لیلیٰ نے ہاشم سے اجنبی کے بارے میں کہنا چاہا مگر کوشش کے باوجود کہہ نہ سکی۔

ہاشم نے لیلیٰ کے آرام اور سہولت کے پیشِ نظر اسے تہران جانے والی ایک بس میں سوار کرا دیا اور اسے ایک تہران کا پتہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ بھی عنقریب تہران پہنچ رہا ہے مگر وہاں اسے کوئی دقت پیش آئے تو فوراً مذکورہ پتے پر ہاشم سے رابطہ قائم کرے۔ بس کا سفر کوئی خوشگوار ثابت نہیں ہوا۔ بس میں ایک [illegible] نے ہنگامہ برپا کر دیا جب [illegible] لیلیٰ کے پیچھے پڑ گئی۔ [illegible] لیلیٰ کی جان [illegible] گئی۔ دوران سفر بس [illegible] پر شہر قم میں رکی اور مسافر بس سے اتر کر کھانے پینے اور کچھ دیر سستانے کی غرض سے قریبی قہوہ خانے میں چلے گئے۔ لیلیٰ نے بھی قہوہ خانے کا رخ کیا۔ وہاں ایک عورت لیلیٰ کے سر پر مسلط ہو گئی اور اسے مجبور کر کے اپنی میز پر بٹھایا۔ وہاں لیلیٰ پر تکلیف دہ اور حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ وہ عورت اور اس کا شوہر [illegible] بھولی بھالی لڑکیوں خصوصاً گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر [illegible] پیشہ کرانا ان کا کاروبار تھا۔ یہ معلوم ہوتے ہی لیلیٰ کی بری حالت ہو گئی۔ [illegible] اس کے لیے جان لیوا تھی۔ عورت نے لیلیٰ کی بے چینی کو محسوس کر لیا۔ اس نے دھمکی دی کہ اگر وہ اس کے کہنے پر نہ چلی تو وہ پولیس کو مطلع کر دے گی کہ وہ گھر سے بھاگ کر آئی ہے۔

فیصلہ کن لمحہ آ پہنچا تھا۔ بہت جلد لیلیٰ کو کوئی فیصلہ کرنا تھا۔ وہ ہاتھ دھونے کے بہانے اٹھی اور قہوہ خانے کے عقبی حصے کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا پھر اس کی نظر ایک چھوٹے سے دروازے پر پڑ گئی۔ اس نے محتاط نظروں سے پیچھے مڑ کر دیکھا، کوئی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے اس دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

دروازے کے دوسری طرف تاریکی تھی۔ تاریکی کے باوجود اسے احاطے کی دیوار میں ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آیا۔ لیلیٰ اس دروازے سے گزرتی ہوئی باہر نکل آئی۔ وہ تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی کہ اچانک اسے احساس ہوا کہ قہوہ خانے کے سامنے بسوں کے اڈے کی طرف آ گئی ہے۔ یہاں بس کے علاوہ اور بہت ساری گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ لیلیٰ نے دیکھ بھال کے تہران جانے والی ایک ویگن منتخب کی اور اس کے پچھلے حصے میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ ویگن کے مالک پرویز اور ثریا اس وقت قہوہ خانے میں موجود تھے۔ ویگن کے مالک آ گئے اور سفر شروع ہو گیا۔ پرویز اور ثریا کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ ایک دوسرے سے منسوب ہیں۔ تہران پہنچ کر جب پرویز سامان نکالنے کی غرض سے ویگن کے عقبی حصے کی طرف آیا تو اس کی نظر لیلیٰ پر پڑی۔ ایک مختصر گفتگو کے بعد پرویز اور ثریا نے لیلیٰ کو ساتھ رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر پرویز کہیں اور رہتا تھا لیلیٰ اور ثریا ساتھ رہنے لگیں۔ ثریا کام پر جاتی تھی اور اس کی غیر موجودگی میں لیلیٰ گھر کا کام کرتی تھی۔ پرویز اکثر و بیشتر ثریا سے ملنے آ جاتا تھا اور وہ کچھ لمحات خواب گاہ میں گزارتے تھے۔ لیلیٰ کو اندازہ ہوا کہ ثریا بہت بے باک اور آزاد خیال لڑکی ہے تاہم وہ اس کے لیے بری نہیں تھی۔ پھر ایک روز جبکہ لیلیٰ گھر کے کام میں مصروف تھی کسی نے باہر اطلاعی گھنٹی بجائی۔ یہ کسی کے آنے کا وقت نہیں تھا۔ نہ پرویز کا نہ ثریا کا۔ لیلیٰ نے جا کر دروازہ کھولا۔ وہاں ایک اجنبی نوجوان کھڑا تھا۔ اس نے اپنا نام بیژن بتایا اور ثریا کا پوچھنے لگا۔ بیژن کے جانے کے بعد جب ثریا گھر آئی تو اس نے بیژن کے بارے میں بتایا۔ بیژن کا نام سن کر ثریا گھبرا گئی اور اس نے لیلیٰ سے وعدہ لیا کہ وہ پرویز کے سامنے کبھی بیژن کا نام نہیں لے گی اور اسے ایک راز سمجھے گی۔ بیژن اس کے بعد ثریا سے ملنے آیا اور لیلیٰ نے بڑی حیرت سے ان دونوں کو خواب گاہ میں جاتے دیکھا۔ ثریا پرویز سے منسوب ہوتے ہوئے ایسا کر رہی تھی۔ ثریا نے لیلیٰ کو منع کیا تھا کہ جب وہ اور بیژن خواب گاہ میں مصروف ہوں تو وہ اندر جھانکنے کی کوشش نہ کرے مگر لیلیٰ کوشش کے باوجود خود پر ضبط نہ رکھ سکی۔ اس کے جذبات اس سے بغاوت پر تل گئے۔ انتہائی مجبور ہو کر اس نے کی ہول سے آنکھ لگا دی اور خواب گاہ میں جھانکنے لگی۔ بیژن کے جانے کے بعد ثریا نے اچانک اس سے پوچھا کہ منع کرنے کے باوجود وہ خواب گاہ میں کیوں جھانک رہی تھی۔ اس اچانک صورتحال سے لیلیٰ گھبرا گئی۔ ثریا اٹھ کر اس کے قریب آئی اور تیز نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

اچانک ثریا کا انداز یکسر بدل گیا اور اس نے معنی خیز مسکرا کر بات ٹال دی۔ اسی دن لیلیٰ پر اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوا کہ ثریا دراصل محبت تو پرویز سے کرتی ہے لیکن محض اپنی ایک کمزوری کی وجہ سے اسے بیژن کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس نے لیلیٰ کو سمجھا بجھا کر اپنا رازدار بنا لیا۔ ایک دن لیلیٰ شاپنگ سے واپس لوٹی تو گھر میں پرویز کو منتظر پایا۔ اس نے موقع پاتے ہی لیلیٰ کو اپنی طرف کھینچا اور چومنے کی غرض سے اس

خالہ کے انداز میں کچھ سوز تھا۔ زوشی تیزی سے اٹھی اور ہوٹل کی کھڑکی کا دروازہ بند کر دیا۔ پھر ہم کوئی گفتگو کیے بغیر کھانے میں مصروف ہو گئے۔ کھانا اچھا اور متنوع تھا۔ گوشت اور مچھلی کے ساتھ پھل بھی تھے۔ جانے کھانے کی خوشبو اڑا دی تھی کہ مجھ سے ایک لقمہ نہ اٹھایا گیا۔ زوشی مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ پھر محبت بھرے لہجے میں بولی: "کیا بات ہے فلاور تم کھا کیوں نہیں رہی ہو؟" میں نے اسے بتایا کہ مجھے بھوک محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ وہ نرمی سے بولی۔ "کھاؤ فلاور کھاؤ۔ یہ تمھاری گھبراہٹ اور وحشت ہے جس کی وجہ سے کھایا نہیں جا رہا ہے۔ تم اپنی ساری فکر و تردد دل سے نکال دو۔ میں تمھارے ساتھ ہوں۔ فکر کی کیا بات ہے۔ یہ تو سوچو کہ اگر ہم کھائیں پئیں گے نہیں تو جئیں گے کس طرح، طاقت کس طرح آئے گی، یہاں کے حالات کا مقابلہ کس طرح کریں گے۔ سیدھے موت سامنے جائیں گے۔ کمزوری انسان کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اور دیکھو یہاں ہر شخص خود اپنی فکر میں مست ہے۔ ہر شخص کچھ کھانے کے چکر میں لگا ہوا ہے۔ خانم سے لے کر خادم تک۔ لوگ شکم پُری کے لیے دوسرے کا جسم نوچ رہے ہیں۔ جیت طاقتور کی ہے۔ کمزور پڑیں تو ماری جاؤ گی۔ خود کو زندہ رکھنا ہے اور لوگوں سے مقابلہ کرنا ہے تو کھاؤ ورنہ کتّے کی موت ماری جاؤ گی۔" اس نے سلاد کی پلیٹ میری طرف بڑھائی اور مچھلی کی خاطر کرنے لگی۔ "میں نے شاید تمھیں نہیں بتایا کہ میں کس طرح اس چکر میں پھنسی تھی۔ مجھے [illegible] کے ایک لڑکے سے محبت ہو گئی تھی۔ اس لڑکے کے پاس کئی گاڑیاں تھیں اور گاڑیاں میری بڑی کمزوری ہیں۔ میرا دل بڑی شدت سے چاہتا تھا کہ میں کسی گاڑی کی اسٹیئرنگ وہیل پر بیٹھوں اور گاڑی ڈرائیو کروں۔ در اصل میری ایک ٹیچر گاڑی پر اسکول آتی تھی، بس اسی کو دیکھ کر مجھے گاڑی کا شوق ہوا۔ اور جب ایرچ اپنی گاڑی لیے ہوئے میرے قریب آیا اور مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کی گاڑی پر بیٹھ جاؤں تاکہ وہ مجھے اسکول تک چھوڑ دے تو میں فوراً راضی ہو گئی۔ ہماری ملاقاتیں بڑھیں۔ ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ پھر ہم نے طے کیا کہ کہیں بھاگ نکلیں۔"

"کیا تمھارے والدین اس شادی کے خلاف تھے۔" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"شادی کی بات ہی درمیان میں نہیں آئی۔" زوشی سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "ایرچ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا وہ تو بس میرے ساتھ کچھ اچھا وقت گزارنا چاہتا تھا۔ اور میں بھی شادی کے بارے میں کچھ سنجیدہ نہیں تھی۔ میں اس بندھن میں جکڑے بغیر آزادی سے کچھ دن گزارنا چاہتی تھی۔ جیسا کہ عموماً یورپی ممالک کی لڑکیاں سوچتی ہیں۔ میں بھول رہی تھی۔ [illegible] پہنچ گئے۔ وہاں [illegible] دوست [illegible] یہ تمہیں کیا بتاؤں کس طرح گزرے۔ بس پلک جھپکتے میں دن گزر گئے۔ پھر ایرچ نے مجھ سے کہا کہ اس کی خالہ کے ہاں چلتے ہیں۔"

"خالہ۔ کیا اس کی کوئی خالہ بھی تھی۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں یہی خانم جس کی ہم دونوں قیدی ہیں۔ ایرچ بہت کمینہ تھا اس نے مجھے یہاں لا کر خانم کے ہاتھ فروخت کر دیا اور ایک معقول رقم جیب میں رکھ کر غائب ہو گیا۔ پھر اس کے بعد کی کہانی کا تم اندازہ کر سکتی ہو۔ تمھاری طرح میں بھی قرض کے خود ساختہ بوجھ سے بے دست و پا کر دی گئی۔ میرا شناختی کارڈ تک چھین لیا گیا۔ انھوں نے شاید تمھارا شناختی کارڈ نہیں لیا۔" زوشی نے مجھ سے پوچھا

"میرا شناختی کارڈ پرس میں موجود ہے۔" میں نے کہا۔ میرے انداز سے لاپرواہی جھلک رہی تھی۔

"دیکھ لو ممکن ہے انھوں نے تمھاری لاعلمی میں نکال لیا ہو۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ بجائے مانگنے کے چوری سے پرس سے نکال لیا تھا۔" زوشی نے نصیحت کرتے ہوئے کہا۔ میں نے جلدی سے پرس اٹھایا اور کھول کر دیکھنے لگی۔ پھر میرا دل دھک سے ہو گیا۔ زوشی کا خیال صحیح تھا۔ کارڈ پرس میں موجود نہیں تھا۔ میں بُری طرح بدحواس ہو گئی۔ میری بدحواسی دیکھ کر زوشی نے مجھے سمجھایا کہ میں صبر و تحمل سے کام لوں۔ گھبرانے سے کچھ حاصل نہیں۔ بہرحال کھانا جیسے تیسے کھا لیا گیا۔ پھر زوشی اپنے کمرے میں جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی اور جاتے جاتے بولی۔ "اب تم آرام کرو، سو جاؤ۔ دو تین گھنٹے کی نیند سے تمھاری طبیعت بحال ہو جائے گی۔ اگر نیند نہ آئے تو خواب آور گولیاں لا کے دیتی ہوں۔"

"نہیں شکریہ۔ میں نے آج تک خواب آور گولی نہیں کھائی۔" میں نے کہا۔

"مگر یہاں کھانے پر مجبور ہو جاؤ گی۔ یہاں تمھیں بہت سی ایسی چیزیں برداشت کرنا پڑیں گی جن کے مقابلے میں یہ خواب آور گولیاں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔" زوشی نے کہا اور کمرے سے چلی گئی۔ میں بستر پر لیٹ گئی اور میری نظریں چھت پر جا کر جم گئیں۔ اس قدر تھکی ہوئی تھی کہ جلد ہی نیند نے آ لیا۔ جانے کتنی دیر تک سوتی رہی تھی کہ کسی نے مجھے جگا دیا۔ کوئی میرے کمرے میں موجود تھا اور مجھے پکار رہا تھا۔ پھر میں اس آواز کو پہچان گئی۔ وہ زوشی تھی۔ کمرے میں تاریکی کی وجہ سے میں اسے نہیں دیکھ رہی تھی مگر اس کی آواز کو صاف پہچان رہی تھی۔ زوشی کی آواز دوبارہ اُبھری۔ "فلاور کیا سو رہی ہو؟ میں نے اتنی دیر تک سونے کے لیے نہیں

کہا تھا، "جانتی ہو کیا وقت ہو رہا ہے؟" "چٹ" کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ تیز روشنی سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے زشی کی طرف دیکھا۔ وہ ایک بہترین اور کھلے گلے کا لباس پہنے ہوئے تھی اور چہرے پر گہرا میک اپ تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑا اور نرمی سے اٹھاتے ہوئے بولی۔ "لڑکی اب اٹھ جا۔ تجھے پتہ بھی ہے ادھر کیا ہو رہا ہے؟ خانم کسی کو ذرا پر خوشخبری دے رہی تھی کہ ایک بہت خوبصورت اور نایاب لڑکی اس کے ہاتھ لگی ہے۔ جانتی ہو وہ کون لڑکی ہے؟" زشی کے لہجے میں ہلکا سا مزاح تھا۔

"سوائے میرے اور کون ہو سکتا ہے۔" میں ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔

"ہاں وہ تمہی ہو" زشی نے کہا۔ "اور خانم نے اس شخص کو دعوت بھی دے دی ہے کہ وہ آج رات یہاں آئے اور اس غنچۂ نورستہ سے لذت کام و دہن حاصل کرے۔ یہ سننے کے بعد میں سیدھی تمہاری طرف چلی آئی تاکہ میں پہلے سے تمہیں آگاہ کر دوں اور تم ذہنی طور پر کسی پیچیدہ صورت حال کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اچھا اب جلدی سے کھڑی ہو جاؤ اور رات کے لیے تیاری شروع کر دو۔ یہ تمہارا پہلا کام ہوگا۔ اس لیے خاص تیاری کی ضرورت ہے۔ ویسے میں نے پوچھا نہیں مگر کیا تم ابھی تک کنواری ہو؟ میرا مطلب ہے کہ تمہاری زندگی میں کوئی مرد تو نہیں آیا؟"

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب میں تو کیا کوئی بھی لڑکی دینا پسند نہ کرتی۔ میرے تذبذب کو محسوس کرتے ہوئے زشی دوبارہ بولی۔ "دیکھو مجھ سے کسی حجاب کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے بے تکلفی میں ہی فائدہ ہے۔ ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد کرنا چاہیے۔"

"میں تیرہ سال کی تھی تو ایک اجنبی نے مجھ پر دست درازی کی تھی۔" میں نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

"پھر اس کے بعد تمہاری زندگی میں کوئی مرد داخل نہیں ہوا یعنی تم کسی کے ساتھ نہیں رہیں۔" زشی نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں — دراصل میں اس قسم کی لڑکی نہیں ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔ زشی ہنسنے لگی۔ ہنستے ہوئے بولی۔

"لڑکی تو میں بھی اس قسم کی نہیں تھی مگر اب ہوں۔" زشی دونوں ہتھیلیاں آپس میں ملتے ہوئے بولی۔ "آج خانم کو بہت عمدہ کمائی ہوگی اور تمہیں بھی ایک معقول رقم ملے گی۔ خانم پہلی رات کسی اہم آدمی کو مدعو کرتی ہے۔ خدا سے دعا کرو کہ وہ آدمی بوڑھا ہو تو ہو مگر کھیلا اور پوچا ہرگز نہ ہو۔ مجھے معنوی جیسی لگتے ہوئے بوڑھے بہت برے معلوم ہوتے ہیں۔"

زشی کی باتیں ایسی تھیں کہ میرا دل اندر ہی اندر ڈوبنے لگا، مگر

آہا! راشا خاندہ دھن بجاتا، سالن جل گیا ہے۔

تسلیم و رضا کے سوا چارہ کیا تھا۔ اگر میں کسی رد عمل کا اظہار کرتی تو نقلی اور داروغہ کی زیادتیاں برداشت کرنا پڑتیں۔ میرا دم گھٹنے لگا اور میں اداسی کے ساتھ سوچنے لگی۔ "تو آج آنے والی رات اپنے جلو میں میرے لیے کوئی اچھی خبر لے کر نہیں آ رہی تھی۔ گویا آج رات اس دوزخ میں جھونکا جائے گا جس سے اب تک خود کو بچاتی آ رہی تھی۔ میں نے کس کس طرح خود کو نازک صورت حال سے بچایا تھا مگر لگتا تھا جیسے اب نہ بچ سکوں گی۔ یہ بھیڑیے مجھے نوچ کھائیں گے۔ میرا وہ جسم و عصمت جس پر مجھے ناز تھا آج خاک میں مل جائیں گے۔"

میں قیدی تھی اور میری حیثیت اس قیدی کی مانند تھی جسے موت کی سزا سنا دی گئی ہو اور وقت کا تعین بھی کر دیا گیا ہو۔ اب مجھے موت کا انتظار کرنا تھا۔ یہ ایک موت ہی تو تھی۔ کیا موت اس سے مختلف ہوتی ہے۔ زشی نے ایک ایک کر کے میرا لباس اتارنا شروع کیا پھر وہ اپنا خوبصورت اور قیمتی لباس پہنانے لگی۔ پھر اس نے میرے بال اور چہرہ سنوارا۔ اس سے فراغت پانے کے بعد میں نے اپنا جائزہ لیا۔ لباس ایسا تھا کہ مجھے خود سے شرم آنے لگی۔ لباس میں نہ صرف یہ کہ آستین نہیں تھیں بلکہ گریبان بھی نہیں تھا۔ اگر کوئی گریبان تھا تو اسے گریبان کہنا زیادتی تھی، کیونکہ وہ صرف اور بٹنوں سے بے نیاز تھا اور میرا نصف سے زیادہ سینہ کھلا ہوا تھا۔

زشی مجھے ٹھیک ٹھاک کر کے فارغ ہوئی تھی کہ خانم اور خالد کمرے میں داخل ہوئیں۔ خانم بڑی عجلت میں تھی۔ آتے ہی اس نے

[illegible] تو عرصہ ہوا ہمیں بس نہیں ہو گیا۔ اس کے بعد اسے بندر عباس کے ایک تیسرے درجے کے قحبہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں دنیا بھر کے ملاح آتے جاتے رہتے ہیں اور چند سکوں کے عوض اپنی غلاظت ان قحبہ خانوں میں چھوڑ جاتے ہیں۔"

میرا دل غم و اندوہ سے بھر گیا۔ دل پر اس قدر بوجھ آ پڑا تھا کہ لگتا تھا جیسے ابھی میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ میرا سر گھومنے لگا۔ میرے کانوں میں اس لڑکی کی درد ناک اور دل کو دہلا دینے والی چیخیں گونجنے لگیں جسے میں نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں اس ستم رسیدہ لڑکی کے چہرے پر بہتے ہوئے تازہ تازہ خون کی بو اپنے نتھنوں میں محسوس کرنے لگی۔ میرا دل بھر آیا اور میں اپنے آنسوؤں کو پینے کی کوشش کرنے لگی۔ نوشی سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے افسردہ لہجے میں بولی۔ "پھر اس لڑکی کا پتہ نہیں چلا کہ وہ بندر عباس سے کہاں گئی۔ وہ زندہ بھی رہی یا مر گئی یا کہیں اور پہنچا دی گئی۔ اب تم خود سوچو اگر میں تمہاری مدد کا ارادہ کروں اور خانم کو معلوم ہو جائے تو کیا میرا حشر اس لڑکی جیسا نہیں ہو گا پھر شاید تم سے میری ملاقات بندر عباس کے کسی قحبہ خانے ہی میں ہو۔"

"مجھے تمہاری کوئی مدد نہیں چاہئے۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔" میں سوا بھرتے ہوئے بولی۔

"تم یہ مت سمجھنا کہ یہ آفت صرف مجھ پر آئے گی، تمہاری حالت بھی مجھ سے مختلف نہیں ہو گی۔ مجھے بیکار و برباد کر کے بندر عباس بھیجا جائے گا تو تمہیں کسی افغانی بردہ فروش کے ہاتھ فروخت کر دیا جائے گا۔" نوشی نے مزید اضافہ کیا۔ میں اس موضوع سے وحشت زدہ ہو گئی تھی۔ یہ موضوع چھیڑ کے پچھتائی تھی اور چاہتی تھی کہ گفتگو تبدیل ہو جائے۔ مگر اسی وقت نوشی دوبارہ بول پڑی۔ "اب بتاؤ کہ تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتی ہو۔ کیا تمہارے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے۔"

"نہیں میرے ذہن میں کوئی منصوبہ نہیں ہے اور میں تم سے کوئی مدد نہیں چاہتی۔" میں نے جلدی سے کہا۔

نوشی مجھے گھورنے لگی پھر رازدارانہ لہجے میں بولی۔ "دیکھو مجھ پر اعتماد کرو۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی بات ہے تو بتا دو۔ شاید کوئی کام کی بات بن جائے۔"

میں سوچ میں پڑ گئی۔ پھر خیال آیا کہ نوشی سے کٹ کر رہنا اچھی بات نہیں ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ میں نے نوشی سے کہا۔ "کوئی خاص منصوبہ تو نہیں البتہ کسی طرح پرویز کو میرے بارے میں معلوم ہو جاتا تو شاید وہ مجھے یہاں سے نکالنے کی کوشش کرتا۔" فوراً نوشی کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر دائیں بائیں دیکھا اور پھر مڑ کر ہال کی طرف دیکھا۔ اندر جھانک کر [illegible] ہو گئی اور اس کی خاطر جلد کر [illegible] سے پہنچ گئی اور اس کے [illegible] نظریں گھمانے کے بعد وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور سرگوشی میں بولی۔ "یہ پرویز کون ہے؟"

میں نے نوشی کو تفصیل سے پرویز، ثریا اور ہیٹرن کے بارے میں بتایا پھر اسے یہ بھی بتایا کہ میں کس طرح دھوکہ دے کر خانم کے حضرت کدے تک لائی گئی۔ نوشی غور سے سنتی رہی اور سر ہلاتی رہی۔ آخر میں اس نے پوچھا۔ "پرویز کہاں رہتا ہے؟"

"معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا کہاں کام کرتا ہے؟"

"یہ بھی نہیں معلوم۔"

"ثریا کے مکان کی نشاندہی کر سکتی ہو۔" نوشی نے کہا۔

"افسوس کہ مجھے اس کے مکان کا بھی پتہ نہیں معلوم۔" میں نے بڑی بے بسی سے کہا۔

نوشی بے ساختہ ہنسنے لگی۔ ہنستے ہوئے بولی۔ "تو پھر تم کیا چاہتی ہو۔ عجیب ہو۔ اپنے عاشق نامدار کا پتہ تک معلوم نہیں۔ آخر تم کس بنیاد پر توقع رکھتی ہو کہ پرویز تمہارے کوائف سے باخبر ہو کر تمہاری مدد کو چلا آئے گا۔" وہ دوبارہ ہنسنے لگی۔ مجھے کچھ غصہ سا آ گیا۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی۔ بہرحال وہ مضبوط اعصاب کی عورت تھی مگر میں اس جیسی نہیں تھی۔ بہرحال اس کے طنز نے میرے اعصاب کو کمزور اور روح کو کھوکھلا کر رکھا تھا۔

رات کے سائے جوں جوں پھیلتے جا رہے تھے میری وحشت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب مجھے نوشی کی بات یاد آ رہی تھی تو خود پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ واقعی میں کس قدر احمق تھی کہ تہران میں رہنے والے کسی بھی فرد کا پتہ نہ لے سکی تھی۔ مسعود اور خالہ تک کا نہیں۔ اور امید لگائے بیٹھی تھی کہ یہ لوگ میری نجات کو آئیں گے۔ اب میں اپنی حماقت کی سزا جس قدر بھگتوں کم ہے۔ میں نے ذہن پر زور دیا تو صرف پرویز کی گاڑی کے بارے میں کچھ یاد کر سکی مگر تہران میں اس جیسی گاڑیاں جانے کتنی ہوں گی۔ میں خفت سے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

جانے کتنا وقت گزر گیا تھا۔ میں اور نوشی اپنے اپنے خیالات میں گم سر جھکائے بیٹھے تھے کہ راہداری میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہم دونوں چونک پڑے۔ پھر نوشی تیزی سے اٹھی اور آئینے کے سامنے جا کر اس طرح کھڑی ہو گئی جیسے آرائش کر رہی ہو۔ میں بھی آنکھیں چھپا کے بستر پر لیٹ گئی جیسے سو رہی ہوں۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بتائے بغیر جان لیا تھا کہ یہ خانم تھی جو کمرے کی طرف آ رہی تھی اور اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔

ہاں وہ خانم ہی تھی۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گئی۔ اس کے پیچھے خادم تھی اور اس کے بعد تقی۔ تقی دروازے پر ہی

یہاں مچھلی کا شکار کرنا منع ہے

کو زمین پر لٹا دیتے اور اس عشرت کدے کو بیخ و بن سے اکھاڑ ڈالتے۔

ہم راہداری سے گزر رہے تھے اور راہداری کے ساتھ ساتھ کمروں کا سلسلہ پھیلا چلا گیا تھا۔ دیواروں پر شرمناک تصویریں چسپاں تھیں اور کمرے کے در و دیوار اور ایک ایک پیچ سے بے حیائی اور فحاشی عیاں تھی یہ یقیناً دانستہ طور پر کیا گیا تھا تاکہ لڑکیاں ہر اعتبار سے اس عشرت کدے کے ماحول اور سانچے میں ڈھل جائیں۔ راستے میں ایک کمرے کا دروازہ اچانک کھلا اور ایک نیم عریاں لڑکی باہر جھانکتی ہوئی خالدہ سے مخاطب ہو کر بولی:۔ "خالہ ذرا وہسکی اور بیئر بھجوا دو۔ میرا مہمان پیاسا ہے۔"
خالدہ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔

شاید آج سب کے سب میری خدمت پر مامور تھے ورنہ میں یوں جلوس کی صورت میں کیوں جا رہی ہوتی۔ ہم راہداری کے سرے پر واقع سب سے آخری کمرے کے سامنے پہنچے تو خالدہ نے ایک چابی نکالی اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ پھر مسکراتے ہوئے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ کمرہ اندر سے روشن تھا۔ یقیناً کوئی اندر موجود رہا ہوگا۔ میں اندر داخل ہوتے ہوئے ہچکچائی۔ میرا تذبذب دیکھ کر نوشی فوراً آگے بڑھ کر کمرے میں داخل ہوگئی اور میرا بازو سختی سے پکڑ کر مجھے اندر کی طرف کھینچنے لگی۔ اسی وقت تقی نے بھی مجھے بازو سے پکڑ لیا اور سرگوشی میں بولا۔ "کیا تمہیں یاد نہیں کہ خانم نے کیا کہا تھا۔ کوئی ایسی حرکت نہ کرنا کہ اندر بیٹھا ہوا مہمان برگشتہ ہو جائے۔ مہمان کی ناراضی سے جو کچھ ہوگا تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔"

مجھے تقی سے سخت نفرت تھی۔ جب اس نے میرے بازو کو چھوا تو میرا دل چاہا کہ اس کے چہرے پر تھوک دوں۔ کاش میں ایسا کر سکتی مگر صرف خواہش کر کے رہ گئی البتہ تسکین طبع کی خاطر میں نے ایک حرکت ضرور کی وہ یہ کہ اپنی نوک دار ایڑی والی سینڈل تقی کے پاؤں پر رکھ دی۔

اور اپنے جسم کا پورا بوجھ ڈالتی ہوئی کمرے میں داخل ہوگئی۔ تقی کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ پیر پکڑ کے بیٹھ گیا۔ میں اطمینان سے نوشی کی رہنمائی میں کمرے کے اندرونی حصے کی جانب بڑھنے لگی۔ نوشی مجھ سے آگے تھی۔ اس نے کسی کو سلام کیا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا —— یہ کمرہ دوسرے کمروں سے مختلف تو نہیں تھا مگر اس میں عجیب سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہ تھی البتہ فرش پر ایک بڑا خوبصورت سا قالین بچھا ہوا تھا۔ قالین پر ایک طرف کشتی میں کھانے کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک دوسری کشتی بھی موجود تھی اس میں شراب کی ایک بڑی سی بوتل اور چند جام رکھے تھے۔ دیواروں پر رنگین تصویروں کے ذریعے آرائش کی گئی تھی۔ تو یہ تھا کمرۂ بزمِ خیام۔ خیام کی مٹی اس طرح کب پلید کی گئی ہوگی۔ اگر وہ اپنے نام سے موسوم اس کمرے کو دیکھ پاتا تو یقیناً رو پڑتا۔

نوشی نے اچانک میرا بازو پکڑا اور جھٹکے سے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔ "فوزیہ کیا بات ہے تمہیں کیا ہوا۔" اس کا لہجہ بے حد نرم اور ملائم تھا۔ میں حیرت سے چونک اٹھی۔ اسی وقت مجھے خانم کی بھی آواز سنائی دی۔ بکر دریا سے بھرپور آواز۔ خانم کمرے میں موجود تھی مگر اس عجیب و غریب روشنی کی وجہ سے وہ مجھے دکھائی نہ دی تھی۔ اس کی آواز پر میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ اس وقت اس نے بڑے بھڑکیلے اور نفرت انگیز انداز میں میک اپ کر رکھا تھا۔ اس نے ایک ایسی آرائش کی تھی جو اس کے سن و سال سے قطعی مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ اس کی گردن اور کلائیوں میں بیش قیمت زیورات دمک رہے تھے۔ ان زیورات کی قیمت یقیناً ہزاروں تومان ہوگی۔ مگر بعد میں نوشی نے بتایا کہ وہ زیورات نقلی تھے۔ خانم کا سراپا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ وہ یقیناً اپنی نوجوانی میں زبردست فاحشہ رہی ہوگی اور بہت مصروف وقت گزارا ہوگا۔ خانم کے قریب ہی ایک بوڑھا آدمی گاؤ تکیے سے لگا بیٹھا تھا۔ اس کی پُرشوق اور حریص نظریں مجھ پر اور نوشی پر جمی ہوئی تھیں۔ ان آنکھوں میں ایک مخصوص وحشیانہ قسم کی چمک تھی۔ خانم مجھ سے مخاطب ہو کر بولی:

"آؤ فوزیہ قریب آؤ۔ معزز مہمان سے ملو۔" اس وقت خانم کا لہجہ اپنائیت لیے ہوئے تھا۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی عزیز از جان بیٹی سے مخاطب ہو۔ میں اس زہر کی پوٹ سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی لہٰذا اس کی اس وقت کی محبت اور منافقت پر قطعاً حیران نہ ہوئی۔ یہ عورت ہم لڑکیوں کے خوبصورت اور معصوم چہروں پر تیزاب پھینک دیا کرتی تھی۔ تقی کے ذریعے ... ان کے چہروں کو مسخ اور ... کر

پڑ رہی تھی۔ اس وقت وہ کس قدر مہربان نظر آ رہی تھی — صرف اس لیے کہ میں اس سے گاہک کی دل کھول کر پذیرائی کروں اور وہ گاہک کی جیب سے منہ مانگی رقم نکال سکے۔

"فلاں جان! تم آقا کو دیکھنا اور ان سے ملنے کے لیے بے قرار تھیں نا۔ لو یہ موجود ہیں۔ آج رات تمہیں یہ سعادت حاصل ہو رہی ہے۔" مجھے خانم کی زہریلی مگر مٹھاس میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

حیرت! میں نے کب یہ بے قراری ظاہر کی تھی۔ میں نے کب تجھ سے اس بدصورت اور کریہہ المنظر بوڑھے کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میں نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ اس کے نام تک سے واقف نہیں۔ میں دل ہی دل میں خانم اور اس بوڑھے پر لعنتیں بھیج رہی تھی کہ زوشی نے لگے سرے سے میرے بازو پر دباؤ ڈالا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ مجھے مشتعل ہونے سے روک رہی ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ بڈھا عجیب سی نظروں سے مجھے اور زوشی کو تکے جا رہا تھا۔ پھر اس نے ذرا پہلو بدلا اور زوشی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خانم سے بولا۔ "میں غالباً اسے پہلے بھی دیکھ چکا ہوں لیکن پہچان نہ سکا ہوں۔"

زوشی ذرا آگے بڑھی اور کچھ جھک کر خوشامدانہ انداز میں بولی —
"سلام آقا! میں ایک بار آپ سے ملنے کی سعادت حاصل کر چکی ہوں اور آج رات فلاں کو ساتھ لے کر آئی ہوں۔ آپ خوش ہو جائیں گے۔" اس موقع پر خانم جھکی اور اس بڈھے کے کان میں کچھ سرگوشی کرنے لگی۔ جب وہ بڈھے کے پاس سے ہٹی تو بڈھا بے حد خوش نظر آنے لگا۔ پھر وہ قالین پر اشارہ کرتے ہوئے جھک کر بولا:
"آؤ بلبل میرے پاس آؤ۔ میں دیکھوں تو سہی کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو۔"

خانم منہ کھول کر ہنسنے لگی اور گری ہوئی شکل کی خاطر بولی: "اس سے کچھ دکھ جلدی گھبرا جاتی ہے۔ نئی ہے نا۔" اس کا تخاطب بڈھے سے تھا۔ پھر وہ پلٹی اور مسکراتے ہوئے میری طرف آئی اور سانپ کی مانند پھنکارتے ہوئے بولی۔ "ایک بات گرہ میں باندھ لو کہ آقا کو کچھ بے جھجک اس پر عمل پیرا ہونا ہے۔ کسی سوال یا اجتناب کی اجازت نہیں ہے۔ حکم عدولی کی صورت میں تمہارا انجام بہت عبرتناک ہوگا۔ اب جاؤ آقا کے پاس بیٹھو۔ اس سے لگ کر بیٹھو اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال دو۔" میرا خون جم کر رہ گیا۔ اس وقت خانم نے مسکراتے ہوئے میرا بازو پکڑا اور کھینچتے ہوئے بولی۔ "آؤ شہزادی جی۔ اس قدر تعجب کیا معنی۔ آقا کسی کی طرف متوجہ ہوں تو یہ اس کے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ خوش نصیبی اس کے قدم چومتی ہے۔ آقا دینے والوں میں حاتم کو شرماتے ہیں۔" خوشامدی،

ہیلو — جان من کیا تمہارا شو — شو — اوہ ہیلو
شوہر کیا تمہاری جان من اندر ہے —

چاپلوس۔ میں دل ہی دل میں چیخ اٹھی۔ میں اس بڈھے کے قریب بھی نہیں پہنچی تھی کہ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بے تابی سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔
"خانم صحیح کہتی ہے تم دلہن تو بن جاؤ۔ میں تمہارے سامنے زر و جواہرات کے انبار لگا دوں گا — آؤ میرے پاس آؤ۔" اس وقت زوشی نے بھی مجھے بازو سے پکڑ لیا۔ خانم کی انگلیاں میرے گوشت میں دھنسی جا رہی تھیں۔ لگ رہا تھا جیسے ابھی بازو کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔ وہ دونوں مجھے کھینچتی ہوئی بڈھے کے پاس لے گئیں۔ بڈھے نے مجھے کلائی سے پکڑا اور لیے ہوئے قالین پر بیٹھ گیا۔ خانم نے زبردستی میرا سر اس کے سینے سے لگا دیا۔ بڈھے کا ایک ہاتھ میرے گلے کے گریبان کے اندر رینگنے لگا۔ اور ہونٹ میرے رخسار پر سے ہوتے ہوتے لبوں پر آ کر جم گئے۔ مجھے گھن اور کراہیت محسوس ہونے لگی۔ پھر اس سے پہلے کہ میں اس کی کھونٹی جیسی کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز صاف طور پر سن لی تھی۔ جیسے ہی کالا کا ایک لمحہ گزرا میں اس منحوس بڈھے سے الگ ہو گئی۔ بڈھا بے حد خوش نظر آنے لگا تھا۔ مسکراتے ہوئے خانم سے بولا۔
"خانم میں اس وقت بہت خوش ہوں۔ میری زندگی میں ایسے لمحات کبھی کبھی ہی آتے ہیں — پھر اب دیر کس بات کی۔"
"حکم فرمائیے۔" خانم اس کے آگے بچھتے ہوئے بولی۔
"فون کر کے کال کر بلا لو۔" بڈھے نے کہا۔
"دوشی کو بھیجنی ہوگی وہ گاڑی میں لے آئے گا۔"

عبید اللہ علیم

محبتوں کے یہ دریا اُتر نہ جائیں کہیں
جو دِل گلاب ہیں زخموں سے بھر نہ جائیں کہیں

ابھی تو وعدہ و پیماں ہیں اور یہ حال اپنا
وصال ہو تو خوشی سے ہی مر نہ جائیں کہیں

یہ رنگ چہرے کے اور خواب اپنی آنکھوں کے
ہوا چلے کوئی ایسی بکھر نہ جائیں کہیں

جھلک رہا ہے جن آنکھوں سے اب وجود میرا
یہ آنکھیں ہائے یہ آنکھیں مُکر نہ جائیں کہیں

پکارتی ہی نہ رہ جائے یہ زمیں پیاسی
برسنے والے یہ بادل گزر نہ جائیں کہیں

نڈھال اہلِ طرب ہیں کہ اہلِ گلشن کے
بُجھے بُجھے سے یہ چہرے سنور نہ جائیں کہیں

فضائے شہرِ عقیدت کی دھند میں ہے اسیر
نکل کے گھر سے اب اہلِ نظر نہ جائیں کہیں

منوّرہ نوری

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے خلیفۂ اعظم تھے اور چونکہ حضرت خواجہ غریب نوازؒ زیادہ تر اجمیر میں قیام فرما رہے لہٰذا دہلی میں ان کے سلسلے کا کام خواجہ بختیار کاکیؒ کے سپرد تھا۔ ستو برس کی عمر سے آخر دم تک آپ خواجہ اجمیریؒ کے دامنِ فیض سے وابستہ رہے اور رشد و ہدایت کا مقدس کام ان کی منشا کے مطابق انجام دیتے رہے۔ آپ ماوراء النہر کے ایک قصبے اوش میں پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب سولہ واسطوں سے حضرت امام حسینؓ سے ملتا ہے۔ پیدائش کے وقت آپ کا اسمِ گرامی بختیار رکھا گیا۔ قطب الدین لقب تھا مگر زیادہ شہرت خواجہ کاکیؒ کے لقب سے ہوئی۔ ابھی آپ صرف ڈیڑھ برس کے تھے کہ والد سید کمال الدین کے سائے سے محروم ہو گئے۔ آپ کی پرورش کا تمام تر اہتمام آپ کی والدہ محترمہ نے کیا اور انھوں نے سب سے زیادہ اہمیت آپ کی تعلیم و تربیت پر دی جس کی بدولت بچپن سے ہی آپ کی ذات بڑے اوصاف کا مرقع نظر آنے لگی۔ اوائلِ عمر میں ہی سیکڑوں واقعات ایسے پیش آئے جو آپ کے نورانی مستقبل اور بلند مرتبہ ہونے کی نشان دہی کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت کے بعد آپ کی والدہ ماجدہ کو آپ کی باقاعدہ تعلیم کی خواہش ہوئی تو انھوں نے حضرت کو اپنے ایک خدا ترس پڑوسی کے سپرد کر کے فرمایا کہ بختیار کو کسی مکتب میں داخل کرا دو جہاں ان کی صحیح تعلیم ہو سکے۔ اس وقت حضرت کی عمر صرف پانچ برس کی تھی۔ آپ اپنے پڑوسی کے ہمراہ جا رہے تھے کہ ایک نورانی صورت باریش بزرگ سامنے آ گئے اور پڑوسی سے استفسار کیا کہ تمھارے ساتھ یہ بچہ کس کا ہے اور تم اسے لے کر کہاں جا رہے ہو؟ جواب میں پڑوسی نے انھیں صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ بولے۔

"میرے ساتھ آؤ میں اس بچے کو ایسے استاد کے پاس لے جاؤں گا جو اس کی صحیح تعلیم کا فرض ادا کر سکے۔" چنانچہ وہ پڑوسی حضرت کو لے کر اس بزرگ کے ہمراہ مولانا ابو حفص کے مکان پر پہنچے جو ایک باکمال بزرگ اور ظاہری و باطنی علوم میں یکتائے زمانہ تھے۔ اس نورانی ہستی نے حضرت کا ہاتھ ابو حفص کے ہاتھ میں دیتے ہوئے فرمایا۔

"ابو حفص! اس بچے کو خاص توجہ سے تعلیم دینا کیونکہ یہ ایک دن آسمانِ ولایت پر آفتاب بن کر چمکنے والا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ بزرگ وہاں سے رخصت ہو گئے۔ تب مولانا ابو حفص نے حضرت کے ساتھی سے دریافت کیا "کیا آپ جانتے ہیں یہ بزرگ کون تھے؟" انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو ابو حفص بولے۔

"یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے جو بختیار کو میرے سپرد کر گئے ہیں۔"

اس واقعہ کے بعد سے حضرت کی تعلیم شروع ہوئی ابو حفص نے بڑی توجہ سے اس کی ابتدا کی اور چند برس کے اندر اندر انھیں ظاہری و باطنی علوم سے بخوبی آشنا کرا دیا۔ حضرت کم عمری سے ہی ریاضت و مجاہدات میں مصروف رہتے۔ سترہ برس کی عمر میں آپ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ اس بیعت کے بارے میں دو روایات مشہور ہیں۔ ایک یہ کہ خواجہ معین الدین اجمیری سیاحت کے دوران جب اوش پہنچے تو خواجہ بختیار کاکیؒ نے ان سے بیعت کی اور دوسری روایت کے مطابق خواجہ بختیار کاکیؒ پیر کامل کی جستجو کرتے کرتے بغداد پہنچے تب انھوں نے بیعت کی۔ بہرحال خواجہ اجمیریؒ کے مرید ہونے کے بعد آپ عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد خواجہ اجمیریؒ کی اجازت سے مختلف ملکوں کی سیاحت کے لیے نکلے اور بہت سے اولیائے کرام سے ملاقات کی۔ اسی دوران میں انھیں اطلاع ملی کہ خواجہ اجمیری بغداد چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے ہیں تو وہ بھی عازم ہندوستان ہوئے۔ پہلے آپ ملتان پہنچے۔ یہ شیخ بہاؤالدین ذکریا کا زمانہ تھا اور اس وقت ناصر الدین قباچہ ملتان کا حاکم تھا۔ ابھی آپ یہیں قیام فرما تھے کہ مغلوں نے ملتان پر حملہ کیا اور شہر کا سخت محاصرہ کر لیا۔ ایک دن حضرت بختیار کاکیؒ شیخ بہاؤالدین ذکریا کے ساتھ محو گفتگو تھے کہ ناصر الدین قباچہ حاضر خدمت ہوا اور محاصرے کی سختی کا ذکر کر کے شیخ سے دعا کی گزارش کی۔ اس وقت حضرت بختیار کاکیؒ کے ہاتھ میں ایک تیر تھا، آپ نے وہ تیر قباچہ کو دیا اور فرمایا۔

"اسے دشمن کے لشکر کی طرف چھوڑ دو۔"

قباچہ نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد دیکھتے دیکھتے دشمن کا لشکر محاصرہ اٹھا کر تتر بتر ہو گیا۔ اس کرامت کا اہل ملتان پر بڑا اثر ہوا اور وہ دل سے حضرت کے معتقد ہو گئے۔ اسی زمانہ میں حضرت بابا فرید الدین گنج شکر حضرت کے مرید ہوئے۔ یہاں سے رخصت ہو کر حضرت دہلی پہنچے۔ سلطان شمس الدین التمش نے آپ کا شاندار استقبال کیا۔ یہ جگہ آپ کو بے حد پسند آئی اور آپ نے دہلی کے باہر ضلع کیلوکھری میں اپنا ڈیرہ جما لیا۔ یہاں سے آپ نے خواجہ اجمیری کی خدمت میں عریضہ ارسال کیا اور ان کی خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش ظاہر کی لیکن انھوں نے جواب دیا۔

"قرب مکانی کے آگے بعد مکانی کوئی چیز نہیں۔ تمھیں دہلی میں قیام کرنا چاہیے۔"

چنانچہ خواجہ کاکیؒ نے دہلی میں سکونت اختیار کی۔ [illegible] الٰہی کے حلقہ ارادت مند تھے۔ کچھ ہی دن بعد دور دور تک شہرت

ہو گئی۔ سلطان التمش بھی خود آپ کی خدمت میں حاضری دیتا۔ کچھ دنوں کے بعد اس نے شہر دہلی میں داخل ہونے پر اصرار کیا تو حضرت شہر میں تشریف لائے جہاں سلطان نے ایک وسیع حویلی آپ کے سپرد کی۔ یہاں بھی خلقت کا بے پناہ ہجوم رہنے لگا۔ آپ کی تبلیغ سے بہت لوگ راہ راست پر آئے حتیٰ کہ روسا، امرا اور عوام سبھی آپ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ اسی زمانہ میں قاضی شہر شیخ الاسلام مولانا جمال الدین بسطامی کا انتقال ہوا تو سلطان التمش نے حضرت سے شیخ الاسلام کا عہدہ قبول کرنے کی گزارش کی مگر آپ نے انکار کر دیا۔ تب اس عہدے پر شیخ نجم الدین صغرا کو مامور کیا گیا جو ایک عالم و فاضل بزرگ اور خواجہ اجمیری کے پیر بھائی تھے لیکن ان دونوں بزرگوں کی بن نہ سکی۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ حضرت خواجہ کاکی کو سماع کا شوق تھا اور شیخ الاسلام اس پر معترض تھے۔ دوسرے حضرت خواجہ کاکی کی بڑھتی ہوئی شہرت عوام میں حد درجہ مقبولیت اور عقیدت شیخ الاسلام کو گوارا نہ تھی۔ اس اختلاف کو مٹانے کے لیے حضرت خواجہ اجمیری نے چاہا کہ خواجہ کاکی کو اجمیر لے جائیں مگر ان کے معتقدین ایک جم غفیر کی صورت میں خواجہ غریب نواز کی خدمت میں حاضر ہوئے اور التجائیں کیں کہ قطب صاحب کو ہم سے جدا نہ کیجیے۔ انھوں نے بچشم خود خواص و عوام میں قطب صاحب کے عقیدت مندوں کو دیکھا اور انھیں دہلی سے لے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد آپ آخر تک دہلی میں مقیم رہے اور آپ کی ذات والا صفات سے بے شمار کرامات ظہور پذیر ہوئیں۔

ایک مرتبہ آپ کی صحبت میں قاضی حمید الدین ناگوری، مولانا علاؤالدین کرمانی اور کئی دوسرے بزرگ تشریف فرما تھے۔ موضوع سخن حج تھا۔ گفتگو کے دوران یکایک حضرت خواجہ کاکیؒ کی زبان سے نکلا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بے حساب ہے، وہ اگر چاہے تو میں

سترگی عزت بھی پیش نہ آئے بلکہ وہ خود ہمارے دربار میں خانہ کعبہ شریف کو بھیج دیتا اور ہم اپنے مقام پر ہی طواف کر لیتے۔ ابھی حضرت نے بات پوری کی ہی تھی کہ حاضرین مجلس پر ایک عجیب وارفتگی کا عالم طاری ہو گیا اور پھر جو سب نے نظریں اٹھائیں تو کعبہ شریف سامنے تھا۔ ان سب نے طواف کیا تو غیب سے آواز آئی "عزیزو! ہم نے تمہیں ثوابِ حج عطا کیا۔"

ایک مرتبہ شاہی حاجب اختیار الدین اشرفیوں کے کچھ توڑے لے کر حاضرِ خدمت ہوا۔ قطب بابا نے پوچھا "یہ کیا ہے؟" اس نے جواب دیا کہ بادشاہ نے اشرفیاں بھیجی ہیں۔ آپ نے اسے اپنے قریب بلایا اور اپنے مصلے کا کونا اٹھا کر بولے "ادھر دیکھو" اختیار الدین نے دیکھا تو سیم و زر کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ وہ حیرت زدہ سا رہ گیا تو آپ بولے "جسے خدائے واحد نے اتنا بڑا خزانہ عطا کیا ہے وہ تمہاری یہ اشرفیاں لے کر کیا کرے گا۔ جاؤ چلے جاؤ مگر یاد رکھو آئندہ ایسی گستاخی نہ کرنا۔"

ایک مرتبہ آپ حضرت بابا فریدؒ کے ساتھ مصروفِ سفر تھے۔ اثنائے راہ میں ایک دریا آگیا۔ جسے پار کرنے کے لیے کوئی کشتی نہ تھی اور اسے فوری طور پر پار کر کے آگے جانا بھی ضروری تھا۔ لہٰذا آپ نے سورۂ اخلاص پڑھ کر پانی پر پھونک ماری تو دریا میں راستہ بن گیا اور آپ بلا تکلف پار چلے گئے۔

سلطان التمش پانی کی کمی دور کرنے کے لیے ایک وسیع تالاب کھدوانا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے موزوں جگہ نہ تھی۔ ایک شب وہ سویا تو خواب دیکھا کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے پر سوار ایک جگہ کھڑے ہیں اور فرماتے ہیں "تالاب یہاں کھدواؤ"۔ التمش بیدار ہو کر فوراً اس جگہ پہنچا تو حیرت زدہ رہ گیا کہ خواجہ قطب الدینؒ وہاں کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں "حضور صلعم کی ہدایت ہے کہ تالاب یہاں کھدواؤ"۔ یہ تالاب آج بھی موجود ہے۔ اور شمسی تالاب کہلاتا ہے۔

آپ کے گھر میں اکثر فاقہ رہتا تھا۔ کبھی کبھار اشد ضرورت کے تحت آپ کی زوجہ محترمہ اپنے پڑوس میں آباد ایک بقال سے کچھ قرض لے لیا کرتی تھیں۔ ایک دن اس بقال کی بیوی کو غرور آگیا اور اس نے حضرت کی زوجہ پر طنز کیا۔

"ہم تمہیں قرض نہ دیں تو بھوکے مر جاؤ۔"

حضرت کو علم ہوا تو اپنی بیوی سے فرمایا کہ آئندہ قرض مت لینا ہاں جب ضرورت ہوا کرے تو حجرے کے طاق میں بسم اللہ پڑھ کر ہاتھ ڈالا کرو تمہیں وہاں سے بقدرِ ضرورت کاک (میٹھی روٹی) مل جایا کرے

گی۔ اس واقعہ کے بعد کاک ہر وقت آپ کے گھر میں موجود رہتی اور اسی کی نسبت سے آپ کاکی کہلاتے۔

ایک دن شاہی نانبائی سے سلطان التمش کے خاص کاک جل گئے۔ ادھر سلطان کے خاصہ کا وقت ہو چکا تھا۔ نانبائی سخت پریشانی کے عالم میں تھا کہ دیکھئے کیا انجام ہوتا ہے۔ اسی وقت حضرتؒ کا ادھر سے گزر ہوا تو اس کا تردد جان کر فرمایا "گھبراؤ نہیں بلکہ بسم اللہ پڑھ کر ان کاکوں کو پھر سینکو"۔ نانبائی نے تعمیلِ حکم کی تو متعجب رہ گیا کیونکہ وہی کاک نہایت عمدہ صورت میں تنور سے برآمد ہوتے تھے۔

حضرت کو سماع سے بہت لگاؤ تھا۔ آپ محفلِ سماع اپنے ہاں منعقد کراتے کبھی قاضی حمید الدین ناگوری یا دیگر درویشوں کے ہاں تشریف لے جاتے اور اپنا ذوقِ سماع پورا کرتے۔ ایک دن شیخ علی سنجری کی خانقاہ میں محفلِ سماع منعقد ہوئی آپ بھی تشریف لے گئے۔ قوالوں نے حضرت احمد جام کا کلام شروع کیا آپ بڑی عقیدت سے سنتے رہے لیکن جس وقت وہ اس شعر پر پہنچے کہ

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را
ہر زماں از غیب جانِ دیگر است

تو حضرت نے اپنی زبان سے اس شعر کو دہرایا اور مرغِ بسمل کی طرح تڑپنے لگے۔ دیر تک یہی کیفیت رہی جب حالت بہت بگڑ گئی تو انہیں واپس ان کے مکان پر لایا گیا یہاں پھر قوالی شروع ہوئی آپ کو قدرے ہوش آیا تو قوالوں کو پھر اسی شعر کی تکرار کا حکم دیا۔ پھر عجب کیفیت تھی کہ شعر کا پہلا مصرعہ سن کر آپ بالکل بے جان ہو جاتے اور دوسرے مصرعہ پر تڑپنے لگتے چار شبانہ روز یہی حالت رہی بالآخر اسی حالت میں ۲۷ دسمبر ۱۲۳۵ مطابق ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ کو آپ کا وصال ہو گیا۔ سلطان التمش نے غسل دیا اور خود ہی نمازِ جنازہ پڑھائی اور آپ کو اس جگہ دفن کیا گیا جو آپ نے عالمِ حیات ہی میں خود اپنے مرقد کے لیے خریدی تھی۔ مزارِ مبارک دہلی میں مرجعِ خاص و عام ہے۔

گلشنِ اقبال سے ملحقہ نئی اسکیم
گلشنِ خیام
بکنگ شروع ہو چکی ہے
شانتی نگر
پارک

نے منہ پھلا لیا۔ اور وہ پیڑا اٹھا کر پھر کھانے لگی۔ یہ اس کی خاص عادت
تھی۔ ناراض ہو جاتی تو منہ پھلا کے بیٹھ جاتی تھی۔
رمضان نے اپنے آگے سے کھانے کی پلیٹ سرکا دی "منہ کالا
ہو جا ناراض ——— ہاں ہو جا ——— میں ابھی سب کھا جاؤں گا ——— پھر تو بیٹھی تکتی رہیو"
"ہائے ——— مریں تیرے دشمن۔ تو کیوں مرے۔ پہلے تو
بتا کہ تو اتنی جلدی ناراض کیوں ہونے لگتا ہے اور پھر منہ سے اول فول
بھی ایسی بکتا ہے کہ دل ہول جائے۔ آگے کبھی مرنے کی بات کی نا
تو سچ کہہ دیتی ہوں رمضے پورے آٹھ دن نہیں بولوں گی۔ چل کھا لے
اب تو ——— " سحر نے اپنے ہاتھ سے نوالہ بنا کر اس کے منہ میں رکھنا چاہا
تو رمضان نے جھپٹ کر اس کی انگلیاں بھی دانتوں میں داب لیں۔
سحر تڑپ گئی۔ "ارے ظالم ——— تو تو سچ مچ میرا دشمن
بن گیا ہے۔" وہ وہیں اس کے سامنے چارپائی پر لیٹ گئی۔ اپنے
ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ رمضان نے عجیب مستانی نظروں سے اسے
گھور کر دیکھا۔ اس کی گرم گرم تپتی نظریں سحر کی پلکوں سے چھن چھن کر
آنکھوں میں اترنے لگیں۔ اس کی ایک آنکھ میں وفا کی جھنکار ———
پیار کا ساگر ——— عشق کی مستی ——— اور محبوب کی چھب...
سب مل جل کر ایک چمک بن گئے تھے ویسی ہی دیتی چمک۔ لیکن اس کی
دوسری بھیگی آنکھ جس کی پتلی پر بڑا سا ایک سفید دانہ رکھا تھا عجیب
ہو گئی۔ کوئی جذبہ ——— کوئی رنگ اس آنکھ سے نہ جھلک سکا۔ بس
یک ٹک جمی ہوئی پتلی کا سفید دانہ رمضان کی تپتی نظروں کا مقابلہ کرتے
کرتے سفید سیل بن گیا۔

رمضان نے بڑے پیار سے اس کے پیٹ پر دھپ جما دی

"چل جا ——— کتاب لا دے ——— دیکھ دوں گا تیرے نام کے معنی بھی۔
کیا یاد کرے گی کہ پڑا تھا پالا کسی لاٹ صاب سے۔"

سحر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "اُف تو بڑا لاٹ صاحب ہے" ارے
کس نے کہہ دیا کہ تو لاٹ صاب ہے۔ تو تو سب لاٹوں کا لاٹ ہے
صاب واب کچھ نہیں۔"

"چل بالشتنی۔ جلتی ہے میرے بے قدرے سے ابھی ٹھیر بتاتا
تجھے۔" اس نے لپک کر سحر کی کلائی پکڑنا چاہی لیکن وہ بل
کھاتی ہوئی نکل گئی۔

کمرے میں سے نیلی جلد والی موٹی سی کتاب لے کر وہ رمضان
[illegible] "بس ہی چاہتی تھی۔ پتا ہے رمضے اسے بھی پڑھنا سکھا دے ———!"
"ہاں تجھے سکھا دوں ——— ارے بابا پہلے میں خود تو سیکھ لوں۔
مشکل ہے یہ پڑھنا لکھنا بھی۔ کبھی کبھی تو ایسا مشکل لفظ آ جاتا ہے

کہ اپنی سمجھ میں ذرا نہیں آتا۔ تبھی تو یہ موٹی کتاب لینا پڑی ہے۔ اس میں
سے اس لفظ کے معنی دیکھتا ہوں جس کے معنی نہ آتے ہوں۔ اچھا چل
بتا اصلی نام کیا ہے تیرا۔ معنی دیکھ دوں۔ میرا تو اتنا دھیان ہی بالکل ہی
بھول گیا نکاح نامے پر تیرا کون سا نام لکھا تھا ——— ؟"
"ہائے کیسا ہے تو۔ تجھے نہیں یاد میرا اصلی نام ——— ؟" سحر نے
اپنی ایک آنکھ میں پیار کی ساری خوشبو سمیٹ کر رمضے کی روح میں
انڈیل دی۔
"مجھے تو تیرا وہی نام یاد ہے ——— سحر رجو ——— اور تو کہتی ہے
کہ تیرا بڑا پیارا سا نام ہے۔ بھلا بتا کیا نام تھا ——— ؟" رمضان کو اسے
چڑانے میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔
"میرا نام ہے ...... سراج ما ...... ما ...... نیر ..."
"سراج ما ...... نیر ——— اوہ ...... اوہ ——— بھئی واہ
کیا نام ہے۔ میں نے کل ہی اس کتاب میں سراج کے معنی دیکھے
ہیں۔ سورج ہیں سراج کے معنی ——— تو سحر تو سورج ہے" رمضان
قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ "واہ یار ایک آنکھ کا سورج ——— کانا سورج یا
پھر گہن والا سورج ہوگا ...... ہے نا سحر۔!" رمضان مسلسل ہنسنے لگا۔
سحر کی آنکھ میں سمندر اترنے لگا۔ اور دوسری آنکھ چٹان کا
پتھر بن گئی۔
"رمضے ——— تو میرا مخول (مذاق) اڑاتا ہے۔ یہ آنکھ میں
نے خود تو نہیں بگاڑی نا۔ اللہ پاک نے بگاڑ دی۔ وہ سارے جہان
کا مالک ہے۔ جو چاہے کرے میں کیا اسے روک سکتی تھی۔ رمضے ———
تو جان جان کر ...... " سحر کی آواز آنسوؤں کی نمی سے بھیگنے لگی۔
رمضان ہنستے ہنستے یکدم چپ ہو گیا۔ "سن سحر ——— میری بات
سن میں نے تیس برسوں میں بڑے بڑے بے وقوف دیکھے۔ پر نہ دیکھا
تو تیرے جیسا یار ——— اری پاگل مجھے تیری صورت سے چڑ ہوتی تو
قاضی سے دو بول کیوں پڑھوا لیتا۔ اپنے بابے کو کیوں چھوڑتا۔ دس
سال سے اوپر ہو گئے تیرے ساتھ رہتے ہوئے۔ لیکن تو ابھی تک
مجھے نہیں سمجھ پائی۔ ہے نا عورت زاد ——— ہے گی پاگل کی پاگل ——— چل
اب چپ ہو جا ——— ہاں تو کیا نام بتا رہی تھی۔ سراج ما نیر۔ سراج کے
معنی تو ہوئے سورج اور منیر ...... مانیر ...... یہ بے ہودہ
مانیر ... ارے نہیں یہ تو منیر ہے۔ منیر ہی ہوگا تیرا نام۔ منیر کے معنی ہیں
روشن، چمکدار، اجلا چمکتا ہوا ......" پھر وہ ہنسا اور اسے گدگداتے
ہوئے بولا۔ "اری تو چمکدار سورج ہے ...... اجلا سورج ... کیوں
بھئی سحر تو واقعی چمکتا ہوا سورج ہے ———" رمضان پھر ہنسنے لگا۔ مگر

# دوشیزہ کی محفل

**حیات شیرازی ، جامعہ کراچی**

ستمبر کا شمارہ پڑھا۔ پسند آیا۔ "ترقی" کی راہ پر تیزی سے گامزن ہے۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ موجودہ شمارے میں "پیاسی دھرتی" بہت اچھا لگا۔ علاوہ ازیں سلسلہ وار آپ بیتی "فرار" تو اس رسالے کی زیب و زینت ہے۔ تاریخی اوراق میں "آس" مختصر مگر جامع کہانی ہے لیکن مصنفہ نے اس کہانی میں عورت کی عظمت کو جن بلندیوں پر پہنچا دیا ہے وہ میرے خیال میں ممکن نہیں۔ اس بارے میں دوسری بات مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ کے یہاں تاریخ کے مشہور ادوار سے متعلق تو کہانیاں لکھی جاتی ہیں لیکن وہ پہلو جو تا حال تشنہ ہیں ان پر قلم نہیں اٹھایا جاتا۔ بہتر یہ ہے کہ اس سلسلہ میں تاریخ کے گمنام ادوار سے لوگوں کو روشناس کرایا جائے۔ امید ہے محترمہ منورہ نوری اس بات پر غور کریں گی۔

**شاہ زمان ، دوبئی**

مسلسل ناول "فرار" دلچسپ ہے۔ اس کے علاوہ دیگر افسانے بھی اچھے ہوتے ہیں۔ اگر آپ اشعار اور لطیفوں کا صفحہ علیحدہ کر دیں تو بہت اچھا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں اپنے لکھے ہوئے چند افسانے دوشیزہ میں بھیج دوں۔ میری طرف سے آپ سب کو عید مبارک۔

**مس غلام نبی میمن ، حیدرآباد**

اس دفعہ "آس" بہت دلچسپ کہانی تھی۔ اس کے علاوہ دیگر کہانیاں دیر پا تاثر قائم نہ کر سکیں۔ چند ماہ پہلے ایک سلسلہ "خواتین کا عالمی سال" شروع کیا گیا تھا۔ یہ ایک اچھا سلسلہ تھا۔ ممکن ہو تو دوبارہ شروع کر دیجئے۔

مرد حضرات سے ہمارے یہ کہنے کا مطلب کہ ان کا داخلہ بند کر دیا جائے یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ سچ مچ محفل سے چلے جائیں دراصل جب یہ بگڑ کر تلخ جواب دینے لگتے ہیں تو ان کی جلی کٹی سننے میں ذرا لطف آتا ہے۔ اسے چھیڑ چھاڑ سمجھ لیں مگر اچھی لگتی ہے۔

**پرنس نسیم کاشف ، مظفر گڑھ**

میں ایک حساس انسان ہوں۔ اللہ میاں نے شکل صورت اور رتبہ بھی کچھ اچھا دیا ہے مگر مجھے خوبصورت لوگ قطعی اچھے نہیں لگتے۔ میرے دوست احباب حیران ہیں کہ میں کیوں بدصورت لوگوں کے پیچھے بھاگتا ہوں۔ محبت کے بھوکے انسان خوش نہیں دیکھے جاتے۔ کاش میں ان سب دکھی لوگوں کا درد بانٹ سکوں۔ اسی فکر میں مبتلا رہتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ بہت سارے لوگ مل کر یہ بیڑا اٹھائیں کہ دنیا میں پیار کی محرومی کا گلہ مٹا دیں گے۔ اس لیے یہ سوچ کر اپنی آواز کا ذریعہ بنا رہا ہوں۔ کیا قارئین میرے سوال کا جواب دیں گے؟

**شمع ناز ، حیدرآباد**

میں نے بہت دن ہوئے آپ سے ایک تصویر کے بارے میں پوچھا تھا۔ آپ کا جواب ملنے پر میں اپنی کزن سے شرط جیت گئی۔ آپ کو شرط کی مٹھائی اس لیے نہیں کھلائی کہ بعد میں ہم دونوں کے درمیان جھگڑے پر سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ آپ حیدرآباد آئیں تو آپ کو بھی کھلائیں گے۔ امید ہے آپ ہمیں نہیں بھولی ہوں گی۔ دوشیزہ باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں۔ بہت دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔

**ریاض حسین قمر ۔ مانسہرہ (ہزارہ)**

اپنی ایک غیر مطبوعہ غزل لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ امید ہے پرچے کے معیار پر پوری اترے گی۔ آپ سب لوگوں کی محنت

کہ عالمی دور تاریخ انسانی میں بھی جو اپنے منفرد انداز سے آگے بڑھ رہا ہے۔

بیگم ریحانہ منیر، صلالہ (عمان)

عرصہ سے اپنے میاں کے ساتھ یہاں رہائش پذیر ہوں۔ کراچی سے روانگی کے وقت میرے شوہر نے سٹال سے دوشیزہ خرید لیا تھا۔ دوران سفر میں نے پڑھا۔ خوشی ہوئی کہ پاکستان میں پڑھی لکھی عورتوں کے لیے اتنا معیاری پرچہ نکل رہا ہے۔ دعاگو ہوں کہ یہ پاکستانی عورتوں میں شعور اور بیداری کا احساس پیدا کرے۔ آمین

حبیب احمد اطہر، کراچی

کتنا عجیب اتفاق ہے کہ میرا نام بھی حبیب ہے اور میں بھی حبیب صاحب (مدیر) کی طرح کسی بہن کی محبت کے لیے ترس رہا ہوں۔ ملازمت پیشہ ہونے کے ساتھ ساتھ طالب علم بھی ہوں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تھا (ہے) ہوں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے ایک بہن کی کمی بری طرح سے محسوس کرتا ہوں۔ اگر کوئی مجھے بھی سگی بہنوں جیسی محبت دے تو ساری عمر اپنی باجی کی پوجا کرتا رہوں گا۔

میرا پتہ یہ ہے۔

H.A.ATHER

PAF STAFF MAINT OFFICER

P.A.F BASE MASROOR KARACHI

نسیم اختر گل، کورنگی (کراچی)

"دوشیزہ" بڑی سبک رفتاری سے خراماں خراماں اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ شمیم نقوی صاحبہ کو مبارک باد پہنچا دیجئے۔ اشعار کی محفل کی غیر حاضری بہت کھلتی ہے ہر ایک کا اپنا اپنا ذوق ہے۔ ہمیں اشعار اچھے لگتے ہیں آپ جانے کیوں اس سلسلے کو شروع کرنے کی قسم کھا بیٹھی ہیں۔

ج: نسیم کیا غزلیں اشعار کی تشنگی مٹانے کے لیے ناکافی ہیں؟

مس افشاں شاہ، صلالہ، نواب شاہ

اگست کے شمارے نے مجھے بہت رلایا۔ پیارے بھائی جی ایم ناز کی موت کی خبر پڑھ کر رسالہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ اس کے بعد بہت دنوں تک سمجھ نہ سکی کہ جی چاہتا ہے پڑھنے کو، کیا ایسے انسان بھی مر سکتے ہیں جو لاکھوں کو ہنسا سکتے ہیں، ہماری لاشوں کو جینا سکھا دیں۔ وہ خود دنیا سے کیسے مر سکتے ہیں۔ وہ ہمارے دلوں میں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

ایم۔ ایل ملک، صلالہ (عمان)

پرچہ تاخیر سے ملا۔ غالباً اس کی وجہ پتے کی غلطی ہے۔ یہ سلطنت عمان ہے۔ اس کا تلفظ انگریزی OMAN ہے اور دوسرا عمان (AMMAN) ہے وہ اردن کا دارالخلافہ ہے۔ اس معمولی سی غلطی سے پرچہ پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ میری طرف سے نیا پرچہ "نکھار" نکالنے کی مبارک باد قبول کریں۔ جی ایم ناز صاحب کی وفات نے دل پر گہرا اثر کیا۔ "آئیڈیل کی تلاش" کے بارے میں عرض ہے کہ محترم صلاح الدین صاحب کی رائے سے میں متفق ہوں کہ مرد حضرات کو بھی اس بارے میں اظہار خیال کا موقع ملنا چاہیے۔

شفیق خان، بنوں

کچھ شکایتیں بھیج رہا ہوں۔ امید ہے ناراضگی کا اظہار نہیں کیا جائے گی۔ دوشیزہ کے اوراق سے "کیا لکھا کیا پایا"، ترنم کش، "کھانے کی میز" اور آخری صفحات کیوں غائب ہو گئے۔ اس کے علاوہ دنیا لڑکیوں کو صدر جیسا اونچا اٹھنے سے آپ کیوں نہیں روکتیں۔ کیا یہی حقیقت پسندی ہے کہ آسمان پر پہنچنے کے خواب دیکھے جائیں ان سے کہیں کہ اللہ کی بندیو زمین پر رہنے والوں کے ساتھ زندگی نبھانے کی باتیں کریں۔

جی ایم ناز کی وفات کی خبر نے دکھ دیا۔

ج: خان بھائی مجھے حیرت ہے کہ آپ کو بھی "کھانے کی میز" سے دلچسپی ہے۔ بہرحال یہ عورتوں اور مردوں کا مشترکہ پرچہ بنانے کے لیے ضروری تھا کہ اس میں دونوں کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے تبدیلیاں کی جائیں۔ اگر اور بھائیوں کا بھی اصرار ہوگا تو "کھانے کی میز" دوبارہ سجا دیں گے۔ رہا کالم "کیا لکھا کیا پایا" تو کیا "تین عورتیں تین کہانیاں" اس کمی کو پورا نہیں کرتیں؟ آخری صفحات عارضی طور پر بند کیے گئے ہیں۔ جلد ہی دوبارہ شروع کر دیے جائیں گے۔ رہ گیا مسئلہ لڑکیوں کو سمجھانے کا، تو اس بارے میں اتنا کر سکتے ہیں مدت کے بعد انہیں اس بارے میں سوچنے کی آزادی ملی ہے، انہیں کہہ لینے دیجئے۔ ذرا آپ بھی تو دیکھیں کہ غیر حقیقی کہانیاں اور خواب دکھانے والا لٹریچر پڑھ پڑھ کر ان لڑکیوں کے ذہنوں نے کیسے کیسے اونچے آئیڈیل تراشے ہیں۔ ہم تو صرف دعا کر سکتے ہیں کہ خدا ان سب کے خواب پورے کرے۔

ارشد چوہدری۔ لاہور

میں نے دوشیزہ کو ایک ترقی پسند رسالہ پایا ہے۔ "آئیڈیل

کی کاوش معصوم جذبات کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ آپ
نے جہیز پر اصلاحی قدم اٹھایا ہے تاکہ افسانوں کے ذریعے
جہیز، شادی میں ذات پات کی رکاوٹ اور جبری شادی جیسی
برائیوں کو بھی بار بار چھیڑیں تاکہ لوگ سنجیدگی سے ان کا سد باب
کر سکیں۔

**نصیر کوثر، لائل پور**

اگست کا شمارہ پڑھا۔ شفقت عرشی کا افسانہ "اجالے کا
گھاؤ" بہت متاثر کن تھا۔ انہیں میری طرف سے بہت بہت
مبارکباد دیجئے۔

**اقبال خان، ہزارہ**

ثروت چوہدری کا افسانہ پسند آیا۔ اسلم صاحب اور
جاوید انیس صاحب سے عرض ہے لڑکیوں سے بحث نہ کیا کریں
یہ نازک دل ہوتی ہیں۔ ان کا لڑنا بھی دو پل کا اور مان بھی جانا دو
گھڑی کا۔ اگر زاہدہ صاحبہ نے تھوڑی سی بحث کر لی تو کیا ہوا۔
آمنہ بلوچ اور نسیم اختر بہنوں جیسا پیار تو رکھتی ہیں۔

**حبیب اختر، ابوظبی**

میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے میری مدد کی ہے
اور میں نے جیسی خواہش کا اظہار کیا تھا وہ ماہنامہ "دوشیزہ" کی
معرفت پوری ہو گئی ہے۔ میرا ایڈریس یہ ہے۔
حبیب اختر پوسٹ بکس نمبر ۳۴۵ ابوظبی (یو اے ای)

**نصرت جہاں صدیقی، حیدرآباد**

اگست کے شمارے میں افسانہ "بے وفا" پسند آیا۔ یوں تو
رسالہ بہت اچھا ہے بس غیر ضروری صفحات کی موجودگی کھٹکتی ہے۔ ہم نے
اپنی ذہنی آزادی کی برقراری کے لیے یہ رسالہ منتخب کیا ہے بلاوجہ
ایسے صفحے ہم ان کی موجودگی میں کیسے کر سکتے ہیں حیران کے خلاف
جاتے ہوں۔

**ایس۔ ایچ۔ نرایش، پشاور**

"تین عورتیں تین کہانیاں" میں "ماں" میں نے دل تھام بہت
پسند آئی۔ میں بھی آپ کو جلد ایک کہانی بھیجوں گا۔ امید ہے شائع
ہو جائے گی۔

**جاوید اقبال، شیخوپورہ**

ستمبر کا "دوشیزہ" پڑھا۔ دل خوش ہو گیا "آس" اور مسلسل
ناول "سینا" بہت دلچسپ تھے۔ حضرت سہیل کا مضمون
بھی معلوماتی تھا۔ اشعار کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیں۔ اور ناول
کے سلسلے میں کوئی تبصرہ ضرور شائع کیجئے۔

**شہناز بخاری، راولپنڈی**

بجیا امر... کی کتابیں "نایافت" اور "خواب میرے"
دوشیزہ کے دفتر کے علاوہ کہاں سے مل سکتی ہیں۔
ج: شہناز آپ یہ کتابیں راولپنڈی کے کسی بھی بڑے
بک ڈپو سے منگوا سکتی ہیں۔ اگر نہ مل سکیں تو
ٹیلیفون کر دیں وہ وی پی کر دیں گے۔

**تاجدار خان، بنوں**

جی ایم ناز کی وفات پر بہت دکھ ہے میرے احساسات ان کے
لواحقین تک پہنچا دیجئے۔ وہ حقیقتاً ایک عظیم انسان تھے۔

**ذوالفقار انجم جعفری، سرائے عالمگیر**

میں نے دو غزلیں بھیجی تھیں۔ جن کی اشاعت کے بارے
میں آپ نے لکھا تھا کہ کسی قریبی شمارے میں شائع ہو جائیں گی
میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ "قریبی شمارے" سے آپ کی مراد
کیا ہے۔ آنے والا مہینہ یا پھر ۔۔۔!
ج: آپ کا طویل طنزیہ خط ملا۔ ستمبر کے شمارے میں
آپ کی غزلیں شائع ہو چکی ہیں۔ امید ہے اب "قریبی
شمارے" کا مطلب واضح ہو گیا ہوگا۔ دراصل کسی
بھی غزل اور مضمون کے بارے میں قطعی طور پر یہ
نہیں کہا جا سکتا کہ کب شائع ہوگا۔ کچھ دفتری
ناگزیر وجوہات کی بنا پر آخری وقت تک پرچے
کے مضامین میں تبدیلی ممکن ہے۔ بہر حال آپ
کی غزلیں ابھی نہیں شائع ہو گئیں۔ امید ہے آپ
کا غصہ دور ہوا ہوگا۔

**عقیلہ انجم، لورالائی**

"دوشیزہ" شوق سے پڑھتی ہوں۔ "میرنیم کش" دوبارہ
شروع کر دیجئے۔ میں ایک غزل بھیج رہی ہوں۔ اس میدان میں
نو آموز ہوں۔ حوصلہ افزائی کرنے سے ضرور کچھ لکھنے کے
قابل ہو جاؤں گی۔

یونس جاوید

ایک پاگل لڑکی کی یہ چیخ آپ کے دل میں درد کا طوفان برپا کر دے گی۔

## کشاں طوار

"بکی بی ——— میں اسے روح سے چاہتی تھی۔ میرا پیار سچا تھا اور اس پیار میں ایک بڑی ہی میٹھی سی کسک تھی جیسے ٹھنڈی چاندنی میں کسی کے انتظار کی کوفت میں جلتی ہے۔ ایک دھیمی دھیمی آنچ ——— بالکل سلگتی ہوئی آگ ——— جس کا دھواں ہر اونچی چیز کو سیاہ کر سکتا ہے میں بھی اپنے آپ کو اونچا سمجھ رہی تھی اور اندر ہی اندر اس دھیمی آنچ

کھولی میں جس جگہ میں بیٹھی تھی وہاں سے ان کے چہرے بالکل صاف تو نہیں مگر دکھائی ضرور دیتے تھے انھوں نے سروں پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے اور وہ یوں ہو گئے دکھائی دے رہے تھے جیسے کسی کے قدرت سے منتظر ہوں۔ جھونپڑی کا پھر ایک طرف سرکا تو سامنے کونے میں پڑی ہوئی تینوں بلیں چراغ کی زرد روشنی میں بھی چمک گئیں۔

پھر ایک دم دور سے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ بالکل چوپال کی سیدھ میں کوئی چلا آرہا تھا۔ اس آواز سے وہ چونکے اور جھونپڑی کے اندر ہی کھڑے کھڑے اندھیرے میں گھورنے لگے۔ میں کھولی میں لیٹ گئی کوئی تیکھی تیز گھوڑی تھی۔ سرپٹ دوڑتی ہوئی یوں اچھل کر رکی اگلی ٹانگیں آسمان کو اٹھ گئیں۔ ایک بار الیا کرنے کے بعد وہ پوری طرح قدم بھی جمانے نہ پائی تھی کہ جھونپڑی کا چھپر گر پڑا تینوں آدمی کھو میں بلیں لیے باہر نکل آئے۔

"دیکھو کوئی میرے پیچھے بھاگ رہا ہے تم یہ لڑکی اندر چھپا دو ——— میں نمٹتا ہوں اس سے۔" میرا سب سے چھوٹا چچا کہہ رہا تھا گاؤں کے نمبردار کا چھوٹا بھائی، گاؤں کی بہو بیٹیوں کا محافظ، گاؤں کی عزت کا رکھوالا، امید کا ستارہ۔

تینوں نے بلیں پھینک کر کمبل میں لپٹی لپٹائی چیز یوں تھام لی جیسے گر گئی تو مٹی ہو جانے کی بستی ہوتی کوئی جان دار چیز تھی منہ بندھا ہوا تھا۔ جسے جھونپڑی کے اندر دھکیل کر چھپر پھر سے لٹکا دیا گیا۔ چاروں کے چاروں یوں کھڑے تھے کہ پیچھے آنے والے کو ختم کر کے ہی دم لیں گے۔

دبلا پتلا سا کوئی جوان تھا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا اور قدم اب لڑکھڑا رہے تھے۔ اندھیرے میں بھی میں نے محسوس کیا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور چہرہ انتہائی پریشان ہے اس کی آواز نے کئی بار ابلنے کی کوشش کی مگر پھولے ہوئے سانس نے اسے بے بس کر دیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا جب وہ چاروں کے درمیان آگیا تو یوں کھڑا ہو گیا جیسے سنگسار کیے جانے کے لیے گاڑا گیا ہو۔

اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ ہاتھ پاؤں شل تھے۔ پانچوں کے پانچوں پل بھر تک ساکت اور خاموش رہے۔ جب جھونپڑی سے کسی کی ہچکیوں کی آواز بلند ہوئی تو دبلا پتلا نوجوان تڑپ اٹھا، اس کی گردن تن گئی اور ہاتھوں میں جیسے حرارت آگئی پھر پاؤں جھونپڑی کی طرف بڑھے تو تینوں بلیں اس کی چھاتی سے لپٹ گئیں۔

چچا نے قہقہہ لگا کر جلدی ہی اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

"کدھر جا رہے ہو شہریئے ———" وہ بولا۔

"ادھر ——— جھونپڑی کی طرف، عصمی کی طرف ——— وہ میری بہن عصمی ہے ———"

ایک اور قہقہہ پڑا مگر ذرا آہستہ۔ پھر بھی سنسان جنگل میں کچھ دیر کے لیے جان آگئی۔

"تم مجھے قید کر لو ——— مجھے مار لو ——— اس نے کیا بگاڑا ہے تمہارا ——— وہ امانت ہے ——— میری ماں نے مجھے سونپا تھا مرتے وقت ——— یہ ———" وہ برابر ہکلا کر بول رہا تھا۔

"تم اسے واپس لے جا سکتے ہو ———" شیرو چچا آگے بڑھ کر اس کے قریب آگیا اور اس کے کندھے پر اطمینان سے ہاتھ رکھ کر کچھ دیر اندھیرے میں اس کا جائزہ لیتا رہا۔

"ہمیں صرف ڈیڑھ ہزار چاہیئے ——— ابھی ——— اسی وقت"

شیرو کی جگہ جگا ڈاکو ہوتا تو بات بھی تھی جس کے قصے زمانے بھر میں مشہور تھے مگر یہ تو شیرو چچا تھا۔ جو چوپال کے اونچے کھاٹ پر بیٹھ کر مظلوموں کی فریاد سنا کرتا تھا اور ظالم کے لیے سزائیں تجویز کرنے کا ماہر تھا۔

"اس کے بغیر ———" بھائی نے پوچھا۔

"قتل کر دی جائے گی" شیرو چچا بڑی بے شرمی سے کہہ رہا تھا "صبح سورج نکلنے سے پہلے تمہیں اسی جگہ پہنچ جانا چاہیئے"

یہ تو صرف ایسٹ لکھاؤں گا اور تم صرف۔ کیا کھاؤ گی۔

لگتی جیسے وہ ابھی ان سیڑھیوں کے ذریعے سے برآمد ہوگی۔ اس کی ٹھوڑی ہنستا کر رک جاتے گی۔ وہ آہستہ آہستہ چل کر میرے قریب آجائے گا اور کہے گا "میں تمھیں ٹھہرنے جانے کے لیے آیا ہوں الوی!" ——— اور ———

"مگر وہ نہیں آیا۔ جنوری کی تیس تو آج ہے۔ پورا ایک برس ہوگیا اسے گئے ہوئے۔ بس وہ آتا ہی ہوگا۔ ہے ناں؟" الزبتھ پاگلوں کی طرح میری آنکھوں میں جھانک گئی میری آنکھیں نیند کے خمار سے تقریباً بند ہورہی تھیں۔ شاید میں اب اس سے اجازت لینے کی بجائے زبردستی اٹھ جاتی کہ وہ خود ہی اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور بولی "تو میں چلی نہر والے ڈیرے پر۔ اس کے آنے کا وقت بہت قریب ہے" وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

بادل اتنے گہرے تھے جیسے سیاہ کمبلوں میں لپٹے ہوں رات جھینگر بھاگ کر سناٹے سے ہمکنار تھی کتے رو رو کر سو گئے تھے میں ڈر رہی تھی جیسے الزبتھ پاگل ہو۔ جانے اس نے کیسی کیسی باتیں کی تھیں مجھے تو ایک خواب نظر آرہا تھا لیکن اپنے چچا کے متعلق اس نے جو کچھ کہا تھا سب سچ تھا۔

اس معصوم لڑکی کی لاش اب بھی اسی طرح میری آنکھوں کے سامنے ہے جس کے نچلے ہونٹ کے قریب ایک نیلا تل تھا۔ گردن میں پھندا ڈال کر مرنے سے اس کی گردن لمبی ہوچکی تھی مگر آنکھیں بند تھیں۔ کسی مرے ہوئے چہرے پر میں نے کبھی اتنا سکون نہیں دیکھا ہو

اسے اس بات کا بھی احساس تھا۔

جانے میں کب بیٹھے بیٹھے سو گئی ——— جب میں جاگی۔ تو الزبتھ میرے پاس بیٹھی تھی خاموش، افسردہ، ساکت۔ میں جلدی سے اٹھ بیٹھی۔

"کیوں؟ ——— وہ ——— ؟ ———" میں نے پوچھا۔

"ہاں ———"

"پھر تم گئی نہیں اس کے ساتھ؟"

"ہوں ———" وہ کچھ دیر بعد چونکی ——— "اس نے انکار کردیا لے جانے سے"

"کیوں؟"

"وہ کہہ رہا تھا۔ تمھارے چچا کو قتل کرنے کے بعد میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوچکا ہے۔ میں اب تمھارے چچا کی دوسری تصویر ہوں۔ میرے دل میں کسی کی آرزو نہیں۔ کسی کے لیے جگہ نہیں۔ تم لوٹ جاؤ، لوٹ جاؤ اب تم مجھے اچھی نہیں لگتی ہو"

پھر اس نے چچا شیرو کی لاش پر تھوکا۔ پاؤں سے ٹھوکر لگائی اور گھوڑے پر بیٹھ کر چلا گیا۔

"شیرو چچا قتل ہوگیا ———؟" وہ میرے سوال کو سنا ان سنا کر رہی تھی جواب دینے کی بجائے اس نے دیوانوں کی طرح بھرپور قہقہہ لگایا۔

"ہاں ہاں ——— یقین نہیں آتا تمھیں۔ یہ دیکھو ——— پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے کپڑوں پر بے شمار خون کے دھبے تھے۔

"میں انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی ناں" وہ اطمینان سے بولی۔ اور پستول پھینک کر کھڑی ہوگئی۔ پھر جلدی سے پستول تو اس نے اٹھالیا مگر اس کے ساتھ اپنے ہاتھ سے گرنے والا خون آلود کاغذ اٹھائے بغیر باہر نکل گئی۔

میں نے حواس ٹھیک کئے اور کاغذ اٹھالیا۔ لکھا تھا۔

"مجھے افسوس ہے میں خود نہیں آسکا۔ محض اس لیے کہ میں بزدل ہوں میں نے اپنے برش توڑنے کی بے حد کوشش کی ناکام رہا۔ جو ہاتھ برش نہ توڑ سکیں، تلوار نہیں اٹھا سکتے میں شرمندہ ہوں تمھیں بھی نہ اپنا سکا ..... !" زین

باہر گلی میں الزبتھ کے قہقہوں سے بے ہنگم چیخیں چھوٹ رہی تھیں۔

**رعنا صدف، لاہور**

ج: رعنا! آپ کے چہرے اور جسم پر بال دراصل اسی بیماری کی وجہ سے ہیں جس کا آپ نے خط میں ذکر کیا ہے تا آپ فوراً کسی اچھے ڈاکٹر سے اس کا علاج کرائیں۔ اور ہاں ویکس سے بال ہمیشہ کے لیے دور تو نہیں ہوتے۔ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔ ہر پندرہ بیس روز بعد آپ کو ویکس استعمال کرنا پڑے گی؟ کوئی فرق نہیں پڑتا سے آپ کی کیا مراد ہے؟ اس کے علاوہ چہرے کی سرخی بھی دور ہو جائے گی۔ ڈاکٹر جو ہدایات دے اس پر عمل کیجئے گا۔

**عائشہ علی، پشاور**

ج: بھول بھی ڈائٹنگ سے مراد یہ نہیں کہ آپ بالکل ہی فاقہ کشی شروع کر دیں۔ خدارا یوں نہ کریں ورنہ واقعی حالت خراب ہو جائے گی۔ آپ صرف مرغن غذاؤں سے پرہیز کیا کریں میٹھی اور بادی اشیاء بھی کھانا قطعی طور پر بند کر دیں۔ روزانہ کھلے میدان میں دوڑ لگایا کریں۔ (اور ہمیں خط بھی ذرا صاف لکھا کریں)

**بیگم ثاقب شیخ، لائل پور**

س: میرے سر میں بے تحاشہ خشکی پیدا ہو گئی ہے اسے دور کرنے کا کوئی طریقہ بتائیے!

ج: دہی، سرکہ اور انڈے کی زردی تینوں کو ملا کر سر میں مالش کریں انشاء اللہ خشکی دور ہو جائے گی اور بالوں میں چمک بھی پیدا ہو جائے گی۔

**شمع پروین، کراچی**

س: کچھ عرصے سے میرے منہ سے بدبو نکلنی شروع ہو گئی ہے اور دانتوں سے خون بھی نکلتا ہے۔ کوئی علاج بتائیے!

پھینٹ لیں پھر لیموں کا رس بھی شامل کر کے خوب پھینٹیں تا کہ ہلکی سی ہو جائے۔ اب آہستہ آہستہ کر کے آئسنگ شوگر بھی شامل کریں مگر اس دوران انڈوں کو پھینٹتی رہیں۔ البتہ رو کیں جب سارا آئسنگ شوگر ختم ہو جائے اور انڈوں کی سفیدی سخت ہو جائے تو اسے گریس پروف پیپر سے ڈھانپ دیں۔

## مارزی پین

اجزاء : بادام ایک پونڈ (باریک پسے ہوئے)۔ کسٹر شوگر (CASTER SUGAR) آٹھ اونس۔ آئسنگ شوگر آٹھ اونس۔ انڈے دو عدد۔ ایک عدد لیموں کا رس۔ ونیلا ایسنس آدھا چائے کا چمچ۔

ترکیب : پسے ہوئے بادام کو کسی کھلے منہ کے برتن میں ڈالیں۔ اب کسٹر شوگر اور آئسنگ شوگر بھی اس میں ملا لیں۔ انڈوں کو پھینٹ لیں اور آہستہ آہستہ انڈوں کو اس میں ملا کر گوندھیں۔ جب اچھی طرح تھوڑے سخت سا گوندھ لیں تو خوشبو اور لیموں کا رس بھی ملا لیں۔ پھر پانچ منٹ بعد اسے رولی کی شکل میں بیل لیں۔

⊗

گلیس آئسنگ :۔ آئسنگ شوگر آٹھ اونس۔ گرم پانی ۲۔۳ کھانے کے چمچے ــــــ آئسنگ شوگر کو چھان کر گرم پانی کے ہمراہ ایک منٹ تک چولہے پر پکا لیں۔

لیمن گلیس آئسنگ :۔ ترکیب بالکل پہلے جیسی ہے صرف پانی کی جگہ لیموں شامل کر لیں۔

اورنج گلیس آئسنگ :۔ آئسنگ شوگر کو چھان کر اورنج جوس کے ہمراہ ایک منٹ تک چولہے پر پکائیں۔ ایک قطرہ زردے کا رنگ بھی شامل کر لیں۔

چوکلیٹ آئسنگ : چار اونس چوکلیٹ کو پگھلا لیں پھر اس میں آٹھ اونس آئسنگ شوگر شامل کریں۔ ایک کھانے کا چمچہ آئسنگ شوگر شامل کریں ایک کھانے کا چمچہ گلاب کا عرق بھی شامل کریں۔ پھر اسے خوب پھینٹیں۔

بٹر آئسنگ :۔ چار اونس مکھن۔ آٹھ اونس آئسنگ شوگر۔ ایک کھانے کا چمچہ دودھ

مکھن کو خوب پھینٹیں، پھر اس میں آئسنگ شوگر بھی شامل کریں۔ اب اتنا پھینٹیں کہ یہ سفید اور جھاگ دار سا ہو جائے پھر اس میں دودھ شامل کر لیں۔

چوکلیٹ بٹر۔ سب سے پہلے بتائے گئے طریقے سے مکھن اور آئسنگ شوگر کو پھینٹ لیں پھر کوکو (COCOA) کو گرم پانی میں ملا لیں۔ کوکو ایک کھانے کا چمچہ لیں۔ پھر اس مرکب کو مکھن اور آئسنگ شوگر میں پھینٹ لیں۔

کافی بٹر آئسنگ :۔ ایک کھانے کا چمچہ کافی لیں اور ایک چمچہ پانی میں گھول لیں۔ پھر یہ مرکب پھینٹے ہوئے مکھن اور آئسنگ شوگر میں شامل کریں۔

لیمن بٹر آئسنگ :۔ ترکیب وہی ہے صرف پانی کی جگہ لیموں استعمال کریں۔

اورنج بٹر آئسنگ :۔ ترکیب بالکل وہی ہے صرف پانی کی جگہ اورنج جوس ملائیں اور ایک قطرہ زردے کا رنگ شامل کریں۔

## آئسنگ بیگ بنانے کی ترکیب

ایک دس انچ لمبا دس انچ چوڑا گریس پیپر لیں۔ اسے دوہرا کریں۔ دیکھئے تصویر۔ اب "A" سرے کو "C" کے ساتھ ملائیں اور "B" کو "C" کے پیچھے لے جائیں اور ملا دیں۔ پھر تمام سروں کو موڑ دیں تاکہ بیگ کھلنے نہ پائے۔ آپ کا آئسنگ بیگ تیار ہے۔

586637
United Bank Limited

No. POA 586637

United Bank Limited

Rs. 40000/-

اعلان کے مطابق ۸ ستمبر کو دفتر دوشیزہ میں بے شمار شائقین معمہ کی موجودگی میں یونائیٹڈ بینک کی طرف سے جاری کیا گیا چالیس ہزار روپے کا پے آرڈر امیر بیگم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو وہ مارے خوشی کے اچھل پڑیں اور بولیں:

"دوشیزہ' ادبی معموں کی دیانتداری کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ انعام کی رقم یونائیٹڈ بینک کے PAY ORDER کے ذریعے ادا کیے جا رہے ہیں۔ آج تک کسی اور ادارہ نے بینک ڈرافٹ یا پے آرڈر کے ذریعے انعامات نہیں دیئے۔"

پاکستان بھر میں دوشیزہ ادبی معمے عظیم معمے ہیں

ماہنامہ • دوشیزہ * پوسٹ بکس ۸۰۹۵ کراچی

# دوشیزہ ادبی معمے ۲ پہلا انعام 50 000 روپے

## تاریخ میں پہلی مرتبہ کی گئی انعامی رقم میں اضافہ

# 54,000 کی بجائے 77,000 روپے

## کی شاندار تقسیم

[illegible]

## پہلا انعام 31,000 کی بجائے 50,000 روپے ادا کیے گئے

### صحیح حل دوشیزہ ادبی معمے نمبر ۲

| شمار | صحیح حل | کتاب یا رسالہ | مصنف یا مترجم | صفحہ |
|---|---|---|---|---|
| ۱ | باپ | سرگزشت ناتمام | شائستہ سہروردی | ۱۲۶ |
| ۲ | غنیمت | غبارے | ممتاز مفتی | ۱۸۲ |
| ۳ | سلوک | وحدت اسلامی | مولانا ابوالاعلیٰ مودودی | ۹۳ |
| ۴ | سفر | ذکر یار چلے | مرزا ظفر الحسن | ۱۰۶ |
| ۵ | آئینے | تذکرہ صوفیائے سندھ | اعجاز الحق قدوسی | ۳۱۱ |
| ۶ | قتل | امراؤ جان ادا | مرزا ہادی رسوا | ۱۲۰ |
| ۷ | برسی | پاکستانی مسلمانوں کے رسم و رواج | شاہ حسین رزاقی | ۲۳۸ |
| ۸ | معلوم | غبارے | ممتاز مفتی | ۲۳۰ |
| ۹ | شمشیر دار | ذکر یار چلے | مرزا ظفر الحسن | ۲۶۹ |

### انعام کی ادائیگی

۶ اکتوبر ۸۵ء کو شام کے ۶ بجے دفتر دوشیزہ میں بنک ڈرافٹ کے ذریعہ کی جائیگی

دوسرا انعام، ۱۲،۵۰۰ کی بجائے ۱۵،۰۰۰ روپے

تیسرا انعام، ۱۰،۵۰۰ کی بجائے ۱۲،۰۰۰ روپے

ایک غلطی پر — ۱۴۵ روپے ۶۳ پیسے فی کس

دو غلطیوں پر — ۳۱ روپے ۴۲ پیسے فی کس

ایک اور دو غلطیوں کے انعامات ارسال کر دیئے گئے

**ریشماں خالق صاحبہ ۲۹۵ دہلی مرکنٹائل کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی بلاک ۳ حیدر علی روڈ کراچی نے بالکل درست حل بھیج کر پہلا انعام ۵۰،۰۰۰ روپے حاصل کیا**

# انعامی رقم ۹۰،۰۰۰ سے تجاوز کر گئی ہے

**ساٹھ ہزار روپے کے انعامات 60,000:**

۳۶ ہزار روپے

**دوسرا انعام: ایک غلطی والے حل پر تیرہ ہزار روپے — تیسرا انعام: دو غلطی والے حل پر گیارہ ہزار روپے**

فیس داخلہ فی حل ایک روپیہ ایک نام اور ایک کوپن کے ساتھ دو روپے پچاس پیسے میں تین حل کے بھیجے جا سکتے ہیں۔ اس حساب سے جتنے چاہے حل بھیج سکتے ہیں۔ دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۵ کے لیے تمام حلوں کے ساتھ ایک کوپن دوشیزہ ادبی معمہ ۵ ضرور بھیجئے جو ماہنامہ دوشیزہ سے کاٹا گیا ہو۔ مفصل شرائط اور ہدایات کی پابندی لازمی ہے جو ماہنامہ دوشیزہ کراچی میں شائع ہوتی ہیں۔ ایک شخص الگ الگ کوپنوں پر الگ الگ انعام حاصل کر سکتا ہے۔

---

دفتر ماہنامہ دوشیزہ ۹۰۰ سی سنٹرل کمرشل ایریا اقبال روڈ پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ میں دستی حل وصول کرنے کی آخری تاریخ ۱۰ اکتوبر دن کے بجے تک اور ڈاک سے ۱۰ اکتوبر

---

## دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۵

| نمبر | اشارے | ممکن الفاظ | | | حل نمبر.... | حل نمبر.... | حل نمبر.... |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | وہ اپنی ——— کے اس بھیانک انجام کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا۔ | زندگی | محبت | شادی | | | |
| ۲ | دنیا کا کون سا کونا ہے جس میں یہ ——— خانہ خراب نہیں پہنچے۔ | سی آئی اے | فرنگی | ہپی | | | |
| ۳ | ——— سازی میں کسی کا کوئی ثانی نہیں۔ | ظروف | برتن | جلد | | | |
| ۴ | میں ہی آپ کی ——— ہوں۔ | بیٹی | بیوی | بلی | | | |
| ۵ | آنکھوں سے ایک سی ——— جھلکتی ہے۔ | مایوسی | اداسی | وحشت | | | |
| ۶ | اس ——— کی سرخی کو دھونے کے لیے تھوڑا سا پانی کافی ہوگا۔ | قتل | فعل | زخم | | | |
| ۷ | ناکام جئے اور ناکام مرے، یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا ——— ہے۔ | کارنامہ | المیہ | حادثہ | | | |
| ۸ | اُن کی حقیقتیں ہم پر ——— ہی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ | خواب | بیداری | مباحثہ | | | |
| ۹ | محبت ایک ——— ہے۔ | فن | سچائی | روگ | | | |

نام اور مکمل پتہ ———————— دستخط ————————

**دو ڈاک سے اپنے حل اور فیس اس پتے پر بھیجئے: دوشیزہ ادبی معمہ ۵** ماہنامہ دوشیزہ پوسٹ بکس ۸۰۹۵-کراچی ۲۹

---

دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۵ کا صحیح حل ۱۱ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو ایک بجے دن دفتر دوشیزہ پر مطبوعہ کتابوں کے مکمل حوالوں کے ساتھ آویزاں کر دیا جائے گا۔ اور ۱۲ اکتوبر کو صحیح حل امن، مشرق کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ میں شائع ہوگا۔ انعام یافتگان کی مکمل فہرست نومبر ۱۹۷۵ء کے "دوشیزہ" میں ملاحظہ کیجئے!

سنگر کی نئی
میمو میٹک
پنچ کارڈ نٹر — خودکار نقوش بنانے والی مشین
سنگر
S

# دوشیزہ

جلد ۵

شمارہ ۵، ۱۲

اداریہ

رخسانہ سحام مرزا

# تنہا سپاہی

نجی محفلوں میں آج کل موجودہ صحافت کو بڑی شدت کے ساتھ ہدفِ ملامت بنایا جا رہا ہے ۔ کہا یہ جاتا ہے کہ صحافیوں کو اپنے قلم کی آبرو کا پاس ہے نہ ناموسِ قلم کے تحفظ کا احساس! ایک بھری محفل میں ایک جواں سال لڑکی نے اپنے اجنبی دوست کے کاندھے کا سہارا لیتے ہوئے خمار آلود لہجے میں کہا "جہاں قلم کی وہ شمشیرگی کا دعویٰ مشکوک ہو تو آپ ہم سے کس چیز کی توقع رکھتی ہیں ۔ صحافت تو مولانا ظفر علی خاں کے بعد اُٹھ گئی ۔" اگر صحافت مولانا ظفر علی خاں کے بعد اُٹھ گئی تو مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اب قوم بھی وہ قوم نہیں رہی جو مولانا ظفر علی خاں کے زمانے میں تھی ۔ کیا اس سے کوئی انکار کر سکتا ہے کہ جب مولانا ظفر علی خاں سے دس ہزار کی ضمانت طلب کی جاتی تھی تو قوم راتوں رات ٹکوں کا ڈھیر نہیں لگا دیتی تھی ۔۔ ؟ آج اگر کسی صحافی سے ایک لاکھ کی ضمانت طلب کی جائے تو قوم دس ہزار بھی دینے کے لیے تیار ہے ۔ ؟ ؟ پھر موجودہ صحافیوں کے قلم سے "شیلنگ" کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے ۔ صحافی اور سپاہی کی قدرِ مشترک یہ ہے کہ اندھیرے اجالے، آندھی، بارش، سردی اور گرمی میں سرحدوں کی چوکسی کرنے والے سپاہی یا قوموں کی بنیادوں کو مضبوط کرنے والے صحافی کو ہر آن یہ احساس رہتا ہے کہ اس کی پشت پر ناقابلِ تسخیر لشکر کھڑا ہوا ہے ۔ کبھی دشمنوں کو تہ تیغ کرنے والے سپاہی کے پیچھے سے فوجِ ظفر موج ہٹا کر دیکھئے آگ اُگلنے والے دہانے کس طرح سرد ہو جاتے ہیں ۔ یہی تو وہ احساس ہے جس کے بل بوتے پر صحافی زندہ رہتا ہے، اگر قوم اس سے یہ احساس چھین لے تو آپ ہی بتائیے مولانا ظفر علی دوبارہ کیسے پیدا ہو سکتے ہیں ۔ صحافی کے ہاتھ میں وہی قلم ہے ۔۔ قلم کی وہی کاٹ ہے، وہی دھار ہے ۔۔ قصور صحافی کا نہیں، قوم کا ہے ۔۔ اعتراض کرنے والی خاتون نے یہ محسوس نہیں کیا کہ خود اس کا رویہ کتنا قابلِ اعتراض تھا، اس لیے میں کہتی ہوں وہ قومیں اوجِ ثریا پر نہیں پہنچ سکتیں جو ذاتی احتساب سے کنارہ کشی کرتی ہیں ۔ ہماری قومی زندگی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم ہمیشہ دوسروں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں ۔ لیکن اپنی ذات کو ہر احتساب سے بالاتر سمجھتے ہیں ۔ مایوسیوں کے دلدل میں پھنسی ہوئی قومیں اسی وقت اُبھرتی ہیں جب ذاتی احتساب عام ہو ۔ بدترین جنگ اور ایٹم بم بھی ان قوموں کو سرنگوں نہیں کر سکا جو ذاتی اور انفرادی احتساب پر ایمان رکھتی تھیں ۔ جس طرح تنہا فوجی سرحدوں کی حفاظت نہیں کر سکتا، قلم کا اکیلا سپاہی بھی اپنے فرائض میں پورا نہیں اُتر سکتا ۔

ہمارے ملک میں زندگی کے ہر شعبے میں دو باتوں کا عام رواج ہے ۔ دوسروں پر اعتراضات کی عادت اور ماضی فراموشی ۔۔ ہم اُن لوگوں کو بھی نہیں بخشتے ہیں جنھوں نے ہمیں مایوسیوں کے دلدل سے نکالا، ہمارے چہرے چمکائے، ہماری مرہم پٹی کی ۔۔ اعتراضات کی بوچھاڑ سے پہلے ہمیں صرف یہ سوچنا چاہئے ۔

سپاہی کو ہم نے تنہا تو نہیں چھوڑ دیا ۔۔۔۔ ؟<br>
چاہے وہ سرحد کا محافظ ہو ۔۔۔۔<br>
قلم کا دھنی ہو ۔۔ یا ۔۔۔۔<br>
وطنِ عزیز کا رہتا ہو ۔۔۔۔

منورہ نوری

شام کا وقت تھا سورج کائنات پر اپنی آخری کرنیں نثار کر رہا تھا جس کے سبب بلند و بالا درخت اور اونچی اونچی عمارات پر دھوپ کا طمع سا نظر آ رہا تھا۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان کے کلعہ نما مکان کے دروازہ پر ہجوم سا لگا دیتا تھا بادی النظر میں کسی تقریب کا گمان ہوتا تھا مگر دراصل آج مروان بن حکم کا پوتا۔ عبدالعزیز بن مروان کا بیٹا اور عبدالملک بن مروان کا عزیز بھتیجا اموی شہزادوں میں سب سے زیادہ خوبرو با اخلاق حلیم الطبع دولت مند اور نفیس مزاج شہزادہ عمر آنے والا تھا۔ مہمان کی آمد کی حیثیت میزبان کی بیقراری سے ہی عیاں تھی۔ ایک طرف کنیز و خدام مصروف کار اپنی کارکردگی کے اظہار کے لیے ادھر سے اُدھر پھر رہے تھے تو دوسری طرف آج خلاف معمول خلیفہ عبدالملک اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا شہزادہ عمر کو سر شام پہنچنا تھا اور اب شام ڈھل رہی تھی سورج غروب ہونے کے قریب تھا عبدالملک منتظر تھا مگر ہر مرتبہ یہی اطلاع مل رہی تھی کہ شہزادے کی سواری ابھی نہیں پہنچی جس کے بعد اس نے اپنے خاص ملازم مہران کو بھیجا تھا کہ صورت حال معلوم کرے اس وقت یہ مدبر خلیفہ جس نے بنی امیہ کے مردہ قالب میں رُوح پھونک کر اسے دوبارہ زندہ کیا تھا جس نے اپنے عزم و استقلال اور شجاعت سے حکومت کو اس وقت صحت مند اور طاقتور بنایا تھا جب معاویہ بن یزید کی دستبرداری کے بعد وہ آخری سانسیں لے رہی تھی اور جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اگر مسندِ حکومت پر نہ آتا تو مسندِ علم کی زینت بنتا۔ وہ اس وقت اپنی فطرت کے خلاف تفکرات میں الجھا، سوچوں میں ڈوبا نظر آ رہا تھا نجانے یہ انتظار کی کیفیت تھی یا ماضی کی یاد، مگر وہ تصورات کے بحر بیکراں میں غرق کسی اور ہی دنیا میں نظر آ رہا تھا۔

والی مصر عبدالعزیز بن مروان اس کا سوتیلا بھائی اسے بے حد عزیز تھا۔ عبدالملک جتنا اپنے باپ مروان سے مشابہت رکھتا تھا عبدالعزیز خصائل و عادات میں اتنے ہی مختلف تھے پھر عمر بن خطاب کی پوتی ام عاصم سے شادی کر کے تو وہ حقیقت میں فاروق اعظم کے خاندان کے فرد بن گئے تھے اور یہی عادات و اطوار ان کے بیٹے شہزادہ عمر میں منتقل ہو گئے تھے۔ وہ بنی امیہ کے خاندان سے تھے مگر پہلی بار دیکھنے والا انہیں ابوبکر صدیق یا عمر فاروق کی اولاد بتاتا اس بات پر عبدالعزیز فخر کرتے تھے۔ شہزادہ عمر کی پیدائش اور نشوونما مدینہ میں ہوئی وہ بارہ سال کی عمر تک اپنی ماں اور ان کے چچا عبداللہ بن عمر فاروق کی نگرانی میں رہے اس کے بعد عبدالعزیز مصر کے حاکم بنا دیئے گئے تو ام عاصم مصر تشریف لے گئیں مگر شہزادہ عمر عبداللہ بن عمر کے پاس ہی رہے جنہوں نے ان کی تربیت کی اس دوران عبدالملک خفیہ طور پر

ان کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے عبدالعزیز جب حج کے لیے آتے تو شہزادہ عمر اور ان کے اساتذہ سے ملتے مگر عبدالملک معتبر ذرائع سے ان کی تعلیم و تربیت کے بارے میں اطلاعات حاصل کرتے رہے اور انہیں ایک ہزار دینار ماہانہ وظیفہ دیتے رہے اتنا بڑا روزینہ کسی اموی شہزادے کو نصیب نہ ہوا تھا حتیٰ کہ عبدالملک کے اپنے بیٹے بھی اس سے محروم تھے۔ عام خیال یہی تھا کہ عبدالملک کو اپنے اس بھتیجے اور شہزادہ عمر کو اپنے تایا جان سے غیر معمولی لگاؤ ہے۔ تعلیم و تربیت سے فارغ ہونے کے بعد شہزادہ دمشق اور پھر اپنے باپ کے پاس مصر چلے گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب عبدالملک اور عبدالعزیز میں ولایت عہد کے متعلق نزاع چل رہا تھا۔ عبدالملک کی خواہش تھی کہ عبدالعزیز اس کے بیٹے ولید کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔ اور عبدالعزیز اس کے لیے تیار نہ تھے یہی چیز دونوں بھائیوں میں کشیدگی کا باعث بن گئی تھی عبدالعزیز اپنے بیٹے شہزادہ عمر کے لیے وہی چاہتے تھے جو عبدالملک ولید کے لیے پسند کرتا تھا اس بات نے عبدالملک کو تشدد پر آمادہ کر دیا۔ پہلے وہ دونوں معمولی خط و کتابت کرتے رہے پھر عبدالملک نے اپنا صحیح حق استعمال کیا اور ایک خلیفہ ہونے کی حیثیت سے عبدالعزیز سے مصر کا خراج طلب کیا جو انہوں نے آج تک ادا نہ کیا تھا انہوں نے بیس برس ایک حاکم کی حیثیت سے مصر پر حکومت کی تھی مگر نہ آمدنی کی ایک پائی خلیفہ کو بھیجی تھی نہ حساب لہٰذا یہ خط وصول کر کے انہوں نے عبدالملک کو جواب لکھا کہ بھائی جان، ہم دونوں عمر کے اس حصے میں پہنچ گئے ہیں جو ہمارے خاندان کے کسی فرد کو نصیب نہیں ہوا اس لیے ان معمولی معمولی باتوں پر آپ مجھ پر عتاب نازل نہ فرمائیں کیونکہ ہمیں نہیں معلوم کہ کب ہمارا وقت آ جائے۔ یہ خط پڑھ کر عبدالملک بڑا متاثر ہوا لیکن ابھی وہ کوئی جواب نہ دینے پایا تھا کہ عبدالعزیز کی موت کی اطلاع ملی جس نے اسے بے تاب کر دیا اسے یاد آیا کہ وہ ایک باپ اور دو ماؤں کے بیٹے ایک دوسرے کے لیے مخلص بھائی تھے ان دونوں نے علم و فن حکومت و سیاست میں یکساں جدوجہد کی تھی لہٰذا ان سے حساب طلب کرنا غلطی تھی عبدالملک کو اپنی زیادتی کا احساس ہوا تو وہ بھائی کی خوبیوں کو یاد کر کے دیر تک روتا رہا اس کا دل چاہا کہ اپنے بھائی کو دیکھے اس سے ملے مگر وہ اس پر قادر نہ تھا البتہ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس نے شہزادہ عمر کو اپنے ساتھ رہنے کی دعوت دی تھی وہ مرحوم بھائی کی اس نشانی کو بھینچ کر پیار کرنا چاہتا تھا۔ خدا جانے یہ واقعی محبت تھی یا وہ شہزادہ عمر سے مصر کی حکومت بچانی چاہتا تھا۔ مصر کی ولایت اپنے بیٹے عبداللہ کو سونپ کر شہزادہ عمر کو فوراً دمشق طلب کیا گیا تھا۔ آج ان کی آمد کا دن تھا۔ عبدالملک تصورات میں گم تھا کہ مہران حاضر خدمت ہوا اور بولا "امیرالمومنین! شہزادے کی سواری پہنچ چکی ہے" خلیفہ نے اسے کچھ اس انداز میں دیکھا جیسے اس کی بات تو سن لی ہو مگر مفہوم سمجھنے سے قاصر ہو شاید عہد رفتہ کی یاد کا جال ابھی ٹوٹا نہ تھا یہ دیکھ کر مہران نے وضاحت کی۔

"عالیجاب! شہزادہ عمر تشریف لے آئے ہیں ان کی سواری قصر کے بالکل پاس پہنچ چکی ہے اور شہزادہ ولید اور شہزادہ سلیمان بنفس نفیس ان کے استقبال کو پہنچ چکے ہیں"

اب تک عبدالملک پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا وہ بے تابانہ میں اپنے کمرے سے نکلا دیکھنے والے محو حیرت تھے کہ خلاف معمول آج خلیفہ ایک مہمان کو خوش آمدید کہنے کے لیے خود آگے بڑھا ہے مگر عبدالملک کو کسی کی پرواہ نہ تھی وہ اپنے بیٹوں کے درمیان آتے ہوئے شہزادہ عمر کو دیکھ رہا تھا جو حسن و وجاہت کا مکمل نمونہ اور مردانہ جمال کا شاہکار تھے ان کی کشادہ جبیں علم و دانش سے روشن، گہری گہری پرکشش آنکھیں ذہانت شائستگی و اخلاق سے چمک رہی تھیں ان کے خوبصورت بال کشادہ پیشانی کو چوم رہے تھے اور تابناک چہرہ شام کی سرخی سے کچھ اور جاذب نظر معلوم ہو رہا تھا ان کا لباس قیمتی و حد درجہ نفیس تھا تمام شہزادے اس پیکر وجاہت اور آن بان کو بچشم حیرت دیکھ رہے تھے یہاں سب کے چچیرے بھائی اور اموی شہزادوں میں ایک خاص حیثیت رکھنے والے شہزادہ عمر تھے۔ جن کے بارے میں مشہور تھا کہ جو لباس ایک بار زیب تن کرتے ہیں دوبارہ پہننا پسند نہیں کرتے اور ان کے ہر لباس کی قیمت اتنی ہوتی جتنی تمام اموی شہزادوں کا ماہانہ روزینہ شہزادہ عمر کی چال میں بے نیازی تھی بڑائی کا احساس تھا چوڑے سینے اور اٹھے ہوئے شانے خود کو سب سے بہتر تصور کرنے کی غمازی کر رہے تھے وہ ایک پُر وقار چال کے ساتھ عبدالملک کی طرف آ رہے تھے ان کے چمکدار قیمتی اور ریشمین لباس کی خوشبو سے راستہ مہک رہا تھا دیکھنے والے اس حسن و جمال کو دیکھتے اور نظریں جھکا لیتے غلام جھک جھک کر سلام کر رہے تھے مگر عبدالملک چند قدم چل کر ٹھٹک کر رہ گیا۔ شہزادہ عمر کی چال میں لغزش تھی۔ وہ نمایاں طور پر لنگڑا کر چل رہے تھے وہ اپنی جگہ رک کر چند ساعت انہیں دیکھتا رہا شاید مرحوم بھائی کی یاد تھی کہ اس کی آنکھوں میں اشک چھلک آئے جنہیں اس نے بدقت تمام روکا اور جونہی شہزادہ عمر قریب پہنچے عبدالملک نے بے تابانہ بانہیں پھیلا دیں اور انہیں یوں سینے سے لگا لیا جیسے وہ کوئی قیمتی شے ہوں اور وہ اس نادر چیز کو دنیا کی نظروں سے چھپا لینا چاہتا ہو ان دونوں کا بغل گیر ہونا بے پناہ محبت کی غمازی کر رہا تھا۔ چند ساعت بعد عبدالملک نے انہیں خود سے الگ کیا اور پوچھا۔

"عمر جان! تمہاری چال میں لغزش کیسی ہے؟"

”ہمیں زخم پہنچا ہے تایا جان“ شہزادہ عمر نے ادب سے جواب دیا۔
”کہاں پر؟“ عبدالملک نے استفسار کیا۔
”شانے کے مابین جوڑ میں“ شہزادہ عمر نے انکساری کے ساتھ جواب دیا۔
”یہ زخم کیسے پہنچا؟“ عبدالملک نے پوچھا۔
”ہم گھوڑے سے گر گئے تھے اس کے بعد علاج ہوا زخم ٹھیک ہو گیا مگر چال ٹھیک نہ ہو سکی“ یہ سن کر عبدالملک بہت خوش ہوا اور جب تنہائی میں ولید نے پوچھا۔
”بابا جان! آپ عمر کی تکلیف کے بارے میں جان کر مسرور کیوں ہوئے تھے“ تو اس نے جواب دیا۔
”کیا تم نے وہ پیش گوئی نہیں سنی کہ بنی امیہ کا سب سے عادل خلیفہ وہ ہوگا جس کا جسم عیب دار ہوگا جب وہ حکومت کرے گا تو دنیا عدل سے بھر جائے گی ہمیں خوشی ہے کہ اگر عمر وہی شخص ہے تو بڑا مبارک ہے“
صبح کا وقت تھا نسیم سحری کے خوشگوار جھونکے جسمانی و روحانی فرحت عطا کر رہے تھے۔ چاند شب بھر اطراف عالم میں نور کی بارش کرنے کے بعد اب ردائے نور سمیٹ رہا تھا۔ ستارے ذرد یدہ نگاہوں سے دنیا کو دیکھتے ہوئے تیزی سے رخصت ہو رہے تھے اور طائران خوشنوا اونچے اونچے درختوں کی شاخوں پر بیٹھے نغمہ سنجی کر رہے تھے ایسے میں شہزادہ عمر تلاوت کلام پاک سے فارغ ہو کر قصر کے عقبی باغیچہ میں چہل قدمی کر رہے تھے وہ زیر لب آیات قرآنی کا ورد کرتے ہوئے اس سہانے وقت کا لطف لے رہے تھے یا نیند کے خمار کو توڑ کر اس آرام کے وقت میں چمن میں آ کر قدرت کی فیاضی اور فطرت کے بے مثل حسن پر عملی داد دے رہے تھے۔
صبح ابھی پوری طرح نہ ہوئی تھی مگر چاند اور ستاروں کی مدھم مدھم روشنی میں قرب و جوار کی چیزیں نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں شہزادہ عمر خیالات میں مگن، تصورات میں کھوئے ہوئے گرد و پیش سے بے خبر آہستہ خرامی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ گلہائے رنگا رنگ ہر طرف بکھرے ہوئے تھے جن کی مہک انہیں بے خود کیے دے رہی تھی کہ اچانک ایک موڑ پر پہنچ کر وہ ٹھٹک گئے چند قدم کے فاصلے پر ایک نو عمر لڑکی پھولوں کا ڈھیر سمیٹ رہی تھی غالباً اس نے یہ تمام پھول توڑ توڑ کر یہاں جمع کیے تھے جنہیں اب اٹھا رہی تھی چودہ سالہ لڑکی کے انداز میں بے پناہ حسن معصومیت اور بے ساختگی تھی اور رنگین کپڑوں میں وہ خود بہار کا ایک جزو معلوم ہو رہی تھی۔ شہزادہ عمر رک کر اسے دیکھنے لگے چند منٹ یوں ہی گزر گئے وہ بغیر کسی جذبے کے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتے رہے پھولوں کو سمیٹ کر وہ سیدھی ہوئی تو ان کی نظریں اس کے چہرے پر پڑیں۔ چہرہ کیا تھا آفتاب نیم روز تھا جسے شاید اس کے بکھرے ہوئے گیسوؤں نے چھپا کر دیکھنے والوں کی نظر بد سے بچانے کی کوشش کی تھی مگر ان کی

یہ کاوش ناکام اس کے حسن میں مزید اضافہ کا سبب بن گئی تھی بلاشبہ وہ اتنی حسین تھی کہ انہیں محسوس ہوا کہ آفتاب کی روشنی ہر جانب سے سمٹ کر چمن کے اس گوشے میں لگ گئی ہے ان کی بیس سالہ زندگی میں کسی نے آج تک انہیں اتنا بے خود نہ کیا تھا وہ ہوش و خرد سے بیگانہ کھڑے تھے کہ اچانک لڑکی نے انہیں دیکھا تب انہوں نے محسوس کیا کہ اس کا چہرہ جتنا معصوم ہے آنکھیں اتنی ہی شریر ہیں شوخی و معصومیت کے اس امتزاج نے انہیں چونکا دیا لڑکی نے انہیں جھک کر سلام کیا اور پلٹ کر جانے لگی تو انہیں جیسے ہوش آ گیا ہو۔
”لڑکی! تمہارا نام کیا ہے؟“
اس سوال پر اس نے پلٹ کر انہیں دیکھا اس کے یاقوتی لب وا ہوئے اور بولی۔
”شہزادے! آپ کو میرے نام سے کیا غرض بس اتنا جان لیجئے کہ میں ایک کنیز ہوں“
اس بے ساختہ جواب پر عمر متعجب سے رہ گئے انہوں نے بے شمار کنیزیں دیکھی تھیں مگر ایسی کنیز ان کی نظر سے آج تک نہ گزری تھی جو شخصیت گفتگو اور ذہانت کے لحاظ سے کسی طرح بھی کنیز کہلانے کی مستحق نہ تھی۔
انہوں نے پھر کہا۔
”ہم نے تمہارا نام پوچھا ہے؟“
”شہزادے! کنیز صرف کنیز ہوتی ہے۔ یوں آپ مجھے گل کہہ دیجئے خار کہہ دیجئے تاریکی کہئے یا روشنی۔ آپ کا جو دل چاہے نام دے دیجئے مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا“ شہزادہ عمر اس جواب پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔
”یہ پھول کیوں سمیٹ رہی ہو؟“
”شہزادی صاحبہ کے گجروں کے لیے“ لڑکی نے تیکھے انداز میں جواب دیا اور جلدی جب تک وہ نظر آتی رہی شہزادہ عمر لاشعوری طور پر ادھر ہی دیکھتے رہے شاید وہ سوچ رہے تھے کہ حسن میں اگر شوخی ہو تو وہ ایسے شعلہ سے کم نہیں جو پہلی نظر میں ہی جلا کر خاک کر دے وہ سوچوں میں گم تھے
شہسوار مشرق کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا، چاند نے اپنی ردا سمیٹی ستارے اپنی محفل برخاست کر گئے، ہوا کے خوشگوار جھونکوں میں آفتاب کی حدت رچ گئی، گلہائے رنگیں پر پھیلے ہوئے شبنم کے موتی خورشید کی حدت سے فنا ہونے لگے اور سورج کی کرنیں عالم کو منور کرنے لگیں مگر شہزادہ عمر کو وقت کا احساس نہ ہوا وہ غیر ارادی طور پر بار بار اسی طرف دیکھ رہے تھے جدھر کنیز گئی تھی کہ اچانک مہران کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔
”جناب! امیر المومنین ناشتہ پر آپ کا انتظار فرما رہے ہیں“
”اچھا“ شہزادہ عمر چونک گئے انہیں اپنی بے خودی پر پشیمانی کا سا احساس ہوا شاید انہوں نے اپنے جذبات کی پردہ پوشی کے لئے گہرا سانس

لیلاو دمشق کے اس حصے کی طرف روانہ ہو گئے جہاں عبدالملک اور شاہی خاندان کے دیگر افراد ان کے منتظر تھے خلیفہ کے بائیں جانب قریب ترین جگہ ان کے لئے خالی تھی وہ سب کو سلام کرتے ہوئے اپنی جگہ پر بیٹھ گئے محفل ان کے معطر لباس سے مہک گئی سب انہیں دیکھ رہے تھے مگر وہ پھر اپنے خیالوں میں الجھنے لگے تایا جان کے پہلو میں بیٹھے ہوئے بھی وہ چمن کے اسی گوشے میں کھڑے تھے جہاں ایک ادنیٰ کنیز نے انہیں متاثر کر دیا تھا۔ وہ محو تصور تھے کہ عبدالملک کی آواز نے انہیں جھنجوڑ دیا۔

"جان عم! تم کس خیال میں ہو؟"

شہزادہ عمر نے چونک کر دیکھا اور خجل سے ہو گئے۔ ولید، سلیمان، ہشام اور یزید سب انہیں دیکھ رہے تھے کچھ نگاہوں میں رشک تھا کچھ میں عقیدت و احترام اور ان کے بالکل سامنے شہزادی فاطمہ براجمان تھیں جن کے دونوں ہاتھوں میں اس کنیز کے چنے ہوئے پھولوں کے گجرے تھے چند برس ادھر کی بات تھی جب مصر جانے سے قبل شہزادہ عمر دمشق آئے تھے تو فاطمہ ایک شوخ و شریر اور لاابالی لڑکی تھی مگر آج وہ ایک خوبصورت دوشیزہ کا روپ دھار چکی تھی شہزادی کا لباس نفیس تھا اور انداز نشست میں بھی بڑی تمکنت تھی۔ وہ انہی کی طرف متوجہ تھیں، شہزادے نے ان کے سلام کا جواب دیا اور شائستگی سے باتوں میں مشغول ہو گئے۔ عبدالملک نے ایک پیالہ اٹھا کر انہیں دیا اور بولا۔

"عمر! ہم نے تمہارے لیے لبنان سے شہد منگایا ہے۔"

شہزادہ عمر اب پوری طرح ہوش میں آ چکے تھے انہوں نے پیالہ لیتے ہوئے چچا کا شکریہ ادا کیا اور پیالے سے تھوڑا سا شہد لے کر کھانے لگے اس دوران عبدالملک اور ولید ان سے مصر کے حالات پوچھتے رہے اور وہ جواب دیتے رہے سب توجہ سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ یہ باتیں قیام مصر کے بارے میں بھی تھیں اپنے اتالیق عبیداللہ بن عتبہ کی بھی تھیں۔ فقہ و حدیث، مذہب و سیاست کی بھی تھیں غرضیکہ انہوں نے قلیل عرصہ میں ہر موضوع پر بات کی۔ عبدالملک بڑی محبت سے یہ باتیں سن رہا تھا اس کم عمری میں بھتیجے کا اتنا علم اس کے لیے وجہ افتخار تھا۔ سب کی آنکھوں میں ستائش و اعتراف تھا وہ سب یوں خاموش تھے جیسے بزبان سکوت شہزادہ عمر کے علم و دانش اور خیالات کی تائید کر رہے ہوں۔ اموی خاندان کے لیے باعث فخر اور وجہ عزت تھے وہ سوچ رہے تھے۔ یہ نوجوان نہ صرف ظاہری علم کا مرقع ہے۔ بلکہ علم نے اس کے ذہن کو بھی جلا بخشی ہے۔

اگلی صبح نہ چاہنے کے باوجود بھی شہزادہ عمر چمن میں ٹہلنے کی غرض سے نکل گئے نجانے کیوں آج غیر محسوس طور پر وہ کسی کی آمد کے منتظر تھے

ان کی نظریں بار بار اسی گوشے کا طواف کر رہی تھیں جہاں کل صبح ایک حسن بے مثال پھول چننے میں مشغول تھا کچھ عجیب کیفیت تھی، ایک طرف وہ ہراساں بھی ہو رہے تھے تو دوسری طرف وہ الجھ بھی رہے تھے اور پریشان بھی تھے۔ یوں بے قراری سے انتظار کرنا کس بات کی علامت تھی؟ اس سوال کا جواب انہیں مضطرب کر رہا تھا اور وہ سنجیدگی سے سوچ رہے تھے کہ وہ اس جگہ سے چلے جائیں دور بہت دور جہاں اس کا گزر نہ ہو اور شاید وہ چلے بھی جاتے کہ اچانک کل والی مترنم آواز نے انہیں متوجہ کر لیا۔

"کنیز شہزادے کی خدمت میں سلام عرض کرتی ہے۔"

انہوں نے گردن موڑ کر دیکھا وہ دونوں ہاتھوں کے کٹوروں میں تازہ پھول لئے کھڑی تھی۔ شہزادہ عمر نے اسے دیکھا انہیں محسوس ہوا کہ وہ صد درجہ معصوم شریر اور الھڑ سی لڑکی ہے معصومیت کے ساتھ شوخی اور بے ساختگی انہوں نے اسی میں دیکھی تھی وہ اپنی ان خصوصیات سے ہر فرد کو متاثر کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی۔ عمر ابھی دیکھ ہی رہے تھے کہ وہ ہاتھ آگے کرتے ہوئے بولی۔

"معزز شہزادے! اپنی پسند کا پھول اٹھا لیجئے۔"

شہزادہ عمر نے دیکھا کہ اس کے دونوں ہاتھوں میں گلاب، موتیا، چنبیلی اور گیندے کے بہت سے پھول تھے نجانے کیوں ان کا دل چاہا کہ کنیز انہیں گلاب کا پھول پیش کرے جو بے پناہ محبت اور جذبات کی علامت ہوتا ہے۔

"تم پھولوں کی زبان سمجھتی ہو؟" شہزادے نے بڑی دھیمی آواز میں پوچھا۔

"شہزادے! کنیز ہر زبان سمجھتی ہے آپ کونسی زبان میں بات کرنا چاہتے ہیں؟"

عمر اس جواب سے بڑے محظوظ ہوئے اور بولے۔

"تم ہمیں پھول دینا چاہتی ہو تو اپنی پسند کا دو اور اس کی زبان سمجھ کر دینا۔"

"کیا آپ پھولوں کی زبان سمجھتے ہیں؟" لڑکی نے اپنی کا سوال لوٹایا۔

"ہم ہر زبان سمجھتے ہیں۔" عمر نے بھی وہی جواب دیا "تم کس زبان میں بات کرنا چاہتی ہو؟"

یہ سن کر لڑکی نے تمام پھول زمین پر ڈالے اور ان میں سے صرف موتیا کے پھول چنے اور بولی۔

"یہ لیجئے۔ کنیز اپنے قابل فخر شہزادے اور عظیم مہمان کو یہ پھول پیش

کرتی ہے۔"

یہ پھول پاکیزہ جذبات کی علامت تھے۔ عمر کی خواہش پوری نہ ہو سکی تھی مگر انہوں نے رسے لئے پھر اس نے گلاب کے تمام پھول جمع کئے تو وہ گویا ہوئے۔

"یہ سب کس کے لئے ہیں؟"

"شہزادی کے لئے۔" وہ بولی اور لوٹ گئی مگر شہزادہ عمر کو ایک نئی سوچ دے گئی جب تک وہ سامنے رہی انہیں احساس نہ ہوا لیکن اس کے چلے جانے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی کوئی چیز چھن گئی ہے وہ الجھے الجھے سے چمن سے لوٹ آئے انہوں نے حسب معمول ناشتہ بھی کیا باتیں بھی کیں، ہنسے بھی بولے بھی مگر آج دل ایک نئے انداز سے دھڑک رہا تھا اور یہ انداز انہیں مسرور کرنے کی بجائے پریشان کر رہا تھا۔ اسی دن شہزادی فاطمہ سے گفتگو کے دوران انہیں علم ہوا کہ وہ شہزادی کی خاص کنیز اور بے تکلف دوست ہے جس کے آنے کے بعد انہوں نے کسی کنیز یا بھول کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ وہ صدر چہ شریر تھی، اس رات شہزادہ عمر نے ایک عجیب سی بے چینی محسوس کی جس کا احساس انہیں پہلے کبھی نہیں ہوا تھا یہ ان کی زندگی کا پہلا اتفاق تھا کہ لاشعوری طور پر وہ مسلسل ایک ہی شخصیت کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ خیالات بھٹک بھٹک کر ایک ہی کا طواف کر رہے تھے بار بار نظروں کے سامنے ایک ہی سراپا آتا۔ کبھی جھک کر پھول چنتے ہوئے، کبھی پھول پیش کرتے ہوئے اور کبھی آہستہ خرامی سے چلتے ہوئے وہ مختلف انداز سے اسی کو دیکھ رہے تھے نہ چاہتے ہوئے بھی اسی کے بارے میں سوچ رہے تھے اور ایک کنیز کا اس درجہ تصور قابل تردد تھا وہ الجھتے رہے پریشان ہوتے رہے مگر اسے بھلا نہ سکے آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس شوخ و شنگ حسینہ سے گریز کریں گے جسے نادانستگی میں پسند کرنے لگے تھے بیجڑی میں چاہنے لگے تھے کیونکہ اسے بھول جانے کا یہی ایک طریقہ تھا اور یہ فیصلہ کرنے کے بعد انہوں نے اگلی صبح چمن کی سیر نہیں کی بلکہ صبح کے وقت تلاوت کلام پاک کے بعد اپنے ہی کمرے میں بیٹھے مطالعہ کرتے رہے پھر ناشتہ سے فارغ ہو کر لباس زیب تن کیا بال سنوارے۔ خوشبو لگائی اور اپنے بہترین گھوڑے پر سوار ہو کر دمشق کے بازاروں میں نکل گئے۔ ان کی سج دھج اور شان ایسی تھی کہ دیکھنے والے مڑ مڑ کر دیکھتے اور ایک دوسرے کو دکھاتے کہ اموی شہزادوں میں سب سے زیادہ خوبرو شہزادہ مصروف گشت آیا ہوا ہے وہ جن راہوں سے گزر رہے تھے وہ مہک اٹھتا تھا۔ اپنی انفرادی شخصیت مردانہ وجاہت اور رئیسانہ رہن سہن کی بدولت وہ سب کی نظروں کا مرکز بنے ہوئے تھے مگر انہیں کچھ خبر نہ تھی ایک تصور ان کے ذہن پر مسلط ہو چکا تھا جسے ہزار کوشش کے باوجود بھی وہ فراموش نہ کر

کسی شخص کی اس لیے تعریف نہیں کرنی چاہئے
کہ اس نے یہ کیا ہے یا اس سے مذمت
نہیں کرنی چاہیے کہ اس نے یہ نہیں کیا
کیونکہ ہم سب حالات، واقعات، ماحول، گرد و پیش، تعلیم،
وراثت اور اپنی اختیار کردہ عادتوں کے فرزند ہیں یہی چیزیں
انسان کو کچھ بناتی ہیں اور بناتی رہیں گی۔ "ممکن"

سکتے تھے آخر کئی گھنٹے کی تفریح کے بعد وہ لوٹ آئے مگر دن بھر کی یہ سیر بھی ان کے ذہن کو سکون نہ دے سکی وہ بری طرح پریشان تھے پشیمان تھے جو نگاہ آج تک غیر عورت کی طرف نہ اٹھی تھی جس دل میں کبھی کسی کا خیال نہ آیا تھا وہ آج ایک کمسن کنیز کے لئے مضطرب تھا وہ خفیف تھے مگر اس کا سدباب نہ کر سکتے تھے۔ انسان ہزار پابندی کرے مگر محبت کسی چیز کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ ایک حاکم کی حیثیت سے اپنے ملک کا دفاع کر سکتے تھے ایک سپہ سالار کی حیثیت سے بڑی سے بڑی دشمن فوج کو پسپا کر سکتے تھے مگر عشق کا وار ایسا اچانک ہوا تھا، حملہ یوں غیر متوقع تھا کہ وہ دفاع بھی نہ کر سکے وہ دیکھتے ہی رہ گئے اور ے جانے والا سب کچھ اثر کر گیا اب وہ یہی کر سکتے تھے کہ اس رہزن ہوش و خرد سے دور رہیں اور یہی کر رہے تھے دن گزرتے رہے صبح و شام کا چکر چلتا رہا گھنٹے دن اور ہفتوں میں ڈھلتے رہے مگر ان کے معمول میں فرق نہ آیا۔ اب عبدالملک کی صحبت سے اٹھ کر ہم مذاق دوستوں کی صحبت میں بیٹھنا یا پھر کئی کئی گھنٹے شہ سواری کرنا ان کا معمول ہو گیا تھا مگر ایک سہ پہر وہ باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ ملازم حاضر خدمت ہوا عبدالملک نے انہیں طلب کیا تھا تھوڑی دیر بعد شہزادہ عمر طویل راہداریاں برآمدے اور کمرے عبور کرتے ہوئے عبدالملک کی نشست گاہ کی طرف جا رہے تھے کہ ایک کمرے کے عقب میں وہی مترنم آواز ان کے قدموں کی زنجیر بن گئی انہوں نے غیر ارادی طور پر دیکھا کہ فاطمہ کے بال سنوارتے ہوئے وہی شوخ و چنچل کنیز گا رہی تھی۔

"شہزادی تو خلیفہ مروان کی پوتی ہے۔ خلیفہ عبدالملک کی بیٹی ہے کئی خلفاء کی بہن ہے اور مستقبل میں تو کسی خلیفہ کی بیوی بنے گی کیونکہ تو ایک خوبرو اموی شہزادے سے منسوب ہونے والی ہے۔"

فاطمہ کا چہرہ یہ شعر سن کر سرخ ہو گیا اس نے پیار سے کنیز کو ڈانٹا

"لیلیٰ ایسا مذاق کیوں کرتی ہو؟"

لیلیٰ نے ترنم سے دوسرا شعر پڑھا۔

"میری حسین شہزادی یہ مذاق نہیں کر رہی بلکہ قصر میں بہت سے ملازم چہ میگوئیوں کی اطلاع دے رہے ہیں کہ کوئی ایک خوبرو شہزادے سے منسوب ہونے والی ہے اور یہ چاند سورج کی جوڑی بڑی مبارک ہو گی۔"

شہزادی فاطمہ نے خوشی سے مغلوب ہو کر اپنے گلے کا طلائی ہار اتار کر لیلیٰ کے گلے میں ڈال دیا اور شہزادہ عمر شب بخیر کہہ کر وہاں سے گزر گئے انہوں نے کچھ نہ سنا تھا سوائے کنیز کے نام کے لیلیٰ لیلیٰ۔ پھر وہ عبدالملک کے پاس بھی گئے اور حسب معمول شہ سواری کے لئے بھی مگر آج ان کے دل کی دھڑکن کو ایک نام مل گیا تھا اس شب وہ بہت پریشان رہے انہوں نے لیلیٰ کو فراموش کر دینے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا تھا مگر ناکام تھے دوسری صبح وہ حسب معمول اپنے کمرے میں کتب بینی میں مصروف تھے کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی انہوں نے تعجب سے دیکھا تو ہاتھوں میں تازہ پھول لئے ہوئے لیلیٰ کھڑی تھی وہی تبسم وہی شریر آنکھیں۔ وہ حیران رہ گئے۔

"شہزادے! شہزادی صاحبہ نے یہ گلدستہ بھیجا ہے اور کہا ہے امید ہے آپ قبول فرمائیں گے۔"

شہزادہ عمر سکتے کے سے عالم میں رہ گئے جس سے بچنے کے لئے انہوں نے وہ راہیں چھوڑ دی تھیں جہاں اس کے ملنے کی توقع تھی وہ خود آموجود ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک نظر ادھر دیکھا بلاشبہ وہ اس درجہ حسین تھی۔ اگر کوئی عام کردار کا مرد ہوتا تو خود پر قابو نہ رکھ سکتا مگر انہوں نے نظریں بچائیں اور چپکے سے کہا "شکریہ۔"

"کس کا —— ؟" لیلیٰ نے شوخ نظریں ڈالتے ہوئے پوچھا اور شہزادے کے جواب کا انتظار کئے بغیر مسکراتے ہوئے بولی "میں شہزادی صاحبہ تک آپ کا پیغام پہنچا دوں؟"

لیلیٰ نے آگے بڑھ کر گلدستہ انہیں تھما دیا اور بولی۔

"شہزادے! آپ نے کنیز کے لئے کون سا نام تجویز فرمایا ہے؟"

اس سوال پر عمر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے وہ بھول گئے کہ تھوڑی دیر پہلے کیا سوچ رہے تھے ہولے سے بولے "لیلیٰ۔"

لیلیٰ چند لمحے انہیں حیرت و مسرت سے دیکھتی رہی پھر اس کی مخصوص شوخی عود کر آئی، بولی:

"میں شہزادی صاحبہ کی بھی لیلیٰ ہوں۔" پھر اس نے معنی خیز انداز میں انہیں دیکھا اور چھیڑنے کی غرض سے بولی "میں ان کی خاص کنیز ہوں، آپ جانتے ہیں؟"

اس کے جانے کے بعد شہزادہ عمر دیر تک اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے رہے جس کا کوئی حل نہ تھا۔ لیلیٰ آج خود ان کی قیام گاہ پر آ گئی تھی نہ بلکہ بھیجی گئی تھی۔ وہ اسے روک بھی نہ سکتے تھے، کیونکہ وہ شہزادی کی خاص کنیز تھی اور شہزادی ان کی چچازاد۔ وہ کیا کہیں کس سے کہیں۔ کئی دن وہ ان ہی سوچوں کی نذر ہو گئے۔ وہ اپنے کمرے میں بھی خوف زدہ سے رہتے کہ جانے شہزادی کب لیلیٰ کو یہاں بھیج دے۔ کبھی وہ سوچتے کیا عشق واقعی کوئی چیز ہے اور کیا انسان کو کسی کا خیال اس طرح مضطرب کر سکتا ہے۔ مگر ان کے پاس کسی سوال کا جواب نہ تھا۔ لیکن وہ یہ اندازہ کر چکے تھے کہ اس جذبے سے انحراف غلطی ہے نادانی ہے اور جو لوگ محبت میں محبوب سے دور رہ کر اسے بھول جانے کی سعی کرتے ہیں وہ فطرت سے لڑتے ہیں۔ وہ سوچ سوچ کر تھک چکے تھے اور ہر بار تھک کر نئے سرے سے حالات پر غور کرنا شروع کر دیتے۔ مگر ہر بار ایک ہی جواب سامنے آتا' ایک ہی حقیقت کا انکشاف ہوتا اور وہ یہ تسلیم کر چکے تھے کہ شہزادے تم ایک حسین و چنچل کنیز پر مائل ہو اور اب اس کے تصور کو ذہن سے کھرچنے پر قادر نہیں رہے مگر ستم ظریفی یہ کہ جس بت طناز نے تمہارا سب کچھ لوٹ لیا اسے اس جذبے کی خبر تک نہیں۔

اکثر شہزادی کی طرف سے پھول یا گلدستے آتے رہے۔ یہ پھول یونہی سوکھ جاتے اور شہزادے کو خبر بھی نہ ہوتی۔ انھیں اگر احساس ہوتا تو صرف اتنا کہ لیلیٰ شہزادی کا کوئی پیغام لائی تھی، کوئی تحفہ لائی تھی اور جب بھی وہ آتی کئی کئی دن کے لئے ان کا سکون تہہ و بالا ہو جاتا اور پھر کئی ہفتے سوچ کے نتیجے میں ان کے ذہن نے ایک انوکھے خیال کو جنم دیا جو بتدریج ذہن پر پھیلتا چلا گیا —— —— اور جس کے عقب میں ہر الجھن ختم ہو گئی۔ کیوں نہ تایا جان سے لیلیٰ کو مانگ لیں۔ اگرچہ انھوں نے آج تک کچھ طلب نہ کیا تھا نہ انھیں کسی خواہش نے اتنا مغلوب کیا تھا۔ ان کی زندگی جہاں بڑی شان کی حامل تھی وہاں بڑی زاہدانہ بھی تھی۔ اپنی ہزار شان و ہیبت کے باوجود انھوں نے کبھی حرام مال کھایا نہ کنیزیں رکھی تھیں نہ عورتوں پر توجہ دی تھی۔ ان کی شہزادگی کی شان صرف بہترین لباس' اعلیٰ زندگی اور قیمتی سواری تک محدود تھی۔ انھوں نے شریعت کے خلاف کبھی کوئی کام نہ کیا تھا مگر اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ لیلیٰ کو مانگ لیں۔ وہ کئی گھنٹے سوچتے رہے یوں بھی ہر حاکم اور ہر شہزادہ کنیزیں رکھتا تھا۔ آخر بڑی سوچ بچار کے بعد انھوں نے عبدالملک کی خدمت میں حاضر ہو کر لیلیٰ کو مانگنے کا فیصلہ کر لیا لیکن اس سے قبل کہ وہ خود جاتے عبدالملک نے ایک شام انھیں خود طلب کر لیا۔

رات کا وقت تھا۔ خلیفہ عبدالملک کی نشست گاہ شمع کی روشنی میں منور تھی اور ایک بڑے سے تخت پر وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کے عین سامنے کرسیوں کی قطار دور تک چلی گئی تھی جن پر ولی عہد سلیمان اور شہزادہ عمر براجمان تھے۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی سب اپنے اپنے خیالات میں کھوئے رہے پھر عبدالملک کی بھاری آواز نے دامن سکوت چاک کیا۔ اس کا روئے سخن شہزادہ عمر کی جانب تھا:

"جانِ عم! ہم تم سے سوال صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ تم برملا غور کرکے اس کا جواب دو۔ کیونکہ اگر تم ایسا نہیں چاہتے تو ہم اپنی خواہش کو تمہاری مرضی پر مسلط نہیں کریں گے۔"

عمر چند لمحے خاموش رہے پھر بولے:

"یا عم! ہم کسی بھی پہلو سے غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے نہ ہم آپ کی تجویز سے انکار کرسکتے ہیں۔ بخدا ہم آپ کی خواہش سے اپنی خوشی کو جدا نہیں سمجھتے اور آپ کو ناخوش کرکے ہم جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔"

اس جواب پر عبدالملک ولید اور سلیمان کے چہرے چمکنے لگے۔ وہ بولا:

"عمر! فاطمہ ہماری بیٹی ہے اور تم ہمارے بھتیجے! ہم تم دونوں کے لیے یہی بہتر سمجھتے ہیں۔"

"یا عم! بابا جان کے بعد ہمیں دنیا میں سب سے زیادہ آپ کے خلوص پر اعتماد ہے اور ہم جانتے ہیں کہ آپ ہمارے لیے جو بہتر سمجھتے ہیں وہی مناسب ہے۔"

اس جواب پر عبدالملک کا دل بھر آیا۔ اس نے اٹھ کر اپنے خوبرو بھتیجے کو سینے سے لگایا، اس کی پیشانی چومی اور فخر سے بولا:

"ہمیں تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔ بخدا اگر کسی اور شہزادے سے یہ سوال کیا جاتا تو اس کا جواب کبھی اتنا مؤدبانہ اور فرزندانہ نہ ہوتا۔"

اس گفتگو کے بعد محفل برخاست ہوگئی اور چند روز کے بعد شہزادی فاطمہ کو عمر سے منسوب کر دیا گیا۔ یہ شادی بڑے کروفر سے انجام پائی جس میں خلیفہ عبدالملک نے اپنی بیٹی کو بے شمار دولت جہیز میں دی، بڑے انعام و اکرام سے نوازا۔ وہ رخصت ہو کر شہزادہ عمر کی قیام گاہ پر آ گئی۔ ان کے جہیز میں سب سے اہم ترین اور عمر کے خیال میں قیمتی چیز لیلیٰ تھی۔ لیلیٰ شہزادہ عمر کی اولین پسند۔ وہ شوخ و چنچل شریر لڑکی جس کی شوخیوں سے قصر کا کوئی فرد نہ بچا تھا اور جس کے لیے شہزادہ پہروں بے چین رہتے۔ اس کے حصول کے بارے میں غور کرتے مگر اب ان کا ہر تردد ختم ہو چکا تھا۔ وہ مطمئن تھے۔ مسرور تھے خوش تھے کیونکہ لیلیٰ شہزادی فاطمہ کی خاص کنیز تھی اور فاطمہ ان کی بیوی۔ بیوی سے ایک لونڈی کو طلب کرنا کیا مشکل تھا۔ انھیں یقین تھا کہ جس دن بھی وہ فاطمہ سے اسے مانگیں گے وہ انکار نہ کریں گی۔ عمر ایک بہترین شوہر ثابت ہوئے۔ انھوں نے ابھی تک اپنی بے تابی کا اظہار نہ کیا تھا، بلکہ وہ فاطمہ کو اپنی محبت کا پہلا حق دار تصور کرتے تھے۔ وہ فاطمہ کی بے پناہ محبت کا اندازہ کر چکے تھے۔ وہ ایک فرض شناس بیوی تھی اور ان کی ملاقات پر ناز کرتی تھی۔ انھیں خلیفہ کی پوتی، خلیفہ کی بیٹی اور خلفاء کی بہن ہونے سے زیادہ شہزادہ عمر کی بیوی بن جانے کا غرور تھا۔ عمر نے کئی بار سُنا وہ فخر سے کہتیں:

"لیلیٰ! ہم اپنی قسمت پر ناز کرتے ہیں کیونکہ ہمیں آمیہ خاندان کا سب سے خوبصورت اور خوش اطوار انسان ملا ہے۔ بھلا کوئی ہمارے شوہر کی برابری کر سکتا ہے؟"

"واقعی شہزادی صاحبہ! امیہ خاندان کا کوئی شخص بھی شہزادے کی برابری نہیں کر سکتا۔" لیلیٰ کہتی۔

ایسی باتیں سن کر عمر اپنے جذبات کے اظہار سے گریز کرتے مگر لیلیٰ کے خیال کو ذہن سے مٹا دینا ان کے اختیار سے باہر تھا۔ وہ خود کو مصروف رکھتے، کبھی گھر میں کبھی باہر لیکن اب ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ لیلیٰ سے بچنا اور اس سے غافلانہ دونوں ہی باتوں کو ناممکن تصور کرتے۔ اس کی شوخیاں بڑھ گئی تھیں۔ کبھی کبھی عمر کو خود بھی اس کی شرارتوں کا نشانہ بننا پڑتا۔ ایسے میں کبھی تو وہ مسکرا دیتے اور کبھی کنی کاٹ کر نکل جاتے اور شہزادی اور لیلیٰ کو ان کے احساسات کے بارے میں شبہ بھی نہ ہوتا۔ یہ کیفیت ان کے لیے بڑی صبر آزما تھی۔ وہ شہزادی سے اور شہزادی لیلیٰ سے جدا نہ ہوتی۔ کبھی کبھی وہ سوچتے کہ شادی ان کے تردد میں اضافہ کا سبب بن گئی ہے۔ ایک شام وسیع و عریض چمن میں شاہی خاندان کے افراد جمع تھے۔ شہزادہ عمر ایک گیند اچھال رہے تھے جو بار بار زمین پر گرتا۔ چھوٹے بڑے کئی بچے بھاگ کر اٹھاتے اور انھیں تھما دیتے، وہ پھر سے اچھال دیتے۔ بچوں کی چھینا جھپٹی بڑا دلچسپ کھیل بن گئی تھی۔ عبدالملک بڑی محبت سے اپنے بھتیجے اور داماد کو دیکھ رہا تھا۔ یوں تو سب ہی ان کی ساحرانہ شخصیت سے مرعوب تھے مگر شہزادی فاطمہ کا چہرہ مسرت و انبساط سے سرخ ہو رہا تھا۔ ان کے قریب ہی لیلیٰ کھڑی تھی جو بڑے انہماک سے کھیل دیکھ رہی تھی، اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ عمر سب کے احساسات سے

> لوگ مذہب کے لیے لڑیں گے، جھگڑیں گے، مذہب کی حمایت میں لکھیں گے، لیکچر دیں گے اور اس کی خاطر مر بھی جائیں گے۔ لیکن اس کے مطابق زندگی بسر نہیں کریں گے۔
>
> بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے سروں کو اتنا بلند کر لیتے ہیں کہ پہاڑوں کی چوٹیاں نیچے رہ جاتی ہیں۔ لیکن ان کی روحوں کی پیمائش کرو تو تم کو معلوم ہوگا کہ وہ ابھی تک تاریک غاروں میں رینگ رہے ہیں۔
>
> بدی بھی دراصل نیکی ہی ہوتی ہے جو اپنی بھوک اور پیاس کی سختیوں کو برداشت کرتے کرتے ظاہر ہو جاتی ہے۔

ناکشتہ اپنی ہی دھن میں بچوں کی شوخیوں سے مسرور ہو رہے تھے۔ انھوں نے کہا۔

"ہم یہ دینار اچھالتے ہیں تم ہمیں کتنی بار اٹھا کر دو گے؟"

"جب تک آپ پھینکتے رہیں گے۔" ایک بچہ نے کہا۔

"نہیں۔ جب تک ہم تھک نہیں جائیں گے۔" دوسرے بچے نے جلدی سے کہا کہ کھیل ختم نہ ہو جائے۔

عمر اس کی سمجھداری سے بڑے خوش ہوئے۔ انھوں نے مسکرا کر عبدالملک کی طرف دیکھا۔ مگر ان کی نظر لیلیٰ پر پڑی جو کھیل کو بڑی محویت سے دیکھ رہی تھی، وہ بولے:۔

"لیلیٰ تم ہمیں یہ دینار کتنی بار اٹھا کر دو گی؟"

"صرف ایک بار۔" لیلیٰ نے شہادت کی انگلی اٹھا کر برجستہ کہا۔

"کیوں؟" عمر متعجب سے ہو گئے

"کیونکہ یہ دوسری بار آپ کے ہاتھ میں نہیں جائے گا۔" لیلیٰ نے بڑی معصومیت سے کہا۔ اس جواب پر سب محظوظ ہوئے۔ فاطمہ نے بڑا فخر محسوس کیا۔ عمر اس برجستہ جواب پر مسکرا کر رہ گئے۔ یقیناً اس کا یہ انداز اس درجہ حسین تھا کہ اگر کوئی اور نوجوان عمر جیسے جذبات رکھتا تو اسے ستائش سے دیکھتا داد دیتا، مگر یہ عمر تھے، عام نوجوانوں سے مختلف کردار کے مالک، پسندیدہ جذبات ان کے دل میں ابھی پیدا ہوئے تھے۔ لیلیٰ کی ذہانت سے متاثر وہ بھی ہوئے تھے مگر انھوں نے اس حسن سے بچنے کے لیے نظریں بچائیں اور بڑی شائستگی سے بولے:۔

"لیلیٰ تم بہت ذہین ہو۔ ہم تمھیں یہ دینار انعام دیتے ہیں۔"

لیلیٰ نے اپنے مخصوص انداز میں جھک کر انھیں سلام کیا مگر وہ پلٹ گئے۔ پھر بچے اصرار کرتے رہے شور مچاتے رہے مگر عمر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے اور اہلِ محفل میں سے کسی کو ان کی بیقراری کا احساس تک نہ ہوا اس واقعہ کے بعد مسلسل ذہنی کشمکش کا شکار رہنے لگے۔ ذہن کہتا اس شوخ سے دور رہو اپنے جذبات کا اظہار نہ کرو مگر دل اصرار کرتا کہ شہزادی سے اسے مانگ لے۔ کنیزیں رکھنا بُری بات تو نہیں ہے۔ آخر انھوں نے دل کا فیصلہ قبول کر لیا اور ایک رات عاجزانہ انداز میں شہزادی سے بولے:

"فاطمہ ہم آپ سے کچھ مانگنا چاہتے ہیں۔"

فاطمہ نے چونک کر انھیں دیکھا، چند ساعت حیرانی سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی:۔

"سرتاج آپ کا رشتہ ہم سے کچھ مانگنے کا نہیں ہے۔ آپ مختار ہیں جو چاہیں چھین لیجیے۔"

"کچھ چیزیں چھینی نہیں مانگی جاتی ہیں۔" عمر مسکرائے۔ "ہم آپ سے طلب کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیا؟" فاطمہ نے بڑے اشتیاق سے انھیں دیکھا مگر عمر کتنی ہی بار جو کوشش کرکے بھی حرفِ مدعا زبان پر نہ لا سکے۔ نجانے کیوں لیلیٰ کا نام لیتے ہوئے دل دھڑکتا تھا۔ وہ قدرے خفیف سے انداز میں فاطمہ کو دیکھتے رہے مسکراتے رہے پھر دھیمے سے گویا ہوئے۔

"آپ خود سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ اب ہم کیا طلب کر سکتے ہیں۔"

فاطمہ چند ساعت حیرت و استعجاب کے عالم میں سوچتی رہی پھر اعترافِ شکست کے لہجے میں بولی:

"ہم کچھ نہیں سمجھ سکے کہ آپ کیا چاہتے ہیں جبکہ ہماری ہر چیز آپ کی ہے ہم بہت پہلے ہی سب کچھ آپ کو دے چکے اور اب بھی دنیا میں صرف ایک چیز کے علاوہ اپنا سب کچھ آپ کو دے سکتے ہیں۔"

عمر کا دل تیزی سے دھڑکا۔ انھوں نے بیقراری سے پوچھا:

"وہ کونسی چیز ہے جو آپ ہمیں نہیں دے سکتیں۔"

"لیلیٰ۔" فاطمہ نے بغیر کسی تامل کے جواب دیا۔ "اپنی اس عزیز اور زندہ دل کنیز کے علاوہ ہم سب کچھ آپ کو دے دیں گے۔ آپ جو چاہے لے لیجیے ہماری اجازت کی ضرورت نہیں۔"

پھر شہزادی دیر تک استفسار کرتی رہی مگر شہزادہ عمر ٹال گئے بتاتے بھی کیا۔ جبکہ فاطمہ لیلیٰ کے علاوہ سب کچھ دینے کے لیے آمادہ تھیں اور انھیں لیلیٰ کے سوا کسی شے کی طلب نہ تھی۔ اس واقعے کے بعد وہ سنجیدگی سے سوچتے رہے۔ اسے بھلانے کی کوشش کرتے رہے مگر نہ اسے حاصل کر سکتے تھے نہ بھلا سکتے تھے۔ وقت اپنے دامن میں بیشمار واقعات سمیٹ کر گزر گیا اس دوران مسرور کن اور اندوہ گیں کئی باتیں ظہور میں آئیں۔ عمر ان سے متاثر بھی ہوئے مسرور بھی اور افسردہ بھی۔ لیکن لیلیٰ کی طلب کا جو جذبہ پیدا ہو چکا تھا اسے مٹا نہ سکے۔ عبدالملک بن مروان کا انتقال ہو گیا۔ ولید بن عبدالملک برسرِ اقتدار آیا اور اس نے شہزادہ عمر کو حجاز کی گورنری عطا کی۔ مدینۃ النبی کی ولایت بڑا اونچا منصب تھا۔ عمر ایک اموی شہزادے کی حیثیت سے پورے جاہ و جلال اہل و عیال اور حرم و حشم کے ساتھ مدینہ تشریف لائے۔ عدل و انصاف اور حق و صداقت کے ساتھ حکومت سنبھالی۔ وہ شب و روز مصروف رہنے لگے۔ وقت گزرتا رہا ان کی مصروفیت بڑھتی گئی۔ یہاں پر ان کا سب سے بڑا کارنامہ مسجدِ نبوی کی تعمیر تھا۔ قیامِ مدینہ کا تقریباً نصف حصہ اسی کام پر صرف ہوا۔ ان دنوں وہ بظاہر ہر چیز کو فراموش کر چکے تھے اور کبھی کبھی انہیں خود بھی محسوس ہوتا کہ وہ لیلیٰ کو بھلانے کی کوشش میں بہت حد تک کامیاب ہو گئے ہیں، مگر ایک شب فاطمہ نے پوچھا:۔

"آپ کا محبت کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

یہ سوال غیر متوقع تھا۔ عمر چند لمحے انھیں دیکھتے رہے۔ نجانے انھیں کیا یاد آ گیا۔

"آپ یہ سوال کر رہی ہیں۔ کیا آپ کے لیے یہی کافی نہیں کہ عمر آپ کو چاہتا ہے۔"

فاطمہ بڑی مسرور ہوئی مگر اصرار آمیز لہجے میں بولی۔

"ہم جذبہ محبت کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

فاطمہ! " عمر کچھ سوچتے ہوئے بولے: "اگر آپ محبت اسے سمجھتی ہیں کہ محبوب کے حصول میں ناکامی دیوانگی کا باعث بن جائے۔ انسان اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھے عقل و خرد سے بیگانہ ہو جائے اور جنگلوں چلا جائے تو ہم اسے محبت تسلیم نہیں کرتے جنھیں زندگی بھر فراموش نہ کر سکیں۔ محبوب کے حصول میں ناکام ہو کر بھی اسے ہر دم اپنے دل کے قریب محسوس کریں تو اسے ہم محبت کہتے ہیں۔"

فاطمہ بڑی متاثر ہوئی اور بولی: "اس کا مطلب ہے آپ نے ضرور کسی کو چاہا ہے۔"

عمر ہنس کر ٹال گئے مگر اس شب وہ سو نہ سکے۔ انھیں محسوس ہوا کہ مصروفیت، دوری اور احتیاط کوئی چیز بھی لیلیٰ کا تصور ان کے ذہن سے مٹا نہیں سکی۔ شاید وہ اسے کبھی بھول سکیں۔ بڑی مشکلوں کے بعد جو ذہنی سکون حاصل ہوا تھا وہ دیکھتے دیکھتے پامال ہو گیا جس طرح بڑی دقتوں سے باندھا ہوا بند ٹوٹ جاتے اور طغیانی قرب و جوار کے علاقوں کو لمحوں میں تباہ کر دے اسی طرح اس گفتگو نے عمر کا سکون غارت کر دیا تھا۔ صبر و قرار لٹ گیا تھا اور وہ بے کل ہو گئے مگر انھوں نے ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ہمیشہ کی طرح خود کو سنبھالنا چاہا۔ اس کیفیت میں کچھ وقت اور گزر گیا۔ دن ہفتوں اور مہینوں میں ڈھل گئے اور مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد چند واقعات ایسے ظہور میں آئے کہ وہ اپنے منصب سے مستعفی ہونے پر مجبور ہو گئے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ انھیں ولید نے خود معزول کیا تھا۔ خیر وہ دمشق لوٹ آئے جہاں ان کی محبت نے جنم لیا تھا۔

اب پھر وہی شب و روز تھے وہی زندگی کے مرحلے اور وہی ان کا عجیب و غریب عشق جس کی آگ میں آہستہ آہستہ سلگ رہے تھے مگر اظہار نہ کر سکتے تھے۔ یہاں بھی انھوں نے کئی بار جھجکتے جھجکتے لیلیٰ کو مانگنا چاہا مگر کبھی فاطمہ کے الفاظ یاد کر کے خاموش ہو جاتے اور کبھی اپنی ہی زبان ساتھ نہ دیتی۔ تب وہ متعجب سے ہو جاتے اور سوچتے لیلیٰ میں آخر ایسی کونسی بات ہے جو ہم اسے شہزادی سے بھی نہ مانگ سکتے ہیں۔ آخر سب ہی شہزادے کنیزیں رکھتے ہیں۔ پھر انھیں محسوس ہوا کہ وہ لیلیٰ کو کنیز نہیں سمجھتے بلکہ وہ ان کے لیے ایک اہم شخصیت بن گئی ہے۔ وہ اسے برسوں سے چاہتے ہیں پسند کرتے ہیں۔ جب انھوں نے پہلی بار عبدالملک کے قصر میں قدم رکھا تھا تو ایک لمحہ میں یہ پھول جیتی ہوئی معصوم لڑکی ان کے لیے سب کچھ بن گئی تھی اور جب سے اب تک وہ ان کے قلب و ذہن میں بس گئی تھی۔ اس نے ان کا سکون لوٹ لیا تھا اور پھر وہ اپنا لٹا ہوا سکون و قرار حاصل نہ کر سکتے تھے۔ شروع دن سے آج تک انھیں وہ بے حد عزیز

ٹپ تو دیتے جایئے

تھی۔ انہیں اس کی شوخی بھی اچھی لگتی تھی مذاق بھی۔

ایک دو پہر وہ دھوپ کی زد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے قریب ہی فاطمہ بیٹھی ہوئی سرخ سرخ سیبوں کے ٹکڑے کاٹ رہی تھیں۔ اُن سے تھوڑے سے فاصلے پر لیلیٰ شہزادی کے دوپٹے پر پھول بنا رہی تھی۔ عمر نے نادانستگی میں کئی بار اسے دیکھا مگر وہ بے حد سنجیدہ اور مصروف تھی۔ شہزادہ عمر نے سیب کھانے کے بعد تمام چھلکے اٹھا کر شہزادی کے سامنے جمع کیے۔ اپنے سامنے کی جگہ صاف کی اور از راہ مذاق بولے:

"دیکھو لیلیٰ! تمہاری شہزادی نے ہم سے زیادہ سیب کھائے ہیں۔ سامنے چھلکوں کا ڈھیر لگا ہے۔"

فاطمہ اس شرارت پر مسکرا کر رہ گئی۔ لیلیٰ نے سر اونچا کر کے ان دونوں کو دیکھا اور بولی:

"جی ہاں۔ شہزادی صاحبہ نے سیب زیادہ کھائے ہیں مگر چھلکے تو چھوڑ دیئے ہیں نا۔"

"لیلیٰ۔" فاطمہ نے قدرے ترش روئی سے مخاطب کیا۔ "تمھیں ان کا مرتبہ پہچاننا چاہیئے۔"

مگر اس وقت شہزادہ عمر مسکرا رہے تھے۔ چپکے چپکے اس ظریفانہ شوخی پر اسے داد دے رہے تھے۔ بیشک لیلیٰ نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا مگر وہ اس کی گہرائی تک پہنچ کر محظوظ ہو رہے تھے کتنا حسین مذاق تھا کیسی لطیف چوٹ تھی لیلیٰ نے اپنی اور ان کی حیثیت کا فرق ملحوظ رکھ کر بھی ان سے پُرلطف مذاق کیا تھا جس کے لیے وہ تحسین آمیز انداز میں ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔ اور لیلیٰ کے جانے

کے بعد شہزادی سے بولے،

"فاطمہ۔ آپ کسی انسان سے اس کی فطرت کے خلاف توقع کیوں رکھتی ہیں۔ آپ جانتی ہیں شرارت اس کی فطرت ہے۔ وہ مذاق سے باز نہیں رہ سکتی۔"

"ہم نے اسے مذاق کرنے سے تو نہیں روکا۔" شہزادی نے کہا۔ "لیکن اسے بہر صورت آپ کی حیثیت اور مرتبہ کا خیال رکھنا چاہئے۔ ہم آپ کی توہین برداشت نہیں کر سکتے۔"

"مگر اس نے ہم سے کوئی نازیبا بات تو نہیں کی، بڑی لطیف چوٹ کی ہے اور ہم اس بذلہ سنجی کو پسند کرتے ہیں۔ بخدا برجستہ گوئی اور حسنِ مزاح انسان کی بہت بڑی صفت ہے۔"

اس دن عمر نے پہلی بار لیلیٰ کی تعریف کی۔ اس کے بعد کئی چھوٹے بڑے

واقعات پیش آئے اور وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اب وہ کسی طور اس کے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ انھوں نے ہر پہلو سے سوچا، ہر نکتہ پر غور کیا، انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی بیوی سے اسے مانگ لیں اور اتنے بڑے جذبے کو چھپائے رکھا، اس کا اظہار کر دیں گے۔ اس رات انھوں نے فاطمہ سے بات کی۔

"فاطمہ۔ اگر ہم آپ سے آپ کی عزیز ترین چیز مانگیں تو ۔ ۔ ۔ ؟"

"سرتاج۔ ہمیں آپ سے زیادہ کوئی عزیز نہیں۔ بھلا ہم نے آپ کے سوا کسی کو نہیں چاہا۔"

عمر شہزادی کے اس جواب سے بڑے متاثر ہوئے اور بولے:

"ہم جانتے ہیں کہ آپ ہمیں دنیا میں سب سے زیادہ چاہتی ہیں یاد کیجئے ایک بار آپ نے کہا تھا کہ آپ کو ایک شخصیت اتنی عزیز ہے آپ کسی کو نہیں دے سکتیں۔"

شہزادی کچھ سوچتی رہی پھر یاد کرتے ہوئے بولی۔ "جی ہمیں یاد ہے ہم نے کہا تھا اور وہ لیلیٰ ہے۔"

عمر مسکرائے اور جھینپے جھینپے انداز میں چند ثانیے شہزادی کو دیکھتے رہے پھر گویا ہوئے،

"اگر آپ کی ایک پسندیدہ ہستی دوسری ہستی کو مانگے تو آپ کا ردِ عمل کیا ہوگا؟"

"ہم سمجھے نہیں ذرا وضاحت فرمائیے۔" شہزادی نے کہا۔

"ہم آپ سے لیلیٰ کو مانگنا چاہتے ہیں۔" شہزادہ عمر نے دل کڑا کر کے اپنی برسوں کی آرزو ایک دم سے بیان کر دی۔ انھیں محسوس ہوا جیسے اظہار تمنا نہیں کیا کوئی قلعہ سر کیا ہے۔ وہ جواب کے منتظر تھے۔ فاطمہ چند لمحے جواب نہ دے سکی پھر سنجیدگی سے بولی،

"ہم معذرت خواہ ہیں ہم لیلیٰ کو نہیں دے سکتے۔"

شہزادہ عمر افسردہ سے ہو گئے۔ انھیں محسوس ہوا جیسے وہ میلوں کا سفر بھاگتے ہوئے طے کر کے آئے ہیں مگر ٹھہرنے کے بعد انھیں تھکن کا احساس ہوا ہو جب تک انھوں نے عرضِ مدعا نہ کی تھی ایک آس تھی امید تھی مگر آج شہزادی نے انھیں مایوس کر دیا تھا ـــــ انھوں نے ہمت نہ ہاری وہ اکثر اصرار کرتے اور شہزادی انکار کرتی رہیں اور وقت کا طیارہ اپنے مخصوص رفتار سے پرواز کرتا رہا، ہر لمحہ ماضی بنتا رہا۔ ولید بن عبدالملک کا انتقال ہو گیا اور سلیمان بن عبدالملک تختِ خلافت پر متمکن ہوا۔ اس کے نزدیک شہزادہ عمر ایک خاص شخصیت و اہمیت کے حامل تھے۔ وہ خلوت و جلوت اور قیام و سفر میں انھیں عموماً اپنے ساتھ رکھتا۔ کبھی کبھی ان دونوں چچیرے بھائیوں میں شدید اختلافِ رائے بھی ہو جاتا۔ شہزادہ عمر ناراضگی کا اظہار کرتے مگر ایسے میں سلیمان انھیں منا لیتا اور ان کی بات تسلیم کرنی پڑتی۔ مگر فرصت کے اوقات میں شہزادہ عمر

بیوی سے تعرض سے نہ بچا پاتے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ چونکہ ایک بار اپنے
ت کا اظہار کر چکے تھے اس لیے اکثر شہزادی سے اس موضوع پر بات کرتے
میں محبت آمیز اصرار ہوتا۔ وہ کہتے،
"فاطمہ ہم آپ سے بیٹی کا تحفہ مانگتے ہیں۔ آخر آپ نے ہمیں اتنے تحفے
ہیں ایک اور سہی۔"
"ہم آپ کو جان دے سکتے ہیں بیٹی نہیں۔" شہزادی جواب دیتی۔
"فاطمہ کیا آپ ہمیں تشدد پر آمادہ کرنا چاہتی ہیں؟"
"نہیں۔ ہم آپ کو اس خیال سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔" شہزادی نے
سوال کا مبہم سا جواب دیا۔

عمر پریشان ہو گئے۔ پھر ان میں اس موضوع پر بارہا تکرار ہوئی مگر نہ وہ
خواہش سے دست بردار ہونے والے تھے اور نہ شہزادی اس پر آمادہ،
ت اپنے روپ بدل بدل کر گزرتا رہا۔ گرمی سردی میں اور سردی گرمی میں بدلتی
، شہزادہ عمر کا موضوع اب اکثر بیٹی ہی ہوتی۔ جس چاہت کو وہ برسوں دل
چھپائے بیٹھے تھے اب اس کا برملا اظہار کرتے۔ انھوں نے گرمیوں کی
شاموں میں چمن میں ٹہلتے ہوئے اسے فاطمہ سے مانگا۔ سردیوں کی
دوپہروں میں تمازت آمیز دھوپ میں بیٹھ کر اصرار کیا۔ سرما کی طویل
میں اپنی خواب گاہ میں لیٹے لیٹے ان کی خوشامد کی۔ کبھی خفگی کا اظہار کیا
روٹھنے کا۔ مگر ان کی طلب جتنی شدید تھی، اتنا ہی شدید شہزادی فاطمہ کا
بھی ہوتا، اور وہ جتنا ان کی بات رد کر رہی تھی ان کی شدتِ طلب اتنی ہی
ہو رہی تھی۔ وقت سالوں میں ڈھلتا رہا۔ شہزادہ عمر بیرونی زندگی میں
سلیمان بن عبدالملک کے سیاسی و نجی مشیر تھے مگر اندرونی زندگی میں ایک
تھا۔ وہ شہزادی فاطمہ کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے رہے، وہ ٹالتی
یوں وہ اگر چاہتے تو جبر بھی کر سکتے تھے۔ مگر تشدد کرنا ان کی عادت نہ تھی
اپنی محبوب بیوی کی دل آزاری ہی برداشت کر سکتے تھے۔ اس طرح
ان کی اپنی دل آزاری ہوتی رہی، خواہش رد ہوتی رہی اور زندگی کی
سے بڑی تمنا پامال ہوتی رہی۔ وہ بیٹی کو بھلا سکتے تھے نہ فاطمہ سے چھین
تھے اور نہ فاطمہ ان کے جذبات کو سمجھ کر ان کی آرزو پوری کرنے کے لیے
تھیں۔ ایسے میں شہزادہ عمر پر مختلف کیفیات طاری رہتیں۔ کبھی وہ اپنی محبت
سینے میں دفن کر لیتے خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھتے اور کبھی مضطرب
رہ جاتے۔ اسی امید و بیم کی حالت میں تین برس گزر گئے۔ سلیمان بن
عبدالملک کا انتقال ہو گیا اور امیہ خاندان کے اعلیٰ ترین رکن اور عبدالملک کے
داماد ہونے کی حیثیت سے شہزادہ عمر خلافت پر متمکن ہوئے۔ اس دن
سب سے پہلے مبارکباد دینے والی ان کی منکوحہ تھیں وہ ان کے پاس آئیں
ہیں۔

"ہم امیر المومنین کو مبارکباد دیتے ہیں اور ان کی خدمت میں تحفہ پیش

## میں کیوں پیدا ہوا؟

اس کا جواب میں کیا، میرے ماں باپ بھی نہیں دے سکتے۔ کسی ماں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کر قاتل ہوگا، ورنہ وہ اسے پیدا ہی نہ کرتی۔ غالباً مریم کو معلوم نہ تھا کہ اس کا بیٹا عیسیٰ مسیح ہوگا ورنہ وہ اسے سولی سے بچا لیتی۔ مائیں بڑی رحم دل ہوتی ہیں۔ مجھے یقین ہے اگر مائیں اپنے دل کے آئینے میں شروع سے آخر تک اپنے بچے کی زندگی دیکھ سکتیں تو آج صفحۂ ہستی پر انسان کا وجود نہ ہوتا۔ یا فرشتے ہوتے یا پھر لٹیرے ہوتے اور، ایک ہی بات ہے۔

"آئینے کے سامنے" از کرشن چندر

ساقت علی میر واقف

کرنے کی اجازت چاہتے ہیں۔"
"آپ ہمیں کیا دینا چاہتی ہیں؟" عمر نے بڑے اشتیاق سے انھیں دیکھا۔
"بیٹی"۔ فاطمہ نے جواب دیا۔ "جسے آپ نے بارہا طلب کیا مگر ہم نے انکار کر دیا۔ آج ہم اسے آپ کو ہبہ کیے دیتے ہیں۔"

عمر دم بخود رہ گئے۔ فاطمہ نے اتنی بڑی بات کتنی آسانی سے کہہ دی تھی۔ وہ انھیں حیران حیران سے دیکھ رہے تھے جس کی طلب انھوں نے برسوں کی تھی، جس کے لیے کتنی راتیں اور کتنے دن عالمِ اضطراب میں گزار دیے تھے، وہ آج ایک دم سے مل گئی تھی۔ ان کے چہرے نے کئی رنگ بدلے، کبھی سالہا سال سے دل میں چھپی ہوئی محبت کا عکس نظر آیا، کبھی ناکامی و محرومی کے اثرات پیدا ہوتے۔ اس وقت ان کی کیفیت اس مریض جیسی تھی جس نے طویل بیماری اٹھائی ہو مگر پرسشِ احوال کو آنے والے اس وقت پہنچیں جب متاعِ زندگی لٹ گئی ہو اور ایک اذیت ناک دور سے گزرنے کے بعد اسے کسی مونس و غم خوار کی ضرورت باقی نہ رہی ہو۔ انھوں نے گردن موڑ کر فاطمہ کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔

"آپ نے بڑی زیادتی کی، بڑا ظلم کیا، کاش آپ اب بھی اسے نہ دیتیں کم از کم ہمیں احساسِ محرومی تو رہتا۔"

مگر وہ خاموش رہے کیونکہ دل و دماغ کی جنگ چھڑ گئی تھی۔ دل کہتا تھا
"عمر آگے بڑھو، اس لڑکی کا ہاتھ تھام لو، وہ تمھاری برسوں کی محبت ہے۔ جس سے تم ہمیشہ محروم رہے آج اس محرومی کا ازالہ کر لو۔"
مگر عقل کا اصرار تھا۔
"نہیں عمر اب وہ دور گزر چکا جب تم اس کی آرزو کرتے تھے اب تم

یہ محترمہ آپ کا [illegible] ہے

شہزادہ عمر نہیں خلیفہ ہو۔ آگے بڑھو اپنی عجیب محبت کو ایک عجیب انجام دے دو۔ لیلیٰ کو اس کے اصل مقام پر پہنچا دو' اس مقام پر جس کی وہ مستحق ہے ۔"

عمر متردد سے کھڑے دل و دماغ کی آوازیں سنتے رہے اور فاطمہ انھیں حیرت سے تکتی رہیں۔ آخر بہت دیر کے مقابلے کے بعد دل کے ہتھیار ڈال دینے اور عقل جیت گئی۔ عمر بولے:

"کہاں ہے اسے بلایئے۔"

فاطمہ نے لیلیٰ کو طلب کیا۔ آج انھوں نے خود اسے خاص انداز سے آراستہ کیا تھا۔ وہ اپنے شوہر کو اس موقع پر ایک خوبصورت تحفہ دینا چاہتی تھیں اور ان کی نظر میں اس سے زیادہ حسین تحفہ کوئی اور نہ تھا۔ عمر نے ایک سرسری نظر لیلیٰ پر ڈالتے ہوئے رعب دار آواز میں پوچھا:

"لیلیٰ ہمیں اپنے خاندان کے بارے میں بتاؤ۔"

لیلیٰ نے بڑے دکھ سے انھیں دیکھا اور زندگی میں پہلی بار افسردگی سے بولی:-

"امیر المومنین! مجھے حجاج بن یوسف کے ایک عامل میمون نے اپنے بیٹے اصبغ کے لیے خریدا تھا۔ مگر اس کی کسی بات پر خفا ہو کر حجاج بن یوسف نے جرمانہ کیا جسے میمون ادا نہ کر سکا تو اس نے اس کا تمام مال و متاع ضبط کر لیا، جس میں میں بھی تھی۔ اس نے مجھے عبدالملک کے اور عبدالملک نے شہزادے کے حوالے کر دیا۔ اس طرح میں آپ کے قصر میں آگئی۔"

یہ حالات سن کر عمر بڑے متاثر ہوئے اور بولے "کیا تم اصبغ کے پاس واپس جانا چاہتی ہو؟"

لیلیٰ خاموش رہی گویا کہ رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے حکم صادر فرمایا کہ میمون اور اصبغ کو پیش کیا جائے مگر میمون چونکہ مر چکا تھا لہٰذا صرف اصبغ ہی حاضر خدمت ہوا۔ اس وقت منصف خلیفہ نے مسند خلافت پر بیٹھتے ہی پہلا انصاف یہ کیا کہ اس کا ضبط شدہ مال و متاع اسے لوٹایا اور لیلیٰ کی خواہش کے مطابق اسے بھی اصبغ کے حوالے کر دیا۔ وقت رخصت وہ بولے:

"اصبغ اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔ اسے لونڈی نہیں ہمارا تحفہ سمجھنا!"

پھر لیلیٰ کی سواری روانہ ہو گئی تو انھیں محسوس ہوا کہ آج شہزادہ عمر مر گئے، فنا ہو گئے۔ ان کی کائنات تہہ و بالا ہو گئی مگر انھوں نے ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی خود کو سنبھالا۔ لیلیٰ کو دعا دی اور سواری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تو پہلے اس وقت برسوں کے مضطرب اور دکھے ہوئے دل نے طنز کیا:

"واہ شہزادے! جس کے لیے عمر بھر تڑپتے رہے' خود طلب کرتے رہے وہ ملی تو اپنے ہاتھوں سے اسے دوسرے کے حوالے کر دیا۔ کیا اسے بھول بھی سکو گے؟"

اس آواز پر عمر کے قدم لڑکھڑا سے گئے مگر انھوں نے زیر لب کہا۔

"اب ہم شہزادہ عمر نہیں' خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ہیں۔ اب ہم سے ایک فرد کا نہیں پوری قوم کا حساب لیا جائے گا۔ بیشک ہم اسے کبھی فراموش نہ کر سکیں گے مگر ہمارا فیصلہ صحیح ہے۔"

واپس آ کر انھوں نے فاطمہ سے کہا۔ "ہم نے آپ کا تحفہ قبول کر لیا۔"

پھر لوگوں نے دیکھا کہ خوش پوش شہزادہ عمر جو ایک لباس کو دوبارہ استعمال کرنا پسند نہ کرتے تھے کھردرے لباس میں ملبوس تھے۔ جن کی خوشبو سے گلی کوچے مہک جاتی تھیں اب بیت المال کے مشک کی خوشبو محسوس کر کے ناک بند کر لیتے تھے۔ انھوں نے ضبط شدہ جائدادیں منسوخ کر کے واپس لوٹا دیں' جاگیردارانہ نظام ختم کیا اور اپنے دور حکومت میں خلافت راشدہ کی روح پھونک دی کیونکہ وہ اب شہزادہ عمر نہیں حضرت عمر بن عبدالعزیز تھے۔ جن کی امامت میں دنیا کو رسول اللہؐ کی شباہت نظر آتی جو عمر ثانی اور اس امت کا مہدی کہلاتے تھے۔ انھیں چالیس برس کی عمر میں زہر دیا گیا۔ مگر لیلیٰ کو رخصت کرنے کے بعد انھوں نے آخر وقت تک کبھی اس کا ذکر نہ کیا۔ ہاں یہ اور بات تھی کہ کبھی کبھی پرانی راہوں سے گزرتے ہوئے ان کے قدم ٹھٹک جاتے تو وہ وہاں سے تیز تیز قدموں سے گزرنے کی کوشش کرتے۔ کبھی موتیا کے پھول کسی کے پاکیزہ جذبات کی یاد دلاتے، کسی کی شرارت آمیز بات یا برجستہ گوئی انھیں متبسم کرتی تو وہ جلدی سے سر جھٹک کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

اظہار
پتھر کی طرح اگر میں چپ ہوں
تو یہ نہ سمجھ کہ میری ہستی
بیگانۂ شعلۂ وفا ہے
تحقیر سے یوں نہ دیکھ مجھ کو
اے سنگ تراش تیرا تیشہ
ممکن ہے کہ ضربِ اولیں سے
پہچان سکے کہ میرے دل میں
جو آگ تیرے لیے دبی ہے
وہ آگ ہی میری زندگی ہے۔

# 3 عورتیں 3 کہانیاں

میری عمر تیئس سال ہے۔ تین سال پہلے جب میں
ن اے کی طالبہ تھی، اخلاقی اقدار کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتی تھی۔ قسم
تی ہوں کہ میں نے کبھی عریاں تصویریں تک نہیں دیکھی تھیں اور نہ کبھی
SE کے معاملے میں رتی برابر دلچسپی لی تھی۔ صرف ایک 'جرم' کیا تھا وہ
ا اپنے منگیتر کو چاہنا۔ میرے منگیتر رشتے میں میرے ماموں زاد بھائی تھے
ران سے میری نسبت بچپن میں طے ہو گئی تھی۔ یہ فطری امر تھا کہ میں

انھیں چوری چوری دیکھوں اور دل ہی دل میں پوجوں۔ میرے اور ان کے
درمیان محبت کے پاکیزہ اور لطیف جذبات بچپن سے ہی جاگ اٹھے
تھے۔ مگر والدین نے پرورش کچھ اس انداز سے کی تھی کہ ملنا جلنا یا خط بازی
کرنا بڑا اُستا پن لگتا تھا۔ سر ڈھانپ کر سات برس کی عمر میں قرآن ختم کیا۔
پھر مذہبی تعلیم گھر پر دلائی گئی تب جا کر اسکول میں داخل کرایا۔ ان سب چیزوں
نے گناہ اور ثواب کی ایسی واضح تشریح کر دی تھی کہ منگیتر صاحب سے
بات کرنا بھی گناہ لگنے لگا تھا۔ یہ وقت گزرا، میں ایف اے کا امتحان دینے
والی تھی کہ والدین کا حکم ہوا، پڑھائی ختم، اب بیاہ کی تیاری کرو۔ انیس بیس
سال کی عمر تھی۔ شادی کی خبر نے تن من پر کیف و سرور کی بارش سی
کر دی۔ میں اپنی سہیلیوں میں اپنے غیر معمولی حسن کی وجہ سے بے حد مقبول
تھی۔ وہ کہتی تھیں کہ تمھاری خوبصورتی کچھ ایسی متناطیسی کشش رکھتی ہے
کہ ایک دفعہ تمھیں دیکھ لینے کے بعد دوسری بار دیکھنے کو طبیعت مچل اٹھتی ہے
ایسی تعریفوں سے نہ کبھی غرور کا احساس ہوا اور نہ بار بار آئینہ دیکھنے
کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مجھے معلوم تھا کہ میری رنگت سرخ و سپید ہے
میری ہیرے جیسی جھلمل کرتی آنکھوں میں ہر کسی کو مسحور کر لینے والی کشش
ہے۔ میرے سیاہ لمبے بال ہر جگہ ستائش کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں
یہ سب جانتے ہوئے بھی میں نے خود کو عام لڑکیوں سے مختلف نہیں سمجھا
تھوڑا سا احساس تھا تو وہ بھی یہ کہ میرا جسم بلا کا متناسب ہے۔ کچھ بالغ
ذہن لڑکیاں کہتی تھیں کہ رضوانہ تم بڑی سیکسی لگتی ہو۔ اس وقت میں ان
کا مفہوم پورے طور پر نہیں سمجھ پاتی تھی مگر اس تعریف سے خوشی ضرور ہوتی
تھی۔ شادی سے کچھ روز پہلے میری ایک شادی شدہ سہیلی نے کان میں
بتایا کہ زیادہ بے صبری مت دکھانا — دولہا بھائی گھبرا جائیں گے۔
اس وقت لاج کا قفل زبان پر پڑا تھا۔ اس جملے کی وضاحت نہ پوچھ
سکی۔ شادی کا دن نزدیک آ گیا۔ میرے ہونے والے شوہر انجینئر تھے

ان کی عمر ۲۶ سال سے زیادہ نہ تھی۔ کیونکہ ملازمت ختم ہی شادی طے ہو گئی تھی۔ وہ جسمانی اعتبار سے قابلِ رشک آدمی تھے۔ ذہنی صلاحیتیں کی خاندان بھر میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ مجھ سے زیادہ خوش نصیب اور کون ہوگا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ خاندان کی سب سے حسین لڑکی برادری کے سب سے زیادہ خوبرو اور ذہین شخص سے بیاہی جا رہی تھی۔ سہیلیوں اور رشتے دار لڑکیوں کی چھیڑ چھاڑ میں رشک اور حسد کے ملے جلے تاثرات گھلے ہوئے تھے۔ ڈھولک بجی ــــ بابل کے گیت آنگن میں گاتے گئے۔ مہندی اور ابٹن کی خوشبو نے ہفتوں پہلے میرا گھیراؤ کیا ہوا تھا۔ ساری رسومات لڑکی کے رومان انگیز جذبات کو ابھارنے کے لیے ادا کی جاتی ہیں۔ جوں جوں میرے بدن کو ایک نئی دنیا سے روشناس کرنے کے لیے خوشبو اور پھولوں میں بسایا جا رہا تھا۔ مجھ پر ایک عجیب سرشاری طاری ہو رہی تھی۔ جسم میں میٹھا میٹھا درد جاگ اٹھا تھا۔ شاید سہیلیاں ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ تم بڑی سیکسی ہو۔ بیاہ کے دن مجھے لگا جیسے میں تیلی میں آنچ میں تپ رہی ہوں۔ نفسیاتی طور پہ مجھے کسی قسم کی الجھن نہیں تھی۔ اور نہ ہی آنے والی رومانی رات کے تصور سے ہراساں تھی۔ مگر پھر بھی ایک نامعلوم سا خوف مجھ پر طاری تھا۔ رسومات کے دوران جونہی ساجد نے میرا ہاتھ پکڑا گھبرا کر سرگوشی میں بولا۔ "تمہیں تو شاید بخار ہے۔" میں نے اس وقت کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر جب عروسی کمرے میں پہنچا دی

گئی اور صاحب نے مسہری پر بیٹھتے ہوئے پھر وہی سوال دہرایا کہ " رضیہ تمہیں بخار ہے ؟ " میں نے شرما کر منہ چھپا لیا۔ میری یہ شوخی غماز تھی کہ میری طبیعت خراب نہیں ہے۔ میں یہ ساری باتیں آپ کو تفصیل سے اس لیے بتا رہی ہوں کہ آپ مجھے گالیاں دینے سے پہلے میرے ان حالات پر غور کر لیں جنھوں نے مجھے اس حال کو پہنچایا۔ شاید اخلاقی قدروں کی بندشوں سے آزاد ہوتے ہی میرے انگ انگ سے لاوا ابلنے لگا تھا جسے میرے شوہر کی نظروں نے بھانپ لیا۔ ہمارے درمیان پھر کوئی بات نہیں ہوئی۔ انھوں نے مجھے اپنی باہوں میں بھر لیا جسم و روح میں چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں ـــــ مگر ـــــ مگر اس رات بہت سارے پیار کے سوا مجھے کچھ نہ ملا۔ میں نے روایاتی شرم کو بالائے طاق رکھ کر ہر جانے میں پیش قدمی کی۔ ان سے سو طرح سے لگ کئے۔ اس رقیبے پر فطری برہمی کا بھر پور اظہار کیا۔ مگر نا اہل ہونے کے باعث وہ میری شکایتوں کا عملی ازالہ نہ کر سکے۔ اس رات میرا عورت پن جو ان کی قربت سے پوری طرح جاگ اٹھا تھا اپنی توہین اور ناآسودگی پر بری طرح بپھر گیا۔ کبھی خود کو مطمئن کرنے کے لیے غیر فطری باتوں کا سہارا لیتی۔ اس بے خبر سونے والے " شخص " کو بار بار جھنجھوڑ کر جگاتی لیکن سونے والا " میرے " اشتعال " میں تھوڑا سا اینڈھن اور جھونک کر پھر خراٹے لینے لگتا۔ اپنے پچھتے کی صدائیں ساری رات سنتی رہی کہ کب سے لپٹے ہونٹ کاٹ کاٹ کر سُجا لیے۔ اللہ اللہ کر کے وہ کی یہ رات کٹی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ صبح ہی صبح برف کی سِل پر جا لیٹوں یا یخ بستہ سمندر کی گہرائیوں میں اتر جاؤں۔ اور اس پر قیامت یہ کہ میں مشرقی لڑکی تھی۔ قدرت نے میرے فطری تقاضوں کو تو سترہ قسم کا جامہ نہیں پہنایا تھا۔ اور میرے شوہر کی بے رخی کا یہ نتیجہ ہوا کہ میں بار بار چھپ چھپ کر روتی۔ دن جیسے تیسے بیت گیا۔ رات آئی اور پھر وہی جان لیوا لمحات آ گئے۔ شوہر کا بار بار جگانا ـــــ سر سے پاؤں تک بوسوں کی بارش کرنا اور پھر منہ پھیر کر سو جانا۔ میں نے بہت ڈھٹائی دکھائی۔ حجاب کی ہر دیوار توڑ ڈالی۔ مگر وہاں وہی بے حسی کہ بس اب سو جاؤ ـــــ

مجھے یقین ہے کہ میری آٹھ دس دنوں کی یہ روئیداد اپنے دامن میں تشنگی نہ سمیٹے ہوتی تو میں خود باقی عمر یہ کہانی نہ بھیجتی۔ میری نس نس میں ننھی ننھی چنگاریاں سی ہر وقت سلگنے لگیں۔ راتوں کی تشنہ بے خوابی سے آنکھوں میں طلب کا احساس بس گیا۔ میں یہ سب کہتی کس سے ؟ شوہر کا حکم تھا کہ کچھ دن صبر کرو۔ کوئی دس بارہ دن بعد پہلی بار صحرا میں تھوڑی دیر کے لیے ابر برسا اور تب مجھے احساس ہوا کہ میں اس شخص کے ساتھ زیادہ دن نہیں رہ سکتی۔ مجھے قدرت نے اس آدمی سے قطعی مختلف پیدا کیا تھا۔ یہ ظلم اتنی شاید نہ بن سکتی جو آٹھ دس دن میرے ساتھ ہوئی۔ بگڑتے بگڑتے خواب پانی سر سے گزر چکا تھا ـــــ وہ دور ہے جب کہ مجھ کا احساس آگ بن کر نس نس میں پھیل گیا تھا کہ شوہر کا دس پندرہ دن بعد نظر کرم کرنا کم از کم میرے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اور پھر آپ جانتے ہیں کیا ہوا۔ ہاں مجھے معلوم ہے آپ مجھے طوائف کہیں گے ـــــ مجھے آوارہ عورت کا خطاب عنایت کریں گے۔ لاحول پڑھ کر گالی دیں گے کہ عورت کا تقدس بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ وہ عورت ہی کیا جو اپنے نفس پر کنٹرول نہ کر سکے۔ تو حضور آپ سب کے دیئے ہوئے خطابات سر آنکھوں پر ـــــ آپ کا کہنا بالکل بجا سہی۔ لیکن ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر کہئے کہ کیا فطری تقاضوں کے حصول میں صرف مرد ہی کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہے۔ عورتیں اپنے جسم و روح کی ہر آواز کو ہر گھڑی کچلتی رہیں تبھی شریف عورتیں کہلا سکتی ہیں جب کہ آپ کی شرافت کا معیار اپنے لیے اس سے قطعی مختلف ہے۔ میں ایک شریف گھرانے کی عورت ہوتے ہوئے پہلی بار صاف گوئی سے آپ کو بتا دینا چاہتی ہوں کہ خدا نے عورتوں کو برف کا تودہ نہیں بنایا۔ جبکہ آپ لوگ چاہتے ہیں کہ شادی سے پہلے وہ برف کی ڈلی بن کر راہبانہ زندگی گزارے اور شادی کے بعد آگ کی پتلی بن جائے۔ اور اگر خدانخواستہ مرد خود برف کا پہاڑ نکلے تو وہ بیچاری عورت پھر برف کی ڈلی بن جائے ـــــ اور زبان پر خاموشی کے تالے لگا کر سلگتی زندگی قبول کر لے۔ میرے شوہر نے مجھے ادھورا چھوڑ دیا جبکہ میں جسمانی طور پر غیر معمولی طور پہ صحت مند تھی۔ میں مقدس قسم کھاتی ہوں کہ اپنی کنواری زندگی میں نے ایک سوئی کیفیت میں بسر کی۔ کیونکہ چھونے والے ہاتھ مجھ سے دور رہے۔ مگر جونہی یہ دوری ختم ہوئی میں اپنے اندر کی بھرپور صحت مند عورت کا گلا گھونٹ کر نہیں مار سکی میں تو کیا کوئی بھی مجھ جیسی عورت ایسا نہیں کر سکتی ـــــ میرے ساتھ زیادتی یہ ہوئی کہ مجھے شوہر ادھورا ملا تھا ـــــ سو اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تفصیل سے نہیں سنا سکتی ـــــ کیونکہ آپ نے پہلے ہی مجھے فاحشہ عورت کا الزام دے دیا ہے۔ حالات سمجھے اور سنے بغیر مجھے سنگسار کر دینے کی صدائیں بلند ہوں گی مگر سچ بات تو میں بھی سنا کر رہوں گی کہ میں نے اس ادھورے پن کی محرومی سے نجات پانے کے لیے جو راہ منتخب کی وہ میرے ذہن کی بتائی ہوئی ہرگز نہیں تھی۔ بس سب کچھ مسمریزم کے مریض کی طرح خود بخود ہو گیا۔ میرے پڑوس میں ایک نو بیاہتا جوڑا آیا۔ ان سے دوستی تعلقات پیدا ہوتے جو خود بخود آگے بڑھتے گئے۔ وہ بیوی کو میکے بھیجنے لگا اور میں اس کی بیوی کے میکے چلے جانے کی دعائیں مانگنے لگی۔ ہاں ٹھیک ہے کہ میں ان عورتوں سے بھی بدتر کہلائی جاؤں گی جو پیٹ کا جہنم بجھانے کے لیے سب کچھ کرتی ہیں مگر خدا کے لیے میرے کرب کی آنکھ سے اس دوسری بھوک کو دیکھئے

یہ بھی پیٹ کے جنم سے کسی طرح کم نہیں۔ مغرب کا ہر جرم کا فضول طریقہ بھی
نے اپنے اندر سمیٹ لیا ــــ ہر بار مسلسل کی آرزو کی آگ کو بھڑکا دیتی سبق
مگر راستہ نہ بدل پائی ۔ احساس گناہ اور احساس جرم ہفتوں طاری رہتا
مگر پھر یہ غیر محسوس انداز سے آگے بڑھتی چلی جاتی۔ سکون مجھے کبھی نہیں
ملا ــــ اور آخر میں نے شوہر کی منت سماجت کر کے ان کی ٹرانسفر کرالی
کہ شاید جگہ بدلنے سے میں اپنے آپ کو بھی بدل لوں۔ مگر جب شوہر کے پاس
وہی بے حسی اور دماغ پیاسا ہی چل پڑنا چاہتا ہے پھر انہی راستوں پر
بھاگ نکلوں۔ جو مجھے آسودگی اور سکون کی دولت کبھی نہیں دیتے۔ مگر
شدید پیاس میں تو حلق تر ہو جانا بھی سرفہرست نظر آتا ہے ــــ میں
ایسا کرنا نہیں چاہتی مگر خدارا مجھے بتائیے اس میں قصور میرا ہے یا
میرے شوہر کا۔ یا پھر الزام اس ہستی کو دوں جس نے مجھے مکمل بھرپور عورت
بنایا ــــ ؟؟؟

رضوانہ صدیقی ۔ حیدرآباد

## [illegible]

میں نے تین سال ہوئے ایک پکچر بھی نہیں
دیکھی ہے۔ اس سے پہلے مجھے فلمیں دیکھنے کا جنون تھا۔ حد یہ کہ
جس زمانے میں آنکھیں دکھنے کی وبا پھیلی تھی میں بھی اس کی زد میں
آ گیا تھا مگر اس حالت میں بھی میں دو دفعہ اماں سے چوری چوری فلم دیکھنے
گیا تھا۔ بعد میں ڈانٹ بھی پڑی تھی۔ جس کی پرواہ میں نے کبھی نہیں کی
میں سمجھتا ہوں کہ یہ جنون ایک مجھے ہی نہیں میری عمر کے ہر لڑکے کو
ہوتا ہے۔ ادھر ادھر سے پیسے مارے اور بال بنا کر سینما ہاؤس کی طرف
چل پڑے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے پہلے کبھی ایک آدھ فلم بھی چھوڑی ہو۔
مگر اب ــــ اب فلم کا نام سنتے ہی خون میں ابال سے آ جاتا ہے۔ مجھے لگتا
ہے جیسے کسی نے مجھے ماں بہن کی گالی دی ہو۔ لاکھ کوشش کرتا ہوں کہ
میری یہ کیفیت دوسروں پر ظاہر نہ ہو۔ لیکن میرے دوست بھانپ جاتے
ہیں پہلے وہ مذاق اڑاتے تھے چاہتے تھے کہ مجھے کیش کر لے جائیں
یا پھر میں انہیں فلموں سے نفرت کی وجہ بتاؤں۔ مگر میں یہ بات تین سال
سے چھپاتے ہوئے ہوں اور اپنے اندر لاکھ کوشش کے باوجود وہ ہمت
نہیں پاتا کہ اپنے دوستوں کو یہ داستان بتاؤں ــــ ہاں یہ ضرور چاہتا
ہوں کہ میرے سینے پر رکھا یہ بوجھ ہلکا ہو جائے جو ایک روز اماں نے
میرے ذہن پر دھر دیا تھا۔ بات یہ تھی کہ ہر نو عمر لڑکے کی طرح مجھے ایک
اداکارہ سے عشق ہو گیا۔ وہ ابھی فلموں میں نئی نئی آئی تھی۔ فلم میں کامیابی
حاصل کرنے سے پہلے ہی اخباروں میں اس کی لمبی چوڑی خبریں آیا
کرتی تھیں۔ میں نے اس کی ہر خبر بڑے شوق سے پڑھی اس کی فلم آئی
تو دوڑا دوڑا گیا۔ اس وقت تک صرف اسے دیکھنے کا شوق تھا۔ مگر
جب اسکرین پر اسے دیکھا تو اس کی چال ڈھال اور پھر رقص کا ماہرانہ
انداز ہر ایک تماشائی کی طرح مجھے بھی گھائل کر گیا۔ باہر نکلا تو رات
کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ فلم خاصی لمبی تھی۔ گھر تک کا فاصلہ
خاصا طویل تھا مگر مجھے ہر قدم پر وہ رقاصہ اداکارہ ناچتی نظر آ رہی تھی۔
بڑے مزے مزے سے گھر پہنچا ــــ رات بھر اسی کے سپنے دیکھے۔ اور صبح
دوستوں کے درمیان بیٹھ کر اس اداکارہ سے اپنے عشق کا اعلان کر دیا۔
یہ کوئی شرم کی بات نہیں میرے دوستوں میں سے ہر کوئی کسی نہ کسی
صورت کا دیوانہ ہے۔ کوئی زیبا پر جان دیتا ہے تو کوئی نشو کے رخسار پر
پڑنے والے ننھے ننھے بھنوروں میں ڈوبا ہوا ہے۔ میں نے جب اعلان
کیا کہ ساری رات میرے خوابوں میں ایک ہی صورت ناچتی رہی تو
دوستوں نے میرا خوب مذاق اڑایا کہنے لگے۔ میاں تم تو ایکٹرس سے
عشق کرنا اپنی شخصیت کی توہین سمجھتے تھے پھر اس صورت کا خواب میں آنا
چہ معنی دارد؟ میں نہیں جانتا کہ مجھ پر دوستوں کی صحبت کا اثر تھا یا پھر
سچ مچ کوئی جذبہ بول رہا تھا۔ انتہائی سنجیدہ ہو گیا اور بولا۔ مجلس یارو
ہم تو اب دل سے گئے۔ جب تک اس مہ پارہ سے جا کر ملاقات
نہیں کر لیں گے اپنی زندگی کو قرار نہیں آسکے گا۔ اس دفعہ دوستوں نے
میری سنجیدگی محسوس کر لی اور سب نے مل کر مجھے خوب چھیڑا اور یہ بات
متفقہ طور پر تسلیم کر لی گئی کہ مجھے واقعی عشق ہو گیا ہے اور آج سے میرا
نام اس اداکارہ کے نام کے ساتھ لکھا جائے گا۔

اس واقعہ کے بعد میں نے اس اداکارہ کی کوئی فلم نہیں چھوڑی
بلکہ ہوتا یہ رہا ہے کہ جس روز اس کی نئی فلم ریلیز ہوتی تو میرے بے تکلف
دوست آ دھمکتے کہ چل دکھا ہمیں فلم۔ اور سچ یہ ہے کہ دوستوں کے ساتھ
چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے فلم دیکھنے کا جو لطف آتا تھا اس کا چٹخارہ دیر تک روح
محسوس کرتی تھی۔ مجھ پر ریمارکس کسے جاتے مخالفت میں بولنے والے

ہیں اداکارہ جیسے بیہودہ فقرے اچھالتے اور بعض تو اس کے ایسے ہیجان انگیز رقص ہوتے تھے کہ میرا تو کیا ہر تماشائی کا عضو عضو پیاس سی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ میں یہ باتیں ذرا کھل کر اس لئے لکھ رہا ہوں کہ آپ میرا کیس پوری طرح سمجھ سکیں۔ جس رات میں فلم دیکھ کر آتا دل میں عجیب سی بے قراری کروٹیں لیتی۔ جسم ایک ہیجان انگیز کیفیت محسوس کرتا بار بار اس کی تصویر رسالہ کھول کھول کر دیکھتا۔ خود پر سو سو بار لعنت بھیجتا کہ یہ کیسا روگ پال لیا ہے میں نے، یہ سال تو آرام سے اپنے سونے کے چھپرکھٹ پر مخملیں گدّوں میں دبکی سو رہی ہوگی اور ہم ہیں کہ اس کی تصویر کو سینے سے لگائے رات رات بھر کروٹیں بدلتے ہیں۔ اسے خبر بھی نہ ہوگی کہ کون اس کے جنون میں اپنی جان گھلا رہا ہے۔

قریب قریب چھ ماہ تک میں اسی ذلیل قسم کے جنون میں مبتلا رہا۔ کتابوں پر اپنے نام کے ساتھ اس کا نام لکھتا رہا۔ رسالوں سے اس کی تصویریں کاٹ کاٹ کر البم بنایا۔ سینکڑوں خط اس کے نام لکھ لکھ کر پھاڑے۔ دو تین ہمت کر کے بھیج بھی دیئے جن کا حشر نہ جانے کیا ہوا ہو۔ میرے گھر والے میرے اس مرض سے بے خبر تھے جیسا کہ عموماً گھرانوں میں ہوتا ہے۔ اماں متفکر تھیں کہ میں پڑھ لکھ کر جلد ملازمت کروں۔ کیونکہ ان کی سب سے بڑی اولاد میں ہوں۔ میرے بعد تین لڑکیاں ہیں اور تینوں ماشاء اللہ جوان سمجھو۔ سب سے چھوٹی چودہ برس کی ہو گئی۔ اماں انہیں دیکھ دیکھ کر پریشان ہوتی جاتی تھیں۔ ابا کا میرے بچپن میں انتقال ہو گیا تھا ——— اور میری سب سے چھوٹی بہن ابا کے مرنے کے تین ماہ بعد پیدا ہوئی تھی۔ ابا کے بعد ہماری پرورش دادا نے کی۔ اس زمانے میں چچا نے بھی بہت ساتھ دیا۔ مگر اس کی شادی ہو جانے اور دادا کے انتقال کے بعد ہم بہن بھائیوں نے بہت دکھ دیکھے۔ اماں حالات سے گھبرا کر اپنے بڑے بھائی کے پاس آگئیں۔ ماموں نے ہمارے سروں پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔ ممانی بھی دل کی بری نہیں تھیں مگر وہ زندہ ہی کم عرصہ رہیں۔ ہمارے یہاں آنے کے دو سال بعد وہ اچانک چل بسیں۔ ماموں کے دو بچے تھے بلکہ انہوں نے پھر شادی نہیں کی۔ ہم سب کی پرورش بڑی ذمہ داری سے کی۔ اب وہ بھی بوڑھے ہو رہے ہیں اور ہر ماں کی طرح میری ماں کی بھی خواہش ہے کہ میں جلد پڑھ لکھ کر اپنے گھر کی ذمہ داری سنبھال لوں۔ ویسے تو ماموں کا اپنا بیٹا بھی جوان ہے مجھ سے ایک برس ہی چھوٹا ہے۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ دکان پر بیٹھتا ہے اسے پڑھائی لکھائی سے قطعی دلچسپی نہیں۔ مگر میری اماں اور ماموں چاہتے ہیں کہ پڑھ لکھ کر اچھی جگہ ملازمت کروں۔ وہ اسی خواہش میں جئے جا رہے تھے اور میں ایک اداکارہ کے عشق میں اپنی پڑھائی لکھائی سے غافل ہو کر ایسٹ ان آہیں بھرنے میں مصروف تھا۔ بچپن سے میری ڈرائنگ اچھی ہے۔ گھر والوں کی نظر بچا کر میں نے اس کی ایک بڑی تصویر بنانی شروع کی۔ رات کو جب سب سو جاتے میں تصویر نکال کر نوک پلک درست کرنے میں گھنٹوں مشغول رہتا۔ تصویر تقریباً پندرہ سولہ دنوں میں تیار ہو گئی تو میرا دل لینے کو جی چاہا۔ میں نے سب سے پہلے اپنے طلوں زاد بھائی کو یہ تصویر دکھائی۔ اس نے بڑی حیرت سے تصویر دیکھی۔ میں نے فخر سے پوچھا "بول استاد یہ کس کی تصویر ہے؟" اس نے ایک لمحہ سوچے بغیر جواب دیا "طاہرہ کی" میرا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رہ گیا اس کی زبان سے یہ سُن کر جی چاہا کہ میں جمیل کو ایک ایسا جھانپڑ دوں کہ اس کی بتیسی باہر آ جائے ——— طاہرہ مجھ سے چھوٹی بہن کا نام ہے۔ جمیل کا اس تصویر کو طاہرہ کی تصویر کہنا میرے لئے ماں بہن کی گالی سے کم نہیں لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا اور اتفاق سے اسی وقت طیبہ میری چھوٹی بہن بھی کمرے میں آ دھمکی اس نے میز پر رکھی تصویر دروازے میں داخل ہوتے ہی دیکھ لی تھی۔ لپک کر آئی اور جھک کر تصویر دیکھنے لگی۔ پھر ایک دم ٹھٹک کر بولی۔ "ٹھیک ہے بھائی جان آپ کو طاہرہ زیادہ پیاری ہے۔ اگر مجھ سے پیار ہوتا تو پہلے میری تصویر بناتے"

اور میرا منہ تو طیبہ کی اس بات پر کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مجھے شدید حیرت ہوئی کہ جس کی تصویر میں نے بنائی ہے اس کا کوئی بھی نام نہیں لے رہا۔ یہ دونوں اسے طاہرہ کی تصویر ثابت کرنے پر تلے ہوتے ہیں۔ طیبہ نے جھپٹ کر تصویر اٹھائی اور باہر اماں اور طاہرہ کو دکھانے بھاگی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگا کہ ماموں جان نے دیکھ لیا تو ناراض ہوں گے۔ مگر اس وقت تک وہ تصویر اماں کے ہاتھ میں پہنچ چکی تھی۔ انہوں نے بڑے غور سے تصویر کو دیکھا۔ طاہرہ نے بھی خوش خوش تصویر دیکھی اور حیرت یہ ہوئی کہ دونوں نے ہی اسے کسی اور کی تصویر نہیں سمجھا۔ گویا یہ تصویر میں نے تو سچ طاہرہ ہی کی بنا ڈالی تھی اور میں نے بھی ذرا غور سے تصویر کو بار بار دیکھا تو بات کسی حد تک درست ہی نظر آئی کہ ہونٹ آنکھیں پیشانی اور ماتھے کا کٹ بالکل طاہرہ جیسا ہی تھا۔ طاہرہ نے بڑے شوق سے تصویر دیکھی پھر ہنستے ہنستے بولی "بھائی جان یہ تصویر تو اپنی سہیلیوں کو دکھاؤں گی۔ پتہ ہے وہ مجھے کیا کہتی ہیں۔ وہ کہتی

"تمہاری شکل ایک اداکارہ سے بہت ملتی جلتی ہے۔" طاہرہ کی یہ بات سن کر میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اس نے میری چوری پکڑ لی تھی۔ اماں نے تصویر ایک جھٹکے سے دور پھینک دی۔ کہنے لگیں "زیادہ بکواس مت کیا کرو تم لوگ۔ کیا تمہارے اسکولوں میں یہی پڑھائی ہوتی ہے کہ ایکٹریسوں سے اپنی شکل و صورت کا موازنہ کیا کرو۔"

میں نے تصویر اٹھالی۔ طاہرہ دُم دبا کر صحن میں بھاگ گئی اور میں سر جھکا کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ مگر یہ بات جیسے پھانس بن کر اٹک گئی تھی کہ کیا واقعی اس ایکٹریس کی طاہرہ سے مماثلت ہے۔ میرے عشق کے جذبے پر برف کی پرت سی جم گئی تھی۔ میں نے تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے کیونکہ میرے نزدیک یہ اس کی تصویر اب نہیں رہی تھی جس کی میں نے [illegible] تھی۔

کچھ دن تک دل کا معاملہ ٹھنڈا رہا۔ اور اتفاق سے اس کی ایک دھماکا فلم آ گئی۔ دوستوں نے پھر آتش شوق کو اپنی باتوں سے بھڑکایا۔ میں نے اس سانحہ کو دماغ سے جھٹکا اور دوستوں کے ساتھ سینما ہال جا پہنچا۔ مگر سچ بات یہ ہے کہ مجھے فلم دیکھنے میں وہ لطف نہیں آیا جو پہلے آتا تھا اور کہیں کہیں تو وہ مجھے بالکل ہی طاہرہ لگی۔ دو چار سین ایسے تھے جن میں وہ سیدھی سادی گھریلو لڑکیوں والے لباس میں آئی تب وہ سچ مچ طاہرہ ہی لگ رہی تھی۔ اور دوست تھے کہ اپنی اپنی ترنگ میں الٹے سیدھے فقرے چست کر رہے تھے جو مجھے قطعی خوش نہ کر سکے۔ اس روز میں نے تہیہ کیا کہ اس کی فلم اب ہمیشہ تنہا ہی دیکھا کروں گا۔

دوسرے روز میری رشتے کی دو بہنیں ہمارے گھر آئیں انہوں نے میرا کمرہ میری غیر موجودگی میں کھنگال ڈالا وہ البم ان کے ہاتھ لگ گیا جس میں میں نے اس اداکارہ کی ہر پوز کی تصویر چپکا رکھی تھی۔ وہ البم ان لوگوں نے اماں کو بھی دکھائی۔ جب میں گھر پہنچا تو یہ تذکرہ ہو رہا تھا کہ کونسا پوز بالکل طاہرہ سے ملتا جلتا ہے اماں باورچی خانے میں تھیں۔ میں نے اس محفل کی ساری باتیں باہر کھڑے ہو کر سنی۔ سمجھ گیا کہ میرے البم کا پوسٹ مارٹم ہو رہا ہے اس ذکر سے مجھے اب ڈر لگنے لگا تھا کیونکہ دو چار بار پڑوس میں یہ بات کہی گئی تھی کہ طاہرہ سے فلاں اداکارہ کی شکل بہت ملتی ہے اب میں خود پر لعنت بھیجنے لگا تھا کہ کس کو دل میں بسا لیا جس کی چاہت کا اب کبھی اظہار بھی نہیں کر پاؤں گا۔ میں بجھے دل سے واپس پلٹنے

**مرد!**

دراصل مرد روئے زمین کی ذہین ترین مخلوق کا نام ہے۔ وہ کسی بھی کرکٹ میچ کے مشہور ترین کھلاڑی کا نام یاد رکھ سکتا ہے۔ ریاضی کا بڑے سے بڑا مسئلہ اس کے سامنے معمولی چیز ہے۔ کار سڑک پر کھڑی ہو جائے وہ کچھ نہ کچھ کر کے اسے ٹھیک کر ہی لیتا ہے۔ لیکن بچے کو کپڑے پہنانا، اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ کس نمبر کی قمیض اس کے بچے کے لیے مناسب رہے گی؟ وہ نہیں جانتا۔ وہ خلا باز بن سکتا ہے۔ طوفانوں اور بھونچال سے اسے کسی قسم کا خوف نہیں آتا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ چوہے سے بھی نہیں ڈرتا۔

● مرسلہ: شبنم افغانی

کو تھا کہ اماں نے باورچی خانے سے مجھے دیکھ لیا۔ وہیں سے آواز دی نا چار مجھے جانا پڑا۔ کہنے لگیں "آج لڑکیاں تیرا البم لئے پھر رہی ہیں۔ یہ تیرا بچپن ابھی تک نہیں گیا۔ بچیاں بھی تیرے شوق کا مذاق اڑا رہی تھیں۔" میں خفیف سا ہو رہا تھا۔ سر جھکا کر بیٹھا رہا۔ اماں نے ایک گہری سانس لی کہنے لگیں "طارق تو اب ماشاء اللہ بڑا ہو گیا ہے۔ جوان بیٹا ماں کا سب سے مضبوط سہارا ہوتا ہے اور مجھے تجھ سے بڑی امیدیں ہیں۔ تجھے پتہ نہیں کہ تیرے باپ نے مجھے کس عمر میں بیوگی دی تھی اور میں نے یہ وقت کیسے کاٹا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ جو دکھ مجھے تیرے باپ نے دیئے تو بھی وہی دے۔ اس لئے میں ہلکی پھلکی بات تجھے بتا دیتی ہوں۔" میں اماں کی بات سے بے حد شرمندہ ہو رہا تھا۔ ان سے معافی مانگنے لگا کہ آئندہ اپنا وقت بیکار تصویروں میں ضائع نہیں کروں گا۔" وہ چپ سی ہو گئیں۔ جیسے جو بات وہ کہنا چاہتی ہیں میں نہیں سمجھ سکا ہوں جس سے انہیں تکلیف سی ہوئی۔ کہنے لگیں "طارق بیٹے مجھے تیرا البم دیکھ کر دکھ نہیں ہوا بلکہ ایک اور بات ہے جو میں تجھے بڑا سمجھدار بیٹا سمجھتے ہوئے بتا دینا چاہتی ہوں۔ مجھے بھی دو ماہ پہلے یہ بات تیرے ماموں نے بتائی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ یہ حقیقت تجھے بھی معلوم ہو جائے" میں حیرت زدہ سا ہو گیا کہ آخر اماں مجھ سے کہنا کیا چاہتی ہیں۔ اماں نے دیر تک خاموشی سادھے رکھی جیسے وہ یہ بات سنانے کے لئے حوصلوں کو چپکے چپکے آواز دے رہی ہوں۔ پھر بولیں "تو نے البم میں جس کی تصویریں لگا رکھی ہیں۔ تجھے پتہ ہے اس سے تیرا کیا رشتہ

ہے؟" میں جھلا گیا کہ یہ اماں کو کیا ہوا ہے۔ اماں کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے بولیں "یہ ایکٹرس تیری بہن ہے۔ تیرے باپ کی دوسری عورت کی اولاد ہے" یہ جیسے سر پر کوئی لوہے کا گرز بھی مارتا تو شاید اتنا نہ چکراتا۔ مارے صدمے کے آنکھوں کے آگے دھبے ناچنے لگے اماں نے میرے جذبات بھے بغیر اپنا سلسلہ جاری رکھا۔ کہنے لگیں۔ "تو جب تین سال کا تھا تب تیرا باپ ایک بازاری عورت کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ لوگ تو کہتے تھے کہ یہ سلسلہ میری شادی سے پہلے شروع ہوا تھا وہ اس عورت کو گھر ڈالنا چاہتا تھا۔ مگر تیرا دادا جو گاؤں کے طاقتور خان تھا جس کی بہت بڑی جاگیر تھی۔ وہ بیٹے کو ایک مراثن سے شادی کرنے کی اجازت کیسے دے سکتا تھا۔ انہوں نے بات پھیلنے سے پہلے جبری طور پر اس کی شادی مجھ سے کر دی۔

مجھے ان حالات کا علم نہیں تھا۔ جب تو ڈھائی تین سال کا ہوا تب یہ بھید مجھ پر کھلا کہ تیرا باپ چار، چار دن کہاں غائب رہتا ہے مجھ سے بہانے کر کے ہفتوں لاہور کیوں ٹھہرتا ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ اس نے مجھے خود بتا دیا کہ میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔ تمہیں اپنے دل میں اس کے لئے جگہ بنانا ہو گی۔ عورت ہر دکھ ہنس کر سہہ سکتی ہے مگر یہ سوت کا جلاپا، اللہ نہ کسی کو دکھلائے۔ میں نے تو رو رو کر اپنا حلیہ بگاڑ لیا۔ سسر تک بھی بات پہنچ گئی۔ انہوں نے میرے سامنے تیرے ابا کو بلایا۔ سر پر جوتے ہی جوتے مارے۔ مگر یہ سرزنش تو اور مصیبت بن گئی۔ اس نے گھر چھوڑ دیا۔ ان دنوں طاہرہ پیدا ہونے والی تھی۔ ایک تو ہر وقت کا رونا پیٹنا اوپر سے یہ مصیبت۔ میں بستر سے لگ گئی۔ طاہرہ پیدا ہوئی تو میں موت کے منہ میں جاتی جاتی بچی۔ دو مہینے بعد تیرے دادا نے بیٹے کا سراغ لگایا۔ کان سے پکڑ کر لائے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ٹھیک ہے سوکن برداشت کر لوں گی مگر اب انہیں جانے نہیں دوں گی۔ مگر تیرے دادا نے تو پھر دیہی شیروں والے رعب دبدبے سے اعلان کر دیا کہ اگر اس نے دوسری شادی اس عورت سے کی تو وہ دونوں کو گولی مار دیں گے۔ تیرا باپ بہت عرصے چپ چپ رہا۔ میں نے اسے پیار سے یقین دلایا کہ بے شک تم دوسری عورت لے آؤ میری طرف سے اجازت ہے۔ اس پر وہ خوش ہو گیا کہنے لگا "میں نے اس عورت سے شادی کر لی ہے اور اس کی وجہ مجھ سے سن لو کہ اس کے بطن سے میری بیٹی ہو گئی تھی۔ وہ دو سال کی ہو گئی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ اس ماحول میں پلے۔ اگر ابا اس عورت کو قبول نہیں کریں گا تو میں اپنے ساتھ ان دونوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ تاکہ سارا معاملہ ہی ختم ہو جائے"

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ اللہ نہ کرے جو ایسا وقت آئے۔ مگر یہ تو ہم عورتوں کی سوچیں ہیں مردوں کی سوچیں کچھ اور ہوتی ہیں۔ تیرے دادا نے اس کی نگرانی شروع کر دی۔ میرے باپ بھائی کو بھی خبر ہو گئی تھی وہ بھی مرنے مارنے کو تل گئے۔ ایک رات اس عورت کے گھر سے نکلتے وقت میرے چھوٹے بھائی نے دیکھ لیا گھر آ کر شکایت کر دی اور اس رات وہ دنگا فساد ہوا کہ محلے والے سلام پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں باپ بیٹے اپنے اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے۔ بیٹے نے کہہ دیا کہ اگر اس عورت کو آپ نے بہو نہیں مانا تو میں زہر کھا لوں گا۔ تیرے دادا نے ٹھکائی کر ڈالی کہ دیکھتا ہوں تو اب زہر کیسے کھاتا ہے۔ مار پیٹ کر کمرے میں دھکیل دیا۔ باہر سے کنڈی چڑھا دی سب سے کہا کہ دو دن تک کوئی روٹی پانی نہ دے۔ جب عقل ٹھکانے آئے گی تب دیکھتا ہوں کیسے باپ کے ٹکڑوں کو لات مارتا ہے۔

مگر تیرے دادا غلطی پر تھے جوان اولاد کو اس طرح سدھارا نہیں جاتا۔ تیرے ابا نے اسی رات نیلا تھوتھا کھا لیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے زہر کہاں سے حاصل کیا اور کس وقت اس نے یہ فیصلہ کیا۔ رات بھر میری تو روتے روتے گزری ان دنوں طیبہ ہونے والی تھی۔ طبیعت ویسے ہی نڈھال تھی۔ صبح تک گھر کا نقشہ ہی بدل چکا تھا میری ساس نے دروازہ کھولا اور اب وہاں کیا تھا۔ تیرے باپ کا ٹھنڈا بدن فرش پر پڑا تھا۔ سرکش باپ کے سرکش بیٹے نے ایک ہی رات میں سارے رشتے توڑ ڈالے۔ اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ تیرے ماموں مجھے بتاتے رہتے تھے کہ وہ عورت کہاں ہے اور اس کی بچی کن حالوں میں ہے وہ جہاں کی خاک تھی وہیں جا پہنچی۔ اس نے پھر اپنی دکان سنبھالی — اور اب اپنی بچی کو فلموں میں بھیج دیا۔ تو شاید یہ خون کی کشش ہے جو تو اس کی تصویریں کاٹ کاٹ کر رکھتا رہا ہے۔ اور طاہرہ کی جو شکل اس لڑکی سے ملتی ہے تو دنیا والے غلط نہیں کہہ رہے ہیں۔ ہے تو وہ بھی تیرے ہی باپ کا خون۔ لاکھ گندی سہی مگر سوت تو اپنوں پر ہی جاتی ہے نا ——"

اماں نے تو یہ داستان سنا کر اپنا بوجھ ہلکا کر لیا۔ مگر مجھ پر جو گزری وہ کس منہ سے بتاؤں۔ غیرت کہتی تھی "ڈوب مر" اور دل کہتا تھا "میں نہیں مانتا کہ یہ سب کچھ سچ ہے" دو ہفتے تک عجیب بحرانی حالت طاری رہی یا تو خود مر جاؤں یا پستول کی گولیاں اس کے سینے میں اتار دوں جو اب میری غیرت بن گئی تھی۔ مگر میں سوائے چھپ چھپ کر تیر تک ڈھونڈنے کے اور کچھ بھی نہیں کر سکا۔ وہ غلطی تھی

کار ڈین ستاروں کی طرح لاکھوں دلوں میں جگمگا رہی ہے۔ میرے
باپ نے اسے جن راستوں سے بچانے کے لئے اپنی جان تک دے
ڈالی قسمت نے اسے انہی راہوں پر دھکیل دیا۔ اور میں اس کا بھائی

جو وقت تک اس کے متعلق بے ہودہ خیالات پاتا رہا۔ اب برداشت کرنے
کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔ صرف یہ کیا کہ فلمیں دیکھنا چھوڑ دی ہیں۔"

**طارق ہارون۔ لاہور**

## ہاں میرے ابا حلال کی کمائی پر ایمان رکھتے تھے

**ہائے** کچھ یاد پڑتا ہے کہ میرا نام ثروت جہاں تھا۔ اور یہ بھی کہ میرے حافظے میں پرچھائیوں کی طرح گھومتا ہے کہ میری بہت ساری سہیلیاں تھیں جن میں مجھے نمایاں مقام حاصل تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ میں بہت اچھی باتیں کیا کرتی تھی یا شاید وہ مجھے میری خوبصورتی کی وجہ سے پسند کرتی تھیں مگر اب۔۔۔ میں حالات کی سیڑھی یکدم کھسک جانے سے اتنی گہرائی میں آن بیٹھی ہوں کہ میرے سارے ساتھی مجھ سے بچھڑ گئے اور یہاں اتنا گہرا اندھیرا ہے کہ اب چہروں کی شناخت بھی مشکل ہو گئی ہے۔ رشتوں کی پہچان کھو چکی تو چہروں کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں کہ جس جسم پر میری ماں کا چہرہ فٹ ہے۔ وہ سچ مچ میری ماں ہی ہے یا کوئی اور۔۔۔ اسی طرح مجھے اپنے ارد گرد کے سبھی لوگ اجنبی لگتے ہیں ہاں کبھی کبھی حافظے کے اسکرین پر بھولی بھٹکی یادوں کی پرچھائیاں چلنے لگتی ہیں تو میں گھنٹوں اس میں الجھی رہتی ہوں کہ یہ شاید ... کی شکل تھی اور یہ ... کی۔ یہ دونوں میری بڑی اچھی سہیلیاں تھیں۔ اپنا سارا دکھ سکھ میں انہیں اور وہ مجھے بتا دیا کرتی تھیں مگر ان دنوں دکھ ہی کیا تھے۔ فلاں مس کے نوٹس نہیں ملے۔ امی نے عید پر نیا جوڑا نہیں بنوایا۔ اس سے بڑے غم مجھے تھے نہیں۔ میرے ابو کے ڈی اے میں ملازم تھے۔ مگر ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ حق حلال کی کمائی پر ایمان رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے امی ان سے ناراض رہتیں۔ گھر میں بھی اللہ کا فضل کچھ کم ہی رہا۔ آٹھ بچے اور دو امی ابا۔ دس آدمیوں کا کھانا پہننا قلیل تنخواہ میں جس انداز سے ہوتا ہوگا وہ آپ خود سوچ لیں کسی کے پاس جوتا ہے تو کپڑے نہیں ہیں۔ اور کوئی کپڑے بنوا لیتا ہے تو اسکول کی فیس پوری نہیں دے سکتا۔ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی میں تھی۔ ابا کی طرح بے حد حساس اور خود دار۔ کاش میں ابو کی بجائے امی پر ہی چلی جاتی۔ وہ بے حد پریکٹیکل اور معاملہ فہم عورت ہیں۔ ابا سے ان کی پتہ نہیں کیسے نبھ گئی۔ شاید اس کی وجہ ابا کا کم گو ہونا تھا۔ امی بک بک جھک جھک کرتی رہتیں مگر وہ چپ چاپ سنتے رہتے۔ میرے کالج میں داخلہ لینے پر بھی امی نے بہت شور مچایا تھا۔

وہ چاہتی تھیں کہ جب تک میرا رشتہ نہیں آ جاتا مجھے گھر بیٹھنا چاہئے۔ یا پھر کسی کمپنی میں چھوٹی موٹی ملازمت کر لوں تاکہ گھر کی آمدن میں کچھ اضافہ ہو۔ ابا اس خیال سے قطعی متفق نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے پہلے اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلاؤں گا۔ اس کے بعد شادی کر دوں گا۔ شادی کے بعد چاہے وہ نوکری کرے یا بچے پالے۔ اس کی اور اس کے شوہر کی مرضی جو چاہیں کریں۔ امی نے اس بات پر ان سے جھگڑا بھی کیا کہ اور جو اتنا چھوٹے ہیں ان کا اچار بناؤ گے۔ ابا کا بس ایک جملہ کہ "اللہ مالک ہے" امی کے آگ لگا دیتا تھا۔ میں خاموش رہتی تھی۔ جانتی تھی کہ ابا میری حمایت میں ہیں۔ اور میرے بارے میں ہر فیصلہ ان کی مرضی سے ہوتا آیا ہے اس لئے امی سے بلا وجہ جھگڑا مول لینا بیوقوفی تھی۔ ابا نے جو چاہا وہ ہو گیا۔ اور مجھے کالج میں داخلہ مل گیا۔۔۔ یہاں تک کی سب یادیں خوشگوار ہیں کالج کی مختصر سی ڈیڑھ سالہ زندگی اور اس کی سرگرمیاں یاد آ جائیں تو ذہن کو کچھ دیر کے لئے تازگی سی مل جاتی ہے۔ اس ثروت جہاں کا کھلا کھلا چہرہ بات بات پر ہنس دینے کی بے اختیاری، کیا یہ سب کچھ میری ذات سے متعلق باتیں ہیں۔ کیا واقعی میں اتنی ہنسا کرتی تھی کہ لڑکیوں نے مس چیرفل کا خطاب دے دیا تھا۔ مگر یہ اس زمانے کی بات ہے جب ثروت جہاں کو باپ کا تحفظ حاصل تھا۔ اس وقت ابا کے دوست میری صلاحیتوں کی تعریفیں کرتے تھے۔ اپنی اولاد کو میری ذہانت کے قصے سناتے تھے۔ انہی دوستوں میں ایک صدیقی صاحب بھی تھے جنہیں میں اپنی اولاد سے زیادہ پیاری لگتی تھی۔ باپ کا تحفظ بھی کیا چیز ہوتا ہے۔ ہر وقت سائبان کی طرح پوری ذات پر سایہ کئے رہتا ہے۔ صدیقی صاحب کہتے تھے کہ ثروت اپنے باپ کی طرح فہیم ہے۔ ہر معاملے میں سوچ بچار سے کام لیتی ہے۔ وہ جب میرے لئے کوئی تحفہ وغیرہ لاتے تو میں ابا سے پوچھے بغیر اسے چھوتی تک نہیں تھی۔ مگر جب ابا پر دل کا دورہ پڑا تو مجھے ہر معاملے میں صدیقی صاحب کی رائے لینا پڑی۔ امی مجھے بار بار صدیقی صاحب کے پاس بھیجتی تھیں کہ جاؤ انہیں بلا کر لاؤ۔ ہم لوگ چورنگی پر رہتے تھے اور صدیقی صاحب ناظم آباد میں کرائے کی کوٹھی میں مقیم تھے۔ ان کی بیوی کا چند برس ہوئے انتقال

ختم ہو چکا تھا۔ تین لڑکیاں تھیں، دو کی شادیاں ہو گئی تھیں ایک کنواری تھی وہ میرے برابر تھی اور ان کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ میرا بار بار وہاں جانا بھلا معلوم نہیں لگتا تھا مگر ابا کی حالت ایسی تھی کہ گھر پر کسی کا موجود ہونا لازمی تھا۔ کچھ ہفتے اسی افراتفری میں گزرے۔ ابا کی حالت اچھی ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ صدیقی صاحب گھر میں بلا تکلف آنے جانے لگے ہیں۔ اور اب یہ بات ابا نے بھی محسوس کر لی تھی کہ گھر میں کسی مرد کا ہونا کتنا ضروری ہے جبکہ میرے دونوں بھائی چھوٹے تھے۔ ابا نے صدیقی صاحب سے اصرار کیا کہ آپ شام کو ایک چکر ضرور لگا لیا کریں۔ جب تک میں بستر پر ہوں آپ کا آنا میرے لئے تقویت کا باعث ہے۔ صدیقی صاحب روز آنے لگے اور شام کا کھانا ساتھ ہی کھاتے۔ ابا کا کوئی بڑا بھائی یا قریبی رشتہ دار نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو شاید اتنا خلوص نہ دکھاتا جتنا کہ صدیقی صاحب نے دکھایا۔ وہ خود بزنس کرتے تھے۔ ابا کی بیماری سے ان کا کام بھی متاثر ہو رہا تھا مگر وہ بار بار یہی کہتے رہے کہ بھیا کو اس حالت میں چھوڑ کر کام کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ ابا کو وہ ہمیشہ بھیا کہہ کر پکارتے تھے۔ امی سے ان کا پردہ نہ رہ گیا تھا اور میں انہیں بالکل ہی گھر کا فرد سمجھنے لگی تھی۔ اب ابا کے ساتھ ساتھ میں ان کے کھانے پینے کا بھی خیال رکھتی تھی۔ کالج جانا عارضی طور پر رک گیا۔ ہفتے میں ایک آدھ دفعہ جاتی۔ پھر گھر کے حالات گھر بٹھا دیتے۔ دبے انداز سے ایک بار صدیقی صاحب سے ملازمت کی بات کی تو وہ بگڑ گئے، کہنے لگے "میرے ہوتے ہوئے تمہیں پیسوں کی فکر کیوں ہو گئی ہے۔ بھیا ٹھیک ہو کر خود حالات سنبھال لیں گے میں تمہیں ملازمت کی اجازت نہیں دے سکتا ۔۔۔ بھیا سے اس بات کا ذکر تک مت کرنا انہیں زیادہ تکلیف ہوگی۔"

ابا کچھ دنوں کے لئے اچھے ہوئے مگر یہ عارضی صحت یابی تھی پھر جو بستر پکڑا تو چھ مہینے کے اندر اندر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئے اور اس تمام عرصے میں پیسہ کہاں سے آیا کیسے خرچ ہوا اس کا حساب کتاب صدیقی صاحب کے علاوہ میں جانتی ہوں۔ کیونکہ ہر ہفتے صدیقی صاحب مجھے دو سو روپے تھما دیتے تھے کہتے تھے تم حساب کتاب کی ماہر ہو خرچ اپنے پاس رکھو بعد میں ادا ہو جائے گا۔ امی کے علم میں بات تھی مگر ابا سے یہ حقیقت چھپائے رکھی۔ انہیں امی یہی کہتی رہیں کہ قرضے لے رہے ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے میرا حساس باپ حقیقت حال سے واقف تھا اگر وہ زندہ رہتا تو ایک ایک پائی چکا دیتا۔ مگر اسے موت نے مہلت ہی نہیں دی اور ایک رات بالکل ٹھیک باتیں کرتے کرتے ہم سے رخصت ہو گئے۔ میں نے یہ جملہ کتنی آسانی سے کہہ دیا اور آپ نے بھی روانی میں پڑھ لیا لیکن ان کی موت نے میرے اعصاب کو کتنا کچلا اور میں نے اس غم سے کیسے سمجھوتہ کیا۔ یہ لکھنے بیٹھوں تو شاید آپ اتنی روانی سے پڑھ سکیں اور نہ میں ایک ہی جملے میں یہ سارا کرب کہہ سکوں۔ آدھی آدھی رات کو اٹھ بیٹھتی تھی لگتا صحن میں ابا [illegible] گھوم رہے ہیں۔ کیا سچ مچ میرے ابا بچھڑ گئے۔ ایسے وقت میں صدیقی صاحب نے سنبھالا کر یقین دلایا "تمہارا شفقت اب میں ہوں۔ تمہارا سارا خیال میری ذمہ داری ہے۔ صرف تم ہی نہیں اس گھر کے سبھی افراد کو میں مرحوم بھیا [illegible] اور پیار دوں گا" کتنی انہونی لگی تھی یہ بات مجھے کہ ابا کا یہ دوست جس کے ہم ہر طرح سے مقروض ہیں اب ہم پر مزید احسانات کرے گا لیکن بعد کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ صدیقی صاحب ٹھیک کہتے تھے۔ انہوں نے سارے اخراجات سنبھالے رکھے۔ مجھے باقاعدگی سے گھر کے خرچ کے لئے پیسے دیتے رہے ۔۔۔ اور یہی نہیں انہوں نے اپنی بیٹی کو گھر میں بلا لیا اور خود بھی یہیں رہنے لگے۔

پڑھائی لکھائی میری کب کی چھوٹ چکی تھی۔ ملازمت اول تو [illegible] پاس کو دیتا کون ہے۔ دوسرے صدیقی صاحب کا حکم تھا کہ ملازمت نہیں کرنے دوں گا اس سے مرحوم بھیا کی روح کو تکلیف ہوگی۔ اس کی بجائے تم میرے کام کر دیا کرو۔ ان کے کام کیا تھے یہی کھانے پینے کا خیال وہ میں پہلے بھی کرتی تھی۔ اپنی بیٹی سے وہ اپنا کام قطعی نہیں کراتے تھے۔ کہتے تھے کہ ثروت سلیقے کی لڑکی ہے میرے کام کو کوئی اور ہاتھ نہ لگائے۔ اب جب گھر کے ہر معاملے میں وہ مجھے فوقیت دینے لگے تو ان کی بیٹی مجھ سے جلنے لگی۔ یہ فطری بات تھی۔ امی ہر معاملے سے لاتعلق رہا کرتی تھیں۔ جیسے انہیں صرف گھر کی گاڑی چلانے سے سروکار ہو۔ جو ظاہرا بخیر و خوبی چل رہی تھی بلکہ ابا کی زندگی سے کہیں زیادہ خوشحالی آ گئی تھی۔ ایک میں ذہنی طور پر بکھری بکھری تھی۔ صدیقی صاحب جو کہتے تھے بلا چون و چرا قبول کر لیتی تھی کہ یہ اس گھر کے محسن ہیں اور یہ نہ ہوتے تو شاید گھر کا ہر فرد مر جاتا۔ اس محسن نے مزید احسان یہ کیا کہ اپنی بیٹی کو جو مجھ سے جلنے لگی تھی اپنی بہن کے پاس مستقل طور پر [illegible] بھیج دیا۔ اور ثروت کو پاگل کر دینے کی حد تک [illegible] رکھنا چاہتا تھا اور اس خوشی کو مستقل طور پر یہاں رکھنے کے لئے انہوں نے ایک دن امی کو بلا کر اپنے قرضے کا حساب کتاب [illegible] کر دیا۔ بولے ہم سب ان کے مقروض ہو چکے تھے۔ کہنے لگے "بھابی میری بزنس بیکاری سے متاثر ہوئی ہے اس سے میری صحت [illegible] ہو رہی ہے۔ اب آپ کے یہ حالات [illegible] کی ذمہ داری [illegible] جا سکے گی۔ بہتر یہی [illegible] کر دیا [illegible] نے بیماری باتیں ایسے سنیں [illegible] انہوں نے دیکھی تھی اس [illegible] کا۔"

ژ ٹوٹ پڑے ماں باپ کے پیار کا تقدس چکنا چور ہو گیا۔ روح کے
زخم جاگ اٹھے۔ مگر یہ دنیا کے حقائق جنہیں تسلیم نہ کرو تو یہ ڈنک
لگتے ہیں۔ زندہ لوگوں کو سنگسار کر ڈالتے ہیں۔ میں نے ان کے
جھکا دیا کیونکہ امّی نے مجھے گالیاں دے دے کر کہا تھا کہ اگر باہر
نکلے گی تو ہزار خصم بنائے گی۔ تو نہ چاہے گی تب بھی قدم قدم
ٹھوکر دینے والے تیرا تعاقب کریں گے اور پھر پیسے ملیں گے بھی
صرف دو سو تین سو ۔۔۔ کیا اس سے بہتر یہ سودا نہیں کہ تحفظ
ملے اور تیرے گھر کے ہر فرد کو عزت سے روٹی بھی کھانے کو مل
۔۔ دنیا میں ایسی لاکھوں شادیاں ہوتی ہیں۔ اک تیری انوکھی تو
ہو رہی۔

نی کے آگے بھلا میں کہاں تک بولتی۔ جب اور کوئی راستہ کوئی
نہ تھا۔ امّی نے میری رضا دے دی۔ اور اگر اس کے بعد کہانی ختم
تی کہ ہماری شادی ہو گئی تو شاید ثروت جہاں پھر بھی زندہ ہوتی
یسا نہیں ہوا بلکہ یہ ہوا کہ صدیقی صاحب نے کہا اگر میں شادی
ان کرتا ہوں تو میری بیٹیوں کے شوہر ناراض ہو جائیں گے۔ وہ
یرے تمہارے یہاں رہنے پر بھی چراغ پا ہیں۔ میں ان لوگوں کی رائے
روں پھر شادی کروں گا۔ فی الحال خاموشی سے منگنی کی رسم ادا کر دیتا کہ
احساس رہے کہ ثروت کی کہیں اور شادی نہیں ہو گی۔ میری امی اس پہ
منی ہو گئیں۔ کیونکہ یہ بات کرنے سے پہلے صدیقی صاحب نے دو ہزار منگنی کی رسم
بہانے امّی کے ہاتھ پر رکھ دیئے تھے۔ امی نے ان پیسوں سے صرف
یہ انگوٹھی خریدی۔ باقی پیسے بہن بھائیوں کے کپڑے جوتوں کی
گئے ۔۔۔ صدیقی صاحب نے اپنے لئے انگوٹھی خریدنے سے منع کر
ا۔ سو اس انوکھی منگنی میں انگوٹھی صرف مجھے پہنائی گئی۔ اور اس
انگوٹھی دیکھنے کے بہانے انہوں نے مجھے اوپر اپنے کمرے میں بلایا۔
ستم یہ ہے کہ آخر میری ماں نے اتنی آزادی انہیں دی کیوں کہ انہوں نے
ٹھی دیکھنے کے بہانے انگلی پکڑتے پکڑتے پہنچا پکڑ لیا۔ اور جب
گرفت مضبوط ہو اور عورت ہر طرح سے بے بس بھی ہو تو پھر دھکا
دینے کی ہمت نہیں رکھتا۔ میں بن نکاحی اس شخص کی دلہن بن
جس کا علم بعد میں میری ماں کو بھی ہو گیا۔ مگر اس عورت نے نہ میری
نکی اور نہ اس شخص کو باہر نکالا۔ کچھ دنوں نظریں چراتی رہیں اور
چپ چپ کے روتی رہی۔ مگر پھر وہی صدیقی صاحب کی نوازشیں،
نکھا تا لاؤ۔ ثروت کپڑے لاؤ۔ میرا گھر آباد کرنے لگیں۔ مجھے یہ کہہ کر
رکھتے رہے۔ آخر تم میری ہونے والی بیوی ہو۔ ذرا حالات سنور جائیں
رانی بنا کر رکھوں گا۔ ابھی داماد وں کے ہاتھوں مجبور ہوں سالے

کہتے ہیں اگر اس نے نکاح کیا تو ہم بھی دوسری شادیاں کر لیں گے۔"
مجھے نہیں معلوم کہ اس میں صداقت بھی ہے یا نہیں بنات کے داماد
کبھی ہمارے یہاں آئے اور نہ ان کی بیٹیوں نے اس گھر میں جھانکا۔ محلے
والوں کا آنا جانا تھا وہ بند ہو گیا کیونکہ ان کی آنکھیں بند نہیں تھیں تو زبان
کیوں بند رکھتے۔ ہم لوگ محلہ چھوڑ کر سوسائٹی منتقل ہو گئے۔ یہاں ہدایت
کر دی گئی کہ کسی سے میل جول مت رکھنا۔ لوگ باگ مجھے ان کی بیوی ہی
تصور کرتے ہیں اور شاید میں نے بھی اس صورت حال کو قبول کر لیا ہے۔ تبھی تو جیسا چاہتے
ہیں سلوک کرتے ہیں۔ گھر کا دو ڈھائی ہزار کا خرچ میرے ہاتھ میں
تھما دیتے ہیں۔ اور اس کے بعد اس کی قیمت صرف مجھے دینا پڑتی ہے۔
ہاں یہ ضرور ہے کہ میری دوسری بہنوں کو بے حد عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں
امی کا ماں کی طرح خیال رکھتے ہیں گو وہ عمر میں ان سے چھوٹی ہی ہوں گی۔
مگر پھر بھی ماں جی کہہ کر بات کرتے ہیں۔ میرے بہن بھائیوں کی پڑھائی
کا سارا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ ہر ایک کی فرمائش خوشی دل سے پوری کرتے
ہیں ان سب کی قیمت صرف میں چکا رہی ہوں۔ انتہائی خاموشی سے۔
اس لڑکی کو میں نے کب کا دفن کر دیا ہے جو ثروت جہاں تھی۔ اب میں کیا
ہوں اس کا نام دنیا والے کچھ اور دیتے ہیں اور میں کچھ اور۔ میں نہیں
جانتی میری منزل کیا ہو گی۔ ان کا یہ کہنا کہ نکاح کروں گا کبھی دل چھوٹا
مت کرو کس حد تک درست ہے۔ جانے کب تک ان لفظوں کے سہارے
یہ زندگی بسر ہو گی۔ کبھی سوچتی ہوں کہ میں قربانی دے رہی ہوں۔ اپنے
بہن بھائیوں کی پرورش کے لئے ۔۔۔ پھر دل ملامت کرتا ہے کہ اس
سے بہتر تھا کوٹھا سجا لیتی ۔۔۔ یہ زندگی اس سے مختلف تو نہیں ۔۔۔ یہ
باتیں صدیقی صاحب سے کہتی ہوں تو گلے سے لگا کر قسمیں کھاتے ہیں کہ
تم میری بیوی ہو۔ نکاح وکاح تو رسمی باتیں ہیں تمہیں حاصل کرنے کے لئے
میں نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ تمہیں چھوڑ دوں گا تو مر جاؤں گا۔"
انہی دلاسوں میں زندگی بسر ہو رہی ہے مگر نہیں جانتی کب تک۔

ثروت جہاں۔ کراچی

باندھنے کے کئی منصوبے بناتا لیکن بے چارہ چھپکلی یا مچھروں کی طرح کم ہمت
اور کم کوش تھا۔ رات کو سینے پر آیۃ الکرسی دم کرتا تب کہیں نیند آتی۔
صبح اٹھتے ہی سورۃ الناس کا ورد کر لیتا تو دن بھر وسوسوں کا شکار
رہتا۔ سرتاج سے مراسم بڑھانے اور پروفیسر صمدانی کو مگدر سے مارنے
کے پلان ملا جلا کر رہ جاتے۔

جب سجاد کے دل میں تمناؤں کی کونپلیں اتنی لگ گئیں کہ
دل کا ڈنٹھل بوجھ سے ٹوٹنے لگا تو وہ دن رات نمازیں پڑھنے لگا۔ وہ
ان تمناؤں کو دل سے یوں نوچا کرتا جیسے بچے گلاب کی پتیاں توڑا
کرتے ہیں۔ اسے تمناؤں کے مجسم ہونے کا پورا یقین تھا۔ وہ ان لوگوں
میں سے تھا جو ہاتھ ملانے کی بجائے ہاتھ کھنچانے کو احسن سمجھتے ہیں
وہ سرتاج سے بھولی بھالی متبرک بے لوث لاتعلق محبت کرنا چاہتا
تھا لیکن برے بھلے خیالات آپ ہی آپ سر نکال بیٹھتے۔ سرتاج کی آنکھیں
انار دانوں سے بھرا دہن، دودھیا رنگت کوندے کی طرح ——
اس کی طرف بڑھتے۔ وہ مقناطیسی کشش کے تحت ان کی طرف
بڑھتا اور کوڑھ کا مرض جان کر پیچھے ہٹتا۔ اس کشمکش میں اس کا دل
بجھ جاتا۔ منہ کا مزہ راکھ کی طرح بے کیف ہو جاتا اور جسم میں درد اٹھنے
لگتا۔ نہ پڑھائی میں دل لگتا نہ سیر سپاٹے پر دل مائل ہوتا۔ وہی
دوست جو ابھی پچھلے سال تک اس کی زندگی کو تل شکری بنائے
ہوئے تھے اب کودن، بے حس، ہنسوڑ اور بھونڈے نظر آتے۔ دوستوں
کی منڈلیاں کافی ہاؤس کے پھیرے کالج کی محفلیں ختم ہو گئیں تو زندگی
سے متعلق سوچ اور بھی نارسا ہو گئی۔

اور بلاؤ کی اس ڈھیری کا قصہ چکاتے چکاتے اب وہ بالکل
خصلت ہو گیا تھا۔ نہ تو گھر والوں کے ساتھ کھانا کھاتا نہ امی ابا کے ساتھ
کسی تقریب میں شمولیت کرتا۔ اب تو کالج سے انجمن ساز لڑکیاں لڑکوں
کے ساتھ لوٹتیں وہ سر جھکاتا۔ لاحول پڑھتا اپنے کمرے میں چلا جاتا
لیکن تیلیا مونگیا نگاہیں آلتی پالتی مار اس کے پلنگ پر آ بیٹھتیں۔
وہ لاکھ جی کو سمجھاتا کہ سرتاج اندرائن کا پھل ہے —— فقط دیکھنے
کی چیز —— لیکن نصیحتوں کا اندوختہ خالی ہو جاتا اور دل کی پیچ ختم
نہ ہوتی۔

ایک دن اسی الجھن سے چھٹکارا پانے کے لئے اس نے
ایک خوبصورت نیلا پیڈ نکالا اس کو تھوڑی سی خوشبو لگائی پھر اس
کاغذ کو پھاڑ کر پرزے پرزے کر دیا۔ وہ سرتاج سے عشق کا اظہار تحریری
کر رہا تھا۔ اس کی محبت تو بے لوث اچھوتی اور جراثیموں سے
بالکل پاک تھی۔

خوشبو لگانے والی چیز کو تکیے تلے بند کر کے اس نے پھر
کاغذ قلم نکالا۔ کئی کاغذ پھاڑ پھینکنے کے بعد جو تحریر قلم زد ہوئی وہ
کچھ ایسی تھی۔

سرتاج!

میرا خط پا کر تمھیں حیرت ہوگی۔ شاید تم
خفا بھی ہو جاؤ لیکن خدارا مجھ سے ناراض نہ ہونا۔
میں کالج کے عام لڑکوں کی طرح تم سے چھچھوری محبت
نہیں کرتا۔ میری محبت کنچن جنگا کی چوٹیوں سے ستھری
ہے ارفع، اچھوتی، پاک۔ جب سے میں نے تمھیں
دیکھا ہے خدا جانتا ہے برسوں کی ایک کمی پوری ہو
گئی۔ خدا نے مجھے کوئی بہن نہیں دی۔ ایک بھائی
ہے سو وہ بھی ملٹری میں ہے —— سال بھر بعد جب
آتا ہے تو وہ فاصلے عبور نہیں کئے جا سکتے جو اس
کی عدم موجودگی پیدا کرتی ہے —— سرتاج!
کیا تم میری بہن بننا گوارا کرو گی —— بولو سرتاج
کہو کیا میں اتنا خوش نصیب ہو سکتا ہوں کہ ہم
دونوں بہن بھائی بن سکیں۔ مجھے مایوس نہ کرنا۔

تمہارا بھائی

سجاد

خط لکھ کر وہ مطمئن ہو گیا جیسے سینے کا ایکسرے صاف نکل
آئے اب گندے خیالات کا دھواں آپ ہی آپ دودکش سے نکلنے
لگا اور صاف بے داغ آگ سینے میں دہک اٹھی۔

یہ خط اس نے دوسرے دن کیمسٹری کے پریکٹیکل کے بعد
کاپی میں چھپا کر دیا۔ وہ اکیلی برآمدے میں چلی جا رہی تھی جب
سجاد اس کے برابر پہنچ گیا۔ وہ مخمل تابوت کی طرح خوبصورت لیکن
بے جان ہو رہا تھا۔ ہتھیلیوں میں پسینہ اور تلوؤں میں جلن سی
محسوس ہونے لگی تھی۔

"مس سرتاج —— !"

"کیا ہے ——؟" مس سرتاج نے مڑ کر دیکھا۔

اب تک شوق کا ابلق سجاد کے زانوؤں تلے تھا لیکن
"کیا ہے" کا تازیانہ لگتے ہی رخشِ تمنا بے قابو ہو گیا۔ بہت جی چاہا
کہ زقند بھرتا بڑھتا چلا جائے لیکن ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ بڑی بے جان

آواز میں بولا — "مس اگر آپ خفا نہ ہوں تو —"

"بات کیا ہے؟" آرسی کی شفاف آواز میں سرتاج نے پوچھا

"میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"

"میں سن رہی ہوں — فرمائیے —؟"

"میں نے اس خط میں اپنا مفہوم بیان کر دیا ہے تفصیل کے ساتھ" سجاد نے اپنی پریکٹیکل کی کاپی آگے بڑھا دی۔

شاید سرتاج نے گالی دینے کے لئے منہ کھولا تھا اور چانٹا مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تھا لیکن اسی وقت پیچھے سے لڑکوں کا ایک ریلا آنکلا اور نہ جانے کیا سوچ کر تاجی نے کاپی پکڑ لی۔ سجاد کی ٹانگیں خوشی اور خوف سے سنگ ملزان کی طرح کانپنے لگیں اس نے نہ تو سرتاج کی طرف مڑ کر دیکھا اور نہ کسی کلاس میں جانے کی تکلیف کی۔ سیدھا گھر واپس آیا اور رضائی لے کر لیٹ رہا۔ اس پر خفقان کی سی کیفیت طاری تھی اور ایک ایک کی دس دس چیزیں نظر آتی تھیں۔ دوسرے روز سرتاج نے اسے پہلی گھنٹی کے بعد ہی برآمدے میں پکڑ لیا۔

"پہلے یہ بتائیے آپ مجھے کیوں بہن بنانا چاہتے ہیں؟"

فضا میں مجیرے بجنے لگے۔

"کیونکہ میری کوئی بہن نہیں ہے" نظریں نیچی کر کے سجاد بولا۔

"لیکن کلاس میں اور لڑکیاں بھی تو ہیں۔ آپ ان میں سے کسی کو بہن کیوں نہیں بنا لیتے ہیں؟"

اس کلا جنگ کا جواب اس نے پہلے نہ سوچا تھا منمنا کر بولا۔

"جی اس لئے کہ — کہ ان کو دیکھ کر میرے دل میں وہ جذبات نہیں ابھرتے جو...."

"جو مجھے دیکھ کر ابھرتے ہیں —" وہ جملہ ختم کرنے میں بڑی تیز تھی۔

"جی —"

"سوچ لیجئے بہن بنانا آسان ہے یہ رشتہ نبھانا مشکل ہے"

"آپ مجھے ہمیشہ ثابت قدم پائیں گی" وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

بھائی بہن بننے کی جزئیات جب ختم ہو گئیں تو سرتاج مسکرا کر بولی "یہ عجیب بات ہے۔ خدا نے آپ کو بہن نہیں دی اور مجھ کو بھائی نہیں عطا کیا۔ ہم دونوں کی کمی پوری ہو گئی آج تک تو جس کسی نے بات کی اس نے دل میں کھوٹ رکھ کر ہی کلام کیا۔"

**ماں** بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے۔ پاس ڈالڈا گھی کا ڈبہ پڑا ہے۔ اس گھی والوں کا کہنا ہے کہ جہاں مامتا ہے وہاں ڈالڈا کا ہونا ضروری ہے۔ جس زمانے میں ڈالڈا گھی نہیں ہوتا تھا مائیں اپنے بچوں سے محبت تھوڑا ہی کیا کرتی تھیں، اٹھا اٹھا کر پٹخا کرتی تھیں۔ جوتے مار کر گھر سے نکال دیتی تھیں۔ مامتا انمول چیز ہے۔ لیکن اب تو ڈالڈا بھی انمول چیز ہے۔ سیٹھ ہر سال دام بڑھا دیتے ہیں۔ اب تو یہ نسخہ ٹھیک ہے کہ بوتل میں بھر کر رکھو — دوا ہی سے روٹی کو چپڑو اور کھاؤ۔

(اقتباس از ، ابن انشاء)

بادِ موافق پا کر سجاد کا دل بادبانوں کی طرح کھل اٹھا۔ گھر پہنچ کر پہلی بار اس نے کمرے کی کھڑکی کھولی۔ سیٹی بجاتے ہوئے وضو کیا اور شکرانے کے نفل پڑھنے کے بعد فلم دیکھنے کا ارادہ کیا۔

اس وقت وہ سرتاج کو اپنی بہن کے روپ میں ہر طرف بکھری ہوئی پا رہا تھا۔ بہن کی باتیں سوچتے سوچتے نہ جانے کہاں سے گندے خیالات کی حرمل دل کی مقدس آگ میں آگری۔ تڑ تڑ جلنے کا شور اٹھا اور چمنی اندھے دھوئیں سے بھر گئی۔ یہ بھدے بھدے خیالات سرتاج کے وجود پر چھاپہ مارنا چاہتے تھے۔ سجاد نے بہت سر پٹخا، طبیعت کو نکیل پکڑ کر درست کرنا چاہا لیکن یہ خیالات پیچھا چھوڑنے والے نہ تھے۔ یتیم خانے سے آتے ہوئے وردی پوش مانگنے والوں کی طرح گھر در کے وارث بن کر کھڑے ہو گئے۔ ان سے بچتا بچاتا سجاد انارکلی جا پہنچا۔

جب وہ رات گئے گھر لوٹا تو اس کے پاس سرتاج کے لئے بائیس بور تلز کی چھوٹی سی نازک گھڑی تھی۔

کالج چھوٹنے کے بعد وہ سرتاج کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ بہن کے تعاقب میں اس کے پیروں کو لغزش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

"میں — میں آپ کے لئے کچھ لایا ہوں"

اس بار سرتاج بالکل نہ بدکی۔ بلکہ بڑے احترام سے راستہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ سجاد نے جیب سے گھڑی کی لمبوتری ڈبیا نکالی ڈھکنا کھولا اور تحفہ سرتاج تک بڑھا دیا۔ نیلی سطح پر اسٹین لیس اسٹیل کی نازک گھڑی جھلملا رہی تھی اور اس پر چھوٹی سی کترن پڑی تھی۔

سرتاج نے ڈبیا پکڑی تو اس کا وجود مکمل سپاس گزاری کا اشتہار بن گیا۔ آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی، خمیدہ ٹانگیں کنہیا روپ آگے پیچھے۔ اس نے کترن کو اٹھایا اس پر رقم تھا "اپنی بہت ہی پیاری بہن کے لئے"

بڑی رقت کے ساتھ سرتاج گھڑی کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی "خدا قسم یہ بہت زیادہ ہے سجاد بھیا"

بھائی لفظ کی ادائیگی اس نازک دہن پر بھاری، نامانوس اور اجنبی سی لگی۔

"ایک بھائی اپنی بہن کے لئے جو کچھ کرنا چاہتا ہے اس کا اندازہ آپ کو نہیں ہو سکتا" سپاس نامہ اب تمام تر آنکھوں میں آبسا۔

"بہت بہت شکریہ —— لیکن —— لیکن اماں خفا ہوں گی"

نہ جانے کیسے بزدلی کی میعاد مقررہ ختم ہو گئی اور سجاد دلیری سے بولا "میں خود اماں سے مل کر معافی مانگ لوں گا"

"ہائے سچ! —— آپ آئیں گے ہمارے گھر؟"

"بہن بلائے اور بھائی نہ آئے یہ کبھی ہوا ہے"

بڑے بڑے خیال اس کے جی کو سلسلانے لگے اور وہ بار بار بہن بھائی کے رشتے کو ان خیالات کی روشنی میں پرکھنے لگا سرتاج نے کاپی کھولی اور پنسل سے اس پر لائنیں کھینچنے لگی ساتھ والے صفحہ پر ہمیڈی ڈمیڈی کی تصویر سجاد کا مذاق اڑا رہی تھی۔

"یہاں سے آپ داہنے ہاتھ مڑ جائیے سامنے چھوٹا سا بازار ہے اس سے گزر جائیے۔ پھر کٹ پیس کی دو چار دکانیں آئیں گی۔ آخر میں ایک ٹال بھی آئے گا بائیں ہاتھ اس سے آگے ورکشاپ ہے موٹروں کا مین اس کے سامنے ہمارا مکان نمبر ۳۱۲ —— یاد رہے گا نا آپ کو؟"

یہ بازار کٹ پیس کی دکانیں، ٹال، ورکشاپ، مکان نمبر ۳۱۲ سب اس کے دل پر کندہ ہو گئے۔ یہ راستہ اسے جانا پہچانا نظر آنے لگا۔

"اب ضرور آئیے گا" سرتاج نے اصرار کیا۔

اس کی نظریں سہل طوطوں پر جمی تھیں۔ ایسی ہیرے آنکھیں اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔

"کیا ہوا بھائی جان؟" سجاد کی محویت دیکھ کر سرتاج بولی۔

"بس ایسے ہی اپنی خوش نصیبی پر رشک آرہا ہے ایسی پیاری بہن قسمت اچھی ہو تو ملتی ہے"

سرتاج کھلکھلا دی۔ اڑتی فاختہ کا جوڑا سجاد کی نظروں میں گھومنے لگا اس واقعے کے بعد سرتاج کے گھر جانے کی راہ تو بن گئی لیکن سجاد ہاتھی کا پاٹھا تھا آنکس مارے بغیر ایک قدم فیل خانے سے باہر نہ نکال سکتا تھا۔ رات رات بھر ہاتھوں دل بڑھاتا۔ صبح اٹھتا تو سارے ارادوں کی ہوائیاں چھوٹی ہوتیں۔

سرتاج پر منہ بولے بھائی بنانے کا الگ اثر ہوا تھا۔ دراصل وہ ازلی عورت کی طرح بڑی نڈر اور ارادے کی پکی تھی۔ کہاں تو گدھے رنگی لڑکیوں میں بیٹھی ہمیڈی ڈمیڈی بناتی رہتی اور اب اس نے پہلی قطار چھوڑ کر دوسری قطار میں سجاد کے پاس بیٹھنا شروع کر دیا۔ باقی لڑکے اس نئی تبدیلی پر جزبز تو بہت ہوئے لیکن ہوٹنگ کرنے کے سوا تمہ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ کیونکہ جس دھونس سے سرتاج نے سجاد کو اپنا بوجھڑا بنا لیا تھا اس کے سامنے کسی کی پیش نہ جاتی تھی۔

سرتاج کی قربت نے سجاد پر عجیب اثر کر رکھا تھا۔ ایوننگ ان پیرس، سالگری اور کارنیشن کے پھولوں کی ملی جلی خوشبو ہر لمحہ پاس والی کرسی سے پارسیوں کی آگ بن کر دہکتی رہتی۔ یہ مخلوط خوشبو بڑی سانپ چڑھی تھی۔ بار بار اس خوشبو کا سانپ اسے اپنے ذہن سے اتارنا پڑتا لاکھوں بار جی کو سمجھانا پڑتا کہ بہن کا رشتہ پاکیزہ اور پرعظمت ہے ایسے رشتوں کا خوشبوؤں سے کوئی تعلق نہیں ہوا کرتا۔

باقی سارے دریودھن تو دروپدی کو کھو کر خاموش ہو بیٹھے لیکن ادریس کی مشکلات اور پوزیشن مختلف تھی۔ اس کی حیثیت میر کارواں جیسی تھی۔ سرتاج کو کسی دوسرے کے ہاتھ کا ہار بنا دیکھا تو اس کے اپنے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے پہلے تو دو چار مرتبہ ہنسی اڑائی پھر تمسخر سے سجاد کو گانٹھنا چاہا لیکن لڑائی کی نوبت نہ آتی کیونکہ سجاد تو پہلے ہی چار قدم ہٹ جانے والا شخص تھا۔

یہ اسپورٹس ڈے کی بات ہے۔ سجاد سفید نیکر اور آستینوں والی بنیان پہنے گیلری میں آرہا تھا کہ ادریس کھونچ لگا کر گزرا۔ سجاد ایک دم رک گیا اور گہری نظروں سے ادریس کو دیکھ کر بولا "اندھا تو دیکھ کر چلا کر ——"

یہ جملہ اشتعال انگیزی کرنے کے لیے نہ کہا گیا تھا یہ اور بات ہے کہ ادریس کو ایسے موقع کی تلاش تھی۔ ایک جست میں ادریس نے سجاد کو دھوبی پٹڑے کا شکار کیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔

"بات کیا ہے؟" — سجاد کے نرخرے سے آواز آئی۔
"سرتاج کا خیال چھوڑ دو۔"
"سرتاج؟ کون سی سرتاج؟"
اس وقت واقعی اس کے دماغ سے ہر نوعیت کی سرتاج نکل چکی تھی۔
"نحوست! بس خیال چھوڑ دو ورنہ میں جان سے مار دوں گا"
"وہ — وہ تو میری بہن ہے"
سوہنی نے پکے گھڑے پر ہاتھ مارا۔
زناٹے دار مکا جبڑے پر آ جما اور منہ میں لہو کی نمکینی اتر آئی۔
"بہن وہن کا ڈھونگ نہیں چلے گا۔ بس کل سے خیال چھوڑ دو اس کا"
ادریس کی بدقسمتی سے اسی وقت سرتاج ادھر آ نکلی پہلے تو اوبدا کر سجاد کے سینے سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس پر طرہ یہ کہ بھاگ جانے کے بجائے وہیں ٹکر ٹکر سرتاج کو دیکھنے لگا۔ ادریس کے اٹھتے ہی سجاد ناک کھجاتا فلیٹ بوٹ جھاڑتا کچھ کچھ سویا جاگتا پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ لہو کی پتلی سی دھار اس کے ہونٹوں سے رسنے لگی تھی سرتاج نے لمحہ بھر میں سارے معاملے کا پڑتا لگایا اور بھرے ہاتھ کا وہ طمانچہ ادریس کے منہ پر رسید کیا کہ ساری گیلری اس بھڑاکے سے گونج اٹھی۔ کچھ لڑکیاں لڑکے کتابیں اٹھائے چلے آ رہے تھے۔ اس فلمی منظر کو دیکھتے ہی وہ زعفران زار بن گئے۔ ادریس اس طرح جھکوس سے کچھ اس طرح زچ ہوا کہ گیلری سے بھاگا تو پھر کالج سے مائیگریٹ کر کے ہی دم لیا۔ اس دن کے بعد سے وہ ایسا دبو ہو گیا تھا کہ جس لڑکی کا نام س سے شروع ہوتا اس سے کسی قسم کا علاقہ ہی نہ رکھتا۔
کچھ تو ادریس دبا کھا کر سجاد کا حوصلہ بڑھ گیا کچھ سرتاج کا رویہ بزرگوں کا سا تھا۔ ہر کام میں وہ سجاد سے مشورہ لیتی ہر معاملے میں اس کی رائے معلوم کرتی۔ اس رویے نے سجاد میں ایک درجہ خود اعتمادی پیدا کر دی تھی۔ اگر ادریس کا واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تو شاید سجاد چند مہینے اور مکان نمبر ۱۳۱۳ تک نہ پہنچ سکتا لیکن جب سے ادریس کا ساکھا جاتا رہا تھا سرتاج نے کھلے بندوں سجاد کو سجاد بھائی کہنا شروع کر دیا تھا۔
سرتاج کا گھر پرانے گھروں کی طرح بند بند تھا۔ گھر لانے کی تقریب کوئی نہ تھی۔ وہ گھر سے یہاں آنے کا عزم بھی نہ کر کے آیا تھا لیکن نہ جانے وہ کون سی قوت تھی جو اس روز اسے سرتاج کے

ساتھ لے آئی تھی۔
لکڑی کے بڑے پھاٹک پر وہ دونوں رک گئے۔ سرتاج نے پاؤں سے ہیل والی جوتی اتاری اور اس کی ایڑی کو بڑی کھٹ داری سے پھاٹک پر بجایا۔
"سارا دن ہیل والی جوتیوں میں انسان تھک جاتا ہے۔ ہے نا بھائی جان"
گو بھائی جان کو سارا دن ہیل والی جوتیوں میں گزارنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن اس نے بڑی فراخ دلی سے غیر مشروط طور پر بات مان لی۔
"بات کیا ہے بھائی جان؟"
سجاد کی نظریں اس وقت سرتاج کے ننگے پیروں پر تھیں ایک جوتیاں اتار دینے سے اس میں کس قدر گھریلو پن کیسی نسائیت اور کس قدر سپردگی بڑھ گئی تھی۔ جی ہی جی میں اس نے اپنے آپ پر نفرین بھیجی۔
"ہائے بتائیے نا کیا بات ہے؟"
سجاد نے سر جھٹک کر گندے خیالات کو ذہن سے نکالا اور کھلنڈرے پن سے سرتاج کے سر پر چپت مار کر کہا "اور جو تم بگلی کو سب کچھ بتا دوں تو پھر ہمارے پاس کیا باقی رہے گا"
سرتاج ہولے ہولے ہنسنے لگی۔
جس وقت سجاد کی انگلیاں اپنی جیب میں پہنچیں ان میں سرتاج کے سر کا لمس انگاروں کی طرح دہک رہا تھا۔ وہ ننگے پیر کالی لڑکی کے پاؤں پڑنے ہی والا تھا کہ مکان کا بڑا دروازہ

کھل گیا۔

"کون ہے؟" ـــــ بھوبل جیسے بالوں والی عورت بولی۔

"ہم ہیں امیا۔ کب سے دروازے بجا رہے ہیں آپ کھولتی ہی نہیں ہیں۔"

"اچھا تاجی ـــــ میں سمجھی وہ بجلی کاٹنے والے آئے پھر!"

اس ایک جملے نے سجاد پر اس گھر کا سالانہ بینک بیلنس عیاں کر دیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے بڑی خاموشی سے گھر میں داخل ہوئے گھر سے باہر کھلی دوپہر تھی۔ بند آنگن میں گھستے ہی شام سرمئیاں چھا گئی آنگن کیا تھا چھتی گلی کی طرح بند۔ بند چاروں طرف دیواروں سے گھری تھوڑی سی خالی جگہ تھی۔ ایک جانب ہینڈ پمپ پاس ہی ایندھن اور اپلوں کا ڈھیر ایک پرانے کموڈ کا ڈھانچہ اور دو چار ایسے گملے پڑے تھے جن میں مرجھاتے ہوئے چنبیلی کے پودے تھے۔ ان تمام چیزوں سے ہٹ کر کونے میں ایک لوہے کا بوسیدہ سا پلنگ پڑا تھا جس پر کچھ بوریاں چند پرانے کھوکھے اور دو چار گھاس پھوس پڑے تھے۔ اس آنگن میں رک کر تاجی نے کنکھیوں سے سجاد کی طرف دیکھا اور پھر اسے اندر لے گئی۔

یہ کمرہ بیٹھک، کھانا کمرہ، سلائی گھر اور استری خانہ سب کچھ تھا، ممی کی امارت اور حال کی غربت بچھڑی بہنوں کی طرح گلے مل رہی تھیں۔ چھت پر پرانے زمانے کا انگلش ویشنگیا سیلنگ فین تھا جس کی ہوا فرش پر بچھے ہوئے بوسیدہ قالین پر پڑتی تھی۔ صوفوں کے اسپرنگ اچھے تھے لیکن پوشش پھٹے ہوئے فیشن کی یاد دلاتی تھی۔ دیواروں پر پرانے کیلنڈر، چغتائی کی تصویریں اور گجراتی گلدان لٹک رہے تھے تاجی اسے امیا کے پاس چھوڑ کر چلی گئی۔ یہ حسین فرنگ کسی زمانے میں تاجی سے بھی زیادہ قہرمان ہو گا لیکن اب اس مصری ممی سے خوف آتا تھا۔ "تاجی کے والد پانچ سال ہوئے فوت ہو گئے تھے تب ہم لوگ ایران میں تھے۔"

"بڑا افسوس ہوا سُن کر ـــــ"

مصری ممی بولی۔ "وہاں کی زندگی اور تھی وہاں کے لوگ کچھ اور طرح کے تھے وہاں تکلف اور دعوت کا رنگ عام زندگی پر غالب تھا۔ خیلے متشکرم ـــــ بندہ پروری است ـــــ ممنون دارم۔ . . . . . وہاں دلیسی باتیں تھیں از راہ تملق نہیں از راہِ ظاہرداری نہیں بیٹا یہ وہاں کا مزاج ہے ان کے بعد ہماری رشتہ داروں سے بنی نہیں ـــــ"

ممی پرانی یادوں میں کھو گئی۔

"تمہاری باتیں بہت کرتی ہے تاجی ـــــ میں نے کہا بیٹے بھائی کو گھر لاؤ تو ہم بھی دیکھیں ـــــ"

سجاد کے دل میں خراش سی چلنے لگی اس کا جی چاہا کہ لو پنچے ہو نیچے کہے ـــــ امیا میرے دل میں ـــــ میرے دل میں پنٹ ہاؤس کھوٹ ہے لیکن خیر ـــــ!

"میری تاجی جب ایران میں تھی تو فر فر فارسی بولتی تھی اب رو رو کہتی ہے کہ اردو پڑھنے میں دقت پیش آتی ہے۔ دراصل اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کی تعلیم یہاں کی نہیں ہے جو کچھ پڑھا ہے سو کونونٹ میں ـــــ بنیاد کمزور رہ گئی ہے۔"

اس وقت تاجی آ گئی۔ اس نے کالج کا چُست اور خوبصورت لباس اتار دیا تھا اور اب میل خوردے سے لباس میں فاختہ سی بنے رنگ نظر آ رہی تھی لیکن اس کا وجود ہی کچھ ایسا تھا کہ سجاد کے خیابان میں رنگ کا سیلاب لے کر آتا تھا۔

"شکنجبین پی لیجئے۔"

سجاد نے نمکینی مائل کم میٹھا لیموں پانی ڈگڈگا کر پی لیا۔ اس گھر میں غربت سُرخ خوان پوش سے ڈھکی ہوئی تھی۔ آدھے گھنٹے میں سجاد نے محسوس کیا کہ اس گھر میں وہ آسودگیاں نہیں جو اس کے تین منزلہ چھپیں کے فرشوں والے گھر میں ہیں لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ اس گھر میں ہینڈ پمپ سے پانی نکال کر عجیب راحت ہوتی یا باورچی خانے میں بیٹھ کر توے سے اترتی روٹی کھا کر حلق تک خوشی بھر جاتی دولت کے بعد اس گھر کا عجیب لطف تھا جیسے پلاؤ قورمے کے بعد کڑکی چھوٹی سی روٹی۔

تاجی کے حُسن کی بناوٹ رقبے پر رد اپڑ جانے او نچی عمارت میں بدل رہی تھی۔ اس ایوان کا جلوہ وہ خود اپنی نظر بچا کر دیکھتا تاجی کو دیکھ کر جو طوفان ناشکیبا اس کے جی میں اٹھتا اس اٹھتے تلاطم کو وہ کچھ ایسی طاقت بخشتا۔ کچھ ایسی کمزوری عطا کرتا کہ ساری محبت ایک بول میں مجسم ہو جاتی۔

ایک دن مصری ممی نے بے تکلفی سے کہا "تم تاجی کو اردو پڑھا دیا کرو گھڑی دو گھڑی، کمبخت وہ کوئی پروفیسر صمدانی ہے خواہ مخواہ بے چاری کو تنگ کرتا ہے۔"

"نہ امیا خواہ مخواہ بھائی جان کا وقت ضائع ہو گا" تاجی بولی۔

"تو ہم ماں بیٹے کی باتوں میں نہ بولا کر ـــــ ہاں" "پڑھا دوں گا جی۔ ضرور پڑھا دوں گا۔"

وعدہ تو سجاد نے بڑے کھلے دل سے کر لیا لیکن دل یہ سوچ سوچ کر نیم پریشان ہوا جاتا تھا کہ روز ۔ ہر روز کون تاجی تک قریب کا یوں متحمل ہو سکے گا اور بالفرض محال ہو بھی گیا تو وہ سب شعروں ساری عشقیہ شاعری کس انداز میں کس طور پہ سمجھانی ممکن ہو گی ۔

پہلے ہی دن بدشگونی ہوئی ۔ گرمیوں کے دن تھے ۔ ہینڈ پمپ سے ہٹ کر وہ پیپل کے پاس تاجی نے میز لگائی اس پر تنکے کا میز پوش ڈالا ۔ ٹیبل فین چلایا اور میز کے گرد دو کرسیاں رکھ کر وہ دونوں بیٹھ گئے ۔ پنکھے کی ہوا تیز تھی اور وہ صرف فاسٹ ہی پر کام کرتا تھا ۔ ساری ہوا تاجی کو چوم چاٹ کر سجاد تک آتی تھی ۔ تاجی کا دوپٹہ کبھی کاپی پر گرتا کبھی پھریرے کے جھال کی طرح سجاد کے منہ پر جا گرتا پہلے تو تاجی نے اسے کانوں کے اردگرد اڑسا پھر اسے سر پر اکٹھا کیا جب یوں بھی قابو نہ آیا تو اس نے اسے پیچھے والے پلنگ پر پھینک دیا ۔ سجاد کی نظریں ایک بار اٹھیں اور پھر تتر بتر ہو کر اس نے انہیں کاپی پر چسپاں کر دیا ۔

"کمبخت کو ذرا تمیز نہیں بار بار بھائی جان کو تنگ کرتا ہے ۔" وہ دوپٹے کے بارے میں بولی ۔

"کون کون سے شعر آج سمجھ میں نہیں آئے کالج میں ؟" اس نے سوال میں سے کپکپی کو منہا کرتے ہوئے کہا ۔

"یہ شعر تو نہیں چلتا بھائی جان ۔" تاجی اٹک اٹک کر شعر پڑھنے لگی ؂

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن
وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

سجاد نے تاجی کی طرف دیکھا ۔ دوپٹہ دور ہو کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں جھکورے کھا رہا تھا ۔ تاجی کے کھلے گریبان پر نسیم ہوا کی تھپکیاں پڑ رہی تھیں ، کندھے ، سینہ ، گردن ہوا کے دباؤ سے اطالوی بتوں کی طرح محتند اور جاندار لگ رہے تھے ۔

سجاد نے ایک دم نظریں جھکا لیں اور بولا ۔ "تاج بہن شعر کی دراصل ایک فضا ہوتی ہے جسے انسان کا احساس ٹٹول لیتا ہے ابھی آپ میں وہ احساس پیدا نہیں ہوا ہے اس لئے بہتر ہو گا اگر شعروں کی تشریح کرنے سے پہلے چند روز بلا ناغہ پانچ شعر یاد کیا کریں ۔ کچھ دنوں میں آپ کی بیک گراؤنڈ بن جائے گی پھر آپ کو شعر سمجھنے میں کچھ ایسی دقت محسوس نہ ہو گی ۔"

پہلے دن پڑھانے کی فضا کچھ ایسی نازک ہو گئی تھی کہ جلد ہی سجاد کو گھر لوٹ جانا پڑا ۔ دوسرے دن پہلے تو سجاد پڑھانے کے مرحلے یاد کر کے بدکتا رہا ۔ جتنی زیادہ ٹھنڈے آنگن کی یاد بھڑکتی تھی اسی قدر وہ اس

تکمّا پر شیریں سے ڈرتا تھا لیکن جب صبر کا یارا نہ رہا تو اس نے اپنا موٹر سائیکل نکالا اور مکان نمبر ۳۱۲ کی طرف چل دیا۔

آنگن میں پہلے ہی ٹیبل فین فل اسپیڈ پر چل رہا تھا۔ آج تاجی نے بال دھو رکھے تھے اور ہوا سے کچھ ہٹ کر یوں بیٹھی تھی کہ اس کے بال فضا میں تیر رہے تھے جل پری کی طرح، ہملیٹ کی اوفیلیا کی مانند۔

"بھائی جان میں نے جو شعر یاد کئے ہیں سنیں گے تو خوش ہو جائیں گے سچ!"

سجاد ذرا اڈرا کرسی کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ تاجی فر فر شعر سنانے لگی۔ سجاد کی سیاہ عینک میز کے کنارے پڑی تھی۔ تاجی نے شعر سنا کر اسے اٹھا لیا اور سانس کی نم دے کر اسے پونچھنے لگی۔

"اس شعر کے معنی میری سمجھ میں نہیں آئے بھائی جان

ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو
انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے؟"

"ابرام کے معنی جانتی ہو۔ تاج بہن؟" بہن کا لفظ بڑی مشکل سے نکلا۔

"جی نہیں" سبز رنگ آنکھیں بھی ساتھ ہی بولیں
"کسی ڈکشنری میں اس کے معنی تلاش کئے تھے؟"
"فیروز اللغات میں اس کا مطلب نہیں ہے بھائی جان۔"
"اچھا۔"

عینک صاف کر کے تاجی نے سجاد کی کہنی کے پاس رکھ دی۔

"ابرام کے معنی ہیں اصرار، تاکید، مطلب سمجھ گئیں اب؟"

"جی نہیں۔"

"شعر دوبارہ پڑھو اور ابرام کے معنی ذہن میں رکھو۔"

تاجی اس کی طرف دیکھ کر شعر پڑھنے لگی پھر نہ جانے کیا ہوا کہ جھٹ اس کی نگاہیں جھک گئیں اور چہرے پر کوندے کی طرح سرخی لپک گئی۔

سجاد نے اپنی حفاظت کی خاطر جلدی سے عینک کو پکڑ لیا اور پروفیسر صمدانی کے لہجے میں بولنے لگا۔ "چلئے یہ شعر صاف ہو گیا اب میں تمہیں چند شعروں پر نشان لگائے دیتا ہوں یہ حفظ کر لینا۔"

وہ پنسل لے کر دیوان غالب میں تصوف کے شعر ڈھونڈنے لگے۔

"مسدس حالی پڑھا ہے۔"

"جی نہیں۔"
"کوئی ناول وغیرہ۔؟"
"جی نہیں۔"
"کمال ہے کوئی ناول نہیں پڑھا آپ نے۔"

"سچ سچ بتا دو ناں بھائی جان؟" تاجی نے ہریل طوطوں کے پر پھڑپھڑا کر پوچھا۔

"ہاں ہاں بتا دو مجھ سے کیا شرم؟"
"کاماسوترا پڑھی ہے جی۔"

سجاد کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی

"میں انگریزی کی کتابوں کا ذکر نہیں کر رہا، اردو کی کتابوں کا پوچھتا ہوں۔"

"جی نہیں۔" بجھا سا جواب آیا۔
"اچھا۔!"
"آپ نے پڑھی ہے کاماسوترا؟"

اب اس نے لہجے میں درشتی بھر کر جواب دیا۔

"نہیں۔"
"اور لیڈی چیٹرلز لور۔"

فضا نہایت ناساعد ہو چلی تھی۔

"نہیں۔"
"اور ٹروپک آف کینسر؟"
"نہیں۔"

"دیکھئے بھائی جان ہماری مسز یہ کتابیں پڑھنے نہیں دیتی تھیں، ہم انہیں چھپا کر پڑھتے تھے۔"

"جن کتابوں کو چھپا کر پڑھنے کی نوبت آئے انہیں پڑھنا نہیں چاہئے۔"

تاجی کے کان کی لویں بھک بھک جلنے لگیں۔

"دیکھئے کوئی اور ہوتا تو میں یہ بات نہ کہہ سکتی تھی لیکن ان کتابوں میں برائی کیا ہے آخر۔"

پینترا بدل کر سجاد بولا۔ "پڑھ کر بتاؤں گا۔"

شعروں کی خالص روحانی فضا اور عقیدت کی پر آشوب وادی میں سے جب وہ صحیح و سالم نکلا تو اس کے دل میں بڑی خود اعتمادی پیدا ہو گئی لیکن اس خود اعتمادی کے باوجود جسم بخار کی سی کیفیت میں مبتلا تھا۔ دل کو کوئی جھانویں سے رگڑ رہا تھا۔ بار بار جی میں آئی کہ لوٹ جائے اور تاجی سے کہے کہ بہت دل بے قابو کو سمجھاتا ہوں لیکن یہ ڈرتے

مارنے سے باز نہیں آتا پھر سوچتا تا جی نے پہلے دن ہی سے کہا تھا کہ بہن کہنا آسان ہے اس رشتے کو نبھانا مشکل ہے ممکن ہے جس پلاٹ پر چڑھ کر وہ عمارت تعمیر کر رہا تھا۔ اس پلاٹ کے گرتے ہی ساری عمارت ڈھے جاتی؟

اسی ادھیڑبن میں اپنے کمرے کی جانب جا رہا تھا کہ ایک وردی پوش نے چیتے کی سی حبت بھری ادا سے بوٹے کے چیلے کی طرح ثابت و سالم اٹھا لیا۔

"ارے فواد بھائی، تم کب آئے؟"

"ابھی آیا ہوں کوئی گھنٹہ بھر ہوا تم کہاں غائب رہتے ہو، امی بہت شکایت کر رہی تھیں تمہاری عدم موجودگی کی۔"

میجر نے بھرپور دھپا اس کے کندھے پر مار کر کہا۔

"یہیں تو رہتا ہوں سارا سارا دن۔"

میجر فواد میز پر خالص فوجیوں کے انداز میں بیٹھ گیا۔

"اماں مشکوک ہو رہی ہیں — TAKE CARE"

"خواہ مخواہ۔"

"کہتی ہیں سدرتا اپنی کلاس فیلو کو پڑھانے جاتے ہو" آنکھ مار کر فواد نے سوال کیا۔

سجاد کو وہم و گمان تک نہ تھا کہ امی اس کے بیرونی مشاغل سے اس حد تک واقف ہیں۔

"تم لوگوں کے مزے ہیں، پڑھانے کو بھی گرلز ہی ملتی ہیں اور ہم لوگوں کو کورس ان پڑھ رنگروٹ پڑھانے پڑتے ہیں انڈے ڈنڈے کی مدد سے۔"

"انڈے ڈنڈے کی مدد سے؟"

"بھئی وہ لوگ نہ تو ورڈ سمجھتے ہیں نہ ایلفابیٹ ہمیں تو بتانا پڑتا ہے۔ ڈنڈا یعنی سیدھا الف اور گولائی یعنی انڈا، اچھا یہ بتاؤ 8 میں کتنے ڈنڈے ہیں؟"

"تین۔" سجاد نے جواب دیا

"ماٹ اور بی میں کتنے ڈنڈے ہوتے ہیں؟"

"ایک۔"

میجر فواد نے مسکرا کر کہا۔ "بس۔ ایک ڈنڈا اور دو انڈے، ہم نے تو سارا علم بتا دیا اب تم ہمیں اپنے اسٹوڈنٹ سے کب ملاؤ گے؟"

"وہ۔ وہ میری بہن ہے۔"

سجاد راجہ گوپی چند کی طرح راج پاٹ چھوڑ اپنی سولہ سورنیل سے تعلق توڑ رانی میناوتی کو اپنی بہن کہہ رہا تھا۔

فکر نہ کرو آج رات وہ جلد سو جائے گی

"بہن؟" پریکٹیکل فوجی نے پوچھا۔ "بہن بنانے کی کیا نوبت پیش آگئی تھی، ایسی غلطی ایمرجینسی میں بھی نہیں کرنی چاہیے۔"

سجاد کا خون کھولنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے فواد اس کے رابطے کو شبہ کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ کوکھ کی سوگند سے پرے بہن بھائی کا رشتہ جیسے ممکن ہی نہ تھا۔

"تم لوگوں کی نازک جس پریڈ کی نذر ہو جاتی ہے تم لوگ مشینی زندگی بسر کرتے ہو۔ دو زندگی کو معراج زندگی اور گھٹیا جذبات کو حاصل حیات سمجھتے ہو، تم کیا جانو کہ منہ بولے بہن بھائی کیسے ہوتے ہیں۔"

"ارے رے رے۔ آئی ایم سوری میں کیا جانتا تھا کہ اس معاملے میں تم اس قدر TOUCHY ہو۔" وہ منہ لٹکا کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے ہاف ماسٹ جھنڈا دیکھ لیا ہو۔ ایک دم سجاد کو اپنی بے وقوفی پر غصہ آگیا۔ بے چارہ بڑا بھائی ہو کر کیسے دبتا تھا۔

"کتنی چھٹی ہے تمہاری؟"

"کل تین دن، آج کا دن ملا کر۔"

"کہیں سیر وغیرہ کو لے چلوں۔"

"AS YOU LIKE"

"چلو تمہیں تا جی سے ملا لائیں، تم خود دیکھو گے کہ پاکیزہ لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں؟"

یہ جملہ اس نے مداوے کے طور پر کہا تھا لیکن فواد کے دل میں تا جی کو دیکھنے کی بڑی شدید تمنا جاگ اٹھی۔ اس تمنا میں سے چقماق کی سی چنگاریاں جل بجھ اٹھیں اور وہ یہ تجزیہ نہ کر پایا کہ وہ تا جی کو کیوں دیکھنا چاہتا ہے؟

دونوں بھائی جب بند بند آنگن میں داخل ہوئے تو تا جی

جارحانہ جانور کی طرح بھڑک اٹھی اس کی گود میں مسدس حالی تھا اور وہ زور و شور سے شعر رٹنے میں مشغول تھی۔

"میں آج اپنے بھائی جان کو بھی ساتھ لایا ہوں، مجھ سے چھ سال بڑے ہیں لیکن ہم میں بہت بے تکلفی ہے میجر فواد مرتاج صاحبہ۔"

فواد نے ایڑیاں جوڑ کر ٹھک ملٹری سیلوٹ جڑ دیا۔

تاجی زیر لب مسکرائی میز پر مسدس حالی رکھا تھا اور آہستہ سے بولی۔ "آپ بیٹھئے میں امتیا کو بلاتی ہوں۔"

امتیا کے ساتھ ایک بار پھر ہلکی چاشت والی نمکینی مائل شکنجبین آگئی۔

"آپ ملٹری میں ہیں؟"

"جی۔"

"کیپٹن ہے؟"

"جی۔ میجر ہوں، میجر فواد۔"

مصری ممی کے چہرے پر بہت دنوں بعد رنگ ابھرا۔

جب تاجی کے ابا زندہ تھے تو ہم لوگ ایران میں رہتے تھے وہاں کے لوگوں میں بڑی محبت، بڑی یگانگت کا جذبہ ہے انکساری تو ایسی کہ گھر آئے مہمان کا دس دس مرتبہ شکریہ ادا کرتے تھے۔ خیلے متشکرم ممنون ام۔ ایں خانہ شما است۔ ادھر آکر تو ہم اجنبی سے محسوس کرتے ہیں کسی سے میل ملاقات ہی نہیں سجاد میاں یہ تم نے اچھا کیا اپنے بھائی جان کو ساتھ لے آئے۔"

امتیا بڑے دنوں بعد بے تکان بولے چلی جا رہی تھی۔ فواد کے ہاتھوں میں نیوپانی تھا اور وہ نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔ جب بھی اس کی نظریں اٹھتیں تاجی تک ضرور پہنچتیں، ایک ایک نظر سجاد کے دل میں بھالے کی طرح چبھ رہی تھی۔

رفتہ رفتہ فواد ان باتوں میں شامل ہو گیا، میس کی زندگی، جونوں کے لطیفے، پریڈ کی باتیں، چھاؤنی کے شب و روز اس گھر میں اتر آئے تھے۔ ماں بیٹی بات بات پر ہنس رہی تھیں اور سجاد منہ پر قفل لگائے دل کو سارس کی طرح غم کے پروں میں چھپائے چپ بیٹھا تھا۔

واپسی پر ابھی وہ ٹیکسی تک پہنچے تھے کہ فواد چہک اٹھا۔ جناب ہم تو قائل ہو گئے آپ کی پسند کے۔"

سجاد اس عقوبت کے لئے تیار نہ تھا۔ سر سے پیر تک لرز گیا۔

"میں تو گھر پہنچتے ہی کہوں گا امی ہمارے لئے تو سجاد نے مصر کا چاند تلاش کر لیا ہے حضرت یوسف کو مصر کا چاند کہتے تھے نا مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں۔" سجاد کے دل میں حضرت زلیخا نے ہاتھیں اٹھا کر شیون کرنا شروع کر دیا۔

کیا سوچ رہے ہیں جناب؟ I hope you don't mind فواد نے اس کی کمر پر دھپا مار کر کہا۔

"نہیں نہیں بھئی میری تو وہ بہن ہے۔"

اس جملے نے سجاد کی خوشیوں کو مٹی سے ڈھانک دیا۔ امی نے سرتاج کے متعلق بہت مین میخ نکالی لیکن فواد فوجی آدمی تھا امی کے ہر حملے کے لئے اس نے بس ایک ہی خندق کھود رکھی تھی، فوراً جواب دیتا۔ "دیکھئے امی اب میں آپ سے کہہ رہا ہوں اور آپ انکار کر رہی ہیں، پھر آپ کی جانب سے اصرار ہوگا اور میں کورا جواب دوں گا۔"

امی اس فوجی ہٹ کو دیکھ کر سوسو کرنے لگیں، سجاد کو کہنے سننے کا کیا موقع ملتا وہ تو پہلے ہی ہاتھ کٹوا چکا تھا تاجی کو بہن کہہ چکا تھا اب بہت رکھنی لازم تھی۔ بظاہر اس میں کسی قسم کا نقص بھی نہیں نکل سکتا تھا جب امی بالآخر سرتاج کے گھر روانہ ہوئیں تو بے چارے پر ایسی افتاد پڑی کہ منہ سر لپیٹ کر اوندھا لیٹا رہا۔ کبھی جی کو سمجھاتا کہ بہن کہہ کر نہ سمجھنا انتہائی ذلالت ہے، کبھی سوچتا اور جو کہیں فواد سے اس کا رشتہ طے ہو ہی گیا تو ساری زندگی ملیا میٹ ہو جائے گی جب جی سے جھگڑے دل کو سمجھاتے بہت شام ڈھل گئی تو وہ اپنے وجود سے سینچر اتارنے سرتاج کے گھر پہنچا۔

آج وہاں ٹیبل فین تھا نہ پڑھنے پڑھانے کی میز، بند بند آنگن میں آج ہر طرف اجنبی رنگ تھا۔ وہ چپ چاپ لوہے کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ سارا گھر خاموش تھا۔ بچپن میں اسے اس کی انا جو جو سے ڈرایا کرتی تھی سو جاؤ جلدی ورنہ جو جو آجائے گا دودھ پی لو نہیں تو جو جو اٹھا کر لے جائے گا۔ چلو نہاؤ، اچھا نہیں نہاتے نہ سہی آنے دو جو جو سمجھ لے گا تم سے ـ آج اسے ان کمروں میں کسی جو جو کے ٹہلنے کی دبی دبی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ کئی بار اس نے اٹھنے کی ہمت کی، کئی بار اٹھ اٹھ کر بیٹھا، نہ تاجی کو آواز دینے کی ہمت باقی تھی نہ اس سے ملے بغیر چلے جانے کا حوصلہ باقی رہا تھا۔ کئی بار سورۃ الناس پڑھی کئی مرتبہ آنکھیں بند کر کے جی کو سمجھایا لیکن جی پر ایک طغیانی کیفیت طاری تھی بالآخر اس نے اٹھ کر ہینڈ پمپ چلایا اور منہ پر چھینٹے مارنے میں مشغول ہو گیا۔

پیچھے سے کسی کی آواز آئی۔ "لائیے میں نلکا چلا دوں؟"

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"تم ہو تاجی ؟"
"جی ۔"
آنکھوں کے طوطے آج روتے ہوئے تھے، سارے چہرے پر آنسوؤں کی چھاپ تھی، اس سیاق و سباق کی روشنی میں اس نے آہستہ سے کہا۔ "تاج ۔"
اس ایک لفظ میں مہینوں کا بحران مقید تھا
"جی بھائی جان۔"
"آج پڑھو گی نہیں ؟"
"اب کیا پڑھنا ہے جی۔" وہ لب کاٹ کر بولی
"کیوں ؟"
تاجی کے ہر پل پھر آنسوؤں سے بھیگ گئے اور اس نے منہ پرے کر کے کہا۔ "آپ کو معلوم نہیں ہے کیا ؟"
ان آنسوؤں میں کسی جودھا کی آتما پھونک دی تھی۔
"امی آئی تھیں ؟"
"جی ۔"
اب سجاد نے پہلی مرتبہ ڈرتے ڈرتے تاجی کے بائیں ہاتھ کی تین انگلیاں پکڑ لیں۔
"پھر ۔ ؟"
"امیّا مان گئی ہیں ۔"
"تمہارا کیا خیال ہے ؟"
قبولیت کا لمحہ آیا اور سر نیہوڑائے ہوئے گزر گیا اسی وقت مصری ممی بالوں کو تولیے سے پونچھتی کھڑاویں کھٹکاتی اندر سے برآمد ہو گئیں۔ سجاد کے ہاتھ سے تاجی کی انگلیاں چھوٹ گئیں جو ملے کا ملکوز اس کی شریانوں میں پہنچا بند ہو گیا۔
"میں تمہارا کس منہ سے شکریہ ادا کروں سجاد۔ ایسے لوگ صرف ایران میں دیکھے ہیں۔ بیگانوں کو اپنوں سے سوا چاہنے والے تم نے تو وہ کچھ کر دکھایا جو سگا بھائی بھی نہ کر پاتا تم نے قول کو فعل کر دکھایا، زبان کی لاج رکھ لی۔"
جو ربط مضمون جو ہر مند لشت جو البتہ ابھی چند لمحے پہلے اس کے دل میں تشکیل پائی تھی غش کھا کر جا پڑی۔
میں نے تمہاری امی سے کہا کہ بھئی دلہن بھاگ تمہارے ہیں کہ ایسی صالح اولاد کو جنم دیا۔ ہمارے لئے تو سجاد فرشتۂ رحمت ثابت ہوا۔ ہم تو یہاں اجنبی تھے جب تاجی کے والد زندہ تھے تو ایران میں تھے، ہم لوگ یہاں آکر کسی سے میل ملاقات قائم نہ کر سکے سجاد نے تو کوکھ جنے سے بھی زیادہ حق ادا کیا۔"
وہ خاموشی سے بیٹھا ایران کے لوگوں کی باتیں سنتا رہا اس وقفے میں خدا جانے کتنی کم عمر تمناؤں کا استقراض ہو گیا۔
"بس ایک فکر ہے مجھے ۔"
جاڑے کے بادلوں میں پہلی بار سورج نے شکل دکھائی۔
"جی وہ فکر کیا ہے ۔"
اسی ایک فکر پر اس کی ساری امیدوں کی اساس تھی۔ یہ فکر چھوٹی چھوٹی کشتیوں کا پل تھا جو آناً فاناً چڑھے پانیوں پر تعمیر ہو گیا تھا
"کہئے کہئے میں سن رہا ہوں۔"
"آپ کی امی کہتی ہیں کہ فواد کی کل تین دن کی چھٹی ہے اس عرصے میں نکاح ہو جانا چاہیئے کم از کم۔ بھلا اتنی جلدی انتظام کیونکر ہو گا ؟"
سجاد کو محسوس ہوا جیسے کسی نے لمبا ڈنڈا اس کی ہتھیلی پر رکھ کر اسے سیدھا رکھنے کی قید لگا دی ہو اس جھونک کے سنبھالنے میں اس کا بازو شل ہو گیا۔
"پھر آپ نے کیا سوچا ہے امیّا ۔ ؟"
"تمہاری کیا رائے ہے، تمہاری بہن ہے تم جو مشورہ دو گے میں عمل کروں گی۔"

**جگوان کی کرپا**

مرسلہ: [illegible]

خاندانی منصوبہ بندی کا ہندوستان میں چرچا ہوا تو ایک سکھ ڈاکٹر کے پاس گیا اور پرستی ہوئی اولاد کے سدباب کے لیے مشورہ مانگا۔ ڈاکٹر نے ہمدردانہ لہجے میں جواب دیا: "سردار جی یہ گولیاں دیتا ہوں گھر والی سے کہو کہ انہیں استعمال کریا کرے۔" "مہاراج یہ علاج تو کر دیکھا۔ گرو جی کی کرپا سے سنت سنگھ پیدا ہو گیا ۔۔۔"
"اچھا تو پھر یہ گولیاں ہیں۔" ڈاکٹر نے دوسری قسم کی گولیاں تھماتے ہوئے کہا۔ "یہ خود کھا لیا کرو۔" "مہاراج یہ علاج بھی کر دیکھا، گرو کی کرپا سے فتح سنگھ ہو گیا۔" "اچھا تو پھر مستری طریقہ بہت بیکار" ڈاکٹر نے کہا۔ "مہاراج یہ بھی کر دیکھا، گرو جی کی کرپا سے منت سنگھ ہو گیا۔" "تو پھر ایک ہی علاج ہے۔" ڈاکٹر نے جل کر کہا۔ "بیوی کے پاس نہ جایا کرو۔" "مہاراج یہ بھی کر دیکھا۔" سردار جی نے منہ لٹکا کر کہا۔ "گرو جی کی کرپا سے منت سنگھ ہو گیا۔"

سجاد نے سر جھکا لیا اتنے تھوڑے سے وقفے میں اتنے سارے علی الحساب دھچکے کھا کر وہ سن ہو گیا تھا اس قسم کی روبکاری کے لئے وہ ہرگز تیار نہ تھا۔

"پھر کیا سوچا ہے تم نے؟ تمہاری امی کہتی ہیں نکاح ضروری ہے، رخصتی بہار میں ہو جائے گی، کہو تم کیا کہتے ہو؟"

تین دن میں نکاح ۔ اور بہار میں رخصتی ۔ آڑو اور آلوچے کے شگوفوں کے ساتھ ۔ جب کھٹے کے درختوں میں پھل لگتے ہیں نارنجی اور سویٹ پیز کے پھول کھلتے ہیں خود رو گھاس کے تختوں پر بیٹھی ہوئی نئی نویلی دلہن ہریل طوطوں کو سوا اینچ لمبی جھلملیوں میں چھپائے انار دانوں کو سرخ خوان پوش میں بند کئے ۔ جھپاک سے سارا نفع تاجی کا ہو گیا اور وہ منہ تکتا رہ گیا ۔

سجاد کے لئے اب کوئی چارہ نہ تھا اس نے حالات کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے نکاح کے سارے انتظامات خود کئے وکیل گواہ کی جگہ دستخط کئے اور اپنے ہاتھوں تاجی کو فواد کی تحویل میں دے دیا۔ اتنے تھوڑے سے وقفے میں اتنے سارے حادثات نے ریل پیل کر اسے نیم جان کر دیا تھا۔ تاجی کے نکاح سے دوسرے دن فواد پنڈی چلا گیا لیکن سجاد میں ہمت پیدا نہ ہوئی کہ وہ مکان نمبر ۲۴۳ تک جا سکتا۔ کبھی جی میں آتا کہ تونبی لے کر گلیوں میں گاتا پھرے، کبھی دل میں سماتی کہ یثرب کا ٹکٹ خریدے اور گنبد خضرا کے مکین سے جا کر کہے کملی والے' دل کے چور کو کچھ تو سمجھا دے یہ جینے تو دے، دم بھر کو سانس تو لینے دے اور جو کہیں اس نکاح کی منسوخی ہو جائے تو عمر بھر یہیں اسی روضے کی جالی پر بیٹھا رہوں۔

نہ جانے یہ سجاد کی تمنا کی غیبی کارکردگی تھی یا فواد کا بے احتیاطی سے موٹر چلانا شکست و ریخت کا باعث بنا، بہرکیف نکاح سے پورے دو ماہ بعد اچانک فواد کا موٹر سائیکل بھٹے کی اینٹوں سے لدے ہوئے ٹرک سے ٹکرا گیا۔

سجاد کے زائچے میں حالات کے الٹ پھیر کی یہ نوعیت نہ تھی برسوں اسے یہی محسوس ہوتا رہا جیسے چیلیں ٹھونگیں مار مار کر اس کا بھیجا کھا رہی ہوں۔

٭

تاجی کے بالوں میں سفیدی آ چلی تھی لیکن آنگن وہی تھا اسی طرح کونے میں لوہے کا پلنگ پڑا تھا۔ پرانے کھانچے کھوکھے کموڈ کا ڈھانچہ وہیں تھا۔ بلکہ تبدیلی آئی تھی تو تاجی میں۔ اس کے لب سوتے ہوئے توام بچوں کی طرح آپس میں سلے رہتے۔ ہریل طوطے اب فاختہ رنگ اور بے حال ہو چکے تھے باتوں میں نہ وہ دلربائی باقی تھی نہ آواز میں مجیرے بجنے کی کیفیت، برسوں کی خاموشی نے اندر ہی اندر اسے کھنگال ڈالا تھا۔

خشک سی شام تھی

منڈیر پر شام ڈھلے گھر جانے والی چڑیاں چہچہا رہی تھیں آنگن میں رات کا سا سماں تھا۔ سجاد اندر داخل ہوا تو اس کے ہاتھوں میں بہت ساری کاپیاں تھیں اور پی ایس سی اردو کے پرچے تھے۔ یہ سارے پرچے اسے ساتوں رات دیکھنے تھے وہ لمبی سی سانس لے کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

آج اس کی کمر میں بہت درد تھا اور وہ ایم اے کی کلاس کو پڑھانے کی بجائے ساری دوپہر اسٹاف روم میں بیٹھا چائے اور اسپرو چبا رہا تھا۔ نہ جانے اتنے سارے سال کیونکر گزر گئے بغیر کسی تصفیے کے بغیر کسی سمجھوتے کے۔ وہ ہمیشہ کی طرح شام کو تاجی کے گھر جاتا تھا اور گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر گھر لوٹ جاتا تھا۔ وقت سے بہت پہلے اس کے سارے بال سفید ہو چکے تھے اور نوجوانی ختم ہونے سے پہلے امی نے اسے شادی پر رضامند کرنا چھوڑ دیا تھا۔

آج اس کی کمر میں بہت درد تھا اور ابھی سارے پرچے دیکھنے تھے اس نے پلنگ کی آہنی پشت سے سر لگا کر آنکھیں بند کر لیں اسے علم نہ تھا کہ ساری عمر اسی طرح ڈھل جائے گی۔

"چائے لاؤں بھائی جان۔" ٹھٹھری سی آواز آئی
"نہیں۔"
سجاد نے نظریں اٹھا کر تاجی کی طرف دیکھا۔ کیسی کوڑیالی جوانی تھی اس جوانی کا رم خوردہ اب سانپ کی لکیر کو غور سے دیکھنے لگا۔
"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے آج۔"
"ہاں۔"
مصری سی سویوں کا گرم گرم بھاپ چھوڑتا کٹورہ لے آئی اس کا زرد پا سر کندھے پر پارے کی طرح مسلسل ہل رہا تھا۔
"سویاں کھا لو بیٹا۔"
"بھوک نہیں ہے امیا۔"
وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔
"سجاد۔"
"جی۔"
"تم سا بے لوث محبت کرنے والا میں نے کوئی نہیں دیکھا۔"
برسوں بعد سجاد کی نظر تیزی سے چلنے لگی۔
"تمہارا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا، کوئی مرے ہوئے بھائی کے ساتھ یوں مٹی ہوا ہے۔"
موٹے موٹے آنسو اس کی عینکوں پر آگرے
تاجی کا اگر کوئی اصلی بھائی بھی ہوتا تو یوں ساری عمر نہ گنواتا جس طرح تم نے گنوادی۔"
تاجی آہستہ آہستہ واپس جانے لگی۔
"تم شادی کر لو بیٹا۔" امیا نے بھربھرے سے لہجے میں کہا۔
"شادی۔۔؟ اب بہت دیر ہوگئی ہے امیا۔"
تاجی نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں پلٹ کر دیکھا اور چلنے لگی۔
"اور ذرا سوچو امیا وہ کون سی عورت ہے جو میرے اور تاجی کے رشتے کو سمجھ پائے گی۔ جو تاجی کو میری بہن۔ میری بھابی سمجھے گی لوگ تو اصلی رشتوں کو کچھ نہیں سمجھتے، بولے منہ بولے رشتوں کو کوئی کیا جانے گا؟"
آنگن میں رات چھا گئی وہ لوہے کے پلنگ پر اب بھی خاموش بیٹھا تھا۔ امیا کبھی کی سو چکی تھیں۔ آنگن کے اوپر چھوٹے سے سیاہ سماں میں مدھم مدھم ستارے دہک رہے تھے۔ وہ ایک دم اپنے آپ سے اپنی زندگی سے تھک چکا تھا اور رات ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ پھر دروازہ کھول کر تاجی نکل آئی۔ آج وہ مصری سی لگ رہی تھی جس کا روپ کسی زمانے میں بہت قہرمان ہوگا۔
"گھر نہیں جائیں گے سجاد بھائی۔"
"گھر؟ کون سے گھر؟"
"اپنے گھر۔؟" تاجی نے بہت آہستہ سے کہا
"نہیں۔!" سجاد نے نظریں اٹھا کر جواب دیا وہ دونوں کئی قرن خاموش رہے پھر سجاد نے رکی رکی آواز میں کہا۔ "امیا کے ساتھ والے کمرے میں میرا بستر لگا دو، میں اب گھر نہیں جاؤں گا۔"
یہ فیصلہ کئی برسوں سے چمگادڑ کی طرح اس کے ذہن میں گھوم رہا تھا۔ "لیکن۔ لیکن۔ سجاد بھائی لوگ کیا کہیں گے؟"
"کیا تمہیں کچھ شبہ ہے؟"
"نہیں بھائی جان لیکن۔"
"میں نے تمہیں پہلے دن کہہ دیا تھا کہ ہم بات نبھانے والے ہیں جب ایک بار بہن کہہ دیا تو ساری عمر سمجھیں گے۔"
وہ کاپیوں کا گٹھا اٹھا کر امیا کے ساتھ والے کمرے میں داخل ہو گیا۔ قبولیت کا آخری موقع آیا اور گردن جھکائے چپ چاپ تاجی کے پاس سے ہو کر گزر گیا۔ تاجی نے لوہے کے پلنگ پر اپنا آپ چھوڑ دیا نہ جانے اتنی ساری سسکیاں کب سے اس کے سینے میں مقید تھیں؟

ہر اُس گھر کا عکاس جہاں کوئی بیٹی موجود ہے!

بات تھی بھی پریشانی کی۔
"اچھے خاصے موگرے کے جھاڑ میں ببول کا کانٹا اگ آیا تھا۔"
لوگ پھول کلیاں چننے آتے زخم کھا کر جاتے۔ کسی کی انگلیاں زخمی ہوتیں کسی کا دل۔ خواہ مخواہ لوگوں کے دامن الجھتے تھے اس کانٹے میں۔
اس میں تھا بھی کیا ۔۔۔۔ ؟ بس دو گہری سی بولتی آنکھیں ہی تو تھیں نا جو ڈسے لیتی تھیں سب کو یا پھر تیس چمکتے ہیرے داروں کو جل دینے والی مستانی زبان جو زنجیر بنتی تھی جال پھینکتی تھی ۔۔۔۔ اور ان زنجیروں میں اس کے ہم عمر لڑکے الجھے تو الجھے لیکن چالیس سال کے پورے پکے مردوں کے قدم بھی اٹک اٹک جاتے تھے۔
اب تو اماں بھی اس کانٹے سے تنگ آ چکی تھیں۔
اور ابا تو سرے سے اسے اپنا خون مانتے ہی نہ تھے۔
وہ سارے خاندان کے حلق میں اٹکی ہوئی تھی، سانپ کے منہ کی چھچھوندر سمجھ لو۔ نہ نگلی جائے نہ اگلی جائے۔ پانچ برس پہلے کسی کو کیا گمان تھا کہ وہ چنچل آنکھوں والی عام سی لڑکی، جو ایک دفعہ مل کر بالکل بھلا دینے والی شے تھی یوں خاندان والوں کے ذہنوں سے چپٹ کر رہ جائے گی۔ ماموں، چچا، خالہ، پھوپھی سب کے یہاں ہی اس کا ذکر زور و شور سے ہو رہا تھا۔ اس کی آواز ریڈیو پر گونج کر سب کے دلوں کو چھیدتی ہوئی اب بھی ان کے کانوں میں گھنٹیاں بجا رہی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک تنگ سی گلی کے اندھیرے کمروں والے مکان میں پلنے والی وہ لڑکی ریڈیو پاکستان تک یوں اچانک جا پہنچے گی۔ آخر اس نے اتنی جرأت کیسے کی کہ وہ عزتی خاندان کی لڑکیوں کے نام اچھالے ۔۔۔۔ وہ جیسی بھی ہے جو کچھ بھی ہے ہے تو آخر خاندان کی عزت۔ کہاں ہم نے لڑکیوں کو آٹھ جماعتوں سے آگے پڑھنے نہ دیا۔ کہاں وہ مردوں میں بیٹھ کے سارے جہاں کو اپنی آواز سنا رہی تھی۔ یہ سب کچھ خدیجہ بیگم کی ڈھیل ہے ان ہی کی شہ پر یہ لڑکی ہاتھوں سے نکلی ہے ۔۔۔۔ سب کی متفقہ رائے یہی تھی ۔۔۔۔
ریڈیو کی بات کچھ کم نہ تھی کہ یہ بھونچال بھی آ گیا کہ اس نے ایک دوائیوں کی کمپنی میں نوکری کر لی ہے۔ خاندان کی غیرتوں پر کندیں ڈال دی تھیں اس نے۔ سب سے پہلے تو بڑے ماموں دندناتے پہنچے: "خدیجہ بیگم سنبھال لو اپنی بیٹی کو۔ ننھیال کا نام ڈبو رہی ہے۔ پہلے تو ریڈیو پہ آ کر سارے جہاں کو اپنی آواز سنانے چلی تھیں تمہاری سریلی بیٹی اور اب نوکری کر رہی ہے۔ قسم سے خدیجہ اگر میری بیٹی ہوتی تو ٹانگیں توڑ کر گھر میں ڈال دیتا۔ بڑی ہے۔ کوئی اشتہار نہیں۔ گھر میں سنبھال کر رکھنے کی چیز ہے سنبھال رکھو۔ نہیں سنبھالی جاتی تو کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کے سر تھوپ دو۔"
اور اماں نے دبے لفظوں اتنا ہی کہا کہ بھیا فالتو تو نہیں میری بچی جو کسی ایرے غیرے کے تھوپ دوں۔ آپ نے آفاق کے لیے اسے مانگ لیا ہوتا تو یہ نوبت آتی۔ خاندان کی ساری لڑکیاں خاندان ہی میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ لیکن میری بچی کے لیے خاندان میں کوئی لڑکا نہیں بچا تو پھر خاندان والوں کو اس کی فکر بھی نہیں ہونا چاہیے۔ وہ جو کچھ کرے گی آپ ہی بھگتے گی۔ میرا تو خون ہے۔ میں اسے جان بوجھ کر کسی غلط ہاتھ میں تو نہیں دے سکتی۔ اور بڑے ماموں ناراض ہو کر چلے گئے۔ لیکن چچا میاں نے تو آتے ہی کہا کہ بھابی پیسوں کی اتنی ہوس اچھی نہیں ہوتی۔ بیٹی کی کمائی سے محل کھڑے کرو گی۔ شاید بھیجو رہے آخر بھتیجا ہے حالانکہ چار بچوں کا باپ ہے۔ اور

بچھڑ کر صرف بھیجا ہے۔ دو ڈھائی سو روپے میں تم تینوں جانوں کا گزر مشکل ہو گیا۔ اور تب ہی ابا نے بھی چیخنا شروع کر دیا۔ "اس لڑکی کے ہاتھ میں دیا گیا ہنر ہو ہے۔ میں نے پہلے منع کیا تھا آنا پڑھانے کو۔ اس پہ بھی پڑھایا لکھایا کروا اے اور تم بیٹھ کر کھاؤ۔ ابھی میں اتنا بے غیرت تو نہیں ہوا ہوں کہ بیٹی کی کمائی کھاؤں۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ میرے خون کی خوشبو ہی نہیں۔ وہی پورا پورا ننھیال والوں کا رنگ ہے۔ ددھیال کی شرم و حیا ہوتی تو یوں نہ بدنام کرتی ساری خاندان کو ۔۔۔ میں تو نہیں رہنے کا اب اس گھر میں اپنے بیٹے کے پاس جا کر رہوں گا سالا شکر ہے وہ بیٹے ابھی سر آنکھوں پر رکھیں گے تم بھی یہاں رہنا سکھانا اپنی لاڈلی بیٹی کی کمائی ۔۔۔ اماں دونوں ہاتھ کے سامنے کیا بولتیں۔ ہاں دو مہینے سے واپسی آئی تو اس پر ہی برس پڑیں زبان کی وہ کڑی مار ماری کہ کوئی دوسری ہوتی تو گھٹنوں گھٹنوں میں سر دیے روتی رہتی۔ لیکن وہ بھی ایک ہی تھی۔ نہ جانے کس خمیر سے گوندھا تھا اسے خدا نے۔ سر جھکائے سب باتیں سنتی رہی۔ اور جب اماں تھک ہار کر چپ ہوئیں تو وہ بانہیں پھیلا کر اماں سے لپٹ گئی۔ اور وہ اسے پیچھے دھکیل دیتیں۔ آخر وہ ان کی کوکھ سے پیدا ہوا کانٹا ہی تو تھی۔ انھوں نے جہاں اپنی کلیوں جیسی دوسری بیٹیوں کو رکھ چھوڑا تھا تو اس کو بھی اپنے خمیر سے گوندھا تھا۔ وہ پیچھے سے لپٹ کر پیٹ سے ڈر کر ہچکیاں لیتی۔ وہ وہ جب بھی ہوتی سوتی لیکن وہ خود بھی تو چین سے نہ بیٹھ پاتیں۔ ان کے سمل میں بھی تو زخم پڑ جاتا بیٹیوں کو پرایا دھن تو انھوں نے ہمیشہ ہی سمجھا تھا پہلے دو لڑکیاں صفیہ اور رشیدہ ان کے اپنے نقتے سے قدم اٹھانے کو ہوئیں تو سارے شہر کو جیسے خبر ہو گئی تھی کہ دو بیٹیاں اس گھر میں بڑی کھڑی ہیں۔ وہ پتھر آنے کو دو بھکا کر رہ گئیں کہ کے بل گھروں کے نوکروں سیاہ کے رشتے تو لگ رہے ہیں گھر میں ہی ماموں کو دیتیں تو پھر بھی ناراض۔ اور اگر پھوپھی کو دیتی ہیں تو خالہ اور چچا خفا۔ بڑی مشکل سے سب کو منا کر راضی کر کے انھوں نے اپنی نند اور بھائی کو لڑکیاں دے دی تھیں۔ لیکن ان کی بجھی بڑی ہوتی تو نہ جانے کچھ کہا مزہ آئیں نہ خالہ کو بھائی بھلی لگی۔ اور ماموں بھی راضی نہ ہو سکے۔ خود اماں نے کتنی بار سب کے سامنے کہا کہ گھر کی لڑکی گھر میں کیا ملتی ہے۔ لیکن کسی نے پلٹ کر پھر کے نہ دیکھا۔ بھلا کوئی کیوں سانولی سلونی شام کو اپنے آنگن میں اتار لیتا۔

سب ہی اجلے چاند تاروں اور دمکتے آفتاب ماہتاب کے دیوانے تھے۔

اماں خاندان سے مایوس ہو کر باہر کی طرف متوجہ ہوئیں۔ کئی آنے جانے والوں کو گھر میں لگی میرن کا احساس دلایا تب کہیں جا کر ایک دو پیام آئے۔ تب تک وہ کالج میں پہنچ چکی تھی۔ کس طرح پہنچی بس یہ دل پوچھیے۔ اماں کا دم تو

اور اس کی ہمت جو اس نے کالج کی فضا میں سانس لی اور کتابوں کی دنیا میں منہ چھپایا۔ اس کے داخلے کی خبر سن کر اختر اور آصف نے کہا میٹرک کر لیا بہت بڑی بات ہے۔ آگے داخلہ دلانے کی ضرورت نہیں لیکن اماں نے یہ کہہ کر سمجھا دیا کہ جانتے ہو تم منع کرتے ہو صورت شکل ایسی نہیں کہ بن پڑھی بھی کوئی بیاہ لے جائے۔ جہیز کے نام پر چند برتنوں اور دو جوڑوں کے سوا کچھ رکھا نہیں تو کیا اس کا اچار ڈالو گے تم دونوں بھائی مل کر۔

اور ایک دن جب وکیل اکبر علی کا پیام آیا تو اماں خوشی کے ہلکورے لینے لگیں۔ شاید ان کے کاندھوں کا بوجھ اترنے والا تھا۔ وہ کالج سے لوٹی تو اماں نے جلدی جلدی سے ڈھیر سارے احکامات سنا دیے۔ کہ سنو جلدی سے کھانا نکال کر تنہا دھو لو۔ اور پھر وہ پیازی والا سوٹ پہن لینا۔ جو پچھلے مہینے بنا کر رکھا تھا۔ اور ہاں کریم پوڈر لگا لو۔ پوڈر بھی رکھا ہے میری الماری میں۔ یہ چابی پکڑو۔ میرے صندوق میں سے کپڑے اور بالیاں نکال کر پہن لو۔ آج شام کو مہمان عورتیں آ رہی ہیں وکیل اکبر علی کے یہاں سے۔

اور تب اس نے اماں کی پیٹھ پر اپنا سر رکھ کر بڑے اداس اور غمگین لہجے میں کہا تھا،

"اماں جانی ـــ وہ مجھے دیکھنے آ رہے ہیں نا ـــ تو پھر انھیں میرا اصل چہرہ دیکھنے دیجئے نا ـــ انھیں پسند کرنا ہے تو مجھے کریں یونہی بغیر کریم پوڈر کے۔ اماں اگر انھیں سونے کے کنگن بالیاں پسند آگئیں تو دیکھ لینا یوں ہوگا کہ کپڑے اور بالیاں وکیل اکبر علی کے یہاں رہ جائیں گے اور تمھاری بیٹی تمھارے پاس لوٹ آئے گی ـــ مجھے اس اہتمام پر مجبور نہ کرو اماں! میں دھوکے کی قائل نہیں۔ مجھے یہ سب کچھ دھوکا لگتا ہے۔ اماں مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میں کوئی بکاؤ مال ہوں جسے تم ہر حال میں کسی گاہک کے ہاتھ اونے پونے بیچنا چاہتی ہو۔ تم اس لیے ہی مجھے سجنے سنورنے کو کہتی ہو تاکہ میں آنے والے مہمانوں کو پسند آجاؤں اور تمھارے کاندھوں کا بوجھ اتر جائے۔ مجھے پتہ ہے اماں جانی کہ تم میرے لیے بہت پریشان رہتی ہو۔ تم پیسے جوڑ جوڑ کر جہیز بناتی ہو لیکن اس جہیز سے بھی کچھ نہ ہوگا اماں۔ بس . . . ."

اور اماں اس سے آگے نہ سن سکیں۔ انھوں نے پلٹ کر ایک ایسا تھپڑ مارا کہ وہ زمین پر آ رہی۔ پیشانی پیتل کے کٹورے سے ٹکرائی۔ چوڑیاں ٹوٹیں کھنکھنائیں اور پھر نہ جانے کیا ہوا۔ اماں اسے مار کر خود رونے لگیں۔ اور وہ دھلے برتنوں کی طرح نجمہ نے حیرانی سے اماں کو دیکھا اور پھر ہاتھوں کی پشت سے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو پونچھ کر وہ ہنس پڑی۔ ایک بار پھر اس کے بازو اماں کی گردن میں تھے۔ اور وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔ "اماں جی مت رونا۔ مجھے شادی وادی کرنا ہی نہیں۔ بس بی اے کر لوں تو کہیں نوکری کر لوں گی اور پھر ہم تم دونوں آرام سے رہا کریں گے۔ میں ایک نوکرانی رکھ لوں گی۔ پھر تمھیں برتن دھونے نہیں پڑیں گے نہ جھاڑو لگانا پڑے گی۔ سارے کام وہ کر دیا کرے گی۔"

تب ہی اماں نے سوچ لیا تھا کہ آج اگر اکبر علی کے گھر کی عورتیں ایک بار اگر پھر رد کر گئیں تو وہ اس کے سارے خوابوں کو حقیقت کا روپ دینے میں اس کی ہر ممکن مدد کریں گی خواہ انھیں سارے خاندان سے ہی ٹکر کیوں نہ لینا پڑے ـــ اور پھر ہوا بھی یہی ـــ اکبر علی کے گھر کی عورتیں سادی سوری سلونی صورت دیکھ کر ایسی پلٹیں کہ پھر خبر بھی نہ لی۔

اور اسی لیے آج اماں بڑے صبر و تحمل کے ساتھ ہر ایک کی باتیں سن رہی تھیں۔ اس کی نوکری شاید سارے خاندان کے منہ پر طمانچہ بن کر لگی تھی جو پہلے ہر ایک بلا بلا کر چلا آ رہا تھا۔ اب انھیں کسی کی فکر بھی کیا تھی۔ نجمہ کے ابا تو ناراض ہو کر اختر کے پاس جا چکے تھے۔ وہ اطمینان سے ہر ایک کو جواب دیتی گئیں۔ اب ہر صبح صبح کمپنی کی بڑی سی گاڑی گلی کے کونے پر کھڑی رہتی تو گلی کے دروازوں کے پردے کھسکنے لگتے۔ ریڈیو پر جب وہ اناؤنسمنٹ کرتی تو ریڈیو کی آوازیں تیز تر کر دی جاتیں۔ اسے پہلی تنخواہ پانچ سو روپے ملی تو خاندان بھر کو جیسے کرنٹ چھو گیا ـــ اس نے گھر میں سفیدی کروا دی، دروازوں پر نئے پردے لا کر ڈال دیئے اور پھر ماہ بماہ صوفہ، کرسیاں اور دیگر چیزیں آتی رہیں۔ اختر بھائی نے تو ابا کے پہنچتے ہی پانچ سو روپے بھیج دیئے تھے۔ نوکری اور پہلی تنخواہ کا سن کر آصف بھائی نے بھی پچاس کا منی آرڈر بھیجا۔ اور اب اسے ان کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ریڈیو سے بھی مل جاتے خاصے پیسے اور نوکری تو تھی ہی۔ اس کا حلقۂ احباب کتنا بڑھ گیا۔ شخصیت نکھر آئی تھی۔ مطالعے نے اس کی زبان کو جلا بخشی۔ چھپی ہوئی ذہانت پر احساسِ کمتری کا رنگ چڑھا تو اس کی ذات جھک کر سامنے آگئی۔ ریڈیو پر ٹی وی پروڈیوسر جمال رانا سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ نجمہ واسطی سے ہوا۔ اس نے نئے سلسلے وار ڈرامے "خون کا رنگ" میں اسے ایک اہم رول دے دیا۔ اور دوسرے ہی دن اسے ٹی وی خرید کر گھر لانا پڑا۔

ٹی وی گھر میں آیا۔ تو نہ جانے کس طرح پھر سے پھوپھی جان کو رشتوں کی پریشانی کر گئی۔ وہ اماں سے ملنے آئیں۔ اور جب پھوپھی آئیں تو چچی جان بلاوا دینے آگئیں۔ ان کے نواسے کا عقیقہ تھا۔ اور جب نجمہ ساڑھی باندھ گردن پر بڑا سا ڈھیلا جوڑا لگائے ہوئے کمپنی کی گاڑی میں سے چچا جان کے دروازے پر اتری تو شکیل کو بیک وقت آنکھیں جھپکانا پڑیں۔ سعود نے حیرت سے مڑ کر اسے دیکھا اور مسکرا کر بولا ـــ اخاہ! نجمہ واسطی تشریف لائی ہیں۔ اور وہ ہنستی مسکراتی گھر میں چلی گئی۔

ان دنوں ٹی وی پر اس کا ڈرامہ "خون کا رنگ" آ رہا تھا۔ سب ہی اسے دیکھ دیکھ کر آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے ـــ ارے یہ تو شاید ـــ خون کا رنگ کی سیما ہے ـــ ہاں سیما ہے ـــ سیما ہی تو ہے ـــ

پھر وہ لڑکیوں کے چمکتے دمکتے جھرمٹ کا چاند بن گئی۔ ہر تقریب میں وہ پھوپھی اور چچا زاد بہنیں اس سے نہ جانے کیا کیا کچھ معلوم کرنے کے چکر میں تھیں۔

اور رشتے کے بھائیوں کو اپنی اپنی بہنوں سے بار بار کوئی نہ کوئی کام پڑنے لگے اور ان ہی چھوٹے موٹے کاموں کے بہانے مجھ سے بھی ایک دو باتیں ہو ہی جاتی تھیں۔ اس کے ساتھ ملنوں میں نو عمر لڑکیوں کا دل نہیں لگتا بڑے بڑے بھی اس کی طرف متوجہ ہوتے۔ پھوپھیاں، چچیاں، خالائیں بڑے فخر سے اس کا تعارف کراتیں۔ بھتیجی ہے ہماری۔ ریڈیو، ٹی وی پر آتی ہے بہت مشہور ہے۔ لیکن یہ صرف ظاہر داری کی بات تھی۔ مگر میں تو اس کی بے باکی کے بے شمار قصے سنائے جاتے۔ وہ ہوتی تو محفل کا عنوان بنی رہتی۔۔۔ اور جو نہ ہوتی تو محفل میں پیچھے چپکے پڑ جاتے۔ اور کہیں وہ لڑکوں لڑکیوں کے جھرمٹ میں بیٹھ جاتی تو صاحب روزگار جوان بیٹوں کی مائیں بہانے بہانے سے اپنے بیٹوں کو باہر کام سے بھیجنے لگتیں۔۔۔ ہاں اس کا اعتبار بھی کیا۔ کسی ایک سے بات کرتے کرتے مسکرا کر اس کی قمیص پر چلتی ہوئی چیونٹی کو انگلی سے ہٹا کر یا کسی تنکے کو جھاڑتے ہوئے وہ کوئی منتر پھونک دے تو دوسرے دن وہ آفس سے سیدھا اپنی پھوپھی، چچی یا خالہ کی خیریت پوچھنے پہنچ جائے تو وہ کیا کر لیں گی۔ انھیں تو پتہ ہے کہ وہ تو ہے ہی پوری جادوگرنی۔۔۔ ذرا سا پڑھ کیا لیا ہے۔ اپنے آپ کو افلاطون کی بیٹی بقراط کی بچی سمجھنے لگی ہے۔۔۔ آنکھ میں ذرا سی شرم نہیں۔ آخر دن رات کا مردوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے۔ کھلا ہوا کھلا منہ لیے باہر گھومتی ہے۔۔۔ بھئی اس لڑکی کا اعتبار ہی کیا۔ جو ریڈیو پر جاتے، ٹی وی پر آتے۔۔۔ نا بھئی نا میں تو اپنے مسعود کے لیے سیدھی سادی گھریلو لڑکی لاؤں گی۔۔۔ لیکن کوئی مسعود کے دل سے تو پوچھتا۔۔۔ وہ تو چاہتا تھا کہ وہ ہو اور نجو ہو بس دونوں بیٹھے ہوئے دنیا جہان کے مسئلوں پر گفتگو کیا کریں۔ سیاست، مذہب، عشق، محبت سب ہی موضوعات پر کھل کر بحث کرنے والی یہ لڑکی جب بھی ہنستی تو اس کی ہلکورے لیتی ہوئی ہنسی مسعود کے دل کی دیواروں سے لپٹ لپٹ جاتی وہ سوچتا کہ واقعی دور سے دیکھنے میں بے صرف کنکر نظر آنے والے انسان قریب آ کر دیکھنے سے کیسے موتی بھی نکلتے ہیں۔ کاش یہ میں نے پہلے جان لیا ہوتا تو آج میں یوں اس سمندر کے کنارے بیٹھ کر پیاسا نہ رہتا۔

نجو اور مسعود نجانے کس بات پر زور سے کھلکھلا کر ہنسے تو اماں نے جھالیہ کی بجائے انگلی سروتے میں دے لی۔ یہ خاندان میں پھر ایک بھونچال لا کے رہے گی۔ کم بخت نہ جانے کیوں مسعود سے ایسی لمبی لمبی بحثیں کرتی ہے۔ کہاں کہاں کی باتیں نکال لیتی ہے۔ لڑکا آتا ہے تو جانے کا نام ہی نہیں لیتا۔ پہلے ہی کیا کم بھیڑ لگا رکھی ہے اپنے آگے پیچھے۔ رضا صاحب، شیخ خان، احمد علی، فریدہ بلوچ، اظفر خان، ارے کس کس آرٹسٹ کیا بنی۔۔۔ مصیبت بن گئی۔ کیسی کیسی زبانیں چلاتے ہیں رشتے دار۔ آخر میں کس کس کے منہ پر لقو دکھوں گی۔۔۔ اور اس سے پیشتر کہ اماں منجھلی ممانی کے منہ پر قفل لگا کر دوڑیں پھوپھی جان نے اگر تازہ اطلاعات پہنچا دیں۔ وہ اپنے کمرے

میں بیٹھی اسکرپٹ دیکھ رہی تھی کہ اماں کی آواز بلند ہوتے ہوتے اس کے اندر گونجنے لگی۔

"اپنے اپنے بیٹوں کو گھر میں روک رکھیں۔۔۔ نجو کسی کو بلانے نہیں جاتی۔۔۔ کیوں آتے ہیں ملنے۔۔۔ مسعود کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں جو اسے بہلا رہی ہے۔ ایسے ہی اسے عشق لڑا کر شادی کرنا ہوتی تو کبھی کی کر لی ہوتی۔ بیوقوف سمجھتی ہے کہ بغیر شادی کے بھی زندگی گزاری جا سکتی ہے یہ دنیا والے کسی کو نہیں چھوڑتے۔ یہ بھلا لڑکیاں ڈورے ڈالیں گی لڑکوں پہ۔۔۔ وہاں سے ملنے جائیں نہ انھیں بلائیں۔۔۔ اور پھر بھی نام بدنام ہو گا ان کا۔۔۔ لڑکے سے کوئی کچھ نہیں کہتا۔"

"ہاں بھابی اپنے گلے میں کون جا لگتا۔۔۔ ذکیہ آپا کہیں تو کہیں۔۔۔ ان کی بیٹیاں بھی کہتی پھرتی ہیں کہ نجو باجی ہاتھ دھو کے بھائی جان کے پیچھے پڑی ہیں۔۔۔ اور گھر بلا لیتی ہیں۔ نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے۔۔۔ ان پر۔۔۔ ہم تو کوئی خوبصورت سی بھابی لائیں گے۔۔۔ نیچی نظروں والی گھرستن سی۔۔۔۔ " اس سے آگے نہ سنا گیا وہ اسکرپٹ پٹخ کر باہر آ گئی۔

"پھوپھو کس پر چل گیا کس کا جادو۔۔۔ کیا قصہ سنا رہی ہیں آپ؟"

وہ ہنسی۔

"ہنس کیا رہی ہو۔۔۔ تمہارے ہی قصے ہیں سارے زمانے میں۔۔۔ سن لو تمہاری ممانی کیا کہہ رہی ہیں تمہارے لیے۔"

"ارے کیا کہیں گی۔۔۔ یہی نا کہ میں عشق لڑا رہی ہوں مسعود سے۔۔۔ یا ان پر ڈورے ڈال رہی ہوں۔۔۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ ویسے مجھے پسند ہیں وہ۔ اچھے آدمی ہیں۔ ہماری عادتیں ملتی ہیں۔ پسند ملتی ہے۔۔۔ میرے دوست ہیں وہ۔۔۔"

"لڑکیوں سے دوستی نہیں ہو سکتی تمہاری۔۔۔ کیا ضروری ہے کہ لڑکوں سے۔۔۔"

"ارے پھوپھی اماں کیا رکھا ان باتوں میں۔۔۔ دوستی جنس نہیں دیکھتی۔۔۔ دل دیکھتی ہے۔۔۔ دل۔۔۔ ویسے محبت کرنا تو ہر انسان کا

پیدائشی حق ہے۔ اور اگر میں یہ حق استعمال کروں گی تو کیا قیامت آ جائے گی؟"

"اچھا بابا مت ۔۔۔ چلو جاؤ اپنے کمرے میں۔"

اور جب بچے بھی چلی گئیں تو اماں اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

"نجمہ ۔۔۔ تم شادی کر لو۔" اماں کا سخت اور تشدد آمیز لہجہ نجمہ کو چونکا گیا۔

"کیوں اماں ۔۔۔ ؟"

"کیوں ویوں میں کچھ نہیں جانتی، بس تم شادی کر لو۔"

"لیکن کس سے اماں ۔۔۔ ؟"

"کسی سے بھی ۔۔۔ رضا سے کر لو، اس کی تم تعریفیں بھی کرتی رہتی ہو۔ تمہارے ساتھ کام کرتا ہے تمہیں جانتا ہے۔"

"لیکن اماں میں بھی اسے جانتی ہوں ۔۔۔ وہ پیتا ہے ۔۔۔ بتاؤ کیا شرابی سے شادی کر لوں ؟"

"کیا ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ شرابی ہے ۔۔۔ اللہ ۔۔۔ اور تم اس کے ساتھ کام کرتی ہو ۔۔۔" اماں کی آواز تھرتھرانے لگی۔

"ہاں اماں ۔۔۔ !"

"اور وہ اظہر خاں ۔۔۔ جو تم سے ملنے بھی آتا ہے ؟"

"میرے علاوہ وہ دس لڑکیوں سے اور ملنے جاتا ہے۔ اس کا تو کام ہی یہی ہے ۔۔۔ اماں اسے ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"تو پھر فریبہ بلوچ یا احمد علی ۔۔۔ ؟"

"احمد علی کی دو بیویاں پہلے ہی موجود ہیں اماں جانی ۔۔۔ اور فریبہ بلوچ کو ریس کا چسکا ہے۔ اسے مجھ سے زیادہ میری چیک بک سے دلچسپی ہے۔ رہ گیا ایک شفیع خاں ۔۔۔ تو اماں وہ بے شک ایک اچھا آدمی ہے۔ وہ مجھے پسند کرتا ہے بلکہ شادی کے لیے سنجیدہ بھی ہے۔ لیکن اس کی ایک جاہل سی بیوی ہے جو اس کی ذہانت، اس کی خواہشات، اس کے ارمانوں پر پوری نہیں اترتی ۔۔۔ میں اسے سمجھاتی رہتی ہوں ورنہ وہ کبھی کا اسے طلاق دے چکا ہوتا۔ آہ ۔۔۔ بس وہی تو ایک آدمی ہے جو صرف میری ذات، میری شخصیت کو، میرے کردار کو، میرے اخلاق کو پسند کرتا ہے یا پھر ۔۔۔ ایک اور ہے اسے تو تم بھی جانتی ہو اماں ۔۔۔" وہ کرسی پر جھولتے جھولتے پلٹ کر بولی۔

"کون مسعود ۔۔۔ ؟" اماں نے اس کی آنکھوں کی تحریر پڑھ لی۔

"ہاں اماں ۔۔۔ !"

"لیکن تم یہ نہیں جانتی کہ اس کی ماں اور بہن بھائی ۔۔۔ تمہیں اچھا نہیں سمجھتے ۔۔۔ تمہارے کردار پر شک کرتے ہیں ۔۔۔ وہ تمہیں آوارہ اور بدچلن سمجھتے ہیں نجمہ۔"

"سمجھتے رہیں ۔۔۔ ان کے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تو نہیں سمجھتا۔ میرے لیے یہی کافی ہے ۔۔۔ اور اماں چاند پر دھول ڈالنے سے چاند میلا تو نہیں ہو جاتا نا ۔۔۔"

"تو پھر کیا سوچا ہے تم نے ۔۔۔ ؟"

"کچھ بھی نہیں سوچا ۔۔۔"

"تو پھر شادی نہیں کرو گی تم ۔۔۔ ؟"

"اوہ اماں جانی میں نے کہا نا ۔۔۔ شادی کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو کا کوئی حل نہ ہو ۔۔۔ میں چاہوں تو اماں جانی کل ہی کروں شادی ۔۔۔ ایک ہلکے سے اشارے کی ضرورت ہے شفیع خاں اپنی بیوی کو طلاق دے کر ابھی کورٹ میرج کرنے پر تیار ہو جائے گا۔ لیکن ایک عورت کا اجاڑ کر اپنا آپ بسانا اچھا نہیں لگتا اور پھر یوں تو طے ہے تا کہ میں خود کسی سے شادی نہیں کروں گی ۔۔۔ کوئی مجھ سے شادی کرے ۔۔۔ تو کرے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا ؟ تم کہنا کیا چاہ رہی ہو ؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔"

"اماں ! میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ کوئی صرف میری ذات میری شخصیت کو پسند کرے۔ اسے میری ضرورت ہو ۔۔۔ وہ میرے لیے اداس ہو، پریشان ہو ۔۔۔ وہ میری خاطر میرے در تک آئے اور آ کر مجھ سے پوچھے بنا تمہارے ہاتھ سے میرا ہاتھ نکال کر لے جائے۔"

"تو پھر بی بی انتظار کرو قیامت تک، تمہارا یہ آئی دماغ میرے چونڈے کے چار سفید بالوں پر اور مٹی ڈلوائے گا ۔۔۔" اماں نے جل کر کہا ۔۔۔ اور وہ بے اختیار ہنس دی۔

"خوامخواہ ہنسو مت نجمہ، یہ ہنسنے کی بات نہیں۔ خدا خود سوچو دسمبر میں تمہاری عمر اکتیس برس ہو جائے گی اور میں پینتیس کی ہو جاؤں گی ۔۔۔ تو پھر بتاؤ کون آئے گا تمہاری عادتیں اور اخلاق و کردار کو ڈھونڈتا ہوا؟ ابھی تو خیر تمہارے پاس عزت بھی ہے، پیسہ بھی ہے۔ چار آدمی تمہیں جانتے بھی ہیں۔ تم نہ جانے کیسی لڑکی ہو کہ تمہیں شوق ہی نہیں کہ تمہارا گھر ہو ۔۔۔ اور زمانے کی لڑکیوں کو دیکھو۔"

"زمانے کی بات چھوڑو اماں، میں زمانے سے الگ ہوں۔ رہی گھر کی بات تو کیا یہ میرا گھر نہیں ۔۔۔ اماں دراصل تم اب مجھ سے اکتا گئی ہو۔ اس لیے چاہتی ہو کہ میں کہیں چلی جاؤں ۔۔۔ اگر ایسی بات ہے اماں تو چلو تمہاری خاطر میں یہ بھی کر لوں گی ۔۔۔ ساری دنیا، سارے زمانے، ساری کائنات میں ایک تم ہی تو ہو جو میری ہو، اپنی ہو۔ پھر میں اتنی ظالم بھی نہیں کہ تمہاری خاطر یہ بھی نہ کر سکوں ۔۔۔ بس اماں میں چلی جاؤں گی۔"

"تیرا تو دماغ چل گیا ہے ۔۔۔ کہاں جائے گی تو ۔۔۔ بھلا کوئی اپنے گھر سے بھی اکتا سکتا ہے بے وقوف ۔۔۔ میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ تیرا بیاہ ہو جائے تو دلہن بنا دوں اپنے ہاتھ سے تیرے ہاتھ میں مہندی لگا کر تجھے رخصت کروں۔"

"ہاں بس رخصت کر دو ۔۔۔ خواہ میں زندگی بھر روتی رہوں یا پھانسی

ے پھندے پر شکی رہوں کیوں اماں؟ کیسی بات ہے نا!"

"خدا نہ کرے — ایسی باتیں منہ سے نہ نکالا کرنا — میں تو تجھے خوش دیکھنا چاہتی ہوں نجو!"

"تو پھر اماں میری خوشی کی خاطر اور انتظار کرنا — میں تو دنیا والوں کو آزمانا چاہتی ہوں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ یہاں سب ہی صورت کو دیکھ کر ... یں یا کوئی جوہری بھی ہے۔ اگر میں اپنا آپ داؤ پر لگا کر اس دنیا کو پرکھوں ... میں دیکھوں گی کہ یہاں سچائی کی کیا قیمت ملتی ہے؟ میں جاننا چاہتی ہوں کہ دنیا کی اس خود غرض منڈی میں کوئی اخلاق و کردار کا گاہک بھی ہے یا سب ہی چاند چہروں کے خریدار ہیں۔"

"نجو تمہارے دل میں جو سودا سمائے وہ کرو۔ میں تم سے ایک ہی بات کہتی ہوں کہ تم جیسی اکیلی ذات ساری دنیا آزمانے چلی ہو۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ دنیا کا کچھ نہیں بگڑے گا بس تم خود ہی بڑھاپے کی دہلیز پر آ پہنچتی جاؤ گی۔"

"واہ اماں کیا شاعرانہ بات کہی ہے تم نے — سچ یوں لگتا ہے تمہارے پہلو میں کسی ادیب کا دل دھڑک رہا ہو — چلو اسی بات پر بل کر چائے پیتے ہیں۔" اس نے ایک بار پھر اماں کو بہلا دیا۔

شام کو مسعود آیا تو دیر تک بیٹھا ہی رہا۔ آخر منجھلے ماموں کو اسے لانے آنا ہی پڑا — وہ تو آنے کو تیار ہی نہ تھے۔ لیکن ممانی کی باتیں جب حد سے بڑھ گئیں تو آخر انھیں بولنا ہی پڑا تھا۔ کتنے دنوں سے وہ سنتے آ رہے تھے کہ ان کا بیٹا ہاتھ سے جا رہا ہے۔ لیکن انھیں پتہ تھا کہ مسعود ہاتھ سے نہیں جا رہا البتہ پابندی سے اپنی پھوپھی کے یہاں ضرور جا رہا ہے۔ ہاں کل ہی تو مسعود کی امی اوپر والے کرایہ داروں کے یہاں سے ٹی وی دیکھ کر لوٹیں تو تازہ خبر یہ سنائی تھی کہ —

"آخر پھانس ہی لیا نا — ہائے کتنا اچھا لڑکا تھا — توبہ توبہ کیا زمانہ آ لگا ہے۔ بیٹیاں کھلے بیلوں کی طرح منہ اٹھائے پھر رہی ہیں۔ جس سے چاہے ہنسی مشغول ہو گیا، جہاں چاہا آنکھ لڑائی — اور جب چاہا شادی رچالی —"

"ارے کس نے رچائی شادی — کیوں گرم ہو رہی ہو اتنا۔"

"آپ کی بھانجی کا ہی ذکر خیر کر رہی ہوں جناب — ابھی ڈرامہ دیکھ کر آ رہی ہوں — انھوں نے شادی کر لی ہے۔"

"لاحول ولا — میں تو سچ ہی سمجھا — ارے وہ تو ڈرامہ تھا۔"

"ڈرامہ تھا تو کیا ہوا — سچ مچ بھی یونہی کر لیں گی — آخر یہ مسعود میاں کو روز روز وہاں جانے کی ضرورت کیوں محسوس آنے لگی ہے۔ دیکھنا تم بھی ایک دن سن لو گے کہ دونوں نے عدالت میں شادی کر لی۔"

"اگر سن بھی لیں گے تو کیا ہو گا — خاندان کی لڑکی ہے کیا شبہ —

پڑھی لکھی ہے —" ماموں نے مذاق میں ٹالا — تو بس طوفان ہی آ گیا۔

ممانی خوب روئیں چیخیں چلائیں — آخر کوئی مذاق کی بھی بات تھی وہ اپنی پہلی بہو بھی خوبصورت اور حسین لانا چاہتی تھیں — اور پھر وہ اپنی بہن کے یہاں بات ڈال چکی تھیں — ان کی بھانجی بقول ان کے پری چہرہ تھی۔ اور جب وہ اپنی بھانجی کی تعریف کرنے کے بعد نجو کے کردار پر اتر آئیں تو ماموں کا خون بھی جوش مار گیا۔

وہ چیخ کر بولے تھے کہ آج میں بتا کر آتا ہوں اس کو — اس کے بعد خود باندھ کر رکھنا گھر میں اپنے بیٹے کو۔ میری بھانجی کو کچھ نہ کہنا۔ تم جاہل عورت کیا جانو تعلیم کی قدر — اور اسی رو میں وہ اٹھ چلے آئے تھے۔ ایک مدت بعد بہن کا گھر دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ منہ سے کچھ نہ کہا گیا بس نجو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بس اتنا ہی کہہ سکے کہ خدا سب کو ایسی بیٹیاں دے۔

اور نجو تو شاید کرنٹ کھا بیٹھی — اس نے چونک کر ماموں کی طرف دیکھا اور پھر حیرانی سے بولی "آپ خیریت سے تو ہیں —؟"

"ہاں بیٹا خیریت سے ہی ہوں — بس سعدیہ اور سلمیٰ نے بڑا تنگ کر رکھا ہے پڑھتیں نہیں۔" اور نجو کی آنکھیں جھل جھل چمکنے لگیں — ایسے لگا جیسے وہ تپتے صحرا میں ٹھنڈے پانی کا چشمہ پا گئی ہو۔ اس کے خشک ہونٹ سیراب ہو گئے ہوں۔ لیکن کہاں یہ پیاس تو اس کا مقدر تھی۔ ماموں تو مسعود کو لے کر چلے گئے لیکن اسے مسعود کا انتظار بخش گئے۔

ایک ہفتہ گزر گیا تو اس نے اماں سے کہا۔

"اماں مسعود تو بزدل نکلا —"

اور اماں نے جواباً اتنا ہی کہا "ہاں اسے بزدل ہی ہونا چاہئے تھا جہاں مائیں تیز ہوتی ہیں وہاں اولاد بزدل ہوتی ہے اور جہاں میری جیسی بزدل مائیں ہوتی ہیں وہاں اولاد تمہارے جیسی ہوتی ہے نجو۔"

اور نجو اماں کی یہ منطق سن کر ہنس پڑی "ہاں تم نے ٹھیک ہی کہا اماں"

اور بہاروں کی یہ رُت مسعود کے انتظار میں بیت گئی — اور جب بہار کی دوسری رُت بیت جانے کو تھی تو نجو نے آ کر اماں کو بتایا "اماں ہمارے نئے منیجنگ ڈائریکٹر آئے ہیں فیاض احمد — سچ بہت اچھے آدمی ہیں — بڑے ہنس مکھ، خوش اخلاق تو اتنے ہیں کہ بس مزہ ہی آ جاتا ہے ان کے پاس بیٹھ کر — میری تو آج اچھی خاصی دوستی ہو گئی ہے ان سے۔ ان کی شخصیت بھی بڑی بارعب ہے — عمر تو خاصی ہو گی لیکن لگتے بالکل ینگ [illegible] سے ہیں"۔ اماں سب نے فیاض احمد کی تعریفیں ہمیشہ کی طرح بڑی دلچسپی کے ساتھ سنی تھیں۔ لیکن انھیں یہ پتہ نہ تھا کہ ایک دن وہ یوں اچانک نجو کے ساتھ آ کر ان کے قریب ہی تخت

پھر بیٹھا جائے گا۔ اماں نے اسے ٹالا کر اندر چلنے کو کہا تو ۔۔۔ وہ بڑے ادب سے بولا:

"نہیں امی میں تو آپ سے ملنے آیا تھا۔ دراصل آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔ بس میں یہیں ٹھیک ہوں۔ آپ بھی بیٹھ جائیے نا یہیں ۔۔۔ اور ہاں نجمہ تم چائے نہیں پلاؤ گی۔؟"

"اُف اللہ ۔۔۔ کچھ تو صبر کیجئے ۔۔۔ چائے بھی مل جائے گی۔"

"نہیں صبر نہیں ہوتا ہم سے ۔۔۔ تم جلدی سے چائے بنا کر لاؤ ۔۔۔ میرا سخت موڈ ہو رہا ہے چائے پینے کا۔"

نجمہ باورچی خانے میں چلی گئی ۔۔۔ اور وہ بے تکلف شخص ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ذرا سی دیر میں اصل مقصد کی طرف آ گیا۔ اس نے بڑے رسان سے اپنا مدعا بیان کر دیا ۔۔۔ اماں پل کے پل میں نجمہ کو دلہن کے روپ میں سجا سنورا دیکھنے لگیں ۔۔۔ جی تو چاہا کہ فوراً ہاں کر دیں لیکن نہ جانے کیا سوچ کر انھوں نے کہا تھا۔

"فیاض بیٹے ۔۔۔ وہ خود سمجھدار ہے۔ اپنے متعلق خود زیادہ اچھا برا سمجھ سکتی ہے۔ دراصل وہ حساس بہت ہے میں اس کے اوپر اپنی مرضی مسلط نہیں کرنا چاہتی۔ تم خود ہی اس سے پوچھ لو۔ اس کی مرضی میری مرضی ہوگی۔"

اور جب نجمہ چائے کے برتن سمیٹ کر لے جانے لگی تو فیاض احمد ہاتھ دھونے کے بہانے اس کے پیچھے چلے آئے ۔۔۔ نجمہ کا دل بے ہنگم طریقے سے دھڑکنے لگا۔ ہونٹ لرزنے لگے ۔۔۔ یہ کیا ہو رہا ہے اسے ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں اماں اور فیاض کی باتوں کی بھنک پڑ گئی تھی تبھی تو وہ ایک دم نروس سی ہونے لگی، ورنہ اتنی جذباتی تو وہ کبھی نہ تھی۔

"نجمہ ۔۔۔" فیاض احمد نے اسے پکارا تھا۔

اس نے برتن زمین میں ڈال کر اپنا سر دیوار سے ٹکا دیا۔ آنکھیں موند کر اس نے سوچا نجمہ بیگم وہ مہمان پہنچا جس کا انتظار تم جنم جنم سے کر رہی ہو ۔۔۔ سو بہاروں کی یہ رُت بے ثمر نہیں گئی ۔۔۔ کوئی تمہارے واسطے تمہارے در پر دستک دینے آیا۔ اب کے در کھول دو نجمہ ۔۔۔

اور فیاض احمد کہہ رہا تھا ۔۔۔ "نجمہ ۔۔۔ میں تصنع اور بناوٹ کا قائل نہیں۔ خود سچا آدمی ہوں ۔۔۔ سچائی پسند کرتا ہوں ۔۔۔ اگر میں یہ کہوں تو تم غلط نہ جاننا کہ مجھے تم نے متاثر کیا ہے۔ تمہارا اخلاق، تمہارا کردار، تمہاری عادات و اطوار سب مجھے بہت پسند ہیں نجمہ ۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا ظرف بہت بڑا ہے۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو ۔۔۔ تم مجھے رد نہیں کرو گی۔ میں نے تمہاری امی سے بات کی تھی۔ انھوں نے فیصلہ تمہاری مرضی پہ چھوڑ دیا ہے ۔۔۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں نجمہ ۔۔۔ میری بیوی کا چھ سال ہوئے انتقال ہو گیا۔ میرے دو بچے ہیں نجمہ انھیں تمہاری ضرورت ہے۔"

نجمہ نے تڑپ کر آنکھیں کھول دیں۔ یہ حرف اجنبی کیوں لگے۔ ٹھنڈی برف کا بُت کیسے بن گئی۔ یہ آنکھوں کی ٹھنڈک ریت بن کر کیوں لگی ۔۔۔ وہ عزیز از جان لمحہ کہاں کھو گیا۔ کاش فیاض احمد تم یہ کہہ دو کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے نجمہ ۔۔۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے تھے کہ فیاض احمد نے اس کے بالکل سامنے آ کر کہا۔

"نجمہ مجھے یقین ہے کہ تم میرے بچوں کے لیے بہترین ماں ثابت ہو گی۔ انھیں تمہاری ضرورت ہے ۔۔۔ میں تم پر جبر تو نہیں کر سکتا پھر بھی یہ ضرور کہوں گا کہ خدارا انکار نہ کرنا۔"

اور تب نجمہ نے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ کر کہا تھا۔ "فیاض احمد تمہارے بچوں کو میری ضرورت ہے تو میں ان کی ماں بننے کے لیے تیار ہوں لیکن میں نے انکار کر دیا تو کیا پتہ کل کسی باپ کے بچوں کو بھی میری ضرورت رہے یا نہ رہے۔"

"اور آج ۱۶ دسمبر ۷۵ء کی دوپہر کو جب فیاض احمد بارات لے کر آنے والا ہے تو تم مسعود کمیں صبح اپنی بیگم کے ساتھ آ کر یہ تحفہ دے کر گئے ہو۔ اور میں نے دیکھ یہ کاغذ کی چٹ بھی ڈھونڈ نکالی ہے جو تم نے لکھا ہے کہ۔

"ڈیئر نجمہ!

شاید تم یقین نہ کرو۔ لیکن میں بھی چاہتا تھا کہ میں تمہارے در پہ بارات لے کر بالکل اسی طرح آؤں جس طرح آج فیاض احمد آ رہے ہیں۔ لیکن میں شاید اس قابل نہ تھا۔ نجمہ تم بہت عظیم بہت بلند ہو ۔۔۔ فیاض احمد ہی تمہارے قابل ہو سکتے ہیں۔ میں تمہیں شریک زندگی بنا کر تمہارے ساتھ زیادتی نہیں کر سکتا تھا۔ اس پُر مسرت موقع پر مبارکباد دینے والے اس شخص کو کیا تم یاد رکھو گی جسے تم کبھی کبھی سودی کہا کرتی تھیں۔

فقط ۔ مسعود"

یہ چٹ پڑھ کر نجمہ کی آنکھیں بھیگ گئیں اور پھر وہ بے اختیار قہقہہ مار کر ہنس دی۔

کیسے ہو تم لوگ بھی ۔۔۔ کبھی ہمیں عظیم سمجھ کر سزا دیتے ہو، کبھی حقیر جان کر چلتے ہو تم لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ہم نہ حقیر ہیں نہ عظیم ۔۔۔ صرف انسان ہیں۔

مرے بچے ہزاروں بار میں نے تم کو اک قصہ سنایا ہے
کبھی لوری کے آنچل میں، کبھی لفظوں کی چادر
تمہیں لپٹا کے گودی میں سلایا ہے۔
تمہارے گرم رخساروں کو اپنے سرد ہونٹوں سے چھوا ہے۔
تم سے اک وعدہ کیا ہے
وہی وعدہ جو انسانوں کی تقدیروں میں لکھا ہے
تحفظ کا، تمہاری آبرو کا سربلندی کا

---

مرے بچے کہانی میں تھکی ہاری جو لڑکی تھی، وہ شہزادی نہیں میں تھی۔
وہ جادو کا محل جو جل کے صحرا ہو گیا تھا، وہ مرا گھر تھا
جہاں بے آسرا وہ رہ گئی تھی ـــــــ میرا بچپن تھا
جہاں وہ مر کے پتھر ہو گئی تھی ـــــــ میری جوانی تھی
جہاں وہ قید تھی، جنگل نہیں تھا۔ میرا آنگن تھا

---

ہزاروں آگ کے دریا تھے، بارش لہو کی تھی
یہ سب کچھ میرا قصہ تھا۔ یہ سب کچھ مجھ پہ گزری تھی۔
جہاں قصے کا آخر تھا، وہاں تم تھے وہاں تم تھے
خوشی کی زندگانی کی علامت
تمناؤں کی اک جہدِ مسلسل
رفاقت کی، صداقت کی ضمانت
جہاں پر صرف خوش انجام تھا ہر ایک افسانہ
مرے بچے وہاں تم تھے وہاں تم تھے
مری آنکھیں کسی پیمان کے زخموں سے بوجھل تھیں
تمہارا عکس ان زخموں کا مرہم تھا
ادھورے عہد کے رشتے سے میرے ہاتھ لرزاں تھے
تمہارا ساتھ اک تسکینِ پیہم تھا
مجھے احساس تھا میں قوت ہوں، تم امن و آسائش
مجھے اقرار تھا میں خاک ہوں تم حسن و زیبائش
میں ماضی ہوں، مگر تم صورتِ فردا فروزاں ہو
میں مشکل ہوں مگر تم صورتِ امیدِ آساں ہو

---

مرے بچے! مرا احساس اور اقرار دونوں آج مجرم ہیں
میں اپنا سر جھکائے اپنی فردِ جرم سنتی ہوں
نہیں معلوم ہے الزام کیا ہے؟
وہ وعدہ جو انسانوں کی تقدیروں میں لکھا ہے
تحفظ کا، تمہاری آبرو کا سربلندی کا۔

**لیلیٰ** ایران کے چھوٹے سے شہر یزد کی ایک ستم رسیدہ لڑکی ہے۔ جب وہ تیرہ سال کی تھی تو ایک اجنبی نے جبراً اس کا دامن عصمت داغدار کر دیا۔ پھر مزید ستم یہ کہ جب وہ بیس سال کی ہوئی تو اس کے والدین نے اس کی مرضی اور پسند کے خلاف آقا میر نامی ایک گنوار اور اجڈ شخص سے اس کی شادی کر دینا چاہی۔ لیلیٰ اس جبر سے سخت دل برداشتہ ہو گئی۔ اس کی مایوسی اس قدر بڑھی کہ وہ گھر سے بھاگ نکلی۔ اس کی منزل تہران تھی۔ وہ ہائی اسکول پاس تھی اور اس کا خیال تھا کہ وہ بہت جلد کسی قابل ہو کر والدین کے پاس واپس آکر سرخرو ہو جائے گی۔ ٹرک ڈرائیور ہاشم اور اس کے ساتھی غلام نے لیلیٰ کو اصفہان تک پہنچانے کا وعدہ کیا۔ راستے میں وہ شب بسری کے لیے ایک قہوہ خانے میں رُکے۔ اس رات ایک اجنبی مجرمانہ حملے کی غرض سے لیلیٰ کے کمرے میں داخل ہوا۔ مگر لیلیٰ بروقت ہوشیار ہو گئی اور اس نے شدید مزاحمت کر کے اجنبی کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ صبح لیلیٰ نے دیکھا اس کی انگلیوں میں خون بھرا ہوا تھا۔ دراصل اس نے مزاحمت کے دوران اجنبی کی آنکھوں کو زخمی کر دیا تھا۔ سفر دوبارہ شروع ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد لیلیٰ کو معلوم ہوا کہ وہ ایک ایسی گاڑی میں سفر کر رہی تھی جس کے مالک اسمگلر تھے اور پولیس ان کی تلاش میں تھی۔ آگے جانے کے بعد ہاشم نے دوبارہ اسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ ایک چھوٹے سے قصبے میں پہنچنے کے بعد ہاشم نے لیلیٰ کو تہران جانے والی بس میں سوار کرا دیا اور اپنا پتہ دیتے ہوئے وعدہ کیا کہ وہ اس سے تہران میں ملے گا اور ہر ممکنہ مدد کی کوشش کرے گا۔ بس کا سفر شروع ہوا اور یہاں ایک بردہ فروش عورت لیلیٰ کی جان کو چپک گئی۔ بس قم میں رُکی تو بہانے سے لیلیٰ نے اس عورت سے جان چھڑائی اور ایک وین میں چھپ کر تہران آ گئی۔ وین کے مالک پرویز اور اس کی منگیتر ثریا تھے۔ چونکہ لیلیٰ کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس لیے وہ پرویز اور ثریا کے ساتھ رہنے لگی۔ بعد میں لیلیٰ پر انکشافات ہوا کہ پرویز کہیں اور رہتا ہے اور ثریا اس مکان میں تنہا زندگی گزار رہی تھی۔ وہاں دونوں کے تعلقات کے بارے میں کچھ مشکوک سی ہو گئی۔ بعد میں اس کا شک یقین میں تبدیل ہو گیا جب ایک دن بیژن نامی ایک نوجوان ثریا سے ملنے آیا۔ لیلیٰ کو یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ثریا پرویز سے منسوب ہونے کے باوجود بیژن سے ناجائز تعلق قائم کئے ہوئے تھی۔ پھر بعد میں لیلیٰ پر انکشاف ہوا کہ ثریا کوئی اچھی عورت نہیں تھی۔ وہ پرویز اور بیژن کو ڈبل کراس کر رہی تھی۔ اس دوران پرویز لیلیٰ کی طرف مائل ہو گیا اور اس نے بتایا کہ ثریا سے اس کی کوئی منگنی وغیرہ نہیں ہوئی ہے۔ وہ خواہ مخواہ اس کے گلے پڑی ہوئی ہے۔ احتیاط کے باوجود ثریا کو اندازہ ہو گیا کہ پرویز لیلیٰ کی طرف مائل ہے اور اس کے ساتھ ہی ثریا لیلیٰ کی جانی دشمن ہو گئی۔ پھر ایک دن ثریا نے بیژن کو محض کسی غرض سے لیلیٰ کے پاس بھیجا کہ وہ اس پر دست درازی کرے اور لیلیٰ پرویز کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ مگر عین اسی دھماکا خیز وقت پر پرویز وہاں پہنچ گیا اور اس نے بیژن کو مار کے بھگا دیا۔ اس طرح پر لیلیٰ نے پرویز کو ثریا اور بیژن کے تعلقات کے بارے میں

بتا دیا۔ پرویز کی طرف سے ثریا سے برگشتہ ہو گیا۔ پرویز کو وہاں ایک برس ملازمت کے دوران ایران کا تبادلہ ہو گیا تھا۔ اس پر اسے ایک گہرا لگا اور بہادر بن سے یہ پتہ چلا کہ پرویز ثریا کا سابق شوہر تھا اور ملک بھر کے ماہرین میں تھے۔ پرویز ثریا کو بلیک میل کر رہا تھا۔ اس انکشاف سے پرویز بہت متردد ہو گیا۔ اب اس گھر میں لیلیٰ کا ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ثریا پر گویا مصائب نازل کرتی۔ پرویز اسی وقت لیلیٰ کو لے کر اپنے دوست مسعود کے گھر روانہ ہو گیا۔ لیلیٰ ایک غیر معین مدت کے لیے وہاں ٹھہر گئی۔ وہاں لیلیٰ کے قیام کو زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ ایک دن بالکل غیر متوقع طور پر ثریا اس کے سر پر پہنچ گئی۔ وہ ایک کانسٹیبل کو ساتھ لائی تھی۔ ثریا نے لیلیٰ پر الزام لگایا تھا کہ وہ ثریا کی نقدی اور زیورات چوری کر کے بھاگی ہے۔ لیلیٰ کو کانسٹیبل کے ساتھ پولیس اسٹیشن جانا پڑا۔ مگر اسے پولیس اسٹیشن نہیں لے جایا گیا اور اس ثریا دھوکا دے کر لیلیٰ کو اغوا کرا لائی تھی اور اسے کہیں اور لے جا رہی تھی۔ گاڑی کا ڈرائیور اور کانسٹیبل ثریا کے ساتھی تھے جو بھیس بدلے ہوئے تھے۔ ثریا نے نشہ آور لیلیٰ کو چھ ہزار تمان کے عوض خانم نامی ایک شاطر عورت کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ خانم ایک عشرت کدہ چلاتی تھی اور یہاں تہران کے نامی گرامی امراء آتے تھے۔ خانم ان لڑکیوں کے ذریعے ان سے خوب کمائی کرتی تھی۔ عشرت کدے میں داخل ہونے کے بعد لیلیٰ پر سخت پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ خانم کے خونخوار قسم کے گماشتے لیلیٰ کی نگرانی پر مامور تھے۔
یہیں اس کی ملاقات نوشی نامی لڑکی سے ہوئی۔ نوشی بھی مظلوم لڑکی تھی اسے دھوکا دے کر یہاں لایا گیا تھا۔ لیلیٰ چونکہ اس ماحول میں نئی تھی اس لیے خانم نے نوشی کو اس کے ساتھ کر دیا تاکہ وہ یہاں کے ماحول سے آشنا ہو سکے۔ کئی دن گزر گئے پھر ایک دن ایسا آیا جبکہ ایک رات کو لیلیٰ کو اپنے پہلے گاہک کی میزبانی کرنا پڑی۔ یہ گاہک بڈھا جوہری تھا۔ لیلیٰ کے ساتھ نوشی بھی اس کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ وقت گزر رہا تھا اور بڈھے کی جوانی طبیعت نقطہ عروج کو پہنچ رہی تھی کہ اس نے اچانک خانم کو بلا کر کہا کہ فوراً ٹیلیفون کر کے کمال کو بلایا جائے۔ لیلیٰ حیران رہ گئی کہ آخر یہ کمال کون تھا اور اس وقت اس کا یہاں کیا کام؟

پھر بہت جلد لیلیٰ کو معلوم ہو گیا کہ کمال کس مقصد سے وہاں آیا تھا۔ لیلیٰ نے سوچا کہ برا وقت آ گیا ہے اور اب وہ آبرو ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی۔ مگر اتفاق نے ایک بار پھر اس کا ساتھ دیا۔ کمال اس پر ریجھ گیا اور اس نے کوئی پیش دستی نہ کی۔ نوشی بھی اس موقع پر اس کے کام آئی۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے بڈھے جوہری کی توجہ لیلیٰ کی طرف سے ہٹا کر اپنی طرف کر لی۔ یوں وہ رات بخیر و خوبی گزر گئی۔ صبح نوشی نے لیلیٰ کو بتایا کہ کمال اسے پسند کرنے لگا ہے اور وہ اسے ضرور یہاں سے نکال لے جائے گا۔ نوشی نے صحیح کہا تھا۔ دوسرے ہی دن خانم کو بڈھے جوہری کا فون موصول ہوا کہ وہ لیلیٰ کو تفریح کی غرض سے کہیں باہر لے جانا چاہتا ہے۔ خانم نے انکار کر دیا۔ وہ کچھ مشکوک ہو گئی تھی کیونکہ جوہری نے اس سے پہلے کبھی کسی کو دوبارہ طلب نہیں کیا تھا۔ پھر ایک رات جبکہ نوشی اور لیلیٰ باہر گئی ہوئی تھیں کمال لیلیٰ سے ملنے آ گیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ لیلیٰ کہیں باہر گئی ہوئی ہے تو وہ مشتعل ہو گیا۔ تقی سے اس کی اچھی خاصی جھڑپ ہوئی جس میں دونوں ہی بری طرح زخمی ہوئے۔ اس صورت حال سے لیلیٰ کو ایک فائدہ ضرور ہوا۔ وہ یہ کہ خانم بہت محتاط ہو گئی اور اس نے لیلیٰ کا گاہکوں سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ (اب آگے پڑھئے)

خانم کے عشرت کدے میں نوشی کی حیثیت میرے لئے اس تناور اور چھتنار درخت کی مانند تھی جو خود تو کڑی دھوپ اور تیز جھکڑ میں گھرا مصیبت جھیل رہا ہو مگر مجھے اپنے سائے میں لئے ہوئے ہر قسم کا تحفظ دے رہا ہو۔ نوشی اگر یہاں موجود نہ ہوتی تو جانے میرا کیا انجام ہوتا۔ میں ٹوٹ پھوٹ چکی ہوتی ریزہ ریزہ ہو گئی ہوتی مگر وہ تو میرا ڈھال بن گئی تھی ایک سپر جس پر سارے تیر آ کر کند ہو جاتے ہیں۔ میں اس کی معیت میں خود کو بہت محفوظ و مامون اور پُرسکون محسوس کر رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے اس کی موجودگی میں میرا یہاں بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا۔ کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ مگر یہ سب عارضی باتیں تھیں، وقت اور مصلحت کی ضرورت۔ خانم نے مجھے نوشی کے ساتھ یا نوشی کو میرے ساتھ اس لئے کیا تھا کہ میں یہاں کے ماحول سے آشنا ہو جاؤں اور میری اجنبیت اور وحشت جاتی رہے اور اب جبکہ میں کسی حد تک یہاں کے ماحول کو سمجھ گئی تھی نوشی اور میری ملاقاتوں میں وقفہ اور تعطل آنے لگا تھا۔ اب وہ مجھ سے پہروں اور کئی کئی دن نہ ملتی۔ میں نے اسے کریدا تو پتہ چلا کہ اس کی کچھ ذاتی مصروفیات ہمارے

میل ملاپ تک آ پہنچاتی تھی۔ یہاں کی سب سے بڑی مصروفیت تو یہی بوائے فرینڈ تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح داؤں پیچ کر کے اس سے مل ہی لیتی تھی نوشی کسی بھی صورت اس جہنم سے نکل جانا چاہتی تھی اور میں صدقِ دل کے ساتھ اس کے لئے دعا گو تھی۔ خدا کرے وہ یہاں سے نکل جائے اور اپنے من پسند نوجوان سے شادی رچا کر ایک نئی اور خوشگوار زندگی کا آغاز کر سکے۔

اور پھر جب میں نے اپنے بارے میں سوچا تو میرے قدم لڑکھڑا گئے۔ اپنی قوت اور مدافعت کا جائزہ لیا تو روح کانپ گئی۔ کب تک بچی رہوں گی کتنے عرصے محفوظ رہ سکوں گی۔ یہ اتفاق تھا جو میں اب تک بچتی چلی آ رہی تھی مگر اس ماحول میں رہ کر کوئی کب تک اپنے دامن کو آلودہ ہونے سے بچا سکتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی کانٹوں پر چلے اور زخمی نہ ہو۔ ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد۔ جو یہاں آ گیا وہ اسی کا ہو گیا۔ اتفاقات کب تک میرا ساتھ دیں گے۔ کمال کے تحفے نے مجھے یہ فائدہ پہنچایا تھا کہ خانم نے کوئی مہمان میرے پاس نہیں بھیجا تھا۔ خانم بہت شکی اور وہمی عورت تھی وہ معاملہ ہموار ہونے تک مجھے باہر کے لوگوں سے دور دور رکھنا چاہتی تھی اور یہ بات میرے حق میں مفید ثابت ہو رہی تھی مگر تابکے۔ میں خود کو خوش بخت تصور نہیں کرتی تھی۔ روزِ بد کسی دن بھی آ سکتا تھا۔

دن رینگ رینگ کر گزر رہے تھے اور میری مصروفیات برائے نام رہ گئی تھیں۔ کمرے میں پڑے پڑے رسالے دیکھنا اور نہا دھو کے لباس تبدیل کرتے رہنا یہی میری مصروفیت تھی اور یہی میری عیاشی یا کبھی کبھی اپنے فرار کے الٹے سیدھے منصوبے بنانے لگتی تھی۔ اس طرح میں خانم اور خالہ مجھ سے برابر ملنے آتی رہیں مگر لکی اور دادو کا پتہ نہ تھا۔ پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا میں نے لکی کی آواز تک نہ سنی تھی۔ مجھے ایک طرح کا اطمینان تھا اور اس کے ساتھ تجسس بھی۔ یوں چپ چاپ، دور اور خاموش رہنا لکی کی فطرت نہ تھی وہ تو سائے کی مانند میرے گرد منڈلایا کرتا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ نوشی نے مجھے بتایا تھا کہ لکی کمال سے جھگڑے کے دوران شدید زخمی ہو گیا تھا اور اب بستر پر پڑا ہوا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں یہاں کے معاملات کے بارے میں یہاں کے مکینوں سے پوچھوں مگر ڈرتی ہی تھی کہ کہیں لوگ میرے بارے میں شکوک میں مبتلا نہ ہو جائیں اور حالات میرے خلاف اور زیادہ خراب ہو جائیں۔

کئی دن گزر گئے۔ ایک صبح میں حمام جانے کی سوچ رہی تھی کہ خانم میرے کمرے میں داخل ہوئی اور گپ شپ باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ باتوں باتوں میں خانم نے پوچھا۔ "فلاور تمہیں وہ رات یاد ہے نا جب بوڑھا جوہری تمہارا مہمان بنا تھا؟"

"ہاں یاد ہے۔" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"اور وہ نوجوان جو اس کے ساتھ آیا تھا؟" خانم نے ٹوہ لینے کے انداز میں پوچھا اور اس کی عقابی نظریں مجھ پر جم گئیں۔ پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی خانم دوبارہ بول پڑیں۔ "تمہارے اور اس کے درمیان کس قسم کی باتیں ہوئی تھیں۔ تم نے آپس میں وعدے وعید تو نہیں کئے؟"

میں ہنس پڑی اور شانوں کو اچکاتے ہوئے لاتعلقی سے بولی۔ "مجھے تو ایسی کوئی بات یاد نہیں پڑتی۔ اس رات میں ہوش میں کب تھی۔ ان لوگوں نے پہلے تو مجھے خوب جی بھر کے شراب پلائی پھر جانے کیا کچھ کرتے رہے۔ مجھے تو کچھ یاد بھی نہیں۔ نوشی سے پوچھئے وہ اس رات وہیں تھی شاید کچھ بتا سکے۔" میں بڑی خوبصورتی سے بات گھمائی۔ خانم بے حد پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگی اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس وقت اس کی حیثیت کسی ہارے ہوئے جواری کی مانند تھی۔ خانم کی پریشانی دیکھ کر میرا دل اندر ہی اندر خوش ہو رہا تھا۔ اس رذیل بڑھیا کو پریشان ہونا ہی چاہئے۔ جس قدر پریشان ہو کم ہے۔ اس نے دوسروں کے لئے ہمیشہ مصیبتیں ہی پیدا کی تھیں اور اب خود کو ایک ہلکی سی چوٹ لگی ہے تو بلبلاتی ہوئی گھوم رہی ہے۔ میں نے لطف لینے کی خاطر ذرا انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ "کوئی خاص بات خانم! اس رات کے بعد میں نے اس نوجوان کو نہیں دیکھا کیا کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے؟"

خانم ٹہلتے ٹہلتے رک گئی اس نے میرے سوال کا جواب تو نہیں دیا مگر سر اٹھا کر مجھے غور سے دیکھنے لگی پھر ذرا سخت لہجے میں بولی۔ "فلاور! ایک بات میں تمہارے کان میں ڈال دوں۔ میں جھوٹ بولنے والوں کو سخت ناپسند کرتی ہوں۔ اگر تم مجھ سے جھوٹ بول رہی ہو تو پچھتاؤ گی، بہت برا حشر ہو گا۔"

"جھوٹ کیوں بولوں گی خانم۔ میں اس گھر سے کبھی تنہا نکلی ہی نہیں ہوں۔۔۔۔" خانم نے میرا جملہ مکمل ہونے نہیں دیا اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "اور اسی وجہ سے تم میرے عتاب سے بچی ہوئی ہو۔ ورنہ اب اس جگہ کوئی لڑکی ایسی نہیں آئی جسے یہاں رہتے ہوئے اتنے دن ہو گئے ہوں اور اسے کوئی سزا نہ ملی ہو۔"

خانم تیزی سے کمرے سے نکل گئی کچھ لمحے بعد اس کے قدموں کی چاپ بھی معدوم ہو گئی۔ اس بار میں تنہا ہوئی تو خوف اور وحشت نے بُری طرح مجھے آ لیا۔ میں خود سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگی آخر یہ خانم مجھ سے اس طرح کے سوالات کیوں کر رہی تھی۔ وہ مجھ سے کیا اگلوانا چاہتی تھی۔ اصل بات صرف مجھے اور نوشی کو معلوم تھی یا پھر کمال کو۔ جوہری بھی اصلیت سے لاعلم تھا۔ کیا خانم کو کسی قسم کا شبہ ہو گیا ہے یا کوئی دوسری نئی بات رونما ہوئی ہے جو خانم یوں بولائی بولائی گھوم رہی ہے۔ جو بات بھی ہوگی نوشی کو ضرور معلوم ہوگی وہ یہاں کے معاملات سے پوری طرح باخبر تھی۔ بے اور اس ماحول کے تمام لوگوں پر نظر رکھتی ہے۔ میں نے سوچا تو پھر نوشی سے ہی ملاقات کی جائے شاید کوئی نیا شگوفہ پھوٹا ہو۔ میں نے باہر نکلنے کے لئے دروازہ کھولا تھا کہ میری نظر سامنے سے گزرتی ہوئی ایک عورت پر پڑ گئی۔ وہ عورت یہیں ملازم تھی۔ لڑکیوں کے کمروں کو صاف ستھرا رکھنا اس کی ذمہ داری تھی میں اس کا نام نہیں جانتی تھی مگر صورت آشنا تھی۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور قریب آنے کا اشارہ کیا۔

"کوئی کام ہے فلاور خانم؟" وہ میرے قریب آ کر بولی۔

"ہاں جانم تم سے ایک ضروری کام ہے شاید میرا ہاتھ بٹا کر میں کپڑوں کی الماری ذرا آگے سرکانا چاہتی ہوں۔ تقریباً ایک گز آگے اور اس کی جگہ ایک خوبصورت پینٹنگ آویزاں کرنے کا ارادہ ہے۔ الماری بہت بھاری ہے اور میرے اکیلے کی بس کی نہیں۔"

عورت نے جھاڑو اور ٹوکری دروازہ کے باہر ڈال دیا اور میرے ساتھ کمرے میں آ گئی۔ الماری ہٹانے کا میرا قطعاً ارادہ نہیں تھا میں تو گپ شپ کر کے اس سے کچھ ٹوہ لینا چاہتی تھی۔ سب سے پہلے میں نے اس کا نام پوچھا۔ اس کا نام اطلس تھا۔ اس نے اپنا نام بتاتے ہوئے ایک سرد آہ بھری اور تاسف بھرے لہجے میں بولی۔ "کبھی میں بھی بہت خوبصورت ہوا کرتی تھی۔ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ میں بے انتہا مغرور، خود پسند اور خود پرست لڑکی تھی لوگ مجھ پر پانی کی طرح پیسہ بہایا کرتے تھے۔ میری خاطر جان تو چل جاتے تھے مگر اب نوبت یہ ہے کہ یہاں جھاڑو دینے پر مامور ہوں۔ یہ نہ کروں تو فاقے سے مر جاؤں۔ یقین کرو فلاور خانم! میں جن لڑکیوں کے کمرے میں جھاڑو دیتی ہوں اپنے زمانے میں ان سے کہیں زیادہ حسین اور خوبصورت تھی۔ یہ تو میرے گرد کو بھی نہیں پہنچتیں۔ بس وقت اور قسمت کی بات ہے۔ نصیب میں یہی لکھا تھا۔" اس کا لہجہ بڑا دردناک تھا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے حسرت و یاس جھلک رہی تھی۔ عورت کا حسن کھو جائے جوانی گم ہو جائے اس سے زیادہ غم کی بات اس کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے۔ میں نے غور سے اطلس کا چہرہ دیکھا وہ بہت اندوہناک اور بجھا بجھا نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنی دونوں آستینیں سمیٹ رہی تھی تاکہ آسانی سے الماری کو ہٹا سکے۔ میں نے گفتگو کو آگے بڑھانے کی خاطر مسکراتے ہوئے کہا۔ "فکر نہ کرو اطلس ایک دن میں بھی ایسی ہی ہو جاؤں گی۔"

"خدا نہ کرے۔" اطلس نے بے ساختہ میری طرف پلٹتے ہوئے کہا۔ "تم میں اور مجھ میں فرق ہے تم میرے مقابلے میں ہوشیار اور عقلمند ہو۔ جانتی ہو میری یہ حالت کیوں ہوئی۔ میں بالکل دو ٹکے کی عاقبت نااندیش تھی۔ میں نے کبھی بھولے سے بھی مستقبل کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ مجھے اندازہ ہی نہیں تھا کہ عورت کا حسن اور جوانی ہمیشہ ساتھ نہیں دیتے۔ یہ جانے والی چیزیں ہیں چلی جاتی ہیں اور عورت خلا میں معلق رہ جاتی ہے۔ پھر اس کے سر پہ آسمان ہوتا ہے نہ پاؤں کے نیچے زمین۔ بالکل میری جیسی حالت۔ مگر تم ذہین ہو اور ذہین ہو۔ اور آجکل کی لڑکیاں تقریباً تمام ہی ایسی ہوتی ہیں وہ مردوں سے پیسے کھینچتی ہیں اور پیسہ پس انداز کرتی ہیں جو ان کے برے دنوں میں کام آتے ہیں اور میری طرح پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے انہیں جھاڑو نہیں دینا پڑتا۔ میرے زمانے میں لڑکیوں کی حالت یہ تھی کہ وہ رقم کھینچنے کی بجائے الٹا مردوں پر خرچ کرتی تھیں۔ اپنی جمع پونجی محبوب مردوں پر لٹا دیتی تھیں۔ بلکہ زندگی موت کی پرواہ نہیں کرتی تھی۔ مگر اب زمانہ الٹا آ گیا ہے اب مرد عشق کے ہاتھوں لٹ جاتا ہے اور عورت عیش کرتی ہے۔" بات کرتے کرتے اطلس رک گئی اور خفیف سی ہو کر بولی۔

"تم سوچ رہی ہوگی کہ یہ اطلس بھی کیا عورت ہے۔ بس بولے ہی چلی جا رہی ہے۔ بکواس رکتی ہی نہیں۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تمہاری گفتگو میں دلچسپی لے رہی ہوں۔" میں نے اطلس کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔ پھر اچانک ہی موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ "یہ تقی کا کیا حال ہے۔" میں نے یہ سوال کچھ اس طرح کیا تھا کہ اطلس کو ذرہ برابر شبہ نہ ہوا کہ میں نے محض اسی سوال کی خاطر اسے اس کمرے میں آنے کی زحمت دی تھی۔ میں نے یہ سوال یونہی روا روی میں کیا تھا جیسے کوئی اسی طور پر کسی کی خیریت پوچھتا ہے۔ اور میری توقع کے مطابق مجھے اس میں کامیابی ہوئی۔ اطلس نے فوراً جواب دیا۔ "اس کی حالت ابھی ٹھیک نہیں ہے آج

کراچی سے خیبر تک
تازیانہ
کی دھوم مچ گئی
تازیانہ کس کو نہیں چاہیے؟
آپ کو بھی، قوم کو بھی
تازہ نہ ملے تو اگلا سہی
ہر تازیانہ اچھا لگے گا
۲۹
تازیانہ پوسٹ بکس ۸۰۹۵ کراچی

میں ناشتہ دے کر اس کے کمرے میں گئی تھی۔ وہ تو ٹھیک سے سانس
بھی نہیں لے سکتا۔ اس کی اچھی خاصی ٹھکائی ہوگئی ہے۔ جسم سوج کر
کپا ہوگیا ہے اور شاید کوئی ہڈی وغیرہ بھی اپنی جگہ سے سرک گئی ہے۔
وہ دو تھے اور اس طرف بھی دو تھے مگر وہ دونوں ان دونوں پر بھاری
پڑ گئے تھے۔ ان میں چار آدمیوں کی طاقت تھی۔ انہوں نے تقی اور
داؤد کو بری طرح مارا۔ تقی کو تو بہت سخت چوٹیں آئی ہیں۔ وہی سب
سے پہلے چیخ مارتا ہوا زمین پر گرا تھا۔ خانم اس کے لئے بہت پریشان
ہے۔"

"میں اور نوشی اس رات گھر پر نہیں تھے۔ آخر جھگڑا کس بات
پہ ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔ حالانکہ میں جھگڑے کا سبب اچھی طرح
جانتی تھی۔ انجان بننے میں جو لذت ہے وہ اور بھلا کس چیز میں ہے
اطلس نے پتلیاں گھمائیں اور اپنی معلومات پر اکڑتے ہوئے بولی۔
"کسی عورت کا چکر تھا۔ کوشش کے باوجود نہ معلوم کرسکی کہ آخر وہ کون
تھی۔ اصل میں مجھے یہ پوچھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ خانم کے اس سلسلے
میں بہت سخت احکامات ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ ہم لوگ لاتعلق باتوں
سے گریز کیا کریں اور صرف اپنے کام سے کام رکھیں۔ پھر جب سر میں
درد ہی نہ ہو تو پٹی باندھنے کی کیا ضرورت ہے۔ البتہ میں نے اڑتی سی
خبر سنی ہے کہ کمال یہاں کی کسی لڑکی کو اپنے ساتھ لے جانے آیا تھا۔ خانم
اسے بہانہ بنا کر ٹال رہی تھی کہ وہ لڑکی یہاں موجود نہیں ہے کوئی آدمی
اپنے ساتھ کہیں باہر لے گیا ہے۔" اطلس نے دروازے کی طرف ذرا
محتاط نگاہوں سے دیکھا اور سر جھکا کر انتہائی رازدارانہ لہجے میں بولی
"دیکھو کسی سے ذکر نہ کرنا بہت راز کی بات ہے۔ وہ آدمی لڑکی سے
دستبردار ہونے پر تیار نہیں ہے۔ کل رات میں نے خانم کو بہت
پریشان اور بدحواس دیکھا تھا۔ وہ پھرکی کی مانند پورے کمرے میں گھومتی
رہی تھی۔ اس نے آناً فاناً مکان کی تمام کھڑکیاں بند کروا دی تھیں اور
روشنی بجھا کر مکمل اندھیرا کر دیا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہی آدمی یعنی
آغا کمال کہیں مکان کے آس پاس دکھائی دے گیا تھا۔"

"تو یہ تھی خانم کی پریشانی اور بدحواسی کی وجہ۔" میں نے دل ہی
دل میں سوچا اور اسی لئے وہ ابھی ذرا دیر پہلے میرے پاس بھاگی ہوئی
آئی تھی اور مبہم انداز میں مجھے دھمکی بھی دی گئی تھی وہ سمجھتی ہے شاید
اندر ہی اندر میرے اور کمال کے مابین کوئی قول و قرار ہوگیا ہے اور میں
یہاں سے بھاگنے کے منصوبے بنا رہی ہوں۔ اگر وہ یہ سوچ رہی تھی تو
کسی حد تک صحیح تھی۔ میرے اور کمال کے درمیان کوئی قول و قرار تو
نہیں ہوا تھا البتہ میں یہاں سے بھاگنے کے موڈ میں ضرور تھی۔ کمال کے
ساتھ یا اس کے بغیر یا کسی اور کے ساتھ۔ معاملہ عشق و محبت کا نہیں تھا
صرف بھاگنے کا تھا۔ ممکن ہے کمال مجھ میں دلچسپی لینے لگا ہو مگر مجھے اس
سے کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ کمال میرا ذریعہ تو بن سکتا تھا،
منزل نہیں۔ اگر اس رات کمال میرے جسم کی رشوت لے کر مجھے یہاں سے
نکالنے پر آمادہ ہو جاتا تو میں بسر و چشم تیار ہو جاتی کیونکہ ایک مرد کو برداشت
کر لینا اس بات سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ متعدد مرد متواتر اور مسلسل میرے
جسم کو روندتے اور کچلتے رہیں۔ ایک زخم کھا کر بہت سارے زخموں سے
بچ لیا جائے تو یہ بات بہتر ہے۔ دو ایک چھینٹوں کو گوارا کر کے غلاظت
کے ڈھیر سے دامن بچا لینا یقیناً مستحسن بات ہے۔ میں تھوڑی سی قربانی
دے کر ایک بہت بڑے اور دائمی عذاب سے نجات مل جائے تو کیا بری
بات ہے۔ ایک بار کا رو لینا بار بار کے رونے سے بہتر ہے۔ آخر جان کا صدقہ
مال ہوتا ہے اور میرا مال و متاع اور اندوختہ کیا تھا۔ میرے پاس کوئی
سرمایہ نہیں تھا بس یہی کہ میں نوجوان تھی اور حسین تھی۔ مگر میں روح کا
کرب کیوں جھیلوں۔ پاگل کیوں بنوں۔ دیوار سے ٹکریں کیوں ماروں۔
نکل کیوں نہ جاؤں۔

بس مجھے نکلنے کی دھن تھی اور میں اس سخت حصار میں کوئی
روزن کوئی شگاف ڈھونڈ رہی تھی اور یہ شگاف کمال تھا۔ کمال مجھے
یہاں سے نکالنے کے لئے کوشاں تھا اور میرے لئے ضروری ہوگیا تھا کہ
میں اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں۔ مجھے اس وقت ایک عجیب قسم کی تقویت
اور طمانیت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے پیار بھری نظروں سے اطلس کی
طرف دیکھا اور پرس سے بیس تومان کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے
ہوئے بولی۔ "الماری خاصی وزنی ہے میں نے خوامخواہ تمہیں پریشان کیا
اسے اسی جگہ رہنے دو میں خانم سے کہہ کر کوئی دوسرا کمرہ لے لوں گی۔"
"تقی کا کمرہ بہت خوبصورت ہے وہی لے لیجئے۔" اطلس نے
نوٹ گریبان میں چھپاتے ہوئے کہا۔
"نہیں بھئی تقی کا حق زیادہ ہے وہ یہاں کا ذمہ دار آدمی
ہے۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔ اطلس نے زور سے سر ہلایا اور زیر
لب کچھ کہا جسے میں سن نہ سکی۔ ممکن ہے اس نے بیس تومان کے لئے میرا
شکریہ ادا کیا ہو۔ پھر وہ جانے کے لئے دروازے کے قریب پہنچی تھی کہ
میں نے پوچھا "کیا تمہاری ملاقات تقی سے روز ہوتی ہے؟"
"ہاں روز۔ صرف اس وقت اس کے کمرے میں جانے کی
ممانعت ہے جب خانم اس کے ساتھ ہوں۔" اطلس نے مسکراتے ہوئے
معنی خیز لہجے میں کہا۔
"کیا مطلب۔ اس کے ساتھ یعنی یعنی۔" میں کہتے کہتے رک

گئی۔ مجھے سخت حیرت ہوئی تھی۔ اطلس ہنسنے لگی۔ ہنستے ہوئے بولی "تم لوگ جب کسی مرد کے ساتھ خلوت میں ہوتی ہو تو کیا کرتی ہو لیکن خانم مرتی ہے اس تقی پر۔ جان دیتی ہے اس پر۔ کبھی اکیلے میں دیکھو وہ تقی کے کوسے جاتی ہے۔ جتنی وہ باہر کی شیر ہے اندر اتنی ہی... " اطلس کہتے کہتے رک گئی۔ غالباً یہ خانم کا خوف تھا جو وہ اس کی غیر موجودگی میں بھی کوئی ناشائستہ لفظ نہ کہہ پا رہی تھی۔ اطلس رکی پھر کچھ دیر بعد ذرا تلخ لہجے میں بولی "سب پیسے کا کھیل ہے فلاور خانم! اس کے پاس پیسے ہوتے تو میں بھی تقی جیسے آدمیوں کو قدموں کو لوٹنے پر مجبور کر دیتی۔ خانم کے پاس پیسہ نہ ہوتا تو تقی اس کی طرف تھوکنا بھی پسند نہ کرتا"

کسی لمحے میں جانے کب میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ میں تقی کو پھانس کر اسے خانم اور داؤد سے دور کر دوں گی اور اپنے کاغذات قبضے میں کر کے یہاں سے فرار ہو جاؤں گی مگر تقی تو خانم میں دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ بھلا میرا خطرہ کیوں مول لے گا اور میرے پاس روپے پیسے نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ تو بس میرے جسم کا رس حاصل کرنا چاہتا تھا اسے میری ذات یا میرے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

تقی سے مجھے نفرت تو پہلے سے تھی مگر اس وقت نفرت کچھ زیادہ ہی محسوس ہوئی۔ تقی سے مایوس ہو کر میری سوچ داؤد کی طرف چلی گئی۔ ہاں داؤد میرے کام آ سکتا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھے حریص نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ میں نے اطلس سے پوچھا "داؤد کہاں ہے۔ میں نے اسے کئی روز سے نہیں دیکھا"

"یہیں گھر پر ہے۔ مگر آپ اسے کیوں پوچھ رہی ہیں" اطلس نے میرے لہجے کی طلب کو محسوس کرتے ہوئے چونکتے انداز میں پوچھا۔

"بس یونہی ایک کام تھا" میں نے سرسری طور پر کہا۔ مگر اطلس ایک جہاں دیدہ عورت تھی میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی "فلاور خانم! داؤد کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ وہ تقی سے کسی صورت بھی کم نہیں ہے۔ خدا جانے تقی کوئی قتل وغیرہ کیا ہے یا نہیں مگر داؤد باقاعدہ قاتل ہے اور جہاں تک میری معلومات ہیں وہ کئی قتل کر چکا ہے۔ اس سے بے تکلف ہونا یا ربط و ضبط بڑھانا ٹھیک نہیں ہے"

"او اطلس تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو" میں نے ہنستے ہوئے کہا "مجھے داؤد سے کوئی خاص کام نہیں ہے اسے میڈیکل اسٹور بھیج کر کچھ دوا منگوانی تھی۔ بس اتنی سی بات ہے"

اطلس کو گویا اطمینان سا ہو گیا۔ باہر نکلتے نکلتے اس نے کہا "میں ابھی داؤد کو بھیجتی ہوں" اطلس چلی گئی تو ایک بار پھر میری سوچ تقی،

داؤد اور خانم کی طرف منتقل ہو گئی۔ تقی یقیناً خانم سے ڈرتا ہوگا پھر اس کے اور خانم کے جنسی تعلقات بھی ہیں۔ اس صورت میں تقی کو اپنی طرف مائل کرنا یقیناً مشکل کام ہوگا۔ لہٰذا داؤد ہی بہتر رہے گا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ داؤد ہی بہتر رہے گا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ داؤد تقی کو ناپسند کرتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں تقی سے نفرت کرتا تھا۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی تھیں۔ ممکن ہے وہ تقی کو اس لئے ناپسند کرتا ہو کہ اس کے خانم سے خصوصی تعلقات تھے۔ اور خانم نے اس کے مقابلے میں تقی کو ترجیح دیا تھا۔ تو پھر وہ خانم سے بھی نفرت کرتا ہوگا۔ یہ سب باتیں میرے لئے بڑی اچھی تھیں مجھے داؤد کی حوصلہ افزائی اور پذیرائی کرنی چاہیئے۔ اس کی نفرت کو اور زیادہ ہوا دینا چاہیئے۔ پھر شاید میں داؤد کو خانم اور تقی سے لڑوا سکوں اور اسے اپنی طرف مائل کر سکوں۔

اطلس چلی گئی تھی۔ میں نے اخبار اٹھایا اور اسپورٹس کا صفحہ ایک فٹ بال میچ کے بارے میں پڑھ رہی تھی کہ کسی نے دروازے پر آہستگی سے دستک دی۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ یہ یقیناً داؤد ہوگا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے ضروری تیاری کر لینا مناسب سمجھا۔ میں نے گریبان کے چند بٹن کھول دیئے اور لباس اوپر سرکا کر اتنا اونچا کر لیا کہ میری سفید اور گداز رانیں نمایاں ہو گئیں۔ پھر میں بستر پر نیم دراز ہو گئی اور داؤد کو اندر آنے کے لئے کہا۔

دروازہ آہستگی سے کھلا اور داؤد کا چہرہ نمودار ہوا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ مجھے اس حالت میں دیکھ کر وہ کچھ سٹپٹا سا گیا تھا۔ وہ گم سم دروازے پر کھڑا رہا مگر اس کی آنکھیں متحرک اور فعال تھیں۔ داؤد بڑی توجہ اور دلچسپی سے میرے جسم کو پڑھ رہا تھا۔ میرا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا۔ اس کی اس حالت پر میں مسکرا

دی اور بڑے نشیلے لہجے میں بولی "کیا دیکھ رہے ہو داؤد! آؤ اندر آجاؤ"
مگر داؤد اپنی جگہ جما کھڑا رہا۔ اس میں اندر آنے کی ہمت نہیں تھی۔
اسے توقع نہیں تھی کہ میں اس ذلت میں اس کا استقبال کروں گی۔ چند
لمحے سرعت سے گزر گئے۔ پھر داؤد نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری
اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا "اس نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے
مجھے بلایا ہے۔ آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟"

"ہاں ایک کام ہے۔ مگر تم دروازے پر کیوں کھڑے ہوئے
ہو۔ اندر کیوں نہیں آجاتے۔ یہاں کوئی شیر ببر نہیں بیٹھا" میں نے
ذرا ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔ مگر داؤد اپنی جگہ کھڑا ہی
رہا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اس قدر سہل الحصول ہو سکتی ہوں۔

"آخر دہشت کیا ہے۔ تم اندر کیوں نہیں آتے" میں ذرا
لگاوٹ سے بولی۔

"ایسا۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا" داؤد ہکلایا پھر تھوک
نگلتے ہوئے بولا "اگر کسی نے دیکھ لیا تو آفت آجائے گی آپ وہیں سے
بتادیں کیا کام ہے"

"میں خود جو کہہ رہی ہوں۔ پھر ڈرنے کی کیا بات ہے"
میں نے اسے کچھ حوصلہ دیا۔

"آہ فلاور خانم۔ بہت سی باتیں ہیں جو آپ نہیں جانتیں"
داؤد نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"آخر کون سی باتیں ہیں میں بھی تو سنوں"

"نہیں۔ ان کا نہ جاننا ہی آپ کے لئے بہتر ہے" داؤد نے
سر ہلاتے ہوئے کہا۔ داؤد جانے کیوں سہما ہوا سا تھا۔ ایک جیسے تن و توش
کے آدمی کو اور وہ بھی جبکہ پیشہ ور قاتل ہو۔ اس قدر ڈرا سہما دیکھ کر
مجھے کچھ تعجب ہوا کچھ ہنسی بھی آئی۔ شاید وہ خانم اور تقی سے بہت
زیادہ ڈرتا تھا۔ غالباً وہ اس گھر میں اکیلا لگتا تھا اور کوئی اس کا پُرسانِ حال
اور حامی نہ تھا۔ اس لئے وہ کوئی خطرہ مول نہ لینا چاہتا تھا۔ کچھ سوچ
کر میں بستر سے اُٹھ بیٹھی۔ آگے کی طرف جھکتے ہوئے میری سینہ پوری
طرح نمایاں ہو گیا۔ اسی وقت میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ داؤد کی
آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک لہرائی تھی۔ میں نے اپنے چہرے پر
ایک بے حد خوبصورت اور دلکش مسکراہٹ سجائی اور مخمور آواز میں بولی
"داؤد میرا ایک کام کرو گے؟"

"کس قسم کا کام ہے" داؤد نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"مجھے اکثر بے خوابی کی شکایت رہتی ہے۔ خصوصاً آج کل تو بالکل
ہی نیند نہیں آتی۔ تم کسی میڈیکل اسٹور سے مجھے ویلیم کی ٹکیاں لا دو۔
اگر میں سو نہ سکی تو میرا سر پھٹ جائے گا۔۔ یہ پیسے لو اور میں تمہیں
کچھ انعام بھی دوں گی" میں نے اپنے پرس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"تم مجھے پیسے دو گی۔ وہ بھی دوا کے اور اوپر سے انعام بھی۔
یعنی اب میرے پاس اتنے بھی پیسے نہیں ہیں کہ میں تمہارے لئے دوا لا
سکوں" داؤد بڑے جوش و خروش سے بولا۔ اس کی مردانہ جبلت اور
خودداری پر زبردست چوٹ پڑی تھی۔ اس نے تیکھے لہجے میں کہا "سنو
میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو انعام کی لالچ میں کوئی کام کرتے
ہیں۔ اور پھر عورت سے کیا انعام لینا۔ نہیں یہ مردوں کے شایانِ شان
نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ کام بھی کون سا کام ہے۔ دوا لانی ہے
کون سا پہاڑ کھود کر نہر نکالنا ہے" داؤد دروازے پر کھڑے کھڑے
اتنا بول گیا تھا۔ وہ سانس لینے کو رکا پھر سر کو جھٹکتے ہوئے بولا "میرے
پاس ہر وقت کچھ نہ کچھ رقم پڑی رہتی ہے۔ اگر نہ بھی ہوتی تو میرے لئے
کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ رقم حاصل کرنا میرے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے
بلکہ بہت ہی آسان بات ہے۔ بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ بس ذرا باہر نکل
کر ہجوم کے درمیان سے گزرنا ہے پھر اس کے بعد میری جیب میں رقم
ہی رقم سمجھو۔ میرے پاس ایک ایسا ہنر ہے جس سے میں کبھی بھی روپے
پیسے کی تکلیف میں مبتلا نہیں ہو سکتا" آخر میں داؤد بے اختیار
ہنس پڑا۔ میں بھی ہنسنے لگی۔ ہنستے ہوئے بولی "اچھا مجھے نہیں معلوم
تھا کہ تم اتنے بڑے فنکار ہو"

داؤد کی جذباتی کیفیت سے میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ
مجھ سے بہت زیادہ متاثر ہو گیا ہے۔ یہ میرے لئے خوش آئند بات
تھی۔ وہ مرد تھا۔ مردوں کے اپنے مخصوص جذبات ہوتے ہیں۔ اس
وقت داؤد کی جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو اس کی بھی یقیناً یہی کیفیت ہوتی
بلکہ وہ تو بہت پہلے پیش قدمی کر چکا ہوتا۔ مگر داؤد تو بے چارا بری طرح
نروس ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "اچھا
تو جاؤ جلدی سے میرے لئے خواب آور ٹکیاں لے آؤ"

داؤد اپنی جگہ جما کھڑا رہا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا "نہیں میں یہ
کام نہیں کر سکتا" اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"آخر کیوں۔ ابھی تو تم راضی ہو گئے تھے" میں نے حیرت
سے دوچار ہوتے ہوئے کہا۔

"شاید تم اس طرح خودکشی کرنا چاہتی ہو۔ یہاں کے ماحول
سے تنگ آگئی ہو" داؤد نے بڑے خلوص اور اپنائیت سے کہا۔
حیران رہ گئی۔ یا عجب! یہ شخص کتنی جلدی پانی ہو گیا ہے۔ اتنی دیر
تو برف کی سِل بھی نہیں پگھلتی میرے جینے مرنے سے اس شخص کو کیا

برازیل کی ایک مقامی ہوائی سفری کمپنی نے اعصابی مریضوں اور ہوائی سفر سے ڈرنے والوں کو رعایت دی ہے کہ وہ ان کو دوائی سے غنودگی کی حالت پیدا کر کے منزلِ مقصود تک پہنچائے گی اور منزلِ مقصود پر ان مسافروں کو پوری طرح ہوشیار کر دیا جایا کرے گا۔ اس طرح کمپنی کو اپنے مسافروں کی تعداد میں اضافے کا پورا یقین ہے۔

قسم کھاؤ کہ تم خودکشی نہیں کرو گی۔"

"میرے مرنے جینے کا تم پر کیا اثر پڑے گا داؤد۔ میرا بھلا کون رونے والا ہے۔" میں نے کہا۔ داؤد پر میرے جملے کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے اضطراری کیفیت میں کچھ کہنا چاہا مگر اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ اس نے ہاتھ میں دبی ہوئی خواب آور دوا کی شیشی کو گھورتے ہوئے بمشکل کہا۔ "جب تک تم قسم نہیں کھاؤ گی میں تمہیں شیشی نہیں دوں گا۔"

"تمہارے سر کی قسم میں خودکشی نہیں کروں گی۔" میں نے داؤد کو اور شیشے میں اتارا۔ وہ ایک دم ریشہ خطمی ہو گیا جیسے جنم جنم سے میرا عاشق چلا آ رہا ہو۔ جیسے میں دنیا بھر میں اسی کو تلاش کرتی ہوئی اس عشرت کدے میں آ بیٹھی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ داؤد کی طرف بڑھایا اور شہد ٹپکاتی ہوئی آواز میں بولی۔ "تنگ نہ کرو۔ لاؤ شیشی مجھے دے دو۔" اب تو داؤد کی حالت اور خراب ہو گئی۔ یہ نہیں کہ اس نے کبھی زندگی میں کوئی عورت نہیں دیکھی تھی بلاشبہ درجنوں عورتوں کی قربت اسے نصیب ہوتی ہو گی۔ مگر وہ عورتیں ایسی ہی رہی ہوں گی جیسا کہ وہ خود تھا۔ "کبوتر با کبوتر باز با باز" کا قانون ہر جگہ عمل پیرا ہے۔ داؤد کو زندگی میں عورتیں ملی ہوں گی مگر لیلیٰ کا ہے کو ہاتھ لگی ہو گی۔ اور اب لیلیٰ پکے ہوئے پھل کی مانند اس کی گود میں گرنے والی تھی۔ داؤد نے ایک قدم آگے بڑھایا اور مجھے شانوں سے پکڑتا ہوا بولا۔ "فلاورز اجازت دو کہ میں تمہارے ہونٹ چوم لوں۔" میں نے ازراہِ نزاکت سے کوئی پیچھے ہٹی اور دل پر جبر کر کے ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھتی ہوئی بولی۔ "نہیں داؤد ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے۔ اس قدر جلد بازی سے کام نہ لو۔ میں کہیں بھاگی تھوڑی جا رہی ہوں۔" میں نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ داؤد پر کیا اثر پڑتا تھا۔ میری اور اس کی اس سے پہلے کبھی اس انداز کی گفتگو اور ملاقات بھی نہ ہوئی تھی پھر وہ کس طرح اس قدر جذباتی اور میرا ہمدرد بن گیا تھا۔ حیرانی شدید حیرانی۔"

میں اٹھی اور دلربا چال چلتی ہوئی داؤد کے قریب گئی اور بڑی ادا سے بولی۔ "اگر تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے تو تم مجھے صرف دو ٹکیاں دے کر وہ شیشی اپنے پاس رکھو۔"

"نہیں یہ بھی غلط ہے۔" داؤد سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "تم ویلیم کے اثرات نہیں جانتیں۔ آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گی اور بعد میں اس کے بغیر نہ رہ سکو گی۔ میں کئی ایسی لڑکیوں کو جانتا ہوں جنہوں نے ویلیم سے شروعات کی اور راکٹ تک جا پہنچیں اور اب وہ موت کی دعائیں مانگتی رہتی ہیں۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔" داؤد نے یہ کہا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ میں اسے آوازیں دیتی رہ گئی۔

عجیب آدمی تھا یہ داؤد بھی۔ مجھے ہنسی آ رہی تھی، کچھ غصہ اور خوشی بھی۔ داؤد نے میرے کام سے انکار کیا تھا مگر اس کا بھی ایک پہلو تھا اور یہ پہلو اشتیاق تھا۔ اس کے انکار میں میرے لئے اس کی وابستگی اور پسندیدگی کا عنصر شامل تھا گویا میں اپنے مقصد میں کامیاب رہی تھی، وہ میرے جال میں آ گیا تھا۔ میں اپنی کامیابی پر مسرور اور نازاں، آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ نوشی آندھی طوفان کی مانند کمرے میں داخل ہوئی۔ اس وقت وہ بہت خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اس کے جسم پر سبز لباس تھا اور اس نے اپنے بال بڑے قاعدے سے سنوارے ہوئے تھے۔ وہ میرے قریب آئی اور بڑی محبت سے میرے رخسار کو بوسہ دیا۔ میں نے اسے بستر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں ڈیر! بیٹھوں گی نہیں۔ جلدی میں ہوں صرف یہ بتانے آئی تھی کہ آج رات پھر میرا تمہارے ساتھ پروگرام ہے۔" مجھے دھچکا سا لگا بے چینی کے عالم میں بولی۔ "تو مصیبت ٹلی نہیں۔ یہ زندگی مجھ پر بھاری پڑ رہی ہے۔"

"مجبوری ہے جانم! دیکھو کیا ہوتا ہے۔ دو ہیں، کہیں باہر سے آئے ہیں۔" نوشی نے انتہائی بیزاری سے کہا۔ پھر اس کے ساتھ ہی جھکی اور دوبارہ میرے رخسار کو چومتی ہوئی بولی۔ "اچھا اب رات کو ملاقات ہو گی۔" نوشی جس تیزی کے ساتھ آئی تھی اسی تیزی سے واپس چلی گئی۔ اسے گئے ہوئے کوئی پندرہ منٹ ہوئے ہوں گے کہ کسی نے دروازے کو تھپتھپایا۔ میں نے دروازہ کھولا سامنے داؤد کھڑا ہوا تھا۔ مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں شیشی لے آیا ہوں۔ مگر

کو دھکیل کر کمرے سے باہر کر دیا اور دروازہ بند کر کے اس سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے بڑی مشقت کا کام کیا تھا۔ داؤد کے جاتے ہی میرا سارا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔ کچھ دیر تک میں دروازے سے لگی کھڑی رہی پھر بے جان سی بستر پر جا کر گر پڑی۔ میرے آلودہ ہونے میں کیا کسر رہ گئی تھی کسی کو ایک دم زہر دیا جاتا ہے کسی کو قطرہ قطرہ کر کے۔ میرے جسم میں قطرہ قطرہ زہر جمع ہو رہا تھا۔ لگ رہا تھا جیسے میں مر رہی ہوں ... میں نے اپنے وجود میں اس قدر گھٹن اس قدر حبس کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ کسی کو ایک دم ہی جلتے الاؤ میں پھینک دیا جاتا ہے کسی کو رفتہ رفتہ انگاروں سے داغا جاتا ہے۔ آخر میں مر دونوں جاتے ہیں مگر اذیت تک موت کس کی ہوتی ہے کسی کا سر تلوار کی ایک جنبش سے جسم سے جدا کر دینا اور بات ہے ایک ایک عضو کاٹ کر ہلاک کرنا اور بات۔ موت دونوں ہی صورت میں تھی مگر کونسی موت دردناک تھی۔ میں قسطوں میں قتل کی جا رہی تھی۔ میں لمحہ لمحہ ہلاک ہو رہی تھی۔ میں بظاہر پاک صاف اور منزہ تھی مگر در حقیقت گردن تک دلدل میں دھنس چکی تھی۔ میرا جسم غلاظت میں نہیں لتھڑا تھا مگر میں اس کی چھینٹیں اپنے جسم پر محسوس کر رہی تھی۔ میرے باطن میں کوئی گندگی کوئی آلودگی نہیں تھی مگر اوپر گندگی کی ایک تہہ چڑھ گئی تھی۔ میری روح بیدار تھی جسم سو گیا تھا، میں جاگ رہی تھی، میں سو رہی تھی۔

دوسرے دن مجھے داؤد کے ساتھ بینک جانا پڑا۔ مجھے اکیلے کہیں جانے کی اجازت نہ تھی۔ شکر ہے کہ تقی بستر پکڑے ہوئے تھا ورنہ وہی میرے ساتھ ہوتا۔ مجھے اس کے منحوس اور چیچک زدہ چہرے سے نفرت تھی یہ داؤد تو پھر گوارا تھا۔ واپسی میں داؤد نے مجھے ٹٹولنے کی خاطر پوچھا "فلاور! کل جو تم نے مجھ سے باتیں کی تھیں ان میں سچائی کہاں تک ہے" میں داؤد کے اس سوال پر ذرا چونکی۔ یعنی کچھ عقل رکھتا ہے یہ سوال ہر عقل کر سکتا تھا۔

"کون سی باتیں؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہ تم مجھ پر مرتی ہو" داؤد نے بڑے بازاری لہجے میں کہا میں کہا۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ اس وقت اس کی حوصلہ افزائی کرنا واقعی خودکشی کے مترادف تھا اور حوصلہ شکنی میرے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتی۔ میں نے سوچنے میں وقت ضائع نہیں کیا داؤد جیسے میں پڑھا تا مسکراتی ہوئی بولی۔ اس میں کوئی شک ہے" میں اپنی فراست پر حیران رہ گئی۔ واقعی کتنا عمدہ، ذو معنی اور مناسب جواب تھا۔ الٹا ایک سوال تھا اور داؤد کی پرسنیلٹی کے لئے ایک چیلنج بھی۔ پھر اس مخمصے کو سرے سے پس پشت ڈالنے کے لئے باقاعدہ ہنس دی۔ داؤد مجھے ابھی

ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا "ہنس کیوں رہی ہو؟"

"اچھا تو اب یہ بھی بتاؤں کہ ہنس کیوں رہی ہوں۔ سوچتا تم مرد ہو کر نہیں" ایک اور الجھا دینے والا سوال۔ داؤد شانے اچکاتے ہوئے طفیل کے عالم میں بولا "کبھی تھا اب تو اس گھر میں آ کر ہیجڑا ہو گیا ہوں۔ اس گھر میں کوئی مرد بھی مردانگی کا دعویٰ نہیں کر سکتا"

"ماشاءاللہ!" میں نے دل ہی دل میں اپنی بیٹھے ٹھکو کی داد دی اپنے اصل موضوع سے کس قدر دور نکل آیا تھا۔ میں ذرا لطف لیتے ہوئے پوچھا "ویسے جسمانی طور پر تو مرد ہی ہو گے"

"وہ تو ہوں مگر فائدہ کیا۔ یہاں تو میری حیثیت ایک مکھی سے زیادہ نہیں ہے۔ خانم جس لڑکی سے ناراض ہوتی ہے اس پر چھوڑ دیتی ہے۔ اپنی پسند کی لڑکی پر نظر میں بھی نہیں اٹھانے دیتی۔ کیا فائدہ ایسی مردانگی سے جس میں اپنی مرضی اور انتخاب شامل نہ ہو" داؤد بہت جلا ہوا تھا دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔ مجھے اس وقت بہت لطف آ رہا تھا شاید بہت دنوں بعد میری حس مزاح بیدار ہوئی تھی اور مجھے ہنسنے کا موقع ملا تھا۔ داؤد اس وقت کچھ اس انداز سے گلے شکوے کر رہا تھا جیسے ستائی ہوئی مطلقہ یا بیوہ عورتیں زمانے کا گلہ کرتی ہیں۔ میں نے گفتگو کا رخ اور موڑ دیا اور داؤد سے ذرا قریب ہوتی ہوئی بولی۔ "سچ بتاؤ داؤد جب کوئی لڑکی خانم کی حکم عدولی کرتی ہے تو خانم تمہیں اور تقی کو کس بات کا حکم دیتی ہے۔ میرا مطلب ہے تم اس لڑکی کو کس طرح کی سزا دیتے ہو؟"

"کیسا سوال پوچھا ہے تم نے" داؤد اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "آہ! اس رات جب تم پہلی بار عشرت کدے میں آئی تھیں تمہیں دیکھتے ہی میں بے قابو ہو گیا۔ میں دعا کر رہا تھا کہ خدا کرے تم اور ہٹ دھرمی سے کام لو اور خانم مجھے اور تقی کو حکم دے کہ ہم دونوں مل کر تمہیں تمیز سکھائیں"

"کیا کرتے تم لوگ" میں نے سانس روکتے ہوئے پوچھا۔

"وہی جو نوشی کے ساتھ کیا تھا۔ وہ پہلی رات تھی اور نوشی نے خانم کو بے حد ناراض کر دیا تھا۔ خانم غصے میں کانپتی، لال پیلی میرے اور تقی کے پاس آئی اور حکم دیا کہ ہم جا کر نوشی کو تمیز سکھائیں۔ چنانچہ ہم نوشی کے کمرے میں پہنچ گئے۔ پہنچتے ہی ہم نے نوشی کا لباس تار تار کر دیا۔ وہ چیختی رہی چلاتی رہی مگر ...... مگر تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو" داؤد نے اچانک ہی سنبھالا لے لیا اور میں جیسے اچھل سی پڑی۔ پھر میں نے بھی سنبھالا لیا اور روہانسی صورت بنا کر بولی "کیا تمہارا دل گوارا کرتا کہ تم اور وہ بھی تقی کے ساتھ میری عزت کو داغدار کرتے" میں نے یہاں دانستہ اس کے ساتھ تقی کا نام جوڑا تھا کہ تقی کے بارے میں

کار دیہ معلوم کر سکوں اور یہ اندازہ کر سکوں کہ وہ کہاں تک تنی سکے خلاف جا سکتا ہے۔ داؤد نے میری توقع کے بالکل خلاف رد عمل ظاہر کیا۔ چلتے چلتے وہ اچانک رکا اور مجھے بری طرح گھورنے لگا۔ پھر ایک ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دیتا ہوا بولا "تم میری ملکیت تو نہیں ہو کہ تمہیں کوئی روک سکتا؟" جواب میں میں کچھ کہنا چاہ رہی تھی کہ دو تین آدمی بالکل قریب سے گزرے۔ مجبوراً مجھے خاموش رہنا پڑا۔ کچھ دیر بعد میں نے منہ کھولا ہی تھا کہ داؤد نے میرا ہاتھ پکڑ کے جھٹکا دیا اور غراتے ہوئے بولا "فلاور! کان کھول کر اچھی طرح سن لو اگر تم نے مجھے دھوکا دیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ میں تمہارے چہرے پر تیزاب پھینک کر اس کا جغرافیہ ہی بدل دوں گا۔"

"نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم مجھے چاہتے ہو۔ اور کوئی مرد اپنی محبوبہ پر تیزاب کیسے پھینک سکتا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ تم نے میری نظروں کو نہیں پہچانا۔ وہ مرد کیا جو عورت کی نظروں کو سمجھ نہ سکے۔ اب کیا سب کچھ زبان سے بتایا جاتا ہے؟" میں نے داؤد کو جھاڑتے ہوئے کہا۔ داؤد کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔

زمین نرم پڑتے دیکھ کر میں نے ایک اور بھرپور ضرب لگائی۔ داؤد کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی "کیا تم کسی ہمدرد اور مہربان عورت کی ضرورت محسوس نہیں کرتے؟"

"کیوں نہیں۔ مجھے زندگی میں کبھی کوئی ایسی عورت نہیں ملی؟" داؤد نے بڑی اداسی سے کہا۔

"مجھے بھی ایک اچھے اور ہمدرد مرد کی تلاش ہے۔" میں نے چھکا لگایا۔ داؤد سوچ میں پڑ گیا۔ پھر ہچکچاتے ہوئے بولا "تمہارا مطلب ہے کہ ہم دونوں یعنی کہ۔ یعنی کہ۔۔۔"

"تم صحیح سوچ رہے ہو۔" میں نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

"مگر ایک بات سوچ لو کہ میرے اندر ایک بہت بڑا عیب ہے۔ وہ یہ کہ جب مجھے کسی سے محبت ہو جاتی ہے تو میں بے پناہ حاسد ہو جاتا ہوں۔ حسد کی آگ میرے رگ و پے میں دوڑ جاتی ہے جب میں حاسد ہوتا ہوں تو بے حد خطرناک ہو جاتا ہوں اور جب خطرناک ہو جاؤں تو ریچھ کی طرح خون بہاتا ہوں پھر مجھے کوئی روک نہیں سکتا۔ اس لئے فلاور ایسی باتیں نہ کرو کہ میری اور تمہاری دونوں کی خرابی ہو جائے۔" داؤد نے ایک عجیب تیور کے ساتھ کہا۔

"اچھا بابا جاؤ۔ معاف کرو۔ تمہارے اندر جرأت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے کہا تھا کہ اس گھر میں تمہاری مردانگی کھو گئی ہے واقعی تم مرد نہیں ہو ورنہ مرد ایسی باتیں نہیں کرتے۔" میں بار بار داؤد کو چھیڑے لگا رہی تھی۔ جواب میں داؤد نے کچھ نہیں کہا وہ

سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میں نے ایک بیکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آؤ چل کر پیسٹری کھاتے ہیں۔" پہلے تو داؤد نے انکار کیا پھر میرے اصرار پر راضی ہو گیا۔ ہم نے دو دو پیسٹری کھائی اور گھر کی طرف چل پڑے۔

"میں مرد ہوتی تو میری زندگی تم سے بہت مختلف ہوتی۔ میں تمہاری طرح آنکھ بند کر کے خانم کے اشاروں پر نہ چلتی۔ اس قدر جسیم اور طاقتور ہونے کے باوجود ایسی مجبوری اور بے بسی۔ میں حیران ہوں کہ تم اس گھر میں کیا کر رہے ہو۔ کیا ایسی ہی کوئی مجبوری ہے جو تم خانم کے در پر کسی درماندہ کتے کی مانند پڑے ہوئے ہو۔" میں نے تیر کا نشانہ لگایا تھا اور اتنا کاری تھا کہ داؤد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس لمحے وہ واقعی بہت بے بس اور مجبور نظر آنے لگا تھا۔ دفعتاً میں نے اپنے جارحانہ رویے کو محسوس کر لیا۔ نرم پڑتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں بولی "آخر کبھی تمہارا کوئی شغل تو رہا ہو گا۔"

"میری موجودہ مصروفیت یا شغل میری اپنی پسند نہیں ہے بلکہ میں تو اس پر کڑھتا ہی رہتا ہوں۔ دل ہر وقت جلتا رہتا ہے مگر کیا کروں مجبوری ہے۔" داؤد نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "یہ ٹھیک ہے کہ میں پہلے بھی کوئی شریف اور نیک نام آدمی نہیں تھا مگر اس قدر گندا اور پست بھی نہیں تھا۔ میرا سابقہ پیشہ کوئی باعزت اور باوقار نہیں تھا بس زندگی گزارنی تھی سو گزار رہی تھی۔ میں کچھ عرصہ پہلے ایک اسمگلر اور اونچے درجے کا چور تھا۔ ہنسنے کی بات نہیں ہے۔ میں بچپن سے محرومیوں کا شکار رہا ہوں۔ مجھے بچپن سے لے کر اب تک کوئی اچھا آدمی نہیں ملا۔ اچھائی پر سے میرا ایمان ہی اٹھ گیا ہے۔ اب تمہیں اچھائی میرے وجود کے کسی گوشے میں نہیں ملے گی۔ جو دو چار قطرے نیکی کے میرے وجود میں رہ گئے تھے وہ میں کبھی کا نچوڑ چکا ہوں۔ اب میں بدی

ہوں مجسم بدی۔ مکمل اور بھرپور برا انسان۔ مجھ سے نیکی کی توقع کرنا بانجھ
سے اولاد کی تمنا کرنا ہے۔ میرے سینے کی تلخی پر مت جاؤ۔ میری شکل و شکل
کو بیرونی سے مت دیکھو۔ میں نے کبھی ایسی دیکھی ہی نہیں جو اس کا
عکس تمہیں میرے چہرے پر نظر آئے۔

بچپن میں میری تربیت کسی نے نہیں کی۔ والدین سے محروم تھا
چچا کے ہاں رہتا تھا۔ میری چچی، خدا اسے جہنم رسید کرے، بڑی بری
عورت تھی اس نے مجھے کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ ناچار میں گھر سے
بھاگ نکلا اور اسمگلروں کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہی کے درمیان میری پرورش ہوئی اور میں اعلیٰ
درجے کا اسمگلر ثابت ہوا۔ چند سال ان کے ساتھ کام کرتا رہا پھر اپنا کام
شروع کر دیا۔ بدقسمتی سے مجھ سے ایک قتل ہو گیا اور بچتے بچاتے بھی ایک
دن دھر لیا گیا۔ جیل میں تھا کہ خانم کے ایک کارندے نے مجھ سے معاملے
کی بات کی، کاغذات پر دستخط کئے اور میں خاموشی سے خانم کے حوالے
کر دیا گیا۔ اب میں خانم کے آگے پر نہیں مار سکتا۔ ذرا کھل کر انہیں کہ خانم نے
ایک مفرور اسمگلر اور قاتل کو قانون کے حوالے کیا۔ میں انسان ہوں آزاد
فضا میں سانس لینے کا خواہاں ہوں۔ خانم کے ساتھ زندگی جو بھی ہو
جیسی بھی ہو یہ تو ہے کہ کم از کم آزادی سے گھوم پھر تو سکتا ہوں۔ خانم
کا ہاتھ اور اس کی سرپرستی اس بات کی ضمانت ہے کہ قانون مجھ پر
کبھی ہاتھ نہ ڈال سکے گا بلکہ اگر میں خود کو گرفتاری کے لئے پیش بھی
کروں تو وہ مجھے پہچاننے سے انکار کر دے گا ـــــ زندگی اور آزاد
فضا سے کسے محبت نہیں ہوتی۔ میں بھی اسی مرض میں گرفتار ہوں۔"

انسان ہونے کے ناطے ان کے مسائل اور مصائب ان کے
قصے اور کہانیوں میں کسی نہ کسی حد تک مماثلت ضرور ہوتی ہے اس
لئے کہ ان کی جڑیں اور بنیادیں ایک ہیں۔ وہ ایک ہی درخت سے
سے پھوٹنے والی شاخیں ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میری اور داؤد کی کہانی
میں بہت زیادہ مماثلت نہیں تھیں مگر زمانے کے ستائے ہوئے دونوں
تھے۔ زمانے کی گردش نے داؤد کو برا انسان بنا دیا تھا اور شاید میں بری
بننے جا رہی تھی۔ جس دم میری نیکی کچھی نیکیاں میرے وجود سے خارج
ہو جائیں گی۔ اسی دم میں داؤد بن جاؤں گی اور پھر شاید ایسی ہی کہانی
کسی پیلی کو سناؤں۔

میں نے دیکھا کہ داؤد کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ گہری
نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھتے
ہوئے کہا: "فلاورز میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔ اس لمحے سے
تم مجھے اپنا حامی اور ہمدرد پاؤ گی مگر یہ بھی یاد رکھو کہ اسی لمحے سے
میں تمہیں اپنی ملکیت تصور کرنے لگا ہوں اگر میں نے تمہاری طرف
سے کوئی کمینہ کوڑ محسوس کیا تو بلا تامل تمہارے چہرے اور سینے پر تیزاب
پھینک کر تمہارے حسن و خوبصورتی کا جغرافیہ تبدیل کر دوں گا۔"

"نہیں داؤد تمہیں جغرافیہ تبدیل کرنے کی ضرورت پیش نہیں
آئے گی۔" میں نے دھیرے سے ہنستے ہوئے کہا: "البتہ میں تمہارا جغرافیہ
ضرور تبدیل کر دوں گی۔" مگر یہ میری نہیں میرے دل کی آواز تھی۔

سہ پہر کو نوشی میرے کمرے میں آئی وہ کچھ اداس اور رنجیدہ
نظر آ رہی تھی حالانکہ یہ بات اس کی عادت اور فطرت کے خلاف تھی۔
وہ مصیبتوں میں بھی چہکتی رہنے والی عورت تھی ہنستا ہنسانا اور قہقہے
لگانا اس کا مشغلہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں
کے قطرے جھلک رہے تھے۔ عجیب بات تھی یہ آخر نوشی کو ہوا کیا تھا۔ اس
دن اس نے بات بھی بہت کم کی بس ہوں ہاں، کرتی رہی۔ میں نے
اسے بہت کریدا بہت ٹٹولا مگر کچھ اگلوا نہ سکی کچھ دیر بعد وہ چلی گئی۔
نوشی چلی گئی مگر میں اس کے بارے میں سوچتی رہی یہاں نوشی ہی ایک
ایسی تھی جو میرے بہت قریب تھی جس نے مجھے سمجھنے کی کوشش کی
تھی۔ نوشی کی اداسی دیکھ کر مجھے دکھ ہوا تھا مگر اس کی اداسی کا سبب
کیا تھا۔ میں سوچ ہی رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ کھولا تو
داؤد سر پر کھڑا تھا۔ پھر وہ میری جان کو آ گیا۔ ایک دم کمبل ہو گیا۔ ضرورت
بڑی بری چیز ہوتی ہے یہ ضرورت ہی تو تھی ـــ جو میں داؤد کو برداشت
کر رہی تھی ورنہ عام حالات میں اس پر تھوکنا بھی پسند نہ کرتی۔ وہ
ادھر ادھر کی دنیا بھر کی باتیں کرتا اور میرا دماغ چاٹتا رہا۔ وہ بول رہا
تھا اور میری نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی زبان
چل رہی تھی مگر آنکھیں کوئی دوسری کہانی سنا رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں
سے ایک قسم کی سخت گیری اور درندگی جھلک رہی تھی بولتے بولتے
اس کی حریص اور ہوسناک نظریں میرے جسم کا طواف کرنے لگتی تھیں۔
داؤد کی نظریں میرے جسم میں چبھی جا رہی تھیں اور میں سوچ رہی تھی
کہ جانے وہ کیا ارادہ کر آیا ہے۔ وہ مجھ سے کہہ چکا تھا کہ مجھے اپنی
ملکیت سمجھتا ہے لیکن اس ملکیت کو تصرف میں لانے کی تو نہیں سوچ رہا
ہے۔ مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ میں اس کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتی تھی۔
اور بلا کو ٹالنا بھی ضروری تھا۔ داؤد جیسے لوگوں کا شمار ان لوگوں میں
ہوتا ہے۔ جنہیں قدرت دماغ تو عطا کرتی ہے مگر وہ دماغ سے زیادہ
جسم سے کام لینے کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ کچھ سوچتے سمجھتے نہیں ہیں
موقع بے موقع بھک سے بارود کی مانند پھٹ جاتے ہیں۔

باتوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو داؤد نے جسم کو زحمت دی۔ آگے
بڑھا اور مضبوط ہاتھوں سے میرے شانے کو پکڑ لیا۔ اس نے میری آنکھوں

علامہ ابن زبیر نے زمزم کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ عجیب و غریب چیز ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر زمزم کا پیالہ بنا کر سمندر میں رکھ دیا جائے تو اندر نمکین پانی کی بجائے میٹھا اور مصفا پانی جمع ہو جائے گا!

یا اجتناب کی پرواہ نہیں کی۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے مالِ غنیمت سمیٹ رہا ہو۔ میں اس وحشی کو خود سے دور رکھنے کی سوچ رہی تھی کہ اچانک ہی دروازے پر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ داؤد اس طرح ایک جھٹکے سے مجھ سے الگ ہو گیا جیسے اسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ میں نے اطمینان کی سانس لی جیسے ایک اژدہا میرے جسم پر سے اتر گیا ہو۔ میں نے داؤد کی طرف دیکھا خوف سے اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ ایک مرد کو اس طرح خوف زدہ دیکھ کر مجھے دل ہی دل میں ہنسی آ گئی۔

"پتہ نہیں کون ہے، مصیبت آ گئی۔" داؤد دروازے کی طرف دیکھتا ہوا بڑبڑایا۔ پھر اس نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔ باہر قدموں کی چاپ اور واضح ہو گئی تھی پھر بیگم کی چال چلتی ہوئی خالہ کمرے میں داخل ہوئی۔ آتے ہی اس نے حکم صادر کیا کہ تقی مجھے اپنے کمرے میں بلا رہا ہے۔ نیا فرمان۔ پہلے تو ایسا کبھی نہ ہوا جسے ملنا ہوتا تھا خود میرے کمرے میں آتا تھا اور پھر یہ تقی کا بلانا اور وہ بھی اپنے کمرے میں، کیا معنی رکھتا ہے۔ یہ خانم کا حکم ہے یا تقی کی اپنی مرضی۔ اگر تقی خود اپنے طور پر مجھے بلا رہا ہے تو کیا اس طلبی کا خانم کو علم ہے۔ جایا جائے یا نہ جایا جائے مشکل مسئلہ درپیش تھا۔ ہر دو صورت میں جانے کیا نتیجہ نکلے۔ خالہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے گومگو کے عالم میں دیکھ کر مسکرائی اور مڑتے ہوئے بولی "اچھا میں خود تقی کو بھیجے دیتی ہوں۔ کہہ دوں گی کہ تم کوئی کام کر رہی ہو۔"

خالہ چلی گئی اور اس کے جاتے ہی مجھ پر گھبراہٹ اور وحشت کا دورہ پڑ گیا تھا، تقی سے ملاقات کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ تقی، خانم کا خاص آدمی، منظورِ نظر، اس گھر کا نگہبان۔ جلاد، شیطان۔ اندر باہر دونوں سے بُرا۔ مجھے اس وقت اس کا سامنا کرنا تھا۔ جانے کیا بات تھی۔ میری طبیعت کچھ خراب سی ہونے لگی۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں سامنے میز پر وہسکی کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ میں نے ایک گلاس بھرا اور گھونٹ گھونٹ کر کے تلخ ذائقہ حلق میں اتارنے لگی یہ پہلا موقع تھا جو میں اپنی مرضی سے ایک ناپسندیدہ چیز پی رہی تھی مگر اس وقت یہ ضروری تھا میری اعصابی کیفیت کچھ اچھی نہیں تھی۔ تقی کا سامنا کرنے کے لئے باہوش اور شجاع ہونا ضروری ہے اور شراب تو گیدڑوں کو بھی شیر کر دیتی ہے۔

آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ اس طرح سے میری طبیعت بہت سنبھل گئی تھی وہ پہلے والی وحشت اور ہراسی غائب ہو گئی تھی۔ اب میں خود کو بہت ہلکا پھلکا اور تر و تازہ محسوس کرنے لگی تھی۔ میں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ میرا چہرہ شراب کی حدت سے دہک رہا تھا ایک عجیب قسم کی شگفتگی آ گئی تھی۔ میرے چہرے پر لیس ہے مجھے یہی چاہیئے تھا۔ میں آئینے کے سامنے کھڑی اپنا جائزہ لے رہی تھی کہ مجھے کہیں دور خاصے فاصلے پر ایک عجیب سی آواز سنائی دی کسی چیز کے رینگنے اور سرکنے کی آواز جیسا ماقبل تاریخ کا کوئی جانور اپنا بھاری جسم لئے زمین پر آہستہ آہستہ سرک رہا ہو گھسٹ رہا ہو۔ مجھے TREASURE ISLAND کی یاد آ گئی جس کپتان کی ایک ٹانگ لکڑی کی تھی اور وہ لکڑی کی ٹانگ لئے جہاز کے عرشے پر گھومتا تھا تو ایک عجیب قسم کی آواز ابھرتی تھی۔ کچھ ایسی ہی آواز اس وقت بھی آ رہی تھی۔ میری نظریں آئینے سے ہٹ کر دروازے پر جم گئیں۔ وہ آواز بالکل قریب آ گئی پھر دروازے کے قریب پہنچ کر ایک دم ساکت ہو گئی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد کسی نے دروازے کو کھٹکھٹایا جیسے کسی لکڑی سے ٹھوکا لگائی گئی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور شگفتہ لہجے میں بولی "آؤ تقی، اندر آ جاؤ۔" لکڑی ہی کی مدد سے دروازہ کھولا گیا۔ دروازہ پاٹوں پاٹ کھلا اور اس کے درمیان تقی نمودار ہوا۔ تقی ایک مضبوط لکڑی کا سہارا لئے کھڑا تھا اور اس کی گردن سے لے کر سینے تک پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ اس کی نظریں براہِ راست مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ مرد تھا اور اپنی عادت اور فطرت کے تحت سامنے کھڑی ہوئی خوبصورت و دلکش نوجوان صحت مند اور باریک لباس میں ملبوس لڑکی کو بھوکی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنچیں اٹھ رہی تھیں اور لبوں پر بڑی مدھم اور معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ آگ اور پانی ایک ساتھ تھے۔

میں آگے بڑھی اور بڑی محبت اور مہربانی سے تقی سے مخاطب ہو کر بولی "آؤ تقی میں تمہیں سہارا دیتی ہوں۔ اندر آ جاؤ۔ تم نے مجھے بلایا، شکریہ۔ میں تمہاری آمد سے بہت خوش ہوں۔ آؤ بیٹھو۔" میں نے سہارا دینے کے لئے اس کی بغل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مگر اس نے میرا ہاتھ روک دیا اور چھڑی کا سہارا لیتے ہوئے کمرے کے اندر آ گیا میں نے اسے کرسی پیش کی وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میرے لباس کا معاملہ کچھ ایسا تھا کہ ہر چند کہیں ہے، نہیں ہے۔ پہلے تو شی آئی، پھر داؤد، اس

کے بعد غالباً مجھے ڈھنگ کا لباس پہننے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہی لباس پہنے ہوئے تھی جو عموماً عورتیں فرصت اور خلوت میں پہنتی ہیں۔ میں نے سوچا لباس تبدیل کر ہی لیا جائے۔ تقی کو مصروف رکھنے کی خاطر میں نے اس سے کہا "وہسکی ہو جائے۔ میں ایک گلاس پی چکی ہوں اور اب خواہش نہیں ہو رہی۔ جانے کیوں ان دنوں مجھے نشہ آور اشیاء کی ضرورت زیادہ محسوس ہو رہی ہے"

"بُری بات نہیں ہے مگر عادی نہیں ہونا چاہیئے۔ نشے کی حالت بڑی ذلیل چیز ہے۔ آدمی کتے کے پلے سے زیادہ بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے۔ اور مرد بھی نشئی عورتوں کو پسند نہیں کرتے" تقی نے فہمائش کے طور پر کہا۔ اور میں بے اختیار ہنسنے لگی۔ خواہ مخواہ، یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میں اس وقت بہت خوش اور اچھے موڈ میں ہوں۔ مجھے اس وقت کوئی ایسی حرکت نہیں کرنی تھی جس سے ثابت ہوتا کہ میں دل ہی دل میں اس سے بے پناہ نفرت کرتی ہوں۔ میرے دل میں تقی کے لئے جو نفرت اور کدورت تھی اس کا اندازہ لگانا دشوار تھا۔ میری نفرت اور کدورت ڈھلنے کی ایک اور صرف ایک صورت تھی وہ یہ کہ کسی طرح اس سے بھیانک انتقام لوں۔ ایسا انتقام جو بہت دردناک ہو اور مجھے جی بھر کے تسکین ملے۔

تقی نے بوتل اٹھائی اور گلاس بھرنے لگا۔ دو تین گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے کرسی کی پشت سے پیٹھ لگائی اور بڑے غور سے میری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا "فلاورا کیا تمہیں یہاں کوئی تکلیف ہے"

میں اس اچانک سوال پر حیران رہ گئی پریشان لہجے میں بولی۔
"نہیں تو۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مگر تمہیں یہ خیال کیونکر آیا؟"

"سوال مت کرو تمہیں صرف جواب دینا ہے" تقی نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ اس نے تیسرے گھونٹ کے بعد گلاس کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور میری اندرونی کیفیت کو ٹٹولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اب تمہیں میرے دو سوال کا جواب دینا ہے اور مجھے امید ہے کہ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گی۔ تقی سے جھوٹ بولنا اپنی زندگی حرام کرنا ہے"
تقی نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔ میرے دل میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی آخر قصہ کیا تھا کیا کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔

"پہلا سوال" تقی نے مجھے مخاطب کیا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اور داؤد کسی کام سے باہر گئے تھے۔ مگر تم دونوں کا انداز خالص عاشقانہ تھا۔ تم لوگوں نے بیکری سے پیسٹری بھی لے کر کھائی تھی۔ تم ہاتھ میں ہاتھ دیئے گھوم رہے تھے آخر یہ قصہ کیا ہے۔ تمہارا اور داؤد کا یہ عشق کب پروان چڑھا"

جواب میں میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑی "یہ صحیح ہے کہ میں نے اور داؤد نے بیکری سے پیسٹری لے کر کھائی تھی مگر بقیہ تمام باتیں بکواس ہیں۔ عشق اور وہ بھی داؤد سے۔ نہیں لیلیٰ کی یہ قیمت نہیں ہے"

"لیلیٰ نہیں فلاورا" تقی مجھے تیز بار نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔
"فلاورا ہی سہی۔ فلاورا اتنی سستی نہیں کہ وہ داؤد جیسے دو ٹکے کے ملازم کے گلے میں باہیں ڈال دے اس کی حیثیت ہی کیا ہے"

تقی مجھے شک اور تجسس کی ملی جلی نظروں سے دیکھنے لگا۔ میرا انداز کچھ ایسا فطری اور حقیقی تھا کہ وہ اس مسئلے پر کچھ آگے گفتگو نہ کر سکا نروس ہو کر رہ گیا پھر اس نے گلاس اٹھایا جلدی جلدی دو تین گھونٹ لئے اور نئے سرے سے حملہ آور ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔

"خیر جو حقیقت ہے جلد معلوم ہو جائے گی۔ اب دوسرا سوال سنو۔ اس رات جب وہ بوڑھا جوہری تمہارے پاس آیا تھا تو اس نے بعد میں ایک نوجوان کمال کو بھی بلوایا تھا کیا تم تفصیل سے اس رات کے بارے میں بتا سکتی ہو"

"ایک بار خانم کو بتا چکی ہوں بار بار نہیں بتاؤں گی" میں چڑ کر بولی "کتنی دفعہ کہوں کہ اس رات ان لوگوں نے مجھے اس قدر شراب پلا دی تھی کہ مجھے اپنے آپے کا ہوش نہیں رہا تھا۔ اب میں تمہیں کس تفصیل کے بارے میں بتاؤں اور تم جس نوجوان کا ذکر کر رہے ہو وہ آدمی کم، ریچھ زیادہ تھا۔ مجھے اس جیسے نوجوانوں سے سخت نفرت ہوتی ہے۔ مجھے یہاں آنے والے ہر شخص سے نفرت ہے"

تقی کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اس نے گلاس اٹھایا اور منہ تک لے گیا مگر اس سے پہلے کہ گھونٹ لیتا ایک انتہائی تیز نسوانی چیخ نے فضا کو ہلا کر رکھ دیا پھر کسی شخص کے دوڑتے ہوئے بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر دروازے کے عقب سے کسی شخص نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا "آقائے تقی۔ آقائے تقی! نوشی بھاگ گئی ہے۔ نوشی فرار ہو گئی ہے۔ اس کا سوٹ کیس بالکل خالی ہے۔ اس نے آہستہ آہستہ کر کے اپنا سارا لباس باہر پہنچا دیا تھا۔ اس کے کمرے میں سوائے اس کے ایک پرانے جوڑے کے اور کچھ نہیں رہا۔ وہ بھاگ گئی ہے۔ فرار ہو گئی ہے"

## غزل

حمایت علی شاعر

آنکھوں میں اُتر آئی ہے تصویر تمھاری
اِک پیکرِ رعنائی ہے تصویر تمھاری

مَیں تو اُسے چُپ چاپ یونہی دیکھ رہا تھا
کس بات پہ شرمائی ہے تصویر تمھاری

آئینہ در آئینہ رہے گی یونہی، روشن
شمعِ شبِ تنہائی ہے تصویر تمھاری

کیوں مجھ کو اس انداز سے وہ دیکھ رہی ہے
کیا میری تمنائی ہے تصویر تمھاری

# [illegible]

کرشن چندر

**بچپن** کے چہروں میں مجھے شانو کا چہرہ بہت یاد آتا ہے وہ ایک دبلی پتلی نازک اندام عورت تھی، عمر پینتیس سال کے قریب، قد چھوٹا سا، ہونٹ پتلے اور گلابی آنکھیں بڑی بڑی اور ڈوبتی ہوئی سی، جلد کی رنگت مومی طرح سپید، وہ ہمیشہ ماتھے تک ذرا سا گھونگھٹ کاڑھے سفید دھوتی میں ملبوس نظر آتی اس کی پوری شخصیت ایک ایسی تصویر کی مانند تھی جو روز بروز دھندلی ہوتی جا رہی ہو۔ اسے تپ دق تھی۔

ان دنوں دق کا کوئی شافی علاج دریافت نہ ہوا تھا۔ اکثر مریض مر جاتے تھے بہت کم ایسے خوش قسمت ہوتے تھے جو کسی نہ کسی طرح بچ جاتے تھے۔ اپنی چھوٹی سی محدود دنیا میں ناکافی ذرائع کے ساتھ میرے والد کو علم طب میں تجربے کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اکثر مشکل مریضوں کا علاج کرتے تھے اور ان میں سے اگر ایک بھی ان کی کاوش سے اچھا ہو جاتا تو وہ بے حد خوش ہوتے اور کئی دنوں تک ان کا موڈ کلیوں کی طرح شگفتہ رہتا۔

عورتوں کے لئے ہسپتال میں ایک الگ وارڈ تھا لیکن میرے والد نے شانو کو اس وارڈ میں نہیں رکھا۔ اس وارڈ سے سو گز پرے ایک بارک نما بلڈنگ تھی جس پر ٹین کی چھت تھی اور جس میں چھ کمرے تھے ساتھ ساتھ ملے ہوئے۔

ان میں سے دو کمروں میں وارڈ بوائے رہتے تھے اور ایک کمرے میں ہسپتال کے پرانے کورٹ، چلمچیاں اور دیگر کباڑ بھرا ہوا تھا۔ چوتھا کمرہ سینیئر کمپوڈر نے اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے اور گپ بازی کرنے کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ پانچویں کمرے میں مالی نے باغبانی کا سامان رکھ چھوڑا تھا۔ چھٹے کمرے کو کوئی استعمال کرنے کے لئے تیار نہ تھا کیونکہ اس کمرے کے بارے میں مشہور تھا کہ جو مریض اس میں آ کر رہتا ہے مر جاتا ہے۔ میرے والد کو اس قسم کی باتوں پر اعتقاد نہ تھا لیکن جب پے درپے تین چار اسی قسم کے حادثات یا اتفاقات ہو گئے تو انہوں نے لوگوں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اس کمرے کو خالی رہنے دیا۔ شانو کو وہ اس کمرے میں نہیں رکھ سکتے تھے اس لئے انہوں نے سینیئر کمپوڈر کی گپ بازی کا کمرہ جو سب سے بہتر حالت میں تھا اس سے چھین لیا اور اس میں شانو کو رکھ دیا۔ سینیئر کمپونڈر نے اس امر پر اعتراض کیا لیکن والد صاحب کا خیال تھا کہ کمپونڈر کو ایک چھوٹا سا بنگلہ اس کے رہنے کے لئے ملا ہوا ہے تو اسے اسی بنگلے کو اپنی اور اپنے دوستوں کی تفریح کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ سینیئر کمپونڈر تو تمام علاقہ ہی دل میں بہت جلا لیکن اس کے آفیسر کا حکم تھا اس لئے اسے وہ کمرہ خالی کرنا پڑا اور اسی دن سے شانو کا دشمن ہو گیا تھا۔

عام طور پر مریضوں کے ساتھ ان کی دیکھ بھال کے لئے ان کے باپ، بھائی، بہن، خاوند یا دوسرے رشتہ دار آتے تھے اور علاج کے دوران وہیں ہسپتال کے کسی برآمدے میں پڑے رہتے تھے لیکن شانو کے ساتھ اس کا صرف آیا تھا اور اسے ہسپتال میں داخل کر چلا گیا تھا وہ اپنے موضع کا سب سے امیر آدمی تھا۔ اگر وہ چاہتا تو شانو کے کھانے پینے کا بندوبست کر سکتا تھا اور اکثر امیر مریض علاج کے دوران ایسا ہی کرتے تھے لیکن اس نے شانو کے بارے میں کسی طرح کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا اور چند دن اس کے پاس رہ کر واپس چلا گیا۔

شانو سورج نکلتے ہی اپنی کھاٹ کمرے سے باہر نکال کر دھوپ میں لے آتی اور بستر پر لیٹ کر دھوپ سینکتی۔ وہ نہایت کم گو اور شریف طبیعت کی عورت تھی اور کسی نے آج تک اس کے منہ سے تلخ بات نہ سنی تھی لیکن مجھے اس بات پر بڑی حیرت تھی کہ وہ چاہے کسی حالت میں ہوتی اپنے ماتھے پر گھونگھٹ کاڑھے رہتی۔

لیکن ایک بار میں نے اسے گھونگھٹ کے بغیر دیکھ لیا صرف ایک لمحہ کے لئے اور اسے دیکھتے ہی میں بھونچکا رہ گیا۔ ہوا یہ کہ میں اپنے بنگلے سے ہسپتال کی طرف دوڑا دوڑا آ رہا تھا۔ پتا جی کو دوپہر کے کھانے پر بلانے کے

لئے۔ دھوپ خوشگوار تھی لیکن ہوا ذرا تیز چل رہی تھی اور شانو باغ کے ایک کونے میں بیٹھی پھولوں کی کیاریوں میں کھرپے سے گڑائی کر رہی تھی کہ اتنے میں ہوا کا جھونکا آیا اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے سر پر ایک بال بھی نہ تھا سارا سر اس طرح منڈا ہوا تھا جیسے میرے پتا جی کا چہرہ شیو کے بعد ہوتا ہے۔

جب میں نے اپنے پتا جی سے اس حیرت انگیز امر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا۔

"شانو ایک کنواری بیوہ ہے۔"

"کنواری بیوہ ہے تو کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔ "ہر عورت کے سر پر بال ہوتے ہیں لیکن یہ تو اپنے بال منڈواتی ہے۔"

"خود نہیں منڈواتی، اس کے بال مونڈے گئے ہیں۔ ہمارے علاقے کے برہمنوں میں یہ رسم عام ہے کہ اگر کنواری لڑکی بیوہ ہو جائے تو اس کے سر کے بال مونڈ دیئے جاتے ہیں۔"

"کنواری لڑکی بیوہ کیسے ہو سکتی ہے؟" میں نے سوچ سوچ کر پوچھا۔

پتا جی مسکراتے بولے۔ "جس سال شانو کی شادی ہوئی تھی اس سال لگن منڈپ ہی میں اس کا خاوند مر گیا تھا اس لئے یہ کنواری بیوہ ہے۔"

"تو کیا اس کی دوسری شادی نہیں ہو سکتی؟"

"نہیں!"

"کیوں نہیں؟"

"بس ایسا دستور ہے۔"

"یہ کیسا دستور ہے؟" میں نے جھلا کر پوچھا

ماں جی اگر اس وقت ہوتیں تو ضرور مجھے اس سوال پر مارتیں کیونکہ میری اوندھے سیدھے سوال کرنے کی شروع سے عادت تھی لیکن پتا جی مجھے کبھی نہ ٹوکتے الٹا خوش ہوتے تھے لیکن اس وقت میرے سوال کا جواب وہ بھی نہ دے سکے اور ہونے ہونے گنگنانے لگے۔ یہاں کا

پشینت طریقہ تھا۔ جب وہ کسی سوال کا جواب نہ دینا چاہتے تھے تو اسی طرح
بیچ میں سے بات چھوڑ کر گنگنانے لگتے تھے۔
"مگر اس کے بال ہوں تو وہ اور بھی اچھی لگے۔" آخر میں نے
کہہ دیا۔

پتہ نہیں باپ نے اپنے بیٹے کے حسن ذوق کو کس نظر سے دیکھا
مگر انہوں نے اس پر بھی مجھ سے کچھ نہ کہا بدستور گنگناتے رہے اتنے میں کھانا
آگیا اور ہم لوگ کھانے کی میز پر چلے گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔
مگر اس دن میں نے کمپونڈر موتی رام کو اپنے دوست پہلوان مل شاہ
سے باتیں کرتے ہوئے سنا۔
"شاہ جی کچھ معلوم ہے، ڈاکٹر صاحب کو شانو سے دلچسپی پیدا
ہو گئی ہے!"
"ہاں یہ سچ ہے۔"
"بالکل —— آج میں نے خود اپنے کانوں سے سنا اور آنکھوں سے
دیکھا، وہ شانو سے کہہ رہے تھے کہ تو اپنے سر پر بال بڑھا لے۔ وہ دیر تک
انکار کرتی رہی مگر وہ برابر اصرار کرتے رہے آخر وہ راضی ہو گئی اور راضی کیسے
نہ ہوتی اور جب وہ راضی ہو گئی تو ڈاکٹر صاحب مجھے الگ کمرے میں لے
جا کر بولے۔
"بال منڈے ہونے سے اس عورت کے اعصاب پر برا اثر پڑتا ہے
یہ عورت اپنے آپ کو عورت ہی نہیں سمجھتی۔ میں اس کے اندر عورت پن جگانا
چاہتا ہوں تاکہ اس کی زندگی میں تھوڑی سی خوشی آجائے اور یہ اپنے مرض کا مقابلہ
زیادہ شگفتہ دلی سے کر سکے۔ یہ ایک نفسیاتی راز ہے موتی رام۔"
"ڈاکٹر صاحب بڑے ماہر نفسیات ہوتے جا رہے ہیں۔" پہلوان
مل شاہ نے طنزاً کہا۔
"ابھی آگے دیکھو اور کن کن امور میں یہ اپنی مہارت دکھاتے ہیں
ہی ہی ہی!"
موتی رام ہنس کر بولا اس کی ہنسی میں بے حد کمینگی تھی جو مجھے ذرا بھی
اچھی نہ لگی۔ اگر پتا جی نے شانو سے بال رکھنے کے لئے کہہ دیا تو کیا برا کیا ایک
بچہ بتا سکتا ہے کہ عورت کے سر پر بال اچھے لگتے ہیں اور میری ماں جی اپنے
بالوں میں جوڑا کر کے جب اس میں کبھی کبھار ایک پھول لگا لیتی ہیں تو اور بھی
اچھا لگتا ہے۔ یہ موتی رام کی عقل کو کیا ہو گیا ہے؟
موتی رام مجھے اپنے پاس کھڑے دیکھ کر اور اپنے دوست کی باتیں
سنتے دیکھ کر کچھ اداس ہو گیا مگر اس نے ڈھٹائی سے میرا کان پکڑ لیا اور بولا
"بیٹو! اپنی ماں کو تار دے کر بلا لے ورنہ ڈاکٹر ہاتھ سے چلا۔" یہ
کہہ کر اس نے میرا کان چھوڑ دیا۔ اور اپنے دوست پہلوان مل شاہ کے ساتھ اپنے
جھونپڑے کی جانب چلا گیا۔

مجھے اس بات پر سخت غصہ آیا لیکن میں چھوٹا سا لڑکا تھا کیا کر سکتا
اور ماں جی یہاں نہ تھیں وہ تو لاہور کے ہسپتال میں پڑی تھیں پتا جی ایک
ہی چھٹی لے کر ان کے آپریشن کے سلسلے میں لاہور گئے تھے میں بھی ساتھ
تھا۔ آپریشن کامیاب ہوا تھا لیکن ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ ابھی ماں جی کو کچھ
اور ہسپتال میں رہنا پڑے گا۔ پتا جی کو مزید چھٹی نہیں مل سکتی تھی اس لئے وہ ماں
جی کو اپنے چھوٹے بھائی کی نگرانی میں دے کر واپس آگئے تھے اور اپنے ہسپتال
کا کام سنبھال لیا تھا۔ ہر ہفتے ماں جی کی چٹھی آتی تھی جس میں میرے لئے بہت
پیار ہوتا تھا۔ ایک بار انہوں نے میرے لئے قندھاری اناروں کا پارسل بھیجا
تھا کیونکہ ہمارے علاقے میں قندھاری انار نہیں ہوتے تھے اور تاراں تو وہ
انار کے دانے کھا کر حیران ہو گئی تھی اس کا خیال تھا کہ ہمارے جنگل کے درخت
سے اچھے انار کہیں نہیں ہوتے۔ اسے ذرا سی تو اس انار کے مقابلے میں ہمارا
بیچ ہے۔ تاراں کو اقبال کرنا پڑا تھا اور قندھاری انار دیکھ کر اسے لاہور کے
بارے میں دوسری باتوں کے سلسلے میں بھی یقین کرنا پڑا تھا جو میں نے وہاں
ہمارے سنائی تھیں قندھاری اناروں نے اسے بالکل قائل کر دیا تھا اور
اس نے یہ سب کچھ سن کر طے کر لیا کہ اب تو وہ صرف مجھ ہی سے شادی کرے گی
اور شادی کر کے لاہور رہے گی لیکن اس دوران میرا ارادہ بدل گیا تھا کیونکہ
میں اس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا جو میری ماں جی کی نرس کی سب سے
چھوٹی لڑکی تھی اور جو میرے ساتھ گیند کھیلتی تھی اور بالوں میں ربن لگاتی تھی
اس پر میری اور تاراں کی بہت لڑائی ہوئی تھی اور تین دن تک ہم نے ایک
دوسرے سے بات تک نہ کی تھی لیکن لاہور بہت دور تھا اور یہاں تاراں
کے سوا میرے ساتھ کھیلنے والا نہ تھا اس لئے دھیرے دھیرے وہ خوبصورت
لڑکی میرے ذہن سے غائب ہو گئی اور میں پھر تاراں کے ساتھ کھیلنے لگا۔
میں نے موتی رام کی خوفناک مونچھوں کے ڈر سے پتا جی کو اس کی باتیں نہیں
بتائیں۔ موتی رام بڑا ہی کمینہ اور بدفطرت آدمی تھا اور اکثر میری الٹی سیدھی
شکایتیں کر کے مجھے ماں جی سے پٹوا دیا کرتا تھا اس کا اپنا بھی کوئی بچہ نہ تھا اور
اس کی بیوی بھی بڑی سڑی بدمزاج عورت تھی جو دن رات کبھی مالی، کبھی چپراسی
کبھی جمعدار کی بیوی سے لڑا کرتی تھی۔ میں اور تاراں اب کبھی ان لوگوں کے گھر
کے پاس سے نہ پھٹکتے پھر بھی موتی رام یا اس کی بیوی میری ماں سے شکایت
کا کوئی نہ کوئی موقع نکال لیا کرتے تھے۔

شانو کے آجانے سے پتا جی کا ذوق تحقیق پھر ابھر آیا تھا۔ وہ ویدک
اور یونانی طب کا بھی گہرا شد بد رکھتے تھے انہوں نے کئی طرح کے نسخے اور کئی طرح
کے علاج الگ الگ اور ملا جلا کر بھی شانو پر آزمانے شروع کر دیئے اور شانو
کی صحت بہتر ہونے لگی مجھے تو وہ اس دن سے بہتر معلوم ہونے لگی تھی جس

دن سے اس کے سر کے بال جھڑنے شروع ہو گئے تھے اور اب تو اس کے بال لاہور کی سیوں کی طرح شانو تک آ چلے تھے۔ سیاہ بل کھاتے ہوئے بالوں میں اس کا سپید چہرہ ایک دم موم کی گڑیا کی طرح پرسکون نظر آتا۔ صبح شام وہ اپنا کھانا خود ہی پکاتی تھی اور خود اپنے برتن صاف کرتی تھی۔ پتا جی نے اس کے کمرے کی دونوں کھڑکیوں کے لئے نیلے رنگ کے پردے لا دیئے تھے جن پر اس نے خود بیل بوٹے کاڑھے تھے ہوئے ہوئے اس نے اپنے کمرے کے سامنے کشادہ صحن کے قطعے کے چاروں طرف سنگترے کی جھاڑیوں کی باڑھ لگا دی تھی اور دو رویہ کیاریوں میں پھولوں کے پودے لگائے تھے باڑھ پر زرد توری اور کال کی بیلیں چڑھا دیں اور وہ جو گھر سے اکیلی آئی تھی ہسپتال کی کھلی فضاؤں اور مہربان ڈاکٹر کی ہمدردی پا کر زندگی میں امید اور امید میں جذبہ اور جذبے میں رس ڈھونڈنے لگی تھی اس سے پہلے وہ مر جانے کی خواہش لے کر آئی تھی جس نے زندگی میں کچھ نہ دیکھا ہو جو پندرہ برس کی عمر میں کنواری بیوہ ہو جائے جس کا مستقبل ایک ٹنڈ منڈ درخت کی طرح سپاٹ ہو جس کے گھر والے اس کے مرجانے کی شب و روز دعا کرتے ہوں۔ اسے اگر تپ دق نہ ہو تو کیا ہو۔ شانو جانتی تھی کہ اس کا جیٹھ اسے اس لئے ہسپتال میں لا کے چھوڑ گیا ہے کہ وہ ان کی آنکھوں سے دور مر جائے اور کسی کو اس کی تیمارداری نہ کرنی پڑے اور جب وہ مر جائے گی تو اس کا جیٹھ اس کے مرحوم خاوند کی زمینوں پر قبضہ کر لے گا اس لئے اس کا جیٹھ چاہتا تھا کہ وہ جلد سے جلد مر جائے اور یہی شانو چاہتی تھی جب وہ ہسپتال میں آئی تھی اور شروع کے بیس پچیس دنوں میں اس نے یہی چاہا تھا کہ وہ جتنی جلدی مر جائے اتنا ہی سب کے لئے اچھا ہے کنواری بیوہ تو دھرتی کے لئے لعنت اور سماج کے لئے گالی اور زندگی کے لئے ایک بوجھ ہوتی ہے جتنی جلد یہ بوجھ آگ کی نذر ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے مگر یہ کس طرح کا ڈاکٹر تھا جو اسے بتا رہا تھا کہ زندگی ہر انسان کی مقدس ہوتی ہے چاہے وہ بیوہ ہو یا شادی شدہ، امیر ہو یا غریب، دھرتی کی لعنت وہ لوگ ہیں جو پندرہ برس کی کنواری بیواؤں کو شادی کرنے سے روکتے ہیں سماج کی گندگی وہ لوگ ہیں جو غریب عورتوں کا حق مارتے ہیں اور وہی لوگ اس زندگی پر بوجھ ہیں جو کسی دوسرے کو خوش نہیں دیکھ سکتے۔ شانو نے اس مہربان مرد کی نگاہیں دیکھیں، اس کی میٹھی باتیں سنیں اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کیا جب وہ اس کی نبض ٹٹولتا تھا تو ہولے ہولے اس کے نیچے ہوتے دل میں ایک شعلہ سا ابھرنے لگتا تھا جینے کی خواہش بیدار ہونے لگی اور لحاف کے اندر راتوں کے سناٹے میں کسی کی تصویر اسے پرستش کرنے پر مجبور کرنے لگی اس کی کھانسی روز بروز کم ہوتی گئی۔ بخار کی حدت گھٹتی گئی اور سپید دھندلے گالوں پر سرخی کی گلابی لہر دوڑنے لگی۔ میرے پتا کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس دھندلی

ملتی ہوئی تصویر میں رنگ بھر رہے ہیں جیسے وہ ڈاکٹر ہی نہیں مصور بھی ہیں جب شانو کے بال کندھوں تک آنے لگے تو اس نے ایک روز شرما کر ڈاکٹر صاحب سے ایک آئینے اور ایک کنگھی کی فرمائش کی عورت جس سے پیار کرتی ہے اس پر اپنا حق جتائے بغیر نہیں رہ سکتی مرد جس سے پیار کرتا ہے اس پر اپنا حق جتائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ڈاکٹر صاحب نے جواب میں کہا۔ "اس شرط پر آئینہ اور کنگھی لا کر دوں گا کہ تم خوشبودار تیل بھی استعمال کیا کرو۔"

"ہائے خوشبودار؟ میں ایک بیوہ خوشبودار تیل کیسے استعمال کر سکتی ہوں؟"

"کر سکتی ہو کرنا پڑے گا۔" ڈاکٹر صاحب بولے۔ "اگر زندہ رہنا چاہتی ہو تو زندگی اور اس کی مہک اور اس کی تمام دلفریب چیزوں سے پیار کرنا ہو گا۔ وہ لوگ کس قدر غلط فہم ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جب کسی عورت کا خاوند مر جاتا ہے تو اس کی بیوہ کا جسم بھی مر جاتا ہے، کتنی خواہشیں کتنی تمنائیں کتنے ارمان روح اور جسم کے تقاضے زندہ رہتے ہیں۔"

شانو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"وہ جب مرے تھے تو میں کچھ بھی نہ جانتی تھی۔ میں نے تو ٹھیک طرح سے ان کی صورت بھی نہ دیکھی تھی میں انہیں پہچانتی تک نہ تھی لیکن لوگوں نے مجھے بتایا کہ میں بیوہ ہو گئی ہوں۔ میں کیا بتاؤں ڈاکٹر صاحب کہ میرے دل کی کوئی آرزو بیوہ نہ ہوئی تھی پھر مجھے یقین کیسے آ جاتا لیکن پندرہ سال تک لوگ مجھے یقین دلاتے رہے، بیوہ کا لکھا کر طعنے دے کر، مار پیٹ کر مجھے دن رات کچلتے رہے اور میں کھلیان کی طرح سب کے پاؤں تلے روند ڈالی گئی جس سے اناج کا آخری دانہ بھی نکال لیا گیا ہو کیونکہ شاستروں میں ایسا ہی لکھا ہے۔"

"زندگی سے بڑا شاستر کوئی نہیں ہے۔"

"رام رام! کیا کہتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔" شانو گھبرا کر بولی۔ "ایسی باتیں نہ بولو، پرلے آ جائے گی۔"

"میں تو ہر روز یہی بولتا ہوں پھر پرلے کیوں نہیں آ جاتی؟"

ڈاکٹر صاحب اتنا کہہ کر ہنستے ہوئے باہر چلے گئے لیکن ان کے جانے کے بعد شانو گھبرا کر شری رام کی تصویر کے سامنے جو اس نے اپنے کمرے میں لگا رکھی تھی ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور کانپتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ہے بھگوان! ان کو معاف کر دو یہ تو ایسے ہی ہیں ان کا جو قصور ہو اس کی سزا مجھے دے دے۔"

یہی تو مصیبت ہے اور اسی وجہ سے عورت پر اکثر مصیبت آتی ہے کہ وہ جس سے پیار کرتی ہے اس کا ہر قصور ہر الزام اپنے سر لے لیتی ہے

اور مرد جس سے پیار کرتا ہے اس لڑکی کی تصویر صاف نہیں کر سکتا۔

جس دن ڈاکٹر صاحب نے شانو کے لئے آئینہ، کنگھی اور خوشبودار تیل منگا دیا اس دن ہسپتال میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ موتی رام نے اپنے دوست پورن مل شاہ سے کہا۔

"حد ہو گئی یار! آج جب شانو کنگھی چوٹی کر کے اپنے کمرے سے باہر نکلی تو ڈاکٹر صاحب نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کے بالوں میں ڈھلیا کا سرخ پھول لگا دیا۔"

"مگر لونڈیا کو بھی تو دیکھو۔" پورن مل شاہ نے کہا۔ "کیسی گدرائی ہوئی ناشپاتی کی طرح بھر گئی ہے۔"

"ارے جیسے اچھے سے اچھا کھانے کو ملے، پہننے کو ملے، ایک خوبصورت کمرہ رہنے کو ملے وہ لونڈیا ناشپاتی تو کیا سیب کی طرح سرخ ہو جائے تو اس میں کیا تعجب ہے؟"

پھر میری طرف دیکھ کر آگے بڑھا اور میرے کان کھینچ کر بولا

"بچو! اب بھی کہتا ہوں میں اپنی ماں کو بلا لو، ورنہ ڈاکٹر تو گیا ہاتھ سے!"

❋

میرے پتا شانو کو دن میں چار مرتبہ دیکھنے جاتے تھے ایک تو صبح اٹھ کر جب وہ سارے وارڈوں کا راؤنڈ کرتے تھے پھر دوپہر کا کھانا کھانے سے پہلے، شام کے چار بجے جب دوسری مرتبہ ہسپتال کھلتا تھا۔ پھر رات کا کھانا کھا کر اور اکثر اس وقت گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اس کے پاس بیٹھتے تھے اور شانو گویا ان کی آمد کے لئے جیتی تھی اور انہیں دیکھ کر نہال ہو جاتی تھی دو تین مرتبہ اس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو اپنے ہاتھ سے کھانا بنا کر کھلائے لیکن ڈاکٹر صاحب نے منع کر دیا۔

"جب تک تیرا بخار نہیں اتر جاتا میں تیرے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاؤں گا!"

اور شانو نے اپنی بڑی چمکیلی آنکھوں سے ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اچھا یہ شرط بھی منظور ہے۔"

اس واقعے کے ڈیڑھ دو ہفتے بعد شانو کا بخار بھی اتر گیا اور میرے پتا جی نے اس کے ہاں کھانا منظور کر لیا۔ شانو آج ڈاکٹر صاحب کو کھانا کھلا کر بہت خوش تھی اور کھانا کھلا کے فرطِ مسرت سے ان کے پاؤں دباتی جاتی تھی اور وارڈ کے لوگ جن کا کام ڈاکٹر صاحب کے پاؤں دبانا ہی تھا ڈاکٹر صاحب کی اس حماقت پر سخت حیران تھے۔

پھر شانو ڈاکٹر صاحب کے لئے سویٹر بننے لگی پھر ہسپتال میں دھیرے دھیرے نرس کا ہاتھ بٹانے لگی تو نرس ہی جل کر خاک ہو گئی۔ اب سارا عملہ بدلی بدلی سی اور نرس سے لے کر سینئر کمپونڈر تک شانو کے ہو چکے تھے مگر شانو سب سے بے خبر، ڈاکٹر صاحب کی مسکراہٹ روز بروز صحت مند ہوتی جاتی تھی۔

یہ ماحول تھا جب ماں جی صحت یاب ہو کر لاہور سے لوٹیں۔ شاید وہ صحت یاب ہو کر ایک ماہ اور لاہور میں اپنے رشتہ داروں میں رہتیں لیکن موتی رام کا خط پاتے ہی انہوں نے فوراً واپس آنے کی ٹھان لی اور بلا اطلاع آ دھمکیں۔ ماں جی کی آمد سے میں اور پتا جی دونوں خوش ہوئے اور میں تو گویا نہال ہو کر ناچنے لگا۔

انہوں نے مجھے اپنی گود میں بٹھا کر بہت چوما اور پیار کیا لیکن پتا جی سے وہ بڑی سرد مہری سے پیش آئیں جس کا اس وقت پتا جی نے بھی نوٹس لیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہسپتال چلے گئے اور ماں جی گھر کے کام کاج میں مصروف ہو گئیں۔ آج وہ خواہ مخواہ نوکروں کو ڈانٹ رہی تھیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کی غیر حاضری میں ان کا سارا گھر چوپٹ ہو گیا تھا۔

رات کو سوتے وقت ماں جی نے ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے اچانک پتا جی سے پوچھا۔

"یہ شانتی کی بچی کون ہے؟"

"کون؟ شانو؟" پتا جی نے پوچھا

"شانو تو ہو گی تمہارے لئے، میرے لئے تو ستھا سڑی ہے کہ اس نے تمہارے دل پر سکہ جمایا ہے؟ ہیں؟"

"کیا بات کرتی ہو کاکے دی ماں؟"

"ٹھیک کہتی ہوں مجھے سب پتہ چل گیا ہے، رب بھلا کرے موتی رام کا اس کے گھر چاند سا بیٹا ہو اس کی بیوی کی مراد بر آئے اس بھلے آدمی نے مجھے سب کچھ لکھ دیا ہے"

"موتی رام نے؟"

"ہاں ہاں موتی رام نے! اور موتی رام کیا چھپاتا سارا ہسپتال تم پر ہنس رہا ہے سارا علاقہ تم پر تھو تھو کر رہا ہے راج دربار تک تمہارے کرتوتوں کی خبر چلی گئی ہے۔"

"میں نے تو کچھ نہیں کیا۔"

"میں نے تو کچھ نہیں کیا۔" ماں جی طنزیہ پیرائے میں پتا جی کی بات دہراتے ہوئے بولیں۔ "اس سے پہلے وہ جنم جلی سپیرن آئی تھی اس سے پہلے وہ خصماں کھانی کرمین آئی تھی۔ اب یہ شانو سر کھانی کہیں سے آ گئی ہے میں کہتی ہوں کہاں تک تمہیں روکتی رہوں گی، تمہیں شرم نہیں آتی۔"

"کسی کا علاج کرنے میں شرم کیا ہے؟"

کشف و کرامات اولیائے کرام کا خاصہ ہے۔ جو کبھی کبھی بزرگانِ دین کے مبارک توسط سے اللہ کے نیک بندوں کو اس کے لطف و کرم کے صدقے میں عطا ہو جاتا ہے۔

**بابا سید شان احمد صاحب**

کا شمار بھی انہی برگزیدہ ہستیوں میں ہے جنھیں روحانی انعام و اکرام سے نوازا گیا اور اس کا منہ بولتا ثبوت حقیقتِ حال سے متعلق وہ اہم پیش گوئیاں ہیں جو بذریعہ کشف تجلی کی صورت میں ان پر ظاہر ہوتی رہیں۔ بابا جی شادی بیاہ، مقدمات، محبت میں کامیابی یا ناکامی، مالی مشکلات اور اولاد وغیرہ سے متعلق آپ کے سوالات کے جوابات بذریعہ کشف دینے پر رضامند ہو گئے ہیں اور وہ پلک جھپکتے میں آپکے حال اور مستقبل کے تانے بانے میں جھانک کر فوراً خدا لگتی کہہ دیں گے۔ صرف ضرورت ہے اس نام کی جس سے آپ زیادہ پکارے اور پہچانے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ آپ کی والدہ محترمہ کا نام، عمر اور مقام پیدائش۔ آپ ایک وقت میں صرف دو سوال کر سکتے ہیں۔ جوابات کے لیے جوابی لفافہ بھیجنا ضروری ہے۔ بابا جی کے جوابات کا کوئی نذرانہ نہیں ہے۔ صرف انہی سوالات کے جوابات دیئے جائیں گے جن کے ساتھ "روحانی ڈاک" کا کوپن ہوگا۔

نام ــــــــ والدہ کا نام ــــــــ

مقام پیدائش ــــــــ عمر ــــــــ

پورا پتہ ــــــــ

ــــــــ

خط لکھنے کا پتہ

روحانی ڈاک

ماہنامہ "دوشیزہ" پوسٹ بکس ۸۹۵

کراچی ۲۹

—سی سے بالوں میں پھول لگانا علاج ہے، اسی سے ماتھے کا پونچھنا علاج ہے، کسی کے پاس ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو گھنٹے بیٹھ کر خوش گپیاں کرنا علاج ہے؟ اگر یہ علاج ہے تو عشق جانے کس کو کہتے ہیں؟"

"دھکے دی ماں!" پتا جی گرج کر بولے۔ "زبان سنبھال کر بات کرو۔"

ماں جی بستر سے اٹھ بیٹھیں اور پاؤں پٹک کر بولیں۔

"میں نہیں مانوں گی، میں نہیں مانوں گی جب تک وہ کلموہی اس جگہ سے رخصت نہیں ہو جائے گی میری زبان بند نہ ہو گی۔"

"جب وہ اچھی ہو جائے گی تو خود بخود یہاں سے چلی جائے گی۔"

"وہ کہاں جائے گی،" ماں جی غصے سے بولیں۔ "وہ جانے کے لئے تھوڑی آئی ہے وہ تو رہنے کے لئے آئی ہے ابھی تو وہ نرس کا کام سیکھ رہی ہے پھر نرس کی جگہ لے لے گی پھر میری جگہ لیتے ہوئے اسے کیا دیر لگتی ہے اپنے خصم کو کھا کر یہاں آئی ہے اب میرا سہاگ بھی کھانا چاہتی ہے ڈائن! میں اس کی ٹانگیں نہ چیر ڈالوں گی دیکھو جی اب میں تم سے صاف صاف کہے دیتی ہوں اس چڑیل کو فوراً یہاں سے نکال دو ورنہ کل سے اس گھر میں میرا ان جل حرام!"

دوسرے دن ماں جی نے فاقہ کشی شروع کر دی دن میں دو مرتبہ نمک ملا پانی ملا کر موتی رام کے گھر سے منگا کر پی لیتیں اور میں رو رو کر ہلکان ہوا جاتا تھا اور بار بار پتا جی سے کہتا تھا کہ وہ ماں جی کو منا لیں اور پتا جی تھے کہ غصے سے سانپ کی طرح پھنکارتے تھے اور کسی طرح شانو کو ہسپتال سے نکالنے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے اسی لڑائی جھگڑے میں پہلا دن گزر گیا پھر تیسرے دن ماں جی بہت نحیف اور کمزور ہو گئیں ان کے منہ سے بات بھی نہ نکلتی تھی ابھی اتنی لمبی بیماری سے اٹھ کر وہ پورے طور سے ٹھیک ہوئی تھیں کہ آتے ہی یہ افتاد پڑی۔ پتا جی غصے میں جھلاتے ہوئے پنگ پانگ کا بلا اور گیند لے کر برآمدے کی دیوار سے پنگ پانگ کھیلنے کی کوشش کرنے لگے۔

اتنے میں ایک نوکر نے ماں جی سے آ کر کہا۔

"شانو آپ سے ملنے کے لئے آئی ہے۔"

اور پیشتر اس کے کہ ماں جی کوئی جواب دیتیں شانو سر جھکائے ہوئے آنکھوں میں آنسو لئے کالے کنارے والی ململی دھوتی پہنے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اندر آ گئی اور ماں جی کے چرن چھوتے ہوئے بولی۔

"میں تو جنم جنم کی پاپن ہوں ورنہ میرا سہاگ کیوں اجڑتا۔ میں یہاں کیوں آئی، تمہارے گھر میں آگ کیوں لگائی اب تم مجھے معاف کر دو میں یہاں سے جا رہی ہوں اور اب یہاں کبھی نہیں آؤں گی۔"

ماں جی چپ چاپ بستر پر پڑی اس کے پوڈر سے غلط ملط کے اندر اس کا پیلا پڑتا ہوا چہرہ دیکھتی رہیں اس کے پھیکے ہونٹ ڈوبتی ہوئی آنکھیں وہ دھندلائے ہوئے مدھم ہوتے ہوئے نقش، جیسے تصویر بگڑ رہی ہو ایک اضطراری حرکت سے شانو نے اپنے تکیے میں پڑے ہوئے سویٹر کو نکالا اور رندھے ہوئے گلے سے بولی۔

"یہ میں ان کے لئے بن رہی تھی جو میرے لئے ہمیشہ دیوتا سے اونچے رہیں گے۔ اگر تمہارے دل میں کسی عورت کے درد کو سمجھنے کی خواہش ہو تو اسے اپنے ہاتھوں سے مکمل کر دینا بس میں تم سے اتنا ہی مانگتی ہوں۔"

اتنا کہہ کر شانو نے وہ ادھ بنا سویٹر ماں جی کے بستر پر ڈال دیا اور اپنے ہونٹوں کو زور سے بھینچتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی کمرے سے باہر جاتے ہوئے یکایک وہ دہلیز کی چوکھٹ سے ٹکرائی اور اس کی دھوتی کا پلو اس کے سر سے اتر گیا اس وقت میں نے دیکھا کہ اس کا سر منڈا ہوا تھا پتہ نہیں کیوں میں اس کے منڈے ہوئے سر کو دیکھ کر رونے لگا۔

شانو کے جانے کے بعد پتا جی کچھ چپ سے رہنے لگے، کچھ بجھ سے گئے، اس کے بعد کئی مہینے تک ان کے منہ سے ان کا پسندیدہ گیت نہ سنا۔ وہی گیت جس سے ماں جی کو اتنی چڑ تھی اب اسی گیت کو ان کے ہونٹوں سے سننے کے لئے ماں جی ترستی تھیں جب بھی ماں جی اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتیں۔ پتا جی کے منہ پر کچھ ایسی چپ سی لگ جاتی کہ ماں جی ان کا چہرہ دیکھ کر اپنی بات دل ہی دل میں رکھ لیتیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شانو کے موضوع پر پتا جی کوئی بات سننا نہیں چاہتے تھے۔

شانو کے جانے کے کوئی چھ ماہ بعد پتہ چلا کہ شانو اپنے گاؤں میں تپ دق سے مر گئی۔ شانو کا بیٹا کسی کام سے یہاں آیا تھا اور ہسپتال آ کر ڈاکٹر صاحب کو بتا گیا تھا۔ اسی شام کو ڈاکٹر صاحب کو اتنے زور کا لرزا چڑھا کر رات ہوتے ہوتے ایک سو پانچ درجے کا بخار ہو گیا۔ ماں جی رات بھر بیٹھی تیمارداری کرتی رہیں لیکن بخار دوسرے دن بھی نہ اترا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ٹائیفائڈ تھا۔ پورے اکیس روز بعد اترا لیکن جب بخار اترا تو پتا جی بے حد نحیف و نزار ہو چکے تھے ان کے جگر کا فعل خراب ہو گیا تھا اور دونوں آنکھیں پیلی پڑ گئی تھیں یرقان کا شدید حملہ تھا۔

ماں جی نے تیمارداری میں دن رات ایک کر دیا ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ پتا جی کے پلنگ سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ خود ماں جی کی صحت پر اس بیماری کا بہت برا اثر پڑا۔

راجہ جی پتا جی پر بہت مہربان تھے اس لئے انہوں نے ان کے علاج کے لئے دوسرے ڈاکٹر کو بھی بلا لیا تھا جو ہسپتال میں کام کرنے کے علاوہ دن رات ان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ نرس بھی اچھا بہت سا وقت

ان کی خبر گیری میں گزارتی تھی۔ لاہور سے بہت سی دوائیں بھی منگوائی گئی تھیں مگر پتا جی کے یرقان کا مرض بڑھتا جا رہا تھا اور وہ دن بدن سوکھتے چلے جا رہے تھے۔

ماں جی نے گنڈے تعویذ، جھاڑ پھونک منتر جنتر سب آزما ڈالے حکیم شمس الدین کی یونانی دوائیں بھی کھلائیں لیڈی میشورام کے شربت اور جڑی بوٹیاں بھی آزما ڈالیں۔ ڈاکٹر گردھاری لال جو میرے پتا جی کی جگہ آیا تھا اس بے چارے نے بھی ہر طرح کے جتن کر ڈالے لیکن پتا جی کسی طرح صحت مند ہونے میں نہ آ سکتے تھے اور روز بروز کمزور ہوتے چلے جاتے تھے۔ ان کی پسلیوں کی ہڈیاں نکل آئی تھیں آنکھیں جو کبھی نہایت خوبصورت تھیں اب سیاہ گڑھوں میں گدلے پانی کی طرح دھندلا گئی تھیں اور ان کے پیروں پر ورم آ چلا تھا۔

ماں جی شب و روز خدمت گزاری میں منہمک رہتیں باقی وقت پوجا پاٹ میں گزارتیں، کبھی کبھی تکیے میں منہ ڈھانک کر سسک سسک کر رو لیتیں مگر میں نے کبھی انہیں پتا جی کے سامنے روتے نہیں دیکھا چہرے پہ ہر وقت ایک زہر بھری مسکراہٹ رکھتیں۔ وقت پر کھانا کھلاتیں۔ وقت پر دوا دیتیں، فرصت کے وقت پاؤں دباتیں، رات کو جس وقت پتا جی کروٹ لے کر جاگتے ماں جی کو ہر وقت پائنتی پر جاگتے ہوئے پاتے ماں جی کب جاگتی تھیں، کب سوتی تھیں، اس کا کسی کو پتہ نہ تھا۔

پتا جی سب کچھ دیکھتے تھے مگر چپ رہتے تھے وہی بجھا بجھا چہرہ پیلی پیلی بے نور آنکھیں، پھیکے خشک ہونٹ اور ہاتھوں کی انگلیاں کانپتی ہوئی دن کو تو وہ سوتے ہی نہ تھے، رات کو بھی انہیں بہت کم نیند آتی تھی وہ لوگوں سے بہت کم بات کرتے تھے۔ اکثر اوقات بس چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کے اندر جینے کی خواہش دب گئی ہے اور انہوں نے اپنے آپ کو بیماری کے حوالے کر دیا ہے۔ ڈاکٹر گردھاری لال مایوس ہوتا گیا گھر میں گہری اداسی کے سائے منڈلانے لگے۔ چلتے پھرتے کام کرتے ایک دم یوں چوکنا ہو جاتے جیسے موت کی آہٹ سن رہے ہوں۔ اگر کسی کتے کے رونے کی آواز آتی تو ماں جی کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگتا اور وہ دوپٹے میں اپنا چہرہ چھپا کر اس طرح خاموشی سے روتیں کہ ان کا سینہ درد اور خوف سے پھٹنے لگتا دھاڑیں مار مار کر رونے سے جی ہلکا ہوتا ہے مگر چپکے چپکے رونے سے دل پر وہ کاری ضرب پڑتی ہے کہ روح کے اندر تک اس کی دھمک سنائی دیتی ہے۔

اسی زمانے میں ایک رمتا جوگی ایک ہاتھ میں چمٹا اور ایک ہاتھ میں ترسول تھامے اور کندھے پہ ایک بڑی پوٹلی لٹکائے بھیک مانگتا ہمارے برآمدے کے باہر آیا۔ ماں جی نے اس کی جھولی میں بہت سا آٹا ڈال کر اس سے اپنی بپتا کہی۔ وہ ہر ایک کو پتا جی کی بیماری کا حال سناتی تھیں اور کسی نئی دوا یا جڑی بوٹی کا نام سننے کے لئے بے تاب رہتی تھیں جوگی نے سب حال سن کر کہا۔

"ہم تیرے گھر دیکھیں گے دو چار جڑی بوٹیاں ہمارے پاس ہیں اگر ان میں سے کوئی کام آ گئی تو مہادیو کی کرپا سمجھیں گے۔"

جوگی نے ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ کی انگلیاں دیکھیں۔ ان کے ناخن دیکھے، پیروں کے ناخن دیکھے، آنکھیں دیکھیں، کان کی لویں دیکھیں، مشک دیکھا پھر ڈاکٹر صاحب کو آشیرواد دے کر باہر چلا گیا اور سر ہلا کر ماں جی سے بولا۔

"اس کا روگ ہمارے بس کا نہیں ہے۔"

ماں جی روتے روتے ہاتھ جوڑ کر جوگی کے پاؤں پڑ گئیں رندھے ہوئے گلے سے بولیں۔

"کچھ تو کیجئے مہاراج!"

"نہیں بچی اس کا روگ ہمارے بس کا نہیں ہے اسے بھگوان ہی بچائیں تو بچائیں مجھے تو ان کی آنکھوں میں یمدوت آتے دکھائی دیتے ہیں۔"

ماں جی ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں شعلہ بار نگاہوں سے جوگی کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"یمدوت آئیں تو سہی ٹانگیں چیر دوں گی ان کی میں بھی کشترانی ہوں۔ میں نے پرن کیا ہے میرے جیتے جی موت ان کو ہاتھ نہیں لگا سکتی۔"

"تم موت کو کیسے روک سکو گی بچی؟" جوگی نے پوچھا

"ان کے مرنے سے پہلے میں اپنی جان دے دوں گی میرے جیتے جی موت ان کو نہ چھو سکے گی، یہ میں نے پرن کیا ہے۔"

ماں جی کا چہرہ غصے کی شدت اور ارادے کے استحکام سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ میں نے ماں جی کو ایسے جلال میں کبھی نہ دیکھا تھا جوگی ان کو دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔

"بچی میں تیرا ارادہ دیکھنا چاہتا ہوں ویسے اس روگ کا علاج ہے مگر اتنا کٹھن ہے کہ اس کے لئے دھیرج اور پختہ ارادے کی ضرورت ہے۔"

"آپ بتائیے تو سہی مہاراج!" ماں جی بڑی مضبوطی سے بولیں "میں اس علاج کو پورا کرنے میں سارے زیور بیچ دوں گی اور اپنی جان کی بازی لگا دوں گی۔"

اس علاج کو برتنے میں ایک پیسہ بھی خرچ نہ ہوگا ہاں مگر بہت کٹھن کام ہے۔ ارادہ دیکھ کر تمہیں بتائے دیتا ہوں۔ جنگلوں میں ایک بیل ہوتی ہے۔ اسے چھپاولی کی بیل کہتے ہیں کبھی کبھی یہ کھیتوں میں بھی مل جاتی ہے مگر جنگلوں

میں عام ہوتی ہے سب لوگ اسے جانتے ہیں اس بیل میں ایک پھل لگتا ہے جسے پھپھالو کہتے ہیں یہ پھل ٹماٹر سے چھوٹا ہوتا ہے لیکن شکل وصورت میں ککڑی سے بہت ملتا ہے اس کا ذائقہ کسی قدر میٹھا اور ترش ہوتا ہے۔"

"ہاں میں نے پھپھالو کھیتوں میں دیکھا ہے۔" ماں جی پر امید ہو کر بولیں "بچے اسے بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔"

"بس وہی ہے مگر آجکل کھیتوں میں نہیں ملے گا اور ملے گا تو جنگل کی ان ڈھلانوں پر جہاں دھوپ کا گزر نہیں ہوتا کیونکہ یہ بہت سرد پھل ہوتا ہے اب تم ایسا کرو کہ اس علاج کو کسی دوسرے پر مت چھوڑو اس کے لئے تمہیں خود سویرے اٹھ کر جنگل میں جانا ہو گا اور پھپھالو کے پھلوں کی اوس جو صبح سویرے ان پر موجود ہوتی ہے اسے اکٹھا کر کے اسے ایک برتن میں جمع کرنا ہو گا اور پھپھالو بھی الگ سے جمع کرنا ہوں گے وہ اوس اکٹھی کر کے اسے سورج چڑھنے سے پہلے اپنے پتی کو پلاؤ پھر اس کے آدھے گھنٹے کے بعد پھپھالو کا رس نکال کر اور بیج الگ کر کے پلا دو لیکن یہ سب کام سورج نکلنے سے پہلے ہونا چاہیئے۔ اگر چالیس دن تک تم یہ دوا کھلاؤ گی تو سمجھو مہاراج کی کرپا سے تمہارے سوامی اچھے ہو جائیں گے۔"

ماں جی نے جوگی کے پاؤں چھوئے اور انہیں دس روپے کا نوٹ نذر کیا مگر جوگی نے لینے سے انکار کر دیا

"آج کے دو وقت کی روٹی تمہارے گھر سے مل گئی بس اس سے زیادہ لینے کی اجازت نہیں۔"

اتنا کہہ کر جوگی چمٹا بجاتا ہوا اٹھا اور ہمارے ہاں سے رخصت ہو گیا۔

دوسرے دن ماں جی نے اپنے ملازم کرپا رام کو ساتھ لیا اور وڑینوں کے جنگل کی طرف چل دیں اور ابھی ٹھیک طرح سے اجالا نہ ہوا تھا کہ وہ پھپھالو کے پھل اور پھپھالو کی اوس ایک کانسی کے ڈھکنے دار برتن میں اکٹھی کر کے لے آئیں۔ وہ اتنی ہوشمند تھیں چنانچہ انہوں ڈاکٹر گردھاری لال کو فوراً بلا بھیجا۔ وہ بے چارہ ابھی سو رہا تھا ماں جی کی اطلاع پاتے ہی فوراً چلا آیا اچانک نیند سے اٹھنے کی وجہ سے کچھ تلخ مزاج بھی ہو رہا تھا اس نے پھپھالو دیکھے تو ایکدم بھڑک گیا بولا۔

"یہ تو وہی ذلیل پھپھالو ہیں جنہیں پہاڑی بچے ہر روز جنگل سے توڑ کر کھایا کرتے ہیں۔"

"یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔" ماں جی بڑی دلجمعی سے بولیں۔ "مگر آپ سے صرف یہ پوچھنا ہے کہ ان کا رس کسی طرح کا نقصان تو نہ کرے گا؟"

"نقصان نہیں کرے گا تو فائدہ بھی کیا کرے گا؟" گردھاری لال نے جل کر کہا۔ "وہ تو پلانے سے معلوم ہو گا۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔"

گردھاری لال نے اب تایا جی کی حالت سے مایوس ہو کر سب کچھ ماں جی پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ علاج اب بھی کرتا تھا مگر اسے تایا جی کے اچھے ہونے کی امید نہ تھی۔

ماں جی نے اس کے دو گھونٹ میرے والد صاحب کو پلا دیئے پھر آدھے گھنٹے کے بعد پھپھالو کا رس بھی پلا دیا۔ یہ سب کام ہو جانے کے کئی گھنٹے بعد سورج نکلا ماں جی کو بڑا اطمینان ہوا۔

بنگلے کے پچھواڑے دریلنگ کے قریب ایک پتھر پر کرپا رام بیٹھا شلوار کے پائنچے سے کانٹے نکال رہا تھا اور کوستا جا رہا تھا۔ کیسا کانٹے دار جنگل ہے کیسی خطرناک ڈھلانیں ہیں جہاں پھپھالو ملتے ہیں۔ کسی سیدھی اور سپاٹ جگہ پر تو ملتے ہی نہیں، کسی کھوہ کے پاس، کسی ڈھلان پر، کسی کھڈ میں خطرناک چٹانوں کے گہرے سایہ میں جہاں بکری بھی نہ پہنچ سکے وہاں یہ بیل اگتی ہے میرے تو پاؤں چھل گئے ہیں اور پاجامہ بھی پھٹ گیا ہے اور صبح کیسی کڑاکے کی سردی تھی۔ کمبل اوڑھ کر گیا تھا پھر بھی دانت بجتے رہے تیری ماں تو شیرنی ہے شیرنی کا ہے کہ اسے تو جنگل میں کسی کا ڈر نہیں کسی چٹان سے پھسل کر کھڈ میں گرنے کا خوف نہیں جہاں میں نہیں پہنچ سکتا وہاں یہ کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے پہنچ جاتی تھی، دہائی ہے میں چالیس دن تک کیسے جاؤں گا تیری ماں کے سر تو جن سوار ہے مجھ سے یہ کام نہ ہو سکے گا میں تو نوکری چھوڑ دوں گا۔"

وہ اسی طرح بکتا رہا مگر اس کے بعد بھی دوسرے دن گیا، تیسرے دن گیا پھر تھے دن گیا، پانچویں دن ہمت ہار گیا۔ ماں جی اس دن جگت سنگھ کو اپنے ساتھ لے گئیں۔ اس سے پہلے یہ دستور ہو تا تھا کہ ماں جی پو پھٹنے سے پہلے گھر سے چلی جاتی تھیں نوکر کو ساتھ لے کر اور سورج نکلنے سے ایک گھنٹہ کبھی آدھ گھنٹہ پہلے آجاتی تھیں بہر حال انہوں نے اپنے معمول میں کبھی ناغہ نہیں کیا تھا اور وہ ہر روز سورج نکلنے سے پہلے پھپھالو کی اوس اور اس کا رس تایا جی کو پلا دیتی تھیں کئی بار نوکروں نے ان سے کہا۔

"ماں جی آپ کے جانے کی ضرورت نہیں، ہم خود پھپھالو اور اس کی اوس جنگل سے اکٹھی کر کے لے آئیں گے۔"

ماں جی سر ہلا کر جواب دیتیں۔ "اور اگر کسی دن تم نہ لا سکے یا کسی دن تم سستی کر گئے اور پھپھالو کی اوس کی بجائے ندی کے پانی کے دو گھونٹ لے آئے تو میں کیا کروں گی؟ نا بھائی اس معاملے میں میں کسی پر بھروسا نہ کروں گی۔"

گیارھویں دن ماں جی جنگل سے دیر تک نہ لوٹیں، نہ فیروز آیا دیر تک لوگ ان کا انتظار کرتے رہے پھر سورج نکل آیا پھر سورج پہاڑوں سے گزر اونچا ہو گیا۔ ماں جی پھر بھی نہ آئیں تایا جی نے دو ایک بار دروازے کی طرف دیکھا پھر خاموشی سے نگاہیں چھت کی طرف لگا لیں جب سورج دو گز اونچا ہو گیا اور نوکروں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں تو وہ آپس

رپھیرتے رہے تھے اور بار بار ... دیکھتے رہے تھے ہم سب
ڈرے سہمے کھڑے ہوکر وڈ نیلے کے جنگل کی طرف دیکھتے رہے تھے پھر ہم نے
ڈے کے پیچھے کی گھاٹی سے فیروز کو دوڑتے آتے دیکھا۔ ماں جی کو اس
سے پہلے ادھر دیکھا تھا بہت سے لوگ فیروز کی طرف دوڑے۔ تیز تیز
دوڑنے سے فیروز کی کمر دوہری ہوگئی تھی اور دم ٹوٹ رہا تھا مجید اور
ہم نے جاکر فیروز کا بوجھ ہلکا کیا اور ماں جی کو اٹھا کر گھر لانے میں نے
ماں کی ساڑھی جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اور ان کے ہاتھوں اور
پیروں سے خون بہہ رہا تھا ان کی آنکھیں بند تھیں اور چہرہ ایک طرف
ڈھلکا ہوا تھا میں زور زور سے رونے لگا مجید اور کرپا نے ماں جی کو
ان کے سامنے دوسرے پلنگ پر لٹا دیا۔
میرے زور زور سے رونے کی آواز سن کر تیا جی نے چھت سے اپنی
پرشالیں اور بولے ۔ "کیا ہے ؟"
بڈھے فیروز نے کہا۔ "ماں جی کھڈ میں گر گئیں، بڑی خوفناک ڈھلوان
کی گہری اور تاریک اور نیچے جاکر پھپھالو کی بیل پر چار پھپھالو لگے
ہوئے تھے اور آج جنگل سے پھپھالو بہت کم ملے تھے میں نے ماں جی کو
سمجھایا لیکن وہ نہیں مانیں۔ میں سرکار اب بہت بوڑھا ہوگیا ہوں
گہری کھڈ میں جانے کی ہمت نہیں کرسکا۔ یہ میری بات نہیں مانیں۔
کھڈ میں اترنے لگیں۔ کھڈ میں اترتے اترتے ان کا پاؤں جو پھسلا تو سب
جان کسی طرح بچ گئی مگر چوٹیں بہت آئی ہیں۔"
تیا جی کسی نہ کسی طرح بستر سے اٹھے اور میری ماں جی کے پلنگ کے
پاس پہنچے، ماں جی پلنگ پر بے سدھ پڑی تھیں۔ لمبے الجھے پیچ کھائے
بالوں میں تیل نہ کنگھی، ماتھے پر لہو کی پپڑیاں، میلے میلے گال ظلم واندوہ
کی دھند لائے ہوئے، پتلی سوکھی بانہوں پر چوٹیں، نیل اور خراش ٹانگوں
پر بہتا ہوا لہو، وہ نہایت کمزور، نحیف اور بے جان سی لگ رہی تھیں تیا
جی نے دھیرے سے کہا۔
"جانکی ! جانکی !!"
ماں جی بے سدھ پڑی تھیں لیکا یک تھرائی ہوئی آواز میں ایک
چیخ مار کر تیا جی ماں جی سے لپٹ گئے۔ "میں نے تیرے ساتھ ظلم کیا
جانکی ! مجھے معاف کر دے ! مجھے معاف کر دے، میں قسم کھاتا
ہوں اب کبھی نہیں . . . اب کبھی نہیں ۔"
ماں جی نے اپنے سوامی کی گود میں آنکھیں کھولیں اور کانپتے ہوئے
ہاتھ کی انگلیوں سے میرے تیا جی کی کئی دن کی بڑھی ہوئی داڑھی کو چھو کر
بولیں۔
"معافی تو مجھے مانگنی چاہیئے، میں نے سمجھا تم شانو سے محبت کرتے ہو
حالانکہ تم اسے صرف بندگی دے رہے تھے۔ مجھے بہت دیر بعد احساس
ہوا کہ اس وقت کو ... اس کی طرف ... ہمارے ... لوگ دستار
میں ہوں جو گناہگار ہوتے ہیں وہی تو معافی مانگتے ہیں۔"
ماں جی آنسو بہا کر شرمائیں سب ذرا سر جھکا کر باہر چلے گئے تیا جی نے
ایک ہاتھ سے مجھے اور ایک ہاتھ سے میری ماں کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا
"ان طوفانوں کو بھول جاؤ، اب کبھی نہیں ، بس اب کبھی یوں نہ ہوگا اب
تک میں کبھی تیرا اتنا نہ ہوا تھا جتنا آج سے ہوگیا ہوں بس اب کچھ باقی نہیں رہا"
ماں جی نے خوشی اور غم سے تیا جی کے سینے میں سر چھپا لیا اور رونے لگیں
تیا جی بھی رونے لگے میں بھی رونے لگا کیونکہ ہم ہندوستانی رونے والی قوم
ہیں اور ہم ہر جگہ اور ہر وقت رو سکتے ہیں۔
دوپہر کے وقت ماں جی اپنے پلنگ پر بیٹھی کچھ کاڑھ رہی تھیں گردھاری
لال ایک کرسی پر تیا جی کے پلنگ کے قریب بیٹھے تھے اور تیا جی پلنگ پر
بڑے بڑے تکیے لگائے نیم دراز حالت میں بیٹھے تھے اور بولے ہولے
گنگناتے رہے تھے گردھاری لال نے پوچھا۔ "اب کون سی دوا شروع
کریں۔" ؟
تیا جی ہنس کر بولے۔ "اب اگر ندی کا پانی بھی پلا دوگے تو اچھا
ہوجاؤں گا۔" ان کے چہرے پر امید کی گہری جھلک تھی ڈاکٹر گردھاری لال
حیرت سے میرے تیا جی کی طرف دیکھنے لگا میری ماں سر جھکائے کچھ
کاڑھنے میں مصروف تھیں
"یہ کیا ہے تمہارے ہاتھ میں ؟" تیا جی نے ماں جی سے پوچھا
ماں جی اپنے پلنگ سے اٹھیں اور تیا جی کو اپنے ہاتھ میں لپٹی ہوئی اون
دکھاتے ہوئے بولیں۔
"سوچتی ہوں شانو والا سویٹر اب پورا کردوں۔"
دھیرے سے تیا جی نے اس نامکمل سویٹر کو اپنے ہاتھ میں لے
لیا۔ دھیرے سے انہوں نے اس پر انگلیاں پھیریں اور بولے۔
"ہاں اب اسے پورا کر ڈالو۔"
لیکن ان کے لہجہ میں کوئی حسرت یا دکھ نہیں تھا ۔ ☐

ابو ظہبی

## شیخ المشائخ

حضرت عبدالسلام شاہ اعلیٰ بڑے صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے آپ کو خرقہ فقر اپنے والد حضرت شیخ نظام الدین سے عطا ہوا تھا آپ کا شجرہ نسب حضرت عثمان غنیؓ سے اور شجرہ بیعت حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ سے ملتا ہے حضرت ظہیرالدین محمد بابر کے دربار میں شعبہ سپہ گری میں ملازم تھے۔ اس زمانہ میں آپ کو تیر اندازی سے شغف تھا آپ اس فن میں زیادہ سے زیادہ کمال حاصل کرنا چاہتے تھے اس کے لئے آپ عمل کرتے اور دعائیں پڑھتے۔ دیکھتے ہوئے ایک مرتبہ کسی نے بتایا کہ اگر حضرت شیخ رکن الدین احمد کھنکوربانی کے نام پر نذر کر کے دعا کی جائے تو ایک ہفتہ میں مشکل حل ہو جاتی ہے حضرت کا شوق اس درجہ تھا کہ آپ نے گوشت اور گندم کی نیاز دلائی، نماز ادا کی اور اس کا ثواب شاہ احمد کھنکوربانی کو بخش کر ان کے طفیل دعا کی ایک شب آپ محو استراحت تھے کہ خواب میں دیکھا کہ ایک نورانی چہرے والے بزرگ تیر و کمان دے کر نشانہ بازی کا اشارہ کر رہے ہیں انہوں نے عالم خواب میں نشانہ لگایا تو وہ بزرگ بولے۔

"مرحبا شاہ اعلیٰ تجھے تیر اندازی مرحمت ہوئی۔"

حضرت اس عجیب خواب سے بیدار ہوئے تو فوراً چراغ روشن کیا اور نشانہ بازی شروع کر دی کہتے ہیں کہ سینتالیس تیر چلائے جو سب نشانے پر لگے۔ اس واقعہ کے بعد آپ ہمایوں بادشاہ کے پاس دہلی آئے تو ایک دن نماز فجر جامع مسجد میں گئے۔ آپ نے دیکھا کہ مسجد میں وہی خواب والے بزرگ تشریف فرما ہیں اور ان کے ہاتھ میں وہی تیر و کمان ہے جو انہوں نے خواب میں دیکھا تھا حضرت متعجب ہوئے اور آگے بڑھ کر بزرگ کی قدم بوسی کی۔ انہوں نے وہی تیر و کمان عطا کیا اور مسجد سے چلے گئے حضرت نے کچھ لوگوں سے ان کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ وہ بزرگ شاہ احمد کھنکوربانی تھے جنہیں دنیا سے پردہ کئے عرصہ ہو چکا تھا۔ حضرت تیر و کمان لے کر محو حیرت لوٹ آئے۔ یہ تیر و کمان شیر شاہ سوری کے زمانہ جنگ تک ان کے پاس رہا ابتدا میں حضرت کا نام شیخ عبدالسلام تھا ظاہری و باطنی علم آپ نے اپنے باپ شیخ نظام الدینؒ سے حاصل کیا۔ شیر شاہ سوری سے جنگ کے بعد حضرت کے دل میں حج کرنے کی آرزو پیدا ہوئی تو آپ نے اپنے والد ماجد سے اجازت طلب کی اور روانہ ہو گئے اسی زمانہ میں آپ کو شیخ حمزہ کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا اور آپ نے شہر شہر پھر کر بہت سے درویشوں سے ملاقات کی۔ ملتان، گجرات، لاہور اور جونپور وغیرہ گئے اور آخر دنیا سے دل اُچاٹ ہو گیا تو آپ نے تمام مال و متاع بیچ کر فقراء میں تقسیم کیا اور تلاش حق کے لئے نکل پڑے۔ آپ جونپور میں شیخ بہاؤالدینؒ، میر قاسمؒ اور شیخ شمس الدین جاموئیؒ سے، بہار میں مولانا حسام الدین بغدادی، شیخ صلاح الدین اور شیخ علی مغربی سے، گمنم پور میں مولانا علی احمد، شیخ عبدالصمد، گجرات میں قاضی محمود اور رانی میں شیخ نظام سے ملے اور فیض حاصل

کرتے رہے مگر ان میں کسی نے بھی بیعت نہ کی اور وطن لوٹ آئے اور پھر سراج شمس الاولیاء شیخ شمس الدین ترک کے مزار مبارک پر اعتکاف میں بیٹھ گئے اور ریاضت و مشاہدہ شروع کر دیا لیکن ابھی پورے چالیس دن نہ گزرے تھے کہ حضرت نے دیکھا کہ حضرت شیخ نظام نارنولی پہنچ گئے لیکن ابھی شہر میں داخل نہ ہوئے تھے کہ شیخ نظام نارنولی کا خادم نعلین اور جامہ لئے حاضر خدمت ہوا آپ نے وہ چیزیں اس سے لے لیں اور آگے بڑھے مگر خانقاہ میں داخل ہونے سے قبل ایک اور خادم حاضر ہوا اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر اسم اعظم درج تھا اس نے کہا۔

"یہ شیخ نظام نارنولی نے اپنے دست مبارک سے یہ اسم اعظم لکھا ہے اور فرمایا ہے کہ اسے پڑھو یہاں تک قلب روشن ہو جائے تب میرے حضور آنا۔"

حضرت سات یوم تک یہ پڑھتے آخر آپ کا قلب صاف ہو گیا۔ آخر حضرت شاہ نظام نارنولی کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے فرمایا "شاہ اعلیٰ" اس دن سے آپ اس نام سے مشہور ہو گئے یہاں پر حضرت نے ایک سال پانچ ماہ قیام کیا اور ریاضت و عبادت کرتے رہے حتیٰ کہ ایک دن شاہ نظام نے انہیں اپنے حجرے میں طلب کیا اور چودہ خانوادوں سے جو کچھ حاصل کیا تھا انہیں عطا کیا اور بولے۔

"تم وطن واپس چلے جاؤ کیونکہ تمہارے جد اعلیٰ شیخ جلال الدین کی مسند خالی ہو چکی ہے۔"

یہ سن کر حضرت شاہ اعلیٰ بڑے حیران ہوئے لیکن گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ان کے والد ماجد شیخ نظام الدین رحلت فرما گئے ہیں اور ان کی مسند سجادگی خالی ہے حضرت پانی پت پہنچے جو چیزیں جد بزرگوار نے ان کے لئے چھوڑی تھیں وہ سب حاصل کیں حضرت شاہ اعلیٰ کی زندگی میں بڑے بڑے عجیب واقعات پیش آئے۔

حضرت کی تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا اور آپ ایک غار میں مصروف عبادت تھے ایک بار ایسا ہوا کہ پانچ روز تک کھانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا اور آپ مسلسل روزے سے رہے تھے پانچویں دن جب آپ کی حالت دگرگوں ہوئی، آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا تو آپ نے ضد کی بات کی کہ اللہ تعالیٰ جب تک غیب سے کچھ عطا نہ کرے گا میں روزہ افطار نہ کروں گا، تمام دن گزر گیا آپ بہ اطمینان بیٹھے تلاوت کلام پاک کرتے رہے کہ اچانک مغرب کے وقت باہر کی جانب سے آواز آئی۔

"شاہ اعلیٰ! باہر آؤ۔"

حضرت باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ ایک انتہائی نورانی چہرے والے بزرگ کھڑے ہیں جن کے ہاتھ میں کوئی سفید سی چیز ہے حضرت نے سوال کیا "آپ کون ہیں؟" مگر انہوں نے کچھ نہیں بتایا اور اس چیز کو توڑ کر حضرت کو روزہ افطار کرایا اور لوٹ گئے ان کے چلے جانے کے بعد حضرت تاسف بھرے گراس وقت دھونڈا مگر خواب میں نظر آئے تو حضرت نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا۔

نادر ان الل غوثانی مولانا طاہری سے روایت ہے کہ "ایک مرتبہ حضرت شاہ اعلیٰ نے حضرت بوعلی قلندر کی نذر ساتی تھی اور مجھ سے یہ طے پایا تھا کہ میرے ساتھ باگھوٹی جاکر یہ نذر ادا کی جائے گی علی الصبح بعد نماز فجر روانگی قرار پائی تھی۔ اتفاقاً ابھی ایک پہر رات باقی تھی کہ بادل گھر آئے اور بارش شروع ہو گئی لہذا میں ٹھٹک گیا مگر شاہ اعلیٰ نے مجھے بلا بھیجا اور فرمایا۔

"میں تمہارا انتظار کر رہا تھا کہ باگھوٹی پہنچ کر قطب ابدال حضرت بوعلی قلندر کی نذر ادا کریں۔"

میں نے عرض کی۔ "یا حضرت! بارش ہو رہی ہے اور باگھوٹی میں بارش سے بچنے کے لئے سایہ بھی نہیں ہے لہذا بہتر ہے کہ آج موقوف کیا جائے اور کل ہم لوگ روانہ ہوں۔"

حضرت نے کہا۔ "کچھ بھی ہو مجھے آج ہی جانا ہے۔"

اس پر میں نے کہا۔ "میں راضی برضا ہوں مجھے بھی کوئی عذر نہیں حضرت اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔

"خاطر جمع رکھو تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

چنانچہ ہم سب باگھوٹی روانہ ہوئے ساتھ میں اور بھی بہت سے معتقدین اور مرید تھے مگر خدا کی شان دیکھیے کہ ہم لوگوں کے دائیں بائیں بارش ہو رہی تھی مگر ہم پر پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں گر رہا تھا نہ صرف یہ بلکہ باگھوٹی پہنچ کر بھی جس جگہ ہم نے کھینی اور دعلی پکا کر لوگوں میں تقسیم کی وہاں بارش نہیں ہوئی۔ ایک مجلس میں بزرگوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے یہ بحث چھڑ گئی کہ اولیاء اللہ کی خدمت میں جنات بھی آ کر کسب کمال کرتے ہیں اس پر مجلس میں موجود حضرت سعد اللہ بن شیخ عبدالرحیم نے فرمایا کہ:۔

"ہاں ایک جن جس کا نام جمال تھا حضرت اقدس شاہ اعلیٰ کی خدمت میں میں نے بھی دیکھا ہے اور وہ اس طرح کہ بچپن میں ایک رات میں حضرت اعلیٰ کی خدمت میں سویا ہوا تھا کہ آدھی رات کے وقت حضرت نے آواز دی۔ "جمال! آفتابہ حاجتی لاؤ۔"

میں حضرت کی آواز سے جاگ گیا دیکھا کہ ایک سفید پوش لمبا سا آدمی آفتابہ ہاتھ میں لئے حضرت کی چارپائی کے قریب کھڑا تھا حضرت جب فارغ ہو گئے تو وہی شخص آفتابہ رکھ کر ایک طرف مؤدب کھڑا ہو گیا۔

حضرت نے فرمایا "جمال جاؤ اب کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ چند قدم چل کر غائب ہو گیا۔

میں نے خوفزدہ ہو کر دریافت کیا "یا حضرت یہ کون تھے؟" حضرت نے خاموش رہنے کی ہدایت کی اور فرمایا تو ان باتوں کو کیا جانے جو پوچھتا ہے۔"

ایک مرتبہ ایک عرس میں حضرت شیخ عبدالسلام شاہ اعلیٰ اقدس تشریف فرما تھے شہر اور گرد و نواح کے بہت سے اکابرین موجود تھے آپ کے قریب ہی پانی پت کے رہنے والے مرزا محمد بھی کھڑے تھے۔ دورانِ گفتگو ان کی زبان سے نکل گیا کہ "آج کل کوئی ایسا درویش نہیں جس کے سماع میں اثر ہو"۔ حضرت شاہ اعلیٰ نے یہ بات سنی قوالوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "توبہ کرو اور ہرگز اس قسم کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ کیونکہ یہ دنیا اولیاء اللہ ہی کی وجہ سے قائم ہے ورنہ فنا ہو جائے"
بعد ازیں قوالوں کو اشارہ کیا کہ کچھ شروع کریں قوالوں نے گانا شروع کیا جب قوال اس شعر پر پہنچے ؎

خاکسارانِ جہاں را بہ حقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

(دنیا کے خاکساروں کو حقارت کی نظر سے مت دیکھ تجھے کیا خبر ان میں کوئی بلند مرتبہ بھی ہو)
تو حضرت نے ان پر ایک نظر ڈالی اور مرزا محمد پر وجد کی کیفیت طاری ہوئی اور تھوڑی دیر بعد ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے لوگوں نے حالت بے ہوشی میں گھر پہنچا دیا۔ دوسرے روز مرزا آستانہ اعلیٰ پر حاضر ہوئے اور معافی طلب کی۔

حضرت شاہ اعلیٰ نور باطنی سے مالا مال تھے اکثر اوقات لوگوں نے آپ کو آزمایا ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چار پانچ شخص حضرت سے ملنے کے لئے چلے۔ راستے میں ایک نے کہا کہ اگر وہاں پہنچتے ہی حضرت کا بچا ہوا کھانا کھانے کے لئے مل جائے تو کتنا اچھا ہو۔ جب یہ سب خدمت اقدس میں پہنچے تو حضرت کھانا تناول فرما رہے تھے آپ نے ان سب کو کھانے کی دعوت دی مگر جو شخص کھانے کا آرزومند تھا وہ تکلف کرنے لگا حضرت یہ دیکھ کر مسکرائے اور باقی لوگوں کو دیکھ کر گویا ہوئے "دیکھو یہی میرا بچا ہوا کھانا کھانے کا آرزومند تھا اور یہی اب تکلف کر رہا ہے۔"
شیخ نظام پانی پتی حضرت کے مرید تھے ایک مرتبہ کسی کام سے کابل جا رہے تھے۔ ان کے ہمراہ کچھ اور بھی لوگ تھے کہ اچانک ان کی کشتی ایک چٹان سے ٹکرا گئی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں بہت سی کشتیاں اس چٹان سے ٹکرا کر تباہ ہو چکی تھیں۔ اس وقت کشتی میں سوار ہر فرد اپنی زندگی سے مایوس تھا کہ اچانک سب نے دیکھا کہ ایک شخص کشتی کے کنارے پکڑا ہے اس کے ظاہر ہوتے ہی کشتی میں سوار تمام لوگوں کو محسوس ہوا کہ ان کی کشتی آگے بڑھنا شروع ہوئی اور اس چٹان سے ہٹ کر چشم زدن میں کنارے سے آ لگی اور وہ شخص غائب ہو گیا۔ اس وقت شیخ نظام پانی پتی کے علاوہ ہر فرد محو حیرت تھا سب نے ان سے پوچھا کہ یہ بزرگ کون تھے جن کی بدولت خطرہ ٹل گیا تو وہ بولے کہ یہ شاہ اعلیٰ تھے۔ سب لوگ بڑے متعجب ہوئے اور حضرت کی تعریف کرنے لگے مگر جونہی شیخ نظام کابل سے واپس وطن پہنچے تو حضرت نے انہیں دیکھ کر بڑی برہمی سے کہا۔ "نظام! پیر اپنے مریدوں کی مدد ہر جگہ کر سکتا ہے مگر مرید کو یہ زیب نہیں دیتا کہ ہر کسی پر پیر کا نام ظاہر کرے۔"
ایک مرتبہ کئی لوگ جو حضرت کی کرامات کے قائل نہ تھے آپ کو آزمانے کے خیال سے روانہ ہوئے ایک نے کہا کہ حضرت اگر حلوہ کھلا دیں تو مانوں دوسرا بولا کہ بھنا ہوا مرغ کھلا دیں جب تسلیم کروں تیسرا اٹھا اور بولا بھائی سب موسمی چیزیں ہیں بات تو جب ہے جب حضرت بے موسم کا ولائتی خربوزہ کھلائیں تب میں ان کی بزرگی کا قائل ہو جاؤں۔ یہ تینوں جونہی خدمت اقدس میں پہنچے حضرت نے حلوہ اور بھنا ہوا مرغ سامنے رکھا اور تیسرے آدمی سے بولے: "اے فرزند تو نے اگرچہ بے موسم کی چیز مانگی ہے مگر اللہ تعالیٰ کے کرم سے وہ بھی آنے والی ہے" ابھی آپ نے اتنا ہی کہا تھا کہ آپ کا مرید جو مدت سے ولایت گیا ہوا تھا اچانک لوٹ آیا اور ولائتی خربوزے پیش کئے۔

حضرت نے ایک سو پچیس برس سے زیادہ عمر پائی آپ کے دو فرزند پیدا ہوئے مگر دونوں سامنے ہی وفات پا گئے تو حضرت نے اپنے پوتے حضرت شیخ محمد کی پرورش کی اور اپنے سامنے ہی خلافت عطا کی۔ آپ کا وصال پچیس ربیع الاول ۱۰۳۲ھ کو ہوا دس برس بعد آپ کی مریدہ مسماۃ روشنائی صاحبہ نے روضہ کی تعمیر کے لئے سنگ سرخ بھیجا ابھی روضہ کی تعمیر شروع ہوئی تھی کہ تعمیرات کے ٹھیکیدار نے خواب دیکھا کہ حضرت فرما رہے ہیں کہ ایک اینٹ صندوق کا تختہ توڑ کر میرے بائیں زانو پر گر پڑی ہے اسے فوری باہر نکالو۔ یہ خواب سن کر روشنائی صاحبہ نے اکابرین شہر اور حضرت کے مریدوں کو جمع کیا ان سب نے جب صندوق کھولا تو خواب کے مطابق اینٹ حضرت کے بائیں زانو پر پڑی تھی جسے باہر نکالا گیا۔ اس وقت حضرت کے وصال کو دس برس ہو چکے تھے مگر جسم صحیح و سالم اور چہرہ منور تھا۔ رخِ انور کی زیارت کے بعد فاتحہ پڑھ کر مرقد مبارک کو درست کر کے تعمیر کا کام شروع کیا گیا اور روضہ مقدس آج تک زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

ا۔ خوف یہ ہے کہ دوزخ کے ڈر سے گناہ ترک کر دے
اا۔ رجا یہ ہے کہ بہ غرضِ جنت خدا کی طاعت کرے۔
ااا۔ محبت یہ ہے کہ اپنی ذات کو رضائے الٰہی کے لئے وقف کر دے

خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ

## غزلیں

### راشدہ فردوس

اے چاند! ڈوب جا کہ طبیعت اداس ہے
دل اور نہ جلا کہ طبیعت اداس ہے

ہم بھول جائیں جس سے زمانے کی تلخیاں
مُطرب وہ گیت گا کہ طبیعت اداس ہے

ہر سُو چمن میں لالہ و گل کا ہجوم ہے
اے دوست! لوٹ آ کہ طبیعت اداس ہے

پھر دل میرا ہے آگ میں جلنے کو بیقرار
برقِ نظر گرا کہ طبیعت اداس ہے

مدت سے کشمکش سے ہے محروم زندگی
طوفاں کوئی اٹھا کہ طبیعت اداس ہے

تاریکیٔ حیات کا کچھ تو علاج ہو
دل کا دیا جلا کہ طبیعت اداس ہے

شاید تری نوا ہی پیامِ نشاط ہو
فردوس گنگنا کہ طبیعت اداس ہے

### محسنہ صدیقی

حادثے ساتھ ساتھ چلتے ہیں — لاکھ ہم راستے بدلتے ہیں
مُسکرائیں گے بیٹھ کر کچھ دیر — آیئے میکدے میں چلتے ہیں
اُٹھ جاتے ہیں ہم مقابل سے — آپ کیوں اپنا رُخ بدلتے ہیں
تیری محفل میں روشنی کے لیے — کیسے کیسے چراغ جلتے ہیں

توڑ کر رشتۂ وفا محسنہ
آج تک وہ بھی ہاتھ ملتے ہیں

## آواز دے کہاں ہے!

میرا آئیڈیل ایک اسمارٹ، پرکشش اور روشن خیال، معقول آمدنی والا شخص ہے اگر بزنس مین ہو تو زیادہ اچھا ہے۔ شکی اور لالچی ہرگز نہ ہو۔

میری عمر ۲۲ سال ہے، دراز قد، خوبصورت اور پرکشش شخصیت کی مالک ہوں انٹر کا امتحان دیا ہے خدا کرے میری آواز میرے آئیڈیل تک پہنچ جائے۔

زینب ۔ کراچی

## ہے کوئی؟

ہے کوئی جو میرے وطن میں بستے ہوئے انسانوں کو مہکتے گلزار میں بدل دے۔ میں ایک ایسے جرأت مند انسان کی آواز سننا چاہتی ہوں جو میری ماں کے کاندھوں کا بوجھ ہلکا کر کے ہم غریبوں میں زندہ رہنے کا حوصلہ پیدا کر دے، اسلامی ممالک میں رہتا ہو تو اچھا ہے۔

میں ایک تعلیم یافتہ، پرکشش لڑکی ہوں صرف ایک جرأت مند انسان کی منتظر ہوں جو میری منزل کا تعین کر دے۔

تنزئین ۔ رحیم یار خان

## م ، ر ، د

ذرا "مرد" کے ہجے پر غور کیجئے۔ "م" سے مکار "ر" سے ریاکار اور "د" سے دغاباز نکلیں۔ مجھے ایسا مرد ہرگز نہیں چاہیے۔ دل بار بار کہتا ہے کہ سارے مرد اس تعریف میں آتے ہیں۔ کیونکہ میں خود معاشرے کی ایک ستم رسیدہ لڑکی ہوں۔ کبھی کبھی دل کہتا ہے پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اسی جذبے کے تحت میں اپنے آئیڈیل کو آواز دے رہی ہوں۔ مجھے صرف ایک پرخلوص شخص کی تلاش ہے جس کے سامنے میں بیٹھ کر میں اپنے سارے دکھ بھول جاؤں۔

غزالہ علوی ۔ لاہور

## نوخیز کلی۔

مجھے ایسے شخص کی تلاش ہے جس نے کبھی کسی پر بری نظر نہ ڈالی ہو، مجھے دل کی گہرائیوں سے چاہے۔ عادات و اطوار مجھ سے ملتے جلتے ہوں سچا ہو، وہ کاروباری شخص ہو یا سروس کرتا ہو، مگر لالچی ہرگز نہ ہو۔ میں ایک غریب گھرانے کی شریف لڑکی ہوں۔ شکل و صورت خدا نے بڑی اچھی دی ہے۔ انتہائی سلیقہ مند اور تعلیم یافتہ ہوں کاش کوئی قدر دان مل جائے۔

عابدہ ۔ گوجرانوالہ

## ایک التجا

ایک پرخلوص شخص کی تلاش ہے جو مضبوط سہارا بن سکے میری دوست ملتان میں رہتی ہے۔ وہیں ان کے والدین کا کاروبار ہے۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔

حمیدہ سعید ۔ ملتان

## زندگی کا سوال

میرا آئیڈیل ڈاکٹر، بینک آفیسر، انجینئر یا پھر کسی اچھے عہدے پر فائز ہو عمر ۲۵ / ۳۰ سال، خوش شکل، آزاد خیال اور شریف ہو کچھ ضدی بھی لیکن شکی مزاج ہرگز نہ ہو۔ پشاور یا پنڈی میں مقیم ہو مگر پشاور میں رہتا ہو تو بہت اچھا ہے۔ میں ایک بزنس مین کی بیٹی ہوں، سنجیدہ، خوبصورت اور ماڈرن ہونے کے ساتھ ساتھ پنج وقتہ نمازی بھی ہوں۔ اگر میرا آئیڈیل مل جائے تو تمام زندگی اس کے قدموں میں گزار دوں گی۔

جبین ۔ پشاور شہر

## خوشیوں کا سال۔

میرا آئیڈیل خوبرو، دبلا پتلا، کلاس ون آفیسر، ڈاکٹر، انجینئر یا کوئی بزنس مین ہے۔ آزاد خیال، ماڈرن اور انتہائی اسمارٹ پٹھان، بلوچ یا راجپوت ہو، غیر ملک میں رہائش پذیر ہو تو زیادہ اچھا ہے۔ اگر میرا آئیڈیل مجھے اسی سال مل جائے تو میرے لیے یہ خوشیوں کا سال ہوگا۔

میرا تعلق ایک اعلیٰ بلوچ گھرانے سے ہے۔ عمر ۲۳ سال، ایف اے، ذہین، معصوم چہرہ، اونچا قد، دبلی پتلی نازک سی لڑکی ہوں۔

الف شیریں ۔ ڈیرہ غازی خان

## خوشگوار زندگی

مجھے صورت نہیں سیرت چاہیے، دولت نہیں ہم خیالی چاہتے کیونکہ میں ایک پڑھی لکھی لڑکی ہوں اور رشتہ اپنے بڑوں کی مرضی سے طے کر کے ایک خوشگوار زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ لالچی حضرات تکلیف نہ کریں۔

ارفہ، گجرات

## بچوں کا سہارا

ہے کوئی اللہ کا نیک بندہ جو میرے دو بدقسمت بچوں کو سہارا اور باپ کی شفقت دے۔ شکل و صورت میں قدرت کا حسین عطیہ ہوں، ایک نقشہ گورا رنگ، سیاہ بال، مناسب جسم، طبیعت میں سادگی، ذہنی سکون کے سوا دنیا کی ہر دولت میسر ہے۔ کاش کوئی آگے بڑھ کر ان معصوموں کے سر پر خلوص نیت سے ہاتھ رکھ دے۔

طاہرہ نورین، کراچی

## اک پردیسی

معزز گھرانے کی تعلیم یافتہ خوش شکل دراز قد لڑکی ہوں۔ دیارِ غیر جانے کی شوقین۔

میرا آئیڈیل کوئی آرمی آفیسر، آرمی ڈاکٹر، راجپوت، پٹھان، مغل حضرات زحمت فرمائیں۔ سنی العقیدہ ہونا ضروری ہے۔ لالچی اور شادی شدہ حضرات تکلیف نہ کریں۔

ش، ر، لائلپور

## ہزار ورنہ ڈیڑھ ہزار

میرا آئیڈیل ۲۸/۳۰ سالہ خوبرو صحت مند نوجوان ہے۔ آمدنی ہزار یا ڈیڑھ ہزار ماہانہ ہو۔ شکی مزاج ہرگز نہ ہو۔

میں یوپی کے اعلیٰ پٹھان خاندان کی چشم و چراغ ہوں۔ عمر ۲۲ سال، تعلیم میٹرک، جہیز حسبِ حیثیت دیں گے۔

ش، ا، کراچی

## ڈاکٹر یا انجینئر

صاف ستھرے ذہن کا مالک ہو۔ عورت کی عظمت کا قائل ہو، عمر ۳۰/۳۲ سال تک ہو، ڈاکٹر یا انجینئر ہو۔ میں ایک امیر خاندان کی بی اے کی طالبہ ہوں۔ پُرکشش، دلکش اور سلیقہ مند۔

شب خیز زمند، کراچی

## تہی دست

دراصل میرا آئیڈیل کوئی سونے کی دیوار نہیں، بےشک غریب ہو مگر مہذب ہو۔ جھوٹ سے واسطہ نہ رکھتا ہو۔ بس خوشگوار ازدواجی زندگی کے خواب جانتا ہو۔ میں کیانی خاندان کی ایک خوش شکل، تعلیم و تربیت سے آراستہ لڑکی ہوں۔ رشتہ والدین کے توسط سے ہونا ضروری ہے۔ اگر کیانی یا ککّڑ خاندان سے تعلق ہو تو خوب۔

الیس ناز کیانی، پشاور

## صرف چاردیواری

میں ایک بدنصیب مطلقہ عورت ہوں۔ میرے شوہر نے عیاشی کی خاطر دوسری شادی کر لی۔ نجانے میرے بچوں کو اس بھری دنیا میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ کوئی میرے بچے کو باپ کا پیار دینے کے لیے تیار ہو تو میں بھی کسی کے معصوم بچوں کو ماں کا پیار دوں گی۔ میں دکھی عورت ہوں۔ خدا نے مجھے سب کچھ دیا ہے۔ صرف تقدیر کھوٹی ہے۔ تعلیم بی اے تک، ریڈیو اور ٹی وی پر کام کر کے بچے کو تعلیم دلوا رہی ہوں۔ اپنی طبیعت پر جبر کر کے گھر کی چاردیواری سے قدم نکالا ہے۔ کاش مجھے چاردیواری پھر مل جائے۔

شان، لاہور

## گھریلو بیوی

تعلیم میٹرک، عمر ۲۰ سال، ایک غریب لڑکی جس کو صرف خوشی کی تلاش ہے۔ خانہ داری میں ماہر، شکل و سیرت میں یکتا۔ ایک غریب لڑکی بھی خوشی، محبت اور خدمت کے سوا دے بھی کیا سکتی ہے۔

نسیم زہرہ، کراچی

## بگڑے نواب

میں ایک امیر کبیر گھرانے کی چشم و چراغ ہوں۔ میری والدہ جرمن ہیں جو کہ اسلام قبول کر چکی ہیں۔ یوں تو میرے بہت سے کزن ہیں لیکن ان میں وہی نوابی خُو بُو باقی ہے جس کو میں ناپسند کرتی ہوں۔ میں طبعاً انتہائی سادگی پسند ہوں۔ شکل و صورت کے لحاظ سے میں اتنا عرض کرنا کافی ہوگا کہ مشرق و مغرب کا حسین امتزاج ہوں۔ عمر ۱۹ سال، تعلیم بی اے، قد ۵ فٹ ۲ انچ۔

میرا آئیڈیل شریف خاندان کا دراز قد، چمکیلی آنکھوں والا تعلیم یافتہ شخص ہے۔ عمر ۲۶/۲۷ سال ہو۔ جس کو میرے ابا حضور او۔کے کر دیں۔

شہزادی ماہ گل، کراچی

## شرطِ اوّلیں — ملتان!

میرا آئیڈیل اعلیٰ تعلیم یافتہ، خوش مزاج اور پرکشش آنکھوں والا نوجوان ہے جو کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو۔

میں ایک معزز خاندان کی ایک سمارٹ لڑکی ہوں، عمر ۱۸ سال۔ اس سال بی اے کا امتحان دیا ہے۔ گوری رنگت، بڑی اور پرکشش آنکھیں، مناسب قد اور تیکھے نقوش ہیں۔ ملتان میں رہنے والوں کو میرا خاندان ترجیح دے گا۔

شاہدہ خانم، ملتان

## شاہین

اچھے کردار، بلند اخلاق، ۳۰/۳۸ سالہ شاہین کی تلاش ہے مگر فضائیہ تعلق شرط نہیں صرف شرط ہے۔

عائشہ شیخ، کراچی

## خواہش دیرینہ

لااُبالی سا، مناسب قد اور کشادہ سینے والا نوجوان میری پسند کا معیار ہے۔ سینے پہ بال ہوں تو کیا کہنے۔ مسکراتا ہوا خوبصورت چہرہ اور فیشن ایبل ہونے کے ساتھ ساتھ فراخ دل بھی ہو۔ ڈاکٹر یا انجینئر ہو تو بس میرے دیرینہ خواب حرف بحرف پورے ہو جائیں۔

میں مناسب قد اور سانولے رنگ کی دوشیزہ ہوں۔ اس کے والدین میرے

والدین سے اجتناب کریں۔ شروت، روہڑی

## دستک کی منتظر

مجھے ایسے کی تلاش نہیں بلکہ ایک معقول ساتھی کی ضرورت ہے جو اتنا معتمد ہو کہ مجھے اس کے سامنے میں بیزاری کا احساس ہو سکے فی الحال کوشش رہتی ہو۔ مہربان اتنا ہو کہ میری غلطیوں اور سوال کا جواب کو نظر انداز کر دے۔

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی معتمد اور سیدھی سفید و شیریں ہوں۔ قد قد پانچ فٹ ایک انچ، خانہ داری میں ماہر ہوں۔ والدین کا گھر بھی میرے دم سے جنت بنا ہوا ہے اور اپنا گھر بھی جنت بنا دوں گی۔ آنکھوں میں انتظار کے دیپ جلائے راہ تک رہی ہوں۔ نیلم خان، کراچی

## دُکھ کا درمان

سلجھے ہوئے ڈاکٹر یا انجینئر کی تلاش ہے یا پھر کوئی غیر ممالک میں رہائش پذیر ہو۔

کافی عرصہ قبل والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ میری بہن نے ایف ایس سی کیا مگر نمبر کم ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر نہ بن سکیں اور بی ایڈ کر کے ٹیچر ہو گئیں۔ ورثہ میں انہیں چار مکان ملے ہیں۔ اُن کی اداسی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ کاش کوئی ان کی اس سسکتی زندگی کو مسکراہٹوں میں تبدیل کر دے۔

صفیہ حبیب اللہ خان، کراچی

## قدرت کا شاہکار

جی ہاں تعریف اس خدا کی جس نے مجھے بنایا۔ اس سے زیادہ اپنی تعریف میں کیا کروں۔ عمر ۱۸ سال، تعلیم میٹرک۔ میرا آئیڈیل دراز قد، چوڑا چکلا سینہ، بھرپور جسم، مضبوط بانہیں، بڑی بڑی مونچھیں، خوش اخلاق، خوش مزاج۔ غرض ہر صفت ہو اور جو نام کرنے ہر اعلیٰ عہدے پر فائز ہو۔ تعلیم کی کوئی قید نہیں۔

عالیہ مہ جبین، ڈگری

## نکھری رنگت

میرا آئیڈیل کالا ہو، مستقبل میں بزنس کرنے یا اعلیٰ افسر بننے کی صلاحیتیں رکھتا ہو۔ وہ صرف میرے لیے اور میں اس کے لیے زندہ رہوں۔ میں ایک امیر خاندان پٹھان خاندان کی بیٹی ہوں۔ صوم و صلوٰۃ کی سختی سے پابند۔ نہایت حساس دل کی مالک، خوش مزاجی میں مشہور، عمر ۱۸ سال، ایف اے کی طالبہ ہوں۔ آنکھ ناک سے درست مناسب قد۔ ریحانہ عراقی ۔ لاہور

## میرا قصور؟

ایک ایسے واقعہ سے میری زندگی پر کاری ضرب پڑی ہے جس کا میری ذات سے کوئی تعلق نہیں مگر میں اس کی لپیٹ میں آگئی ہوں اور احساس کمتری کا شکار ہو گئی ہوں۔ میری والدہ نادانی میں اپنے گھر بار کو چھوڑ کر چلی گئیں جس کی سزا میں بھگت رہی ہوں۔ ہمدردی تو ہر کوئی کرتا ہے مگر سہارا کوئی نہیں بنتا، یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ماں کی سزا بیٹی کو دی جائے۔ ہم تو وہ بدنصیب ہیں کہ ہماری ماں نے اپنی ذاتی مجبوریوں کو ہماری زندگی پر ترجیح دی تو لوگ ہمیں اپنے سائے میں جگہ دے سکتے ہیں۔ اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں تصور کرتی ہوں تو سسرال والوں کے طعنے سنائی دیتے ہیں، گھبرا کر اپنے ہی کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتی ہوں۔ کاش کوئی مجھے میرا قصور بتا دے۔ میں تو خود ایک باحیا، باکردار مشرقی لڑکی ہوں جو اپنی ماں کی مجبوریاں بھی منظر عام پر نہیں لا سکتی۔ کسی اچھے خاندان کی بہو بننے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ خود میرے عزیز سب کچھ جانتے ہوئے میری طرف نہیں بڑھتے۔ میں نے تو مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ شادی کے لفظ کو اپنی لغت سے نکال دوں گی، مگر والد صاحب کی تشویش اور بھائیوں کی پریشانی نے مجھے پھر سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کیا اتنی بڑی دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں جو میری ذات، میرے کردار اور میری دوشیزگی پر پورا پورا اعتماد کر کے معاشرے کے منہ پر بھرپور طمانچہ مارے۔

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی پڑھی لکھی ۲۲ سالہ لڑکی ہوں۔ میری ساری زندگی کتاب کی طرح کھلی ہے۔ واسطہ خدا کا صرف وہ لوگ میری طرف ہاتھ بڑھائیں جو میری ماں کی مجبوریوں کو نظر انداز کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ مجھے حاصل کرنے والے نوجوان کو اتنا یقین دلا سکتی ہوں کہ اسے زندگی بھر پچھتاوے کا احساس نہیں ہوگا۔ شگفتہ ناز، کراچی

## انسان شناس

میرا آئیڈیل ایسا شخص ہے جو ہمدردی اور خلوص کا پیکر ہو، زندگی کے پُر پیچ راستوں میں گزر چکا ہو، خلوص کی دولت سے مالا مال ہو۔ دراز قد ہو۔

میں ایک بھولی بھالی لڑکی ہوں، سانولی رنگت اور سیرت لاجواب ہے۔

غزالہ مسعود ۔ لاہور

## دل کی دستک

مجھے ایسے آئیڈیل کی تلاش ہے جو بیرون ملک برسر روزگار ہو تاکہ مجھے بیرون ملک سیر کا موقع ملے۔ تعلیم گریجویٹ، عمر ۲۵/۳۰ سال، شیعہ فرقے سے تعلق، روشن خیال اور قابلِ اعتماد ہو۔

میرا تعلق ایک معزز اور سلجھے گھرانے سے ہے۔ عمر ۱۸ سال، نکھرتا ہوا رنگ، شکل مناسب، صحت مند، ایف اے کی طالبہ۔ ز۔ مسعود ۔ کراچی

## عکس کا آئینہ

میرا آئیڈیل ایک روشن خیال، اسمارٹ اور باوقار نوجوان ہے جو پہلی ہی نظر میں بہترین تاثر دے سکے۔ دراز قد، بڑی بڑی آنکھیں، خوش مزاج و خوش لباس ہو۔ صاف رنگ، پرکشش خدوخال اور اچھے کردار کا مالک ہو۔ تنگ مزاج ہرگز نہ ہو [illegible] مکمل اعتماد کرے۔ جہیز کے لالچی حضرات نہ ہوں تو بہتر ہے۔ عمر ۲۵/۳۰ سال کے درمیان ہو۔

میں ایک متوسط پٹھان قریشی خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ میری عمر ۲۰ سال
ہے۔ تعلیم ایف اے، میرا قد دراز، بڑی بڑی نشیلی آنکھیں، رنگت گوری اور بے حد
... ہے۔ بچپن سے پیار جیسی نعمت سے محروم ہوں۔ مجھے ایسے آئیڈیل کی
تلاش ہے جو حقیقی پیار دے سکے۔ میں اس کی اتنی خدمت کروں گی کہ دیکھنے
والے رشک کریں۔ بیرون ملک والے تکلیف گوارا نہ کریں۔

ف۔ا۔ کراچی

شاہین سلطانہ کراچی کے نام:

تنخواہ پانچ سو روپے، فوجی ملازمت
رانا محمد لطیف اقبال۔ ٹیم کمپنی ہیڈکوارٹر ایس ایس جی
معرفت ایس، پی، پی، او نمبر ۱۱۔ پاک آرمی

---

میں ۲۲ سالہ خوبصورت زمیندار ہوں۔ اپنا ذاتی کاروبار بھی ہے۔
ملک سعید جاوید، چاہ شیرے والا جنوبی
نزد انصار کالونی، بدرسنت روڈ، ملتان شہر

این، پی زیدی لاہور کے نام!

زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اس وقت بطور گورنمنٹ کنٹریکٹر
کلاس اے مختلف پراجیکٹس پر کام کر رہا ہوں تب کو پی ایچ ڈی کرانے
کی ذمہ داری میری ہوگی۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔
محمد خان نیازی گورنمنٹ کنٹریکٹر
نیازی و چوہدری کنسٹرکٹرز اینڈ جنرل آرڈر سپلائرز (ہیڈ آفس چاہ نواب خیل)
مقام و ڈاکخانہ پائی خیل، تحصیل و ضلع میانوالی

الوینہ ثمینہ خان، سوات کے نام

واجبی شکل و صورت کا انسان ہوں۔ عمر یہی کوئی ۳۱ سال ہے اور تنخواہ
..۱۰ روپے۔ معزز پٹھان گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔
شاہد معرفت حیدر علی، اسٹور مین، چارسدہ شوگر ملز لمیٹڈ، چارسدہ (پشاور)

شاہانہ نازلی کے نام!

آپ کے بارے میں پڑھ کر متاثر ہوا۔ میں سنی مغل نوجوان ہوں۔ ایک
جگہ میں ملازم، تنخواہ تقریباً ایک ہزار روپے ماہانہ۔
محمد احمد مرزا معرفت جاوید مرزا۔ فرسٹ نیشنل سٹی بینک
آئی آئی چندریگر روڈ۔ کراچی

شازیہ کراچی کے نام!

تعلیم گریجویٹ، عمر ۲۰ سال، سرکاری ملازم، قبول صورت، ہزارہ کا

باشندہ ہوں۔ بشارت خان معرفت نصیر سگریٹ تمباکو فروش
چوک مین بازار۔ ایبٹ آباد۔ ہزارہ

---

عمر ۲۲ سال، تعلیم میٹرک، پرائیویٹ فرم میں بطور سیلزمین ملازم ہوں
تنخواہ ۴۵۰ روپے، کافی شہری جائداد، خود مختار ہوں۔
مرزا حامد بیگ، مکان نمبر اے، بی ۔ ۴۵۲
گلی نمبر ۱، محلہ موہن پورہ۔ راولپنڈی

---

نیوی میں ملازم ہوں، تنخواہ ۸۰۰ روپے ماہانہ، عمر ۲۰ سال، تعلیم انٹر۔
سلیم شہزاد، مکان نمبر ۲/۲۰۲ جی۔ پاکستان نیوی ... 
ماری پور، حب ندی روڈ۔ کراچی

---

سیر و تفریح کا شوقین، موسیقی سے دلچسپی اور جہیز سے نفرت ہے، سرکاری
ملازم عمر ۲۳ سال، معقول تنخواہ، تعلیم ایف اے۔ رنگ سانولا۔
ایم اقبال معرفت ماسٹر عبدالرشید۔ مکان نمبر ۲۰ سی
عالمگیر روڈ۔ شیر شاہ کالونی۔ کراچی ۲۷

فائزہ وقار، سرگودھا کے نام!

آپ کے خیالات پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ عمر ۲۵ سال، تعلیم یافتہ، معقول
تنخواہ، زمیندار گھرانے سے تعلق ہے۔
ظفر اقبال آفیسر یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ، اسار مارکیٹ منگورہ، سوات

---

ایئر فورس میں آفیسر، زمیندار، تعلیم بی اے۔ جس کی آپ کو تلاش ہے میں
وہی ہوں۔ فضل السلطان ملک معرفت طارق کریانہ شاپ
غلہ منڈی جوڑالی۔ تحصیل خوشاب، ضلع سرگودھا۔

---

عمر ۱ سال۔ ماں کا اکلوتا۔ سرکاری ملازمت تنخواہ ۸۰۰ روپے ماہانہ، میرا تعلق اعلیٰ خاندان سے ہے۔ جمال احمد معرفت جاوید اختر دیبک
مکان نمبر ۲۶۵۸ - محلہ جوگن شاہ۔ علاقہ ڈبگری، پشاور شہر

---

فرنیچر کا کاروبار آمدنی تقریباً ایک ہزار سے ڈیڑھ ہزار، عمر ۲۳ سال تعلیم میٹرک آپ کی شخصیت مجھے پسند آئی۔ خدا کا دیا سب کچھ ہے جہیز کی حاجت نہیں۔
مستری ناظم الدین ٹھیکیدار، مکان نمبر ۲۴۱۰
محلہ سروری، علاقہ یکہ توت، پشاور شہر

ادم۔ کراچی کے نام!
میں ایک کامیاب بزنس مین ہوں۔ تعلیم یافتہ خوبصورت اور بہت سمارٹ
منصور حسین روم نمبر ۴۷۔ باسی چیمبرز، رابسن روڈ۔ کراچی

---

میں ایک اہم عہدے پر فائز ہوں۔ عمر ۲۵ سال۔
کنور نازعالم۔ پی، او بیلہ (لسبیلہ)

---

خوبرو، دراز قد، ۲۲ سالہ انجینئر۔ آپ کا آئیڈیل ہوں۔
میاں سلطان، ہائی سکول لاوا۔ براستہ میانوالی

---

میں آپ کے معیار پر پورا اترتا ہوں، عمر ۲۳ سال، پیشہ ڈاکٹر، تنخواہ ۱۵۰۰/- روپے ماہانہ۔
لیاقت علی اپارٹمنٹ نمبر ۲۳۔ ڈاکٹرز میس، جناح ہسپتال۔ کراچی

شمائلہ انجم کے نام!
میری تنخواہ پانچ ہزار روپے ہے، عمر ۲۶ سال۔ مجھے آپ کے خط نے بہت متاثر کیا۔ شفیق احمد، پوسٹ بکس ۳۰۱۶، ابوظہبی (یو اے ای)

---

ایک امریکن کمپنی میں اچھی پوزیشن پر ملازم ہوں، عمر ۲۴ سال۔
اے نکے بٹ، پوسٹ بکس نمبر ۱۳۲ - ابوظہبی (یو اے ای)

شاہینہ ناز کے نام!
عمر ۲۳ سال، تعلیم ایف اے، مزید تعلیم کا از حد شوق رکھتا ہوں، اس وقت میں فوڈ گرین سپروائزر کے عہدے پر فائز ہوں۔
صابر جرچ۔ مکان نمبر ۲۰-۸ بلوچی اسٹریٹ۔ برجہ لال روڈ۔ کوئٹہ

ر۔ب، ملتان کے نام!
آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔ ذاتی کاروبار، خدا کا دیا سب کچھ ہے۔
اقبال حسین معرفت سلیم جنرل اسٹور، مین بازار، مظفر گڑھ۔

---

میں سید شبیر خاندان سے ہوں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھے عہدے پر فائز ہوں۔ آپ کی دوسری شرائط پر بھی پورا اترتا ہوں۔
ح۔ بشش معرفت محمد ہارون۔ نیشنل بینک آف پاکستان
ہیڈ آفس انسپکشن ڈویژن۔ پی آئی اے [illegible] آفس
ڈاکٹر ضیاء الدین روڈ۔ کراچی

شازیہ لاہور کے نام!
میں ایک خوبصورت پرکشش ۲۴ سالہ نوجوان ہوں۔ تعلیم بی اے سرکاری ملازم ہوں۔ کاش آپ میری زندگی میں قوس قزح کا رنگ بھر دیں!
خورشید احمد۔ ملٹی سٹوری بلڈنگ ۵۱
۱۰ - ایریا۔ پی او ایف واہ کینٹ راولپنڈی۔

شہر یانو کراچی کے نام!
عمر ۲۲ سال بی کام کا طالب علم ہوں اور ملازم بھی ہوں۔ زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے میں کوشاں ہوں۔
شہزاد درانی۔ سروس ڈیپارٹمنٹ، پوسٹ بکس ۲۷۰۹۔ کراچی

---

سرکاری ملازم تنخواہ ۵۰۰/- روپے ماہوار۔ گوجرانوالہ کا رہنے والا، عمر ۲۰ سال۔ بی اے کا طالب علم ہوں اور معزز گھرانے سے تعلق ہے۔
نعیم بٹ معرفت چوہدری محمد اسحق
اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ پی آئی سی بلڈنگ، پوسٹ بکس ۳۴۴۴ لا

فاخرہ پرویز۔ ملتان کے نام!
معزز سید زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ پڑھا لکھا ہونے کے ساتھ ساتھ کافی زرعی زمین اور ایک عدد کوٹھی کا واحد مالک ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری شخصیت آپ کے آئیڈیل سے مطابقت رکھتی ہے۔
ایس ارشد محمود۔ پنجاب فارم، جینیرٹ روڈ۔ منڈی بھٹیاں ضلع گوجرانوالہ

---

آپ کے خیالات پڑھ کر کافی متاثر ہوا ہوں۔ ذاتی کاروبار ہے۔ سید خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔
جاوید معرفت محمد اسلم بیگ، ملتان الیکٹرک سپلائی کارپوریشن، بشیر شاہ روڈ۔ ملتان

بلقیس ساہیوال کے نام!
تعلیم میٹرک، عمر ۲۸ سال، کپڑے کی دکان ہے۔ زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ شادی شدہ ہوں۔ بہت ہی حساس انسان ہوں۔ علاوہ ازیں جو پیار مجھے اپنی بیوی سے نہ ملا اس پیار کا متلاشی ہوں۔
ملک محمد یوسف، مقام و ڈاکخانہ سیر پید، تحصیل چکوال۔ ضلع جہلم

روبینہ کراچی کے نام!
میں شادی شدہ تقریباً ۲۵ سال کا نہایت تنومند اور خوبصورت انسان ہوں اور تقریباً ۵۰۰ روپے ماہانہ تنخواہ ہے۔

چودھری نذیر احمد سب انسپکٹر ایم سی پی۔ ہسپتال روڈ کیمبل پور

---

عمر ۳۰ سال ہے [illegible] ہزار روپے پاکستانی ہے۔
شادی شدہ ہوں مگر ایک اچھی بیوی کی ضرورت ہے۔

H.S.P.E c/o P.O. BOX NO: 434
GEORGE WHKEY ARMY COMPIZKI MUSCAT & OMAN

رانی تبسم، سکھر کے نام!
مسقط کی آرمی میں ڈرائیور ہوں۔ تنخواہ ۔/۳۰۰۰ روپے ماہوار
ناگ محمد کریم ۔۔۔ ایم ٹی فضا گارڈ یونٹ مولا افغار مسقط سلطنت عمان

---

میں نے دکھوں کو سینے سے لگایا ہے۔ ایک مقامی فرم میں اسٹینو ہوں۔
تنخواہ ۔/۹۰۰ روپے ماہوار۔ جہیز کا لالچ نہیں۔
عزیز اللہ بٹ۔ مکان نمبر ۱۹۔ آر اے بازار نوشہرہ صدر

سبرینہ، لاہور کے نام!
میرا کھاتے پیتے معزز گھرانے سے تعلق ہے۔ خوب صورت، نیک سیرت
ٹیکنیکل کام کا ماہر تعلیم میٹرک، عمر ۳۰ سال۔
عبدالسعید طاہر نعیم الیکٹرک اسٹور صدر بازار، کمالیہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ

---

میرا تعلق آرائیں زمیندار گھرانے سے ہے۔ پانچ سال سے دوبئی میں
مقیم ہوں، ذاتی کاروبار اور عمر ۲۴ سال ہے۔
چودھری محمد لطیف، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۰۵۔ ڈیرہ۔ دوبئی

عندلیب ناز کے نام!
آپ کی تحریر نے متاثر کیا۔ میٹرک پاس غریب ہوں کلفٹن رہتا ہوں اور ۔/۵۰۰
روپے ماہوار پر ملازم ہوں خدا نے سب کچھ دیا ہے۔ جہیز کی ضرورت نہیں۔
غلام مرتضے اظہر۔ ڈائمنڈ انڈسٹریز
ایس ۸/اے۔ ایس آئی ٹی ای۔ کراچی ۱۶

---

روشن خیال اور اچھے گھرانے کا فرد ہوں۔ ذاتی کاروبار، تعلیم میٹرک۔
ملک حسین۔ گاؤں کبوہ، ڈاکخانہ پنج غلام۔ تحصیل و ضلع پشاور

---

ایک مل میں فٹر ہوں۔ تنخواہ ۔/۱۰۰۰ روپے۔ جہیز سے نفرت ہے۔
آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔
آفتاب سعید، فوراً تی نکسال۔ عرب محلہ۔ بلدیہ ٹاؤن۔ کراچی ۲۸

---

[illegible] زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ تعلیم ایف اے عمر ۲۲ سال
ابوظہبی [illegible] ت، معقول تنخواہ۔ وقار اعوان
معرفت محمد اسحق۔ ڈیفنس انجینئرنگ فورس، پوسٹ بکس ۳۹۱۔ ابوظہبی

---

ایم اے پریویس کا طالب علم ہوں، اچھے گھرانے سے تعلق ہے شکارپور
کا ہوں۔ شیخ خورشید اللہ۔ ۲۳ اے ای یونٹ ۱۔ لطیف آباد حیدرآباد

---

جہیز کا لالچ نہیں عمر ۲۱ سال ہے۔ امریکن سفارت خانہ میں ۔۔۔ سو پچاس روپے
پر ملازم ہوں۔ تعلیم انٹرمیڈیٹ۔
ایس ایم اقبال۔ یو ایس اے اسٹاف ہاؤس۔ ایکسی بنگلہ ۱۸۸
سیکٹر جی ۲/۶/۱۔ اسٹریٹ ۸۸۔ اسلام آباد

بلبل، کراچی کے نام!
میں بھی آپ کی طرح دکھی ہوں۔ سرکاری ملازم ہوں ماہانہ تنخواہ ۔/۴۰۰
روپے، تعلیم ایف اے۔ رنگ سانولا۔ جہیز پر لعنت بھیجتا ہوں۔
ایم ایم عالم معرفت فیوئلنگ سپرنٹنڈنٹ عبدالرشید بٹ
پاکستان برما شیل کمپنی۔ ایئرپورٹ، کراچی

---

مکہ میں سول انجینئر کی حیثیت سے ملازم ہوں۔ عمر ۲۵ سال تنخواہ ۔/۴۰۰۰
روپے ماہانہ۔ اے ایچ خان۔ ص ب ۱۳۳۵ مکۃ المکرمہ (سعودی عرب)

ن، حق کراچی کے نام!
میں سید گھرانے کا لڑکا ہوں۔ معقول آمدنی، الباقد اچوڑا سینہ، اسمارٹ اور
خوب رو۔ مجھے امید ہے کہ آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔
عمران، پوسٹ بکس نمبر ۷۵۹۰۔ کراچی

---

معزز پنجابی خاندان کا فرد ہوں۔ پی آئی اے میں معقول تنخواہ پر
ملازم ہوں اور ایم اے کا پرائیویٹ طالب علم بھی ہوں۔
آصف معرفت چودھری حنیف ایل ایم ۱۰۔
پی آئی اے کالونی۔ کراچی ایئرپورٹ، کراچی

فرحت افزا، سیالکوٹ کے نام!
بی اے کا طالب علم ہوں۔ عمر تقریباً ۲۰ سال۔
میاں مکان نمبر ڈی۔ ۱۴۲۔ حسرت موہانی کالونی۔ بڑا بورڈ
شکور پیر روڈ۔ کراچی

---

سوئی گیس میں ۔/۱۹۰۰ روپے پر ملازم ہوں۔ قوم شیخ راول۔

اشرف طاہر قذافی۔ میڈ سپانسر دندہ شاہ بلاول۔ میانوالی

---

میں غریب محلہ، فوجی اور زمیندار خاندان سے تعلق ہے۔

حوالدار قمر الدین

پشین اسکاؤٹ۔ ۵۹ ونگ۔ چمن ہیڈ کوارٹر۔ تحصیل چمن

**سبرینا رضا کے نام!**

میرا تعلق آرائیں خاندان سے ہے۔ تعلیم میٹرک، عمر ۲۵ سال۔ رنگ گورا سائیکلوں کا کاروبار اور ذاتی مکان ہے۔ عبدالرحیم سہیل

مکان نمبر ۶۰۲۔ گلی نمبر ۵۰۔ کوتوالی محلہ، صدر بازار۔ لاہور کینٹ

---

آپ کے آئیڈیل کی جامع تصویر ہوں۔

ایس ایم اقبال۔ سپروائزر سیز۔ ٹیکسٹائل ملز ادکاڑہ۔ ضلع ساہیوال

**انجم رافی کے نام!**

میں تعلیم یافتہ اور صاحب جائیداد ہوں۔ عمر ۲۴ سال۔ آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔ ثناء اللہ جان

معرفت ڈاکٹر نصر اللہ جان۔ تخت بھائی، ضلع مردان

**شگفتہ نسرین، ساہیوال کے نام!**

عمان بحریہ میں ملازم ہوں۔ تنخواہ دو ہزار روپے، عمر ۳۰ سال، صاحب جائیداد ہوں، جہیز کی تمنا نہیں۔

عبداللہ مراد۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۷۰۔ مسقط عمان

---

تعلیم میٹرک تنخواہ ۴۰۰/- روپے، سرکاری ملازمت۔ شاید آپ میرے دکھ دور کر سکیں۔

جاوید قریشی۔ ۱۸ جی / ۴۰۶ پی او ایف، واہ کینٹ

---

میں آرائیں خاندان کا اکیس سالہ خوبصورت پُرکشش انسان ہوں، تعلیم ایف اے تنخواہ ۵۴۰/- روپے ماہانہ۔ سرکاری عہدے پر فائز ہوں۔

مشتاق احمد شاد انسپکٹر آئی۔ آر۔ ڈی۔ پی

ماناحلانی ڈاکخانہ خاص، تحصیل و ضلع ڈیرہ غازی خان

---

عارف والا کے ایک چک کا زمیندار ہوں۔ تعلیم میٹرک۔ عمر ۲۶ سال۔ گورنمنٹ ملازم ہوں۔ ماہانہ تنخواہ ۵۰۰/- روپے

خان محمد ولد عاشق محمد چک نمبر E-B/337

ڈاکخانہ چک نمبر E-B/153 تحصیل پاک پتن ضلع ساہیوال

---

جب سے آپ ڈیڈی کو دیکھنے آرہے ہیں میرے دل میں بھی درد سا اُٹھنے لگا ہے

---

میں آپ کا آئیڈیل ہوں۔

امتیاز حسین معرفت عبدالقدوس علوی آڈیٹر

آفس آف دی اکاؤنٹنٹ جنرل۔ ایم ڈبلیو ایف پی۔ پشاور

---

ایک مل میں سپروائزر اور یوسف زئی خاندان کا فرد ہوں ماہانہ آمدنی ۶۰۰/- روپے اور عمر ۲۱ سال ہے۔

رئیس خان، سپروائزر علی اصغر ٹیکسٹائل ملز کورنگی۔ کراچی

---

بلاشبہ آپ ہی میرے حسین خواب کی تعبیر ہیں۔ عمر ۲۱ سال۔ تعلیم انٹر دسمبر میں ابوظہبی جانے کا ارادہ ہے۔ عزیزالرحمٰن صدیقی

مکان نمبر جی۔ ۱۲۷ آصف کالونی، شکور پیر روڈ۔ کراچی ۱۲

---

میں آپ کے خیالات سے متفق ہوں۔ تنخواہ تقریباً پانچ ہزار روپے عمر ۲۲ سال ہے۔ ایم اے

معرفت مصبغتہ خیطان الجدید۔ شارع سوق، خیطان الجدید، کویت

---

آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں ماشاءاللہ کا دیا سب کچھ ہے۔

ایس ناشاد معرفت ہیرا ڈائز ہیر سیلون۔ کوٹلی۔ آزاد کشمیر

---

مجھے جہیز کی ضرورت نہیں۔ آپ جیسی غریب باپ کی بیٹی کی ضرورت ہے

ہداد حسین۔ انچارج سب آفس لورالائی

---

سرکاری ملازمت۔ تنخواہ ۲۸۵/- روپے۔ تعلیم آٹھویں جماعت پاس۔

سپاہی نذیر احمد۔ پولیس لائن نمبر ۲۔ بیکورٹی فورس۔ ملتان

شاید میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں۔ ترجمانی کرتا ہوں۔ عمر ۲۲ سال۔
عبدالرزاق۔ سوار بریالی سناء اللہ خان، تحصیل پھالیہ، ضلع گجرات

---

معزز گھرانے سے تعلق ہے۔ عمر ۲۲ سال۔ پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں ہی آپ کا آئیڈیل ہوں۔
محمد شریف۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۲۵۰ - دوحہ قطر - عربین گلف

---

آپ کے خیالات کی تہہ دل سے قدر کرتا ہوں۔ تعلیم ایف اے۔ عمر ۲۱ سال۔ معقول تنخواہ۔
پرویز اقبال اعوان، ملٹری کیمپ BADAZAID ابوظہبی (یو اے ای)

---

میں گورنمنٹ ملازم ہوں۔ تنخواہ ۴۰۰/- روپے ہے۔ اکیلا ہوں، کوئی رشتہ دار نہیں۔
محمد ارشد، آرڈیننس ڈپو برانچ سلو/ایس ایس، کوئٹہ

---

عمر ۲۰ سال، مذہبی خیالات۔ اپنے گاؤں میں میڈیکل پریکٹس کرتا ہوں۔ خود کفیل ہوں۔ احمد یار ناصر، بنگلہ صالح، تحصیل دیپالپور، ضلع ساہیوال

**نسرین سوز، راولپنڈی کے نام:**

یہاں وزارت صحت میں ملازم ہوں۔ تنخواہ پانچ ہزار روپے ماہانہ۔ عمر تقریباً ۲۵ سال ہے۔
ایم ایچ۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۷۶۴ - مسقط، سلطنت عمان

---

عمر ۲۴ سال۔ تعلیم میٹرک۔ نجی کاروبار ہے۔ آپ کا ہم خیال اور پیار جیسی دولت کا بھوکا ہوں۔
ے حسین، ویلج کمبوہ، ڈاکخانہ پچا غلام، تحصیل و ضلع پشاور

---

عمر ۲۳ سال، ذاتی کاروبار، امیر آدمی نہیں مگر فکر معاش بھی نہیں۔
ایم بشیر ملک - ایم بشیر ملک اینڈ کمپنی
ڈسٹری بیوٹرز نیشن پاکستان لمیٹڈ، نیو ڈڈیال میرپور (آزاد کشمیر)

**تسنیم راحت، لاہور کے نام:**

لیبیا میں تجارتی ادارے میں ملازم ہوں۔ ماہوار تنخواہ تین ہزار روپے۔ عمر ۲۳ سال۔
محمد نواز معرفت محمد رمان
SHAHRA ZAWIET OBIED NO.14
BENGHAZI _ LIBYA

---

میری عمر ۲۴ سال، تعلیم میٹرک اور صاحب جائیداد ہوں۔ عمان میں ایک کمپنی میں ملازمت کرتا ہوں۔ تنخواہ تین ہزار روپے ہے۔
محمد شاکر خان
CEMENATION CO (JERSEY) LTD
MADINAT QABOUS PROJECT POST BOX 4035
RUWI MUSCAT SULTANAT OF OMAN

**ثمینہ شہاب، گجرات کے نام:**

تعلیم ایف اے۔ ایک پرائیویٹ فرم میں ۳۵۰/- روپے پر ملازم ہوں۔
رانا محمد یار۔ ۵ شاہ چینز ہاؤس - لاہور

---

میں متوسط گھرانے کا ۲۴ سالہ خوبصورت نوجوان ہوں۔ تعلیم بی اے۔ تنخواہ ۸۰۰/- روپے ماہوار۔
ضیاء الرحمٰن۔ رینج فارسٹ آفیسر، پارہ چنار، کرم ایجنسی

---

میری عمر ۲۴ سال، تعلیم بی اے اور ماہوار آمدنی تین ہزار روپے ہے
A.M. KHAN CEMENATION CO, P.O.BOX 4035
MADINAT QABOOS PROJECT RUWI MASCAT

---

ذاتی کاروبار، ماہانہ بچت چھ سو روپے، عمر ۲۳ سال
صدیقی معرفت فرنیچر ڈیلی میکر، اسپتال روڈ - طارق آباد

**ش ب - کراچی کے نام:**

میری عمر ۲۱ سال دو ماہ ہے۔ تعلیم میٹرک۔ عرصہ چار سال سے ٹیکنیکل کام کر رہا ہوں۔ بیرون ملک جانے کا پروگرام ہے۔
محمد اقبال ولد محمد سلیمان، بمقام چکوڑہ، ڈاکخانہ ادھروال، تحصیل چکوال

---

خوبصورت اسمارٹ اور گریجویٹ ہوں۔ عمر ۲۱ سال۔ غیر ملک جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔ کلیم قندانی۔ بلاک ۱۳ ڈیرہ غازی خان

---

میرا بھائی جس کی عمر ۲۶ سال ہے، خوبرو حسین تو نہیں البتہ اچھے خدوخال کا مالک ہے۔ نیشنل بینک میں ملازم اور ایم اے کا طالب علم ہے۔
نیلوفر قدوائی۔ بی ۱۰/۱۸ ایف سی ایریا۔ کراچی ۱۹

---

عمر ۲۲ سال۔ بی اے آنرز کا طالب علم ہوں۔
محمد الیاس مجاہد، مکان نمبر ایم/۷۹ مرکین کوارٹرز، حیدرآباد

## موسمِ بہار کے ساتھ ساتھ

# دوشیزہ میں بھی خوشگوار تبدیلیاں آرہی ہیں

اس دور کے اکثر بچے ایسی باتیں کر جاتے ہیں جن سے بڑوں کو اپنے چھوٹے پن کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ذہین بچوں کی معصوم باتیں ہمیں لکھ بھیجئے تاکہ ان بچوں کا اکیسویں صدی کے بچوں سے موازنہ کیا جاسکے۔ بچوں کی تصویروں کے ساتھ نام اور عمر بھی لکھئے۔

آپ کسی بھی فن میں مہارت رکھتے ہیں دفتر دوشیزہ میں تشریف لے آئیں۔ آپ کا خوبصورت انٹرویو تصویروں کے ساتھ شائع کر دیا جائیگا

خاتونِ اول بیگم عشرت کی کونسی بات آپ کو زیادہ پسند آئی — ؟

ہمسایہ کو آپ سے شکایات ہے یا آپ کو اپنے ہمسایہ سے شکایت ہے۔ تفصیل آپ لکھئے فیصلہ ہم کریں گے۔

وہ جو دوسروں کو اچھا مشورہ دیتے ہیں یا وہ جو اپنے دفن کر دیتے ہیں۔

ترقی یافتہ اقوام کا ہم سے موازنہ ؛

ہمیں ایسے ٹیلنٹس TALENTS کا نام اور پتہ بتلا دیجئے جو گوشہ گمنامی میں چھپے ہوئے ہیں۔ دنیا سے روشناس کرانا ہمارا کام ہے۔

بہت سی کہانیاں بچوں کو سنائی جاتی ہیں لیکن سبق بڑے بڑے حاصل کرتے ہیں۔ ان کہانیوں کو غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے

نئی نسل کیا چاہتی ہے ؟ نئی نسل ہم سے بدظن ہے یا ہم نئی نسل سے بدگمان ہوتے جا رہے ہیں

ہم وطنوں کے تحفظ اور ملک کی حفاظت کے لیے قربانیوں کی ضرورت ہے یا نہیں۔ ہمارا رجحان قربانی سے گریز کی طرف کیوں بڑھ رہا ہے ؟

وطن سے دور رہنے والے دوستوں کو وطن کی کون کونسی باتیں یاد آتی ہیں۔

ہر ماہ آپ ہم سے جھوٹ بولنے کی کوشش کیجئے۔ سال کے ختم پر ہم سب سے بڑے جھوٹے کو سب سے بڑا انعام دیں گے ؛

## آئیڈیل کی تلاش — دوشیزہ کا مقبول ترین کالم

| نااقابلِ فراموش سلسلے | اور |
|---|---|

دوشیزہ کی محفل اور بے شمار دلچسپ افسانے

دوشیزہ کی کہانیاں آپ کو سوچنے نہیں دیں گی ؛

بی اے فائنل کا طالب علم ہوں۔ معزز پٹھان فیملی سے تعلق ہے۔ عمر ۲۲ سال ہے۔ میرے نین نقش کابل کے کہسار نظر آتے ہیں۔
بادشاہ خاں معرفت آئی اوڈی او آفس۔ سوات

---

یاسمین۔ ساہیوال کے نام!
آپ کی تحریر کی انفرادیت نے متوجہ کیا۔ عمر ۲۴ سال، تعلیم میٹرک، ماہانہ آمدنی ۲۵۰/- روپے ہے۔ تنہا ہوں
ایم ایس عرفان ۲/۱۱۰۔ ڈرگ کالونی ملیر۔ کراچی ۲۵

---

آپ کی تحریر نے مجھے متاثر کیا ہے۔
جاوید پنجابی۔ محمدی ہوٹل۔ حیدرآباد

---

میری عمر ۲۸ سال ہے۔ ماہانہ آمدنی ۶۰۰/- روپے
محمد سعید معرفت کریانہ ٹریڈرز۔ ایف ۲۹ مارکیٹ روڈ۔ کراچی

---

عمر ۲۵ سال، گورنمنٹ ملازم ہوں۔ تنخواہ ۲۵۰/- روپے ماہوار، اپنی زمین بھی ہے۔ کے ایم صدیقی
معرفت فرینڈز ریڈیو اینڈ جنرل الیکٹرک سروس۔ ڈاکخانہ چوک شاہ والا۔ ضلع ساہیوال

---

آپ کی دکھ بھری تحریر نے بیقرار کر دیا ہے۔ میں موٹر مکینک ہوں، تعلیم میٹرک اور عمر ۲۳ سال ہے۔ جہیز کو لعنت سمجھتا ہوں۔
اسلم اعوان، قربان حسین موٹر گیراج
نزد گرین ہوم اسکول۔ پہلی چورنگی ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

---

میں کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں، تعلیم میٹرک، عمر ۱۹ سال اور تنخواہ ۳۲۰/- روپے ماہوار ہے۔ آپ ہی میرا آئیڈیل ہیں۔
صابر حسین جاوید
ڈاکخانہ و مقام بابو سیں، تحصیل گوجر خاں، ضلع راولپنڈی

---

شاید میں آپ کی پسند پر پورا اتروں۔
سلطان کے ارشاد معرفت سپاہی غلام حسین۔ این ایس۔ بی بی گلگت

---

میں زمیندار گھرانے کا فرد ہوں۔ عمر ۲۱ سال۔ آر بی اے۔ بمقام جاترپکے

ڈاکخانہ ... تحصیل فیروز والا۔ ضلع شیخوپورہ

---

میں میٹرک ہوں اور پی آئی اے میں ملازمت کرتا ہوں۔ تنخواہ معقول ہے
طاہر محمود معرفت منظور شیشے والے
فیضی اسٹریٹ ۳۵، مکان نمبر ۹۔ ساندہ خورد۔ لاہور

---

میں ۲۱ سالہ قبول صورت میٹرک پاس نوجوان ہوں۔ ۱۵۰ بیگھے زمین کا مالک ہوں۔ فاروق احمد اعوانی
مانہ اعوانی شہر۔ ڈاکخانہ خاص۔ تحصیل و ضلع ڈیرہ غازی خاں

---

شاہدہ۔ راولپنڈی کے نام!
میں ایک ٹریڈنگ کمپنی کا منیجر ہوں۔ تنخواہ پانچ ہزار روپے ماہانہ۔
افتخار احمد۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۴۴۔ بن غازی۔ لیبیا

---

لوم آرٹس۔ تعلیم بی اے۔ تنخواہ ۸۰۰/- روپے ماہوار اور زرعی زمین سے آمدنی ۵۰۰/- روپے ماہوار۔ میاں صدیق احمد
معرفت پبلک میڈیکل اسٹور۔ عارف والا۔ ضلع ساہیوال

---

آسیہ ممتاز۔ کراچی کے نام!
میں ابوظہبی میں وفاع میں الیکٹریشن ہوں۔ ایک ہزار ریال میری تنخواہ ہے۔ عمر ۲۲ سال اور تعلیم میٹرک ہے۔ امتیاز وجاہت
پوسٹ بکس نمبر ۳۰۹۔ میدانا ہوٹل کیمپ۔ ابوظہبی (یو اے ای)

---

آپ کے خیالات اور احساسات سے متاثر ہوا ہوں۔ مجھے دولت اور جہیز سے نفرت ہے۔ میری عمر ۲۲ سال ہے۔ تعلیم انٹر ہے۔ سرکاری ملازم ہوں۔ تنخواہ ۴۰۰/- روپے ماہوار ہے۔ ریاض احمد درانی
معرفت انڈسٹریل اکاؤنٹنٹ۔ فانا ڈی سی روڈ سک روڈ۔ پشاور صدر

---

شازیہ۔ پشاور کے نام!
میں آپ کے آئیڈیل پر پورا اترتا ہوں۔ عام گھرانے سے تعلق ہے۔ تعلیم ایف اے ہے۔ چھوٹا موٹا کاروبار کرتا ہوں۔
محمد شفا معرفت دفتر ایس ڈی ایم استور۔ استور خاص گلگت ایجنسی

---

میں اعلیٰ خاندان کا فرد ہوں۔ پروجیکٹ انجینئر کے عہدے پر فائز ہوں۔ ماہانہ آمدنی ۱۸۰۰/- روپے ہے۔ ۱۹۷۶ء کے آغاز میں امریکہ چلا جاؤں گا۔
پروجیکٹ انجینئر انجم رضا۔ کمرہ نمبر ۳۵۔ نیو ہال۔ انجینئرنگ یونیورسٹی۔ لاہور

آر۔ رحیم یار خان کے نام!

میرے ایک دوست عبدالرؤف فاروقی جو پیپر مل میں سینئر کلرک ہیں۔ عمر ۲۶ سال۔ تنخواہ ۔/۴۰۰ روپے ماہانہ۔ تعلیم میٹرک۔

رانا محمد اعظم پی/۲۹۰ غلام محمد آباد کالونی۔ لائل پور

مس کملی کے نام!

دو سال سے سندھ سیکریٹریٹ میں اسٹینوگرافر ہوں، عمر ۳۳ سال ہے۔

ایم ایچ ایچ تالپور۔ یوسف پلازا فلیٹ نمبر اے/۲۹
فیڈرل بی ایریا۔ کراچی ۳۸

نائیلہ صدف، پشاور کے نام!

آپ کا آئیڈیل ہوں۔

محسن پرویز۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۹۲۶۔ دوحہ۔ قطر

---

حقیقت پسند ہوں۔ آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ عمر ۲۶ سال تعلیم میٹرک۔ تنخواہ پانچ ہزار روپے

سی کے اسلم۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۵۔ ابوظہبی

---

مسقط میں ایک باعزت ملازمت کر رہا ہوں۔ تنخواہ ۔/۲۵۰۰ روپے

عمر ۲۸ سال    آئی ایچ انجم

SOGEX P.O BOX 4737 ROVI GOBRA SITE
MUSCAT SULTANAT OF OMAN

---

عمر ۲۵ سال، تعلیم میٹرک۔ نہ دولت کی ہوس نہ جہیز کی پرواہ۔

اے ایچ ناشاد۔ گڈز آفس ریلوے اسٹیشن۔ پشاور سٹی

---

میں آپ کے خیالات سے متفق ہوں۔ تعلیم ایف اے۔ عمر ۲۷ سال ماہانہ تنخواہ ۔/۹۵۰ روپے۔ جائیداد کا مالک بھی ہوں۔

محمد ناصر ملک معرفت چنار گل ایم ای ایس۔ چوک چراٹ ضلع پشاور

---

میں کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہوں۔ تعلیم بی اے۔

جاوید انجم۔ عوامی کلاتھ ہاؤس۔ دکان نمبر ۲۴۴۲
ہشت نگری، جھنڈا بازار۔ پشاور شہر

---

میٹرک پاس سرکاری ملازم ہوں۔ تنخواہ چار سو روپے ماہوار۔ جیک جنٹل مین۔ دل سکون سے محروم شخص ہوں۔

محمد ناصر۔ مکان نمبر ۱۶۴ جی ایل۔ سام باغ روڈ۔ ایبٹ آباد

نجمی، کراچی کے نام!

مجھے جہیز کا لالچ نہیں۔ میں تعلیم یافتہ گھرانے کا گریجویٹ لڑکا ہوں۔

نور محمد نورانی بک اسٹال، عرب محلہ بلدیہ ٹاؤن۔ کراچی ۲۸

---

میں انجینئر ہوں اور مغلیہ خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ عمر ۲۶ سال۔

محمد ارشد مغل چ ب/۲۷۱
گنڈا سنگھ والا۔ گوجرہ تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ ضلع لائلپور

---

میرے چھوٹے بھائی ایک مقامی مل میں انجینئر ہیں۔ ماہانہ آمدنی ۱۵۰۰ روپے۔ جہیز کی قید نہیں۔

رضیہ میمن۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۷۔ سکھر

عالیہ، کراچی کے نام!

ہم دونوں کے ملن سے کامیابی قدم چومے گی۔

شاہین معرفت سلیم اکرم۔ مدینہ آباد۔ گوالمنڈی۔ راولپنڈی

ثمرین عظمیٰ، رحیم یار خان کے نام!

میں ایک ادارے میں ذمے دار عہدے پر ملازم ہوں۔ اچھے گھرانے سے تعلق ہے۔

علوی معرفت شمس الحسن رضوی۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۶۶۲۔ کراچی

---

میں آپ کے آئیڈیل کے عین مطابق ہوں۔

محمد ایاز۔ اسسٹنٹ ٹی ڈی سی۔ کابلیاں بازار۔ پشاور صدر

---

عمر ۳۱ سال۔ تنخواہ ۔/۸۰۰ روپے ماہوار۔ ایک مربع نہری زمین کا واحد مالک ہوں۔ پاپولیشن پلاننگ آفیسر کی حیثیت سے ملازم ہوں

میاں صدیق احمد معرفت پبلک میڈیکل اسٹور۔ عارف والا ضلع ساہیوال

---

میں اچھے گھرانے کا اکلوتا تعلیم یافتہ لڑکا ہوں۔

سید مہر حسین شاہ۔ ٹیکس کلکٹر بدریہ حسن ابدال۔ معرفت
راجہ محمد صفدر پان سگریٹ ہاؤس اڈہ لاریاں۔ حسن ابدال ضلع کیمبلپور

---

عمر ۲۵ سال۔ خوش شکل۔ تعلیم ایف اے۔ ذاتی کاروبار۔

محمد حنیف۔ کوارٹر نمبر ۱۴۲۔ مہاجر کالونی۔ بہاولنگر

روبینہ شاہین، ملتان کے نام!

میں مکھن تے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہوں۔ تعلیم ایم اے۔ نشتر ہسپتال میں میڈیکل سوشل آفیسر ہوں۔ پانچ مربع زمین کا اکیلا مالک ہوں۔

عمر حیات خاں۔ میڈیکل سوشل آفیسر

مکان نمبر ۳۳۰/۳۳ محلہ پیر کاجو شاہ۔ نزد خونی برج۔ ملتان شہر

---

عمر ۳۲ سال۔ تعلیم ایم اے۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ شادی شدہ ہوں ایک تین سال کا بچہ بھی ہے۔ دوسری شادی کرنا چاہتا ہوں۔

ع معرفت اسلم میڈیکل ہال، چوک دولت گیٹ۔ ملتان شہر

رانی شبّو، بہاولنگر کے نام!

میں آپ کے خیالات سے مطابقت رکھتا ہوں۔

خان محمد لائن پار۔ محلہ محمود آباد۔ ٹنڈو آدم

---

عمر ۲۹ سال، تعلیم بی اے۔ اپنی ذاتی ساڑھے تین سو ایکڑ نہری زمین ہے۔ اپنی ذاتی جیپ اور بنگلہ ہے۔

ایس۔ ایم آنادر رضوی

ڈاکخانہ خیر پور گمبو (GUMBO) براستہ جھڈو۔ ضلع بدین

---

مجھے دولت کی ضرورت نہیں صرف صورت اور سیرت چاہیے

راجہ حسن اختر۔ فرسٹ ائر رول نمبر ۲۷

گورنمنٹ فریدیہ ڈگری کالج۔ پاک پتن۔ ضلع ساہیوال

---

بہاولنگر کے قریب میری زمینیں ہیں۔ سلجھے ہوئے سید خاندان سے متعلق ہوں۔ ذوالفقار معرفت

ایم صغیر انور۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۴۱۰۔ کراچی

ن، ت۔ راولپنڈی کے نام!

میں آپ کے معیار کے عین مطابق ہوں۔ عمر ۳۰ سال۔

ایس کمال۔ پریمیئر شوگر ملز۔ مردان (صوبہ سرحد)

---

تعلیم میٹرک، تنخواہ ۴۰۰/- روپے۔ پی آئی اے میں ملازم ہوں۔ ذاتی مکان اور تھوڑی سی جائیداد بھی ہے۔

راجہ ولیپذیر۔ ایل ایس ڈی سی۔ پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن۔ راولپنڈی

---

تعلیم بی اے۔ عمر ۲۲ سال، تنخواہ ۷۵۰/- روپے اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ جینز سے نفرت ہے۔ م' ا' خان

معرفت محمد حیات ہیڈ ڈریسر۔ یونیورسٹی روڈ۔ جہانگیر آباد۔ پشاور شہر

---

مقامی بینک میں کیشئر ہوں۔ تنخواہ ۵۰۰/- روپیہ ماہانہ۔ عمر ۲۵ سال، خوش مزاج، قبول صورت

غفران احمد صدیقی کیشئر

یونائیٹڈ بینک، سٹی برانچ، چوک فوارہ۔ راولپنڈی

---

انڈر گریجویٹ اسٹینو، تنخواہ تقریباً پانچ سو روپیہ ماہوار، ذاتی مکان، عمر ۲۴ سال۔

ایاز احمد

کوارٹر نمبر ۵۰/بی۔ ۸۴۔ جی۔ ۴۔ ۱/۶ اسلام آباد

---

آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ اپنا کاروبار اور خدا کا دیا سب کچھ ہے۔

محمد صفدر، اڈہ لاریاں۔ پان سگریٹ شاپ حسن ابدال

---

ایک فرم میں باعزت ملازمت کرتا ہوں۔ آپ تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ قبول ہیں۔

"زلفی" پوسٹ بکس نمبر ۵۷۲۱۔ کراچی ۲

---

میں ٹائپسٹ ہوں۔ تنخواہ ۵۰۰/- روپے ماہوار۔

ایم ایس خاں معرفت محمد سرور

ٹائپسٹ اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن۔ پی او بکس ۵۶۔ پشاور

منیزا رحمان، لاہور کے نام:

اگر کہوں تو بیجا نہ ہوگا کہ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔

فیض الرحمن "اولمپیا"

تیسری منزل، انشورنس ہاؤس ۱ے۔ حبیب اسکوائر۔ ایم اے جناح روڈ کراچی

---

میں آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔ فوج میں ملازم ہوں۔ تعلیم میٹرک اور تنخواہ معقول ہے۔

ایچ آر۔ پوسٹ بکس نمبر ۳۴۴۔ دوحہ قطر (عرب گلف)

---

مجھے آپ کی تحریر نے بے چین کر دیا ہے۔ میں آپ کے آئیڈیل پر پورا اتروں گا۔

سید مہر حسین شاہ بخاری ٹیکس کلکٹر کمیٹی حسن ابدال۔ ضلع کیمبل پور

---

میں الیکٹریکل انجینئر ہوں سالانہ تنخواہ ۱۲۵۰۰/- روپے۔

محفوظ علی چودھری ۱۱۲۔ ایچ گلبرگ۔ لاہور

**نعیمہ ممتاز، کراچی کے نام!**

عمر ۲۵ سال۔ تعلیم بی اے۔ انگلش فرم میں ۴۰۰/- روپے پر ملازم ہوں۔
اقبال فراز۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۹۵ - دوبئی (یونائیٹڈ عرب امارات)

---

آپ کے خوابوں کا عکس میری شخصیت میں ہے۔ عمر ۲۳ سال، تنخواہ ۳۰۰۰/-
این احمد۔ پوسٹ بکس نمبر ۲۹۸۰ - دوبئی (یو اے ای)

**روبینہ ملک، لاہور کے نام!**

نہ بہت خوبصورت ہوں نہ بہت دولت مند، عمر ۲۲ سال۔
افضال۔ ایم بی بی ایس (اسٹوڈنٹ)
۱۰۰ - اے طارق ہال - نشتر میڈیکل کالج - ملتان

---

آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ ذاتی کاروبار۔ عمر ۱۸ سال۔
ممتاز خان آفریدی
معرفت سید خان۔ تمباکو ڈیلر سبزی منڈی ھکڑہ (میانوالی)

---

میں ایک سلجھا ہوا، ۲۰ سالہ نوجوان ہوں۔
خالق پرویز معرفت
محمد انور دھوبی مرغی والے، امام باڑہ روڈ گھسیٹ پورہ، لائلپور

---

تعلیم بی اے۔ ایک کمپنی میں سیکنڈ انجینئر ہوں۔ عمر ۲۰ سال، تنخواہ ۹۰۰۰/-
طارق محمود، مارک سپر وائزر، پوسٹ بکس نمبر ۲۲۵ - شارجہ (یو اے ای)

**فوزیہ ناہید، ڈیرہ اسمٰعیل خان کے نام!**

عمر ۳۲ سال، سنجیدگی، خودداری، سادگی، خلوص اور نیک نیتی کا مجسمہ۔
حلیم شاہ ہاشمی، پوسٹ بکس نمبر ۳۸۵ - دوحہ قطر (عرب گلف)

---

عمر ۲۳ سال، گورنمنٹ ملازم ہوں۔ تنخواہ ۵۰۰/- روپے ماہوار۔
M.A.KHAN INDUSTRIAL DIRECTRATE
CENTRALLY ADMINISTERED TRIBAL AREAS
DEVELOPMENT CORP, PESHAWAR. CANTT

**فرزانہ حلیم، راولپنڈی کے نام!**

میں پڑھا لکھا، برسر روزگار، مخلص اور نیک سیرت ہوں۔
حلیم خان - پوسٹ بکس ۲۱۱، ابوظہبی

---

ایک نیک سیرت، معقول تنخواہ، اچھی صحت، عمر ۳۰ سال

غلام قریشی معرفت امام بخش، پوسٹ بکس نمبر ۲۱۹۵ - کراچی ۲

---

ذاتی کاروبار، خود مختار، عمر ۳۰ سال، آمدنی ۴ ہزار روپے ماہانہ
قادر، پوسٹ بکس ۵۵ - لاڑکانہ۔

**ط۔ع۔ میانوالی کے نام!**

میں آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔
ن، معرفت ایاز لائبریری۔ کوہاٹی گیٹ، پشاور شہر

**بیگم اورنگ زیب۔ کراچی کے نام!**

تعلیم میٹرک۔ آمدنی ۱۲۰۰/- روپے۔ بیرون ملک جانے کا ارادہ ہے۔
مستری محمد اقبال
ڈاکخانہ اوڈھروال، بمقام چکوڑہ، تحصیل چکوال، ضلع جہلم۔

**س۔ن۔ش کے نام!**

فوج میں میجر ہوں۔ جٹ فیملی سے تعلق ہے۔
میجر امتیاز احمد چیمہ 30-COVLARY ملتان کینٹ

**آصف زیدی، سیالکوٹ کے نام!**

عمر ۲۸ سال، تعلیم میٹرک، دراز قد، مضبوط جسم، اگورانگ اور
ذاتی کاروبار۔ محمد یونس اصغر
معرفت لیاقت علی پراپرائٹر جنرل اسٹور، شاہی بازار - ڈگری (سندھ)

---

تنخواہ چار ہزار روپے ماہانہ۔ عمر ۲۷ سال، شکل و صورت آپ کے آئیڈیل جیسی
خالد سہیل، پوسٹ بکس نمبر ۱۷۲۴ - ڈیرہ، دوبئی (یو اے ای)

**شگفتہ بانو، بہاولنگر کے نام!**

وہ سب خامیاں مجھ میں موجود ہیں جو آپ چاہتی ہیں۔
جی آر، معرفت ملک الٰہی بخش، ڈرائنگ ماسٹر
گورنمنٹ میونسپل ہائی اسکول، بھکر، ضلع میانوالی

---

میں آپ کے خیالات سے ہم آہنگ ہوں۔
شاہد حسین پراچہ، امانیکا پوسٹ آفس، حویلی تحصیل دیپالپور، ضلع ساہیوال

---

آپ کو جس آئیڈیل کی تلاش ہے وہ میں ہی ہوں۔
اے ایم نواب، مکان نمبر ۳۸۵، مہاجر کالونی، بہاولنگر

---

میں ایک معزز ۲۴ سالہ گریجویٹ ہوں۔ تنخواہ ۵۰۰/- روپے ماہانہ۔
شاہد نواب معرفت ایم ایچ صدیقی ۳۸۶/۳ ریلوے کوارٹرز، کراچی ۲

۵۰۰ شہ ۵۱۰

**بیگم ح ل۔ کراچی کے نام!**

جہیز وغیرہ کو لعنت سمجھتا ہوں، سیرت کا قائل ہوں۔

سے رشید ملک

RADMANDGADE 24-B . ST 2200 COPEN.HAGENN DANMARK

---

میں ۲۵ سال کا تعلیم یافتہ، برسر روزگار، مخلص آدمی ہوں۔ جہیز کو برا تصور کرتا ہوں۔

نعیم جان معرفت پوسٹ بکس نمبر ۲۷۲۰۔ ابوظبی (یو۔اے۔ای)

**س، خان۔ لاہور کے نام!**

مستقل مزاج، پرخلوص، مذہب پسند انسان ہوں۔ عمر ۲۴ سال، تنخواہ آٹھ ہزار روپے ہے۔

چودھری محمد اقبال معرفت پوسٹ بکس نمبر ۱۳۴۲۔ دوبئی (یو۔اے۔ای)

**رضا کوثر۔ کراچی کے نام!**

عمر ۲۲ سال، تعلیم یافتہ، ذاتی کاروبار اور معزز گھرانے سے تعلق ہے۔

ایم آئی کے کمپنی، شاپ نمبر ۲۔ وفا روڈ۔ کوئٹہ۔

---

آپ کے معیار پر پورا اتروں گا۔ عمر ۲۶ سال۔ کراچی مہاجر کیمپ میں کلینک، تعمیرات، انجینئرنگ ورک سے وابستہ ہوں۔

ڈاکٹر ایم ایچ خان۔ پوسٹ بکس نمبر ۵۲۹۔ ابوظبی

**بانو ناز۔ لاہور کے نام!**

عمر ۲۵ سال، پیشہ المونیم کنسٹرکشن فورمین۔

ایم ایچ کورائی۔ پوسٹ بکس ۱۸۴۔ السعد المونیم۔ ابوظبی (یو۔اے۔ای)

---

عمر ۲۵ سال، شارجہ میں بلڈنگ ٹھیکیدار ہوں۔ آمدنی تقریباً چھ ہزار روپے ماہانہ۔ مجھے جہیز کی ضرورت نہیں۔ تعلیم میٹرک ہے۔

مرزا شبیر حسین، پوسٹ بکس نمبر ۵۷۳۔ شارجہ (یو۔اے۔ای)

---

عمر ۳۱ سال، تعلیم بی اے۔ تنخواہ آٹھ سو روپے ماہوار۔

ایس اے میاں معرفت پبلک میڈیکل اسٹور عارف والا۔ ضلع ساہیوال

**منظور حسین، کراچی کے نام!**

آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ ۴۰۰/- روپے تنخواہ، سرکاری ملازمت۔ شکل و صورت کی بجائے عقل و سیرت پسند ہے۔

ایم مظفر معرفت ایل ایچ شاہ نقوی، اسٹیٹ بینک آف پاکستان۔ پشاور

**نورین مسعود۔ لاہور کے نام!**

میں پروفیسر ہوں۔ عمر ۲۶ سال، خوبصورت، گورا رنگ۔

اے علی چودھری

342.6 WHITING ST E-33 ALEX .V.A.22304 (U.S.A)

**فریدہ مرزا۔ کراچی کے نام!**

میں آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ جہیز کا لالچ نہیں۔ معقول آمدنی، تعلیم ایف اے ہے۔

محمد شمیم معرفت پوسٹ بکس نمبر ۲۴۲۰۔ ابوظبی (یو۔اے۔ای)

**گ، ا۔ کوہاٹ کے نام!**

میری عمر ۲۵ سال، تعلیم میٹرک، نجی کاروبار ہے۔ جہیز کی ضرورت نہیں۔ صوم و صلوٰۃ کا پابند ہوں۔

ایم اے خان درانی۔ گڈز آفس۔ ریلوے اسٹیشن۔ پشاور۔ یونیورسٹی

---

عمر ۲۲ سال، ذاتی کاروبار ہے، جہیز کی کوئی پروا نہیں۔

بی اے ساحر۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۹۶۔ ابوظبی (عرب امارات)

**نازین تارا۔ حیدر آباد کے نام!**

اچھے کھاتے پیتے شریف گھرانے کا فرد ہوں۔ تعلیم انٹرمیڈیٹ پر بسر کر رہا ہوں۔

خواجہ محمد انور ضیاء

۲ فضیلا اسٹریٹ، نیو کالونی۔ ڈاکخانہ اوستہ محمد، ضلع نصیر آباد (بلوچستان)

---

عمر ۱۹ سال، تعلیم میٹرک، ذریعہ معاش ملازمت

محمد شہباز طاہر۔ مکان نمبر ۲۱۱۳ ای ای، چاہ سلطان۔ راولپنڈی

**میمونہ ممتاز۔ کراچی کے نام!**

آپ کا ہم آواز ہیں ساز۔ عمر ۳۲ سال۔ تنخواہ ۱۵۰۰/- روپے۔

ایم اے ملک۔ پوسٹ بکس نمبر ۴۰۶۔ بن غازی۔ لیبیا

**شاہ نمیر، کراچی کے نام!**

عمر ۲۳ سال۔ پی آئی اے میں آفیسر۔ آمدنی گیارہ سو روپے ماہانہ۔

شہزاد معرفت کاظم الیف ۲۶/۲/۲۶ جیکب لائن۔ کراچی

**فرزانہ (سہیل) کراچی کے نام!**

میں زندگی کے ایک ایک لمحے کی بھرپور چاہتیں اور تمام محبتیں آپ کی سہیلی کے قدموں میں نچھاور کرتا ہوں گا۔

ڈاکٹر ایم ایس شاد ۲۲۔ الراضی ہاسٹل

لیاقت میڈیکل کالج، جامشورو۔ حیدر آباد

# غزل

ناصر زیدی

جسے چاہوں اُسے اپنا کر چھوڑ دیتا ہوں
حسینوں کو بہت نزدیک لا کر چھوڑ دیتا ہوں

میں اپنے دشمنوں سے بھی عداوت کر نہیں سکتا
خود اپنے قاتلوں کو مسکرا کر چھوڑ دیتا ہوں

جنونِ شوق میں حائل نہ ہوں منطق کی دیواریں
خرد کی راہ میں کانٹے بچھا کر چھوڑ دیتا ہوں

مجھے معلوم ہے رسم و رہِ الفت کی دشواری
پری چہروں کو میں بے شک رُلا کر چھوڑ دیتا ہوں

کسی زلفِ رسا کے پیچ و خم پر جاں فدا میری
کسی جُوڑے میں پھولوں کو سجا کر چھوڑ دیتا ہوں

کوئی شعروں کی فرمائش کرے مجھ سے اگر ناصر
میں اس کو صرف حالِ دل سُنا کر چھوڑ دیتا ہوں

## شامیں

سرمئی سناٹے، اور لامحدود وسعت

کنارہ کہاں ہے؟

کیا کنارہ ہے؟؟

میں تھوڑی دیر پہلے سوچ رہی تھی "احساس" کیا ہے اور کیوں ہے کہ فکر کی اس اُدھیڑ بن اور الجھاؤ نے مجھے گھبرا دیا — میں اپنی مسہری سے اُتر کر کرسی پر آن بیٹھی ہوں۔ آخر میں اپنے آپ کو تجربا تی جانور کیوں بناؤں میں زندگی کو سمجھنے کی اذیت میں کیوں مبتلا ہوں۔ میں کرسی پر آن بیٹھی ہوں اور مٹھیاں باندھے، دانتوں پر دانت جمائے زندگی کو "برتنے" کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔

مگر "احساس" یہاں بھی ٹھوکے دے کر میرے استغراق میں مخل ہو رہا ہے۔ تو یہ جو میری ایک ٹوٹی پھوٹی چھوٹی سی کشتی ہے جیسے میں شاموں کے سرمئی سناٹوں میں لامحدود پانی کے سینے پر کھیتی ہوئی بھٹکتی رہتی ہوں، میری دشمن بن گئی ہے۔

میں کمرے میں لوٹ آتی ہوں۔ اپنے کمرے میں جہاں میں نے زندگی کی "پہل ودیج" کو سمجھا ہے اور جہاں میں نے اجنبیت کے احساس سے اُلجھنا اور مانوس کرنا سیکھا ہے۔ کھڑکی کے قریب میری کرسی ہے اور سامنے میز پر ٹیلیفون رکھا ہے — میں ڈائرکٹری اٹھا لیتی ہوں اور اس کی ورق گردانی کرتی ہوں۔ بہت سے نام، بہت سے گھر، بہت سے پتے ان میں سے ہر نام کچھ لوگوں کے لیے کتنا اہم ہے۔ کیونکہ ناموں کے عقب میں رشتوں، خواہشوں، خوابوں کے پیچیدہ راستے پھیلے ہوئے ہیں۔

ایک نام پر میری بھی نظر ٹھہر جاتی ہے۔

اس نام کے شانے کے اوپر سے جھانک کر کچھ با معنی پہیلیاں مجھے بھی نظر آتی ہیں۔

"ہیلو! میں بول رہی ہوں"

"جی — کہاں ہو —؟"

"کیا کر رہے تھے ___؟"

"خالی بیٹھا تھا ___!"

"عجب ہو، شام کو گھر میں بیٹھے ہو۔ باہر کیوں نہیں نکلتے؟"

"باہر ___ اور اندر! کیا فرق پڑتا ہے۔ یاد ہے پرسوں ہم نے طے کیا تھا کہ جو اندر ہے وہ بھی باہر کی ہی دین ہے۔ اور جو باہر ہے اس کا تجربہ ہم اندر کی لذت سے ہی کرتے ہیں۔ تو باہر اور اندر ایک ہی بات ہے۔"

"چلو یہی سہی، تو پھر کیا فرق پڑے گا اگر تم ادھر آ جاؤ۔"

زندگی کو سمجھنا اب کتنا دلچسپ لگ رہا تھا۔ دراصل میرے ہاتھ تو میں اُس اُلجھی ہوئی ڈور کا ایک سرا آگیا تھا۔ وہ میرے لیے "لا" تھا جسے نظر میں رکھ کر پرابلم سمجھنے تک اسی پر گھوم پھر کر واپس آنا تھا۔

وہ یعنی "لا" یعنی وقار میرا یعنی رتیا آنند کا یونیورسٹی میں ہم جماعت تھا۔ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اور مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ ہاں۔ مجھے اس کی سنجیدگی اور اداس آنکھوں اور مسکراتے ہوئے ہونٹوں کا تضاد اچھا لگ رہا تھا اور اس کی سنجیدہ اور پیچیدہ باتیں مجھے اندر سے سلجھا رہی تھیں۔

محبت موسیقی کی طرح HARMONY سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

غالباً جسم اور جبلت سے زیادہ ذہنی ہم آہنگی نے ہمارے رشتے میں موسیقیت یا محبت پیدا کر دی تھی۔

وقار میرے لیے یا میں وقار کے لیے "گنبد کی صدا" نہ تھے۔ ذہنی ہم آہنگی کا یہ مطلب بھی نہیں ہے۔ ہماری نیتوں میں ہم آہنگی تھی اور ہم اکثر اختلافات کے باوجود اس "اتفاق" پر مطمئن رہتے کہ زندگی کو تعصب اور "انا" کے بغیر ایک اکائی میں سمجھا جائے۔ جمالیات کو سائنس اور فرد کو معاشرے سے علیحدہ نہیں کیا جائے بلکہ ایک دوسرے کی مدد سے سمجھا جائے۔

یونیورسٹی لائبریری یا برٹش کونسل کی سیڑھیوں پر جب ہم ایک دوسرے کو خدا حافظ کہنے آتے اور اکثر آخری سلام بھی اتنا طویل ہو جاتا کہ گزرتے ہوئے لوگ مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھنے لگتے تو کتنا اچھا لگتا تھا۔

جب ہر ملاقات میں بہت ساری باتیں کرنے کے بعد بہت ساری باتیں کرنے کو باقی رہ جاتیں تو ملاقاتیں کتنی ضروری ہو جاتی ہیں۔

"ہم شام سے لان میں بیٹھے ہیں۔ تم بحث کرنے میں کتنے INVOLVE ہو۔ چیزیں اچھی کیوں لگتی ہیں! جمالیات کیا ہے! تم نہیں جانتے کہ چیزوں کے اپنے اندر کوئی خوبی ہے جو ہم سے اپنے آپ کو منواتی ہے۔ یہ احساس تو ہمارے اندر ہوتا ہے ___"

مگر میں تمہاری بات اب نہیں سن رہی ہوں۔ میں رات کی رانی کی خوشبو محسوس کر رہی ہوں جو میرے اتنی قریب ہے اور جس میں اتنی مسحور کر دینے والی کیفیت ہے اور تمہارا میرے قریب ہونا اتنی طمانیت بخشنے والی حقیقت ہے اور اب میں خاموش ہو جاؤں گی تو تم سمجھو گے تم نے مجھے ہرا دیا۔ اور پھر تمہیں احساس ہوگا کہ اب اندھیرا ہو چلا ہے۔ اور تم اپنی کرسی کے ہتھے پر ہاتھ پھیر کر کہو گے۔

"اوہو! کتنی شبنم ہے۔ میں چلتا ہوں۔"

حالانکہ تم ابھی نہیں جاؤ گے۔ تم میرے ساتھ رسوئی میں آ جاؤ گے اور میرے قریب پیڑھی پر بیٹھ کر مجھے پوریاں تلتے دیکھو گے۔ بچوں کی طرح جلدی کرو گے۔ اور جلتی پوری منہ میں رکھ لو گے تو میں پوریاں کڑھائی میں جلتی چھوڑ کر خوب ہنسوں گی اور پھر ہم دونوں خوب ہنسیں گے اور ایک دوسرے کو منہ چڑائیں گے۔ بڑے فلاسفر بنتے تھے۔

ہماری لائبریریاں قطعی سیکولر تھیں۔ ٹیگور اور رادھا کرشنن کی کوئی کتاب میرے پاس نہ ملے تو وقار کی لائبریری میں ضرور ہوگی۔ اقبال کی کسی کتاب کی وقار کو ضرورت ہو اور نہ مل رہی ہو تو میری لائبریری میں ضرور مل جائے گی۔ نہج البلاغہ، بائیبل، بھگوت گیتا، الفاروق، مہابھارت، داس کیپیٹل، لینن، ایلیٹ، رسل، مارکس، ماوزے تنگ ان سب کو شیلف میں ساتھ دیکھ کر وقار نے ایک مرتبہ کہا: "سیکولرازم لائبریریوں تک تو آگیا ہے، لیکن رسوئی اور رہائشی کمروں تک نہیں آسکا۔"

تو جب ہم لائبریریوں کی قربتوں کی وقتی دنیا سے نکل آتے اور جب ہم مباحثوں اور تبادلہ خیال سے اکتا کر اس کے علاوہ ایک دوسرے کی خاموشی میں روی شنکر کے ستار کا لطف لینے لگے تو ___ زندگی کو برتنے کا مسئلہ درپیش تھا۔

"وقار تم نے محسوس کیا؟ یونیورسٹی سے نکل کر یکدم ایک عجیب سی FEELING ہوتی ہے ___ تم اس کے بارے میں سوچتے ہو ___؟"

"ان کتابوں کے نوٹس بنانے اور ڈگری کے لیے درخواست لکھنے کا فرق مجھے محسوس ہوتا ہے۔ اب کہیں اپنے آپ کو لٹوانا ہے۔ اور تمہیں پتہ ہے میں اب کبھی کبھی ڈرنے لگا ہوں۔"

"ڈر ___! کیوں ___؟"

"لائبریری اور رہائشی کمروں کے ماحول میں بڑا فرق ہے رتیا ___ میں ڈرتا کسی سے نہیں ہوں، اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں ہم اس سارے معاملے میں بزدل نہ ٹھہریں۔"

میں نے ایک جھرجھری سی محسوس کی ___ اور مجھے اپنا بچپن یاد آیا ___ میری ناک زبردستی بند کر کے مجھے کڑوی، بدبودار دوا پلائی جا رہی ہے ___ اور اسے حلق سے اتارنا ___

میں نے وقار کی طرف دیکھے بنا ہاتھ بڑھایا۔ اپنا ٹھنڈا لرزتا ہوا ہاتھ
اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔
ہم نے ایک دوسرے کو اتنا زیادہ جانا ہے، آہیں سب انتظار کرتا ہے
اور خواہشیں لکھتا ہیں۔"

میں نے اس کے الفاظ کا مطلب سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے اس
کے لمس سے اپنے اضطراب کو کم ہوتے ہوئے پایا —— اور یہی مجھے پانا تھا۔
میں پھر سکون کے کچھ لمحے سے نکل کر اضطراب کے اندھیرے میں آ گئی ہوں۔
وقار میرے سامنے کرسی پر شانت سا بیٹھا ہے۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے کیسا
طوفان اٹھایا ہے۔ سب یہ بظاہر سنجیدہ مگر اصل کتنا مطمئن ہے۔ اس نے
تھوڑی دیر پہلے مجھے بتایا ہے کہ وہ سدا کتب خانوں میں نہیں رہ سکتا
اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس کے والدین مجھے اور اسے ایک ساتھ ڈرائنگ
روم اور رہائشی کمروں میں نہیں دیکھ سکتے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ وہ
مجھے لائبریری میں تنہا چھوڑ کر اپنے والدین کا اہتمام کر رہائشی کمروں کی طرف
جا رہا ہے۔

والدین! مگر یہ والدین کہاں سے آ گئے۔!
"وقار میں تم سے مطالبہ تو خیر ہرگز نہیں کروں گی۔ مگر مجھے یہ بتاؤ، والدین کی
آشیرباد اور نیک تمناؤں کے بغیر جو سفر ہم نے ایک ساتھ طے کیا اور جو شامیں ہم
نے ایک ساتھ بتائیں وہ ہمیں اتنی اچھی کیوں لگیں۔؟"
مذہب اور روایتیں تمہارے لیے اہم ٹھیریں۔ مگر میرا، میرا بھی تو ایک مذہب
کا بھی ایک مذہب تھا اور روایتیں میرے لیے بھی۔ ہاتھ پھیلاتے 'پہلے کون
آتا ہے پہلے کون آتا ہے۔!' کا جاپ کر رہی تھیں۔ میں تو ان سے بھاگ آئی تھی۔
مگر تم دو ڈگران مشترکہ مینوں سے جانتے۔ مجھے تو تم نے اس کھیل میں کبھی ایک
بار کھلکھلا کر ہنسنے بھی نہیں دیا۔
مگر میں یہ سب کچھ تم سے نہیں کہوں گی۔ ہم نے طے کیا تھا: 'ہم سمجھنے
کے لیے ہاتھ پھیلائیں گے'، کر 'جاننا' میرا حق یا ملکیت نہیں ہے۔ وہ ہم سب
کا حق ہے۔ مگر رشتے کے لیے ہم ہاتھ نہیں پھیلائیں گے۔ اب میں تم سے سوال
کیوں کروں جب مجھے یہ خوف ہے کہ تم اب سوال کو مطالبہ سمجھو گے۔
"تم اتنی دیر سے خاموش ہو رتیا۔ میں جانتا ہوں میں نے تمہیں دکھ دیا ہے
مجھے سکون ملے گا اگر تم اس جبر کو سمجھ جاؤ جس کی بنا پر انسان ایک دوسرے کو دکھ دیتے
ہیں۔"

"میں دکھ تو نہیں رہی ہوں دیر ہو گئی ہے بھی نہیں۔ یہ میں نے فیصلہ کیا
ہے! میں تو سوچ رہی تھی کہ زنجیروں میں جکڑا ہوا غلام کیا زنجیروں کی کھنک کو
موسیقی سمجھ کر لطف اندوز ہو سکتا ہے!
تم میرے لیے زندگی تھے۔ تم نے زندگی کی پہیلی دو سچ سمجھنے میں میری مدد
کی ہے۔ پھول اپنی ہی ہوا ہی ہوتی ہیں۔ میرے ادھر سے ادھر ہوا اور ادھر چل لیا۔ میں
زندگی کا یہ دوجا روپ سمجھنے کے لیے تمہاری شکرگزار کیوں نہ ہوں۔"
وہ تھوڑی دیر پہلے اٹھ کر چلا گیا ہے۔ ہم کوشش سے کوئی بھی احساس
پیدا کر سکتے ہیں۔ اس نے اپنے گرد تم تلاش کر لیا ہے
میرے لیے وہ اب صرف ایک نام ہے جو ڈائری کی کسی ایک سطر
میں سمٹ آیا ہے۔
میں بھی اپنے اطراف سے بے خبر کب تک رہوں گی۔ شام ہو رہی ہے
اندھیرا کتنی خاموشی سے کمرے میں آن چھپا ہے۔ یوں کمرے میں دیکھے بغیر
کیا ہو گا —— یہاں کرسی پر بیٹھ جاؤں اور باہر جگمگاتی ہوئی روشنیوں کو دیکھوں
روشنی جو میرے باہر ہو گی کب تک مجھے اندر سے منور نہیں کرے گی۔
میں کھڑکی سے باہر دیکھتی ہوں۔ میری نظر ایک سائے پر پڑتی ہے
جو لان میں پھاٹک کے پاس سے آ رہا ہے۔ یہ قدموں کی مانوس آہٹ مجھے
کتنا سکون بخشتی ہے۔
"رتیا بیٹی اندھیرے کمرے میں کیوں بیٹھی ہو۔ باہر کھلی ہوا میں آ جاؤ"
جب وہ گویا ہاتھ پھیلاتے، آنکھیں بند کئے میرے آنے کے منتظر
کھڑے ہوتے مجھے کتنے اچھے لگ رہے تھے۔
"پتا جی ۔!" میں ان سے لپٹ کے جا لگی اور نہ جانے کیوں اس
وقت میری آنکھوں میں آنسو آ گئے
"آپ کچھ دنوں سے بہت خاموش رہنے لگی ہیں بٹیا۔ کوئی خاص بات۔۔؟"
اور تب انھوں نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ اور وہ تھوڑی
دیر کو خاموش ہو گئے۔ پھر انھوں نے بہت آہستگی سے میری پیٹھ تھپکی
میں جانتی تھی وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہیں گے۔ وہ زود رنجیوں کی
طرح جذبات کبھی نہیں لاتے۔ حالانکہ جب سے میری بڑی بہنیں شادی
کے بعد بستی گئی تھیں اور میرے دونوں بھائی ملک سے باہر، تب سے وہ
مجھ سے بہت زیادہ پیار کرنے لگے تھے۔
لیکن اس دن انھوں نے صرف میری پیٹھ ہی نہیں تھپکی —— بڑے
رندھے ہوئے لہجے میں انھوں نے کہا۔ "آپ وعدہ کیجیے کہ کبھی پیلی نہیں
گی نہیں ۔" اگرچہ اس بات پر مجھے اور بھی رونا چاہیئے تھا مگر میں
مسکرانے لگی

میرے پتا جی خاموش رہنے والے آدمی ہیں۔ وہ ہم بہن بھائیوں
کے معاملات میں دخل کم ہی دیتے ہیں اور میری پڑھائی لکھائی میں تو بالکل
بھی نہیں۔
"بھئی آپ کی لائبریری سے ہمیں ڈر لگتا ہے۔ ہمیں تو اب پڑھنے
وڑھنے سے الجھن ہوتی ہے۔"

لیکن اس دن کے بعد وہ اکثر میرے پاس آن بیٹھتے ہیں۔ وہ کبھی نہیں پوچھیں گے کہ اس دن یوں اچانک کون سا ریلا آیا تھا جس سے میرے صبر کے بند اس دن ٹوٹ گئے تھے۔ مگر وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

آج تو وہ شام سے ہی میرے کمرے کے قریب ٹہل رہے ہیں۔ دو ایک بار انھوں نے اندر دیکھا اور پھر وہ میرے بہت قریب آن کھڑے ہوئے۔

"آپ کو فرصت ہو تو میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

انھوں نے اس لہجے میں مجھ سے بات کی تو میں لرز گئی وہ مجھ سے میرے بارے میں بات کریں گے۔ میں انٹرویو سے بہت گھبراتی ہوں اور عجیب خصوصاً پتا جی سائل ہوں۔ جو کبھی ایسا نہیں کرتے۔

"جی ــ"

"آپ کو شاید علم نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے کچھ دن ہوئے میرا کارڈیوگرام کیا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ میری زندگی کی مدت بہت کم رہ گئی ہے انھوں نے کارڈیوگرام کو دیکھ کر مجھے چلنے پھرنے سے بھی منع کیا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں چاہتا ہوں آپ اپنے لیے ....."

ان کی آواز میرے کانوں میں نہیں آ رہی تھی اور میں اس سے آگے اور کیا سن سکتی تھی۔ وہ پوری رات مجھ سے ایک ہی بات کہتے رہے تھے اور پوری رات میں ایک ہی بات سن رہی تھی جسے سننا کتنا مشکل تھا۔ "میری زندگی کی مدت بہت کم رہ گئی ہے۔ انھوں نے کارڈیوگرام ....."

میں اچانک چونک گئی ــ کیا میں سو گئی تھی۔ میں میز پر سر رکھے بیٹھی تھی اور سامنے کاغذ پر جگہ جگہ لکھا تھا۔ "اگر پتا جی چل بسے ــ اگر پتا جی چل بسے ــ"

صبح ہو چکی تھی۔ میں نے اسٹڈی کا دروازہ مقفل کر دیا۔ میرا دل چاہتا تھا میں کسی کو بتاؤں کہ میرے پتا جی مرض الموت میں مبتلا ہیں۔ اور کچھ دن بعد میں تنہا رہ جاؤں گی۔ لیکن جب میرے ہاتھ غیر ارادی طور پر ٹیلیفون کی طرف بڑھے تو میں رک گئی۔ ہم نے طے کیا تھا کہ ہم برتنے کے لیے ہاتھ نہیں پھیلائیں گے۔

میں نے پتا جی کے کمرے میں کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ تکیے کے سہارے لیٹے اخبار دیکھ رہے تھے۔ ان کی کنپٹیوں پر سے بال سفید براق ہو گئے تھے۔ اور ان کے چہرے پر زندگی بکھری ہوئی تھی۔

میرا دل چاہا میں ان کے کمرے میں آہٹ کیے بغیر جاؤں اور ان کی اطلاع کے بغیر ان کو گھنٹوں دیکھتی رہوں۔ مگر اس سے قبل انھوں نے مجھے دیکھ لیا۔

"اندر آ جائیے بٹیا ــ"

انھوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ "آج آپ بہت سویرے اٹھ گئیں۔"

"بی پتا جی۔ میں رات پڑھتی رہی ہوں۔"

انھوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ یقین تو انھوں نے نہیں کیا۔ میرے چہرے پر پریشانی کے آثار تو انھوں نے ضرور پڑھ لیے ہوں گے۔ مگر انھوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ جیسا کہ وہ عموماً نہیں کرتے تھے۔

"دوسری پیالی اٹھا لیجیے میں آپ کے لیے پیالی میں چائے انڈیلتی ہوں۔ آپ جب تک یہ اخبار کی خبریں سنا دیجیے۔"

اس وقت اخبار پڑھنا کتنا مشکل لگ رہا تھا۔

مگر اس رات میرا خاموش رہنا اس سے کہیں زیادہ مشکل تھا۔ اس دن ان کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ اب تک اندیشہ تھا اب وہ واقعی بیمار تھے اور نیم بیہوش۔

پتا جی کو فیکٹری کا ڈاکٹر ہارٹ اسپیشلسٹ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ "وہ انھیں اسپتال نہیں لے جائیں گے۔ میں یہیں رہوں گا اور ضرورت پڑنے پر آپ کو اطلاع دوں گا۔"

ڈرپ قطرہ قطرہ ان کے جسم میں جا رہی تھی۔ اور وہ بے سُدھ پڑے تھے۔ وقت کی طرح لمحہ لمحہ زندگی کیا ہے۔ میں انھیں دیکھتی ہوں۔ نہیں میں اپنے آپ کو دیکھتی ہوں۔ بے تعلق رہتے ہوتے بھی انھوں نے مجھے کتنا چاہا ہے۔ اور ان کا چاہنا میرے لیے کتنا ضروری ہے۔ جب....

صبح انھیں ہوش آ گیا ہے۔ جب ڈاکٹر ان کا بلڈ پریشر لے رہا تھا میں کمرے سے نکل آئی۔ اور باہر ٹہلتی رہی۔ میں اپنے کمرے کی طرف آئی اور میں نے اپنا کمرہ بند کر دیا۔ میں اب پتا جی کے کمرے میں ہی رہوں گی۔ میرا اُن کے قریب رہنا کتنا ضروری ہے۔ دروازہ بند کرتے ہوئے میرا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ کچھ دن بعد جب میں واپس اپنے کمرے میں آؤں گی تو بالکل تنہا ہوں گی۔

میں یونہی بے مقصد ٹہلتی رہی۔ لان میں، دالانوں میں، پھر میں پرانے کمرے میں آ گئی جو عرصے سے کھولا نہیں گیا تھا۔ یہاں بہت سی پرانی چیزیں رکھی تھیں جنھیں بہت خاص موقعوں پر ہی نکالا جاتا تھا۔ پرانی چیزیں جو جیرو دادا کلکتے سے لائے تھے۔ خاندانی تصاویر، پرانی OUT DATED کراکری۔ سامنے شیلف تھا جس پر کچھ کتابیں نہ جانے کب سے رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک میں نے اٹھا لی۔ گرد کے سبب اس کا سرورق پڑھا نہیں جاتا تھا مگر جھاڑ کر میں نے اُسے کھولا۔ وہ بھگوت گیتا کا ایک بہت پرانا نسخہ تھا۔ اُسے میں نے دوبارہ رکھنا چاہا تو وہ میرے ہاتھ سے پھسل پڑی۔ کتاب میں نے بڑی مشکل سے سنبھالی تو میرے پیروں کے پاس کتاب کے اندر سے ایک لفافہ آن گرا۔ یونہی میں نے وہ لفافہ اٹھا لیا۔ اوپر پتا جی کا نام لکھا ہوا تھا۔ اور بھیجنے والے کے نام کی جگہ ہرچرن کے دستخط تھے۔ ہرچرن انکل کا ذکر میں نے اکثر سنا تھا۔ وہ میرے پتا جی کے بچپن کے ساتھی تھے۔ مگر بہت پہلے دوسرے ملک مستقلاً بسنے چلے گئے تھے۔

میں نے خط کھولا، لکھا تھا۔

بہت پیارے، بہت پاگل آنند

تم بھی عجیب آدمی ہو۔ یقین مانو، مجھے تمھارا خط پڑھ کر بڑا رنج ہوا تم بھگوان کی دیا پر یوں پچھتاتے ہو۔ تم چاہتے نہیں تھے کہ تمھارے اولاد ہو۔ سو کوشش تم نے اپنی سی کی۔ پر بٹیا بھگوان کے آگے کس کی چلتی ہے اور اب نئے مہمان کا دل سے سواگت کرنے کے بجائے الٹا تم اپنے آپ کو کوس کوس کر ہلکان کر رہے ہو۔ اولاد سے یوں نفرت کرنا تمھارے جیسے پڑھے لکھے شخص کو زیب نہیں دیتا۔ تو بھیا میں تو تمھارے ساتھ رونے پیٹنے والا نہیں ہوں۔ میرا تو منہ میٹھا کراؤ۔ اور بٹیا کو اپنی طرف سے نہیں تو میری طرف سے پیار کرو۔ فقط

تمھارا ہرچرن ۔ ۲۴ دسمبر ۴۸

۲۴ دسمبر ۴۵ !....

خط میرے ہاتھ سے نیچے آن گرا۔ ۲۴ دسمبر ۴۸ یعنی میری پیدائش کے بارہ دن بعد۔ تو میں ! تو میں .... !!

اس واردات نے مجھے کمرے میں تنہا کھڑی تھی۔ اور میں نہ جانے کب تک کھڑی رہتی اگر میری نظر سامنے آئینہ پر نہ پڑتی۔ جس کی طرف میں نظر بھر کر دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔۔۔ مگر میں روئی نہیں کیونکہ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں روؤں گی نہیں۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ وہ لغت جو کہیں میرے اندر موجود تھی اور جس کی مدد سے مجھے "پاپ" کے معنی سمجھاتے تھے۔ پارہ پارہ ہو گئی ہے۔

میں نے اپنا کمرہ دوبارہ کھولا۔ کرسی پر بیٹھ گئی اور میں نے اپنا سر میز پر ٹکا دیا۔ سامنے وہ کاغذ پڑا تھا جس پر لکھا تھا۔ اگر پتا جی چل بسے. اگر پتا جی چل بسے۔۔۔۔ نہ جانے کتنی دیر بعد میں نے سر اٹھایا۔ تو میرے سامنے وہی کاغذ تھا۔ اور جگہ جگہ لکھا تھا۔ "پتا جی چل بسے" ـــــــــ "پتا جی چل بسے۔"

# دُنیا اور مَیں

ثروت چوہدری

مَیں چُپ چاپ چلتی تھی۔
نگاہیں نیچی کئے۔ سمٹے سمٹاتے۔ ہولے ہولے قدموں کے ساتھ
اُس وقت مَیں دُنیا سے ڈرتی تھی۔
دُنیا مجھ پر ہنسنے لگی۔
میری اداؤں پر۔ میری شرم و حیا پر
میری گھبراہٹ پر
مَیں پیچ و تاب کھانے لگی۔
اک روز میں بپھر گئی
دنیا کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ تن کر۔ بے جھجک ہو کر
میں نے بات کی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
میں کیوں ڈرتی جب کہ میرے اندر کوئی کمی نہ تھی۔
اب دُنیا مجھ سے ڈرتی ہے۔
میں دُنیا پر ہنستی ہوں۔
دُنیا مجھ پر روتی ہے۔

شمیم نقوی

وہ بستر پہ بے دم سی ہو کر گر پڑی ——— باہر گھپ اندھیرا تھا۔ سردی کافی گہری ہوتی ہی جا رہی تھی۔ ساحل پر ایک پُراسرار سی خاموشی چھائی تھی۔ رات بیتتی جا رہی تھی۔ ساری دھرتی سو رہی تھی، سارا جگ سو رہا تھا ——— سراج ولا کا ہر باسی سو رہا تھا سوائے بینا کے ——

"آج بیگم آفریدی ملی ہیں کل کو جانے کون کون ملے گا۔ اس کو بھی زندگی کو یاد دلائے گا۔ مصنوعی ہمدردی جتا کر زخم کریدنے والے جانے کتنے لوگوں سے ابھی اور واسطہ پڑے گا۔"

"اب میں غرور سے سر اٹھا کر کیسے چل سکوں گی۔"

اور یہ سوچ کر اس کا چہرہ یک دم ہی خطرناک حد تک پیلا پڑ گیا۔ اپنی توہین کا اور بھی شدت سے احساس ہونے لگا۔ اپنا وجود اور بھی کمتر معلوم ہوا ——— لرزتی کانپتی اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ اس نے کھڑکی کی ٹھنڈی سلاخوں سے سر ٹیک دیا۔ سرد ہوا چہرہ سُن کیے دے رہی تھی۔ بارش کے ننھے ننھے قطرے ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اندر آ رہے تھے اور اس کا چہرہ بھگو رہے تھے۔ سردی ہڈیوں تک اتر گئی مگر وہ یونہی ساکت کھڑی رہی۔

"تم آ کر مجھے اپنے بازوؤں میں کیوں نہیں سمیٹ لیتے شرجیل"

اس کا اندر چہرہ یاسیت کی تاریکی میں ڈوب گیا۔ چند لمحے باہر پھیلے اندھیرے کو دیکھتی رہی، گہری گہری سانسیں لیتی رہی، پھر آنکھوں میں تیرتی نمی لیے نڈھال قدموں سے پیانو پر آ بیٹھی ——— دل کا درد سروں میں ڈھل گیا۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا جب شرجیل کی آنکھ کھلی ——— ہوا کے دوش پر لہراتی موسیقی کی دھن اس کے کانوں تک آئی۔

"یہ لڑکی اپنی جان لے کر رہے گی۔" گاؤن پہنتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا اور اپنے کمرے سے نکل کر بینا کے کمرے کی طرف آیا اندر سبز رنگ کی مدھم سی روشنی ہو رہی تھی اور وہ پیانو پر بیٹھی پُرسوز دھن بجا رہی تھی۔ اپنے آپ میں اتنی گم تھی کہ شرجیل کے آنے کی بھی خبر نہ ہوئی ——— شرجیل دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا پاس گیا اور اپنے بھاری ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے ——— وہ چونک کر پیچھے مڑی۔ شرجیل نے اس کی آنکھوں میں اداسی کے گہرے سائے گر آندھی بنتے دیکھا اور خود اس کے دل پر گھونسے سے پڑنے لگے۔ اس کا بس چلتا تو دکھوں کی ماری اپنی اس سب سے عزیز ہستی کو اس بے رحم دنیا اور ظالم سماج کے شکنجے سے چھڑا کر دور ——— بہت دور لے جاتا لیکن وہ کتنا مجبور تھا ——— اس دیوار کو کیونکر گراتا جسے بینا نے شادی سے انکار کر کے خود کھڑی کر دی تھی ——— دکھے دل کے ساتھ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا جہاں درد کا ایک جہان آباد تھا۔

"مرنا ہے تو ایک بار ہی مر جاؤ بینا، یہ لمحہ لمحہ کی موت میرے لیے بے حد اذیت ناک ہے ———" شرجیل کے لہجے میں کچھ ایسا ہی تاثر تھا کہ وہ گھائل پنچھی کی طرح تڑپ کر اس کی طرف مڑی ——— دھندلی نگاہوں سے اسے دیکھا اسے کچھ کہنا چاہا مگر کچھ بول نہ پائی۔ اس کی پلکوں کے بند ٹوٹ کر رخسار پر بکھر گئے۔ وہ اور بھی پریشان ہوئی۔

[illegible]
دنیا کی دیواریں کیونکر بند کروں ——— کیسے ان کی نظروں کو برداشت کروں شرجیل ——— بولو کیسے میں ———"

"بینا ———" شرجیل نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ "یہ سب کچھ سوچنا چھوڑ دو بینا ——— ورنہ یہ سوچیں تمہیں موت کی ٹھنڈی تہہ میں اتار دیں گی۔"

بینا چہرہ چھپا کر بُری طرح رو پڑی۔

شرجیل نے اسے دیر تک رونے دیا پھر پیار سے شانے تھپتھپائے "بس ——— اب زرد و ہمیں قسم ہے اس کی جو تمہیں اب اس دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے ———" وہ مسکرایا۔

شرجیل کی بات سن کر وہ رونا بھول گئی۔ عجیب سے تاثر چہرے پر ابھر آیا ——— وہ سر اٹھائے شرجیل کو تکتی رہی ——— اپنی گہری گہری سیاہ آنکھوں سے ——— پلکیں جھپکیں ——— ایک بار، دو بار ——— تین بار ——— اور پھر کچھ دکھ، کچھ تذبذب اور کچھ خوشی اور پیار کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہو کر وہ شرجیل سے لپٹ گئی۔ شرجیل نے بڑی گرمجوشی سے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ [illegible] جذب کے عالم میں اسے دیکھتا رہا اور پھر جذبات کی شدت سے مغلوب [illegible] اپنے لب اس کے اتھرے لبوں پر رکھ دیئے۔

چند سیکنڈ میں ہی یہ سب کچھ ہو گیا ——— شرجیل بنا اس کی طرف دیکھے بھاری پردہ اٹھا کر تیز قدموں سے باہر نکل گیا اور بینا نشے کی سی کیفیت میں اپنی جگہ کھڑی رہی ——— یہ سب غیر متوقع طور پر ہی ہوا تھا اور اب اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے ہونٹ جل رہے ہوں ——— وہ ہلکی سی نمی ——— ہلکا سا گداز ——— ہلکی سی گرماہٹ ——— اور ان سب چیزوں کا احساس کر کے اسے خود سے ہی شرم سی آنے لگی مسکراہٹ اپنے آپ ہی ہونٹوں پر پھیل گئی۔

♛

صبح دم جب شرجیل کی آنکھ کھلی تو چند منٹ تک وہ دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے یونہی بینا پچھلی رات کی باتیں یاد کرتا رہا ——— کچھ عجیب قسم کی خوشی اور ہلکا سا خوف دل میں اٹھ رہا تھا ——— "جانے میری اس حرکت کا بینا پر کیا ردعمل ہوا ہو ——— اگر وہ خفا ہو گئی ہو تو ——— نہیں وہ خفا نہیں ہو سکتی ——— اس کی آنکھوں میں خود سپردگی کے تمام تاثرات تھے ——— وہ خفا نہیں ہو سکتی ———" شرجیل نے اٹھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا اور گاؤن پہنتا باہر آیا ——— کوریڈور سے گزر کر وہ برآمدے میں آیا تو دیکھا سامنے سے برآمدے میں اس

[illegible]
پچھلی نماز پڑھ رہی ہے ——— عبادت کرتے ہوئے وہ اتنی پاکیزہ، معصوم اور مقدس لگ رہی تھی کہ شرجیل کا دل اس کی تقدیس پر قربان ہو جانے کو چاہا۔

بینا نے سلام پھیر کر خدا کے حضور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ شرجیل آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا پاس آگیا ——— بینا نے دعا مانگ کر ہاتھ ہٹائے اور آنکھ کھولی تو شرجیل کو سامنے پایا ——— شرجیل کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خود بخود مسکراہٹ آگئی اور آنکھوں میں شرم کا ہلکا سا گلابی پن تیرنے لگا۔

شرجیل اور قریب آگیا، مسکراتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"کیا دعا مانگی گئی بینا ——— ؟"

اس نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر شرجیل کو دیکھا اور ہونٹ دبا کر مسکرا دی۔

"آپ کے بتانے کی نہیں۔"

"واہ، کیا بات ہوئی ——— کیا ہم اتنے غیر ہیں۔" شرجیل نے مسکراتے ہوئے شرارت سے کہا۔ بینا کا چہرہ جیسے سرخ پڑ گیا جا نماز اٹھا کر ہنستی ہوئی دوسری طرف چلی گئی ——— اس کی شوخ سی ہنسی کا جلترنگ دیر تک شرجیل کے کانوں میں گونجتا رہا۔

وہ دن بڑا چمکیلا اور روشن تھا۔ بینا اس گھر کے بہت پرانے مالی رام چندر کے ساتھ لان میں مصروف رہی کتنے ہی پودے اپنے ہاتھوں سے لگائے، کتنوں کی ہی قطع برید کی، پانی دیا اور رام چندر سے مزے مزے کی باتیں کرتی شام تک لان سنوارنے میں لگی رہی ——— رام چندر اسے کام سے منع کرتا ہی رہا مگر وہ نہ مانی۔ اپنی من مانی کرتی رہی اور رام چندر کی پیار بھری جھڑکیاں سنتی رہی ——— آج اسے سب کچھ اچھا لگ رہا تھا ——— شرجیل کی موٹر گیٹ کی راہ اندر آئی تو بینا نے نیا پودا لگاتے ہوئے مڑ کر دیکھا ——— اور مسکرا دی۔ شرجیل گاڑی بند کر کے ادھر ہی آگیا۔ بینا کے دونوں ہاتھ مٹی میں بھرے ہوئے تھے، بال الجھ رہے تھے اور لباس پر کتنی ہی شکنیں تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے ؟" اس کی آنکھوں میں رات کی شرارت کی چمک ناچ اٹھی۔

"نئے پودے لائی ہوں، بڑی مشکلوں سے حاصل کئے ہیں۔ جب اس میں پھول آئیں گے تو دیکھنا کیسے پیارے لگیں گے۔"

"پھول تو بعد میں دیکھوں گا پہلے ذرا آپ کا حلیہ تو ملاحظہ فرمالوں۔"

بینا نے ایک نظر مٹی بھرے ہاتھوں اور شکن آلود لباس پر

ڈالی اور اپنے حلیے کا احساس کر کے ہنس پڑی۔

"بھرزوز بیسب! مجھے چائے پلاؤ پھر میں نے آج فرد البا پروگرام بنایا ہے ——— ذرا اہتمام سے تیار ہونا۔"

"جانا کہاں ہے ——؟"

"نے فیشن میں ڈنر لیں گے، پکچر دیکھیں گے، سیر کریں گے۔"

"اچھا ——!" بینا کی آنکھیں چمک اٹھیں

"جاؤ پہلے چائے بنالاؤ میرے لیے ——"

"میں تھک گئی ہوں نہیں بناتی آج چائے وائے" خانسامے کہیں۔"

بینا مصنوعی بے رخی سے صاف کرتی مڑکر اندر کی طرف چلی۔ شرجیل نے بڑھ کر پیچھے سے اس کی چوٹی کھینچ لی۔

"یہ کیا بھئی ——" وہ جھنجلا کر پیچھے مڑی۔

"رام چندر مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے تم جو اتنا ڈھیر سارا کام اس کے سلقے ال کر خوشی خوشی کرتی رہیں۔ میرے لیے ایک کپ چائے بناتے جان نکل رہی ہے ——" وہ عجیب انداز سے بولا۔ شرجیل کی بات پر بینا بے ساختہ ہنس پڑی۔ ایک جھٹکے سے چوٹی چھڑائی اور یونہی ہنستی ہوئی اندر کی طرف بھاگ گئی۔

آج کے ڈنر کے لیے اس نے اپنے لیے گہرے رنگ کی بنفشی ساڑی کا انتخاب کیا جس پر سنہرے ستاروں کا خوبصورت کام بنا ہوا تھا ——— زیور کا وہ ہلکا سا سیٹ بھی نکال لیا جو قیمتی پتھروں کا تھا اور جسے اس کے پاپا سنگاپور سے لائے تھے۔ بال بھی ذرا نئے انداز سے بنائے جو اس پر بہت خوب رہے تھے۔ ہمیشہ کی نسبت ذرا گہرا میک اپ کیا اور سینٹ لگانے کے بعد ایک بار غائر نظروں سے آئینے میں خود کا جائزہ لیا اور مسکرا پڑی۔

بہت دن پہلے کی رضا کی بات اسے یاد آگئی۔

"مشرقی حسن بھی کیا ورٹ لینے والا ہوتا ہے۔"

وہ سچ ہی کہتا تھا ——— شانے پر پلّو جمایا، ڈریسنگ ٹیبل سے ہٹ کر پیچھے مڑی ——— اور اک دم سے ہی مسکرا دی۔ پھر محجوب ہو کر نظریں جھکائیں ——— شرجیل دروازے کا پردہ تھامے بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پسندیدگی کا کھلا تاثر تھا۔ بینا کے چہرے پر افشاں سی بکھر گئی۔ شرجیل نے پردہ چھوڑ دیا۔ نرم سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے اس کی طرف آیا۔ وہ شرجیل کی نظروں کا پیغام پڑھ کر حیا آلود سرخی چہرے پر لیے سر جھکائے خوامخواہ ہی ہاتھوں میں پہنا بریسلٹ کھول کر پھر پہننے لگی۔ شرجیل کی چال میں تمکنت اور وقار تھا، ٹھہراؤ اور سنجیدگی تھی۔

ڈارلنگ صرف یہی چیزیں بچی ہیں

"بینا ———" شرجیل نے دونوں شانوں سے تھام کر سرگوشی میں پکارا۔ اس نے معنی بھری مسکراہٹ کے ساتھ نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں درخشاں ہی درخشاں تھی۔ "یہ حسن کس کے لیے ہے بینا ——؟" وہ بڑی الفت سے پوچھ رہا تھا۔ بینا کا دل زور سے پہلو میں دھڑکا، دل چاہا کہہ دے:

"تمہارے لیے صرف تمہارے لیے شرجیل ———" لیکن وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ بعض جذبے ہوتے ہی ایسے ہیں کہ الفاظ کا جامہ پہن کر اپنا تاثر کھو دیتے ہیں ——— وہ بات کو مذاق میں ٹال گئی۔ شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

"کیوں ہیرو بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

بینا کی یہ بات سن کر شرجیل کا سارا رومانی موڈ غارت ہو گیا۔

"دھت تیرے کی ——— سارے موڈ کا بیڑہ غرق کر دیا ——"

بینا کھلکھلا کر ہنس پڑی، ہنستے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا اور باہر آ گئی ——— شرجیل شوخ کھلنڈرے نوجوان کی طرح سیٹی بجاتا پورچ کی طرف چلا گیا۔

آج کی سیر حسب معمول بہت پر لطف رہی۔ ورائٹی شو بھی دیکھا اور کھانا بھی ہوٹل میں کھایا ——— آج بل بینا نے ضد کر کے ادا کیا۔ بینا بہت موڈ میں تھی اس کے اندر کی عورت اپنی پوری تمناؤں کے ساتھ جاگ اٹھی تھی اور یہ بات شرجیل نے محسوس کر لی تھی۔ واپسی میں موٹر چلاتے ہوئے کہنے لگا:۔

"تمہارے بل دے کر ایسی خوشی ہوئی ——— اتنی اپنائیت معلوم ہوئی کہ بس ——"

"مجھے بھی ——" وہ دلکش انداز میں مسکرائی۔

خریدار :- آپ نے اخبار میں لکھا تھا کہ شراب میں الکوحل حل ہو جاتی ہے۔ میں نے اسے درست پایا۔ بڑا مہربانی یہ بتائیے کہ شراب میں اور کیا کیا چیز حل ہو جاتی ہے۔؟

ایڈیٹر : شراب میں سونا' چاندی' نوٹ' مکان' زمین' عزت' شرافت' ننگ و ناموس اور آخر میں پینے والا خود بھی حل ہو جاتا ہے۔

---

"سگریٹ بھی ختم ہو گئی ہے۔ یہ آخری سگریٹ پی رہا ہوں۔"

"پھر گاڑی روکئے کسی دکان پر ــــــ" بینا نے گاڑی سے باہر جھانکا۔

"کتنا اچھا لگے گا جب تم میرے لیے اپنے پیسوں سے سگریٹ خرید کر دو گی ــــــ" وہ چاہتا تھا بینا آج وہ بات کہہ دے جسے سننے کے لیے وہ مدتوں سے منتظر تھا۔

وہ صرف مسکرا دی بولی کچھ نہ۔

شرجیل نے گاڑی پورشن میں کھڑی کی اور بینا کا ہاتھ تھام کر لان کے اس کونے میں لے آیا جہاں سنگ مرمر کی بنچ بچھی تھی اور سونٹ پی اور نرگس کے پھولوں کی کیاریاں تھیں۔

رات کے چاند کے جزیرے میں غیر مرئی اور روشن خوشبو والے جاسے ناچ رہے تھے۔ نیلے آسمان پر ستاروں کی مدھم قندیلیں روشن تھیں اور خوشبو بھری مست ہوا ڈھیرے ڈھیرے درختوں' پودوں اور پھولوں سے سرگوشیاں کرتی پھر رہی تھی۔

"یہ سکوت آمیز لمحات کتنے تسلی آمیز اور راحت بخش ہیں۔"

شرجیل نے اپنے بالکل قریب بیٹھی بینا کو دیکھ کر سوچا۔

چاند کی سنہری کرنیں اس کے تابندہ رخساروں کا طواف کر رہی تھیں۔ اور اس کے گمبھیر رخسار اس سنہری روشنی میں انگارے کی طرح دمک رہے تھے ــــــ ایک انوکھا سا نشہ فضا پر طاری تھا۔ نیم وا آنکھوں سے شرجیل بینا کو مسلسل تک رہا تھا ــــــ اور ان نظروں کی گہرائی اور پُر اسرار سی چمک کو محسوس کر کے بینا کے چہرے پر لالی دوڑ گئی۔ ایک بار شرگیں نگاہوں سے شرجیل کو دیکھا پھر آنکھیں بند کر کے اس کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ شرجیل کے لیے اس وقت سنبھلنا بہت مشکل ہو گیا' اس کی زندگی اس کے قدموں سے لپٹی تھی مگر وہ اسے اپنا نہیں سکتا تھا ــــــ دونوں کے دلوں میں ایک ہی جذبہ تھا' پیار کا' محبت کا' محبت جو دنیا کی پہلی اور آخری سچائی ہے ــــــ پیار جو دونوں کی روحوں میں سما کر پارے کی مانند مچل رہا تھا مگر اظہار سے دونوں ہی گریزاں تھے ــــــ دونوں خوفزدہ تھے ــــــ پچھلے واقعات کی بنا پر ــــــ۔ شرجیل چند لمحے بے خودی کے عالم میں بینا کو دیکھتا رہا ــــــ اس نے دل میں ایک انوکھی سی چبھن محسوس کی ــــــ اور آہستہ سے آنکھیں موند لیں۔

"کیا ہوا شرجیل ــــــ ؟"

اس نے آنکھیں کھولیں' ایک بار ــــــ دوبار ــــــ بینا کو دیکھا پھر آنکھیں موند لیں۔

"مجھے اپنا ہمراز بنا لو شرجیل۔ میں تمھاری سب سے پیاری دوست ہوں نا ــــــ !"

اور اس وقت بینا کے منہ سے "دوست" کا لفظ سن کر شرجیل کو ایسی ہی اذیت پہنچی جیسی کہ بینا بارہا اٹھا چکی تھی۔

"بینا ــــــ" اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔ اس نے اپنا سر بینا کے زانو پر رکھ دیا ــــــ وہ پیار سے اس کے لمبے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

"مجھے اتنا کچھ جان کر بھی کچھ نہ جان سکیں ــــــ" وہ مسکرایا۔

"مجھے تو یہی لگتا ہے کہ تم کسی کے عشق میں پاگل ہو رہے ہو اور وہ تمہیں گھاس نہیں ڈالتی۔ شاید اس سانولی رنگت کو دیکھ کر بدک گئی ہو گی۔ ٹھیک ہی کیا اس نے' اتم کچھ ایسے حسین تو نہیں ہو نا ــــــ !"

"ہم دونوں ہی خود اذیتی کا شکار ہیں۔" شرجیل نے اٹھتے ہوئے سوچا اور سگریٹ سلگاتا ہوا اپنے کمرے کو مڑ گیا۔

❋

اس دن خانم کی طبیعت قدرے ناساز تھی۔ نزلے کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا بخار بھی ہو گیا تھا۔ بینا نے اپنا زیادہ وقت خانم کے پاس ہی گزارا انہیں کوئی کام نہ کرنے دیا خود ہی سب کام کرتی رہی ــــــ شام کی چائے بھی بینا خانم کے کمرے میں ہی لے آئی ــــــ شرجیل بھی آفس سے آ گیا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے خانم ــــــ ؟" وہ ان کے پاس بیٹھتا ہوا بولا۔

"ٹھیک ہوں ــــــ بیٹھو چائے پیو ــــــ"

بینا نے سب سے پہلے خانم کو چائے دی۔ پھر شرجیل کو اور اپنا کپ لے کر کچھ دور رکھی ایزی چیئر پر بیٹھ رہی ــــــ دونوں ماں بیٹے صدیقی صاحب کے گھر والوں کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ مسز صدیقی نے جمیلہ کو بے حد پسند کیا تھا اور اپنے بیٹے کا رشتہ اس سے کرنا چاہ رہی تھیں۔ ان کا لڑکا ڈاکٹری پڑھ رہا تھا ایک سال پڑھائی کا اور رہ گیا تھا۔

مسز صدیقی منگنی کرنے پر زور دے رہی تھیں۔ شادی چاہے دو تین سال بعد ہو مگر صبیحہ انھیں اتنی پسند آئی تھی کہ وہ اسے انگیج کر لینا چاہتی تھیں۔ لڑکے کو سبھی نے دیکھا ہوا تھا۔ خوبصورت، عقلمند اور اچھے کردار کا تھا۔ شرجیل کو پسند بھی تھا۔ کہنے لگا۔

"تو پھر کر دیں منگنی، حرج ہی کیا ہے۔؟"

"صبیحہ کی اتنی جلدی نہیں ہے۔ یہ اچھا نہ لگے گا کہ بینا سے پہلے اس کی شادی طے ہو جائے۔" خانم نے بہت آہستہ لہجے میں یہ بات کہی جو بینا کے کانوں تک بھی پہنچ گئی ——— اور چہرے کی رنگت بدلنے لگی مگر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پا لیا۔ ٹانگیں ہلاتے ہوئے بیٹھی سکون سے چائے پیتی رہی اور پاس پڑے میگزین سے تصویریں دیکھتی رہی مگر کان ادھر ہی لگے تھے۔

"بات تو آپ کی ٹھیک ہے خانم ——— اس طرح وہ اور بھی احساسِ کمتری کا شکار ہو جائے گی اور یہ اچھا نہ ہوگا ———" پھر ذرا ٹھہر کر کہنے لگا: "بینا کے لیے کوئی مناسب لڑکا ہے آپ کی نظر میں۔؟"

"تم سے زیادہ اور کون مناسب ہوگا شرجیل ———" وہ اپنے دل کی بات کہہ گئیں۔

"خانم ایک بار کا تجربہ کافی نہیں ہے کیا آپ کے لیے ——— سب کچھ جان کر بھی آپ دوبارہ ایسا کہہ رہی ہیں۔"

خانم چپ سی ہو گئیں ——— شرجیل نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کنکھیوں سے بینا کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے انہماک سے تصویریں دیکھنے میں لگی تھی۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر خانم بولیں:

"زمان صاحب کا لڑکا کیسا رہے گا ———؟"

"کون ——— اعجاز ———!"

"ہاں میں اسی کے متعلق کہہ رہی تھی۔ کینیڈا سے سی اے کر کے پچھلے سال ہی لوٹا ہے۔ اچھی پوسٹ پر لگا ہے۔ اس کے گھر والوں نے اور خود اس نے بھی بینا کو دیکھا ہے۔"

"بینا سے پوچھ لیں ———"

"میرا خیال ہے مشکل سے ہی راضی ہوگی۔" خانم سر ہلا کر تفکر سے بولیں۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ خانم بات شروع کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہی تھی اور شرجیل دل کا دکھ دھوئیں میں اڑا رہا تھا ——— آخر کار خانم نے بینا کو مخاطب کر ہی لیا:

"بینا ———"

"جی ———" وہ جان بوجھ کر قدرے چونکی۔ "جی خانم!"

"نہیں بینا مجھے تم سے کسی اور ہی مسئلے پر گفتگو کرنی ہے۔"

"میں سن رہی ہوں کہیے آپ ———"

"صبیحہ کے لیے رشتہ آیا ہے صدیقی صاحب کے لڑکے کا۔" خانم نے بڑی ہوشیاری سے بات شروع کی۔

"پھر خانم ——— کیا آپ کو لڑکا پسند نہیں ———؟"

"پسند ہے ——— مگر تم سے پہلے صبیحہ کی شادی کا کیا سوال۔"

"خانم میں ابھی شادی نہ کروں گی ———"

"جی ہاں ———" شرجیل خندہ سے بولا۔ "آپ کبھی شادی نہ کریں گی اور میری اماں جان کے سینے پر مونگ دلیں گی۔" شرجیل نے کچھ اس انداز سے کہا کہ خانم کے ساتھ ساتھ بینا بھی ہنس پڑی ——— پھر خانم نے پوچھا:

"تم نے زمان صاحب کے لڑکے اعجاز کو دیکھا ہے ———؟"

"بھئی خانم چھوڑیں نا اس ذکر کو ———"

"آخر تم نے سوچ کیا رکھا ہے بینا ———" خانم قدرا تیز لہجے میں بولیں۔

"جو سوچ رکھا ہے وہ بتانے کا وقت ابھی نہیں آیا۔" وہ مسکرائی۔

"ہاں جب بال سفید ہو جائیں گے تب وقت آئے گا۔" خانم کو غصہ آ گیا۔ بینا بیٹھی ہنستی رہی۔

"خانم یہ لڑکی آپ کو اسی طرح ستاتی رہے گی، جلاتی رہے گی، آپ اس کی بالکل نہ سنیں، جیسا آپ مناسب سمجھتی ہیں کریں ——— اعجاز کے علاوہ میرے بھی کتنے اچھے اچھے دوست ہیں ——— بینا ملواؤں تمھیں ان سے پسند کر لو کسی ایک کو ———" وہ شرارت سے مسکرایا۔

# ماہنامہ دوشیزہ کی عظیم پیشکش

بہترین طبعزاد رومانی ناول کیلئے 5000 روپے

ماہنامہ دوشیزہ کے قارئین کے لیے ہم رومانی ناول کا ایسا سلسلہ شروع کرنا چاہتے ہیں جس کی ہر قسط بے انتہا خوبصورت اور دلچسپ ہو! بہترین ناول کا انتخاب ۵ جوں پر مشتمل کمیٹی کرے گی۔ منتخب کئے جانے والے ناول کو ۵ ہزار روپے دیئے جائیں گے۔ ناول دوشیزہ کے کم از کم تین سو صفحات پر مشتمل ہونا چاہیے۔ نئے اور پرانے لکھنے والے اس مقابلہ میں حصہ لے سکتے ہیں۔

| بہترین طبعزاد کہانی | 500 روپے |
|---|---|
| دوسرے نمبر پر | 300 روپے |
| تیسرے نمبر پر | 250 روپے |
| دوشیزہ میں چھپنے والی ہر کہانی پر | 150 روپے |

| بہترین ترجمہ شدہ کہانی | 300 روپے |
|---|---|
| دوسرے نمبر پر | 150 روپے |
| تیسرے نمبر پر | 75 روپے |
| دوشیزہ میں چھپنے والی ہر ترجمہ شدہ کہانی پر | 50 روپے |

**صوبائی کہانیاں** سندھی، بلوچی، پشتو اور پنجابی کہانیوں کو ہر صورت میں ترجیح دی جائے گی؛ منتخب کی جانے والی کہانیوں کو مزید ۲۵ روپے دیئے جائیں گے؛

## اس مقابلہ کی آخری تاریخ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۵ء ہے

ان خواتین اور حضرات کو دوشیزہ سال بھر تک مفت بھیجا جائے گا جن کے بھیجے ہوئے ۶ لطیفے، تراشے یا اقتباسات دوشیزہ میں اشاعت کے لیے چن لیے جائیں گے۔ اس کی اطلاع فوری طور پر خط کے ذریعے دی جائے گی۔ ڈائجسٹوں میں چھپے ہوئے لطیفے، تراشے اور اقتباسات قابل قبول نہیں ہوں گے۔

**آپکی نظر میں** ۱۹۷۲ء کا بہترین افسانہ کونسا تھا؟ کس رسالہ یا ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا؟ کٹنگ بھیج کر خصوصی انعام لیجئے

**صرف "دوشیزہ" میں لکھنے کا معاہدہ کرنے والے معروف افسانہ نگاروں کو ماہوار ۱۰۰۰ روپے دیئے جائینگے**

مزید تفصیلات کیلئے

**ماہنامہ دوشیزہ * پوسٹ بکس ۸۰۹۵ کراچی ۲۹**

چلی گئیں تو آپ یہیں بیٹھے رہے اور آپ آئیں بھی تو اطلاع تک نہ دی —"
بینا ہنس پڑی۔ اس ہنسی کی آواز کو کچھ دور کھڑے شرجیل نے بھی سنا اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ رضا اور بینا کو یوں ہنستے باتیں کرتے دیکھ کر چہرے پر تلخی سی ابھر آئی — رضا کی نظر شرجیل پر پڑی تو آواز دے ڈالی۔ وہ سگریٹ پیتا لاپروائی سے چلتا پاس آگیا۔

"بھئی کمال کر دیا شرجیل۔ بینا یہاں چار ماہ سے ہیں اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں —"

"کوئی ایسی خاص ضرورت نہ سمجھی تھی۔"

"تمہیں ضرورت نہ تھی مجھے تو تھی یار۔" شرجیل نے رضا کے لہجے میں چھپی دلچسپی کو محسوس کیا اور دوسرا سگریٹ سلگانے لگا۔

"آپ کی یہ زیادتی قابلِ معافی نہیں ہے مس بینا —" رضا نے آنکھوں میں ہزاروں شکوے لیے بینا کو دیکھا۔

"تو سزا دے لیں۔" وہ ہنس کر بولی۔

"دوں گا — ضرور دوں گا۔ ابھی مناسب موقع نہیں ہے۔ — اور سزا بھی دلچسپ ہے۔ اتنے لوگوں کے درمیان دی بھی نہیں جا سکتی کل شام کو آؤں گا۔ تیار رہیے گا —"

"بسر و چشم —" بینا شوخی سے ہنستی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔
شرجیل نے اس شوخ سی ہنسی کو سنا، اس کے والہانہ انداز کو محسوس کیا اور ہونٹ بھینچ کر ادھ جلی سگریٹ پیروں تلے مسل ڈالی۔

شرجیل کی موٹر کی آواز سن کر بینا کے بال بناتے ہاتھ رک گئے — برش ہاتھ میں لیے کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے اس نے ایک اچٹتی سی نظر گھڑی پر ڈالی۔

"ابھی تو ساڑھے چار ہی بجے ہیں — آج اتنی جلدی —؟"
اس نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر دیکھا شرجیل موٹر برآمدے کی سیڑھیوں تک لے آیا تھا۔ ایک ٹانگ کھلے دروازے سے گھاس پر رکھی تھی اور سوچ کا ہلکا سا تاثر تھا — بینا کھڑکی میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ یوں سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کچھ الجھن سی محسوس کر رہی تھی —"

"کیا بات ہو سکتی ہے —؟" اس نے ہونٹ دبا کر سوچا —
"اونہہ ہو گی کوئی بات —" اس نے شانے جھٹکے اور دوبارہ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف چلی گئی۔

کل دعوت میں رضا نے آج آنے کے لیے کہا تھا۔ اور بینا اس کی منتظر تھی۔ بہت دنوں بعد بلکہ کئی مہینوں بعد کل اس سے ملاقات ہوئی

حساس اور سلجھا ہوا انسان تھا۔ ایک اچھے انسان کی طرح بینا اسے پسند کرتی تھی۔ اس سے زیادہ اور کوئی جذبہ بینا کے دل میں رضا کے لیے نہ تھا۔ جانتی تھی کہ رضا کس حد تک اسے پسند کرتا ہے — اور بارہا اس نے بڑی معصومیت اور سلجھے ہوئے انداز میں اپنے دلی جذبات کا اظہار مبہم لفظوں میں اسے اپنا لینے کی شدید خواہش کا اظہار بھی کیا تھا جسے سن کر بینا اکثر ہنستی رہتی، بعض اوقات سب کچھ جان کر بھی انجان بن جاتی صرف اس لیے کہ یہ معصوم دل انسان کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر خود کو کوئی روگ نہ لگا بیٹھے — اور دل کا روگ کیسا برا ہوتا ہے اس کا اندازہ بینا کو اچھی طرح تھا — اب وہ اس دل کا کیا کرے جس میں رضا کے لیے ایسے کوئی جذبات نہ تھے جسے محبت یا پیار کا نام دیا جا سکے۔

وہ خوبصورت ہے — دولتمند ہے — خوش مزاج ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ مجھے اتنا پسند کرتا ہے — مگر ان سب چیزوں سے ہٹ کر بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے — بالکل انوکھی — بالکل علیحدہ — یہ تو دل کے رشتے ہوتے ہیں۔

"کاش میں تمہارے ان جذبات کی قدر کر سکتی رضا۔"

اسے رضا سے بے پناہ ہمدردی محسوس ہوئی۔ کل اتنے عرصے بعد اچانک بینا کو دیکھ کر جس طرح خوش ہوا تھا جتنی گرم جوشی سے ملا تھا اور اس کے انداز میں جتنی وارفتگی تھی اسے بینا نے صاف طور پر محسوس کیا تھا — اور کچھ خوش اور کچھ حیران سی بھی تھی — وہ مجھے اتنا پسند کرتا ہے — اس حد تک — یہ سب کچھ محسوس کر کے بینا اس سے بہت متاثر ہوئی تھی اپنی ذات کے متعلق اتنی گہری پسندیدگی محسوس کر کے رضا سے اور بھی اپنائیت سی محسوس ہوئی — آج اس کے آنے کے خیال سے وہ خوش تھی — اس کی منتظر تھی — اس کے منہ سے ڈھیروں باتیں سننا چاہتی تھی جو صرف اس کی ذات کے متعلق ہوں۔

"بینا —!" وہ خیالوں سے چونکی

"بینا —!!"

"آ جائیں شرجیل — آ جائیں۔" اس نے کرسی پر پڑا دوپٹہ اٹھا کر جلدی سے شانوں پر ڈال لیا۔

"کہاں کھوئی ہوئی تھیں —" وہ اسے گہری نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔ جیسے اسے نظروں ہی نظروں میں ٹٹول رہا ہو

"جہاں کھونا تھا کھو چکی۔ بار بار کھونے کی عادت نہیں —" وہ بڑے دلکش انداز میں مسکرائی۔ شرجیل کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آ گئی۔

"پوچھ سکتا ہوں — کھوئی کہاں ہو —؟" وہ شرارت سے

مسکرایا۔
"نہ ―― پوچھنے کی نہیں ہوتی ――" وہ شوخی سے ہنسی۔
"یہ بات ہے ―― اچھا ――"
"بتاؤں بھی کیا ――" وہ ہنسی۔ "جبکہ خود کو بھی پتہ نہیں۔"
"ارے واہ یہ کیا بات ہوئی ―― خود کو خبر نہیں کہ کہاں کھوئی ہو
کچھ تو سراغ لگایا ہوتا ――"
"ضرورت بھی کیا ہے ――" وہ بدستور شرارت سے ہنستی رہی۔
"اگر کہو تو میں سراغ لگاؤں تمہارا ――" وہ مسکرایا۔
"مہربانی ضرور کی ―― " بینا نے ہنستے ہوئے ہاتھ جوڑے۔
"آپ تکلیف نہ کریں۔"
"تمہارے بھلے کی ہی کہہ رہا تھا ――" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔
"بھلا کیسا ―― ؟"
بینا نے پھر شرارت بھری جگمگاتی آنکھوں سے شرجیل کو دیکھا۔ وہ
کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے سگریٹ پیتے ہوئے نیم وا آنکھوں سے
اسی کو تک رہا تھا ―― وہ جو انگوری لباس میں مسکراتے چہرے کے
ساتھ بڑی بھلی لگ رہی تھی ―― جس کے رخساروں پر لالی سی تھی اور
آنکھوں میں شوخی اور ایک خاص چمک تھی ―― وہ ایک الہڑ سی لڑکی
کی طرح انگوری شلوار قمیص اور سیاہ چپل پہنے پھولوں سے گھرے دریچے
میں جھکی تھی ―― اس کے سیاہ گھنیرے بالوں کی چوٹی کمر پر لہرا رہی تھی
چہرے پر خوشگوار سا تاثر تھا ―― بینا نے گھڑی دیکھی اور شرجیل ایک دم
سے ہی جوش میں آگیا ―― تیزی سے اٹھ کر بینا کے پاس آیا ――
اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔
"چلو کہیں تفریح کے لیے چلتے ہیں کتنا پیارا موسم ہے۔"
"شرجیل ―― دل نہیں چاہ رہا ――"
"دل نہیں چاہ رہا یا ―― یا ――"
بینا نے اس ادھوری بات کو سنا اور ہونٹ کاٹنے لگی۔
"سچ بولنا اچھی بات ہوتی ہے ――" شرجیل کے لہجے میں
ایسی چبھن تھی کہ بینا برداشت نہ کر سکی ―― چہرہ گرم ہو گیا مگر فوراً ہی
خود پر قابو پا لیا ―― بینا اس کی طرف دیکھ کر آہستہ لہجے میں بولی۔
"مجھے بھی جھوٹ سے نفرت ہے۔"
"اور سچ بول بھی نہیں سکتیں ―― بہت خوب ――"
شرجیل تلخی سے ہنسا۔
"آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں ―― ؟" بینا نے تیز لہجے میں پوچھا۔
"تم رضا کا انتظار کر رہی ہو ―― ؟"

**دنیا** میں جتنی لعنتیں ہیں بھوک ان سب
کی ماں ہے، بھوک گداگری سکھاتی ہے۔ بھوک جرائم کی ترغیب
دیتی ہے۔ بھوک انتہا پسندی کا سبق سکھاتی ہے۔ اس کا حملہ
بہت شدید اور اس کا وار بھرپور اور اس کا زخم بہت گہرا ہوتا ہے۔

سعادت حسن منٹو
ثاقب علی مردان

"ہاں ――" اس نے بغیر رخ موڑے جواب دیا ―― اور
اس صاف جواب پر شرجیل نے یک دم عجیب سی تھکن محسوس کی جس نے
اس کے اعصاب کو نڈھال کر ڈالا ―― کچھ دیر پتھرائی آنکھوں سے
اسے دیکھتا رہا ―― بینا کے قریب کھڑے رہنا دوبھر ہو گیا۔ قدم اٹھے
پھر تھم گئے۔
"بینا ―― !" شرجیل نے پکارا۔
"جی ―― !" بینا نے رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ ہاتھ میں
لاپروائی سے سگریٹ تھامے کھڑا تھا۔ چہرے پر سنجیدگی اور تھوڑی سی سختی
تھی ―― بینا نے ایک لمحے کو رک کر کچھ سوچا پھر پاس آگئی ――
آہستہ سے اس کے بازو کو چھوا ――
"شرجیل ―― ہوا کیا ―― کیا سوچ رہے ہیں ―― ؟"
"میرے ساتھ کہیں سیر کو چلو ―― !"
"رضا آ رہا ہے شرجیل آج ―― کل آپ کے ساتھ چلوں گی۔"
"اور پرسوں ―― ؟" شرجیل چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔
بینا یک دم چونک پڑی ―― نظر اٹھا کر شرجیل کو دیکھا۔ اس
کے چہرے پر سختی تھی، ہلکی سی کرختگی بھی اور ہونٹوں پر پراسرار سی تحقیر آمیز
سی مسکراہٹ ―― ایسی مسکراہٹ جس نے بینا کے سارے وجود
کو ہلا دیا ―― اتنی شدت سے اپنی توہین کا احساس ہوا کہ دل چاہا
خود مر جائے یا شرجیل کو مار ڈالے۔ شعلہ بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے
سخت لہجے میں پوچھا۔
"اس بات سے کیا مطلب ہے آپ کا ―― ؟"
جواب میں شرجیل نے اونچا تلخ قہقہہ لگایا اور مڑ گیا۔
"شرجیل ――" بینا آؤٹ ہو گئی ―― بڑھ کر پیچھے سے
اس کا بازو تھام لیا انتہائی سختی سے۔
"میری بات کا جواب دیں آپ ――"
"مجھے خاموش رہنے دو تو زیادہ بہتر ہے ――" وہ ایک دم

[illegible] ——— اپنی حماقت کا احساس ہوا
شرجیل کی بات پر غور کیا اور اک دم ہی چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا ———
غصے سے گال تمتما اُٹھے۔

"شرجیل ———!" اس نے تیز لہجے میں پکارا۔ "اتنی گھٹیا بات کہنے کی آپ کو اجازت کس نے دی ——— کیسے کہی یہ بات مجھے جواب دیں ——— کیسے کہی اور کیوں کہی ———؟؟" اس کی آنکھوں میں شعلوں کی لپک تھی ——— شرجیل نے انتہائی چبھتی نظروں سے اسے دیکھا اور تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے سے باہر چلا گیا ——— بینا کی آنکھوں کے آگے رنگ برنگے پتنگے سے ناچنے لگے ——— "اتنی جلدی" اتنی اچانک وہ پہلے والے شرجیل اور بینا لوٹ آئے ——— ایک ہی لمحے میں تناؤ بھرا سارا فاصلہ پیدا کر ڈالا ——— اپنی اپنی جگہ دونوں حیران تھے یہ ایک ہی پل میں کیا ہو گیا ——— دونوں کی حاسد اور ضدی فطرت ایک بار پھر پوری شدت کے ساتھ اُبھر آئی تھی ———
وہی شرجیل، ضدی، تلخ، اکھڑ اور مغرور جسے بینا نے پہلے روز دیکھا تھا، ایک طویل عرصے کے بعد پھر اسی روپ میں سامنے آگیا۔ اور شرجیل جس نے بینا کو پہلے دن سے ہی بے حد خود دار، تقریباً اذیت پسند اور ضدی پایا تھا اب دوبارہ وہی بینا لوٹ آئی تھی ——— اپنا اصلی چولا پہن کر سامنے آگئی تھی۔ جسے بظاہر دنیا کی پروا نہ تھی جس نے ہمیشہ اپنی من مانی کی ہے اور جسے اپنا پن بہت عزیز ہے۔

دکھوں اور پے در پے صدمات نے اسے بدل ڈالا تھا۔ بہت نرم بہت سیدھی ہو گئی تھی۔ احساس کمتری کا شکار ہو گئی تھی ——— جس میں خود ترسی کا مادہ پیدا ہو گیا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ احساس کمتری کم ہوتا گیا ایک بار پھر اپنا آپ بہت عزیز ہو گیا۔ وہ عام لڑکیوں سے قطعی مختلف فطرت کی مالک تھی۔ اس نے بہت جلد حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ پچھلی ساری ہی باتوں کو بھلا دیا۔ اپنے بچھڑنے ہونے کا احساس مٹ گیا۔
"یوں تو ہوتا ہی رہتا ہے ایسی کون سی بڑی بات ہے۔"
یہ سوچ اسے مطمئن کر گئی۔ اس کے اندر کی سوئی ہوئی خود دار بینا کو بیدار کر گئی۔

"تم خود کو فریب دے رہی ہو بینا ———" پھر کسی نے پاس ہی سرگوشی کی ہو بہت مدھم ——— بہت پُراسرار لہجے میں ——— اور بینا کی پیشانی پر ٹھنڈے پسینے اُتر آئے۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر گہری سانس لی اپنے آپ سے کچھ خوف سا معلوم ہونے لگا ——— وہی مدھم سی سرگوشی ایک بار پھر اُبھری۔

آنکھیں کیوں چھلک اٹھتی ہیں۔ شرجیل کا خیال تمہارے ذہن کی فضا میں کیوں کھینچے لگتا ہے۔ تم حقیقت کو جھٹلا رہی ہو۔ اپنے آپ کو خود سے بھی چھپائے رکھتی ہو ——— آخر کیوں ——— کیوں ——— کیوں ———؟"
"نہیں نہیں یہ سب جھوٹ ہے ——— میں بالکل مطمئن ہوں"
اُلجھی اُلجھی سی سانسیں لیتی وہ بے دم سی ہو کر بستر پر گر پڑی ———
بازوؤں میں سر چھپائے وہ ان دنوں کے متعلق سوچتی رہی جب زندگی پُرسکون تھی ——— جب شرجیل اس کے لیے بہت بڑا سہارا بن گیا تھا ——— بڑے اچھے انداز میں اس سے پیش آیا کرتا تھا ——— وہ لمحے کتنے خوبصورت ——— کتنے پیارے تھے۔ گزرے ہوئے لمحات کا احساس انجانی سی خوشی دے گیا۔

گھر کے ماحول میں پھر وہی کھچاؤ پیدا ہو گیا تھا پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ ——— راجو اور صبیحہ ناشتے کے بعد کالج چلے جاتے۔ بینا خانم کے ساتھ مل کر کام کروایا کرتی۔ ہر دم خود کو مصروف رکھتی بیکار سے کاموں میں اُلجھی رہتی ——— اپنے آپ سے خوفزدہ سی رہتی ———
"کسی وقت جانے کیا کر ڈالوں ———"
کبھی کبھی دل چاہتا سب کچھ توڑ پھوڑ کر کر دے ——— یا کوئی ایسی بات ایسا کام کر ڈالے کہ سب چونک اُٹھیں۔ سب کے ساتھ اپنے وجود کو بھی مٹا ڈالے ——— اور کچھ باقی نہ بچے ——— ایک لمحے میں قیامت آجائے اور سب کچھ اپنے آپ مٹ جائے ——— یوں کہ نام و نشان باقی نہ رہے اور ایسے ہی اکثر اس کا ذہن تخریبی ہو جاتا پھر اک دم سے ہی سہم اٹھتی۔
"مجھے کیا ہو گیا ہے ——— کہیں کچھ کر نہ ڈالوں ———"
سارا دن کتابوں میں سر کھپایا کرتی، ڈھیروں ہی ناول پڑھ ڈالے، اور وہ شوق جو اُسے بچپن میں تھا ایک بار پھر اُبھر آیا ——— چھوٹے چھوٹے خوبصورت افسانے لکھنا جن کا انجام ہمیشہ المیہ ہوتا ——— یا پھر پیانو پر بیٹھی رات گئے تک مختلف دھنیں بجایا کرتی جن میں سے کچھ شوخ بھی ہوتیں اور کچھ المیہ بھی ——— اور جب بہت تھک جاتی تو ہتھیلیوں پر چہرہ ٹکا کر آنکھیں بند کئے خاموشی سے کچھ سوچتی رہتی ——— یا پھر اپنے ہاتھوں سے ڈھیروں چائے بنا کر پیتی رہتی۔ اکثر چائے کا کپ سامنے رکھا ہوتا اور وہ جانے کیا سوچا کرتی۔ گرم بھاپ کو اُٹھتے دیکھتی رہتی یہاں تک کہ چائے ٹھنڈی ہو کر پالا ہو جاتی ——— پھر وہ اپنے لیے دوسرا گرم کپ تیار کرتی اور یہ سب کچھ رات کو ہی ہوتا، دن کو وہ بظاہر خوش باش سی پھرا کرتی، شیلا سے گھنٹوں گپیں لڑاتی۔ اس کی دلچسپ باتوں پر ہنستی رہتی ——— اور اس کی چھیڑ چھاڑ کو وہ بڑے سکون سے ہنس کر ٹال دیتی ——— اس کی بیباکیوں پر اسے ڈانٹتی رہتی ———

شیلا منوج سے ساتھ ہر وقت ساری داستان بیان کرتی رہتی تھی کہ وہ باتیں بھی جو اپنے ہی حد تک محدود رکھنے کی ہوتی ہیں۔ مگر وہ سب کچھ بتا ڈالتی۔ بینا اسے صرف باتیں سناتی اور شوخ شوخ سے قہقہے لگایا کرتی ——— پھر کبھی کبھی سنجیدگی سے بینا کو سمجھاتی بھی کہ وہ شرجیل یار ضا میں سے کسی ایک کو پسند کرلے ورنہ وقت گزر جائے گا اور پچھتاوے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ بینا خلاؤں میں دیکھتے ہوئے اس کی بات سنتی اور بینا اس کی طرف دیکھے کہتی۔

"مجھے بیاہ نہیں کرنا ہے شیلا۔"

"تنہا کیونکر جی سکو گی بینا۔ یہ جگ بڑا خراب ہے اور عورت کو مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے ——— ورنہ یہ ظالم سماج اسے کچل ڈالتا ہے۔ اس پر ایسے ایسے الزامات لگا دیتا ہے کہ جیون روگ بن جاتا ہے۔ عورت کے لیے یہ دنیا بہت بُری ہے۔ مرد کی خطاؤں کی سزا بھی عورت کو ہی ملتی ہے بینا یہ جانے کیا پرادھی کرن ہے ——— بھلا کس نے کیا ہے۔" اور شیلا کے منہ سے ایسی سنجیدہ گفتگو سن کر بینا حیرت میں پڑ جاتی۔ یہ لڑکی جو بظاہر اتنی لاپروا شوخ اور الہڑ سی نظر آتی ہے اندر سے کتنی گہری ہے۔

شیلا کے ہزار سمجھانے پر بھی جب بینا کا یہی جواب ہوتا کہ مجھے بیاہ نہیں کرنا ——— تو شیلا چڑ کر کہتی،

"میری بلا سے ڈکرو بیاہ سورگ میں جاؤ۔"

اس روز جب شام ڈھل رہی تھی اور سنہری دھوپ اپنے اجلے پر سمیٹ کر جانے کے اونچے درختوں میں چھپ رہی تھی بینا گول ستونوں والے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی شفق کا نظارہ کر رہی تھی۔ شیلا نے ریل کی رفتار سے بھاگتی ہوئی آئی اور دھم سے اس کے برابر بیٹھ رہی۔ گہری گہری سانسیں لیتی ہوئی بولی۔

"بینا فٹافٹ تیار ہو جاؤ ———"

"ارے کیا افتاد آپڑی ———"

"بھگوان قسم وہ بس تمھارے ہی لیے پیدا ہوا ہے۔"

"ارے کون ——— ؟"

"وہ کاشف ——— میرے گھر آیا بیٹھا ہے۔"

"میں نہیں جانتی کسی کاشف واشف کو دفع ہو یہاں سے۔"

"رام قسم ایسا گولڈن چانس پھر کبھی نہ آئے گا۔ چلو اٹھو میرے ساتھ!"

"مجھے کہیں نہیں جانا ———" اس نے بیزاری سے شانے جھٹکے۔

"ہائے اسے ایک نظر دیکھ تو لے ظالم ———" شیلا نے کچھ ایسے

انداز میں کہا کہ بینا ہنس پڑی۔ "سچ کہتی ہوں وہ اتنی ڈیشنگ پرسنلٹی کا مالک ہے کہ تم دیکھتی رہ جاؤ گی۔"

"تم سچ مچ گھاس کھا گئی ہو ———" بینا ہنستے ہوئے اس کے ساتھ ہولی، راستے بھر شیلا اس کے کان کھاتی رہی۔ اس کی تعریف میں کلاک ٹاور کھڑے کرتی رہی۔ بینا سب کچھ سنتی رہی مسکراتی رہی بولی کچھ نہ۔

کوٹھی پر پہنچ کر شیلا نے ہانک لگائی

"ماتا بینا آئی ہے ——— گرم گرم چائے ———" اور پھر وہ یونہی بینا کا ہاتھ پکڑے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔

"ارے ہاتھ تو چھوڑ بھاگی تھوڑا ہی جا رہی ہوں۔"

"تمھارا کچھ بھروسہ نہیں ———" وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔

بینا ہنس پڑی ——— ڈرائنگ روم کا پردہ اٹھا کر اندر آئی تو وہ سامنے ہی صوفے پر بیٹھا گوپال سے باتیں کر رہا تھا۔ بینا نے اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی۔ وہ چھبیس ستائیس سال کا بیحد اسمارٹ اور خوش پوشاک نوجوان تھا جس کے بال بیحد سیاہ اور ہلکے سے گھونگھریالے تھے۔ ماتھے پر ایک خوبصورت سی لٹ کسی گیت کے آوارہ بول کی طرح پڑی تھی ——— اور اس کی آنکھوں میں بیحد چمک اور بڑی گہرائیاں تھیں ——— وہ شیلا کے ساتھ ہی سامنے والے صوفے پر بیٹھ رہی۔

"ہائے ناسپرڈ بیٹرز ——— ؟" شیلا نے سرگوشی کی۔ بینا کچھ نہ بولی ایک دو بار پلکیں جھپک کر کاشف کو دیکھا اور پھر دوسری طرف دیکھنے لگی سپاٹ چہرے کے ساتھ ———

"دیدی ان دونوں کا تعارف تو کرا دو ———" گوپال شیلا سے بولا۔

"ارے ہاں میں تو بھول ہی گئی ——— بینا یہ کاشف ہیں

ہ۔۔۔ بچے۔ پھر ہم ہیں۔ جہاں ہماری ملاقات پہلی بار ہوئی ہے۔" پھر وہ کاشف کی طرف مڑی۔ شرارت بھرے لہجے میں بولی۔ "اس کے متعلق بس اتنا ہی بتا دینا کافی ہے کہ کاشف کو سٹ

کوراکاغذ تھا یہ من میرا ـــــ"

وہ موڈ میں پیچ پیچ گنگنانے لگی۔ شیلا کی اس بات پر کاشف ہنس پڑا۔ بینا بھی کچھ جھینپ کر مسکرا دی۔

"لیے مسٹر ـــــ" شیلا نے کاشف کی طرف دیکھا۔ "میری اتنی پیاری سکھی دیکھی اور تم نے اس کی تعریف میں ایک لفظ نہ کہا۔"

کاشف نے گہری نظروں سے بینا کی طرف دیکھا۔ چند لمحے دیکھتا رہا ـــــ ماچس جلا کر سگریٹ سلگائی اور دھواں چھوڑتے ہوئے دھند کے پیچھے سے بینا کو نیم وا آنکھوں سے دیکھا ہلکے گلابی لباس میں وہ بہت سندر لگ رہی تھی۔ پلکیں جھکائے گلابی چہرے کے ساتھ صوفے پر بیٹھی تھی۔

"میں نے ان کی تعریف میں کچھ نہیں کہا شیلا اس کی تمہیں شکایت ہے ؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اور کیا ـــ آپ نے میری اتنی پیاری سہیلی کی تعریف نہ کر کے اس کی گریٹ انسلٹ کی ہے۔ آپ سے ایک بہت بڑا جرم سرزد ہو چکا ہے اس کی سزا تو ملے گی آپ کو۔" شیلا چہکی۔

"مجرم سزا سننے کے لیے تیار ہے۔" وہ بدستور مسکراتا رہا۔

"شاندار ڈنر ـــــــ منظور ـــ ؟"

کاشف نے نظر اٹھا کر بینا کو دیکھا ـــــ شیلا نے اس کا بازو چھوا۔

"کیوں پارٹنر سزا خوبصورت ہے نا ـــــ ؟" بینا مسکرا دی۔ بولی کچھ نہ۔

"میں تو اس سے کہیں زیادہ خوبصورت سزا کی توقع رکھتا تھا۔" کاشف نے اپنی بادامی آنکھوں سے ہونٹوں پر بہت معنی خیز سی مسکراہٹ لیے بینا کو دیکھا ـــــ وہ نروس ہو گئی ـــــ اس معنی خیز مسکراہٹ کو محسوس کر کے کان کی لویں تک سرخ ہو گئیں۔

"گوپال بابا اب آپ چھٹی کریں ـــــ" شیلا گوپال کی طرف مڑی۔

"کیا مطلب ـــــ ؟"

"مطلب کے بچے۔ یہاں سے پھوٹ لو اب ـــــ"

گوپال منہ بسورے اٹھ گیا۔

"بہت بری ہو شیلا ـــــــ" بینا بول پڑی ـــ

"بالکل درست ـــــ" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی ـــ "تا تا چائے بنا رہی ہو یا آ رہی ہو ـــــ" باہر نکلتے نکلتے وہ دروازے سے چلائی ـــــ شیلا کی بات پر کاشف اور بینا کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

"آفت ہے ـــــ آفت ـــــ" کاشف سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتا ہوا بولا۔ بینا مسکرا دی بولی کچھ نہ ـــ

چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ بینا پلکیں جھکائے ہاتھ میں پہنی چوڑیوں سے کھیل رہی تھی خوامخواہ ہی کچھ نروس سی ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد شیلا چائے لے کر آ گئی۔ چائے کے دوران تینوں مزے مزے کی باتیں کرتے رہے۔ بینا تھوڑی خاموش رہی۔ جب اسے ماحول سے گھٹن ہونے لگی تو اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا بھئی خدا حافظ پھر کسی وقت آؤں گی۔ آپ تو اب اکثر یہاں آتے رہیں گے نا ـــــ ؟"

"آپ کا خیال درست ہے ـــــ !"

شیلا اسے چھوڑنے گیٹ تک آئی۔ مڑ کر اسے روک لیا۔

"کیا خیال ہے۔ ہے نا ونڈر فل ـــــ ؟"

"تمہاری تو بریکیں فیل ہو گئی ہیں ـــــ" وہ بیزاری سے بولی۔

"کاشف سے کون کہ تمہیں نہ پسند کرے۔ میرا خیال ہے اس نے تمہیں بہت لائیک کیا ہے۔" شیلا سنجیدگی سے پوچھ رہی تھی۔

"دماغ تو نہیں چل گیا ہو ـــــ" بینا گرم ہو گئی ـــــ "اگر اس سے کچھ کہا یا اوٹ پٹانگ باتیں کیں تو میں آنا ہی چھوڑ دوں گی۔" بینا نے وارننگ دی۔

بینا اپنی کوٹھی پر واپس آئی تو گیٹ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا شرجیل موٹر نکال رہا تھا۔ بینا نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی اور بے توجہی لان کو پار کرنے لگی۔ شرجیل موٹر لیے اس کے پیچھے ہی پیچھے چلا آ رہا تھا۔ بینا نے قدم تیز کر دیئے۔ شرجیل نے کار کی رفتار بھی تھوڑی تیز کر دی ـــــ بینا نے غصے سے پلٹ کر اسے دیکھا وہ ایک ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھے بڑی شان سے بیٹھا تھا۔ ہونٹوں پر وہی تلخ مسکراہٹ پھیلی تھی جو اس نے پہلے دن دیکھی تھی۔ وہی چھری کٹاری جیسی تیز دھار جو احساس کو زخمی کرتا دل میں چبھتا چلا جائے ـــــ وہ چند لمحے سرخ چہرے کے ساتھ اسے گھورتی رہی پھر تیزی سے شانوں کو جھٹک کر مڑ گئی ـــــ شرجیل نے موٹر پھر پیچھے لگا دی اور آخر کار برآمدے کی سیڑھیوں تک پہنچتے پہنچتے اسے موٹر کا ہلکا سا دھکا لگ ہی گیا۔ وہ لڑکھڑائی، گرنے کو تھی کہ ستون کا سہارا لے کر سنبھلی ـــ

"دماغ میں کچھ خلل تو نہیں آ گیا۔ مار ڈالنے کا ارادہ ہے کیا ـــ ؟" وہ انتہائی غصے سے بولی۔

گلشن اقبال سے ملحقہ نئی اسکیم
گلشنِ خیام
اپنجن پور سروے نمبر ۲۰۰۱۹ ،۲۱۱ ۴
بکنگ شروع ہو چکی ہے
نیشنل ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری
شانتی نگر
پارک
پارک
پارک
پارک
فلٹر پلانٹ کے ۔ ڈی ۔ اے
باٹا فیکٹری کے ۔ ڈی ۔ اے
ٹی ۔ پی ۔ ایس گیسٹ ہاؤس

"بیک تمھارے مرجانے سے دنیا خالی تو نہ ہو جائے گی۔" وہ تمسخر سے ہنسا۔

"شرجیل ـــــ" اس کی آواز میں بلا کی تیزی تھی۔

وہ اُسی انداز میں کٹیلی مسکراہٹ لیے بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا ـــــ بینا نے قدم بڑھائے تو وہ کار کا دروازہ کھول کر جلدی سے باہر نکلا اور سخت لہجے میں اسے آواز دی۔

"بینا ـــــ !" بینا کے اُٹھتے قدم تھم گئے۔ چند لمحے یونہی پشت کیے کھڑی رہی پھر اپنے مخصوص انداز میں ذرا سی گردن موڑ کر دیکھا۔ شرجیل دو قدم آگے آگیا۔

"کچھ ملا ـــــ ؟" وہ کٹیلے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

بینا نے اپنی بڑی بڑی حیران کن آنکھوں سے شرجیل کی طرف دیکھا۔

"بتاؤ ملا کچھ ـــــ ؟" شرجیل نے چبھتی مسکراہٹ کے ساتھ پھر اپنا سوال دہرایا۔

"کیا ملا ـــــ ؟" اس نے حیرانی سے شرجیل کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

"کوئی تیسرا شکار ـــــ"

"شٹ اپ ـــــ" وہ حلق پھاڑ کر چلائی، مارے غصے کے اس کے گال تمتا اُٹھے اس شدت سے جیسے ان سے آگ نکل رہی ہو۔

وہ زور سے ہنسا تضحیک آمیز انداز میں۔ اس کا لمبا اونچا طویل قہقہہ بینا کو تتر بتر کر گیا ـــــ چہرہ تپ کر انگارہ ہو گیا اور یونہی سرخ چہرے کے ساتھ وہ ہونٹ کاٹتی ستون کی آڑ میں ہو گئی ـــــ قہقہے کی گونج بڑی دیر تک سنائی دیتی رہی

"میں اس سلسلے میں تمھاری مدد کرنے کو تیار ہوں۔" وہ بڑھ کر اس کے سامنے آگیا۔

"شرجیل ـــــ" وہ چیخی اور گھوم کر ستون کی دوسری جانب چلی گئی۔ شرجیل بھی گھوم کر اسی سمت آگیا، بالکل اس کے مقابل ـــــ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تکنے لگا۔

"کلب جا رہا ہوں، تم نے تو دیکھا ہی ہے وہاں کیسے اسمارٹ اسمارٹ سے مرد آتے ہیں ـــــ خوبصورت بھی، دولتمند بھی، میری سفارش پر کوئی نہ کوئی تیار ہو جائے گا تمھیں سنبھالنے کو ـــــ" ایسی تحقیر آمیز مسکراہٹ ایسی نظریں کہ اب بینا کو ضبط کا یارا نہ رہا۔ ہیجانی کیفیت میں آگے بڑھ کر کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا ـــــ مگر وہ یونہی دل جلانے والی مسکراہٹ لیے پُرسکون انداز میں کھڑا رہا ـــــ بینا پر جیسے پاگل پن کا دورہ سا پڑ گیا۔ وہ زور زور سے شرجیل کو جھنجوڑ رہی تھی پوری طاقت کے ساتھ ـــــ کچھ دیر شرجیل یونہی کھڑا رہا پھر زور سے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے ـــــ وہ ہانپتی ہوئی ستون سے ٹک گئی ـــــ بالکل نڈھال ہو کر۔ شرجیل نے قدم آگے بڑھائے پھر مڑ کر ایک بار بینا کو دیکھا اور ویسا ہی اونچا اور طویل قہقہہ لگاتا ہوا اپنی کار کی طرف چلا گیا ـــــ بینا آنکھیں موندے نڈھال سی ستون سے ٹیک لگائے کھڑی تھی، موٹر اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور چند ہی لمحوں بعد موٹر گیٹ سے باہر تھی ـــــ جانے کتنی دیر گزر گئی وہ یونہی بے دم سی کھڑی رہی ـــــ خاصی دیر بعد اس نے آنکھ کھولی تو پیشانی پسینے سے تر تھی ـــــ ڈگمگاتے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلی۔ ایک ذرا دیر کو گیلری میں رکی، چند لمحے خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ پھر پلکوں پر ستارے سے لیے اپنے کمرے میں آگئی ـــــ لائٹ بھی نہ جلائی، اندھیرے میں ہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہی ـــــ تلخ انداز میں اس کے متعلق سوچتی رہی جو دوسری شخصیت رکھتا تھا ایک معمہ سا تھا ـــــ اس کی فطرت کیسی ہے وہ کیا ہے۔ بینا اب تک نہ سمجھ سکی ـــــ اس کے ساتھ ہی پچھلے دنوں کی خوشگوار باتیں یاد آگئیں ـــــ اس کا پیار، اس کی چاہت، اس کی دلداری اور تسلی آمیز باتیں ـــــ دھندلے دھندلے سایوں کی طرح اس کی نظروں میں پھر رہے تھے ـــــ جانے کتنی دیر گزری تھی کہ کسی کے قدموں کی چاپ پر ہوش میں آئی ـــــ آنے والے نے لائٹ جلائی وہ خانم تھیں۔ بینا کو دیکھ کر حیران سی ہو گئیں۔

"اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہو ـــــ ؟" وہ پاس آگئیں۔

بینا نے نظر اٹھا کر انھیں دیکھا اور بنا کچھ بولے باتھ روم میں چلی گئی۔ تولیے سے چہرہ خشک کرتی باہر نکلی۔ خانم قریبی کرسی پر بیٹھی تھیں۔

"بینا کیا بات ہے اس قدر خاموش کیوں ہو ـــــ ؟"

وہ آئینے کے سامنے کھڑی بال بنا رہی تھی۔ خانم کی بات سُن کر ہاتھ روک لیے ایک بار مُڑ کر ان کی طرف دیکھا۔

"سچ آپ کو بہت تنگ کرتی ہوں۔ آپ میری وجہ سے فکرمند رہتی ہیں اور مجھے خوشی سی ہوتی ہے کہ کسی کو تو میرا خیال ہے ـــــ تھوڑا ہی سا سہی ـــــ"

"ہاں بیٹا میں تمھاری وجہ سے فکرمند رہتی ہوں ـــــ"

"فکر نہ کیجیے خانم ـــــ بہت وقت پڑا ہے ـــــ میرا بھی کوئی نہ کوئی ٹھکانہ ہو ہی جائے گا ـــــ خواہ دیر سے ہو ـــــ ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے ـــــ جلد بازی اچھی نہیں ہوتی، اکثر جلد بازی کی بدولت انسان بڑے بڑے نقصان اٹھاتا ہے۔"

خانم سر ہلا کر مسکرائیں ـــــ

"خانم کو سبق سکھا رہی ہو مجھے خوشی ہے لیکن کچھ تو سمجھ آتی ہے
کہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہے گا ——— میں اپنے فیصلے
اٹل ہوں ——" وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔
"یہ کیا بات ہوئی ——؟" خانم کی تیوریوں پر بل آ گئے۔
"جو کچھ کہہ رہی ہوں ——— اسے سمجھیں ——" وہ مسکرائی۔
"میرے تو ناک چنے چبوا دیئے ——— تم اور شرجیل مجھے مار ڈالو گے
ایک دن ——— صاحبزادے کچھ دنوں کے لیے سنبھل گئے تھے پھر اسی
ڈگر پر چل نکلے۔ دونوں ہی میرے لیے مصیبت ہو۔" خانم بیزاری سے
بولیں۔
خفا ہو گئیں خانم ———؟" بینا نے پیچھے سے آ کر ان کی گردن
میں باہیں ڈال دیں۔
"بڑی پرواہ ہے نا جیسے میری خفگی کی ——— جاؤ ہٹو۔" انھوں
نے بینا کے ہاتھ ہٹانے چاہے مگر وہ ان سے لپٹ گئی۔
"خانم پلیز آپ یوں خفا نہ ہوں ———" وہ اٹھلائی۔
"پھر میری بات مان لو نا ——— اپنا فیصلہ بدل دو نا ———"
"خانم پھر وہی بات ——— جو بالکل انہونی ہے۔"
"میری طرف سے جہنم میں جاؤ ———" وہ پیار بھرے غصے
سے بولیں ——— بینا ان کے غصے پر ہنستی رہی ——— "چلو کھانا لگ رہا
ہے ———" خانم یہ کہتی ہوئی باہر چلی گئیں۔
کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی ——— تنہا کمرے کی
دنیا کتنی ویران تھی۔ کتنی سوگوار، کمرہ قیمتی سامان سے آراستہ تھا، فرش پر
سرخ و سبز قالین، دیواروں پر بہترین تصاویر، آرٹ کے نادر نمونے ———
بک شیلف میں اچھی اچھی دلچسپ کتابیں ——— نازک مگر صدرنگ خوبصورت
روسی گلدان اور ان میں سجے رنگ برنگے پھول، قیمتی پیانو ——— اور
ریڈیوگرام سب ہی کچھ تو تھا، لیکن سب کچھ ہونے کے باوجود بھی اسے
یوں لگتا جیسے یہاں کچھ بھی نہ ہو ——— یہ چیزیں جو اتنی قیمتی ہیں انھیں
میں صرف استعمال کر سکتی ہوں لیکن ان پر میرا کوئی حق نہیں ہے ———
اس خیال سے اسے بڑا دکھ پہنچتا۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتی دریچے میں
جھک گئی۔ باہر تاریکی تھی لیکن اتنی زیادہ نہیں۔ آخری تاریخوں کا باریک سا
چاند نیلے آسمان پر چمک رہا تھا ——— وہ کچھ اداس اور دل گرفتہ سی
دریچے میں جھکی باہر پھیلے اندھیروں کو تک رہی تھی ——— رات کی رانی
کا پودا خوب مہک رہا تھا ——— بھینی بھینی سی خوشبو چاروں اور
پھیلی تھی ——— اس کا ذہن بار بار شرجیل کی طرف چلا جاتا۔ اس کا تلخ
لہجہ معنی خیز فقرے، ہونٹوں پر پھیلی طنزیہ مسکراہٹ ——— سبھی کچھ یاد

آ جاتا ——— کبھی اس سے بے پناہ نفرت محسوس ہوتی اور کبھی بیزاری
کے ساتھ ساتھ لگاؤ کا احساس ہونے لگتا۔ ان دنوں وہ بہت بدنام ہو
رہا تھا۔ اس کی دلچسپیاں اور ایکٹریسز آوارگی کو چھونے لگی تھیں۔ ویسے
آنا معمول ہی تھا اور آتا تو پی کر ——— بہت سے لوگوں کی زبان پر
اس کا نام رہنے لگا تھا۔ لوگ اس کے متعلق اچھے انداز میں نہیں سوچتے تھے
جس کا خانم کو بہت دکھ تھا ——— اور اس سے زیادہ بینا کو ———
وہ کن راہوں پر جا رہا ہے۔ یہ سب چیزیں تباہی کے راستے کو جاتی ہیں۔
اور میں اسے تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتی ——— یہ میرے بس میں نہیں ہے
میں اسے ان راہوں سے واپس لے آؤں گی ——— لیکن اب وہ
اتنی دور نکل گیا ہے ان راہوں پر کہ شاید واپس لوٹنا اس کے اپنے بس
میں بھی نہیں رہ گیا تھا اور اس احساس نے بینا کا دل زخمی کر دیا ———
شرجیل سے اسے نفرت تھی مگر اس کے ساتھ ہی محبت کے جذبات بھی
رینگ رہے تھے۔ بہت کم دونوں کا سامنا ہوتا۔ وہ ناشتہ اپنے کمرے
میں ہی منگوا لیا کرتا تھا۔ ناشتہ کر کے تیار ہو کے باہر کی راہ لیتا اور اس وقت
لوٹتا جب پریم نگر ٹھنڈے اندھیارے میں سو رہا ہوتا ——— بینا خود
بھی اس کے سامنے نہ جاتی۔ اس کی تلخ مسکراہٹ تحقیر آمیز باتیں اور نگیں
نگاہوں کا مقابلہ کرنے کی تاب نہ تھی۔ بعض اوقات تو وہ اتنا ظالم بن جاتا کہ
بینا کو اس سے خوف سا آنے لگتا ——— اس کی سرخ سرخ آنکھوں کو
دیکھ کر بسا اوقات اتنا ڈر لگتا کہ کہیں وہ کسی کو قتل نہ کر ڈالے۔ مگر اس نے
کسی کو قتل نہ کیا، خود کو قتل کر ڈالا۔
"شرجیل یوں اپنے آپ کو قتل نہ کرو"
بینا نے ہونٹ دبا کر سسکی روکی، اور مڑ کر پیانو کے پاس آ بیٹھی ———

دسوں انگلیاں تیزی سے پیانو کے تاروں پر چل رہی تھیں، وہ بہت شوخ سی دھن تھی۔ شاید اس شوخ دھن میں وہ اپنی اداسی دبا دینا چاہتی تھی مسلسل اس کی انگلیاں حرکت کرتی رہیں اور اسے خبر بھی نہ ہوئی کہ کب شرجیل اس کے پیچھے آکھڑا ہوا ——— پتھر سا بے جان چہرہ لیے اسے جنونی کیفیت میں پیانو بجاتے دیکھتا رہا اور پھر بینا نے تھک کر بالکل نڈھال سی ہو کر پیانو پر سر رکھ دیا ——— شرجیل نے پیچھے سے بال پکڑ کر اس کا چہرہ اٹھایا۔ بینا جیسے ہوش میں آگئی، مڑ کر پیچھے دیکھا۔ شرجیل کی گہری آنکھوں میں سرخی گھل رہی تھی اور چہرے پر کرختگی تھی۔

"تم اب تک سوئی کیوں نہیں ——— ؟" اس نے ترش لہجے میں پوچھا۔

بینا نے ایک نظر اسے دیکھا۔ ہاتھوں پر گرے آنسو پونچھے اور سر جھکا لیا۔ ذرا سخت لہجے میں کہنے لگی "آپ سے مطلب ہی کیا ——— میں اپنی مرضی کی مالک ہوں ———"

"بہت خوب ———" وہی تحقیر آمیز طویل قہقہہ جو بینا کے سارے وجود کو لرزا دیا کرتا تھا ——— "تم اب اپنی بھی کہاں رہی ہو۔" پُراسرار سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ بینا نے ذرا سا رُخ موڑ کر ترچھی نگاہوں سے اسے دیکھا،

"کیا مطلب ——— ؟"

"خاصی عقلمند ہو اور مطلب بھی صاف ہے ——— تم بہت سے لوگوں میں بٹ گئی ہو ——— مجھ میں، رضا میں، کاشف میں، مصیبح میں اور جانے کس کس میں ———" وہ جھنجھلا کر بولا۔

"شرجیل ———" بینا تڑپ کر چیخی۔

"بہت بُری لگی میری بات ——— ؟ اصل حقیقت ہمیشہ تلخ ہی ہوا کرتی ہے مس بینا ——— بُرا لگنا بھی چاہیئے ———" وہ مسکرایا۔

"شرجیل میں ایسی باتیں سننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔

"پھر بھی تمہیں سننا پڑیں گی ——— کبھی مجھ سے اور کبھی دنیا والوں سے سمجھیں ——— ؟" وہ اس کا بازو جھٹک کر غصے سے بولا ——— اور بینا ان نظروں کی تپش سے گھبرا اُٹھی تھی مگر ظاہر نہ کیا۔

"کوئی زبردستی ہے ———" بینا کی تیوریوں پر سینکڑوں بل آگئے۔ تیز نظروں سے اسے دیکھا ——— دیکھتی رہی ———

"یہی سمجھ لو ——— میں تمہیں آزاد نہیں چھوڑ سکتا کہ تم اپنی من مانی کرتی رہو ———" وہ غصے سے بولا۔

"کیا کیا ہے میں نے ——— ؟" بینا نے پُرسکون انداز میں پوچھا۔

"کیا کیا ہے تم نے ———" چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ اور بھی مشتبہ تھی ——— "کچھ نہیں ——— کچھ بھی نہیں ———" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر ہنس پڑا تضحیک آمیز انداز میں ——— اونچا طویل قہقہہ پھیلتا ہوا سا ویران کمرے کی فضاؤں میں گونجتا رہا۔

بینا نے گھبرا کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

"تم مجھے پاگل کر دو گے شرجیل ———" اس نے پھٹی آواز سے کہا ——— اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور دل کی دھڑکن کہیں زیادہ تھی۔

"شرجیل آپ چلے جائیں میرے کمرے سے یہ میرا حکم ہے۔"

یہ سن کر اس کی پتلیاں گھوم کر ساکت ہو گئیں ——— جسم بے جان سا لگنے لگا۔ "یہ حکم دینے کی اجازت تمہیں کس نے دی ——— ؟" اس کے لہجے میں چھپی چبھن نمایاں تھی اور چہرے پر بلا کی کرختگی۔

"بتا دوں ——— ؟" وہ پُراسرار انداز میں جلا دینے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"ضرور ——— میں سننا چاہتا ہوں ——— تمہیں مجھ پر حکم چلانے کی اجازت کس نے دی آخر ———"

"رضا نے ———" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر تلخ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"اوہ ——— !" اس نے ہلکی سی سیٹی بجائی اور آہستہ آہستہ چلتا پاس آگیا پھر ایک دم سے ہی تحقیر آمیز انداز میں ہنس پڑا۔

"رضا کی حیثیت ہی کیا ہے ———" اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے۔

"آپ سے بہرحال بہتر ہے ———" وہ تلخی سے بولی۔

"یہ بات ہے تو پھر شادی کر لو نا اس سے ———"

"کروں گی آپ کو کاہے کی فکر ہے ———" وہ بھی ویسے ہی جلے بھنے انداز میں بولی۔

"فکر اس بات کی کہ اور بھی کئی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ ایک کو اپنا لو بقیہ خود ہی واپس لوٹ جائیں گے۔"

"مشورے کا شکریہ مسٹر شرجیل ———"

"اور میرے متعلق کیا خیال ہے ——— ؟" اس نے پُراسرار انداز میں پوچھا اور نظریں اس پر گاڑ دیں اور اس پر تھوڑا سا جھک گیا۔ بینا نے اس کی بات کو سُنا، چند لمحے یونہی اس کے مقابل مدھم سی روشنی میں کھڑی پلکیں جھپکاتی رہی پھر انتہائی تلخی سے ہنس پڑی۔

"بتاؤ ——— میں جواب سننا چاہتا ہوں۔"

لیجے بن بڑا اور بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔
"تمہیں اپنانے سے مرجانا زیادہ پسند کروں گی۔" وہ بڑی بے دردی سے بولی۔ شرجیل کے چہرے پر دھند سی چھاگئی ——— مگر خود کو بظاہر پرسکون رکھا ——— آگے بڑھ کر اس کے اور قریب آگیا اس کی سیاہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔
"خیال برا نہیں ———"
ایک ناگوار سی بُو نے بینا کو چونکا دیا
"تم نے پی رکھی ہے ———؟"
"ہاں ——— پی ہے بوتل سے، تمہارے ہونٹوں سے نہیں۔"
وہ ایک آنکھ دبا کر مسکرایا۔
بینا نے حیران کن نگاہوں سے اسے دیکھا، اس کی بات سن کر رخسار جل اٹھے ——— بڑی بیدردی سے ہونٹ کاٹ ڈالے شرجیل ایک پُراسرار سی مسکراہٹ کے ساتھ اس پر جھک گیا۔
"کہو تو ان ہونٹوں سے پی لوں ——— ان کا سارا رس چوس لوں ——— باقی کچھ نہ بچے ——— کچھ نہ رہے ——— کچھ نہ رہے۔"
بینا کے چہرے پر آگ سی جل اٹھی زور سے اسے پرے دھکیل دیا۔
"یہ ہاتھ دیکھے ہیں ———" بینا نے دانت پیس کر ہاتھ آگے کر دیا۔ "معلوم ہوتا ہے پچھلا طمانچہ بھول گئے ———"
"بینا ———" وہ پوری قوت سے چیخا اور اس پر تھپڑوں کی بارش کر دی ——— اور جب بینا کو ہوش آیا تو وہ کمرے سے جا چکا تھا اس کے رخساروں میں آگ سی لگی تھی۔
"تم نے اچھا کیا میں اسی قابل تھی شاید۔"
اس نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر سسکی روکی ——— اور اس رات ڈھیروں برسات ہوگئی ——— اتنی کہ اس میں اس کا پورا وجود ڈوب گیا ———
صبح وہ ناشتے پر آئی تو حلیہ ہی بگڑا ہوا تھا ——— رات کا لباس بھی نہ تبدیل کیا تھا۔ بال اُلجھے اُلجھے سے تھے اور چہرہ سُرخ۔ خلافِ معمول شرجیل کو بیٹھا دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔ اپنے اُلجھے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور بیزاری سے شانے جھٹک کر خانم کے برابر والی خالی کرسی پر آ بیٹھی۔
"طبیعت تو ٹھیک ہے بینا ———" خانم اس کا حلیہ دیکھ کر فکرمندی سے بولیں۔
"مجھے کیا ہوا ——— اچھی بھلی تو ہوں ———" وہ بے جان پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔
"مگر رنگ دیکھو پیلا ہو رہا ہے اور گال بھی سرخ ہو رہے ہیں ——— رات ہی

رات میں تمہیں کیا ہوگیا ———؟"
وہ اپنے لیے انڈا چھیل رہی تھی، بینا سر اٹھا کے بولی: "آپ ایک رات کی بات کر رہی ہیں بعض اوقات تو ایک عمر بھی اتنا خاطر اتنا اذیت رساں ہوتا ہے کہ زندگی کی ڈور ہی ٹوٹ جاتی ہے ———"
"کیسی باتیں کرتی ہو بینا ——— مجھے تمہاری فکر ہو رہی ہے۔"
انھوں نے اس کا ہاتھ چھوا ——— اور چونک اٹھیں۔
"تمہیں بخار بھی ہے ———"
"شاید ———"
"ڈاکٹر کو دکھا لینا کہیں طبیعت زیادہ نہ خراب ہو جائے ———"
"ارے خانم آپ خوامخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ یہ بڑی سخت جان ہے اتنی سی بیماری سے نہیں مرے گی ———" شرجیل ہنسا ——— ہنس کر بینا کو دیکھا۔ بینا نے شکستہ نگاہوں سے اسے دیکھا ——— دیکھتی رہی پھر ہونٹ سکیڑ کر چائے کا کپ اٹھا لیا۔ ہونٹوں تک لے گئی پھر بنا پیئے ہی واپس رکھ دیا ——— کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔
"ایسا کیوں کہتے ہو شرجیل ———" خانم نے ڈانٹا۔
شرجیل بولا کچھ نہیں۔ تلخ سے انداز میں ہنس دیا ——— بینا خاموش بیٹھی چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی تھی ——— چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ جذبات سے قطعی عاری۔
"اچھا خانم پی جیا اگر کوئی خاص بات ہو تو مجھے زبیدہ کے گھر فون کر لیجیے گا ———" وہ لفظ 'خاص' پر زور دیتے ہوئے بولا۔
"کوئی خاص بات ہے کیا ———؟" خانم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا ——— وہ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لیے سگریٹ سلگا رہا تھا۔ سگریٹ سلگا کر دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔
"یہی کہ اگر خدانخواستہ آپ کی لاڈلی مر وَر جائے تو اطلاع دے دیجیے

کم از کم گزرتے اوقات کے دن آخری لمحات ہیں۔ ورنہ یہ کم بخت لڑکی مر کر بھی مجھے چین نہ لینے دے گی۔" وہ ایسی بے رخی سے بولا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو شرجیل —— " خانم نے زور سے ڈانٹا۔

وہ قہقہہ لگاتا ڈائننگ ہال سے باہر نکل گیا۔ اس طویل قہقہے کی گونج دیر تک سنائی دیتی رہی جس میں صد درجہ تلخی اور تھوڑا سا کرب بھی تھا —— بینا کی سانسیں حلق میں پھنسنے لگیں۔ دماغ پر ہتھوڑے سے برسنے لگے لیکن وہ اپنی اندرونی کیفیت چھپائے پُرسکون انداز میں بیٹھی آہستہ آہستہ چائے پیتی رہی۔

"بینا —— " خانم کی آواز پر اس نے رُخ موڑ کر دیکھا۔ "تم شرجیل کی باتوں کا بُرا نہ ماننا کہ وہ بہت ملول، بہت گستاخ ہو گیا ہے پہلے سے بھی زیادہ میں اسے سنبھالتے ہار چکی ہوں —— "

"میں جانتی ہوں خانم —— اور پھر اس کی باتوں کا بُرا کیا ماننا میں اسے آپ سے زیادہ جانتی ہوں —— " وہ بھولے سے مسکرائی۔

"اچھا —— " خانم مسکرائیں —— پھر کہنے لگیں۔

"مجھ سے تو وہ سنبھلتا نہیں تم ہی کسی طرح سنبھالو اسے پھر —— اگر تم اسے مجھ سے زیادہ جانتی ہو —— "

"نہیں خانم —— " اس نے ٹھنڈی سانس لی، چہرے پر سوچ ابھر آئی بہت تکلیف دہ سی —— گہری گہری آنکھوں میں سایا سا ڈولنے لگا۔ "اتنی بھاری ذمہ داری مجھ پر نہ ڈالیے —— پلیز خانم —— "

"تم کوشش تو کرو مجھے یقین ہے تم اسے ضرور سنبھال لو گی پچھلے دنوں کی طرح اور پھر شاید یہ بھی ممکن ہو جائے کہ تم دونوں اپنی اپنی ضدیں چھوڑ دو۔ قربت یقیناً تمہارے فیصلوں پر حاوی ہو جائے گی —— اور پھر —— " وہ بڑی دلکشی سے مسکرائیں۔

بینا نے غور سے ان کا مسکراتا چہرہ دیکھا ان کی آنکھوں میں التجا سی تھی اور چہرے پر خوبصورت سی سوچ کا حسین تاثر۔ بینا نے ان کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔ کچھ دیر یونہی گود میں دونوں ہاتھ رکھے ہونٹ کاٹتی رہی پھر بنا سر اٹھائے دھیمے لہجے میں بولی:

"ایسا ناممکن ہے خانم —— میرا فیصلہ بدل نہیں سکتا اور اپنے اس فیصلے پر مجھے دُکھ بھی ہے اور ندامت بھی۔ مجھے معاف کر دیجیے گا خانم میں بالکل مجبور ہوں —— " وہ آنکھوں میں آئی نمی جذب کرتی کرسی پیچھے دھکیل کر تیکھے سے قدم اٹھاتی باہر نکل گئی —— خانم اسے جاتے دیکھتی رہیں —— چپ چاپ ساکت سی بیٹھی رہیں —— چہرے پر کرب امڈ آیا ——

"خدا اس بچی کے حال پر رحم کرے۔"

بینا نے اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے ایک ذرا دیر کو رک کر ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھے۔ چند لمحے یونہی بیکار میں کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر سر جھٹک کر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ غور سے اپنے سرخ رخساروں کو دیکھتی رہی اور نرمی سے ان پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ اور ایسا کرتے ہوئے اسے عجیب سی لذت کا احساس ہوا —— یہ سرخی شرجیل کی بخشی ہوئی تھی۔ اس نے خواہش کی کاش میرے رخسار ہمیشہ ہی اسی طرح سرخ رہیں اس سرخی کو شرجیل کا دیا ہوا تحفہ جان کر زندگی بھر اس کی حفاظت کروں۔

"اس کی اتنی زیادتیوں کے باوجود تم اب بھی اس سے اتنا پیار کرتی ہو —— " ہوا کے ایک شریر جھونکے نے سرگوشی کی۔

بینا نے لمبی سانس لی۔

"ہاں۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی ہوں —— "

اس نے اپنے آپ سے کہا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھا ایک انگلش ناول اٹھا کر پڑھنے لگی۔ لیکن کتاب کے حرفوں کے پیچھے وہی سانولا چہرہ ابھر آیا جس پر خفگی اور تلخی پھیلی ہوئی تھی —— بھنچے ہونٹ، شکن آلود پیشانی اور آنکھوں میں بیزاری کی گمبھیرتا —— اس نے کتاب سینے پر رکھی اور بیٹھی چھت کو گھورتی رہی "آج کل وہ افواہوں میں گھرا ہوا ہے —— " بینا نے دکھ سے سوچا۔ لوگ کھلم کھلا اس کے کردار پر حملہ کرنے لگے ہیں اور بینا کو یہ چیز صد درجہ دکھ پہنچاتی —— اس کے مزاج میں توازن اور معقولیت کے فقدان کے باعث ہر شخص پریشان تھا۔ گھر کا ہر فرد دکھی تھا مگر خانم کہتی ہیں ایک خانم کیا سبھی کہتے ہیں کہ چند سال قبل تک وہ ایک فرمانبردار بیٹا تھا۔ مگر اب اس سے زیادہ گستاخ بھی کوئی نہ تھا۔ بینا نے آنکھیں سکوڑ کر سوچا۔

"اس ذہنی تبدیلی کا محرک آخر کون سا جذبہ ہے —— ؟"

قدموں کی ہلکی سی چاپ پر بینا نے تکیے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ صبیحہ اُداس چہرے کے ساتھ اس کے پاس آ رہی تھی۔ وہ بینا کے بالکل قریب بیڈ پر ہی بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے بے بی —— کیوں اداس ہو —— ؟"

وہ کچھ نہ بولی۔ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ آنسو پلکوں سے جھڑ کر بینا کے ہاتھ پر گرے۔

"تم رو رہی ہو —— ؟ کیا بات ہے صبیحہ —— ؟ اپنی ہمشیر کو نہ بتاؤ گی —— ؟" بینا نے پیار سے جھک کر پوچھا۔

"بھیا آپ کے ساتھ اتنی زیادتی کیوں کرتے ہیں —— ؟"

"یہ بات ہے —— " اس کے [illegible] لگا، وہ تو

ے کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں۔ تمہیں یاد ہے ابو کو بھی تو ڈانٹتے دیتی تھیں
ڈانٹنے کی بات الگ ہوتی ہے۔ وہ آپ کا مذاق اڑاتے ہیں آپ
یا تلخ کرتے ہیں — آپ کے ساتھ ان کا رویہ بالکل مختلف ہوتا ہے
ت بُرا — بہت خراب۔۔۔"

"اتنی سی عمر میں اتنی سمجھ دار ہو گئیں۔" بینا مسکرائی

"میں شرجیل بھیا سے آپ کی شادی نہیں کروں گی۔ ۔۔۔ ٹھیک تا ہے، رضا انکل سے آپ شادی کر لیں وہ بہت اچھے ہیں۔ کبھی آپ کو برا نہیں کہتے۔ ہم سے بھی اتنا پیار کرتے ہیں۔ آپ انہیں سے شادی کر یں۔ رضا انکل اچھے ہیں نا — آپ کو اچھے لگتے ہیں؟"

"ہاں —!" بینا مسکرائی

"تو پھر آپ ان سے شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔"

"تم ابھی بچی ہو۔ ان باتوں کو کیا جانو اور تم سے بحث بھی کیا کی جا سکتی ہے۔"

"میں بچی ہوں۔" اس نے غصے سے بینا کو دیکھا۔ وہ ہنس پڑی ہنستے ہوئے کہنے لگی۔

"بچی نہیں ہو — مگر اتنی بڑی بھی نہیں ہو کہ ان معاملات میں مجھے مشورہ دو — جاؤ آج تمہاری چھٹی ہے کسی سہیلی کے گھر چلی جاؤ، اداسی جاتی رہے گی۔"

اس نے مسکرا کر بینا کو دیکھا اور اک دم سے ہی جھک کر اس کے گال چوم لیے — اور مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی — صبیحہ کی اس حرکت پر بینا کو اس پر ڈھیروں پیار آیا — صبیحہ چلی گئی تو بینا نے پھر کتاب اٹھائی مگر جلد ہی اکتا گئی — اٹھ کر کمرے کے پردے برابر کر دیے اور ریکارڈ پلیئر پر بہت پرسوز سا گیت لگا دیا — دبیز پردوں نے کمرے میں ہلکا سا اندھیرا پھیلا دیا۔ وہ دوبارہ اپنے بستر پر آ گئی — تکیے کے سہارے نیم دراز آنکھیں موندے وہ دھیرے دھیرے ریکارڈ سنتی رہی۔ کمرہ نیم تاریک تھا، اندر ہلکی سی گھٹن کا احساس تھا۔ موسیقی کی وہ دھیری مدھم مدھم سی لہریں کمرے میں اور بھی اداسی گھول رہی تھیں اور اس نیم تاریک کمرے میں لیٹی لڑکی کا چہرہ پیلا تھا۔ اس پر گہری سوچ کا اثر نمایاں تھا اس کے لباس پر شکنیں تھیں اور بال بے ترتیب سے۔ گال سرخ تھے۔ بند پلکوں میں ڈھیروں آنسو چھپے تھے — اور ہونٹ کپکپا رہے تھے — لڑکی بڑی اداس بڑی بے چین تھی۔ یہ بیتے لمحوں کی اداسی کتنی ظالم ہے خوبصورت لمحات کتنی جلدی بیت جاتے ہیں۔ یوں کہ جیسے کبھی آئے ہی نہ ہوں، جیسے زندگی ہمیشہ سے غمگین اور دکھ بھری ہو — سوچ کی اس تلخی نے فضا کو اور بھی سوگوار بنا دیا تھا۔ اور اس سوگوار سی فضا میں کسی کے

قدموں کی چاپ ابھری وہ یونہی لیٹی رہی۔ آنکھ نہ کھولی۔ خانم نے اسے لیٹا دیکھا، دبے قدموں سے پاس آ گئی۔ آہستہ سے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ شفیق ہاتھوں میں لمس کی یہ نرمی، شفقت اور دبے دبے سے پیار کی آمیزش لئے تھی۔ ہلکے ہلکے دباؤ میں کس قدر لذت اور سرور تھا۔

"بینا سو رہی ہو کیا —؟" خانم نے دھیرے سے پوچھا۔ بینا نے آنکھ کھول دی۔ مضمحل سی مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھا۔

"طبیعت زیادہ خراب ہے کیا —؟"

"بالکل نہیں خانم۔ بس ذرا تھوڑا رومینٹک ہو گیا ہے۔" وہ بھرپور انداز میں مسکرائی اور خانم اس کی بات سن کر ہنس پڑیں۔ کتنی ہی دیر ہنستی رہیں۔ پھر پیار سے اس کے گال تھپتھپا کر ہنستی ہوئی باہر چلی گئیں — خانم چلی گئیں — اور اسے پہلے سے بھی زیادہ اداس کر گئیں۔ کمرے پر چھائی عجیب سی ویرانی اور تنہائی کا شدید احساس دو گنا ہو گیا۔ چہرے پر ہلکی سی سوچ کا تاثر لیے خوبصورت دھنوں والے ریکارڈ سنتی رہی۔ تلخ فقرے اور اونچے تضحیک آمیز قہقہے اس کا تعاقب اب بھی کر رہے تھے طلاق کے ملتے ہی وہ اتنی کمتر ہو گئی تھی کہ ایک باوقار خاندان کا فرد ہوتے ہوئے بھی فقرے بازی کا نشانہ بن رہی تھی۔ شرجیل کے متعلق وہ زہریلے انداز میں سوچتی رہی۔ کھانے کے وقت خانم کھانا اس کے کمرے میں ہی لے آئیں۔ بینا انہیں دیکھ کر مسکرا پڑی۔

"بڑی ہوشیار ہیں خانم آپ۔" اس نے کھانے کی ٹرے تھامتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"ماؤں کو اپنے بچوں کی فطرت کا بخوبی علم ہوتا ہے۔" وہ مسکراتی ہوئی بولیں۔ جاتے جاتے کہتی گئیں۔ "کسی چیز کی ضرورت ہو تو منگوا لینا۔"

"شکریہ خانم — ضرور منگواؤں گی، آج آپ سے خدمت کروانے کو دل چاہ رہا ہے۔"

جاتے ہوئے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور سر ہلا کر باہر چلی گئی۔
بینا نے کمرا ٹھیک کر کے بال بنائے۔ نائٹی اتار کر دوسرے کپڑے پہنے اور واپس
بستر پر آ گئی — خوبصورت دھنوں والے ریکارڈوں میں الجھانے سے
جذبے بیدار ہو رہے تھے۔ اس کا دھیان ایک دم سے ہی رضا کی طرف
چلا گیا —— وہ جو اتنا سادہ، اتنا صاف دل اور صاف گو تھا۔ سیدھا سادہ
ہوا اور پُرخلوص تھا۔ اکثر ہی وہ بینا سے ملنے آتا رہتا تھا۔ بینا اسے دیکھ
کر پہلے کی طرح بیزار نہ ہوتی بلکہ اس کی آمد کی منتظر سی رہتی۔ اس کے پاس
بیٹھ کر اس سے باتیں کر کے خوشی محسوس کرتی۔ اسے سامنے پا کر سب دکھ
بھول جاتی۔ رضا کی شخصیت میں اسے ایک بہت پیارا دوست مل گیا
تھا۔ وہ آتا تو بینا ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرتی رہتی۔ ہر دکھ ہر غم
پرے پھینک دیتی —— اس کے قریب بیٹھ کر خود کو بہت سبک
محسوس کرتی —— اکثر اس کے اصرار پر اس کے ساتھ کہیں سیر کو بھی چلی
جاتی —— اس کا ساتھ اچھا لگتا تھا۔ وہ رضا کو پسند کرتی تھی مگر وہ
جذبہ جسے محبت کہتے ہیں اس کے دل میں کہیں ڈھونڈے سے نہ ملتا۔
رضا مجھے معاف کر دینا میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتی۔ تمہیں دینے
کو میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں بالکل تہی دست ہوں۔ میرے پاس
تو اپنا پن بھی نہیں ہے۔

ریکارڈ ختم ہو گئے تھے۔ کمرے میں گمبھیر سناٹا چھا گیا۔ اور اس سکوت
اس جان لیوا تنہائی اور گہرے سناٹے سے اسے وحشت سی ہونے لگی۔
اٹھ کر دوبارہ ریکارڈ پلیئر پر ریکارڈ چڑھا دیے اور بلی کی طرح تکیے میں منہ
چھپا کر لیٹ رہی —— جانے کتنی دیر گزری تھی کہ سگریٹ کی مخصوص بھینی
بھینی سی خوشبو محسوس کر کے آنکھیں کھول دیں۔

شرجیل کو دیکھ کر اس نے بیزاری سی محسوس کی۔ وہ ہونٹوں پہ دل
کو لبھا کر ڈالنے والی مسکراہٹ لیے کھڑا تھا —— اور اسی کو دیکھ رہا تھا۔
بینا نے نظریں جھکا لیں۔ بیدردی سے ہونٹ کاٹتے ہوئے چہرہ دوسری طرف
کر لیا۔

"اندھیروں سے بڑا پیار ہے کیا ——؟" بینا نے اس کی بات
سن کر گہری نظروں سے اسے دیکھا۔ اکھڑے لہجے میں بولی۔
"ہاں ہے — آپ کو کوئی اعتراض ہے ——؟"
"واقعی اندھیرا بڑی پیاری چیز ہے۔ سب سے بڑا راز داں اور پیارا
اسی لیے ہوتا ہے کہ یہ عیبوں کی پردہ پوشی کر دیتا ہے۔" وہ معنی خیز مسکراہٹ
کے ساتھ بولا۔ آنکھ کا کونا دبا کر۔
"اپنے تجربے کی کہہ رہے ہیں شاید۔" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی
شرجیل ہونٹ بھینچے چند لمحے اسے تکتا رہا۔ وہ نظروں کی گہرائی اور
تندی سے گھبرا اٹھی۔ شرجیل یونہی اس پہ نظریں گاڑے ہوئے
پاس آ گیا۔ ہاتھ آگے کرتا ہوا بولا۔
"یہ ہاتھ دیکھ رہی ہیں۔" اس نے بینا کی بات دہرا
کے انداز میں اور ہنس کر بینا بھرپور انداز میں ہنس پڑی۔
مسکرا دیا۔

"مجھے اندھیرے میں وہ سانولے چہرے کے
بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ سانولا رنگ اور بھی گہرا ہو گیا
ہوتے وہ اس پہ جھک آیا۔ اس کے سرخ رخسار دیکھ
پڑھا ہے " آتش غم تو شگفتگی ہے ہائے بے
آہ غم کیوں آپ کے رخسار تک
اس نے مسکراتے ہوئے انگلی سے بینا کے سرخ گال
پڑی۔ ہنس کر رخ پھیر لیا۔
شرجیل وہیں جوتوں سمیت قالین پہ آلتی پالتی
"نیچے کیوں بیٹھے ہیں، کرسی پر بیٹھ جائیں نا۔"
اس کی طرف کر لی۔
"ہم اس قابل کہاں جی کہ آپ کی برابری کریں۔
آپ کے قدموں میں ہے۔" وہ بڑے موڈ میں نظر آ رہا تھا
مسکرا دی۔ وہ سگریٹ سلگا رہا تھا۔ ایک طویل کش لے
بینا پر چھوڑ دیا۔
"آج کس موڈ میں ہیں آپ ——؟"
"میری چھوڑو اپنی کہو۔"
"اپنی کیا کہوں بس یہی کہ

میں جو بدلوں تو تغیر ہے مری ذات تلک
آپ بدلیں تو شب و روز بدل جاتے ہیں"

شرجیل پاس ہی قالین پر بیٹھا مسکراتا رہا مگر
اک دم سے ہی پوچھ بیٹھا۔
"تمہارا شام کا کیا پروگرام ہے؟"
"کیوں ——؟"
"یونہی پوچھ رہا ہوں۔"
"رضا آئے گا —" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔
"رضا کو میں نے بہت برداشت کر لیا۔ اب یہ
وہ یہاں اب نہیں آئے گا۔" شرجیل کے لہجے میں سختی
"آپ اسے یہاں آنے سے نہیں روک سکتے۔
لہجے میں بولی۔

ہوں۔" اس کے چہرے کی کرختگی میں اضافہ ہو گیا۔
"روک سکتے ہیں تو روک لیں۔" بینا پُرسکون لہجے میں بولی۔
"تمہاری ماں تو بڑی سیدھی سادی عورت تھیں تم آخر کس پر گئیں؟"
وہ بھنویں سکوڑ کر بولا۔
"کیا مطلب ——؟" بینا نے سخت لہجے میں پوچھا
"عزیز صاحب بھی بلند کردار انسان تھے تم نے اتنی برائیاں کہاں سے جمع کر لیں۔" پھر وہ تھوڑا سا مسکراتے ہوئے پھر اس کے قریب سے آیا۔ "یہ آوارگی تم پر زیب نہیں دیتی —— کیا سمجھیں ——؟"
"شرجیل ——" بینا گرم ہو گئی، بیٹھے بیٹھے دونوں ہاتھوں سے اسے پرے دھکیل دیا —— وہ بلند قہقہہ لگاتا ہوا دیوان قالین پر لیٹ رہا۔ اس کے دونوں ہاتھ سر کے نیچے تھے اور چہرے پہ چھلکے سے کرب کا احساس لیے چھت کو تک رہا تھا۔ کمرے میں مکمل خاموشی تھی۔ کوئی آہٹ کوئی آواز نہ تھی۔ اس گہری خاموشی سے اکتا کر بینا گنگنانے لگی ؎
"جیون کی گاڑی دھوپ میں جائیں تو کہاں ہم"
"جہنم میں۔" شرجیل نے بلند آواز میں مسخرے پن سے کہا اور بینا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ہنسی کی سحر بھری جلترنگ شرجیل کے کانوں کو بڑی بھلی لگی۔
"بینا۔" وہ کہنی کے سہارے لیٹا بینا کو دیکھ رہا تھا۔
"کیا بات ہے —— کہیں ——"
"بینا ——"
"آپ کہیں تو —— میں سن رہی ہوں"

؎ "وہ دل کہ جس نے آپ کو اپنا سمجھ لیا
اس تفرقی جنوں پہ پشیمان ہے آجکل"

وہ دکھی انداز میں بولا۔
"مجھے ہمدردی ہے آپ سے۔" وہ عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی ایسی مسکراہٹ جس میں دکھ کرب اور پیار کے ساتھ ساتھ نفرت کا بھی تاثر تھا۔ مدھم آواز میں مسکرا کر یہ شعر پڑھا۔

؎ آج ہم ہیں تو ہماری کوئی پرواہ نہیں
کل نہ ہوں گے تو ترس جائے گی دنیا ہم کو

"سب بکواس، سب بکواس۔ اطمینان رکھو کوئی نہیں ترسے گا" بینا کے اس شعر پر شرجیل نے جل بھن کر کہا۔ "بہت لڑکیاں ہیں اس دنیا میں ایک تمہارے نہ ہونے سے شرجیل صاحب پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ دوسری سے جتیں گے اور عیش اڑائیں گے۔" وہ اسی مسخرے پن سے بولا۔

"حالانکہ یہ سراسر غلط ہے تم خود کو فریب دے رہی ہو۔"
شرجیل نے بینا کی بات سنی عجیب انداز میں آنکھ کا کنارہ دبا کر اسے دیکھا۔ ذرا سا نزدیک سرک آیا۔ "پھر کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے شاید۔"
"توبہ کیجیے قطعی نہیں —— ایک بار کا تجربہ ہی کافی ہے۔" اور یہ کہہ کر وہ اٹھ کر دریچوں کے پردے سرکانے لگی۔
"رہنے دو —— پردے یونہی پڑے رہنے دو۔" وہ اٹھ کر بولا
بینا نے مڑ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"اندھیرا سر گناہوں کو ڈھانپ لیتا ہے۔ دونوں محفوظ رہیں گے۔"
"کیا مطلب؟" بینا کے ماتھے پر شکنیں آ گئیں۔ "ہم یہاں کون سا عیب کر رہے ہیں؟"
"کر تو نہیں رہے مگر اس رومانی فضا میں کر بیٹھنے کا امکان بہت زیادہ ہے۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔
"لعنت ہے شرجیل آپ پر۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔
"لعنت کے ساتھ آپ کا لفظ کچھ جچتا نہیں۔" وہ بینا کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ بینا دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ شرجیل نے جیب سے گلاب کا سرخ پھول نکالا اور بینا کی طرف اچھال دیا۔ بینا نے اسے بڑی مہارت سے کیچ کر لیا۔ چند لمحے اس پھول کو دیکھتی رہی سرخ رنگ میں آگ سی لگی معلوم دے رہی تھی۔ وہ جھکی اور آہستہ سے اپنے لب پھول پہ رکھ دیئے۔ شرجیل نے اسے یوں تکتے دیکھا اور کلیوں خوشبوؤں اور رومان سے بھرپور لمحہ دل میں ہلچل سی مچا گیا۔ دل ڈولنے ڈگمگانے لگا۔ بینا کے ہونٹ اب بھی پھول پر تھے —— اور شرجیل کو ضبط کا یارا نہ رہا، لپک کر اسے بانہوں میں بھر لیا —— بینا مچھلی کی طرح پھسل کر اس کی بانہوں سے نکل گئی —— اور اسی پھول کو جسے وہ چند لمحے قبل مدہوشی کی کیفیت میں چوم رہی تھی بیدردی سے فرش پر پھینک دیا —— پھول کی کنواری پتیاں ہوا میں بکھر گئیں اور شرجیل کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پتیوں میں مل گیا ——
"بینا تم نے ایسا کیوں کیا ——؟" وہ تھکی ہوئی سی آواز میں بولا اور نامعلوم احساس سے مغلوب ہو کر دیر تک یونہی کھڑا رہا۔ پتھرائی پتھرائی آنکھوں سے بینا کو دیکھتا رہا۔ جو پُراسرار انداز میں ہونٹوں پہ مسکراہٹ لیے دیوار سے ٹیک لگائے اسی کو تک رہی تھی ——
"بینا ——" شرجیل کی تھکی سی آواز بینا کے کانوں میں آئی اور اس درد بھری آواز کو سن کر بینا کی ساری ہستی ڈول گئی —— اک دم سے ہی آگے بڑھ کر شرجیل کو بانہوں میں بھر لیا۔

——(باقی آئندہ)——

# دوشیزہ کی محفل

ریحانہ فاروقی

**شہناز پروین اختر ۔ کراچی**

بحرین سے آنے کے فوراً بعد آپ کو خط لکھا مگر وائے نصیب پرانے قاری ہوتے ہوئے بھی محفل میں جگہ نہ ملی۔ ویسے ہم پھر بھی دوشیزہ کے پرستاروں میں رہیں گے کہ اس نے ہمیں ہمارے آئیڈیل سے ملوا دیا۔ شادی کے بعد بحرین چلی گئی ہوں۔ ہم دونوں اس پرچے کے دلدادہ ہیں کیونکہ خلوص اور لگن سے محنت کر رہے ہیں وہ پرچے کو معیاری نکھار رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم چاہتے ہیں یہ اور آگے بڑھے ۔۔۔ کام آئیڈیل کی تلاش میں مجھے منزل مل جانے کی وجہ سے مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ سبھی لوگ اگر خلوص اور سچائی سے ان صفحات کا استعمال کریں تو سینکڑوں گھروں کو مجھ جیسی خوشی دے سکتا ہے۔ اس ضمن میں اگر والدین آگے بڑھیں تو میرے خیال میں یہ زیادہ با مقصد اقدام ہوگا۔

میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ بتائیے کس روز آؤں؟

ج: شہناز نئی زندگی کی ہماری طرف سے مبارکباد لو۔ دوشیزہ آپ کا پرچہ ہے۔ آپ سب کے ہی مشوروں سے اسے ترتیب دیتے ہیں۔ اس لیے اس کی کامیابی کی مبارکباد کی آپ بھی مستحق ہیں۔ دفتر میں ہم سے ملنے کے اوقات شام چھ بجے سے رات آٹھ بجے تک ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کسی بھی جمعہ یا ہفتہ کو دوپہر دو بجے کے بعد دفتر آجائیں انشاءاللہ ملاقات ہو جائے گی۔

**رضوانہ آس ، لاہور**

ایک مصور ہونے کی حیثیت سے مجھے آپ کے اداریے "خاموشی" کی تصویر کو خراج تحسین پیش کرنا ہے۔ افسانوں میں "خالی ازل" "ملک عرام" پسند آئے۔ ویسے تعریف کرنا اس لیے ضروری نہیں سمجھتی کہ معیاری افسانوں کی آپ کے پرچے میں کبھی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ خواجہ فرخ کا افسانہ "نئی زندگی" اور لسی حق ناگوری صاحب کی کاوش "سرحد" بھی تعریف کے حقدار ہیں۔ "دنیا" کی رفتار شکست ہو گئی ہے۔ ویسے ناول بہت اچھا ہے۔ خالد فاز کے خط نے بہت متاثر کیا۔ غزلوں میں اقبال نیازی کی غزل بہت اچھی تھی۔

**شاہدہ ، پشاور**

آپ کے کالم "تین عورتیں تین کہانیاں" میں بشیر احمد صاحب کی کہانی "دونوں نے گھر بسر کی اور چل دیئے" کے سلسلے میں آپ کی مدد چاہتی ہوں۔ مجھے بشیر صاحب کا ایڈریس چاہیے۔

ج: شاہدہ بی بی یہ سطور بشیر صاحب کی نظروں سے ضرور گزریں گی۔ وہ جونہی اپنا پتہ ہمیں بھیجیں گے شائع کر دیا جائے گا۔

**راحت ناز ، کراچی**

دو بار آپ کی محفل میں آنا چاہا مگر آپ نے نامراد واپس لوٹا دیا۔ بندی شکوہ کرنے کا حق تو رکھتی ہے۔ آخر ایسا کونسا قصور ہو گیا ہے جس کی سزا آپ نے دی۔ غزل بھیج رہی ہوں رائے سے مطلع کیجئے۔

ج: آپ کا شکوہ بجا نہیں، کیونکہ جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے اس محفل میں آپ کے خط کا جواب ہم دے چکے ہیں۔ آپ کو غزل کہنے کے لیے ابھی مشق کی ضرورت ہے۔

**امجد چوہدری ، ساہیوال**

تعلیمی مصروفیات میں کچھ لکھنے کا وقت نہیں ملا ورنہ بہت دنوں پہلے پرچے کی مقبولیت کی مبارکباد دے چکا ہوتا۔ کہانی تحریر کر رہا ہوں۔ ٹوٹے پھوٹے الفاظ ہیں۔ پسند آئے تو کہانی بنا ڈالیے۔ میرے پہلے مضمون کا کیا بنا؟

ج: آپ کا مضمون تشنہ تھا۔ کہانی رکھ لی ہے۔ شائع کر دی جائے گی مگر ذرا اسے صبر سے منتظر رہیے۔

**ناہید شہناز ، وزیرآباد**

آپ لوگوں کے خلوص نے پرچے کو زیادہ نکھار دیا ہے۔ ایک افسانہ اور غزل بھیج رہی ہوں۔ اشاعت کے متعلق اپنی رائے سے ضرور نوازیے۔

ج: ناہید آپ کے دو خطوط ہمیں اسی مضمون کے ملے ہیں مگر ہنوز وہ افسانہ ہمیں نہیں ملا جس کی اطلاع آپ نے اپنے دونوں خطوط میں دی ہے۔ غزل کہنے کے لیے ابھی آپ کو شعراء کا کلام پڑھنا ہوگا۔

مقابلوں میں حصہ لے سکتا ہے۔ تیسرا سوال میرا یہ ہے کہ صوبائی کہانیوں کا کام ختم ہو گیا اس سلسلہ میں طبع زاد کہانی کے سلسلے میں ہی قبول کیا جا سکتا ہے اور میرا آخری سوال یہ ہے کہ کیا دوشیزہ میں لکھنے کا معاوضہ کرنے والے افسانہ نگار صرف نامور افسانہ نگار ہی ہو سکتے ہیں! کیا گمنام افسانہ نگار بھی اس ضمن میں اپنا نام بھیج سکتے ہیں۔

ج : آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ آپ اس مقابلے میں ضرور حصہ لیجئے ۔۔۔ ایک ہی شخص مختلف مقابلوں میں حصہ لے سکتا ہے۔ اور جہاں تک صوبائی کہانیوں کا تعلق ہے، صوبائی کہانیوں کو نہ صرف مقابلے میں شامل کیا جائیگا، اور صرف ۲۵۰ روپے انعام دیا جائے گا۔ مستقل معاوضہ لینے والے افسانہ نگاروں میں صرف نامور افسانہ نگار ہی شامل کئے جائیں گے۔

ریاض حسین قمر، ٹیکسلا

اگر آپ دوشیزہ کے صفحات بڑھا دیں تو زیادہ سے زیادہ لوگ اپنی رائے کا اظہار کر سکیں گے۔ میں قارئین سے استدعا کروں گا کہ وہ دوشیزہ میں چھپنے والی نظم و نثر کی خامیوں کی طرف توجہ دلایا کریں تاکہ نئے فنکار اس کی روشنی میں آگے بڑھ سکیں۔

جمیل احمد، کراچی

"دوشیزہ" کے افسانے بہت منفرد اور معیاری ہوتے ہیں مگر لطائف عموماً اچھے نہیں ہوتے۔ اس طرف توجہ دیجئے۔ "آئیڈیل کی تلاش" اچھا کالم ہے۔ اسی طرح مجھے "تین عورتیں تین کہانیاں" بھی بہت پسند ہے

فضل لطف ادب تونسوی، تونسہ شریف

اکتوبر کے شمارے میں "حضرت بختیار کاکیؒ" کے مضمون نے متاثر کیا۔ اس کے بعد کرشن چندر کے "سپنوں کے قیدی" پڑھا ۔۔۔ اور یہ رائے بھیج رہا ہوں کہ اس کے پڑھنے کے بعد کچھ بھی نہ پڑھتا تب بھی رسالہ مکمل تھا۔ منگنی کا مضمون بھی خاصا دلچسپ رہا۔ جی چاہتا ہے میں بھی کچھ بھیجوں۔

عباسی سومرو۔ کراچی

ہم دوشیزہ کے پرانے قارئین میں سے ہیں اور اکثر رسالہ پڑھنے کے بعد اس کے مضامین پر ہم چند دوست بحث کیا کرتے ہیں۔ اس دفعہ ہماری بحث کا موضوع "تاریخ کے اوراق" تھا۔ میرے دوستوں کو یقین ہے کہ اس موضوع پر خواتین اتنی عرق ریزی نہیں کر سکتیں لہٰذا

مسعود غوری صاحب کے نام سے کوئی مرد یہ کہانیاں لکھ رہا ہے۔ ہم میں چند دوست اس خیال سے متفق نہیں ہیں۔ فیصلہ آپ پر چھوڑا۔ انعام میں یہ طور بھی شامل کر لیجئے کہ یہ کہانیاں عورت لکھ رہی ہو یا مرد مگر قابل ستائش ہے۔

ج : سومرو صاحب جب پورا رسالہ خواتین چلا سکتی ہیں تو پھر بھلا خاتون کے تاریخی کہانی لکھنے پر اس قدر تعجب کیوں۔ ہوا خواتین ہر میدان میں آپ کے برابر ہیں بس ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی ان کی صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی کی جائے تو آپ کو اور بھی بہت سے مقامات پر تعجب کا اظہار کرنا پڑے گا۔ مسعود غوری صاحب کو مبارکباد پہنچا دی گئی ہے۔

مس شبنم امتشال، شہداد پور

میں ایم اے کے امتحانات کی تیاری میں مصروف ہوں۔ آپ کا رسالہ پر تفصیلی تبصرہ امتحانات سے فارغ ہونے کے بعد کروں گی مختصراً عرض ہے کہ رسالہ نکھرتا جا رہا ہے۔ اقتباسات بھیج رہی ہوں دیکھ لیجئے اس مصروفیت میں بھی آپ سے تعاون کر رہی ہوں۔

صوفیہ شاہجہان، مردان

دوشیزہ میں مقابلے کے لیے افسانہ بھیج رہی ہوں۔ کرشن چندر کا یہ خوبصورت افسانہ یقیناً پڑھنے والوں کو پسند آئے گا۔

ایچ اے، اطہر، کراچی

آپ نے بہن کی تلاش میں جو تعاون کیا میں اس کا شکر گزار ہوں۔ میری تحریر پڑھ کر بہت سی بہنوں نے مجھے بھائی بنانے کی آفر دی۔ میں نے اپنی خواہش کے مطابق ایک بہن کو جو مجھ سے بڑی ہیں بلا جھجک باجی کہہ سکتا ہوں منتخب کر لیا ہے۔ دعا کریں میری باجی یہ وعدہ نبھائیں کہ وہ مجھے سگے بھائیوں جیسا خلوص دیں۔

# آپ کا بیوٹی سیلون

ذہین حوری

**محمد اقبال زاہد، ملتان**

س: میرے چہرے پر خشکی کے نشان رونما ہو جاتے ہیں بہت پریشان ہوں۔ علاج بتا کر ممنون فرمائیں۔ اس کے علاوہ یہاں پر وکس بھی نایاب ہے براہِ مہربانی بذریعہ وی پی بھیج دیں۔

ج: بھیا آپ منہ دھونے کے فوراً بعد کوئی بھی اچھی قسم کی چکنی کریم چہرے پر مل لیا کریں۔ خشکی کے نشان نہ پیدا ہوں گے۔ اپنا ایڈریس صاف اور خوشخط لکھ کر بھیجیں تبھی ہم وکس بھیج سکیں گے۔

**ب۔ام۔کوئٹہ**

س: میری عمر ۱۵ سال ہے۔ میرے تمام چہرے پر بھورے رنگ کے تل ہیں۔ کوئی ایسا طریقہ بتائیں جس سے یہ دور ہو جائیں۔

ج: آپ رات کو سونے سے قبل ایک اونس گلیسرین میں ٹارٹیکا ۹۲ ذرام ملا کر چہرے پر مل لیا کریں۔ صبح CUTICURA صابن سے منہ دھو لیں۔

**شاہدہ ممتاز چوہدری ساہیوال**

س: میرے چہرے کا ایک حصہ جل گیا تھا۔ اب وہاں سیاہ دھبہ ہے جو بہت بدنما نظر آتا ہے۔ اسے دور کرنا چاہتی ہوں۔ کوئی دوا بتائیں۔

ج: شاہدہ بہن ہمیں افسوس ہے۔ یہ نشان دور نہیں ہو سکتا۔ اس آپ پلاسٹک سرجری کرا لیں۔ یہی اس کا واحد علاج ہے۔

**سلطانہ توصیف ساہیوال**

س: میرے چہرے پر بھورے رنگ کے تل ہیں اور آنکھوں کے گرد جلد سیاہ ہو گئی ہے۔ انہیں دور کرنے کا کوئی علاج بتائیں۔

ج۔ بھورے تلوں کے سلسلے میں ہم کو جو مشورہ دیا ہے آپ بھی اسی پر عمل کریں۔ تازہ سبزیاں اور پھل خوب کھائیں۔

حلقوں کو دور کرنے کے لیے روئی کے دو چھوٹے چھوٹے پیڈ بنائیں ٹھنڈے پانی میں بھگو کر نچوڑ لیں۔ پھر ٹھنڈے کھیرے کے رس میں ڈبو کر آنکھوں پر رکھ لیں اور گھنٹہ بھر کے لیے آرام کریں۔ یہ عمل روزانہ کریں۔ رات کو سونے سے قبل حلقوں پر کوئی بھی سی آئی کریم ملیں۔

**عذرا مظفر۔ پشاور**

س: باجی میرے چہرے پر سفید پیپ والے دانے نکلتے ہیں۔ جب یہ دور ہوتے ہیں تو چہرے پر نشان چھوڑ جاتے ہیں۔ میں سخت پریشان ہوں۔ خدارا اس مصیبت سے نجات دلا دیجئے۔ میری جلد بھی چکنی ہے۔

ج: آپ ہر روز اپنے چہرے کی کلینزنگ کیا کریں۔ چہرہ میڈیکیٹڈ سوپ سے دھوئیں اور ہفتے میں ایک بار آرڈینا ماسک لگائیں (ماسک اتارنے کے بعد کسی اچھی قسم کا اسٹرنجنٹ ضرور استعمال کریں) دانوں کے نشان خود بخود دور ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے آپ پریشان نہ ہوں۔

**ثریا ملک، ملتان۔**

ج: آپ اپنا ایڈریس لکھ کر بھیجیں ہم براہِ راست جواب دے دیں گے۔

**ناہید قریشی۔ راولپنڈی**

ج: آپ کے حالات پڑھ کر ہمیں سخت دکھ اور افسوس ہوا۔ ہم آپ کو دوائیں اپنے خرچ پر بھیجیں گے۔ اچھی بہن آپ خدارا ابھی پریشان نہ ہوں آئندہ کوئی ایسا پرابلم ہو تو بلا جھجک لکھ دیا کریں۔

**ثمینہ رانا۔ لاہور**

ج۔ ننھی منی سی بہن آپ بالکل نارمل ہیں۔ بیکار قسم کی الجھنوں کا شکار نہ ہوں۔ کچھ تو صبر کیجئے۔

**شمشیر، گلگت**

ج: آپ اپنا پتہ روانہ کریں۔ ہم آپ کو منجن بھیجیں گے۔ اس کے استعمال سے آپ کے دانتوں کے تمام امراض دور ہو جائیں گے۔

**نسیمہ شاہین۔ میرپور خاص**

ج: نسیمہ بہن! عذرا مظفر کے لیے تجویز کردہ تدابیر پر آپ بھی عمل کریں۔

# آسان بُنائی

سوئیٹروں کا زمانہ آنے سے پہلے ہی خواتین کے ہاتھوں میں رنگا رنگ اون کے گولے اور سلائیاں نظر آنے لگتی ہیں اور دکانوں اور بازاروں میں مختلف اقسام کی اون کے ڈھیر دکھائی دینے لگتے ہیں تیز بُنائی کرنے والی خواتین عموماً ایک سوئیٹر ہفتہ بھر میں بُن لیا کرتی ہیں۔ لیکن اس بار رنگ کچھ اور ہے اور اس تبدیلی میں سنگر کی تازہ ترین پیشکش میوزیکل پنچ کارڈ نٹر کا بڑا ہاتھ ہے جب تو سلائیوں اور ڈیزائنوں کے ساتھ مغز پچی کرنا پڑتی ہے اور ایک سوئیٹر کی تیاری میں پورا ایک ہفتہ لگتا ہے۔

آپ نے اشتہارات میں ماڈل گرلز کو اون کی بنی ہوئی سکیاں اور میکسی اسکرٹ، پاجامے، قمیص، شالیں اور دوپٹے وغیرہ پہنے دیکھا ہوگا لیکن اس میں

حیران ہونے کی بات نہیں، کیونکہ اب یہ کام چند گھنٹوں کا رہ گیا ہے۔ اب پیچیدہ قسم کے ڈیزائنوں والے دو سیدھے قسم کے نمونوں کی ضرورت نہیں رہی ہے اور نہ ہی بار بار ڈیزائن کے مطابق مشین کو سیٹ کرنا پڑے گا۔ پسند آپ کی اور غور و فکر کے سارے کام پنچ کارڈ اور مشین کے۔ اس مشین کے ساتھ پنچ کارڈوں کا سیٹ بھی ملتا ہے۔ اپنی پسند کے ڈیزائن کا کارڈ لگائیے اور مشین چلائیے۔ اور اگر ان میں سے کوئی بھی ڈیزائن پسند نہ ہو تو اپنی پسند کا ڈیزائن سادہ پنچ کارڈ پر پنچ کیجئے اور بُنائی شروع کر دیجئے۔

آپ اس سے نہ صرف دو مختلف رنگوں کا بیک وقت استعمال کر سکتی ہیں بلکہ چاہیں تو باریک دھاگے، نائیلون یا چاندی کے تاروں سے نفیس لباس بھی تیار کر سکتی ہیں یا ایک ہی لباس کے مختلف حصوں کو مختلف رنگوں سے بُن سکتی ہیں۔ لیکن ایسے ملبوسات کی بُنائی میں ایک مشکل ہے اور وہ یہ کہ جتنی بھی احتیاط کریں پیمائش میں کمی بیشی رہ جاتی ہے مثلاً ۳۸ × ۲۸ × ۱ کی جگہ ۳۲ × ۳۰ × ۳۶ بن جائے تو آپ کیا کر سکتی ہیں۔ اس کا علاج کنٹرولر ہے جو مشین میں ہوتا ہے۔ کنٹرولر کے کاغذات پڑھ کر آپ پیمائش کے مطابق لباس تیار کر سکتی ہیں اور اگر مطلوبہ پیمائش کا کنٹرولر نہ ہو تو کنٹرولر پر پیمائش درج کریں۔ انشاءاللہ خیر ہوگا۔

اور مزید لطف یہ کہ آپ چاہیں تو اون کی ٹائی سے لے کر بیڈ روم کے پردوں تک ہر چھوٹی بڑی چیز بُن کر رکھ سکتی ہیں۔ اس طرح بھی مقابلتاً کم ہوگا اور وقت اور محنت کی سو فیصد بچت بھی۔

۱۸۔سی خضوعیت اسٹریٹ۔ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی کے

# دوشیزہ ادبی معمّے ۵ میں

بالکل دُرست حل اور ایک غلطی کے انعامات کی مجموعی رقم

## ۱,۳۰,۰۰۰ روپے حاصل کی

This portion to be detached by the Payee before presentation.

545340

United Bank Limited

No. POA 545340 — 13-11-1978

Payee's A/c Only.

United Bank Limited

Nursery Branch, Karachi.

For United Bank Limited

Accountant — Manager

Rs. 115000/-

This portion to be detached by the Payee before presentation.

545399

United Bank Limited

No. POA 545399 — 13-11-1978

Payee's A/c Only.

United Bank Limited

Nursery Branch, Karachi.

For United Bank Limited

Accountant — Manager

Rs. 15000/-

یہ اُن پے آرڈرز کی عکسی تصویر ہے جو یونائیٹڈ بینک نے سیّد مُذکر حسین کے نام جاری کئے

# دوشیزہ ادبی معمّے پاکستان کے واحد معمّے ہیں

جو بڑے انعامات کی ادائیگی چیک کی بجائے بینک کے پے آرڈر اور ڈرافٹ کے ذریعے کرتے ہیں!

انعام اختر، اکرام صابر، صداقت جان، قائم رضا، میرن شاہ، صائمہ شیرازی، عابد،
حبیب الدین، یوسف، فاروق اختر، خالق حسین، جمیل حق، ستارہ زیدی، پرویز ناز،
سبیلہ، حامد حسین، سرد حنیف، شمسہ حسین، سائرہ صدیقی، طاہرہ بیگم، زیب النسا، شکیلہ اختر،
ذوالفقار، خیال قادر، ظلی حسین، احمد سبحانی، مجتبیٰ حسین، جشیر حسن، محشر علی،
قاسم علوی، ممتاز بیگم، اختر شیرانی، غالب علی، جمال اکبر، ناصر رضا، ساجد اختر،
ماجد سبزواری، نبی بخش، ذاکر حسین، اعظم فاروق، انیس چشتی، اقبال بادشاہ، سلیم اعظم،
مشرف کاظمی، بشیر حیدر، شاہ عالم، ظلی، صوفیہ بانو، نیلو ناز، ابرو بیگم، سرکش
زیدی، مہر النسا، رحیق، اقبال خاتون، ریحانہ، فاروق، صابر بیگ، جہانگیر حسین،
بلال احمد، [illegible] کاظمی، سیما ناہید، اصغیر حسن، اقدس، انور مراد، مولا بخش، ایوب جمال،
حنیفہ خاتون، سجاد حسین، سبط علی، شاہینہ، شمیم کوثر، حشمت علی، انعام اللہ، اقبال علی،
مجیب الرحمن، بخت خان، سلیم النسا، فرحت امام، خدیجہ امام، شاہ عالم، نسیم واجد،
راحت حسن، فرح طارق، باقر قادری، سعید سبحانی، رضیہ حسن، جعفری بیگم، مشتاق حسین،
طلعت مرزا، داور علی، صدیقی، داؤد، خورشید قاسم، صالحہ حسن، مبین عالم، فرزانہ،
باقی صدیقی، عابد علی حسین، تصدق صابری، احسان علی، عاقلہ فاطمہ، شفقت مرزا،
پروین اختر، علی حاتم، بسم اللہ خاتون، عطیہ رحمانی، رابعہ بھوپالی، نفیس اختر،
شمس النسا، مہتاب بیگم، سعیدہ قریشی، رقیہ انور، پیر میاں، نسیم الدین، کمال بخش،
رحمن فاروقی، انجم شباب، ثاقب حیدری، سعادت علی خان، ثاقب بریلوی، شبانہ اعظم،
صادقہ بیگم، صفدر علی، رفیعہ جعفری، شورش حسین، سلام الحسن، نجمہ بیگم، ذوالجلال،
اقتدار، عابدہ، کریم احمد، سرور النسا، تسنیم اختر، امام الدین، فرخ ناز، فریحہ اسلم،
وکیل احمد، جلال نواز، سوار حیات، خیرات حسین، نایاب بیگم، منصور، اطہر،
انسر خان، ساجد کاظمی، حاتم علوی، فائزہ احمد، غیاث احمد، تشکیل افضل، غلام علی،
نواب الدین، اختر ضیاء الدین، شیخ شمس الدین، ضمیر حسین، صلاح الدین، میر امام حسین،
تلمیذ زیدی، فوزیہ اختر، عبدالملک، اسما حیدر، شازیہ، فاخرہ، آصف خان، راغب،
ولی حسین، عقیل چشتی، صابر نظامی، یاسمین ناز، امیر حسین، عبداللطیف، سلام تابش،
نجمہ، سلمیٰ، محمد حسین، حفیظ حسین، سمیعہ ناز، نادر شاہ، گلزار خان، عیسیٰ خان،
امجد علی، واجد خان، مبین حسین، قدسیہ، شمیم، آمنہ زیدی، سہیل دلاور، اکرم علی،
عابد علی شاہ، رابعہ حق، فاطمہ بیگم، کریم النسا، صغریٰ خانم، نور احمد، حمید علی بخاری،
نرگس بیگم، آسیہ خاتون، ممتاز علی، منظر جلال، فراست حسین، خورشید نقوی،
شبیب کاظمی، عثمان علی، شجاع الدین، رضا قیصر خان، احمد اللہ، رمضان فد
رجب علی بیگ، ناظر حسین، ریحانہ امتیاز، فرخندہ کاظمی، ظفر علی، شمس، قمر، مقصود نعیم،
طاہرہ خالق، نکہت ناصر، صفت بیگم، زاہدہ زیدی، عائشہ سلطان، سعد اللہ حسن،
اقبال حسین،

لاہور :۔ رضیہ خاتون، عبدالقدوس چودھری (۲ حل)، کمال احمد (۵ حل)،
نوازش ملک (۵ حل)، عبدالجبار (۳ حل)، نزہت صاحب (۱۲ حل)، اسحاق محمد، نسیم راشد،
اسلم محمد، طالب حسین، یوسف چودھری، روحی بانو، افشاں ستار، نائلہ بیگم، کوثر بیگم،

عبدالعزیز، سیف اللہ، سرفراز احمد، محمد صدیق، جبار جاوید، نذیر چودھری، مسرت شاہد،
گلزار خان، ندیم اختر، اللہ بخش، عابد علی، ارشد چودھری، ہاشم حسین، پرویز شاہد،
آزاد دھوری، شاہین بیگم، اشتیاق حسین، خالد جاوید، علی بخش، اشرف کاظمی، افتخار
زیدی، ظاہرہ بیگم، ذہانت علی، ذاکرہ خانم، انام، نسرین، ثریا شاہین، زیبا صادق،
فرخ کمال، درشہوار، معصوم خان، فائق مدنی، راسخ مدنی، جمیل الدین، نظام حسین،
گوہر جمال، رحمان ایرانی، شریف حسین، اسد عابدی، عثمان لکھنوی، نگینہ قمر،
رکن الدین احمد، مقبول علی، بتول جعفری، خانم، خالدہ، عابدہ، سعیدہ، مرحمت،
سرور بیگم، نفیسہ، جیلانی بانو، امیر حسین، عدنان، زبیر علی، عمران حسین، منظر کاظم،
ناظم سعیدی، اطہر حسین، اعظم خان، فرید اللہ، اکبر ناز، غلام فاروق، جنت بی بی،
محمد اطہر، زمان علی، بندے علی، باقر نظامی، فاروق اعظم، حضرت حسین، انور،
جلیس حسن، ثریا صمد، مینا تاج، اکمل، حجاب ناز اختر، عاشق حسین، اقرار احمد، مقصود
مظہر النسا، رہبر نواز، مشفق عالم، سائرہ بانو، یعقوب بیگ، ناصر بیگ، [illegible]
آغا داؤد، شاب بلند، بیگ اکبر خان، نازش عثمان، عزت حسین، فصاحت بیگ،
نسیم چودھری، غلام حسین، حمیدہ اختر، ثروت اکرام، حسن آرا، جمال آرا، اللہ دتی بیگم،
سہیلہ نقوی، فرزند علی چودھری، اکرم محمد، اختری بیگم، انور النسا، نذیر شیخ،
دردانہ، نہال، نصیر کمال، ذاکر حسین، شاکر علی، منصب علی، شکور احمد، [illegible]
سیما حقانی، غلام عباس، ارشد ملک، الطاف حسین، اقبال رسول، مشتاق احمد،
نور علی، ظفر عالم، محسن علی، لے عنایت، اورنگ زیب، منظور احمد، چودھری [illegible]
مقبول اشرف، عمران حیات، ذکا اللہ، خیرات علی، محمد نواز، نجمہ، خادم [illegible]
عنایت بی بی، یاسین، حمید الوہاب، تفضل حسین، کے یاجوہ، روحی بانو، رحیم گل،
طاہرہ، شوکت حسین، عائشہ، انجم رانی، شوکت علی، رعنا الطاف، تصور بیگ،
رضیہ سلطانہ، مسعود سلطان، عبدالہادی، ممتاز، خدا بخش، افسری بیگم، عبدالسلیم،
امام الدین، قمر زہرہ جبیں، صابر علی، التصدق جنجوعہ، قرۃ العین، خلیل بیگم، حسین خان۔

جہلم :۔ چودھری فرزند علی، شفیق، زبیدہ رفیع، اکرم قریشی، مدثر علی، رحیم النسا،

گجرات :۔ اقبال فاروقی، رشیدہ سلطانہ، تہمینہ عباس، ارشد علی،

پشاور :۔ زاہدہ، ناہیدہ، عابدہ، صغیر گل، سلمان، زمان، زمان خان، [illegible]
منصب زمان، سیما اکمل، صبیحہ اکرم، بشیر احمد خان، جاوید حسین، رحیم چشتی، نیاز احمد،
عادل نواب، ثمر سلطانہ، کلیم حسین، زیرک خان، انعام اللہ، خورشید حسین، شاہ عالم،
باقر صدیقی، حبیب اللہ، داؤد حسین، حنیفہ چشتی، گل مہدی، زاہد بٹ، ارم ناز، اقبال
لودھی، دریا خان، فیاض علی، اسماعیل جلال، اکبر علی، سعادت خان، کبیر حسین، [illegible]
نائلہ کاظم، اطہر کلیم، جمیل اختر، نواب حسین، سوار علی، حافظ الدین، سلیم اکبر، صائمہ نسیم،
فوزی، رفیق دلاور، حمیدہ شاہ، شمیم شاہ، اقبال حسن، صداقت علی، فاروق کاظم، [illegible]
سلیم باقر، صغیر احمد، بشیر احمد، اعظم نفیس، ناہید رانی، ایوب انصاری، خرم خان،
عالیہ شاہین، شہباز، مسعود، نغمہ، شاہین قادری، صابر حسین، شفیع نقی، سمیعہ فاطمہ،

باقی صفحہ ۱۴۲ پر

دفتری اور انتظامی اخراجات کیلئے صرف ۵ فیصد رقم وضع کی جائے گی،

## 2.60 لاکھ

دو لاکھ ساٹھ ہزار روپے کے انعامات

پہلا انعام بالکل درست حل پر ۲ لاکھ روپے

## دوسرا انعام، ایک غلطی والے حل پر چالیس ہزار روپے　　تیسرا انعام، دو غلطی والے حل پر بیس ہزار روپے

فیس داخلہ فی حل ایک روپیہ ایک نام اور ایک ڈکن کے ساتھ دو روپے پچاس پیسے میں تین خانے بھیجے جا سکتے ہیں۔ اس حساب سے جتنے چاہے حل بھیج سکتے ہیں۔ دوشیزہ ادبی معمہ نمبر ۷ کے اپنے تمام خانوں کے ساتھ ایک ڈکن دوشیزہ ادبی معمے نمبر ضرور بھیجئے جو ماہنامہ دوشیزہ سے کاٹا گیا ہو، مفصل شرائط اور ہدایات کی پابندی لازمی ہے۔ جو دوشیزہ کراچی میں شائع ہوتی ہیں۔ ایک شخص الگ الگ ڈکنوں پر الگ الگ انعام حاصل کر سکتا ہے۔ انعامی رقم میں مزید کمی و بیشی ہو سکتی ہے۔

دفتر ماہنامہ دوشیزہ ۹۰۹ سی سنٹرل کمرشل ایریا اقبال روڈ پی ای سی ایچ ایس کراچی میں حل وصول ہونے کی آخری تاریخ ۵ دسمبر آخر ڈاک سے ڈاک خانہ ۹ دسمبر تک

## دوشیزہ ادبی معمہ نمبر (۷)

| نمبر | اشارے | ممکن الفاظ | | | حل نمبر... | حل نمبر... | حل نمبر... |
|---|---|---|---|---|---|---|---|
| ۱ | ـــــ میں اُردو زبان میں کوئی کام نہیں ہوا تھا۔ | سرحد | سندھ | پنجاب | | | |
| ۲ | شطرنج کا ایک ـــــ بھی چھالیا کے ساتھ کتا رکھا تھا۔ | رُخ | فیل | پیادہ | | | |
| ۳ | خدا اور رسول کے بعد میں آپ ہی کی ـــــ کا قائل ہوں۔ | عظمت | خدمت | عزت | | | |
| ۴ | ـــــ غریبوں میں ہی پیدا ہوا۔ | کمیونزم | سوشلزم | اسلام | | | |
| ۵ | اُس سے ـــــ کا سا سلوک کریں۔ | دوستوں | باغیوں | دشمنوں | | | |
| ۶ | ـــــ وبا کی صورت اختیار کر گئی۔ | فحاشی | بیماری | عریانی | | | |
| ۷ | اسے بادشاہ کے ـــــ کی حیثیت حاصل تھی۔ | خدمتگار | نائب | مصاحب | | | |
| ۸ | وہ ـــــ بار اپنے ماں باپ کو قتل نہیں کر سکتے۔ | بار | دو | ایک | | | |
| ۹ | اپنے عمل کی بنا ـــــ پر نہیں علم پر رکھو۔ | خیالوں | اکائیوں | دھوپوں | | | |
| ۱۰ | اصل سبب یہ تھا کہ وہ ـــــ کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ | فارسی | اُردو | سندھی | | | |

نام اور مکمل پتہ ـــــــــــــــــــــــــــــــــــــــــ

دستخط ـــــــــــــــــــ

ڈاک سے اپنے حل اور فیس اس پتے پر بھیجئے ۔ **دوشیزہ ادبی معمہ**، ماہنامہ دوشیزہ پوسٹ بکس ۵۹۰۸ کراچی ۲۹

دوشیزہ ادبی معمہ کا صحیح حل ۷ دسمبر ۱۹۷۵ء کو ایک بجے دن دفتر دوشیزہ پر مطبوعہ کتابوں کے مکمل حوالوں کے ساتھ آویزاں کر دیا جائے گا۔
۱۰ دسمبر کو صحیح حل امن، مشرق کراچی، لاہور، پشاور، کوئٹہ میں شائع ہوگا۔ انعام یافتگان کی مکمل فہرست جنوری ۷۶ء کے دوشیزہ میں ملاحظہ کیجئے۔

رفیق احمد سی، آفتاب بیگ، نوازش چودھری، اسلم علی، امجد حسین، معز احمد، ادھم حسین شاہ، سلطان احمد، ابراہیم فاروقی، صادق حسین۔

راولپنڈی اسلام آباد :۔ محمد حسین، جبار اختر، فضل حق، فائزہ، صدر خان، ممتاز چشتی، ذاکر حسین، جمیل احمد، نذر حسین، منور علی، توحید یقی، رضیہ سرور، مسعود احمد، عاصمہ منیم، ریحان قریشی، احمد یار خان، احتشام اللہ، زبیر الدین، سکھ علی، معینہ باقر، بدرالدین، جعفر حسین، سطوت آرا، عفت حسین، منیر احمد، پروین، فریدہ چوہان، شفیعہ چوہان، ریاض اختر، شمس الدین، امیر زمان، محمود خالد، کرامت جیلانی، طارق سلمان، شاہد کریم، القدس سلطان، ریحانہ بیگم، عطیہ رحمٰن، بلقیس حمید، ثریا کمال، عرفانہ شاہ، شوکت چودھری، انور حسین، دلنواز حسین، فرحانہ فاروقی۔

حیدرآباد :۔ شہلا پروین، آفتاب عالم، وسیم احمد، خورشید خاتون، قمر بیگم، شاہین صدیقی، عفت نظام، عشرت، مہر ابراہیم، ساجد علی، راحت انجم،

## کلیم کی آخری تاریخ ۲۰ دسمبر ۷۵ء

دوشیزہ ادبی معمہ ۶۰ کے انعام یافتگان کی مکمل فہرست شائع کی جا رہی ہے۔ پہلے انعام کی خوشخبری تار کے ذریعے پہنچا دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ معمہ نمبر (۶) کے ایک اور دو غلطی کے انعام پانے والے خوش نصیبوں کو فرداً فرداً بذریعہ ڈاک اطلاع دی جا چکی ہے اور اطلاع سے دو دن بعد انعامی رقم بھی ارسال کر دی گئی ہیں جو اس رسالہ کی اشاعت سے قبل آپ کو مل چکی ہوں گی!

اگر آپ کو انعامی رقم نہ ملے اور آپ سمجھتے ہیں کہ آپ انعام کے حقدار تھے تو ایک روپیہ کلیم فیس کے ساتھ اپنے بھیجے ہوئے حل کی تفصیلات سے مطلع فرمائیں یعنی کس تاریخ کو کتنے حل بھیجے تھے انہیں کس طرح روانہ کیا تھا۔ منی آرڈر رسید نمبر، پوسٹل آرڈر یا نقد نامہ نمبر کا حوالہ دیجئے۔ اگر حل رجسٹری ڈاک سے بھیجے گئے تھے تو رجسٹری نمبر اور ڈاک خانے کا نام۔ آپ کا حل کس انعام کا مستحق ہونا چاہیے تھا۔ ایسے تمام کلیم ہمیں زیادہ سے زیادہ ۲۰ دسمبر تک مل جانے چاہئیں۔ اس تاریخ کے بعد کوئی کلیم قابل غور نہ ہوگا۔ اگر آپ کا کلیم درست ثابت ہوا تو انعامی رقم کے ساتھ آپ کی کلیم فیس بھی واپس کر دی جائے گی۔

دوشیزہ ادبی معموں کے خاکے مفت نہیں دیے جائیں گے چھ پیسے فی خاکے کے حساب سے جتنے خاکے چاہیں دفتر دوشیزہ سے طلب کئے جا سکتے ہیں۔

مرتاز، اللہ بخش، اکرام الدین، فرہاد شفیق، کمال حسین، آفاق علی، مہدی عباس، سبب نواز، شہزاد نعیم، مصطفیٰ، عنایت، آنسہ شمیم، سلمیٰ اکبر، وحید حسین، شہزاد خان، عصمت رفیق، منصب، رانی۔

ساہیوال :۔ باقر حسین، انجم قادری، ساجد زیدی، فاروق سلیم، اختر اطہر، قیادت علی، اعظم حسین، عزیزہ بیگم، کبیر احمد، رحمت بخاری، اقبال حسین، راشد غلام، سوار احمد، ناظم حسین، غلام عباس، علی افضل، نورالدین، احسان، لطیف احمد، کاظم حسین، عابدہ، لودھی، مریم بی بی، ناہید بیگم، سعید ہاشمی، نجمہ، درخشاں، گلاب بی بی، وصی حسین، سرفراز، سلیمہ جمال، حمید چودھری، پرویز اختر۔

ملتان :۔ خادم حسین، نغمہ فاروقی، سجاد حیدر، سمیع خان، کرم خاتون، دلیہ اسلام، خورشید، احسن علی، عباس حیدری، امام الدین، جلال احمد، سعد قریشی، فیروز اطہر، اصغری خانم، اعظم حسین، نورخان، اسلمان، نصرت علی، نہال احمد، طیبہ خاتون، حامد کریم، امیر حسن۔ —— رحیم یار خان :۔ مقصود حسین، عاقل بیگ، افضال زیدی، انعام الحق، انصر خان، سعیدہ افضال، تقدیر حسین، عثمان فاروقی، اویس اختر، کبریٰ خاتون —— سکھر :۔ اللہ دتہ، نورالدین، ہاشم حسین، تکمیل الدین، رقیہ بیگم، عطاء اللہ، فرزانہ زیدی، احسن حلیم —— لائلپور :۔ اصغری خانم، مشتاق خانم، سروش احمد، میاں افضال، دبیر حسین، وکیل احمد،

متفرق :۔ کوکو حسین (ٹھٹھہ)، صدیقہ خاتون (ٹھٹھہ)، عنایت علی (دادو)، شبیر علی میرپور، شوکت حیات گھوٹکی، حاتم بیگ میرپور خاص، آمنہ سالار (خضدار)، کرم علی شکارپور، قمر حسین جیکب آباد، نظام الدین جھنگ، معین احسن جھنگ، عاطر گل، گوجر خان، افزار احمد کوئٹہ، افتخار کوئٹہ، شرافت حسین شیخوپورہ، ذوالفقار شکارپور، کامران حسین ماتلی، محمد خان ملک خوشاب، عطاء الشہار رث واہ، عاشق حسین، عارف اللہ، نذیر احمد ڈونگہ بونگہ، صداقت علی سندری، اخلاق احمد کوہاٹ، صادق حسین مظفر۔

✂

کاش میرا آئیڈیل میری زندگی میں بہار بن کر آجائے۔
• ش۔ ن "کراچی

## نینوں کی نیّا

مجھے بھی اپنے آئیڈیل کی تلاش ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ وہ انجینئر، آرمی آفیسر یا ڈاکٹر ہو۔ بس ایک اچھے گھرانے سے تعلق رکھتا ہو اور مناسب عہدے پر فائز ہو۔ وہ اسمارٹ اور پُرکشش شخصیت کا مالک ہو۔ عمر کم از کم ۳۰ سال۔ وجاہت کے معاملے میں فراخ دل ہونا از بس ضروری ہے۔

میں ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میٹرک کی طالبہ ہوں اور مستقبل میں ڈاکٹر بننے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ میں بہت نازک اور دُبلی پتلی سی ہوں، گوری رنگت، ستواں ناک اور کشتی نما بڑی بڑی آنکھیں۔ میرے والد صاحب بھی ڈاکٹر ہیں۔

اگر مجھے میرا آئیڈیل مل جائے تو میں اپنے گھر کو چہکتی ہوئی خوشیوں کا گہوارہ بنا دوں گی۔
• افشاں ناز، سکھر

## مسرت کے موتی

میرا آئیڈیل ـــــ کشمیری خاندان کا چشم و چراغ، دراز قد، اسمارٹ نوجوان، پائلٹ، آرمی آفیسر یا کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو اور ایک سلجھے ہوئے باذوق شریکِ سفر کا متلاشی ہو۔

میں ایک دولت مند مگر سادہ کشمیری گھرانے کی قبول صورت لڑکی ہوں۔ ایف اے کی طالبہ ہوں، دراز قد، صاف گو اور نہایت سلجھی ہوئی۔ الٹرا ماڈرن تو نہیں البتہ ایک جائز حد تک فیشن کی دلدادہ ضرور ہوں۔

اگر مجھے میرا آئیڈیل مل گیا تو میں ابرِ رحمت بن کر چھا جاؤں گی تاکہ اس پر سدا مسرتوں کے موتی برستے رہیں۔
• فوزیہ مبشر "لاہور۔

## ہونٹوں کے کنول

میرا آئیڈیل ـــــ دراز قد، خوب صورت، لمبی لمبی مونچھوں والا آرمی آفیسر یا ڈاکٹر، ماڈرن قسم کا اور دولت مند بھی کیونکہ مجھے شاپنگ کرنے کا بڑا شوق ہے۔

میں سید گھرانے کی ۲۴ سالہ حسین دوشیزہ ہوں۔ زلفیں لانبی لانبی، سرخ و سپید رنگت، پھولوں ایسے نرم و نازک ہونٹ، بہت اسمارٹ اور دلکش سراپے کی مالک ہوں۔

مجھے یقین ہے کہ میرا آئیڈیل ضرور مل جائے گا۔
• شہناز "کراچی

## کانٹوں کا پیراہن

میرا آئیڈیل ـــــ سانولا رنگ، متناسب جسم، شادی شدہ ہو، ایک ایسا شخص جسے اچھی گھریلو زندگی نصیب نہ ہو سکی ہو۔ معقول تنخواہ پاتا ہو۔ شکی مزاج نہ ہو۔

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی ۲۴ سالہ لڑکی ہوں۔ گریجویٹ اور بہت خوبصورت مگر شومئ قسمت سے خاندانی روایات کی بھینٹ چڑھ کر دو بار طلاق لے چکی ہوں کیونکہ کسی وجہ سے مجھے دونوں شادیاں راس نہ آئیں۔ بہت ہی دل شکستہ ہو چکی ہوں۔ یوں سمجھئے کانٹوں پر لوٹ رہی ہوں۔ چاہتی ہوں میرا آئیڈیل بے شک شادی شدہ ہو مگر نیک اور پُرخلوص ہو جو میری سونی زندگی کو اپنی چاہتوں سے جگمگا دے اور میری اس بے کیف زندگی میں ایک نئی روح پھونک دے۔

میں اپنی نئی زندگی کو خوش آمدید کہنے کے لیے بے تاب ہوں۔
• روفب "کراچی

## مصرعِ تر کی صورت

میرا آئیڈیل ایک معمولی انسان ہے۔ خوب صورت نہیں، قبول صورت تو ضرور ہو۔ بزنس مین ہو تو بہت خوب، اگر کسی اور شعبے میں ہو تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی شخصیت بارعب، بڑی بڑی مونچھیں اور آنکھوں سے شرارت ہر لمحہ ٹپکتی ہو۔ عمر یہی کوئی ۲۹ سال۔ شکی مزاج حضرات معاف ہی فرمائیں۔

میں ایک معزز اور متمول گھرانے کی دُبلی پتلی نازک اور بڑی شرمیلی سی لڑکی ہوں۔ بی ایس سی کر رہی ہوں۔ شاعری کا بھی شوق ہے۔ دو چار چھپتی ہوئی غزلیں بھی لکھی ہیں۔

خدا کرے "دوشیزہ" کے سہارے مجھے میرا آئیڈیل مل جائے۔
• مس غزالہ "ڈیرہ غازیخان۔

## اپنے نہ ہوئے اپنے!

میرا آئیڈیل ایک باوقار شخصیت کا مالک ڈاکٹر، آرمی آفیسر یا کوئی تعلیم یافتہ صاحبِ جائیداد نوجوان ہے جو دراز قد، خوش شکل اور خوش مزاج ہو۔ اس کے دل میں خلوص اور چاہت کوٹ کوٹ کر بھری ہو۔ شکی مزاج ہرگز نہ ہو۔

میں ایک کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی ہوں۔ عمر ۱۷ سال، خوش شکل، خوش مزاج اور صحت مند۔ میٹرک پاس کر چکی ہوں۔ حالات کی ستائی ہوئی ہوں اور بیگانگی کا سلوک سہہ چکی ہوں۔ اس لیے چاہتی ہوں کہ کوئی ایسا پُرخلوص اور ہمدرد انسان مل جائے جس کی چاہتوں میں ڈوب کر زندگی کے سارے غم بھول جاؤں۔

کاش میری یہ تمنا پوری ہو جائے۔
• ع۔ ف "رحیم یار خان

09

جو عمر بھر شادی نہ کرنے کا عہد کیے بیٹھی تھی آج وہ بڑی بڑی شربتی آنکھوں میں بستے ہوئے دکھ کے ساگر دیکھ کر یوں پشیماں ہو گئی تھی کہ اسے اپنا عہد، اپنی ذات، اپنی ساری خود اعتمادی ان دو شربتی جھیلوں میں ڈوبتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ نرم تکیہ گود میں رکھے سفید لباس میں ملبوس شب دیجور کی طرح سیاہ زلفیں بکھرائے مسہری پر لیٹے ہی لیٹے افسانے کا کوئی پریشان کردار بنی بیٹھی تھی۔ پیڈ کے کاغذ کسی نئے افسانے کے لیے تڑپ رہے تھے اور اس کا پرانا سیاہ قلم اس کے لمس کا منتظر تھا لیکن وہ تو ماضی کے بام و در میں گھوم پھر کر اپنے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ تلاش کرتی پھر رہی تھی...... اس کے کانوں میں انہی باتوں کی بازگشت گھوم رہی تھی جو اس نے اپنی سہیلیوں کے درمیان بیٹھ کر کی تھیں۔

"اونھ! شادی!... کوئی اتنی حسین شے تو نہیں جس کی آرزو کی جائے جس کے ارمان کیے جائیں...... بی بی جسے تم پریم بندھن کہتی ہو نا...... یہی بعد میں جیون کا روگ بننے لگتا ہے...... مرد ذات سے خدا بچائے۔ ثریا سچ کہتی ہے کہ مرد عورت کو صرف کھٹ مٹھی گولی سمجھتے ہیں..... جب تک دل چاہا چوستے رہے اور جب طبیعت بھر گئی تھوک دیا یا پھر بڑی خاموشی سے نگل گئے...... تم یقین کرو! میں تو مرتے دم تک شادی نہیں کروں گی"...... وہ اٹل لہجے میں کہتی تو اس کی سہیلیاں اس کی معصومیت پر کھلکھلا کر ہنس پڑتیں۔

"ارے پگلی...... یہ مرد خواہ کتنا ہی ظالم کتنا ہی بے مروت کیوں نہ ہو لیکن ایک دن اپنا کہہ کر اپنا تن من دھن سب کچھ ہی دے دیتا ہے۔ یہی تو ریت ہے اس دنیا کی..... تو بھی کسی مرد کے سہارے کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتی۔ زندگی کے ایک موڑ پر تیرا دل اپنے آپ ہی چاہے گا کہ کوئی مرد آ کر تیرے نازک وجود کو سہارا دے۔"

"نا جی میں نہیں مانتی تمہاری یہ دلیل، عورت جو اپنی کوکھ سے مرد کو جنم دیتی ہے وہ اتنی کمزور نہیں ہوتی کہ مرد کے سہارے کے بغیر زندگی نہ گزار سکے تم نے مادر ملت کو نہیں دیکھا کیا؟" اور جب وہ بحث کرنے کے موڈ میں آجاتی تو اس کی سہیلیاں بعض یہ سوچ کر خاموش ہو جاتیں کہ ایک دن وہ خود اپنی اس جذباتیت کے آگے سپر ڈال دے گی تب اس سے پوچھیں گے۔

گود میں رکھا ہوا تکیہ سر کے نیچے رکھ کر وہ مسہری پر لیٹ گئی، اس کا ذہن پھر بھٹکنے لگا۔ اسے یاد آیا جن دنوں اس کے افسانے ملک کے مشہور رسالوں میں دھڑا دھڑ شائع ہو رہے تھے ان دنوں اس کے لیے کئی ایک اچھے رشتے آئے تھے۔ اور تو اور اپنے محلے کے وہ صاحب جنہیں وہ روزانہ یونیورسٹی جاتے وقت اسکوٹر پر اپنے آفس جاتے ہوئے دیکھتی تھی انہوں نے بھی اپنی امی اور باجی کو اس کے یہاں بھیج دیا تھا اسے پتہ تھا کہ وہ صاحب کو اس سے زیادہ اس کے افسانے پسند ہیں۔ بس اسٹاپ سے گزرتے وقت وہ اپنے اسکوٹر کی رفتار اس قدر دھیمی کر لیتے کہ انہیں اس کی کتابوں میں


۵۶ اگست ۵۵ء

ہنسی مذاق کرتے کرتے سب مل کر بیت بازی کرنے لگے ——
شرجیل نے ایسے ایسے مزاحیہ اشعار سنائے کہ سب کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہو گیا۔
وہ اس وقت خاصے موڈ میں تھا۔ ریحان اور رضا شعر و شاعری کے معاملے
میں بالکل کورے تھے سو ان کے بدلے شرجیل ہی جوابا شعر پڑھتا رہا ——
اور بینا دل ہی دل میں اس کے ذوق اور اس کی قابلیت کی داد دیتی رہی۔
بیت بازی میں اچھا خاصا لطف آیا۔ وقت کا احساس ہی نہ رہا۔ جب ہوا
میں کافی ٹھنڈ آ گئی تو سب جانے کو اُٹھے۔

کھانے کے بعد صبیحہ، راحیلہ اور رضا پھر سیر پر آمادہ تھے —— چاندنی
رات کا لطف لینا چاہتے تھے مگر دوسروں نے ان کی تجویز سے اتفاق نہ کیا۔
یوں بھی دن بھر کے سفر کے بعد تھکن باقی تھی —— صبح چڑیوں کے شور
سے بینا کی آنکھ کھلی تو کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا کر دیکھا —— نیلی سی
روشنی چاروں طرف پھیلی تھی —— سفید پروں والے بگلے آسمان کی
پہنائیوں میں اڑتے پھر رہے تھے —— اور موسم انتہائی خوشگوار اور
آزاد رنگ سا تھا —— بے ترتیب بالوں کو سمیٹتی وہ چھوٹے چھوٹے
قدم اُٹھاتی باہر آ گئی —— راہ میں آگے کاسنی اور سفید پھولوں کو توڑتی
وہ قریبی چشمے کے پاس آ کر ٹھہر گئی —— ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ
کر پانی کو گرتے ہوئے دیکھنے لگی —— اس وقت خود کو بہت سبک
اور تازہ دم محسوس کر رہی تھی —— قریب پڑے ننھے ننھے پتھر پانی
میں اچھالتی رہی۔ ہلکے سروں میں کچھ گنگناتی رہی —— ہاتھ میں تھامے
پھول بے دھیانی میں پانی میں جا گرے۔ جھک کر انہیں اُٹھایا، سیدھی
ہوئی تو سامنے سے رضا کو آتے دیکھا، دیکھ کر مسکرا دی —— وہ قریب
آ گیا ——

"کیا ہو رہا ہے ——؟"
"دیکھ لیں۔" وہ شگفتگی سے مسکرائی۔
"بڑی جلدی جاگ گئیں۔"
"کچھ اتنی جلدی بھی نہیں —— روز ہی اسی وقت آنکھ کھلتی
ہے ——"
"مجھے تو دیر تک سونے کی عادت ہے۔"
"پھر آج کیسے اُٹھ گئے ——؟"
"نئی جگہ پر آ کر معمول میں تھوڑی سی تبدیلی تو کرنی پڑتی ہے۔
اور پھر جاگ جانے پر فائدہ ہی ہوا۔" وہ مسکرا رہا تھا۔
"فائدہ کیسا ——؟" وہ ایک پل کو حیران ہوئی۔
"آپ سے تنہائی میں ملاقات ہو گئی۔ ورنہ تو سارے لوگ ہیں
کہ آپ سے اکیلے میں بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا ——"

"تنہائی میں بات کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی بھئی۔"
"آپ سمجھتی کیوں نہیں بینا ——" وہ جھنجھلا گیا۔ "یا سب
کچھ سمجھ کر بھی انجان بن رہی ہیں۔"
"کیا سمجھوں بھئی —— جانے آپ کیا سمجھانا چاہ رہے ہیں۔"
"اجازت ہو تو صاف صاف کہہ دوں —— ناراض تو نہ ہوں گی؟"
"ایسی کونسی بات ہے بھلا —— اور پھر ناراضگی کیسی ——!!"
وہ کچھ دیر چپ چاپ کھڑا رہا۔ کچھ سوچتا رہا پھر اسے دیکھا۔
"میں آپ کو بہت پسند کرتا ہوں بینا!"
"اچھا —— واقعی ——" وہ سادگی سے مسکرائی اور پُرسکون
انداز میں بولی:
"میں بھی آپ کو پسند کرتی ہوں۔"
"سچ کہہ رہی ہیں نا ——!"
"ہاں —— جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی نہیں۔ آپ اچھے انسان
ہیں اور اچھے انسانوں کو سب ہی لائیک کرتے ہیں۔"
"سب کی بات چھوڑیئے اپنی کہئے ——"
"بتایا نا کہ میں بھی آپ کو پسند کرتی ہوں۔ آپ کی باتیں بڑی
دلچسپ ہوتی ہیں۔ دلکش شخصیت کے مالک ہیں آپ ——" پھر اس
نے مسکرا کر رضا کی طرف دیکھا۔
"اور کچھ سننا چاہتے ہیں آپ؟"
"نہیں ——" وہ پانی پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا —— مڑ کر بینا
کو دیکھا —— بولا "کبھی آپ کو اچھی طرح اپنی پسند کا مطلب سمجھاؤں گا۔"